جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

اشرف التفاسیر

سورۃ الفاتحہ
......تا......
سورۃ بنی اسرآئیل

تقدیم و کاوش

شیخ الاسلام فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

نظر ثانی

عالم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ

مرتب

حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ

(خلیفہ ارشد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ)

۱-۲

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-0322-6180738

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ الفاتحہ ......تا...... سورۃ آل عمران

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا

اشرف علی تھانوی قدس سرہ

کے جملہ خطبات

ملفوظات اور تقریباً

جملہ تصانیف سے

منتخب سینکڑوں الہامی

تفسیری نکات

تقدیم وکاوش

شیخ الاسلام فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

نظر ثانی

عالم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ

مرتب

حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ

(خلیفہ ارشد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ)

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-0322-6180738)

اَشرفُ التفاسیر

تاریخ اشاعت.............. ذوالحجۃ ۱۴۳۰ھ
ناشر.............ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.............سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان — اسلامی کتاب گھر...خیابان سرسید عظیم مارکیٹ... راولپنڈی
ادارہ اسلامیات........انار کلی........لاہور — دارالاشاعت........اُردو بازار........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید........اردو بازار......لاہور — ادارۃ الانور........نیو ٹاؤن..........کراچی
مکتبہ رحمانیہ........اُردو بازار .... لاہور — مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار.....پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے الہامی تفسیری نکات کے اس مجموعہ کو جو عوام وخواص میں مقبولیت ہوئی وہ محتاج بیاں نہیں۔

اہل علم اور تفسیری ذوق کے افراد نے اس مجموعہ کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور خوب استفادہ کیا۔

حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے خطبات وملفوظات سے مزید تفسیری نکات کا اضافہ کیا گیا۔

قرآنی سورتوں کی ترتیب اور ربط پر مشتمل عربی رسالہ ''سبق الغایات فی نسق الآیات''
بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں ملحق کر دیا گیا ہے۔

اس جدید ایڈیشن میں ممکنہ حد تک از سر نو تصحیح کا اہتمام کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ علم دوست حضرات اس اضافہ وتصحیح شدہ ایڈیشن کو پہلے سے بہتر پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ اس جدید ایڈیشن کو شرف قبولیت سے نوازیں۔ آمین

والسلام

احقر محمد اسحاق غفرلہ

ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ، دسمبر 2009ء

اجمالی فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنعاماتِ اِلٰہیہ

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم اما بعد!

تصوف وطریقت جو کہ دین اسلام کا ایک اہم جزو ہے اس کے مطالعہ سے ایک عام قاری اھل اللہ کی صحبت کی اہمیت وافادیت کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن وہ خوش نصیب جن کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے وہی اسکی حقیقت وافادیت ضرورت و اہمیت کو سمجھتے ہیں۔

احقر کی زندگی میں تقریباً ۷۰ء کا سال ایک خوشگوار انقلاب کا سال تھا جس نے احقر کو دینی و دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کر دیا جس دن کہ مجھے سیدی ومرشدی ومربی عارف باللہ حضرت الحاج مولانا محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ ارشد حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ) کا دامن نصیب ہوا جن کی صحبت اور پرخلوص دعاؤں نے وہ ثمرات عطا کئے کہ جن پر جس قدر بھی شکر خداوندی ادا کیا جائے کم ہے' اللہ پاک اس کی صحیح قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ''طریق القلندرؒ'' کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جس کو حضرتؒ کافی سنبھال کر رکھا کرتے تھے۔ ایک دن احقر نے اس وعظ کی نایابی اور حضرتؒ کی اس سے خصوصی عقیدت کی بنا پر عرض کیا کہ حضرت کیوں نہ اس وعظ کو چھپوا دیا جائے؟ جس پر حضرتؒ نے کافی مسرت کے ساتھ دعاؤں سے نوازا اور یوں احقر نے اپنی زندگی میں اس وعظ کی طباعت سے حکیم الامتؒ کی کتب کی طباعت واشاعت کی ابتداء کی اور اس وعظ کی طباعت کے موقع پر میرے محسن جناب حاجی انوار الٰہی صاحبؒ نے خصوصی معاونت فرمائی جن کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ پاک ان کی بال بال مغفرت فرمائیں۔ آمین

مذکورہ وعظ کی طباعت پر حضرت مرشدی حاجی صاحبؒ نے خصوصی شفقت ومہربانی کا معاملہ فرمایا بلکہ ایک دفعہ میری درخواست پر کہ حضرت اگر ادارہ کی مطبوعات پر اظہار مسرت کے طور پر کچھ تحریر فرما دیں تو کتب کے شروع میں اس تحریر کو

لکھ دیا جائے تو حوصلہ افزائی و برکت کا باعث ہوگی جس پر حضرتؒ نے درج ذیل کلمات تحریر فرمادیئے۔

''مجھے دلی خوشی ہے کہ عزیز القدر حافظ محمد اسحاق صاحب' مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تالیفات شائع کرنے کے حریص ہیں انہیں حضرتؒ سے صرف محبت ہی نہیں محبت کا نشہ ہے حضرت کے مسلک و مذاق کی تبلیغ کے بہت خواہشمند ہیں اور زر کثیر خرچ کر کے حضرت کی کتب جو نایاب ہیں چھپواتے رہتے ہیں'' ۔

مرشدی حضرت حاجی صاحبؒ کی وفات کے بعد احقر نے اپنا اصلاحی تعلق عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب سے قائم کیا۔ رفتہ رفتہ حضرت عارفی صاحب کی بے پناہ شفقت و محبت حاصل ہوگئی۔

ایک دفعہ حاضری پر کسی صاحب نے حضرت عارفیؒ سے کلید مثنوی شرح مثنوی رومی کے بارہ میں پوچھا کہ حضرت کلید مثنوی کے بارہ میں سنتے ہیں کیا حضرت کے پاس مکمل کلید مثنوی موجود ہے جواب میں حضرت عارفی رحمہ اللہ نے حسرت بھرے لہجے میں فرمایا ''میری دلی خواہش تھی کہ میں اسے مکمل حاصل کروں لیکن بہت کوشش کی تو صرف دو تین جلدیں ہی حاصل کر سکا ہوں۔ بس حضرت کی حسرت بھری تمنا سن کر دل میں اس کو مکمل حاصل کر کے طبع کرانے کا داعیہ پیدا ہوا اور ہند و پاک سے تلاش کے بعد الحمد للہ اس وقت مکمل **24** حصے بارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ **اللھم لک الحمد و لک الشکر.**

اب اس وقت عارف ربانی مرشدی حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب مہاجر مدنی دامت برکاتہم کی خصوصی شفقتوں اور دعاؤں سے اس وقت ''اشرف التفاسیر'' چار جلدوں میں تکمیل کے مراحل میں ہے۔

اشرف التفاسیر کیا ہے؟ یہ حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے جملہ خطبات و تالیفات سے ان قرآنی آیات کی عجیب و غریب الہامی تفسیر و تشریح کا مجموعہ ہے۔ جن کو حضرت تھانویؒ کے سلسلہ کے اکابرین دیکھ کر حسرت بھری تمنا رکھتے تھے کہ یہ کسی طرح جمع ہو کر کتابی شکل میں آ جائے۔ خصوصاً حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارف صاحبؒ مؤرخ اسلام سید سلیمان ندوی صاحبؒ حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ جیسے ارباب علم حضرات اسکی تالیف و ترتیب کے خواہش مند رہے۔ انہی اکابر کی دعاؤں اور توجہات سے یہ مبارک مجموعہ ''اشرف التفاسیر'' کے نام سے منظر عام پر آ رہا ہے اگر چہ بندہ اس کا بالکل اہل نہیں تھا اور نہ ہے۔

اپنے اکابر کی دعاؤں اور توفیق خدا سے ان نکات کو جمع کرنے کا یہ کام شروع کیا تھا۔ جیسے بن پایا جمع کرتا رہا پھر اس کا تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم سے کیا تو انہوں نے شفقت کی انتہا فرمادی کہ کثیر تعداد میں خطبات جن پر حضرت مطالعہ کے دوران تفسیری نکات پر نشان لگا چکے تھے ان تمام جلدوں کو ارسال فرما کر بندہ کی حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ اس سے اس کام کو چار چاند لگ گئے اور ایک جامع مقدمہ بھی اس پر تحریر فرمادیا جس کو شروع کتاب میں لگادیا گیا ہے۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے بھی اس کام کو شروع کر رکھا ہے۔ انہوں نے بھی ازراہ شفقت ارسال کرنے کو فرمایا۔ بندہ نے ان سے درخواست کی کہ ہم اپنا مسودہ آپ کی خدمت میں بھیج دیتے ہیں آپ سب نکات کو ترتیب دے دیں۔ انہوں نے کرم بالا کرم فرماتے ہوئے اس درخواست کو قبول فرمایا اور کافی محنت و

کاوش سے ان نکات کو مرتب فرمادیا اور بیان القرآن سے منتخب آیات کا ترجمہ بھی لکھا۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء.

اس کے بعد بھی مسودہ تشنۂ تکمیل تھا جس کی وجہ سے نظر ثانی کیلئے علماء کی ضرورت شدت سے تھی تا کہ ہر لحاظ سے یہ مسودہ مستند ہو جائے اس لئے درج ذیل علماء کی خدمات حاصل کی گئی۔

اولاً یادگار سلف حضرت مولانا مفتی عبدالقار صاحب مدظلہم (شیخ الحدیث دارالعلوم کبیر والا) نے بھی نظر فرمائی اور اپنی نگرانی میں اپنے شاگرد رشید مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب (استاد حدیث جامعہ محمدیہ عربیہ نواب شاہ) سے بقیہ پر نظر ثانی کروائی۔ اس کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب صادق آباد اور مولانا محمد ازہر صاحب مدیر ماہنامہ الخیر نے بھی تصحیح و ترتیب میں کافی معاونت فرمائی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

بہر حال یہ سب کچھ اپنے بزرگان کی دعاؤں کا ثمرہ ہے ورنہ ہماری حالت تو بزبان حال یہ ہے

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہو گا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ ہوا ہوا تیرے کرم سے جو کچھ ہو گا تیرے ہی کرم سے ہو گا

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا آیات کے ربط کے بارہ میں خصوصی شغف تھا اور اللہ پاک نے آپ کو اس میں کافی مہارت سے نوازا تھا۔ جس کی بنا پر حضرت نے ایک مستقل رسالہ ''سبق الغایات فی نسق الایات'' تحریر فرمایا تھا جس کی افادیت و ضرورت کے پیش نظر اہل علم حضرت کیلئے ہر سورۃ کے آخر میں رسالہ کا متعلقہ مضمون لگا دیا گیا ہے

جہاں ہمیں دوسرے حضرات کی دعائیں حاصل ہوئیں وہاں جناب نواب عشرت علی خان قیصر صاحب (مسترشد خاص حضرت تھانویؒ) کی بھی خصوصی دعائیں اور توجہات شامل حال رہیں اور کچھ عرصہ قبل ایک خط میں یوں تحریر فرمایا کہ ''حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی تالیفات کی اشاعت و طباعت سے حضرت مجدد صاحبؒ کی روح مسرور ہے اور آپ پر برزخی توجہ ہے۔ اللھم لک الحمد و الشکر

اللہ تعالیٰ ہماری اس سعی ناتمام کو شرف قبولیت نصیب فرمائیں اور اپنے اکابرین کے مسلک و مذاق پر قائم رکھیں اور انہی کی سرپرستی میں اپنے دین کی خدمت لیتے رہیں۔ آمین

والسلام
احقر محمد اسحٰق بن عبدالقیوم عفی عنہما
(ربیع الثانی) ۱۴۲۰ھ

مقدمہ

از شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمین. والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم و علی آله واصحابه اجمعین' امابعد

قرآن کریم کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا گیا ہے کہ "لاتنقضی عجائبه" یعنی اس کے الفاظ واسالیب میں پنہاں اسرار وحکم کے اتھاہ خزانے کبھی ختم نہیں ہوسکتے۔ یہ کلام الٰہی کا اعجاز ہے کہ جب ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی اسے سادگی سے پڑھتا ہے تو اس کا وہ سادہ مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ جو اسے عمومی ہدایت دینے کے لئے کافی ہو۔لیکن جب کوئی عالم اسی کلام سے احکام اور حکمتوں کا استنباط کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہی کلام بڑے دقیق وعمیق نکات کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ان نکات کی گہرائی اور وسعت ہر شخص کے علم وبصیرت کی نسبت سے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے جا بجا اس کلام میں تدبر کا حکم دیا ہے جس کے نتیجے میں بسا اوقات ایک عالم پر وہ نکات واضح ہوتے ہیں جن کی طرف سے پہلے کسی نے توجہ نہیں کی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے اس آخری دور میں مآخذ دین کی تشریح وتبلیغ کی غیر معمولی توفیق عطا فرمائی تھی' یوں تو دین کے تمام ہی علوم میں حضرت کو کامل دستگاہ حاصل تھی لیکن وہ خود فرماتے تھے کہ انہیں تفسیر اور تصوف سے خاص مناسبت ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تدبر قرآن کا خصوصی ذوق عطا فرمایا تھا' ان کی تفسیر "بیان القرآن" اہل علم کیلئے ایک گرانقدر سرمایہ ہے' اور اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب مشکل مواقع پر انسان پچھلی تفاسیر کو کنگھالنے کے بعد اس کی طرف رجوع کرے۔

لیکن حضرت کے تدبر قرآن کا شاہکار درحقیقت وہ تفسیری نکات ہیں جو آپ نے اپنے مواعظ وملفوظات میں کسی اور سلسلہ کلام کے ضمن میں بیان فرمائے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی وعظ یا کسی مجلس میں کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کریم کی کوئی آیت آپ کے قلب پر وارد ہوتی ہے' اور آپ اس کی تفسیر کرتے ہوئے اس سے عجیب وغریب مسائل مستنبط فرماتے ہیں۔قرآن کریم کے نظم واسلوب کی بے مثال توجیہات بیان فرماتے ہیں فوائد وقیود کی دلنشین تشریح فرماتے ہیں۔مختلف آیات قرآنی کے درمیان الفاظ وتعبیر کا جو فرق ہے اس کی حکمتیں ظاہر فرماتے ہیں اور بیشتر مواقع پر انسان ان تفسیری نکات کو پڑھ کر بیساختہ پھڑک اٹھتا ہے اور واقعۃً یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نکات منجانب اللہ حضرت کے قلب پر وارد فرمائے گئے ہیں۔مواعظ وملفوظات میں بکھرے ہوئے ان تفسیری نکات کی یہ اہمیت وندرت ہر اس باذوق شخص نے محسوس

(یہاں یہ واضح رہے کہ نت نئے نکات کی دریافت وعظ وتذکرہ' معارف وحقائق اسرار تکوین اور تشریع کی حکمتوں سے متعلق ہوتی ہے۔اس میدان میں نئے آنے والے ایسے حقائق دریافت آسکتے ہیں جن کی طرف متقدمین کی نظر نہیں گئی اور اسی کو حضرت علیؓ نے "او فهم یؤتاه الرجل" سے تعبیر فرمایا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عقائد اور احکام کے تعین میں بھی ایک شخص پوری امت کے اجماع کے برخلاف قرآن کریم کی کوئی ایسی نئی تفسیر کرسکتا ہے جو مسلمہ عقائد واحکام کے منافی ہو۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن جن عقائد واحکام کی تبلیغ کیلئے آیا تھا وہ اب تک مبہم اور ناقابل فہم ہے اور اس کے دین کا ناقابل اعتبار ہونا لازم آتا ہے۔ والمعاذ اللہ)

کی ہے جس نے اہتمام سے ان مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کیا ہو۔

عرصہ دراز سے احقر کی خواہش تھی کہ مواعظ وملفوظات میں منتشر ان تفسیری نکات کو یکجا مرتب کر کے سورتوں کی ترتیب سے ان کا مجموعہ شائع کیا جائے لیکن مواعظ ومفلوظات کے سمندر سے (جو تقریباً ۳۵'۴۰ ضخیم جلدوں پر محیط ہے) ان جواہر کی تلاش و انتخاب اوران کی ترتیب وتدوین بڑا محنت طلب کام تھا جس کے لئے مدت درکار تھی۔ اپنی شدید مصروفات کی وجہ سے احقر کو براہ راست یہ کام شروع کرنے کی تو ہمت نہ ہوئی لیکن احقر نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ احقر روزانہ حضرتؒ کے مواعظ میں سے جس تھوڑے سے حصے کا معمولاً روزانہ مطالعہ کیا کرتا تھا اس میں ایسے تفسیری نکات پر نشان لگالیتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح آہستہ آہستہ تمام مواعظ میں سے ایسے مقامات منتخب ہو جائیں گے۔ پھر انہیں نقل کرا کر سورتوں کی ترتیب پر مرتب کرلیا جائے گا اور پھر یہ مجموعہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ احقر کے ذہن میں یہ تجویز بھی تھی کہ بعد میں اس مجموعہ کا عربی میں بھی ترجمہ کیا جائے۔

اس طرح بڑی سست رفتار ہی سے سہی' لیکن بفضلہٖ تعالیٰ احقر کے پاس حضرتؒ کے تقریباً ایک سوتیس مواعظ (تیرہ جلدوں) میں منتخب تفسیری نکات پر نشانات لگ گئے اور اپنے بعض رفقاء کی مدد سے احقر نے انہیں نقل کرانا بھی شروع کر دیا۔

اسی دوران برادر مکرم جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مدظلہم ناظم ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان نے احقر کو بتایا کہ انہوں نے بھی اسی قسم کا کام شروع کیا ہوا ہے۔ احقر کو اس بات سے خوشی ہوئی اور احقر نے اپنا کیا ہوا کام ان کے حوالے کر دیا۔ اس طرح الحمدللہ تقریباً ساڑھے تین سو مواعظ سے ان تفسیری نکات کا انتخاب تیار ہو گیا۔ مولانا موصوف نے بڑی عرق ریزی سے ان تمام نکات کو قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب پر مرتب فرمایا۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ احقر کا کام صرف مواعظ کی حد تک محدود تھا۔ مولانا نے ملفوظات سے بھی ان نکات کا انتخاب کیا ہے' احقر نے ان کے کئے ہوئے کام کا نمونہ دیکھا ہے' اگرچہ پورا کام نہیں دیکھ سکا لیکن انہوں نے اپنا کام بعض دوسرے علماء کو بھی دکھالیا ہے اس لئے امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ مناسب ہوگا۔

اب حضرت حکیم الامت کے تفسیری جواہر کا یہ عظیم مجموعہ آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ یہ نہ جانے کتنے علماء اور کتنے بزرگوں کی خواہش کی تکمیل اور کتنے اہل ذوق کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا صوفی محمد اقبال قریشی صاحب اور محمد اسحاق صاحب کو دنیا و آخرت میں بہترین جزاء عطا فرمائیں کہ وہ اس عظیم کام کو منظر عام تک لانے کا ذریعہ بنے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ حضرت حکیم الامت کے مواعظ وملفوظات میں تفسیری نکات کے ساتھ احادیث کی تشریح کے سلسلے میں بھی بڑے قیمتی نکات ملتے ہیں۔ احقر نے اپنے کام کے دوران ایسے نکات پر بھی نشان لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ ان تفسیری نکات کے بعد ان حدیثی نکات پر مشتمل بھی ایک مجموعہ مرتب اور شائع فرمائیں۔ آمین

ان گزارشات کے ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس مجموعے کو مبارک ومسعود فرمائیں۔ اسے امت کے لئے نافع فرمائیں اور یہ ان تمام حضرات کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو جنہوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

محمد تقی عثمانی عفی عنہ — طیارہ پی آئی اے براہ کراچی از ملتان

۱۸ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمات تشکر

از شیخ الحدیث حضرت مفتی عبدالقادر صاحب دامت برکاتہم العالیہ

الحمد لله حمدا یوافی نعمه و یکافی مزیده و صلی الله علی سیدنا محمد و علی اله و اصحابه اجمعین. امابعد

حق تعالیٰ نے جب سے انسانوں کو وجود بخشا اس وقت سے ان کی ہدایت کا سامان بھی بھیجا یعنی انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ یکے بعد دیگرے نبی اور رسل آتے رہے جب ایک نبی کی امت میں دینی قوت مضمحل ہو جاتی تو دوسرا نبی بھیج دیا جاتا جو ان میں علم و عمل کی روح پھونک دیتا۔ یہ سلسلہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے سلسلہ نبوت ختم ہو گیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء ربانیین سے اللہ تعالیٰ نے وہ کام لیا جو پہلے انبیاء علیہم السلام سے لیا جاتا تھا اس امت کے علماء اگرچہ شان و مرتبہ میں انبیاء سابقین کے برابر نہیں مگر نور ہدایت کے پھیلانے میں انبیاء بنی اسرائیل کے مثل ضرور ہیں۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا **علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل** یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے۔

بحمد اللہ یہ سلسلہ ہدایت امت کے ابتدائی دور سے شروع ہوا اور ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء آئے اور علوم کے دریا بہائے بعد میں آنے والے علماء سے بھی اللہ تعالیٰ نے دین کی حیرت انگیز خدمتیں لیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالی شان صادق آ گیا جس میں آپ نے فرمایا **انما مثل امتی مثل الغیث لایدری اخره خیر ام اوله** یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اول بہتر ہے یا آخر اور علماء نے صحیح فرمایا۔ **کم ترک الاول للاخر** ۔ پہلے لوگ پچھلوں کے لئے بہت سی چیزیں چھوڑ گئے بعد میں آنے والے حضرت میں حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذات ستودہ صفات بھی ہے حق تعالیٰ نے علم تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، تجوید و قراءت اصلاح معاشرت غرضیکہ دین کی جمیع ابواب میں آپ کو خدمت کا موقع عطا فرمایا اور ہر باب میں حضرت کی گراں قدر تصنیفات میں جن سے امت کے افراد خصوصاً علماء و تعلیم یافتہ حضرات نفع اٹھا رہے ہیں آپ کی باقیات صالحات میں سے آپ کے کثیر تعداد مواعظ بھی ہیں جو آپ نے اپنے مستقر پر رہتے ہوئے اور کبھی دور دراز کا سفر کر کے عوام و خاص کے مجامع میں بیان فرمائے ان مواعظ میں اللہ تعالیٰ نے بڑی تاثیر رکھی تھی۔

؎ بتقاضا از دل خیز و بر دل ریزد

آپ کے مواعظ دلوں کو گرما دیتے تھے۔ بے شمار لوگ متاثر ہوتے اور ان کی زندگیوں میں انقلاب آ جاتا تھا۔ مجلس وعظ کیا ہوتی ایک شیخ کامل کی اصلاحی مجلس ہوتی تھی۔ جس میں سامعین کے قلوب میں نسبت مع اللہ کا القاء کیا جاتا' اور سامعین وعظ سننے کے بعد دین پر عمل کرنے کے ذوق وشوق میں سرشار ہوتے' کتنے گناہ گار اور غفلت شعار لوگوں کو توبہ کی توفیق مل جاتی بحمد اللہ سینکڑوں کی تعداد میں حضرت کے مواعظ آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد شائع ہوئے ہیں جن سے عوام وخواص نفع اٹھا رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ مواعظ عربی زبان میں ہوتے تو غزالی ورازی رحمہم اللہ کے علوم سے کم نہ ہوتے حضرت کی تصنیفات اور مواعظ کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے بے حد مفید ہے بعض اکابر کا تجربہ ہے کہ حضرت کے مواعظ کے مطالعہ انگریزی خاں اور دیگر جدت پسند لوگوں کے اشکلات کے جوابات خوب ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ایسا شخص کبھی ان لوگوں سے نہیں دبتا اور نہ مات کھاتا ہے۔ حضرت قاری محمد طیب ؒ نے اپنی ایک کتاب میں اکابر دیوبند کا تعارف پیش کیا ہے اور ہر ایک کی تصنیف اور کلام پر تبصرہ کیا ہے کسی کے بارہ میں فرمایا کہ ان کا کلام متکلمانہ ہے کسی کے بارہ میں فرمایا کہ ان کا کلام فقیہانہ ہے اور کسی کا محدثانہ اور کسی کا عارفانہ لیکن حضرت تھانوی ؒ کے متعلق فرمایا کہ ان کا کلام محدثانہ فقیہانہ متکلمانہ عارفانہ ہے سب صفات جمع کر دیں حضرت ؒ کے مواعظ کو جہاں سے پڑھنا شروع کر دیا جائے اس سے دین کی رہنمائی حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہے ایک بات یہ بھی ہے کہ حضرت کے اہل حق ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت کا دینی فیض وفات کے بعد بھی روز افزوں ہے۔

حضرت کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء اور ان کے خلفاء اصلاح امت کے کام میں لگے ہوئے ہیں اسی طرح حضرت کے شاگردوں کے شاگرد اور ان کے شاگرد علمی وتحقیقی ضیاء پاشیوں میں مشغول ہیں اور حضرت کی تصنیفات اور مواعظ مستقل صدقہ جاریہ ہیں اور عجیب اور حیران کن بات یہ ہے کہ حضرت ؒ کی تصنیفات ومواعظ کے بحر بے کراں کے ذریعہ سے نئی نئی تصنیفات وجود میں آ رہی ہیں جن سے حضرت کا فیض عام سے عام ہو رہا ہے۔ بعض اہل علم نے حضرت کی تصنیفات اور مواعظ کو کھنگال کر ایک موضوع سے متعلق حضرت کی تحقیقات کو یکجا جمع کر دیا ہے جس سے گویا نئی تصانیف وجود میں آ گئی ہیں بندہ نے ایک ضخیم کتاب جو دو جلدوں پر مشتمل ہے دیکھی ہے جس کا نام تحفۃ العلماء ہے اس میں حضرت کی تصانیف سے وہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جن کا تعلق علماء سے ہے اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت مفتی محمد زید مدظلہ کو جنہوں نے محنت کر کے اتنا بڑا ذخیرہ حضرت کی تصنیفات سے اخذ کر کے امت کو پیش کر دیا ہے اس طرح انہوں نے کئی موضوعات پر حضرت کی تصنیفات سے مواد جمع کر کے اس کو مستقل نام کے ساتھ شائع کیا ہے جو امت کے لئے بہت مفید چیز ہے۔ **فجزاہ اللہ احسن الجزاء**

اہل باطل اور اہل بدعت کی زندگی میں ان کا خوب غلغلہ رہتا ہے لیکن ان کے مرنے کے بعد عموماً سارا شور اور جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور اہل حق علماء کے مرنے کے بعد بھی ان کا فیض جاری وساری رہتا ہے۔

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کا عجیب ملکہ عطا فرمایا تھا خود بطور تحدیث بالنعمت کے فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے

شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے تفسیر اور تصوف کے بارہ میں دعا کرائی تھی کہ مجھے ان میں مہارت نصیب ہو چنانچہ حضرت کی دعا و برکت سے ان دونوں میں بحمد اللہ مجھ کو مہارت نصیب ہوئی چنانچہ حضرت کی تفسیر بیان القرآن باوجود مختصر ہونے کے حضرت کے علوم کا شاہکار ہے اس طرح مجالس وعظ میں آپ نے موقع کے مناسب آیات کی جو تفسیر فرمائی وہ بھی حضرت کی مہارت کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ آیات قرآن کے بارے میں نت نئے علوم' نکات' رموز' حقائق ولطائف القاء ہوتے تھے۔

جن کو آپ مجلس وعظ اور مجلس ملفوظات میں لطف لے لے کر بیان فرماتے رہتے تھے ان میں بہت سے رموز و نکات ایسے ہیں جو عموماً تفسیر کی کتابوں میں نہیں ملتے بلکہ یہ خداداد قرآن فہمی کا نتیجہ ہیں گویا حضرت والا اس شعر کا صحیح مصداق تھے

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید واوستا

یہ نکات و رموز حضرت کے مواعظ وملفوظات کے سمندر میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے ان کو یکجا جمع کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ ہمارے محترم دوست حافظ محمد اسحاق صاحب کو جنہوں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا خود بھی محنت کر کے تفسیری نکات کا ایک ذخیرہ جمع کیا اور دوسرے اہل علم حضرات اس سلسلہ میں جو کام کر چکے تھے انہوں نے وسعت ظرف اور اخلاص کا ثبوت دیتے ہوئے کیا کرایا حافظ صاحب موصوف کے سپرد کیا۔ حافظ صاحب موصوف کے لئے اب راہ آسان ہوگئی طبع کرنے کا عزم بالجزم کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظ صاحب موصوف کو شیخ کامل حضرت حاجی محمد شریف صاحب کے فیض صحبت سے حکیم الامت کی کتب چھاپنے کا ایسا جذبہ پیدا ہوا ہے جو ان کو ہر وقت بے تاب کئے رہتا ہے ماشاء اللہ حضرت حکیم الامتؒ کی سینکڑوں کتابیں اور مواعظ طبع کرائے ہیں اور تا حال اس میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ موصوف کو اپنی شان کے مطابق بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائیں اور ان کی کوششوں کو بار آور فرمائیں۔ ماشاء اللہ ''اشرف التفاسیر'' تیار ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے اہل علم اور باذوق حضرات ان شاء اللہ اس کی قدر کریں گے اس سے نفع اٹھائیں گے اور اپنے ذوق علمی کی تسکین کا سامان پائیں گے۔

ان تفسیری نکات کی لذت کا حال ان سے پوچھیے جو قبل ازیں اس لذت سے آشنا ہو چکے ہیں' معنوی لذت حسی لذت سے کم نہیں ہوا کرتی عربی کا مشہور مقولہ ہے تدادل الافکار خیر من افتضاض الابکار.

اشرف التفاسیر کو اس نظر سے نہ دیکھا جائے کہ یہ کتاب باقاعدہ کوئی تفسیر کی کتاب ہے کہ جس میں ہر آیت کا ترجمہ اور تفسیر لکھی گئی ہو بلکہ اس میں صرف وہ آیات لی گئی ہیں کہ جن کے متعلق حضرتؒ نے مواعظ میں کچھ بیان فرمایا باقی آیات زیر بحث نہیں لائی گئیں اور جن آیات سے تعرض کیا گیا ہے بعض مواقع میں ان کی بھی مکمل تشریح وتفسیر نہیں کی گئی بلکہ صرف اسی قدر اکتفاء کیا گیا جس قدر حضرتؒ کے مواعظ وملفوظات میں مواد موجود ہے بندہ نے اشرف التفاسیر پر نظر ثانی کی ہے۔ مضامین تو حضرتؒ کے ہیں جن کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں البتہ بعض جگہ کہیں کہیں تکرار آ گیا ہے پھر اسی آیت شریفہ کے بارے میں دوسرے وعظ سے مضمون نقل کیا گیا دونوں مضمون ملتے جلتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ سطحی نظر

سے اس کو تکرار محض سمجھ لیا جائے حقیقت میں ایک مضمون میں دوسرے سے کچھ اضافہ ہوتا ہے یا ان کا فرق ہوتا ہے بالفرض اگر تکرار بھی مان لیا جائے تو قند مکرر سمجھ کر پورا مضمون پڑھ لینا چاہیے۔

اسی طرح اصل مضمون جو مقصود ہوتا ہے اس کا ربط دوسرے مضمون سے ہوتا ہے۔ دونوں مضمونوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا اس لئے مقصود سے قبل یا بعد دوسرے مضامین بھی آ گئے ہیں جن کا بظاہر آیت سے کوئی ربط نہیں نظر آتا مگر مجبوراً ان مضامین کو شامل کرنا پڑا وہ مضامین بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتے پس یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ غیر متعلقہ مضامین کیسے آ گئے بہر حال اگر کوئی فرو گذاشت نظر سے گزرے تو وہ مرتب، کاتب یا مصحح کی طرف سے ہوگی حضرتؒ اس سے بری ہیں۔

پس اس تفسیر کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ جو تفسیر اور سبب نزول، استنباط مسائل اور رموز و نکات حضرت نے بیان فرمائے ہیں وہ کس قدر رو قیع، دقیق اور دلچسپ ہیں ان کو بغور پڑھنے سے ان شاء اللہ قرآن دانی میں مدد ملے گی اور قرآن پاک کے مضامین کے مناسبت پیدا ہوگی اس کے بعد اصل کام آ گے ہے یعنی ان پر عمل کرنا اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا اور یہی مقصود اعظم ہے کیونکہ اسی سے آخرت کی دائمی کامیابیاں نصیب ہوں گی اسی کو فرماتے ہیں

جان جملہ علم ہا ایں است و ایں   کہ بدانی من کے ام یوم دین

حق تعالیٰ اس محنت و کاوش کو قبول فرمائیں اور حضرت حکیم الامت اور مؤلفین اور حافظ موصوف کے لئے صدقہ جاریہ بنائیں اور ان حضرات کو اور ہم سب کو اپنی رضا نصیب فرمائیں...... آمین برحمتک یا ارحم الراحمین

عبدالقادر عفی عنہ

ربیع الاول ۱۴۲۰ھ

مدرس دار العلوم کبیر والا ضلع خانیوال

تعارف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم. و علی الہ و اصحابہ و اولیاء ہ
اجمعین و بارک وسلم تسلیما کثیراً کثیرا.

امابعد الحمد اللہ اس ناکارہ نے ۱۹۶۵ء میں عارف باللہ' استاذ العلماء سیدی ومرشدی حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری قدس سرہ سے بیعت ہوکر مواعظ اشرفیہ کا مطالعہ شروع کیا تو اس میں معارف ہائے قرآنی کا دریا موجزن دیکھا اور الحمد اللہ ان تفسیری نکات کو جمع کرنا شروع کیا اور اس کا معتدبہ حصہ ماہنامہ ''صدائے اسلام'' پشاور میں بالاقساط شائع ہوا۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس سیدی ومرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے بھی اس پرمسرت کا اظہار فرمایا اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی ہدایت فرمائی اور اپنے ادارہ کی طرف سے اسے شائع کرنے کا عزم صمیم کررکھا تھا۔ برادر مکرمی جناب حافظ محمد اسحاق صاحب ملتانی کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اصرار فرمایا کہ مناسب ہے کہ یہ تفسیری نکات یکجا شائع ہوں تاکہ قارئین زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں چنانچہ انہوں نے ازراہ ذرہ نوازی اپنا مسودہ بھی ناکارہ کے حوالے کردیا اور

۱- احقر نے قرآنی سورتوں کے مطابق آیت نمبر بھی درج کرکے انہیں یکجا کیا۔
۲- شروع میں آیت بحوالہ قرآنی سورت درج کرکے بیان القرآن سے اس کا اردو ترجمہ نقل کیا۔
۲- بعدہ تفسیری نکات کے مطابق ذیلی عنوانات قائم کئے اس طرح ملفوظات کی صورت کی بجائے یہ نکات تفسیری شکل میں سامنے آ گئے۔
۴- دونوں مسودات کو یکجا کرنے کے بعض مواقع پر تفسیری نکات کا تکرار ہوگیا جناب حافظ صاحب نے نظر ثانی میں اس تکرار کو حذف فرمادیا۔

اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں سب کی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرما کر زاد آخرت اور وسیلہ نجات بنادیں آمین کیونکہ عنداللہ مقبولیت ہی اصل سرمایہ ہے۔

یاں تو اپنا بھی اک نالہ ہے گر پہنچے وہاں
گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم

محتاج دعا بندہ محمد اقبال قریشی غفرلہ

امام وخطیب جامع مسجد تھانہ والی ہارون آباد ۲۵ ذوالحجہ 1419ھ

حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی خدمات قرآنی کا اجمالی تعارف

از مؤرخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمہ اللہ

اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک' مولانا نے اسکی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانہ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے وہاں خیر امت اولین مفسر قرآن حضرت ابن عباسؓ کو خواب میں دیکھا جن کو آنحضرت ﷺ نے اللھم علمہ الکتاب کی دعا دی تھی اور بشارت سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس رویا کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ رویا اس کی طرف اشارہ تھا۔

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی بلکہ لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے وہ حافظ تھے اور بڑے جید حافظ و قاری تھے اور فنون و تجوید و قراءت کے بڑے ماہر' اخیر زمانہ میں پانی پت کو قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی کی برکت سے قراءت سے ایک خاص مناسبت حاصل ہوگئی تھی۔ مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالقصد کسی جہری نماز کا امام بنا دیا' مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر ایسی قراءت فرمائی کہ قاریوں نے تعریف کی کہ صحت مخارج' کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر مؤثر قراءت نہیں سنی۔ ایک اور مقام پر جہاں اہل نظر موجود تھے صبح کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب نے کہا کہ موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قراءت میں بھیرویں کی کیفیت تھی جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قراءت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی لیکن لہجہ میں قاریوں کی بناٹ نہ تھی اور نہ تحسین آواز کے لئے بہ تکلف اتار چڑھاؤ ہوتا تھا بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسب موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی کہ "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد"

تجوید قراءت و متعلقات قرآن

علوم القرآن میں سے یہ پہلا فن ہے' مولانا نے اس پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱- جمال القرآن:- یہ فن تجوید کا رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل ہیں' مخارج اور صفات حروف اظہار و اخفاء ابدال وادغام و تفخیم و ترقیق' وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

۲-تجوید القرآن:-اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لئے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔

۳-رفع الخلاف فی حکم الاوقاف:-اوقاف قرآنی کے بارے میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ وتطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے۔

۴-وجوہ المثانی:-اس میں قرآن شریف کی مشہور قراءتوں کے اختلاف کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترکیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے اور آخر میں تجوید وقراءت کے کچھ قوائد تحریر فرمائے ہیں۔

۵-تنشیط الطبع فی اجراء السبع:-قراءت سبع اور اس فن کے رواۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

۶-زیادات علی کتب ,روایات:- اس میں قراءت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں یہ ''وجوہ المثانی'' کے آخر میں بطور ضمیمہ ہے۔

۷-ذنابات لمانی الروایات:-یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے۔

۸-یادگار حق القرآن:-اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔یہ ''تجوید القرآن'' کا اختصار وضمیمہ ہے۔

۹-متشابہات القرآن لتراویح رمضان:-قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہیں' ان سے بچنے کے لئے ان میں چند قواعد کلیہ یعنی گر بعض آیات کے ضبط فرمائے گئے۔

۱۰-آداب القرآن:-قرآن پاک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے ہدایات وتنبیہات ہیں۔

۲-ترجمہ وتفسیر قرآن

۱-ترجمہ:-قرآن پاک کا سلیس وبامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے تراجم خالی ہیں۔قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے اس لئے عام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں یعنی ترجمہ صحیح اور زبان صحیح ہے اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں انکا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی نہ ہونے پائے۔اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے۔

۲-تفسیر بیان القرآن:-یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا (اب تین جلدوں میں شائع ہوتی ہے) اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیات ہیں۔

سلیس و بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ۔ ترجمہ نیچے ''ف'' کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر، تفسیری روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفاسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات وحقائق ومعارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر ''روح المعانی'' پر اعتبار فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتاً مفید ہے کہ تیرہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف ومنتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیر صرف عوام اردو خوانوں کے لئے علماء لکھتے ہیں یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحبؒ نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے، خود میرا (یعنی علامہ سید سلیمان ندویؒ) کا خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں سے راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے۔ ساتھ ہی ربط آیات وسورہ کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں اس لئے وجوہ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق ووجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے۔

۳- چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور انکی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی اس لئے وہ ہمیشہ ان کو گمراہیوں سے بچانے میں بجان ودل ساعی رہتے تھے۔ اردو میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع ہوئے تھے وہ بالکل کافی تھے مگر نئے زمانہ میں پہلے سرسید نے بضمن تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے اپنے ترجمے شائع کئے تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کریں، اولین توجہ زبان کی طرف رکھیں اور اقوال سلف کی پروا نہ کریں اس طرز عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مولانا نے اپنا ترجمہ اسی ضرورت سے مجبور ہو کر کیا، مگر اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا اور اس کے اغلاط پر نشان دے کر ایک رسالہ اس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا جس کا نام ''اصلاح ترجمہ دہلویہ'' ہے۔

۴- مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا اور انہوں نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے پر اعتراضات شروع کئے اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا جس کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے، کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلند تھے، بہر حال مولانا نے اس ترجمے کی اغلاط کی اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام ''اصلاح ترجمہ حیرت'' ہے۔

۵-بعض معاصر علماء نے اردو میں قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں جن میں ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے اور آیات کو بہ تاویل واعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے اور اس تاویل واعتبار میں کہیں کہیں اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھیں جن کا نام ''التقصیر فی التفسیر'' ہے۔

۶-لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں ''تفصیل البیان فی مقاصد القرآن'' کے نام سے جمع کیا ہے اس کے مولف کی درخواست پر اس میں جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے ''الھادی للحیران فی وادی تفصیل البیان'' کے نام سے ظاہر فرمائے۔

۷-مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا اور اکثر آیات کی تفسیر وتقریر کو ضبط تحریر میں کر لیا تھا وہ ایک مجموعہ ہو گیا اور اس کا نام ''تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الایات'' رکھا مگر چھپا نہیں۔

۸- ''رفع البناء فی نفع السماء'' الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء کی تفسیر جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا فائدے ہیں یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب میں ہے۔

۹- ''احسن الاثاث فی نظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلث'' سورہ بقرہ کی تین آیاتوں پر نظر ثانی فرمائی ہے۔

۱۰-''اعمال قرآنی'' قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربہ میں آئے ان کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۱-''خواص فرقانی'' اس کا موضوع بھی وہی ہے اس کا ایک اور حصہ ہے جس کا نام ''آثار تبیانی'' ہے ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز غیر شرعی تعویذ گنڈوں اور عملیات سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف ملتفت کرنا ہے اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں۔

۳-علوم القرآن

علوم القرآن کے مختلف مباحث ومسائل تو مولانا کی ساری تصانیف ومواعظ ملفوظات اور رسائل میں ملتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو خاصی ضخیم کتاب ہو جائے مگر ان پر مستقل طور پر بھی بعض کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں سے اول ''سبق انعایات'' ہے۔

۱-''سبق الغایات فی نسق الایات'' یہ قرآن پاک کی آیات وسورہ کے ربط ونظم پر عربی میں پندرہ صفحوں کی کتاب ہے جس کو ۱۳۱۶ھ میں ڈھائی مہینوں میں تصنیف فرمایا اس میں مولانا نے سورہ فاتحہ سے سورۃ الناس تک تمام سورتوں اور ان کی آیات کے ربط پر کلام فرمایا ہے اور اس کا بڑا حصہ امام رازی کی ''تفسیر کبیر'' اور مفتی ابوالسعود بغدادی المتوفی ۱۹۵۱ھ کی ''ارشاد العقل السلیم الی ضرایا القرآن الکریم'' سے ماخوذ ومستنبط ہے ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافوں کو ''قال المسکین'' کہہ کر بیان فرمایا ہے۔ یہ حصہ بھی اچھا خاصا ہے اور اخیر کی صورتوں میں زیادہ تر اضافات ہی ہیں جن میں مولف نے ان سورتوں کے موضوع اور عمود کی تعین فرمائی ہے چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہیں

اس لئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائیں مختلف ہوسکتی ہیں' تاہم ان سے مولانا کے ذوق قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہوسکتا ہے تفسیر ''البیان'' میں بھی ربط ونظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے۔

ذوق ربط آیات

مولانا کے ذوق ربط آیات وسورہ کا حال چونکہ عام طور سے لوگوں کو معلوم نہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مواعظ میں دو قول نقل کر دیئے جائیں جن سے ان کا ذوق اور ان کے بعض اصول ربط واضح ہو جائیں سبیل النجاح ص ۹ میں فرماتے ہیں۔

جواب اس شبہ کا کہ ''مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع ہیں کیونکہ خدائے تعالےٰ نے ان ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں'' اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت مصحف اور ہے۔ یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوگئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوگئی وعلی ہذا تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہیں۔ اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالی عزاسمہ نے بدل دی۔ یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبرئیل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور ﷺ سے یہ کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورہ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورہ کے ساتھ علی ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہو تو ترتیب آیات ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا'' (سبیل النجاح)

پھر اسی کتاب کے ص ۶ میں ارشاد ہے کہ ایک شفیق باپ چاہتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کرے کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس طریقہ کو وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جائے اور ان سب رعایتوں کا منشاء وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جاسکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب ومرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پہلی بات کو پورا

کرے۔ یہی راز ہے اس کا کہ خدائے تعالیٰ کا کلام ظاہر میں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا منشاء شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آئے بلکہ وہ ایک نئے مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے سورہ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے پھر فرماتے ہیں **بل الانسان علی نفسه بصیرة ولو القی معاذیره** (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن انسان اپنے نفس کے احوال و اعمال سے خوب واقف ہوگا کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ (بمقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے اس کے بعد فرماتے ہیں **لاتحرک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه و قرانه فاذا قرانه فاتبع قرانه ثم ان علینا بیانه**

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جما دینا اور زبان سے پڑھوا دینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتہ کی قراءت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون **کلا بل تحبون العاجلة و تذرون الاخرة** کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں **وجوہ یومئذ ناضرة الی ربها ناظرة** بعض کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے الخ تو **لاتحرک به لسانک** سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے

''کلامے کہ محتاج یعنی باشد لایعنی است''

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور ﷺ کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا۔ باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور ﷺ اس خیال

سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقتضاء یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو بھی یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔

۲-''اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن'': مولانا کے چند مواعظ سے ان کے ایک معتقد و خادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہیں افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے اس کے مرتب ہو سکتے تھے۔

۳-''دلائل القرآن علی مسائل النعمان'': مولانا کو حضرت امام اعظمؒ کی فقہ سے جو شدید شغف تھا' وہ ظاہر ہے۔ اس کا مدت سے خیال تھا کہ ''احکام القرآن'' ابوبکر جصاص رازی اور ''تفسیرات احمدیہ'' ملاجیون کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوق قرآنی سے ان آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و اخراج ہو لیکن یہ کام انجام نہ پا سکا۔ آخر میں یہ خدمت اپنے مسترشد خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائیں' چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہو گئے۔ ابھی حال میں جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے تو خانقاہ امدادیہ میں جا کر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے' مولانا روزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکتے ان کو یاد آتے جاتے' بیان فرماتے اور جناب مفتی صاحب اس کو اپنے مقام پر آ کر قلمبند فرما لیتے یہ تصنیف اس طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا اور کام ناتمام رہ گیا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی روایت میں نے سنی ہے جن کو خود بھی ماشاء اللہ قرآن پاک کے فہم کا ذوق ہے' وہ نقل کرتے تھے کہ مجلس میں مولانا ان آیات پر جب گفتگو فرماتے تھے اور فقیہانہ دقت نظر سے کسی حنفی مسئلہ کی صحت پر استدلال کرتے تھے تو اچنبھا ہوتا تھا کہ یہ مسئلہ اس میں موجود تھا لیکن اب تک اس پر اس حیثیت سے نظر نہیں پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بادل چھٹ گیا اور آفتاب نکل آیا۔ اس کے ساتھ وہ مفتی صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے کہ مولانا سے سن کر اپنے مستقر پر پہنچ کر اس کو بعینہ اسی طرح قلمبند کرتے تھے جس طرح مولانا نے تقریر فرمائی تھی۔

۴-''تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبارات'': تفسیر بیضاوی میں حروف مقطعات کا جو مجمل و مغلق بیان ہے اس رسالہ میں بزبان عربی اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے جس سے حروف مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے۔

۵-۶ مولانا کے دو رسالے علم القرآن سے متعلق اور ہیں اور ان دونوں کا تعلق سلوک سے ہے ایک کا نام ''مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور دوسرا کا نام تائید الحقیقہ بالایات العتیقہ'' ہے ان دونوں رسالوں کا موضوع قرآن پاک کی ان آیتوں کی تفسیر ہے جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس دوسرے رسالہ کی بنا ایک سابق مولف کی تالیف ہے جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۲۷ھ میں بہاولپور میں ملا تھا اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے۔ (ماخوذ از حکیم الامت کے آثار علمیہ معارف اعظم گڑھ صفر ۱۳۶۳ھ)

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے کمال بیان ربط آیات قرآن کی چند مثالیں

از فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہ العالی (ساہیوال ضلع سرگودھا)

ربط کی ایک مثال

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ ------ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (پ ۷) کا ربط اوپر کی آیت قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ ---- وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ پ ۷ سے بیان القرآن میں اس طرح تحریر فرمایا گیا ہے۔ اوپر مشرکین پر وقوع عذاب فرض کر کے اس بنا پر ان کے دعویٰ شرک کو باطل کیا گیا تھا۔ آگے اس فرض کا غیر مستبعد ہونا ثابت کرنے کے لئے بعض امم سابقہ کا معذب و ہلاک ہونا بیان فرماتے ہیں تا کہ مخاطبین کو اس فرض کے غلط کہنے کی گنجائش نہ ہو اور اس ہلاکت کا ذکر بھی ایک خاص طور سے فرمایا ہے جس سے کفار موجودین کے منشاء انکار کا جواب بھی ساتھ ساتھ ہو جاوے کیونکہ بڑا منشاء انکار کا یہ ہوتا ہے کہ بعض مصائب آ آ کر ٹل جاتے ہیں تو نادان کو دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ سزائے اعمال نہ تھی ورنہ ٹلتی نہیں اس لئے سنا دیا کہ ان ہالکین کی دارو گیر کی ترتیب بھی یہی ہوتی تھی کہ اول نزول بلیات ہوا کہ تضرع کریں پھر استدراجاً نزول نعم فرمایا گیا جب خوب کفر بڑھ گیا پھر ہلاک کر دیئے گئے تو تم بعض بلیات کے ٹلنے سے دھوکہ مت کھانا (بیان القرآن جلد ۳ ص ۹۳)

بعض اور مثالیں

قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ کا ترجمہ ’’کہہ دو کہ میں تمہارے اوپر نگہبان یا داروغہ نہیں ہوں‘‘ کر دینے سے جیسا کہ اکثروں نے کیا نہ مطلب کھلتا ہے نہ ربط معلوم ہوتا ہے‘ بخلاف اس کے کہ حضرت علیہ الرحمۃ نے یہ فرمایا کہ ’’آپ کہہ دیجئے کہ میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں‘‘ اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ ’’کہہ دیجئے کہ میں تم پر عذاب واقع کرنے کے لئے تعینات نہیں کیا گیا ہوں کہ مجھ کو مفصل اطلاع ہو یا میرے اختیار میں ہو البتہ ہر چیز کے وقوع کا وقت اللہ کے علم میں ہے اور جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عذاب آیا‘‘

اسی طرح آگے وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ پ ۷ کا ترجمہ بالعموم یہ کر دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پرہیزگاری کرتے ہیں ان پر ان کا کچھ حساب نہیں حضرت تھانوی نے ترجمہ فرمایا کہ ’’جو لوگ احتیاط رکھتے ہیں ان پر ان کی باز پرس کا کوئی اثر نہ ہوگا‘‘ اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ ’’جو لوگ منہیات شرعیہ سے جن میں بلاضرورت ایسی مجالس

(خائضین فی آیات اللہ) میں جانا بھی ہے احتیاط رکھتے ہیں ان پران (طاغین اور مکذبین) کی باز پرس (اور گناہ طعن) کا کوئی اثر نہ پہنچے گا (یعنی ضرورت) وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے (بیان القرآن)

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ (پ ۷) اس آیت کا ترجمہ مع تفسیر اس طرح کیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کو (کفر و معصیت پر عذاب الٰہی سے خاص طور پر ڈرایئے جو اعتقاداً یا احتمالاً) اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ (قیامت میں) اپنے رب کے پاس (قبروں) سے زندہ کرنے کے بعد ایسی حالت سے جمع کئے جائیں گے کہ جتنے غیر اللہ (کفار کے زعم میں مددگار اور مستقل شفیع سمجھے جاتے) ہیں (اس وقت) نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی مستقل شفیع ہوگا (اور ایسے لوگوں کو) اس امید پر (ڈرایئے) کہ وہ (عذاب سے) ڈر جائیں (اور کفر و معصیت سے باز آجائیں کیونکہ نہ ڈرنا کسی ولی و شفیع کے بھروسے سے ہوتا ہے اور وہ معدوم ہے)'' (بیان القرآن)

ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر پڑھنے والا شخص یہ محسوس کرے گا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کتاب پڑھ رہا ہے جس کا ہر جملہ دوسرے جملہ سے ملا ہوا ہے اور جڑا ہوا ہے۔ وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ الایۃ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت میں احکام روزے کے بیان ہیں اور یہاں ہے کہ حرام مال سے بچو اس میں جوڑ کیا ہے؟ لیکن اگر غور کیجئے تو آپس میں بڑا جوڑا ہے روزہ میں فرماتے ہیں وَكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَـكُمُ الۡخَـيۡطُ الۡاَبۡيَضُ مِنَ الۡخَـيۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اس وقت تک کھاؤ پیو اور جب صبح صادق نکل آوے تو اس وقت کھانا پینا چھوڑ دو پھر سورج غروب ہو جائے اس وقت روزے کو ختم کر دو سو روزہ تو موقت ہے کہ اس میں جو چیزیں چھڑوائی گئی ہیں وہ ایک خاص وقت تک چھڑائی گئی ہیں کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت تک حرام کر دی گئیں مگر حرام سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزہ کا ذکر فرمایا خیال تو فرمایئے کتنا لطیف ربط ہے (احکام الجاہ)

وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا پ ۵ یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے' اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں بعض دفعہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور اچھا جواب کہ غلبہ فی الحجت مراد ہے' مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی غلبہ نہ ہوگا مشاہد اور مشاہدے کے موافق ہے حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گو یہ جواب فی نفسہ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سیاق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے یہ فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اس فیصلہ کے متعلق ہے۔ پوری آیت یوں ہے فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا (پ ۵) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلے کریں گے۔ قیامت کے دن اور حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے دیکھئے سیاق میں نظر کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے (التزاحم)

ربط کی ایک عجیب مثال

سورہ قیامت میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع

ڈھونڈے گا اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ترجمہ: اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا ہوا جتلا دیا جائے گا (اور انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہیں ہوگا بلکہ انسان خود اپنی حالت پر بوجہ انکشاف ضروری کے خود مطلع ہوگا گویا بمقتضائے طبیعت اس وقت بھی اپنے حیلے حوالے پیش لاوے۔

یہاں تک تو قیامت کے بارے میں مضمون تھا آگے ارشاد فرماتے ہیں لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ۝ ترجمہ: یعنی حضور کو ارشاد ہے کہ قرآن نازل ہوتے وقت اس کو یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ قرآن کو آپ کے دل میں جما دینا اور زبان سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے تو جب ہم قرآن نازل کریں تو اس وقت فرشتے کی قراءت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کی زبان سے اس کو بیان کرا دیں گے۔

اس کے بعد قیامت ہی کا ذکر ہے وجوہ یومئذ ناضرة الی ربها ناظرة۔ ترجمہ: بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

تو اوپر بھی قیامت کا ذکر اور بعد کو بھی اس کا ذکر اور درمیان میں یہ مضمون کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے لوگ اس مقام کے ربط میں تھک گئے اور بہت سی توجیہات کی گئیں مگر سب میں تکلف ہے لیکن جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور کے ساتھ ہے اس کو صاف نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع اور ربط ہے چنانچہ بیان القرآن میں اس کا جو ربط تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ سے دو مضمون مستفاد ہوئے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں دوسرا یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب حکمت مقتضی ہوتی ہے تو علوم غائبہ کثیرہ کو ذہن مخلوق میں حاضر کر دیتا ہے گو ان علوم غائبہ کا حاضر ہو جانا خلاف عادت طبعی ہو جیسا کہ قیامت میں اس کا وقوع ہوگا۔

اب آگے اس کا ربط ملاحظہ ہو

جب یہ بات ہے تو آپ وحی کے نزول کے وقت جیسا کہ اب تک آپ کی عادت ہے اس قدر مشقت کہ سنتے بھی ہیں پڑھتے بھی ہیں دھیان بھی رکھتے ہیں محض اس احتمال سے کیوں برداشت کرتے ہیں کہ شائد کچھ مضمون میرے ذہن سے نکل جائے کیونکہ جب ہم نے آپ کو نبی بنایا ہے اور آپ سے تبلیغ کا کام لینا ہے تو یہاں مقتضائے حکمت یہی ہوگا کہ وہ مضامین آپ کے ذہن میں رکھے جائیں اور ہمارا محصی ہونا تو ظاہر ہی ہے اس لئے آپ یہ مشقت برداشت نہ کیا کیجئے (بیان القرآن)

یہ چند مثالیں تو آیات کے درمیان ربط کی پیش کی گئی ہیں اب ذیل میں ایک ایسی مثال پیش کی جاتی ہے جس میں ایک ہی آیت کے اجزاء میں بڑا ہی عجیب اور نفیس ربط بیان فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَیْهَا مِنْ دَآبَّةٍ (پ۱۴) ترجمہ اور گر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے ظلم کے سبب دارو گیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے۔

بظاہر اس کلام میں ربط معلوم نہیں ہوتا کہ مواخذہ تو صرف لوگوں سے کیا جاتا اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیا جاتا حضرت تھانوی نے بیان القرآن میں اس آیت کی تقریر اس طرح فرمائی ہے۔

تقریر ملازمت شرط و جزا میں احقر کے نزدیک یہ ہے کہ ظالم تو اپنے ظلم کی وجہ سے ہلاک ہوتے اور غیر ظالم اس لئے کہ حکمت خداوندی باعتبار اکثر اوقات کے اس عالم مجموعے کے آباد کرنے کو مقتضی ہے ورنہ نیکوں کی آبادی زمین پر بغیر ظالموں کے مثل آبادی ملائکہ کے آسمان پر ہوتی پھر آبادی زمین کو جدا کیوں کیا جاتا اور اس مضمون کو تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے لولم یذنبوا الذھب اللہ بکم الخ یعنی لولم یکن فیکم مذنبون اس لئے نیک بھی نہ رہتے اور چونکہ حیوانات انسان ہی کے منافع کے لئے مخلوق ہوتے ہیں یہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتے۔ ھذا من المواھب وللہ الحمد اور اکثر اوقات کی قید اس لئے لگائی کہ بعض اوقات دنیا میں صرف غیر ظالم ہی رہیں گے جیسے زمانہ عیسیٰ علیہ السلام میں (بیان القرآن)

اس کی تفصیل حضرتؒ کے ایک وعظ میں نظر سے گزری وہ بھی افادہ عام کے لئے پیش ہے حضرتؒ فرماتے ہیں بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے مقدم (لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ) اور تالی (ماترک علی ظھرھا من دابة) میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ظاہر تو یہ ہے کہ یوں فرماتے کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے نہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور نرے کیا کرتے کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے۔ (الصلوۃ)

ربط کی ایک اور انوکھی مثال اور منصب نبوت کا احترام

سورہ ص کے دوسرے رکوع میں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس ان کے عبادت خانے میں دیوار پھاند کر اہل مقدمہ کے آنے کا ذکر کیا گیا ہے اور قصے کے اخیر میں فرمایا گیا ہے وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ. فتنہ کی تفسیر میں قول مشہور کسی عورت سے نکاح کرنے کے واقعہ کو محققین نے باطل قرار دیا ہے اور بعض نے داؤد علیہ السلام کا لَقَدْ ظَلَمَكَ بلا تحقیق کہہ دینا اس کی تفسیر میں کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ان کی گستاخیوں پر غصہ آ گیا تھا اس سے استغفار کیا مگر غصہ آنا ثابت نہیں کر سکے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کے صبر و تحمل کا امتحان مقصود تھا کہ آیا زور سلطنت میں متواتر گستاخیوں پر دارو گیر کرتے ہیں یا غلبۂ نور نبوت سے عفو فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس میں صابر ثابت ہوئے لیکن انبیاء کی جلالت شان عدل کے جس درجہ عالیہ اور ذروہ قصوی کو مقتضی ہے اس سے بظاہر ایک گونہ بعید اتنا خفیف سا یہ امر پیش آ گیا کہ بعد قیام برہان شرعی کہ وہ بینہ ہو یا اقرار بجائے اس کے صرف ظالم سے خطاب فرماتے کہ تو نے ظلم کیا اس مظلوم سے خطاب فرمایا کہ تجھ پر ظلم کیا جس سے ایک طرح کی طرفداری متوہم ہوتی ہے اور گو مظلوم ہونے کی حیثیت سے یہ طرفداری بھی عبادت ہے خصوص مقدمہ ختم ہو چکنے کے بعد لیکن فریق مقدمہ ہونے کی حیثیت سے اور عدم تبدل مجلس تخاصم اور مجلس واحد کے جامع

المتفرقات ہونے کی حیثیت سے اس تو ہم طرفداری کا بھی نہ ہونا اعدل واکمل تھا سو داؤد علیہ السلام غائت تقوی سے اتنی بات کو بھی مخل کمال صبر ومنافی ثبات فی الامتحان سمجھے اور انہوں نے اس سے بھی اپنے رب کے سامنے توبہ کی۔ الخ

حضرت فرماتے ہیں کہ بندہ نے جو تفسیر کی ہے اس کا مبنی خود منصوص قرآنی ہے اور اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ کے ساتھ اس قصے کا یاد دلانا قرینہ ہے کہ اس میں بھی صبر علی الاقوال تھا گو دونوں جگہ اقوال میں کفر اور سوءِ ادب کا اختلاف ہے البتہ یہ امر مظنون ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اس کو مبنی سمجھا ہو سو چونکہ اور تفسیر کا مبنی بھی قرآن میں نہیں اس لئے یہ تفسیر اوروں سے اقرب ہے (بیان القرآن)

مطلب یہ کہ اس کے مبنی کا قرآن میں منصوص ہونا تو متیقن ہے مگر یہ امر محض مظنون ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اس کو مبنی سمجھا اور وہ مبنی یہ قول ہے لَقَدْ ظَلَمَكَ (حاشیہ بیان القرآن)

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان دراصل اس بات میں تھا کہ انہوں نے ایک دن عبادت کے لئے اس طرح خاص کر لیا تھا کہ اس دن وہ مخلوق سے بے تعلق ہو جاتے تھے ایک دن کو عبادت الٰہی کے لئے اس طرح خاص کر لینا کہ ان کا تعلق مخلوق خدا سے منقطع ہو جائے منصب نبوت اور منصب خلافت کے منافی تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر اور خلیفۃ اللہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں تھا چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس روش کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح آزمائش میں مبتلا کیا (قصص القرآن)

اور بعض اکابر نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش ان کی عاجزی اور بندگی میں تھی کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی عبادت کے پروگرام کا بارگاہ حق میں اظہار کیا اور اس اظہار میں عجب وبڑائی کا شائبہ تھا اس پر گرفت کی گئی اور دو آدمی خلاف معمول اندر آ گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام متنبہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ کی توفیق کے بغیر آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔

یہ دونوں توجیہیں بھی اگرچہ درست ہو سکتی ہیں مگر قرآن کریم کے کسی لفظ میں ان کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا اور اوپر کی آیات سے ان کا کوئی ربط ظاہر نہیں ہوتا اس کے برخلاف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اختیار کردہ توجیہ کا ذکر خود لفظ قرآنی لَقَدْ ظَلَمَكَ میں بھی موجود ہے اور اس کا ربط اوپر کی آیت اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ سے بھی قائم ہو جاتا ہے اس لئے اس توجیہ کا سب توجیہات سے لطیف واولیٰ ہونا بعد امعان نظر کے ثابت ہوتا ہے۔ **فلله در حكيم الامت التهانوی ما ابهى دره وامعن نظره والله اعلم.**

منصب نبوت کے احترام اور عظمت پیغمبرانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت نے آیات کا باہمی ربط اور حضرت داؤد علیہ السلام کی انابت واستغفار کرنے کے ساتھ غیر مستند روایات اور غلط توجیہات کی تردید بھی فرما دی۔ تفسیر بیان القرآن میں حضرت تھانوی نے اسرائیلی روایات سے حتی الامکان احتراز کیا ہے اور قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن کی آیات اور مستند روایات سے ہی فرمائی ہے خاص طور پر منصب نبوت کے احترام اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات کی وضاحت میں اسرائیلی خرافات سے پرہیز کرنے میں یہ تفسیر خصوصی امتیاز رکھتی ہے بیان القرآن میں انبیاء علیہم السلام کے تمام واقعات کی تفسیر میں ایسے کسی واقعہ کو نقل نہیں فرمایا اور نہ کسی ایسی روایات کو تفسیر کی بنیاد بنایا جس سے اسلام کے مسلمہ عقائد پر زد پڑتی ہو یا حضرات انبیاء

علیہم السلام کا احترام ومقام مجروح ہوتا ہو ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کے بعد دو واقعے حضرت سلیمان علیہ اسلام کے بیان فرمائے گئے ہیں ارشاد ربانی ہے

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝ فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰي كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا بہت اچھے بندے تھے کہ بہت رجوع کرنے والے تھے جبکہ شام کے وقت ان کے روبرو اصیل عمدہ گھوڑے پیش کئے گئے تو کہنے لگے میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا۔ یہاں تک کہ آفتاب پردہ مغرب میں چھپ گیا ان گھوڑوں کو ذرا میرے سامنے لاؤ سو انہوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور ہم نے سلیمان کو ایک اور امتحان میں ڈالا اور ہم نے ان کے تخت پر ایک دھڑ لا ڈالا پھر انہوں نے رجوع کیا کیا اے میرے رب میرا قصور معاف کر اور مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا کسی کو میسر نہ ہو آپ بڑے دینے والے ہیں۔ (پ ۲۳ سورہ ص)

بیان القرآن میں ان دونوں واقعات کی ایسی تفسیر بیان کی گئی ہے جس میں ایسی غیر مستند اسرائیلی روایات وخرافات سے مکمل طور پر پرہیز کیا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان عالی اور منصب نبوت کے قطعی طور پر لائق نہیں ہیں۔ حضرت تھانوی نے اپنی تفسیر کی بنیاد روایات صحیحہ پر رکھی۔ پہلے واقعہ کے متعلق حضرت تھانوی فرماتے ہیں۔

(وہ قصہ ان کو یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ شام کے وقت اس کے روبرو اصیل اور عمدہ گھوڑے (جو بغرض جہاد وغیرہ رکھے تھے) پیش کئے گئے (اور ان کے ملاحظہ کرنے میں اس قدر دیر ہو گئی کہ دن چھپ گیا اور کچھ معمول از قسم نماز فوت ہو گئی۔ کذا فی الدر المنثور عن علی اور بوجہ ہیبت اور جلالت کے کسی خادم کی جرأت نہ ہوئی کہ مطلع ومتنبہ کرے۔ کذا فی الدر عن ابن عباس پھر جب خود متنبہ ہوا) تو کہنے لگے کہ افسوس میں اس مال کی محبت میں لگ کر اپنے رب کی یاد سے (یعنی نماز سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ آفتاب پورا (مغرب میں چھپ گیا (پھر چشم وخدم کو حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو ذرا پھر تو میرے سامنے لاؤ (چنانچہ لائے گئے) سو انہوں نے ان گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار سے) ہاتھ صاف کرنا شروع کیا (کذا فی الدر مرفوعا بسند حسن یعنی ان کو ذبح کر ڈالا اس کو اصطلاح تصوف میں غیرت کہتے ہیں کہ جو چیز سبب غفلت عن اللہ ہو جاوے اس کو اپنے پاس نہ رہنے دیں۔ پھر فائدہ میں اس کی وضاحت اس طرح فرمادی کہ: یہ نماز جو رہ گئی تھی اگر نفل تھی تو کوئی اشکال نہیں مگر انبیاء کی شان اعظم ہوتی ہے اس لئے انہوں نے اس کا بھی تدارک کیا اور اگر فرض تھی تو نسیان میں گناہ نہیں ہوتا اور یہ قطع کرنا سوق واعناق کا اتلاف مال نہ تھا بلکہ بطور قربانی کے تھا اور قطع سوق کو شاید خروج دم اور زہوق روح میں آسانی ہونے کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ کذا فی الروح مگر ہماری شریعت میں قطع سوق مشروع نہیں للنھی عن النخع کذا فی تخریج الزیلعی عن الطبرانی و ھذا مثلہ.

اس وضاحت سے بڑی خوبی کے ساتھ تمام اشکالات کا حل اور ذہنوں میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب ہو گیا

کہ نسیان فرض میں گناہ نہیں اگر فرض کرلیا جائے کہ وہ فرض نماز تھی اور قطع سوق واعناق بظاہر اتلاف مال معلوم ہوتا ہے وہ بطور قربانی کے تھا جو کہ مالی اور جانی عبادت ہے اور اب ہماری شریعت میں قطع سوق مشروع نہیں ہے۔

اس تفسیر سے حضرت تھانوی کی فقہی بصیرت اور جامعیت اور ہر پہلو پر عمیق نظر کا ہونا ثابت ہو رہا ہے اور احترام نبوت کا لحاظ بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

دوسرے قصہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ (حدیث شیخین میں ہے کہ ایک بار سلیمان علیہ السلام اپنے امراء لشکر کی کسی کوتاہی جہاد پر خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ میں آج کی رات اپنی ستر بیبیوں سے ہمبستر ہوں گا اور ان سے سو مجاہد پیدا ہوں گے فرشتہ نے قلب میں القاء کیا کہ ان شاء اللہ کہہ لیجئے آپ کو کچھ خیال نہ رہا چنانچہ صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور اس سے بھی ایک ناقص الخلقت بچہ پیدا ہوا (جس کے ایک طرف کا دھڑ نہ تھا) اور (اسی کی نسبت کہا گیا ہے کہ) ہم نے ان کے تخت پر ایک (ادھورا) لاڈالا (یعنی قابلہ نے آپ کے سامنے تخت پر لا رکھا کہ یہ پیدا ہوا کذا فی الروح) پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا (اور ترک ان شاء اللہ سے توبہ کی اور توبہ کرنا ایسے امر سے چونکہ دلیل ہے کمال ثبات فی الدین کی اس کو امتحان میں پورا اترنا کہیں گے ان توجیہات کی تائید کی مستند احادیث سے ہو رہی ہے اور منصب نبوت کا ان میں پورا پورا احترام ملحوظ ہے اور بعض بے سروپا اسرائیلی قصے جو بعض کتب تفسیر میں نقل ہو گئے ہیں اور ان میں عظمت پیغمبرانہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ایسے قصوں سے اپنی اس تفسیر کو مکمل طور پر محفوظ رکھا۔

ربط کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی محققانہ تحقیق

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ربط کے سلسلہ میں عربی رسالہ بھی لکھا اور اپنی تفسیر بیان القرآن میں بھی آیات اور سورتوں کے درمیان ارتباط کا لحاظ رکھا اور واقع میں بھی ترتیب نزول آیات اور ترتیب تلاوت کہ مختلف ہونے سے ربط کی ضرورت ثابت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ باہم آیات میں کوئی مناسبت اور تعلق ضرور ہے لیکن اگر آیات میں ربط نہ بھی ہوتب بھی قرآن کریم پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرز تصنیف نہیں اختیار کیا گیا بلکہ نصیحت مع لحاظ شفقت اختیار کیا گیا ہے اور اس میں ضرورت مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاذ ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے۔ استاذ تو ضابطہ پری کر دیتا ہے مگر باپ ضابطہ پری نہیں کر سکتا نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کر لے۔ اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کرتے وقت کبھی بے ربط و بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے وقت نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اسی درمیان اس نے دیکھا بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے شفقت کا

مقتضا یہی ہے کہ بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ میں کہہ کر پہلے بات کو پورا کرے یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا منشاء شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے (وعظ سبیل النجاح ص ۳۳۵ وغیرہ)

اس نصیحت وشفقت کے پیش نظر اللہ تبارک وتعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جس میں ساری سورت کا مضمون اجمال کے ساتھ مذکور ہوتا ہے اور تھوڑے سے مختصر لفظوں میں بڑا مضمون ادا کر دیا جاتا ہے جس کو بلاغت میں ایجاز کہتے ہیں اس طرح تمام احکام پر عمل کرنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں مختلف ابواب کے احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اخیر کی آیت میں بطور میزان الکل کے ایک بات ایسی بتا دی جو سب کو جامع ہے اس طرح یہ آیت اخیرہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تمام سورت کے احکام کو اجمالا جامع ہے جس میں بالاجمال جملہ احکام مذکور داخل ہیں اور دیکھنے میں دو تین باتیں ہیں جن پر عمل بہت آسان ہے۔

سورتوں کے درمیان ربط

آیتوں کے درمیان ربط کے علاوہ سورتوں کے درمیان ربط کا بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر اہتمام فرمایا ہے مثلاً سورہ فاتحہ سے سورہ بقرہ کا ربط اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔

سورہ فاتحہ سے اس سورت کا یہ ربط ہے کہ اس میں راہ ہدایت کی درخواست کی گئی تھی اور اس میں اس درخواست کی منظوری ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اس پر چلو (بیان القرآن)

اور سورہ بقرہ کے ختم پر سورہ آل عمران سے ربط اس طرح ذکر کیا ہے فرماتے ہیں

میرے نزدیک یہ تمام سورت جملہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ سے مرتبط ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ اجزاء میں کفار کیساتھ مجاہدہ باللسان وبالبنان مذکور ہے جیسا تتبع سے معلوم ہوتا ہے (بیان القرآن جلدا)

اگر آیتوں اور سورتوں کے روابط کو تفسیر بیان القرآن سے علیحدہ جمع کر کے شائع کر دیا جائے تو طلباء علوم دینیہ کے لئے نہایت درجے مفید ہو سکتا ہے پھر کسی اور جگہ سے ربط کے تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ سکتی۔

حضرت حکیم الامت کی بعض خاص تفسیری تحقیقات

اردو عربی محاورے کا فرق

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض الفاظ لغت عربی میں کسی معنی خاص میں صریح نہیں ہیں مگر اردو محاورہ میں وہ اس معنی میں صریح ہو گئے ہیں اب ان الفاظ کو قرآن میں دیکھ کر بعض جاہلوں کو قرآن پر اشکال ہوتا ہے کہ اس میں تو غیر

مہذب الفاظ ہیں مثلاً ذکر عربی میں (نر) کو کہتے ہیں جو انثی (مادہ) کا مقابل ہے و ذکر و انثی عربی میں نر و مادہ کو کہتے ہیں اور کبھی کنایہ عضو مخصوص کو بھی کہتے ہیں یہ تو عربی کا استعمال ہے مگر اردو میں ذکر کا استعمال عضو ہی کے لئے ہونے لگا۔ اب اگر کوئی قرآن میں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ دیکھ کر اعتراض کرنے لگے کہ اس میں غیر مہذب الفاظ ہیں یہ اس کی حماقت ہوگی کیونکہ جو لفظ تمہارے محاورے میں غیر مہذب ہے وہ عربی میں اس معنی کے لئے موضوع ہی نہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ اور اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا بعض جہلا اس کو غیر مہذب سمجھتے ہیں یہ بھی حماقت ہے کیونکہ عربی میں لفظ فرج شرمگاہ عورت کے لئے موضوع نہیں بلکہ اس کے اصل معنی شگاف کے ہیں کنایۂ کبھی شرمگاہ کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے۔ چنانچہ احصنت فرجها کا ترجمہ ہے کہ مریم علیہا السلام اپنے گریبان کو دست اندازی غیر سے بچانے والی تھیں۔ اسکا مرادف یہ ہے کہ پاکدامن تھیں کتنا نفیس عنوان ہے جس میں بتلائیے کون سا لفظ غیر مہذب ہے اور فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے گریبان میں دم کر دیا جس سے وہ حاملہ ہو گئیں بتلائیے اس میں کیا اشکال ہے (المورد الفرخی)

چنانچہ بیان القرآن میں اس لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے جنہوں نے اپنے ناموس کو (حرام اور حلال دونوں سے) محفوظ رکھا (بیان القرآن)

مگر محض ترجمہ سے یہ باتیں تھوڑا ہی معلوم ہو سکتی ہیں ترجمہ دیکھنے والے ایک لفظ کا ترجمہ اپنے محاروہ کے موافق کر کے قرآن کریم پر اشکال کرنے لگتے ہیں۔ قرآن کریم عربی کلام ہے اور اس کی بلاغت و فصاحت اور اس کے معانی و مطالب کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عربیت کا پورا ماہر ہو اور عربی زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ قرآن کریم کو اسی زبان میں سمجھتا ہو جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہو۔ (المورود الفرخی)

اردو زبان کی تنگ دامانی

اردو میں جب عربی زبان کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو چونکہ اردو عربی زبانیں مختلف ہیں دونوں کے محاورات الگ ہیں اس لئے اگر کسی کا عربی میں علم کافی نہیں ہے اس کے ترجمے میں بعض دفعہ ایہام رہ جائے گا جس سے شبہات پیدا ہوں گے اور بعض جگہ ترجمہ غلط ہو جائے گا۔

مثلاً سورہ والضحیٰ میں ضَآلًّا کا ترجمہ بعض نے گمراہ کر دیا۔ جو باوجود فی نفسہ صحیح ہونے کے ایک عارض کے سبب غلط ہو گیا وہ عارض یہ ہے کہ ضال لفظ عربی ہے اس کا عربی میں مختلف استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس میں بھی جس کو وضوع دلیل نہ ہوا ہو اور اس میں بھی جو بعد وضوع دلیل کے مخالفت کرے گمراہ ہمارے محاورہ میں صرف اس کو کہتے ہیں جو وضوع دلیل کے بعد حق کا اتباع نہ کرے اور لغت عربیہ کے اعتبار سے لفظ ضال دو معنی کو جیسا کہ مذکور ہوا عام ہے ایک معنی ضال کے وہ ہیں جو ہمارے محاورے میں گمراہ کے آتے ہیں اور دوسرے معنی بے خبر کے ہیں اور بے خبر اس کو کہتے ہیں جس پر دلائل ظاہر ہی نہیں ہوئے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور حق کے بعد اس کا اتباع نہ کرنا محال ہے لہٰذا اس جگہ گمراہ

ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ بے خبری سے ترجمہ کرنا مناسب ہے۔

اور گو بے علمی بھی بے خبری کا مرادف ہے مگر اس سے بھی ترجمہ مناسب نہیں کیونکہ ہمارے محاورہ میں بے علم جاہل کو کہتے ہیں جو علوم صحیحہ سے بالکل عاری ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے گو علوم نبوت سے بے خبر ہوں مگر علوم عقلیہ میں کامل تھے۔ پس بے علمی سے بھی ترجمہ مناسب نہیں بلکہ بے خبری ہی سے ترجمہ کرنا مناسب ہے اور کسی بات سے بے خبری کچھ عیب نہیں کیونکہ ذاتی اور علم محیط سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہر شخص علم میں تعلیم الٰہی کا محتاج ہے بالخصوص علوم سمعیہ نقلیہ میں جن کے ادراک کے لئے عقل محض ناکافی ہے اور ہر شخص کو جو علم حاصل ہوتا ہے معلوم کرنے سے پہلے وہ غیر معلوم ہی ہوتا ہے پس علم بعد عدمِ علم کوئی عیب نہیں۔ مناسب ترجمہ ضالا کا اس جگہ ناواقف ہے اس لفظ کا یہ صحیح ترجمہ موجود تھا مگر مترجمین کی نظر اس پر نہیں پہنچی اور وہ ضالا کا ترجمہ گمراہ کر گئے حاصل یہ کہ الفاظ عربیہ کا ترجمہ ہر جگہ کافی نہیں ہوتا اور مقصود کے سمجھنے میں غلطی واقع ہو جاتی ہے اس لئے ترجمہ کے لئے خود عربی کا بھی پوری طرح جاننا اور اس زمانے کے محاورات سے بھی جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے پورا واقف ہونا ضروری ہے (زکوۃ النفس)

آج کل اردو میں محاورہ بدل گیا گمراہ کا استعمال ہی معنی میں ہوتا ہے دوسرے موقع میں ناواقف اور بے خبر کہا جاتا ہے۔

اسی طرح **لا تکونن من الجھلین** ترجمہ دیکھنے والوں کو خیال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے سخت لفظ سے خطاب فرمایا گیا یہ شبہ اصل میں خلط محاورہ سے ہوا ہے ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اس کا اگر ترجمہ کیا جائے تو آسان لفظ ہو جاتا ہے جاہل کا ترجمہ نادان ہے یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے توہین لازم نہیں آتی بلکہ شفقت کے موقع پر یہی بولا کرتے ہیں ظاہر میں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے یہ اشکالات خلط محاورہ سے ہوتے ہیں (آداب التبلیغ)

محاورہ کے درپے ہونا

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کے ترجمے میں یہ ضروری ہے کہ قرآن کا مدلول باقی رہے۔ آج کل کے ترجموں میں ان کو بامحاورہ کرنے کے درپے ہو کر اس کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ قرآن مجید کے ترجمہ میں محاورہ کی اتباع کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی مدلول کے باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔

زمانہ حال کے بعض ترجمہ کرنے والوں نے محاورات کے اتباع کی پابندی میں اصل مدلول قرآن کا لحاظ نہیں رکھا اور بعض ایسے محاورات استعمال کئے جو فصاحت کے مقام سے گرے ہوئے ہیں حالانہ ترجمہ قرآن کریم میں زبان فصیح ہونی چاہئے اور محاورہ بھی شاہانہ انداز کا استعمال کرنا چاہیے جس سے کلام کی عظمت و ہیبت قلوب میں باقی رہے اور عامیانہ بازاری محاوروں سے کلام کی وقعت متاثر ہو سکتی ہے مگر عامیانہ طبائع ایسے ہی محاورات پر فریفتہ اور لٹو ہیں۔

مثلاً ایک ایسے ہی مترجم صاحب نے جن کی محاورات دانی پر لوگ فریفتہ ہیں **یعمھون** کا ترجمہ ٹامک ٹوئیاں مارنا لکھا ہے اور ذھبنا نستبق میں استباق کا ترجمہ کبڈی کھیلنا کیا ہے۔ یہ ترجمہ لغت کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے لغت

میں استباق کے معنی آپس میں اس طرح دوڑنے کے ہیں کہ جس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنا مقصود ہو اور عقلاً بھی ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دور نہیں جایا کرتے جس سے محافظ بچے کی نسبت بھیڑیئے کے کھا جانے کا احتمال ہوا گر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اس پر ضرور جرح فرماتے۔ اسی طرح وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ کی تفسیر میں اس مفسر نے لکھ دیا کہ جو شخص روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے یہ تفسیر اس آیت کی بالکل غلط ہے (وعظ الصوم)

حالانکہ روزہ کے بدلے میں فدیہ کا یہ حکم شروع اسلام میں مشروع تھا پھر فمن شهد منكم الشهر فليصمه سے منسوخ ہو گیا البتہ جو شخص بہت بوڑھا ہو یا ایسا بیمار ہو کہ اب صحت کی توقع نہیں ایسے لوگوں کے لئے یہ حکم اب بھی باقی ہے مگر روزہ کی طاقت رکھنے والوں کے لئے یہ حکم منسوخ ہے جیسا کہ بیان القرآن مع حاشیہ میں مذکور ہے۔

قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے عربی لغت اور صرف نحو کے علاوہ دوسرے قواعد (عقلیہ) منطقیہ جاننے کی ضرورت بھی ہے کیونکہ آج کل عقول سلیمہ بہت کم ہیں اگر عقل سلیم ہو تو نتیجہ نکالنے کا سلیقہ اور اس کی غلطیاں خود معلوم ہو جاتی ہیں مگر جب عقل سلیم نہ ہو تو قواعد منطقیہ کی ضرورت ہے اس سے صحت استدلال اور نتیجے کا صحیح و غلط ہونا معلوم ہو جاتا ہے بدوں اس کے قرآن میں بعض جگہ غلطی ہو جانے کا اندیشہ ہے مثال کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُمْ مُّعْرِضُونَ۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ ان دونوں مقدموں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لو علم الله فيهم خيرا لاسمعهم ولو اسمعهم لتولوا وهم معرضون. اور اس کا بطلان ظاہر ہے اس اشکال کا حل علم معقول جاننے والا جلد دے سکتا ہے کہ یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کیونکہ صحت نتیجہ تکرار حد اوسط پر موقوف ہے اور یہاں حد اوسط مکرر نہیں کیوں مطلب یہ ہے۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ سماع قبول وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ سماع عدم قبول لَتَوَلَّوا وَّهُمْ مُّعْرِضُونَ اور اس پر کوئی اشکال نہیں اس لئے بقدر ضرورت علم معقول کی بھی ضرورت ہے (المورد الفرنجی)

بیان القرآن کے عربی حاشیہ میں حضرت نے اس اشکال اور جواب کی تقریر ان لفظوں میں کی ہے۔

اندفع بهذا مايوهم من الشرطيتين من الاستلزام علم الله منهم خير التوليهم بناء على ان لازم الازم لازم وجه الاندفاع ظاهر فان الاسماع الازم غير اللسماع الازم و قدرايت التصريح بهذا المعنى فى الدر المنثور عن ابن زيد نصر هكذا ولو اسمعهم بعد ان يعلم ان لاخير فيهم مانفعهم بعد ان علم بانهم لا ينتفعون به.

اسی طرح آیت انما يخشى الله من عباده العلماء میں علماء کو یہ شبہ ہوا کہ ہم عالم ہیں تو ہم میں خشیت بھی ہے اور جب خشیت بھی ہے تو اس فضیلت میں داخل ہوئے حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ محض علم سے خشیت ہونا ضرور نہیں اس کے لئے تدبیر مستقل کی حاجت ہے اور عوام کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم سے خشیت ہوتی ہے حالانکہ ہم نے تو بہت سے عالم دیکھے ہیں کہ ان کو خوف خدا کچھ بھی نہیں۔ عوام کے اعتراض کا اکثر یوں جواب دیا جاتا ہے کہ جس عالم کو خوف خداوندی نہ ہو اس کا علم معتد بہ نہیں ہے پس جہاں علم معتد بہ ہو گا وہاں خشیت ضروری ہے حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب فی نفسہ تو صحیح ہے مگر اس مقام پر نہیں چلتا۔ (حضرتؒ کی تقریر سمجھنے کے لئے علوم الٰہی اور اصطلاحات منطقیہ کی ضرورت ہوگی۔) چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس پر مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ خشیت علم پر ضرور مرتب ہو گی اور علم سے مراد علم مع الخشیت ہوگا۔ پس خشیت مرتب ہوگی خشیت پر پس تقدم الشی علی نفسہ لازم آئے گا اور یہ دور صریح ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ خوف کا پیدا کرنا ضروری ہے اور اس کا موقوف علیہ ہے علم اس کو حاصل کرو لیکن علم حصول خشیت کی علت تامہ نہیں ہے بلکہ اس علت کا ایک جزو ہے دوسرا اجزو تقویٰ ہے۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو علم دین کی کیونکہ یہ نہ ہو تو خشیت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اذا فات الشرط فات المشروط اور دوسری چیز خلوت ہے۔

(فضائل العلم والخشیت)

اب ظاہر ہے کہ ان دونوں آیتوں کا مطلب اور مقصد بغیر قواعد منطقیہ کے کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

دوسری مثال

قرآن کریم کی آیت وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔ کے بارہ میں حضرت تھانویؒ سے ایک عالم نے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ زمین کے مالک کفار ہو گئے؟ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ مولانا آپ تو عالم ہیں مگر ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے (حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے بلکہ اس میں اطلاق کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے صدق کے لئے ایک بار وقوع کافی ہے چنانچہ صحابہؓ کے زمانے میں اس کا وقوع ہو چکا۔ یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق وسباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے اور جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے اس پر کچھ بھی اشکال نہیں۔

بیان القرآن میں حضرت نے اس زمین سے جنت کی زمین ہی مراد لی ہے فرماتے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے اور اسی صفحہ کے حاشیہ عربیہ میں فرماتے ہیں کہ جنت کے لفظ سے اشارہ اس طرف ہے کہ الارض محمول ہے ارض جنت پر جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ میں الْأَرْضَ سے مراد جنت کی زمین ہے۔

تیسری مثال

اور مسئلہ روایت باری تعالیٰ کی دقیق تحقیق

ایک صاحب نے سوال کیا فلما تجلی ربه الی. خر موسی سے معلوم ہوتا ہے کہ خرور بعد تجلی کے ہوا پس

رویت ثابت ہوگئی پھر لن ترانی کے کیا معنی؟ جواب یہ دیا کہ تقدم زمانی نہیں تقدم ذاتی ہے پس تجلی اور خرور میں کوئی زمانہ نہیں ہوا جس میں رویت ہو (ملفوظ ۹۳ از مقالات حکمت)

ایک اور سوال و جواب جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی رویت کی توضیح کیلئے مفید معلوم ہوتا ہے سوال کیا گیا کہ وادی ایمن میں موسیٰ علیہ السلام کو جو نور نظر آیا وہ اگر نور مخلوق نہ تھا تو رویت میسر ہوگئی پھر رب ارنی انظر الیک کی درخواست کی کیا وجہ؟ اور اگر نور مخلوق تھا تو موسیٰ علیہ السلام میں اور ہم میں کہ دوسرے انوار مخلوقہ کو مثل نور شمس و قمر دیکھتے ہیں کیا فرق ہوا؟ جواب دیا۔

کہ وہ نور غیر مخلوق نہ تھا مگر چونکہ مخلوق بالواسطہ تھا اس لئے اس کو بنسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس و تعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا یعنی ایک معنی کو نور حق کہنا بھی صحیح ہے جیسے کلام لفظی کہ ماتریدیہ کے نزدیک مخلوق ہے مگر اس خاص تلبس کی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہنا صحیح ہے۔ بخلاف کلام زید و عمرو کہ اس کو کلام اللہ کہنا جائز نہیں پس سب اشکالات رفع ہوگئے۔ (ملحوظ)

واقعی وادی ایمن میں نور حق نظر آنے کے بعد رویت کی وجہ اور دونوں رویتوں میں اور پھر اس رویت نور وادی ایمن اور دوسرے انوار میں فرق کو بڑی عجیب مثال کلام لفظی سے واضح فرما کر ہر طرح کے اشکالات کو رفع کر دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ علم کلام سے پوری مناسبت اور اس میں مہارت تامہ کے بغیر ایسے دقیق علوم کا سمجھنا سمجھانا ممکن نہیں۔ اسی طرح کی دقیق تحقیق مسئلہ رویت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بیان القرآن میں کی گئی ہے جو قابل ملاحظہ ہے جس سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وقت نظر اور علوم عقلیہ منطقیہ میں بھی کامل مہارت کا اندازہ ہوسکتا ہے فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا مگر یہ کہ اس کی حقیقت کیا تھی اللہ ہی کو معلوم ہے جن احتمالات عقلیہ کی شریعت نفی نہ کرے ان سب کے قائل ہونے کی گنجائش ہے لیکن بلا دلیل عدم تعین اسلم ہے تفصیل اس کی کتب کلامیہ میں ہے البتہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کو بنسبت اس کلام کے جو عطائے نبوت کے وقت ہوا تھا کچھ زیادہ اختصاص متکلم سے ہے چنانچہ یہاں مطلق کلمہ ربہ ہے۔ وہاں نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ آیا ہے اور غالباً زیادہ اختصاص کے سبب یہ کلام مورث اشتیاق رویت ہوا وہ نہیں ہوا۔ واللہ اعلم

اس تقریر سے دونوں کلاموں میں فرق واضح ہو کر سوال رویت کی وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ زیادت اختصاص تکلم ہے اور آگے فرماتے ہیں۔

پہاڑ پر تجلی ہونے کے معنی واللہ اعلم یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا نور خاص بارادہ خداوندی خلائق سے محجوب ہونے کے جو وسائط ہیں وہ حجب اور موانع ہیں تعیین ان کی اللہ کو معلوم پس غالباً ان حجب میں بعض حجب مرتفع کر دیئے ہوں اور چونکہ وہ حجب مرتفعہ قلیل تھے اس لئے ترمذی کی حدیث مرفوع میں تمثیلاً اس کی حالت کو انملہ خنصر سے تشبیہ دی ہے ورنہ صفات الٰہیہ تجزی و مقدار سے منزہ ہیں اور چونکہ افعال حق تعالیٰ کے اختیاری ہیں اس لئے ممکن کہ وہ حجب کے اعتبار سے مرفوع ہوئے ہوں اور موسیٰ علیہ السلام اور دیگر خلق کے اعتبار سے مرتفع نہ ہوئے ہوں یہ معنی ہو جاویں گے لـلـجبـل

کے صفات حق اور افعال حق کے درمیان فرق واضح فرما کر صفات الٰہیہ میں تجزی کے سخت اشکال کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ہی مختصر اور جامع لفظوں میں حل فرمادیا ہے کہ عقل حیران ہے۔اب تجلی للجبل کے معنی بھی واضح ہو گئے ہیں اور صفات الٰہیہ کی تجزی کا اشکال بھی رفع ہو گیا آگے فرماتے ہیں۔

اور چونکہ ارتفاع حجب کا خاصہ احراق ہے جیسا کہ حدیث میں ہے **لاحرقت سبحات النور ما انتھی الیه بصره**۔ اس لئے پہاڑ کی یہ حالت ہو اور یہ ضروری نہیں کہ سارے پہاڑ کی یہ حالت ہو جائے گی کیونکہ تجلی فرمانا باختیار خود کسی خاص قطعہ پر ممکن ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی بے ہوشی ان پر تجلی فرمانے سے نہ تھی چونکہ ظاہر للجبل کے خلاف ہے بلکہ پہاڑ کی یہ حالت دیکھ کر نیز محل تجلی کیساتھ ایک گونا تعلق وتلبس ہونے سے یہ بے ہوشی ہوئی۔

سبحان اللہ کیا عجیب علمی تحقیق ہے ورنہ تو بظاہر نظر اس تجلی کا حضرت موسیٰؑ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ بصیرت نے اس کو للجبل کی قید سے خارج سمجھا اور یہ اشکال بھی اس سے مرتفع ہو گیا کہ جس طرح جبل پر تجلی ہوئی ایسے ہی ایک گونا حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تجلی کے مورد ہوئے اور کسی نہ کسی درجے میں گو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کیوں نہ ہو رویت ہو گئی اور یہ لن ترانی کے خلاف ہے۔حضرت رحمہ اللہ کی اس تقریر بلیغ سے سمجھ میں آ گیا کہ تجلی صرف پہاڑ پر تھی اور یہ تجلی فرمانا چونکہ فعل حق تھا اور افعال حق اختیاری ہیں اسی لئے پہاڑ کے علاوہ دوسری کسی مخلوق سے یہ حجابات مرتفع نہیں کئے گئے۔

آگے استقرار جبل کی تقریر رویت کے وقوع اور عدم استقرار کی تقریر پر رویت کے عدم وقوع میں باہم علاقہ کی تحقیق فرماتے ہیں۔''ظاہراً فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ سے استقرار کی تقریر پر رویت کا وقوع اور عدم استقرار کی تقدیر پر رویت کا عدم وقوع مفہوم ہوتا ہے اس میں قابل تحقیق یہ امر ہے کہ ان میں باہم علاقہ کیا ہے سو عدم استقرار اور عدم وقوع رویت میں تو علاقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاسہ بصریہ موسویہ ترکیب عنصر میں جبل سے اضعف والطف ہے جب اقویٰ واشد متحمل نہ ہوا تو اضعف کیسے متحمل ہوگا اور اس تقریر پر گو استقرار مستلزم تحمل بصر موسوی عقلاً نہ ہوگا لیکن اس کو وعدے پر محمول کرنے سے اشکال رفع ہو جائے گا یعنی باوجود دونوں کی عدم تساوی ہم تبرعاً وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ متحمل ہو گیا تو تمہارے حاسہ بصریہ کو بھی متحمل کر دیا جائے گا''۔

واقعۃً یہ اشکال بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے کہ استقرار جبل سے رویت کا تحمل کیسے لازم ہوگا اور ان دونوں میں عقلاً کیا ملازمہ ہے کہ استقرار جبل سے رویت کا تحمل بھی ثابت ہو سکے جب یہ ملازمہ ثابت نہ ہوگا تو اشکال رویت پر رہے گا لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے استقرار جبل اور رویت موسوی میں بنا بر وعدہ عطائے تحمل کے مساوات اور ملازمہ ثابت کر کے اس اشکال کی اساس کو ہی منہدم کر دیا۔

نیز فرماتے ہیں''وقوع تجلی سے وقوع رویت کا شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ دونوں مترادف یا متلازم نہیں بلکہ تجلی کا معنی کسی شے کا ظہور ہے گو دوسرے کو اس کا ادراک نہ ہو پس تجلی کا انفکاک رویت سے ممکن ہے جیسے آفتاب کو متجلی وطالع کہہ سکتے ہیں لیکن خفاش کو رائی اور مدرک کہنا لازم نہیں آتا چونکہ ممکن ہے کہ مبادی تجلی کے سبب چشم خفاش معطل ہو جاتی ہو تجلی کے قبل یہ قبلیت زمانیہ یا تجلی کے ساتھ بمعیت زمانیہ وقبلیت ذاتیہ''(بیان القرآن) وقوع تجلی سے وقوع رویت کے شبہ کو کس طرح

واضح مثال کے ساتھ دور فرمایا گیا ہے کہ باید وشاید واقعی سخت سے سخت تر شبہ کا حل کر کے پھر اس کو ذہن نشین کر دینا حضرت ہی کی خصوصیات میں سے ہے۔

اس بحث کے متعلق آیت لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (پ ۸) کے تحت حضرت فرماتے ہیں

''حاصل مقام کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی مبصر و مرئی خواہ کیسا ہی اکبر اعظم ہوا ایسا نہیں کہ اس کا احاطہ کسی رائی کی بصر سے خواہ وہ کیسا ہی اصغر واحقر ہو محال ہو چنانچہ اس کا امکان باقتضائے عقل ظاہر ہے بخلاف حق تعالیٰ کے باوجود کہ دنیا میں عقلاً مبصر ہونا فی حد ذاتہ ممکن ہے جیسا کہ رب ارنی کی درخواست سے ظاہر ہے مگر شرعاً ممتنع ہے جیسا کہ لن ترانی سے یقینی ہے نیز احادیث میں علی الاطلاق اس کی تصریح ہے اور آخرت میں مبصر ہونا واقع ہے لیکن احاطہ ہر حالت میں محال ہے اور یہ امر خواص باری تعالیٰ سے ہے پس یہ شبہ دفع ہو گیا کہ بعض اجسام عظیمہ پر بھی یہ امر صادق آتا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وجہ دفع ظاہر ہے کہ وہاں ادراک بمعنی الاحاطہ محال تو نہیں پس نفی ادراک مذکور فی الایت مرتبہ استحالہ میں خواص واجب سے ہوا اور احاطہ عقلیہ کا محال ہونا مستقلاً بھی کتب کلامیہ میں مذکور ہے اور لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ بھی بالاولی اس پر دال ہے۔ اس کی تقریر اثنائے ترجمہ میں کر دی گئی اور يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ میں تخصیص ابصار کی باقتضائے خصوصیت مقام ہے کہ مقام بیان ابصار کا ہے خصوصیت حکم کی مقصود نہیں کیونکہ عموم دوسرے دلائل سے ثابت ہے اور اس کا مضمون خواص واجب سے اس طور پر ہے کہ ممکنات میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ دوسری چیز کا اس کو محیط ہونا محال ہو اور اس کا احاطہ اس دوسری چیز کو واجب ہو پس لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ میں نفی مرتبہ استحالہ میں معتبر ہوگی اور يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ میں اثبات مرتبہ وجوب میں معتبر ہوگا۔ اب دونوں حکموں کا خواص باری میں سے ہونا ظاہر و متیقن ہو گیا''۔ (بیان القرآن)

اس آیت مبارکہ کی تفہیم میں مسائل کلامیہ اور قواعد میزانیہ کے علم کی سخت ضرورت ہے ورنہ اس کی صحیح تفسیر و تفہیم ممکن نہیں لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے ظاہر سے یہ عقلی شبہ ہوتا ہے کہ بعض اجسام عظیمہ کا بھی ادراک ابصار سے نہیں ہوتا تو پھر اس میں باری تعالیٰ کی کیا خصوصیت ہوئی؟ مگر حضرت کی تقریر بالا سے یہ شبہ دور ہو کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خصوصیت واضح ہو گئی کہ ایک تو کسی ممکن چیز کا منفی ہونا اور اس کے وقوع کی نفی کرنا ہے اور ایک اس کا محال ہونا ہے اس آیت میں ابصار سے احاطہ کے وقوع کی صرف نفی مقصود نہیں بلکہ ادراک کا محال ہونا ثابت کرنا مقصود ہے اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس کا ادراک ابصار سے محال ہے بعض اجسام عظیمہ کا احاطہ اور ادراک ابصار سے اگرچہ منفی اور غیر واقع ہو مگر غیر ممکن اور محال نہیں ہے حاصل یہ کہ ادراک کی نفی مرتبہ استحالہ میں معتبر ہے جیسا کہ هُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ میں اثبات ادراک مرتبہ وجوب میں معتبر ہے مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے خواص میں سے ہے کہ ابصار سے اس کا ادراک محال ہے اور ابصار کا ادراک باری تعالیٰ کے لئے مرتبہ وجوب میں ثابت ہے اور وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ میں جو بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابصار کے علاوہ اور سب چیزوں کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے پھر صرف ابصار کے ادراک واحاطے کا اس جگہ خصوصیت سے کیوں ذکر فرمایا گیا تو اس تخصیص ذکری کی وجہ مقام کی خصوصیت ہے کہ مقام بیان ابصار کا ہے خصوصیت حکم کی مقصود نہیں

کیونکہ عموم اور اللہ تعالیٰ کا ہر چیز کو محیط ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہے مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر ابصار سے احاطہ کی نفی کا ذکر تھا تو باری تعالیٰ کے لئے اسی کے احاطہ اور ادراک کا اثبات فرمادیا گیا۔

لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ کا ترجمہ اس کو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی فرمایا گیا ہے اس کے بارے میں حضرت ارشاد فرماتے ہیں اور ''ادراک کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اس سے معتزلہ کا استدلال دربار انکار رویت الٰہیہ کے اہل جنت کے واسطے ساقط ہوگیا اور ادراک کے یہ معنی ابن عباس سے منقول ہیں۔ چنانچہ درمنثور میں ہے۔

اخرج ابن جریر عن ابن عباس لاتدرکه الابصار و لا یحیط بصر احد بالله تعالیٰ آ ہ اور روح میں ہے و الیه ذهب الکثیر من ائمة اللغة و غیرهم پس مطلق رویت ثابت اور احاطہ منفی اور حدیثوں میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سوال کے جواب میں هل رایت ربک دو جواب آئے ہیں ایک نورانی اراہ دوسرا رائیت نورا پہلے جواب میں احاطہ مراد ہے دوسرے میں مطلق رویت'' (بیان القرآن)

رویت اور عدم رویت کی حدیثوں میں تطبیق کی یہ کیسی عجیب وغریب صورت تجویز فرمائی گئی ہے جس میں نقل اور عقل ہر ہر پہلو کی رعایت کے ساتھ مذہب اہلسنت والجماعت کی موافقت بھی حاصل ہے۔ آگے ایک اور شبہ کا جواب ارقام فرماتے ہیں جو بظاہر اس تقریر پر ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کی رویت دنیا میں شرعاً ممتنع ہے فرماتے ہیں'' جاننا چاہیئے کہ لیلۃ المعراج میں آپ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جیسا کہ جلالین سے بتخریج مستدرک حاکم بروایت حضرت ابن عباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے۔ رایت ربی عزو جل الحدیث وہ اس حکم امتناعی شرعی فی الدنیا سے مخصوص ہے اور شیخ اکبر رحمۃ اللہ سموت و ما فوقھا کو دنیا سے خارج فرماتے ہیں اور آخرت میں داخل کرتے ہیں اس بناپر کہ آخرت کا ایک زمانہ ہے جو قیامت میں آوے گا اور ایک مکان ہے جو اوپر مذکور ہو پس یہ رویت آخرت میں ہوئی تھی فلاحاجة الی القول بالتخصیص'' (بیان القرآن)

شروع میں گزر چکا ہے کہ تفسیر قرآن کے لئے بہت سے علوم کی ضرورت ہے جیسا کہ تفصیل مذکور سے ناظرین پر واضح ہو چکا بغیر علوم عربیہ اور قواعد ضروریہ کے قرآن کریم کی آیات کا صحیح مفہوم و مطلب نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ تعارض اور اشکالات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور انسان شبہات میں گھر جاتا ہے اس کی ایک مثال اور پیش ہے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے قد افلح من زکھا (جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا) فرمایا ہے جس سے تزکیہ کا مدار فلاح اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ فلا تزکوا انفسکم (تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو) اس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ لاتزکوا نہی کا صیغہ ہے مشتق تزکیہ سے تو اب اس کو اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزکیه کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہی ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگر اس آیت میں لاتزکوا انفسکم کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن کریم میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کرلیا جائے گا تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہو جایا کرے تو اس جگہ شبہے کا جواب موجود ہے۔ چنانچہ لا تزکوا انفسکم پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ ہوا

تھا اس کا جواب اسی جملے کے ساتھ ساتھ دوسرے جملے میں مذکور ہے یعنی ھو اعلم بمن اتقی کیونکہ اس میں نہی مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں ایک اپنا زیادہ علیم ہونا دوسرے من اتقی کے ساتھ اپنے علم کا متعلق ہونا اور نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقوی باطنی عمل ہے۔ نیز تقوی کے معنی لغتہ ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے ڈرنا خود اصلاح باطنی ہے لہٰذا تقوی اور تزکی دونوں مرادف ہوئے آیت کا حاصل یہ ہوا ھو اعلم بمن تزکیٰ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکی کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے تو وہ مقدور ہوا پھر یہ کہ اعلم فرمایا ہے اقدر نہیں فرمایا اس سے بھی اشارۃً معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی نہیں ہے پس اس سے بھی تقوی اور تزکی کا مقدور عبد ہونا مفہوم ہوا' ورنہ اَعلم نہ فرماتے بلکہ اقدر علی جعلکم متقین یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے جب تقوی اور تزکی ایک ٹھہرے اور مقدور عبد ٹھہرے اب غور کرنا چاہیے کہ ھو اعلم بمن اتقیٰ" لاتزکوا انفسکم کی علت بن سکتی ہے یا نہیں اگر لاتزکوا کے معنی یہ لئے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو رذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو ھو اعلم بمن اتقی اس کی علت نہیں ہو سکتی کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ اور تقوی کیا ہے اور یہ ایک بے جوڑ سی بات ہے یہ تو ایسا ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ نماز نہ پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کس نے نماز پڑھی ہے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندے کے کسی فعل کو جاننا اس کے ترک کی علت نہیں ہو سکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کر دینا چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ بندہ کے سب افعال کو جانتا ہے بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہو سکتی تھی کہ ھو اقدر علی جعلکم متقین یعنی یوں فرماتا کہ تم نفس کو رذائل سے پاک نہ کرو کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں پھر کیوں کوشش کرتے ہو۔ جب یوں نہیں فرمایا بلکہ اعلم بمن اتقی فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ھو اعلم بن سکے سو وہ معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کون متقی ہیں اور کون پاک ہوا ہے یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لئے دعویٰ بلا تحقیق مت کرو اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت معلول میں کامل ارتباط ہے (وعظ زکوٰۃ النفس)

لاتزکوا انفسکم پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ ہو رہا تھا تقریر مذکور سے وہ رفع ہو گیا اور آیت کے اگلے حصے ھو اعلم بمن اتقیٰ میں غور کرنے کے بعد یہ شبہ جاتا رہا حسب تقریر سابق علت و معلول میں ارتباط اور کلام میں اتصال سے یہ ثابت ہو گیا کہ تزکیہ کے دو معنی ہیں پاک کرنا اور پاک کہنا ایک آیت میں ایک معنی مراد ہیں اور دوسری میں دوسرے معنی اگر دونوں میں ایک ہی معنی مراد لئے جائیں تو تعارض پیدا ہوتا ہے اب تزکیہ کے دو معنی ہونے کی علت اور اس کی حقیقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زبان فیض ترجمان سے سنئے فرماتے ہیں

"اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کے مصدر ہے اور تفعیل کی خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک

خاصیت تعدیہ ہے اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے۔پس قد افلح من زکھا میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا اس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہوگیا اس میں نفس کو رذائل سے پاک کرنے کا امر ہے اور لاتزکوا انفسکم میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو۔اس میں نفس کو پاک کہنے کی ممانعت ہے اب ان دونوں میں کچھ بھی تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اس کی ممانعت نہیں بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے اور ممانعت پاک کہنے سے ہے" (زکوٰۃ النفس)

مگر اس حقیقت کو وہی سمجھے گا جو عربیت اور ابواب کی خاصیات سے واقف ہوگا اس لئے فہم قرآن کے لئے لغت اور صرف ونحو وغیرہ جاننے کی ضرورت ہے ایسے علوم کے حاصل کئے بغیر قرآن کا صحیح ترجمہ نہیں سمجھا جا سکتا۔جو شخص خاصیت ابواب کو نہ جانتا ہوگا وہ دونوں آیتوں میں ایک ہی معنی سمجھے گا اور شبہات میں پڑے گا اور جو شخص جانتا ہوگا وہ سمجھ لے گا کہ باب تفعیل کی خاصیت جس طرح تعدیہ ہے اس کی ایک خاصیت نسبت بھی ہے اور پاک نہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تزکیہ کی طرف منسوب نہ کرو یعنی یہ دعویٰ نہ کرو کہ ہم پاک ہوگئے یعنی گفتن کے دو معنی ہیں ایک تو مطلق کہنا کہ بقصد قبول حق کے دوسرا کمال کا دعویٰ کرنا پس لاتزکوا میں تزکیہ بمعنی پاک گفتن سے مراد دعویٰ پاکی کردن ہے (زکوٰۃ النفس)

علم باری کی وسعت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ کی تفسیر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں۔

یہ گردن کی رگیں ورید اور شریان دونوں کو محتمل ہیں مگر شریان مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان میں روح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے اور ورید میں بالعکس یہاں جس کو روح میں زیادہ دخل ہو اس کا مراد لینا مناسب ہے اور سورہ حاقہ میں وتین بمعنی رگ دل سے تعبیر کرنا اس کا موئید ہے کیونکہ جو رگیں قلب سے ثابت ہیں شرائین ہیں اور گو قرآن میں لفظ ورید ہے مگر معنی لغوی اس کے عام ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ ہم باعتبار علم کے اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے۔چنانچہ علم حصولی میں انسان کو اپنی بہت سی حالتوں کا علم نہیں ہوتا اور جن کا علم ہوتا ہے بعض اوقات ان کا نسیان یا ان سے ذہول ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ میں یہ احتمالات گنجائش ہی نہیں رکھتے اور علم حضوری میں گو حضور معلوم کا لازم ہے مگر بوجہ حادث ہونے کے خود وہ وجود معلوم سے متاخر ہے اور حق تعالیٰ کا علم جو اس سے متعلق ہے جو اس کے وجود سے متقدم ہے اور ظاہر ہے کہ جو علم ہر حالت میں ہو اس کا تعلق بہ نسبت اس کے کہ ایک حالت میں ہو زیادہ ہوگا غرض علم باری کا جمیع احوال انسانیہ کے ساتھ متعلق ہونا بھی ثابت ہوگیا۔(بیان القرآن)

اور سورہ ق میں جان کو رگ گردن سے تعبیر فرمایا اور یہاں رگ دل سے جس سے ظاہر مراد شرائین ہیں جن کا منبت قلب ہے بات یہ ہے کہ اسی رگ قلب کی شاخیں گردن تک بھی پہنچی ہیں پس دونوں تعبیروں کا حاصل ایک ہی ہے اور اگر

وہ مراد ہوں جن کا منبت کبد ہے اور وہ دل میں ہو کر بدن میں پھیل گئی ہیں اور اسی لئے اس کو رگ دل کہہ دیا ہو تو اس کی شاخ بھی گردن میں گئی ہے (بیان القرآن)

لغوی تحقیق کے ساتھ دونوں آیتوں میں مطابقت کیسے اچھے اور عمدہ طریقے سے فرمادی گئی ہے علم لغت میں مناسبت اور مہارت کے بغیر ایسی عجیب تحقیق اور حسین تطبیق کا سمجھنا اور لکھنا ممکن ہے۔

قرب حق کی تحقیق

اسی آیت کے سلسلے میں مزید تشریح سنئے حضرت فرماتے ہیں حق تعالیٰ کو بندہ سے جتنی محبت ہے اتنی بندہ کو حق تعالیٰ سے نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ظاہر ہے کہ جیسی معرفت بندہ کی خدا کو ہے بندہ کو خدا کی نہیں اور یہ معنی ہے آیت وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ کے کہ علماء و معرفۃً بندہ سے ہم قریب ہیں۔ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ اسی وجہ سے وَنَحْنُ اَقْرَبُ فرمایا ہے کہ ہم قریب ہیں۔ انتم اقوب الینا نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو۔ سو اگر اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا چونکہ یہ قرب نسبت متکررہ سے ہے اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری سے بھی ضرور ہوگا رہا قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو گا تو دوسری طرف سے بھی ہو تو قرب علمی خدا کی طرف سے تو ہے اس لئے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں چونکہ بندہ ہے غافل پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب (الصلوۃ ص ۴۰)

چونکہ قرب حق کا یہ مسئلہ نہایت دقیق اور عمیق تھا اور اس کی کنہ اور حقیقت و کیفیت تک رسائی ناممکن تھی اس لئے قرب علمی مراد لے کر تفسیر کی جاتی ہے اور اسی سے یہ اشکال بھی حل ہو جاتا ہے کہ قرب تو نسبت متکررہ سے ہے جس میں دونوں طرف سے قرب کا تحقق ہونا چاہئے یہاں ایسا نہیں اس کا حل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر مذکور سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ قرب علمی میں یہ بات ضروری نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف سے قرب علمی ہو اور دوسری طرف سے نہ ہو یہ تقریر تو عام فہم اور علمی اصطلاحی تھی جو علماء کرام میں مشہور اور متعارف ہے آگے ایک نہایت عجیب و غریب تحقیق اور بڑی ہی لطیف تقریر سنئے ارشاد ہوتا ہے۔

اب رہا یہ سوال (اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ) رگ گردن سے زیادہ قریب کیسے؟ اس کا حقیقی جواب یہ ہے اس مسئلہ کو کوئی حل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بعض نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں قرب علمی مراد ہے مگر من حبل الورید کا لفظ بتلا رہا ہے کہ یہاں قرب علمی سے زیادہ کوئی دوسرا اقرب بتلانا مقصود ہے کیونکہ حبل الورید ذی علم نہیں ہے کہ اس سے اقرب ہونا اقربیت فی العلم پر دال ہو کیونکہ یہاں قرب ذات پر دلالت مفہوم ہوتی ہے مگر اس کیفیت کو ہم بیان نہیں کر سکتے چونکہ حق تعالیٰ کیفیت سے منزہ ہیں ان کا قرب بھی کیفیت سے منزہ ہے مگر تقریب فہم کے لئے اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ ہم کو جو اپنی ذات سے قرب ہے یہ قرب وجود کی فرع ہے اگر وجود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہم کو اپنی ذات سے قرب ہوتا اور ظاہر ہے کہ وجود میں حق تعالیٰ واسطہ ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اور اس تعلق کے درمیان میں واسطہ ہیں جو ہم کو اپنی جان کے ساتھ ہے تو ہم کو اول حق تعالیٰ سے تعلق ہے پھر اپنی جان کے ساتھ تعلق ہے اس تقریر کے استحضار سے قرب حق کا

مشاہدہ گو بہت کچھ ہو جائے گا مگر کیفیت اب بھی واضح نہ ہو گی۔ البتہ عقلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ہماری جان سے بھی زیادہ قرب وتعلق ہے اور یہی مقصود ہے (وعظ عصم ص ۲۰)

اس تقریر پر انیق کی خصوصیت اور اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ قرب سے علمی قرب کے علاوہ غیر معلوم الکیفیت قرب مراد ہے صفات الہیہ کے کلامی مسائل میں دسترس اور ان میں عبور ومہارت حاصل کئے بغیر اس تقریر کی تہہ تک نہیں پہنچا جا سکتا اور اس کی دقت وغموض تک رسائی نہیں حاصل ہو سکتی۔

رحمۃ للعالمین کا مطلب

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور ہم نے (ایسے مضامین نافعہ دے کر) آپ کو اور کسی ذات کے واسطے (رسول بنا کر) نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر (اپنی) مہربانی کرنے کے لئے (وہ مہربانی یہی ہے کہ لوگ رسول سے ان مضامین کو قبول کریں اور ہدایت کے ثمرات حاصل کریں اور جو قبول نہ کرے یہ اس کا قصور ہے اس مضمون کی صحت میں کوئی خلل نہیں پڑتا) (بیان القرآن)

اس پر ایک طالب علمانہ اشکال عام طور پر ہوتا ہے اس کی تقریر اور رفع اشکال ذیل میں پڑھئے اگر چہ اس تفسیر پر جو اوپر کی گئی ہے کوئی اشکال متوجہ نہیں ہوتا یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ جب رحمۃ اللعالمین ہیں تو ابوجہل پر بھی کچھ رحمت ہونا چاہیے کیونکہ عالمین میں وہ بھی داخل ہے یہ تو ہوا اشکال اب اس کا جواب سنئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں رحمت سے مراد رحمت تبلیغ وارسال ہے نجات وآخرت کے اعتبار سے رحمت مراد نہیں دلیل یہ ہے کہ اِلَّا رَحْمَةً اس جگہ ارسال کی غایت ہے یہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں رحمت سے وہی مراد ہے جو ارسال پر مرتب ہوتی ہے نیز اس سے پہلے ارشاد ہے اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ یہ بھی اس کا قرینہ ہے کہ یہاں تبلیغ کی برکات کا ذکر ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جو آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے اس سے اہل عالم پر مہربانی کرنا منظور ہے کہ آپ کے ذریعے سے لوگوں کی طرف وحی پہنچائیں اور ظاہر ہے کہ یہ رحمت تمام عالم کو ہے کوئی فرد بشر اس سے محروم نہیں رہا چاہے کوئی ہدایت قبول کرے نہ کرے۔ (المورد الفرخی)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں تفسیر ہی ایسے طریقے سے کردی ہے جس پر کوئی اشکال وارد ہی نہیں ہوتا جس کے جواب کی ضرورت ہو اور عام طور پر جو اشکال الفاظ کے اطلاق کی وجہ سے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے اس کا حل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اس واضح تقریر و بیان سے ہو جاتا ہے

ملحقات الترجمہ عربی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا حاصل مطلب اس طرح ہے کہ ترجمے میں (اور کسی بات کے واسطے) بڑھا کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رحمت علت اور مفعول لہ ہے اور تمام علتوں میں سے ایک علت رحمت مستثنیٰ ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کے رسول بنا کر بھیجنے کے سوائے رحمت کے اور کوئی وجہ نہیں اور مہربانی سے پہلے (اپنی) کا لفظ بڑھا کر اشارہ اس طرح ہے کہ رحمت مصدر کا فاعل اللہ ہے (بیان القرآن)

ظاہر ہے اس تقریر کو علم نحو میں مناسبت کے بغیر اچھی طرح ذہن نشین نہیں کیا جاسکتا یہ مسئلہ علم نحو کا ہے کہ مفعول لہ کا فاعل وہی ہوتا ہے جو اس کے فعل عامل کا فاعل ہوتا ہے اور وما ارسلنک میں ارسال فعل عامل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہیں اس لئے مفعول لہ کا فاعل بھی اللہ ہے اس نحوی قاعدہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مفعول لہ کے ترجمے سے پہلے اپنی کا لفظ بڑھا کر ظاہر کر دیا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر میں علم معانی کی رعایت

آیت ذیل کی تفسیر میں علم بیان و معانی اور قواعد عربیت کی رعایت جس عجیب انداز سے کی گئی ہے وہ اہل علم کی توجہ کی طالب ہے فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں یعنی اس کی عبادت سے بچتے ہیں اس ترجمے ہی سے معلوم ہوگیا کہ ان یعبدوھا الطاغوت سے بدل ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے جو ہر شیطان کو شامل ہے۔ وَاَنَابُوْۤا اِلَى اللّٰهِ یہ تقابل بدیع ہے یعنی وہ لوگ شیطان کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اسی کو مقصود و معبود سمجھتے ہیں اس کے بعد مبتداء کی خبر ہے۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى کی جن کی یہ شان ہے بشارت سنانے کے مستحق ہیں جیسا کہ مفہوم ہے لام کا اس کے بعد ہے فَبَشِّرْ عِبَادِۙ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ کہ اچھا پھر ان کو بشارت سنا ہی دیجئے۔ سبحان اللہ قرآن بھی کس قدر بلیغ ہے کہ اول تو اس کا مستحق بشارت ہونا بیان فرمایا پھر بشارت فرمانے کا حکم دیا کہ ان کو بشارت سنا ہی دیجئے اس طرز تشویق کا جس درجے مخاطب پر اثر ہوتا ہے اہل ذوق پر مخفی نہیں۔

اب یہ سمجھئے کہ یہاں عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کہ وہ شیطان سے بچتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں کیونکہ عربیت کا قاعدہ ہے اذا عیدت المعرفۃ کانت الثانیۃ عین الاولی کہ جب معرفہ کو دوبارہ معرفہ ہی بنا کر اعادہ کیا جائے تو ثانی سے مراد وہی ہوگا جو اولی سے مراد ہے مگر اعادہ معرفہ کی بھی ظاہر صورت یہ تھی کہ یہاں ضمیر لائی جاتی اسم اشارہ یعنی فبشرھم یا فبشر ھؤلا فرمایا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ضمیر کو چھوڑ کر وضع الظاہر موضع المضمر اختیار کیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس عنوان سے تحصیل کمالات کا طریقہ بتلایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ تحصیل کمالات میں ترتیب ہے حاصل اس ترتیب کا یہ ہے کہ تم کو اول استماع القول لازم ہے جس کا حاصل طلب علم ہے اس کے بعد اس کا اتباع لازم ہے اس کا حاصل عمل ہے خلاصہ یہ ہوا کہ تحصیل کمال کا طریقہ علم وعمل ہے (وعظ الاستماع والاتباع)

اس آیت مبارکہ کی کیا ہی عجیب وغریب اور مربوط ومرتبط نفیس تفسیر فرمائی گئی ہے جس سے پوری آیت کا مفہوم بڑا ہی وجد آفرین ہو جاتا ہے اور علم معانی و بیان اور دوسرے قواعد عربیت کی ضرورت کس درجہ واضح ہو جاتی ہے وہ اہل علم کے غور کرنے کی چیز ہے اب رہا یہ کہ القول سے مراد آیت مبارکہ میں کونسا قول ہے اور اس کی کیا دلیل ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اب سمجھئے کہ یہاں یستمعون القول قول سے مراد کلام اللہ ہے دو وجہ سے ایک یہ کہ اس میں لام عہد کا ہے اور یہاں معہود کلام اللہ ہی ہے دوسرے قاعدہ عربیت کا ہے المطلق اذا اطلق یرادبه الفرد الکامل کہ مطلق سے مراد فرد

کامل ہوتا ہے پس یہاں بھی مطلق قول سے مراد قول کامل ہونا چاہیے اور قول کامل قرآن ہی ہے۔ یہ عقلی دلیل تھی القول سے قرآن کی مراد ہونے کی اور اس آیت کے چند آیات بعد ہی نقلی دلیل بھی مذکور ہے کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ اس میں قرآن کو احسن الحدیث کہا گیا ہے اور یہاں احسنہ فرمایا جس کا مرجع قول ہے تو حاصل احسن القول ہوا اور احسن الحدیث و احسن القول کے ایک ہی معنی ہیں اور اس سے یعنی قرآن کو احسن الحدیث کہنے سے یہ معلوم ہو گیا کہ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ میں احسن کی اضافت تغایر کے لئے نہیں بلکہ بیانیہ ہے یہاں تک یہ بات ثابت ہو گئی کہ طریقہ تحصیل کمال کا یہ ہے کہ اول علم قرآن حاصل کیا جائے پھر اس پر عمل کیا جائے اور علم قرآن کو استماع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے شبہ نہ کیا جائے کہ صرف الفاظ کا سننا مراد ہے معنی کا جاننا مطلوب نہیں کیونکہ آگے فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ بھی ہے اور اتباع الفاظ مجروہ کا نہیں ہو سکتا بلکہ اتباع بعد علم معانی کے احکام کا ہوگا اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ مراد تو علم معانی ہیں مگر اس کو استماع سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ معانی کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ اول الفاظ کو غور سے سنا جائے جو شخص تحصیل علم کے وقت معلم کی تقریر کو توجہ سے نہیں سنتا وہ مراد بھی نہیں سمجھ سکتا (الاستماع)

مسائل سائنس

مسائل سائنس کے بارہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق درج ذیل کی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ یہ مسائل قرآن کریم کے موضوع لہ نہیں ہیں اس لئے ان مسائل پر تفسیر قرآن کی بنیاد رکھنا درست نہیں۔ ویسے بھی یہ مسائل یقینی نہیں ہیں۔ محض ظن و تخمین کے درجہ کی چیزیں ہیں جو آئے دن تجربات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہیں اس وجہ سے بھی قرآن کریم کی تفسیر مسائل سائنس پر مبنی نہیں کرنی چاہیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں

آج کل لوگوں نے قرآن کے ماوضع لہ کو بالکل نہیں سمجھا قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن کا موضوع نہیں ہے پھر جب کوئی فلسفہ کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھونس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے قرآن نے تیرہ سو برس پہلے ہی اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے۔ قرآن کریم ایک قانون کی کتاب ہے سائنس وغیرہ کا ذکر اگر اس میں آئے گا تو مقصود کے تابع ہو کر آئے گا۔ چنانچہ سائنس کے متعلق جو گفتگو ہوگی محض اس قدر کہ یہ سب مصنوعات ہیں اور ہر مصنوع کے لئے ایک صانع کی ضرورت ہے لہٰذا ان کے لئے بھی کسی صانع کی ضرورت ہے مگر اس استدلال کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس چیز کی حقیقت بھی دریافت ہو جائے بلکہ مجملاً ان کا علم ہونا کافی ہے۔

قرآن کریم نے توحید کا دعویٰ کیا اس کی دلیل میں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الایہ فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں بھی توحید کے دلائل ہیں تو اس کائنات میں چند حیثیتیں ہیں اول ان کا دلیل توحید ہونا دوسرے ان کے پیدا ہونے کے طریق اور تیسرے ان کے تغیرات کے ڈھنگ قرآن کریم کو صرف پہلی حیثیت سے ان سے تعلق ہے اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیونکر ہوتی ہے اور اس قسم کے حالات تو

قرآن سے ان کا تلاش کرنا غلطی ہے۔(ضرورت العلم)

کائنات سے وجود صانع پر بیان القرآن میں اس طرح عقلی استدلال فرمایا گیا ہے۔

اس استدلال عقلی کا مختصر طریقہ یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں بعض تو بداہتہ بسبب مشاہدہ وجود بعد العدم یا تغیر وتبدل احوال کے اور بعض بدلیل ترکیب من الاجزا یا افتقار بعض الی البعض کے اور ممکن بوجہ تساوی الوجود والعدم ہونے کے محتاج ہوتا ہے کسی مرجح کا وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا تو قطع تسلسل محال کے لئے انتہا واجب ہے کسی واجب الوجود کی طرف یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی۔

تقریر توحید صانع

آگے رہا اس کا واحد ہونا سو اس کی تقریر یہ ہے اگر نعوذ باللہ متعدد مثلاً دو فرض کئے جاویں تو ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر ہونا ضروری ہے شق اول محال ہے کیونکہ عجز منافی ہے وجوب وجود کے اور شق ثانی پر اگر ان میں سے ایک نے کسی امر کا مثلاً ایجاد زید کا ارادہ کیا تو دوسرا اس کے خلاف ارادہ کرسکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کرسکتا تو اس کا عجز لازم آوے گا جو منافی وجوب وجود کے ہے اور اگر ارادہ کرسکتا ہے تو اس پر ترتیب مراد کا ضروری ہے یا نہیں اگر ضروری نہیں تو مختلف مراد کا ارادہ قادر مطلق سے لازم آوے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آوے گا کیونکہ ایک واجب کے ارادے پر ایک مراد مرتب ہوا دوسرے واجب کے ارادے پر دوسرا اس مراد اول کی ضد مرتب ہوا تو اجتماع ضدین لازم آیا اور وہ محال اور مستلزم محال کو محال ہے تو تعدد واجب کا محال ہے پس وحدت واجب ہے اور یہی مطلوب تھا خوب سمجھ لو۔(بیان القرآن)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر دلائل توحید میں سائنس کے مسائل مذکور ہوتے تو توحید کو سمجھنا ان کے علم پر موقوف ہوتا اور مسائل سائنس خود نظری ہیں تو توحید بدوں ان کے سمجھے ہوئے ثابت نہ ہوتی اور مخاطب ان دلائل کے عرب کے بادیہ نشین تک ہیں تو وہ توحید کو کیسے جانتے یہ نقصان ہوتا سائنس کے مسائل کو قرآن میں داخل کرنے کا کہ اصل مقصود ختم ہوجاتا۔

ایک مثال

یہی وجہ ہے گو قرآن میں جگہ جگہ سموات اور ارض (مذکور) ہیں لیکن سموات بصیغہ جمع اور ارض بصیغہ واحد لایا گیا تا کہ مقدمات میں شغب نہ ہونے لگے پھر مستقل دلیل سے بتلایا کہ زمین بھی سات ہیں چنانچہ بعض کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ ہم تو سب جگہ پھرے ہم کو کوئی دوسری زمین نہیں ملی اور ارض کا ترجمہ حدیث تعدد ارض میں اقلیم کا کیا ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن شریف میں بعد سبع سموات کے من الارض مثلھن فرمایا ہے تو اقلیم ترجمہ کرنے کی گنجائش کہاں ہے اور حدیث میں صاف آ گیا ہے کہ آسمان سات ہیں اور ہر دو آسمانوں کے

درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے۔ پانچ سو برس سے مراد کثرت ہے اس کے بعد زمین کے متعلق بھی فرمایا اب اقلیم کی تاویل کیسے چل سکتی ہے۔

باوجود کہ یہ ثابت تھی مگر پھر بھی قرآن نے ارضین نہیں فرمایا بلکہ ارض بصیغہ واحد ارشاد فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان مصنوعات سے توحید پر استدلال کیا جائے اور استدلال مقدمات مسلمہ سے ہوا کرتا ہے تو اگر ارضین فرماتے تو اصل مقصود تو ثابت نہ ہوسکتا اور مسئلہ گفتگو کے قابل ہو جاتا اور اب یہ ہوا کہ جو واقف ہیں وہ لفظ ارض ہی سے جو کہ اسم جنس ہے قلیل کثیر سب کو شامل سمجھ لیتے ہیں اور جو لوگ واقف نہیں وہ بھی بوجہ ایک ارض کے محسوس ہونے کے نفس استدلال کو بخوبی سمجھ گئے تو معلوم ہوا کہ قرآن میں کسی ایسے مسئلے سے کام نہیں لیا گیا جس سے سامع کو الجھن ہو اگر سائنس کے مسئلے اس میں ہوتے تو سامعین ان کی تحقیق میں پڑ جاتے اور ہر شخص کو اس کے آلات وذرائع کی تحصیل ممکن نہ تھی تو ہر شخص ایک الجھن میں پڑ جاتا نیز ان میں اختلاف اس قدر ہے کہ آج تک بھی کوئی بات محقق نہیں ہوئی۔

خاتمہ

دل چاہا کہ اس ''مقالہ اشرف'' کو حضرت حکیم الامت کی بیان کردہ اس لطیف مناسبت اور عجیب وغریب ارتباط کے بیان پر ختم کیا جائے جس کو حضرت نے قرآن مجید کے آغاز سورہ فاتحہ اور انجام سورہ الناس کے مضامین میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت حکیم الامت تفسیر بیان القرآن کے خاتمہ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

اور ایک عجیب لطیفہ اس سورت میں جس سے قرآن کا حسن آغاز وانجام بھی ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کے اور فاتحہ کے مضامین میں غایت درجے کا تقارب کہ حکم اتحاد میں ہے محقق ہے چنانچہ رَبِّ النَّاسِ کے مناسب رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور مَلِكِ النَّاسِ کے مناسب یَوْمِ الدِّیْنِ اور اِلٰهِ النَّاسِ کے مناسب اِیَّاكَ نَعْبُدُ اور استعاذہ کے مناسب اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ امر الْوَسْوَاسِ ۙ۬ الْخَنَّاسِ الخ کے مناسب اِهْدِنَا الخ ہے۔ (بیان القرآن)

اللهم اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم و اعذنا من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنة والناس وصلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وعلی اله واصحابه اجمعین الی یوم الدین سبحان ربک رب العزة عما یصفون و سلام علی المرسلین والحمد لله رب العالمین.

سید عبدالشکور ترمذی عفی عنہ
مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا
26 رجب المرجب 1404ھ
29 اپریل 1984ء

سُوْرَة الفَاتِحَة

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴿۶﴾ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں جو مالک ہیں روز جزا کے ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں۔

استعانت کا مفہوم

سوال کیا گیا کہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے حصر استعانت معلوم ہوا ہے حالانکہ کام کاج میں لوگوں سے استعانت کی جاتی ہے ارشاد فرمایا مراد یہ ہے کہ بالاستقلال کسی کو معین سمجھ کر سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگنا چاہئے۔ باقی جو چیزیں لوگوں کے اختیار میں ہیں ان میں ان سے مدد لینا جائز ہے کیونکہ وہاں ان کا غیر مستقل ہونا ظاہر ہے سب جانتے ہیں کہ ابھی خدا معذور یا بے کار کردے تو وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اسی طرح صوفیہ فیوض باطنی میں مشائخ احیا و اموات سے مستفیض ہوتے ہیں اور یہ کشف اور تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ نفع ہوتا ہے اس لئے اس نفع کا ظنا اعتقاد رکھنا جائز ہے لیکن اس میں مستقل سمجھ کر استعانت کرنا جیسا کہ عوام کا اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ مستقل حاجت روا سمجھتے ہیں بالکل ناجائز ہے۔ (اشرف المقالات)

ایاک نعبد الخ انشاء ہے

فرمایا انشاء ہے خبر نہیں واعظ اس میں غلطی کیا کرتے ہیں (خیر الافادات ص ۷۹)

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوئے۔

ضَآلِّيْنَ کا مفہوم

عرض کیا گیا کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ سے مراد مغضوب فی الدنیا ہے مغضوب فی الاخرہ فرمایا کہ دونوں ہو سکتے ہیں کیونکہ مَغْضُوْبُ عَلَيْهِمْ یہود پر اطلاق فرمایا گیا ہے جن پر دنیا میں بھی غضب کیا گیا مثل مسخ وغیرہ عرض کیا گیا کہ پھر ضَالِّيْنَ میں بقرینہ مقابلہ غضب فی الاخرہ کی نفی ہوتی ہے فرمایا کہ جی نہیں کلام مجید میں صفت غالبہ کے اعتبار سے عنوانات اختیار کئے گئے ہیں۔ مَغْضُوْبُ عَلَيْهِمْ یہود کے لئے فرمایا گیا ان میں صفت مغضوبیت غالب تھی کیونکہ باوجود علم کے محض شرارت وعناد کی رو سے مخالفت کرتے تھے۔ ایسے لوگ زیادہ مورد غضب ہوتے ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں ان میں صفت ضلال غالب تھی کیونکہ عیش پرستی کی وجہ سے دین سے غافل اور بے پرواہ تھے لہٰذا ضَالِّيْنَ میں ان کی صفت ضلال کا اظہار فرمایا گیا ہے گو مغضوب فی الاخرۃ وہ بھی ہونگے دوبارہ استفسار پر فرمایا کہ قرینہ ضالین سے تو مغضوب علیہم میں غضب فی الدنیا مراد معلوم ہوتا ہے کیونکہ ضالین کا ضلال بالمعنی المذکر دنیا میں واقع ہوتا تھا۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾

ترجمہ: یہ کتاب، ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں

تفسیری نکات

قرآن میں شک نہ ہونے کا مفہوم

حالانکہ اسی سورت کے تیسرے رکوع میں ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا (اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمائی) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو قرآن میں شک بھی تھا مگر قرآن باجوداس کے لاریب فیہ بے دھڑک کہہ رہا ہے کیونکہ ان لوگوں کے شک کی مثال ایسی ہے جیسے یرقان والا کہتا ہے یہ کپڑا زرد ہے اور تندرست آدمی اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اس میں زردی نہیں تو وہ صحیح کہتا ہے کیونکہ وہ زردی تو اس کی آنکھوں میں ہے (التیسیر للتیسیر ص ۱۳)

حروف مقطعات

چنانچہ اس فائدہ کی نسبت ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ الف لام

میم کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے میم ایک حرف ہے سو صرف الم کہنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں اور بقول بعض کے نوے نیکیاں ملتی ہیں۔ اس طرح کہ الم میں جو الف ہے اس کو تعبیر کرنے میں جو تین حرف ہوتے ہیں (ا۔ل۔ف) ہر ایک کے عوض میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔ دس الف پر اور دس لام پر اور دس فاء پر سب تیس ہوئیں اس طرح لام کی تعبیر میں تین حرف (ل۔ا۔م) ہوئے جس کی تیس نیکیاں ہوئیں اسی طرح سے میم کی تعبیر میں تین حروف (یعنی م۔ی۔م) پر تیس نیکیاں ملیں سب کا مجموعہ نوے ہو گیا۔

قرآن پاک میں کوئی بات موجب خلجان نہیں

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ترجمہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں اس جملہ میں قرآن کی مدح ہے کہ یہ کتاب کامل ہے اس میں کوئی بات موجب خلجان نہیں رہا یہ شبہ کہ کفار تو اس میں بہت شبہات نکالتے ہیں اس کا جواب ایک تو مشہور ہے کہ قرآن میں کوئی بات فی نفسہ موجب خلجان نہیں ہے اور شبہ نکالنے والوں کو جو شبہات پیش آتے ہیں ان کا منشا قرآن کے مضامین نہیں بلکہ ان کا قصور فہم ہے اور اگر کسی اندھے کو دن میں طلوع آفتاب میں شک ہو تو اس کے شک سے طلوع آفتاب مشکوک نہیں ہو جاتا اور دوسرے جواب میں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں اشارہ ہے۔ حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ اگر کسی کو قرآن میں کوئی شک و شبہ پیش آتا ہے تو وہ شبہ اسی وقت تک ہے جب تک قرآن کی تعلیم پر عمل نہ کیا جائے اور اگر قرآن کی تعلیم پر پوری طرح عمل کیا جائے تو سب شبہات خود بخود زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ قرآن متقین کیلئے ہدایت ہے پس اہل شبہات کو چاہیے کہ وہ تعلیم قرآن پر عمل کرنا شروع کریں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب عمل کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت میں قرآن سرتاپا ہدایت ہی ہدایت ہے اس میں کوئی امر موجب خلجان نہیں۔

درجات ہدایت

اب سمجھئے کہ ان آیات میں زیادت فی الہدیٰ کی مطلوبیت کا ذکر ہے حق تعالیٰ قرآن کی صفت میں فرماتے ہیں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اس پر اشکال مشہور ہے کہ متقین تو خود ہی ہدایت یافتہ ہیں ان کے لئے ہدایت ہونے کا کیا مطلب ہے؟
اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ متقین میں تاویل کرو کہ اس سے مراد متقی بالفعل نہیں بلکہ صائرین الی التقوی مراد ہیں جن کو باعتبار ما یؤل کے متقی کہہ دیا گیا مگر حقیقت ممکن ہوتے ہوئے مجاز لینا خلاف اصل ہے اس لئے راجح توجیہ یہ ہے کہ لفظ متقین اپنے معنی پر رہے اور ہدی میں درجات نکالے جائیں کہ ہدایت کے لئے مدارج مختلف ہیں جن میں سے بعض مدارج کا حصول ان لوگوں کو بھی نہیں ہے جو بالفعل متقی ہیں۔ قرآن ان مدارج کی طرف متقیوں کو پہنچاتا ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہدایت کے مدارج بہت ہیں۔
رہا یہ کہ زیادت فی الہدیٰ مطلوب ہے۔ اس کی دلیل سورہ فاتحہ کی آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے جس میں طلب ہدایت کا امر ہے۔ سورہ بقرہ کو سورہ فاتحہ سے ربط بھی ہے کہ اس میں دعائے ہدایت بھی ہے اس میں اجابت دعا ہے

کہ لو یہ کتاب ہدایت ہے اس پر چلو اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پر بھی یہی اشکال عود کرتا ہے کہ وہ لوگ تو پہلے ہی سے ہدایت یافتہ ہیں جن کو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے اس کا بھی یہی جواب ہے کہ مراد زیادت فی الہدیٰ کی طلب ہے اب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ پر کوئی اشکال نہ رہا کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اور کتابیں تو ان پڑھوں کو پڑھائی جاتی ہیں اور یہ کتاب پڑھے ہوؤں کو پڑھانے والی ہے۔ یہ ہدایت یافتوں کے لئے ہدایت ہے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہدایت اور علم متقارب ہیں اور یہاں سے زیادت فی الہدیٰ کا مطلوب ہونا ثابت ہے تو زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا بھی ثابت ہو گیا۔

قرآن غیر متقیوں کے لئے بھی ہے

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرہ آیت ۲) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض متقیوں کے لئے ہے اور غیر متقی کے لئے نہیں اس آیت سے اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے نیز دوسری آیات میں بھی غلط سمجھ لیتے ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قرآن کو فلسفی نظر سے دیکھا جاتا ہے چنانچہ ایک سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے اس کے متعلق دریافت کیا میں نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں یہ محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ متقی نظر آتے ہیں یہ اسی کی بدولت متقی بنے ہیں اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اب بالکل صاف ہو گیا۔ تو اس میں کوئی توجیہ یا تاویل نہیں ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ لوگ محاورات سے قطع نظر کر کے فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی واسطے ضروری ہے کہ قرآن کو تمام علوم فلسفیہ سے پہلے کسی محقق عالم سے پڑھ لیں۔ باقی نرے ترجے کا خود مطالعہ کرنے سے قرآن حل نہیں ہوتا۔

کورس تقویٰ

ایک مقام پر حافظ محمد احمد صاحب مرحوم (مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے نیچری سوال کر رہے تھے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا کیا مطلب ہے حافظ صاحب مرحوم جواب دیتے تھے انکی سیری نہ ہوتی تھی آخر میں کہا اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم کہا کرتے ہو یہ کورس بی اے کا ہے یعنی اس کے پڑھنے سے بی اے ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ کورس تقویٰ کا ہے یعنی اس کی ہدایت اختیار کرنے سے متقی بن جاتا ہے۔

متقین کا معنی

فرمایا کہ ایک بار مولانا صاحب سے کسی نے سوال کیا کہ قرآن کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سو متقین تو پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں تو یہ تحصیل حاصل ہوا۔ اس کے جواب مختلف حضرات نے مختلف دیئے ہیں چنانچہ ایک جواب صاحب جلالین نے دیا ہے کہ مراد متقین سے صائرین الی التقوی ہیں مگر مولانا محمد قاسم نے ایک دوسرا جواب دیا کہ یہاں تقوی سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی ہیں یعنی خوف اور کھٹک تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے اور فکر ہے اور قصد ہے اپنی اصلاح کا ان کو قرآن ہدایت کرتا ہے باقی جو شخص اپنی اصلاح کا قصد ہی نہ کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے قرآن کا اس میں کیا نقص ہے تو مولانا محمد قاسم صاحب کا جب یہ جواب میں نے سنا تو فوراً اس جواب کی

ایک تائید قرآن سے میری سمجھ میں آئی۔ وہ یہ کہ سورہ واللیل میں ارشاد ہے فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی اس کے بعد ارشاد ہے وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی یہاں صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ بخل کا استعمال کیا گیا ہے اور اعطاء اور بخل میں تقابل ظاہر ہے اس طرح پہلی آیت میں کذب ہے تو دوسری میں صدق اور صدق اور کذب میں بھی تقابل موجود ہے۔ پس اس طرح پہلی آیت میں استغنٰی ہے تو دوسری میں اس میں مقابل کوئی مفہوم ہونا چاہیے اور وہ اتقی ہے پس اس تقابل کی وجہ سے یہاں تقوی کے وہ معنی مراد ہونگے جو استغنا کے مقابل ہوں۔ پس استغنا کے معنی ہیں بے فکری کے تو یہاں تقوی کے وہ معنی ہوں گے فکر اور کھٹک ورنہ فصاحت کے خلاف ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ متقین کے وہ معنی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے بیان فرمائے وہ قرآن سے ثابت ہیں اب میں ان لوگوں سے جو محض ترجمہ کے مطالعہ سے قرآن کو حل کرنا چاہتے ہیں دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ اس اشکال کا جواب محض ترجمہ سے حل کر سکتے تھے (الافاضات الیومیہ تاج ۱)

آیت کی تفسیر پر شبہ اور اس کا جواب

چند نو تعلیم یافتہ حضرات نے سوال کیا کہ حضرت آیت ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ قرآن ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے حالانکہ متقی لوگ تو خود ہی ہدایت پر ہیں ان کو تو ضرورت نہیں غیر متقی جن کو ضرورت ہے ان کے لئے یہ ہدایت نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں اس سے یہ مفہوم سمجھ میں آ جائے گا کہ کسی جگہ چند انگریزی کی کتابیں رکھی ہوں جو بی اے کورس میں داخل ہیں ان کو یہ کہنا کہ یہ بی اے کا کورس ہے صحیح ہے یا نہیں سب نے کہا کہ بالکل صحیح ہے حضرت نے فرمایا کہ جو شخص بی اے کر چکا ہے اس کو تو اس کورس کی ضرورت نہیں اور جس نے نہیں کیا وہ بی اے نہیں جو جواب آپ یہاں دیتے ہیں وہی ھدی اللمتقین کا جواب ہے سب کے سب مطمئن ہو کر خاموش ہو گئے۔ مطلب واضح ہو گیا کہ یہ کتاب متقی بنانے والی ہے (مجالس حکیم الامت)

درجات تقوی میں ترقی

یہاں ایک سوال ہے وہ یہ ہے کہ اس تقریر کی بنا پر ھدی للمتقین سے معلوم ہوتا ہے کہ تقوی سبب ہے ھدی مفسر بزیادت فی العلم کا اور آیت والذین اھتدو از ادھم ھدی واتھم تقوٰھم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدی سبب ہے ہدی کے درجہ علیا اور تقوی کا جو کہ موہبت ہے تو حاصل مجموعہ نصین کا یہ ہوا کہ بندہ اول نفس تقوی جب بکسب اختیار کرتا ہے اس پر ہدی مرتب ہوتا ہے پھر اس ہدی پر ثابت رہنے سے خود اس میں بھی ترقی ہوتی ہے اور تقوی کا درجہ علیا موہوبہ بھی اس سے عطا ہوتا ہے اور قرینہ اس ارادہ موہبت کا لفظ اتاھم ہے اور قرینہ اس کے علیا ہونے پر اضافت ہے تقوی کے ضمیر مھتدین کی طرف جو اس کے کمال پر دال ہے جیسے وسعی لھا سعیھا ای السعی المناسب لھا. اسی طرح یہاں مراد

ہے ای التقوی المناسب لشانھم و ھم الکاملون والتقوی المناسب للکاملین ھو الکامل منہ.

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ پر اشکال کا جواب

(ملفوظ) کسی سلسلۂ کلام میں یہ فرمایا کہ ھدی للمتقین پر ایک اشکال کیا جاتا ہے کہ جو متقی ہوگا اس کے لئے ہدایت کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے متقی ہے۔ اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں لیکن میرے نزدیک یہاں تقوی کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی دل میں کھٹک پیدا ہونا اور یہ امر محقق ہے کہ اول دل میں کھٹک ہی پیدا ہوتی ہے پھر ہدایت ہوتی ہے اور میری سمجھ میں قرآن سے اتقاء بمعنی کھٹک کی ایک تائید آئی ہے۔ سورہ واللیل میں فاما من اعطے واتقی و صدق بالحسنے فسنیسرہ للیسری واما من بخل و استغنی و کذب بالحسنے فسنیسرہ للعسریٰ. یہاں سب متعاطفات میں تقابل ہوگا اور استغنے کے معنی ہیں بیفکری تو اتقی کے معنی ہوں گے فکر اور یہی حاصل ہے کھٹک اور خوف کا جو لغوی معنی ہیں تقوی کے اور وہ ہمیشہ مقدم ہوتا ہے ہدایت پر پس کوئی اشکال نہیں رہا۔

۲۶ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ مجلس شام

(ملفوظ) فرمایا ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے کسی نے سوال کیا کہ قرآن کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے ھدی للمتقین سو متقین تو پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں تو یہ تحصیل حاصل ہوا اس کے جواب مختلف حضرات نے مختلف دیئے ہیں چنانچہ ایک جواب صاحب جلالین نے دیا ہے کہ مراد متقین سے صائرین الی التقویٰ ہیں مگر مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک دوسرا جواب دیا کہ یہاں تقویٰ سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی ہیں یعنی خوف اور کھٹک تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے اور فکر ہے اور قصد ہے اپنی اصلاح کا ان کو قرآن ہدایت کرتا ہے باقی جو شخص اپنی اصلاح کا قصد ہی نہ کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے قرآن کا اس میں کیا نقص ہے تو مولانا محمد قاسم صاحب کا جب یہ جواب میں نے سنا تو فوراً اس جواب کی ایک تائید قرآن سے میری سمجھ میں آئی۔ وہ یہ کہ سورۂ واللیل میں ارشاد ہے فاما من اعطے واتقی و صدق بالحسنے اسکے بعد ارشاد ہے واما من بخل واستغنی و کذب بالحسنے ۔ یہاں صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا چنانچہ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ بخل کا استعمال کیا گیا ہے اور اعطاء اور بخل میں تقابل ظاہر ہے۔ اس طرح پہلی آیت میں کذب ہے تو دوسری میں صدق اور صدق اور کذب میں بھی تقابل موجود ہے۔ بس اس طرح پہلی آیت میں استغنے ہے تو دوسری میں اس کے مقابل کوئی مفہوم ہونا چاہیے اور وہ اتقی ہے پس اس تقابل کی وجہ سے یہاں تقوی کے وہ معنی مراد ہونگے جو استغناء کے مقابل ہوں۔ پس استغناء کے معنی ہیں بے فکری کے تو یہاں تقوی کے وہ معنی ہوں گے فکر اور کھٹک ورنہ فصاحت کے خلاف ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ متقین کے وہ معنی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے بیان فرمائے وہ قرآن سے ثابت ہیں اب میں ان لوگوں سے جو محض ترجمہ کے مطالعہ سے قرآن کو حل کرنا چاہتے ہیں دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ اس اشکال کا جواب محض ترجمہ سے حل کر سکتے تھے۔

رزق باطن کے انفاق پر آیت قرآنی سے استدلال

فرمایا کہ صوفیہ نے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں فیض باطنی پہنچانا بھی مراد لیا ہے سو اگر یہ محض بطور علم اعتبار کے ہو تب تو کچھ شبہ کی گنجائش نہ تھی لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ اگر اس کو تفسیر مان لیا جائے تو اچھا ہے کیونکہ کسی لغت یا قواعد تفسیریہ کے خلاف نہیں ہے اور اس خیال کی تائید اس سے ہوگئی تھی کہ اہل ظاہر نے بھی اس قول کو لیا ہے چنانچہ بیضاوی نے کہا ہے ومن انوار المعرفة یفیضون اگر یہ بات قواعد سے صحیح نہ ہوتی تو اہل ظاہر اس کو نہ لیتے لیکن مزید تائید کے لئے جی یہ بھی چاہتا تھا کہ اگر کسی جگہ قرآن شریف میں رزق کا استعمال اس معنی میں یعنی رزق حسی کی طرح رزق معنوی میں بھی ثابت ہو جائے تو خوب ہو چنانچہ بحمد اللہ ایک مقام کئی روز ہوئے نظر میں آیا بہت خوشی ہوئی لیکن بھول گیا جس کا اس خوشی سے بھی زیادہ رنج ہوا اور جی چاہتا تھا کہ یاد آ جائے تو کہیں لکھا دوں مگر الحمد للہ آج یاد آ گیا وہ یہ ہے کہ سورہ واقعہ میں ہے وتجعلون رزقکم انکم تکذبون.

اس میں تکذیب کو جو کہ ایک امر معنوی ہے رزق فرمایا یعنی تم اپنا حصہ تکذیب کو کرتے ہو اس میں انکم تکذبون مفعول ثانی ہے اور ان بالفتح معنی میں مصدر کے کر دیتا ہے تو انکم تکذبون کے معنی ہوئے تکذیبکم ای تجعلون رزقکم تکذیبکم پس تکذیب کو جو کہ رزق متعارف نہیں رزق فرمایا اور ایک غالی درویش جو صاحب مجاہدہ وصاحب کشف بھی تھے اور سانس کے ساتھ ستارے نظر آنے کے مدعی بھی تھے انہوں نے اس کی عجیب تفسیر کی یعنی و تجعلون رزقکم انکم تکذبون کے یہ معنی کئے کہ تم مواقع النجوم کو اپنا رزق بھی بناتے ہو اور پھر اس کی تکذیب بھی کرتے ہو اور بمواقع النجوم کا ترجمہ یہ کیا کہ نجوم جو سانس کے ساتھ جوف میں داخل ہوتے ہیں ان کی قسم کھاتا ہوں ایسے ہی جاہل صوفیوں نے ابو الدرداءؓ کی جو حدیث نسائی میں ہے لاابالی اشرب الخمر اور اعبد ھذہ الساریة (یعنی میں پرواہ نہیں کرتا کہ ستون کی عبادت کر لوں یا شراب پی لوں اور مراد اس سے تغلیظ ہے شرب خمر کی کہ عبادت ساریہ کی برابر ہے) اس کے یہ معنی گھڑے ہیں کہ تصوف میں ایک مقام ایسا ہے کہ وہاں پہنچ کر شراب اور بت پرستی یعنی حرام چیزیں سب جائز ہو جاتی ہیں اور آدمی مرفوع القلم ہو جاتا ہے اللہ بچائے اس جہالت سے۔ (الافاضات الیومیہ ج۱۱ ص۲۱۵-۲۱۶)

أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر۔ جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب

تفسیری نکات

صراط مستقیم ہونے کا نفع

یہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی جزاء میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں ایک جزا دنیوی یعنی واقع فی الدنیا ہے عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں) دوسری جزاء اخروی یعنی واقع فی الاخرة ہے۔ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمانوں کے لئے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ پس ہدایت پر ہونا بھی بڑی رحمت اور راحت کی چیز ہے۔

ہدایت کا دنیوی نعمت ہونا

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۝ (البقرہ آیت ۸) کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

اعمال صالح کے ثمرات

یعنی اعمال صالحہ کا ایک ثمرہ اخروی فلاح تو ہے ہی دوسرا عاجلہ ہدایت بھی ہے یہاں ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ ہدایت کا ثمرہ ہونا کیسا ثمرہ تو وہ جس میں حظ ہو اور ہدایت تو خود عملی حالت ہے اس میں کیا حظ ہوتا مگر ایک حکایت سے آپ کو اسکا ثمرہ ہونا معلوم ہو جائے گا اور وہ خود مجھے پیش آیا میں ایک دفعہ سہارنپور سے کانپور جا رہا تھا تو سہارنپور سے لکھنو جانے والی ریل میں سوار ہوا اسی گاڑی میں میرا ایک دوست اور ہم وطن مگر جنٹلمین بھی پہلے سے سوار تھا میں یہ سمجھا تھا کہ شاید یہ لکھنو جا رہے ہوں گے کیونکہ ایک زمانہ میں ان کے تعلقات لکھنو میں بہت رہ چکے تھے سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بیک بنی دو گوش تھے نہ ساتھ میں کمبل نہ رضائی کیونکہ آج کل جنٹلمینوں کے سفر کا اصول یہی ہے کہ سفر میں اسباب ساتھ نہیں لیتے جب ریل چھوٹ گئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ لکھنو جائیں گے کہنے لگے میں میرٹھ جا رہا ہوں میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جا رہے ہوں لیکن میں افسوس کرتا ہوں یہ گاڑی لکھنو جا رہی ہے میں نے انہی کے محاورہ میں گفتگو کی اب تو وہ بڑے چونکے کہنے لگے کیا یہ گاڑی لکھنو جا رہی ہے؟ میں نے کہا ہاں پھر تو ان کی یہ حالت تھی کہ بار بار لاحول پڑھتے ہیں اور ادھر ادھر دیکھتے جاتے ہیں میں نے کہا ہاں میاں اب تو رڑکی سے اس طرح یہ گاڑی ٹھہرتی نہیں پریشان ہونے سے کیا حاصل اطمینان سے بیٹھو اور باتیں کرو تو وہ جھلا کر کہتے ہیں کہ تم کو باتوں کی سوجھی ہے اور مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ اس وقت میں نے اپنی اور ان کی حالت میں غور کیا کہ حالانکہ میں ابھی تک منزل پر نہیں پہنچا اور یہ ابھی اپنے مقصود سے بہت دور نہیں آئے بلکہ لوٹتی گاڑی میں یہ اپنی منزل مقصود پر مجھ سے پہلے پہنچ جائیں گے مگر پھر بھی میں مطمئن ہوں اور یہ غیر مطمئن تو آخر میرے اطمینان اور ان کی بے اطمینانی کا سبب کیا ہے یہی معلوم ہوا کہ میرے اطمینان کا سبب یہ تھا کہ میں راہ پر تھا اور ان کی بے اطمینانی کا سبب یہ تھا کہ وہ راہ سے ہٹے ہوئے تھے۔ اس وقت ریل جس قدر مسافت طے کرتی تھی میری مسرت و راحت بڑھتی تھی اور ان کو ہر ہر قدم خار تھا تو اس واقعہ سے آیت کی تفسیر واضح ہوئی کہ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ (یہ لوگ ہیں ہدایت پر اپنے رب کی جانب سے) یہی ایک بڑا ثمرہ ہے اور ہدایت پر ہونا بڑی نعمت اور بڑی دولت ہے۔ یہ ثمرہ دنیا میں ہر مسلمان کو حاصل ہے کافر کو یہ بات نصیب نہیں۔

مزید برآں یہ بات سونے پر سہاگہ ہے کہ اعمال صالحہ باقیات صالحات بھی ہیں کہ آخرت میں ان کا اجر ہمیشہ کے

لئے باقی رہنے والا ہے مگر اس بقاء میں بھی تفصیل ہے کہ بعض اعمال تو مطلقاً باقیات ہیں اور بعض کو ابقی (زیادہ باقی رہنے والا) کہنا چاہیے جیسے مدرسہ اور خانقاہ کہ یہ صدقات جاریہ ہیں یعنی بعض اعمال اس طرح ہیں کہ زندگی کے بعد ان کا ثواب نہیں بڑھتا بس جتنا ثواب زندگی میں کما چلے ہوا تنا ہی باقی رہے گا۔ اس میں ترقی نہ ہوگی اور صدقات جاریہ کا ثواب مرنے کے بعد بھی برابر بڑھتا رہتا ہے۔ تم قبر میں پڑے سو رہے ہوگے اور اس وقت بھی فرشتے نامہ اعمال میں ثواب لکھتے ہوں گے تو مدرسہ اور خانقاہ کی بنا ایسے ہی اعمال ہیں جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے (مظاہر الامال)

راہ پر آگاہ کرنا بڑی چیز ہے

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ہدیٰ کو فلاح سے بھی پہلے فرمایا۔ اصل چیز تو راہ ہی ہے جس کو صراط مستقیم کہتے ہیں دنیا میں مسلمان کے لئے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہی ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستے پر چل رہا ہے اور جو اس راہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے اس کے لئے مفلحون فرمایا گیا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایسے بزرگوں کی جوتیوں میں پہنچا دیا کہ انہوں نے سیدھے راستہ پر ڈال دیا خلاصہ یہ ہے کہ بڑی چیز راہ پر آگاہ کر دینا اور پتہ ونشان بتلا دینا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر اور شبہ کا ازالہ

آیت أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ اس میں دو چیزیں ہیں ایک ہدایت دوسرے فلاح کو بطور جزاء کے ذکر فرمایا ہے کیونکہ ان سے پہلے ایمان بالغیب اور ایمان بالرسل کے اوصاف مذکور ہیں۔ اس ایمان کی جزاء کے طور پر اس میں ہدایت وفلاح کو بیان فرمایا گیا ہے ان میں فلاح کا جزائے عمل ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کہ فلاح کے معنی کامیابی اور مراد پوری ہونے کے ہیں لیکن ہدایت تو راستہ دکھانے کو کہا جاتا ہے کسی چیز کا راستہ دیکھ لینا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ وہ جزائے عمل میں ہو سکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥

ترجمہ: بیشک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لاویں گے۔

تفسیری نکات

حضور علیہ السلام کو تبلیغ میں بہر صورت ثواب ہے

یہ فرمایا کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ یہ نہیں فرمایا کہ سواء علیک کیونکہ آپ کے لئے انذار وعدم انذار مساوی نہیں بلکہ انذار ثواب مرتب ہوا جو کہ عدم انذار کی صورت میں نہ ہوتا اور یہیں سے اہل علم کے نزدیک اس اعتراض کا بھی جواب ہو جاوے گا کہ جب آپ کا انذار وعدم انذار مساوی تھا تو ایک عبث فعل آپ کے کیوں سپرد ہوا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ عبث تو اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب آپ کے حق میں بھی برابر ہوتا اور جب آپ کے

حق میں برابر نہ تھا۔ لترتب الثواب علی الانذار و انتفائه علی عدمه (بسبب ثواب مرتب ہونے کے ڈرانے پر اور نہ مرتب ہونا نہ ڈرانے پر تو یہ فعل عبث نہ رہا۔ (فوائد الصحبة)

غرض اس میں تو شبہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو تبلیغ وانذار پر ثواب تو ملتا ہے لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ ثواب آپ کی نظر میں بھی انذار سے مقصود تھا یا نہیں تو حضور ﷺ کی شفقت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو محض ثواب مقصود نہ تھا کیونکہ اگر آپ کو محض ثواب مقصود ہوتا تو اس قدر دل سوزی کی کیا وجہ تھی ثواب تو صرف تبلیغ پر بھی مرتب ہو جاتا تھا جس کے باب میں قرآن مجید میں ارشاد ہے

لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین (شاید آپ اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں اس وجہ سے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں) اور مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (آپ ان پر وکیل نہیں ہیں) اور لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۝ (دوزخ والوں کی نسبت آپ سے سوال نہ ہوگا) ان سب آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بے حد غم تھا ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس کو صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا (فوائد)

قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ

ترجمہ: تو ہر بار یہی کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے بیشتر اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا۔

تفسیری نکات

ثمرات جنت دنیا کے مشابہ ہونگے

چنانچہ هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ میں مفسرین نے چند اقوال نقل کئے ہیں ایک یہ کہ نعمائے جنت صورۃ نعمائے دنیا کے مشابہ ہونگے ان کو دیکھ کر جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہم نے اس سے پہلے دنیا میں کھائی تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ ثمرات جنت باہم مشابہ ہوں گے اس لئے ایک بار کسی چیز کو کھا کر پھر دوبارہ جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو صورۃ پہلے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے کہیں گے کہ یہ تو ابھی کھائی تھی اور بعض نے کہا ہے کہ وہ نعمتیں اعمال کی صورت ہوں گے جن کو دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ تو وہی نماز ہے جس کی ہم کو دنیا میں توفیق ہوئی تھی اور وہ مناسب ایسی ہوگی جس کو صاحب عمل فوراً سمجھ جائے گا اور گو اس تفسیر کو علماء ظاہر نے زیادہ قبول نہیں کیا مگر اس کی تغلیط بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے اِنَّ الْجَنَّةَ قِيْعَانٌ وَغِرَاسُهَا سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت تسبیح وتحمید وغیرہ ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کے درخت ان کلمات کی صورت ہیں اسی طرح بعض نصوص قرآنیہ میں ہے ذوقوا ما کنتم تعملون کہ چکھو ان چیزوں کو جو تم کرتے تھے۔ اگر اس میں تاویل نہ کی جائے تو ظاہر نص ان لوگوں کی تائید کرتا ہے جو جزاء کی صورت اعمال کہتے ہیں باقی یہ مقدمات اقناعیہ ہیں میں ان کی بنا پر دعویٰ نہیں کرتا اور نہ آیات کی تفسیر کرتا ہوں بلکہ ایک لطیف استشہاد علم اعتبار کے طور پر کرنا چاہتا ہوں۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ

ترجمہ: فرشتے کہنے لگے کہ کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد اس میں اور خوں ریزیاں کریں

تفسیری نکات

فساد سے مراد تحلیل ہے

ایک مولوی صاحب کے کسی سوال کے جواب میں فرمایا کہ اگر بالفرض آدم علیہ السلام سے بھی لغزش نہ ہوتی تب بھی چونکہ مادہ تو ایسی لغزش کا ان میں تھا ہی جس سے بلزوم عادی ان کی اولاد میں سے جنت میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ کرتا اور اس کو نکالا جاتا اس وقت وہ کسی کا بیٹا ہوتا کسی کا پوتا کسی کا بھتیجا کسی کا بھانجا کسی کا بھائی تو روزانہ جنت میں کہرام مچا رہتا اس وجہ سے باپ ہی آ گئے ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت جنت میں رنج کیسے ہوتا فرمایا کیوں شبہ کیا ہے آخر آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جنت سے نکلو اس وقت آدم علیہ السلام کو رنج ہوا ہوگا یا نہیں وہ رنج طبعی سہی عقلی نہ سہی اس وقت وہ دنیا میں تھے یا جنت میں عرض کیا کہ جنت میں فرمایا بس ثابت ہو گیا کہ جنت میں بھی رنج ہو سکتا ہے اور یہ تو پیشتر ہی حق تعالیٰ نے فرشتوں سے ظاہر فرما دیا تھا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً اس سے بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ارض میں خلیفہ ہونگے جنت سے نکل جانا آدم علیہ السلام کا اسی وقت فرشتوں کو معلوم ہو چکا تھا اسی سلسلہ میں فرمایا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا کی تفسیر جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی عجیب وغریب ہے بہت سی تفسیریں دیکھیں مگر وہاں تک کسی مصنف کی رسائی نہیں ہوئی وہ یہ کہ یہ امر فطری ہے کہ اپنی بنی ہوئی چیز کے بگڑنے سے رنج ہوتا ہے اور خلافت کے لئے تصرف لازم ہوگا اور تصرف کا حاصل یہی تحلیل وترکیب سے ہے اور تحلیل بھی توڑ پھوڑ ہے بس فساد سے یہی تحلیل مراد ہے فساد بمعنی معصیت مراد ہونا ضروری ہی نہیں اسی طرح سفک دماء سے سفک محرم مراد ہونا ضروری نہیں چونکہ فرشتوں کا کام تھا پرورش کرنا شجر کو مویشی وغیرہ کو اور یہ آدمی کسی درخت کو کاٹے گا کسی کی کڑیاں بنائے گا کسی میں تختے' جانوروں میں کسی پر سواری کرے گا کسی سے کھیتی کا کام لے گا کسی کو ذبح کرے گا فرشتوں کو یہ گراں ہوا اب یہ شبہ بھی نہ رہا کہ فرشتوں نے بنی آدم کی طرف معصیت کو کیسے منسوب کر دیا عجیب تحقیق ہے۔

فساد کے لغوی معنی

اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو فساد اور خونریزی اس میں بیان کی گئی ہے یہ خود آدم علیہ السلام میں بھی ہے حالانکہ وہ نبی معصوم ہیں اس کا جواب دوسرے حضرات نے تو یہ دیا ہے کہ اس سے خود آدم علیہ السلام کی ذات مراد نہیں بلکہ بنی آدم مراد ہیں۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب نے جواب یہ دیا ہے کہ یہاں فساد اور خونریزی کے شرعی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں کیونکہ انسان ان جانوروں کو ذبح کر کے کھائے گا شکار کرے گا تو لغوی معنی کے اعتبار سے فساد کی ایک صورت ہے۔

تخلیق آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا حاکمانہ اور حکیمانہ جواب

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفۃ الارض بنانے کے لئے پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے عرض کیا تھا کہ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ تو حق تعالیٰ نے فرشتوں کو دو جواب دیئے ایک تو حاکمانہ جواب دیا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے) میرے معاملات کی تمہیں کیا خبر۔

؎ رموز مملکت خویش خسرواں دانند

میں اپنے معاملات کا تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں دوسرا جواب حکیمانہ دیا کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (اور علم دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کا) کہ تم اوصاف اور اسماء اور خواص اشیاء کے جن سے ان کو کام پڑھنے والا تھا تعلیم فرمادیئے تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوسکیں۔ آدم علیہ السلام کو بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ یعنی آپ زمین میں ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے جو فساد اور سفک دماء کریں گے اور ہم آپ کی تسبیح اور تقدیس کے لئے ہر دم تیار ہیں۔ اس آیت کی تفسیر عام مفسرین نے تو معصیت سے کی ہے یعنی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ انسان زمین میں فساد کریں گے خون بہاویں گے مگر مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک عجیب تفسیر کی ہے فرمایا کہ فساد فی الارض معصیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہاں فساد کے معنی بگاڑنے کے ہیں یعنی انسان پیدا ہوگا تحلیل و ترکیب کے لئے انسان کا کام جوڑنا اور توڑنا ہے یعنی جوڑی ہوئی چیزوں کو توڑنا اور علیحدہ چیزوں کو جوڑنا۔ بس ترکیب تحلیل کام ہے۔ انسان ایجاد و اعدام تو کرتا نہیں یعنی اعطائے وجود یا سلب وجود نہیں کرسکتا۔ بس اس کا کام اتنا ہی ہے کہ کسی کو جوڑ دیا کسی کو توڑ دیا مثلاً یہ پنکھا ہے اس میں آپ نے کیا کھجور کی تو ٹہنی کاٹ کر لائے اس کو پیڑ سے توڑا اور پھر سب پتوں کو جوڑ لیا پنکھا ہوگیا۔ تو اس میں آپ نے صرف تحلیل و ترکیب ہی کی اور کوئی کمال آپ کا نہیں ہے اور فساد کے معنی ہیں بگاڑنا۔ جب کسی کو توڑو گے تو ضرور بگڑیگا اور یہ سب چیزیں فرشتوں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہیں اور اپنی بنائی ہوئی چیز سے محبت ضرور ہوتی ہے اس لئے طبعی طور پر ان کو قلق ہوا اور رحم آیا کہ یہ انسان ہماری بنائی چیزوں کو توڑے پھوڑے گا کیونکہ یہ سب چیزیں شجر حجر حیوانات جمادات نباتات، جن وغیرہ سب انسان سے پہلے ہو چکے تھے۔ اور ان سب کے پیدا ہونے میں فرشتوں سے کام لیا گیا ہے پھر انسان ان سب سے بعد میں ان میں تصرف کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ بعد میں پیدا ہونا دلیل ہے اس کی شرافت کی دیکھئے جب آپ کا کوئی معزز مہمان آتا ہے اس کی خاطر مدارات کی جتنی اشیاء ہوتی ہیں سب پہلے سے موجود کر لیتے ہیں پھر اس کو بلاتے ہیں چنانچہ اس کے آنے سے پہلے مکان کو جھاڑو دلواتے ہیں عمدہ فرش بچھاتے ہیں میز کرسی تیار رکھتے ہیں۔ قالین، لالٹین، دیوار گیری سب لگائے رکھتے ہیں۔ جب وہ آتا ہے تھوڑی دیر باہر بٹھلا کر اندر لے آتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ جب مہمان آجائے اسی وقت جھاڑو دلواتے ہوں تاکہ وہ گرد اس کے اوپر پڑے اور نہ اس وقت فرش بچھاتے ہیں تو انسان کا سب سے پیچھے آنا ہی دلیل ہے اس کے معزز ہونے اور شریف ہونے کی، غرض

سب چیزیں پہلے موجود تھیں اور انسان بعد میں آیا اور فرشتے جانتے تھے کہ انسان ان سب کو توڑے پھوڑے گا اور یہ ان کی بنائی ہوئی چیزیں تھیں ان کو قلق ہوا عرض کیا آپ ایسے شخص کو پیدا کرتے ہیں جو توڑ پھوڑ کرے گا۔ اب فساد کی تفسیر معصیت سے کرنے کی ضرورت نہ رہی واقعی عجب تفسیر ہے۔ (اجر الصیام حصہ اول)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام (کو پیدا کرکے) سب چیزوں کے اسماء کا پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی ان کے آثار و خواص) اگر تم سچے ہو (فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہم کو علم ہے ہی نہیں بے شک آپ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (کہ جن قدر جس کیلئے مصلحت جانا اسی قدر فہم و علم عطا کیا) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم علیہ السلام ان کو چیزوں کے اسماء بتلا دو جب بتلا دیئے آدم علیہ السلام نے ان کو چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے کہتا نہ تھا کہ میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں اور زمینوں کی اور جانتا ہوں جس بات کو تم ظاہر کر دیتے ہو اور جس بات کو دل میں تم رکھتے ہو۔

تفسیری نکات

تعلیم اسماء کی استعداد

اور دوسرا امر یہ فرمایا کہ استعداد کا مسئلہ بڑا اہم ہے قصہ آدم علیہ السلام اور ان کی تعلیم اسماء میں اور فرشتوں کے عجز عن الجواب کی بناء یہی استعداد ہے ان علوم اسماء کے اخذ کرنے کی استعداد آدم علیہ السلام میں تھی ملائکہ میں نہ تھی اس لئے آدم علیہ السلام کو جو علم عطاء ہوا وہ فرشتوں کو عطاء نہیں ہوا پس اس سے یہ اشکال رفع ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو جن علوم خاصہ کی تعلیم دی گئی اگر ملائکہ کو دی جاتی وہ بھی ان علوم سے متصف ہو جاتے پھر آدم علیہ السلام کا کمال کیا ہوا وجہ دفع تقریر بالا سے ظاہر ہے کہ آدم علیہ السلام کو کوئی خفیہ تعلیم نہیں دی گئی مگر ملائکہ میں ان علوم کی استعداد نہ تھی اس لئے ان کو تلقی نہیں کر سکے باقی یہ سوال کہ ان کے عجز عن الجواب کے بعد پھر قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ کے کیا معنی اس وقت وہ علم ان کو کیسے حاصل ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تعلیم محض الفاظی اطلاع تھی معنوی نہ تھی معنوی اطلاع صرف آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی گئی

تھی مگر آدم علیہ السلام کے اخبار سے ملائکہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کو جو حقیقت معلوم ہے ہم کو معلوم نہیں اگر کوئی کہے کہ وہ استعداد فرشتوں کو کیوں نہ دے دی گئی جواب یہ ہے کہ وہ استعداد خواص آدم سے تھی اگر ملائکہ کو عطاء ہوتی تو فرشتہ فرشتہ نہ رہتا اسی کے متعلق ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ انباء جو اَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ کا مادہ ہے مطلق اخبار کو کہتے ہیں اور تعلیم عَلَّمَ آدَمَ کا مادہ ہے حقیقت کا منکشف کر دینا ہے پس انباء سے تعلیم لازم نہیں آتی غرض استعداد خاص عطاء ہونا یہ بھی محض وموہبت ہے کسی عمل کا ثمرہ نہیں چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے کوئی عمل سابق نہیں ہوا تھا۔

خاصیت اور استعداد

پھر فرشتوں پر پیش کیا اور پھر فرشتوں نے فرمایا اَنۢبِـُٔونِىْ بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ اگر تم سچے ہو ان کے نام بتلاؤ اور اسماء کی تخصیص محض ذکری ہے۔ مقصود اوصاف وخواص بتلانا ہے۔ پھر فرشتوں نے حق تعالیٰ سے اپنے عجز کا اقرار کیا اور کہا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا الآیۃ (آپ تو پاک ہیں ہم کو علم نہیں مگر وہی جو آپ نے ہم کو سکھلایا ہے) پھر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے نام بتلاؤ قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم! تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے نام) پس آدم علیہ السلام نے سب بتلا دیا۔ فَلَمَّآ اَنۢبَاَهُم جب آدم علیہ السلام نے نام بتلا دیئے تو قَالَ اَلَمْ اَقُل لَّكُمْ الآیۃ۔ حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں تو خلاصہ یہ ہوا کہ خلافت کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان کو تعلیم فرمائی۔

جواب اشکال

اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے تھے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو امتحان میں اس طرح شریک کریں کہ ایک کو تو پندرھویں مقالہ کی شکل اول خلوت میں سکھلا دیں اور دوسرے سے اسی شکل میں بغیر سکھلائے ہوئے امتحان لیں۔

اس شبہ کا جواب سننے کے قابل ہے یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلائے تھے اور جب ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے ہی بتلا دیا ہو اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہو سکتی بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہوگی کہ پندرہویں مقالہ کی شکل اول دونوں طلباء کے سامنے بیان کی گئی اور امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت بتلا سکا اور دوسرا نہیں بتلا سکا۔ اعتراض جو وارد ہوتا ہے اول صورت میں ہوتا ہے اور اس پر منع کافی ہے اور وہ احتمال بالفرض راجح نہ سہی مگر احتمال تو ہے کہ فہرست سب کے سامنے پیش ہوئی اور پھر جب آدم علیہ السلام نے تو بتلا دیا اور فرشتے نہ بتلا سکے کیوں کہ علم کے واسطے استعداد کی ضرورت ہے اول علوم کی استعداد بشر ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت کہ جبرائیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی بوجہ عدم استعداد اس کی حقیقت نہ بتلا سکے تو حق تعالیٰ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی۔

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھ سکے ہوں گے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہوگئی مگر یہ محض لغو اعتراض ہے کیونکہ بتلانے کے لئے مخاطب کا سمجھ لینا لازم نہیں اور اس لئے انباء فرمایا علم نہیں فرمایا۔ تعلیم کے معنی ہیں سمجھا دینے کے اور انباء کے معنی ہیں اخبار کے یعنی تقریر کر دی گو مخاطب نہ سمجھا ہو۔ بہر حال استعداد کی ہر علم کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔

اس تقریر پر بھی اعتراض پڑتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ خاصیت ہی بدل دیتے اور وہ استعداد ملائکہ میں پیدا کر دیتے تو وہ بھی سمجھ لیتے۔ جواب یہ ہے کہ خاصہ اس کو کہتے ہیں کہ اس ذات کے علاوہ کسی اور ذات میں نہ پایا جائے ورنہ خاصہ نہ رہے گا تو استعداد جو خاصہ بشر ہے ملائکہ میں کیسے پائی جاسکتی ہے اور اگر کہو کہ اول ہی فرشتوں کو بشر کر کے خلیفہ کر دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے اس میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں کیا اس کی نسبت صرف یہی کہا جائے گا

حدیث مطرب و می گو وراز دہر کمتر جو　　　کہ کس نکشو دو نکشاید بحکمت ایں معمارا

مطرب و می کی بات کر زمانے کے راز تلاش نہ کر کہ کسی نے حکمت سے اس معمہ کو نہیں کھولا۔

فہم کی ایک مثال

(ملفوظ ۲۳۳) ایک مولوی صاحب نے سوال کیا کہ حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا ہے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ کیا آپ ایسے لوگوں کو زمین میں پیدا کریں گے جو فساد کریں گے اس میں اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر آپ کو تسبیح اور تقدیس کرتے رہتے ہیں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (یعنی میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے) تو یہ مجمل جواب دیا اس کے بعد آدم علیہ السلام کو اسماء بتلا دیئے اور ملائکہ سے فرمایا۔

اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

فرشتوں نے عرض کیا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۝

حق تعالیٰ نے فرمایا یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ الخ یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیا جاتا تو ان کو بھی یہ علم حاصل ہو جاتا تو اس میں آدم علیہ السلام کی کیا فضیلت ثابت ہوئی جواب میں فرمایا کہ یہ کہیں ثابت نہیں کہ فرشتوں سے اخفاء کیا گیا مگر فرشتوں میں خاص ان علوم کی استعداد نہ تھی اس لئے باوجود اعلانیہ تعلیم کے بھی ان علوم کو نہیں سمجھ سکتے تھے جیسے استاد اقلیدس کے کسی دعوے کی تقریر دو طالب علموں کے سامنے کرے مگر جس کو مناسبت ہے وہ تو سمجھے گا دوسرا نہیں سمجھے گا اگر کہا جائے۔

فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی علم اسماء کی استعداد تھی اس کا جواب یہ ہے کہ انباء محض اخبار روایت کو کہتے ہیں جس کا درجہ تعلیم سے کم ہے پس اس سے علم حقائق اسماء کا حاصل ہو جانا لازم نہیں آتا حاصل یہ کہ علم اسماء کی استعداد بشر کے ساتھ خاص تھی فرشتوں کے اندر وہ استعداد ہی نہ تھی اب رہا یہ سوال کہ فرشتوں میں وہ استعداد رکھ

دیتے۔اس کا جواب یہ ہے کہ بشر میں رکھنا اور فرشتوں میں نہ رکھنا یہ حکمت ہے جس پر کوئی اعتراض ہی نہیں کر سکتا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتہ جیسا فرشتہ ہے ویسا ہی رہے اور آدمی جیسا آدمی ہے ویسا ہی رہے اس وقت یہ تفاوت ہوگا جس کا منشا اختلاف استعداد ہے۔جس کو مختلف محل میں مختلف پیدا کرنا محض حکمت ہے ایک بدعقیدہ صوفی نے اس سوال کے جواب میں یہ غضب کیا ہے اور اس کو لکھ بھی دیا ہے اور وہ رسالہ چھپ بھی گیا یہاں مدرسہ میں ہے یہ لکھا ہے کہ وہ استعداد غیر مخلوق اور قدیم اور محدثات ممکن کا ہے اس واسطے یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ نے ایک میں استعداد رکھی اور ایک میں نہیں رکھی اس شخص نے اپنے زعم میں خدا تعالیٰ کو اعتراض سے بچایا ہے مگر بیچارہ خود ہی نہیں سمجھا اب ایک سوال اور رہا وہ یہ کہ جب فرشتے آدم علیہ السلام کے اخبار سے بھی نہیں سمجھے تو فرشتوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو یہ علم حاصل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تقریر کی قوت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کہہ رہا ہے گو اس تقریر کو کوئی نہ سمجھے یہ ایسا ہے کہ جیسے اقلیدس کا ماہر کوئی شکل بیان کرے تو اس کو سمجھے گا تو وہی جو پہلے سے مبادی سے باخبر ہے اور جو مبادی ہی سے بے خبر ہے وہ سمجھے گا تو نہیں مگر اتنا سمجھ لے گا کہ یہ سمجھ کر کہہ رہا ہے آگے اس میں قصور سمجھنے والے کا ہے کہ نہیں سمجھا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔

تفسیری نکات

شیطان کے مردود ہونے کا سبب

اس پر شبہ کیا کہ شیطان کے مردود ہونے کی وجہ کیا ہے اس کو تو سجدہ کا حکم ہوا ہی نہیں بلکہ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف ملائکہ کو ہوا تھا۔نہ معلوم ان صاحبوں کو شیطان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے

جواب اشکال کا یہ ہے کہ عدم ذکر ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں اس کے ذکر کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ آگے اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ میں اس کا ذکر آ رہا ہے یہ اس کا قرینہ ہے کہ وہ بھی مخاطب تھا۔بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کا ذکر آگے موجود ہو تو کلام سابق میں اکتفاء باللاحق اس کا ذکر نہیں کیا کرتے جیسا کہ عرض امانت میں انسان کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ آئندہ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ میں اس کا ذکر موجود ہے یہ جواب اس اشکال کا بہت سہل ہے اس میں استثناء متصل و منفصل کی بحث کی ضرورت نہ رہے گی۔بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ابلیس کا ذکر کلام سابق میں ایجازاً محذوف ہے اور تقدیر کلام اس طرح تھی وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ والابلیس اسجدوا

ابلیس کا سجدہ نہ کرنا آدم کے کمال کی دلیل

فرمایا۔ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملائکہ کا سجدہ کرنا جیسا ان کے یعنی آدم علیہ السلام کے کمال کی دلیل ہے ویسا ہی ابلیس کا سجدہ نہ کرنا بھی ان کے کمال کی دلیل ہے کیونکہ اگر ابلیس بھی سجدہ کرتا تو اہل کمال کو یہ شبہ ہوتا کہ شیطان کو آدم علیہ السلام سے کچھ مناسبت ضرور ہے جس کی وجہ سے اس کو ان کی طرف میلان ہوا اور ان کو سجدہ کیا اب سجدہ نہ کرنے کی صورت میں یہ تحقیق ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور ابلیس کے درمیان کوئی مناسبت نہیں کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس (الکلام الحسن حصہ اول ۷۹)

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی ان ہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

تفسیری نکات

لاتقربا فرمانے میں حکمت

حق تعالیٰ نے زنا کی حرمت اس لفظ سے بیان فرمائی ہے کہ لاتقربوا الزنا حالانکہ یہ لفظ بھی کافی تھا لاتزنوا یعنی زنا نہ کرو مگر بطور تاکید اور پیش بندی کے یہ لفظ اختیار کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ اور آدم علیہ السلام کو اکل من الشجرہ سے منع فرمانے کیلئے بھی لا تقربا ھذہ الشجرۃ اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قریب بھی مت جاؤ ایک حدیث تو اس بارہ میں صریح موجود ہے من یرتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ یعنی ارشاد فرماتے ہیں حضور علیہ السلام جو کوئی سرکاری چراگاہ کے آس پاس بکریاں چرائے گا تو ممکن ہے کہ کوئی بکری چراگاہ میں بھی گھس جائے یہ ٹکڑا ہے ایک حدیث کا وہ یہ ہے کہ الحلال بین والحرام بین و بینھما مشتبھات فمن اتقی الشبھات فقد استبرء لدینہ و من یرعی حول الحمی یوشک ان یقع فیہ.

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حلال بین ہے اور حرام بین ہے اور دونوں کے درمیان میں مشتبہات ہیں یعنی وہ اعمال ہیں جن کا حلال و حرام ہونا پوری طرح واضح نہیں ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ جو شبہات سے بھی بچا رہے اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی سرکاری چراگاہ کے قریب اپنے مویشی کو لے جائے گا (یعنی شبہات کا ارتکاب کرے گا جو حرام کی سرحد سے ملی ہوئی ہے) تو عجب نہیں کہ مویشی چراگاہ میں بھی گھس جائیں اور وہ سرکاری مجرم ہو جائے۔

لا تقربا ھذہ الشجرۃ یعنی اس درخت کے قریب مت جاؤ۔ حالانکہ منہی عنہ اکل شجرہ ہے لیکن منع کیا گیا اسکے پاس جانے سے اس لئے کہ حق تعالیٰ نہایت رحیم و کریم ہیں انہوں نے دیکھا کہ جب پاس جاویں گے تو پھر رکنا دشوار ہے اس لئے پاس جانے سے ہی روک دیا جیسے بچے کو شفیق باپ کہتا ہے کہ دیکھو بیٹا چولہے کے پاس نہ جانا حالانکہ جانتا ہے کہ

چولہے کے پاس جانا کچھ مضر نہیں لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ پاس جا کر بچنا مشکل ہے اس لئے روکتا ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ

ترجمہ: اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی توریت کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے) اور مت ہو پہلے کافر اس کے ساتھ۔

تفسیری نکات

اہل کتاب سے خطاب

ارشاد وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ یہ خطاب اہل کتاب ہی کو ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اُے اہل کتاب ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے اتاری ہے کہ وہ تمہاری کتابوں کی بھی تصدیق کرنے والی ہے اور اس کے ساتھ اول کافر نہ بنو یعنی اگر تم اس کا انکار کرو گے تو کافر ہو گے اور سب سے اول درجہ کے کافر ہو گے کیونکہ تم اہل علم ہو اور پہلے بھی تم کو کتاب مل چکی ہے برخلاف مشرکین کے کہ وہ اہل علم نہیں اور کسی کتاب کو نہیں مانتے ان سے اس کتاب کا انکار بھی اتنا بعید نہیں جتنا تم سے ہے اس آیت میں مَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ سے سوائے قرآن کے اور کچھ مراد نہیں ہوسکتی لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن پر ایمان لانا بھی شرط ایمان ہے بلا اس کے آدمی مومن نہیں ہوسکتا کافر ہی رہے گا اور کافر کی نجات نہیں اور ظاہر ہے کہ تمام قرآن حضور کی رسالت سے بھرا پڑا ہے قرآن پر جو کوئی ایمان لائے وہ حضور کی رسالت کا ضرور قائل ہوگا اس سے ثابت ہوا کہ بلا حضور کی رسالت پر ایمان لائے بھی نجات نہیں ہوسکتی۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

ترجمہ: اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور زکوٰۃ دو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ

تفسیری نکات

حب مال اور حب جاہ کا علاج

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ میں حب جاہ کا معالجہ ہے وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ میں حب مال کا علاج ہے۔

ازالہ کبر کی تدبیر

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○ جو تتمہ ہے واقیموا الصلوٰۃ کا یہ کبر کے زائل ہونے کی تدبیر ہے۔ (التھذیب حصہ اول ۱۷)

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: یا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے

تفسیری نکات

امر بالمعروف اور نسیان النفس

مگر یہ دھوکہ ہے اور سبب اس دھوکہ کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ عمل نہ کرو تو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرو حالانکہ یہ مقدمہ بالکل غلط ہے کیونکہ امر بالمعروف طاعت ہے اور اس طاعت کی شرائط میں یہ شرط کہیں نہیں کہ اگر خود بھی عمل کرے تو طاقت ہوگی ورنہ نہیں ہاں اپنا عمل نہ کرنا ایک مستقل گناہ ہے جو کہ قابل ترک ہے لیکن امر بالمعروف کے ساتھ اس کو شرطیت وغیرہ کا کچھ تعلق نہیں اور یہ کسی حدیث سے یا کسی مجتہد کے قول سے ثابت نہیں کہ اگر گناہ سے نہ بچے تو دوسری طاعت بھی طاعت نہ ہوگی اور اگر اس کو مانا جائے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے بارے میں ہے جو کہ نیکی بھی کرتا ہے لیکن گناہ میں بھی مبتلا ہے تو اگر گناہ کرنا دوسری اطاعت کے طاعت نہ ہونے کا موجب ہو تو اس کے کفارہ سیئات کی کوئی صورت ہی نہ رہے گی اور مضمون آیت کے بالکل خلاف لازم آتا ہے البتہ اگر کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو کہ مفوت طاعت ہے تو بیشک پھر طاعت طاعت نہ رہے گی اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں طاعت اپنی حالت پر رہے گی اگرچہ معصیت کرنے سے گناہ بھی ہوگا ہاں اتنا اثر ضرور ہوگا کہ گناہ کی وجہ سے طاعت کی برکت کم ہو جائے گی مگر طاعت منعدم نہ ہو جائے گی اور دلیل اس کی یہ آیت ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

جب اس کی بناء الگ ہوئی تو یہ سمجھنا کہ اگر وعظ کہوں گا تو گنہگار ہوں گا غلطی پر مبنی ہے پس امر بالمعروف طاعت ہوا اور اس کا طاعت ہونا گناہ نہ کرنے پر موقوف نہ ہوا بلکہ آیت میں ملامت اس پر ہے کہ تم خود کیوں عمل نہیں کرتے اور وعظ کے چھوڑ دینے سے تو دوسرا جرم قائم ہو گیا یعنی نہ خود عمل کریں اور نہ باوجود معلوم ہونے کے دوسروں کو بتلائیں دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب ایک شخص امر بالمعروف کرتا ہے جو کہ طاعت ہے اور طاعت مزیل ہوتی ہے معصیت کی تو اس کا اقتضاء یہ ہو سکتا تھا کہ یہ کفارہ ہو جاتا نسیان نفس بمعنی ترک عمل کا مگر اس طاعت کے ہوتے ہوئے بھی اس کا یہ نسیان اس امر بالمعروف سے ہوا تو جہاں امر بالمعروف بھی نہ ہو نری بدعملی ہی ہو جس میں عیب جوئی بھی داخل ہے تو کیونکر موجب ملامت نہ ہوگی ضرور ہوگی۔ خلاصہ یہ ہوگا کہ اے شخص جو کہ اپنی حالت کو بھول رہا ہے جبکہ تیری حالت ایک معصیت اور ایک طاعت کے مجموعہ پر بھی محل ملامت ہے تو جب طاعت ایک بھی نہ ہو بلکہ

دونوں امر معصیت ہوں تو کیونکر موجب ملامت نہ ہوگی اور دو معصیتیں اس طرح ہوئیں کہ بدعملی تو اپنی حالت پر رہی جس کو تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ فرمایا ہے اور امر بالمعروف کے بجائے دوسرے کی عیب جوئی ہوگئی تو اس حالت میں تو بدرجہ اتم ملامت ہونی چاہیے پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس میں ملامت کی بناء بدعملی وعیب جوئی ہے علماء کو ہی خطاب نہیں بلکہ جہلاء کو بھی ہے کیونکہ اس کا ارتکاب وہ بھی کرتے ہیں بلکہ جہلا کو زیادہ سخت خطاب ہے اور علماء کو ہلکا کیونکہ ان کے پاس ایک ہونے کی تو ہے امر بالمعروف اور جہلاء کے پاس تو ایک بھی نہیں اب اس کو غور کیجئے اور جہل پر اپنے فخر کو دیکھئے کہ اس کی بدولت تعزیرات الٰہیہ کی ایک دفعہ اور بڑھ گئی اور مقصود اس سب سے یہ ہے کہ ہماری جو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی کیا کرتے ہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے اور اپنی فکر میں لگنا چاہیے۔

اپنی برائیوں پر نظر رکھنے کی ضرورت

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی کیا تم سمجھتے نہیں ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ جس طرح نقلی ہے عقلی بھی ہے یعنی عقل بھی اس کے قبح کا فتویٰ دیتی ہے بہرحال اس آیت سے بدلالت مطابقی اس پر وعید ہوئی کہ اوروں کو سمجھاؤ اور خود عمل نہ کرو اور بدلالت التزامی و بدلالت النص یہ ثابت ہوا کہ اوروں کی برائی کے درپے ہونا اور اپنی برائیوں کو فراموش کرنا برا ہے ضرورت اس کی ہے کہ ہر وقت اپنے گناہوں اور عیوب پر نظر ہو اور اسکے معالجے کی فکر کی جائے اور جس میں اپنی فکر کافی نہ ہو اس میں دوسرے ماہر سے رجوع کرو شرم وحجاب کی وجہ سے اپنے امراض کو معالج سے چھپایا نہ جائے کیونکہ اظہار مرض کے بغیر علاج ممکن نہیں۔

اپنی صلاح ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (وہ اس سے یہی سمجھے کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے) کیونکہ ہمزہ تامرون پر انکار کے لئے داخل ہوا ہے تو امر بالبر منکر ہوا یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے۔

آیت اتامرون الناس کا مطلب

نیز قبل روانگی ریل ایک شخص نے سوال کیا کہ آیت اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم کا مطلب کیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جسکے اپنے اعمال درست نہ ہوں اسکو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرنی چاہیے۔ فرمایا یہ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آمر بالبر کو ناسی نفس نہ ہونا چاہیے ورنہ امر بالبر ضروری چیز ہے اور کچھ نہ کچھ نفع اس سے ضرور ہوتا ہے سامع کو تو ہوتا ہی ہے آمر کو بھی ہوتا ہے میرا تجربہ ہے کہ جس بات کی میں اپنے آپ میں کسر پاتا ہوں اس کا وعظ کہہ دیتا ہوں بس اسی دن سے وہ کام شروع ہو جاتا ہے کیونکہ شرم آتی ہے کہ میں لوگوں کو اس کی تعلیم کر چکا ہوں اور میں اس میں سے خالی ہوں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: (اور اگر تم کو مال وجاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو) تو مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں اور خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

تفسیری نکات

نماز کی گرانی کا علاج

اب ایک اشکال رہ گیا کہ نماز وصبر خود بھی تو مشکل ہے پس ایسی چیز سے مدد لینے کی تعلیم دی جو خود بھی آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اعمال جن میں مدد لی جاتی ہے بہت سے ہیں اور یہ صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ سو ہمت اور محنت سے دو باتوں کا حاصل کرنا کچھ دشوار نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی بھی تدبیر بتلائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (ہاں بے شک نماز بہت گراں ہے مگر خاشعین پر) اس کے جزو اول پر تعارض کا شبہ نہ ہو کہ ابھی تو نماز کو آسان کہہ رہے تھے ابھی اس کو بھاری مان لیا۔

بات یہ ہے کہ نماز فی نفسہ آسان ہے اور عارض مزاحمت نفس سے گراں ہو جاتی ہے دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں بطور مخاطب کے اس کو گراں مان لیا گیا ہے تا کہ مخاطب کو ابتداء ہی سے وحشت نہ ہو بلکہ مصلح کو اپنی موافقت کرتا ہوا دیکھ کر اس کی بات کو سن لے۔

کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ مصلح اگر مریض کی بات کو مان کر اصلاح کرے تو مریض کا دل بڑھتا ہے۔ مثلاً طبیب نے مونگ کی کھچڑی بتلائی مریض نے کہا کہ وہ بدمزہ ہوتی ہے اب ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کی بات کو رد کیا جائے۔ اس سے تو بحث کی صورت پیدا ہو جائے گی اور مریض ہرگز اس کی بات نہ مانے گا بلکہ اپنی بات پر اڑ جائے گا ایک صورت یہ ہے کہ طبیب یوں کہے کہ ہاں واقعی بدمزہ ہے مگر اس لئے تجویز کی جاتی ہے کہ مریض زیادہ نہ کھا جائے۔ فرماتے ہیں واقعی نماز بہت گراں ہے سبحان اللہ کیسا شفقت کا عنوان اختیار فرمایا کہ گرانی کو تسلیم کر لیا آگے فرماتے ہیں خاشعین پر کچھ گراں نہیں پس تم خشوع حاصل کر لو تم پر نماز گراں نہ رہے گی۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ترجمہ: جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ رب کی ملاقات کرنے والے ہیں اور اسی طرح لوٹنے والے ہیں۔

لقائے رب کا استحضار مشکل نہیں

کہ تم لقاء رب ورجوع الی اللہ کا استحضار کرو اور یہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ خیالات کا بالکل روکنا تو مشکل ہے مگر ایک خیال کا استحضار تو مشکل نہیں اگر وہ دل سے ہٹ جائے تو پھر لے آ ؤ اس طریقہ سے خشوع قلب جلد حاصل ہو جائے گا۔

خشوع کی حقیقت

مگر لوگ اس میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ عدم حضور وساوس کو خشوع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خشوع کی حقیقت عدم احضار وساوس ہے قصداً خیال نہ لایا جائے اور جو بلا قصد آوے وہ مضر نہیں نہ خشوع کے منافی ہے بلکہ اس کو دفع بھی نہ کرو اس کی طرف التفات ہی نہ کرو۔

صوفیا نے لکھا ہے کہ وساوس کی مثال ہوا کی طرح ہے کہ جو شخص برتن میں سے تنہا ہوا نکالنا چاہے وہ عاجز ہو جائے گا کیونکہ خلا محال ہے ہاں برتن میں پانی بھر دو۔ جب بھر جائے تو پھر ہوا کا نام بھی نہ رہے گا۔ پس تم اپنے قلب میں لقاء رب ورجوع الی اللہ کا خیال اچھی طرح بھر لو پھر وساوس کا نام بھی نہ رہے گا۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ یعنی مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں اور خشوع کرنے والے وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

اکثر مفسرین نے صبر سے مراد صوم لیا ہے اور اس کو آیت میں مشکل نہیں فرمایا بلکہ صرف نماز کے ساتھ اس حکم کو مخصوص کیا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں روزہ رکھنے میں بڑی مستعدی کرتی ہیں اور نماز پڑھنا ان پر قیامت ہوتا ہے اس لئے کہ افعال وجودی میں مشقت زیادہ ہے اور نہ کھانے میں عورتوں کا کچھ کمال بھی نہیں اس لئے اول تو مزاج بارد جس میں تحلیل رطوبات کم ہوتی ہیں دوسرے کھانا پکانے سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور مردوں میں یہ امور محقق نہیں ہیں۔

خشوع کی ضرورت

نماز کو جو آیت میں دشوار کہا گیا ہے اس سے خاشعین کو مستثنیٰ بھی فرمایا ہے کہ وہ خاشعین پر مشکل نہیں اس لئے خشوع کی بھی ضرورت ہے تاکہ اس سے نماز آسان ہو اس واسطے خشوع پیدا کرنے کی ترکیب بھی الذین یظنون الخ میں ارشاد فرمائی یعنی وہ یوں خیال کرتے ہیں کہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں بخدا یہ خشوع پیدا کرنے کے لئے عجیب علاج ہے آدمی ہر عبادت میں یہی خیال کرلے کہ یہ میرا خدا سے ملنے کا آخری وقت ہے تو بڑا خشوع ہی ہوگا اسی لئے رسول ﷺ کا ارشاد ہے صل صلوة مودع مودع یعنی رخصت کئے گئے شخص جیسی نماز پڑھو۔

قرآن شریف اور محاورات عرب میں ظن کے وسیع معنی

فرمایا کتب درسیہ کے بعد قرآن شریف کی تفسیر کو پڑھنے سے لغات اور اصطلاحات میں خلط ہو جاتا ہے اور اس سے بہت سی غلطیاں ہو جاتی ہیں مثلاً ظن کو قرآن شریف میں ملا کر حسن ظن کی اصطلاح میں سمجھ گئے پھر اس سے احکام میں خبط ہونے لگا حالانکہ قرآن شریف میں اور اسی طرح محاورات عرب میں ظن یقین سے لے کر خیالات باطلہ تک بولا جاتا ہے مثلاً اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ میں ظن بمعنی یقین ہے اور ان نظن الا ظنا میں ظن بمعنی خیالات باطلہ مستعمل ہے اور باقی مراتب کی مثالیں تم خود سمجھ لو گویا علم کے جمیع مراتب پر ظن کا اطلاق آتا ہے جیسا قرینہ ہو۔ اب یہ اشکال نہ رہا کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا سے بعض مسائل کی تخصیص کی جائے کیونکہ اصطلاح فقہ میں تو ظن بمعنی جانب راجح معتبر بلکہ آیت میں ظن سے مراد خیال بلا دلیل ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس قسم کا ظن اثبات حق کے لئے کافی نہیں باقی جو ظن مستند الی الدلیل ہو وہ مثبت حکم ظنی ہو سکتا ہے۔

نماز روزہ سے زیادہ مشکل ہے

ارشاد ربانی ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (یعنی مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں۔ (البقرہ آیت ۴۵)

حضور علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے نماز میں تو تخفیف کی درخواست کی لیکن روزہ کا عدد تیس سے تین نہیں کرایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ روزہ نماز سے آسان ہے (عصم الصنوف ۲۹)

اگر نماز روزہ کے برابر ہوتی تو نانی یاد آجاتی (عصم الصنوف ۱۲) چنانچہ اب بھی لوگ روزہ کا اہتمام زیادہ کرتے ہیں بلکہ اپنے نابالغ بچوں تک کو رکھواتے ہیں لیکن سارا ماہ اہتمام سے تراویح با جماعت نہیں پڑھتے اور دشوار سمجھتے ہیں۔ بعض تو مطلقاً تراویح نہیں پڑھتے۔

نماز میں پابندی زیادہ ہے چنانچہ بولنے کی بھی پابندی ہے لیکن روزہ میں کوئی ایسی پابندی نہیں چنانچہ اگر کوئی دن بھر سوتا رہے تب بھی اس کا روزہ صحیح ہو جائے گا (عصم الصنوف)

نماز میں کوئی فعل مفسد صلوۃ نسیان سے صادر ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے اور روزہ میں کوئی فعل نسیان ہو جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ نماز کی ہیئت مذکر ہے اس لئے نسیان عذر نہیں اور روزہ کی ہیئت مذکر نہیں اس لئے نسیان عذر ہے اور ظاہر ہے کہ نماز کا مذکر ہونا اس کے وجودی ہونے اور صوم کا مذکر نہ ہونا اس کے عدمی ہونے کی دلیل ہے اور وجودیت کا شاق ہونا اور عدمی کا سہل ہونا لوازم طبعیہ سے ہے (عصم الصنوف عن عم الانوف)

حق تعالیٰ شانہ نے بھی مذکورہ آیت میں نماز کو وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ فرما کر بندوں کے جذبات کی رعایت فرمادی لیکن اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ فرما کر گرانی کی تسہیل کا طریقہ بھی بتلا دیا کہ

خشوع حاصل ہونے کے بعد نماز گراں نہ رہے گی اور خشوع دیدار الٰہی کا استحضار اور موت کا دھیان رکھنے سے حاصل ہوگا۔

نماز کی گرانی دور کرنے کا طریقہ

بہر حال اس میں شک نہیں کہ نماز کے اندر جو پابندی ہے وہ نفس کو بہت گراں ہے اور قرآن میں اس کی گرانی کو تسلیم کیا گیا ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ بے شک نماز بہت گراں ہے مگر اب حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ آگے اس گرانی کے زائل کرنے کی بھی تدبیر بتلاتے ہیں اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ یعنی مگر خشوع کرنے والوں پر نماز گراں نہیں ظاہر میں مقصود استثنا ہے مگر درحقیقت اس میں بتلانا مقصود ہے کہ نماز کی گرانی کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خشوع حاصل کرو۔ خشوع کے معنی عربی میں سکون ہیں اور سکون حرکت کا ضد ہے اور قاعدہ ہے کہ علاج بالضد ہوتا ہے پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ نماز گراں اس لئے تھی کہ قلب متحرک رہنا چاہتا ہے تم اس کو سکون کا عادی کرو تو یہ گرانی باقی نہ رہے گی۔ اس جگہ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آیت کی اس عنوان سے تقریر کرنا ہمارے ذمہ ضروری نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خشوع سے گرانی نہیں رہتی مگر ایسی تقریر کر دینا محض سامعین کی خاطر ہے مگر شاید کوئی اس علاج پر یہ شبہ کرے کہ یہ تدبیر تو صحیح مگر یہ تو ایسی تدبیر ہوئی جیسے کسی نے کہا تھا کہ ایک منٹ میں سات دفعہ سورہ بقرہ پڑھ لو تو سلطنت ہفت اقلیم مل جائے گی۔ یا جیسے گاندھی نے کہا تھا کہ سب ہندوستانی اتفاق کر کے گورنمنٹ سے ترک موالات کر دیں تو سوراج مل جائے گا یہ تو مسلم مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں اتفاق ہو بھی سکتا ہے ہرگز نہیں یہاں کی آب وہوا میں خاصیت یہ ہے کہ یہاں اتفاق ہو نہیں سکتا اور ہو بھی جائے تو رہ نہیں سکتا تو یہ علاج بھی ایسا ہی ہوا کہ قلب کو سکون کا عادی کر لو نماز گراں نہ رہے گی یہ تو مسلم مگر سکون کیونکر حاصل ہو۔

خشوع قلب حاصل کرنے کا طریق

تو صاحبو! اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر نہیں بتلائی جو حاصل نہ ہو سکے چنانچہ آگے خشوع حاصل کرنے کا بھی طریقہ بتلاتے ہیں اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ کہ خشوع قلب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لقاء رب کا مراقبہ کرو کیونکہ لقاء رب کا مراقبہ قاطع جملہ افکار ہے جس دل میں یہ مراقبہ ہوگا وہاں اور کوئی فکر جم نہیں سکتا پس سکون قلب اور خشوع حاصل ہو جائے گا اسی کو دوسری آیت میں فرماتے ہیں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے خشوع اور اطمینان اور سکون سب متحد ہیں اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اطمینان ایمان کے علاوہ کوئی اور شے ہے کیونکہ اطمینان خشوع کا مرادف ہے اور بغیر خشوع کے ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت لوگ ایماندار ہیں جن کو خشوع حاصل نہیں تو ایمان بھی بدوں اطمینان متحقق ہو سکتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا
هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (67) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ
لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ
ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (68) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ
اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ (69) قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
لَمُهْتَدُوْنَ (70) قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي
الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا
كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (71) وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا
كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (72) فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى
وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (73) ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ
كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ
مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ
اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (74)

ترجمہ: اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ بیل ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخر بناتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ معاذ اللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کردیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں آپ نے فرمایا کہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے درمیان سو اب کرڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے کہنے لگے کہ درخواست کردیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے یہ بیان کردیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ آپ

نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں سے اس کے اوصاف کیا کیا ہوں کیونکہ ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ٹھیک سمجھ جاویں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق باری تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ ہل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے اور نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جاوے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی اور پھر اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم ہوتے نہ تھے کہ جب تم لوگوں نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے پر اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کو ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اس طرح حق تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیں گے اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس موقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو ایسے واقعات کے بعد پھر بھی تمہارے دل سخت ہی رہے تو ان کی مثال پتھر کی سی ہے یا سختی میں اس سے زیادہ اور بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور ان ہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے اوپر سے نیچے کو لڑھک آتے ہیں اور حق تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں)

تفسیری نکات

قصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا اس کے وارثوں نے طمع مال میں اس کو قتل کر دیا تھا کہ جلدی سے اس کے مال پر قبضہ ہو جائے قتل کر کے پھر خود ہی خون کے مدعی ہو گئے۔ جب قاتل خود مدعی ہو تو قاتل کا پتہ کون دے اس لئے سب کی رائے ہوئی کہ اس قصہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے جایا جائے وہ وحی وغیرہ سے قاتل کا پتہ بتلا دیں گے چنانچہ سب لوگ آپ کے پاس آئے آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا تو وہاں سے ایک جانور ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ (جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) بقرہ سے خاص گائے مراد نہیں اور نہ اس میں تاء تانیث کے لئے ہے بلکہ تاء وحدت کے لئے ہے اور بقرہ گائے بیل دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس جگہ بیل ہی مراد ہے کیونکہ آگے اس کی صفت میں یہ بات مذکور ہے لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ کہ وہ کام کاج میں پامال نہ ہو زمین کو جوتتا اور کھیتی کو پانی نہ دیتا ہو اور یہ شان بیل کی ہوتی ہے گائے سے ہل نہیں چلاتے نہ اس سے کھیتی کو پانی دیتے ہیں ہاں اس زمانہ میں اگر گائے سے بھی یہ کام لیا جاتا ہو تو خیر ممکن ہے اس وقت گائیں مضبوط ہوتی ہوں جو بیل کا کام دیتی ہوں جیسے بعض لوگ عورتوں سے چور مروایا کرتے ہیں بعض عورتیں اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مردوں کی طرح چور کو مار لیتی ہیں اور جس طرح بعض عورتیں بہادر ہوتی ہیں ایسے ہی بعض مرد عورت ہوتے ہیں۔

جب بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے آ کر قصہ عرض کیا انہوں نے جناب باری سے دعاء کی وہاں سے حکم ہوا

کہ ایک بقرہ ذبح کرو اور یہ نہیں بتلایا کہ بقرہ ذبح کرنے سے کیا ہوگا قاتل کا پتہ اس سے کیونکر معلوم ہوگا کیونکہ آقا کو کچھ ضرورت نہیں ہے پوری بات بیان کرنے کی اور اپنے احکام کی علت وحکمت اور غایت بتلانے کی مگر غلام کا ادب یہ ہے کہ چون وچرا نہ کرے جو حکم ہو فوراً بجالائے اور جتنی بات کہی جائے اس کی جلدی تعمیل کردے چاہے اس کا فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر بنی اسرائیل نے ایسا نہ کیا وہ چوں وچرا میں پڑ گئے حکم کے سنتے ہی نبی پر اعتراض کردیا۔ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا آپ ہم سے مسخرہ کرتے ہیں۔

حکیم کے احکام حکمت سے خالی نہیں

منشاء بنی اسرائیل کی اس غلطی کا یہ ہوا کہ وہ تو قاتل کو دریافت کرنے آئے تھے اور یہاں حکم ہوا ذبح بقرہ کا تو وہ سوچنے لگے کہ سوال جواب میں جوڑ کیا ہوا ہمیں قاتل کا پتہ پوچھنا تھا اس کا جواب یہ تھا کہ نام بتلا دیتے فلاں ہے یا فلاں یہ بے جوڑ حکم کیسا کہ بقرہ ذبح کرو۔

درس عبرت

بنی اسرائیل کو سمجھنا چاہیے تھا کہ حق تعالیٰ حکیم ہے ان کے احکام میں کچھ حکمت ہوگی ہم نہ سمجھیں تو کیا ہے مگر انہوں نے اپنی عقل سے چون وچرا کو دخل دیا یہ خلاف ادب ہے خوب سمجھ لو اول تو انہوں نے ذبح بقرہ کے حکم کو معاذ اللہ اس پر محمول کیا کہ موسیٰ علیہ السلام ہم سے دل لگی کرتے ہیں یہ نبی کا ادب تھا بھلا نبی ان سے مسخرا پن کیوں کرنے لگے تھے اور اگر مزاح کرتے بھی تو اس کے لئے وقت موقع ہوتا ہے یہ کیا موقع تھا مزاح کا کہ لوگ تو ایک مقدمہ فیصل کرانے آئیں اور نبی ان سے دل لگی کریں پھر دل لگی بھی اس عنوان سے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (اللہ تعالیٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) خدا تعالیٰ کی طرف ایک حکم کو منسوب کر کے اگر یہ بھی دل لگی ہو سکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ موسی علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی طرف یہ حکم غلط منسوب کردیا استغفر اللہ بھلا اس عنوان سے کچھ بھی مزاح کا احتمال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں مگر بنی اسرائیل نے موسی علیہ السلام کو بے دھڑک کہہ دیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) موسی علیہ السلام نے لرز کر ڈر کر فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (نعوذ باللہ جو میں جہالت والوں کا سا کام کروں) بتلا دیا کہ احکام الٰہی بیان کرتے ہوئے دل لگی کرنا جہالت ہے اور نبی جہالت سے معصوم ہے پھر تمہارا اپنے پیغمبر کو ایسی بات کہنا گنوار پن کی دلیل ہے اب ان کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ حکم خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے چاہیئے تھا کہ اب دیر نہ کرتے فوراً تعمیل کر دیتے مگر چونکہ انکو یہ خلجان ہو رہا تھا کہ ذبح بقرہ کو قاتل کے پتہ سے کیا جوڑ ہے اس لئے مختلف حالات میں پڑ کر متردد ہو گئے اور سوچنے لگے کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا جس کو اس کام میں دخل ہوگا اسلئے سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ کہنے لگے اے موسی علیہ السلام اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ صاف صاف ہم کو بتلا دیں وہ بقرہ کیا چیز ہے یعنی کیسی ہے۔

قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت پر سمجھنے کی ضرورت

ماھی سے اصطلاح معقول پر سوال مرادنہیں جوسوال حقیقت کے لئے موضوع ہے کیونکہ حقیقت تو ان کو معلوم ہو چکی تھی کہ بقرہ ہے بلکہ ماھی سے سوال صفات مراد ہے ای ماصفاتھا (اس کی صفات کیا ہیں) اور محاورات میں ماھی سے سوال صفات بھی ہوتا ہے یہاں محاورات ہی کے موافق استعمال ہے لوگ غضب کرتے ہیں قرآن مجید کو اصطلاحات فنون حاصل کرنے کے بعد پڑھتے ہیں پھر ان اصطلاحات کو قرآن مجید میں جاری کرتے ہیں جس سے اشکال پڑتا ہے اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا قرآن کریم کو اصطلاحات فنون کا اتباع کس دلیل سے لازم ہے قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت اور محاورات پر سمجھنا چاہیے اصطلاحات علوم پر منطبق نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ سب اصطلاحات نزول قرآن کے بعد مدون ہوئی ہیں باقی اس کا انکار نہیں کیا جاتا کہ ماھی محاورات میں بھی کبھی سوال حقیقت کے لئے آتا ہے مگر اس میں ہی منحصر نہیں۔

سوال کیفیات وصفات کے لئے بھی بہت مستعمل ہے اور ممکن ہے کہ اس کو سوال عن الماہیۃ پر محمول کر کے کہا جاوے کہ ان لوگوں نے صفات کا سوال مـاھی سے اس لئے کیا ہو کہ اس عجیب بقرہ کے صفات کا مجہول ہونا گویا ان کے ذہن میں خود ذات کا مجہول ہونا تھا وہ یہ سمجھے کہ جس بقرہ کے ذبح کا ہم کو حکم ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے گائے بیلوں کے ساتھ صرف نام میں شرکت رکھتا ہے اور خواص وکیفیات میں شاید ان سب سے ممتاز ہوگا۔

وہاں سے جواب ملا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (آپ نے یہ فرمایا کہ وہ فرماتے ہیں وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا بچہ ہو پٹھا ہو دو عمروں کے درمیان سو اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے)

بے ادبی کی سزا

اب ادھر سے بھی تشدد شروع ہوا کیونکہ غلام کا آقا کے حکم میں چون وچرا اور توقف کرنا خلاف ادب ہے جس کی سزا ان کو دی گئی کہ اچھا جب تم ہمارے حکم کو بے جوڑ سمجھتے ہو (کہ اس کو ہمارے سوال سے کچھ ربط نہیں) اور اس لئے بقرہ کے بارہ میں متعجب ومتردد ہو کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا تو ہم بھی ایسی قیود کا اضافہ کرتے ہیں جن سے تم کو حقیقت نظر آ جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم کسی نوکر سے کہیں کہ بازار سے پانی پینے کا کٹورا خرید لاؤ اس کو چاہیے کہ اس بات کے سنتے ہی حکم کی تعمیل کرے مگر نہیں اب وہ پوچھتا ہے حضور کتنا بڑا لاؤں یہ سوال محض لغو ہے کیونکہ پانی پینے کا کٹورا سب جانتے ہیں کتنا بڑا ہوا کرتا ہے مگر اس کی اس کاوش پر کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا ہو جس میں پورا آدھ سیر پانی آتا ہو نہ اس سے زیادہ ہو نہ کم اگر کچھ بھی کم وبیش ہوا تو واپس کر دیں گے لیجئے اب اس کے لئے دن بھر کا دھندا ہو گیا پھر ٹکریں مارتا ہوا سارے بازار میں اگر وہ سنتے ہی حکم کی تعمیل کر دیتا تو یہ مصیبت نہ اٹھانی پڑتی اسی طرح بنی اسرائیل نے چون وچرا کر کے خود اپنے سر مصیبت دھری ورنہ کوئی سی گائے بیل بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا چنانچہ حدیث شریف میں ہے لـو ذبحوا ای بقرة اجزاتهم ولكن شددوا فشدد الله عليهم (اگر وہ کوئی سا بیل بھی ذبح کر ڈالتے تو ان کو کافی ہوتا لیکن انہوں نے اپنے اوپر

سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی ڈال دی اب ان کے سوال پر یہ قید بڑھائی گئی کہ وہ بقرہ نہ تو عمر رسیدہ ہو نہ بچہ ہو بلکہ درمیانی عمر کا ہو یہ قید بھی کچھ زیادہ سخت نہ تھی کیونکہ اس شان کے بیل گائے بھی بہت دستیاب ہو سکتے ہیں اور خیر خواہی اور شفقت کے طور پر یہ بھی کہہ دیا گیا فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ کہ جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے اس کو کر ڈالو۔ اس میں زیادہ کاوش نہ کرو مگر وہ کب ماننے والے تھے ان کو اس صفت سے اور تردد پیدا ہو گیا کہ یہ تو کوئی خاص صفت نہ ہوئی ایسی گائے بیل تو بہت موجود ہیں اس لئے دوبارہ پھر سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا یعنی ہم کو یہ بھی بتلا دیا جائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے وہاں سے رنگ بھی متعین کر دیا گیا۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ کہ وہ بقرہ زرد رنگ کا ہو جس کی زردی خوب گہری ہو جو اپنے رنگ سے دیکھنے والوں کو خوش کر دے ان کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی کیونکہ اس رنگ کی بھی بہت سی گائے بیل تھیں اور وہ لوگ تعین جزئی کے طالب تھے کہ بس ایسا پتہ نشان بتلا دیا جائے جس میں غیر کا احتمال ہی نہ رہے (مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ وہ گائے یا بیل جو فلاں جنگل میں فلاں کھیت میں ایسے ایسے درخت کے پاس چر رہا ہے یا وہ بیل جو فلاں شخص کے پاس وغیرہ وغیرہ اور حق تعالیٰ کی طرف سے جتنی صفات بتلائی گئیں وہ سب صفات کلیہ تھیں اور قاعدہ ہے کہ صفات کلیہ چاہے کتنی ہی ہوں ان سے تعین نہیں ہوتی احتمال شرکت باقی رہتا ہے جیسے ایک وہمی کا قصہ ہے کہ وہ نماز میں جب کسی امام کی اقتدا کرتا تو پہلے یہ کہتا کہ اقتدا کرتا ہوں میں اس امام کی جو میرے آگے ہے اس سے بھی تسلی نہ ہوتی تو پھر کہتا کہ جس کا لباس ایسا ہے جس کا یہ نام ہے پھر وہم ہوتا کہ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو اور اس کا یہ نام ہو تو پھر اس کی کمر میں انگلی چبھو کر کہتا پیچھے اس امام کے تو یہ شخص اس حقیقت کو سمجھا کہ صفات کلیہ سے تعین نہیں ہوتی تعین اشارہ جزیہ سے ہوتی ہے وہ بھی اس طرح کہ اس پر ہاتھ رکھ دیا جائے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کو بھی ان صفات سے تسلی نہ ہوئی تو سہ بارہ پھر سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جائیں گے)

یعنی ایک مرتبہ اور بتلا دیا جائے کہ وہ بقرہ کیسی ہے ان صفات سے تو تعین نہیں ہوتی بلکہ اس شان کی بہت افراد ہیں جن کی ہم کو تشابہ التباس ہو رہا ہے، ہم متردد ہیں کہ کون سا بقرہ ذبح کریں ایک دفعہ اور وضاحت کر دی جائے ان شاء اللہ ہم راہ پا جائیں گے یعنی سمجھ جائیں گے اس مرتبہ یہ خیر ہوئی کہ ان کے منہ سے ان شاء اللہ نکل گیا۔

ان شاء اللہ کی برکت

حدیث میں آتا ہے ولو لم یستثنوا لما بین لھم اخر الابد (اوکما قال) یعنی بنی اسرائیل اگر استثناء نہ کرتے (یعنی ان شاء اللہ نہ کہتے) تو قیامت تک ان کو پتہ نہ دیا جاتا مگر ان شاء اللہ کی برکت سے یہ سلسلہ سوالات و جوابات کا جلدی ہی ختم ہو گیا چنانچہ ارشاد ہوا۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُوْنَ (موسیٰ) علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ

وہ ہل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے اور نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جائے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے اب آپ نے پوری بات فرمائی اور اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے کہ وہ ایسا بقرہ ہے جو کام کاج میں استعمال نہیں کیا گیا نہ زمین کو جوتتا ہے نہ کھیت کو پانی دیتا ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بقرہ سے بیل مراد ہے تندرست بدن کا ہے جس پر کوئی داغ دھبہ ذرا نہیں مطلب یہ کہ جو جانور کھیتی وغیرہ کے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کے بدن پر جوا رکھنے کا نشان یا مار پیٹ کا نشان ہو جاتا ہے وہ ایسا نہ ہو اب سمجھنے لگے بس اب لائے تم ٹھیک بات یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اخیر میں بھی تو کچھ زیادہ تعیین نہیں ہوئی کیونکہ اس میں بھی تو صفات کلیہ ہی ہیں جزئیات نہیں اور تعیین جزئیات سے ہوتی ہے نہ کلیات سے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں استثناء کی برکت سے ان کے لئے بیان ہو گیا تھا (جس سے متبادر یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت ہو گئی تھی)

حالانکہ بظاہر اب بھی پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت نہیں ہوئی جو صفات اخیر میں مذکور ہوئی ہیں اس شان کے بیل بھی بہت ہوتے ہیں تو بات یہ ہے کہ گو تعیین جزئی اب بھی نہیں ہوئی مگر ان کی تسلی اس طرح ہو گئی کہ ان کے ذہن سے ان شاء اللہ کی برکت سے وہ مقدمات واہیہ نکل گئے اور وہ سمجھ گئے کہ تعیین درست ہو گئی غرضیکہ اس کے بعد جانور کی تلاش ہوئی اور اس قدر گراں قیمت میں ان صفات کا جانور ملا کہ بقرہ کی کھال میں سونا بھر کر دینا پڑا مگر اس گرانی سے بنی اسرائیل گھبرائے نہیں خرید کر ذبح ہی کر دیا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ کہ انہوں نے اس کو ذبح کر ہی دیا اور وہ کرنے والے تھے نہیں۔ یہاں سے ان شاء اللہ کی برکت معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض افعال کی تاثیر ایسی ہوتی ہے جو ظاہر ہو کر رہتی ہے گو محل زیادہ قابل نہ ہو (یعنی فاعل ان افعال کا چاہے کیسا ہی ہو پورا قابل یا کم قابل مگر فعل کا اثر ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض افعال مؤثر بالخاصہ ہوتے ہیں جیسے بعض ادویہ مؤثر بالخاصہ ہوتی ہیں کہ خصوصیت مزاج ان کے اثر کو نہیں روک سکتی۔ تو جب بنی اسرائیل کے ان شاء اللہ کا یہ اثر ہوا کہ ان کی فہم اس کی برکت سے درست ہو گئی حالانکہ وہ کچھ زیادہ مؤدب بھی نہ تھے ان کا ادب تو اسی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ خطاب کیا اتتخذنا هزوا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) پھر حکم الٰہی میں چون وچرا کی اور سب سے بڑی "ادب" کی بات تو وہ تھی جو انہوں نے اخیر میں کہی یعنی اَلْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ کہ اب لائے ٹھیک بات گویا اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک نہ تھا اور یہ جملہ اس وقت کہا جب ان شاء اللہ کی برکت سے راہ پر آ گئے تھے فہم درست ہو گئی تھی تو جن کا سمجھ آ جانے کے بعد یہ ادب ہے ان کا مودب ہونا ظاہر ہے مگر پھر بھی ان شاء اللہ نے اپنا اثر کیا گو قائل زیادہ قابل نہ تھے بلکہ نا قابل تھے۔

تشبیہ نفس

نفس کو بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینا بہت ہی مناسب ہے اس کے بعد ارشاد ہے قال انه يقول انها بقرة لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ (یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بقرہ جس کے ذبح کا حکم ہوا ہے نہ تو بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے اوسط میں لغت میں فارض کے معنی منقطع العمر ہیں یعنی جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ

قطع کرلیا ہو فرض کے معنی قطع ہیں تو فارض کے معنی بہت بوڑھے کے ہوئے اور بکر کہتے ہیں اس نر یا مادہ کو جو دوسرے سے جفت نہ ہوا ہو اور جانور عادۃً جوانی سے پہلے ہی بکر رہتا ہے جوان ہونے کے بعد بکر نہیں رہتا پس بکر کے معنی یہاں بچہ کے ہیں جو ابھی تک جوان نہ ہوا ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ بقرہ نہ بچہ ہو نہ بوڑھا ہو بلکہ ان دونوں عمروں کے درمیان ہو جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ جوان ہو کیونکہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان جوانی ہی کا درجہ ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علم اعتبار کے طور پر بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی جاتی ہے تو اس صفت کو بھی نفس پر جاری کرنا چاہیے جس سے اشارۃً یہ ثابت ہوا کہ جوانی میں مجاہدہ نفس کی زیادہ فضیلت ہے کیونکہ اس وقت غلبہ قوت نفس کے سبب مجاہدہ شاق ہوتا ہے **والاجر بحسب المشقة** (یعنی ثواب اعمال کا مشقت کے موافق ہے) جس عمل میں زیادہ مشقت ہو وہ اس سے افضل ہے جس میں مشقت کم ہو نیز قوت بدن کے سبب عمل بھی زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ کثرت عمل موجب ہوگا کثرت ثواب کا اور اس سے لازم آتا ہے کہ بچپن اور بڑھاپے میں مجاہدہ کرنا جوانی کے مجاہدہ کی برابر نہ ہو مگر یہاں ایک سوال و جواب ضروری ہے وہ یہ کہ جوانی کے مجاہدہ میں دو درجے ہیں ایک یہ کہ جوانی میں مجاہدہ کرتے ہوئے کام زیادہ کیا یا مقاومت نفس میں مشقت زیادہ برداشت کرنا پڑی اور اتنا کام اور اتنی مشقت بچپن اور بڑھاپے میں نہ کرنا پڑی اس صورت میں تو جوانی کے مجاہدہ کا بچپن کے اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس وقت عمل اکثر واشد ہوا تو قرب واجر بھی زیادہ ہوگا اور ایک درجہ یہ ہے کہ جوانی میں بحالت مجاہدہ عمل زیادہ نہیں کیا نہ مشقت زیادہ ہوئی بلکہ اتفاق سے کسی محل میں عمل و مشقت اتنی ہی کرنا پڑی جتنی بچپن یا بڑھاپے کے مجاہدہ میں ہوتی تو کیا اس صورت میں بھی جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں جوانی اور بڑھاپے کا مجاہدہ برابر ہو کیونکہ مجاہدہ شباب کی فضیلت بوجہ شدت و کثرت عمل کے تھی اور وہ اس صورت میں مفقود ہے۔

بقرہ کی ایک صفت یہ مذکور ہے قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ . یعنی ارشاد ہے کہ وہ بقرہ زرد رنگ کی ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو۔ اس صفت کو بھی نفس سے مناسبت ہے کیونکہ صوفیہ کو لطیفہ نفس کا رنگ بھی زرد ہی مکشوف ہوا ہے اور اس کو لطیفہ میں نے اصطلاح کے اعتبار سے کہہ دیا اور وہ اصطلاح بھی تغلیب پر مبنی ہے ورنہ وہ تو کثیفہ ہے البتہ مجاہدہ سے مطمئن ہونے کے بعد ایک معنی کر لطیفہ ہی بن جاتا ہے ایک صفت بقرہ کی یہ ہے لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا کہ وہ بقرہ کام کاج میں مستعمل نہ ہو نہ زمین کو جوتتا ہو نہ کھیت کو پانی دیتا ہو اس میں داغ دھبہ نہ ہو اس میں اشارہ ہے نفس کے فراغ کی طرف یعنی مجاہدہ سے پہلے نفس کو تمام افکار و تعلقات سے فارغ کر کے یکسو ہو کر مجاہدہ کرنا چاہیے کہ اسی حالت میں مجاہدہ کا اثر پورا ظاہر ہوتا ہے کچھ دنوں کے لئے سارے کاروبار کسی کے سپرد کر کے عزلت گزیں ہو کر مجاہدہ کرو پھر دیکھو کہ کتنی جلدی اثر ہوتا ہے گو مجاہدہ بحالت شغل بھی اپنا اثر دکھاتا ہے مگر تجربہ یہ ہے کہ حالت فراغ میں جیسا اثر کامل ہوتا ہے ویسا بحالت شغل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانہ میں نسبتیں قوی ہوتی تھیں اور حالات بھی عالی طاری ہوتے تھے کیونکہ پہلے زمانہ میں طالبین فراغ کے ساتھ مشغول مجاہدہ

ہوتے تھے اور مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیْھَا صحیح وسالم ہو اس میں داغ ودھبہ نہ ہو میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس مجاہدہ سے پہلے تمام معاصی سے پاک صاف ہو جائے یعنی معاصی سابقہ سے توبہ صادق کر کے مجاہدہ کرے اگر کسی بندہ کے حقوق ذمہ ہوں ان کو ادا کر دے یا معاف کرالے اور خدا کا حق جیسے نماز روزہ قضا ہو گیا ہو تو اس سے توبہ کر کے ان کی قضا شروع کر دے اس طرح توبہ کرنے سے نفس گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے گا کیونکہ التائب من الذنب کمن لاذنب له (پس وہ اسی کا مصداق ہوگا مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیْھَا)

احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا بڑا جرم ہے

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْھَا وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ اور جب تم نے ایک جان کا خون کر دیا پھر اس کو ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور حق تعالیٰ کو اس بات کا ظاہر کرنا تھا جسے تم چھپا رہے تھے یہ اس قصہ کی ابتداء ہے جس کو ترتیب میں مؤخر کیا گیا ہے۔ مفسرین نے اس تقدیم وتاخیر میں بہت سے نکات لکھے ہیں ان سب میں سہل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقام پر دور سے بنی اسرائیل کی بے عنوانیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے اور یہاں بھی اس کا بتلانا مقصود ہے اور اس قصہ میں بنی اسرائیل سے دو بے عنوانیاں ہوئی تھیں ایک قتل کر کے اخفا واردات کرنا دوسرے احکام خداوندی میں خواہ مخواہ کی حجتیں نکالنا۔ پہلی بے عنوانی ابتداء قصہ میں ہوئی اور دوسری اس کے بعد اگر قصہ کو ترتیب وار بیان کیا جاتا تو ناظرین پہلے جزو کو مقصود سمجھتے اور دوسرے جزو کو تتمیم قصہ پر محمول کرتے اور ترتیب بدلنے سے صاف معلوم ہو گیا کہ دونوں ہی جزو مقصود ہیں اور ہر جزو سے ایک مستقل بے عنوانی پر تنبیہ کرنا منظور ہے (دوسرے احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا اخفاء واردات سے بھی بڑھ کر جرم ہے اس لئے اس کو پہلے بیان کیا گیا کہ ناظرین کو تنبیہ ہو جائے تاکہ خدا کے نزدیک قتل وغیرہ کی نسبت احکام میں حجتیں نکالنا زیادہ شدید ہے جس کو عام لوگ معمولی بات سمجھتے ہیں۔

امتثال امر پر رحمت خداوندی

فَقُلْنَا اضْرِبُوْہُ بِبَعْضِھَا کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی وَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (پس ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اس طرح حق تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

پھر ہم نے کہا کہ اس مقتول پر بیل کے کسی عضو کو لگا دو اس سے وہ زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلائے گا اس وقت گر کی بات بتلا دی کہ بیل کے ذبح کرنے کا حکم اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے کسی عضو کے مس کرنے سے مقتول زندہ ہو جائے گا پہلے یہ بات نہیں بتلائی کیونکہ بنی اسرائیل کی اطاعت کا امتحان مقصود تھا جس میں وہ ناکام ثابت ہوئے مگر جب حجتیں نکالنے کے بعد انہوں نے بقرہ کو ذبح کر دیا اس وقت امتثال امر پر یہ رحمت فرمائی کہ اس حکم کی حکمت بتلائی گئی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دیا اور پھر مر گیا یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ مقتول کے قول پر فیصلہ کیونکر

ہوا کیونکہ مقتول بھی فی الجملہ مدعی ہوتا ہے اور مدعی کا قول محتاج بینہ یا اقرار مدعی علیہ کا ہے خود حجت نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہاں مقتول کا قول فی نفسہ حجت نہ تھا بلکہ حجت وحی تھی جس سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مقتول زندہ ہو کر جو کچھ کہے گا وہ صحیح ہوگا۔

علم اعتبار کی حقیقت

یہ تو قصہ تھا اب میں اس کو منطبق کرنا چاہتا ہوں مقصود پر یعنی مضمون مجاہدہ پر قربانی سے تو مناسبت اس قصہ کے جزو اول ہی کو تھی اس کا بیان تو بوجہ مناسبت زمانہ کے ضروری تھا ہی مگر چونکہ مجھے مجاہدہ سے بھی اس مضمون کی مناسبت بیان کرنا ہے اس لئے میں نے جزو اخیر کو بھی تلاوت کیا مجاہدہ کے مقصود سے اس کو مناسبت ہے اب یہ سمجھو کہ اس وقت میں جو کچھ بیان کروں گا وہ علم اعتبار ہوگا جو کہ تفسیر آیات نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس کو تفسیر سمجھا ہے وہی صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں مگر صوفیہ کی مراد علم اعتبار سے یہ نہیں ہے کہ نصوص کو ظاہر سے محرف کریں بلکہ ظاہر کو ظاہر پر رکھ کر پھر بطور قیاس کے امثال قرآنی کو وہ اپنے مقصود پر جاری کرتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کا قیاس ہے جس کی نصوص سے اجازت ہے جیسے فقہی قیاس کی اجازت ہے چنانچہ حق تعالیٰ سورہ حشر میں قصہ بنی نضیر کے بیان کے بعد فرماتے ہیں فاعتبروا یا اولی الابصار (اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو اس واقعہ سے) تو اب اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کا مطلب کیا ہے یہی تو مطلب ہے کہ تم اپنے حال کو ان کے حال پر موازنہ کر کے دیکھو اگر تمہارے اندر ان جیسے اعمال و خصائل ہوں گے تو سمجھ لو کہ یہی معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا اسی طرح عاد و ثمود وغیرہ کے قصے بیان فرما کر ارشاد فرمایا لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (البتہ ان قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے) اب بتلایا جائے کہ ان کے قصے میں عبرت کیا ہے یہی تو ہے کہ ان کے اعمال میں غور کر کے اپنے کو ان سے بچائے یہی صوفیہ نے کیا ہے قصص قرآنیہ کو وہ اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں ان قصوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے (بلکہ ہر چیز کی نظیر اپنے اندر قائم کر کے مشبہ کے احکام کو مشبہ بہ پر جاری کرتے ہیں ۱۲)

مثلاً قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ جا بجا مذکور ہوا ہے اس کی تفسیر صوفیہ کے نزدیک بھی وہی ہے جو کتب تفاسیر میں مذکور ہے موسیٰ علیہ السلام سے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ فرعون سے مراد خاص وہی شخص ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا لیکن صوفیہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ تفسیر آیات کے بعد اس قصہ کو اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی ایک چیز موسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہے یعنی روح یا عقل اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی نفس اور جس طرح فرعون کا غلبہ موسیٰ علیہ السلام پر باعث فساد تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا غالب ہونا موجب صلاح ہے اس کے بعد وہ تمام قصے کو روح و نفس کے معاملات پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں اب وہ کہتے ہیں کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کی طرف جاؤ اس نے سرکشی کی ہے) کے معنی علم اعتبار کے طور پر یہ ہیں اذهب ایها الروح الی النفس انه طغی (اے روح نفس کی طرف جا اس نے سرکشی کی ہے) تو بتلایئے اس میں شرعاً کیا خرابی ہے اس کی حقیقت قیاس فقہی کے قریب ہے۔

قیاس اور تشبیہ

اتنا فرق ہے کہ قیاس کا نتیجہ بواسطہ قیاس مدلول نص ہے اور اعتبار کا نتیجہ مدلول نص نہیں بلکہ مدلول نص کے مشابہ ہے اور اسی فرق کا یہ اثر ہے کہ حکم قیاسی میں تو اگر مستقل نص نہ ہو تب بھی مقیس علیہ سے مقیس میں حکم کو متعدی کر سکتے ہیں اور حکم اعتباری میں اگر مستقل نص نہ ہو تو مشبہ بہ سے مشبہ میں حکم کو متعدی نہیں کر سکتے جیسے حدیث شریف میں ہے لاتدخل الملئکة بیتا فیه کلب (اس گھر میں فرشتہ نہیں آتا جس میں کتا ہو) اور اس سے بطور اعتبار یہ کہا گیا ہے کہ لاتدخل الانوار الالهته قلبافیه صفات سبعیة (نہیں ہوتے داخل انوار الٰہی اس دل میں جس میں بہائی صفات ہوں) تو اگر یہ حکم کسی مستقل دلیل سے ثابت نہ ہو تو محض اس نص سے حکم کا تعدیہ نہیں کر سکتے اس لئے بجائے قیاس کے اگر اس کا نام تشبیہ رکھا جاوے تو مناسب ہے تاکہ خلط نہ ہو۔

علم اعتبار کا سلف سے ثبوت

شاید تم یہ کہو کہ دلائل سے تو علم اعتبار کا صحیح ہونا اور خلاف شرع نہ ہونا معلوم ہو گیا لیکن یہ بتلاؤ کہ اس کا ثبوت کہیں سلف سے بھی اس قسم کی نظائر منقول ہیں چنانچہ رزین نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے جس کو تیسیر الاصول میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک آیت میں اسی طرح کا مطلب بیان فرمایا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ (کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر ایک زمانہ گزر گیا پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی ان میں کے کافر ہیں)

اس میں تو خشوع کا امر ہے اور قساوت قلب سے بچنے کی تاکید ہے اس کے بعد فرماتے ہیں اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد اس کے مردہ ہونے کے زندہ کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

قال ابن عباس لین القلوب بعد قسوتها فیجعلها مخبتة منیبتة یحی القلوب المیتة بالعلم والحکمة والا فقد علم احیاء الارض بالمطر مشاهدة و مقصودة ان هٰذا امثل ضربه الله لعباده و یرید ان قلوبکم کالارض فلاتیئسوا من قساوتها فانها یحی بالاعمال کالارض تحیی بالغیث

(حضرت ابن عباس نے فرمایا نرم کر دیا دلوں کو بعد ان کی قساوت کے پس ان کو مطیع و فرمانبردار بنا دیا' اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو علم و حکمت کے ساتھ زندہ کرتے ہیں ورنہ جان لیا تھا زمین کے زندہ ہونے کو بارش سے مشاہدہ سے اور یہ مثال ہے کہ بیان کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اور مراد یہ ہے کہ ان کے دل مثل زمین کے ہیں پس ان کی قساوت سے نا امید مت ہو زندہ کر دیں گے ان کو اعمال سے مثل زمین کے کہ اس کو بارش سے زندہ کرتے ہیں)

یعنی مقصود عبداللہ بن عباسؓ کا یہ ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا الخ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد مردہ ہونے کے زندہ کر دیتے ہیں) اس میں حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے ایک مثال بیان فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ اس طرح زمین خشک ہو جانے کے بعد بارش سے زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح قلوب بھی قساوت کے بعد اعمال صالحہ سے زندہ ہو جاتے ہیں پس اگر کسی کے قلب میں معاصی گزشتہ سے قساوت پیدا ہو گئی ہو تو وہ اصلاح سے مایوس نہ ہو کیونکہ زمین کی نظیر تمہارے لئے ہم نے بیان کر دی ہے اس پر اپنے قلوب کو بھی قیاس کر لو۔

تو اب دیکھ لو کہ حضرت عباس نے اس آیت میں ارض سے قلب مراد لیا اور موت سے قساوت یہی علم اعتبار ہے ورنہ لغۃً ارض کے معنی قلب اور موت کے معنی قساوت کے کہیں نہیں ہیں مگر انہوں نے آیت کو تشبیہ پر محمول کر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں اسی طرح صوفیہ بطور تشبیہ کے کہہ دیتے ہیں کہ موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے **وعلی ھذا** جب علم اعتبار کی نظیر سلف سے بھی منقول ہے اور قواعد شرع کے بھی وہ خلاف نہیں تو اب کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر وہ علم اعتبار کے طور پر اس قصہ کو مضمون مجاہدہ پر منطبق کر کے بیان کریں۔ الغرض اس جگہ یہ ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل کو ذبح بقرہ کا امر ہوا تھا۔

نفس کشی کا امر

اور اہل لطائف علم اعتبار کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ گویا نفس کشی کا امر ہوا تھا گویا بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی گئی ہے اور یہ تشبیہ بہت مناسب ہے کیونکہ گائے بیل بھی بہت حریص ہوتے ہیں کھانے پینے کے اور نفس بھی بہت حریص ہوتا ہے اس لئے نفس کو بقرہ کہنا تو مناسب ہے لیکن آج کل نفس کو کتا کہا جاتا ہے چنانچہ شعراء کے کلام میں سگ نفس بکثرت مستعمل ہے مگر یہ واہیات ہے اسی طرح بعض لوگ نفس کو کافر کہتے ہیں یہ اس سے بھی واہیات ہے ہمارا نفس تو الحمد للہ نہ کتا ہے نہ کافر ہے ہاں بقرہ تو ہوگا۔ نہ معلوم لوگ نفس کو کیا سمجھتے ہیں لغت میں تو نفس حقیقت شئے کو کہتے ہیں پس نفس زید حقیقت زید ہوئی تو حقیقت میں نفس ہمارا ہی نام ہے ہم سے الگ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے تو اپنے کو کتا یا کافر کہنا کیا زیبا ہے اور اگر نفس کوئی مستقل چیز بھی ہو تب بھی اول تو وہ ہمیشہ شریر نہیں ہوتا کہ اس کو کتے سے تشبیہ دی جاوے۔

نفس کے تین اقسام

بلکہ کبھی مطمئنہ ہوتا ہے کبھی لوامہ بھی ہوتا ہے کبھی امارہ ہوتا ہے چنانچہ نصوص میں یہ تینوں صفات مذکور ہیں ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتلاتا نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے)

دوسری جگہ ارشاد ہے لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)

اور تیسری جگہ ارشاد ہے

یٰٓاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ۙ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً

(اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو)

پھر اگر شریر بھی ہو تب بھی مسلمان تو ہے تو مسلمان کو کافر کہنا یا کتے سے تشبیہ دینا کیا مناسبت ہے ہاں بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینے کا مضائقہ نہیں غرض جس طرح بقرہ کے ذبح کا امر ہوا تھا اسی طرح نفس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے۔ بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے بس ویسے ہی کامیاب ہو جائیں۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: اور ان میں بہت سے ناخواندہ ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے لیکن دل خوش باتیں اور خیالات پکا لیتے ہیں۔

تفسیری نکات

خودرائی کی مذمت

ایک خط میں کسی نے یہ لکھا تھا کہ کلام کا بلا معنی پڑھنا لا حاصل ہے بربناء آیت وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ الخ فرمایا کہ افسوس لوگوں کو کیا ہو گیا کہ خودرائی اس درجہ ہو گئی ہے کہ کلام مجید ہی کو اڑانا چاہتے ہیں ایسے لوگوں کو جواب لکھنے سے کچھ نفع نہیں لیکن اس لئے لکھ دیتا ہوں کہ شاید اوروں کو ان کی تقریر سے شبہ پڑ جائے چنانچہ جواب لکھ دیا گیا کہ اس میں ان یہود کی تقبیح ہے جو نہ علم کو ضروری سمجھتے تھے نہ عمل کو پس اس کی مذمت ہے نہ کہ ترجمہ نہ جاننے کی۔ (ملفوظات حکیم الامت)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ: آپ (ان سے) یہ کہیے کہ جو شخص جبرئیل سے عداوت رکھے سو انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے پہلی کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو۔

تفسیری نکات

قلب معانی کا ادراک کرتا ہے

چنانچہ ارشاد ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن حضور کے قلب پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ قلب معانی کا ادراک کرتا ہے اور الفاظ کا ادراک سمع کو ہوتا ہے پس اس سے لازم آتا ہے کہ منزل من اللہ صرف معانی ہوں الفاظ منزل من اللہ نہ ہوں اس کا ایک

جواب تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے بہت معانی کا منزل ہونا معلوم ہوالفاظ کا منزل نہ ہونا کیسے معلوم ہوا کیونکہ عدم ذکر دلیل ذکر عدم نہیں ہے ان کا منزل ہونا دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ انا انزلناہ قرانا عربیا اور عربی ہونا صفت الفاظ ہی کی ہے مگر اس جواب سے عوام کو شفا نہیں ہوتی دوسرا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے دیا ہے اور یہ جواب ان کے سوا کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا وہ فرماتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ زبان داں کو اپنی مادری زبان میں گفتگو سنتے ہوئے اول التفات معانی کی طرف ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف بعد میں التفات ہوتا ہے اور غیر مادری زبان میں اول التفات الفاظ کی طرف ہوتا ہے ثانیا معانی کی طرف جیسا کہ آپ لوگ اس وقت میرا بیان سن رہے ہیں چونکہ میں آپ کی مادری زبان میں بول رہا ہوں اس لئے معانی کی طرف آپ کو اول التفات ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف اگر ہوتا ہے تو ثانیا پس قرآن مجید چونکہ آپ کی زبان میں ہے اس لئے وحی کے اسماع کے وقت اول التفات آپ کو معانی کی طرف ہوتا پھر الفاظ کی طرف اس لحاظ سے قرآن کو منزل علی القلب کہہ دیا گیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ الفاظ منزل نہیں۔

نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ کی عجیب وغریب تفسیر

اور نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ کے متعلق ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آ گئی گو مقام سے اجنبی ہے مگر استطرادا اسی آیت کے ذکر کی مناسبت سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض اہل باطل کے نزدیک یہ الفاظ قرآنیہ منزل من اللہ نہیں ہیں اور ان کو نزلہ علیٰ قلبک سے دھوکہ ہوا کہ اس میں محل نزول قرآن قلب کو فرمایا ہے اور قلب معانی کا مورد ہوتا ہے اور الفاظ کا مورد سمع ہوتا ہے نہ کہ قلب سو واقع میں یہی غلط ہے کیونکہ الفاظ دل میں بھی ہوتے ہیں چنانچہ ہر حافظ قرآن سوچ لے کہ الحمدللہ وغیرہ کے الفاظ دل میں ہیں یا نہیں یقیناً ہیں اسی کو ایک شاعر کہتا ہے

ان الکلام لفی الفواد و انما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

تحقیق کلام منہ میں ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زبان کو دل پر نشان بنایا ہے

البتہ اس پر یہ سوال ضرور ہوگا کہ گو قلب پر بھی الفاظ کا ورود ہوتا ہے مگر بواسطہ سمع کے ہوتا ہے تو یہاں سمع کا ذکر چھوڑ کر قلب کی قید کی کیا ضرورت تھی اس کا جواب ایک محقق نے خوب دیا ہے کہ مادری زبان اور غیر مادری زبان میں فرق ہوتا ہے غیر مادری زبان میں تو اول التفات الفاظ پر ہوتا ہے پھر معانی پر اور مادری زبان میں بالعکس ہے التفات اول معانی پر ہوتا ہے پھر الفاظ کی خصوصیات پر گو خارج میں دونوں مقارن ہیں مگر التفات میں تقدم وتاخر ضرور ہے پس نزلہ علی قلبک میں اس امر کو بتلایا گیا ہے چونکہ قرآن آپ کی مادری زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کا نزول اول آپ کے قلب پر ہوتا ہے یعنی الفاظ پر التفات ہونے سے پہلے قلب کو معانی کا ادراک ہو جاتا ہے واقعی یہ بات بہت عجیب ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ

ترجمہ: اوراس (سحر) کا بھی گو کہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا شہر بابل میں جن کا نام ہاروت ماروت تھا۔

تفسیری نکات

قصہ ہاروت وماروت

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ انہی میں سے ہاروت وماروت زہرہ کا قصہ بھی ہے جس کو آج کل بھی بہت لوگ صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے یہ غضب کیا ہے کہ اس قصہ کو تفسیروں میں ٹھونس دیا ہے مگر محدثین نقاد نے اس کو موضوع کہا ہے وہ قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں بنی آدم کے اندر معاصی کی کثرت ہوئی تو فرشتوں نے طعن کیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو خلیفۃ اللہ بنائے گئے ہیں کہ گناہ کرا کے خداتعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں اور ہم خدا کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے ہم تو ہمیشہ اس کی اطاعت ہی کرتے ہیں خداتعالیٰ نے فرمایا کہ انسان میں جو شہوت کا مادہ رکھا گیا ہے اگر وہ تمہارے اندر پیدا کر دیا جائے تو تم بھی گناہ کرنے لگو گے۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم ہرگز گناہ نہ کریں گے بلکہ اس وقت بھی ہم اطاعت ہی کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو جو سب سے زیادہ عبادت گزار ہوں چنانچہ ہاروت وماروت کو منتخب کیا گیا۔ خداتعالیٰ نے ان دونوں میں شہوت کا مادہ رکھ دیا اور زمین پر ان کو اتارا اور حکم دیا کہ انسان کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' نہ شراب پینا اور نہ زنا کرنا نہ کسی آدمی کو ناحق قتل کرنا چنانچہ وہ دن بھر مقدمات کا فیصلہ کرتے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے۔

اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا ایک دن ان کے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا جو کہ نہایت ہی حسین وجمیل تھی یہ دونوں ان پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے موافق فیصلہ کر دیا پھر اس سے اپنی خواہش ظاہر کی اس نے کہا ایک شرط سے میں راضی ہو سکتی ہوں یا تم شراب پیو یا میرے شوہر کو قتل کر دو یا بت کو سجدہ بھی کرو جو تمہارے سامنے ہے یا مجھ کو وہ اسم اعظم بتلا دو جس سے تم آسمان پر جاتے ہو۔ اول تو انہوں نے انکار کیا مگر پھر نہ رہا گیا تو انہوں نے شراب پینے کو منظور کیا اور یہ سمجھا کہ یہ سب سے سہل گناہ ہے اس سے توبہ کر لیں گے۔

چنانچہ شراب پی کر اس سے زنا کیا اور اسی مدہوشی کی حالت میں شوہر کو بھی قتل کر دیا اور بت کو سجدہ کیا اور بے خبری کی حالت میں اس عورت کو اسم اعظم بھی بتلا دیا وہ عورت تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی۔ خداتعالیٰ نے اسے ستارہ کی صورت میں مسخ کر دیا۔ چنانچہ زہرہ ستارہ وہی ہے۔

یہ دونوں فرشتے جب مستی سے ہوش میں آئے تو بڑے پریشان ہوئے شام کو آسمان پر جانے لگے تو ان کو روک دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ یا تو دنیا کا عذاب اختیار کرو یا آخرت کا۔ انہوں نے دنیا کو عذاب سمجھ کر اختیار کر لیا۔ چنانچہ وہ

دونوں بابل کے کنویں میں اوندھے منہ لٹکے ہوئے ہیں جہاں ان کو عذاب ہو رہا ہے اور یہ دونوں فرشتے سحر بھی تعلیم کرتے ہیں جس کی تعلیم کا ان کو حکم ہوا تھا۔ یہ سحر انہیں سے منقول چلا آتا ہے۔

اس قصہ کو سن کر وہ شخص جس کو حدیث سے ذرا بھی مس ہے فوراً موضوع کہے گا اس کا طرز بتلا رہا ہے کہ یہ رسول ﷺ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اسرائیلیات میں سے ہے دوسرے شرعی حیثیت سے اس میں بہت سے اشکالات ہیں۔

ایک اشکال تو یہی ہے کہ فرشتے خدا تعالیٰ کے سامنے اس طرح گفتگو نہیں کر سکتے کہ حق تعالیٰ تو یہ فرمائیں کہ اگر تم میں شہوت پیدا کر دی جائے تو تم بھی انسانوں کی طرح گناہ کرنے لگو گے اور وہ خدا تعالیٰ کی بات کو رد کر دیں گے کہ نہیں ہم اس حال میں بھی گناہ نہیں کر سکتے فرشتے ہرگز خدا کی بات کو رد نہیں کر سکتے۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس زنا کی وجہ سے یہ فرشتے معذب ہوئے وہ عورت کیوں نہ معذب ہوئی وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر کیوں کر چلی گئی اور ایسی مقرب کیوں کر ہو گئی۔

اور بہت سے اشکالات ہیں جن کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں مگر بعض مفسرین نے تفاسیر میں اس واقعہ کو لکھ دیا ہے اس لئے بہت لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں اسی لئے ہر کتاب دیکھنے کے قابل نہیں ہوتی کسی عالم کو تجویز کرو۔ اس کو کتاب دکھلاؤ کہ جب وہ کہہ دے کہ یہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد مطالعہ کرنا چاہیے اس سے میرا یہ مطلب نہیں جن کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے وہ معتبر کتابیں نہیں ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ہر معتبر کتاب کا ہر جز و معتبر نہیں ہوتا یہ ممکن ہے کہ ایک کتاب معتبر ہو لیکن اس میں کوئی بات غیر معتبر بھی ہو۔ ایک دو مضمون کے غیر معتبر ہونے سے ساری کتاب کو غیر معتبر نہیں کہہ سکتے لیکن اس کا امتیاز عالم محقق ہی کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں کون سی بات غیر معتبر ہے۔ غرض یہ قصہ محض غیر معتبر ہے۔

حقیقت قصہ ہاروت و ماروت

صرف ہاروت و ماروت کے قصہ کی مختصر حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا میں بالخصوص بابل میں جادو کا بہت چرچا ہو گیا تھا حتیٰ کہ اس کے عجیب آثار دیکھ کر جہلاء کو انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں اور سحر میں اشتباہ ہونے لگا کیونکہ سحر سے بھی بعض باتیں خرق عادت کے طور پر ظاہر ہو سکتی ہیں حالانکہ سحر اور معجزہ میں کھلا فرق ہے۔

ایک فرق تو یہی ہے کہ سحر میں اسباب طبعیہ کو خفیہ دخل ہوتا ہے اور زیادہ تر اس کا مدار تخیل پر ہوتا ہے بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسباب طبعیہ کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا محض حق تعالیٰ کے حکم کے بدوں اسباب کے خلاف عادت امور ظاہر ہو جاتے ہیں۔

دوسرے صاحب معجزہ کے اخلاق و عادات و اطوار و اعمال میں اور ساحر کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ نبی کی صحبت سے خدا تعالیٰ کی محبت و معرفت اور آخرت کی رغبت دنیا سے نفرت پیدا ہوتی ہے ان کے پاس بیٹھنے سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے اور ساحر کی صحبت میں اس کے خلاف اثر ہوتا ہے لیکن اس فرق کو وہی دریافت کر سکتا ہے جس کی طبیعت سلیم ہو عقل صحیح ہو عوام اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے تو نبوت کی دلیل معجزہ ہوتا ہے اور ظاہر میں معجزہ اور سحر دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس اشتباہ کو دور کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نام کے نازل کئے تاکہ وہ لوگوں کو سحر کی حقیقت پر مطلع کر دیں کہ اس میں فلاں فلاں اسباب کو دخل ہے اس لئے یہ منجاب اللہ ساحر

کی مقبولیت کی دلیل نہیں ان اسباب کے ذریعہ سے ہر شخص وہ کام کرسکتا ہے جو ساحر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ سحر تو حرام و کفر ہے۔اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل کئے گئے۔اس کا جواب یہ ہے کہ سحر پر عمل کرنا حرام اور کفر ہے باقی اس کا جاننا اور بضرورت شرعی سیکھنا جب کہ اس پر عمل مطلق نہ ہو حرام نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے لیکن اس کے گوشت کی خاصیت معلوم کر لینا اس کو بیان کر دینا یہ حرام نہیں کیونکہ خاصیت جاننے اور بتلانے کو گوشت کھانا نہیں کہہ سکتے۔اسی طرح شراب پینا حرام ہے لیکن اگر طبی کتاب میں شراب کی خاصیتیں لکھی ہوئی ہوں تو ان کو پڑھنا اور پڑھانا حرام نہیں کیونکہ اس کو شراب پینا نہیں کہہ سکتے۔اس طرح کلمات کفریہ کا عمداً زبان سے نکالنا کفر ہے لیکن اگر کوئی شخص کلمات کفریہ سے بچنے کے لئے ان کو جاننا چاہے کہ کن کلمات سے ایمان جاتا رہتا ہے تاکہ میں ان سے بچتا رہوں یہ کفر نہیں بلکہ جائز ہے۔

چنانچہ فقہانے کتابوں میں کلمات کفر کے لئے مستقل باب منعقد کیا ہے جس میں ایسی باتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ان کے جاننے اور پڑھنے کو کوئی حرام نہیں کہتا کیونکہ نقل کفر کفر نہیں اسی طرح فلسفہ کے مسائل بہت سے کفر میں داخل ہیں لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کے مسائل بہت سے کفر میں داخل ہیں لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ میں اس کا رد بھی کر دیا جاتا ہے۔

جس سے مقصود صرف یہی ہے فلسفہ کی حقیقت اور اس کا بطلان معلوم کر لینے کے بعد کوئی شخص ان کے دلائل سے متاثر نہ ہو اور ضرورت کے وقت ان کے دلائل کا جواب دے سکے پس یہ اشتباہ جاتا رہا کہ تعلیم سحر کا اہتمام کیوں کیا گیا۔

رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل ہوئے انبیاء علیہم السلام سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہدایت محضہ کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور تعلیم سحر میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کو سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول و مبتلا ہو جائے تو اس طرح انبیاء علیہم السلام ضلالت و گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو ان کی شان ہدایت محضہ کے منافی ہے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو ضلالت کے سبب بعید بنانا بھی گوارا نہیں کیا۔بخلاف فرشتوں کے کہ ان سے تشریع اور تکوین دونوں قسم کے کام لئے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش کرتے ہیں اس طرح کفار کی بھی کرتے ہیں۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۭ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: اور ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں ہیں اور ضرور یہ یہودی بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو اختیار کرے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بیشک بری چیز ہے سحر و کفر جس میں یہ جان دے رہے ہیں کاش ان کو اتنی عقل ہوتی۔

تفسیری نکات

علوم نافعہ

اس آیت میں ایک نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو معلوم ہے کہ جو شخص علم مضر کو اختیار کرے۔ آخرت میں اس کے لئے (اس علم کی وجہ سے) کچھ حصہ نہیں آگے فرماتے ہیں۔ لو کانوا یعلمون۔ کاش وہ جاننے والے ہوتے اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ جانتے تھے تو پھر اس کا کیا مطلب کہ کاش وہ جانتے ہوتے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ بمنزلہ جہل کے ہے اس لئے یہودیوں کا وہ جاننا تو نہ جاننے کے برابر ہو گیا۔ اب آئندہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ کاش اب بھی جان لیں یعنی اپنے علم پر عمل کرنے لگیں۔

اور یہاں سے میں ایک اور غلطی پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ علوم نافعہ وہ ہیں جو آخرت میں کام آئیں مطلق علوم مراد نہیں اب آج کل بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ علم کی فضیلت میں آیات واحادیث لکھتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ شریعت میں علم حاصل کرنے کی بہت تاکید ہے اور اس کے بعد ان تمام فضائل کو انگریزی تعلیم پر چسپاں کرتے ہیں اس تمام تمہید کے بعد وہ انگریزی پڑھنے کی ضرورت ثابت کرتے اور اس کی ترغیب دیتے ہیں جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گویا انگریزی پڑھنے سے یہ تمام فضائل حاصل ہو جائیں گے۔

ویتعلمون ما یضرّهم ولا ینفعهم

یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

مضرو نافع علوم

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب بعض علوم مضر ہیں تو کوئی نافع بھی ضرور ہے تو اس سے دو حکم معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ علم مضر سے بچنا چاہیے دوسرے یہ کہ علوم نافعہ کو سیکھنا چاہیے رہا یہ کہ مضر کون ہے اور نافع کون ہے اس کی تعیین خود اسی آیت میں موجود ہے۔

ولقد علمو المن اشتراه ماله فی الاخرة من خلاق

اس سے معلوم ہوا کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آوے تو اس کے مقابلہ میں نافع وہ ہوا جو آخرت میں کام آوے اور ان دونوں کے مجموعہ سے دو غلطیاں معلوم ہوئیں۔ ایک علماء کی ایک عوام کی۔ علماء کی غلطی تو یہ ہے کہ ان میں سے بعضے ساری عمر علوم غیر نافع ہی میں صرف کر دیتے ہیں یعنی صرف معقول ہی پڑھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معقول آخرت میں کام آنے والی نہیں البتہ اگر علم دین کے ساتھ معقول کو اس غرض سے پڑھا جاوے کہ اس سے فہم واستدلال میں سہولت ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جو نحو صرف بلاغت وغیرہ کا حکم ہے کہ یہ سب علوم الٰہیہ ہیں۔ اگر ان سے علم دین میں مدد مل جائے تو تبعاً ان سے بھی ثواب مل جاتا ہے لیکن ساری عمر علوم الٰہیہ ہی میں گنوانا یہ سراسر حماقت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ساری عمر ہتھیار کی درستی اور صفائی میں گزار دے اور ان سے کام ایک دن بھی نہ لے تو ہر شخص اس کو بیوقوف بتلائے گا۔

اور بعضے صرف معقول تو نہیں پڑھتے مگر علوم دینیہ پر اس کی تقدیم کرتے ہیں یہ بھی غلطی ہے۔اس میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اگر اس حالت میں موت آ گئی تو معقولیوں ہی میں اس کا حشر ہوگا۔ دوسرا ضرر یہ ہے کہ اس شخص کی عقل پر معقول رچ جاتی ہے۔ پھر یہ حدیث وقرآن کو معقول ہی کے طرز پر سمجھنا چاہتا ہے اور ہر جگہ اس کو چلاتا ہے اس لئے حدیث وقرآن کا اثر اسکی طبیعت پر نہیں جمتا۔

گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کے پاس ایک معقولی طالب علم حدیث پڑھنے آئے۔ایک دن سبق میں یہ حدیث آئی لایقبل الله صلوة بغیر طهور ولا صدقة من غلول یعنی نماز بدوں طہارت (اور وضو) کے قبول نہیں ہوتی الخ۔ مولانا نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بغیر نماز فاسد ہے معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ اس سے تو قبول نہ ہونا معلوم ہوتا ہے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بغیر وضو کے نماز صحیح نہیں ہوتی ممکن ہے کہ صحت تو بدوں وضو کے بھی ہو جاتی ہو لیکن قبول بدوں وضو کے نہ ہو اس پر سب کو ہنسی آ گئی سو معقول پہلے پڑھنے کا یہ ضرر ہوتا ہے کہ حدیث کا ذوق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ (الصمیمہ التعلیم ملحقہ مواعظ عمل وعمل)

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: معاف کرو اور درگزر کرو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق) اپنا حکم (قانون جدید) بھیجیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیری نکات

تہذیب نفس ابتداء میں کامل نہیں ہوتی

فرمایا کہ امام غزالی نے کہیں لکھا ہے کہ مبتدی سلوک کو وعظ وغیرہ نہ کہنا چاہیے کیونکہ تہذیب نفس ابتدا میں کامل نہیں ہوتی احتمال نفس کے خراب ہو جانے کا ہوتا ہے جب شہرت وعجب وغیرہ سے اس رائے کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ کیونکہ یہ آیت ممانعت قتال بالکفار مکہ میں نازل ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک مخاطبین تازہ اسلام لائے تھے۔ تہذیب نفس کامل طور پر نہیں ہوئی تھی احتمال تھا کہ شاید قتال میں نفس کا شائبہ ہو جائے اور یہ وجہ نہ تھی کہ اسوقت تک صحابہ کا عدد کم تھا کیونکہ مسلمانوں کو قلت عدد سے کبھی رکاوٹ نہیں ہوئی آخر ساٹھ آدمی ساٹھ ہزار سے لڑے اور مظفر ومنصور ہوئے اور جب مدینے میں آئے تو چونکہ اکثر کو تہذیب نفس کی کامل ہو چکی اور اقل تابع ہوتے ہیں اکثر کے اس لئے اجازت قتال دے دی گئی اور یہ آیت نازل ہوئی۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: وہاں جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ مغموم ہونے والے ہیں۔

تفسیری نکات

ہماری فلاح کا مدار

یہ ایک آیت ہے کہ جس کے اول میں رد ہے بعض مدعین کے ایک غلط دعوے کا اور بعد میں دلیل رد کے مقام پر ایک قاعدہ کلیہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے ایک نہایت ضروری مضمون ذکر فرمایا ہے جو جامع ہے تمام مشرب ومسلک حق کا' عرصہ سے ہم لوگوں کی تمام حالتیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں جس کے اسباب مختلف عنوانوں سے بیان کئے جاتے ہیں مگر حقیقت میں اس تباہی و بربادی کا اصلی سبب اس قاعدہ کلیہ کا چھوڑ دینا ہے اس آیت میں اسی کا ذکر ہے ہر چند کے رد اور قاعدہ کلیہ دونوں میں یہاں زیادہ محط فائدہ رد ہے مگر وہ قاعدہ کلیہ جو کہ رد کے لئے بھی کافی ہے اور نیز ہماری حالتوں کی اصلاح بھی اس سے وابستہ ہے چونکہ وہ متضمن (ضمن میں لینے والا) فائدہ کو ہے اس لئے اس وقت بیان میں وہ ہی زیادہ مقصود ہے اور وہ قاعدہ کلیہ کہ جس پر مدار ہے ہماری فلاح کا اور جس سے غافل رہنے کی وجہ سے ہماری خرابی اور تباہی بڑھتی جاتی ہے اور نہایت ضروری ہے وہ تعبیر میں تو بہت چھوٹی سی بات ہے مگر حقیقت میں بڑی بات ہے اور اس امر ضروری کا نام جس کا تکفل (ذمہ داری) اس قاعدہ نے کیا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنا ہے اب ان لفظوں کی حقیقت پر جب تک زیادہ غور نہ کیا جاوے یہ سمجھ میں نہ آوے گا کہ ہم نے اس قاعدہ کو چھوڑ رکھا ہے اس واسطے کہ ہر شخص یہی جانتا ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے مگر یہ امور غور طلب ہے کہ آیا آپ کو خدا سے تعلق ہے یا خدا کو آپ سے تعلق ہے پس یہ ہے سمجھ لینے کی بات سو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خدا کو ہم سے تعلق ہے اور ہمیں خدا سے تعلق نہیں ہے اور اس نے باوجود یہ کہ اس کے ذمہ واجب نہیں لازم نہیں مگر اتنے حقوق ادا کئے ہیں کہ ہم ان کا شمار و اندازہ بھی نہیں کر سکتے یہ محض تعلق اور رحمت ہے ورنہ ہمارا کیا حق اور کیا لزوم اہل سنت نے اس مسئلہ کی حقیقت کو خوب سمجھ لیا ہے کہ ہمارا کوئی حق خدا پر واجب نہیں جو کچھ وہ عطا فرمائے محض رحمت اور خالص عنایت ہے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (البقرہ ۱۱۲)

غلط دعویٰ پر رد

اور اگر فکر ہے تو سنو حق تعالیٰ اسی کا طریق بتلاتے ہیں بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ

عِنْدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ بلیٰ میں رد ہے اہل باطل کے ایک غلط دعویٰ کا کہ جس کے متعلق رد سے پہلے ارشاد ہے تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ یہ ان کی آرزوئیں ہیں دعویٰ یہ تھا کہ ہم ہی جنت میں جاویں گے پہلے اس کو اس طرح رد فرمایا تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ یہ ان کی آرزوئیں کہ بجز ان کے اور لوگ جنت میں نہیں جاویں گے آگے ارشاد ہوا بلیٰ یعنی کیوں نہیں جاویں گے پھر اس کی دلیل قاعدہ کلیہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ الخ جو شخص سپرد کردے اپنی وجہ یعنی ذات کو خداوند تعالیٰ کے لئے اس حال میں وہ محسن ہو ان کا اجر اللہ کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے یہ ترجمہ ہوا۔

یہاں پر حق تعالیٰ نے اس عمل منجی کو اسلام سے تعبیر فرمایا اس کی تفصیل سمجھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ وہ کیا چیز ہے سو ہمارے روشن خیال حضرات کے نزدیک اس کی حقیقت ایسی چیز ہے کہ نہ اس میں کچھ مامورات ہیں نہ منہیات ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو کسی منہی عنہ سے منع کرو تو کہتے ہیں کیا اس سے ایمان جاتا رہا مولویوں نے خواہ مخواہ تنگی کردی ہے جی اسلام بہت وسیع چیز ہے وہاں ایسے ایسے افعال کا کیا اثر بس لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو گئے اور اسلام کامل ہو گیا نہ کسی فعل سے اس میں نقصان آتا ہے نہ کسی عقیدہ سے اس میں خلل آتا ہے اس کے لئے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے۔ من قال لا الٰہ الا اللہ فقد دخل الجنة (جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا یقیناً وہ جنت میں داخل ہوگا) سبحان اللہ اچھا ست نکالا کہ لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا بس کافی ہے اب اور اعمال کی کیا ضرورت بے شک حدیث صحیح ہے مگر جو مطلب آپ سمجھے وہ اس کا مطلب ہی نہیں اس کا مطلب ایک دیہاتی مثال میں سمجھئے ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرلے قاضی پوچھے تم نے قبول کی وہ کہے قبول کی لیجئے نکاح ہو گیا یہ میاں یوں سمجھے کہ عورت ہاتھ آئی خوب چین کریں گے یہ خبر نہ تھی کہ تھوڑے دنوں میں لدنا پڑے گا جس کی حقیقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی کے پوچھنے پر خوب بیان فرمائی۔ سرور شہر ایک مہینہ کی خوشی پھر پوچھا ثم ماذا یعنی پھر کیا ہوا فرمایا لزوم مہر یعنی مہر لازم آجاتا ہے پوچھا ثم ماذا پھر کیا فرمایا غموم دھر یعنی تمام زمانہ کے رنج و غم پھر پوچھا ماذا (پھر کیا) فرمایا کسور ظہر یعنی کمر ٹوٹ جاتی ہے غرض میاں ایک ماہ نوشہ ہے خوب عزت رہی دعوتیں ہوئیں اس کے بعد ماں باپ نے الگ کردیا اب گھر کیلئے بیٹھے اب وہ غموم دھر میں مبتلا ہوئے الگ ہوتے وقت ماں باپ نے ایک ماہ کا غلہ وغیرہ دے دیا تھا مہینہ بھر تک وہ کھاتے رہے جب ختم ہو گیا اب بیوی نے کہنا شروع کیا کہ غلہ لاؤ گھی لاؤ کپڑا لاؤ وغیرہ وغیرہ یہ لاؤ وہ لاؤ تو آپ کہتے ہیں بی بی تو پاگل ہو گئی ہے کیسی لکڑی کیسا کپڑا کیسا گھی میں نے ان چیزوں کی کہاں ذمہ داری کی ہے اس نے کہا آخر تم نے ایجاب قاضی پر کہا نہ تھا کہ میں نے قبول کی وہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ میں نے غلہ وغیرہ بھی قبول کیا میں نے تو فقط تجھے قبول کیا تھا نہ میں نے آٹا قبول کیا نہ لکڑی قبول کی غرض جھگڑا اس قدر بڑھا کہ محلے کے عقلاء فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے ان میں آپ بھی ہوں اب آپ بتائیے کہ کیا فیصلہ کیا جائے کہ روٹی کپڑا سب اس سے دلائیں گے اور کہیں گے کہ ارے احمق بیوی کا قبول کرنا اس کی تمام ضروریات کا قبول کرلینا ہے اس کے لئے کسی مستقل معاہدہ کی ضرورت نہیں۔

بس لا الہ الا اللہ کے بھی یہی معنی ہیں اب ذرا سنبھل کر کہے گا بس اسی مختصر کلمہ نے تو باتوں کو لے لیا لہٰذا جب وضع خلاف شرع ہوگئی تو ایک جزو لاالہ الا اللہ کا چھوٹا تو مولوی اہل محلہ کے مثل ہیں اور یہ اسی نادان کے مثل ہے جو کہتا ہے کہ میں نے لاالہ الا اللہ کہا تھا یہ کہاں کا جھگڑا نکالا کہ وضع خلاف شرع نہ رکھو داڑھی مت منڈاؤ یا مت کٹاؤ مونچھیں مت بڑھاؤ نماز پڑھو روزہ رکھو۔ حاصل یہ کہ سپرد کر دینے کے بعد پھر رائے نہیں دی جایا کرتی جس طرح مقدمہ وکیل کے سپرد کر دینے کے بعد کوئی رائے نہیں دیتا اسی کو فرماتے ہیں اسلم وجھہ (جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا) باقی ذات کو 'وجہ' سے کیوں تعبیر کیا۔

'وجہ' کہتے ہیں منہ کو عموماً مفسرین نے تو لکھا ہے کہ یہاں تسمیۃ الکل باسم الجزء ہے یعنی جز بول کر کل مراد لیا ہے اور وجہ تخصیص یہ کہ 'وجہ' تمام اعضاء میں اشرف تھا جب اشرف کو سپرد کر دیا تو کل کو سپرد کر دیا مگر ایک اس سے زیادہ بات لطیف ہے وہ یہ کہ پہچان چہرہ سے ہوتی ہے تو گویا تشخص میں زیادہ دخل چہرہ کو ہے پس وجہ سے تعبیر کرنا ذوات مشخصہ کو نہایت برمحل ہے یہ تو پرانے طالب علموں کے کام کی بات تھی۔

ایک بات نو تعلیم یافتہ لوگوں کے کام کی بھی سمجھ میں آئی کہ آج کل جو رائے دی جاتی ہے اس کی قوت ودماغ کے اندر ہے اور وجہ کو دماغ سے خاص تلبس ہے گویا دونوں متلازم ہیں پس وجہ کو سپرد کرنا گویا دماغ کو سپرد کرنا ہے اور دماغ کے سپرد کرنے کے بعد جب دماغ ہی آپ کا نہ رہا تو رائے اور خیال آپ کا کہاں سے آیا تو یہ تعبیر مشیر ہے خود رائی کے قطع کر دینے کی طرف۔

اگر کوئی کہے کہ کیا دماغ سے کام نہ لیں اسلام کے احکام تو سب دماغ ہی کے متعلق ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مقدمہ کسی بیرسٹر کے سپرد کر دو تو اگر وہ گواہوں کی شناخت کے واسطے کہے تو کیا اس کو یہ جواب دو گے کہ ہم نے تو آپ کے سپرد کر دیا' جس چیز کو سپرد کر دیا ہے اس میں اپنی رائے کا دخل مت دو باقی جتنے میں وہ خود دخل دینے کو کہے اس میں دخل دو پس اسی طرح یہاں بھی دماغ سے اتنا کام لو جتنا حکم ہے۔

اور یہ توجیہیں تو جب ہیں کہ 'وجہ' کو ظاہری وجہ پر رکھا جائے اور اگر 'وجہ' کہ وجہ باطن پر محمول کیا جائے تو یہاں پر 'وجہ' کے معنی قلب کے ہوں گے جیسے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ (میں اپنے قلب کو اسی ذات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا) میں کہا گیا ہے کہ یہاں وجہ سے مراد چہرہ نہیں ہے کیونکہ اس کو خدا کی طرف کرنے کے کیا معنی بلکہ یہاں مراد قلب ہے کہ میں نے پھیر دیا رخ قلب اپنا خدا کی طرف جس نے مجھے پیدا کیا تو یہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ کا بطن اور باطن تھا خلاصہ مجموعہ توجیہین کا یہ ہوا کہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کر دیا۔ اب سمجھئے کہ کبھی سپرد کرنا غرض کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی خوف سے اور کبھی محبت سے محققین کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی نے غرض کی وجہ سے سپرد کیا کہ کام خوب نکلیں گے تو یہ شرک خفی ہے کہ کام بنانے کے لئے اطاعت کرتا ہے خدا کے لئے نہیں کرتا پس یہ تسلیم اس لئے کرو کہ اس کا حق ہے اس لئے وھو محسن بھی فرمایا کہ سپرد کرنے میں اخلاص ہو اپنی کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ

اسلام جب ہی مقبول ہے کہ اس میں ریا نہ ہو کیونکہ یہ خلاف اخلاص ہے اس تفسیر کے بعد معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسلام مطلوب کی یہی حقیقت ہے کہ خالصتاً اللہ کے ہو جاؤ۔

بلاغت قرآن مجید

اس کے بعد وعدہ ہے کہ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے پروردگار کے نزدیک فلہ اجرہ پر کفایت نہیں بلکہ عِنْدَ رَبِّهٖ بھی بڑھایا اس میں بڑا راز ہے ایک تو کسی مزدور سے کہتے کہ کام کرو ہم تمہیں کھانا کھلائیں گے اور ایک یہ کہ اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلائیں گے اور وہ مزدور عاشق بھی ہو تو کس قدر شوق سے کام کرے گا اور کھانے سے کس قدر مسرور ہو گا عندربہ اس لئے بڑھایا ہے۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چوماہ جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں فوق گردوں است نے قعر زمیں

(جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب ہو خوش وخرم بیٹھ وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند تر ہے نہ پست زمین)

سبحان اللہ کیا قرآن کی بلاغت ہے بس یہ شعر صادق آتا ہے

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت رابوار باب معنی را

(اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے) یعنی دو مذاق کے لوگ ہیں ایک تو روٹی کھانے والے جیسے ہم ہیں ان کو فلہ اجرہ سے خوش کر دیا کہ گھبراؤ نہیں روٹیاں مل جائیں گی ایک وہ ہیں جو دیدار کے مشتاق ہیں ان کے واسطے عند ربہ فرمایا کہ دعوت ہو گی اور ہمارے پاس ہو گی اور یہ سب انعام ہوا انعام کا کمال یہ ہے کہ منفعت عطا ہو اور مضرت سے بچایا جاوے منفعت کا ذکر تو ہو چکا آگے مضرت سے بچانے کا وعدہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ان پر کوئی خوف نہیں کوئی قید نہیں لگائی کہ کہاں خوف نہیں گو بعض جگہ سے آخرت کی قید معلوم ہوتی ہے کہ آخرت میں کوئی خوف نہیں لیکن یہاں کا اطلاق اگر بحالہ رکھا جاوے تو دنیا و آخرت دونوں کو عام رہے گا رہا یہ کہ دوسری آیات میں یخافون سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خوف ہے سو محققین نے جواب دیا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ فرمایا لاخوف بھم یالھم نہیں فرمایا یعنی ان پر خوف کی چیز واقع نہ ہو گی گو خود وہ خوف کیا کریں اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ غمگین ہوں گے خوف آئندہ کا اندیشہ ہے اور حزن واقعہ ماضیہ کے متعلق ہوتا ہے تو حاصل یہ ہوا کہ نہ تو مستقبل میں کسی مضرت کا احتمال ہے نہ کسی ماضی کی فوت سے ان پر حزن ہے کہ ہائے یہ نہ ہوا ہائے وہ نہ ہوا دنیا میں نہ آخرت میں خلاصہ یہ کہ ہر قسم کی مضرتوں سے محفوظ ہوں گے یہ اسلام پر انعام ہوا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۚ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

ترجمہ: اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر اور عبادت کئے جانے سے روکے اور ان کے ویران اور معطل ہونے میں کوشش کرے ان لوگوں کو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم نہ رکھنا چاہیے تھا بلکہ جب جاتے ہیبت اور ادب سے جاتے ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں سزائے عظیم ہوگی۔

تفسیری نکات

ویرانی مساجد کا مفہوم

شان نزول میں گو اختلاف ہو مگر قدر مشترک اتنا ضرور شامل ہے تعطل مساجد کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم کو جیسا آگے آتا ہے اور جملہ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ الخ (ان لوگوں کو بے ہیبت ہو کر ان میں قدم نہ رکھنا چاہیے تھا) گویا بطور دلیل کے ہے ماقبل کے لئے گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کو چاہیے تھا کہ خود بھی جب مساجد میں داخل ہوتے خاشع وخاضع ہو کر داخل ہوتے' دوسرے آنے والوں کو جو ذاکرین مخلصین ہیں ان کو بھی روکتے ہیں کیونکہ یہ بے خوف ہونے کی اور بھی زیادہ علامت ہے اس لئے ایسا شخص بہت زیادہ ظالم ہوگا یہاں پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ آیت تو کفار کے حق میں ہے اس کا مخاطب مسلمانوں کو کیوں بنایا جاتا ہے تو اس کا جواب بطور اصولیین کے یہ ہوسکتا ہے کہ العبرہ لعموم اللفظ الالخصوص المورد (اعتبار لفظ کا ہے نہ کہ مورد کا) اور اس کی نظیر شرعی لعان وحد زنا ہے اور تمثیل جیسے اگر کوئی محسن اپنے کسی نوکر کو کسی بات پر سزا دے اور کہے نہ جو ایسی حرکت کرے گا اس کو ایسی سزا ہوگی تو اس کے کہنے کا سبب اس وقت یہ خاص نوکر ہے مگر چونکہ الفاظ عام اس لئے دوسرے نوکر بھی اپنے لئے اس کو عبرت سمجھتے ہیں اور وہ کام نہیں کرتے میرے نزدیک یہ قاعدہ اصولیہ کہ العبرۃ لعموم اللفظ الخ (اعتبار عموم لفظ کا ہے عموم کے ساتھ مقید ہے جہاں تک مراد متکلم کی ہو اس کے آگے تجاوز کر کے ہر عموم کو شامل نہیں ہوسکتا اس کی نظیر حدیث لیس من البر الصیام فی السفر (سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے) کو باوجود (لفظ کے عموم کے چونکہ مطیق کو عام ہونا مراد متکلم کی نہیں ہے ہر مسافر کو شامل نہیں بلکہ صرف اسی کو جس کو خوف ہلاک واز دیاد مرض ہو دوسری نظیر یہ کہ اگر آج کل کوئی شخص کسی عالم سے رہن کا مسئلہ پوچھے تو وہ عالم بوجہ اطلاع عرف متعارف کے حکم منع ہی کا دے گا کیونکہ عرف رھن مع الانتفاع ہے اس لئے مراد یہی رہن خاص ہوگا گو فتوے کا لفظ ہوگا کہ رہن جائز نہیں۔

پس محض کسی لفظ کا عام ہونا دلیل ہر عموم کی نہیں ہے تاوقتیکہ قرائن مستقلہ سے اس عموم کا مراد ہونا ثابت نہ ہو جائے۔
حاصل یہ آیت میں لفظا تعمیم نہیں مسلم وغیر مسلم کو بلکہ آیت تو کفار ہی کے حق میں ہے جو منع خاص یہاں مراد ہے ایسا منع مخصوص ہے کفار سے مگر مسلمان کو یہ اس طرح سے شامل ہے وہ یہ کہ منع کے بعد سَعٰی فِیْ خَرَابِھَا (ان کی ویرانی میں کوشش ہے فرمانا بطور تعلیل کے ہے اور خراب مقابل عمارت کا ہے اور عمارت مسجد کی صلوۃ سے ہے بس خراب یعنی ویرانی ایسے امر سے ہوگی جو منافی ہو ذکر وصلوۃ کے پس اگر مسلم سے مسجد میں کوئی فعل خلاف ذکر وصلوۃ ہو تو وہ بھی اس ملامت میں شریک ہوگا بوجہ اشتراک علت کے رہا یہ قیاس کہ ظنی ہوتا ہے تو ذم یقینی نہیں جواب اس کا یہ ہے کہ قیاس ظنی جب ہوتا ہے کہ اس کی علت بھی ظنی ہو اور اگر منصوص علیہ قطعی ہو جیسا کہ یہاں ہے تو قیاس بھی قطعی ہوگا رہا یہ کہ مسلمان اگر ایسا فعل بھی کرے تو قصد خرابی مسجد کا تو نہ ہوگا جو متبادر ہے سعی سے پھر اس کو کیسے شامل ہوا' جواب یہ ہے کہ اگر سعی خاص ہوتی تو مباشر کے ساتھ تو اس شبہ کی گنجائش تھی غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعی عام ہے مباشر اور سبب کو دلیل اس کی یہ ہے کہ جب رسول ﷺ نے مدینہ میں خواب دیکھا انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہے عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ تشریف لائے اور صحابہ سے آپ نے یہ خواب بیان کیا گو اس میں یہ نہ تھا اس سال ہوگا مگر شدت اشتیاق میں صحابہ نے سفر کی رائے دی اور آپ نے خوش خلقی سے قبول فرمایا تو کفار قریش نے آپ کو دخول مکہ سے روک دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس روکنے کو مسجد کی ویرانی کا سبب قرار دے کر ان کو سَعٰی فِیْ خَرَابِھَا اور ان کی ویرانی میں سعی کریں کا مصداق بنایا حالانکہ کفار مکہ نہ صرف مسجد حرم بلکہ تمام حد حرم کی غایت تعظیم کرتے تھے اور عمارت بھی مگر بایں معنی وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا اور ان کی ویرانی میں کوشش کریں کا مصداق بنایا گیا صرف اس لئے کہ انہوں نے رسول ﷺ وصحابہ کو کہ ذاکرین مخلصین تھے روکا' اس سے اب بدلالۃ النص یہ بات ثابت ہوگی کہ کوئی ایسا کام کرنا مسجد میں جس میں ذکر اللہ سے اس کا تعطل ہو گو علی سبیل التسبب ہی سہی منع مساجد الله وسعٰی فی خرابھا مساجدوں سے روکنا اور ان کی ویرانی میں کوشش کرنا کا مصداق بنا ہے ورنہ کفار نے کوئی قفل نہیں ڈالا تھا اور نہ مسجد کی بے تعظیمی کی تھی اور نہ عمارت میں کوئی خرابی کی تھی ظاہر ہے کہ مسجد میں بلاضرورت دنیا کی باتیں کرنا دنیا کے کام کرنا نہ ذکر ہے نہ ذکر کے متعلق ہے اس لئے بلاشبہ معصیت اور ظلم ہے پھر ان یــذکــر کی تقریب فضیلت ذکر کے متعلق متعدد واقعات بیان کئے گئے اس میں یہ بھی بیان تھا کہ آدمی ذکر تلاوۃ پر عوض دنیوی لیتے ہیں حالانکہ اللہ کا نام ایسا گراں مایہ ہے کہ دونوں عالم بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتے اور یہ شعر پڑھا۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
(تو نے اپنی قیمت دونوں جہاں بتلائی ہے نرخ بڑھاؤ ابھی ارزانی ہے)

تقریب ختم کلام مجید حفاظ کا بعوض مال رمضان میں یا رسوم وغیرہ میں اور قبور پر قرآن پڑھنے کا ممنوع ہونا بیان ہوا اور اہل اللہ دنیا کو تو اللہ کے نام اور رضا سے بڑا کیا سمجھتے آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت تو نعمائے جنت سے بھی افضل ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (رضا الٰہی بہت بڑی چیز ہے) نص صریح ہے اور دین فروشی کے شبہ سے بچنے کے لئے بعض

بزرگ بازار میں نہیں جاتے کہ شاید ان کو دیندار سمجھ کر ان کے دین کی وجہ سے کوئی دوکاندار داموں میں رعایت کرے تو وہ اس قسم کا عوض ہو جائے گا دین کا پس نہ جانا بازار میں دو وجہ سے ہوتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ وہ تو حرام ہے دوسرا اس وجہ سے کہ لوگوں پر ہماری وجاہت سے رعب پڑے گا اور وہ دب کر ارزاں دیں گے جس سے ان کو نقصان ہوگا یہ مستحب بھی ہے اور ضروری ہے اس میں شبہ دین فروشی سے بچنے کے علاوہ رفع التاذی عن الخلق (مخلوق سے اذیت کو ہٹانا)

حاصل یہ ہے کہ مشرکین میں لیاقت مسجد کے آباد کرنے کی نہیں کیونکہ جس چیز سے مسجد کی آبادی ہے جس کا ذکر آیت آئندہ میں ہے وہ ان میں نہیں ہے یعنی وہ تعمیر ذکر اللہ ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے۔ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ الخ (اللہ تعالیٰ کی مساجد کو وہی بناتا ہے جو اللہ پر ایمان لائے الخ) اس آیت میں مقصود اصلی اقام الصلوۃ ہے جس کے لئے مسجد موضوع ہے اور امن بطور شرط کے لایا گیا اور اتی الزکوۃ اقام کی تتمیم ہے یعنی اقامت بمعنی ادائے حقوق صلوۃ موقوف ہے خلوص اور محبت پر اور اس کی ایک علامت انفاق اموال ہے حاصل یہ کہ نرا ذکر زبان سے جیسا کہ نماز میں ہوتا ہے دلیل خلوص قلب کی نہیں مال بھی دینا چاہیے اور زکوۃ وہی دے گا جس کے قلب میں خلوص ہوگا کیونکہ حاکم تو مطالبہ کرنے والا ہی نہیں اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ زمانہ خلفائے راشدین میں تحصیل زکوٰۃ کے لئے عامل مقرر تھے وہ جبراً لیتے ہوں گے پھر اس میں خلوص کہاں رہا جواب یہ ہے کہ عامل صرف مواشی کی زکوٰۃ لیتے تھے اور اموال باطنہ زر و سیم مالکوں کے اختیار میں تھے مواشی کے لئے بھی عامل تحصیل کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض بہ نظر سہولت مصارف تاکہ اصحاب اموال میں دقت نہ ہو اور مال پورے طور پر مستحقین کو مل جائے اور اموال تجارت میں بھی عاشر کی طرف سے کچھ زبردستی نہ تھی بلکہ پوچھا جاتا تھا حولان حول سال گزرا یا نہیں اگر کسی نے کہا نہیں گزرا تو چھوڑ دیا اور اگر اس نے کہا کہ ہم نے زکوٰۃ خود دے دی ہے تب بھی چھوڑ دیا دوسری دلیل اس دعوے کی مسجد کا موضوع لہ ذکر ہے یہ آیت فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (ایسے گھروں میں جا کر عبادت کرتے ہیں جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے) اس میں رفعت معنویہ مراد ہے تیسری دلیل حدیث انما بنیت المساجد لذکر اللہ (مساجد اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بنائی گئی ہیں پس جو کام ذکر کے متعلق نہ ہو وہ مسجد کی ویرانی ہے) منع ہے جیسا بعض کاتب اجرت مسجد میں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں یا درزی کپڑے سینے بیٹھ جاتے ہیں بلکہ فقہا نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص اجرت پر علم دین پڑھاتا ہو اس کو بھی مسجد میں بیٹھ کر پڑھانا منع ہے۔ علی ھذا القیاس مسجد میں قرآن خواں لڑکوں کا پڑھانا جن سے کسی قسم کی اجرت لی جاتی ہے ممنوع ہے البتہ درس دینیات بلا اجرت خود ذکر ہے اس کا کچھ مضائقہ نہیں ایسا ہی معتکف جو ذکر اللہ کی غرض سے مسجد میں آ بیٹھا ہے اس کو بیع و شرا کا معاملہ بلا حضور مبیع بضرورت جائز ہے تاکہ ذکر اللہ سے حرمان نہ رہے ورنہ مشتغلین بالتجارت کا اعتکاف معتبر نہ ہوتا اور یہ شرط عدم حضور مبیع کی اس وقت ہے جب وہ متاع مسجد کی جگہ کو گھیرے ورنہ اگر کوئی مختصر سی چیز ہو تو احضار سلعہ بھی جائز ہے اور بجز معتکف کے دوسرے کو خرید و فروخت کا معاملہ خواہ کیسا ہی چھوٹا ہو مثلاً ریزگاری وغیرہ کا لین دین مسجد میں منع ہے اسی طرح کسی ایسی چیز کا اعلان سے پوچھنا جو مسجد سے کہیں باہر کھوئی گئی ہو منع ہے البتہ اگر مسجد کے

اندر چیز گم ہوگئی تو اس کا پوچھ لینا مضائقہ نہیں اسی طرح اپنی تجارت کے اشتہار مسجد میں تقسیم کرنا ممنوع ہے چوتھی دلیل دعویٰ مذکور کی یہ ہے کہ حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں وارد ہے مساجدھم عامرۃ وھی خراب (مساجد ان کی آباد ہونگی مگر خلوص سے کم ہوں گی) عمارت اور خرابی کا جمع ہونا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظاہری عمارت میں تو بڑی زیب و زینت اور مجمع کی کثرت ہوگی مگر معنوی آبادی یعنی جو خلوص ہے کم ہوگا۔ اس سے بھی وہی بات ثابت ہوئی پانچویں دلیل لوگوں نے رسول علیہ السلام سے دریافت کیا کہ شر البقاع (بری جگہیں) کیا چیز ہے اور خیر البقاع (اچھی جگہیں) کون سی جگہ ہے فرمایا مجھے معلوم نہیں جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا اور یہ کہا کہ دربار خداوندی سے دریافت کر کے جواب دوں گا چنانچہ پوچھنے گئے اس وقت بہ برکت اس مسئلہ کے پوچھنے کے حضور اقدس علیہ السلام کے لئے ان کو اس قدر قرب ہوا کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو بھی اتنا قرب نہیں ہوا یعنی ستر ہزار حجاب درمیان میں رہ گئے غرض دربار خداوندی سے جواب ارشاد ہوا کہ شر البقاع بازار ہے اور خیر البقاع مسجد سو غور کرنا چاہیے کہ دونوں میں مابہ الامتیاز کیا ہے بجز ذکر اللہ و ذکر الدنیا کے پس معلوم ہوا کہ مسجد کا موضوع یہی ذکر اللہ ہے پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو شر البقاع بنانا ہے جو اس کی ویرانی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب سمتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی کیونکہ تم لوگ جس طرف منہ کرو ادھر (ہی) اللہ تعالیٰ کا رخ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ (تمام جہات کو) محیط ہیں کامل العلم ہیں۔

تفسیری نکات

بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے میں حکمت

فرمایا کہ کعبے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا جو حکم ہے اس میں یہی مصلحت ہے کہ تفریق کلمہ نہ ہو اور شریعت کے تمام کام انتظام سے انجام پائیں ورنہ اگر آیت فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ سے ہر شخص جس طرف چاہے نماز پڑھ لیا کرے تو اس مطلق العنانی سے جماعت کا کام انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔

علم کلام کی ضرورت

فثم وجه الله-یداه مبسوطتان- علی العرش استویٰ-والسمٰوٰتُ مطویت بیمینه (یعنی کسی جگہ کہا گیا ہے کہ جدھر تم منہ کرو خدا کا رخ ادھر ہی ہے کہیں فرمایا کہ خدا کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں کہیں فرمایا ہے کہ خدا عرش پر مستوی ہے کہیں فرمایا کہ آسمان خدا کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔

تو اس پر بعض جاہلوں کو یہ شبہ ہوگا کہ خدا کے بھی ہماری طرح منہ اور ہاتھ اور پیر ہیں مگر علم کلام کے دلائل سے معلوم ہو گا خدا تعالیٰ جوارح اور مکان وزبان سے پاک ہے اس کے لئے ان چیزوں کا ثابت ہونا حقیقۃً ممکن نہیں ہاں مجازاً کوئی دوسرے معنی مراد لئے جاویں تو ممکن ہے چنانچہ علماء نے ان آیات کے معانی خدا کی شان کے لائق بیان بھی کئے ہیں اور سلف کا طرز اس بارہ میں سکوت ہے تو علم کلام سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے لئے کس صفت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور کن کن باتوں سے اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت کرتے رہے جس طرح کہ تلاوت کا حق ہے ایسے لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو شخص نہ مانے گا خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے۔

تفسیری نکات

تلاوت کرنے والوں کی مدح

اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے اس آیت میں ہر چند کتاب سے مراد توریت ہے مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے اور چونکہ قرآن افضل کتب ہے تو اس کی تلاوت زیادہ قابل مدح ہوگی اور اسی آیت سے اس کی فضیلت بطریق اولیٰ ثابت ہو گئی اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے اب آیت میں فرماتے ہیں کہ تم ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ترکیبا تو اخبار ہے مگر مقصد انشاء ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ حقوق ادا کریں۔

حقوق تلاوت

جب تلاوت کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں باطنی اور ظاہری قربان جایئے تعلیم شریعت کے کہ اعمال میں صرف بناوٹ نہیں بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائے اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ کہ ان کے سامنے پستی اختیار کرو وضع قطع میں تکلم میں نشست و برخاست میں غرض ہر چیز میں ان سے تذلل برتو کسی بات پر ترفع مت کرو یہ حق ظاہری ہے اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے فرما دیا یعنی مِنَ الرَّحْمَةِ یعنی ان کے سامنے نری ظاہری پستی پر اکتفا نہ کرو اس کا اعتبار نہیں بلکہ اس ظاہری

پستی کا منشاء رحمت ہو رحمت رقت قلب کو کہتے ہیں یعنی ان کی عزت دل سے کرو جیسا کہ ظاہر ان کے سامنے پست کیا ہے باطن کو بھی پست کرو۔ دل کے اندر تواضع بھی ہو خضوع بھی ہو قرآن میں کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں جاتی یہی خوبی ہے کلام اللہ کی کسی حاکم یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور اس پر بھی اکتفاء نہیں کیا آگے فرماتے ہیں وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا اور کہو اے پروردگار ان دونوں (یعنی والدین کو نواز جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی اوپر تو ان حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا علم ان کو اور لوگوں کو وقت ادا ہو جائے گا اور اس میں فرما دیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو ان کو بھی دل سے ادا کرو یہاں حکم ہے کہ ان کے ان حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع نہ ہو قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا یعنی ان کے لئے دعا بھی کرو یہ بھی ایک حق باطنی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حق تین ہیں ظاہری اور باطنی اور ابطن اور تینوں قسم کے ادا کا حکم ہے اسی طرح حق تلاوت بھی مختلف ہوتے ہیں میں اس کی ایک مثال دیئے دیتا ہوں جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دے کر کہے کہ اس کو پڑھو تو اس کی حالت پڑھتے وقت کیا ہوگی کہ ہر ہر لفظ کو صاف صاف پڑھے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کو ناپسند ہو اور اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا ایک تو اس خیال سے عبارت کا لہجہ بلا معنی سمجھے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ایک اس خیال سے کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو اور ایک حالت پڑھنے والے کی یہ ہوگی کہ دل میں اس قانون کے احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے دے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں بلکہ حال سے قال سے یہی ثابت کرے گا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا ہوں بس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھئے اور سمجھئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی اسی طرح کے تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور مخرج سے ادا کرنا ہے اور ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا یہ نہیں کہ خیال کہیں پہلے صرف طوطے کی طرح لفظ ادا کر دیئے۔ یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے اور ایک مرتبہ اس سے بھی ابطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت کا ادا کیا۔ غرض کل تین حق ہوئے ایک حق ظاہری یعنی تلاوت۔ دوسرا حق باطنی یعنی معنی سمجھ لینا۔ تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو ابطن کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ فیما بینہ و بین اللہ ہے ان تینوں میں وجوداً سب سے مقدم حق ظاہری ہے اور موکد ہے وہ تیسرا درجہ یعنی عمل ان دونوں میں حقیقت اور صورۃ کا فرق ہے اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے بس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت کے باطل دیکھئے اللہ میاں نے آگے فرما دیا أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ جو لوگ تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان رکھتے ہیں پس عمل موقوف علیہ ہے کمال ایمان کا اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے پس ضرور عمل بھی واجب ہوگا کمال ایمان کا وجوب اس آیت میں صاف مصرح ہے۔ غرض حق تلاوت کا تیسرا درجہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔ ہاں وجوب فی الفور نہیں تدریجا ہے مسلمان ہوتے ہی یہ فرض نہیں ہو جاتا کہ جملہ فروع ایمان پر بھی عبور ہو جائے اور نہ یہ فرض ہو جاتا ہے کہ قرآن شریف کے تینوں حق فوراً ہی ادا کرے بلکہ مہلت دی گئی ہے کہ

اس میں سیکھ لینا چاہیے البتہ یہ جائز نہیں کہ بالکل بیٹھ رہے اور کمال کی طرف توجہ نہ کرے غرض حق ظاہری تو یہ ہے کہ ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ترتیل کی یہ تفسیر منقول ہے **تجوید الحروف ومعرفة الوقوف** ترتیل اس کو کہتے ہیں (حقوق القرآن)

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾

ترجمہ: حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور اس شخص کو جو کافر رہے سو ایسے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں عذاب دوزخ میں پہنچاؤں گا وہ پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے۔

تفسیری نکات

اسلام مسلمان کو انہماک فی الدنیا سے مانع ہوتا ہے

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ نے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ (فرمایا اور کوئی کفر کرے سو ایسے شخص کو خوب آرام برتاؤں گا) کی تفسیر میں ایک لطیف بات فرمائی ہے اس آیت میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ فَأُمَتِّعُهُ (اس کو خوب آرام برتاؤں گا) کو ماقبل سے اعراباً کیا تعلق ہے بعض نے کہا کہ فَأُمَتِّعُهُ (سو اس کو بھی خوب آرام برتاؤں گا) کلام مستانف ہے اور من کفر (جو کفر کرے) فعل مقدر کا مفعول ہے تقدیریوں ہے وارزق من کفر کہ میں کافروں کو بھی رزق دوں گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں مومنین کی تخصیص کی تھی۔ وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں سے بھی عنایت کیجئے جو کہ ان میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں) حق تعالیٰ نے ومن کفر (جو کفر کرے) بڑھا دیا کہ دعا رزق کو مومنین کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں کفار بھی شریک ہوں گے اور ابراہیم علیہ السلام نے یہ تخصیص ادباً کی تھی کیونکہ اس سے پہلی دعاء میں انہوں نے تعمیم فرمائی تھی قال و من ذریتی (کہا اور میری ذریت سے) جس کو حق تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ خاص کر دیا تھا تو اب انہوں نے دوسری دعا کو خود ہی مومنین کے ساتھ خاص کر دیا حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اس کو خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ رزق تو میں سب کو دوں گا اس کے بعد فامتعه (سو اس کو بھی خوب آرام برتاؤں گا) سے کافر کو رزق دینے کی تفصیل ہے کہ اسکو صرف دنیا میں رزق دیا جائے گا آخرت کے رزق سے وہ محروم ہے اور بعض نے کہا کہ فَأُمَتِّعُهُ (سو اس کو بھی خوب آرام برتاؤں گا) خبر ہے من کفر کی اب اس پر سوال ہوتا ہے کہ خبر پر فاء اس وقت داخل ہوتی ہے جبکہ مبتدا میں معنی شرطیت کے ہوں اور مبتدا سبب ہو خبر کے لئے تو لازم آئے گا کہ کفر کو تمتیع میں دخل ہو جمہور نے تو اس لازم کا التزام نہیں کیا اور یوں کہا کہ محط فائدہ ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ (پھر اس کو کشاں کشاں دوزخ میں پہنچاؤں گا) ہے اور

فَأُمَتِّعُهٗ قَلِيلًا (سواس کو بھی تھوڑے روز خوب آرام برتاؤں گا) اس کی تمہید ہے جس پر فاء اس لئے داخل ہوگی کہ مبتدا کو فَأُمَتِّعُهٗ کے معطوف میں دخل ہے گو معطوف علیہ میں دخل نہ ہو مگر مقصود و معطوف ہے معطوف علیہ محض اس کی تمہید ہے لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں بلکہ مَنْ كَفَرَ کو فَأُمَتِّعُهٗ (سواس کو بھی ضرور آرام برتاؤں گا) کے ساتھ ہی شرطیت کا علاقہ ہے اور کفر کو تمتیع دنیا میں دخل ہے متاع دنیا کامل طور پر کافر ہی کو دی جاتی ہے کیونکہ وہ آخرت کا قائل نہیں اس لئے ہمہ تن دنیا میں منہمک ہوتا ہے اور ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے کہ دنیا میں ترقی کیونکر ہو اور مال کس طرح جمع کیا جائے تو دنیا کی تمتیع اس کے لئے ہوتی ہے بخلاف مسلمان کے کہ اس کو اسلام انہماک فی الدنیا سے مانع ہوتا ہے اس لئے اس کو تمتیع دنیا کافر سے کم ہوتی ہے۔

تشریح دعائے ابراہیمی

چنانچہ قرآن شریف میں ہے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهٗ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهٗٓ إِلٰى عَذَابِ النَّارِ یہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے اس سے اوپر یہ ارشاد ہے وَإِذِ ابْتَلٰٓى إِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو چند احکام میں آزمایا' اور جب اس میں پورے اتر گئے تو خطاب فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام اور مقتدا بناؤں گا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو امام اور پیشوا بنائیے۔ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ ارشاد ہوا کہ امامت ظالم کافر کو نہیں مل سکتی یعنی ذریت میں سے۔ پھر مناسبت مقام سے درمیان میں خانہ کعبہ کا ذکر فرمایا وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا۔ کہ ہم نے خانہ کعبہ کو مقام امن اور لوگوں کا مرجع فی العبادات بنا دیا۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى الایۃ اس کے آگے ہے وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا کہ یا اللہ اس مقام کو امن والا شہر کر دے وَارْزُقْ أَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ اور اس کے رہنے والوں کو پھل بھی دے۔ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لاوے آپ نے ثمرات دنیوی کو دینی امامت پر قیاس کیا وہاں حکم ہوا تھا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ کہ کافر ظالم کو امامت اور نبوت نہیں مل سکتی۔ آپ نے اس پر قیاس کیا کہ شاید نعمت دنیوی بھی کافر کو نہ ملے اس لئے دعا میں مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کی قید لگا دی تا کہ بے ادبی کا احتمال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهٗ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهٗٓ إِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ عام مفسرین نے تو اس کی اور تفسیر کی ہے مگر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے تفسیر مظہری میں ایک عجیب تفسیر کی ہے۔ عام مفسرین نے تو یہ تفسیر کی ہے کہ یہ معمول ہے ارزق مقدر کا یعنی وارزق من کفر کہ میں کافر کو بھی رزق دوں گا۔ آگے اس کی تفصیل ہے فَأُمَتِّعُهٗ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهٗٓ إِلٰى عَذَابِ النَّارِ اس تفسیر کے موافق گویا من کفر پر جملہ ختم ہو گیا۔ فَأُمَتِّعُهٗ قَلِيلًا الخ الگ جملہ ہے اور قاضی ثناء اللہ صاحب نے کہا ہے کہ من مبتداء ہے اور فامتعہ خبر ہے یا یوں کہو وہ من شرطیہ ہے اور امتعہ اس

کی جزاء ہے۔خواہ من کو مبتدا مانو یا شرطیہ اور امتعہ کو خبر بناؤ یا جزا دونوں جائز ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ یہ جملہ مستقلہ ہے۔مطلب یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اس کو دنیا سے متمتع کروں گا' اور قلیلا قید واقعی ہے۔ **کما قال تعالیٰ قل متاع الدنیا قلیل** اب اس پر ایک سوال ہوتا ہے کہ اس تقریر کا تو حاصل یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اسی کو متاع حاصل ہوگی تو کیا کفر سبب تمتیع کا ہے؟ قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا کہ دنیا کو مومن سے کم مناسبت ہے اور کافر سے زیادہ مناسبت ہے۔یہ ایسی بات ہے جیسے ارشاد ہے اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ کہ خبیث کو خبیث ہی ملا کرتا ہے۔دنیا خسیس ہے اور کفار بھی خسیس ہے لہٰذا ان میں باہم تناسب ہے اور مومن شریف ہے اور دنیا خسیس ہے لہٰذا ان میں باہم تناسب نہیں ہے۔میں نے اسی تفسیر پر دعویٰ کیا تھا کہ کفار کا دنیا سے تناسب نقل سے ثابت ہے۔اس لئے تدابیر باطلہ کفار کے لئے مفید ہے۔ بخلاف اہل اسلام کے ان کے لئے تو وہی تدابیر نافع ہوں گی جو اسلام کے مناسب ہیں' وہ تدابیر کیا ہیں' وہ وہ ہیں جو اللہ میاں نے بیان فرمائی ہیں جن کو میں نے اب بیان کیا ہے کہ اپنی اصلاح کرو' اخلاق کو درست کرو' عقائد و اعمال کو سنوارو۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے کو تمہارے بہکانے کی طمع نہ ہوگی' دست درازی کی ہمت نہ ہوگی۔یہ تو اپنا ذاتی فائدہ ہے اپنے نفس کی حفاظت ہے' آگے دوسرا درجہ اشاعت اسلام کا ہے اس سے بھی اس میں کامیابی ہوگی۔کیونکہ اس کا حسن ایسا ہے کہ دوسروں کے دل میں کھینچتا ہے۔اگر تمہارے اندر اسلام کے پورے اوصاف پائے جائیں گے۔اس کے انوار و برکات تم میں جمع ہو جائیں تو دوسری قومیں خود ہی اس کے اندر آجائیں گی۔زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار اور اس جماعت کے اندر ہی میں ایک ایسے پیغمبر مقرر کر دیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو آسمانی کتاب کی اور خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں بلاشبہ آپ ہی غالب القدرت کامل الانتظام ہیں۔

تفسیری نکات

ابراہیم علیہم السلام نے جہاں اپنی اولاد کے لئے نفع دنیاوی کی دعا کی کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. وہاں اس دینی نفع کی بھی دعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ ——————

دعائے ابراہیمی کی تشریح

فرماتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری اولاد میں ایک رسول بھیجئے جن کی یہ صفت ہو کہ ان لوگوں کو آپ کے احکام سنائیں اور

یہ شان ہو کہ ان کو کتاب اور حکمت تعلیم کریں اور ان کا تزکیہ کریں رذائل سے' بے شک آپ قادر ہیں اور حکیم ہیں کہ موافق حکمت کے کرتے ہیں اور ایسا کرنا مصلحت ہے تو آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں گے اس آیت کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ رسول کی تین صفتیں اس آیت میں بیان کی گئی ہیں اور ان رسول سے مراد ہمارے حضور انور علیہ ہیں۔ اس لئے کہ داعی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل ہیں لہٰذا ضرور ہے کہ یہ رسول ان دونوں حضرات کی اولاد میں ہونا چاہیے اور ہر چند کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضور علیہ کے علاوہ بھی متعدد انبیاء ہوئے مگر وہ بسلسلہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہوئے ہیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے سلسلے میں صرف ہمارے حضور علیہ ہی ہیں لہٰذا آپ ہی مراد ہوئے۔

دعا کے درمیان میں بعثت رسول کی دعا کرنا ایک بڑی رحمت کاملہ کا مانگنا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یوں کہتے' ان کو پاک کیجئے اور ان کو کتاب دیجئے اور ان کو قبول کیجئے لیکن تعلیم بواسطہ وحی اس تعلیم سے افضل ہے جو کہ بلا واسطہ وحی کے بذریعہ الہام کے ہو۔

دین کے ضروری شعبے

اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اے سننے والو سمجھ جاؤ کہ ضروری چیزیں یہ ہیں جن کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا اور سمجھ کر ہم سے دعا کی۔

اب سمجھنا چاہیے کہ وہ ضروری چیزیں کیا ہیں۔ سو وہ مفصلاً تو تین چیزیں ہیں۔ یتلوا اور یعلم اور یزکی. اور مجملاً ایک چیز ہے جس کو دین کہتے ہیں کیونکہ یہ سب دین ہی کے شعبے ہیں اس لئے کہ دین مرکب ہے دو چیزوں سے ایک علم اور دوسرا عمل جیسے فن طب کہ اس میں اول علم کی ضرورت ہوتی ہے پھر عمل کی۔ قرآن مطب روحانی ہے اس میں صرف دو چیزیں ہیں ایک علم اور دوسرا عمل یزکی میں عمل کی طرف اشارہ ہے اور یعلم میں علم کی طرف۔ حاصل یہ ہوا کہ اے سننے والے! اہتمام کے قابل دو چیزیں ہیں علم اور عمل۔ انہی کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ (ضرورت الاسلام والدین)

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

ترجمہ: اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو تو انہوں نے عرض کیا میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی۔

تفسیری نکات

اسلام کی حقیقت

اس میں حق جل وعلاشانہ نے اسلام کی حقیقت بتائی ہے کہ اسلام کیا چیز ہے تو فرماتے ہیں وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ فرماتے ہیں کون شخص ایسا ہے جو اعراض کرے ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ سے ابراہیم علیہ السلام کا طریق تو ایک ایسی ملت تھا اور ایک ایسا مشرب تھا کہ کون سا مقبول بندہ ہے جو اس سے روگردانی کرے اور اعراض کرے اباء کرے استغنا کرے اور اس کو ترک کرے یا اس سے ہٹ جاوے سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی بے قدری کی سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی۔ سوا اس کے کوئی ایسا نہ کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو نفس کی قدر جانے گا وہ اس کو نفع پہنچائیگا اور ضرر سے بچائے گا کیونکہ نفس کی یہ قدر ہے کہ وہ اس کو نفع پہنچانا اور اس کو مضرت سے بچانا۔ تو جو اپنے نفس کی قدر جانے لگا وہ ملت ابراہیمی کو ضرور اختیار کرے گا اور کیوں اختیار کرے گا جب وہ چیز ہی اس درجہ کی ہے کیونکہ اس کی ہی برکت سے ابراہیم علیہ السلام اس درجہ کو پہنچے جس کو فرماتے ہیں وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ یعنی ہم نے انہیں مقبول بنایا تھا دنیا میں۔ اور حرف تاکید کے ساتھ فرماتے وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اور آخرت کے اندر بھی وہ صالحین میں سے ہیں یعنی اس ملت کی برکت سے وہ دنیا میں بھی مقبول تھے اور آخرت میں بھی مقبول ہیں۔ تو ملت ابراہیم ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت ابراہیم علیہ السلام ایسے مرتبہ کو پہنچے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ کتنی بڑی چیز ہوگی۔ پھر بھلا ایسی چیز سے کون اعراض کرے گا سوا جاہل کے اور سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی آگے اس ملت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے ارشاد ہے اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ یعنی جب ان کے رب نے کہا کہ اسلام اختیار کرو۔ اگر کوئی کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے ہی اسلام لائے ہوئے تھے تو پھر اس کے کیا معنی تو یہ سمجھو کہ یہ کہنا ایسا ہے جیسے میاں جی نے سبق پڑھا دیا لڑکے نے اسے یاد کر کے سنا بھی دیا۔ اب دوسرے دن میاں جی نے جب کہا کہ آؤ سبق پڑھو تو وہ کہے کہ آج کل تک

سبق پڑھ چکا ہوں اور یاد کر کے سنا بھی چکا ہوں۔ یہ اجی پڑھانا کیسا تو وہ میاں جی کہتا ہے کہ ارے بھائی کل جو تم نے پڑھا ہے تو کیا ساری کتاب ختم کر لی ہے۔ کیا اب کچھ پڑھنے کو باقی نہیں رہا۔ کیا ایک ہی سبق میں علم کی پوری تکمیل کر چکے۔ ارے ابھی اور بھی تو بہت کچھ پڑھنا پڑھانا ہے تو جس طرح میاں جی کہتا ہے کہ اور پڑھو اسی طرح یہ ارشاد ہے کہ اسلم مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں لڑکے نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کل تو پڑھ چکا تھا اور یہاں کوئی نبی ایسا نہیں جو اسلم کے جواب میں یہ کہے کہ اسلام لا چکا بلکہ جواب میں وہ کہیں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا یعنی یہ کہا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ کہ میں نے اسلام اختیار کیا یہ ترجمہ کا حاصل ہوا اس میں تعیین ہوگئی اس ملت کی کہ وہ کیا ہے یعنی اسلام غرض ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ اس میں اسلام ہی کی فضیلت وارد ہوئی ہے اور معلوم ہوا کہ یہی وہ ملت ابراہیمی ہے جس کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اب اس کے ساتھ اگر سیاق وسباق کو بھی ملا لیجئے تو اسلام کی فضیلت اور عظمت اور زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی اس کے قبل حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ جمع ہو کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی اس کا واقعہ مذکور ہے اور اس دوران میں جو دعائیں دونوں نے مل کر مانگی تھیں وہ نقل کی گئی ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ (اور جبکہ اٹھا رہے تھے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل (علیہ السلام) بھی کہ اے ہمارے پروردگار یہ خدمت ہم سے قبول فرمایئے بلاشبہ آپ خوب سننے والے جاننے والے ہیں) پھر ان کی دوسری دعا نقل فرمائی ہے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ تو یہاں اپنے واسطے بھی دعا مانگی ہے کہ اے اللہ ہم کو سچا مسلمان بنا دے۔ دیکھئے کتنی بڑی چیز ہے اسلام کہ انبیاء علیہم السلام بھی باوجود اتنے بڑے درجہ پر ہونے کے یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں کامل اسلام عطا فرما۔ پھر کتنی بڑی سخاوت اور خیر خواہی ہے کہ اپنے ساتھ ہم نالائقوں کو بھی یاد فرمایا وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اور اے اللہ میری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان جماعت بنائیو خواہ وہ اولاد جسمانی ہو یا روحانی اس کے واسطے کہ ایک جگہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ اس کے مخاطب ہیں امت محمدیہ (علی صاحبها الصلوٰۃ والسلام) اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساری امت کے جسمانی باپ نہیں ہو سکتے۔ تو لامحالہ یہاں روحانی باپ ہونا مراد ہے اور کہا جائے کہ خاص عرب مخاطب ہیں جن کے آپ جسمانی باپ بھی ہیں تو اس آیت میں سباق وسیاق اس کا مساعد نہیں چنانچہ اوپر يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا میں عام اہل ایمان کو خطاب یہ ہے کہ خاص عرب کو پھر آگے سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ اور لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ واقع ہے جو کہ صفت مشترکہ ہے تمام امت کی تو معلوم ہوا ابیکم عام ہے جسمانی باپ ہونے کو بھی اور روحانی باپ ہونے کو بھی۔ غرض وہ یعنی اہل عرب جسمانی اولاد ہیں اور غیر اہل عرب روحانی اولاد ہیں ان سب کو بھی اپنے ساتھ دعا میں یاد فرما لیا البتہ اس اولاد میں سے اس کو مستثنیٰ کر دیا جو اسلام کے ساتھ موصوف نہ ہوں چنانچہ یوں نہیں فرمایا ذریتنا بلکہ من بڑھا دیا کیونکہ اس سے قبل جو اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ (میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا) کی بشارت سن کر دعا کی تھی۔ و من ذریتی اور اس کے جواب میں ارشاد ہوا تھا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ اس سے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ ایسے بھی ہوں

گے جو طریق حق پر نہ ہوں گے اسلئے اس دعا میں انکو مستثنیٰ کر دیا اس دعا میں ایک بات یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ آپ نے لقب اس امت کا مسلمہ رکھا جس کا ذکر ایک تفسیر کی بنا پر دوسری آیت بھی ہے هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ کیونکہ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف ضمیر راجع ہو۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے بھی اسلام کو ثابت کیا اور امت محمدیہ ﷺ کے لئے بھی اسلام کی درخواست کی اس سے اسلام کا جو کچھ شرف ثابت ہے ظاہر ہے۔ یہ تو سابق میں نظر تھی آگے سیاق یعنی مابعد میں دیکھیے تو ایک صفحہ کے اندر ہی اندر جا بجا اسلام کا ذکر فرمایا ہے سب سباق و سیاق میں جو میں نے غور کیا تو سات جگہ اسلام کا ذکر ہے ایک وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ میں دوسرا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ میں تیسرے قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ میں چوتھے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ میں پانچویں فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ میں چھٹے وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ میں ساتویں لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ میں اور محاورات عرب میں سات کا عدد یہ کثرت کا مرتب ہے اور جب اور مبالغہ مقصود ہوتا ہے تو ستر کا عدد استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ سات اور ستر کا استعمال کثرت کے لئے احادیث کثیرہ میں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا کیا درجہ ہے کہ ایک ہی مقام پر بار بار اس کا کئی طرح ذکر کیا جاتا ہے نیز اس مقام کی آیات سے بھی معلوم ہوتا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب اسلام ہی رہا ہے تو اسلام اتنی قدر کی چیز ہے۔ یہ تو اسلام کی اہمیت وعظمت کا ذکر ہوا اب اسلام کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے۔

اسلام اصل میں ایک لغت عربی ہے پھر اور قرآن وحدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصوص میں جو اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ لغوی معنوی پر ایک قید لگائی گئی ہے اس لحاظ سے دو قسم کا اسلام ہوا ایک تو اسلام لغوی اور ایک اسلام شرعی۔ اسلام لغوی کے معنی ہیں سپردن سونپ دینا۔ اس کو تعبیر کر دیتے ہیں گردن نہادن بہ طاعت سے۔ غرض جو تسلیم کے معنی ہیں وہی اسلام کے معنی ہیں۔ مادہ دونوں کا سین لام میم ہے اور ان حروف میں تسلیم کے معنی مودع ہیں چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے بلى من اسلم اى من فوض ذاته لله یعنی جس نے سپرد کر دیا اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لئے۔ غرض اسلام کے معنی ہیں سپرد کر دینا۔ شریعت نے اس میں ایک اور قید بڑھائی یعنی ایک قید تو اسلم کے معمول میں بڑھائی اور ایک قید اس کے متعلق میں۔ لغوی اسلام میں کوئی قید نہیں۔ اس کے معنی ہیں مطلق سپرد کرنا۔ جس کو چاہے سپرد کرنا اور جس کے چاہے سپرد کرنا۔ اب اسلام شرعی کی قیدیں سنئے ایک قید تو یہ ہے کہ اسلم کا معمول کون ہے خود اپنی ذات اور اس کا متعلق کون ہے اللہ۔ اصل کیا ہوا اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا۔ یہ ہے حقیقت اسلامی شرعی کی۔ (ملت ابراہیم علیہ السلام)

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا

ترجمہ: اب تو بے وقوف لوگ کہیں کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس (بات) نے بدل دیا۔

تفسیری نکات

مسلمانوں کو تلقین

یہ آیت تحویل قبلہ کے متعلق ہے کیونکہ قبلہ کے احکام اول اول بدلتے رہتے تھے۔ پہلے مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو عارضی قبلہ بنایا تھا اور آئندہ اس کو منسوخ کرنا تھا اور اس پر کفار کی طرف سے اعتراض واقع ہونے والا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا کہ آئندہ واقع ہونے والے اعتراضات سے مسلمانوں کو زیادہ رنج نہ پہنچے۔ تو پہلے ہی سے اطلاع فرمادیا کہ بے وقوف اور نادان لوگ تمہارے اوپر اس اس طرح اعتراض کریں گے تم ان سے دلگیر نہ ہونا۔ (الجبر بالصبر)

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا

ترجمہ: اور ہم نے تم کو ایسی جماعت بنادیا جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے

تفسیری نکات

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں: ۱۔ حکمت' ۲۔ عفت' ۳۔ شجاعت

اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے اور قرآن میں جو فرمایا ہے وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا۔ اس سے بھی عدل مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے (ایک ایسی شریعت دے کر جو سراپا عدل ہے) امۃ وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔

ایک مقدمہ اور لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وسط حقیقی ایک وسط عرفی۔ وسط حقیقی وہ خط ہے جو بالکل بیچوں بیچ ہو۔ وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا اور ایک وسط عرفی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم ہے اس کے اندر بھی ایک جز دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے پھر وہ وسط حقیقی کہاں سے ہوا۔ حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے۔ سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو بلکہ عین وسط ہو۔ یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے اور یہی کمال ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم

ہوگا۔اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی۔ کیونکہ بال بھی غیر منقسم ہے اور وسط حقیقی بھی غیر منقسم ہے۔ پس قیامت میں یہی روح شریعت یعنی وسط حقیقی جوہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جائے گا۔ پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی وسہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ یہی شریعت تو ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلا یا کم چلا ہے وہ پل صراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ

ترجمہ: اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں یعنی بیت المقدس وہ تو محض اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹتا ہے۔

تفسیری نکات

ایک آیت کی عجیب تفسیر

فرمایا ایک بہت بڑے معقولی فاضل نے آیت لنعلم میں دفع اشکال حدوث کے لئے غضب کیا ہے کہ علم سے مراد علم تفصیلی لیا ہے وہ حادث ہے البتہ علم اجمالی کا ترتب حادث پر صحیح نہیں کیونکہ وہ صفت قدیمہ ہے اور یہ توجیہ بالکل غلط ہے کیونکہ علم تفصیلی تو اصطلاح میں خود معلومات کا نام ہے اس لئے نہ اس سے اشتقاق صحیح ہے اور نہ ہی اس کی اسناد الی الواجب صحیح اور آیت میں اشتقاق بھی ہے اور اسناد بھی۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے اس کی تفسیر پارہ سیقول میں نہایت عمدہ کی ہے اور کہا ہے کہ علم حق جو اشیاء کے متعلق ہے وہ واقع کے مطابق ہے پس ماضی کے ساتھ صفت مضی اور حل استقبال کے ساتھ حال واستقبال کی صفت کے ساتھ متعلق ہے پس جو چیز مستقبل تھی اس کے ساتھ علم یوں متعلق تھا کہ یہ چیز مستقبل میں واقع ہوگی۔ اب اس علم ثابت فی الآیہ کی یوں تعبیر ہوگی کہ جس چیز کو اس طرح جانتے تھے کہ مستقبل میں ہوگی۔ اب اس طرح جان لیں کہ ماضی میں ہو چکی اور دونوں انکشافوں میں مطلق تفاوت نہیں پس یہ تغیر اضافۃ میں ہوا جو صفت معلوم کی ہے علم میں نہیں جو صفت عالم کی ہے۔ (الکلام الحسن حصہ اول)

تفسیر کے اشکال کامل

فرمایا ایک بہت بڑے معقولی فاضل نے آیت لنعلم میں دفع اشکال حدوث کے لئے یہ غضب کیا ہے کہ علم سے مراد علم تفصیلی لیا ہے اور وہ حادث ہے البتہ علم اجمالی کا ترتب حادث پر صحیح نہیں کیونکہ وہ صفت قدیمہ اور یہ توجیہ بالکل غلط ہے

کیونکہ علم تفصیلی تو اصطلاح میں خود معلومات کا نام ہے اس لئے نہ اس سے اشتقاق صحیح ہے اور نہ ہی اس کی اسناد الی الوجب صحیح اور آیت میں اشتقاق بھی ہے اور اسناد بھی۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے اس کی تفسیر پارہ سیقول میں نہایت عمدہ کی ہے اور کہا ہے کہ علم حق جو اشیاء کے متعلق ہے وہ واقع کے مطابق ہے پس ماضی کے صفات صفت مضی کے ساتھ متعلق ہے اور حال اور استقبال کے ساتھ حال و استقبال کی صفت کے ساتھ متعلق ہے۔ پس جو چیز مستقبل تھی اس کے ساتھ علم یوں متعلق تھا کہ یہ چیز مستقبل میں واقع ہوگی۔ اب اس علم ثابت فی الآیہ کی یوں تعبیر ہوگی کہ جس چیز کو اس طرح جانتے تھے کہ مستقبل میں ہوگی۔ اب اس طرح جان لیں کہ ماضی میں ہو چکی اور دونوں انکشافوں میں مطلق تفاوت نہیں پس یہ تغیر اضافۃ میں ہوا جو صفت معلوم کی ہے علم میں نہیں جو صفت عالم کی ہے۔ (الکلام الحسن ج ا ف ۷۰)

تفسیر عجیب لِنَعْلَمَ

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ

ترجمہ: اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے۔

ایک تقریر اس کی یہ ہو سکتی ہے جو مظہری میں ہے کہ شیخ ابو منصور کہتے ہیں کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم پہلے اس طرح جانتے تھے کہ وہ موجود کی جاوے گی۔ اس کو ہم موجود فی الحال جان لیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں جن چیزوں کو وہ موجود کرنا چاہتا ہے اس طرح تو علم ہے کہ اس کو فلاں وقت میں موجود کروں گا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو ازل میں ان چیزوں کا اس طرح علم تھا کہ وہ فی الحال موجود ہے کیونکہ جب وہ واقع میں موجود نہیں تو حکیم خلاف واقع موجود فی الحال کیسے جان سکتا ہے اور یہ تغیر معلوم میں ہوا ہے علم میں نہیں ہوا۔ (ماخوذ البدائع)

تفسیر آیت

فرمایا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ الآیہ میں لنعلم پر جو اعتراض ہے کہ اس حدیث میں حدوث علم لازم آتا ہے اس لئے کہ جعل قبلہ حادث ہے اور علم جو اس پر مرتب ہو ظاہر ہے کہ وہ بھی حادث ہی ہوگا۔ بعض معقولین نے اس اعتراض کا ایک جواب دیا جو بالکل غلط ہے وہ یہ کہ مراد علم تفصیلی ہے وہ حادث ہے اور صفات میں سے نہیں اور یہ غلط اس واسطے ہے کہ یہ ایک اصطلاحی لفظ بمعنی معلومات ہے نہ کہ لغوی بمعنی مصدر جس سے اشتقاق ہوتا ہے پس لنعلم میں بمعنی علم تفصیلی لینے سے ایک تو اشتقاق لنعلم درست نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر بتکلف اشتقاق کا دعویٰ کیا جاوے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تبدیل قبلہ اس لئے کیا تا کہ ہم ممکنات کے عین ہو جاویں کیونکہ تفصیلی معلومات ممکنہ کا عین ہوتا ہے اور بہترین جواب اس اعتراض کا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے دیا ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہوتا ہے اور یہ مقدمہ ظاہر ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ واقعات تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ماضی، مستقبل اور حال۔ پس اللہ تعالیٰ

جملہ واقعات کو مع ان کے زمانہ کے جانتے ہیں۔یعنی حق تعالیٰ جملہ اشیاء کو کشف تام سے جانتے ہیں مع ان کے قیود واقعیہ کے مثلاً جو چیزیں ماضی میں واقع ہیں ان کو اسی طرح جانتے ہیں کہ قد وقع اور جو مستقبل میں ہیں ان کو اس طرح جانتے ہیں کہ سیقع اور جب وہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کو قد وقع کی قید سے جانتے ہیں اور یہ تغیر معلوم میں ہے عالم میں نہیں۔پس تحویل قبلہ کے وقوع سے پہلے تو اس طرح جانتے تھے کہ فلاں فلاں اشخاص اسلام پر رہیں گے اور فلاں فلاں مرتد ہو جاویں گے جب تحویل قبلہ ہوگئی تو بصورت ماضی جان لیا باقی انکشاف دونوں حالتوں میں تام اور کامل ہے اور یہی مراد معلوم ہوتی ہے مفسرین کے اس قول کی لنعلم علم ظہور۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ

ترجمہ: اور ہر شخص (ذی مذہب) کے واسطے ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ عبادت میں منہ کرتا رہا ہے۔

تفسیری نکات

ترقی کو شرعاً واجب فرمانا

فرمایا لکھنؤ میں ایک ترقی یافتہ مجمع کی درخواست پر میرا وعظ ہوا۔میں نے آیہ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ الآیہ کا بیان کیا اور استباق کی حقیقت ترقی بتلا کر میں نے کہا صاحبو! تم تو ترقی کو عقلاً واجب کہتے ہو اور ہم شرعاً واجب کہتے ہیں تو ہم ترقی کے زیادہ حامی ہوئے۔کیونکہ ہم جب اس کو شرعاً واجب کہتے ہیں تو اس کے ترک پر گناہ کے بھی قائل ہوں گے۔غرض تم اور ہم اس پر تو متفق ہوئے کہ ترقی مطلوب ہے اور اس پر بھی تم کو اتفاق کرنا پڑے گا کہ ہر ترقی مطلوب نہیں کیونکہ اگر بدن پر مثلاً ورم ہو جائے تو وہ بظاہر ترقی جسمانی ہے مگر تم بھی اس کا علاج کراتے پھرو گے۔اسی طرح اگر سمن مفرط ہو جاوے تو اس کا بھی علاج کرانا ضروری سمجھو گے۔پس اس سے صاف ظاہر ہوا کہ ترقی وہ مقصود ہے جو نافع ہو اور جو ضار یعنی نقصان دہ ہو وہ مطلوب نہیں پس اتنے حصہ میں تو ہمارا تمہارا اتفاق ہے اختلاف اگر ہے تو صرف اس امر میں ہے کہ کونسی ترقی نافع ہے کونسی مضر سو تم صرف دنیاوی ترقی کو نافع سمجھتے ہو اگرچہ آخرت میں مضر ہو اور ہم دینی ترقی کو مطلقاً نافع سمجھتے ہیں اور دنیاوی ترقی کو قید عدم ضرر کے ساتھ ورنہ ترقی فی الورم والسمن کی طرح مضر سمجھتے ہیں۔چنانچہ قرآن عزیز میں اسی نافع ترقی کا حکم فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ میں فرمایا ہے کیونکہ خیر نافع کو کہتے ہیں باقی مولویوں پر جو شبہ کیا جاتا ہے کہ مولوی تو جائز دنیوی ترقی کا بھی وعظ نہیں کرتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیوی ترقی کا وعظ جب کہتے جبکہ تم لوگ اس کو نہ جانتے ہوتے تو وعظ سے اس کی ضرورت کو بتلایا جاتا۔تم تو خود اس قدر زیادہ اس میں مشغول ہو کر حدود سے بھی نکل گئے ہو۔پھر ہمارے وعظ کی آپ کو اس ترقی کے متعلق کیا ضرورت رہ گئی بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تم جو حدود سے نکل گئے ہو اس سے تم کو روکا جائے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو نہایت تصریح کے ساتھ صاف کر دیا ہے

یعنی اول قارون کی دنیوی زندگی کا ذکر فرمایا ہے۔ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ پھر دنیوی ترقی کے مقصود سمجھنے والوں کا قول نقل فرمایا ہے قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۔ اس کے بعد مولویوں کا جواب ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ یہ تو دنیاداروں اور دینداروں کے اختلاف کی حکایت تھی آگے اللہ تعالیٰ ان میں فیصلہ فرماتے ہیں اور فیصلہ بھی عملی فیصلہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ. جب اللہ تعالیٰ کا یہ عملی فیصلہ دیکھا تو دنیوی ترقی کے طالبوں کی رائے بدل گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ اور میں بقسم کہتا ہوں کہ تم بھی عملی فیصلہ کے وقت اقرار کرو گے کہ مولوی ٹھیک کہتے تھے مگر یہ فیصلہ کب ہوگا جب موت آوے گی اس وقت اپنی غلطی کا اقرار کرو گے کہ ہائے علماء حق پر تھے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

ترجمہ: پس (ان نعمتوں پر) مجھ کو یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گزاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو۔

تفسیری نکات

ذکر اللہ کا ثمرہ

فرمایا کہ انسان کے جملہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں بعض وہ ہیں جس کا کچھ دنیا میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے جیسے تصنیف کتب وغیرہ۔ بعض وہ ہیں جن کا ثمرہ دنیا میں کچھ مشاہدہ نہیں ہوتا جیسے ذکر اللہ و نماز وغیرہ پہلی قسم کے اعمال نفس پر بہت آسان ہو جاتے ہیں لیکن دوسری قسم کے عمل بے حد کٹھن ہیں اور ان کے کرنے میں نفس پر سخت بار ہوتا ہے اس کے آسان کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ خاص ثمرات پر نظر ہی نہ کرے بلکہ اس نیت سے ذکر کرے کہ وعدہ خداوندی ہے فاذکرونی اذکرکم جب اس کو یاد کرینگے تو وہ ہم کو ضرور یاد کرے گا اور اس کا یاد کرنا مطلوب ہے پھر جب مطلوب حاصل ہے تو اس سے لذت وغیرہ اگر نہ بھی حاصل ہوئی تو کیا مضائقہ ہے اور یہی علاج ہے قبض کا جب ایسی حالت پیش آئے سمجھئے کہ ہم کو نہ قبض مطلوب ہے نہ بسط اور نہ یہ ثمرہ ذکر ہے بلکہ جو حالت ہو ہم اس میں راضی ہیں اور وہی خدا کا فضل ہے اس لئے کہ

دل کہ اوبستہ غم و خندیدن ست   تو بگو کے لائق آں دیدن ست

ذکر اللہ کا مقصود

فرمایا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ذکر سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ

اور کسی چیز کا طالب نہ ہونا چاہیے۔ نہ حالات کا نہ واردات کا کہ یہ مقصود نہیں ہے صرف رضائے حق مقصود ہے۔ پھر جس کے لئے جو مناسب ہوتا ہے عطا فرماتے ہیں۔ کسی کو ذوق شوق میسر ہوا۔ کسی کو قبض ہر شخص کو انعام مناسب ملتا ہے مثلاً دنیا میں کسی کو کپڑا انعام میں ملا' کسی کو روپیہ' کسی کو غلہ علی ہذا القیاس۔ پس فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ پر نظر رہنا چاہیے۔

اللہ کے ذکر سے قرب خداوندی نصیب ہوتا ہے

ایک ذاکر نے عرض کیا کہ میں ذکر کرتا ہوں مگر کوئی اثر اس کا محسوس نہیں ہوتا کوئی نور یا خواب تک بھی نظر نہیں آتا۔ فرمایا ذکر اس واسطے بتایا ہی نہیں گیا کہ کچھ نظر آوے ذکر سے غرض قرب ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ذکر سے قرب ہوتا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ جو کوئی میرا ذکر کرتا ہے میں اسکو اس سے بہتر مجمع میں ذکر کرتا ہوں خود قرآن شریف میں ہے فاذکرو نی اذکر کم پھر یہ کیا تھوڑا ثمرہ ہے کہ آپ کا ذکر وہاں ہو۔

ہمینم بس کہ واندما ہرویم کہ من نیز از خریداران اویم
ہمینم بس اگر کاسہ قماشم کہ من نیزاز خریدار انش باشم

لوگوں کو یہ خبط ہے کہ ذکر کا کچھ نظر آنا قرار دیا ہے۔ ذکر کا محسوس اثر بڑا یہ ہے کہ اس پر دوام ہو۔ حضرت حاجی صاحب سے کسی نے یہی شکایت کی تھی تو فرمایا کہ تمہارا کام یہی ہے کہ

یابم اور ایانیابم جستجوئے می کنم حاصل آیدیا نیاید آرزوئے می کنم

اور حضرت کے پاس ایک شخص آیا کہ میں نے طائف میں چلہ کھینچا سوا لاکھ مرتبہ روزانہ اسم ذات کا ورد کیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا اس سے مجھے خیال ہے کہ آپ مجھ سے ناخوش ہیں فرمایا میں ناخوش ہوتا تو ممکن بھی تھا کہ تم یہ چلہ پورا کر لیتے۔ ثابت ہوا کہ بعض وقت کسی کی امداد ہمارے ساتھ ہوتی ہے اور ہم کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا تو جو شخص ذکر پر مداومت کرتا ہے اسکے ساتھ امداد حق ہے گو کوئی محسوس علامت اسکی نہیں ہے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ نظر آنا کیا چیز ہے۔ ان کیفیات کو لوگ مقصود سمجھ لیتے ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ یہ کیفیات اکثر محمود ہوتی ہیں مگر مقصود نہیں۔

فوائد و نتائج

محمود اور مقصود میں فرق یہ ہے کہ مقصود غرض کو کہتے ہیں اور اس کے حصول و عدم حصول پر فعل کا دارومدار ہوتا ہے اور محمود وہ امر حسن ہے کہ اسکے حصول و عدم پر دارومدار نہ ہو جیسے دوا کا میٹھا ہونا کہ محمود ہے مقصود نہیں مقصود شفا ہے اگر حصول مقصود کے ساتھ دوا میٹھی بھی ہو تو خوبی دوبالا ہے اور اگر صرف مقصود یعنی شفا حاصل ہو تو کڑوی دوا بھی پینا چاہیے اور جب مقصود حاصل نہ ہو تو چاہے کیسی ہی میٹھی اور خوشگوار دوا ہے اس کا اختیار کرنا غلطی ہے یہی حکم واردات و کیفیات کا ہے کہ جب کسی عمل میں وہ شرائط موجود ہوں جن کی تعلیم شریعت نے تصریحاً دی ہے یا وہ شرائط جن کی شیخ نے تعلیم فرمائی ہے تو انکی پروانہ کرنا چاہیے۔ اگر عمدہ حالات محسوس ہوں ورنہ کچھ ملال نہ کرے اور اگر وہ شرائط موجود نہیں ہیں تو خواہ اسکے زعم میں معراج ہی کیوں نہ

ہونے لگے مگر اس کو جولا ہے والی معراج سمجھے۔ الحائک اذا صلے یومین انتظر المعراج وہ ضرور سلسلہ شیطانی ہے۔ یہ وہ خوفناک چیز ہے کہ ہزار ہا مخلوق خدا اسکی بدولت ایمان تک کھو بیٹھے ہیں۔ جوگی دہریئے قادیانی سب اسی خبط میں گمراہ ہیں اور حقیقت صرف یہ ہے وقیضنا لھم قرناء فزینوا لھم ما بین ایدیھم وما خلفھم و کذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا ہ و کذالک زینا لکل امۃ عملھم. افمن زین له سوء عمله فراه حسناء. کشف وکرامت اور اچھے خوابوں کے متعلق رسالہ ہذا میں بہت جگہ تحقیق موجود ہے ملاحظہ فرماویں خصوصاً حکمت ششم اور حکمت سی ویکم اور حکمت بست وہفتم میں۔ (مجالس الحکمت ص ۵۱-۵۲)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿۱۵۳﴾

ترجمہ: اے مومنو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد چاہو بلاشبہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیری نکات

حصول صبر کی سہل تدبیر

استعینوا خود بتلا رہا ہے کہ اس میں کسی کام کو آسان کرنے کی تعلیم ہے تب ہی تو استعانت کی حاجت ہوئی اور سہولت کی توجیہ یہ ہے کہ نماز سے خدا تعالیٰ کی عظمت بڑھ جائے گی اور اپنی عظمت یعنی حب جاہ نکل جائے گی آگے نماز میں خود ایک دشواری تھی اس لئے صبر کی تعلیم دی اس کا دخل نماز کی سہولت میں اس طرح ہے کہ نماز فعل ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَىْءٍ مِّنَ ٱلْخَوْفِ وَٱلْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ ٱلْأَمْوَٰلِ وَٱلْأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٰتِ ۗ وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿۱۵۵﴾ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا۟ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ﴿۱۵۶﴾

ترجمہ: اور البتہ ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے یعنی تم کو دشمنوں کی طرف سے اندیشہ اور خوف بھی پہنچے گا۔ اور جوع سے یعنی کسی وقت تم پر فاقہ بھی آئے گا اور اموال ونفوس اور ثمرات کے نقصان سے (یعنی کسی وقت تمہارا مال بھی ضائع ہو گا جانیں بھی ضائع ہوں گی اور ثمرات بھی ضائع ہوں گے) اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم نے اس کی طرف لوٹنا ہے۔

تفسیری نکات

ثمرات کی ایک تفسیر

ثمرات کی ایک تفسیر تو پیداوار ہے مطلب یہ ہے کہ کسی وقت تمہاری کھیتوں اور باغات کی پیداوار پر آفت آئے گی اور گو اموال میں یہ بھی آ گئے تھے مگر چونکہ زمینداروں کے نزدیک یہ اعز الاموال (مالوں میں سے عزیز تر) ہیں اور مدینہ والے اکثر زمیندار تھے اس لئے ثمرات کو مستقلاً بیان فرمادیا اور ایک تفسیر ثمرات کی اولاد ہے کیونکہ وہ ماں باپ کے جگر کے ٹکڑے ہیں اسی لئے اولاد کو ثمرات الفواد (دلوں کا پھل) کہا جاتا ہے اور گو وہ نفوس میں داخل ہو سکتے ہیں مگر یہاں بھی تخصیص کی وہی وجہ ہوگی جو ثمرات بمعنی پیداوار کو اموال کے بعد ذکر کرنے کی وجہ تھی یعنی چونکہ اولاد اعزالنفوس (جانوں میں زیادہ عزیز) ہیں اور ان کے مرنے کا غم زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کو جدا بیان کر دیا کہ کسی وقت تمہاری اولاد بھی ہلاک ہوگی۔ اس میں ایک تو یہ بتلا دیا کہ تم پر یہ واقعات وارد ہوں گے۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے امتحان

دوسرے یہ بھی بتلا دیا کہ ان واقعات سے ہم تمہارا امتحان لیں گے یہی ایک لفظ ایسا ہے کہ اگر اور کچھ بھی نہ ہوتا تو اسی سے مصیبت ہلکی ہوگئی ہوتی کیونکہ امتحان کا لفظ سنتے ہی مخاطب کو فکر ہو جاتی ہے کہ مجھے اس امتحان میں پاس ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ میں فیل ہو جاؤں اور قاعدہ ہے کہ انسان امتحان کے وقت اپنے حواس وعقل کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے پس یہ سن کر یہ واقعات بطور امتحان کے آئیں گے ہر شخص اس کی کوشش کرے گا کہ ان مواقع میں اپنے عقل وحواس کو مجتمع رکھے از خود رفتہ نہ ہو جائے کیونکہ امتحان کے وقت بدحواس ہو جانے سے آدمی فیل ہو جاتا ہے اور مصیبت کے وقت عقل وحواس قائم رکھنا بھی اس کے اثر کو بہت کم کر دیتا ہے۔ پس لنبلونکم (ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے) میں اس پر تنبیہ کر دی ہے کہ مصائب کے وقت بدحواس نہ ہونا چاہیے بلکہ ان کو امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنا چاہیے پھر اس میں صیغہ جمع متکلم اختیار فرمایا جس سے عظمت ابتلا پر دلالت ہے کیونکہ معلوم ہو گیا کہ یہ امتحان حق تعالیٰ خود لیں گے اور جیسا ممتحن عظیم الشان ہوتا ہے ویسا ہی امتحان بھی عادتاً مہتم بالشان ہوتا ہے گو واقع میں حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان عظیم نہ ہو آسان اور سہل ہی ہو مگر مخاطب کو بتلا دیا کہ وہ ابتلا عظیم کے لئے تیار رہے اور اس میں بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ پہلے سے ہم کو مطلع فرما دیا کہ تم کو ایسے ایسے واقعات پیش آئیں گے اس صورت میں تکلیف کی کلفت تو ہوگی مگر دفعتہً جو ایذاء پہنچنے کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو پہلے سے کہہ دیا جائے کہ تمہارا اپریشن کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس کو اپریشن کی تکلیف تو ہوگی مگر دفعۃً کلفت پہنچنے کا صدمہ نہ ہوگا۔

حضرات کاملین کے عشق ومحبت کا امتحان

یہاں شاید یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ غافلین کو پھراس کی کیا وجہ ہے کہ نا گوار واقعات میں حق تعالیٰ کی رحمت میں اعتقاد نہ ہو نا گوار واقعات پیش آنے کی تو یہ حکمت ہے مگر کاملین کو ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں وہ تو بد شوق نہیں ہیں جس سے ان کو تنبیہ کی ضرورت ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ اہل اللہ کاملین کو بھی ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اس شبہ کا جواب اسی آیت میں لفظ لنبلونکم سے نکلتا ہے کیونکہ اس میں اولاً حضرات صحابہ کو خطاب ہے جو سب کے سب کاملین ہیں اور ان سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو ان واقعات سے آزمائیں گے معلوم ہوا کہ کاملین پر ایسے واقعات بطور تنبیہ اور تادیب کے نہیں آتے بلکہ بطور امتحان کے پیش آتے ہیں حق تعالیٰ ناگوار واقعات سے ان کی محبت وعشق کا امتحان فرماتے ہیں اور حق تعالیٰ کو خود امتحان کی کوئی ضرورت نہیں ان کو ہر شخص کی حالت خوب معلوم ہے بلکہ اس امتحان سے دوسروں کو دکھلانا منظور ہے مثلاً ملائکہ وغیرہ کو کہ دیکھو ہمارے بندے مصائب میں بھی کیونکہ ہم کو چاہتے ہیں کاملین کو بھی مصائب میں کلفت ہوتی ہے۔ نیز لفظ لنبلونکم (ہم تم کو ضرور آزمائیں گے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین کو مصائب سے کلفت بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس آیت کے مخاطب حضرات صحابہؓ ہیں جو سب کے سب کامل ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا ان پر یہ واقعات بطور امتحان کے آتے ہیں اور بغیر احساس کلفت کے امتحان نہیں ہو سکتا رنج طبعی کو کم کرنے کی کوشش کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بلکہ حق تعالیٰ نے تو رنج طبعی کے کم کرنے کے بھی سامان کئے ہیں چنانچہ وہ باتیں تعلیم فرمائی ہیں جن کے استحضار سے رنج طبعی بھی کم ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ یعنی حضور ﷺ کو خطاب ہے کہ ان صابرین کو بشارت دے دیجئے جو مصیبت پہنچنے کے وقت یہ کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اس جملہ میں ایسا مضمون سکھلایا گیا ہے جو رنج وغم کی بنیادیں اکھاڑنے والا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی واقعہ سے صدمہ جب ہوا کرتا ہے جب وہ خلاف مرضی واقع ہوا ہو اور کوئی واقعہ خلاف مرضی جب ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شق تجویز کرلیں کہ یوں ہونا چاہیے جب اس کے خلاف دوسری شق ظاہر ہوتی ہے تو وہ ناگوار اور خلاف مرضی ہوتی ہے چنانچہ کسی عزیز کی موت پر ہم کو صدمہ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ یہ ہم سے بھی کبھی جدا نہ ہوا ہمیشہ پاس ہی رہے حق تعالیٰ نے انا للہ میں تجویز کا استیصال کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تم کو یہ مضمون پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہم خدا کی ملک ہیں خدا تعالیٰ ہمارے مالک ہیں اور ہم ان کے مملوک ہیں اور مملوک کی ہر چیز مالک کی ہوا کرتی ہے تو ہماری چیز ہی خدا ہی کی ملک ہے اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلیہ یہ ملالو کہ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے غلام کو کسی تجویز کا حق نہیں۔ جب تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے تو ہمارا کسی عزیز کی مفارقت پر اس لئے غم کرنا کہ ہم نے اس کے متعلق یہ تجویز کر رکھا تھا کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہے بڑی غلطی ہے آپ تجویز کرنے والے ہوتے کون ہیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ گھر کی مالکہ نے الماری میں برتنوں کو ایک خاص ترکیب سے رکھ دیا ہو۔ جو ماما کہ ترکیب کو دیکھ کر نالہ وشیون کرنے لگے کہ ہائے میری تجویز

کے خلاف کیوں ہوا۔ تو بتلایئے آپ اس کو احمق کہیں گے یا نہیں یقیناً ہر شخص اس کو پاگل کہے گا آخر کیوں۔ اسی وجہ سے کہ تجویز کا حق مالک کو ہے ماما کو کسی تجویز کا حق نہیں پھر حیرت ہے کہ آپ کی ادنیٰ سی ملک تو ایسی ہو کہ اس کے سامنے دوسروں کا حق باطل ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی حقیقی ملک کے سامنے آپ کی تجویز باطل نہ ہو۔ یقیناً اگر خدا تعالیٰ کو مالک حقیقی سمجھا جاتا ہے تو آپ کو اور کسی کو تجویز کا حق نہ ہونا چاہیے پس سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ نے عالم کے دو درجے بنائے ہیں۔ آسمان اور زمین جیسے الماری کے دو درجے اوپر نیچے ہوتے ہیں جس میں انہوں نے بعض ارواح کو اوپر کے درجہ میں رکھا ہے۔ یعنی آسمان میں اور بعض کو نیچے کے درجہ میں رکھا ہے یعنی زمین میں پھر وہ کبھی اس ترتیب کو بدل کر اوپر کی روحوں کو نیچے بھیج دیتے ہیں اور نیچے کی روحوں کو اوپر رکھ دیتے ہیں اور وہ مالک ہیں ان کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے۔ اس میں ہم غلاموں کا اس لئے نالہ وشیون کرنا کہ ہائے ہماری تجویز کے خلاف کیوں کیا گیا حماقت ہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا مفہوم

غرض قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) میں دو جملے ہیں پہلے جملے میں حق تعالیٰ کی مالکیت کو ظاہر کر کے بندوں کی تجویز کا استیصال کیا گیا ہے پھر جب ہم پہلے سے کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز ہی نہ کریں گے تو کوئی واقعہ ہمارے خلاف مرضی نہ ہوگا کیونکہ خلاف مرضی ہونے کا مبنیٰ تجویز ہی تھی جب وہ نہ رہی تو اب جو کچھ بھی ہوگا خلاف مرضی نہ ہوگا دوسرے جملے میں عوض ملنے پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے استحضار سے رہا سہا غم اور بھی ہلکا ہو جائے گا۔

رنج طبعی کم کرنے کی تدبیر

البتہ مفارقت کا طبعی غم اس کے بعد رہ سکتا ہے سو گو طبعی غم پر مواخذہ نہیں اور نہ وہ دفعۃً زائل ہو سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کو کم کرنے کا بھی سامان کیا چنانچہ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ (اور ہم اللہ کے پاس جانے والے ہیں) میں اس کا بھی سامان موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہم کو جو موت عزیز سے مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے تو غور کر لیا جائے کہ یہ صدمہ نفس مفارقت پر نہیں بلکہ اعتقاد مفارقت دائمہ اس کا سبب ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب یہ ہمیشہ کے واسطے ہم سے جدا ہو گیا اگر یہ خیال ذہن میں نہ جمے تو نفس مفارقت سے زیادہ صدمہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں بھی بعض دفعہ اس سے مفارقت ہوتی تھی چنانچہ کبھی ہم کو سفر پیش آتا تھا کبھی عزیز کو سفر پیش آتا تھا جس میں مہینہ دو مہینہ اور بعض دفعہ سالہا سال کی مفارقت ہوتی تھی مگر یہ اس لئے گوارا تھا کہ پھر ملاقات کی امید رہتی ہے تو اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس مفارقت کو دائمی مفارقت نہ سمجھو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں جانے والے ہو جہاں یہ عزیز گیا ہے اور وہاں اس سے ملاقات ہو جائے گی پس یہ مفارقت ویسی ہی چند روزہ مفارقت ہے جیسی دنیا میں کبھی سفر وغیرہ سے پیش آیا کرتی تھی ایک دن یہ مفارقت ختم ہو کر مبدل بہ وصال ہو جائے گی اور قاعدہ ہے کہ جس فراق کے بعد وصال کی امید ہو وہ زیادہ گراں نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال

ہے جیسے نظام حیدرآباد ایک شخص کو اپنے یہاں کسی اعلیٰ ملازمت پر بلالیں اور اس کے بھائی کو مفارقت کا صدمہ ہو نظام اس کے صدمہ کی خبر سن کر لکھ دیں کہ گھبراؤ نہیں ہم تم کو بھی بلالیں گے تو غور کر لیجئے کہ نظام کے اس خط سے غمگین بھائی کا صدمہ فوراً زائل ہو جائے گا یا نہیں یقیناً پہلا سا غم تو ہرگز نہ رہے گا۔ البتہ اب اس فکر میں پڑ جائے گا کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں اور جب تک مفارقت رہے گی اس وقت تک گن گن کر دن گزارے گا اور امید واصل میں فراق کے دن خوشی سے گزار دے گا پس ہم کو بھی کسی عزیز کی وفات پر یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ مفارقت چند روزہ ہے ایک دن خدا تعالیٰ ہم کو بھی بلالیں گے جیسا اسے بلایا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کل الینا راجعون (ہر شخص ہمارے پاس آنے والا ہے) پھر حیرت ہے کہ نظام حیدرآباد کے تو اس کہنے سے کہ ہم تم کو بھی بلالیں گے مفارقت کا غم جاتا رہے اور خدا تعالیٰ کے فرمانے سے ہلکا بھی نہ ہو غرض اس نصوص سے معلوم ہوا کہ صاحب شریعت کا مقصود یہ ہے کہ صدمہ کے وقت ہمارے زخم پر مرہم لگادیں چنانچہ حزن عقلی کے استیصال کا اور حزن طبعی کی تخفیف کا ہر طرح مکمل سامان کر دیا ہے۔

بے صبری امتحان میں ناکامی کی دلیل ہے

پھر چونکہ لَنَبْلُوَنَّكُمْ (ہم تمہارا ضرور امتحان لیں گے) سے معلوم ہو گیا کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ (وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ) آپ صابرین کو بشارت دے دیجئے۔ اس جملہ سے معلوم ہو گیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابرین ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دی جایا کرتی ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ اس میں حق تعالیٰ نے مواقع صبر کو بیان فرمایا کہ ہم تم کو ان ان واقعات سے آزمائیں گے تم ان میں صبر کرنا آگے صابرین کو بشارت دی گئی ہے۔ عام مفسرین نے تو خوف وجوع و نقص اموال وغیرہ کی تفسیر واقعات تکوینیہ سے کی ہے کہ خوف سے دشمن کا خطرہ مراد ہے اور جوع سے قحط اور نقص اموال و انفس و ثمرات سے آفات ومصائب خسران وہلاکت وقتل وموت ومرض مراد ہیں مگر امام شافعی نے بعض کی تفسیر احکام تشریعیہ سے کی ہے کہ خوف سے مراد خوف حق اور جوع سے مراد صوم ہے اور نقص اموال سے مراد زکوٰۃ وصدقات اور نقص انفس سے مراد امراض اور نقص ثمرات سے مراد موت اولاد ہے اور ان احکام تشریعیہ کی تعمیل کرنے والا صابر ہے پس صائم بھی صابر ہوا اور ایک آیت میں خود لفظ صبر کی تفسیر بعض مفسرین نے صوم کے ساتھ کی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ مفسرین نے کہا ہے کہ ای بالصوم و الصلوۃ اس لئے یہاں بھی صابرون کی تفسیر صائمون سے ہو سکتی ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ یہاں بغیر حساب سے فرمایا ہے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اجر بغیر حساب بجز صوم کے کسی طاعت کا نہیں مگر یہ اس پر موقوف ہے کہ بغیر حساب کی تفسیر بغیر حد لی جائے جیسا کہ ظاہر ومتبادر یہی ہے مگر آیت اس مضمون میں مصرح نہیں ہے اس میں دونوں احتمال برابر درجہ کے ہیں یہ احتمال بھی کہ بغیر حساب سے بغیر حد مراد ہے اور یہ احتمال بھی بغیر حساب سے مطلق

کثرت مراد ہو اس صورت میں اجر کا غیر متناہی ہونا ثابت نہ ہوگا۔ نیز آیت میں جیسے یہ احتمال ہے کہ صابر سے صائم مراد ہو یہ بھی احتمال ہے کہ مطلق صبر مراد ہو۔

حقیقت بلاء نعمت

مگر یہ احکام اپنی خاصیت سے ایسے ہیں اور ان کی جامعیت اور برکت ہے کہ ان سے منافع دینوی بھی بلاقصد نصیب ہو جاتے ہیں مگر مختلف طور پر حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات حسًا اور ظاہرًا تو بلا ہوتی ہے مگر معنیً و باطنًا نعمت ہوتی ہے یہ نکتہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد سے معلوم ہوا۔ ایک بار فرمایا کبھی نعمت بصورت بلا ہوتی ہے چنانچہ خضر علیہ السلام کا کشتی کا توڑنا ظاہر میں بلا تھی مگر حقیقت میں نعمت تھی ''نعمت کا بصورت بلا ہونا قرآن میں بھی آیا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ظاہر میں یہ بلائیں ہیں مگر اصلاح اخلاق کے اعتبار سے یہ نعمتیں ہیں کہ اس سے تربیت باطنی ہوتی ہے۔

صیغہ جمع موجب تسلی

صیغہ جمع انا لله (ہم اللہ ہی کے ہیں) بھی ایک گونہ تسلی بخش ہے کیونکہ اس میں دلالت ہے کہ میں تنہا مصیبت میں نہیں اور لوگ بھی میرے ساتھ شریک ہیں جیسے علماء نے آیت كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (یعنی تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں) میں یہی نکتہ اشتراک کا بیان فرمایا ہے اسی کے قریب نکتہ ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) جمع لانے میں اس لئے ایہام تعظیم عابد کی پروا نہیں کی گئی مگر اللہ بچاوے جہل سے ایک جاہل اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کی جگہ ایاک اعبد (میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں) پڑھتا تھا اور کہتا تھا کہ نعبد میں اپنی تعظیم ہے اسے اعبد کہنا چاہیے شاید یہ جاہل یہاں بھی انی انا اللہ (میں اللہ ہی کا ہوں) پڑھنے کی رائے دے مگر اس جاہل نے یہ نہ سوچا کہ اگر اس میں کوئی نکتہ بھی نہ ہوتا تب بھی سب سے بڑی عبدیت تو امتثال امر ہے جب اللہ تعالیٰ خود فرمائیں کہ تم اپنے کو صیغہ جمع سے تعبیر کرو تو ہم کو ایسی لفظی تواضع کی کیا ضرورت ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دریں　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(یعنی جب بادشاہ حقیقی مجھ سے طمع کرنے کی خواہش کرتے تو اس کے بعد قناعت کو ترک کردوں گا)

مگر امتثال امر میں بھی بعض کو غلو ہو جاتا ہے چنانچہ اہل ظاہر نے اس غلو سے ضروری اجتہاد کو بھی ترک کر دیا۔ یہ بھی نہ چاہیے افراط تفریط تو ہر چیز میں مذموم ہے ضرورت ہر امر میں اعتدال کی ہے۔ غرض ایاک نعبد (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کو کسی متبع احکام نے ایاک اعبد (میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں) نہیں پڑھا اسی طرح انا لله کو انی لله نہیں پڑھا باقی آجکل کے مدعیان ذوق جو حقیقت میں بدذوق ہیں اگر نعبد کو اعبد' انا لله (ہم اللہ ہی کے ہیں) کو انی

لله (میں اللہ کا ہی ہوں) کہنے لگیں تو اس کا کچھ علاج نہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ انا لله میں صیغہ جمع بھی موجب تسلی ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبتلائے مصائب میں تنہا نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت ہیں اور قاعدہ ہے مرگ انبوہ جشنے دارد چنانچہ بہت آدمی جیل میں جارہے ہوں تو وہ بھی گھر سا معلوم ہونے لگتا ہے بلکہ پچھلے دنوں تو بعض لوگ تمنا کیا کرتے تھے کہ حکومت ان کو جیل میں بھیجے کیونکہ اس جیل کے بعد قوم میں عزت ہوتی تھی تو وہ جیل جیل ہی معلوم نہ ہوتا تھا پہلے تو کوئی معمولی آدمی جیل میں جاتا تھا اب بڑے بڑے آدمی جیل جانے لگے تو جیل خانہ مصیبت نہ رہا۔ اور دیکھئے روزہ رکھنا بہت دشوار ہے مگر رمضان میں آسان ہے کیونکہ سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی مصیبت زدہ اس تسلی کے نسبت شبہ کرے اور یہ کہے کہ گو مبتلائے مصیبت دوسرے بھی ہیں دوسرے کے اوپر سب سے زیادہ مصیبت ہے مگر یہ تو تفتیش کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے سوچا کرو تو یقیناً بعضے تم سے بھی زیادہ مصیبت میں گرفتار ملیں گے۔ اب یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کیطرف لوٹنے والے ہیں) کی تعلیم سے مقصود تو اہل مصائب کی تسلی اور ازالہ حزن وغم ہے۔

مصیبت کا ایک ادب

مصیبت کا ایک ادب یہ ہے کہ زبان سے تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کی کثرت کرے اور دل سے ان باتوں کو سوچے اور ان کے ذریعہ سے اپنے نفس کو تسلی دے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہمارے حال پر کس قدر رحمت وشفقت ہے کہ ان کو ہمارا زیادہ غم گوارا نہیں گویا فرماتے ہیں کہ گو ہم نے کسی کی وجہ سے تم کو رنج دیا ہے مگر تمہارا زیادہ رنجیدہ ہونا پریشان ہونا ہم کو گوارا نہیں اس لئے مصیبت کے موقع پر تم اس اس طرح اپنے آپ کو تسلی دیا کرو اور چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ کے غم کے ناگوار ہونے کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے **ما ترددت فی شیء ترددی فی قبض نفس عبدی ارید لقائه وهو یکره الموت و لن یلقانی حتی یموت** او کما قال یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی کام میں ایسا تردد نہیں ہوتا جیسا اپنے بندے کی جان قبض کرنے میں تردد ہوتا ہے (میں اس سے ملاقات کا ارادہ کرتا ہوں اور وہ موت کو مکروہ سمجھتا ہے اور جب تک نہ مرے گا مجھ سے ہرگز ملاقات نہیں کر سکتا) اس کی تفسیر ہم نہیں کر سکتے بلکہ اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کرتے ہیں مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے ساتھ کس قدر تعلق ہے کہ موت سے جو اس کو تکلیف ہوتی ہے وہ بھی ان کو گوارا نہیں حالانکہ موت ضروری اور لابدی ہے۔

اور جس طرح مصیبت زدہ کو خود تسلی کا مضمون سکھلایا گیا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی حکم ہے مصیبت زدہ کو تسلی دیں چنانچہ تسلی دینے کی فضیلت حدیث میں بہت آئی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شفقت ورحمت کی دلیل ہے کہ خود بھی اپنے بندے کو تسلی دیتے ہیں اور کوئی دوسرا تسلی دے تو اسکو ثواب عطا فرماتے ہیں حدیث میں ہے **من عزی ثکلی کسی بردا فی الجنة** او کما قال جو ایسی عورت کو تسلی دے جس کا بچہ مر گیا ہو اس کو جنت میں بڑھیا چادر یا لباس پہنایا جائے گا اور **من عزی مصابا فله مثل اجره** او کما قال جس نے کسی مصیبت زدہ کی تسلی کی اس کو مصیبت زدہ کے برابر

ثواب ملے گا یہ تو قول کلی کے طور پر بیان تھا مقصود آیت کا اب اس کی دو چار تفریعات بیان کرتا ہوں۔

ایک یہ کہ اس آیت میں تسلی کا جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کی حقیقت مراقبہ ہے اس مضمون کو زیادہ سوچنا اور ذہن میں حاضر رکھنا چاہیے۔ خصوصاً جس وقت رنج وغم کا غلبہ ہوا اور اگر کسی وقت مراقبہ دشوار ہو تو زبان ہی سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کی کثرت رکھے۔ کہ حق تعالیٰ سے ہماری کوئی قرابت نہیں اور اسی سلسلہ میں قرابت کے موہم الفاظ کے استعمال کو خلاف ادب بتلایا تھا مگر باوجود قرابت نہ ہونے کے پھر بھی ان کی شفقت و رحمت ہمارے ساتھ بے انتہا ہے۔ چنانچہ کیا یہ عین شفقت و رحمت نہیں ہے کہ جو مشقت ہم اپنے اختیار سے برداشت کریں اس پر بھی اجر اور جو بلا اختیار وارد ہو جائے اس پر بھی اجر اور گو باوجود قرابت نہ ہونے کے حق تعالیٰ سے ہمارا ایسا تعلق ہے جس کے مقابلہ میں نہ قرابت کوئی چیز ہے نہ ابوۃ و بنوۃ اور بعض صوفیہ تو اس تعلق کی تفسیر میں بہت آگے پہنچ گئے ہیں کس کا تحمل عقول عامہ کو نہیں ہو سکتا مگر اتنی بات تو سب سمجھ سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ رحمت بلا علت ہے اس سے بڑھ کر کیا تعلق ہوگا اور اس شدت تعلق کا مقتضا بھی یہی ہے کہ وہ ہم پر خاص توجہ فرمائیں تو پھر ہر حال میں اجر دینا کیا عجیب ہے سو یہ شدت تعلق اس کا یہ مقتضا مسلم مگر اس کے ساتھ استغناء حق پر بھی تو نظر کی جائے جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے تو اس پر نظر کرنے سے پھر عقل کا فتویٰ یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کوئی نفع نہ پہنچائیں کیونکہ جب ان کا کوئی کام ہمارے اوپر اٹکا ہوا نہیں اور وہ تمام عالم سے مستغنی ہیں تو وہ ہم پر کوئی انعام کیوں کریں؟ کیونکہ سلاطین جو کسی پر انعام کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو بھی رعیت کی احتیاج ہے وزراء وافسران فوج کو خوش رکھنے کی ان کو ضرورت ہے تاکہ رعیت باغی نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کو کسی کے خوش رکھنے کی ضرورت نہیں وہ جس پر رحمت فرماتے ہیں بلا سبب اور بلا علت فرماتے ہیں۔

لطف بشارت

الغرض حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ مشاق اختیاریہ وغیر اختیاریہ دونوں پر ثواب کی بشارت ہے اور بشارت بھی بلا واسطہ نہیں بلکہ رسول ﷺ کے واسطہ سے بشارت دلوائی ہے بظاہر بشارت بلا واسطہ کو ترجیح معلوم ہوتی ہے چنانچہ بعض مقامات پر اسی وجہ سے بلا واسطہ بھی وارد ہے مگر عام قاعدہ یہ ہے کہ سلطان عظیم الشان کی بشارت بلا واسطہ سے ہیبت میں اضافہ ہو کہ حواس گم ہو جاتے ہیں اور بشارت کا لطف حاصل نہیں اس لئے حضور ﷺ کے واسطہ سے بشارت دلوائی ہے کہ آپ ہم جنس بھی ہیں ہم نوع بھی ہیں بلکہ مثل عین کے ہیں چنانچہ اسی لئے قرآن میں حضور ﷺ کے لئے کسی جگہ تو منهم فرمایا کسی جگہ مثلکم اور کسی جگہ من انفسکم اور ظاہر ہے کہ نفس شیء و عین شیء کے ایک ہی معنی ہیں اور اس معنی کا مصداق آپ میں یہ کہ آپ مسلمانوں کو جان سے زیادہ محبوب ہیں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ آپ ﷺ مسلمانوں کو ان کی جان سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور محبّ و محبوب کو ایک گونہ اتحاد ہوتا ہے یہی مراد ہے صوفیہ کی عین سے لوگوں نے اس سے عین باصلاح سمجھ لیا اور اعتراض کرنے لگے ورنہ اس میں اعتراض کی بات کیا ہے محاورات میں دوسرے کو کہہ دیا کرتے ہیں کہ تم غیر تھوڑا ہی ہو اور جب غیر نہ ہوا تو عین ہوگا بس جو عین کے یہاں ہیں وہی صوفیہ کے کلام

میں ہیں مگر نااہلوں کے سامنے ایسے الفاظ جو ان کی عقول سے بالا ہوں کلموا الناس علی قدر عقولھم (لوگوں سے ان کے عقلوں کے اندازہ پر گفتگو کرو) غرض اللہ تعالیٰ نے اس بشارت میں بھی ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے چونکہ بشارت بلا واسطہ ہے بوجہ غایت عظمت حق تعالیٰ کے ہیبت ہوتی اور بشارت کا پورا لطف نہ آتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے بواسطہ بشارت دلوائی بات میں واسطہ بھی حضور ﷺ کا ہے جو مسلمانوں کو اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں پھر آپ کو بھی یہ نہیں فرمایا کہ اخبر یا نبی یعنی خبر دیجئے بلکہ بشر فرمایا اور بشارت وہ خبر ہے جس سے سننے والے کا چہرہ کھل جائے چہرہ پر اسی کے آثار نمایاں ہو جائیں پس اگر کوئی بشارت بھی نہ ہوتی تو بشر کا لفظ ہی ہمارے خوش ہونے کو کافی تھا مگر اس پر بس نہیں ہے بلکہ آگے بھی دلجوئی کے بہت سے سامان جمع فرمائے گئے ایک یہ کہ ان کو صابوین خطاب دیا اور اس معزز جماعت میں شامل کیا جس میں انبیاء علیہم السلام سب سے پیش پیش ہیں یہ صبر تو پہلا درجہ کا ہے۔ صبر کے بعد یہ ہے الَّذِيْنَ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ الخ (وہ لوگ جبکہ ان کو تکلیف پیش آتی ہے) جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ صابر ایسے ہیں کہ صبر کے بعد اپنے دل کو تھام لیتے ہیں۔ بس یہ دوسرا درجہ تسلی کا ہے اور تسلی بھی کس طرح دیتے ہیں اس کا طریقہ خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؁ جب مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس میں لفظ اذا کا اختیار فرمانا منجانب اللہ ایک مستقل تسلی ہے کیونکہ لغت عرب میں اذا تیقن کے موقعہ پر بولا جاتا ہے شرط کا وقوع متیقن ہو تو اس میں بتلا دیا گیا کہ اے مخاطبو دنیا میں تو مصیبت کا پیش آنا یقینی ہے اس کیلئے پہلے ہی سے تیار رہو اور یہ بھی رحمت ہے کہ پہلے سے انسان کو خبردار کر دیا جائے کہ تجھے ایسا واقعہ پیش آنے والا ہے علماء نے سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (یعنی اب تو بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے ان کو ان کے قبلہ سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس نے بدل دیا میں یہی نکتہ بیان فرمایا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں دنیا میں مصیبت ضرور آئے گی کیونکہ انسان دنیا میں مشقت ہی کے واسطے پیدا ہوا ہے یہاں چین کہاں؟

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ؁ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؁ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ؁ **ترجمہ**: آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے اور ہم سب اللہ ہی کے پاس جانے والے ہیں ان لوگوں پر خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کو رسائی ہوگی۔

مصائب غیر اختیاریہ پر ثواب کی بشارت

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں مصائب اور بلیات کا تذکرہ ہے یعنی مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ہم تم کو مختلف مصائب و بلیات سے آزمائیں گے یعنی تمہارا امتحان لیں گے۔ یہ عنوان اس لئے اختیار فرمایا تاکہ بندوں کو مصائب و بلیات سے توحش نہ ہو بلکہ وہ اس کے لئے پہلے سے آمادہ رہیں اور ظاہر ہے کہ انسان جس چیز کے لئے پہلے سے آمادہ رہتا ہے وہ زیادہ پریشانی کا سبب نہیں بنتی۔ پھر اس کو امتحان و آزمائش قرار دینے سے ہر شخص کو اس بات کی فکر ہو

گی کہ اس امتحان میں کامیابی حاصل ہونا کامی کا سامنا نہ ہو اور کامیابی کا طریقہ آگے صبر بتلایا ہے تو پہلے ہی سے صبر کی تیاری کرے گا اور تکمیل کی کوشش کرے گا تو یقیناً وقت پر مصیبت کا اثر بہت ہی معمولی رہ جائے گا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جن مصائب و بلیات کا اس مقام پر ذکر ہے ان کی تفسیر مختلف ہے بعض تفاسیر پر ان سے تکوینی مصائب ہیں یعنی مصائب غیر اختیاریہ چنانچہ خوف سے ناگہانی خوف مراد لیا ہے جیسے ڈاکو چور درندہ وغیرہ کا خوف اور جوع سے فاقہ جس کا سبب عسرت و افلاس اور نقص اموال سے ناگہانی نقصان مال جیسے تجارت میں نقصان ہو گیا یا مال چوری ہو گیا اور نقص انفس سے عزیزوں کی موت جو کسی مرض یا وبا کی وجہ سے ہو جائے اور نقص ثمرات سے باغات کا نقصان جیسے بجلی یا پالے یا آندھی سے پھل گر جائیں یا خراب ہو جائیں وغیرہ وغیرہ اور بعض تفاسیر پر ان کا محل تکالیف تشریعیہ ہیں یعنی وہ امور اختیاریہ جن کا شریعت نے انسان کو مکلف کیا ہے چنانچہ امام شافعی سے جوع کی تفسیر روزہ سے اور نقص ثمرات کی تفسیر زکوٰۃ سے اور خوف اور نقص انفس کی تفسیر جہاد سے منقول ہے اور چونکہ کسی نے کسی تفسیر کو غلط نہیں کہا اس لئے یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں مصائب تکوینیہ بھی تشریعیہ بھی اور جو ثواب مصیبت پر صبر کرنے کا اس جگہ مذکور ہے وہ دونوں پر متفرع و مرتب ہوگا اور چونکہ امت نے دونوں تفسیروں کو قبول کر لیا ہے اس لئے تلقی امت بالقبول (امت کی قبولیت) کے بعد کسی کو اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال (یعنی جب احتمال نکل آئے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے) کہنے کا موقع نہیں رہا'' یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید کوئی ذہین طالب اشکال کرے کہ جب آیت کی تفسیر میں اختلاف ہو تو اس سے کچھ بھی ثابت نہ ہوا'' جواب یہ ہے کہ اذا جاء الاحتمال (جب احتمال نکل آئے) اس مقام کے لئے ہے جہاں دونوں شقوں کا حکم جمع نہ ہو سکے اور جہاں دونوں شقیں حکم میں جمع ہو سکیں اور امت نے دونوں کو قبول بھی کر لیا ہو وہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پس سبحان اللہ حق تعالیٰ کو کس قدر رحمت ہے کہ امور اختیاریہ پر تو اجر ملتا ہی ہے غیر اختیاریہ پر بھی اجر عطا فرماتے ہیں۔ جو مشقت انسان اپنے اختیار سے اٹھائے اس پر تو استحقاق اجر ہو سکتا ہے مگر جو مصیبت بلا اختیار و ارادہ کے وارد ہو اس پر اجر دینا رحمت ہی رحمت ہے اور اگر زیادہ غور کیا جائے تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ طاعات اختیاریہ پر اجر ملنا بھی رحمت ہے کیونکہ طاعات تو غذا روحانی ہیں جن سے ہم کو ہی نفع ہوتا اور ہمارے باطن کو غذا ملتی ہے تو ان طاعات کے بعد اجر عطا فرمانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو دعوت کھلا کر دانت گھسائی کے دو روپے بھی دیئے جائیں۔ اسی طرح مجاہدات غیر اختیاریہ کی ایسی مثال ہے جیسے مسہل دیا جاتا ہے اب اگر کوئی طبیب مسہل دے کر مریض کو دو روپے بھی دے تو یہ عنایت ہے یا نہیں؟ پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ہماری کوئی قرابت اور رشتہ داری تو ہے نہیں اور جن لوگوں نے قرابت جتلائی تھی ان کو بہت سختی کے ساتھ زجر کیا گیا ہے اور ایسا سخت خطاب کیا گیا کہ وہ دم بخود ہی رہ گئے وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (یعنی یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں آپ یہ پوچھئے کہ اچھا تو پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض عذاب کیوں دیں گے بلکہ تم بھی منجملہ اور مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو) یہ تو ان کے متعلق ارشاد ہے جنہوں نے اپنے کو حق تعالیٰ کا قرابت دار بتلایا تھا

اور جنہوں نے دوسرے مقبولین کو اللہ کا قرابت دار ٹھہرایا تھا ان پر تو بہت مقامات میں انکار و وعید مذکور ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولا درکھتا ہے سبحان اللہ بلکہ خاص اللہ تعالیٰ کی مملوک ہیں جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور سب ان کے خادم بھی ہیں۔ حق تعالیٰ موجد بھی ہیں آسمانوں اور زمین کے اور جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس اس کی نسبت فرما دیتے ہیں کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے) اسی طرح جا بجا مختلف طریقوں سے ابنیت کا ابطال فرمایا ہے اور گو یہ دلائل ابنیت حقیقیہ کی نفی کرتے ہیں اور یہود و نصاریٰ ابنیت حقیقیہ کے قائل نہ تھے صرف ابنیت مجازیہ کے قائل تھے مگر حق تعالیٰ نے ابنیت حقیقیہ کے ابطال سے اس بات پر ہم کو متنبہ فرمایا ہے جس بات سے اللہ تعالیٰ منزہ ہیں اور اس کا ثبوت حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے محال اور خلاف شان ہے اس کے ایہام سے بھی بچنا واجب و لازم ہے کیونکہ موہم الفاظ کا استعمال کرنا خلاف ادب ہے۔

جو امتحان میں پاس ہوں اور اس سے بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بے صبری فیل ہونے کا سبب ہے پھر اس جگہ بشر بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ تو صابرین کو بشارت دے دیجئے تفصیل نہیں کہ کس چیز کی بشارت دے دیجئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوش خبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل کردی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا ان ہی میں بشارت کا حصر ہو جائے گا اور جب اجمالاً کہہ دیا گیا کہ صابرین کو خوشی ہونے کی خبر دے دیجئے تو اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے جس سے تمام خوش ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گا اور یہ کام حق تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کی خواہش کو پورا کردیں۔

غرض بشر کا عموم قدرت کے عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اس میں بجائے نبشــر (ہم بشارت دیتے ہیں) صیغہ متکلم کے بشر صیغہ امر اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ بشارت بواسطہ زیادہ موثر ہوتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ہم سے خود تکلم فرماتے ہیں تو غلبہ جلال و ہیبت ایسا ہوتا کہ اس غلبہ کے سامنے لذت بشارت حاصل نہ ہوتی اور جنت میں ہمارے قویٰ بڑھ جائیں گے وہاں ہم کو اس ہیبت و جلال کا تحمل ہو جائے گا تو تکلم بلا واسطہ مفید ہو گا۔ باقی دنیا میں تکلم بلا حجاب کا ہم کو تو کیا تحمل ہوتا حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو بھی تحمل نہ ہوا ان سے بھی حجاب کے ساتھ کلام ہوا ہے۔

صابرین کو بشارت

حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان غم سے پریشان نہ ہوں چنانچہ اسی لئے پیشگی اطلاع فرما دی کہ ہم تم کو طرح طرح کی تکالیف سے آزمائیں گے تا کہ دفعتہً کلفت آنے سے پریشانی نہ ہو۔ پہلے سے اس کے لئے آمادہ رہیں پھر چونکہ لنبلونکم سے معلوم ہو گیا ہے کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ وبشـر الـصـبرين اور

صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو۔
اس جملہ سے معلوم ہو گیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابرین ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دی جایا کرتی ہے جو امتحان میں پاس ہوں اور اس سے بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بے صبری فیل ہونے کا سبب ہے۔
پھر اس جگہ بشر میں بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضور کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ ﷺ تو صابرین کو بشارت دے دیجئے تفصیل نہیں کی کس چیز کی بشارت دے دیجئے اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوشخبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل کر دی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا انہی میں بشارت کا حصر ہو جائے گا اور جب اجمالاً کہہ دیا گیا کہ صابرین کو خوش ہونے کی خبر دے دیجئے تو اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے جس سے تمام خوش ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گی اور یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کی خواہش پوری کر دیں۔

صابرین کو دنیوی جزا

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ یعنی صابرین پر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی۔ اس میں صابرین کے لئے دوسری بشارت ہے جو بلاواسطہ سنائی گئی ہیں۔
بشر الصابرین میں بشارت بواسطہ تھی یہ بلاواسطہ ہے اور یہ مبنی ہے اس قاعدہ پر کہ تاسیس تاکید سے اولیٰ ہے۔
بعض علماء نے اس کو بشر الصابرین ہی کا بیان سمجھا ہے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ مستقل کلام ہے ماقبل کا بیان نہیں کیونکہ دونوں مستقل آیتیں ہیں۔ پس ظاہر یہی ہے کہ دونوں کا مفہوم بھی مستقل ہو بیان کہنے میں یہ آیت مضمون سابق کی تاکید ہو گی اور مستقل ماننے میں تاسیس ہے اس لئے یہی اولی ہے۔ پس میرے ذوق میں بشر الصابرین میں بواسطہ بشارت ہے اور اس جملہ میں بلاواسطہ بشارت ہے۔

تیسری بشارت

بہرحال اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ صابرین پر خاص و عام دونوں طرح کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ خاص رحمت تو آخرت میں ہو گی اور رحمت عامہ کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے صابرین کو صبر و استقلال کا ثمرہ دنیا میں بھی حق تعالیٰ کھلی آنکھوں دکھلا دیتے ہیں بشرطیکہ صبر کی حقیقت صحیح طور پر موجود ہو اس کے بعد ایک تیسری بشارت تو ایسی بیان فرمائی ہے کہ وہ جزا تو ہر صابر مومن کو ضرور ہی حاصل ہے۔ یعنی وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ کہ یہی لوگ راہ صواب پر چلنے والے ہیں۔ صاحبو جو شخص ناگوار واقعات میں شریعت پر کامل طور پر جما رہتا ہے گو ظاہر میں اس کو کیسی ہی کلفت ہو مگر دل میں اس کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ خدا کے فضل سے میں حق پر ہوں۔ (فضائل صبر و شکر)

ایک آیت کی تفسیر سے شبہ کا ازالہ

ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم میں لم تقولون مالا تفعلون. یعنی کیوں کہتے ہو وہ جو خود نہیں کرتے۔ اس کے ظاہر سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جو شخص خود کوئی نیک عمل نہیں کر رہا اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو اس نیکی کی طرف دعوت دے حالانکہ تصریحات یہ غلط ہے۔ اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اس کو دعوت پر محمول کر لیا حالانکہ یہ آیت دعوت کے متعلق نہیں بلکہ دعویٰ کے متعلق ہے اور مراد یہ ہے کہ جو وصف تم میں موجود نہیں اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام تم نے کیا نہیں یا جو وصف تم میں موجود نہیں اس کا دعویٰ نہ کرو۔

اہل اللہ کی شان

الذین اذا اصابتھم مصیبة فرمایا ان اصابتھم نہیں فرمایا اذا یقین کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور ان احتمال کے موقعہ پر پس اِذَآ اَصَابَتْهُمْ میں بتلایا گیا کہ مصیبت تو آوے ہی گی۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نو   زجام دہر مئی کل من علیھا فان

اور اس علم کے بعد مصیبت سے وہ غم نہیں ہوتا جو دفعۃً آنے سے ہوتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اھل اللہ بڑے عاقل ہیں جو موت کو ہر دم یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان پر موت دفعۃً نہ آئے گی اس لئے ان کو موت سے وحشت ہی نہ ہو گی دنیادار اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں یہ غلط ہے وہ بہت سے بہت آ کل ہیں عاقل نہیں ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے دل میں حساب وکتاب ومعاش کا لگاتے رہتے ہیں اور بڑے بڑے منصوبے قائم کرتے ہیں اور وہ حساب وکتاب پورا ہوتا نہیں کیونکہ

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ   تجرب الاریاح بما لا تشتھی السفن

انسان کی ہر آرزو پوری نہیں ہوا کرتی بلکہ ہوائیں کبھی کشتی کے خلاف بھی چلتی ہیں

تو جب خلاف امید واقعات ان کو پیش آتے ہیں اس وقت سخت پریشانی کا سامنا ہوتا ہے اور اہل اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ سمجھتے ہیں شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود (الجبر بالصبر)

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ترجمہ: وہ لوگ ایسے ہیں جبکہ ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔

تقلیل غم اور تسہیل حزن کا طریقہ

عارفین نے اس مضمون پر غور کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ اس میں حق تعالیٰ نے تقلیل غم وتسہیل حزن کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کو یہ مطلوب نہیں کہ غم بڑھایا جائے بلکہ اس کا کم کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ اول توانا للہ (ہم اللہ ہی کے ہیں) کی تعلیم ہے کہ یوں سمجھو کہ تم خدا کے ہو اور تمہاری ہر چیز خدا کی ہے پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہاری ذات میں یا متعلقین ومتعلقات میں کچھ تصرف کریں تو تم کو ناگواری کا کیا حق ہے اور جن عارفین نے وحدۃ الوجود کو ظاہر کیا ہے جن میں اول شیخ

ابن عربی ہیں وہ تو یوں کہتے ہیں کہ ہمارا وجود ہی کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ ہم کسی شے کے مستحق ہوں عارفین کی تو اسی سے تسلی ہوگئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں بلکہ اصل مالک اور اصل موجود حق تعالیٰ ہیں دنیا و آخرت دونوں انہیں کے ہیں ان کو اختیار ہے کہ جب چاہیں کسی کو دنیا میں رکھیں اور جب چاہیں آخرت کی طرف بلالیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے پاس ایک الماری ہو جس کے اندر متعدد تختے لگے ہوئے ہوں اور اس نے ایک خاص ترتیب سے برتنوں کو ان میں لگا رکھا ہو اب کسی وقت وہ اس ترتیب کو بدل دے اور نیچے کے برتن اوپر اور اوپر کے نیچے رکھ دے تو کسی کو اعتراض یا ناگواری کا کیا حق ہے؟ اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں عالم کے دو تختے ہیں ایک دنیا ایک آخرت اگر وہ کسی وقت ان کی موجودات کی ترتیب کو پلٹ دیں کہ اوپر کی ارواح کو نیچے بھیج دیں اور نیچے کی ارواح کو اوپر بلالیں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے؟ وہ الماری کے بھی اور اس کے برتنوں کے بھی مالک ہیں تم کھڑ بڑ کرنے والے کون ہو؟ عارفین کو تو اس سے پوری تسلی ہوگئی مگر اہل ظاہر کو صرف عقلی تسلی ہوئی اور طبعی غم مفارقت کا باقی رہا تو اس کی تقلیل و تسہیل کے لئے آگے تعلیم فرماتے ہیں کہ تم یوں سمجھو اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؁ (ہم اس کی طرف پھر لوٹ کر جانے والے ہیں) کہ ایک دن ہم بھی وہیں جانے والے ہیں جہاں ہمارا عزیز گیا ہے اس تصور سے مفارقت کا غم بھی ہلکا ہو جائے گا اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدرآباد نے ایک بھائی کو دکن بلا کر وزیر کر دیا دوسرا بھائی مفارقت کے غم میں رونے لگا نظام نے اس کو لکھ بھیجا کہ ارے تو کیوں روتا ہے تجھے بھی عنقریب یہیں بلا لیا جائے گا اس مضمون سے دوسرے بھائی کی یقیناً تسلی ہو جائے گی تو یہاں اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؁ کا مطلب یہی ہے کہ تم مفارقت کا غم نہ کرو بہت جلدی تم بھی وہیں جاؤ گے جہاں تمہارا عزیز گیا ہے۔ عارفین کو یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہتا ہے اس لئے ان کو مفارقت حبیب کا زیادہ غم نہیں ہوتا۔

مصیبت کا آنا یقینی ہے

یہیں سے نکتہ معلوم ہوتا ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ فرمایا ان اصابتھم نہیں فرمایا کیونکہ اذا یقین کے موقع پر استعمال ہوتا ہے اور ان احتمال کے موقع پر پس اذا اصابتھم میں بتلا دیا گیا کہ مصیبت تو آوے ہی گی۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید　　زجام دہر مے کل من علیھا فان

جو بھی پیدا ہوا ضروری طور پر اسے فنا کی شراب زمانے کے پیالے سے پینی ہوگی

علم کے بعد مصیبت سے وہ غم نہیں ہوتا جو دفعتہً آنے سے ہوتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ بڑے عاقل ہیں جو موت کو ہر دم یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان پر موت دفعتہً نہ آئے گی اس لئے ان کو موت سے وحشت بھی نہ ہوگی۔ (الجبر بالصبر)

تمام غموم اور احزان کا علاج

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؁ تمام غموم و احزان کا علاج ہے اگر اس کو شرائط سے استعمال کیا جائے۔ اب اس کے

شرائط سنئے۔ مگر تمام شرائط کو تو کون ادا کرے گا اور میں ہی کیا ادا کروں گا مگر سب سے ادنیٰ شرط تو یہ ہے کہ اس کو تفکر وفہم معنی سے ادا کیا جائے۔ محض طوطے کی طرح بے سمجھے بوجھے نہ کیا جائے۔ اب سنئے اس کے معنی کیا ہیں۔ اس میں پہلا جملہ تو یہ ہے اناللہ۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ بے شک ہم سب خدا ہی کی ملک ہیں۔ وہ ہمارے اور تمام چیزوں کے مالک ہیں۔ ہم کسی چیز کے مالک نہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان کے بھی مالک نہیں۔ یہ جان بھی خدا ہی کی ملک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی جان میں بھی ہم کو ہر طرح کا تصرف جائز نہیں خودکشی حرام ہے۔ مضر چیزیں کھانا جائز نہیں ہے۔ اپنے کو ذلیل کرنا' رسوا کرنا ممنوع ہے۔ آخر کیوں۔ اس لئے کہ تم اپنی جان کے مالک نہیں ہو۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی امانت ہے بدوں اس کے اذن کے تم کوئی تصرف اس میں نہیں کر سکتے اگر کرو گے مواخذہ ہوگا جب تم اپنی جان کے مالک نہیں۔ تو مال واولاد واعزہ واقرباء کے تو کیونکر مالک ہو سکتے ہو۔ مال جائیداد گھر بار جو کچھ ہے برائے نام تمہاری ملک ہے اور یہ برائے نام ملک بھی اس لئے مقرر کی گئی ہے تاکہ نظام عالم میں اختلال نہ ہو۔ ورنہ کسی کے پاس کوئی چیز بھی نہ رہا کرتی۔ اگر شریعت بندوں کو مالک نہ کہتی تو خدا کی چیز سمجھ کر ہر شخص اس کو چھیننا چاہتا۔ اس لئے برائے نام تم کو مالک بنا دیا گیا ہے مگر حقیقت میں ہر چیز اس کی ملک ہے۔

در حقیقت مالک ہر شے خداست ایں امانت چند روزہ نزد ماست

ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملاؤ کہ مالک کو اپنی مملوکات میں ہر طرح کا اختیار ہوتا ہے وہ جیسا چاہے تصرف کرے۔ دوسرے کو کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ اس مضمون کے استحضار کے بعد کسی مصیبت اور کلفت سے بھی پریشانی نہیں ہو سکتی کیونکہ سارے غم کی جڑ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہیں۔ یہ مال ہمارا ہے جائیداد ہماری ہے۔ بیوی بھی ہماری ہے اولاد بھی ہماری ہے۔ پھر اس میں طرح طرح کی تجویزیں کرتے ہیں کہ یہ مال بڑھنا چاہیے۔ ہمارے ہی پاس رہنا چاہیے۔ ضائع نہ ہونا چاہیے۔ باغ میں ہمیشہ پھل آنے چاہئیں۔ اولاد کے متعلق تجویزیں کرتے ہیں کہ یہ پھلیں پھولیں۔ بڑے ہوں۔ کمائیں کھائیں۔ ہماری خدمت کریں۔ اسی طرح تمام چیزوں کے متعلق ہم ایسی ایک تجویز ذہن میں قائم کر لیتے ہیں کہ یوں ہونا چاہیے۔ اس کے خلاف نہ ہونا چاہیے۔ پھر جب اس کے خلاف ہوتا ہے تو رنج غم ہوتا ہے کہ ہائے میں نے تو یہ امید کر رکھی تھی مجھے تو یہ توقع تھی۔ یہ کیا ہو گیا پس انا للہ میں ان تمام تجاویز کی جڑ کٹ گئی کہ تم کو کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز قائم کرنے کا حق نہیں کیونکہ تم اور یہ سب چیزیں خدا کی ملک ہو۔ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے۔ غلام کو کیا حق ہے کہ وہ مالک کی چیزوں میں تجویزیں لگاتا پھرے۔ (ایواء الیتامی)

جذبات طبعیہ کی رعایت

مرنے سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں اس سے زیادہ کوئی امر پریشان کن نہ تھا پھر اس کے بارے میں کیسی عمدہ تعلیم فرمائی ہے کہ قرآن شریف میں ہے اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ کہ ان پر مصیبت آتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس کے اندر ہم کو تسلی کا طریقہ بتلایا ہے کہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ کہنے سے تسلی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو مصیبت میں تو اس

کو پڑھا تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا تو جواب یہ ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھنے کو کس نے کہا تھا بلکہ ساتھ اس کی حقیقت پر بھی تو غور کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ مصیبت آنے پر دو باتوں کا لحاظ رہے۔

ایک تو یہ کہ ہم خدا کی ملک ہیں۔ ہم اپنے نہیں۔ جب خدا کے ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جیسے چاہیں ہم میں تصرف کریں۔ یہاں رکھیں یا اٹھالیں۔ اس میں تو عقل کی تسلی ہوگئی۔ دوسری یہ ہے کہ جہاں ہمارے عزیز چلے گئے ہم بھی وہیں چلے جائیں گے۔ اس میں طبع کی رعایت ہے۔ ایک عقل ہے اور ایک طبعیت عقل انا للہ سے راضی ہوگئی تھی کیونکہ عقل تسلیم کرتی ہے کہ ہم اللہ کے ہیں تو پھر ہم کو ان کے کسی تصرف پر رنج کا کیا حق۔ ان کو اختیار ہے جیسا چاہیں کریں مگر طبع ابھی راضی نہ ہوئی تھی کہ باپ مرگیا اس کے مرنے کا کیسے رنج نہ ہو۔ تعلق ہی ایسا ہے کہ خواہ مخواہ رنج ہوتا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔ اس لئے دوسرا جملہ طبع کے سنبھالنے کو بتلایا کہ جس عشرت کدہ میں وہ گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جلدی ہی ملاقات ہوجائے گی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو حیدرآباد کی وزارت کا عہدہ مل گیا اور وہ وہاں چلا گیا۔ اس کے بیٹے کو اس کے چلے جانے سے سخت صدمہ ہوا اور اس سے کہا گیا کہ تم کیوں گھبراتے ہو وہ تو بڑے عیش میں ہے وزارت کے عہدہ پر ہے اور تم بھی عنقریب وہیں بلالئے جاؤ گے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا صدمہ اس کو سن کر باقی رہے گا۔ یہ دوسرا جملہ (وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝) طبع کی تسلی کے لئے بڑھایا ہے۔

دوسرے عارفین نے اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ کے مضمون پر غور کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ اس میں حق تعالیٰ نے تقلیل غم و تسہیل حزن کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کو یہ مطلوب نہیں کہ غم کو بڑھایا جائے بلکہ اس کا کم کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ اول تو انا للّٰہ کی تعلیم ہے کہ یوں سمجھو کہ تم خدا کے ہو اور تمہاری ہر چیز خدا کی ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہاری ذات میں یا متعلقین و متعلقات میں کچھ تصرف کریں تو تم کو ناگواری کا کیا حق ہے اور جن عارفین نے وحدۃ الوجود کو ظاہر کیا ہے جن میں اول شیخ ابن عربی ہیں وہ تو یوں کہتے ہیں کہ ہمارا وجود ہی کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ ہم کسی شے کے مستحق ہوں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے پاس ایک الماری ہو جس کے اندر متعدد تختے لگے ہوں اور اس نے ایک خاص ترتیب سے برتنوں کو ان میں لگا رکھا ہو اب اگر کسی وقت وہ اس ترتیب کو بدل دے اور نیچے کے برتن اوپر اور اوپر کے نیچے رکھ دے تو کسی کو اعتراض یا ناگواری کا کیا حق ہے؟

اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں عالم کے دو تختے ہیں۔ ایک دنیا اور ایک آخرت اگر وہ کسی وقت ان کی موجودات کی ترتیب کو پلٹ دیں کہ اوپر کی ارواح کو نیچے بھیج دیں اور نیچے کی ارواح کو اوپر بلالیں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے وہ الماری کے بھی اور اس کے برتنوں کے بھی مالک ہیں۔ تم گڑبڑ کرنے والے کون ہو؟

عارفین کو تو اس سے پوری تسلی ہوگئی مگر اہل ظاہر کو صرف عقلی تسلی ہوئی اور طبعی غم مفارقت کا باقی رہا تو اس کی تقلیل

وتسہیل کے لئے آگے تعلیم فرماتے ہیں کہ تم یوں سمجھو انا الیہ راجعون کہ ایک دن ہم بھی وہیں جانے والے ہیں جہاں ہمارا عزیز گیا ہے اس تصور سے مفارقت کا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد نے ایک بھائی کو دکن بلا کر وزیر کر دیا۔ دوسرا بھائی مفارقت کے غم میں رونے لگا۔ نظام نے اسکو لکھ بھیجا کہ ارے تو کیوں روتا ہے۔ تجھے بھی عنقریب یہیں بلا لیا جائے گا۔ اس مضمون سے دوسرے بھائی کی یقیناً تسلی ہو جائے گی تو یہاں انا الیہ راجعون کا مطلب یہی ہے کہ تم مفارقت کا غم نہ کرو۔ بہت جلدی تم بھی وہیں جاؤ گے جہاں تمہارا عزیز گیا ہے۔ عارفین کو یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہتا ہے اس لئے ان کو مفارقت حبیب کا زیادہ غم نہیں ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک بڈھا روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ دیکھو کیسی عجیب بات ہے ایک قیدی قید سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا رو رہا ہے کہ ہائے یہ قید سے کیوں نکل رہا ہے۔ پھر فرمایا تم بھی ایک دن اسی طرح قید سے چھوٹ جاؤ گے۔ میں نے دل میں کہا کہ اور بیوی کو چھڑانے آؤ تم بھی منگوائے گئے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ
ترجمہ: اور جو مومن ہیں ان کو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ قوی محبت ہے۔

تفسیری نکات

ایمان کے لئے شدت محبت الٰہی لازم ہے

حاصل جملہ آیت کا یہ ہوا کہ مسلمان خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہوتے ہیں ترجمہ سن کر معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس مقام پر ایک جملہ خبریہ ارشاد ہوا لیکن بقاعدہ مذکورہ یہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس خبر سے ایک نتیجہ مقصود ہے اور وہی اس خبر کا ثمرہ ہے لیکن بصورت خبر اس لئے بیان فرمایا کہ یہ حکم بہت ہی مہتم بالشان ہو جائے جیسا کہ علم بلاغۃ میں ثابت ہو چکا ہے کہ اس تعبیر میں یہ نکتہ ہوتا ہے کہ مخبر صادق کے کلام میں خبر تو ضروری الوقوع ہے ہی پس انشاء کو اس کی صورت میں لانا تحریض ہے سامع کو کہ اس کو ضرور واقع کرے تا کہ صورت عدم وقوع کی نہ ہو اور وہ نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ کی محبت میں نہایت مضبوط ہونا چاہیے اور خدا تعالیٰ کے برابر کسی کی محبت اس کے دل میں نہ ہونی چاہیے۔ اب دیکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ جو شان مومن کی خدا تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ ہم میں پائی جاتی ہے یا نہیں یعنی ہم خدا تعالیٰ کی محبت میں پورے طور سے مضبوط ہیں یا نہیں اگر پورے طور سے مضبوط ہیں تو ہم وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کے پورے مصداق ہیں ورنہ جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجے کا ایمان بھی ہوگا یعنی یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ کسی مسلمان کو خدا تعالیٰ سے بالکل ہی محبت نہیں تھوڑی بہت تو سب کو ہی ہے کیونکہ یہ اس آیت کی رو سے ایمان کے لئے لازم ہے اور انتفاء لازم مستلزم ہوتا ہے انتفاء

ملزوم کو پس اگر محبت کی بالکل نفی کی جائے تو اس کے ساتھ ہی ایمان کی بھی نفی کردینی پڑے گی حالانکہ ایمان بحمد للہ ہم سب میں پایا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ محبت سب میں ہے بلکہ محبت کے ساتھ اس کی شدت بھی ہر مومن میں پائی جاتی ہے اسی آیت کی رو سے لیکن خود شدت کے بھی مراتب مختلف ہیں کہ کسی میں بہت شدت ہے اور کسی میں اس سے کم اور اسی مناسبت سے ایمان کے مراتب بھی مختلف ہوں گے باقی ضعف محبت کسی مسلمان میں پایا ہی نہیں جاتا اور نہ پایا جاسکتا ہے کیونکہ شدت محبت کی نفی سے بھی ایمان کی نفی ہوجائے گی تو اس اعتبار سے مراتب کا اختلاف شدت بلکہ اشدیت ہی میں رہا یعنی کسی کو اشد محبت ہے اور کسی کو اشد سے بھی اشد۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اشدیت محبت ہر مسلمان کے لئے لازم ہے اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو اشدیت محبت کس درجے کی ہے اور اسمیں کلام ہی نہیں کہ آپ کو اشدیت محبت حاصل ہے اور یہ بالکل نئی بات ہے ورنہ سب واعظین یہی کہتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں تو گویا میں نے آپ کو یہ نئی بشارت دی ہے یعنی اگر کوئی شخص فاسق فاجر گنہگار شرابی بھی ہے تو اس میں بھی اشدیت محبت کی ہے لیکن باوجود اس اشتراک کے پھر بھی مراتب اس کے مختلف ہیں کیونکہ ہر اشدیت برابر نہیں ہوتی اور اشتراک اشدیت اگرچہ اسوقت محسوس نہیں ہوتا لیکن امتحان کے موقع پر یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے مثلاً اگر کسی مسلمان کے سامنے کوئی شخص خدا تعالیٰ کی شان میں یا اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو اگرچہ وہ مسلمان نہایت کم درجہ کا ضعیف الایمان ہو لیکن اس گستاخی کو سن کر اس قدر بے چین ہوجاتا ہے کہ ماں کی گالی سننے سے بھی اس قدر بے چین نہیں ہوتا اور اس درجہ کی بے چینی بدوں اشدیت محبت کے نہیں ہوسکتی پس معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے اشد محبت ہے اگر ضعیف محبت ہوتی تو اس قدر بے چین نہ ہوتا۔ گو نہ بے چینی کسی نہ کسی مرتبے میں اس وقت بھی ہوتی ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ شدت محبت لازم ایمان اور اس کے مراتب مختلف اور جس مرتبے کی شدت اسی مرتبہ کا ایمان ہوگا اور یہی بات خدا تعالیٰ کو اس آیت میں بتلانا ہے اور مقصود اس بتلانے سے یاد دلانا ہے کہ تم شدت محبت اختیار کرو جس کی علامت اطاعت کاملہ ہے اور اس کی تائید کے لئے کچھ وقت ذکر اللہ کے لئے مقرر کرنا اور طاعت کے لئے علم دین سے واقفیت حاصل کرنا تاکہ طاعت میں سہولت ہو اور اس سے محبت بڑھے۔

محبت کا طبعی اثر

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہے اس لئے محبت ہونے سے انکار بھی نہیں کرسکتے جب تمہاری محبت اور عشق نص سے ثابت ہوگیا تو عشق تو ایسی چیز ہے کہ سوائے محبوب کے کسی کو نہیں چھوڑتا پھر موانع پر نظر کیسی' خوب فرمایا۔

عشق آں شعلہ است کوچوں برفروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براندہ درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز تفت

محبت خداوندی کا رنگ سب پر غالب آنا چاہیے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اس سے پہلے کفار کے بارہ میں فرمایا ہے یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ کہ وہ اپنے اصنام سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے خدا تعالیٰ سے یہاں شبہ ہوگا کہ کفار کو خدا تعالیٰ سے محبت کہاں تھی جو اس کے برابر بتوں سے محبت کرتے تو خوب سمجھ لو کہ کاف مماثلت میں نص نہیں بلکہ مشابہت کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ بتوں کے ساتھ ان کی محبت مشابہ اس محبت کے ہے جو خدا سے محبت رکھنے والوں کو خدا سے ہوا کرتی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کہ مسلمانوں کو خدا سے زیادہ محبت ہے اس میں مشابہت مذکورہ پر بھی نکیر ہے یعنی کسی مخلوق کی محبت خدا تعالیٰ کی محبت کے مشابہ بھی نہ ہونا چاہیے برابر ہونا تو درکنار محبت خدا کا رنگ ایسا غالب ہونا چاہیے کہ سارے عالم پر ظاہر ہو جائے کہ ان کو سوائے حق تعالیٰ کے کسی کی محبت نہیں ہے۔

حق سبحانہ تعالیٰ سے منشاء محبت

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی جو لوگ مومن ہیں وہ اللہ کی محبت میں سخت ہیں اگر کوئی کہے کہ کفار کو تو نہیں ہے ورنہ وہ کفر نہ کرتے اگر غور کیا جائے تو ان کو بھی ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۝ (یعنی بے شک اس دن (قیامت کے دن) وہ کفار اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔ اس آیت کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی محبت ہے ورنہ وعید ان کو کیوں سنائی جاتی یہ تو دلیل ہے۔ محبت کی اور واقعات میں اگر غور کیا جائے تو بہت واضح ہے کہ ہر شخص کو اپنے خالق سے تعلق جبی ہے دیکھو جس وقت آدمی سب کاموں سے فارغ ہوتا ہے اس کو ایک توجہ اپنے مولی کی طرف ہوتی ہے اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھئے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی شے سے یا آدمی سے محبت ہے کسی کو عورت سے کسی کو اولاد سے کسی کو باغ سے کسی کو جانوروں سے اور یہ ظاہر ہے کہ منشاء محبت کا یہ اشیاء من حیث ہی نہیں بلکہ محبوب ان کا کوئی وصف ہوتا ہے مثلاً کسی کو حسن محبوب ہے۔ کسی کو علم کی وجہ سے محبت ہے کسی کو محسن ہونے کی وجہ سے محبت ہے۔ اس کے بعد سمجھئے کہ تمام کمالات حق تعالیٰ کے لئے بالذات ثابت ہیں اور مخلوق کے لئے بالعرض جو کمال جس کے اندر ہے حق تعالیٰ کی ذات پاک اس کے لئے واسطہ فی الاثبات ہے جیسے کسی نے کہا

چاہ باشد آں نگار کہ بندد ایں نگار ہا

(وہ محبوب کس قدر حسین ہوگا جس نے ایسی اعلیٰ درجہ کی حسین صورتیں بنائی ہیں)

اور بعض کے کلام سے واسطہ فی العروض بھی معلوم ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ پس بہ چشم عاشقاں خود راتماشا کردہ

(اپنے حسن کو محبوبان دنیا کے ذریعے آشکارا کر کے تو نے عاشقوں کی آنکھ سے خود ہی اس کا نظارہ کیا ہے یعنی حقیقتاً حسن اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے محبوبان دنیا مظہر ہیں)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾

ترجمہ: اے ایمان والو جو (شرع کی رو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔

تفسیری نکات

وَاشْكُرُوا سے مراد

مقصود تو اشکروا للہ تھا اور شکر سے مراد عبادت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے مگر اس حکم سے پہلے فرماتے ہیں کلوا من طیبت ما رزقنکم یعنی اے مسلمانو ہم نے تم کو جو کچھ پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں ان کو کھاؤ پیو اس کے بعد فرماتے ہیں وَاشْكُرُوا لِلَّهِ یعنی ان نعمتوں کو کھا پی کر خدا کا شکر بھی ادا کرو۔ دیکھئے بلا تشبیہ ایسی ہی صورت ہے جیسے باپ کو یہ منظور ہو کہ بیٹے کا سبق سنے تو وہ اس کو بلا کر کہتا ہے کہ آ و بیٹا یہ لڈو مٹھائی کھالو ہم تمہارے واسطے لائے ہیں پھر مٹھائی دے کر کہتا ہے کہ اچھا بیٹا سبق تو سنا دو ہم تمہیں پھر بھی مٹھائی دیں گے وہی صورت یہاں ہے کہ پہلے تو پاکیزہ نعمتوں کے کھانے کا حکم فرمایا پھر عبادت کا حکم فرمایا اور عبادت کے بعد پھر مٹھائی دینے کا وعدہ ہے وہ کیا ہے جنت۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾

ترجمہ: اے ایمان والو جو پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے کھاؤ اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔

چاہے مزا آئے یا نہ آئے دل لگے یا نہ لگے اس میں آجکل بہت کوتاہی ہو رہی ہے لوگ اعمال کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ لذت کو مطلوب سمجھتے ہیں اس لئے اعمال کی ضرورت کا بتلانا ضرور ہے سو اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾۔ اس میں طیبات کی بھی دو تفسیریں اور شکر کی بھی طیبات کی ایک تفسیر تو حلال ہے حلال ہے مطلب یہ ہے حلال کھاؤ حرام نہ کھاؤ اس صورت میں امر وجوب کے لئے ہوگا یعنی اگر کھاؤ تو اس میں حلال کی رعایت واجب ہے اور اگر کی قید میں نے اس لئے بڑھائی کہ کھانا فی نفسہ واجب نہیں لغیرہ واجب ہے البتہ اس میں حلال کی رعایت کرنا فی نفسہ واجب ہے اور ایک تفسیر جس کی طرف اکثر مفسرین گئے ہیں یہ ہے کلوا من مستلذات مارزقناکم کہ طیبات سے مراد لذیذ اور پاکیزہ چیزیں ہیں یعنی حلال اشیاء میں سے لذیذ عمدہ عمدہ چیزیں کھاؤ اور یہی تفسیر راجح ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس سے پہلے فرمایا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (اے لوگوں جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزوں کو کھاؤ اور

شیطان کے قدم بقدم نہ چلو) اس میں اول تو حلالا کے ساتھ طیبا لایا گیا ہے جس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ طیب حلت کے علاوہ کوئی صفت مراد ہے کیونکہ تاسیس تاکید سے اولی ہے دوسرے اس آیت میں کفار عرب کے طریقہ پر انکار کیا گیا ہے اب دیکھنا چاہئے کہ وہ طریقہ کیا تھا آیت سے ظاہر ہے کہ کفار عرب کا وہ طریقہ حرام کو حلال کرنے کا نہ تھا بلکہ حلال کو حرام کرنے کا تھا۔ حق تعالیٰ اس سے منع فرماتے ہیں کہ حلال کو حرام نہ کرو بلکہ حلال کو حلال سمجھو اس میں ترغیب دینے کے لیے طیب کی تفسیر مستلذ ہی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے کہ شیطان تمہارا ارادہ مارتا ہے کہ تم کو لذیذ چیزوں سے محروم کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کا اتباع نہ کرو تمہارا دشمن ہے اور ان لذیذ پاکیزہ اشیاء کو کھاؤ پیو اس میں خدا تعالیٰ کی کس قدر رحمت ٹپکتی ہے کہ تحریم حلال سے ناخوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میرے بندے لذیذ چیزیں کھالیں کوئی لذیذ چیز نہ کھاوے تو کسی کا کیا حرج ہے مگر وہ نہیں چاہتے کہ بندے ان لذیذ نعمتوں سے محروم رہیں بخدا مجھ کو تو ہر آیت میں رحمت نظر آتی ہے چنانچہ سورہ رحمٰن میں حق تعالیٰ نے نعمتوں کے ذکر کے بعد تو فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ فرمایا ہی ہے دوزخ اور ذکر عذاب کے بعد بھی فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ فرمایا ہے بعض لوگوں کو ذکر عذاب کے بعد اس کا موقع سمجھ میں نہیں آتا مگر حقیقت میں یہ وہاں بھی موقع پر ہے اور ذکر عذاب میں بھی ایک رحمت ہے وہ یہ کہ ہم کو ایک مضر چیز کی اطلاع دے دی تاکہ اس سے بچنے کی کوشش کریں اگر طبیب کسی شے کے متعلق یہ کہہ دے کہ دیکھو اسے نہ کھانا یہ زہر ہے تو اس کو شفقت کہیں گے یا نہیں اسی طرح یہاں بھی سمجھو مجھے تو آیات قہر میں بھی رحمت نظر آتی ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ آیت مداینہ سے زیادہ کوئی بھی آیت رحمت کی نہیں کیونکہ اس میں حق تعالیٰ نے حفاظت مال کے طریقے بتلائے ہیں کہ جب کسی کو قرض دیا کرو تو لکھ لیا کرو اور اس پر دو آدمیوں کو گواہ کرلیا کرو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں تو جان کا نقصان تو کب گوارا ہوگا پھر وہ جنت سے محروم کر کے دوزخ میں ہم کو کب ڈالنا چاہیں گے جب تک کہ تم خود ہی اس میں نہ گھسو۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ سبحان اللہ کیا شفقت ہے یوں نہیں فرمایا لا یعذبکم اللہ بلکہ فرماتے ہیں مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ کہ خدا تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا لیں گے اگر تم ایمان لے آؤ اور عمل کرو۔ اسی شفقت کا ظہور اس آیت میں ہے کہ حق تعالیٰ ہم کو ترغیب دیتے ہیں لذیذ اور مرغوب غذاؤں کی کہ لذیذ چیزیں کھاؤ عمدہ عمدہ کھانے کھالو پھر کچھ عمل کرلو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کا تم سے محض حاکمانہ ہی تعلق نہیں ہے بلکہ ماں باپ جیسا تعلق ہے حاکمانہ تعلق تو ایسا ہوتا ہے جیسا کلکٹر تم سے کہہ دیتا ہے کہ سالانہ مال گزاری ادا کرو جب تم مال گزاری ادا کرتے ہو تو اسکے صلہ میں تمہاری کوئی دعوت ضیافت نہیں ہوتی اور ماں باپ کا تعلق ایسا ہوتا ہے کہ باپ بیٹے کو پڑھانا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ روپیہ لے لو اور سبق پڑھ لو یا مٹھائی کھالو اور سبق سنادو اور ایسے ہی برتاؤ حق تعالیٰ کا تمہارے ساتھ ہے۔

وما اهل به لغير الله (اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو)

اولیاء اللہ کے نام پر نذر ونیاز کا حکم اور اس کی علمی تحقیق

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت جو لوگ اولیاء اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کرتے ہیں یا ان کے مزار پر

نذر و نیاز کی مٹھائی وغیرہ چڑھاتے ہیں اس میں دو قسم کے عقائد کے لوگ ہیں ایک تو یہ کہ ان کو حاجت روا سمجھ کر ایسے کرتے ہیں اس کے تو شرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ایک صورت یہ ہے کہ ذبح تو کرتے ہیں اللہ ہی کے نام پر مگر اولیاء کو ایصال ثواب کرتے ہیں اور انکو مقبول سمجھ کر ان سے دعاء کے طالب ہوتے ہیں اس میں کیا حکم ہے فرمایا کہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہیں مگر عوام کا کچھ اعتبار نہیں اس لئے اس میں بھی احتیاط ضروری ہے سو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہے حکم میں اختلاف نہیں وہ کہتے ہیں کہ سب عوام کی نیت شرک نہیں ہوتی اور ہم کہتے ہیں قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کی نیت شرک کی ہوتی ہے تو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہوا حکم میں اختلاف نہیں باقی غالب واقعہ یہی ہے کہ نیت عوام کی یہ ہی ہوتی ہے کہ وہ راضی ہو کر خوش ہو کر ہماری حاجت کو پورا کر دیں گے بس یہی شرک ہے اور بعضے اہل کی تفسیر ذبح سے کر کے اس مذبوح بہ نیت تقرب الی غیر اللہ و علی اسم اللہ کو حلال کہتے ہیں سو یہ ان کی غلطی ہے اور اگر ان کی تفسیر کو مان لیا جاوے اور **ما اھل لغیر الله** (اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) میں داخل نہ مانا جاوے تب بھی وہ **ذبح علی النصب** (اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے) میں داخل ہونا تو قطعی ہے اس لئے کہ وہ عام ہے ہر منوی لغیر اللہ جس میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کے تقرب کی نیت کی گئی ہو) کو گو مذبوح باسم اللہ (اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو) ہی ہوا اس لئے سب ایک ہی حکم میں داخل ہیں البتہ قرائن سے یہ عموم حیوانات کو شامل ہوگا۔ غیر حیوان کو جیسے شیرینی وغیرہ کو شامل نہ ہوگا یعنی لفظاً اس کو عام نہ ہوگا اشتراک علت سے حکم عام ہوا اور گو لفظ **ما اھل** ظاہراً اس کو بھی عام ہے مگر عموم وہی معتبر ہے جو مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو حدیث **لیس من البر الصیام فی السفر** (سفر میں روزہ رکھنا ضروری نہیں) اس کی دلیل ہے چنانچہ جمہور فقہا کا مذہب ہے کہ سفر میں روزہ افطار کرنا واجب نہیں کیونکہ قرائن سے مراد متکلم کی حدیث میں وہی صوم ہے جو سبب درود یعنی مشقت شدید تک مفضی ہو بہر حال اس عموم لفظی میں ایک حد ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ قرائن میں کلام ہو مراد آباد کے ایک وعظ میں میں نے یہ مسئلہ عموم کے محدود ہونے کا بیان کیا تھا جسمیں مولانا انور شاہ صاحب بھی شریک تھے انہوں نے بہت پسند کیا۔

ف- احقر اشرف علی کہتا ہے کہ ضابطہ ملفوظات اس مضمون کو کافی طور پر ضبط نہیں کر سکتے اس لئے میں خلاصہ لکھے دیتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ **ما اھل به لغیر الله** کو بعض نے خاص کیا ہے اس جانور کے ساتھ جس کو غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جاوے اور جو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جاوے گو اصل نیت تقرب الی غیر اللہ کی ہو اس کو حلال کہا ہے اور منشا اس کا یہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس میں عند الذبح (ذبح کے وقت) کی قید لگا دی ہے مگر یہ قول محض غلط ہے دوسری آیت **ماذبح علی النصب** میں ما عام ہے اور وہاں کوئی قید نہیں اور مذبوح باسم اللہ کو بھی شامل ہے سو اس کی حرمت کی علت بجز نیت تقرب کے کیا ہے پس اسی طرح **ما اھل به لغیر الله** بھی عام ہوگا اور دونوں کے مفہوم میں اتنا فرق ہوگا کہ **ما اھل به لغیر الله** میں غیر اللہ کے لئے نامزد ہونا قرینہ ہوگا قصد تقرب بغیر اللہ کا اگر چہ انصاب بتوں پر ذبح نہ کیا جاوے اور ماذبح علی النصب میں ذبح علی الانصاب اس مقصد کا قرینہ ہوگا اگر چہ غیر اللہ کے نامزد نہ کیا گیا ہو پس دونوں میں عموم و خصوص من وجہ ہوگا اور یہی تغایر مبنی ہوگا ایک کے دوسرے پر معطوف ہونے کا سورہ مائدہ میں پس علت حرمت کی قصد مذکور ہوگا یہ تو قرآن مجید سے استدلال ہے ما اھل بہ لغیر اللہ میں عند الذبح کی قید نہ ہونے کی اور فقہاء نے مذبوح لقدوم الامیر (جو امیر کے آنے

کے وقت اس کے تقرب کے لئے ذبح کیا ہو) کی حرمت میں اس کی تصریح کی ہے وان ذبح علی اسم اللہ تعالیٰ (اگر چہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو) اور یہ علت بیان کی ہے لانه ماأهل به لغير الله

بس معلوم ہوا کہ عندالذبح کی قید اتفاقی جزماً علی العادۃ ہے یا اس قید سے یہ مقصود ہے کہ ذبح کے وقت تک وہ نیت تقرب کی رہی ہو یعنی اگر ذبح کے قبل توبہ کر لی تو پھر حرمت نہ رہے گی اور تفسیر احمدی میں جو بقر منذورۃ اولیاء (اولیاء اللہ کو ثواب پہنچانے کے لئے جو جانور ذبح کیا جاوے) کو حلال کہا ہے وہ اس تحقیق کے خلاف نہیں ہے کیونکہ منیہہ میں یہ تاویل کی ہے کہ ذبح للہ ہے اور نذر سے مقصود ان کو ایصال ثواب ہے تو یہ اختلاف واقعہ کی تحقیق میں ہوا کہ ان کے نزدیک عوام کی نیت تقرب کی نہیں نہ کہ منوی للتقرب (جس میں تقرب کی نیت کی گئی ہو) کی حرمت میں اس تاویل سے خود ظاہر ہے کہ منوی للتقرب کو وہ حرام سمجھتے ہیں اور بعض نے ما اہل بہ کو ایسا عام کہا ہے کہ حیوان وغیر حیوان دونوں کو شامل ہے یعنی طعام وشیرینی بھی اسمیں داخل ہے مگر تامل وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصود بیان کرنا احکام حیوان کا ہے رہا مأکے عام ہونے سے استدلال سو محقق یہ ہے کہ اس عموم میں ایک قید بھی ہے وہ یہ کہ مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو اور یہاں تجاوز ہو جاویگا مگر اس سے حلت لازم نہیں آتی بلکہ اشتراک علت سے حکم بھی مشترک ہوگا حیوان میں نص قطعی سے اور غیر حیوان میں قیاس ظنی سے واللہ علم۔ (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۹)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَٰبِ وَيَشْتَرُونَ بِهِۦ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۴﴾

ترجمہ: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کا اخفاء کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں متاع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نہ تو قیامت میں کلام کریں گے اور نہ ان کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔

تفسیری نکات

منشاء دین فروشی کتمان حق

اس میں اہل کتاب کی دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی ہے اس کے بعد یہ آیت ہے أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالْهُدَىٰ الخ ہے اس میں ان اعمال سابقہ کا منشا بتلایا گیا ہے کہ اہل کتاب جو دین فروشی اور کتمان حق پر دلیر ہیں اس کا منشا دو باتیں ہیں ایک یہ کہ ان لوگوں نے (دنیا میں) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی

دوسرے یہ کہ انہوں نے (آخرت کی چیزوں میں سے) اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کیا اس کے بعد ان دونوں پر سخت وعید ارشاد فرماتے ہیں فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (دوزخ کے لئے کس قدر باہمت ہیں) یہ ایسا ہے جیسا ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ شاباش ہے اس کی ہمت کو آگ میں کودنے کے لئے کیسا باہمت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو دوزخ میں جانے کے لئے کیسے باہمت ہیں۔

اسباب مغفرت کو اختیار کرنے کی ضرورت

خلاصہ یہ کہ آیت ترک ہدایت اور اختیار ضلالت پر اور ترک اسباب مغفرت واختیار اسباب عذاب پر وعید ہے اور میں نے اسباب کا لفظ ترجمہ میں اس لئے بڑھا دیا کہ عذاب کو بالواسطہ کوئی اختیار نہیں کرسکتا جس سے بھی پوچھا جائے ہر شخص عذاب سے نفرت وکراہت اور خوف ہی ظاہر کرے گا اور کوئی نہ کہے گا کہ مجھے عذاب لینا منظور ہے مگر حق تعالیٰ نے اسباب کے لفظ کو اس لئے حذف کر دیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اسباب کو اختیار کرنا عذاب کو اختیار کرنا ہے دیکھئے جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ بغاوت وقتل کی سزا پھانسی ہے وہ اگر قتل وبغاوت پر اقدام کرے تو عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کمبخت پھانسی پر لٹکنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ پھانسی پر لٹکنا ہرگز نہیں چاہتا مگر اس کے اسباب کو جان بوجھ کر اختیار کرنا عقلاء کے نزدیک پھانسی ہی کو اختیار کرنا ہے ایسے ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کر لیا تو یوں کہنا چاہیے کہ گویا مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کرلیا تو یوں کہنا چاہئے کہ گویا مغفرت کو چھوڑ کر خود عذاب ہی کو اختیار کیا ہے یہ توجیہ ہوئی جانب عذاب میں اسباب کو مقدر کرنے کی یہی وجہ ہے کیونکہ خود عذاب کو بلاواسطہ کوئی اختیار کرسکتا اور جانب مغفرت میں لفظ اسباب کے مقدر کرنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ مغفرت ہر شخص کو مطلوب ہے اسکو بھی بلاواسطہ کوئی ترک نہیں کرتا جس سے بھی پوچھو گے وہ طالب مغفرت ہی ہوگا پس ترک مغفرت کے بھی یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب کو ترک کر دیا اور ایک علت مشترکہ مقدر کرنے کی یہ بھی ہے کہ ترک واختیار کا تعلق ان اشیاء سے ہوا کرتا ہے جو بندہ کی قدرت میں داخل ہوں اور عذاب ومغفرت انسان کی قدرت سے خارج ہیں اس لئے بلاواسطہ ہمارے ترک واختیار کا تعلق ان کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ البتہ دونوں کے اسباب ہمارے قدرت کے تحت میں ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارا ترک واختیار متعلق ہوسکتا ہے اور اسباب کے واسطہ سے عذاب ومغفرت کے ساتھ بھی ان کا تعلق ہوتا ہے۔

تو یہ ترجمہ تھا آیت کا جس سے معلوم ہوگیا کہ ترک ہدایت واختیار ضلالت اور ترک اسباب مغفرت واختیار اسباب عذاب بڑا سنگین جرم ہے جس کے مرتکب کی بابت حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم میں جانے پر بڑے ہی دلیر ہیں۔ اور اس جرأت کو تعجب کے صیغہ سے بیان فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو یہ جہنم میں جانے کے لئے کیسے دلیر اور بے باک ہیں اور غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہی افعال منشا ہیں تمام جرائم کا جن میں سے دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر خصوصیت سے اوپر آ بھی چکا ہے کہ ان کا منشاء یہی ترک ہدایت واختیار ضلالت وغیرہ ہوا ہے اور اس سے بطور مفہوم کے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح ترک ہدایت وترک مغفرت صدور معاصی ودخول جہنم کا سبب ہے اسی طرح

اختیار ہدایت وطلب مغفرت صدور طاعات ودخول جنت کا سبب ہے۔

اس کے مقابلہ میں یہاں وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ہے تو اس ایک حدیث کی بنا پر وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ کی تفسیر وَاعْمَلُوْا صَالِحًا سے ہوئی ہے کیونکہ شکر کا طریقہ شرعاً عمل ہی ہے جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا اے آل داؤد عمل کرو شکریہ کے طور پر یہاں شکراً مفعول بہٖ نہیں بلکہ مفعول لہ ہے جس کے بڑھانے میں اس پر تنبیہ ہے کہ تم سے عمل کو بے وجہ نہیں کہا جاتا بلکہ تم پر عقلاً شکر لازم ہے اور وہ زبان ہی سے فقط نہیں ہوتا بلکہ حقیقت شکر کی یہ ہے کہ کچھ کر کے دکھاؤ زبانی شکریہ کافی نہیں بلکہ عملی شکریہ بجالاؤ۔ اہل بلاغت نے بھی اس راز کو سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ حمد تو زبان کے ساتھ خاص ہے اور شکر زبان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ قلب اور لسان اور جوارح سب سے ادا ہوتا ہے اور گو زبانی شکریہ میں شکر کی تصریح ہوتی ہے اور عملی شکر میں اس کی تصریح نہیں ہوتی مگر درجہ عملی شکر کا بڑھا ہوا ہے دیکھو اگر تم اپنے دو غلاموں کو انعام دو جن میں سے ایک غلام نے تو محض زبان سے شکریہ ادا کر دیا اور ایک غلام روپیہ اور خلعت ہاتھ میں لے کر آپ کے پیروں میں گر پڑا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر زبان سے کچھ نہیں کہا تو بتلاؤ کس کا شکر بڑھا ہوا ہے۔ یقیناً جو پیروں میں گر پڑا اس کا شکر بڑھا ہوا ہے معلوم ہوا کہ شکر عمل سے بھی ہوتا ہے اور اس میں قدرے نعمت زیادہ ظاہر ہوتی ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زبان روشن ترست لیک عشق بے زبان روشن گرست

اور اگر زبان سے بھی شکریہ ہو اور پھر پیروں میں گر پڑے تو یہ تو نور علی نور ہے (عمل الشکر)

یہاں طیبات کے ساتھ مارزقنا کم بڑھایا گیا تا کہ لذت مطعومات میں منہمک ہو کر عطائے حق سے غافل نہ ہو جائیں پس ساتھ ساتھ تنبیہ کر دی کہ یہ ہماری دی ہوئی نعمتیں ہیں یاد رکھنا چونکہ انبیاء میں یہ احتمال نہ تھا اس لئے وہاں كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ مطلق فرمایا اور نیز وہاں وَاعْمَلُوْا صَالِحًا میں صراحۃً عمل کا مطالبہ فرمایا کیونکہ عمل ان پر گراں نہیں اور غیر انبیاء پر چونکہ گرانی کا احتمال ہے اس سے واعملو کے مضمون کو وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ کے عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ شکر نعمت انسان میں فطری تقاضا ہے اس کی طلب گراں نہیں ہوتی اس طرح یہ آیت ترغیب و ترہیب دونوں کو جامع ہو گئی۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَٰلَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ: یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور مغفرت کو چھوڑ کر عذاب سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں۔

تفسیری نکات

گناہوں کا سبب جہالت اور عذاب سے بے خوفی ہے

پس حاصل یہ ہوا جہل اور عذاب سے بے خوفی گناہوں کا سبب ہے اور علم و رغبت مغفرت طاعات کا سبب ہے آیت کا حاصل مدلول یہ ہوا کہ تحصیل علم کی بھی سخت ضرورت ہے اور عمل کی بھی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فَمَآ أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ . یہ سخت وعید ہے جس میں حق تعالیٰ صیغہ تعجب سے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو ہدایت اور مغفرت کو اور بعنوان دیگر علم و عمل کو چھوڑ کر ضلالت و معصیت میں مبتلا ہیں جہنم میں جانے کے لئے کیسے دلیر اور بے باک ہیں۔ لفظ اصبر کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وعید صبر و ثبات علی المعصیت پر ہے یعنی گناہوں پر اصرار کرنا اور ان پر جمار ہنا سب پر وعید ہے ورنہ ایک بار گناہ کر کے پھر نادم ہو کر اس پر ثبات نہ کرنا اس وعید کا محل نہیں بلکہ توبہ کر لینے سے آئندہ و ماضی دونوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کے کلام میں کیسی بلاغت اور کتنی رعایت ہے کہ لفظ لفظ سے علم عظیم پیدا ہوتا ہے۔ (الھدی و المغفرہ)

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَٰٓئِكَةِ وَالْكِتَٰبِ وَالنَّبِيِّۦنَ ۚ

ترجمہ: کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو (لیکن اصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور (سب) کتب (سماویہ) پر اور پیغمبروں پر۔

تفسیری نکات

نیکی محض استقبال قبلہ نہیں

ایک شخص ایک تصوف کی کتاب لائے اس میں ایسی باتیں تھیں روزہ رکھنا بخل ہے آخر میں تھا دل کو قابو میں لانا مردوں کا کام ہے۔ فرمایا کتاب اچھی ہے لیکن عوام کے لئے مضر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ روزہ نہیں رکھنا چاہیے بلکہ

مطلب یہ ہے کہ اگر دل قابو میں نہ لایا جائے تو بے اس کے روزہ بخل کے مثل ہے اور کامل جب ہی ہوگا جب دل بھی قابو و اس کی نظیر قرآن میں ہے لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مقصود نہیں کہ استقبال قبلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ مقصد یہ ہے کہ بغیر ایمان کے جو کہ اصل بر ہے استقبال محض معتبر نہیں۔ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ○ ترجمہ: اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں۔ یہ لوگ ہیں جو سچے کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں۔

کمال اسلام کی شرائط

آیت وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ کی تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ اوپر سے اس آیت میں کمال اسلام کے شرائط کا بیان چلا آتا ہے۔ پھر اوپر سے آیت کو پڑھا اور فرمایا کہ عقائد بھی اس میں ہیں اور اعمال بھی ہر قسم کے ہیں۔ پھر آداب المعاشرت بھی ہیں۔ پھر اخلاق یعنی اعمال باطنیہ صبر وغیرہ بھی ہیں اور مجاہدہ کی حقیقت بھی کہ مخالفت نفس ہے اور نفس کو فطرتاً آزادی پسندیدہ ہے اور جس قدر اعمال شرعیہ ہیں ان میں تقلید ہے اور تقلید نفس کی خواہش کے خلاف ہے۔ پھر فرمایا کہ مصیبت میں دو اثر ہیں ''قربت'' اور ''بعد عن اللہ'' اگر صبر کرے تو قربت اگر شکایت کرے تو بعد من اللہ۔ (الکلام الحسن)

صبر کی تین حالتیں

حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں تینوں حالتوں کے متعلق دستور العمل بیان فرمادیا ہے چنانچہ ان تینوں حالتوں کی فہرست میں کچھ تطویل ہے لیکن دستور العمل صرف ایک حکمت میں ہے وہ کیا ہے والصابرین یعنی ان تینوں میں تعلیم صبر کی فرمائی ہے صبر کی حقیقت تو میں بعد میں بیان کروں گا اور باساء ضراء . باس. ان تینوں لفظوں کی تفسیر میں کلام کرتا ہوں۔ باس کی تفسیر میں کچھ اختلاف نہیں باقی۔ باساء اور ضراء کے مدلول میں اختلاف ہے کہ ان دونوں سے کیا مراد ہے جو میرے نزدیک راجح ہے وہ بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ باساء کے معنی شدت کے ہیں اب رہی یہ بات کہ کون سی شدت مراد ہے فقر وفاقہ کی یا مرض کی۔ ضراء کی تفسیر اگر مرض سے کی جاوے جیسا کہ مشہور ہے تو باساء۔ سے مراد فقر وفاقہ ہوگا لیکن یہ تفسیر میرے نزدیک مرجوح ہے میں کہتا ہوں کہ ضراء کے معنی تو فقر وفاقہ کے ہیں اور باساء کا مدلول مرض ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عباد متقین کی فضیلت میں دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ (یعنی وہ لوگ خرچ کرتے ہیں خوشی اور ناخوشی میں)

مفہوم آیت

اب اس مقام پر دیکھنا چاہیے کہ خوشی اور ناخوشی سے کیا مراد ہے اور وہ کون سی ناخوشی ہے جو خرچ کرنے کی ہمت کو گھٹا

دیتی ہے۔ سوظاہر ہے کہ وہ ناداری اور فقر وفاقہ ہی ہے نہ کہ مرض اس لئے کہ مرض کی حالت میں خرچ کرنے کی ہمت نہیں گھٹتی بلکہ خرچ کرنا بہت آسان ہے دووجہ سے اول تو اس وجہ سے کہ آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ خرچ کروں گا تو بیماری سے چھوٹ جاؤں گا دوسرے یہ کہ بیماری کی حالت مایوسی کی ہوتی ہے مال سے تعلق کم ہو جاتا ہے اس لئے آدمی سمجھتا ہے جو خرچ کروں گا وہ میرا ہے اور جو رہ جائے گا وہ پرایا ہے پس سراء و ضراء سے مراد تنگدستی اور بیماری کی خوشی وناخوشی مرادنہیں ہے بلکہ سراء سے مراد فراخی اور ضراء سے مراد تنگ دستی وفقر وفاقہ ہے اس لئے کہ تنگ دستی کی حالت میں خرچ کرنا بڑی ہمت کی بات ہے پس جب کہ ضراء سے مراد فقر وفاقہ ہوا تو باساء سے مراد اس کا مغائر ہونا چاہیے وہ کیا ہے مرض پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ صبر کرنے والے ہیں مرض اور فقر وفاقہ میں اور قتال کے وقت بھی جہاں پیش آ جاوے حاصل اور ملخص کیا ہوا کہ ناگواری کی حالتوں میں صبر کرنے والے ہیں۔ یہ تو مجملاً دستور العمل ہو گیا۔

صبر کی تعریف

اب اس کے بعد دیکھنا چاہیے کہ صبر کس کو کہتے ہیں شکوہ شکایت کا مذموم ہونا تو لفظ صبر ہی سے معلوم ہو گیا ہو گا اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں رہا بعض اور امور میں اشتباہ باقی ہے اس وقت اس کا زائل کرنا ضروری ہے۔

سوایک شبہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں نے باساء کا مدلول مرض لیا ہے تو مرض میں صبر کرنے کے معنی شاید کوئی یہ سمجھے کہ دوا دارو بھی نہ کرے اس کا کرنا بھی صبر کے خلاف ہے تو یاد رکھو کہ تداوی صبر کے خلاف نہیں شریعت نے اس کا مکلف نہیں کیا دوانہ کرو تدبیر نہ کرو۔ شبہ صبر کی حقیقت نہ جاننے سے ہوا ہے صبر کے معنی استقلال کے ہیں تو دوادارو نہ کرنا یا تدبیر کرنا بےاستقلالی کا فرد نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے خود تدبیر اور دوا فرمائی ہے چنانچہ پچھنے لگوائے ہیں زخم پر مہندی رکھی ہے۔ بارش کی دعا فرمائی ہے اور زیادتی بارش میں کمی بارش کی دعا فرمائی ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک اعرابی کھڑا ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ! وھلکت الاموال فادع اللہ لنا آپ نے دعا فرمائی اللھم اسقنا چنانچہ بادل آئے اور برسنا شروع ہو گئے اور ایک ہفتہ تک برستے رہے دوسرے ہفتے میں وہی اعرابی یا کوئی اور کھڑا ہوا کہ یارسول اللہ ﷺ گھر گر گئے اور کام بند ہو گئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ بارش روک دیں حضور ﷺ نے دعا فرمائی اللھم حوالینا ولا علینا اللھم علی الاکام والاودیہ وعلی الظراب وعلی الجبال او کمال قال. چنانچہ اسی وقت بادل پھٹ گیا اور چاروں طرف بادل تھے اور بیچ میں صاف تھا بس دعا بھی ایک تدبیر ہے اور احسن تدبیر ہے لوگ اس تدبیر کو نہیں سمجھتے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ (یعنی یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں)

مقبول کون؟

صدق صرف قول کے ساتھ خاص نہیں بلکہ صدق اصل میں قلب کی صفت ہے جس کا اثر قول وفعل وحال سب میں ظاہر ہوتا ہے اور تقوی بھی گو صفت قلب کی ہے چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا الا ان التقوی ھھنا واشار الی صدرہ

یعنی آ گاہ رہو کہ تقوی یہاں ہے اور اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا لیکن اس کا زیادہ ظہور افعال جوارح سے ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ مقبول وہ ہے جسکا ظاہر بھی اچھا ہو باطن بھی اچھا بعنوان دیگر یوں سمجھئے کہ ظاہر و باطن دونوں کو جمع کرلو۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ اول فرمایا ہے اس کے بعد اقام الصلوۃ و اتی الزکوۃ یعنی انفاق کا ایک مرتبہ تو یہ فرمایا کہ مال دیا کرو قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو۔ پھر دوسرا عمل یہ فرمایا کہ زکوۃ دیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دینے سے اور مراد ہے اور زکوۃ دینے سے اور اس کو سمجھ کر حضور ﷺ نے فرمایا ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ. اس لئے ہمیں یہ حقوق سمجھ کر فرائض کے علاوہ اور بھی کچھ کرنا چاہیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا (اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ)

تفسیری نکات

روزہ ایک عظیم نعمت خداوندی

اس تشبیہ میں اس کی رعایت ہے کہ سہل ہو جائے کیونکہ ایک تو مسابقت میں رغبت ہوتی ہے اور ایک مرتبہ جوش ہوتا ہے کہ ہم بھی کریں گے دوسرے یہ کہ ہماری شان کنتم خیر امۃ (تم بہتر امت ہو) ہے تو غیرت بھی ہوتی ہے کہ ہم باوجود افضل ہونے کے حق تعالیٰ کا وہ کام نہ کریں۔ جو ہم سے مفضول کر گئے تو گویا پہلی قوم میں ایک ایسی چیز لے گئیں جو تمہیں اب تک نہیں دی گئی۔ انہیں ہم نے ایک سواری دی تھی جس سے وہ بہت جلد اپنا راستہ قطع کر سکتے تھے۔ تمہیں بھی دے دی تا کہ تم ان سے پیچھے نہ رہ جاؤ۔ اسی لئے فرمایا کتب علیکم (تم پر فرض کیا گیا) یہ خدا کی بڑی رحمت ہے کہ فرض کر دیا جس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے کو زبردستی مسہل پلائے واقعی بڑی رحمت ہے کہ فرض کر دیا کیونکہ جانتے تھے کہ بغیر اس کے نہیں کریں گے۔ ہمارے والد صاحب نے بچپن میں مجھے مسہل پلانا چاہا میں نے انکار کیا مجھ سے کہا کہ پی لو تو ایک روپیہ دیں گے میں جانتا تھا کہ اب اگر انکار کروں گا تو دھمکی دے کر پلائیں گے پھر روپیہ بھی جائے گا اور پینا پڑے گا اس لئے پی لیا۔

حق تعالیٰ نے بھی ہماری ہی ضرورت اور ہماری ہی مصلحت کے لئے مسلسل تجویز فرمایا اور اس کے پی لینے پر انعام کا وعدہ فرمایا اور نہ پینے پر دھمکی بھی دی۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس عنایت و شفقت کا۔ واللہ وجد کے قابل ہے۔ لوگ ستار کی تن تن اور سارنگی کی روں روں پر کودتے ناچتے ہیں۔ افسوس انہیں حس نہیں۔ وجد کی چیزیں یہ علوم ہیں۔

ادراک اوامر

شاید کوئی یہ شبہ کرلے کہ قرآن مجید نازل ہوئے سینکڑوں برس ہوگئے جو کچھ حکم ہونا تھا ایک بار ہو چکا روز روز صوموا (تم روزہ رکھو) کہا جاتا ہے فقہا حقیقت میں بڑے عارف تھے وہ اس کی حقیقت کو خوب سمجھے وہ کہتے ہیں کہ صوم کا سبب وجوب شہود شہر (مہینہ کا حاضر ہونا) ہے لہٰذا جب شہود شہر ہوگا تو تقدیراً امر ہوگا کہ صوموا (تم روزہ رکھو) جس طرح جب ظہر کا وقت ہوگا تو تقدیراً ہمیں امر ہوگا صلوا (تم نماز پڑھو) کیونکہ وقت ظہر وجوب ہے ہاں حج کا سبب بیت اللہ ہے اور وہ چونکہ مکرر نہیں اس لئے حج بھی مکرر نہیں اور یہاں چونکہ یہ اسباب مکرر ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان کے مسببات بھی مکرر ہوں گے مگر تمہیں ادراک نہیں ہوتا۔ عارفوں جیسے کان پیدا کرو تو تمہیں بھی ہر ظہر کے وقت صلوا (نماز پڑھو) اور رمضان کے ہر دن میں صوموا سنائی دینے لگے۔ اسی کو عارف رومیؒ فرماتے ہیں۔

پنبہ اندر گوش حس دوں کنید تا خطاب ارجعی رابشنوید

ترجمہ: ان ظاہری کانوں میں جو ادنی درجہ کے حواس سے ہیں روئی رکھ کر گوش باطن کو درست کرو جب اس قابل ہو گئے کہ ارجعی کا خطاب سنو اور عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

الست از ازل ہمچناں شان بگوش بفریاد قالو بلی در خروش

ترجمہ: الست بربکم کی ندا ان عاشقان صادق کے کانوں میں ہنوز ویسی ہی ہے قالوا بلی کی فریاد سے شور کر رہے ہیں کہ جو الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) ازل میں کہا گیا تھا وہ منقطع نہیں ہوا اسی طرح صلوا وصوموا (نماز پڑھو اور روزہ رکھو) منقطع نہیں ہوا آج بھی موجود ہے اور برابر رہے گا۔ اہل ادراک ہی اس کو ادراک کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

محکمہ نفع وضرر

الغرض حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ کس قدر شفقت ہے کہ پرہیز کرایا مگر تھوڑی دیر کہ اَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ (تم رات کو روزہ کو پورا کیا کرو) اس سہولت پر طبیعت اس لئے قادر نہیں کہ وہ مظہر نفع وضرر ہے اور حق تعالیٰ محدث ہے نفع وضرر کا کہ جب تک چاہا ایک شئے کو نافع رکھا اور جب چاہا اسے ضار بنا دیا حق تعالیٰ کو کس قدر تمہاری رعایت منظور ہے کہ ایک محکمہ نفع وضرر کا قائم کیا کہ ایک ہی شے رات بھر نافع رہتی ہے اور صبح کو کا ضار ہو جاتی ہے دن بھر مضر رہتی ہے رات سے پھر مفید ہو جاتی ہے۔ ایک یہ رحمت دوسری یہ شفقت کہ جب مضر ہوا تو اس سے بچنا فرض کر دیا اور یہی نکتہ ہے کتب علیکم میں آگے فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۞ روزہ تم پر فرض کیوں ہوا اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ۔

مقصود روزہ

اس ترجمہ سے یہ اشکال رفع ہو گیا ہوگا کہ لعل تردد و ترجی کے لئے ہے جب باری تعالیٰ کو تمام اشیاء کا علم ہے تو تردد کا کلمہ کیوں استعمال کیا۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ فرض ہوا ہے تمہاری اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ گے یعنی روزہ رکھ کر یہ امید رکھو

کہ متقی ہو جاؤ گے یہاں بھی امید و بیم میں رکھا کہ تمہیں روزہ رکھ کر متقی بن جانے کی امید رکھنا چاہیے یقین نہ رکھنا چاہیے۔ یہ بھی خدا کا لطف ہے کیونکہ اگر یہ فرمادیتے کہ تم متقی ہونے کا یقین رکھو تو روزہ رکھنے کے بعد تو متقی ہونے کا ناز ہی ہو جاتا جو بالکل خدا سے بعید کر دیتا کیونکہ ناز و نیاز جمع نہیں ہوتے جیسے صحابہ کے بارے میں ارشاد ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے ان سے مغفرت اور ثواب عظیم کا) یہاں بھی منھم فرمایا اگر منھم نہ فرماتے تو اس لفظ سے جو نیاز اب پیدا ہوتا ہے وہ پیدا نہ ہوتا۔ ایک ذرا سا لفظ بڑھایا اور سارے جہان کو ہلا دیا تو منھم اس واسطے بڑھایا کہ صحابہ کو یہ کیفیت بھی میسر ہو کیونکہ ناز والوں کو قرب نہیں ہوتا قرب نیاز والوں کو ہوتا ہے اسی واسطے تمام انبیاء اہل نیاز ہوئے اور یہی نکتہ ہے منھم کے بڑھانے کا کہ نیاز کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں اور ناز کو پسند نہیں کرتے۔

احکام اسرار

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ اس کا مفعول محذوف ہے یا تو النار اس کا مفعول ہو گا یا المعاصی مگر دونوں کا حاصل ایک ہے کیونکہ نار سے بچنے کے لئے اولاً معاصی سے بچنا ضروری ہے اسی طرح معاصی سے بچ کر نار سے بچ سکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل ہوا۔ اطباء جانتے ہیں کہ اشیاء کی تاثیر دو طرح پر ہوتی ہے کوئی شے مؤثر بالکیف ہوتی ہے اور کوئی شئے مؤثر بالخاصیت بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ تمام اشیاء مؤثر بالخاصیت ہی ہیں کیونکہ اگر مؤثر بالکیفت ہوتیں۔ تو ایک ہی درجہ کی تمام اشیاء ایک ہی اثر کرتیں یعنی جو اشیاء پہلے درجہ میں گرم ہیں ان سب کا ایک ہی کا اثر ہونا چاہیے تھا اور جو دوسرے درجہ میں سرد ہیں ان سب کا بھی ایک اثر ہونا چاہیے اور جو اشیاء تیسرے درجہ میں خشک ہیں ان کا ایک اثر ہوتا ہے اور جو چوتھے درجہ میں تر ہیں ان کا ایک اثر ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہی درجہ کی اشیاء اثر میں مختلف ہو جاتی ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کی تاثیر بالخاصیت ہے اور یہ کوئی طب کے خلاف نہیں بلکہ یہ مسئلہ تو فلسفہ کا ہے اس میں کوئی امر خلاف لازم نہیں آتا سو ہم سے یہ سوال کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل۔ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم یہ کہیں کہ روزہ موثر بالکیفیت ہے اور اگر ہم مؤثر بالخاصیت کہیں تو یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جس قدر عبادات کے آثار بیان کئے گئے ہیں سب ان عبادات کے آثار بالخاصہ ہیں۔ لوگ رمضان سے پہلے کیسے ہی فسق و فجور میں مبتلا ہوں مگر رمضان میں ضرور کمی کر دیتے ہیں۔ نماز بھی پڑھ لیتے ہیں تلاوت بھی کرنے لگتے ہیں تو جتنی دیر ان عبادات میں لگے رہتے ہیں معاصی سے بچے رہتے ہیں۔ ایک جواب تو اس سوال کا یہ ہوا کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل؟ دوسرا جواب جس کی ایک تو مشہور تقریر ہے اور ایک حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرے قلب پر وارد کی ہے۔ مشہور تقریر تو یہ ہے جسے امام غزالیؒ وغیرہ سب نے لکھا ہے کہ روزہ سے قوت بہیمیہ گھٹ جاتی ہے کیونکہ لذات و شہوات کو چھوڑنا پڑتا ہے اور یہی چیزیں گناہ کا باعث تھیں۔ میرے قلب پر جو تقریر وارد ہوتی ہے وہ بالکل بے غبار ہے اور اس پر ایک غبار ہے وہ یہ ہے کہ شہوات اور لذات میں کیا کمی ہوئی ہم پوچھتے ہیں کہ رات کو پیٹ بھر کھانا بیوی سے مشغول ہونا جائز ہے یا ناجائز۔ اگر جائز ہے تو قوت بہیمیہ کچھ بھی

نہیں گھٹی کیونکہ رات کو بہت سے لوگ اس قدر کھاتے ہیں کہ ایک دن کیا ڈیڑھ دن کی فرصت ہو جائے۔ اس تقریر پر تو روزہ کا نفع جب ہوتا کہ دن کی طرح رات کو بھی منہ بند ہوتا اور اگر نا جائز کہو تو نص کے خلاف لازم آتا ہے۔

سوا اس پر یہ غبار ہے جس کے لئے بڑے بڑے لوگوں کو ایک نئی اور بے دلیل بات کا قائل ہونا پڑا اور وہ یہ کہ رات کو بھی کم کھاوے کیونکہ اگر کمی نہ کی تو غایت صوم حاصل نہ ہوگی۔ بظاہر یہ توجیہ رنگین اور اقرب ہے مگر حقیقت میں ابعد ہے کیونکہ سوال یہ ہے کہ کہیں روزہ میں تقلیل طعام کی ترغیب دی گئی ہے یا نہیں اگر دی گئی ہے تو کہاں ہے ہم نے تو باوجود یہ کہ بہت تلاش کیا کہیں نہ پایا بلکہ پایا تو اس کے خلاف كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الۡخَيۡطُ الۡاَبۡيَضُ الخ (کھاؤ پیو بھی اس وقت تک کہ تم کو سفید خط یعنی نور صبح (صادق) سے متمیز ہو جاوے) اور جن احادیث میں تقلیل طعام کی فضیلت آئی ہے وہ عام ہے اور روزہ کے ساتھ اس کی تخصیص نہیں ہو سکتی۔ سوال تو یہ ہے کہ روزہ کے اندر تقلیل طعام کی خصوصیت کے ساتھ کیا دلیل ہے لامحالہ کہنا پڑے گا کہ نص میں ترغیب نہیں دی گئی۔

یہ البتہ صواب معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ باوجود شب کو توسع ہونے کے آخر رمضان میں کس قدر ضعف ہو جاتا ہے اور اسی پر عاجز عن النکاح (نکاح سے عاجز) کے لئے صوم کا معالجہ تجویز فرمایا گیا ہے پھر اس پر اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ رمضان میں رات کو کم کھاوے ورنہ غایت حاصل نہ ہوگی بلکہ اس کا قائل ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

دوسری تقریر حق تعالیٰ نے انہیں حضرات کی برکت سے میرے قلب پر وارد کی ہے اس میں ایک دوسرا مبنیٰ بھی ہے کہ صوم کو گناہوں سے بچنے میں دخل اور طرح سے بھی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح شرک وکفر سے بچانے کے لئے جابجا عذاب کا ذکر ہے مگر اس شرک وکفر سے بچنے میں وقوع عذاب کو دخل نہیں۔ تصور عذاب کو دخل ہے کہ یہ سوچنا کہ عذاب ایسا ہوگا سبب بن جاتا ہے ترک کفر وشرک کا اسی طرح تصور حقیقت سوم کو بھی معاصی سے بچنے میں دخل ہے مشہور تقریر کا حاصل تو یہ تھا کہ صوم ایسی ہیئت ہے کہ اس کا وقوعہ معاصی سے روکتا ہے اور اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ صوم ایک ایسی شئے ہے کہ جس کی ہیئت کا تصور معاصی سے روکتا ہے کسی کو عقل سلیم ہو تو روزہ کی حقیقت میں غور کرے کہ کیا ہے۔ روزہ کی حقیقت ہے نہ کھانا نہ پینا بیوی سے مشغول نہ ہونا اس سے یہ سمجھے گا کہ یہ چیزیں حلال تھیں۔ جب یہ حرام کردی گئیں تو جو چیزیں پہلے سے حرام ہیں ان کا کیا درجہ ہوگا۔ پھر یہ خیال کرے گا کہ غیرت کی بات ہے کہ جو چیزیں حلال تھیں انہیں چھوڑ دیں اور حرام میں مبتلا ہوں۔ (روح الصیام) لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۙ (شاید تم متقی ہو جاؤ)

شاہانہ محاورہ

یہ بھی شاہانہ محاورہ ہے بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ انہی لفظوں کیساتھ وعدہ لیا کرتے ہیں کہ امیدوار باشید (امیدوار رہو) اور یہ لفظ ان کے کلام میں دوسروں کی قسموں سے زیادہ مؤکد ہے پس ایک بات آخرت کی یہ قابل رغبت ہے کہ اس کی طلب بے کار نہیں جاتی بلکہ ثمرہ ضرور مرتب ہوتا ہے بخلاف دنیا کے کہ وہاں اس کا وعدہ نہیں پھر یہ کہ طالب آخرت کو طلب سے زیادہ ملتا ہے چنانچہ ایک عمل کا دس گنا ثواب تو ہر شخص کے لئے مقرر ہے۔ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا (جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس حصہ ملیں گے) اور بعضوں کو سات سو گنا بھی ملے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ‌ؕ (جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں جمیں

ہر بالی کے اندر سودانہ ہوں) پھر اس پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ ارشاد ہے فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (اس کو اس کی افزونی عطا کریں گے کثرت سے افزونی عطا کرنا) اب تو کچھ حد ہی نہ رہی کیونکہ دوسری آیت کا نزول اس وقت ہوا ہے جب پہلی آیت کے نزول پر حضور اقدس ﷺ نے دعا مانگی تھی۔ اللھم زدنی (کذا ذکر فی التفسیر المظھری من عدۃ کتب الحدیث) (اے اللہ مجھے زیادہ عنایت کیجئے اس کو تفسیر مظہری میں حدیث کی متعدد کتابوں سے ذکر کیا ہے) تو یقیناً اس میں پہلی آیت سے زیادہ ہی تضاعف ہے اور مفسرین نے اس کے ہر ضعف کو سات سو کہا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کثرت کثیرہ میں تو شبہ ہی نہیں وہ تو منصوص ہے اور حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ کے راستے میں ایک چھوارہ کوئی دے تو حق تعالیٰ اس کو یہاں تک بڑھاتے ہیں کہ احد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے اس سے تو اور بھی حد بڑھ گئی کیونکہ چھوارہ کے برابر احد پہاڑ کے اجزا کرنے بیٹھو تو اجزا کرنے ہی میں سو دو سو برس لگ جائیں گے گویا اتنا بے حساب ملے گا کہ بعض جاہل لوگ تو اتنی جزا کو سن کر ہی گھبرا گئے چنانچہ ایک جاہل آریہ نے لکھا ہے کہ جزا کا جو قاعدہ مسلمانوں میں ہے وہ ٹھیک نہیں کیونکہ ہمارے اعمال تو محدود ہیں ان پر جزائے غیر محدود کا مرتب ہونا ایسا ہے جیسا کہ پاؤ بھر غذا والے کو پچاس من کھلا دیا جائے تو وہ مرجائے گا پس محدود کو جزائے غیر محدود کی طاقت کہاں۔ اس جہالت کی بات کا جواب ظاہر ہے کہ پاؤ بھر کی غذا والا پچاس من کھلانے سے اس وقت مرے گا جب اسکو ایک وقت میں ایک دم سے کھلا دیا جائے اور اگر جزائے غیر محدود کے ساتھ عمر بھی غیر محدود ہوا اور عمر غیر محدود میں غذا کھلائی جائے تو بتلایئے اس میں کیا اشکال ہے اس جاہل نے جزا کو تو غیر محدود رکھا اور عمر کو محدود لے لیا اور خواہ مخواہ اعتراض کر دیا یہ نہ دیکھا کہ مسلمان عمر دار الجزاء کو بھی غیر محدود کہتے ہیں۔

تقوی دواماً مطلوب ہے

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے عامل میں گفتگو ہوئی ہے کہ کیا ہے مفسرین نے ایک صوموا مقدر نکال کر اس کا معمول بنایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ تتقون کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تقوی تو دواماً مطلوب ہے وایاماً کا عامل کیسے ہو سکتا ہے لیکن اس تقریر سے ان کا تتقون سے معمول ہونا سمجھ میں آ گیا ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ چند روز متقی بن جاؤ یہ تم کو دائمی متقی بنا دے گا۔ باقی بات کہ یہ تفسیر کسی نے کی نہیں سو یہ کوئی بات نہیں۔ قواعد شرعیہ و عربیہ کی موافقت کے بعد نقل خاص کی ضرورت نہیں۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ترجمہ: پھر جو کوئی تم سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا ہے

یعنی مسافر اور مریض کے لئے ارشاد ہے کہ روزہ افطار کر لینا جائز ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ یہ شیخ فانی کا حکم ہے یعنی اس کے لئے روزہ کا فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا دو وقت کا شکم سیر کر کے اور اگر کوئی زیادہ دے دے اپنی خوشی سے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ گو بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان تصوموا خیر لکم و علی الذین یطیقونه سے متعلق ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ظاہراً تو تینوں ہی کے متعلق ہے یعنی مسافر مریض اور شیخ فانی ان تینوں کے لئے روزہ رکھ لینا بہتر ہے مگر دوسرے دلائل کی وجہ سے اس حکم میں قید یہ ہے کہ تحمل ہو۔ یعنی اگر تحمل ہو تو روزہ رکھ لینا اچھا ہے تو ان تصوموا خیر لکم سے مسافر کیلئے بھی روزہ رکھنا افضل ہوا اور اگر قرآن کو اس بارہ میں نص نہ کہا جائے کیونکہ بعض کے نزدیک اس کا تعلق شیخ فانی کے ساتھ محتمل ہے اور اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال مگر حدیثیں تو صریح ہیں۔ چنانچہ

صحابہؓ نے حضور ﷺ کے ہمراہ سفر میں روزہ رکھا اور حضور ﷺ نے انکار نہیں فرمایا اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جیسا جائز ہے ویسا ہی افضل بھی ہے بہرحال سفر میں روزہ رکھنا ہی افضل ہوا (شرائط الطاعۃ)

اس زمانے میں ایک قرآن شریف کا ترجمہ طبع ہوا ہے اس میں:

وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ. جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے نہ ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے۔

کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے اس سے لوگوں کی جرات بڑھ گئی اور بجائے روزہ کے فدیہ کو کافی سمجھ لیا۔

یاد رکھو کہ یہ تفسیر اس آیات کی بالکل غلط ہے اور وجہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ کرنے والا اہی علوم سے بالکل جاہل ہے اس لئے کہ مولوی تو مولا والا ہے اور نفس علم کی وجہ سے اگر کوئی مولوی ہو جائے تو شیطان بڑا عالم ہے بلکہ معلم الملکوت و فرشتوں کا استاد مشہور ہے۔ خدا جانے یہ کہاں کی روایت ہے کسی بزرگ کے کلام میں ہو تو اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ علوم میں فرشتوں سے زیادہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ فرشتوں کو میاں جی کی طرح پڑھایا کرتے تھے اور شیطان کا علم میں زیادہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولویوں کو بہکاتا ہے مولوی کو وہی شخص بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہو دیکھئے اگر وکلاء کو کوئی دھوکا دے تو وہ وکالت ذاتی میں اس سے زیادہ ہوگا۔ جب مولویوں کو بھی دھوکا دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مولویوں سے زیادہ علم رکھتا ہے مگر صاحبو! علم تو اور ہی شے ہے علم وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں

علم چہ بود آنکہ بنمیدت　　زنگ گمراہی زول بزو ایدت

تو ندانی جز یجوز لا یجوز　　خود ندانی تو کہ حوری یا نجوز

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡیَصُمۡهُ ؕ وَمَنۡ كَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾

ترجمہ: ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالت ہے منجملہ اُن کتب کے جو کہ ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اُس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہیے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا چاہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ شمار کی تکمیل کر لیا کرو اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کیا کرو۔ اس پر کہ تم کو طریقہ بتلا دیا اور تاکہ تم لوگ شکر ادا کیا کرو۔

تفسیری نکات

احکام عشرہ آخیرہ رمضان

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس آیت میں خدا تعالیٰ نے رمضان کی ایک فضیلت کا بیان فرمایا ہے اس آیت سے بظاہر عشرہ اخیرہ کے مضمون کو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن غور کیا جائے تو عشرہ اخیرہ سے اس آیت کا تعلق معلوم ہو جاوے گا خدا تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان کی جو فضیلت بیان کی ہے اسی فضیلت میں غور کرنے سے معلوم ہو جاوے گا کہ وہ فضیلت عشرہ اخیرہ کے لئے بدرجہ اولی واتم ثابت ہے فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ایسا اور ایسا ہے سو اس آیت سے اس قدر معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ رمضان تیس دن کے زمانہ کا نام ہے اور اس آیت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل زمانہ کے کس جز میں نزول ہوا ہے لیکن اگر ہم اس کے ساتھ دوسری آیت کو بھی ملا لیں تو دونوں کے مجموعہ سے تعیین وقت بھی ہم کو معلوم ہو جاوے گی سو دوسری آیت فرماتے ہیں اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ پس ان دونوں آیتوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کا نزول ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔ رہا یہ شبہ کہ ممکن ہے کہ شب قدر رمضان میں نہ ہو تو اس صورت میں دوسری آیت کا ضم مفید نہ ہوگا سو اس کا جواب یہ کہ اول تو شب قدر کا رمضان میں ہونا حدیث میں موجود ہے اس سے قطع نظر اگر ہم ذرا فہم سے کام لیں ان دونوں آیتوں سے ہی معلوم ہو جاوے گا کہ شب قدر رمضان ہی میں ہے اس لئے کلام مجید کا نزول دو طرح ہوا ہے ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے خود کلام مجید سے ہوتا ہے۔ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا کہ یہ آیت مشرکین و نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد ﷺ نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب دفعۃً پوری کی پوری آسمان سے کیوں نہیں دی گئی جس طرح موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی تھی خدا تعالیٰ کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کذالک لنثبت به فوادک جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس لئے نازل کیا اس تدریج کے ذریعے سے آپ کے دل کو نثبت اور اس کو محفوظ کرنے اور سمجھ لینا آسان ہو جائے واقعی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر نثبت فواد اور ضبط وفہم بتدریج نازل کرنے میں ہو سکتا ہے نزول دفعی میں نہیں ہو سکتا (احکام العشر الاخیرہ)

قرآن شریف لوگوں کے لئے بہت بڑی ہدایت ہے

اس آیت میں (ھدی للناس) میں تنوین تعظیم کی ہے یعنی بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضح ہیں یہ عطف تفسیری ہے من الھدیٰ میں من تبعیضیه اور الف لام جنس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضح ہیں ان شرائع سماویہ میں سے جن کی شان ہدایت ہے یعنی شرائع سماویہ تو متعدد ہیں ان سے ایک قرآن بھی ہے اب من کا تبعیضیہ ہونا واضح ہو گیا اور یہ تخصیص بعد تعمیم ہے یوں تو تمام کتب سماویہ اور تمام شرائع کی شان ہدایت ہے مگر اس تخصیص سے قرآن کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے اور فرقان لوازم ہدیٰ سے ہے کیونکہ وضوح حقیقت کے بعد امتیاز بین الحق والباطل لازم ہے۔

یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ موقع تو ہے رمضان کی فضیلت بیان کرنے کا چنانچہ اوپر سے صوم ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے

اور بیان کی گئی قرآن کی فضیلت اس کی کیا وجہ ہے جواب یہ ہے کہ فضیلت بیان کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک تو یہ کہ خود اس چیز کی فضیلت بیان کریں اور ایک یہ فضیلت تو بیان کریں دوسری شئے کی اور اس کی فضیلت اس سے لازم آ جاوے اور یہ احسن طریق ہے کیونکہ اس میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی ہے اسی کو کہتے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

مثلاً ہم کو حضرت حاجی صاحبؒ کی فضیلت بیان کرنا ہو تو اس کا ایک طریق تو یہ ہے کہ خود ان کی فضیلت بیان کریں اور دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہیں کہ حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا گنگوہیؒ جیسے شخص ہیں اور یہ احسن طریقہ ہے پس اسی طریق پر رمضان کی فضیلت اس طرح لازم آ گئی کہ ماہ رمضان وہ ہے جس میں ایسا ایسا کلام نازل ہوا ہے جس ماہ کو اتنی بڑی چیز سے ملابست ہوگی تو وہ ماہ کتنی فضیلت رکھتا ہوگا ظاہر ہے کہ بڑی فضیلت والا ماہ ہوگا۔

اہتمام تلاوۃ

اب ماہ رمضان میں نزول قرآن سے برکت ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ برکت اس کو قرآن کے نازل ہونے سے حاصل ہوئی ایک یہ کہ برکت اس ماہ میں پہلے سے تھی اور قرآن کے نازل ہونے سے یہ ماہ نور علی نور ہو گیا ہو۔ اسی کے مناسب نعت کا یہ شعر ہے

نبی خود نور اور قرآن ملا نور   نہ ہو پھر ملکے کیوں نور علی نور

اسی طرح عیاں ہوگا کہ رمضان خود نور پھر قرآن دوسرا نور ملکر نور علی نور يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرہ آیت)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں اور تا کہ تم لوگ ایام ادا یا قضا کی تکمیل شمار کر لو اور تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بزرگی (ثنا) بیان کیا کرو اس پر کہ (تم کو ایک ایسا طریقہ بتلا دیا جس سے تم برکات اور ثمرات صیام سے محروم نہ رہو گے) اور تا کہ تم شکر کرو۔

مجاھدہ میں آسانیاں اور سہولتیں

بعض مجاہد ایسے ہیں کہ گوشت، گھی، میوہ جات نہیں کھاتے اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوں گی تو شکر بھی حق تعالیٰ کا ان پر نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کا جواب اور مجاہدات ارشاد شدہ کی شان اس آیت میں بیان فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت کا ارادہ فرماتے ہیں اور تم پر سختی کا ارادہ نہیں کرتے۔ یہ ابطال اس کوتاہی کا کہ ان کے مجاہدات میں دشواری ہی دشواری ہے۔ یہاں تو یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ جن مجاہدات کی تعلیم کی گئی ہے وہ سب نہایت لطیف اور ہماری طبیعت اور مذاق کے موافق اور نفع میں سب مجاہدوں سے بڑھ کر ہیں آگے ارشاد ہے وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اور تا کہ تم شمار کو پورا کر لو یہ اس کوتاہی کا ابطال ہے کہ ان کے مجاہدہ کا کہیں خاتمہ ہی نہیں اور نہ اس میں اکمال ہے۔ یہاں اختتام بھی ہے اور اکمال بھی۔ ایک کوتاہی یہ تھی کہ مجاہدہ کر کے ناز ہوتا تھا اور یہ اس طریق میں سخت مضر ہے اس کو دفع فرماتے ہیں وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ یعنی تا کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی ولعلکم تشکرون یعنی اور تا کہ تم شکر کرو۔ یہ اس کوتاہی کی تکمیل ہے کہ ان کے مجاہدہ کے اختیار کرنے

میں نعم اورلذات سے محرومی تھی تو نعمتوں کا شکر بھی ادا نہ ہوتا تھا اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانی فرمائی کہ خوب سب کچھ کھاؤ پیو اور شکرو۔ بعض مفسرین نے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ سے تکبیرات عیدین مراد لی ہیں یعنی روزوں کے شمار کو پورا کرنے کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر عید کی نماز میں کہو۔ میں نے اس کو اختیار نہیں کیا اس لئے کہ میرا ذوق اس سے آبی ہے اس لئے میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا لیکن اس سے بھی میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یہ تو اجمالاً اس آیت کا حاصل ہے اب میں تفصیلاً اس کی شرح کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اللہ تمہاری آسانی چاہتے ہیں منجملہ آسانیوں کے ایک آسانی تو یہ ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا اور خود عین مجاہدہ کے وقت بہت آسانیاں ہیں چنانچہ اعتکاف میں یہ سہولت فرمائی کہ مسجد میں اس کو مشروع فرمایا تاکہ خلوت درانجمن کا مضمون ہو جائے۔ اعتکاف سے آدمی اس کا خوگر ہو جاتا ہے سب سے الگ ایک گوشہ میں بیٹھے ہیں اور سب کے ساتھ شریک بھی ہیں۔

از بروں شو آشنادہ ازروں بیگارش ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

عُجب کی مذمت

آگے ارشاد ہے وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ یہ ابطال ہے اس کمی کا جو اہل مجاہدہ کو بعض اوقات مجاہدہ سے پیش آجاتی ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شدت مجاہدہ سے بعض اہل مجاہدہ کو عجب پیدا ہو جاتا ہے اور مجاہد یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں یہ بڑی شئے ہے اور یہ بہت بڑا مرض ہے اپنے کو یہ شخص مستحق ثمرات سمجھتا ہے اور جب وہ ثمرات نہیں حاصل ہوتے تو دل میں حق تعالیٰ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ میرے ذمہ ہے وہ میں ادا کرتا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے وہ (نعوذ باللہ) ادا نہیں فرماتے حالانکہ کام مقصود ہے ثمرات مقصود نہیں ہیں۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہمارے حضرتؒ ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے

یابم اور ایانیابم جستجوئے میکنم حاصل آیدیا نہ آید آرزوئے میکنم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں مگر اس کی جستجو کرتا رہتا ہوں مقصود حاصل ہو یا نہ ہو آرزو کرتا رہتا ہوں)

مولاناؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک ذاکر تھے ہمیشہ رات کو اٹھ کر نماز پڑھتے ذکر کرتے ایک مدت گزر گئی ایک شیطان نے بہکایا جی میں آیا کہ اتنے دن ہو گئے اللہ کا نام لیتے ہوئے نہ ادھر سے سلام ہے نہ پیام ہے۔ یہ محنت ہماری اکارت ہی گئی یہ سوچ کر سو رہا خواب میں حکم ہوا۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز وسوز و دردت لبیک ماست

(اس نے کہا کہ اے اللہ ہماری لبیک تیرے لئے ہے اور یہ عاجزی اور سوز و درد ہمارے تیرے لئے ہیں)

کہ جب حق تعالیٰ کی بڑائی پیش نظر ہوگی تو اپنے اعمال اور خود اپنی ذات لاشی ءنظر آوے گی اور بجائے عجب کے شکر کرے گا۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور جیسے دل سے بڑائی کی تعلیم ہے اسی طرح زبان سے بھی سکھلائی گئی ہے کہ عید کے راستہ میں اللہ اکبر اللہ اکبر زبان سے کہتے جائیں اور نیز پانچوں وقت کی نماز میں بھی اسی واسطے حکم فرمایا اللہ اکبر زبان سے کہیں اور اسی کی نظر ہے نماز کی نیت کہ اصل نیت تو دل سے ہے لیکن زبان سے کہنا بھی فقہاء نے مشروع فرمایا ہے۔ الحاصل یہ بڑی رحمت ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا۔ اور وجوبی حکم فرمایا کہ عید کے دن ضرور کھاؤ پیو۔ دیکھئے اس میں ہماری مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے جیسے جمعہ کے بارہ میں ارشاد فرمایا فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ

فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ یعنی جب نماز ادا کر لی جاوے تو زمین میں متفرق ہو جاؤ ہم لوگ خود ایسے تھے کہ نماز کے بعد خود ہی بھاگتے لیکن حکم بھی فرما دیا۔اس میں بھی مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے اور یہی وجہ تشبیہ ہے گو یہ حکم وجوبی نہیں اور نیز ایسے دلدادہ بھی تھے جو مسجد ہی میں رہ جاتے ہیں بقول امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

خسرو غریب ست ایں گدا افتاد در کوئے شما باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب ایسا فقیر ہے جو تیری گلی میں پڑا ہوا ہے پس اب تجھ کو چاہیے کہ خدا کے واسطے غریبوں کی طرف نظر کرے)

ان کے لئے بھی انتشار فی الارض کو مصلحت سمجھا اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک کام سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور نیز طبائع اکثر ضعیف ہیں جب زیادہ پابندی ہوتی ہے اور اس سے حرج معاش ہوتا ہے اور حاجت ستاتی ہے تو ساری محبت رکھی رہ جاتی ہے۔اس لئے ارشاد فرمایا کہ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ یعنی زمین میں متفرق ہو جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق طلب کرو علاوہ اس کے اس میں ایک تمدنی وسیاسی مصلحت بھی ہے جس کو میں نے ایک مرتبہ کراچی میں وعظ کے اندر بیان کیا تھا اس طرح سے کہ تمدن کے مسائل جیسے قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں ایسے دوسری جگہ سے نہیں ہوتے چنانچہ اس آیت سے بھی ایک مسئلہ مستنبط ہوا کہ بلا ضرورت اجتماع نہ ہونا چاہیے اگر بضرورت ہو تو رفع ضرورت کے بعد فوراً منتشر ہو جانا چاہیے۔یہی وہ مضمون ہے جو تمام اہل سیاست پائے ہوئے ہیں کہ ناجائز مجمع کو منتشر کر دیا جائے قرآن مجید میں اس مجمع کے ناجائز بننے سے پہلے یہ محض اس احتمال پر کہ اب ان کو کوئی کام تو رہا نہیں یہ ناجائز مجمع نہ بن جاوے سب کو منتشر کر دیا گیا۔اس وعظ میں ایک بڑا عالی مرتبہ انگریز بھی تھا اس نے بعد وعظ کے مسرت ظاہر کی۔الحاصل مجاہدہ کو ختم کر کے کھانے پینے اور عیدگاہ میں جانے اور خوشی منانے کی اجازت دی اور اس میں بھی یہ نہیں کہ کوئی لہو ولعب ہو بلکہ اس دن میں ایک خاص عبادت مقرر فرمائی اور اس کا طرز علیحدہ رکھا کہ شہر سے باہر صحرا میں جائیں اور اچھے اچھے کپڑے پہنیں اور وہاں نماز پڑھیں اور اس نماز کا طریقہ بھی جداگانہ رکھا اور نمازوں سے اس میں چھ مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر زیادہ ہے۔یہ اس لئے کہ جوش مسرت میں موحد اور خداپرست کی زبان سے اللہ اکبر ہی نکلا کرتا ہے غرض ہماری فرحت بھی ایسی ہے کہ اس میں بھی عبادت ہے اور مشقت میں بھی راحت ہے بخلاف اور قوموں کے کہ ان کے یہاں خوشی کے دن لہو ولعب اور بعض قوموں میں فسق و فجور تک ہے اور اس دن میں ایک طریق ادائے شکر اور اظہار خوشی کے کا یہ مقرر فرمایا کہ اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرمایا اس لئے کہ حق تعالیٰ نے جو نعمت ہم پر فائز فرمائی کہ روزے ہم سے ادا ہو گئے اس کا شکر یہ ہے کہ اپنے بھوکے ہونے کو یاد کر کے اپنے بھوکے مسلمان بھائی کی امداد کریں اور کم از کم دو وقت کی کفایت کے لئے اس کو کھانا دیدیں اور نیز اس میں اپنی خوشی کی تکمیل بھی ہے اس لئے کہ مجمع میں اگر ایک شخص بھی کبیدہ ہوتا ہے تو اس کا اثر سب پر ہوتا ہے تو اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرمادیا تا کہ سب مسلمان بھائی آج سیر اور خوش نظر آ دیں اور خوشی کی تکمیل ہو جائے ورنہ اپنے بھائی کو افسردہ دیکھ کر دل پھٹ جاتا ہے غرض اس میں ادائے شکر بھی اور فرحت کی تکمیل بھی اور اس کے ساتھ معنی صدقہ کی بھی اس لئے کہ غیر صائمین اور صبیان کی طرف سے

بھی ادا کیا جاتا ہے۔ بہر حال رمضان کا تمام مہینہ تو مجاہدہ کا وقت ہے اور عید اس کا اختتام ہے اور اس اختتام یعنی عید اور مقصود یعنی مجاہدہ رمضان میں چند امور مشترک ہیں وہ یہ ہیں کہ رمضان المبارک میں بعض عبادتیں فرض ہیں بعض نفل ہیں مثلاً روزہ رکھنا فرض ہے اور تراویح واعتکاف مسنون ہیں عید کے دن میں بھی بعض عبادتیں واجب ہیں بعض مستحب ہیں۔ عید کی نماز واجب ہے صدقہ فطر واجب ہے اور غسل کرنا عطر لگانا اور اچھے کپڑے پہننا مستحب ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اس جملہ میں ایک عجیب بات غور کرنے کی ہے وہ یہ کہ اس میں واؤ عطف کا ہے اور لام غایت کا ہے واؤ عطف معطوف علیہ کو چاہتا ہے اور لام غایت عامل کو چاہتا ہے پس یہاں دو تقدیریں ہیں ایک لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ کا عامل دوسرا اس عامل کا معطوف علیہ پس عامل یہ ہے یسیر بکم جو یرید الله بکم الیسر سے مفہوم ہوتا ہے اور معطوف علیہ یہ ہے کہ شرع لکم الاحکام المذکورۃ جو اوپر کی آیتوں سے مفہوم ہے مشہور توجیہ یہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے روزہ کو مشروع کیا اور اس کے احکام میں سہولت کی رعایت کی تا کہ تم ایک مہینہ کی شمار پوری کرلو کیونکہ اس شمار کے پورا کرنے میں تمہارے واسطے منافع ہیں اس سے یہ لازم آیا کہ اکمال عدت مقصود ہے کیونکہ اس پر لام غایت داخل ہوا ہے اور ہر کام میں غایت زیادہ مطمح نظر ہوتی ہے کیونکہ وہ مقصود ہے مگر اس تقدیر مشہور میں صرف اکمال عدت کی مقصودیت ثابت ہوئی۔ یسر کی مقصودیت ثابت نہ ہوئی حالانکہ ظاہراً اثبات یسر زیادہ مہتم بالشان معلوم ہوتا ہے اس لئے دوسری توجیہ یہ ہے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ کو قوت میں اسی جملہ کے کیا جاوے کہ یرید بکم الیسر اور اس کا عامل شرع بکم الاحکام کو کہا جاوے پس کلام کا حاصل یہ ہوگا کہ شرع الله لکم ماذکر لیرید بکم الیسر ولیرفع عنکم العسر و لتکملوا العدۃ کہ اللہ نے روزہ کے احکام مذکورہ کو اس لئے مشروع کیا کہ وہ تم کو آسانی دینا اور تنگی رفع کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے مشروع کیا تا کہ تم شعار کو پورا کرلو۔ اس صورت میں دو مقصود ہوئے ایک یسر کہ اول مذکور ہونے کے سبب اصلی مقصود اور دوسرا اکمال عدت کہ تاخر فی الذکر دوسرے درجہ میں مقصود ہوا کیونکہ عادت یہی ہے کہ اگر کوئی عارض نہ ہو تو اہم کو ذکر میں مقدم رکھتے ہیں پس آسانی اسی توجیہ پر غایت درجہ کی آیت کی مدلول ہوگی کیونکہ مدخول لام ہونے کے سبب وہ خود بھی مقصود ہوگی اگر چہ ثواب وقرب ورضا مقصود ہے مگر آسانی بھی فی نفسہ مقصود ہوگی اس تقدیر پر صرف عامل مقدر ہوگا باقی معطوف علیہ ظاہر ہوگا اس لئے یہی اولیٰ ہے اور ہر حال میں یسر ثابت ہے اب اس ثبات یسر پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کو بیان کرتا ہوں اول یہ کہ بے روزوں کو شرم کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تو صاف وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزوں میں تم کو آسانی دینا چاہتے ہیں تنگی کو رفع کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ روزہ میں دشواری ظاہر کر کے ناحقیقت شناس مخالفین کو فرمان خداوندی پر ظاہراً اعتراض کا موقع دیتے ہیں ارے ظالمو تم نے روزہ رکھ کر تو دیکھا ہوتا اس کے بعد ہی اس کو دشوار کہا ہوتا سب سے اول تو روزہ میں روحانی یسر آپ کو عطا ہوتا ہے اس سے دلچسپی ہو جاتی پھر جسمانی یسر بھی حاصل ہوتا غرض اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزہ کو آسان کر دیں گے اور مراد کا ارادہ آلہیہ سے تخلف ہو نہیں سکتا تو یہ مراد یقیناً متحقق ہوگی چنانچہ مشاہد ہے کانپور میں ایک شخص نے چالیس سال

تک روزہ نہیں رکھا تھا میں نے ان سے کہا کہ یہ تو بہت آسان چیز ہے تم رکھ کر تو دیکھو پھر چاہے رکھنے کے بعد درمیان میں دشواری معلوم ہوگی توڑ دینا۔ انہوں نے رکھا اور روزہ پورا ہو گیا تو بعد میں اقرار کیا کہ واقعی بہت آسان چیز ہے پھر رکھنے لگے یہ روزہ کی خاصیت ہے کہ اس میں ترک طعام وشرب آسان ہو جاتا ہے اگر کوئی بدوں نیت صوم کے دن بھر بھوکا پیاسا رہنا چاہے تو بہت دشوار ہے مگر نیت کے بعد آسان ہو جاتا ہے ان دونوں صورتوں میں وجہ فرق صرف یہی ہے کہ پہلی صورت میں صوم نہیں اور دوسری صورت میں صوم ہے۔

روزہ کو مشروع فرمانے کے مصالح

حاصل آیت کا یہ ہوا شرع الله لکم الصوم للیسرو اکمال العدة ولتکبروا الله علی ماهدکم جس میں متعدد غایات ہیں اور ایک غایت پر دوسری غایت مرتب چلی آتی ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ کی ایک نعمت تو یہ ہے کہ روزہ کو مشروع کیا ورنہ ہم کیسے رکھتے دوسرے یہ کہ اس کو آسان کر دیا تیسرے یہ کہ احکام میں ایسی رعایت فرمائی جس سے شمار کا پورا کرنا آسان ہو گیا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں آتی ہے تو اس پر خدا کی تکبیر کہو گے یہ چوتھی نعمت ہے اب اس کا دشوار ہونا ایسا ہے جیسا ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میاں لاالہ الا اللہ سے زیادہ کیا چیز آسان ہوگی مگر کفار کے لئے یہ سب سے زیادہ دشوار ہے تو اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو آسان ہے وہ خدا تعالیٰ کا فضل ہی ہے ورنہ ہم لوگ اپنی قوت سے کوئی کام نہیں کر سکتے جب تک اللہ تعالیٰ اس کو آسان نہ کر دیں۔ عوارف میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں ان کی زبان سے کوئی کلمہ ناگوار خلاف شرع نکل گیا تھا اس کے بعد وہ ولی ہوئے صاحب معرفت شیخ ہوئے مگر اس کلمہ کو کہنا یاد بھی نہ رہا اس سے خاص توبہ نہیں کی ایک دن لاالہ الا اللہ کہنے کا ارادہ کیا تو زبان سے کلمہ نہ نکلا اور سب باتیں کر سکتے تھے مگر لاالــه الا الـلـه نہ کہہ سکتے تھے یہ حالت دیکھ کر لرز گئے جناب باری میں دعا کی یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے مجھے بتلایا جائے الہام ہوا کہ فلاں زمانہ میں تم نے فلاں کلمہ کہا تھا اور اب تک اس سے استغفار نہیں کیا اس لئے آج اتنے برس کے بعد ہم نے اس کی سزا دی یہ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور توبہ کی تو فوراً زبان کھل گئی۔ اسی واقعہ سے سمجھنا چاہیے کہ کبھی طاعت کی دشواری کا سبب دوسرے معاصی بھی ہو جاتے ہیں اس کا علاج توبہ واستغفار ہے کبھی دشواری کا سبب وحشت بھی ہوتی ہے کہ ذکر اللہ سے وحشت ہو وحشت کی وجہ سے اللہ نہ کہہ سکے آپ بہت لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ بہت وقت بیکار ضائع کرتے ہیں مگر ذکر اللہ کے لئے ان کی زبان نہیں اٹھتی اسکا سبب بھی وہی معصیت ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے دل کو ذکر اللہ سے وحشت ہے اسی کو ایک شاعر کہتا ہے

احب مناجاة الحبیب باوجه ولکن لسان المذنبین کلیل

اسی واسطے بے ضرورت گناہوں کو یاد کرنا اپنے ہاتھوں وحشت کا سامان کرنا ہے اسی کے متعلق شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ گناہ معاف ہو جانے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ گناہ دل سے مٹ جائے اور جب تک وہ مٹے گا نہیں قلب پر وحشت سوار رہے گی جو اس گناہ کی سزا ہے اسکی شرح میں مشائخ طریق کا ارشاد ہے کہ گناہ کے بعد جی بھر کے توبہ کر کے پھر

اس کو جان جان کر ... کرے اس سے بندہ اور خدا کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے جو محبت اور ترقی سے مانع ہے پس خوب سمجھ لو یہ تیسیر بھی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کو ہمارے لئے آسان کر دیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ میں ہم کو اس نعمت پر متنبہ فرمایا ہے کہ یہ احکام اس واسطے مشروع کئے گئے ہیں کہ ان کو تمہارے واسطے آسان کر دیں اور گنتی پورا کرنے کی توفیق دیں پس تم اس کو دشوار نہ سمجھو اور نہ اس کی فکر کرو کہ تیس دن کیوں کر پورے ہوں گے اس کے بعد ارشاد ہے وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ یعنی اور تا کہ ان نعمتوں پر تم خدا کی بڑائی ظاہر کرو یہاں اللہ تعالیٰ نے لما اکم فرمایا ہے شرع لکم نہیں فرمایا کیونکہ ھدا کم سب نعمتوں کو شامل ہے تشریعی نعمتوں کو بھی اور تکوینی نعمتوں کو بھی اور یہاں دونوں قسم کی نعمتیں مذکور ہوتی ہیں کیونکہ تیسیر و اکمال عدۃ تکوینی نعمتیں ہیں تو ان سب نعمتوں پر جس کا میزان الکل ھدا کم ہے خدا کی تکبیر کہو پھر یہاں لتحمدوا اللہ نہیں بلکہ لتکبروا اللہ فرمایا کیونکہ اس سے حادثہ کی وقعت معلوم ہوتی ہے اور حادثہ عظیمہ پر ہمارے اندر تکبیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ حمد کا اور قرآن شریف میں ہماری محاورات وجذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے۔

ہمارے جذبات کی رعایت

غرض اس مقام پر لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ ہمارے جذبات کی رعایت سے فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں بڑی ہیں اور بڑی نعمت کو دیکھ کر ہم کو اللہ اکبر کا تقاضا ہوتا ہے نہ الحمدللہ کا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کی ایسی رعایت فرمائی کہ تکبیر کو ہماری رائے پر نہیں چھوڑا بلکہ خود شروع کر کے دکھلا دیا چنانچہ عید کے روز تکبیر کہنا ضروری کر دیا نماز عید کی ہر رکعت میں تین تکبیریں زیادہ کہی جاتی ہیں یہ تو واجب ہیں راستہ میں بھی عیدگاہ کو جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے بعض آئمہ کے نزدیک جہراً اور ہمارے امام صاحب کے نزدیک سراً اور عجب نہیں کہ صلوۃ عید میں تین تکبیریں اس لئے ہوں کہ ایک بمقابلہ یسر کے ہے دوسری مقابلہ رفع عسر کے تیسری بمقابلہ اکمال عدۃ کے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ اور یہ نعمتیں اس لئے تم کو عطا کیں تا کہ تم ان پر شکر کرو اور یہ عجیب نعمت کا بیان ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یسر و عدم عسر و اکمال عدۃ و تکبیر ان سب پر شکر کرو اور شکر دوسری عبادت کے اعتبار سے تو ان عبادات کے متعلق ہے مگر فی نفسہ یہ خود بھی مستقل عبادت ہے اس لئے یہ خود بھی مطلوب اور مقصود ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی ایک غایت ہے جس کے لئے یسر و اکمال عدۃ وغیرہ ہم کو عطا کیا گیا۔

ربط آیات

پھر چونکہ منعم کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے نعمتوں کا استحضار ہو کر منعم کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور محبت کے بعد محبوب سے قرب کا تقاضا ہوتا ہے تو اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے قرب کو بیان فرماتے ہیں وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس تقریر سے تمام آیات واجزاء آیات کا ربط بخوبی ظاہر ہو گیا اور جس طرح ان آیات کی تفسیر آج ذہن میں آئی ہے اس سے پہلے کبھی نہیں آئی آیت (واذا سالک عبادی) کا ربط پہلی آیت سے مشہور یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو صوم اور تکبیر و شکر

وغیرہ کا امر کیا ہے تو ممکن ہے کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ نہ معلوم خدا تعالیٰ کو ہمارے ان افعال کی خبر بھی ہوتی ہے یا نہیں خصوصاً شکر قلب کی کیونکہ افعال قلبیہ مستور ہوتے ہیں جن کی اطلاع دنیا میں تو کسی کو نہیں ہوتی اور چونکہ طبیعت انسانیہ قیاس الغائب علی الشاہد کی عادی ہے اس لئے بعض لوگوں نے سوال بھی کیا **اقریب ربنا فنناجیه ام بعید فتنادیه** کیا ہمارا پروردگار ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے خفیہ طور پر مناجات کرلیا کریں یا بعید ہے کہ پکارا کریں اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی یہ ربط بھی عمدہ ہے مگر ربط اول احسن ہے اور ربط مشہور پر اس آیت کا پہلی آیت سے متصل آنا امام ابوحنیفہؒ کے اس قول کی تائید کرتا ہے کہ تکبیر عیدالفطر راستہ میں سرا ہونی چاہیے جہر کی ضرورت نہیں، رہی تکبیر صلوۃ تو وہ چونکہ قراءت کے متصل ہے اور قراءت جہری ہے اس لئے اتصال جہری کی وجہ سے اس میں بھی جہر ہو گیا دوسرے اس میں جہر کی یہ بھی وجہ ہے کہ مقتدیوں کو اعلام کی ضرورت ہے کہ اس وقت تکبیر کہہ رہا ہے تو وہ بھی اس کی اقتدا کریں اور تکبیر طریق میں ہر شخص مستقل ہے وہاں اعلام کی ضرورت نہیں اور تکبیر تشریق کا جہر خلاف قیاس نص سے ثابت ہے۔ **لقوله صلی الله علیه وسلم الحج العج والثج وفی تکبیر التشریق تشبیه تلبیة الحاج فافهم** اور **اذا سالک عبادی عنی فانی قریب** کی بلاغت عجیب قابل دید ہے کہ **فقل انی قریب** یا **فانه قریب** نہیں فرمایا بلکہ بلاواسطہ **فانی قریب** فرمایا ہے یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے سوال کرے کہ فلاں شخص کہاں ہے اور وہ بول پڑے کہ میں تو موجود ہوں اور یہ جب یہ ہوگا جبکہ مجیب کو سائل کے ساتھ خاص تعلق ہو اور اگر خاص تعلق نہ ہو تو وہ قریب ہوتے ہوئے بھی خود نہ بولے گا بلکہ جن سے سوال کیا گیا ہے ان سے کہے گا کہ اس سے کہہ دو وہ یہاں موجود ہے اور تعلق کی صورت میں ایسا نہ کرے گا خود بول پڑے گا کہ میں تو موجود ہوں اسی طرح یہاں حق تعالیٰ نے خود بلاواسطہ جواب دیا کہ میں تو قریب ہوں حضور ﷺ سے نہیں فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں اس میں جس خاص تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور وہ تعلق ایسی نعمت ہے کہ اس پر ہزار جانیں قربان کردی جائیں تو تھوڑا ہے پھر اس جواب کا حضور کی زبان سے ادا ہونا بتلاتا ہے کہ رسول ﷺ کا بولنا خدا ہی کا بولنا ہے۔

گرچہ قرآں از لب پیغمبر است ہر کہ گوید حق نگفت او کافر است

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

حضور ﷺ میں ایک شان تو مبلغ ہونے کی ہے اور دوسری شان لسان حق ہونے کی ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے لئے بمنزلہ لسان یعنی ترجمان کے ہیں اس عنوان سے گھبرائیں نہیں کیونکہ جب شجرہ طور لسان حق ہو گیا اور اس سے ندا آئی **اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ** تو حضور ﷺ کا لسان حق ہونا تعجب خیز کیوں ہے پھر حدیث میں اہل قرب کے لئے آیا ہے **کنت بصره الذی یبصر به وسمعه الذی یسمع به ورجله التی یمشی بها** اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ سے زیادہ مقرب کون ہوگا تو آپ کی یہ شان سب سے زیادہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے خلاصہ ان اجزاء مرتبہ کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو دیکھ کر خود بخود آپ کے دل پر شکر کا تقاضا ہوگا کہ آپ کی ہی مصلحت و نفع کے لئے صوم کو مشروع فرمایا پھر اس میں تشریعاً و تکویناً یسر و عدم عسر کی رعایت فرمائی تا کہ روزہ کی تکمیل ہو جائے اور تکمیل کے بعد اس نعمت پر تکبیر کہو اور شکر و کرو پھر شکر سے محبت پیدا ہوگی اور محبت سے قرب حق کا تقاضا ہوگا تو اس آیت میں تسلی فرمادی کہ میں تم سے قریب ہوں

مجھے تمہارے سب احوال واقوال کی خبر ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں ہر دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کر لیتا ہوں یہاں دعا سے مراد عبادت ہے وہ دعائے ظاہری مراد نہیں جیسا آیۃ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں بقرینہ ان الذین یستکبرون عن عبادتی یہی مراد عبادت ہے اور عبادت کو دعا سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ تمہاری عبادت کی حقیقت محض دعا والتجا ہے جیسے کوئی شخص ڈوبتا ہو تو وہ دوسروں کو پکارتا ہے پس آپ کی عبادت کا صرف یہ درجہ ہے اس کے بعد جو کچھ ہے حق تعالیٰ کی عطا وفضل ہے اگر ہم اپنی عبادت پر ناز کرنے لگیں تو اس کی ایسی مثال ہوگی ڈوبنے والے کی پکار سن کر کسی نے اس کو بچا لیا ہو اور وہ ڈوبنے والا اس کے بعد فخر کرنے لگے کہ میں شناور ہوں ارے تجھے خبر بھی ہے کہ دوسرے نے تجھ کو بچا لیا ورنہ محض پکارنے سے تو کہاں بچ سکتا تھا اور حقیقت میں ہمارا تو پکارنا بھی ان ہی کی عطا ہے اگر وہ طلب دل میں پیدا نہ کریں تو ہم سے پکارنا بھی نہ ہو سکتا مولانا فرماتے ہیں

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو　　　ایمنی از تو مہابت ہم زتو

اس کے بعد فرماتے ہیں فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ کہ جب ہم تمہارا کام کر دیتے ہیں اب تم بھی ہمارا کہنا مانو کہ میری باتوں کی تصدیق کرو اور عملاً اس کی تعمیل کرو لعلھم یرشدون کہ تم کو رشد وفلاح حاصل ہو اور ہدایت میں ترقی ہو (یہ ترجمہ لفظی نہیں حاصل مطلب ہوا) اس میں بتلا دیا کہ ہم جو تم سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا کہنا مانو تو اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کا نفع بھی تمہارے ہی لئے ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرا کہنا مانو ایسا ہے جیسا ہم بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ میاں ہماری ایک بات مان لو اور وہ یہ ہے کہ کھانا کھا لو اس عنوان سے اس پر گرانی نہ ہوگی اور وہ اپنا کام تمہاری خاطر سے کرے گا اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے جو کام بتلایا ہے وہ ہمارا ہے ہمارے ہی فائدہ کا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ اس کو اپنا کام قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارا کہنا مان لو یہ تو مختصر طور سے آیت کی تفسیر تھی اور اصل مقصد اکمال کا بیان کرنا تھا اب میں اصل مقصود کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں پس سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اکمال عدت کی مقصودیت کو بیان فرمایا ہے کہ ہم نے احکام صوم میں آسانی کی رعایت اس لئے کی ہے تاکہ اس مدت کو جو روزہ کے لئے مقرر کی گئی ہے پورا کر لو ہر چند کہ اس عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکمال عدت خود مقصود ہے مگر در حقیقت خود اسی مقصود سے بھی مقصود دوسری چیز ہے جس کے لئے اکمال عدت ذریعہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ ذرائع کو بھی مقصود بنا کر سکھاتے ہیں تاکہ مخاطب ذریعہ کا پورا اہتمام کرے تو نتیجہ اس پر خود مرتب ہو جائے گا اور یہی اصول صوفیہ نے قرآن سے سیکھا ہے چنانچہ وہ طالبین کو یہی تعلیم کرتے ہیں کہ مقصود عمل ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ عمل اختیاری ہے اور وصول غیر اختیاری ہے تم عمل کے مکلف ہو اسی کو مقصود سمجھ کر بجا لاتے رہو اس پر وصول خود مرتب ہو جائے گا اب سمجھئے کہ وہ مقصود کیا ہے جس کے لئے اکمال عدت کا حکم ہے اکمال عدت اصل میں ذریعہ ہے تقویٰ کا جس کو اللہ تعالیٰ نے صوم کے ذکر میں ابتداءً ہی بیان فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ اور تقویٰ کی حقیقت ہے دنیا میں گناہوں سے بچنا اور آخرت میں عذاب سے نجات پانا یہ نفع ہے اکمال کا اس کے بعد یہ بھی

سمجھئے کہ اکمال عدت کے دو درجے ہیں ایک اکمال ظاہری کہ رمضان کا پورا مہینہ روزہ میں تمام ہو جائے ایک اکمال معنوی کہ اس پر یہ غایت مرتب ہو جو اکمال سے مطلوب ہے پس روزہ کا حقیقی پورا کرنا یہ ہے کہ ہم ہر دن یہ دیکھتے رہیں۔ کہ گناہوں سے کس قدر بچے اور آئندہ کے لئے کس قدر اہتمام کیا۔ اگر یہ غایت مرتب نہ ہوئی تو اکمال عدت محض ظاہری ہو گی حقیقی اکمال حاصل نہ ہوگا اسی لئے حدیث میں ہے من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة ان یدع شرابه و طعامه جو شخص روزہ میں بے ہودہ باتیں اور بے ہودہ کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کچھ پروا نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اکمال عدت کا یہ درجہ مطلوب ہے جس پر تقوی مرتب ہو پس ہم کو اپنی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ہم رمضان میں گناہوں سے کس قدر بچے اور کتنا اس کا اہتمام کیا افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ہم لوگوں کو روزہ میں گناہوں سے بچنے کا ذرا بھی اہتمام نہیں ہماری حالت وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ بعضوں کے تو رمضان میں گناہ پہلے سے بھی بڑھ گئے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا مذاق یہ ہو۔

ہر گناہے کہ کنی در شب ادینہ کن تا کہ از صدر نشینان جہنم باشی

یہ وہ بیباک لوگ ہیں جن کو متبرک زمانہ میں بھی تنبہ نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں گناہ کرنے کا وبال اور دنوں سے زیادہ ہے قاعدہ سے تو یہ چاہیے تھا کہ جن لوگوں نے ان متبرک دنوں کو یوں برباد کیا ہے ان کے لئے ان ایام کی مکافات کا کوئی طریقہ نہ ہوتا مگر خدا تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے وہ اب بھی رحمت کرنے کو موجود ہیں اگر ان بقیہ دنوں کی درستی کر لی جائے اور اب تک کے گناہوں سے توبہ کر لی جائے۔ صاحبو! ہمیں اس رحمت کی قدر کرنا چاہیے ورنہ پھر یہ وقت شاید نہ ملے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک اور اندیشہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بددعا نہ لگ جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو بددعا دی ہے جس نے رمضان میں بھی اپنے گناہوں کی مغفرت نہ کرائی ہو۔

جملہ احکام شریعت آسان ہیں

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں)

شبہ یہ ہے کہ بہت سی دشواریاں بھی پیش آتی ہیں اگر یہ عسر بارادہ (دشواری) حق ہے تو نص مذکورہ کے خلاف ہے کہ مثلاً وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (یعنی آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے)

چند تکبیریں بڑھا دیں کہ امتیاز علامت ہے اہتمام شان کی اور اسی لفظ سے قرآن میں بھی ارشاد ہے وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہو گیا کہ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ میں تکمیل رمضان مراد ہو اور لتکبروا سے عید اور ایک حکمت دیکھئے مسلمان میں دو چیزیں ہیں ایک دین اور ایک طبیعت اور جس طرح اس کی طبیعت میں بعض امور کا جوش اور تقاضا پیدا ہوتا ہے اسی طرح اس کے دین کو بھی جوش ہوتا ہے اور ان دونوں کی معدل عقل ہوتی ہے۔

پس خدا تعالیٰ نے جوش دین کا تو یہ انتظام فرمایا کہ نماز مقرر فرمائی اور جوش طبیعت کا یہ انتظام فرمایا کہ اس دن اچھے سے اچھا کپڑا پہننے کی اجازت دی۔ سبحان اللہ شریعت کا کیا پاکیزہ انتظام ہے۔

مجاہدات میں انسانی مزاج کی رعایت

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت کا ارادہ فرماتے ہیں اور تم پر سختی کا ارادہ نہیں کرتے۔

یہ ابطال ہے اس کوتاہی کا کہ ان کے مجاہدات میں دشواری ہی دشواری ہے یہاں تو یہ بات نہیں ہے چنانچہ جن مجاہدات کی تعلیم کی گئی ہے وہ سب نہایت لطیف اور ہماری طبیعت اور مذاق کے موافق اور نفع میں سب مجاہدوں سے بڑھ کر ہیں آگے ارشاد ہے وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ (اور تا کہ تم شمار کو پورا کرلو) اس کوتاہی کا ابطال ہے کہ ان کے مجاہدہ کا کہیں خاتمہ ہی نہیں اور نہ اس میں اکمال ہے۔ یہاں اختتام بھی ہے اور اکمال بھی۔ ایک کوتاہی یہ تھی کہ مجاہدہ کر کے ناز ہوتا تھا اور یہ اس طریق میں سخت مضر ہے اس کا دفع جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یرید سے مراد ارادہ تشریعیہ ہے یعنی حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ مشکل احکام مشروع کریں بلکہ آسان آسان احکام مشروع کرنا چاہتے ہیں چنانچہ کہیں کوئی حکم شریعت کا مشکل بتلا تو دو کہیں نہیں بہر حال یہ مراد ہے ارادہ سے۔

جوش دین اور جوش طبیعت کا انتظام

صاحبو! غور کیجئے کہ خدا تعالیٰ ہماری خوشی کو بھی کس انداز پر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں نماز کا حکم فرمایا اکثار صدقہ کا حکم فرمایا کہ یہ زکوۃ کے مشابہ ہے اور نماز کی بھی ایک خاص ہیئت مقرر فرمائی کہ اس میں فرماتے ہیں

وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ (یعنی تا کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی) لعلکم تشکرون ۔ یعنی تا کہ تم شکر کرو۔

یہ اس کوتاہی کی تکمیل ہے کہ ان کے مجاہدہ کے اختیار کرنے میں نعمت اور لذات سے محرومی تھی تو نعمتوں کا شکر بھی ادا نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانی فرمائی کہ خوب سب کچھ کھاؤ پیو اور شکر کرو۔

بعض مفسرین نے لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ سے تکبیرات عیدین مرادلی ہیں یعنی روزوں کے شمار کو پورا کرنے کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر عید کی نماز میں کہو۔ میں نے اس کو اختیار نہیں کیا اس لئے کہ میرا ذوق اس سے آبی ہے اس لئے میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا لیکن اس سے بھی میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یہ تو اجمالاً اس آیت کا حاصل ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ احکام وقوانین مقرر کرنے سے دشواری منظور نہیں تا کہ تم لوگ ایام (ایام قضا) کی تکمیل کرلیا کرو اور تا کہ تم لوگ اللہ کی بزرگی اور ثنا بیان کیا کرو اس پر تم کو ایسا طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات وثمرات ماہ رمضان سے محروم نہ رہو گے) اور تا کہ تم شکر کرو۔

تفسیر رحمۃ للعالمین

اب میں آیت کی تفصیل کیلئے دو حدیثیں پڑھتا ہوں جن میں ایک کو تو لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ سے مناسبت ہے یعنی ختم رمضان سے اور ایک کو لِتُكَبِّرُوا اللهَ سے تفسیر اول پر یعنی عید کی نماز سے مناسبت ہے۔

پہلی حدیث تو یہ ہے کہ جس کے راوی غالباً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ انکی ناک رگڑی جائے۔ ذلیل وخوار ہو جائیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ حضور ﷺ کی بددعا کیسی ہوگی۔ شاید اس پر کوئی طالب علم یہ کہے کہ ہم حضور ﷺ کی بددعا سے نہیں ڈرتے کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں دوسرے آپ نے حق تعالیٰ سے یہ بھی عرض کیا ہے۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَيُّمَا مُؤْمِنٍ اٰذَيْتُه اَوْشَتَمْتُه فَاجْعَلْهَا لَه صَلٰوةً وَزَكٰوةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُه اِلَيْکَ

اے اللہ! میں بشر ہی ہوں (اس لئے عوارض بشریہ مجھے بھی لاحق ہوتے ہیں) تو جس شخص کو میں ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا سزا دوں یا کسی پر لعنت (بددعا) کروں تو اس کو اس کے حق میں رحمت اور گناہوں سے پاکیزہ اور قربت کا سبب بنا دیجئے کہ اس کے ذریعے سے آپ اس کو اپنا مقرب بنالیں۔ تو جب آپ نے اپنی بددعا کے متعلق خود یہ دعا کی ہے کہ وہ سبب رحمت وقرب بن جایا کرے تو پھر آپ کی بددعا سے کیا ڈر؟

اس کا جواب یہ ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں تو یہی امر محل سوال ہے کہ عالمین سے مراد کیا ہے اور عالمین کے لئے رحمت ہونے کا کیا مطلب ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عالمین اپنے عموم پر ہے اور اس عموم میں کفار بھی داخل ہوں گے اور چونکہ آیت میں کوئی تحدید وتقیید نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ کفار کے لئے دنیا وآخرت دونوں میں سبب رحمت ہیں اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ کفار پر آخرت میں آپ کی رحمت کس طرح ظاہر ہوگی۔

بعض علماء نے جواب دیا ہے کہ اگر ہمارے حضور ﷺ کا وجود نہ ہوتا تو کفار کو آخرت میں اب سے زیادہ عذاب ہوتا۔ حضور ﷺ کی برکت سے اس میں کچھ کمی تجویز کی گئی ہے مگر میرے دل کو یہ جواب نہیں لگتا کیونکہ اس دعوے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی کہ حضور ﷺ نہ ہوتے تو عذاب زیادہ تجویز کیا جاتا۔ دوسرے جہنم کا عذاب قلیل بھی ایسا شدید ہے کہ ہر شخص یوں سمجھے گا کہ سب سے زیادہ عذاب میں میں ہوں تو اس قلت سے ان کو نفع کیا ہوا۔

میرے ذہن میں جو اس کا جواب آیا ہے وہ یہ ہے کہ عالمین سے مراد تو معنی عام ہی ہیں مگر رحمت سے مراد خاص وہ رحمت ہے جس کا تعلق ارسال سے ہے یعنی رحمت فی الدنیا۔ کیونکہ ارسال دنیا ہی کے ساتھ خاص ہے آخرت سے اس کو کوئی علاقہ نہیں اور دنیا میں جو آپ کی رحمت مومنین وکفار سب کو عام ہے وہ رحمت ہدایت وایضاح حق ہے چنانچہ قرینہ مقام اسی پر دلالت کر رہا ہے اس لئے کہ پہلے تبلیغ ہی کا ذکر ہے۔ ان فی هذا لبلاغا اس میں کافی مضمون ہیں لِقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ایسے لوگوں کے لئے جو بندگی کرتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر اس میں آپ کی تخصیص کیا ہے۔ ہدایت ایضاح حق میں تو تمام انبیاء آپ کے شریک ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص محض رحمت کے اعتبار سے نہیں بلکہ مجموعہ رحمۃ للعلمین کے

اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالمین سے مراد تمام مکلفین کے لئے ہادی بن کر آپ ہی مبعوث ہوئے ہیں اور عالمین سے مراد تمام مکلفین ہیں جن میں جن وانس، عرب عجم سب داخل ہیں، حاصل یہ ہوا کہ بعثت عامہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بخلاف اور انبیاء کے کہ ان کی دعوت خاص خاص اقوام کے لئے تھی۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دیگر انبیاء کی دعوت خاص تھی تو نوح علیہ السلام کی تکذیب سے تمام عالم کے کفار کیوں غرق کئے گئے بلکہ چاہیے تھا کہ عذاب صرف ان لوگوں پر آتا جن کی طرف خاص طور پر مبعوث ہوئے تھے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ جو دعوت عامہ مخصوص ہے اس سے مراد دعوت عامہ فی الفروع ہے باقی اصول میں تو ہر نبی کی دعوت عام ہوتی ہے کیونکہ اصول تمام انبیاء کے یکساں ہیں اور نوح علیہ السلام کے زمانہ میں تمام عالم کے کفار اصول ہی میں ان کی تکذیب کرتے تھے یعنی توحید و اعتقاد رسالت ہی میں خلاف تھے اس لئے سب پر عذاب نازل ہوا۔

بہر حال اس آیت کی تفسیر اگر وہی ہے جو میں سمجھا جب تو اس میں صرف عموم دعوت کا بیان ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ کی بددعا بھی رحمت ہے جو اس سے بےفکری کی جائے اور اگر دوسری مشہور تفسیر ہے تو وہ منافی عذاب کے نہیں رہی حدیث تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی یہ درخواست اس بددعا کے ساتھ مخصوص ہے جو غلبہ غضب میں بلا عمد صادر ہو اور یہ بددعا تو عمداً ہے کیونکہ اس میں تو آپ تبلیغ احکام کے ساتھ رغم انفه فرما رہے ہیں۔ اگر یہ مضمون الخ ہر بددعا کے لئے عام ہوگا۔ تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا۔ اگر آپ کی بددعا مطلقاً قبول نہیں ہوتی تو لعنتهم کے بعد کل نبی مستجاب سے تاکید کیوں کی جارہی ہے۔

بہر حال یہ شبہ تو رفع ہو گیا۔ اس لئے آپ کی بددعا سے بےفکری نہیں ہو سکتی مگر حضور ﷺ نے اس حدیث میں بددعا ایسے لفظوں سے کی ہے جن سے دعا بھی نکل سکتی ہے۔ کیونکہ آپ رغم انفه فرمار ہے ہیں۔ اور رغم انفه نماز میں بھی ہوتا ہے۔ تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دیجئے۔ گو محاورہ میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے مگر لفظ سے بنا بر لغت نکل سکتے ہیں اور کبھی حضور ﷺ نے بھی ایسا کیا ہے کہ ایک لفظ کو معنی عرفی سے صرف کر کے بنا بر لغت دوسرے معنی پر محمول کیا ہے تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس وقت حضور ﷺ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو روکا کہ آپ ایسے لوگوں کی نماز کیوں پڑھاتے ہیں جن کے لئے استغفار کرنے سے حق تعالیٰ نے آپ کو منع فرمایا ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ان کے لئے دعا کریں یا نہ کریں اگر ستر مرتبہ بھی کریں تب بھی ان کی بخشش نہیں ہوگی۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! حق تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر سے زیادہ کرنے سے ان کی مغفرت ہو جائے گی تو میں اس سے زیادہ کرلوں گا۔

فلسفی مزاج مصنفین تو اگر حدیث کو سن لیتے ہیں تو موضوع ہی کہہ دیتے کیونکہ اس سے اشکال ہوتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ

حضور ﷺ کو عربی محاورہ کی بھی خبر نہ تھی کہ اس قسم کی تردید سے تخییر مراد نہیں ہوتی بلکہ نسوۃ فی عدم النفع مراد ہوتا ہے اور ذکر سبعین سے تحدید کا قصد نہیں ہوتا بلکہ تکثیر مراد ہوتی ہے مگر حدیث صحیح ہے۔ بخاری مسلم کی روایت ہے اس کو موضوع نہیں کہا جا سکتا۔ باقی علماء نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں مگر میں نے ان جوابوں کو یاد نہیں رکھا بلکہ اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کا جواب مجھے بہت پسند آیا وہی یاد رکھا۔

ہمارے استاد علیہ الرحمۃ کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے غایت رحمت سے محض الفاظ سے تمسک فرمایا۔ اس جواب کا حاصل وہی ہے کہ آپ نے معنی عرفی سے عدول کر کے معنی لغوی پر کلام کو محمول فرما لیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنی عرفی کی آپ نے نفی فرما دی بلکہ لفظی احتمال کے طور پر فرمایا کہ فی نفسہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا۔ ایسے ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ گو عرفاً رغم انفہ بددعا کے لئے ہے مگر لغۃً اس سے دعا بھی نکل سکتی ہے کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دے تاکہ ان کے یہ عیوب سب مٹ جائیں۔ یہ ایسی تاویل ہے جیسے مثنوی کے اس شعر کی شرح میں

آتش ست ایں بانگ نای و نیست باد ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

شراح کا اختلاف ہوا ہے۔ بعض نے مصرعِ ثانی میں نیست باد کو بددعا پر محمول کیا ہے جس پر یہ آتش عشق نہ ہو خدا کرے وہ ملیامیٹ ہو جائے اور بعض نے اس کو دعا پر محمول کیا ہے کہ مولانا ان کے لئے مقام فنا کی دعا کر رہے ہیں کہ خدا ان کو بھی فنا عطا فرما دے۔ ایسے ہی رغم انفہ میں دعا اور بددعا دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

اہمیت ذکر رسول

اب سنئے وہ تین شخص کون ہیں ایک تو وہ شخص ہے جو حضور ﷺ کا نام سنے اور ﷺ نہ کہے۔ حضور ﷺ کا بڑا حق ہے کہ جب آپ کا نام مبارک لیا جائے یا سنا جائے تو صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنا واجب ہے اگر نہ کہے گا تو گناہ ہوگا ایسے ہی حق تعالیٰ کے نام پاک کے ساتھ جل جلالہ یا کوئی اور لفظ تعبیر کرنا مشعر ہے کہ تعظیم کرنا واجب ہے ورنہ گناہ ہوگا۔ لیکن اگر ایک مجلس میں چند بار نام لیا جائے تو حضور ﷺ کے نام کے ساتھ ﷺ کہنا اور حق تعالیٰ کے نام کے ساتھ جل جلالہ یا تعالیٰ ایک بار کہنا تو واجب ہے اور ہر بار کہنا مستحب ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ
فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

ترجمہ: اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو (آپ میری طرف سے فرمادیجئے) میں قریب ہی ہوں (اور باستثنا نامناسب درخواست کے) منظور کرلیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے سوان کو چاہیئے کہ میرا کہا مانے اور میرے ساتھ ایمان لائیں تا کہ وہ ہدایت پالیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

حدیث میں آتا ہے کہ لوگوں نے رسول ﷺ سے عرض کیا **اقریب ربنا فتناجیه ام بعید فتنادیه** کیا اللہ تعالیٰ ہم سے نزدیک ہیں تو آہستہ سے عرض معروض کرلیا کریں یا دور ہیں کہ زور سے پکارا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ سلاطین دنیا تک ہر شخص کی بات نہیں پہنچتی ہے مگران سوال کرنے والوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ زور کی آواز کو سنتے ہوں آہستہ کو نہ سنتے ہوں یا تو اس لئے کہ وہ ہم سے دور ہیں اور بعد کا خیال بوجہ عظمت کے ہو (**وایضافان قوله تعالی فوق العرش منصوص واثبات العوله لازم شرعا کما هوا عقیدة للسف من غیر بیان کیفیته علوه وفوقیته** یا اس لئے کہ وہ بہت سے کاموں میں مشغول ہیں اور شغل کی حالت میں آہستہ آواز مسموع نہیں ہوتی گو سامع قریب ہی ہو آگے اس سوال کا جواب ہے فانی قریب ظاہر حال کا مقتضا یہ تھا کہ یہاں **فقل انی قریب** ہوتا کیونکہ اوپر اذا سالک میں سوال واسطہ حضور ﷺ کے ہے تو جواب بھی حضور ﷺ کے واسطہ سے دیا جاتا کہ آپ ﷺ اس سوال کے جواب میں فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں دور نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے جواب بلاواسطہ دیا ہے کہ یہاں قل کو حذف کردیا گو یہ جواب پہنچے گا بواسطہ رسول ہی کے مگر حذف قل میں اس بات کو ظاہر فرمادیا کہ ہم تمہارے سوال کا جواب بلاواسطہ دیتے ہیں گو یہ سوال ہماری شان وعظمت کے خلاف ہے مگر ہم اس خطا کو عفو کر کے بلاواسطہ جواب دیتے ہیں اس طرز وعنوان میں جو کچھ عنایت وکرم مزید ہے ظاہر ہے آگے جواب کے بعد ارشاد ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ اس میں ایک دوسری عنایت کا اظہار ہے کیونکہ سوال کا جواب تو اس سے ہوگیا کہ فانی قریب اس کے بعد سائل کو کسی اور بات کا انتظار نہ تھا مگر کلام علی اسلوب الحکیم کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ جس میں اس پر تنبیہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب علمی یہ تو فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ سے معلوم ہو چکا دوسرے قرب تعلق خصوصیت جیسا کہ اردو میں ہم کبھی تو یوں کہتے ہیں کہ میں پاس ہی ہوں کہو کیا کہتے ہو یعنی سن رہا ہوں اس میں تو پاس ہونے سے قرب علمی وقرب سماع

کا بیان مقصود ہے اور کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں تو ہمارا قریب ہے یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے نیز کہتے ہیں کہ تم تو دور رہ کر بھی پاس ہی ہو یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔ پس اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں دوسرے قرب کو یعنی قرب تعلق کو اور اب اس قرب کی خصوصیت کو بیان کیا گیا کہ میں باعتبار علم کے قریب قریب ہوں کہ سب کی بات سنتا ہوں اور باعتبار شفقت و رحمت و توجہ و عنایت کے بھی قریب ہوں کہ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔ پس اجیب کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست کو لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے بے توجہی نہیں ہوتی۔

اسی لئے عشاق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کے لئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی بات سن لے عاشق کے لئے یہی بات بہت کافی ہے اس کے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے تو چاہیے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت بعد نظر آتا ہے صاحبو! پھر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا اور ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں بس ہم دور ہو رہے ہیں اسی لئے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ فرمایا انتم اقرب الینا نہیں فرمایا کیونکہ یہاں قرب علمی مراد ہے اور قرب علمی میں طرفین سے قرب لازم نہیں ہے بخلاف قرب حسی کے کہ یہاں طرفین سے قرب لازم ہے پس اس وقت ہماری حالت سعدیؒ کے شعر کی مصداق ہے

دوست نزدیک تراز من بمن ست — ایں عجب تکرہ من ازوے دورم

اس مقام پر استطراداً میں ایک شبہ کو بھی رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں کو پوری آیت نحن اقرب الیہ سے یہ شبہ ہو گیا ہے کہ وساس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ پوری آیۃ ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ. اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو اس کے دل میں بطور وسوسہ کے آتی ہیں) ان لوگوں نے نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ کو وعید پر محمول کیا ہے اور منشا شبہ کا یہ ہوا کہ بہت سی آیتوں میں جیسے وما اللہ بغافل عما تعملون. وھو علیم بذات الصدور. انہ خبیر بما تعملون۔ علم وعید کے لئے وارد ہے۔ انہوں نے وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ کو بھی اسی پر قیاس کیا حالانکہ یہاں سیاق و سباق میں نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کو وعید سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ دراصل یہاں اوپر سے حق تعالیٰ میعاد کو ثابت فرما رہے ہیں جس کے لئے کمال قدرت کمال علم کی ضرورت ہے۔ پس اولاً کمال قدرت کو ثابت فرمایا اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا الایہ میں اور اس کے بعد وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ سے کمال علم کو ثابت فرماتے ہیں جس کو انسان کے وساوس کا علم ہو جو دل میں چھپتے بھی نہیں پھر اعیان خارجہ و اجزاء اجسام کا علم کیونکر نہ ہوگا اس کے بعد ونحن اقرب الیہ میں قرب علمی کو بیان فرمایا ہے کہ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اور یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ہمارا اور ہماری حالت کا جس قدر علم ہے ہم کو حق تعالیٰ کا اس قدر علم نہیں بلکہ یوں کہئے کہ ہم کو بجز اسماء کے حق تعالیٰ کا

کچھ بھی علم نہیں بلکہ ہم کو خود اپنی حالت کا بھی پورا علم نہیں کہ ہمارے اندر کتنی رگیں ہیں اوران سے کیا کیا کام لئے جارہے ہیں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا کہ آیت میں قرب علمی مراد ہے پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے قرب علمی اس درجہ ہے کہ ہم کو بھی اپنے ساتھ نہیں۔ اس کو اس طرح تعبیر فرمایا کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہیں (دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ خالق ہیں تمام اعضا اور تمام قویٰ انہی کے عطا کئے ہوئے ہیں پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے ہمارے اعضا سے زیادہ قرب ہے)

اجابت کا وعدہ

پس اجابت کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ ان شاء سے مقید ہے کہ اگر مشیت ہو گی تو ایسا ہو جائے گا ورنہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ بعض علماء نے اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ کو بھی ان شاء سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں نے حذاقت میں شمار کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ یہاں سباق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا ترتب ضروری ہے اس میں ان شاء کی قید خلاف ظاہر ہے نیز یہاں بھی انی قریب کے بعد اجیب دعوة الداع کو بیان فرمایا جس میں قرب کو محقق و موکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اجابت مشیت کے ساتھ مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قریب ہونا محقق ہے علماً بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی (لقوله سبقت رحمتی غضبی وهو المراد بالتعلق پس میرے نزدیک اجابت بالمعنی الاول نہیں ہاں اجابت بالمعنی الثانی ان شاء سے مقید ہے جب دعا اس طرح سے قبول ہے پھر دعا میں کوتاہی کیوں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آپ استجابت کے یہی معنی لیجئے میں اپنی تفسیر سے رجوع نہ کروں گا میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس آیت میں صرف اتنی ہی بات کا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مان لو۔ اور وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ تفسیر ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ کی پس استجابت سے مراد ایمان لانا اور احکام الٰہیہ کو مان لینا ہے اب یہ آیت نظیر ہے دوسری آیت کی یعنی یا يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ یہاں بھی اجیبوا کی تفسیر آمنوا سے وارد ہوئی اور اجابت و استجابت دونوں متحد المعنی ہیں پس آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہاں استجابت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کو مان لو یہاں عمل کا ذکر نہیں لیکن عدم ذکر سے یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ یہاں اعمال کی نفی کی گئی ہے ہرگز نہیں یہاں یوں کہو کہ سکوت ہے اس کا مضائقہ نہیں کیونکہ ایک آیت میں سب باتوں کا ذکر ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک بات کا حکم ایک آیت میں ہے دوسری باتوں کا دوسری آیتوں میں ہے پس فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ کو اجابت بالمعنی الاول پر محمول کرنا تو صحیح مگر اس سے عمل کی نفی کرنا غلط جیسا کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں ہم نے بھی اجابت بالمعنی الاول کا اثبات کیا ہے مگر اجابت بالمعنی الثانی کی نفی تو نہیں کی بلکہ اس سے آیت کو ساکت مانا ہے پھر تم نفی عمل کی زیادت کیسے کرتے ہو۔ دوسرے اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں ہم نے بھی اجابت بالمعنی الاول کا اثبات کیا ہے مگر اجابت بالمعنی الثانی کی نفی تو

نہیں کی بلکہ اس سے آیت کو ساکت مانا ہے پھر تم نفی عمل کی زیادت کیسے کرتے ہو۔ دوسرے أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں تو سکوت عن عطاء المراد کی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ تمہاری درخواست بعض دفعہ نامناسب خلاف مصلحت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں یہ بات نہیں ہے تو ہم کو یہ بھی حق ہے کہ ہم فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي کو طلب عمل سے ساکت نہ مانیں کیونکہ جو احکام سراپا خیر اور سراپا مصلحت ہیں ان کو ماننے کے معنی یہی ہیں کہ ان کے موافق عمل کیا جائے۔ اس کے بعد ارشاد ہے لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ بظاہر یہ سب امور مذکورہ کے متعلق ہے مطلب یہ ہوا کہ بندوں کو میرے قرب علمی اور قرب تعلق سے اطلاع دے دیجئے تا کہ وہ اس کو معلوم کر کے میرے احکام کو مانیں اور اس مجموعہ سے توقع ہے کہ ان کو ثواب و رشد حاصل ہو جائے گا۔ یہ جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ صواب و رشد یہی ہے کہ حق تعالیٰ سے اس طرح معاملہ کیا جائے کہ اعتقاد ان کو اپنے سے قریب سمجھے اور عموماً اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور دعا کرنے کی عادت کی جائے اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

اجابت کا مفہوم

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي کہ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں اس سے متبادر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دعا کرتا ہے وہ ضرور ہی مستجاب ہوتی ہے تو ایک جواب تو وہی ہے جو مذکور ہوا کہ مطلوب سے زیادہ اچھی چیز مل جانا یہ بھی مطلوب ہی کا ملنا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اجابت کے معنی منظور کردن ہیں عطا کردن نہیں ہیں عطا کرنا قبول کے بعد کا درجہ ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کلکٹر کو درخواست دے کہ مجھے تحصیلدار کر دو اس کا جواب آ جائے کہ تمہاری درخواست منظور کر لی گئی ہے تو اگر یہ شخص دو چار مہینہ کے بعد کہیں تحصیلداری پر بھیجا جائے فوراً نہ بھیجا جائے تو کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ درخواست مردود ہو گئی؟ نہیں وہ منظور ہو گئی۔ تو پھر اللہ کے فعل میں کیوں انتظار نہیں کرتے کیا خدا کے فعل کو اتنی بھی قدر نہیں۔ وہاں یہ چاہتے ہو کہ فوراً ہو جاوے کسی نے کہا شام کو دعوت ہے تم نے منظور کر لی تو اب اجابت کے معنی یہ ہونا چاہئیں کہ قبول کرتے ہی فوراً کھانا کھالو شام کا انتظار نہ کرو اگر اجابت کے یہی معنی ہیں کہ فوراً ہی اس کا وقوع ہو تو تم نے اس صورت میں کھانا تو کھایا ہی نہیں پھر اس پر قبول دعوت کیسے صادق آیا۔

قبولیت دعا کا مفہوم

اس طرح سمجھو کہ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ کے معنی یہ ہیں کہ میں منظور تو فوراً کر لیتا ہوں پھر موقع پر دے دیتا ہوں کبھی تو اسی شکل میں جیسا کہ مانگا ہے اور کبھی شکل بدل کر اور کبھی فوراً کبھی توقف سے کبھی دنیا میں کبھی آخرت میں۔ دیکھو موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے فرعون کے حق میں بددعا کی تھی جس پر ارشاد ہوا۔ قد اجیبت دعوتکما تمہاری دعا منظور کر لی گئی پھر اسی کے متعلق فرماتے ہیں فاستقیما اس کی تفسیر میں لکھا ہے لاتستعجلا جلدی نہ کرنا انتظار کرنا جب چاہیں

گے پورا کردیں گے تو دیکھئے یہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے اور سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس برس کے بعد اس کی قبولیت کا ظہور ہوا۔ پھر آپ تو ان کے مقابلہ میں موسیٰ نہیں تو آپ کی اتنی عجلت کیوں ہے۔

اجابت دعا کی تین صورتیں

فرمایا۔ اجابت دعا کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ بعینہ وہ شے مطلوب مل جائے۔ دوسری صورت یہ کہ کوئی بلا آنے والی ٹل جائے۔ مگر انسان کو چونکہ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہوا۔ کون سی بلا ٹل گئی۔ ایسے وقت بہت سے اوہام اور شکوک انسان کو گھیر لیتے ہیں اور عدم قبول کا شبہ ہونے لگتا ہے حالانکہ وعدہ ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ حدیث شریف میں آیا ہے دعا مانگتے وقت اجابت کا یقین رکھو۔ جب شک اور شبہ کی ممانعت ہے تو پھر دعا مقبول کیونکر نہ ہوگی۔ البتہ صورت اجابت بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ بلا سے محفوظ ہو گیا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شے مطلوب کا ذخیرہ رکھ دیا جاتا ہے مثلاً کوئی لڑکا نادان اشرفی روپیہ مانگے تو بعض اوقات اس کے نام سے کسی تجارت کی کوٹھی میں جمع کر دیتے ہیں اور بوجہ نادانی خود اس کو نہیں دیتے کہ جب ہوشیار ہوگا۔ لیکر حسب مصلحت خرچ کرلے گا۔ اب لیکر بجز اس کے کہ خراب کردے اور کیا کرے گا حق تعالیٰ بھی اپنے بندے کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اس مسئول سے اچھی نعمت آخرت میں ذخیرہ فرما دیتے ہیں۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ
ترجمہ: بیبیاں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو

تفسیری نکات

لباس کا مفہوم

(اس آیت مبارکہ) میں زوجین کو لباس سے تشبیہ دے کر ایک اشارہ تو اس طرف فرمایا کہ ہم نے ادائے حقوق کی تسہیل کے لئے زوجین میں ایسا قوی تعلق پیدا کیا ہے کہ جس کی وجہ سے گویا دونوں متحد ہیں کہ ایک دوسرے کو مشتمل ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ دو قالب یک جان ہیں۔

اور دوسرا اشارہ اس تشبیہ میں اس طرف فرمایا کہ جیسے لباس میں ستر کی شان ہے اسی طرح عورت مرد کی ساتر ہے اور مرد عورت کے لئے ساتر ہے اور یہ ستر کئی طرح پر ہے ایک اس طرح کہ ہر ایک دوسرے کے عیوب کے لئے ساتر ہے کیونکہ نفس میں جو تقاضے پیدا ہوتے ہیں اگر ان کے پورا ہونے کے لئے ایک محل بھی تجویز نہ کیا جائے تو پھر انسان تقاضے کو ہر جگہ پورا کرے گا اور اس طرح اس کی بے حیائی کا عیب نمایاں ہو جائے گا اسی لئے شریعت نے نکاح تجویز کیا ہے اس

ایک محل میں ترک حیا کا یہ انجام ہوگا وہ دوسرے مواقع میں حیا و عفت محفوظ رہے گی پھر معاصی کا تقاضا شدید نہ ہوگا جوش کو سکون ہو جائے گا باقی اگر کوئی یہ چاہے کہ نکاح کے بعد معاصی کا وسوسہ بھی نہ آئے ذرا بھی تقاضا نہ ہو تو یہ نہیں ہوسکتا۔

پس تشبیہ باللباس سے ایک اشارہ اس طرف ہوا کہ شوہر بیوی کا اور بیوی شوہر کی ساتر و محافظ ہے یعنی ایک دوسرے کی حیا و عفت کو محفوظ رکھتا اور بچاتا ہے بشرطیکہ کوئی خود بھی بچنا چاہے اور جو گوہ ہی کھانا چاہے تو اس کے لئے کوئی تدبیر بھی نافع نہیں یہ دو وجہ تشبیہ تو علماء کے کلام میں منقول ہیں۔ایک وجہ تشبیہ میرے ذہن میں یہ آئی ہے کہ جیسے بدوں کپڑے کے انسان سے صبر نہیں ہوسکتا اس طرح بدوں نکاح کے مرد عورت کو صبر نہیں آسکتا کوئی تقاضائے نفس ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اعانت وغیرہ میں عورت اپنے خاوند کی محتاج ہے اور خدمت و راحت رسانی میں مرد عورت کا محتاج ہے۔

ایک وجہ تشبیہ میرے ذہن میں اور آئی کہ جس طرح لباس زینت ہے اسی طرح زوجین میں عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے زینت ہے لباس کا زینت ہونا خود نص سے ثابت ہے یعنی **یابنی ادم خذوا زینتکم و قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ**۔میں بالاتفاق زینت سے مراد لباس ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَرِیۡشًا مرد کی زینت یہ ہے کہ بیوی بچوں والا آدمی لوگوں کی نظر میں معزز ہوتا ہے وہ اگر کسی سے قرض مانگے تو اس کو قرض بھی مل جاتا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس کی اکیلی جان نہیں بلکہ آگے پیچھے اور بھی آدمی ہیں یہ کہاں جاسکتا ہے اور اکیلے آدمی کو ادھار قرض (آسانی سے) نہیں ملتا۔

قرآن میں جہاں تک میں نے غور کیا لباس کا لفظ عذاب و ضرر کے واسطے مستعمل نہیں ہوا سوائے ایک جگہ کے فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ بِمَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ۝ اور اس کے ساتھ ہی بطور جملہ معترضہ کے ایک فائدہ بتلاتا ہوں کہ لفظ ذوق قرآن میں زیادہ تر عذاب ہی کے واسطے آیا ہے تو اس آیت میں عجیب صنعت ہے کہ عذاب کے لئے لفظ ذوق بھی اور لباس بھی۔تو ذوق کے لفظ سے تو عذاب کو مطعوم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے صفت احساس میں کہ اس کا ایسا احساس ہوگا جیسا منہ میں رکھی ہوئی چیز کا ہوتا ہے اور لباس کے لفظ سے عذاب کو تشبیہ دی گئی ہے ملبوس کے ساتھ اشتمال واحاطہ میں۔تو عورتوں کو لباس کہنے میں اس طرف بھی اشاہ ہوسکتا ہے کہ عورتوں میں اضرار کی شان بھی ہے گو قلیل ہی ہے۔

عورت میں جہاں بہت سے منافع ہیں کچھ ضرر بھی ہے چنانچہ اس شان ضرر کی طرف اس طرح حدیث میں اشارہ ہے **ما اتخوف فتنة اضر علی امتی من النساء** کہ میں اپنی امت کے لئے عورتوں سے زیادہ خطرناک فتنہ کوئی نہیں سمجھتا۔

ایک نکتہ تشبیہ باللباس کا اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ لباس تابع ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں مردوں کی تابع ہیں پھر لباسیت نساء کا ذکر مقدم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تابعیت میں عورتیں مقدم ہیں۔یہاں یہ سوال ہوگا کہ آگے تو مردوں کو بھی عورتوں کا لباس کہا گیا تو کیا وہ بھی عورتوں کے تابع ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں ایک درجہ میں وہ بھی تابع ہیں مگر ان کی تابعیت موخر ہے متبوعیت مقدم ہے اور عورتوں کی تابعیت مقدم ہے متبوعیت موخر ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورتیں تو فطرتاً اور قانوناً مردوں کی تابع ہیں اور مرد محبت کی وجہ سے تابع ہو جاتے ہیں اور یہ تابعیت محبت کی بقا تک ہے اور محبت کا بقا پردہ کی بقا تک ہے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ: اوران بیبیوں (کے بدن سے) اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں تم کہ لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں یہ خداوندی ضابطے ہیں سوان سے نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے اور احکام بھی لوگوں کی اصلاح کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں اس امید پر کہ وہ لوگ مطلع ہو کر خلاف کرنے سے پرہیز رکھیں۔

تفسیری نکات

دواعی وطی حکم وطی میں ہے

لاتباشروا جو بشرہ سے ماخوذ ہے اس لئے ہاتھ لگانا بھی جائز نہیں کیونکہ دواعی وطی حکم میں ہے اسی لئے ان سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے اور دیکھئے کہ کیسی خوبصورتی سے اعتدال کیا ہے کہ بالعکس کیوں نہ ہوا۔ یعنی یہ ہوتا کہ مباشرت تو جائز ہوتی اور اکل و شرب ناجائز ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہر ایک میں دو حیثیتیں ہیں حاجت ولذت۔ مگر فرق اتنا ہے کہ عادۃ اکل وشرب میں تو حاجت غالب ہے اور لذت مغلوب اور مباشرت میں لذت غالب ہے اور حاجت مغلوب چنانچہ کھانے پینے میں حاجت کا غالب ہونا ظاہر ہے مگر چونکہ لذت بھی ایک درجہ میں مقصود ہے اس لئے اس میں تکلفات بھی سوجھتے ہیں اور بیوی کے پاس جانا اس میں عادتاً حاجت مغلوب ہے لذت غالب ہے۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت میں تو احکام روزہ کے بیان ہوئے ہیں اور اس آیت میں فرماتے ہیں وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ الخ کہاں تو روزہ کا بیان اور کہاں یہ کہ حرام مال سے بچو۔ اس میں جوڑ کیا ہے لیکن اگر غور کیجئے۔ تو آپس میں بڑا جوڑ ہے۔ روزہ میں فرماتے ہیں وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ۔ یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اس وقت تک کھاؤ پیو اور جب صبح صادق نکل آوے تو اس وقت کھانا پینا چھوڑ دو۔ پھر جبکہ سورج غروب ہو جائے۔ اس وقت روزہ کو ختم کر دو۔ سو روزہ تو موقت ہے۔ کہ اس میں جو چیزیں چھڑائی گئی ہیں وہ ایک وقت خاص تک کے لئے چھڑائی گئی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت سے خاص وقت تک حرام کی گئیں۔ مگر حرام مال سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزہ کا ذکر فرمایا۔ خیال تو فرمائیے کتنا لطیف ربط ہے۔

حدود معاملات

اسی طرح معاملات کو دیکھ لیا جائے ان میں بھی حدود ہیں نکاح کی بھی ایک حد ہے کہ چار بیبیوں سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ اسی طرح ہر عورت سے نکاح جائز نہیں بلکہ بعض حلال ہیں بعض حرام ہیں بہت سی عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں بعض رضاع کی وجہ سے بعض مصاہرت کی وجہ سے بیع وشراء کے لئے بھی حدود ہیں بعض صورتیں ربوا میں داخل ہیں بعض صورتیں بیوع فاسدہ ہیں بعض صورتیں بیوع باطلہ ہیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا احکام کو ذکر فرما کر اکثر موقعہ پر **تلک حدود اللہ** (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ تمام احکام شرعیہ حدود ہی ہیں چنانچہ ارشاد فرمایا ہے **تلک حدود اللہ فلاتقربوھا** (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں ان کے پاس بھی نہ جاؤ) طلاق کے مسائل کے بعد فرمایا **تلک حدود اللہ فلاتعتدوھا**۔ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں پس ان سے تجاوز نہ کرو)

شریعت میں رعایت حدود کا حکم

گویا تمام شریعت میں حدود ہی حدود ہیں ان کو مہمل سمجھنا کتنی بڑی غلطی ہے مگر آجکل اس میں ابتلاء عام ہو رہا ہے لوگ عام طور پر کاموں میں حدود کی رعایت نہیں کرتے اس لئے ضرورت ہے کہ اس مبحث پر قدرے گفتگو کی جائے اور احکام کی حدود سے لوگوں کو مطلع کیا جائے چنانچہ اس آیت میں بھی جس کو میں نے ابھی تلاوت کیا ہے حق تعالیٰ نے بعض احکام فرما کر **تلک حدود اللہ** (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے مجھے اس آیت میں اخیر کا حصہ مقصود ہے۔ پہلا حصہ مقصود نہیں شاید آپ کو پوری آیت سن کر تعجب ہوا ہوگا کہ طلاق کے ذکر کو اس مقام سے کیا مناسبت۔ مگر میں نے پوری آیت کو تبرکاً پڑھ دیا ہے مقصود اخیر کا حصہ ہے کیونکہ اس میں رعایت حدود کی تاکید مخصوص طور پر مذکور ہے جو دوسرے مقام پر نہیں۔

احکام طلاق کے حدود میں حکمت

حق تعالیٰ نے اس جگہ اول طلاق کے احکام بیان فرمائے ہیں اس کے بعد ارشاد ہے۔

تلک حدود اللہ و من یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ

یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں اور جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ ظلم اخروی تو ظاہر ہے کہ تعدی حدود سے گناہ ہوتا ہے جس کا نتیجہ آخرت میں بہت سخت ہے تو یہ شخص اپنے ہاتھوں مصیبت آخرت کو خریدتا ہے مگر تعدی حدود میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ان حدود کے مقرر کرنے سے یہ بھی مقصود ہے کہ لوگ راحت سے زندگی بسر کریں تو ان سے تعدی کرنے میں دنیوی پریشانی بھی ضرور لاحق ہوتی ہے لہٰذا اس میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے۔ آگے فرماتے ہیں

لاتدری لعل اللہ یحدیث بعد ذالک امرا.

تم نہیں جانتے ممکن ہے حق تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں۔ یہ حکمت ہے ان حدود کی جو طلاق کے متعلق اس جگہ ذکر کئے گئے ہیں اور یہی وہ مضمون ہے جو اس مقام میں خاص طور پر مذکور ہے۔ دوسرے مقام پر مذکور نہیں لاتدری (تم نہیں جانتے) میں خطاب بظاہر حضورؐ کو ہے لیکن حقیقت میں خطاب امت کو ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُوا۟ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا۟ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ اور ان (جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ اور تم کو (اپنے ظلم اور جھوٹ کا) علم بھی ہو۔

تفسیری نکات

شفقت کی رعایت

غرض اس آیت میں حق تعالیٰ ہم کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ اور اس آیت میں خدا تعالیٰ نے لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم کہ اپنا مال مت کھاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ لاتاکلو اموال اخوانکم کہ اپنے بھائیوں کا مال مت کھاؤ۔ حالانکہ مطلب یہی ہے۔ قرآن شریف کی تعلیم بھی حکمت اور عقل پر اس قدر منطبق ہے کہ کسی کی تعلیم ہو ہی نہیں سکتی اس کی تعلیم ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے کا کلام ہے جو بڑا حکیم ہے اور شفیقانہ کلام ہے نرا ضابطہ کا کلام نہیں۔ یہ ایسا ہی کلام ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو خطاب کرتا ہے کہ اس میں ہر پہلو سے شفقت کی رعایت ہوتی اور ایک نرا ضابطہ کا کلام نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی منادی کرنے والا حاکم کی طرف سے اعلان کرتا ہے اس میں نرے ضابطہ کے الفاظ ہوتے ہیں اس میں اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ مؤثر الفاظ ہوں اور بلیغ عنوان جو قلب پر اثر کریں۔ ضابطہ کی منادی میں اس کا اہتمام کہاں ہوتا ہے اور شفیقانہ کلام میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کو سننے سے دشوار کام بھی آسان ہو جاوے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسی طرح نصیحت فرمائی جیسے باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو یوں ہوتا ولاتاکلوا اموال غیر کم۔ یہ کلام ہوتا تو درست مگر اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو آیت کے الفاظ کا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اموالکم اس واسطے فرمایا کہ انسان کو اپنا مال زیادہ محبوب ہوتا ہے دوسرے کے مال سے۔ اگر اپنا مال زیادہ محبوب نہ ہوتا تو پرائے مال کو اپنا مال بنانے کی کیوں کوشش کرتا۔ تو چونکہ انسان کو غیر مال سے چنداں محبت نہ تھی اس لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسے عنوان سے کہا جاوے جو داعی ہو حفاظت کا اور اس کی حفاظت کا داعی بجز اس کے اور کوئی

لفظ نہ تھا کہ اس کو امو الکم سے تعبیر فرمائیں یعنی غیر کا مال بھی ایسا ہی سمجھو جیسے اپنا ہی ہے۔ اس کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسے اپنے مال کی کیا کرتے ہو۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ تو شاعری ہے کہ غیر کے مال کو اپنا سمجھو غیر کے مال کو تو غیر ہی سمجھا جاوے گا اس کو اپنا کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

مکافات عمل

جواب یہ ہے کہ غیر کا مال تو غیر ہی کا ہے واقعی اپنا نہیں مگر لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ فرمانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ جب کسی کا مال تلف کرو گے تو تمہارا مال تلف ہوگا۔ خواہ دنیا میں یا آخرت میں۔ اس معنی سے بھی دوسرے کا مال تلف کرنا اپنا ہی مال تلف کرنا ہے۔ اکثر تو یہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ جو کوئی دوسرے کا مال تلف کرتا ہے تو اپنا بھی تلف ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت میں تو ضرور ہی ہوگا۔ حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ مال وجوہ باطلہ سے حاصل کرتے ہیں دنیا میں بھی ان کا بھلا نہیں ہوتا۔

سودی مال اور محق کی حقیقت

اب وجوہ باطلہ کی کچھ مثالیں سنیے سو اس میں سے ایک سودی معاملہ ہے جس کے بارہ میں يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا سودی مال جمع ہوتا ہے اور ایک دن مٹ کر رہتا ہے اور حقیقتاً تو مٹتا ہی ہے مگر صورۃً بھی مٹتا ہے ایک دن بے طرح مارے جاتے ہیں اور اگر اتفاقاً کبھی نہ بھی مٹے تب بھی اس سے کلام الٰہی پر اعتراض نہیں آتا۔ کیونکہ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا قضیہ مہملہ ہے جو قوت میں جزئیہ کے ہوتا ہے۔ اگر ایک دفعہ بھی مٹ جائے تو وہ صادق آ جائے گا معنی یہ ہیں کہ سود والے اکثر مٹتے ہیں اور اس کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اگر کہیں ظاہراً نہ مٹے تو اور طریقہ سے مٹتا ہے۔

محق کی قسمیں مختلف ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مال جاتا رہے چوری وغیرہ ہو جائے۔ یہ تو ظاہری محق ہے اور ایک محق ہے معنوی وہ یہ کہ سود والا مال سے خود منتفع نہیں ہوتا فاقہ بھر بھر کر عمر ختم ہو جاتی ہے۔ سود لینے کا سبب بخل ہے جتنا سود لیتا ہے اتنا ہی بخل بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ (احکام المال)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ: لوگ آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے آیا کرو ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں اُن کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

تفسیری نکات

چاند گھٹنے اور بڑھنے میں حکمت

اس کے آگے مذکور ہے لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ۔ (یہ کوئی نیک کام نہیں ہے گھروں میں تم پچھواڑوں سے آؤ) کو اس سے کیا ربط ہے۔ سو وہ ربط یہ ہے کہ ماقبل میں چاند کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں وجہ اور علت نہیں بیان کی گئی بلکہ حکمت بتلا دی گئی۔ اس سے سائنس دانی کا فضول ہونا یقیناً ثابت ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ لوگ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اس کی علت کیا ہے تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ چنانچہ اس سے لوگوں کو اپنے کاروبار کیلئے وقت کا اندازہ ہوتا ہے (یہ تو دنیوی نفع ہے) اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یہ دینی نفع ہے تو علت کو چھوڑ کر حکمت بتلانے میں اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ علت کا دریافت کرنا فضول ہے حکمت کو معلوم کرنا چاہیے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا. اور گھروں میں پشت کی طرف سے آنا کچھ نیک کام نہیں بلکہ نیک کام تقویٰ کا اختیار کرنا ہے۔ پس اس کا تعلق سابق سے یہ ہوا کہ سوال برمحل اور بے محل کی مثال ایسی ہے جیسے گھر میں دروازہ سے داخل ہونا اور پشت کی طرف سے داخل ہونا۔ پس جس طرح گھر میں بغیر دروازہ کے آنا برا ہے اسی طرح سوال بے محل بھی برا ہے آگے فرماتے ہیں۔ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا. اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ یعنی سوالات بھی برمحل کیا کرو بے محل سوال نہ کیا کرو۔ پس اس صورت میں وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ حکم عام ہوگا اس کو خاص اس واقعہ ہی سے تعلق نہیں ہوگا جو اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ وہ حالت احرام میں دروازے سے گھر میں آنا برا سمجھتے تھے بلکہ ایک عام قاعدہ کا بیان ہوگا کہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کیا کرو جس میں وہ واقعہ بھی داخل ہو گیا اور تبعاً اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ احرام میں غیر دروازہ سے آنا نیک کام نہیں پس

پہلی تفسیر پر تو وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۔ اور گھروں میں دروازہ سے داخل ہوا کرو۔ میں اہل جاہلیت کے خاص فعل کا حکم مذکور تھا اور دوسری تفسیر پر یہ حکم عام ہوگا اور میرا مقصود جس کو اس وقت بیان کرنا منظور ہے اس دوسری تفسیر پر تو آیت کا مدلول بلاواسطہ ہے۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿﴾ (اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص (حرام چیزوں سے) بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ)

شریعت کو ہر شئے میں تصرف کا اختیار ہے

غرض یہ ثابت ہو گیا کہ مباحات میں بھی شریعت کو تصرف کا اختیار ہے چنانچہ اسی بناء پر ارشاد ہے وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا کہ گھر میں دروازہ سے آیا کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ امر عبادات کے متعلق نہیں بلکہ عادات کے متعلق ہے اور اس میں یہ تصرف کیا کہ بدوں حکم شرعی کے کسی عادت کو نا جائز اور کسی کو باعث ثواب نہ سمجھو۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انتظام بھی مطلوب شرعی ہے ہر کام میں خواہ دینی کام ہو یا دنیوی۔ چنانچہ گھر میں پیچھے سے آنا خلاف انتظام ہے اس سے منع کیا گیا اور دروازے سے آنے کا امر فرمایا گیا۔ اس میں رعایت انتظام کی تاکید ہے مگر ایک تاویل پر تو قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ تعلیم کی گئی ہے وہ تاویل یہ کہ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) میں بیوت عام ہو مقاصد کو اور ابواب عام ہو ان طرق کو جو ہر عام کے لئے مقرر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ سب کاموں کو ان کے طریقوں سے کیا کرو۔ اس میں گھروں میں دروازوں سے آنا بھی داخل ہے۔ اور ایک تاویل پر بطور قیاس کے اس پر دلالت ہوگی کہ جس طرح بیت میں باب سے داخل ہونا ایک انتظام ہے اسی طرح ہر مقصود میں اس کے طریق سے داخل ہونا ایک انتظام ہے۔

آیت کا محل

اس آیت کے دو محل ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق خاص رسم جاہلیت سے ہو جو حج کے متعلق تھی اور اس صورت میں ماقبل سے اس کا ارتباط ظاہر ہے دوسرا محل یہ کہ بطریق استعارہ کے اس میں مطلقاً ہر فعل کو صحیح طریق سے کرنے کی تعلیم ہو اور اس کا ربط ماقبل میں چاند سے متعلق اس طرح ہے کہ لوگوں کو اپنے کاروبار کیلئے وقت کا اندازہ ہوتا ہے (یہ تو دنیوی نفع ہے اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یہ دینی نفع ہے) تو علت کو چھوڑ کر حکمت بتلانے میں اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ علت کا دریافت کرنا فضول ہے حکمت کو معلوم کرنا چاہیے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا اور گھروں میں پشت کی طرف سے آنا کچھ نیک کام نہیں بلکہ نیک کام تقویٰ کا اختیار کرنا ہے) پس اس کا تعلق سابق سے یہ ہوا کہ سوال برمحل اور بے محل کی مثال ایسی ہے جیسے گھر میں دروازہ سے داخل ہونا اور پشت کی طرف سے داخل ہونا۔ پس جس طرح گھر میں بغیر دروزہ کے آنا برا ہے اسی طرح سوال بے محل بھی برا ہے۔ آگے فرماتے ہیں وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ یعنی سوالات بھی برمحل کیا کرو بے محل سوال نہ کیا کرو۔ پس اس صورت میں وَاْتُوا الْبُيُوْتَ

مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) حکم عام ہوگا اس کو خاص اس واقعہ ہی سے تعلق نہیں ہوگا جو اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ وہ حالت احرام میں دروازہ سے گھر میں آنا برا سمجھتے تھے بلکہ ایک عام قاعدہ کا بیان ہوگا کہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کیا کرو جس میں وہ واقعہ بھی داخل ہو گیا اور تبعاً اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ احرام میں غیر دروازہ سے آنا نیک کام نہیں پس پہلی تفسیر پر تو وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازہ سے داخل ہوا کرو) میں اہل جاہلیت کے خاص فعل کا حکم مذکور تھا اور دوسری تفسیر پر یہ حکم عام ہوگا اور میرا مقصود جس کو اس وقت بیان کرنا منظور ہے اس دوسری تفسیر پر تو آیت کا مدلول بلاواسطہ ہے اور پہلے تفسیر پر چونکہ بواسطہ قیاس اس سے مستنبط ہوتا ہے اس لئے مدلول بواسطہ ہے اور وجہ قیاس اس ظاہر ہے کہ ایتان بیوت من الظهور (مکانوں میں پشت سے آنا) ایک بے موقع فعل ہے اور اس لئے مذموم ہے پس ہر فعل بے موقع مذموم ہوگا۔

اصل تقویٰ

پس معلوم ہوا کہ کوئی خاص تکلیف اپنی طرف سے اختراع کر کے برداشت کرنا تقویٰ نہیں ہے لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنہوں نے اپنے نفس کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں اس لئے کہ اول تو وہ حضرات حد اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے پھر وہ بھی اس کو بطور علاج کے کرتے تھے عبادت اور ذریعہ قرب نہیں سمجھتے تھے ان کے مجاہدے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص گل بنفشہ پینے لگا کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑے کہ وہ اس دوا پینے اور ترک اطعمہ کو عبادت نہیں سمجھتا بلکہ ذریعہ حصول صحت سمجھتا ہے اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر پینے لگے تو وہ یقیناً گنہگار ہوگا اس واسطے کہ اس نے قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے اگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو روزمرہ میں اس کی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کرے اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کرے اور ملک سلطنت کے لئے بھی حد مفید ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائے گا اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا تو اگر اس طرح سے کوئی گوشت وغیرہ کو ترک کرے گا تو بلاشبہ جرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں بہرحال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق کو ادا کرنا بھی ضروری ہے اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ صحابی کا واقعہ ہے کہ وہ رات کو بہت جاگتے تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو روکا آخر مقدمہ جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں اور یہ ارشاد فرمایا ان لنفسک علیک حقا الخ غرض ایام جاہلیت میں لوگ منجملہ اور تکالیف کے ایک تکلیف اپنے نفس کو یہ بھی دیتے تھے خدا تعالیٰ اس کو فرماتے کہ اصل چیز تقویٰ ہے اس کو اختیار کرو اور گھر میں پس پشت سے آنا کوئی ثواب کا کام نہیں ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ گو لفظاً خاص ہے ایک ہی امر کو مگر معناً عام ہے ایسے امور کو جو اس کی نظیر ہوں وہ معنی مشترک

یہ ہیں کہ جس کام کا جو طریقہ ہے اسی طریقے سے اس کام کو کرو بے طریقے نہ کرو اور یہ مضمون عام ہے لہٰذا آیت میں معنی تعمیم ہو گئے اور جملہ ثانیہ واتقو اللہ الخ سے بدلالت مطابقی بھی تعمیم ہو رہی ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ جو بات تقوی پر مبنی نہ ہو گی گو ظاہراً وہ موجب قربت نظر آئے گی وہ موجب کامیابی نہ ہو گی اور تمہارے ظہور ابواب سے بیوت میں داخل ہونا تقوی پر مبنی نہیں ہے لہٰذا یہ بھی اس کامیابی کا سبب نہیں جو تمہارا مقصود ہے کہ رضاء حق حاصل ہو اب آیت کا مضمون پیش نظر رکھ کر اپنی حالت کو دیکھئے کہ ہم اکثر کام ایسے ہی طریقے سے کرتے ہیں جس میں کامیابی نہیں ہوتی اور مراد اس وقت دنیا کے کام نہیں کیونکہ اسکی کامیابی کے طریقہ کا تعلیم کرنا ہمارا کام نہیں ہم سے یہی بہت غنیمت ہے کہ ہم دنیا کے کام کی اجازت دے دیتے ہیں اس وقت مجھے یہ شعر یاد آتا ہے جس میں اہل دنیا کے اس انتظار کا جو کہ علماء سے کامیابی دنیا کا طریقہ بتلانے کے متعلق ان کو رہتا ہے جواب ہے کہتے ہیں

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم جوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

نہ تو میں شب ہوں اور نہ شب پرست ہوں جو خواب کی کہانی کہوں جب میں آفتاب کا غلام ہوں تو ساری باتیں آفتاب کی کہوں گا۔

ماہر چہ خوانده ایم فراموش کرده ایم الاحدیث یار کہ تکرار می کنیم

جو کچھ ہم نے پڑھا ہے سب بھول گئے ہیں علاوہ حدیث یار کے کہ بار بار اس کو دہراتے ہیں۔

یعنی ہم کو خدا تعالیٰ کی باتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہا اور ہم دنیا کی باتیں کچھ نہیں جانتے اور اگر اب تک جانتے تھے تو اب بھول گئے غرض اس وقت گفتگو دین کے کاموں کے متعلق ہے کہ ان میں بھی وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہونے کے سبب اخروی کامیابی کا سبب نہ ہو۔

قاعدہ کلیہ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو ہم خلاف شرع تو نہیں کرتے یعنی دین کا جو کام کرو اسکا طریقہ کامیابی بھی دیکھ لو اور دنیا کا جو کام کرو اس میں بھی یہ دیکھ لو کہ یہ جائز ہے یا نہیں۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۖ وَاَحْسِنُوْا ۚ (اور اپنے آپ کو) اپنے ہاتھوں سے تباہی میں مت ڈالو۔

مجاہدین فی العبادات

فرمایا کہ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ یہ دلیل ہے مجاہدین فی العبادات کی کیونکہ ان کو تقلیل عبادت سے تکلیف و پریشانی ہوتی ہے۔

عشاق کا حال

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ اپنے بزرگوں کی تحقیقات اور علوم و معارف کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجہ کے لوگ تھے اپنے زمانہ کے رازی اور غزالی تھے خصوصاً حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو فن تصوف کے امام اور مجتہد تھے۔ ایک

صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اب اس زمانہ کے علماء میں رازی اور غزالی نہیں پیدا ہوتے تو میں نے کہا ان سے بڑھ کر موجود ہو سکتے ہیں۔ سب بزرگوں کے ملفوظات اور تحقیقات کو دیکھ لیا جائے معلوم ہو جائے گا۔ پھر حضرت حاجی صاحبؒ کی ایک عجیب تحقیق کو نقل فرمایا وہ یہ کہ بعض اہل ظاہر کثرت عبادت پر نکیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَۃِ کے خلاف ہے حضرت نے جواب میں فرمایا کہ اہل باطن اور عشاق کہتے ہیں کہ قلت عبادت ہمارے لئے اتقاء الی التهلكة ہے ہم کو اس سے تکلیف شدید ہوتی ہے۔ ہم اسی آیت سے اس کے خلاف پر استدلال کرتے ہیں یہ نمونہ ہے حضرت کے علوم اور معارف کا سبحان اللہ۔ (الافاضات الیومیہ جلد ہشتم)

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (اور جس کو دین کا فہم مل جائے اسکو بڑی خیر کی چیز مل گئی)

علم کا زیادہ حصہ غیر مکتسب ہے

فرمایا وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (بقرہ آیت ۲۶۹)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔

صیغہ مجہول سے مفہوم ہوتا ہے کہ زیادہ حصہ علم کا غیر مکتسب اور وہبی ہے اور حکمت سے مراد دین کی سمجھ ہے۔

(ملفوظات حکیم الامت ۴۹)

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰىکُمْ وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۱۹۸﴾

ترجمہ: تم کو اس میں (ذرا بھی) گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس مزدلفہ میں قیام کر کے خدا کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے اور حقیقت میں تم اس سے قبل ناواقف ہی تھے۔

تفسیری نکات

حج اور تجارت

شبہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تو زیادت مال کے حرص کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور نص قرآنی سے اجازت معلوم ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ یہ آیت احکام حج کے متعلق ہے۔ جاہلیت میں لوگ حج کو ایک میلہ سمجھتے تھے۔ اس لئے حج کے زمانہ میں باہر کے لوگ تجارت کی نیت سے مکہ آیا کرتے

تھے جب اسلام آیا اور مسلمانوں کو خلوص کی تعلیم دی گئی تو صحابہ کو شبہ ہوا کہ شاید سفر حج میں مال تجارت کو ساتھ لے جانا خلاف خلوص ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا رزق جو تفسیر ہے فضل کی طلب کرو جس میں تجارت کی بحالت حج کی اجازت دی گئی۔ حق تعالیٰ کی بھی کتنی بڑی رحمت ہے کہ خاص اپنے دربار کی زیارت کو آتے ہوئے بھی تجارت کی اجازت دے دی۔

بھلا اگر تم کسی بادشاہ یا ادنیٰ حاکم سے ملنے جاؤ اور ساتھ میں تجارتی مال بھی لے جاؤ تو اس کو یہ بات معلوم کر کے کتنا ناگوار ہوگا اس کے دل میں تمہاری اس ملاقات کی کچھ بھی وقعت نہ ہوگی۔ بلکہ کان پکڑ کے دربار سے نکال دیئے جاؤ گے کہ تم ہم سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ سوداگری کو آئے تھے مگر حق تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ سفر حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں۔ یہاں تو اباحت ہی ہے مگر قواعد فقہ سے ایک صورت میں یہ تجارت مستحب بھی ہے جب کہ یہ نیت ہو کہ اس سے رقم بڑھے گی تو سفر حج میں سہولت ہوگی۔ فقراء کی امداد کریں گے۔

رہا یہ کہ اس صورت میں خلوص ہوگا یا نہیں اس کے جواب میں تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ ہوتا جب بھی ضرور حج کو جاتا۔ تو اس صورت میں خلوص محفوظ ہے اور ثواب حج بھی کم نہ ہوگا اور اگر حج اور تجارت دونوں کی نیت برابر درجہ میں ہے' تو اس حالت میں تجارت جائز تو ہے مگر خلوص کم ہوگا۔ اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حج کے ساتھ ایک فعل مباح ہی کو منضم کیا ہے فعل حرام کو تو منضم نہیں کیا اور اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص ریا کار ہوگا کیونکہ یہ مخلوق کو دھوکا دے رہا ہے کہ جاتا تجارت کے لئے ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ میں حج کو جا رہا ہوں۔

رہا یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صورت میں مال تجارت لے جانا افضل ہے یا نہ لے جانا افضل ہے تو اگر زادراہ بقدر کفایت موجود ہی ہے بقدر کفایت نہیں اور نیت تجارت تابع ہے تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت واعانت ہوگی مال تجارت لے جانا موجب ثواب ہے۔

اب اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اور اس آیت میں تعارض کچھ نہیں۔ کیونکہ حدیث میں طلب معاش سے منع نہیں کیا گیا جو مدلول ہے آیت کا بلکہ انہماک اور زیادت حرص سے منع کیا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں طلب مال کی مطلقاً اجازت نہیں بلکہ اس قید سے اجازت ہے کہ وہ ابتغاء فضل کا مصداق بھی ہو اور ابتغاء معاش ابتغاء فضل میں اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں ابتغاء رضا بھی ہو جس کا قرینہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ابتغاء فضل کے ساتھ بعض جگہ ذکر اللہ کو بھی بڑھایا ہے سورہ جمعہ میں فرماتے ہیں وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔ تو وَاذْكُرُوا اللّٰهَ کو بڑھانا بتلا رہا ہے کہ طلب معاش کو ابتغاء فضل جبھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ذکر اللہ ہو ورنہ وہ ابتغاء فضل نہیں بلکہ ابتغاء فضول ہے بلکہ طلب نقصان ہے اور جو شخص طلب معاش میں ابتغاء رضا کر رہا ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ ثواب کا کام کر رہا ہے اور حدیث میں اس طلب کی ممانعت ہے جو حد سے متجاوز ہو۔ خوب سمجھ لو۔

سفر حج میں مال تجارت ہمراہ لے جانے کا حکم

فرمایا کہ سفر حج میں مال تجارت ساتھ نہ لے جانا بہتر ہے لیکن اگر زادراہ کم ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ میرا دل پریشان ہوگا اور نیت ڈگمگا جاوے گی قوت توکل نہ ہونے سے خدا تعالیٰ کی شکایت دل میں پیدا ہوگی تو مالی تجارت ساتھ لینے میں مضائقہ نہیں اور قرآن مجید میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ سے اذن تجارت فی الحج کا اسی حکمت کے لئے ہے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔

تفسیری نکات

لفظ حسنہ کا مفہوم

بعض محرفین نے اس آیت میں حسنہ اول انگریزی سے مفسر کیا ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ حسنہ کہتے ہی اچھی حالت کو اور اچھی حالت یعنی خوشحالی صرف انگریزی پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہوگا ہمیں بھی آخرت میں انگریزی والوں کا ساتھ نصیب ہو یہ محض تحریف ہے بلکہ یہاں حسنہ سے مراد اعمال حسنہ ہیں اور دونوں جگہ مراد ہیں مگر ایک جگہ باعتبار صورت کے اور ایک جگہ باعتبار حقیقت، نعماء جنت کی حقیقت یہی اعمال حسنہ ہیں اور اتنے فرق کا مضائقہ نہیں فرق تو ضروری ہے کیونکہ نکرہ کے اعادہ میں مغائرت فی الجملہ لازم ہے۔ حسنہ سے اعمال حسنہ مراد لینے میں اور ایک جگہ صورت اعمال اور دوسری جگہ حقیقت اعمال سے تفسیر کرنے میں اتحاد کے ساتھ مغائرت فی الجملہ بھی موجود ہے دوسرے یہاں حسنہ سے دنیوی خوشحالی مراد لینا اس لئے بھی غلط ہے کہ آیت میں دنیا کو حسنہ کا ظرف بنایا گیا ہے اور ظرف ومظروف میں تغایر لازم ہے تو فی الدنیا حسنۃ کا لفظ چاہتا ہے کہ وہ حسنہ دنیا سے مغائر ہے تو کلام کی تقدیر یہ ہوگی رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا۔ دنیا اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور دنیوی خوش حالی بھی دنیا ہی ہے وہ دنیا سے مغائر نہیں اس لئے تفسیر صحیح نہیں ہوسکتی پس انگریزی کو حسنہ کا مصداق بنانا بالکل غلط ہے یہاں تک دو قسمیں مذکور ہوئیں پہلی قسم کا مصداق تو کافر ہے اور دوسری قسم کا مصداق عام مومنین ہیں اور چونکہ سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ یہ تقسیم موقع حج ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور عام آدمیوں میں بعض منافق بھی ہوں گے اس لئے تیسری قسم منافقین کی بھی ذکر کردی گئی۔

ولاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو)

حضرات صوفیا کا استدلال

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرات چشتیہ کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو سب غیر اللہ سے ذہول ہو گیا تھا ایک کے سوا سب کو فنا کر دیا تھا اس فنا کے غلبہ میں بعض اوقات بعض اہل ظاہر کو ان حضرات پر شبہ ہو گیا ہے خلاف شریعت عمل کرنے کا حالانکہ واقعی شان انکی بالکل اسکی مصداق ہے۔ و اصطنعتکَ لنفسی یعنی اللہ نے تم کو اپنا لیا اس شبہ کی ایک مثال ہے کہ شدت شوق میں تمام شب جاگے اسکو اہل ظاہر نے خلاف سنت میں داخل کیا اور بدعت کہا حالانکہ حقیقی عشاق پر اعتراض کرنا ہی بدعت ہے گو بعض اہل ظاہر نے کثرت عبادت کو بدعت کہا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہیں وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ مگر وہ حضرات بھی اس ہی آیت سے استدلال کرتے ہیں ان کے لئے اسکا مدلول اسکا عکس ہے آیت وہی ہے وہ استدلال میں یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم کثرت سے عبادت نہ کریں تو ہلاک ہو جائیں تو تقلیل عبادت تہلکہ ہے کیسا عجیب اور لطیف استدلال ہے جسکا معترض کے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ یہ استدلال حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ سبحان اللہ۔ (الافاضات الیومیہ)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

ترجمہ: اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر بتاتا ہے اپنے دل کی بات پر حالانکہ وہ مخالفت میں شدید ہے۔ جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس فکر میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور کھیتیاں اور جانیں تباہ کرے اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کرتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔

تفسیری نکات

حق تعالیٰ کی رحمت عظیمہ

آگے چوتھی قسم بیان فرماتے ہیں جس کا مصداق مومن کامل ہے اور اس کو اس لئے الگ بیان فرمایا تا کہ پہلی صورت میں مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کو کوئی مومن کامل مخصوص نہ کرے پس حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ مومن کامل کو مستقل بیان فرما دیا چنانچہ ارشاد ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ اور بعض آدمی وہ ہے جو اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لئے بیچ دیتا ہے اس میں دو قول ہیں کہ شراء سے یہاں کیا مراد ہے بعض نے یشری کو یشتری کہا یعنی ومن الناس من یشتری نفسه من المهالک والمخاوف ایسا ہوگا جیسے بئسما اشتروا به انفسهم (وہ حالت بری ہے جس کو اختیار کر کے وہ جانوں کو چھڑانا چاہتے ہیں) میں اشتراء نفس مذکور ہے اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض آدمی وہ ہیں جو (اعمال صالحہ کر کے) اپنے آپ کو خطرات اور خوفناک امور سے بچا لیتے ہیں مگر اس تفسیر میں اتنا بعد ہے کہ اشتراء تو اس چیز کا ہوتا ہے جو اپنے پاس نہ ہو اور جان تو اپنے پاس ہے گو اس جگہ کلام میں مجاز ہے مگر مجاز میں بھی قرب ہو تو بہتر ہے اور گو بیع کے معنی مراد لینے کے بھی مجاز ہے مگر وہ بعید نہیں کیونکہ بیع کے معنی مراد لینے کے مجاز صرف یہ ہوگا بیع میں طرفین سے مالیت ہوتی ہے اور یہاں نفس مال نہیں سو یہ مجاز تو دونوں صورتوں میں مشترک ہے باقی یہ بات بیع حقیقی کی باقی رہے گی کہ بیع ایسی چیز کی ہوتی ہے جو بائع کے پاس تھی اور وہ بعد بیع کے ثمن کا مستحق ہو جاتا ہے سو یہ بات یہاں متحقق ہے کیونکہ جان اپنے پاس تھی اب اس کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیع کر دیا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کی جان حق تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں رہا یہ کہ یہاں تو بیع کے بعد بھی ہماری جان ہمارے پاس ہی رہتی ہے سو یہ وجہ بعد نہیں کیونکہ تمام بیع کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مبیع بائع کے قبضہ سے نکال دی جائے بلکہ بلا تسلیم بیع ہو جاتی ہے دوسرے یہاں تو تسلیم بھی متحقق ہے کیونکہ مومن کامل اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔

ایک آیت پر منطقی اشکال اور اسکا جواب

ارشاد فرمایا قرآن کریم میں ہے ولو علم الله فيهم خير الاسمعهم ولو اسمعهم لتولوا وهم معرضون۔ منطقی قاعدے سے یہ قیاس کی شکل اول ہے جسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے ولو علم الله فيهم خيرا لتولوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان میں کوئی بھلائی معلوم ہوتی تو یہ منہ پھیر کر بھاگتے حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ نتیجہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

فرمایا کہ جواب اسکا یہ ہے کہ شکل اول کا نتیجہ جب صحیح نکلتا ہے جب حد اوسط مکرر ہو یہاں مکرر نہیں ہے کیونکہ لفظ اسمعهم جو مکرر آیا ہے وہ درحقیقت مکرر نہیں ہے کیونکہ ان دونوں لفظوں کے معنی الگ الگ ہیں کیونکہ پہلے جملے میں اسمعهم سے مراد وہ سماع ہے جو علم خیر کے ساتھ جمع ہوتا ہے یعنی سماع مقبول و مؤثر اور دوسرے جملے میں سماع سے وہ سماع مراد ہے جو علم خیر کے ساتھ جمع نہیں ہوتا یعنی صرف کانوں سے سننا اور دل میں کوئی اثر نہ لینا۔ اس لئے تقدیر عبارت دوسرے جملے کی یہ ہے ولو اسمعهم مع عدم علم الخير لتولوا یعنی اگر اللہ تعالیٰ یہ جانتے ہوئے کہ ان کو حق بات سنانا مفید نہیں ہوگا پھر بھی سنائیں تو وہ سننے کے باوجود منہ پھیر کر بھاگے لیکن جیسے آیت ولو شاء الله ما اشركنا جو اہل جہنم بشور عذر کے کہیں گے یہ غلط ہوگا اور تقریباً یہی الفاظ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں ولو شاء الله ما اشركوا۔ یہ غلط نہیں وجہ یہ ہے کہ شاء الله کا مفہوم دونوں جملوں میں الگ الگ ہے پہلے جملے میں مشیت معنی رضا سے یعنی اہل جہنم یہ عذر کریں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے شرک و کفر پر راضی نہ ہوتا تو ہم شرک کر ہی نہ سکتے تھے اور دوسرے جملے میں مشیت بمعنی

ارادہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اگر ارادہ یہ ہوتا کہ لوگ شرک نہ کریں تو انکو شرک کرنے کی قدرت ہی نہ ہوتی کیونکہ اللہ کے ارادہ پر کسی کا ارادہ غالب نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر اللہ کے ارادہ کے دنیا میں نہ کوئی اچھا کام ہو سکتا ہے نہ برا۔ البتہ رضا اللہ تعالیٰ کی اچھے کاموں کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔ برے کاموں سے رضا متعلق نہیں ہوتی بلکہ برے کاموں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۝

(ترجمہ) (اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزے دار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر بتاتا ہے وہ آپ کی مخالفت میں نہایت شدید ہے)

اعتبار عموم الفاظ

اس پر نظر کر کے تو تفسیر آیت کی یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ نے یہاں تقسیم کی ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو **معجب بالحیوۃ الدنیا** ہے۔ دوسرے وہ جو حیات دنیا کو ابتغاء رضا الٰہی میں بیع کر چکا ہے۔ اس کا بیان وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ الخ میں ہے اور اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ وہ **ومن الناس من یعجبک قولہ الخ** یہ آیت مع اپنے توابع کے ایک منافق کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا نام غالباً اخنس تھا۔ گو حکم مذکور میں اس کی تخصیص نہیں بلکہ جو بھی ویسا ہو اس کا وہی حکم ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔

جو لوگ استرسال نفس کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں وہ تخصیص شان نزول سے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ جہاں کسی فعل شنیع پر وعید نظر آئی انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو فلاں شخص یا فلاں جماعت کے بارہ میں نازل ہوئی ہے ہم سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ مگر خدا جزائے خیر دے اصولیین کو کہ انہوں نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ **العبرۃ لعموم اللفظ لالخصوص السبب** کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہے خصوص سبب نزول کا اعتبار نہیں پس جہاں کسی فعل پر کوئی وعید عموم الفاظ کے ساتھ وارد ہو گی یا کوئی حکم مرتب ہو گا اس کو عام ہی کہا جائے گا۔ مورد کے ساتھ خاص نہ کیا جائے ورنہ چاہیے کہ لعان کا حکم حضور ﷺ کے بعد نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کا نزول ایک خاص واقعہ میں ہوا ہے مگر خود حضور ﷺ نے بھی اس واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ میں اس حکم کو جاری کیا ہے اور خلفاء نے بھی ہمیشہ اس کو جاری رکھا ہے اسی طرح یہاں رکھا جائے گا کہ گو نزول آیت کا ایک خاص منافق کے باب میں ہے مگر حکم اسی کے ساتھ خاص نہیں۔ شان نزول صرف محرک نزول ہو جاتا ہے مقصود اصلی وہی نہیں ہوتا۔

لسان کا طبعی اثر

غرض وہ منافق بڑا لسان تھا ایسا کہ کبھی کبھی حضور ﷺ پر بھی طبعاً اس کی لسانی کا اثر ہو جاتا تھا۔ اسی لئے تو **یعجبک قولہ** حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ باوجود یہ کہ حضور ﷺ ایسے عاقل تھے۔ کہ میں آپ ﷺ کے عاقل ہونے پر ایک لطیفہ بیان کیا کرتا ہوں وہ یہ کہ مسلمان تو آپ ﷺ کو عاقل مانتے ہی ہیں وہ تو غلام ہیں اپنے آقا کو اچھا کہیں ہی گے اور جتنا کچھ کہیں تھوڑا ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ آپ ﷺ کو عاقل مانتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار کفار کو بھی ہے۔ حضور ﷺ نے تھوڑی سی مدت میں اتنے بڑے بڑے کام کئے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا۔ عرب کے جاہلوں کو تھوڑے ہی دنوں میں ایسا شائستہ اور مہذب بنا دیا کہ تمام تعلیم یافتہ قومیں ان کے سامنے پست ہو گئیں پھر اس کے ساتھ

قواعد متعلقہ معاش ومعاد ایسے مہد کئے جن کی نظیر نہیں مل سکتی یہ سب باتیں کفار کو تسلیم ہیں مگر ہم تو حضور کو محض سلطان نہیں کہتے بلکہ نبی بھی کہتے ہیں اور ان فیوض وکمالات کو تائید من اللہ اور نبوت کی برکت سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتے وہ حضور کے ان سب کارناموں کو آپ کی عقل سے ناشی سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑے عاقل انسان تھے۔ کہ تھوڑی سی مدت میں آپ نے ایسے ایسے کام انجام دیئے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے زیادہ عاقل مانتے ہیں کہ جو کام ہمارے نزدیک خدا کے کرنے کا تھا۔ ان کے نزدیک وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کا نتیجہ ہے غرض حضور ایسے عاقل تھے کہ موافق ومخالف سب کو آپ کا عاقل کامل ہونا مسلم ہے مگر وہ منافق ایسا لسان تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عاقل پر بھی اس کی لسانی کا طبعاً اثر ہو جاتا تھا۔ طبعاً اس لئے کہا کہ عقلاً آپ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا کیونکہ عاقل دھوکہ نہیں کھایا کرتا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے۔

اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَنۡ لَّنۡ يُّخۡرِجَ اللّٰهُ اَضۡغَانَهُمۡ ۝ وَلَوۡ نَشَآءُ لَاَرَيۡنٰكَهُمۡ فَلَعَرَفۡتَهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ ؕ وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِىۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ؕ

ترجمہ: جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا اور ہم تو اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بتلا دیتے۔ سو آپ ان کو حلیہ سے پہچان لیتے اور آپ ان کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے۔

عقلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہرگز دھوکہ نہیں ہوسکتا

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ نہ ہوتا تھا۔ طرز کلام سے آپ ہر شخص کو پہچان لیتے تھے کہ یہ مومن ہے یا منافق۔ سچا ہے یا جھوٹا کیونکہ ولتعرفنهم میں لام تاکید اور نون تاکید کے ساتھ کلام کو مؤکد کیا گیا ہے یعنی آپ ضرور پہچان لیں گے۔ پس عقلاً آپ کو ہرگز دھوکہ نہ ہوتا تھا اور یہاں جو فرمایا ہے يُعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا اس سے طبعی اثر مراد ہے کہ آپ پر اس منافق کی لسانی کا طبعاً ایک گونہ اثر ہو جاتا تھا اور یہ بشری خاصہ ہے کہ فصیح وبلیغ زوردار کلام سے تھوڑی دیر کے لئے انسان ضرور متاثر ہو جاتا ہے (جیسے کوئی شاعر عمدہ غزل سنا دے تو سننے والا ضرور متاثر ہوتا ہے) گو اس سے عقلاً دھوکہ نہیں ہوتا کیونکہ جانتا ہے کہ شاعر مبالغہ بہت کیا کرتے ہیں اسی طرح کوئی بلیغ آدمی زوردار تقریر کرے تو کلام کا اثر تھوڑی دیر کے لئے ضرور ہوگا گو یہ بھی جانتے ہوں کہ یہ شخص جھوٹی باتیں بہت بنایا کرتا ہے اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ان من الشعر لحکمة و ان من البیان لسحرا۔ پس اب دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا ایک میں طبعی تاثر کا اثبات ہے دوسری میں عقلی تاثر کی نفی ہے۔

آثار طبعیہ

اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آثار طبعیہ ولوازم بشریہ کو ظاہر کر دیا تاکہ آپ پر الوہیت کا شبہ نہ ہو۔ گو بعض جہال نے اس پر آپ کو الوہیت تک پہنچا دیا ہے بلکہ اب تو جہلاء نے

حضرت غوث اعظمؒ کو بھی الوہیت پر پہنچا رکھا ہے۔

يُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے)

آرام دہ اشیاء

آجکل کی باتیں لوگوں کی چکنی چپڑی تو ضرور ہوتی ہیں مگر ان میں نور نہیں ہوتا اور ان حضرات کے کلام میں ایسا نور ہوتا ہے گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آفتاب نکل آیا آخر مقبولین اور غیر مقبولین میں کوئی فرق تو ہونا ہی چاہیے مگر اس نور کے ادراک کے لئے بصیرت کی ضرورت ہے کیونکہ بعض اوقات ظاہراً باطل میں آب وتاب ہوتی ہے اور حق میں ظاہراً کم رونقی اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کبھی پیشاب صاف ہوتا ہے اور پانی بمقابل اس کے گدلا ہوتا ہے اسی طرح مقبولین اور غیر مقبولین کے اقوال و افعال میں جو فرق ہوتا ہے وہ صورت کا نہیں ہوتا بلکہ بعض مرتبہ صورۃً غیر مقبولین کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے الفاظ نہایت بڑے بڑے اور چست ہوتے ہیں۔ يُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس کی دلیل ہے بلکہ ان میں فرق جو ہوتا ہے وہ حقیقت کا ہوتا ہے جیسے میں نے پیشاب اور پانی کی مثال بیان کی۔ پیشاب ہے صاف مگر ہے ناپاک۔ پانی گدلا ہے مگر ہے پاک۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

ترجمہ: اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے شدت محبت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ یعنی لوگ مختلف ہیں اوپر کئی قسم کا بیان ہو چکا انہی میں سے ایک قسم یہ ہے کہ بعضے بیچ دیتے ہیں اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی مرضی کی تلاش میں بیع ایک امر ہے جس کا تحقق بدلین سے ہوتا ہے جب ایک طرف سے اپنے نفس کو بیع کی تو دوسری طرف سے بھی عوض ہوگا جس کا بیان اس جملہ میں **واللہ روف بالعباد** یعنی حق تعالیٰ بڑے مہربان ہیں بجائے تصریح عوض کے یہ مضمون لایا گیا جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے عوض ہوگا جو حق تعالیٰ کے شان رافت کے مناسب ہوگا جس کا ترجمہ ہے شدت رحمت حق تعالیٰ کی رحمت اگر خفیف سی ہو تو یہ بھی بہت ہے چہ جائیکہ شدید ہو اور الف لام العباد میں یا تو عہدی ہے اس کے معنی یہ ہونگے کہ حق تعالیٰ ایسے بندوں کے ساتھ شدت رحمت سے محبت کرنے والے ہیں اور اگر جنس کا بھی لیں تب بھی ظاہر ہے کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ عام طور سے بندوں کے ساتھ مہربان ہیں اس سے التزاماً نکلتا ہے کہ ایسے خاص بندوں کے ساتھ تو اولی رافت کا برتاؤ کریں گے معلوم

ہوا کہ ادھر سے عوض وہ چیز یہ عطا ہوگی جس سے اس بدل کو کچھ مناسبت ہی نہیں پھر یہ نہیں کسی عوض کی نہ معلوم کیا عطا ہوگا بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عدم کی وجہ یہ ہے کہ وہ عوض سمجھ میں آنے کی چیز نہیں کہ اس کا بیان کیا جاوے پس بدلین میں کچھ مشابہت اور مناسبت ہی نہیں ہوگی جن کی نسبت کہا ہے شعر

چند دادم جاں خریدم — چند پیسوں میں جان خریدی ہے

بنام ایزد عجب ارزاں خریدم — خدا کی قسم بڑی سستی خریدی ہے

یہی معاملہ حق تعالیٰ کا ہے اس وقت کے مال کے یعنی لذات کے مشتری بنتے ہیں مگر جتنا لیں گے اس کا عوض نہیں بلکہ اضعافا مضاعفہ اور ہزاروں گنا زیادہ دیں گے محبت میں ظاہر ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی زندگی حاصل ہوگی وہ اگر مر بھی جائے تو واقعہ میں اس کو زندہ کہا جائے۔

نیم جاں بستاند صد جاں دہد — آنکہ دروہمت نیاید آں دہد

فانی اور حقیقت جان لیتے ہیں اور اسکے بدلے باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم گماں میں بھی نہیں ہوتا عنایت کرتے ہیں۔ غرض یہ بیع بھی فرض ہے اور درحقیقت عطا ہی عطا ہے۔ بہر حال فرماتے ہیں کہ بعض لوگ وہ ہیں جو بیچتے ہیں اپنی جان کو ابتغاء مرضاة اور اس کے دام ادھر سے کیا ہیں۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۔ اپنے بندوں کے ساتھ بہت ہی مہربان ہیں۔ ترجمہ آپ نے فرمایا میں بتاتا ہوں وہ یہ کہ وہ انتہائی مرتبہ کیا ہے جس کا اس آیت کو میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا پس جان لو کہ سلوک جس کا یہ مسئلہ ہے اس کے ماہرین اور محققین نے اکثر علامات اعمال باطنہ میں ترتیب کا حکم کیا ہے اور ان مقامات کی مثال درسیات کے سبق کی سی ہے کوئی سبق تو ایسا ہے کہ اس میں اور اسباق میں ترتیب ضروری ہے جیسے الف بے اور سپارہ کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ الف بے کو سپارہ پر مقدم نہ کیا جاوے اور بعضے سبق ایسے ہیں جو کئی کئی ہو سکتے ہیں جیسے کافیہ اور قطبی لوگ اس فن سے چونکہ بالکل ناآشنا ہو گئے ہیں اس واسطے قاعدہ اور طریقہ جانتے نہیں جو چال سمجھ میں آجاتی ہے اختیار کر لیتے ہیں اور مدتوں پریشان رہتے ہیں اور کچھ بھی نہیں جیسے کوئی یہ نہ جانتا ہو کہ الف بے اور سپارہ میں ایک ضروری ہے اور وہ بلا الف بے پڑھے سپارہ شروع کر دے ایک حصہ عمر کا گزار دے مگر سپارہ میں کما حقہ کامیاب نہ ہوگا جبکہ اس کو ایک شخص ترتیب سے پڑھے تو اس کو اتنی محنت کرنی پڑے گی نہ اتنا وقت صرف ہوگا اور کامیاب بھی ہو جاوے گا دوسرے کے نزدیک سپارہ اس قدر مشکل چیز ہے کہ اس کے پڑھنے میں وقت بھی بہت زیادہ صرف ہو گیا اور دماغ بھی خالی ہو گیا اور کچھ بھی نہیں آرام سے پڑھا اور وقت زیادہ لگا اور کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی یہ طریقہ اچھا ہے۔

بیع کا مفہوم

اس میں دو قول ہیں ایک شراء سے یہاں کیا مراد ہے بعض نے یشری کو بمعنی یشتری کہا ہے یعنی وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ من المهالك والمخاوف اور یہ ایسا ہوگا جیسے بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ میں اشتراء نفس مذکور ہے اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض آدمی وہ ہیں جو (اعمال صالحہ کرکے) اپنے آپ کو خطرات اور خوفناک امور سے خرید لیتا ہے یعنی بچا لیتا ہے مگر اس تفسیر میں اتنا بعد ہے کہ اشتراء تو اس چیز کا ہوتا ہے جو اپنے پاس نہ ہو اور جان تو اپنے پاس ہے

گواس جگہ کلام میں مجاز ہے مگر مجاز میں بھی قرب ہو تو بہتر ہے اور گو بیع کے معنی مراد لینے میں بھی مجاز ہے مگر وہ بعید نہیں کیونکہ بیع کے معنی مراد لینے میں مجاز یہ ہوگا کہ بیع میں طرفین سے مالیت ہوتی ہے اور یہاں نفس مال نہیں سو یہ مجاز تو دونوں صورتوں میں مشترک ہے باقی یہ بات بیع حقیقی کی باقی رہے گی کہ بیع ایسی چیز ہوتی ہے جو بائع کے پاس تھی اور وہ بعد بیع کے ثمن کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات یہاں متحقق ہے کیونکہ جان اپنے پاس تھی اب اس کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیع کر دیا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کی جان حق تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

رہا یہ کہ یہاں تو بیع کے بعد بھی ہماری جان ہمارے پاس ہی رہتی ہے سو یہ وجہ بعد نہیں کیونکہ تمام بیع کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مبیع بائع کے قبضہ سے نکال دی جائے بلکہ یہ بیع بلا تسلیم بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہاں تو تسلیم بھی متحقق ہے کیونکہ تسلیم کے لئے دوسرے کے قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو قادر کر دینا کافی ہے جس کو فقہا تخلیہ سے تعبیر کرتے ہیں پس مومن کامل اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اس پر ہر طرح قادر ہیں اب یہ ان کی عنایت ہے کہ وہ مبیع کو ہمارے ہی پاس امانت چھوڑ دیں۔ غرض یشری نفسه میں بیع کے معنی بعید نہیں ہیں البتہ مالیت کے اعتبار سے مجاز ضرور ماننا پڑے گا۔

ہاں ایک اشکال یہ ہوگا کہ جیسے اشتراء میں مشتری وہ شی ہوتی ہے جو پہلے سے اپنے پاس نہ ہو ایسے ہی مبیع وہ شی ہوتی ہے جو پہلے سے مشتری کی ملک نہ ہو اور ہماری جان تو پہلے ہی سے حق تعالیٰ کی ملک ہے جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے مگر چونکہ ہم اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اس لئے ہمارے زعم کے موافق بیع کا اطلاق صحیح ہے اور جو لوگ اپنی جان کو خدا کی ملک سمجھتے ہیں ان کو یہ علم کہ مخاطبین جان کو اپنی ملک سمجھتے ہیں بعد سماع لفظ بیع کے حاصل ہوا ہے پہلے حاصل نہیں ہوا۔ ابن عطاء کا قول ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ کو سن کر عوام تو خوش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلہ میں ہماری جانیں خرید لی ہیں ہم کو اس کے عوض جنت ملے گی مگر خواص شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ ہمارے اندر دعوی مالکیت تھا جبھی تو اشتری فرمایا اس سے میرے جواب کی تائید ہو گئی کہ یہاں ہمارے مذاق کی رعایت کی گئی ہے پس راجح یہی ہے کہ یشری نفسه میں بیع مراد ہے میں نے اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ بعض وہ لوگ جو طلب رضا الٰہی کے لئے اپنی جان (تک) بیچ دیتے ہیں یہ تک میں نے اس لئے بڑھایا ہے کہ شان نزول اس آیت کا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو آ رہے تھے راستہ میں کفار نے گھیر لیا تو انہوں نے کہا تم جانتے ہو کہ میں کیسا تیر انداز ہوں (تیر اندازی کے فن میں یہ بہت مشہور تھے) اگر مقابلہ کرو گے تو میں تیروں سے سب کو مار ڈالوں گا باقی اگر تم کو مال کی ضرورت ہو تو مکہ میں میرا مال بہت ہے لاؤ میں تم کو رقعہ لکھ دوں تم جا کر میرے وکیل سے مال لے لو۔ کفار نے اسی کو غنیمت سمجھا کیونکہ مقابلہ میں ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا چنانچہ انہوں نے رقعہ لکھ دیا اور وہ سب واپس چلے گئے۔ سو یہاں تو حضرت صہیب نے جان بچائی تھی اور جان بچانے کو مال دیا تھا جان دی نہیں تھی سو شان نزول کو دیکھ کر معنی بیع پر اشکال ہوتا ہے کہ واقعہ نزول میں جان کی بیع کہاں ہوئی تھی بلکہ وہاں تو جان کو بچایا گیا تھا (اسی وجہ سے بعض مفسرین نے یشری نفسه کی تفسیر یشتری نفسه من المهالک والمخارف سے کی ہے) مگر میں نے لفظ تک بڑھا کر اشکال کو رفع کر دیا ہے کہ گو حضرت صہیب نے اس واقعہ میں بظاہر مال ہی دیا تھا مگر حقیقت

میں وہ اپنی جان تک کو اللہ کی رضا کے لئے بیچ کر چکے تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تن تنہا ہجرت کے لئے چل کھڑے ہوئے اور یہ وہی کرسکتا ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کر چکا ہو کیونکہ کفار کے نرغہ میں سے تن تنہا ہجرت کر کے نکلنا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چلنا ہے پھر یہ تو ایک اتفاقی بات تھی کہ کفار مال لینے پر راضی ہو گئے اگر وہ مقابلہ پر آمادہ ہوتے تو حضرت صہیبؓ اللہ کے لئے جان دینے پر بھی تیار تھے اور اس کے لئے تیار ہو کر ہی نکلے تھے شاید کوئی یہ کہے کہ حضرت صہیبؓ مقابلہ کرتے تو واقعی کمال تھا یا مال کو صدقہ کرتے تو یہ بھی ایک کمال تھا باقی جان بچانے کو مال دے دینا کیا بڑا کمال ہے یہ تو ہر شخص کیا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے تو جان بچاتے ہیں اپنی جان کی محبت سے اور حضرت صہیبؓ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان بچائی تھی جیسا کہ ابتغاء مرضاة الله سے معلوم ہو رہا ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

ترجمہ: سو بعضے آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے دیجئے اور ایسے شخص کو آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے گا اور بعضے آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیے ایسے لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا ان کے اس عمل کی بدولت' اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کئی روز تک پھر جو شخص دو دن میں جلدی کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے اس پر بھی گناہ نہیں اس شخص کے واسطے جو ڈرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین کرو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو صرف دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر مانتا ہے اپنے دل کی بات پر حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور تباہ کر دے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتے۔ اور جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہے اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

مکلّف کی دو قسمیں ہیں

مومن اور کافر اور ان میں سے ہر ایک دو دو قسم پر ہے تو چار قسمیں ہوئیں۔ خلاصہ یہ کہ ایمان اور کفر کے اعتبار سے مکلف کی چار قسمیں ہیں یہ مضمون ان آیات کے بعض اجزاء میں مذکور ہے جہاں جہاں لفظ من ہے وہاں ایک ایک قسم ہے اس آیت میں تین جگہ من ہے اور ایک جگہ منھم ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ کہیں من مظہر پر داخل ہے اور کہیں مضمر پر اور معنی من الناس اور منھم کے ایک ہی ہیں۔ غرض چار قسمیں کی گئی ہیں۔ مقسم وہی مکلف ہے باعتبار ایمان اور کفر کے تقسیم اول یہ ہے کہ مکلف یا مومن ہے یا کافر اور دونوں کی دو دو قسمیں ہیں۔ تو کل قسمیں یہ ہوئیں مطلق مومن اور مطلق اور مومن کامل اور کافر شدید اول مطلق مومن اور مطلق کافر کا بیان ہے اور ان دونوں میں سے مقدم ہے کافر کا بیان اور اس کے بعد بطور مقابلہ مومن کا بیان مطلق کافر کا بیان یہ ہے فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا یعنی ایک قسم ان میں سے وہ لوگ ہیں جو صرف دنیا کے طالب ہیں ان کی نسبت ارشاد ہے۔ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ آخرت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہیں، یہاں نکرہ ہے بعد نفی کے جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ذرا بھی حصہ ان کے واسطے آخرت میں نہیں ہوگا اس میں کافر کی ایک حالت تو دنیا کی بیان ہوئی اور ایک آخرت کی جو کہ دنیاوی حالت پر بطور نتیجہ متفرع ہے اور مومن کا ذکر گو آگے صریح آتا ہے

مطلق مومن کی شان

مگر اتنی بات یہیں سے معلوم ہوسکتی ہے کہ جب مومن کافر کا مقابل ہے تو اس کی دنیاوی حالت اس کی دنیاوی حالت کے مقابل ہوگی اور اخروی اور اس کی اخروی کے مقابل ہوگی یعنی مطلق مومن کی شان یہ ہوگی خواہ وہ فاسق وفاجر ہی کیوں نہ ہو کہ نہ تو وہ دنیا میں محض دنیا کا طالب ہوگا اور نہ آخرت میں اس کے واسطے مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ہوگا۔

مومن کے لئے خلود فی النار نہیں

یعنی ہر مومن کی نجات ضرور ہے گو اخیر میں ہو اور اولاً جزا اور سزا اعمال کی بھگتنی پڑے چنانچہ حدیث میں اس معنی کی تصریح موجود ہے لایبقی فی النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من ایمان (نہیں باقی رہے گا دوزخ میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو) کہ دوزخ میں کوئی وہ شخص نہیں رہے گا۔ دوزخ اس کے رہنے کا مکان نہیں ہے۔ مکان اصلی اس کا جنت ہے مگر بعارض دوزخ میں آ گیا ہے، غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی ایمان ہے جس کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہہ سکیں اس کے واسطے بھی جنت ثابت ہے اور خلود فی النار نہ ہوگا اور کبھی نہ کبھی دوزخ سے نکال لیا جائے گا حتیٰ کہ اس قدر ضعیف اور قلیل الایمان شخص بھی جس کے دل میں اس قدر تھوڑا حصہ ایمان کا ہوگا جس کا پتہ انبیاء اور ملائکہ کو بھی نہ لگے گا اور اس کی اطلاع فقط اللہ تعالیٰ کو ہوگی وہ بھی نکال لیا جاوے گا چنانچہ ایک حدیث ہے جو شفاعت کے بارہ میں وارد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اخیر میں فرمائے گا کہ سب لوگ شفاعت کر چکے انبیاء بھی اور ملائکہ بھی اور مومنین بھی۔

حدیث شفاعت میں ایک لطیف تحقیق

اور جس جس کو شفاعت کا حق تھا سب کر چکے یہ لفظ ہے حدیث کا کہ بقی ارحم الراحمین یعنی اب شفاعت حق تعالیٰ کی باقی رہی اس کو شفاعت مجازاً فرمایا۔ دراصل تو رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو کسی دوسرے سے سفارش کرنا نہیں ہے۔ یہ فرما کر ایک لپ بھر کر دوزخیوں کی جنت میں داخل کر دیں گے۔ یہ لپ بھر کنایہ ہے تعداد کثیر سے۔ اس حدیث میں غور کرنا یہ ہے کہ تھوڑے تامل سے بخوبی واضح ہوسکتا ہے کہ اس سے میرے اس دعوے کا اثبات ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں اتنا ضعیف ایمان ہوگا جس کا پتہ کسی شفاعت کرنے والے کو حتیٰ کہ انبیاء اور ملائکہ کو بھی نہ چلے گا اور ان کو بھی نجات ہوگی۔ یہ بات ذرا غامض معلوم ہوتی ہے مگر تھوڑی تقریر کے بعد غامض نہ رہے گی وہ تقریر یہ ہے کہ نص قطعی موجود ہے اس پر کہ کافر کی کبھی مغفرت نہ ہوگی۔ چنانچہ سورہ بینہ میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) اور اس مضمون کی آیتیں صدہا قرآن شریف میں موجود ہیں چنانچہ عقیدہ اہل سنت کا یہی ہے کہ کافر کے لئے خلود فی النار ضرور ہوگا اور اس کی کبھی مغفرت نہ ہوگی تو اب یہ لوگ جن کو حق تعالیٰ نے اخیر میں دوزخ سے نکالا وہ اس دلیل سے مومن تو ضرور ہی ہیں تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کیوں نہیں کی مومنین کیلئے سفارش کی اجازت ہو چکی' اس کی وجہ اگر ہوسکتی ہے تو یہی کہ یہ لوگ اس قدر ضعیف الایمان ہوں گے کہ کسی کو ان کے ایمان کا احساس نہ ہوسکے گا باوجودیکہ سب حدید البصر ہیں مومن کے لئے حدیث میں وارد ہے اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله یعنی مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کیونکہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے۔ غرض کسی مومن پر مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ صادق نہیں آسکتا یہ شان صرف کافر کی ہے۔

کافر کی دو حالتیں

تو کافر کی حالتیں دو ہوئیں دنیا میں یہ کہ وہ فقط طالب دنیا ہو اور آخرت میں یہ کہ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ کا مصداق ہو اب سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

کفر ذرا سا بھی موجب خلود فی النار ہے

اس جزو آیت میں یعنی فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ میں مطلق کافر کا ذکر ہے اور اس کے درجات کا بیان نہیں کیونکہ ضعیف سے ضعیف کفر کا بھی یہ حکم مشترک ہے کہ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہرگز اس کی نجات نہیں ہوسکتی اور راز اس میں یہ ہے کہ کفر اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس درجہ قبیح ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی خوبی موثر نہیں کہ اس پر کوئی حصہ آخرت میں اس کو ملتا اور وہ حقیقت بغاوت ہے جس کا یہ اثر مسلم ہے۔

غرض یہ شبہ محض بے اصل ہے کہ کافر کی کسی خوبی کا اعتبار کفر کے ہوتے ہوئے ہو سکتا ہے کافر کے واسطے چاہے وہ تمام اوصاف کا مجموعہ ہو عقلاً یہی حکم ہونا چاہیے کہ اس کی سب خوبیاں بے سود ہیں اور نتیجہ یہی ہے کہ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ بعض لوگ انکار توحید پر تو اس سزا کے ترتب کو موافق عقل کے سمجھتے ہیں مگر انکار رسالت پر شبہ کرتے ہیں کہ مقصود اعتقاد رسالت سے بھی اعتقاد توحید ہی ہے کہ انبیاء اسی واسطے آ گے ہیں پس جب مقصود حاصل ہے تو طریق کے انکار سے کیا ضرر پس اصل دین یعنی توحید اس میں موجود ہے محض ایک رسالت کے متعلق اس کا خیال غلط ہے سو یہ غلطی ایسے شخص کو معاف ہونا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ منکر توحید کی نسبت تو اس سزا کا استحقاق تم کو بھی مسلم ہے صرف منکر رسالت کے بارے میں شبہ ہے سو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ جو شخص منکر رسالت ہوگا وہ منکر توحید بھی ہوگا پس اب منکر رسالت کے استحقاق پر بھی شبہ نہ رہا۔ غرض یہ جزو آیت کا یعنی مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ مطلق کافر کی شان میں ہے۔

مکلّفین کی دوسری قسم

دوسری قسم مکلّف کی اس دوسرے جملہ میں ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک گروہ آدمیوں کا وہ ہے جو کہتا ہے اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی نیکی دیجئے اور آخرت میں بھی۔ ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مومن مطلق کی شان میں ہے کیونکہ اعتقاد آخرت ہر مومن میں مشترک ہے۔

آیت فی الدنیا حسنة سے ترقی دنیا مراد نہیں

اور یہاں ایک بات پھر یاد آئی کہ اس آیت کو آج کل کے تعلیم یافتہ بہت پڑھتے ہیں اور اپنا ایک مدعا اس سے ثابت کرتے ہیں وہ مدعا کیا ہے ترقی دنیا کہتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم تو یہ ہے کہ آخرت کی ترقی کے ساتھ دنیا میں بھی ترقی کرو اور خشک مغز مولوی دنیا کی ترقی کو بالکل روکتے ہیں یاد رکھئے کہ آیت ہی میں اس کا جواب موجود ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے من الدنیا حسنة نہیں فرمایا بلکہ فی الدنیا حسنة فرمایا اگر من الدنیا حسنة فرمایا ہوتا تو یہ معنی ہو سکتے تھے کہ دنیا کی وہ حالت دیجئے جو اچھی ہو۔ جس کو بلفظ دیگر ترقی کہہ سکتے ہیں جس کے ثبوت کے لئے یہ آیت پیش کی جایا کرتی ہے اور فی الدنیا حسنة کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں بھی ہم کو اچھی چیز دیجئے اور اس اچھی چیز کا جزو دنیا ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ لفظ حسنہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دنیا کی چیز نہیں کیونکہ یہی لفظ حسنہ آگے بھی موجود ہے اور ظاہر یہی ہے جو معنی اس کے وہاں ہیں وہی یہاں بھی ہوں گے اور ظاہر ہے کہ و فی الآخرة حسنه میں مراد ترقی مصطلح نہیں ہے بلکہ نیکی مراد ہے تو اس دعا میں دنیا کی اچھی حالت نہیں مانگی بلکہ دنیا میں نیکی مانگی اور دنیا میں وہ نیکی اعمال صالحہ ہیں اور آخرت میں وہ نیکی ان کی جزا ہے تو حسنہ دنیا میں جس کی طلب کی گئی ہے وہ انگریزی پڑھنا نہیں ہوئی بلکہ توفیق اعمال صالحہ ہوئی۔

ترقی دین کی دعا

قرآن شریف میں فی الدنیا کا لفظ ہے نہ کہ من الدنیا کا تو حسنہ کے معنی نیک کام کے ہوئے تو معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ ہم کو دنیا میں نیک کام کی توفیق دیجئے اور آخرت میں ان کی جزا دیجئے بلکہ اشارۃ ترقی متعارف کی نفی ہے اس کا قرینہ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہے ورنہ اس کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً کافی تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی مانگنے کے ساتھ دوزخ میں لے جانے والی برائی سے بچنے کی بھی دعا ہے جس میں وہ ترقی بھی داخل ہے جو موجب معصیت ہو غرض اس آیت میں دعاء ترقی دین ہی کی ہے اور ظاہر ہے کہ دین کی دعا کرنا یہ شان مومن کی ہے اتنا تو بہت ہی صاف ہے البتہ اس میں مومن کا درجہ کا بیان نہیں کہ ادنیٰ ہے یا کامل مگر میرا مدعا ہر طرح محفوظ ہے کہ اقسام اربعہ مکلفین میں سے اس آیت میں ایک قسم یعنی مومن مطلق کا بیان ہے جیسا کہ اس سے اوپر کافر مطلق کا بیان تھا باقی دو قسمیں آگے آتی ہیں بیچ میں چند جملے اور ہیں جن کا مضمون مقام کے ساتھ گو مرتبط ہے مگر اس کو تقسیم سے تعلق نہیں۔

مکلفین کی تیسری قسم

لہٰذا آگے کی آیتوں سے بقیہ اقسام اور ان کے احکام بیان کرتا ہوں تیسری قسم یہ ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۔ترجمہ یہ کہ بعض آدمی وہ ہیں جن کی بات دنیا کے بارہ میں آپ کو اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنی قلبی حالت پر گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ بڑا جھگڑالو ہے۔ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ترجمہ یہ ہے اور جب وہ یہاں سے جاتا ہے تو اس کا کام یہ ہے کہ زمین میں قتل اور غارت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اور اس کی حالت یہ ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ . یعنی جب اس کو اس پر نصیحت کی جاتی ہے اور خدا کا خوف دلایا جاتا ہے تو اس کو گناہ کرنے پر حمیت اور عار مجبور کرتی ہے یعنی باوجودیکہ گناہ ہونا اس کے قلب میں ثابت ہو جاتا ہے مگر حمیت اور عار اور ضد سے گناہ کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ اس کے لئے جہنم کافی ہے۔ اور وہ بری جگہ ہے اس کے شان نزول سے معلوم ہوا ہے کہ یہ آیت مطلق کافر کے بارہ میں نہیں ہے کیونکہ یہ آیت اخنس نامی منافق کے بارہ میں اتری ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے اور دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ ملایئے کہ منافق اشد ہے کافر مجاہر سے اور اسی واسطے منافق کا عذاب مطلق کافر سے اشد ہے کیونکہ یہ دھوکہ دیتا ہے اس لئے قرآن شریف میں منافق کے بارہ میں وارد ہے إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ یعنی منافقین دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے ہر دو مقدموں کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس آیت میں معمولی کافر کا ذکر نہیں ہے بلکہ اشد کافر کا ہے نیز جن اعمال کا اس آیت میں ذکر ہے وہ نہایت شدید جرائم ہیں مثلاً **فساد فی الارض** اور **اہلاک حرث والنسل** یعنی قتل وغارت سب جانتے ہیں کہ یہ شدید جرائم ہیں چنانچہ خود حق تعالیٰ نے بھی فرمایا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ

یعنی خدا تعالیٰ کو یہ اعمال پسند نہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آیت مطلق کافر کے بارہ میں نہیں بلکہ شدید کافر کے بارہ میں ہے شدید ہونا تو تقریر مذکور سے معلوم ہوا باقی یہ کہ یہ شخص کافر ہے سو اس کا پتہ مال سے چلتا ہے وہ مال یہ ہے فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ یعنی اس کے لئے جہنم کافی ہے جو بری جگہ ہے یہ حکم کافر ہی کا ہو سکتا ہے نہ کہ مومن کا غرض آیت کے اس ٹکڑے میں کافر شدید کا ذکر ہے۔ نہ مطلق کافر کا جیسا کہ اوپر کافر مطلق کا ذکر آچکا ہے یہ تین قسمیں ہو گئیں۔

مکلفین کی چوتھی قسم

اس کے بعد آیت ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ یہ عطف دور سے چلا آرہا ہے اور یہ جملہ اس واسطے میں نے دور سے اس آیت کو شروع کیا وہیں سے ومن الناس کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ قرآن شریف روزمرہ پڑھا جاتا ہے مگر پڑھنے والے کی نظر کبھی نہیں جاتی اس پر کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ میں مرتبط ہیں اول کی دو قسموں پر تو نظر پڑ جاتی ہے کیونکہ ان کا عطف قریب قریب ہے اور یہ دو قسمیں جملہ مستانفہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان کا عطف بعید ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان قسموں کو ماقبل سے کوئی تعلق نہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ سب جملے باہم مرتبط ہیں اور ایک ہی مقسم کی چاروں قسمیں آیت میں موجود ہیں۔ غرض چوتھی قسم یہ ہے کہ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ۔ بمعنی بیع کے ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ ایک قسم آدمیوں کی وہ ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے بیچ ڈالتے ہیں ان کا کام تو یہ ہے اور حق تعالیٰ کا ان کے ساتھ برتاؤ یہ ہے وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ اس کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہی اشخاص کی شان میں ہے جو کمال درجہ ایمان پر پہنچے ہوئے تھے جن کو مومن کامل کہنا چاہیے اور لفظ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ بھی بتاتا ہے کہ آیت مطلق مومن کے بارے میں نہیں ہے بلکہ بڑے مومن کے بارہ میں ہے کیونکہ رؤف مبالغہ کا صیغہ ہے رافت خود شدت رحمت کو کہتے ہیں اور اس سے مبالغہ کا صیغہ بنا تو اور رحمت میں شدت ہو گئی پس ایسی رحمت اسی شخص کے واسطے ہو سکتی ہے جو بدرجہ کمال اس کا مستحق ہو اور وہ مومن کامل ہی ہے اور لفظ بالعباد بھی بتاتا ہے کہ مومن کامل ہی مراد ہے کیونکہ اعلیٰ درجہ کا کمال عبدیت ہی ہے غرض ہر ہر لفظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس آیت میں بیان مومن کامل کا ہے تو کل قسمیں مکلفین کی چار ہوئیں یہ تو مدلول لفظی تھا ان آیات کا اب اس مدعائے مستنبط کو بیان کرتا ہوں تقریر مذکور میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ ایمان کے مراتب بھی مختلف ہیں اور کفر کے مراتب بھی مختلف ہیں ایک کفر کامل (کامل تو کیوں کہوں کیونکہ کفر تو بدترین عیب اور بدترین نقص ہے اس کی جگہ لفظ کفر شدید اختیار کرتا ہوں) دوسرا غیر شدید اور ظاہر ہے کہ آخری وہ درجہ جس کو کامل اور شدید کہا جائے انتہائی درجہ ہوتا ہے پھر اس کے مقابل جو سب میں اول ہو ابتدائی کہلاتا ہے جیسے درسیات میں ہدایہ امور عامہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے کہ پہلی کتاب ہے اسی کو ابتدائی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں غرض کمال کو انتہاء اور پہلے درجہ کو ابتداء کہتے ہیں اور جب کفر میں یہ مراتب ہیں تو ضرور ایک مرتبہ اخیر ہو گا جس کو میں نے شدت کفر کہا تھا اور ایک درجہ سب سے کم ہو گا جس کو ابتدا کہہ سکتے ہیں غرض کفر میں دو مرتبے نکلے ابتدا اور انتہا اور ایسے ہی ایمان میں بھی ابتداء اور انتہاء ہوئی اور مجھ کو اس وقت صرف ایمان کے ان

مراتب کا بیان مقصود ہے اور یہی ہے وہ مضمون مستنبط جس کی تمہید کو گو طول تو ہوا مگر ضرورت کی وجہ سے ہوا کیونکہ ایمان کے ان مراتب کا ثابت کرنا اس سب بیان پر موقوف تھا غرض تقسیم مذکور تو مکلفین کی قرآن سے ثابت ہوئی اور اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلی ملایا گیا جو بہت ظاہر ہے پس اس طرح سے آیت میں ابتدائی اور انتہائی درجہ کا بیان ہو گیا اور سوق کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اولاً بیان ہے ابتدائی مرتبہ کا اس کے بعد انتہائی کا اور ذکر مراتب میں اسی طرح تدریجاً ترقی کیا کرتے ہیں اور کمال کو بعد میں بیان کیا کرتے ہیں اکثر عادت یہی ہے گو یہاں قرآن میں کوئی لفظ صریح نہیں اس ترتیب کے بارہ میں مگر ایسی ترتیب بلغاء کی عادت ہے اور قرآن بلیغ ہے تو قرآن میں بھی یہی ترتیب ہونا بہت قرین قیاس ہے پھر اقسام کی حقیقت میں نظر کرنے سے بھی یہی ترتیب واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ اول مطلق کا درجہ مذکور ہو۔ پھر کمال کا پس اس طور پر آیت کے مجموعی مضمون سے یہ دعویٰ مستنبط ہو گیا کہ کفر کی طرح ایمان میں بھی یہ مراتب ہیں یعنی ابتدائی اور انتہائی اور اس وقت میری بحث کا تعلق صرف ایمان سے ہے میں درجات کفر سے تعرض نہ کروں گا غرض ایمان کا ایک درجہ تو ابتدائی ہوا اور ایک انتہائی اور آگے کی ایک آیت ہے یہ دلالت بہت ہی واضح ہو جائے گی اور وہ آیت یہ ہے يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۔ یہ صاف ہے اس بارہ میں کہ دو مرتبے ہیں اسلام میں کیونکہ اس میں خطاب ہے ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں اور ان کو حکم ہے **دخول فی السلم کافۃ** کا معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد بھی کوئی مرتبہ باقی ہے جس کو **دخول فی السلم کافۃ** کہہ سکتے ہیں اور اس سے پہلے یہ مرتبہ حاصل نہیں غرض ایمان کے دو درجہ ہونا بہت ہی صراحت کے ساتھ ثابت ہو گیا۔ ایک مطلق جو ابتدائی درجہ پر بھی صادق ہے اور چونکہ تفاوت ایمان کا اعمال سے ہوتا ہے چنانچہ بعض اعمال سے نفس ایمان کا وجود ہوتا ہے مثلاً کلمہ شریف کا پڑھنا اور بعض اعمال سے کمال ایمان ہوتا ہے جیسے دوسرے اعمال پس ایمان میں ان دو درجے کے ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ ایمان سے جن اعمال کا تعلق ہے ان اعمال میں دو درجے ہیں۔ ایک اول الاعمال دوسرا آخر الاعمال۔ حق تعالیٰ نے حج کے احکام کے ساتھ فرمایا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا

ترجمہ: یعنی جب تک مناسک حج پورا کر چکو تو خدا تعالیٰ کو یاد کرو جیسا اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے تھے یا ان کے ذکر سے بھی زیادہ یاد کرو۔

مسلمان طالب حسنہ ہیں

زمانہ جاہلیت میں حج کے بعد منیٰ میں اہل عرب قیام کرتے اور وہاں مشاعرہ ہوتا۔ اور مفاخرت کے طور پر اپنے خاندانی فضائل کا مذاکرہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ذکر اللہ سے بدل دیا کہ اب بجائے ذکر دنیا کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ جاہلیت کا طریقہ چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اب ذکر اللہ یعنی دین کے اعتبار سے لوگوں کی چند قسمیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی بعض آدمی تو وہ ہے جو (دعا میں) یوں کہتا ہے اے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں ہی دے دے اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں

یہ تو کافر ہے کیونکہ جس کو آخرت میں کچھ نہ ملے وہ کافر ہی ہے مسلمان اس کا مصداق نہیں ہوسکتا آگے دوسری قسم ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ اس آیت کا سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ اس کے مصداق وہ مسلمان ہیں جو طالب آخرت ہیں اس پر شاید سوال ہو کہ جب یہ لوگ مسلمان طالب آخرت ہیں۔ تو انہوں نے دنیا کیوں مانگی۔ اور اس سے بعض انگریزی خوانوں نے طلب دنیا کا مضمون سمجھ کر یہ کہا ہے کہ دنیا جس کی مذمت کی جاتی ہے اور جس کی طلب سے علماء منع کرتے ہیں۔ ایسی چیز ہے جس کی طلب نص میں بیان کی گئی ہے اور اس پر مدح کی گئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دنیا کو کہاں مانگا گیا ہے حق تعالیٰ نے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا فرمایا ہے۔ دنیا تو نہیں فرمایا اگر یوں فرماتے تو بے شک طلب دنیا مفہوم ہوتی۔ مگر نص میں تو رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وارد ہے جس میں مطلوب حسنہ ہے اور دنیا محض ظرف ہے پس اس سے طلب دنیا لازم نہیں آتی بلکہ طلب حسنة فی الدنیا لازم آئی۔ اس لئے ان کو طالب دنیا کہنا غلط ہے بلکہ وہ تو طالب حسنہ فی الدنیا ہیں۔ اس پر شاید سوال ہو کہ پھر ان کو طالب آخرت کہنا بھی صحیح نہ ہوگا بلکہ طالب حسنہ فی الاخرۃ کہنا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ طلب آخرت کے تو معنی یہی ہیں کہ طلب حسنہ ہو۔ اب چاہے تم اس کو طالب آخرت کہو یا طالب حسنہ فی الآخرۃ کہو۔ دونوں برابر ہیں۔

اس پر اگر تم کہو پھر ہم بھی طالب دنیا نہیں بلکہ طالب حسنة فی الدنیا ہیں۔ یعنی مال و دولت حسنہ ہے اور ہم اس کے طالب ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حسنہ سے مراد حسنہ واقعیہ ہے نہ کہ حسنہ مزعومہ اور یہ شریعت سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حسنہ واقعیہ کیا ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ تمہارے نزدیک حسنہ ہے مگر شرعاً تو وہ حسنہ نہیں ہے پس شریعت پر فیصلہ ہے پس اس آیت کا مصداق وہی شخص ہوسکتا ہے جو حسنہ شریعت کا طالب ہو اور حسنہ شریعہ سے بھی وہ مراد ہے جو حقیقتاً حسنہ شرعیہ ہو۔ محض سورۃ ہی حسنہ نہ ہو کیونکہ بعض افعال صورۃ دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتاً دین نہیں ہوتے ہم ان سے بھی منع کرتے ہیں۔

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ پہلی آیت کا مصداق کافر ہے اور دوسری آیت کا مصداق مومن عام مفسرین نے تو یہی دو قسمیں سمجھی ہیں اور آگے مِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ سے مستقل کلام لیا ہے مگر قاضی ثناءاللہ صاحب نے مجموعہ کلام میں چار قسمیں سمجھی ہیں دو تو وہ ہیں جو ابھی مذکور ہوئیں اور دو مِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ الخ اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي الخ.

خلاصہ فرق دونوں توجیہوں کا یہ ہے کہ عام مفسرین کے نزدیک تو یہاں پر دو تقسیمیں ہیں۔ تقسیم اول انسان کی تقسیم ہے۔ مومن و کافر کی طرف تقسیم ثانی انسان کی تقسیم ہے منافق اور مخلص کی طرف مگر یہ اقسام باہم جمع ہوسکتی ہیں چنانچہ کافر و منافق جمع ہوسکتے ہیں اور مومن و مخلص جمع ہوسکتے ہیں۔ اس تقسیم کی ایسی مثال ہے جیسے نحاۃ نے کلمہ کی تقسیم کی ہے اسم و فعل و حرف کی طرف۔ پھر دوبارہ تقسیم کی ہے مذکر و مونث کی طرف و علی ھذا تو یہ اقسام باہم جمع ہوسکتی ہیں۔ یہ تو جمہور مفسرین کی توجیہ کا حاصل ہے۔

اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں ایک ہی تقسیم ہے اور مقسم بھی واحد ہے۔ یعنی انسان مقسم ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں مومن و کافر۔ پھر کافر کی دو قسمیں ہیں۔ مجاھر و منافق اور مومن کی دو قسمیں ہیں ایک طالب آخرت اور ایک طالب حق پس کل چار قسمیں متبائن ہوگئی کافر مجاہر اور کافر غیر مجاہر۔ اور مومن طالب آخرت اور مومن طالب حق بدوں التفات الی الاخرۃ (بدوں اس کے کہ آخرت کا طالب ہو)

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَالَه فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ میں کافر مجاہر کا ذکر ہے جو کہ دنیا محضہ کا طالب ہے اور وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً الخ. میں مومن طالب آخرت کا ذکر ہے اور من الناس من یعجبک قولہ میں کافر غیر مجاہر یعنی منافق کا ذکر ہے اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ میں مومن طالب حق کا ذکر ہے جو محض طالب رضا ہے آخرت اور دنیا دونوں کی طرح ملتفت نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۝

ترجمہ: کہ بعض لوگ وہ ہیں جو اپنے نفسوں کو بدل کر دیتے ہیں یعنی خرچ کر دیتے ہیں اللہ کی مرضی طلب کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت مہربان ہیں۔

شراء نفس کی فضیلت اور غایت

حاصل یہ ہے کہ اس جگہ ایک عمل کی فضیلت مذکور ہے یعنی شراء النفس کی اور ایک اس کی غایت مذکور ہے یعنی ابتغاء مرضات اللہ اور گو غایت بھی ایک فعل ہی ہے مگر اس میں جہت مقصودیت غالب ہے اس لئے بہ نسبت عمل کہنے کے اس کو غایت کہنا زیادہ زیبا ہے اور ایک ثمرہ مذکور ہے وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۝ کہ اس فعل اور غایت کا ثمرہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت اور رافت متوجہ ہوتی ہے یہ تین مضمون اس آیت میں مذکور ہیں اور اس کی تفسیر میں سیاق وسباق پر نظر کر کے مفسرین نے اس کی توجیہیں بیان کی ہیں بعض نے ایک توجیہ بیان کی ہے اور بعض نے دوسری توجیہ بیان کی ہے اس میں بھی سیاق وسباق پر نظر ہے مگر دور تک نہیں انہوں نے صرف قریب کی آیت پر نظر کی ہے سیاق کا لفظ ویسے ہی زبان سے نکل گیا مقصود صرف سباق ہے کیونکہ ان توجیہات میں سباق ہی کو دخل ہے اور سباق پر نظر کرنا بھی تفسیر کا بڑا جزو ہے خصوصاً ربط سمجھنے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے ورنہ بعض اشکالات ہونے لگتے ہیں اس کی نظیر میں ایک آیت اس وقت یاد آئی جس میں سباق پر نظر نہ کرنے سے اشکال واقع ہوا ہے آیت یہ ہے وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا اور اچھا جواب ہے کہ غلبہ سے غلبہ فی الحجت مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی غلبہ نہ ہوگا اور یہ مشاہدہ کے موافق ہے حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گویا جواب فی نفسہ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اسی فیصلہ کے متعلق ہے پوری آیت یوں ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا یعنی پس اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرینگے قیامت کے دن اور (اس فیصلہ میں) حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دینگے۔ دیکھئے سباق میں نظر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے علماء کو یاد کر لینا چاہیے کہ تفسیر آیت کے وقت صرف آیت کے اسی ٹکڑے کو نہ دیکھیں جس کی تفسیر مقصود ہے

بلکہ اوپر سے ملا کر دیکھیں ان شاء اللہ اس طرح اول تو اشکال ہی وارد نہ ہوگا اور اگر ہوا بھی تو جواب بھی اسی موقع پر مل جاوے گا دوسری نظیر ایک اور یاد آئی کہ وہاں بھی سباق پر نظر نہ کرنے ہی سے اشکال واقع ہوا ہے۔ آیت یہ ہے۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

ترجمہ: اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تمہارے میں سے کچھ رسول آئیں جو میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھیں تو پھر جو شخص (ان کے حکم کے موافق) تقوی اختیار کرے اور (اعمال کی) اصلاح کرے گا ان پر کچھ اندیشہ نہ ہوگا نہ وہ غمگین ہونگے۔ (سورہ اعراف)

اس آیت کے الفاظ پر نظر کر کے بعض اہل باطل نے استدلال کیا ہے کہ ارسال رسل کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ جملہ بنی آدم کو جن میں امت محمدیہ ﷺ بھی داخل ہے خطاب فرما رہے ہیں کہ اگر تمہارے پاس رسول آئیں الخ اگر باب رسالت مسدود ہو چکا ہے تو اب اس قسم کے خطاب کے کیا معنی ہوئے یہ اشکال اس لئے ہوا کہ ان لوگوں نے محض اسی آیت کے الفاظ کو دیکھا اگر سباق پر نظر کی جائے تو پھر قصہ سہل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ اوپر سے آیات میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے اوپر آدم علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ وہ پیدا کئے گئے پھر جنت میں رکھے گئے پھر وہاں سے زمین پر اتارے گئے اور اس وقت آدم علیہ السلام کو ان کی ذریت کو کچھ خطابات ہوئے ہیں چنانچہ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ قَالَ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَ فِیْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ میں آدم و ذریت آدم دونوں کو خطاب ہے پھر یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِیْشًا اور یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا میں اسی وقت اولاد آدم کو خطاب ہوا ہے اسی وقت کے خطاب کا یہ بھی تتمہ ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ الایة پس یہ سب خطابات قصہ ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت یا اس کے متصل ہی ارواح بنی آدم کو ہوئے ہیں جن کو اس وقت اس لئے نقل کر دیا گیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ عہود ہم سے قدیم زمانہ میں لے لئے گئے ہیں کوئی نئی بات نہیں اور اس وقت باب رسالت بند نہ تھا لہٰذا اب کوئی اشکال نہیں (اور اس خطاب کے قدیم ہونے کی تائید آثار سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ بیان القرآن میں بروایت ابن جریر ابو یسار سلمی کا قول نقل کیا گیا ہے) دوسرے القرآن یفسر بعضه بعضا کے قاعدہ سے سورہ بقرہ کی آیت بھی اس کی موید ہے کیونکہ وہاں ارسال رسل کا مضمون حکم ہبوط کے ساتھ متصل ہی بیان ہوا ہے۔ فرماتے ہیں قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. اس خطاب میں بجز اس وقت کا خطاب ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا پس ایسے ہی یہاں بھی خطاب یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ الخ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ سے مربوط ہے گو بیچ میں اور مضامین بھی آ گئے ہیں اس کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ بات میں سے بات نکل ہی آیا کرتی ہے بلاغت کا مسئلہ ہے الکلام یجر بعضه بعضا چنانچہ بلغاء کا قاعدہ ہے کہ ایک بات کو شروع کرتے ہیں اس سے دوسری بات نکل آئی تو تبعاً اس کو بھی بیان کر دیا اس کے بعد پھر پہلی بات کی طرف عود کرتے ہیں

قرآن کا نزول اسی طرز محاورہ پر ہوا ہے معقولیین یا مصنفین کے طرز پر نہیں ہوا لہٰذا یہاں ربط سمجھنے اور تفسیر دریافت کرنے کے لئے دور تک آیات کو دیکھنے کی ضرورت ہے لطف تفسیر کا اسی میں ہے اور اس سے سب اشکالات حل ہو جاتے ہیں ایسے ہی یہاں بھی سباق میں نظر کر کے آیت کی تفسیر کرنا چاہیے گو یہاں سباق میں نظر نہ کرنے سے کوئی اشکال تو واقع نہ ہوگا مگر لطف بھی حاصل نہ ہوگا اس لئے مفسرین نے سباق پر نظر کر کے اس کی دو توجیہیں کی ہیں بعض نے سباق قریب پر نظر کی ہے اور وہ یہ ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ الآیۃ اس پر نظر کر کے تو تفسیر آیت کی یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ نے یہاں تقسیم کی ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو معجب بالحیوۃ الدنیا ہے دوسرے وہ جو حیات دنیا کو ابتغاء رضاء الیہ میں بیع کر چکا ہے اس کا بیان وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ الخ میں ہے اور اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ الخ یہ آیت مع اپنے توابع کے ایک منافق کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا نام غالباً اخنس تھا۔ گو حکم مذکور میں اس کی تخصیص نہیں بلکہ جو بھی ویسا ہو اس کا وہی حکم ہے جو یہاں بیان ہوا ہے جو لوگ استرسال نفس کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں وہ تخصیص شان نزول سے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ جہاں کسی فعل شنیع پر وعید نظر آئی انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو فلاں شخص یا فلاں جماعت کے بارہ میں نازل ہوئی ہے ہم سے اس کا کچھ تعلق نہیں مگر خدا جزائے خیر دے اصولیین کو کہ انہوں نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے العبرة لعموم اللفظ لالخصوص السبب کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہے خصوص سبب نزول کا اعتبار نہیں پس جہاں کسی فعل پر کوئی وعید عموم الفاظ کے ساتھ وارد ہوگی یا کوئی حکم مرتب ہوگا اس کو عام ہی کہا جائے گا مورد کے ساتھ خاص نہ کیا جائے گا۔

ورنہ چاہیے کہ لعان کا حکم حضور ﷺ کے بعد نہ ہوتا کیونکہ اس کا نزول ایک خاص واقعہ میں ہوا ہے مگر خود حضور ﷺ نے بھی اس واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ میں اس حکم کو جاری کیا ہے اور خلفاء نے بھی ہمیشہ اس کو جاری رکھا ہے اسی طرح یہاں رکھا جائے گا گو نزول آیت کا ایک خاص منافق کے باب میں ہے مگر حکم اس کے ساتھ خاص نہیں شان نزول صرف محرک نزول ہو جاتا ہے مقصود اصل وہی نہیں ہوتا غرض وہ منافق بڑا لسان تھا ایسا کہ کبھی کبھی حضور ﷺ پر بھی طبعاً اس کی لسانی کا اثر ہو جاتا تھا اسی لئے تو یعجبک قولہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے باوجودیکہ حضور ﷺ ایسے عاقل تھے کہ میں آپ کے عاقل ہونے پر ایک لطیفہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ مسلمان تو آپ کو عاقل مانتے ہی ہیں وہ تو غلام ہیں اپنے آقا کو اچھا کہیں ہی گے اور جتنا کچھ کہیں تھوڑا ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ آپ کو عاقل مانتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار کفار کو بھی ہے کہ حضور ﷺ نے تھوڑی سی مدت میں اتنے بڑے بڑے کام کئے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا عرب کے جاہلوں کو تھوڑے ہی دنوں میں ایسا شائستہ اور مہذب بنا دیا کہ تمام تعلیم یافتہ قومیں ان کے سامنے پست ہو گئیں پھر اس کے ساتھ قواعد متعلقہ معاش و معاد ایسے ممہد کئے جن کی نظیر نہیں مل سکتی یہ سب باتیں کفار کو تسلیم ہیں مگر ہم تو حضور ﷺ کو محض سلطان نہیں کہتے بلکہ نبی بھی کہتے ہیں اور ان فیوض و برکات کو تائید من اللہ اور نبوت کی برکت سمجھتے ہیں اور کفار حضور ﷺ کو نبی نہیں مانتے وہ حضور کے ان سب کارناموں کو اپنی عقل سے ناشی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد عربی ﷺ بہت

بڑے عاقل انسان تھے کہ تھوڑی سی مدت میں ایسے ایسے کام انجام دیئے تو وہ آپ کو ہم سے زیادہ عاقل مانتے ہیں کہ جو کام ہمارے نزدیک خدا کے کرنے کا تھا ان کے نزدیک وہ حضور ﷺ کی عقل کا نتیجہ ہے غرض حضور ﷺ ایسے عاقل تھے کہ موافق ومخالف سب کو آپ کا عاقل کامل ہونا مسلم ہے مگر وہ منافق ایسا لسان تھا کہ حضور جیسے عاقل پر بھی اس کی لسانی کا طبعاً اثر ہو جاتا تھا طبعاً اس لئے کہا کہ عقلاً آپ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا کیونکہ عاقل دھوکہ نہیں کھایا کرتا چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ۝ وَلَوْ نَشَاۗءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۭ (ترجمہ) جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا اور ہم تو اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بلا دیتے سو آپ ان کو حلیہ سے پہچان لیتے اور آپ ان کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا طرز کلام سے آپ ہر شخص کو پہچان لیتے تھے کہ یہ مومن ہے یا منافق سچا ہے یا جھوٹا کیونکہ ولتعرفنهم میں لام تاکید اور نون تاکید کے ساتھ کلام کو موکد کیا گیا ہے یعنی آپ ضرور پہچان لیں گے پس عقلاً آپ کو ہرگز دھوکہ نہ ہوتا تھا۔

خاصہ بشری

اور یہاں جو فرمایا ہے يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس سے طبعی اثر مراد ہے کہ آپ پر اس منافق کی لسانی سے طبعاً ایک گونہ اثر ہو جاتا تھا اور یہ بشری خاصہ ہے کہ فصیح و بلیغ زوردار کلام سے تھوڑی دیر کے لئے انسان ضرور متاثر ہو جاتا ہے (جیسے کوئی شاعر عمدہ غزل سنا دے تو سننے والا ضرور متاثر ہوتا ہے گو اس سے عقلاً دھوکہ نہیں ہوتا کیونکہ جانتا ہے کہ شاعر مبالغہ بہت کیا کرتے ہیں اسی طرح کوئی بلیغ آدمی زوردار تقریر کرے تو کلام کا اثر تھوڑی دیر کے لئے ضرور ہوگا گو ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ یہ شخص جھوٹی باتیں بہت بنایا کرتا ہے اسی کو حضور فرماتے ہیں ان من الشعر لحكمة و ان من البيان لسحرا) پس اب دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا ایک میں طبعی تاثر کا اثبات ہے دوسری میں عقلی تاثر کی نفی ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ان آثار طبیعہ ولوازم بشریہ کو ظاہر کر دیا تا کہ آپ پر الوہیت کا شبہ نہ ہو گو بعض جہال نے اس پر بھی آپ کو الوہیت تک پہنچا دیا ہے بلکہ آپ تو آپ جہلاء نے حضرت غوث اعظم کو بھی الوہیت تک پہنچا رکھا ہے چنانچہ ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی جس کا لڑکا مر گیا تھا کہ حضرت اس کو زندہ کر دو آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہو چکی اب زندہ نہیں ہو سکتا وہ رونے اور اصرار کرنے لگی تو آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کر دیا جائے وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں اس لئے اب زندہ نہیں ہو سکتا تو حضرت غوث اعظم حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت آپ سے کہنے کی تو اسی لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں اگر اس کی تقدیر میں کچھ اور زندگی ہوتی تو آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی پھر تو آپ مجبور ہو کر خود ہی زندہ کرتے (نعوذ بالله منه) وہاں سے حکم آیا کہ پھر تقدیر کے خلاف تو نہیں ہو سکتا اس پر غوث اعظم کو جلال آیا اور اپنے قوت کشفیہ سے ملک الموت کو ٹٹولا کہ وہ

کہاں ہیں آخر نظر آئے تو دیکھا کہ وہ ایک تھیلے میں اس دن کے مردوں کی روحیں بھر کر لے جارہے ہیں ابھی تک ہیڈ کوارٹر پر نہ پہنچے تھے کہ غوث اعظم نے ان کو ٹوکا اور کہا بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کردو تم اس کو نہیں لے جاسکتے وہ انکار کرنے لگے آپ نے وہ تھیلا ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا جتنی روحیں تھیں سب پھر پھرا گئیں اور اس دن جتنے آدمی مرے تھے وہ سب زندہ ہو گئے تو غوث اعظم نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہو گئے ایک مردے کے زندہ کرنے پر تو راضی نہ ہوئے اب بہت جی خوش ہوا ہوگا جب ہم نے سارے مردوں کو زندہ کر دیا توبہ توبہ استغفر اللہ۔

کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور ان کو بیان کر کے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ غوث اعظم وہ کام کر سکتے ہیں جو خدا بھی نہیں کر سکتا بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا جب جاہلوں نے غوث اعظم رضی اللہ عنہ کو اس رتبہ پر پہنچا دیا تو اگر حضور ﷺ کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازم بشریہ کو ذکر نہ کیا جاتا تو نہ معلوم یہ لوگ حضور ﷺ کو کہاں پہنچاتے اور اب اگر کوئی ایسی غلطی کرے تو یہ محض حماقت ہے کیونکہ قرآن میں سب باتیں بیان کر دی گئیں کہ آپ کھاتے بھی تھے سوتے بھی تھے بیوی کی بھی آپ کو ضرورت تھی آپ لسان آدمی کی بات سے متاثر بھی ہوتے تھے ان آثار کے ہوتے ہوئے الوہیت کا احتمال کہاں؟ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ سے لوازم بشریت اور امور طبعیہ زائل نہیں ہوا کرتے اس میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاہدہ سے لوازم بشریت و تقاضاء طبعی مسلوب ہو جاتا ہے پھر بعد اعتدال و تمکین کے جب ان آثار کا عود ہوتا ہے تو پریشان ہوتا ہے کہ ہائے میری ساری محنت برباد اور میرا سارا مجاہدہ ضائع گیا حالانکہ یہ اعتقاد غلط ہے مجاہدہ سے امور طبعیہ مسلوب نہیں ہوتے بلکہ جوش مجاہدہ سے صرف مغلوب ہو جاتے ہیں پھر بعد اعتدال کے جب ہنڈیا پک جاتی ہے تو وہ جوش نہیں رہتا بلکہ سکون ہو جاتا ہے (فناء النفوس فی رضا القدوس)

آیت ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ پر رفع اشکال

ارشاد ہے فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی بعض آدمی تو وہ ہے جو (دعا میں) یوں کہتا ہے کہ اے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہے) دنیا ہی میں دے دے اور اس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں یہ تو کافر ہے کیونکہ جس کو آخرت میں کچھ نہ ملے وہ کافر ہی ہے مسلمان اس کا مصداق نہیں ہو سکتا آگے دوسری قسم ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے رب ہمیں دنیا میں خیر دیجئے اور آخرت میں بھی خیر دیجئے اور نار کے عذاب سے بچایئے) اس آیت کا سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ اس کے مصداق وہ مسلمان ہیں جو طالب آخرت ہیں۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ جب یہ لوگ مسلمان طالب آخرت ہیں تو انہوں نے دنیا کیوں مانگی اور اس سے بعض انگریزی خوانوں نے طلب دنیا کا مضمون سمجھ کر یہ کہا ہے کہ دنیا جس کی مذمت کی جاتی ہے اور جس کی طلب سے علماء منع کرتے ہیں ایسی چیز ہے جس کی طلب نص میں بیان کی گئی ہے اور اس پر مدح کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دنیا کو کہاں مانگا گیا ہے۔ حق تعالیٰ نے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا دنیا۔ تو نہیں فرمایا گیا۔ اگر یوں فرماتے تو بے شک طلب دنیا مفہوم ہوتی مگر نص میں تو رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي

الدُّنْیَا حَسَنَةً (اے رب ہمیں دنیا میں خوبی دیجئے) وارد ہے جس میں مطلوب حسنہ ہے اور دنیا محض ظرف ہے پس اس سے طلب دنیا لازم نہیں آتی' بلکہ حسنة فی الدنیا لازم آئی اس لئے ان کو طالب دنیا کہنا غلط ہے بلکہ وہ طالب حسنہ فی الدنیا ہیں۔ اس پر شاید سوال ہو کہ ان کو طالب آخرت کہنا بھی صحیح نہ ہوگا بلکہ طالب حسنہ فی الآخرہ کہو۔ دونوں برابر ہیں۔ اس پر اگر تم کہو کہ پھر بھی طالب دنیا نہیں ہیں بلکہ طالب حسنہ فی الدنیا ہیں۔ یعنی مال و دولت حسنہ ہے اور ہم اس کے طالب ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حسنہ سے مراد حسنہ واقعیہ ہے نہ کہ حسنہ مزعومہ اور یہ شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حسنہ واقعہ کیا ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ تمہارے نزدیک حسنہ ہو مگر شرعاً تو وہ حسنہ نہیں ہے پس شریعت پر فیصلہ ہے۔ پس اس آیت کا مصداق وہی شخص ہو سکتا ہے جو حسنہ شرعیہ کا طالب ہو اور حسنہ شرعیہ سے بھی وہ مراد ہے جو حقیقۃً حسنہ شرعیہ ہو۔ محض صورۃً ہی حسنہ نہ ہو کیونکہ بعض افعال صورۃً دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقۃً دین نہیں ہوتے ہم ان سے بھی منع کرتے ہیں اس سے آپ کو ہمارے انصاف کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم صرف صورت دنیا ہی کے مخالف نہیں بلکہ دنیا بصورت دین کے بھی مخالف ہیں۔ جیسے بدعات وغیرہ کہ گو ظاہر میں وہ دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر ان سے بھی منع کرتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کہتے ہیں مانع عن اللہ کو اور یہ مال و دولت ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض ایمان بھی مانع عن اللہ ہوتا ہے۔ جیسے وہ ایمان جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ. یعنی ظاہری ایمان جس میں حقیقت کا پتہ نہ ہو۔ ایسے ہی بعض اعمال بھی جو صورۃً دین ہیں مگر حقیقت دین ان میں موجود نہیں مانع عن اللہ ہیں۔ یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم صرف طالبان دنیا ہی کی مذمت نہیں کرتے بلکہ بعض طالبان دین کی بھی مذمت کرتے ہیں جو حقیقت میں دین کی صورت میں دنیا ہی کے طالب ہیں۔

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ پہلی آیت کا مصداق کافر ہے اور دوسری آیت کا مصداق مومن عام مفسرین نے تو یہی دو قسمیں سمجھی ہیں اور آگے مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ سے مستقل کلام لیا ہے مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے مجموعہ کلام میں چار قسمیں سمجھی ہیں دو تو وہی جو ابھی مذکور ہوئیں اور دو مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ الخ اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ الخ خلاصہ فرق دونوں توجیہوں کا یہ ہے کہ عام مفسرین کے نزدیک تو یہاں پر دو قسمیں ہیں تقسیم اول انسان کی تقسیم ہے۔ مومن وکافر کی طرف تقسیم ثانی' انسان کی تقسیم ہے۔ منافق اور مخلص جمع ہو سکتے ہیں اور مومن و مخلص جمع ہو سکتے ہیں اس تقسیم کی ایسی مثال ہے جیسے نحاۃ نے کلمہ کی تقسیم کی ہے اسم فعل و حرف کی طرف پھر دوبارہ تقسیم کی ہے۔ مذکر و مونث کی طرف وعلیٰ ہذا۔ تو یہ اقسام باہم جمع ہو سکتی ہیں یہ تو جمہور مفسرین کے نتیجہ کا حاصل ہے اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں ایک ہی تقسیم ہے اور مقسم بھی واحد ہے۔ یعنی انسان مقسم ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ مومن و کافر پھر کافر کی دو قسمیں ہیں۔ مجاہر و منافق اور مومن کی دو قسمیں ہیں ایک طالب آخرت اور ایک طالب حق۔ پس کل چار قسمیں متبائن ہو گئیں۔ کافر مجاہر اور کافر غیر مجاہر اور مومن طالب آخرت اور مومن طلب حق بدوں التفات الی الآخرت (بدون اسکے کہ آخرت کا طالب ہو) فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ میں کافر مجاہر کا ذکر

ہے جو کہ دنیائے محضہ کا طالب ہے اور مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً الخ میں مومن طالب آخرت کا ذکر ہے اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ میں کافر غیر مجاہر یعنی منافق کا ذکر ہے اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ میں مومن طالب حق کا ذکر ہے جو محض طالب رضا ہے آخرت اور دنیا دونوں کی طرف ملتفت نہیں۔ (ماخوذ البدائع)

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

ترجمہ: ترجمہ: اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

تمنّی کا علاج

فرماتے ہیں عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ یعنی ممکن ہے تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے واسطے بہتر ہو اسی طرح ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور ممکن ہمارے اعتبار سے فرمایا یعنی تم اس بات کا احتمال رکھو آگے فرماتے ہیں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ کو (ہر خیر و شر کا) علم ہے اور تم نہیں جانتے۔ اس ترجمے کے سننے سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ آیت ہمارے ایک مرض کی اصلاح کر رہی ہے جس کو ہم بہت ہی ہلکا سمجھتے ہیں یعنی تمنّی ہماری نظر تو اس طرف جاتی نہیں لیکن آیت بتلا رہی ہے کہ ہم جو یہ کہا کرتے ہیں کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اور یوں ہوتا تو اچھا ہوتا یہ سب ناپسندیدہ بات ہے اور یہاں سے غلطی کو ظاہر فرما رہے ہیں کہ تم کو کیا خبر ممکن ہے کہ جس کو تم نے مضر سمجھا ہے وہ واقع میں تمہارے لئے نافع ہو اور جس کو تم نے نافع سمجھا ہے وہ واقع میں مضر ہو یہ تو محض احتمال عقلی کے طور پر فرمایا تھا آگے فرماتے ہیں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی شاید کسی کو یہ احتمال ہوتا کہ ممکن ہے وہی نافع ہو اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ جانتا ہے یعنی جو شخص خدا کا قائل ہوگا وہ صفت علم کا بھی قائل ہوگا اور کمال اس کا یہ ہے کہ کوئی اس کے برابر علم میں نہ ہو تو اپنے علم کے اثبات سے استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے جو کہ واقعی نفع وضرر کو جانتے ہیں اس کو واقع فرمایا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں تو ان کا واقع کرنا دلیل اس کی ہے کہ یہی بہتر تھا تو دوسرا احتمال بالکل قطع ہو گیا اور معلوم ہوا کہ تمہاری رائے غلط ہے اگر اس میں مصلحت ہوتی تو خدا تعالیٰ اس کو واقع فرماتے۔

ہماری غلطی پر تنبیہ

خدا تعالیٰ نے ہم کو ہماری ایک غلطی پر تنبیہ فرمائی اب دو باتیں دیکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ آیا ہم میں یہ غلطی ہے

یا نہیں سو اس کا ہم میں ہونا تو اس قدر ظاہر ہے کہ شاید کوئی قلب اس سے خالی ہو اور یہ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ تکوینیات سے گزر کر تشریعیات تک اس کی نوبت پہنچی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ احکام دو قسم کے ہیں ایک احکام تشریعیہ جیسے نماز روزہ کا فرض ہونا۔ چوری غصب جھوٹ تفاخر ریا بخل کا حرام ہونا۔ دوسرے احکام تکوینیہ جن کو حوادث کہتے ہیں جیسے مرنا جینا قحط طاعون یا اور کوئی وبا۔ مال کا ضائع ہو جانا آگ لگ جانا اور ان دونوں قسم کے امور کا صدور خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے تو ہم کو یہاں تک تمنی کا ہیضہ ہوا ہے کہ دونوں قسموں کے متعلق تمنائیں کرتے ہیں یعنی جس طرح یہ کہتے ہیں کہ فلانا اور جیتا تو اچھا ہوتا اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ روزہ فرض نہ ہوتا سود حرام نہ ہوتا تو خوب ہوتا تو فرق اتنا ہے کہ جو علم دین پڑھے لکھے ہیں وہ احکام تشریعیہ میں ایسی بیباکی نہیں کرتے اور جو آزاد و بیباک ہیں وہ دونوں میں ایسی تجویزیں کرتے ہیں چنانچہ ایک نوجوان نے تو یہاں تک نوبت پہنچائی کہ نماز کے متعلق یہ رائے ظاہر کی اسلام میں اگر نماز نہ ہوتی تو اسلام کی خوب ترقی ہوتی کیونکہ نماز سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں نعوذ باللہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بھی رائے دیتے ہیں۔

امور تشریعیہ و تکوینیہ

لفظ شیئا اس آیت میں عام ہے امور تشریعیہ اور امور تکوینیہ سب کو کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا اور تم اس کو ناپسند کر رہے ہو) ھو کی ضمیر یا تو قتال کی طرف راجع ہے جو کہ امر تکوین ہے یا کتابت قتال کی طرف جو کہ امر تشریعی ہے یا ترجیح بلا مرجح سے بچنے کے لئے عام کہا جائے دونوں کو مرجع قتال ہو باعتبار وجود تشریعی اور تکوینی کے اور بہتر یہی ہے کہ عام کہا جائے اور معنی عام کی تعلیل میں اس جملہ و عسی الخ کو کہا جائے۔

دعاء کو مشروع فرمانے میں حکمت

اصل مضمون یہ تھا کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج پیش آئے اس کو مصلحت سمجھے اور اس پر خدا کا شکر کرے خواہ بلائے ظاہری ہو خواہ بلائے باطنی ہو۔ یہ تھا بیان مرض تمنی کا جس میں اہل سلوک بھی کم و بیش مبتلا ہیں اس کی ممانعت اس حدیث میں ہے کہ ایاکم ولوفان لو یفتح عمل الشیطان ہم نے ہزاروں مرتبہ یہ آیت شریف پڑھی ہوگی لیکن آج جو بات اس سے سمجھ میں آئی وہ آج تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔

الحمدللہ اور ایک بڑی رحمت اس کے ساتھ یہ فرمائی ہے کہ طبیعت انسانی کا بھی لحاظ فرمایا یعنی تمنا خود بخود طبیعت سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کی تعدیل فرمادی وہ یہ کہ دعا کو مشروع فرمادیا کہ اگر کسی چیز کی تمنا پیدا ہو تو بجائے اس کے خدا تعالیٰ کو رائے دو وہ ارمان اس طرح نکالو کہ دعا کر لیا کرو کہ تمنا سے وہ بہتر ہے کیونکہ تمنا کے معنی تو خدا کو رائے دینا ہے کہ اس طرح کرنا مناسب تھا بخلاف دعا کے کہ وہ عرض ہے جناب باری میں اور ساتھ ہی اس پر رضا ہے کہ اگر یہ اس طرح نہ ہوگا تو میں اسی کو مصلحت سمجھونگا حاصل مضمون عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا الآیۃ کا یہ ہے کہ پس دعاء غبار نکالنے میں تو تمنی کے ہم پلہ ہے اور عرض میں اس کے خلاف مثلاً جب بیمار ہو تو صحت کی دعا کرو اسی طرح صبر کی دعا کرو تو اس سے غبار تو نکل جائے گا۔ جو بات پسند آئے کہہ لے اور حسرت نہیں ہوگی جیسے تمنی میں ہوتی ہے کیونکہ حسرت مافات پر ہوتی ہے۔

غرض دعا کو بھی مشروع فرمایا جیسا دوسرے نصوص میں ہے اور تمنی کو منع فرمایا جیسا اس آیت میں وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ الخ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جتنے احکام ہیں تکوینی یا تشریعی ان کے خلاف تمنا نہ کرے بلکہ ان پر صبر اور جو دل میں کوئی تمنا پیدا ہو بجائے اس کے دعا کرتا رہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

ترجمہ: یعنی لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں لوگوں کو بعض فائدے بھی ہیں اور وہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔

تفسیری نکات

خلاصہ آیت

اول بطور تمہید کے اس جزو آیت کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے خمر اور قمار کا حکم پوچھا تھا اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے ان میں منافع بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت تحریم خمر و میسر سے پہلے کی ہے اور اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن لفظوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ تسامح ہوا ہے اس لئے کہ باوجود لفظ اثم کبیر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا پس بظاہر یہ آیت بھی تحریم کے بعد ہی کی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے بعد والی آیت یعنی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ الخ (یعنی اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں) اس کی زیادہ تاکید ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت کو سن کر بعض لوگوں نے لفظ منافع پر نظر کر کے شراب کے ترک میں سستی کی ہو اور فیھما اثم کبیر (ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں) میں کچھ تاویل کر لی ہو مثلاً یہ کہ ان کو خود اثم نہیں فرمایا بلکہ متضمن اثم فرمایا ہے اس طرح سے کہ کبھی یہ مفضی الی المعاصی ہو جاتے ہیں تو جب ایسا انتظام کر لیا جائے کہ یہ احتمال نہ رہے تو جائز ہو گا جیسے قبیح لغیرہ کی بات ہوتی ہے مگر یہ تاویل بہت بعید ہے اس لئے نہایت شد و مد سے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا الخ نازل ہوئی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے قبل تحریم نہیں ہوئی تھی اور منافع للناس سے جواز پر تمسک نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کسی محرم شے میں منافع کے وجود سے اس کی اباحت پر استدلال نہیں ہو سکتا بلکہ منافع کا ذکر منشا شبہ کو رفع کرنے کے واسطے ہے یعنی اگرچہ ان دونوں میں منافع بھی ہیں چنانچہ خمر میں قوۃ غریزیہ اور میسر میں تکثیر مال بہ سہولت ہے لیکن مفاسد ان کے منافع سے زیادہ ہیں اس لئے حرام ہیں یہ حاصل ہے آیت کا۔ (ترجیح المفسدہ علی المصلحہ)

پاکیزہ طرز کلام

سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز کا جواب ہے یعنی لوگوں کو شراب اور جوئے کی حرمت میں یہ وسوسہ ہو سکتا تھا کہ ان میں منافع دنیویہ بہت ہیں اسی لئے ان کو حرام نہ کرنا چاہیے تو حق تعالیٰ اس شبہ کے اصل سے انکار نہیں فرماتے بلکہ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ واقعی ان میں لوگوں کے لئے نفع بھی ہے اور ایک ہی نفع نہیں بلکہ ہم صیغہ واحد کی بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں کہ ان میں بہت سے منافع ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان میں ایک گناہ بھی ہے۔

اس جگہ یہ بات قابل غور ہے کہ حق تعالیٰ نے منفعت کے بیان میں تو جمع کا صیغہ اختیار فرمایا یعنی منافع للناس اور مضرت کے بیان میں صیغہ واحد یعنی اثم۔ اگر یہ کلام بشر کا ہوتا تو مقابلہ کے لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ اثام ہوتا مگر حق تعالیٰ نے اس جگہ صیغہ واحد ہی اختیار فرمایا جس سے اس حقیقت پر متنبہ فرمانا منظور ہے۔ اگر کسی چیز میں ہزاروں منفعتیں ہوں مگر اس میں ایک گناہ بھی ہو یعنی ادنیٰ شائبہ ناراضی حق کا ہو تو وہ ہزاروں منفعتیں ایک گناہ کے سامنے ہیچ ہیں کیونکہ جس طرح خدا کی رضا خواہ ذرا ہی سی ہو بڑی دولت ہے چنانچہ ارشاد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ -- خدا کی ناراضی بھی بڑی وبال چیز ہے خواہ اس ناراضی کا سبب ایک ہی گناہ کیوں نہ ہو۔ اس لئے اس جگہ اثم بصیغہ واحد لایا گیا مگر اس کو کبیر کے ساتھ موصوف کر دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ شراب اور جوئے میں منافع تو بہت ہیں مگر ایک گناہ بھی ہے اور وہ ایک ہی گناہ اتنا بڑا ہے جس نے ان سب منافع کو گاؤ خورد کر دیا ہے اس لئے آگے منافع کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ نفع کا لفظ اختیار فرمایا۔ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کہ ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے۔ یہاں صیغہ واحد اختیار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ پہلے کلام سے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ ان منافع کے مقابلہ میں ایک گناہ بھی ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک من مٹھائی میں تولہ بھر زہر ملا ہوا ہو تو وہ ساری مٹھائی اس ایک تولہ زہر کی وجہ سے خاک میں مل جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ منافع ایک گناہ کی وجہ سے خاک میں مل گئے تو اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا جائے۔ اس لئے فرماتے ہیں وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ کسی چیز کے حرام ہونے اور گناہ ہونے کا مدار دنیا کے نفع و نقصان پر نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھے ہوئے ہیں اور بعض دفعہ زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس کام میں کیا حرج ہے یہ تو نفع کی چیز ہے۔ چنانچہ تعویذ اور عملیات میں بہت لوگ اسی دھوکا میں پڑے ہوئے ہیں کہ جس عمل سے کسی کو نفع ہوتا ہو وہ جائز ہے۔ خواہ اس میں شیاطین سے استعانت ہو یا کیسے ہی بے ہودہ کلمات استعمال کرنے پڑتے ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ شراب اور جوئے کی نسبت حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ان میں لوگوں کے لئے ایک نفع نہیں بلکہ بہت سے منافع ہیں مگر پھر بھی یہ حرام ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ خدا تعالیٰ ان کو پسند نہیں فرماتے' ان سے ناراض ہوتے ہیں اب یہ مسئلہ بالکل حل ہو گیا کہ حرمت کا مدار خدا تعالیٰ کی ناراضی پر ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

ترجمہ: (یعنی اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اس لئے بیان فرماتے ہیں تا کہ) دنیا و آخرت میں فکر کرو۔

گناہ میں مصلحت

میں کہتا ہوں کہ آج کل عقل پرستی کا بہت زور ہے لیکن افسوس ہے کہ اس عقل کو دین کے اندر صرف نہیں کیا جاتا آپ مصلحت کی وجہ سے ایک شے کو جائز کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ چونکہ اس میں یہ مصلحت مضر تھی اسی واسطے تو ضرورت ممانعت کی ہوئی کیونکہ جس میں کوئی مصلحت نہ ہوئی اس کے منع کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ منع ہمیشہ اسی امر کو کیا جاتا ہے کہ جس میں کچھ مصلحت بھی ہو جس کے سبب سے اس کے کرنے کی رغبت ہو مگر اس میں مفاسد دقیق ہوتے ہیں کہ ان مفاسد تک ہماری عقل نہیں پہنچتی پس گناہ ایسا ہی ہے کہ جس میں کوئی مصلحت باعث علی الفعل ہوتی ہے اور وقوع اس کا ہمیشہ اسی مصلحت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ امن کو تو ہر ذی ہوش شخص واجب الترک سمجھتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مصلحت گناہ کی منافی نہیں ہے چنانچہ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) میں اول بیان ہو چکا ہے کہ یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں نفع ضرور ہے لیکن نقصان زیادہ ہے باقی یہ کہ وہ نقصان کیا ہے تو اس کو اگر ہم نہ جانتے تب بھی ماننا جاننے پر موقوف نہ تھا دیکھو حکام جو قوانین مقرر کرتے ہیں تو قوانین کا علم تو ہر شخص کو ضروری ہے لیکن اس کی لم اور مصالح کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری نہیں پس حق تعالیٰ کا اجمالاً یہ فرما دینا کافی ہے کہ اس میں نقصان ہے باپ کا بیٹے کو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہم کو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ فلاں شے مضر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس مضرت کی وہ تفصیل بھی بیان کرے۔ پس خداوند جل جلالہ کو بطریق اولیٰ یہ حق حاصل ہے لیکن باوجود اس حق کے حاصل ہونے کے پھر بھی کچھ دینی و دنیوی مضرتیں خمر و میسر کی بیان فرما دیں چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (یعنی شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے آپس میں بغض اور عداوت واقع کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے) بہر حال وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) سے معلوم ہو گیا کہ گناہ میں مصلحت ہو سکتی ہے چنانچہ شراب کے اندر قوت اور یہ کہ شرابی سیر چشم ہو جاتا ہے۔ بخل جاتا رہتا ہے چنانچہ شعراء جاہلیت نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر بھی کیا ہے اور میسر میں اگر جیت ہو تب تو حصول مال اور اگر ہار ہو تو مال سے بے رغبتی ہو جانا پس گناہ میں بعض اوقات امر محمود کا منضم ہو جانا بعید نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ گناہ نہ رہے اسی طرح جی بھر کر گناہ کرنا اگر اس میں یہ مصلحت ہو بھی کہ وہ سبب توبہ اور اطاعت کا ہو جائے تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ حرام نہ ہو بلکہ گناہ حرام رہے گا۔

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ اگرچہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں مصلحت ہے لیکن چونکہ مفاسد بھی ہیں اسی لئے حرام ہے۔ (ترجیح المفسدہ ملحقہ مواعظ مفاسد گناہ)

تفکر فی الدنیا کی دو لطیف تفسیریں

یہاں تفکر فی الدنیا کی تاکید ہے اس پر یہ اشکال ظاہر میں ہوتا ہے کہ دنیا میں تفکر کی کیا ضرورت ہے بلکہ اس سے تو

فکر کو ہٹانا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کے اندر جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل دنیا کے لئے ہو اس کو مقصود بالذات سمجھ کر اور اگر مقصود بالذات نہ سمجھے تو وہ فکر بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے **طلب الحلال فریضة بعد الفریضة** (حلال روزی کا طلب کرنا فرضوں کے بعد ایک فرض)

دوسری تفسیر اس سے لطیف ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں تفکر کرو موازنہ کے لئے کہ ان میں کون قابل اختیار کرنے کے ہے اور کون قابل ترک ہے یعنی جو فکر ترک دنیا کے لئے ہو وہ مطلوب ہے اسی لئے اھل اللہ نے دنیا میں فکر کر کے اس کی حقیقت کو سمجھا ہے اس لئے انہیں دنیا سے سخت نفرت ہے۔

فکر فی الدنیا کی ایک عمدہ تفسیر

دنیا کی تکالیف اور دنیا کی لذات میں غور کرے کہ یہاں کی لذات سب ایک دن فنا ہو جائیں گی اور دنیا کی زندگی تکالیف سے بھری ہوئی ہے اور فکر آخرت سے اس کا عکس ثابت ہوگا' اس مجموعہ سے سوچنے سے دنیا کی بے قدری ہوگی اور آخرت کی طرف رغبت بڑھے گی جب دونوں کا موازنہ کرے گا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا لاشیء محض ہے اور اس مراقبہ سے دنیا کی تکالیف میں بھی کمی ہوگی کیونکہ جب سوچے گا کہ دنیا میں بالفرض اگر چہ تکالیف ہیں مگر ایک روز یہ فنا ہو جائے گی اور آخرت میں راحت ہی راحت ہے تو وہ تکالیف نہ معلوم ہوں گی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ: اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اُن کی مصلحت کی رعایت رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم اُن کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور اللہ مصلحت کے ضائع کرنیوالے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو جانتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم کو مصیبت میں ڈال دیتے اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

طریق اصلاح

چنانچہ اسی مقام پر دیکھئے۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ (آپ سے یتامی) کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ. آپ ان کے سوال کے جواب میں کہہ دیجئے حقیقی جواب تو آگے آئے گا۔ پوچھا تو واقعہ جزئیہ۔ اس کے جواب میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں۔ پوچھا ایک بتائیں سو کہ شاید ادب کی وجہ سے بار بار نہ پوچھ سکیں۔ اس لئے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں کہ اسے یاد رکھیں۔ وہ یہ ہے **اصلاح لھم خیر** (یعنی ان کے حال کی درستی کرنا) یہ ہے بڑی اچھی بات۔ آگے جواب ہے وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ.

(اگر تم ملا جلا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) غیر نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ حرج نہیں مگر یہ قاعدہ کلیہ پیش نظر رہے۔ اصلاح لھم۔ یہ کھانا ان کی مصلحت کے لئے ہو۔ اصلاح لکم۔ نہ ہو۔ یعنی تمہاری مصلحت کے لئے نہ ہو کیونکہ مخالطت میں دو مصلحتیں ہیں۔ ایک اپنی کہ اپنا کم ملایا ان کا زیادہ ملایا اور ان کی مصلحت ہے کہ یوں بچا ہوا بگڑتا ہے اور اب ملا جلا کر کھالو۔ اگلے وقت ان کی کم جنس سے لیں گے۔ یا خود اپنی ہی جنس میں ان کو شریک کرلیں گے۔ تو مخالطت کرو مگر ان کی مصلحت سے اپنی مصلحت سے نہیں تو فرماتے ہیں اس طور پر مخالطت کرلو کہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ واقعی اگر اتنی بھی مخالطت نہ ہوگی تو آپس میں یک جہتی نہ ہوگی اور وہ بھی غیر سمجھ کر الگ تھلگ رہیں گے۔ ان کی شفقت بھی ظاہر نہ ہوگی۔ بس دل میں حساب کتاب رہے کہ خود سمجھ رہے ہیں کہ یہ ان کی چیز ہے اور یہ ہماری ہے۔

اب ایک سوال باقی رہا تھا کہ نیت تو اصلاح کی ہے مگر اس طرح کرنے سے ممکن ہے کہ کچھ ان کے ہمارے ہاں صرف ہو جائے۔ شاید اس کا مواخذہ ہو۔ اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے۔

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (یعنی خدا جانتا ہے مفسد اور مصلح کو)

مطلب یہ کہ کوڑی کوڑی کا حساب نہیں دیکھتے صرف نیت دیکھتے ہیں اگر نیت اصلاح کی ہے اور ان کا کچھ اپنے ذمہ صرف ہو گیا تو وہ معاف ہے نیت تو کھلانے کی ہے اگر اس پر بھی کچھ کھا لیا گیا تو وہ ہمارے یہاں معاف ہے اور اس قسم کے کھانے کی اجازت ہے۔

اللہ اکبر! کس قدر رعایتیں ہیں ایسی تعلیم تو کسی بڑے سے بڑے حکیم کی بھی نہیں ہو سکتی حق یہ ہے کہ ذرا سے غور میں ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ واقعات پیش آنے کے بعد ان احکام کی اچھی طرح قدر ہوتی ہے جیسے ایک اور مقام پر والدین کے حقوق کے ضمن میں فرمایا ہے لَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ (یعنی انہیں "ہوں" بھی نہ کہو) وَلَا تَنْهَرْهُمَا انہیں مت جھڑکو الی قولہ تعالیٰ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا یعنی ان کے ساتھ کرم کرو۔ تواضع سے پیش آؤ ان کے حق میں دعا کرو۔

جامعیت کلام الٰہی

چنانچہ اس مقام میں بھی آگے ارشاد ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَاَعْنَتَكُمْ۔ اور خدا کو منظور ہوتا تو تمہیں خوب مشقت میں ڈالتے یعنی مخالطت کی اجازت ہی نہ دیتے اور حفاظت اموال کا امر فرماتے تو ظاہر ہے بے انتہا مشقت ہوتی اس میں دو دعوے ہیں ایک تو یہ کہ اسے مشقت میں نہیں ڈالا آگے دونوں کی دلیل علی الترتیب فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۝ (بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے، غالب ہے اس لئے کہ مشقت ڈالنے کی قدرت ہے حکمت والا ہے دانا ہے اس لئے کہ مشقت میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا)

یہ ان آیات کا ترجمہ ہے اور اس ترجمہ سے مفصل مضمون معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس وقت مجھے قل اصلاح لھم خیر کے متعلق بیان کرنا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں اصلاح جو مبتداء ہے نکرہ ہے اور خیر جو خبر ہے وہ بھی نکرہ ہے مگر خبر میں

اصل نکارت ہی ہے اور مبتداء میں اصل تعریف ہے کیونکہ مثلاً رجل جاء نی ایک آدمی میرے پاس آیا کہنے سے مخاطب کو کوئی نفع نہیں ہوتا تاوقتیکہ کہ رجل کی تعریف یا تخصیص نہ کر دی جاوے اس لئے مبتداء کا معرفہ ہونا یا کسی صفت یا ظرف کے ساتھ مقید ہو کر اس میں تخصیص ہونا ضروری ہے یہاں پر اصلاح اگر چہ نکرہ ہے مگر لھم کی قید نے اسے مبتداء بننے کے قابل کر دیا اور یہاں معرفہ بھی فرما سکتے تھے یعنی اصلاح لھم کی بجائے اصلاحھم مگر نکرہ ہی لائے۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اصلاح کی تنوین تقلیل کی ہے کہ اگر تھوڑی بھی اصلاح ہو تب ہی خیر ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ اصلاح کتنا بڑا حق ہے اور اس کے لئے کس قدر اہتمام کی ضرورت ہے آگے فرماتے ہیں خیر یہ افعل التفصیل کا صیغہ ہے مبتداء میں تقلیل اور خبر میں تکثیر سبحان اللہ! کیا رعایت ہے یعنی تھوڑی بھی اصلاح بہت بہتر ہے اور اس کا اتنا اجر ہے کہ ہزاروں عبادتوں سے بڑھ کر ہے سبحان اللہ!

یوں تو یتامی پر توجہ کے لئے بہت مضامین ہیں مگر اس چھوٹے سے جملہ کی نظیر نہیں اور کوئی نظیر کہاں سے لائے۔ نہ وہ خدا ہوگا نہ ایسے جملے لا سکے گا۔ واقعی قرآن عجیب چیز ہے

علوم قرآن

یہ ہیں قرآن کے علوم (اصلاح لھم خیر) کیا عجیب وغریب جملہ ہے اور کتنا بڑا اہتمام ہے کہ اصلاح کو نکرہ لائے جس سے اصلاح کی تعیین نہ رہی تو اصلاح کی جونسی قسم چھوٹی ہو یا بڑی' خواہ جسمانی' خواہ روحانی سب کی خیریت حق تعالیٰ نے بیان فرمادی ہے۔ اصلاح لھم بالکل عام ہے اس میں نہ قید ہے بدن کی نہ روح کی بلکہ یہ دونوں کی جامع ہے۔ سبحان اللہ! جیسے وہ خود جمیع صفات کمالیہ کے جامع ہیں ویسا ہی ان کا کلام بھی کیا جامع ہے اس لئے نام ہی نہیں لیا کسی خاص اصلاح کا۔

اب اصلاحات کی فہرست سنئے ان اصلاحات کے ایک بدن کی ہے کہ انہیں کھلایا جاوے پلایا جاوے سردی گرمی سے بچایا جاوے مگر اس کھلانے پلانے کے آداب کا خیال رکھا جاوے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا

میں اسی کھلانے پلانے کا ادب بیان کیا گیا ہے بعض ادب تو علی حبه میں ہیں اس طرح سے کہ اس کی ضمیر میں کئی احتمال ہیں یا تو اس کا مرجع حق تعالیٰ ہے تو مطلب یہ ہے کہ کیوں کھلاتے ہیں؟ حق تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کھلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ کھلانے پلانے میں ناموری یا تفاخر مقصود نہیں ہوتا بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہے سو یہ بھی ادب ہے جس کا حاصل اخلاق ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مرجع الطعام ہو اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ کھانا کھلاتے ہیں باوجود اس کھانے کے محبوب ومرغوب ہونے کے حاصل یہ ہے کہ بچا کھچا گرا پڑا جو بالکل اپنے کام نہ آسکے نہیں کھلاتے بلکہ خود کو بھی مرغوب ہے اور اس کے حاجت مند بھی ہیں وہ کھلاتے ہیں یہ نہیں کہ کھانا خراب ہو گیا لاؤ یتیم کو دے دیں۔ مؤذن کو دے دیں۔

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان کو وہ کھانا دینا چاہیے جسے دینے کو جی بھی چاہتا ہو یہ نہیں کہ جو لامحالہ پھینکنا پڑے گا وہ

دے دیا یہ دونوں احتمال تو منقول تھے۔

ایک تیسرا احتمال جو میری سمجھ میں آیا ہے اور کہیں منقول نہیں دیکھا یہ ہے کہ جملہ کی ترتیب یہ ہے سب سے پہلے فعل اور اس کے بعد فاعل پھر مفعول بہ اور اس کے بعد ظرف وغیرہ ہوتا ہے یہاں الطعام کو تو جو مفعول بہ اول ہے موافق قاعدہ کے مقدم کیا اس کے بعد علی حبہ لائے پھر مسکینا و یتیما و اسیرا کو لائے جو معطوف علیہ سب مل کر مفعول بہ ثانی ہے اور اس سے وجہ اسے علی حبہ پر لفظاً نہ سہی مگر معناً تقدم حاصل ہے اور اب علی حبہ کی ضمیر بہ تاویل کل واحد کے ان کی طرف پھر سکتی ہے اور اب اضمار قبل الذکر کا اشکال بھی نہیں رہا کیونکہ اضمار قبل الذکر وہ ناجائز ہے جو لفظاً اور رتبۃً ہو یہاں اگرچہ لفظاً ہے مگر رتبۃ اضمار قبل الذکر نہیں ہے اب معنی یہ ہوئے کہ ان کو جو کھلاتے ہیں ان کی محبت کر کے کھلاتے ہیں تو تیسرا ادب یہ ہوا کہ انہیں محبت وشفقت سے کھلائے۔

غرض پہلا ادب یہ ہوا کہ خدا کی محبت کی وجہ سے کھلاؤ ناموری شہرت اور تفاخر کی نیت سے نہ کھلاؤ دوسرا یہ ہوا کہ عمدہ کھانا کھلاؤ۔ تیسرا ادب یہ ہوا کہ محبت اور شفقت سے کھلاؤ۔

یہ نہیں کہ کھلا پلا کے اور دے کر ان سے شکریہ کے متوقع ہو۔ اے خدمت کرنے والو! مصارف خیر میں رقم دے کر کسی سے متوقع شکریہ کے مت ہو۔ اگر تم نے توقع شکریہ کی رکھی تو یاد رکھو اس کا حق ادا نہ کیا کیونکہ دینے والے کا ادب تو یہ ہے۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (کہ ہم جو کچھ دیتے ہیں تم سے اس کا اجر اور شکریہ نہیں چاہتے)

اور اے مہتممان یتیم خانہ ومدارس وانجمن تم بھی کسی کا شکریہ ادا نہ کرو کیونکہ شکریہ تو اسے ادا کرنا چاہیے جس کے ساتھ احسان کیا جائے۔

من لم یشکر الناس لم یشکر الله

کا مطلب یہی ہے کہ اگر ہو سکے تو احسان کی مکافات کرو۔ اگر استطاعت نہ ہو مکافات دعا اور تعریف سے کر دو اور یہی شکریہ ہے مگر یہ شکریہ خواہ مکافات کے طور پر ہو یا دعا وتعریف کے طور پر اس شخص کے ذمہ ہے جس کے ساتھ احسان کیا جائے بلکہ تمہارے شکریہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں دیا ہے اس سے ایک فہیم شخص کی حوصلہ افزائی کے بدلے اسے بدظنی کا موقع مل سکتا ہے کہ شکریہ ادا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے بلکہ بجائے آپ کے انہیں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ ایک کام میں جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں مال کا موقع پر صرف کرنا حساب کتاب کو مرتب کرنا جھگڑے اور دشواری کے کام ہیں جنہیں بجائے ان کے آپ نے اپنا ذمہ لیا ہے اس لئے آپ کا ممنون ہونا چاہیے نہ یہ کہ آپ ان کا الٹا شکریہ ادا کریں۔ (اصلاح الیتامی)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

ترجمہ: کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فرمادیا کہ مرجاؤ پھران کو جلا دیا بے شک اللہ تعالیٰ بڑے فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

تفسیری نکات

شان نزول

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں سنی جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے یہ استفہام تعجیب کے لئے ہے کہ قصہ بہت عجیب ہے چنانچہ ہمارے محاورات میں بھی ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں خبر بھی ہے آج ایسا ہو گیا اس سوال واستفہام سے محض تعجب دلانا مقصود ہوتا ہے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ قصہ بنی اسرائیل کی ایک بستی کا ہے جہاں طاعون ہوا تھا جس سے گھبرا کر لوگ بھاگ گئے مگر حق تعالیٰ نے حذر الموت (موت سے ڈر کر) فرمایا ہے حذر الطاعون (طاعون سے ڈر کر) نہیں فرمایا کیونکہ خوف تو اصل موت ہی کا ہے اور طاعون کا خوف بھی اسی لئے ہے کہ وہ اسباب موت سے ہے۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا حق تعالیٰ نے ان سب سے کہا مرجاؤ سب مر گئے موت ہی سے بھاگے تھے اور موت ہی نے پکڑ لیا۔ واقعی خدا تعالیٰ کے سوا کسی جگہ پناہ نہیں مل سکتی بھاگنے سے کیا ہوتا ہے بلکہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ طاعون سے بھاگنے والے بہت کم بچتے ہیں وہ دوسری جگہ جا کر بھی مبتلائے طاعون ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ دوسروں کی نظروں میں ذلیل بھی ہوتے ہیں دوسری بستی والے ان سے ملنے ملانے سے پرہیز کرتے ہیں پھر ذلت گوارہ کرنے پر موت سے وہاں بھی بچاؤ نہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گر گریزی برامید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

(اگر کچھ راحت کی امید پر بھاگے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بغیر دوڑ دھوپ کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے آرام نہیں ہے)

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ یعنی پھر حق تعالیٰ نے ان کو دفعۃً زندہ کر دیا بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوئے ایک تو ان سب کا دفعۃً مرنا عجیب تھا پھر سب کا دفعۃً زندہ ہو جانا اس سے بڑھ کر عجیب ہوا کیونکہ موت کے لئے

تو اہل طبعیات ظاہر میں کوئی سبب تراش بھی سکتے تھے مثلاً یہی کہ طاعون کی جگہ سے آ رہے تھے وہاں کب آب وہوا اثر کر چکی تھی اس لئے مرگئے مگر زندہ ہونے کے لئے کون سا سبب نکالا جائے گا اور اگر اس کا بھی کوئی سبب ہوتا تو لوگ اس کو بھی اختیار کرتے اور اگر کسی کو دعویٰ ہو کہ اس کا بھی کوئی طبعی سبب تھا تو میں ان سے کہتا ہوں کہ ذرا مہربانی کر کے آج کل بھی اس سے کام لے کر دکھا دیجئے اور حقیقت میں تو ان کی موت بھی بلا سبب ظاہری تھی کیونکہ تبدیل آب وہوا کو اور طاعون کی جگہ سے چلے جانے کو اطبا یا ڈاکٹر تو سبب موت کہہ نہیں سکتے بلکہ وہ اس کو سبب حیات بتلاتے ہیں رہا اثر سابق سو اول تو موثر سے بعد میں اس کے اثر کو ضعیف ہو جانا چاہئے نہ کہ قوی۔ دوسرے اتنی بڑی جماعت میں ایک وقت میں اور ایک درجہ میں اثر ہونا یہ خود قانون طبعی کے خلاف ہے پس واقع میں زندگی اور موت سب اللہ کے قبضہ میں ہے۔

سب کا دفعۃً مرجانا اور دفعۃً زندہ ہو جانا دونوں واقعے عجیب اور خلاف عادت ہی تھے جن سے حق تعالیٰ کو اس امر کا اظہار مقصود تھا کہ احیا واماتت ہمارے قبضہ میں ہے کہ خلاف مقتضاء اسباب بھی واقع کر سکتے ہیں فرار سے کچھ نہیں ہوتا اور پہلی امتوں میں ایسے ایسے عجائبات بہت ہوتے تھے آج کل کھلی کھلی نشانیاں ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ اب تو جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے درجہ میں ہوتا ہے کیونکہ کھلم کھلا واقعات کے بعد انکار کرنے پر عذاب بھی بہت سخت ہوتا تھا اور اس امت پر رحمت زیادہ ہے اس لئے اب جو کچھ نشانات ظاہر ہوتے ہیں اسباب کے پردہ میں ہوتے ہیں اس سے عدم تذکیر پر عذاب بھی کم ہوتا ہے دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس امت کے کفار پر رحمت ہے کہ پہلی امتوں کے کفار کی طرح ان پر سخت عذاب نہیں آتا اسکے بعد فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت فضل فرماتے ہیں لیکن اکثر شکر نہیں کرتے) یہاں مفسرین نے الناس کو عام لیا ہے اور یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ لوگوں پر بہت فضل کرنے والے ہیں کہ ایسے ایسے عجائبات وواقعات سے ان کو ہدایت فرماتے ہیں یا یہ کہ قہر کے بعد لطف بھی بے انتہا ہوتا ہے تو فضل سے مراد یہ لطف شامل ہو جاوے گا مگر میرے ذوق میں الناس سے یہاں مراد امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ سنا کر یہ مضمون حق تعالیٰ نے ہم کو سنایا ہے کہ تم پر اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ پہلے لوگوں کے قصے سنا کر تم کو عبرت دیتے ہیں یہ نہیں کیا کہ تم کو معذور کر کے دوسروں کو عبرت دیں۔

طاعون سے بھاگنے کے احکام

حدیث شریف میں آتا ہے الطاعون من اعداء کم الجن۔ (طاعون تمہارے دشمن جنوں کی ایذا اور طعن سے ہے) مگر قتال میں مدافعت بالمثل ہے اور اس کی اجازت بھی ہے بلکہ امر ہے اور یہاں اس مدافعت کی کوئی صورۃ نہیں کیونکہ وخز اور واخز کا ہم کو ادراک ہی نہیں ہوتا ہاں مدافعت بالعلاج کی اجازت ہے کہ دوا دارو کرو۔ طبی تدابیر کا استعمال کرو۔ یہ تو مشابہت حقیقت میں ہے دوسری مشابہت طاعون کو قتال سے کہ فرع ہے پہلی مشابہت کی وہ مشابہت حکم میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح فرار من الزحف (میدان جنگ سے بھاگنا) حرام ہے اسی طرح طاعون سے بھاگنا بھی حرام ہے اور حدیث شریف فرار من الطاعون کو فرار من الزحف (میدان جنگ سے بھاگنا) حرام ہے اسی طرح طاعون سے بھاگنا بھی حرام ہے اور حدیث شریف فرار من الطاعون کو فرار من الزحف (میدان جنگ سے

بھاگنا) کے مثل قرار دیا گیا ہے اور یہ تو فعل قبیح نقلی ہے پھر طاعون سے بھاگنا عقلاً بھی قبیح ہے کیونکہ مفید تو ہے نہیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ بھاگنے والوں کی موت بھی طاعون ہی میں ہوتی ہے اور اس کے علاوہ اس میں ذلت بھی ہے جہاں یہ لوگ جاتے ہیں وہاں کے باشندے ان سے پرہیز بلکہ نفرت و وحشت کرتے ہیں اور کہتے ہیں ان سے دور رہو یہ طاعون کی جگہ سے آئے ہیں اور مان بھی لو کہ بھاگنا مفید ہے لیکن اخیر بات یہ ہے کہ جان حق تعالیٰ کی ہے جہاں جس طرح حکم ہو ہم کو اس کی تعمیل ضروری ہے۔ کہیں حق تعالیٰ نے احتیاط کی اجازت دی ہے اور یہاں یہی حکم ہے کہ اس طریقہ سے احتیاط نہ کرو جیسے فوج میں تم خود کہتے ہو کہ بھاگنا قانوناً جرم ہے حالانکہ وہ بھی احتیاط ہی ہے یہ اہل فلسفہ کا منہ بند کرنے کے لئے جواب ہے کہ وہ اس حکم عدم فرار پر عقلی اعتراض کیا کرتے ہیں البتہ چونکہ مسئلہ فرعی ہے اعتقادی اور اصولی نہیں اس لئے اس میں محل فرار کی تعیین میں اجتہاد سے اختلاف کی گنجائش ہوگئی ہے اکثر علماء اس حکم کو علت خاصہ کے ساتھ معلل کرتے ہیں پھر ان میں سے بعض نے تو یہ کہا ہے فرار فی نفسہ حرام نہیں بلکہ خلل فی الاعتقاد کی وجہ سے حرام ہے یعنی جس کا یہ اعتقاد نہ ہو کہ یہاں سے بھاگ کر طاعون سے بچ جاؤں گا اور عدم فرار سے ہلاک ہو جاؤں گا اس کو بھاگنا جائز نہیں اور جس کا یہ اعتقاد ہو اس کو چلا جانا جائز ہے مگر اول تو حدیث شریف میں جو اس فرار کو فرار من الزحف سے تشبیہ دی گئی ہے وہ اس تعلیل سے آبی ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ فرار من الزحف میں بھی یہی تفصیل ہو دوسرے یہ کہ اس اعتقاد سے تو ہر مرض اور ہر بلا سے فرار حرام ہے طاعون ہی کی کیا تخصیص ہے حالانکہ حدیث سے صریح تخصیص مفہوم ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ جس کا اعتقاد درست ہوگا وہ بھاگے گا ہی کیوں بھاگے گا تو وہی جسکا اعتقاد کمزور ہوگا تو تفصیل بھی بے معنی ٹھہرتی ہے اور بعض نے اس ممانعت کی علت یہ بتلائی ہے کہ بھاگنے کی صورت میں پیچھے رہنے والوں کو تکلیف ہوگی اس علت کی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ اگر سب کے سب بھاگ جائیں تو جائز ہے اور انفراداً بھاگنا حرام ہے اور ان لوگوں نے ایک واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لشکر ایک مقام میں فروکش تھا وہاں طاعون شروع ہو گیا اور حضرت عمرؓ نے لشکر کو وہاں سے منتقل ہونے کا امر فرمایا مگر یہ علت بھی اسی شبہ سے مخدوش ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ جہاد میں بھی یہی تفصیل کر کے سب کا بھاگ جانا جائز ہو بعض کا ناجائز ہو اسی طرح یہ استدلال بھی تام نہیں کیونکہ وہ مقام لشکر مسکن نہ تھا عارضی قیام گاہ تھی اور فرار مسکن سے حرام ہے نہ کہ عارضی قیام گاہ سے مثلاً کوئی شخص مسافر ہو کر کسی مقام پر جائے اور طاعون شروع ہو جائے تو وہاں پر رفع طاعون تک قیام کرنا اس پر واجب نہیں دوسرے یہ کہ کیا معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے طاعون کی وجہ سے ان کو انتقال کا حکم دیا ممکن ہے کسی دوسری وجہ سے حکم دیا ہو کیونکہ لشکر تو ہوتا ہی ہے تبدل و تفرج کے لئے اس لئے استدلال تام نہیں راجح اور صحیح یہی ہے کہ ان علل کے حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ اقرب العلل وہ ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ چونکہ اس میں کفار جن سے مقابلہ ہے اس لئے فرار ناجائز ہے البتہ اتنی گنجائش ہے کہ جس شہر میں طاعون ہو وہاں بستی سے نکل کر فناء شہر میں آ پڑیں۔ ہمارے اکابر نے بھی اتنی اجازت دی ہے گو یہ اجازت بھی اجتہادی ہے اس میں بھی اختلاف رائے کی گنجائش ہے مگر ظاہر اس کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں اور اس کی نظیر یہ ہے کہ جیسے لشکر اسلام کا خرگاہ اس میدان جنگ میں بدل دیا جاوے تو یہ فرار نہیں ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بلاد مع فناء بقعہ واحدہ ہے اس کے ہر جزو میں رہنا اس بقعہ ہی میں رہنا ہے۔

قرض حسن

آ گے فرماتے ہیں مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے یہاں قرض حسن سے وہ معنی مرادنہیں جو عوام میں مشہور ہیں۔ عوام بے سودی قرض کو قرض حسن کہتے ہیں جس میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا دیا تھا بلکہ قرض حسن سے مراد وہ ہے کہ خلوص محبت کے ساتھ طوع ورغبت سے دے پھر اس کا معاوضہ مساوی نہ ملے گا بلکہ بہت زیادہ ملے گا جیسا کہ ابھی آگے آتا ہے تو مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں تو قرض حسن قرض بلا زیادت ہے اور خالق کے ساتھ معاملہ کرنے میں قرض حسن قرض مع الزیادت ہے یہاں ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ یہ کہ اس آیت کے ربط میں لوگوں کو اشکال پیش آیا ہے کہ ماقبل سے اس کا کیا ربط ہے مشہور یہ ہے کہ اس آیت کے ربط میں لوگوں کو اشکال پیش آیا ہے کہ ماقبل سے اس کا کیا ربط ہے مشہور یہ ہے کہ اوپر بذل نفس کا ذکر تھا یہاں بذل مال کا ذکر ہے اور قتال میں دونوں کی ضرورت ہوتی ہے نیز تمہیو للقتال میں اصلاح ہے نفس کی اور اس اصلاح نفس میں بذل مال کو بھی بڑا دخل ہے بلکہ بعض لوگ نفس کے لئے تو تیار ہوتے ہیں مگر بذل مال ان پر گراں ہوتا ہے چنانچہ اسی مذاق کے ایک شخص کا قول ہے

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ور زر طلبی سخن دریں ست

(اگر جان مانگو مضائقہ نہیں اور اگر مال مانگو اس میں کلام ہے)

ممکن ہے شاعر کا خود یہ مذاق نہ ہو اس نے دوسروں کا مذاق بیان کیا ہو تو بہت لوگ اس مذاق کے بھی ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے مجاہدہ بذل النفس کے ساتھ ہر جگہ مجاہدہ بذل المال کا بھی ذکر فرمایا ہے تا کہ اصلاح کامل ہو جائے اور نسخہ مکمل ہو جائے یہ ربط بہت عمدہ ہے مگر اس کی ضرورت اسی وقت ہے جبکہ قرض کا استعمال بذل نفس میں نہ ہو سکتا ہو نہ حقیقۃً نہ مجازاً اور نہ اس کو بذل مال کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں میں اس کو عام کہوں گا اور اس صورت میں بذل نفس سے بے تکلف ربط ہو جائے گا کیونکہ قرض میں بذل نفس بھی داخل رہے گا خواہ حقیقۃً خواہ مجازاً مطلب یہ ہوگا کہ اوپر بذل نفس کی ترغیب بصورت امر تھی یہاں دوسرے عنوان سے اسی کی ترغیب ہے کہ تم اپنی جان اللہ تعالیٰ کو ادھار ہی دے دو پھر تم کو ہی مع الزیادت واپس دیدی جائے گی مگر میں اس تفسیر پر اس لئے جرأت نہیں کرتا بلکہ صرف احتمالاً اس توجیہ کو بیان کر رہا ہوں کہ مجھے لغت یا محاورہ کی تحقیق نہیں کہ قرض کا استعمال بدل نفس میں ہو سکتا ہے یا نہیں۔

اَضْعَافًا كَثِیْرَةً کا مفہوم

فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً۔ یعنی پھر اللہ اس قرض کو بڑھا کر ادا کریں گے دو گنے چوگنے کر کے دیں گے دوسری آیت سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ سات سو تک بڑھائیں گے مگر اس آیت میں بقرینہ سبب نزول اَضْعَافًا كَثِیْرَةً (بڑھا چڑھا کر) سے سات سو سے بھی زیادہ مراد ہے کیونکہ لباب النقول میں اس آیت کے تحت میں ایک حدیث لکھی ہے کہ

جب آیت مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانے کی حالت جس سے سات بالیں جمیں اور ہر بالی کے اندر سو دانہ ہوں) نازل ہوئی جس میں سات سو تک تضاعف کا ذکر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رب زدنی۔ ہمیں اس سے بھی زیادہ دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (اور کون شخص ہے کہ اللہ کو دے قرض کے طور پر قرض دینا اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت حصے کو دیوے) معلوم ہوا اس آیت میں سات سو سے زائد تضاعف کا ذکر ہے اس بناء پر کم از کم سات سو سے دو گنا تو ہوگا اضعاف کی جمعیت اور اس کے اتصاف بالکثرت پر نظر کی جاوے تو پھر کچھ حد نہیں رہتی۔ اور ایک حدیث سے تو صریح معلوم ہوتا ہے کہ تضاعف فوق المتعارف ہے وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے راستہ میں ایک چھوارہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے یمین میں لے کر اس کو پروان فرماتے ہیں یہاں تک کہ وہ جبل احد سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے تو اب خیال کیجئے جبل احد میں اگر تمر کے مساوی حصے فرض کئے جاویں تو کتنے اجزاء نکل سکتے ہیں ان کا کیا عدد ہوگا پھر اگر وہ حصے تمر کے مساوی حصے فرض کئے جائیں تو اور زیادہ عدد بڑھ جاوے گا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ احد سے بھی زیادہ ہوگا تو معلوم ہوا کہ تضاعف کی کوئی حد نہیں بلکہ لاالی النہایۃ ہے مگر یہ لاتناہی تناہی متعارف ہے لاتناہی عقلی نہیں پھر اگر قرض کو بذل مال کے ساتھ خاص کیا جائے تب تو تضاعف میں کوئی اشکال نہیں اور اگر بذل نفس کے لئے بھی عام کیا جائے تو وہاں تضاعف کی کیا صورت ہے کیا ایک جان کی ہزار جانیں ہو جائیں اول تو قدرت حق سے یہ بھی بعید نہیں کہ اس پر مجھے مولانا کا شعر یاد آتا ہے

نیم جان بستاند و صد جاں دہد انچہ درو ہمت نیاید آں دہد

(ضعیف وحقیر اور فانی جان لیتے ہیں جان باقی دیتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان میں نہیں آسکتا وہ دیتے ہیں)

صد جان دہد (سو جانیں دیتے ہیں) کے کیا معنی ہیں۔ بعض نے تو کہا ہے کہ جان تو ایک ہوگی مگر قوت سو کے برابر ہو گی مگر صوفیہ اس سے آگے بڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں اگر حقیقۃً ایک جان سو جان ہو جائیں تو یہ بھی بعید نہیں کیونکہ وہ دنیا میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر آخرت میں اس کا وقوع مستبعد کیوں ہے۔ حضرت قضیب البان کا قصہ ہے کہ کسی نے ان کے متعلق کسی امر منکر کی قاضی شہر کو اطلاع دی وہ درہ لے کر تعزیر کی نیت سے چلے وہ سامنے اس طرح نمودار ہوئے کہ بجائے ایک قضیب البان کے سو قضیب البان قاضی کے سامنے آگئے اور کہا ان میں سے ایک کو پکڑ لو جو تمہارا ملزم ہے۔ قاضی صاحب یہ کرامت دیکھ کر معتقد ہو گئے تو وہاں سچ مچ ایک جان کی سو جان اور ایک جسم کے سو جسم ہو گئے تھے۔

وهو العلی العظيم (البقره) اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے

ملفوظ فرمایا کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد کے نام کو بجائے مملوک علی کے مملوک العلی

یعنی لام کے ساتھ لکھا ہے کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام پر الف لام نہیں داخل کیا جاتا۔ گو علی اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے لیکن بلا الف لام داخل کیے اسکا ایہام تھا کہ لفظ علی کو بجائے اللہ تعالیٰ کے نام کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام سمجھ لیا جاتا۔ اسی ایہام سے بچنے کے لئے الف لام داخل کر دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا جو نام علی ہے وہ الف لام کے ساتھ بھی مستعمل ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا خود ارشاد ہے وھو العلی العظیم نیز بلا الف لام بھی مستعمل ہے جیسے اس آیت میں انه علی حکیم لیکن لفظ علی جو حضرت علی کا نام ہے۔ وہ ہمیشہ بلا الف لام ہی کے ہوتا ہے۔ اس لئے الف لام داخل کرنے کے بعد اسکا اشتباہ ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ اللہ کا نام نہیں ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۲ ص ۲۰)

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

ترجمہ: سو جو شخص کہ شیطان کے ساتھ کفر کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں (ہو سکتی) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اور) خوب جاننے والے ہیں۔

تفسیری نکات

کفر محمود

معلوم ہوا کہ ہر کفر مذموم نہیں ہے بلکہ ایک کفر محمود بھی ہے یعنی کفر بالطاغوت (شیطان کے ساتھ کفر کرنا) تو کافر بھی بایں معنی محمود ہے اور صوفیہ کی اصلاح میں بھی کافر کے معنی اسی کے قریب ہیں کیونکہ وہ فانی کو کافر کہتے ہیں جو غیر حق سے نظر قطع کر چکا ہو تو اس کا حاصل بھی وہی ہے جو کافر بالطاغوت کا حاصل ہے کیونکہ صوفیہ کے نزدیک ہر غیر حق طاغوت ہے جس کو وہ صنم اور بت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسلمان ان کی اصلاح میں باقی کو کہتے ہیں اور کفر و اسلام فنا و بقا کو کہتے ہیں اس معنی کر حضرت خسرو فرماتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمان در کار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں عشق میں فانی ہوں مجھ کو بقا کی خواہش نہیں ہے میری ہر رگ تار ہو گئی ہے زنار کی ضرورت نہیں ہے)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾

ترجمہ: اے مخاطب تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود) کے بارے میں جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے کہنے لگا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روز کے روز) مشرق سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال دے اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن پایا) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ پر چلنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیری نکات

نمرود کی کج فہمی

اسی طرح نمرود بھی منکر صانع تھا۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کیا تھا کہ تم جو خدا کی ہستی کے مدعی ہو بتلاؤ خدا کیسا ہے قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب ایسا ہے کہ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ (یعنی مارنا اور جلانا اس کے خاص کمالات میں سے ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا اور عالم میں ان دونوں فعلوں کا وقوع مشاہد ہے پس خدا کا وجود بھی ضروری التسلیم ہے) وہ کوڑھ مغز جلانے اور مارنے کی حقیقت کو تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں کر سکتا ہوں یہ کوئی خدا کی خاص صفت نہیں جس کے وجود سے خدا کا وجود تسلیم کرنا لازم آ جائے کیونکہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جس واجب القتل کو چاہوں چھوڑ دوں یہ جلانا ہے پھر جیل خانہ میں سے دو واجب القتل قیدیوں کو بلا کر ایک کو رہا کر دیا اور ایک کو مار ڈالا۔ ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی بھدی عقل کا ہے اسے جلانے اور مارنے کی حقیقت بھی معلوم نہیں حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈالے نہ یہ کہ جاندار کو چھوڑ دے اسی طرح مارنا یہ ہے کہ زندہ کی جان اپنے اختیار سے نکالے اور گردن کاٹنے میں قاتل کے اختیار سے جان نہیں نکلتی اس کا کام تو صرف گردن کاٹنا ہے۔ اس کے بعد بدوں اس کے اختیار کے جان نکلتی ہے ورنہ پھر یہ بھی اختیار ہونا چاہیے کہ گردن الگ کر دے اور جان نہ نکلنے دے اور یہ گفتگو حضرت ابراہیم نے اس لئے نہ چھیڑی کہ قرائن سے معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھے گا نہیں یا سمجھ بھی گیا تو

تسلیم نہ کرے گا اور خواہ مخواہ اس میں الجھے گا اس ضرورت سے دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو (اگر بزعم خود خالق ہے تو ایک ہی دن) مغرب سے نکال کر دکھلا دے۔

نمرود کی مرعوبیت

فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ اس پر وہ کافر ان کا منہ تکنے لگا اور کچھ جواب بن نہ آیا پھر اس نے بھی وہی کیا جو فرعون نے کیا تھا کہ سلطنت کے زور سے کام لینے لگا اور حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈلوا دیا جس کی گزند سے خدا تعالیٰ نے ان کو بچالیا اور آگ کا مطلق اثر نہ ہوا اس جگہ دو سوال وارد ہوتے ہیں ایک یہ کہ نمرود کو یہ کہنے کی تو گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی سورج کو مغرب سے نکال دے پھر اس نے یہ کیوں نہ کہا جواب اس کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سے بلا اختیار یہ بات پڑگئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے۔ اور یہ بھی بے اختیار اس کے دل میں آ گیا کہ یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا اور ایسا ہونے سے جہان میں انقلاب عظیم پیدا ہوگا کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ یہ لوگ اس خارق عادت کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہولیں اور ذرا سی حجت میں سلطنت ہاتھ سے جاتی رہے یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور کوئی دوسرا جواب تو تھا نہیں اس لئے حیران ہو کر منہ دیکھتا رہ گیا دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم نے اپنی حجت کیوں بدلی یہ تو آداب مناظرہ کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح تو گفتگو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا پس جہاں مدعی کی دلیل پر نقض وارد ہوا ہو وہ اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری بیان کرنے لگے گا پھر اس پر نقض وارد ہوگا تو تیسری دلیل پیش کر دے گا وعلی ہذا القیاس یوں تو سلسلہ غیر متناہی ہو جائے گا اسی لئے اہل مناظرہ نے مدعی کے لئے تبدیل حجت کو منع کیا ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اہل مناظرہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ مدعی کو اپنی مصلحت سے تبدیل دلیل کی اجازت نہیں باقی خصم کی مصلحت سے کہ مثلاً وہ غبی ہے اور دلیل اول کو غموض کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ حجت کا بدلنا اور دوسری صحیح دلیل بیان کرنا جائز ہے بلکہ جہاں سمجھانا مقصود ہو وہاں ایسا کرنا واجب ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھانا ہی مقصود تھا وہاں ایسا کرنا دلیل غامض کو بدل کر سہل دلیل اختیار کی اور گو اہل مناظرہ نے اس کی تصریح نہیں کی مگر ان کے قول کو اس پر محمول کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طرح ایک مصلحت عقلیہ تبدیلی کے عدم جواز کو مقتضی ہے اسی طرح ایک مصلحت عقلیہ بھی فہم مخاطب اس کے جواز کو مقتضی ہے اور ظاہر ہے کہ ہم نے پہلے قاعدہ کو محض اقتضاء عقل کی وجہ سے تسلیم کیا ہے ورنہ محض اہل مناظرہ پر کوئی وحی تھوڑا ہی نازل ہوئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اقتضائے عقل کی وجہ سے اس قاعدہ میں استثناء کا قائل نہ ہوا جائے یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق تھی۔

احیاء واماتت کا مفہوم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ۔ کہ میرا خدا احیاء واماتت کرتا ہے تو اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلا کر ایک کو مار ڈالا ایک کو رہا کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ تو محض گدھا ہے اس پر گھوڑے کا پالان کیوں لادا۔ تو آپ نے دوسری دلیل بیان فرمائی کہ میرا خدا تو

آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال دے اس پر وہ مبہوت ہو گیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔

اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ نمرود اس کے جواب میں کہہ سکتا تھا کہ مشرق سے تو میں نکالتا ہوں اگر خدا کوئی ہے تو اس سے کہو کہ مغرب سے نکالے۔

اس کا جواب ہمارے بعض اساتذہ نے یہ دیا ہے کہ ہاں اس کو اس کہنے کی گنجائش تھی مگر خدا تعالیٰ نے یہ جواب اس کے دل میں نہیں ڈالا کیونکہ اگر وہ یہ جواب دیتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ سے دعا کرتے اور آفتاب مغرب سے طلوع ہو جاتا اور یہ علامت قیامت سے ہے تو اسی وقت قیامت قائم ہو جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی عالم کا بقاء مقصود تھا۔ اس لئے نمرود کے دل میں یہ سوال نہیں ڈالا۔

وہی میرے استاد یہ بھی فرماتے تھے کہ فبهت الذی کفر۔ میں بهت بصیغہ مجہول اسی لئے لایا گیا کہ اس کافر مجہول کو حیران بنا دیا گیا اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کو سوال کی گنجائش تھی مگر اس کو حیران بنا دیا گیا مگر یہ نکتہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ بهت معروف بھی متعدی حیرت میں ڈالنے کے معنی میں مستعمل ہو۔ میرا خیال یہ ہے کہ بهت مجہول ہی تحیر کے معنی میں ہے اور اس کا معروف متعدی مستعمل نہیں۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ اس مقام پر ایک علمی اشکال ہے میں اس کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ علم مناظرہ میں یہ طے ہو چکا ہے کہ مناظر کو ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز نہیں ورنہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری دلیل کی طرف کیوں انتقال کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال اپنی مصلحت سے ممنوع ہے اور مخاطب کی مصلحت سے جائز ہے جب کہ وہ بلادت فہم کی وجہ سے دلیل اول کو نہ سمجھ سکے۔ نمرود احمق تھا وہ سمجھا نہیں کہ احیاء واماتت کے معنی ایجاد حیات وایقاع موت کے ہیں اور ابقاء حی کو احیاء نہیں کہتے نہ قتل کو اماتت کہتے ہیں کیونکہ قتل عین موت نہیں بلکہ سبب موت ہے اور بعض دفعہ قتل سے موت کا تخلف بھی ہو جاتا ہے۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔

نمرود کا احمقانہ ذہن

تو نمرود کہنے لگا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یہ کہہ کر اس نے قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلایا جن میں سے ایک واجب القتل تھا اس کو تو رہا کر دیا اور ایک قیدی رہائی کے قابل تھا اس کو قتل کر دیا۔ حالانکہ یہ احیاء واماتت نہ تھا کیونکہ احیاء کے معنی حیات بخشنے کے ہیں جس قیدی کو نمرود نے رہا کیا تھا اس کو پہلے سے حیات حاصل تھی نمرود نے اس کو اپنے گھر سے حیات نہ دی تھی اور اماتت ازہاق روح کا نام ہے اور جس قیدی کو اس نے قتل کیا تھا اس میں نمرود کا فعل صرف اس قدر تھا کہ اس نے اس کی گردن جدا کر دی اب یہ عادۃ اللہ ہے کہ انگلی یا ہاتھ کے جدا کر دینے سے جان نہیں نکلتی اور گردن کے جدا کر دینے سے جان نکل جاتی ہے پس گردن کا جدا کرنا نمرود کا فعل تھا اس کے بعد جان خود بخود عادۃ اللہ کے موافق نکل گئی انسان کا اس

میں کچھ دخل نہ تھا پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے تفریق جزاء وعدم تفریق اجزاء کو احیاء وامات سمجھا جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی کور مغزی دیکھی تو آپ نے دوسری دلیل کی طرف اس کو عجز عن الفھم (فہم کے عاجز ہونے) کے سبب نہ کہ اپنے عجز عن الجواب کے سبب انتقال کیا کیونکہ آپ نے یہ دیکھا کہ اگر میں اس کا جواب دوں اور احیاء وامات کی حقیقت بیان کروں اور یہ بتلاؤں کہ تیرا فعل احیاء وامات میں داخل نہیں تو یہ کوڑ مغز اس فرق کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس لئے آپ نے دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ واضح بیان فرمائی وہ یہ کہ میرا خدا وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا کا منکر ہے تو مغرب سے آفتاب کو نکال اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر ان کا منہ تکنے لگا اور اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔

اہل مناظرہ کے اشکال کا جواب

یہاں سے اہل مناظرہ کے ایک اشکال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا۔ اشکال یہ ہے کہ فن مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال کرنا مناظر کو جائز نہیں اور یہ ایک مسئلہ عقلیہ ضروریہ ہے کیونکہ اگر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز کر دیا جائے تو اس طرح سلسلہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا۔ تم نے ایک دلیل بیان کی خصم نے اس کو توڑ دیا تم نے اس سے انتقال کر کے دوسری دلیل بیان کر دی اس نے اس کو بھی توڑ دیا تم نے تیسری دلیل بیان کر دی تو یہ تو غیر متناہی سلسلہ ہو جائے گا۔ پھر حق کبھی ظاہر ہی نہ ہو سکے گا اس لئے علماء مناظرہ نے انتقال الی دلیل آخر کو ناجائز مانا اور کوئی شخص اس اشکال کا یہ جواب نہ سمجھے کہ یہ تو علم مناظرہ کا ایک مسئلہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں ان کے ذمہ ہمارے اصول کا ماننا کب لازم ہے بلکہ ہم کو ہی ان کی بات کا ماننا لازم ہے جواب ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ محض ہمارے اصول مسلمہ کی قسم سے نہیں بلکہ عقلی مسئلہ ہے جس کا تسلیم کرنا فی نفسہ ضروری ہے۔ پس اب اس اشکال کا صحیح جواب سنئے۔ بات یہ ہے کہ مناظرہ میں انتقال الی دلیل آخر اپنی مصلحت سے تو ناجائز ہے لیکن خصم کی مصلحت سے جائز ہے مثلاً ہم نے ایک دلیل غامض بیان کی جس کو خصم نہیں سمجھ سکتا تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دلیل غامض کو سہل عنوان سے بیان کیا جائے سو اگر اس میں تطویل زیادہ نہ ہو نیز مخاطب تسہیل کے بعد سمجھنے پر قادر ہو تب تو اس کی تسہیل کر دینی چاہیے اور اگر تسہیل میں تطویل ہو یا مخاطب ایسا بلید ہو کہ تسہیل کے بعد بھی دلیل غامض کو نہ سمجھ سکے تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ اس دلیل غامض سے انتقال کر کے دوسری واضح دلیل بیان کر دی جائے جس کو خصم بخوبی سمجھ سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت میں مخاطب کی مصلحت سے انتقال کیا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ مخاطب بڑا ہی کور مغز ہے۔ اس لئے اس سے کیا امید تھی کہ وہ امات واحیاء کو سمجھے گا اور جھک جھک نہ کرے گا۔ اگر نمرود کو کچھ بھی علم وفہم ہوتا تو اس کی بات کا جواب بہت سہل تھا ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ ازہاق روح تیری قدرت میں نہیں تیرا کام صرف گردن جدا کر دینا تھا اس کے بعد روح کا نکل جانا عادۃ اللہ کے موافق ہوا تیرا اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ قاعدہ عقلیہ ہے **القدرۃ تتعلق بالضدین** کہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے جو شخص جان نکالنے پر قادر ہو گا وہ اس کے روکنے پر بھی ضرور قادر ہو گا پس تفریق گردن کے بعد اگر زہوق روح تیرے اختیار سے تھا تو اس پر بھی تجھ کو قدرت ہونی چاہیے کہ ایک شخص کی گردن جدا

کر کے اس کی جان کو نہ نکلنے دے اگر تو اس پر قادر ہے کہ گردن کاٹنے کے بعد جان کو روک لے اور نہ نکلنے دے تو ایسا بھی کر دکھا اس کا جواب اس کے پاس ہرگز کچھ نہ تھا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل کمزور نہ تھی اور نہ اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے دوسری دلیل کی طرف انتقال کیا تھا بلکہ محض اس وجہ سے انتقال کیا کہ پہلی دلیل کے سمجھنے کی اس کور مغز سے امید نہ تھی غرض انسان کا کام محض تحلیل وترکیب ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے ارشاد فرمایا کہ تم ایمان نہیں لائے انہوں نے عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا لیکن اس غرض سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے ارشاد ہوا کہ اچھا تم چار پرندے لے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو پھر ہر پہاڑ پر ان میں ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر ان سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس سب دوڑے (دوڑے) چلے آئیں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

تردد کے اقسام

وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ آخر لیطمئن کا کیا مطلب ہے خود واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو کس درجہ کا تردد تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں۔ فرمایئے کہ ابراہیم کو کون سا تردد تھا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ تردد تو ہو نہیں سکتا جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان کے نہیں۔ ایک فرد تردد کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان کے نہیں۔ ایک فرد تردد کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان نہیں۔ تردد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہ تردد جو حضرت ابراہیم کو تھا ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے اول تو ابراہیم علیہ السلام کی شان ایسی ہے کہ ان کی نسبت یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ ان میں ایسا تردد تھا جو کہ ایمان کے منافی ہے اور پھر قرآن میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ اولم تومن کہ کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ بلی یعنی ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اس لئے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان ہو جاوے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین آپ کو پورا تھا' شک ذرا بھی نہ تھا۔ ہاں تردد کا وہ درجہ تھا جو اطمینان کے مقابل ہے اور وہ منافی ایمان نہیں۔

قرآن اور ترجمہ

اطمینان عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سکون کے ہیں یہ یقین کا مرادف نہیں ہے البتہ اردو میں اطمینان بمعنی یقین مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن شریف کے کسی ترجمہ میں اطمینان کا لفظ دیکھ کر اس سے دھوکا ہوا ہو۔ اور آج کل تو ایسے ترجمے بھی ہو گئے ہیں کہ ان کے اندر ایسے دقیق فرقوں کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ یہی تو وجہ ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں بہت علوم جاننے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ترجمہ دیکھنا بھی نہ چاہئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کے متعلق مجھ کو پوچھنا ہے مگر اول اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ کروں گا اور گمراہ فارسی میں تو عام ہے۔ اس کو بھی جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور اس کو جو واقف ہو کر راہ سے بھٹکا ہو۔ لیکن اردو میں گمراہ اسی کو کہا جاتا ہے جو قصداً راہ سے الگ ہو گیا ہو کسی مترجم نے ضالاً کا ترجمہ لفظ گمراہ سے کر دیا ہے۔ بس اس کو دیکھ کر دل میں اعتراض آیا ہوگا میں نے کہا سنئے ترجمہ یہ ہے پایا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پھر واقف بنا دیا اس کو سن کر چپکے ہی تو ہو گئے۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن میں بہت سے علوم کی ضرورت ہے۔ ترجمہ کے مطالعہ کے لئے صاحب کشاف نے مفسر کے لئے چودہ علوم کی ضرورت لکھی ہے۔ میں نے ایک موقعہ پر (فتح پور کے وعظ میں) ثابت کر دیا تھا کہ اگر نحو نہ جانتا ہوگا تو ترجمہ میں یہ غلطی کرے گا اور فلاں علم سے واقف نہ ہوگا تو یہ غلطی کرے گا۔ خوب واضح طور سے ثابت کر دیا تھا کہ اتنے علوم کی ضرورت ہے قرآن شریف کے ترجمہ کیلئے آج کل ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے جیسے کہ لفظ گمراہ ہے اسی طرح لفظ اطمینان بھی ہے یہ اردو میں تو مرادف ہے ایقان کا مگر عربی میں اس کا مرادف نہیں بلکہ عربی میں اس کے معنی ہیں سکون قلب اور اس کا مقابل ہے تردد یعنی اضطراب قلب یعنی قلب میں حرکت سکون کی قسم کے خلاف ظاہر ہونا۔

وساوس اور اسباب

مطلب یہ ہے کہ اس کا تو یقین ہے کہ آپ زندہ کرنے پر قادر ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کیسے کریں گے۔ یہ دکھا دیجئے۔ جیسے حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا تھا انی یکون لی غلام کہ یہ تو یقینی ہے کہ آپ بیٹا دینے پر قادر ہیں مگر یہ بتلا دیجئے کہ کس طرح ہوگا۔ آیا ہم میاں بیوی جوان کئے جاویں گے یا اسی حالت میں ہوگا انی استبعاد کے لئے نہیں انی بمعنی کیف یعنی سوال عن الکیفیت کے لئے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کرتے ہیں کہ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ اس کی کوئی نظیر دکھا دیجئے۔ اس پر حکم ہوا فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ۔ الخ ان کو ہلا لو۔ پھر ذبح کر کے خوب ان کا قیمہ کر لو اور چار حصے کر کے چار جگہ رکھ دو پھر ان کو پکارو سب دوڑے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور پکارا بس سب زندہ ہو کر ان کی طرف چلے آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھ سے تماشا دیکھ لیا بس اس سے معلوم ہو گیا کہ

مطلق تردد نہ ایمان کے منافی ہے اور نہ کمال ولایت کے۔

یہ سالکین کے کام کی بات ہے

اطمینان اور ایمان اور چیز ہے

فرمایا اطمینان اور چیز ہے اور ایمان اور چیز ہے ان میں فرق قرآن مجید سے سمجھنا چاہیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ارشاد ہوا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ عرض کیا بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قلبی اس سے معلوم ہوا کہ ایمان تو تھا یعنی تصدیق مگر اطمینان کی طلب تھی اور وہ فرق یہ ہے کہ ایمان تو فقط تصدیق سے ہے اور اطمینان وہ کیفیت خاص ہے جو بعد مشاہدہ کے ہوتی ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾

ترجمہ: اور ان لوگوں کے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں کو عمل شاق کا خوگر بنا کر ان میں پختگی پیدا کریں مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ دگنا چگنا پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی کافی ہے اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں۔

تفسیری نکات

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں (تا کہ آئندہ انفاق بھی اور دوسرے اعمال صالحہ بھی سہولت سے صادر ہوا کریں) ان لوگوں کے صدقات ونفقات کی حالت مثل ایک باغ کی حالت کے ہے جو بلند زمین پر ہے اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زمین تو نشیب کی اچھی ہوتی ہے جس میں پانی ٹھہرے بلند زمین میں پانی کیونکر ٹھہرے گا۔ جواب یہ ہے کہ زمین بلند سے یہ کیونکہ سمجھ لیا گیا کہ وہ گنبد ہے بلکہ بلند بھی ہے اور مسطح بھی ہے کیونکہ بلندی پر ہوا لطیف ہوتی ہے اس کے بعد ارشاد ہے اصابها وابل اس کو موسلا دھار بارش نصیب ہوگئی تو وہ اپنا پھل دو چند لایا چار چند۔ دو باتیں اس لئے کہی کہ ضعف کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ضعف کہتے ہیں مجموعہ مثلین کو تو ضعفین تثنیہ ہے اس کے معنی چار مثل یعنی چار چند کے ہو

گئے اور بعض نے کہا ہے کہ ان مثلین میں سے ہر مثل کو ضعف کہتے ہیں ان کے نزدیک ضعفین کا ترجمہ دو چند ہوگا جیسے زوج کبھی ہر فرد کو کہتے ہیں جس کا تثنیہ زوجین بمعنی صنفین آتا ہے اور کبھی مجموعہ فردین کو کہتے ہیں جیسے دو کے عدد کو زوج کہتے ہیں بمعنی مجموعہ عددین آگے فرماتے ہیں فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ اور اگر اس کو موسلا دھار بارش نہ پہنچے تو پھوار بھی کافی ہے ای فطل یکفیہ طل یا تو طل مبتدا ہے خبر محذوف ہے یا فاعل ہے جس کا فعل مقدر ہے اور نکرہ کا مبتداء ہونا جو ممنوع ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ مفید نہیں ہوتا اور اگر مفید ہو تو مبتدا ہونا جائز ہے اور یہاں مفید ہے وجہ افادہ کی یہ ہے کہ یہ صورۃً نکرہ ہے اور معنیٔ نکرہ موصوفہ ہے کیونکہ طل سے مراد مطلق طل نہیں بلکہ وہ طل ہے جو اس باغ سے لگے اس کو پہنچے اس کے بعد ارشاد ہے وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ۞۔ اس کا ربط آیت کے اجزاء کی تحلیل سے معلوم ہوگا بدوں اس کے معلوم نہ ہوگا۔

اخلاص کی تشبیہ

ہمیں اعمال اختیاریہ کی تحصیل کا مکلف کیا ہے اور شارع کے ذمہ تسہیل کی رعایت نہیں مگر محض عنایت کی وجہ سے بعض دفعہ تسہیل کی بھی رعایت فرمالیتے ہیں جیسا کہ اس آیت میں کیا گیا ہے پس سالکین کی یہ بڑی غلطی ہے کہ وہ سہولت کے طالب ہیں اور طلب تحصیل میں کوتاہی کرتے ہیں اس میں مقصود بالذات کو تابع اور مقصود بالعرض کو اصل قرار دینا ہے نیز صفت اختیار کا ابطال ہے جو اہانت الٰہیہ ہے اب میں مختصراً تشبیہ کے متعلق جو اس آیت میں مذکور ہے کچھ عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ نے یہاں نفقات کو جنات سے تشبیہ دی ہے وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح باغ میں پھل کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح نفقات میں زیادت ہوتی ہے اور وابل سے اخلاص کی تشبیہ مقصود ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ اوپر ریاء فی الانفاق کی مذمت ہے كَالَّذِىۡ يُنۡفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ الایہ ۔ اس کے بعد اخلاص فی انفاق کی فضیلت بیان فرمائی گئی اور جب وابل سے مراد اخلاص ہے اور اس کے مقابلہ میں طل مذکور ہے اور وابل کہتے ہی موسلا دھار بارش کو اور طل کہتے ہیں پھوار کو تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وابل سے اخلاص کامل مراد ہے اور طل سے اخلاص قلیل مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر اخلاص کامل ہوا تو نفقات میں ترقی زیادہ ہوگی اور اگر اخلاص قلیل ہوا تو وہ بھی ترقی کے لئے کافی ہے گو زیادہ ترقی نہ ہو اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے بلکہ اس سے وہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل کا مطلوب ہونا ان کے ذہن نشین ہو جائے تو ان سے کوئی عمل نہ ہو سکے گا کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہو سکتا۔

جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے سامنے ایک جنازہ کی نماز شروع ہوئی اور وہ شریک نہ ہوئے کسی نے پوچھا کہ آپ نے نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی فرمایا کہ میں نیت کی تصحیح میں مشغول رہا یہی سوچتا رہا کہ اس وقت اس میت کی نماز پڑھنے میں کیا نیت ہے کیونکہ نماز جنازہ میں مختلف نیتیں ہوتی ہیں کبھی اعزہ واقرباء کی خاطر سے پڑھی جاتی ہے کبھی میت کی وجاہت کا اثر ہوتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ میت محلہ دار ہے اگر نماز نہ پڑھیں گے تو اہل محلہ ملامت کریں گے یہی وجہ ہے کہ رئیس یا عالم کے جنازہ کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے غریبوں کے جنازہ کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا اگر اخلاص منشاء ہوتا تو یہ فرق کیوں ہوتا۔ اسی طرح حافظ اگر تراویح میں سوچتا رہے کہ میں تراویح میں جو بنا سنوار کر قرآن پڑھ رہا ہوں اس میں کیا

نیت ہے کیونکہ تنہا نماز پڑھتے ہوئے ایسا اہتمام نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ تراویح ہرگز نہ پڑھا سکے گا پس اس وہم کا علاج کر دیا گیا کہ تم کس وہم میں پڑے ہو ہمارے یہاں اخلاص قلیل بھی کافی ہے بس تم اپنی طرف سے برا قصد نہ کرو اس کے بعد بے فکر ہو کر کام میں لگو اور اخلاص کامل کے لئے سعی کرتے رہو اسی طرح سے ایک دن اخلاص کامل بھی میسر ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی دن اخلاص کامل پر عمل کو موقوف رکھا تو تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا یہ مطلب ہے فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ کا کہ ابتداء میں اخلاص قلیل ہی کو کافی سمجھو اور عمل شروع کر دو یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل ہی مطلوب ہے بلکہ مطلوب تو اخلاص کامل ہے مگر اس کے حصول کا طریقہ یہی ہے کہ اول قلیل ہی سے عمل شروع کر دو۔

بعض نے جو ارشاد خداوندی أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ سے تضاعف حسنات کی تحدید سات سو تک نکالی ہے سو آیت میں درحقیقت تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک تمرۃ جو راہ خدا میں دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی تربیب فرماتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جبل احد کے برابر ہو جاتا ہے اور جبل احد کے اگر ایک تمرۃ کے برابر اجزا بنائے جائیں تو سات سو گنے کیا کروڑوں اربوں گنے تک نوبت پہنچے گی پس معلوم ہوا کہ آیت میں تحدید مراد نہیں بلکہ تکثیر الی ما یحصی مقصود ہے۔ محاورات میں ایسے اطلاقات ہوتے ہیں کیونکہ بسا اوقات بول چال میں عدد مخصوص بولا جاتا ہے اور مراد عدد معین نہیں ہوتا بلکہ تکثیر مراد ہوتی ہے جیسا ہمارے محاورے میں بھی بولا جاتا ہے کہ بیسیوں دفعہ یہ کام کیا۔ پچاس دفعہ کھایا۔ باوجود یکہ عدد معین بولا گیا ہے لیکن مراد صرف کثرت ہے نہ عدد مخصوص۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی سبع۔ سبعین وغیرہ اکثر بول کر مراد کثرت لی جاتی ہے۔ پس بعض ظاہر بین کوتاہ نظر جو شبہ کیا کرتے ہیں کہ احادیث و روایات میں بعض نعمائے جنت اور عذاب و دوزخ کے بیان میں ستر ستر کی تحدید کیوں ہے اس کا جواب ہو گیا۔ کہ بدلالت محاورہ عرب تحدید مراد نہیں بلکہ تکثیر مراد ہے اور ہر زبان کے محاورات اور خواص جدا ہوتے ہیں۔

عمل کے بعض ثمرات خاص عامل ہی کو ملتے ہیں

عمل کی بعض خاصیتیں وہ ہیں کہ ان کا ثمرہ خاص عامل ہی کو حاصل ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ۔ یعنی مثل ان لوگوں کی جو اپنے مالوں کو اللہ کی رضا مندی کی طلب کرنے اور اپنے نفسوں کو نیک کاموں پر جمانے کے لئے خرچ کرتے ہیں دیکھئے اس آیت میں مال کے خرچ کرنے کی خاصیتیں ارشاد فرمائی ہیں اول تو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی طلب کرنا یعنی ثواب دوسرے اپنے نفس کو جمانا یعنی اس میں سخاوت کا ملکہ پیدا کرنا جس کا حاصل اخلاق کی درستی ہے۔

چنانچہ واؤ عاطفہ ان دونوں کے تغایر پر دال ہے۔ پس ثواب تو وہ شے ہے کہ دوسرے کے کرتے سے بھی مل جاتا ہے اور نفس عمل کو جو خاصیت ہے یعنی نفس میں ملکہ اور قوۃ پیدا ہونا یہ بغیر اپنے کئے نہیں ہو سکتا دیکھو پہلوان دوست دشمن سے بچا دے گا لیکن تمہارے اندر وہ قوۃ پیدا کر سکتا قوت ہی ہوگی جب تم خود ورزش کرو گے خلاصہ یہ ہے کہ بدوں اپنے کئے نفس کے اندر قوۃ نیک اعمال کی پیدا نہیں ہو سکتی اور اس قوۃ ہی کا نام خال ہے سو لوگوں کو بالعموم اس کی فکر ہی نہیں۔ نماز پڑھتے

ہیں لیکن اس کا فکر نہیں کہ اس کی دھن لگ جائے۔ روزہ رکھتے ہیں حج کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں مگر اترے دل سے اس کا شوق نہیں کہ بعض فرائض وواجبات سے ترقی کر کے ذکر بھی کرتے ہیں لیکن ان کا ذکر صرف زبان پر ہے قلب میں کچھ اثر نہیں اور اس اثر نہ ہونے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی ان عبادات کو دوام نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ ان کی جڑ قلب میں پیدا نہیں ہوئی اگر نماز قضا ہو جائے تو ہو جائے کچھ غم نہیں۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ اس میں تیمم اور قصد کی ممانعت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے چھانٹ کر بری چیز کا قصد نہ کرو تیمم کی قید میں بھی رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ بعض لوگ غریب بھی ہوں گے جن کے پاس گھٹیا ہی مال ہوگا تو اگر وہ گھٹیا دیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ وہ گھٹیا کا انتخاب اور قصد نہیں کرتے بلکہ اس لئے گھٹیا دیتے ہیں کہ ان کے پاس اور ہے ہی نہیں پھر آگے اسکا معیار بتلاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہر شخص کے اعتبار سے گھٹیا کا درجہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ. یعنی بس یہ دیکھ لو کہ اگر ایسی چیز کوئی تم کو دے تو تم بھی خوشی سے اس کو لے سکتے ہو لحاظ کر لینا معتبر نہیں اس لئے آگے إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ بھی بڑھا دیا پس جو چیز تم دوسرے سے خوشی کے ساتھ لے سکتے ہو اس کو اللہ کے نام پر بھی دے سکتے ہو اور ظاہر ہے کہ جس غریب کے پاس سب گھٹیا ہی مال ہے وہ دوسرے سے بھی اس جیسی چیز کو لے سکتا ہے لہٰذا ان کو گھٹیا جانور کی قربانی جائز ہے اور جو لوگ ایسے نازک ہیں کہ بیمار اور دبلے جانور کا گوشت کبھی نہیں لیتے ہمیشہ عمدہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں اگر یہ دبلا پتلا جانور قربانی کریں گے تو اس کی ممانعت ہوگی کیا رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے معیار بھی خود ہی بتلا دیا تمہاری رائے پر نہیں چھوڑا آگے فرماتے ہیں واللہ غنی یعنی خدا تعالیٰ غنی ہے اس کو تمہارے مال کی ضرورت نہیں پس خدا کے نام پر ایسا مال دو جیسا اغنیاء کو دیا کرتے ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب خدا تعالیٰ کو احتیاج نہیں پھر ہم جیسا چاہیں خرچ کر دیں تو فرماتے ہیں حمید یعنی گو ان کو احتیاج نہیں مگر کرتے تو ان کی رضا کے لئے ہو جب یہ ہے تو وہ محمود بھی ہیں اس لئے ان کے نام پر ہر حال میں مال محمود ہی خرچ کرنا چاہیے پھر بعض کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ تو سب کچھ ہے کہ اللہ کے لئے مال محمود خرچ کرنا چاہیے کیونکہ وہ غنی حمید ہے مگر عمدہ مال میں روپے بھی تو بہت خرچ ہوتے ہیں پھر محتاج ہو جاویں گے اس کا جواب دیتے ہیں الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ کہ یہ شیطان کا دھوکہ ہے وہ تم کو فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کی بات بتلاتا ہے فحشاء سے مراد یہاں مفسرین کے نزدیک بخل ہے واقعی یہ کیسی بے حیائی کی بات ہے کہ خدا ہی کا مال اس کے حکم سے دینا نہیں چاہتا آگے زیادہ ہمت بڑھاتے ہیں وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا اور اللہ تعالیٰ تم سے (انفاق پر) مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں اور ترقی (مال و دولت) کی امید دلاتے ہیں پس مطمئن رہو کہ صدقہ خیرات سے مال میں کمی نہ آئے گی بلکہ ترقی ہوگی (حدیث میں اس کی زیادہ تصریح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا) آگے وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ بھی ایک اشکال کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ بڑے وسعت والے ہیں ان کے یہاں کچھ کمی نہیں اس لئے وعدہ فضل پر شبہ نہ کرو اور وہ ہر شخص کے عمل کو خوب جانتے ہیں اس لئے یہ

وسوسہ نہ کرو کہ اتنے آدمیوں میں ہمارے عمل کی کیا خبر ہوگی ان سے ذرہ برابر کسی کا عمل مخفی نہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو (نیک کام میں) خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہے اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں تعریف کے لائق ہیں شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں خوب جاننے والے ہیں دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں)

تفسیری نکات

رعایت غربا

اس میں غرباء کی رعایت کی گئی ہے اگر طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ نہ فرماتے بلکہ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مطلقاً فرماتے تو غرباء کو فکر ہوتی کہ ہمارے پاس تو جتنا کچھ ہے امیروں کی نظروں میں سب ہیچ ہے تو طیبات کاملہ ہم کہاں سے لائیں اس لئے حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ طیبات کاملہ کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارے پاس جو کچھ ہے اس میں سے پاکیزہ مال خرچ کرو اور اس میں سے چھانٹ کر ردی مال اللہ کے واسطے نہ نکالو۔

اب یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے کہ جب نیا کپڑا پہنے تو پرانے کو خیرات کر دے اور نیا جوتا پہنے تو پرانے کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ردی مال صدقہ کیا جائے گا تو میں اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ

پرانے کپڑے اور جوتے کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے نہ دیا جائے بلکہ اعانت غریب کی نیت سے صدقہ کیا جائے تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نہ کرو۔ چاہے اللہ تعالیٰ تم کو ثواب بھی دیدیں خوب سمجھ لو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد اس سے وہ پرانا ہو جو ردی کے درجہ تک نہ پہنچا ہو بہر حال تحصیل بر کے لئے احب الاشیاء کا انفاق ضروری نہیں اور حضرت ابو طلحہؓ کا احب الاشیاء کا خرچ کرنا یہ اس غرض سے تھا کہ وہ خیر کامل کے قصد سے انفاق اعلیٰ کرنا چاہتے تھے کیونکہ حضرات صحابہؓ کی یہی شان تھی کہ وہ ہر کام میں اعلیٰ درجہ کا قصد کرتے تھے۔ دوسرے خود نص میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول بر کے لئے انفاق احب الاشیاء ضروری نہیں اور وہ قرینہ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔

اس آیت کی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ آیت سابقہ کی علت ہے کہ تم کو انفاق پر ثواب کیونکر نہ ملے اللہ تعالیٰ تمہارے انفاق کو خوب جانتے ہیں اس تفسیر پر تو اس کا حاصل آیت سابقہ سے متحد ہے مگر میری سمجھ میں خود بخود یہ بات آئی تھی کہ یہ آیت پہلی آیت کے مقابل ہے کہ پہلی آیت میں انفاق محبوب پر بر کامل کے حصول کو موقوف کیا گیا تھا اور اس آیت میں ماتنفقوا عام ہے محبوب و غیر محبوب دونوں کا مطلب یہ ہے کہ بر کامل تو انفاق محبوب ہی سے حاصل ہوگی اور ویسے جو کچھ بھی تم خرچ کرو خواہ محبوب ہو یا غیر محبوب بشرطیکہ ردی نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں یعنی ثواب کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ گو بر کامل حاصل نہ ہو۔ یہ تفسیر میرے ذہن میں آئی تھی مگر میں اس پر مطمئن نہ ہوا بلکہ تفاسیر میں تلاش کیا تو بیضاوی نے یہی لکھا ہے جو میں سمجھا تھا اس سے میرا جی بہت خوش ہوا اور اطمینان ہو گیا کہ یہ تفسیر بالرائے نہیں۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ (اور جس کو دین کا فہم مل گیا اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی)

حکمت موہبت خداوندی ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص حکمت یعنی علم دین عطا کیا جاوے تو اس کو بیشک خیر کثیر مل گئی اب یہ سمجھئے کہ آیت میں يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فرمایا۔ یہ نہیں ارشاد فرمایا من تعلم الحكمة یا من حصل الحكمة۔ یعنی حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جو شخص حکمت دیا جاوے اس کو خیر کثیر مل گئی یہ نہیں فرمایا جو حکمت سیکھے یا جو حکمت حاصل کرے اس کو خیر کثیر مل گئی اس میں یہ رمز ہے کہ کہیں طالب علم و محصل کو زعم اور عجب اور ناز نہ پیدا ہو جاوے کہ میں نے اپنی فطانت و ذہانت و محنت سے علم حاصل کیا ہے پس من يوت میں یہ بتلا دیا کہ یہ محض موہبت خداوندی ہے جس کو چاہیں عطا فرما دیں گو اس کے اسباب مکتسبہ ضرور ہیں اور اسی بناء پر انسان اس کی تحصیل کا مکلف قرار دیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے طلب العلم فريضة على كل مسلم (قال الجامع رواه ابن عبدالله باسناد صحيح سچ یہ ہے کہ بعد سعی کے علم دین کا حاصل ہو جانا یہ محض موہوب من اللہ ہے مکسوب نہیں ہے جیسے نکاح فعل اختیاری ہے اور اسی طرح مجامعت بھی فعل اختیاری ہے مگر اولاد کا نہ ہونا بالکل غیر اختیاری ہے اگر حق تعالیٰ چاہیں عطا فرما دیں اور چاہیں محروم فرمائیں سو اسی طرح کتاب پڑھنا محنت کرنا سامان تحصیل مہیا کرنا افعال اختیاریہ ہیں لیکن حصول علم دین غیر اختیاری ہے کیونکہ در حقیقت علم دین حقائق دینیہ کا قلب پر وارد ہونا ہے اور وہ محض موہوب ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ دو طالب علم لیجئے جو ہر طرح ظاہری اسباب تحصیل

میں مساوی درجہ کے ہوں یعنی استاد دونوں کا ایک ہو توجہ بھی استاد کی دونوں پر مساوات کے ساتھ ہو تدریس وتحشیہ وتصنیف وغیرہ کا کام بھی دونوں سے برابر درجہ میں لیا گیا ہو مدت تکمیل بھی دونوں کی ایک ہو عمر بھی ایک ہو فطانت وذہانت میں بھی برابر ہوں مگر ایک میں تقویٰ زیادہ ہو تو ضرور ہے کہ متقی کا علم لطیف اور بڑھا ہوا ہوگا اور یہ امر مشاہدہ ہے لاریب فیہ بلکہ بعض اوقات متقی اس درجہ کا ذہین نہیں ہوتا جس درجہ کا وہ دوسرا شخص ذہین ہوتا ہے جو اس سے تقویٰ میں کم درجہ کا ہے مگر باوجود اس کے متقی کا علم زیادہ اور لطیف ہوتا ہے پھر اسباب ظاہریہ کی مساوات کے ہوتے ہوئے تقویٰ سے علم کا زیادہ لطیف ہو جانا یہ موہوب ہونے کے سبب نہیں ہوسکتا تو اور کیا ہے پس معلوم ہوا کہ حصول علم دین محض وہبی ہے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید وا وستا

(اگر شبہ ہو کہ تقوی بھی تحصیل علم کا سبب ہے اور وہ ایک شخص میں کم ہے اسی لئے اس کے علم میں بھی کمی ہے پھر موہوب علم کہاں رہا اور مساواۃ کہاں متحقق ہوئی تو جواب یہ ہے کہ اول تو یہی مسلم نہیں کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا ایک سبب ہے چنانچہ کوئی شخص خاص اس نیت سے تقویٰ کر کے دیکھے کہ ہمارے علم میں ترقی ہوگی سو دیکھ لے گا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے علم میں خاک بھی ترقی نہ ہوگی ترقی تو عادۃً ہو جاتی ہے جبکہ مقصود تقویٰ سے خالص رضائے الٰہی ہو اور بر تقدیر تسلیم یہ اسباب ظاہریہ میں سے نہیں ہے اور یہاں ذکر اسباب ظاہری کا ہے اور جو اسباب کو عام لیا جاوے تو اسباب غیر ظاہری تو رحمت خداوندی بھی ہے جو سبب ہے موہبت کا تو پھر یہ بھی کہا جاوے گا کہ ایک کے شامل رحمت الٰہیہ ہے اور وہ سبب ہے زیادت کا اور دوسرے کو یہ میسر نہیں فلا مساواۃ حالانکہ یہ اعتراض کوئی فہیم نہیں کر سکتا ۱۲)

اسی طرح مجامعت بھی فعل اختیاری ہے مگر اولاد کا ہونا بالکل غیر اختیاری ہے اگر حق تعالیٰ چاہیں عطا فرما دیں اور چاہیں محروم فرمائیں سو اسی طرح کتاب پڑھنا محنت کرنا سامان تحصیل مہیا کرنا افعال اختیاریہ ہیں لیکن حصول علم دین غیر اختیاری ہے کیونکہ درحقیقت علم دین حقائق دینیہ کا قلب پر وارد ہونا ہے اور وہ محض موہوب ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ دو طالب علم لیجئے جو ہر طرح ظاہری اسباب تحصیل میں مساوی درجہ کے ہوں یعنی استاد دونوں کا ایک ہو توجہ بھی استاد کی دونوں پر مساوات کے ساتھ ہو تدریس وتحشیہ وتصنیف وغیرہ کا کام بھی دونوں سے برابر درجہ میں لیا گیا ہو مدت تکمیل بھی دونوں کی ایک ہو عمر بھی ایک ہو فطانت وذہانت بھی برابر ہوں مگر ایک میں تقویٰ زیادہ ہو تو ضرور ہے کہ متقی کا علم لطیف اور بڑھا ہوا ہوگا اور یہ امر مشاہدہ ہے لاریب فیہ۔

اور ایک یہ بات سمجھنے کی ہے کہ آیت میں حکمت یعنی علم دین کو خیر کثیر کہا گیا حالانکہ صرف خیر کا لفظ بھی کافی تھا کیونکہ یہ لفظ موہم تفضیل ہے اس کے معنی ہیں بہت اچھا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جیسی عظیم الشان ذات جس چیز کو بہت اچھا فرمائے اس کی خوبی کس درجہ کی ہوگی مگر صرف اسی لفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مزید مبالغہ کے لئے کثیرا کا لفظ بھی اضافہ فرمایا یعنی علم دین بہت ہی بڑی نعمت ہے اور بہت اچھا ہونے کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ کوئی چیز بہت سی چیزوں سے یا کسی خاص چیز سے بہت اچھی ہو اور دوسرے یہ کہ تمام چیزوں سے زیادہ عمدہ ہو اور یہاں ظاہراً دوسری صورت مراد ہے کیونکہ

یہاں مفضل علیہ مذکور نہیں ہے پس مراد یہ ہے کہ علم دین تمام اچھی چیزوں سے زیادہ بڑھ کر ہے واضح ہو کر اس خیر کے مفضل علیہ میں تمام واقعی عمدہ چیزیں داخل ہیں اور مال و دولت تو واقع میں کمال ہی نہیں اور نہ وہ کچھ زیادہ اچھا ہے بلکہ بقدر حاجت روائی محمود ہے اور وسیلہ ہے مقصود کا خود بذاتہ کچھ محمود مقصود نہیں اس لئے اس خیر کے مفضل علیہ میں اس کے داخل ماننے کی ضرورت ہی نہیں اب رہا ایمان سو وہ خود ایمان اس علم ہی میں داخل ہے کیونکہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہے۔ اب رہی جنت سو وہ اس خیر کے مفضل علیہ میں داخل ہے کیونکہ ایمان کہ علم دین کی ایک فرد ہے جنت سے افضل ہے گو بعض لوگوں نے جنت کو ایمان سے افضل کہا ہے اور یہ دلیل بیان کی ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا یعنی جو شخص نیکی کرے تو اس کو اس نیکی سے بڑھ کر جزا دی جاوے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم سے جزاء افضل ہے اور اعمال میں ایمان بھی ہے لہٰذا ایمان کی جزاء یعنی جنت ایمان سے افضل ہوئی لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں خیر سے مراد جنت نہیں بلکہ نفس حسنہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آدمی جو نیکی کرتا ہے خواہ وہ ایمان ہو یا دیگر اعمال اللہ تعالیٰ اس عمل کو بڑھا دیتے ہیں مثلاً ایک نیکی کو بڑھا کر دس نیکی کر دیں پھر ان دس نیکی پر جزاء مرتب ہوتی ہے اور دوسری آیت میں تصریح ہے کہ وہ بڑھائی ہوئی چیز حسنہ ہی ہے چنانچہ فرمایا ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اور ظاہر ہے کہ امثالہا میں ضمیر مضاف الیہ کا مرجع حسنہ ہے تو حسنہ کے امثال حسنات ہی ہیں مثلاً کسی نے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کو اول بیس رکعت یعنی دس گنا فرمایا پھر اس بیس رکعت کا ثواب مرحمت فرمایا کام کمزور تھا لیکن لکھا گیا قوی، تھوڑا کیا تھا تحریر میں لایا گیا زیادہ، پس حسنات مضاعفہ کا حسنہ معمول بہا سے افضل ہونا لازم آیا نہ کہ جزاء کا عمل سے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۷۳﴾

ترجمہ: ان فقراء کے لئے جو کہ اللہ کے راستے میں گھرے ہوئے ہیں زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے جاہل ان کو غنی گمان کرتے ہیں ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو (کہ فکر و فاقہ سے چہرے پر اثر ضرور آ جاتا ہے) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے اور جو مال خرچ کرو گے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے۔

تفسیری نکات

امور دین میں مصروف لوگوں کا حق

دیکھو! لام للفقراء میں استحقاق کا ہے یعنی یہ لوگ اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ اگر نہ دو تو نالش کر کے سکتے ہیں گو

دنیا میں نالش نہ ہو سکے لیکن خدا تعالیٰ کے ہاں قیامت میں دیکھئے گا کتنی ڈگریاں آپ پر ہوتی ہیں۔

خدا تعالیٰ نے آیت میں ان لوگوں کو بلفظ فقراء ذکر فرمایا ہے فقیر آج کل کے عرف میں ایک ذلیل لفظ ہے مگر یہ ذلت اگر ذلت ہے جیسا کہ تمہارے نامعقول عرف نے سمجھ لیا ہے تو صرف انہی لوگوں کو نہیں ساری دنیا کے لئے فرماتے ہیں يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ (اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو) تو ہم کو تو فخر ہے کہ ہم خدا کے فقیر ہیں

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس اور دیوانہ ہیں لیکن پھر اس ساقی اور اس پیمانہ میں مست ہیں)

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرہ آیت ۲۷۳)

صدقات اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ ناواقف ان کو بے سوالی سے تونگر خیال کرتا ہے تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو کہ فقر و فاقہ کا چہرہ پر ضرور اثر نمایاں ہوتا ہے وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے۔

اس میں احصروا فرمایا ہے جس کا ترجمہ سہل یہ ہے کہ محبوس ہو گئے دین کے کام میں اور تجارت وغیرہ کے لئے سفر نہیں کر سکتے۔ مجھے خوب یاد آیا کہ آج کل بعض لوگ مولویوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں کھانے کمانے کے قابل نہیں۔ مگر یہ اپاہج کا خطاب ان کو خدائی دربار سے ملا ہے فرماتے ہیں لایستطیعون ضربا فی الارض یعنی ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ پس اس کہنے پر برا نہ مانا کرو بلکہ یہ پڑھا کرو۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں۔

اے گروہ علماء و طلباء اگر کوئی تمہیں دیوانہ کہے تو برا نہ مانو۔ پس یہ اپاہج ہی ایسا وصف ہے کہ سب انبیاء اس سے متصف تھے۔

انبیاء درکار دنیا جبری اند کافراں درکار عقبےٰ جبری اند

یعنی انبیاء علیہم السلام تو کار دنیا میں جبری اور تارک اسباب ہیں اور کفار کار عقبیٰ میں جبری اور تارک اسباب ہیں۔

انبیاء راکار عقبےٰ اختیار کافراں راکار دنیا اختیار

یعنی انبیاء علیہم السلام کو کار عقبےٰ اختیار ہوا ہے کہ اس کے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔ کفار کو کار دنیا اختیار ہوا ہے کہ اس سے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔ (حق الاطاعۃ ملحقہ مواعظ نظام شریعت)

غرض جو لوگ دین کے کاموں میں وقف ہیں ان کا حق آپ کے ذمہ ہے اور علامت وقف ہونے کی یہ ہے کہ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ. یہ وہی بات جس کو آپ بروئے طعن مولویوں سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپاہج ہو جاتے

ہیں صاحبو! بیشک اپاہج ہیں اور کیوں نہ ہوں جب خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ دوسرے کام کریں اگر طاقت سے مراد شرعی طاقت ہے کہ ان کو اجازت نہیں کہ یہ دوسرے کام میں لگیں اس مسئلے کو میں ایک مثال دے کر زیادہ واضح کرتا ہوں ہمارے اطراف میں ایک صاحب نے جو کہ سرکاری ملازم تھے ایک مطبع کر لیا شدہ شدہ حکام کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے نام ایک پروانا آیا کہ یا تو نوکری سے استعفیٰ دیدو ورنہ مطبع بند کر دو۔ آخر اس حکم کی کیا وجہ' وجہ یہی ہے کہ مطبع کرنے کی صورت میں وہ نوکری کا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے اب تو غالباً تسکین ہوگئی ہوگی کیونکہ سفید رنگ والوں کا بھی اس پر اتفاق ہے یہ تو شرعی طور پر تھا اب میں تمدنی طور پر اس مسئلے کو بیان کرتا ہوں کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام قوم کا ایک ایک پیسہ دو دو پیسہ جمع کر کے جس کو خزانہ کہا جاتا ہے کیونکہ خزانہ واقع میں اسی مجموعے کا نام ہے جو کہ تمام قوم سے چن چن کر جمع کیا جاتا ہے کسی نے پوچھا تھا کہ بیوی فوج کس کو کہتے ہیں اس نے کہا کہ میرا میاں تیرا میاں بس یہی فوج ہے تو آپ کا پیسہ ان کا پیسہ اسی کے مجموعے کا نام خزانہ ہے تو واقع میں خزانہ قوم کی چیز ہے اب سمجھئے کہ اس خزانہ سے جو تنخواہ دی جاتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بادشاہ اور پارلیمنٹ ایسے قوم کاموں میں مصروف ہیں کہ وہ دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے اس لئے قوم کے مجموعہ مال میں سے اس کو نفقہ دیا جاتا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو قومی کام میں مشغول ہو اس کا حصہ قوم کے اموال میں ہے اگر کہا جائے کہ خزانہ تو سلطنت کی ملک ہوگیا تو سمجھو کہ وہ سلطنت مجموعہ افراد قوم کی نائب ہے تو سلطان کے ہاتھ سے جو کچھ پہنچ رہا ہے وہ واقع میں قوم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہا ہے اگرچہ قوم کا ہاتھ ایک حجاب میں دست سلطان کی آڑ میں آ گیا ہے اب تو غالباً آپ پورے طور پر اس کو سمجھ گئے ہوں گے۔

صدقات کے مستحق

صدقات اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ ناواقف ان کو بے سوالی سے تونگر خیال کرتا ہے تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو کہ فقر و فاقہ کا چہرہ پر ضرور اثر نمایاں ہوتا ہے وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے۔

اس میں احصروا فرمایا ہے جس کا ترجمہ سہل یہ ہے کہ محبوس ہو گئے دین کے کام میں اور تجارت وغیرہ کے لئے سفر نہیں کر سکتے۔ مجھے خوب یاد آیا کہ آج کل بعض لوگ مولویوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں کھانے کمانے کے قابل نہیں مگر یہ اپاہج کا خطاب ان کو خدائی دربار سے ملا ہے فرماتے ہیں لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ یعنی ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ پس اس کہنے پر برا نہ مانا کرو بلکہ یہ پڑھ دیا کرو۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم — مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں۔

اے گروہ علماء وطلباء اگر کوئی تمہیں دیوانہ کہے تو برا نہ مانو۔ پس یہ اپاہج ہی ایسا وصف ہے کہ سب انبیاء اس سے متصف تھے۔

انبیاء درکار دنیا جبری اند کافراں درکار عقبےٰ جبری اند

یعنی انبیاء علیہم السلام تو کار دنیا میں جبری اور تارک اسباب ہیں اور کفار کار عقبیٰ میں جبری اور تارک اسباب ہیں۔

انبیاء راکار عقبےٰ اختیار کافراں راکار دنیا اختیار

یعنی انبیاء علیہم السلام کو کار عقبےٰ اختیار ہوا ہے کہ اس کے اسباب میں سعی کرتے ہیں کفار کو کار دنیا اختیار ہوا ہے کہ اس سے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو ہر کام میں قرآن پر نظر کرنی چاہیے تھی اور اسی سے سبق لینا چاہیے تھا اور یوں کہنا چاہیے تھا کہ حسبنا کتاب اللہ یعنی ہم کو قرآن شریف ہی کافی ہے) مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حدیث وفقہ کوئی چیز نہ ہوئی کیونکہ قرآن ایک متن ہے حدیث وفقہ سب اس کے لئے شروح ہیں۔ اسی کو فقہا نے کہا ہے القیاس مظہر لا مثبت (یعنی قیاس حکم کا ظاہر کرنے والا ہے ثابت کرنے والا نہیں ہے) تو حدیث وفقہ نے قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے کوئی حکم قرآن کے خلاف نہیں بیان کیا۔

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق مقفل ہے اور کنجی سے اسے کھول دیا اور بہت سے جواہرات نظر آنے لگے تو یہ جواہرات کنجی سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے مگر پوشیدہ تھے کنجی نے ان کو ظاہر کر دیا تو حدیث وفقہ قرآن کے لئے کنجی ہیں۔ جتنے علوم ہیں سب قرآن ہی سے نکلے ہیں اس کی تو یہ شان ہے۔

عبارا تنا شتی و حسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

یعنی عنوانات مختلف ہیں اور حسن یعنی قرآن ایک ہی ہے ہر عنوان اس ایک ہی حسن کی طرف مشیر ہے

ایک محبوب ہے جس نے صبح کو دھانی جوڑا پہنا۔ شام کو دوسرا جوڑا پہنا تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں پہچانے گا مگر عاشق کہے گا

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش من انداز قدت رامی شناسم!

آیت میں فقراء سے کیا مراد ہے

تو قرآن میں جو فرمایا ہے اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ الایۃ کہ وہ مقید اور اپاہج ہیں وہ جو کچھ نہیں کر سکتے۔ یعنی دنیا کے کاموں سے اپاہج ہیں ورنہ دینی کام میں ان سے بڑھ کر چست کون ہوگا اور اگر غور کیا جائے تو یہ اپاہج ہاتھ پیر چلانے والوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ باقی عرف کا تو کوئی علاج نہیں اور اب تو عرف بھی بدل گیا۔ غرض جب ہندوؤں نے یہ عہد کر لیا کہ ان کے مذہب (باطل) کی خدمت کے لئے ایک جماعت وقف کر دی جائے جس کو دنیاوی امور سے کچھ سروکار نہ ہو تو کیا مذہب حق کی خدمت کے لئے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں پس ان لوگوں کے لئے جو خدام دین ہیں کسب ناپسندیدہ ہے اوروں کے لئے نہیں بلکہ اوروں سے ترک کسب پر باز پرس ہوگی۔

فقراء کی شان

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا کہ صدقہ ان لوگوں کا حق ہے کہ اللہ کے کام میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ نہ تجارت کرتے ہیں نہ زراعت کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک شخص سے دو کام نہیں ہوتے تو لـلفقراء میں لام استحقاق کا ہے کہ ان کا حق ہے تو حق تعالیٰ کی تصریح سے ان کا قرض دیانۃ واجب ہے پس جب کہ ان کا حق ہے تو وہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں مگر غیرت علم کی وجہ سے مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ علم وہ چیز ہے کہ صاحب علم کے دماغ میں اس سے علو اور استغناء پیدا ہو جاتا ہے اور یہ جو لوگ اسوقت ادھر ادھر وعظ کے ذریعہ سے مانگتے اور علماء کے طبقہ کو ذلیل کرتے پھرتے ہیں ان میں دینداری تو کیا استعداد علمی بھی نہیں ہے تو یہ علماء نہیں ہیں۔ بس یہی ہے کہ ادھر ادھر کے مضامین یاد کر لئے ہیں۔ اب انہی پر لوگ اور علماء کو بھی قیاس کرتے ہیں حالانکہ جو عالم ہوگا گو باعمل نہ ہو پھر بھی وہ ایسی حرکتوں سے علم کی تذلیل نہ کرے گا۔

لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے)

دباؤ سے چندہ لینا ناجائز ہے

فرمایا کہ مدارس کے چندوں کے بارے میں ہمیشہ سے میری رائے یہ ہے کہ زور دے کر اور دباؤ ڈال کر وصول نہ کئے جائیں اور اس طرز کو میں سدا سے ناجائز کہتا تھا لیکن اب اس کے متعلق ایک عجیب تائید تفصیل کے ساتھ قرآن شریف کی آیت سے مل گئی جس پر اس کے قبل کبھی نظر نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ ہے کہ چندہ لینے میں ایک سوال کا مرتبہ ہے اور وہ ناجائز ہے اور ایک ترغیب کا مرتبہ ہے اور وہ جائز ہے اور سند اس کی کلام مجید کی اس آیت سے ملتی ہے خدا تعالیٰ مذمت سوال میں فرماتے ہیں کہ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا اس سے معلوم ہوا کہ سوال نہ کرنا چاہیے اور دوسری جگہ فرماتے ہیں وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ. اس لئے چندے میں ترغیب کا مضائقہ نہیں کیونکہ حفاظت دین ضروری امر ہے اور بغیر سلسلہ تعلیم و تعلم ممکن نہیں اور یہ سلسلہ اس وقت عادۃً بدوں اعانت نہیں چل سکتا۔ پس اعانات ایک امر خیر کا مقدمہ اور موقوف علیہ ہے لہٰذا خیر ہے بلکہ ایک امر ضروری کا مقدمہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ پھر فرمایا کہ جس طرح علماء کو دباؤ ڈال کر سوال نہ کرنا چاہیے اسی طرح اہل دنیا کو ترغیب پر انکار بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا یُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا یَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝ اِنْ یَّسْئَلْكُمُوْهَا فَیُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَیُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ ۝

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم لوگ ایمان لا کر متقی بن جاؤ تو خدا تعالیٰ تم کو اجر بھی دے گا اور تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا کیونکہ اگر تم سے تمہارے مال کا خدا تعالیٰ سوال کرے اور سوال میں مبالغہ بھی کرے تو تم ضرور بخل کرو گے

اور تمہارے بخل کو یہ سوال ظاہر کرے گا (گویا اڑ کر سوال کرنے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس پر دینے کو جی نہیں چاہتا اور انسان انکار ہی کر دیتا ہے اور اسی طبعی خاصہ کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ خدا تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا لیکن اس سوال نہ کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بالکل چھٹکارا ہو گیا اور اب کوئی بات بھی ہمارے ذمہ نہیں رہی کیونکہ باوجود سوال نہ کرنے کے) اے لوگو تم کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوۃ (ترغیب) دی جائے گی اور تم لوگوں کی محبت مال اور دینی بے پروائی سے یہ خیال ہے کہ کچھ لوگ تم میں سے ترغیب پر دینے میں بھی بخل کریں گے لیکن یہ سمجھ لو کہ وہ لوگ اپنا ہی نقصان کریں گے (کیونکہ اس اعطاء کا ثواب ان ہی کو ملتا ہے) خدا (تو تمہارے مالوں سے) بالکل غنی ہے اور تم (اس کے افضال اور انعامات کے) سراپا محتاج ہو اور (سن رکھو کہ) اگر تم لوگ (اس طرح بھی دینے سے) پھر و گے تو خدا تعالیٰ (تم کو نیست و نابود کر کے) تمہاری جگہ دوسری ایسی قوم پیدا کرے گا کہ وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر اڑ کر سوال کرنے پر انکار کیا جائے تو چنداں عیب نہیں کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ ہے لیکن اگر محض ترغیب پر انکار کیا جائے تو سخت وبال کا اندیشہ ہے پس چندہ مانگنے والوں کو بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے فرمانے سے کام نہ لیں محض ترغیب کا مضائقہ نہیں اور اس کی دو صورتیں خاص ہو ہی نہی اور یا اگر خاص خطاب ہو تو ایسے بے تکلف دوست تکلف تم سے انکار بھی کر سکے۔

سوال اور الحاف برا ہے

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم لوگ ایمان لا کر متقی بن جاؤ تو خدا تعالیٰ تم کو اجر بھی دے گا اور تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا کیونکہ اگر تم سے تمہارے مال کا خدا تعالیٰ سوال کرے اور سوال میں مبالغہ بھی کرے تو تم ضرور بخل کرو گے اور تمہارے بخل کو یہ سوال ظاہر کر دے گا (گویا اڑ کر سوال کرنے کا یہ خاصہ ہے کہ اس پر دینے کو جی نہیں چاہتا۔ اور انسان انکار ہی کر دیتا ہے اور اس طبعی خاصہ کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ایک گونہ ان لوگوں کو معذور رکھ کر یہ فرما دیا کہ خدا تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا لیکن اس سوال نہ کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بالکل چھٹکارا ہو گیا اور اب کوئی بات بھی ہمارے ذمہ نہیں رہی کیونکہ باوجود سوال نہ کرنے کے) اے لوگو! تم کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت (ترغیب) دی جائے گی (اور تم لوگوں کو جو محبت مال اور دینی بے پروائی ہے اس کے سبب) کچھ لوگ تم میں سے ترغیب دینے میں بھی بخل کریں گے لیکن یہ سمجھ لو کہ وہ لوگ اپنا ہی نقصان کریں گے (کیونکہ اس دینے کا ثواب انہیں کو ملتا اور انہیں کی دینی اور دنیوی ضرورتیں اس سے پوری ہوتیں) خدا (تمہارے مالوں سے) بالکل غنی ہے اور تم (اس کے افضال اور انعامات کے) سراپا محتاج ہو اور (سن رکھو کہ) اگر تم لوگ (اس طرح بھی دینے سے) پھرو گے تو خدا تعالیٰ (تم کو نیست و نابود کر کے) تمہاری جگہ دوسری ایسی قوم پیدا کر دے گا کہ وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر اڑ کر سوال کرنے پر انکار کیا جاوے تو چنداں عیب نہیں کیونکہ یہ انسان کا طبعی خاصہ ہے لیکن اگر محض ترغیب پر انکار کیا جاوے تو سخت وبال کا اندیشہ ہے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سوال والحاف برا ہے اور دعوت و ترغیب حسن ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

ترجمہ: اللہ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو (اور) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو۔

تفسیری نکات

سود کے مال میں برکت نہیں ہوتی

ارشاد فرمایا ہے يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا محق سے مراد محق برکت ہے نہ محق ذات ربوا۔ کیونکہ ذات ربوا اکثر ربوا خواروں کے پاس موجود رہتی ہے یہی روپیہ حاصل کردہ سود بنفسہ قائم رہتا ہے لیکن برکت اس سے مسلوب ہوتی ہے یعنی مالک کے حوائج ضروریہ میں کارآمد نہیں ہوتا بلکہ فضولیات میں صرف ہوتا ہے مثلاً عمارت تیار کرنا۔ بیاہ شادی میں اڑانا اس کے لوازمات میں خرچ کرنا اگرچہ ہاتھ ہی سے اٹھتا ہے لیکن اس کے کارآمد نہیں ہوتا سو ثابت ہوگیا کہ ربوا سے مراد برکت ربوا ہی ہے ذات ربو نہیں اور ربوا کی کوئی تخصیص نہیں ہر شے حرام کی یہی حالت ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۗ

(یعنی اگر مقروض تنگ دست ہو تو اس کو مہلت دینی چاہیے جب تک کہ وہ دے سکے)

قرض کا ایک ضروری حکم

اور آپ کے اس قرض کا وقت وہ مقرر ہے جبکہ شادی ہو خواہ کسی کے پاس ہو یا نہ ہو اور ایک حکم یہ ہے کہ مدیون جس وقت ادا کرنا چاہے تو ادا ہو سکتا ہے اگر کوئی ایک مدت کا وعدہ بھی کر کے قرض لے اور اس مدت سے پہلے ادا کرے تو دائن کو نہ لینے کا اختیار نہیں اسی وقت لینا پڑے گا اور آپ کے اس نیوتہ کو اگر کوئی بلاتقریب کے واپس کرنا چاہے تو نہیں لیا جاتا یہ کیسا قرض ہے۔ یہ حق تعالیٰ کے احکام میں مداخلت ہے اور ایک فساد اس میں بہت بڑا یہ ہے کہ جب نیوتہ قرض ہوا تو قرض میں میراث جاری ہوتی ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ عورت مرجاتی ہے تو اس کے وارث خاوند پر نالش کر کے مہر کا روپیہ وصول کر لیتے ہیں تو نیوتہ کے روپیہ میں بھی میراث جاری ہونی چاہیے اور حصہ شرعی کے موافق سب وارثوں کو پہنچنا چاہیے مگر اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتا یہ میراث کے احکام کو بدلنا ہے جس کی نسبت قرآن شریف میں ہے۔

فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا یعنی میراث کی تقسیم خدائے تعالیٰ کی مقرر کردہ ہے اور خدائے تعالیٰ علیم و حکیم ہیں

تقسیم کے مواقع اور مقادیر حصص کو تم سے زیادہ جانتے ہیں اسی کے آگے دوسری آیت ہے۔

وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

یعنی خدائے علیم حلیم کے مقرر کردہ احکام ہیں جو کوئی اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کو مانے گا اس کو جنت میں داخل کریں گے اور جو کوئی اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کو نہ مانے گا اس کو دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈالیں گے۔

اس آیت میں وصیۃ من اللہ سے احکام میراث میں تشدد پیدا ہوتا ہے پھر حکم ماننے پر وعدہ ہونے اور حکم نہ ماننے پر وعید ہونے سے اس میں اور تاکید ہوتی ہے اور وعید بھی کیسی کہ جس کی شدت ظاہر ہے اب دیکھئے کہ نیوتے میں کیا ہوتا ہے۔ اگر دینے والا بہت جگہ نیوتہ چھوڑ کر مر جاتا ہے تو وہ نیوتہ بڑے بیٹے کی شادی کے وقت ادا کیا جاتا ہے اور وہ اس کو اپنی شادی کے خرچ میں لاتا ہے حالانکہ یہ سب وارثوں کا مال ہے جو ایک کے خرچ میں آ رہا ہے اس سے کھانا کیا جاتا ہے اور سب برادری کھاتی ہے اس میں دوسرے وارثوں کی حق تلفی ہوئی۔ اور بلا اجازت ان کے ان کھانے والوں نے کھایا یہ حق العبد ہوا اور اگر ان وارثوں میں کچھ نابالغ بچے بھی ہیں تو ان کا حصہ بھی کھانے والوں نے کھایا۔ اس میں حق العبد ہونے کے ساتھ اتنا اور اضافہ ہے کہ یتامی کا مال ہے جو ظلماً کھایا گیا جس کی نسبت قرآن شریف میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا یعنی جو لوگ یتیموں کا مال بلا کسی حق کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور عنقریب دوزخ میں جائیں گے۔

یہ آپ کے نیوتہ کے مختصر نتائج ہیں جن میں ساری برادری والے گرفتار ہوتے ہیں کیا کوئی مسلمان ان وعیدوں کے سننے کے بعد اس کے جاری رکھنے کی جرأت کرے گا دینا تو درکنار یہ ایسی وعیدیں ہیں کہ ان کے خوف سے عجب نہیں کہ اپنا آتا ہوا بھی وصول کرنا بھول جائے۔ یہ تو ایسی رسم کا حال ہے جس کو سب سے اچھی رسم کہا جاتا ہے اور جن رسموں کو آپ خود بھی برا کہتے ان کا حال کیا ہوگا یہ تو خوشی کی رسمیں ہیں اسی کے قریب قریب غمی کی رسمیں ہیں۔

جب کوئی مرتا ہے تو اس کی فاتحہ، تیجہ اور دسواں سب اسی کے مال میں سے ہوتا ہے حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ وہ مال وارثوں کا حق ہو چکا سب سے اول تو اس قرض میں دینا چاہیے جو کوئی چیز گروی رکھ کر لیا گیا ہے۔ تجہیز و تکفین بھی اس کے بعد ہے وہ گروی چیز چھڑا کر بیچی جاوے اور اس میں سے تجہیز و تکفین کی جاوے اور بعد تجہیز و تکفین کے اور قرض دیئے جاویں اور میراث بعد ادائے قرض ہے رہی میت کی فاتحہ اور ایصال ثواب اس کا شریعت میں کہیں پتہ نہیں ہے اس کو کوئی حق میت کے مال کے متعلق نہیں قرار دیا گیا اگر میت کسی مصرف میں صرف کرنے کی وصیت بھی کر جائے تب بھی ایک

تہائی سے زیادہ میں نافذ نہیں اور اس تہائی سے مراد بھی اس مقدار کا تہائی ہے جو بعد ادائے قرض بچے اگر قرض میں سب آ جائے تو وصیت بھی نافذ نہیں۔

اب دیکھ لیجئے کہ آپ کے یہاں میت کا مال کس طرح اڑایا جاتا ہے نہ کسی کو قرض کی خبر نہ وصیت کی نہ میراث کی بلا سوچے سمجھے سب سے پہلے تیجہ اور دسویں پر لگا دیا جاتا ہے جس کا شرعاً یہ حکم ہوا کہ اگر میت قرض دار ہے تو تیجہ اور دسویں کے کھانے والے ان قرض خواہوں کا حق مارتے ہیں اور اگر میت قرضدار نہیں بھی ہے تو وارثوں کا حق اس مال کے ساتھ متعلق ہو چکا ان کا حق مارنے والے ہیں۔ غرض ہر صورت میں حق العبد کے دین دار ہیں یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ وارثوں کی تو اجازت ہوتی ہے کیونکہ میں بارہا بیان کر چکا ہوں کہ رسمی اور شرما حضوری کی اجازت معتبر نہیں۔ اجازت جب معتبر ہے کہ مال تقسیم کر کے سب کو دیدیا جائے پھر ان سے کہا جائے کہ اتنا اتنا سب مل کر دو تو فاتحہ کی جائے یہ اجازت معتبر ہو سکتی ہے مگر یاد رکھئے کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو ایک وارث بھی آیا ہوا پیسہ دینا گوارا نہ کرے گا یہ حکم بھی بالغین کا ہے اور اگر وارثوں میں کوئی نابالغ ہے تو بعد تقسیم کے بھی اس کا خوشی سے دینا معتبر نہیں۔

فقہ کا مسئلہ ہے کہ نابالغ کے تصرفات تبرعات کے متعلق نافذ نہیں غرض یہ مال جو تیجہ اور دسویں پر لگایا جاتا ہے مال سحت ہے غنی کو یا فقیر کو کسی کو بھی اس کا کھانا جائز نہیں کیونکہ حق غیر ہے خاص کر اس صورت میں کہ جب وارث نابالغ ہوں کہ اس میں حق غیر ہونے کے ساتھ اتنا اور اضافہ ہے کہ مال یتامی ہے جس پر قرآن شریف کی یہ وعید ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا۔

آثم قلبہ کا مفہوم

وَمَنْ یَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ (اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گناہ گار ہوگا)

فرمایا کہ آثم قلبہ میں قلب کی تخصیص اس لئے کی کہ کتمان اصل فعل قلب کا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جوارح کو سزا نہ ہوگی بلکہ جوارح کو بھی سزا دی جائے گی۔

قرض دیتے وقت لکھنے کا حکم

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا الایۃ. یعنی لکھنے سے اکتاؤ نہیں چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا اور فرمایا کہ لوگ خدا تعالیٰ کی وسعت رحمت پر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ وغیرہ سے استدلال کرتے ہیں لیکن میں اس آیت یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ الخ. سے استدلال کرتا ہوں کیونکہ خداوند کریم کے نزدیک دنیا نہایت ذلیل ہے تو جب اس کی حفاظت کے لئے یہ طرق بتلائے تو معلوم ہوا کہ خدائے کریم ہماری آخرت میں تو ذرا بھی کمی نہ فرمائیں گے غرض ہر شئے میں ایک طریقہ خاص ہے اسی کے موافق اس کو انجام دینا چاہیے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا

ایک معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو) آخر رکوع تک یہ بہت بڑی آیت ہے حتیٰ کہ اس سے بڑی کوئی اور آیت قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ جب ادھار کا کوئی معاملہ کرو تو اس کو لکھ لو اس کے بعد کاتب کے لئے کچھ ہدایات ہیں پھر یہ ارشاد ہے کہ دو گواہ کرلو پھر گواہوں کے متعلق کچھ ہدایات ہیں پھر آگے دین کا ذکر ہے اور اس کے متعلق کچھ ہدایات ہیں غرض اس آیت میں اول سے آخر تک کہیں عذاب ثواب کا ذکر نہیں صرف بعض معاملات کا ذکر ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اس کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر دارو گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے۔ جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب ہم کو کوئی ایسا بار (دنیا یا آخرت) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگزر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں آپ ہم کو کافروں پر غالب کیجئے۔

تفسیری نکات

بیان اعذار میں حکمت

جیسے ایک شخص نمازی ہے نماز کو ضروری سمجھتا ہے اس کی پابندی بھی کرتا ہے وضو کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں بھی وضو کو ترک نہیں کرتا وہاں ضرورت ہے اعذار شرعیہ بتلانے کی کہ ان اعذار سے وضو ساقط ہو کر تیمم جائز ہو جاتا ہے تطہیر ثیاب معاف ہو کر ناپاک کپڑوں ہی سے نماز درست ہو جاتی ہے استقبال قبلہ معاف ہو کر جس طرح بھی نماز پڑھ سکے نماز صحیح ہے اور قیام پر قادر نہ ہو تو قعود سے اور قعود پر قدرت نہ ہو تو اضطجاع سے نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں بیان اعذار کی ضرورت کا راز یہ ہے کہ اگر ایسے شخص کو اعذار نہ بتلائے جائیں تو اس کو اعتقادی اور عملی تنگی پیش آئے گی۔ اعتقادی تنگی تو یہ ہوگی کہ اس کو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ اور شبہ ہو گا جو کہ زوال یا ضعف ایمان کا سبب ہے اور عملی تنگی یہ پیش آئے گی کہ اگر اس کو تیمم کا قاعدہ نہ بتلایا گیا تو وہ عذر کے وقت مجبور ہو کر وضو ترک کرے گا اور چونکہ وضو کو شرط سمجھتا ہے اس لئے بے وضو نماز پڑھے گا نہیں یہ عملی تنگی ہے پس ایسے شخص کے

سلامت ایمان اور سلامت اعمال کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اعذار شرعیہ کے احکام سے مطلع کیا جائے اس سے اس کا ایمان یوں سلامت رہے گا کہ اس کو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ نہ ہوگا اور عمل یوں سلامت رہے گا کہ وہ کسی عذر کے وقت عمل کو فوت نہ کرے گا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے بلکہ ثواب وعذاب کا مدار کسب واکتساب پر ہے معلوم ہوا کہ انسان اختیارات کا مکلف ہے اور احوال اختیاری نہیں اس لئے ان کا مکلف نہیں اور یہ بات اس آیت کے شان نزول سے زیادہ واضح ہو جائے گی کیونکہ اس کا نزول احوال کی تحقیق میں ہے۔ شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ جب آیت اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔ نازل ہوئی تو صحابہ اس سے ڈر گئے کیونکہ مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ بظاہر عام ہے وساوس غیر اختیاریہ وعزائم اختیاریہ سب کو تو صحابہ یہ سمجھے کہ شاید ان سب پر مواخذہ ہوگا اور اس خیال کا منشا صحابہ کی قلت علم نہ تھا بلکہ اسکا منشا غلبہ عشق تھا جس کی شان یہ ہے

باسایہ ترانمی پسندم عشق ست و ہزار بدگمانی

عاشق کو ضعیف احتمالات پر بھی بڑی فکر رہتی ہے ورنہ صحابہ قواعد سمعیہ وعقلیہ سے جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ فرمائیں گے کیونکہ مقتضائے رحمت کے خلاف ہے مگر عشق ومحبت کی وجہ سے خشیت کا غلبہ تھا آیت میں عموم دیکھ کر ڈر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہنا چاہتے ہو۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہو کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے صحابہ نے ادب سے کام لیا اور سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہا گو زبان لڑکھڑاتی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ وساوس غیر اختیاریہ میں شاید اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکے مگر ادب کی وجہ سے اطاعت کا وعدہ کر ہی لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا پسند آگئی اس پر اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر سورۃ تک آیت نازل ہوئیں اور ادب کی برکت سے آیت کی تفسیر کر دی گئی۔ ادب بڑی چیز ہے۔ مولانا نے ادب کے متعلق قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اور ان پر عتاب ہوا اور حضرت آدم نے رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا کہا اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی تو بعد میں ان سے پوچھا کہ اے آدم خالق افعال تو میں ہوں تم نے ظلمنا انفسنا کیونکر کہا۔ آدم علیہ السلام نے جواب دیا۔

گفت من ہم پاس آنت داشتم لیک من پاس ادب نگذاشتم

اسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہاں ادب سے کام لیا کہ خود اس آیت کی تفسیر نہ کی ورنہ آپ خود بھی تفسیر کر سکتے تھے مگر آپ نے وحی کا انتظار کیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کی تعریف ہے کہ سب نے ایمان پر استقامت ظاہر کی اور سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا اور جس کی کوتاہی کا اندیشہ تھا اس نے استغفار کیا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۝ اس تعریف کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر کی گئی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا میں جس کا حاصل یہ ہے کہ مدار تکلیف کا صرف اختیار ہے اور خطرات اختیاری نہیں تو عبد ان کا مکلف بھی نہیں۔ اب اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ غیر اختیاری کا مکلف تو نہ ہو مگر اس پر مواخذہ ہو جاوے اس کا جواب آئندہ جملہ میں ارشاد فرمایا گیا۔

امورِ غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ ہوگا

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ کیونکہ کسب واکتساب کے معنی عمل بالاختیار کے ہیں اور لھا و علیھا میں لام اور علی کا مدلول ثواب وعقاب ہے پھر دونوں مجرور کو مقدم کیا گیا ہے جو مفید حصر ہے اس حصر سے معلوم ہو گیا کہ استحقاق ثواب وعقاب صرف امور اختیاریہ ہی پر ہے۔ پس آیت بالا کی تفسیر ہو گئی کہ مراد مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ سے اعمال اختیاریہ ہیں اور مسئلہ کا منصوص ہونا ثابت ہو گیا جس کا میں نے دعویٰ کیا تھا اسی مسئلہ پر اپنے مقصود کی پھر تصریح کرتا ہوں کہ جب ثواب وعقاب کا مدار اختیار پر ہے اور مقصود عبد کا صرف حصول ثواب اور نجات عن العقاب ہے پھر غیر اختیاری کے فکر میں کیوں پڑے یہاں ایک اور سوال کے جواب پر بھی متنبہ کرتا ہوں وہ سوال یہ ہے کہ بعض مصائب ایسے آتے ہیں جو تحمل سے زیادہ ہوتے ہیں جواب یہ ہے کہ یہاں تکلیف سے مراد تکلیف شرعی ہے تکلیف تکوینی مراد نہیں سو اس کی یہاں نفی نہیں پس امور تکوینیہ میں فوق طاقت کا وقوع ہو سکتا ہے شاید اس پر یہ سوال کہ جب تشریعات میں رحمت کی وجہ سے یہ قاعدہ ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا تو تکوینیات میں بھی رحمت کا یہ مقتضیٰ کیوں ظاہر نہ ہوا جواب یہ ہے کہ تکوینیات میں بوجہ زیادت اجر کے فوق طاقت کا وقوع خلاف رحمت نہیں) رہا یہ سوال کہ پھر تشریعیات میں بھی زیادت اجر کے لئے ایسا کیا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تشریع سے عمل مقصود ہے اور فوق طاقت کا صدور کیونکر ہوتا اور تکوینیات میں صدور اس کا فعل نہیں ایک دوسری بات مطلوب ہے جو کہ وہ اختیاری ہے یعنی صبر کہ خدا تعالیٰ کی شکایت نہ کرے اور اس میں بھی اتنی توسیع ہے کہ حقیقی شکایت نہ کرے گو صورت شکایت ہو جائے تو وہ معاف ہے۔

بس شکایت حقیقی نہ ہونا چاہیے اور یہ امر اختیاری ہے اور تکوینیات میں انسان اسی کا مکلف ہے اس کے سوا کسی عمل وغیرہ کا مکلف نہیں۔ پس تکوینیات میں فوق الطاقت کا وقوع جائز ہے اور تشریعیات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں تکوینیات کے بارہ میں آگے دعا کی تعلیم ہے کہ فوق الطاقت مصائب سے بچنے کی بھی دعا مانگا کرو چنانچہ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا کے بعد جو کہ تشریعیات کے باب میں ہے اس کا اضافہ بھی فرمایا گیا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۔ ایک نکتہ اس مقام میں قابل غور یہ ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ میں دو عنوان کیوں اختیار کئے گئے حالانکہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اور ایک مقام پر ارشاد ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ ان جگہوں میں اکتساب نہیں فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ اکتساب میں کسب سے زیادت ہے کیونکہ افتعال کی خاصیت تکلف ہے اب خیر کے لئے کسب اور شر کے لئے اکتساب اختیار کرنے میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاصی کے لئے انسان کو اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے گو وقوع اس کا سہولت سے ہو جائے مگر اہتمام شر کے لئے زیادہ ہوتا ہے اور خیر کے لئے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان کی اصلی فطرت خیر ہے جیسا کہ حدیث **کل مولود یولد علی الفطرة.** سے معلوم ہوتا ہے اور فطریات کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی نیز خیر سے مانع کوئی قوی قوت انسان کے اندر نہیں رکھی گئی اور شر سے مانع ایک قوی قوت اس کے اندر موجود ہے یعنی عقل، عقل خود معاصی سے روکتی ہے اسی لئے بعد

معاصی کے انسان کوندامت بے حد ہوتی ہے اس لئے شر کے واسطے اکتساب فرمایا اور خیر کے لئے کسب اور جو حدیث میں ہے حفت الجنة بالمکارہ و حفت النار بالشھوات. وہ اس تقریر کے منافی نہیں کیونکہ شر میں فی نفسہ سہولت نہیں ہاں عادت کے غلبہ سے وہ سہل اور مرغوب ہو جاتی ہے اور خیر میں فی نفسہ دشواری نہیں ہاں عادت نہ ہونے سے اس میں عارضی دشواری ہو جاتی ہے اور اسی درجہ کے لحاظ سے ان کو مکارہ کہا گیا ہے اب کچھ اشکال نہ رہا (میں کہتا ہوں کہ یہاں کسب واکتساب میں تبدیل عنوان کی توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خیر میں مطلق کسب پر اجر ملے گا خواہ اتفاقاً خیر کا صدور ہو جائے اور شر میں مطلق کسب پر عذاب نہیں بلکہ تعمد کسب پر مواخذہ ہوتا ہے چنانچہ خطا ونسیان عفو ہے واللہ اعلم)

ایک سوال و جواب یہاں حصر کے متعلق ہے جو لہا اور علیہا کی تقدیم سے حاصل ہوا ہے وہ یہ کہ اس حصر سے لازم آتا ہے کہ جیسے عقاب بلا کسب نہیں ہونا چاہیے کہ ثواب بھی بلا کسب نہ ہو حالانکہ ثواب کبھی بلا عمل محض فضل سے بھی مل جاتا ہے جیسا کہ نصوص میں وارد ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ حصر باعتبار حصول کے نہیں بلکہ باعتبار استحقاق کے ہے یعنی استحقاق تو ثواب کا بھی بدوں کسب نہیں گو عطا ہو جاوے اور اوپر میرے کلام میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ (اے ہمارے رب! ہم پر دارو گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجے جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو)

جو چیزیں اس آیت میں مذکور ہیں یعنی نسیان اور خطا وغیرہ ان پر مواخذہ نہ ہونا اس کا لوگوں سے وعدہ ہو گیا تھا اور پہلی آیت یعنی

اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں اگر تم ظاہر کرو گے یا کہ پوشید رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے۔

بالمعنی العام منسوخ ہو گئی تھی نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمادیا ہے کہ رفع عن امتی الخطاء والنسیان میری امت سے خطا اور بھول معاف کر دی گئی۔

مگر پھر بھی یہ حکم ہوا کہ یوں ہی مانگے جاؤ اور یہ دعا تعلیم کی گئی تو بات یہ ہے کہ منسوخ ہونے کے قبل تو یہ سوال طلب کے لئے تھا کہ ہم سے یوں مانگا کرو اب بطور شکر کے ہے کہ جیسے ہم ملنے سے پہلے محتاج تھے اب بھی محتاج ہیں۔

غیر اختیاری وساوس پر موخذہ نہیں

ایک نکتہ اس مقام پر قابل حل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا کی ہم کو تعلیم فرمائی ہے اور حدیث میں ہے کہ یہ دعا قبول ہو چکی ہے چنانچہ حضور فرماتے ہیں رفع عن امتی الخطاء والنسیان. اب سوال یہ ہوتا ہے کہ نسیان وخطا امر اختیاری ہے یا غیر اختیاری ظاہر یہ ہے کہ غیر اختیاری ہے اور لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا الخ

سے معلوم ہو چکا ہے کہ غیر اختیاری پر مواخذہ نہیں پھر بعد رفع مواخذہ آئندہ کے لئے دعائے عدم مواخذہ کی تعلیم کے کیا معنی جبکہ مواخذہ کا احتمال ہی نہیں دوسرا اشکال یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے رفع خطاونسیان اس امت کے ساتھ مخصوص ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ دوسری امتوں پر مواخذہ تھا اور یہ عقل کے خلاف ہے کہ دوسری امتوں کو تکلیف مالا یطاق دی گئی ہے نیز نص لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا میں نفس عام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشریعیات میں تکلیف لایطاق کسی کو نہیں دی گئی اور عقل بھی عموم کو چاہتی ہے اس کے جوابات علماء نے مختلف دیئے ہیں مگر میرے ذہن میں جو جواب آیا ہے میں اس کو عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ خطرات وساوس میں دو درجے ہیں ایک درجہ حدوث کا ہے وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک درجہ بقاء کا ہے یہ بعض اوقات اختیاری ہوتا مثلاً کسی اجنبیہ کا دل میں بلا قصد خیال آ گیا تو یہ غیر اختیاری ہے مگر اس وسوسہ کا کچھ دیر تک باقی رہنا یہ بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے اور یہ بقاء کبھی قصیر ہوتا ہے اور کبھی طویل اور بقاء اکثر ہوتا ہی ہے۔ کیونکہ وسوسہ کا ایسا وقوع نادر ہی ہے کہ حدوث کے ساتھ ہی فنا ہو جاوے زیادہ یہی ہے کہ وسوسہ کچھ دیر کو ضرور باقی رہتا ہے مگر انسان کو اکثر بقاء قصیر کا احساس کم ہوتا ہے بقاء طویل ہی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ ابتداء میں اس کو اس پر التفات نہیں ہوتا کہ وسوسہ درجہ حدوث سے تجاوز کر کے درجہ بقاء حاصل کر چکا ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھو کہ درجہ حدوث پر تو کسی سے مواخذہ نہیں کیونکہ وہ تو من کل وجہ غیر اختیاری ہے اور تیسرے درجہ پر سب سے مواخذہ ہے یعنی بقاء طویل پر کیونکہ وہ من کل وجہ اختیاری ہے اب ایک درجہ بیچ کا ہے یعنی جبکہ وسوسہ کو بقاء قصیر ہو یہ امت محمدیہ سے عفو ہے اور پہلی امتوں سے اس پر مواخذہ تھا کیونکہ یہ درجہ فی نفسہ اختیاری ہے اس لئے محل مواخذہ ہونے کے قابل ہے مگر مشبہ غیر اختیاری کے ہے اس لئے امت محمدیہ سے اس کے متعلق مواخذہ مرتفع ہو گیا رہا یہ سوال کہ جب یہ درجہ مشابہ غیر اختیاری کے ہے تو پہلی امتیں اس سے کس طرح بچی ہوں گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب فی نفسہ اختیاری ہے تو وہ اہتمام مزید کر کے بچے ہوں گے اور نہ بچتے ہوں تو ان پر اس سے استغفار واجب ہوگا اور امت محمدیہ پر اس سے استغفار کا وجوب نہ ہوگا گو استحباب ضرور ہے او یہی دو درجہ خطا ونسیان میں ہیں کہ خود خطا ونسیان تو غیر اختیاری ہے مگر اس کا منشاب یعنی عدم

گو استحباب ضرور ہے اور یہی دو درجہ خطا ونسیان میں ہیں کہ خود خطا ونسیان تو غیر اختیاری ہے مگر اس کا منشاء یعنی عدم

استحضار وغفلت ہی سے ہوگا چنانچہ اگر دن میں ہر وقت روزہ کا دھیان رہے تو نسیان طاری نہ ہوگا نماز میں اگر افعال صلوٰۃ پر پوری توجہ ہو تو سہو نہ ہوگا اور یہ امر اختیاری ہے کہ توجہ رکھو تو اس کے ترک پر مواخذہ ہو سکتا ہے اب آیت وحدیث رفع عن امتی الخ پر تو اشکال نہ رہا لیکن ایک مستقل اور اشکال وارد ہوگا کہ رسول اللہ علیہ وسلم کو جو نماز میں سہو ہوا ہے کیا اس کا منشاء بھی عدم استحضار افعال صلوٰۃ تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں سہو نبوی کی علت بھی یہی ہے لیکن علت عدم استحضار افعال صلوٰۃ ہم میں اور ہے اور حضور اقدس میں اور یعنی ہماری عدم توجہ الی الصلوٰۃ کا منشاء تو یہ ہے کہ ہم کو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی ہے جو نماز سے ادنیٰ ہے یعنی دنیا اور حضور کی عدم توجہ الی الصلوۃ کا منشاء یہ ہے کہ آپ کو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی تھی جو نماز سے اعلیٰ ہو۔ یعنی ذات حق خوب سمجھ لو (الفصل والانفصال ص ۳۸)

نگاہ بد اختیاری ہے

فرمایا کہ ایک صاحب کو اسی میں کلام تھا کہ نگاہ بد اختیار میں نہیں۔ اس پر بہت ہی اصرار کرتے رہے۔ میں نے کہا کہ سوچو تو بعد کو انہوں نے لکھا کہ واقعی میں غلطی پر تھا نگاہ اختیار میں ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ نفس سے تکلیف گوارا نہیں ہوتی۔ نگاہ ہٹانے میں الجھن ہوتی ہے تکلیف گوارا نہیں کرتے نفس کے ساتھ ہو لیتے ہو تمہارا جو خیال ہے اس سے تو شریعت پر اعتراض لازم آتا ہے کہ اس نے ایسی چیز کا مکلف کیا ہے جو اختیار میں نہیں۔

احقر عرض کرتا ہے کہ اس گفتگو کے وقت احقر بھی حاضر تھا۔ یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر عورت کی چھاتی پر سوار اور زنا کا مرتکب ہونے والا ہو اس وقت بھی ہٹنا اختیار میں ہے گو مشقت چاہے جتنی ہو۔ کیونکہ اس وقت بھی اس کو شریعت حکم کرتی ہے کہ اس سے باز آجاؤ ایسی حالت میں اگر اختیار نہ مانا جائے تو اس سے نعوذ باللہ قرآن کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ ارشاد ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا الخ سوچئے تو کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہاں تک یہ بات پہنچتی ہے۔

ہم کو اسی قدر کا مکلف کیا گیا ہے کہ جس قدر طاقت ہو اگر اس پر کوئی کہنے لگے کہ ہم کو تو صرف ایک ہی وقت کی نماز کی طاقت ہے تو جواب یہ ہے کہ تم نے صرف اسی کو دیکھا ہے دوسرے مقام کو نہیں دیکھا کہ حق تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز کا مکلف فرمایا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اس سے صاف معلوم ہوا کہ جتنے کا مکلف فرمایا ہے اس کی طاقت ضرور ہے پس اب جو یہاں فرمایا ما استطعتم مطلب یہ ہوا کہ جتنا تم کو بتلایا سب کرو اور یہ عنوان دل بڑھانے کے لئے فرمادیا جیسے کوئی نوکر سے کہے کہ تم سے یہ کام تو ہوسکتا ہے تو جو ہوسکتا ہے وہ تو کرو تو گویا تصریحاً متنبہ کیا کہ تم سے تو ہوسکتا ہے تو یہ شبہ تو دفع ہوگیا۔

عدم توجہی

اب ایک اور شبہ رہا کہ یہ تو مشاہدہ ہے کہ نہیں ہوسکتا تو یہ دعویٰ مشاہدہ کا بالکل غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ ہمت نہیں کرتے اس لئے کچھ ثقل معلوم ہوتا ہے جس نے انسان کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلف کیا گیا۔

آپ نے سمجھ لیا کہ نہیں ہوسکتا اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ کو رات کے وقت خفیف ترشح میں پیاس لگی مگر سردی کی وجہ سے آپ کو باہر جانا ایسا دشوار ہوا کہ یوں سمجھے کہ ہم جا ہی نہیں سکتے لیکن رات کو دو بجے کے وقت ایک سوار آیا اور پروانہ دیا کہ کلکٹر صاحب نے بلایا ہے پس آپ نے معاً حکم دیا کہ گھوڑا کسو اور بارانی پہن کر دو میل چلے گئے اور راستہ میں رعد و برق بھی ہوا سب کچھ ہوا مگر گئے ضرور تو اگر اس وقت پانی پینے کے لئے باہر نکلنا مشکل تھا تو اسی وقت دو میل چلنا کیسے آسان ہوگیا تو بات یہ ہے کہ فرق فقط ہمت کا ہے کہ اول پیاس کے وقت عزم و ارادہ نہ کیا تھا اور اب ارادہ کیا ہے تو جتنے کاموں کو آپ کہہ رہے ہیں کہ نہیں ہوسکتا ان سب میں آپ نے ارادہ ہی نہیں کیا بس یہ ہے وجہ حضرت مولانا استاذ نا کی حکایت یاد آئی کہ نماز کے بارہ میں ایک حدیث ہے کہ ایسی نماز ہو کہ جس میں حدیث النفس وسوسہ نہ دلاوے وہ حدیث

سبق میں آئی ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت کیا ایسی نماز ہوسکتی ہے مولانا نے کہا خوب فرمایا کیا کبھی ارادہ کیا تھا کہ نہیں ہوئی ویسے ہی سمجھ لیا کہ نہیں ہوسکتی کر کے دیکھا ہوتا۔ (التقوی ملحقہ مواعظ حقیقت تصوف وتقویٰ)

وسوسے آنے پر مواخذہ نہیں

(۲۴۳) فرمایا۔ معصیت اگر غلطی سے ہوجاوے تو اس کے اثر سے ظلمت مانع نہ ہوگی کیونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (۱) رفع عن امتی الخطاء والنسیان اور اس رفع عن امتی کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاء اور نسیان پر مواخذہ تو ہوسکتا تھا مگر رفع کردیا گیا کیونکہ یہ مواخذہ تکلیف مالایطاق نہیں ہے جیسا ابھی معلوم ہوگا لیکن رحمت خداوندی سے یہ خطاء ونسیان معاف فرمادیا گیا یہی وجہ ہے کہ اس نسیان وخطاء کے رفع کی دعا بھی تعلیم فرمائی۔ (۲) ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا (البقرہ:۲۸۶) اور نسیان وخطاء پر مواخذہ کا تکلیف مالایطاق نہ ہونے کی وجہ سے پیشتر کے دونوں اختیار سے باہر نہیں جیسا مولانا رومؒ ایک مقام پر فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نسیان وخطا بھول سے ہوتا ہے۔ اگر ہر وقت تیقظ رہے تو نسیان وخطا کا ہونا ممکن ہی نہیں اور ہر وقت تیقظ رکھنا گو مشکل ہے مگر ہے اختیاری اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم فرمائی (۳) ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطانا (البقرہ آیت ۲۸۶) اور اس دعا کو قبول فرما کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری فرمادیئے۔ رفع عن امتی الخطاء والنسیان۔ بخلاف امم سابقہ کے کہ ان سے خطاء ونسیان پر بھی مواخذہ ہوتا رہا کیونکہ یہ مالایطاق نہیں جیسا ابھی مذکور ہوا اسی طرح حدیث میں ہے' میری امت سے وسوسہ پر مواخذہ نہ ہوگا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وسوسہ پر مواخذہ ہوسکتا ہے اور وہ بھی مالایطاق ہے اگر مالایطاق ہوتا تو اس میں اس امت کی کیا تخصیص ہوتی۔ اس کے مایطاق ہونے کی تحقیق یہ ہے کہ وسوسہ جو ذہول وعدم تنبہ سے ہو سو حدوث وسوسہ تو غیر اختیاری ہے۔ اور اس پر کسی سے مواخذہ نہیں ہے اس امت کو بھی تخصیص نہیں اور بقاء وسوسہ جو عدم تنبہ سے ہو سو یہ درجہ تنبہ نہ ہونے تک امم سابقہ سے معاف نہ تھا اور ہماری اس امت سے معاف ہے۔ باقی تنبہ ہوجانے کے بعد پھر وسوسہ وغیرہ کا امتداد یہ کسی سے بھی معاف نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت)

سُورۃ اٰل عِمرٰن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی) مثلاً عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے نمبر (یعنی نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیاوی زندگی میں اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

تفسیری نکات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان چیزوں کو دیکھا تو جو اثر ان پر ہوا اور جو رائے انہوں نے ظاہر کی وہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد ان پر یا ان کے پیروکاروں پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مطلقاً ترک دنیا سکھاتے ہیں۔ پہلے تو آپ ان ذخائر وغنائم کو دیکھ کر روئے اور پھر یہ دعا کی کہ اے اللہ یہ تو ہم نہیں عرض کرتے کہ آپ ان چیزوں کی محبت ہمارے دل سے نکال دیجئے کیونکہ آپ کا ارشاد ہے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ جب آپ نے خود ان چیزوں کی محبت کو ہمارے قلوب میں مزین فرما دیا ہے تو اس کے زائل ہونے کی دعا کرنا تو سخت گستاخی ہے لیکن یہ عرض ہے کہ ان چیزوں کی محبت کو آپ اپنی محبت کی معین بنا دیجئے۔ سبحان اللہ کیا اچھی دعا فرمائی کیسا حقیقت کو سمجھا۔

زین کی دو مختلف تفسیریں

زین کی دو مختلف تفسیریں ہیں اور وہ اختلاف اس میں ہے کہ زین جو مبنی للمفعول ہے اس کا فاعل کون ہے ان چیزوں کی

جو محبت مزین (بفتح الیاء) کر دی گئی تو اس کا مزین بکسر الیاء) کون ہے یعنی اس تزئین کا فاعل کون ہے۔ یعنی اس میں اختلاف ہے کہ اس تزیین کے فاعل حق تعالیٰ ہیں یا شیطان ہے اب یہاں ضرورت علم کی ہے۔ افعال میں ایک مرتبہ تو خلق کا ہے اور ایک کسب کا سو مرتبہ خلق میں تو اللہ تعالیٰ فاعل ہیں اور مرتبہ کسب میں شیطان۔ یعنی اس زینت کے پیدا کرنے والے اور خالق تو حق تعالیٰ ہیں۔ انہوں نے یہ چیز قلب میں پیدا فرمادی اگر تم اس کو اپنے محل میں استعمال کرو تو وہ خیر ہے۔ اگر غیر محل میں استعمال کرو تو وہی شر ہے۔ یہ استعمال مرتبہ کسب کا ہے اور اس مرتبہ میں شیطان متصرف ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرتبہ خلق پر نظر تھی کیونکہ عارف کی غلبہ توحید میں اول اسی پر نظر جاتی ہے۔ اسی کے غلبہ میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا کہ ان چیزوں کی محبت تو آپ نے طبائع میں پیدا کر دی ہے یہ کیسے زائل ہو سکتی ہے اور اس سے ہم اپنا تبریہ کیسے کر سکتے ہیں۔ ہر شخص کو ان چیزوں کی طرف طبعی میلان ہے۔ روپیہ پیسہ کیا کسی کو برا لگتا ہے اگر برا لگتا تو انبیاء علیہم السلام دوسروں کو بانٹتے نہ اگر سانپ بچھو سمجھتے تو کیا دوسروں کو سانپ بچھو بانٹے جاتے ہیں۔ ہمارے حضور اقدس ﷺ نے سو سو اونٹ ایک ایک شخص کو ایک ایک وقت میں عطا فرمائے ہیں۔ کوئی بادشاہ بھی ایسی داد و دہش کیا کرے گا جیسی حضور نے کی ہے تو کیا آپ نے سانپ بچھو بانٹے۔ بہر حال ان چیزوں کی ہر شخص کو طبعی محبت ہے اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دعا نہیں کی کہ ان کی محبت زائل فرما دیجئے بلکہ یہ دعا کی کہ آپ نے جو ان چیزوں کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا کر دی ہے وہ معین ہو جاوے آپ کی محبت کی۔ غرض دنیا کی محبت میں بھی بڑی مصلحتیں ہیں۔ مولانا رومیؒ اسی مصلحت کو فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گل تخن است کہ ازو حمام تقوی روشن است

اموال دنیا کی طرف طبعی میلان

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی طرف میلان اور رغبت اور ان کی محبت آپ نے طبعی طور پر نفوس میں رکھی ہے (یہ ایک خاص تفسیر پر مبنی ہے کہ تزئین کا فاعل اللہ تعالیٰ کو قرار دیا جاوے اور اس صورت میں یہ تزئین حکمت کے لئے ہوگی خواہ وہ حکمت کچھ ہی ہو) اور جب یہ محبت طبعی ہے تو اس سے ہم بھی بری نہیں اور نہ اس کے ازالہ کی ہم دعا کرتے ہیں البتہ یہ ضرور دعاء کرتے ہیں کہ اس کی محبت معین ہو جائے آپ کی محبت میں اللہ اکبر ان حضرات کی حقائق پر کیسی نظر تھی۔ (ملفوظات جلد ۴)

ملکات اور دواعی اپنی ذات میں مذموم نہیں

حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں جب عراق فتح ہوا۔ کسریٰ کے خزائن مسجد نبوی میں لا کر ڈھیر کر دیئے گئے تو حضرت فاروق اعظمؓ نے بارگاہ حق تعالیٰ میں عرض کیا یا اللہ آپ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ یعنی لوگوں کے دلوں میں خواہشات نفسانی کی چیزیں عورتیں، بچے، سونے چاندی کے ڈھیر وغیرہ کی محبت ڈال دی گئی ہے۔

اس لئے میں یہ دعا تو نہیں کرتا کہ یہ فطرت بدل دی جائے گی مگر یہ دعاء کرتا ہوں کہ ان چیزوں کی محبت آپ کے راستہ اور آپ کی رضا جوئی میں ہمارے لئے معین و مددگار ہو جائے۔ حضرت نے اس واقعہ کو نقل کر کے فرمایا کہ اسی لئے ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ رذائل کا ازالہ مقصد نہیں۔ امالہ مقصود ہے یعنی رذائل کے جذبات و دواعی کو خیر و طاعت کی طرف مائل کر دینا مطلوب ہے اصل داعیہ کو زائل کرنا نہیں کیونکہ ملکات اور دواعی مثلاً شہوت و غضب وغیرہ۔ یہ اپنی ذات میں مذموم نہیں۔ شہوات کو حلال میں صرف کیا جائے اور قوت غضب کو شیطان اور کفر کے مقابلہ میں خرچ کیا جائے تو یہی درجات عالیہ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ حضرت مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے۔

شہوت دنیا مثال گلخن ست ۔۔۔ کہ از و حمام تقوی روشن است

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ

ترجمہ: بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے

تفسیری نکات

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ کہ دین خدا تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اہل علم اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ ترکیب مفید حصر ہے جس سے ایک گونہ قوت پیدا ہوگئی مضمون میں۔ اس سے اسلام کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ ایسا دین ہے کہ خدا کے نزدیک وہی مقبول ہے۔ یہاں یہ شبہ ظاہر میں ہوسکتا ہے کہ ادیان تو بہت ہیں۔ پھر اس کا کیا مطلب کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے یوں فرمانا چاہیے تھا کہ دین حق صرف اسلام ہی ہے مطلق دین کو اس میں منحصر کرنا کیسا؟ میں کہتا ہوں کہ حصر کے علاوہ یہ وہ دوسرا مبالغہ ہے کیونکہ قاعدہ ہے **المطلق اذا اطلق یرادبه الفرد الکامل** کہ مطلق سے فرد کامل مراد ہوا کرتا ہے پس ہر چند کہ مطلب تو یہ ہے کہ دین کامل اسلام ہی ہے اور یہ بلا کلام صحیح ہے کیونکہ دوسرے بعض ادیان تو اصل ہی سے حق نہیں اور یا منسوخ ہیں مگر مطلق کو منحصر کرنے میں ایک قسم کا دعویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام ایسا کامل دین ہے جس کے سامنے اور مذاہب اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو دین کہا جائے چنانچہ محاورات میں بولا جاتا ہے کہ بس حسین تو فلاں شخص ہے جس میں دعویٰ ہے کہ اس کا حسن ایسا کامل ہے کہ دوسرے حسین اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو ان کے سامنے حسین کہا جائے اس ادعا کی وجہ سے مطلق کا حصر کر دیا جاتا ہے۔ یہی صورت اس جگہ ہے پس حاصل یہ ہوا کہ گو ادیان اور بھی ہیں مگر اسلام ایسا کامل و مکمل دین ہے کہ اس کے سامنے دوسرے ادیان کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ فضیلت تو اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو طلب کرے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔ یہاں حقیقت کے موافق کلام فرمایا گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کو بھی دین کہہ دیا گیا' مگر اسلام کے مقابلہ میں ان کو غیر مقبول قرار دیا گیا۔ یعنی اسلام کے بغیر کسی دین کے اختیار کرنے سے نجات حاصل نہیں ہوسکتی۔

تدبیر حسن خاتمہ

امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ اگر ایمان پر خاتمہ چاہتے ہو تو ہمیشہ نعمت ایمان پر خدا کا شکر کرتے رہو کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں نعمت کو بڑھاؤں گا اسے زیادہ کردوں گا۔ سبحان اللہ یہ نہیں فرمایا لَئِنْ شَكَرْتُمْ لا اسلبنکم یالا انقصنکم کہ اگر شکر کرو گے تو میں نعمت سلب نہ کرونگا یا کم نہ کرونگا بلکہ لَاَزِيْدَنَّكُمْ فرمایا جس میں زیادت کا وعدہ ہے وعدہ زیادت سے نقصان کی نفی ہوگئی اور نفی نقصان سے سلب کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگئی کیا بلاغت ہے کہ ایک لفظ ایسا فرمادیا جس سے نقصان وسلب دونوں کی نفی بھی ہوگئی اور ترقی کا وعدہ بھی ہوگیا۔ کوئی کلام ایسا بلیغ ہے جس کے ایک لفظ سے اتنے معانی حاصل ہوتے ہوں اگر خدا فہم دے تو قرآن کا لفظ لفظ اعجاز سے بھرا ہوا ہے جب شکر پر وعدہ زیادت ہے تو جو شخص نعمت ایمان پر شکر ادا کرتا رہے گا اس کا ایمان کبھی زائل یا کم نہ ہوگا بلکہ دن بدن بڑھتا رہے گا پس یہ ورد دستور العمل بنانے کے قابل ہے اگر اپنا ایمان دنیا سے سلامت لے جانا چاہتے ہو تو ایمان کا شکر کبھی نہ بھولو۔

اللھم فلک الحمد ولک الشکر علی ماایتنی من نعمۃ الاسلام ولک الحمد ولک الشکر علی ما اکرمتنی بنعمۃ الایمان. اللھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین خیر خزایا ولا مفتونین امین ۱۲ جامع)

حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ میری امت غافل ہے یہ از خود ایمان واسلام کا شکر بہت کم ادا کریگی۔ (محاسن الاسلام ص ۲۵۶-۲۵۸)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۘ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے یوں کہئے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو چاہیں غالب کردیتے ہیں اور جس کو چاہیں پست کردیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

تفسیری نکات

آداب سوال

ارشاد فرمایا کہ اس وقت تلاوت کے وقت اس آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ کے متعلق ایک نکتہ خیال میں آیا ہے وہ یہ کہ اوپر سے اضداد کو بیان فرمایا ہے اور اس کی تعلیل میں ارشاد ہے بیدک الخیر حالانکہ اوپر دونوں ضدوں کا ذکر ہے۔ خیر کا بھی شر کا بھی۔ تعز خیر ہے تذل شر ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ بیدک الخیر والشر فرماتے چنانچہ مفسرین نے والشر مقدر کہا ہے مگر مقدر ماننے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوتی ہے پس یہ کہنا کہ بیدک الخیر یہ خود ہی بیدک الشر ہے لیکن منجملہ

آداب سوال کے یہ بھی ہے کہ صرف مطلوب کو ذکر کرتے ہیں۔ اس کی ضد کو ذکر نہیں کرتے۔ گو مسئول عنہ دونوں پر قادر ہوتا ہے مثلاً سائل ملازمت یہ نہیں کہتا۔ آپ کے اختیار میں ملازمت دینا بھی ہے اور موقوف کرنا بھی۔ (اشرف البیان)

محبیت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں

راز اس کا یہ ہے کہ اس سرکار میں محبیت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں جہاں محبیت ہے وہاں محبوبیت بھی ہے اور جہاں محبوبیت ہے وہاں محبیت بھی ہے اسی معنی کو کہا ہے

ہر کہ عاشق بینیش معشوق داں گو بوہ نسبت ہست ہمیں و ہم آں

اور اسی واسطے مشورہ دیتے ہیں

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجو شد آیت از بالاؤ پست

پیاسے کو مشورہ دیتے ہیں کہ تو پانی کا طالب ہے تو سمجھ لے کہ تو مطلوب بھی ہے جیسے تو پانی کو ڈھونڈتا ہے ایسے ہی پانی بھی تجھ کو ڈھونڈتا ہے چنانچہ صاف فرماتے ہیں

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

یعنی جیسا کہ پیاسے پانی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ایسے ہی پانی بھی خود پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے دیکھ لیجئے پیاسوں کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پیدا ہوا تو پانی جو مطلوب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت طالب اور پیاسا جو طالب سمجھا جاتا ہے اس اعتبار سے مطلوب ہے تو طالبیت اور مطلوبیت دونوں طرف سے ہوئی یہ حالت تو مخلوق کی باہم ہے اور جو کوئی خدا تعالیٰ کے ساتھ علاقہ پیدا کرے تو خدا تعالیٰ تو بہت کریم ہیں ذرا سا بہانہ ڈھونڈتے ہیں ادھر سے ارادہ ہوا اور ادھر سے خود کرم فرماتے ہیں تو جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کرے گا خدا تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ محبت کریں گے جب ادھر سے محبت ہوئی تو یہ محبوب ہو گیا نتیجہ یہی ہوا کہ محبیت کے لئے محبوبیت لازم ہے چنانچہ ایک جگہ صاف فرماتے ہیں یحببکم اللہ اس سے اوپر ارشاد ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی اور یہ اس کا ثمرہ ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے محبّ ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو حق تعالیٰ تم کو محبوب بنالیں گے یہاں بظاہر موقع تحبو اللہ کا تھا یعنی تمہارا محب ہونا اس وقت معتد بہ ہوگا جب تم اتباع کرو اس سے تم اللہ کے محبین میں شمار ہو سکتے ہو سو یہ نہیں فرمایا بلکہ یحببکم اللہ فرمایا یعنی ایسا کرنے سے تم کو حق تعالیٰ اپنے محبوبین میں داخل کرلیں گے یہ آیت تو بالکل ہی صریح ہے اس باب میں کہ محبیت کے لئے محبوبیت لازم ہے اور بہت آیتوں میں یہ مضمون آیا ہے مثلاً واللہ یحب المحسنین اور واللہ یحب الصابرین وغیرہ وغیرہ اس قسم کی بہت سی آیات ہیں یحب کے معنی یہی تو ہیں کہ محبت رکھیں گے اس کی ضمیر حق تعالیٰ کی طرف ہے تو فاعل اس کی ذات حق ہوئی اور محبت کے فاعل کو محب کہتے ہیں اور مفعول اس کا صابرین یا شاکرین ہیں بلفظ دیگر مومنین ہیں اور محبت کے مفعول کو محبوب کہتے ہیں تو مومنین کے لئے بشارت ہوئی محبوب بنالینے کی یہ مضمون جابجا آیات میں موجود ہیں اور یحببکم اللہ میں تو بالکل ہی صاف موجود ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ کتنی بڑی بات ہے اس پر تو عاشق کو شادی مرگ ہو جائے تو عجب نہیں عاشق

کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر اتنا بھی سن لے کہ محبوب نے میرا نام لیا تو پھولا نہیں سماتا اور کہاں اتنا بڑا لفظ کہ مجھ کو پسند کرلیا۔

ادا حق محبت عنایتے است زدوست — وگرنہ عشق مسکیں ہیچ خورسند است

محبوبیت کا لفظ تو بہت ہی بڑا ہے عاشق کے لئے تو محبین ہی میں شمار ہوجانا بڑے سے بڑا درجہ ہے وہ کہتا ہے۔

بمینم بس کہ داند ماہر ویم — کہ من نیز از خریداران اویم

بمینم بس اگر کاسد قماشم — کہ من نیز از خریدار انس ہاشم

عاشق کا حوصلہ تو اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو محب اور بلفظ دیگر عاشق کہہ دیا جائے اور اگر خود محبوب ہی اس کی نسبت یوں کہہ دے کہ یہ میرا عاشق ہے تو شاید مرا ہوا بھی جی جائے یا جیا ہوا مر جائے اور دوسرے محبوبوں سے تو اتنی بھی توقع ہونا مشکل ہے کہ اپنے طالب کو عاشق ہی کہہ دے لیکن حق تعالیٰ کا فضل ہے اور غایت کرم ہے کہ اپنے ناچیز بندوں کو محبوبیت کی بشارت سناتے ہیں ان کی رحمتوں اور راحتوں کی کیا حد ہوسکتی ہے۔ (الاسلام الحقیقی ملحقہ مواعظ رحمت دو عالم ﷺ ۲۵۸ تا ۲۶۰)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

اعمال صالحہ سے حق تعالیٰ شانہ کی محبت پیدا ہوتی ہے

فرمایا عمل سے حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوجاتی ہے جیسے روزمرہ کسی کے پاس آنے جانے سے اس سے محبت ہوجاتی ہے آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری (یعنی رسول اللہ ﷺ کی) پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

محبت کو اتباع پر مرتب فرمایا اور اتباع عمل ہے تو عمل سے محبت آئے گی۔ بظاہر اشکال ہے کہ یوں چاہیے تھا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا سے تم کو محبت ہوجائے گی۔

جواب یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی محبت نہیں کیونکہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ہم کو معرفت کامل ہی نہیں۔ (الکلام الحسن ج ۲ ص ۴۰، ص ۴۱)

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

ترجمہ: سو جب کبھی زکریا علیہ السلام ان کے پاس عبادت خانہ میں تشریف لاتے تو آپ کے پاس تشریف لاتے تو ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آئیں وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب رزق عطا فرماتے ہیں۔

تفسیری نکات

حضرت مریم علیہا السلام کا کمال فہم

حضرت مریم علیہا السلام جب حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں تھیں تو جب حضرت زکریا علیہ السلام تشریف لاتے تو تازہ پھل مریم علیہا السلام کے پاس دیکھتے تو پوچھتے قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا اے مریم یہ کہاں سے آئے؟ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ یعنی مریم علیہا السلام فرماتیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب رزق دیتے ہیں۔ اس آیت کی اسی وقت ایک عجیب تفسیر سمجھ میں آئی ہے کہ مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ ان اللہ یرزق من یشاء حق تعالیٰ کا مقولہ ہے لیکن اگر اس کو قالت کے تحت میں داخل کر کے مریم علیہا السلام کا مقولہ بنایا جاوے تو حضرت مریم کے کمال فہم کی دلیل ہوگی کہ جزئیہ کے بعد کلیہ بھی بیان کر دیا۔

اے مریم (علیہا السلام) اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والیاں ہیں۔

تحصیل تواضع کا طریق

اب تم یہ سمجھو کہ حضرت مریم علیہا السلام آخر تم سے تو بزرگی میں زیادہ ہی تھیں باوجود اتنے کمالات کے پھر ان کو یہ حکم ہے کہ اے مریم تواضع کرو اپنے رب کے سامنے اور سجدہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ قلب کو بھی مشغول رکھو اور جوارح کو بھی کہ نماز پڑھو چونکہ تمام ارکان صلوۃ میں اعظم مقصود سجدہ ہے۔ اس لئے اس کی تخصیص فرمائی اور وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ میں یا تو رکوع اصطلاحی مراد ہے اور یا لغوی معنی ہیں اور میں اخیر احتمال پر تفسیر کو مبنی کرنا چاہتا ہوں۔ پس مطلب یہ ہے کہ جھکو یعنی عاجزی کرو۔ اس کے بڑھانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ سب کچھ کرو مگر اپنے کو بڑا نہ سمجھو۔ اپنے کو پست کرو۔ خدا کے سامنے کمزور سمجھو اور مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کے بڑھانے میں یہ نکتہ ہے کہ تواضع کے حاصل ہونے کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی تحصیل کا کیا طریقہ ہے۔ حاصل طریق کا یہ ہے کہ تواضع کرنے والوں کے ساتھ رہو یعنی نیک صحبت اختیار کرو۔ صحبت نیک اخلاق کی درستی کا نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ بغیر صحبت کے اخلاق کی درستی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ مستورات کو اس کا

موقع بہت کم ملتا ہے اسی واسطے ان کے اخلاق عموماً درست نہیں ہوتے۔ پس ان کو صحبت نیک کی بہت ہی ضرورت ہے کہ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ میں تواضع کے حاصل ہونے کا طریقہ بھی ارشاد ہوا ہے اور دوسری توجیہ اور ہوسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقنتی میں تو تواضع للرب مراد ہے جیسا کہ لربک کی تقیید سے ظاہر ہے اور وارکعی سے تواضع للخلق مراد ہے خلاصہ یہ ہوا کہ خدا کے سامنے بھی عاجزی کرو اور مخلوق سے بھی تواضع سے پیش آؤ۔ اس صورت میں یہ آیت تواضع مع اللہ اور تواضع مع الخلق دونوں کو جامع ہو جاوے گی۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ
ترجمہ: اور لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے اچھے ہیں۔

تفسیری نکات

عربی اور اردو کے معنی کا فرق

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ سے بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بھی مکر کیا۔ اور خدا نے بھی مکر کیا اور خدا سب سے بہتر مکر کرنے والا ہے۔ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ دیکھو اس سے خدا کا نعوذ باللہ مکار ہونا لازم آتا ہے تو منشاء اس اشکال کا صرف یہی ہے کہ انہوں نے عربی لفظ کا ترجمہ اردو محاورہ کے موافق کیا' اردو میں مکر کرنا فریب دینے کو کہتے ہیں جو کہ عیب کی صفت ہے اگر یہ لوگ اس عربی کے لفظ کا ترجمہ محاورہ عربیہ کے موافق کرتے تو اشکال کچھ بھی نہ تھا' عربی میں مکر کے معنی تدبیر خفی کے بھی آتے ہیں اور تدبیر خفی کرنا یہ عیب نہیں' بلکہ صفت کمال ہے' ترجمہ آیت کا یہ ہوا کہ کافروں نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ نے ان کو بچانے کے واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں میں بہتر ہے کہ کسی کی تدبیر اس کی تدبیر پر غالب نہیں آسکتی' اس ترجمہ کے بعد کچھ بھی اشکال نہیں' اسی طرح ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے مجھ کو کچھ پوچھنا ہے' مگر اول اس آیت کا ترجمہ کردو' وَوَجَدَكَ ضَاۗلًّا فَهَدٰى میں نے کہا کہ اس کا ترجمہ یہ ہے اور پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس واقف بنادیا سن کر میرا منہ دیکھنے لگے' میں نے کہا جو پوچھنا ہو پوچھئے' کہنے لگے۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا! میں نے کا کہ کیا آپ مجھ سے یہ امید کرتے ہیں کہ میں اس جگہ ضالا کا ترجمہ گمراہ سے کرونگا' بعض تراجم میں گمراہ سے ترجمہ کیا ہے' جس سے لوگوں کو اشکال پڑ جاتا ہے لیکن ان حضرات پر کوئی الزام نہیں ممکن ہے اس وقت گمراہ کے معنی ناواقف بھی مستعمل ہوتے ہوں' جیسا کہ عربی میں ضلالت کے معنی غیبت اور فقدان کے بھی آتے ہیں چنانچہ کھوئی ہوئی چیز کو ضالہ کہتے ہیں جس کے معنی مفقود الخبر کے ہیں اسی طرح ضال کا اطلاق فاقد الخبر پر بھی آتا ہے' جس کا ترجمہ ناواقف ہے لیکن اب فارسی و اردو کا محاورہ بدل گیا' اب گمراہ اسے کہتے ہیں جو باوجود راستہ جاننے کے ٹیڑھے راستہ پر چلے' آجکل بے خبر اور ناواقف کو گمراہ

نہیں کہتے' اس لئے اب گمراہ سے ترجمہ کرنا صحیح نہیں اور حضور ﷺ کا نبوت سے پہلے بعض علوم سے ناواقف ہونا کچھ عیب نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ جو علوم نبوت کے بعد آپ کو عطا ہوئے نبوت سے پہلے آپ ان سے ناواقف تھے اگر چہ اس وقت بھی دنیا بھر کے عقلاء سے زیادہ آپ واقف کار تھے لیکن علوم قرآن و احکام سے تو خبردار نہ تھے' یہ علم تو نبوت کے بعد ہی آپ کو حاصل ہوا! اسی کو حق تعالیٰ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (اور کسی بشر کی (بحالت موجودہ) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتہ کو بھیج دے۔ کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔ بے شک وہ بڑا عالی شان بڑی حکمت والا ہے اسی طرح (یعنی اسی قاعدہ کے موافق ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (اور اس کے قبل آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان و معرفت کا اعلیٰ درجہ جو کہ اب آپ کو حاصل ہے وہ) کیا چیز ہے (گو نفس ایمان ہر نبی کو ہر وقت نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے) لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں' ہدایت کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ آپ (اس قرآن اور وحی کے ذریعہ سے عام لوگوں کو) ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کرتے ہیں) (سورۃ الشوریٰ) پارہ ۲۵

حضور ﷺ کا پہلے علوم سے بے خبر ہونا عین کمال ہے

پس وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى میں ضال کے معنی وہی ہیں جو آیت ماکنت تدری الخ سے معلوم ہوتا ہے یعنی خدا کی تعلیم و ہدایت سے پہلے آپ ان علوم سے بے خبر تھے اور یہ حضور ﷺ کے لئے کوئی نقص نہیں' بلکہ عین کمال ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے انبیاء کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا' نہ ان کے پاس کمالات بدوں اعطاء الٰہی کے ہوتے ہیں گو ہم کو ایسا کہنا زیبا نہیں دیتا کہ انبیاء کے پاس کچھ کمالات نہ تھے کیونکہ اس سے ایہام بے ادبی کا ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ کے ذمہ تو حضور کا ادب لازم نہیں آپ تمام عالم کے سردار اور سب سے افضل ہیں مگر حق تعالیٰ کے تو بندے ہی ہیں اس لئے حق تعالیٰ آپ کو ناواقف اور بے خبر جو چاہیں کہہ سکتے ہیں تو دیکھئے اس سائل کو حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى میں اشکال پڑا کیوں کہ اس نے ترجمہ میں گمراہ کا لفظ دیکھا اور اس کے وہ معنی سمجھا جو آج کل کے محاورہ میں گمراہ کے معنی ہیں اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ عوام کو خود نہ دیکھنا چاہیے بلکہ علماء سے پڑھنا چاہیے ورنہ ایسے ایسے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے پیدا ہوں گے جن کا جواب عوام کے ذہن میں نہ آئے گا' چنانچہ قرآن میں حق تعالیٰ کی صفت استغناء کو دیکھ کر بعض لوگ یہی سمجھے کہ حق تعالیٰ ایسے مستغنی ہیں جیسے ہمارے محاورہ میں کسی کو مستغنی کہا کرتے ہیں حالانکہ استغنا کے معنی عربی میں یہ ہیں کہ اس کو کسی کی حاجت نہیں' وہ کسی کا محتاج نہیں اور ہمارے محاورہ میں مستغنی اسے

بھی کہتے ہیں جسے کسی کے نفع وضرر کی پرواہ نہ ہو! اب لوگ غضب کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو بایں معنی بھی غنی سمجھتے ہیں چنانچہ ایسے مقام پر اس صفت کو استعمال کرتے ہیں جہاں سوا اس کے اور کچھ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک بات سنو جو ہمارے تمہارے نزدیک برابر (درجہ میں ماننے کے قابل) ہے وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں پھر اگر وہ لوگ (حق سے) اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

تفسیری نکات

یہ عنوان ایسا ہے جس سے وحشت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کفار بھی شرک کو برا سمجھتے تھے۔ گو اپنے شرک کو برا نہ سمجھتے تھے۔ اس کے بعد ارشاد ہے فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (یعنی اگر وہ اس بات کو مان لیں تب تو گویا اسلام کو مان لیا کیونکہ اسلام کی تعلیم یہی ہے) اگر وہ اس سے اعراض کریں تو (صاف) کہہ دو۔ کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔ اس میں تالیف قلب کی رعایت نہیں جب کہ مخاطب کسی طرح سمجھنے پر آتا ہی نہیں۔ سبحان اللہ! اس آیت میں ایسی بات بتلائی گئی ہے جس کا فیصلہ عقلاء ہزاروں برس میں بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ عقلاء میں بعض کی رائے تو اصلاح میں تالیف قلب کی طرف مائل ہوتی ہے اور بعض کی رائے صفائی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مگر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ بتلایا ہے کہ ابتداء میں تو تالیف قلب کرو اور انتہا میں صفائی سے کام لو۔

چنانچہ اس آیت میں ابتداء تو ایسے عنوان سے ہے جس میں تالیف قلب ہے اور انتہا میں صفائی کی تعلیم ہے مگر آج کل حالت یہ ہے کہ اگر مصالح کی رعایت ہے تو عمر بھر مصالح ہی مصالح چلتے جائیں گے۔ کبھی صاف بات منہ پر نہ آئے گی اور اگر صفائی اختیار کرتے ہیں تو شروع ہی لٹھ سا مار دیتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آل عمران آیت ۷۷)

ترجمہ: یقیناً جو لوگ معاوضہ حقیر لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے (انہوں نے) کیا ہے اور بمقابلہ اپنی قسموں کے ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں وہاں کی نعمت کا نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ ان سے لطف کا کلام فرمائیں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

گناہگار مسلمانوں کا دخول جہنم میں تزکیہ کے لئے ہوگا

یہاں کفار کی نسبت وَلَا یُزَکِّیْهِمْ فرمایا ہے اور وعید میں مفہوم مخالف بالاتفاق معتبر ہے۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے جہنم کا دخول تزکیہ کے طور پر ہوگا جیسے یہاں حمام کا دخول تنظیف کے لئے ہوتا ہے۔ گو اس میں کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے مگر پھر بھی خوشی زائل نہیں ہوتی۔ دیکھئے مسہل اور اپریشن میں کیسی تکلیف ہوتی ہے۔ بعض لوگ رونے لگتے ہیں مگر خوش بھی ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اپریشن کا انجام صحت و راحت ہے۔ اسی طرح گنہگار مسلمان کو بھی موت پر خوش ہونا چاہیے اور یہ سمجھ لے کہ اگر جہنم میں جانا بھی ہوا تو تزکیہ اور اپریشن کے لئے جانا ہوگا جس کا انجام راحت و عافیت ہے ہاں کافر کے لئے کچھ خوشی نہیں کیونکہ اس کے واسطے جہنم تزکیہ نہیں بلکہ دائمی قید خانہ ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾

ترجمہ: کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر لیکن (کہے گا کہ) تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو۔

تفسیری نکات

ربانی بننے کی ضرورت

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ تقدیر کلام اس طرح ہے ولکن ینبغی له ان یقول کونوا ربانین یعنی رسول سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کا امر کرے ہاں رسول کی شان یہ ہے کہ وہ حکم دے۔ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ جس کے معنی یہ ہیں اللہ والے ہو جاؤ ربانی میں یاء نسبت ہے اور الف و نون مبالغہ کے لئے بڑھایا گیا ہے قرآن میں ایک مقام پر اصل کے موافق والربیون بھی آیا ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی شان یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اللہ والا بننے کا حکم فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ سب مسلمانوں کو عموماً اور اہل علم کو خصوصاً ضروری ہے اس پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں ان سے کیا کوتاہی ہو رہی ہے غور کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ وہ کوتاہی کیا ہے آگے اس امر کو اس امر کے ساتھ معلل فرماتے ہیں اس پر بھی اہل علم کو غور کرنا چاہیے وہ علت یہ ہے۔

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ حاصل یہ ہوا کہ چونکہ تم کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو اس لئے تم کو اللہ والا بننا چاہیے کتاب معہود سے یا تو کتاب مراد ہے (یعنی قرآن) یا جنس کتاب مراد ہے یعنی کتب دینیہ لیکن لام جنس کی صورت میں بھی ہر قسم کی کتابیں خواہ ان کو دین سے تعلق ہو یا نہ ہو مراد نہیں ہو سکتیں بلکہ کتب دینیہ مراد ہیں کیونکہ اس جگہ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ علت بنایا گیا ہے كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ کا پس اسی کتاب کی تعلیم وتدریس مراد ہو سکتی ہے جس کو اللہ والا بنانے میں دخل ہو اور ظاہر ہے کہ یہ اکثر کتب دینیہ ہی کی تعلیم میں ہے نہ کہ اور کتب کی تعلیم وتعلم میں لہٰذا جنس کو عموم کلی پر محمول نہیں کیا جا سکتا یہ تفصیل میں نے اس لئے کی کہ آج کل تعلیم کا لفظ نئی تعلیم پر بھی اطلاق ہونے لگا ہے یعنی انگریزی تعلیم پر چنانچہ اخباروں اور رسالوں میں جب تعلیم کے اہتمام پر زور دیا جاتا اور انگریزی کی ضرورت کو ظاہر کیا جاتا ہے تو جہل کی مذمت وعلم کی فضیلت وضرورت میں جو آیات واحادیث وارد ہیں ان کو استدلال میں پیش کیا جاتا ہے جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان آیات واحادیث میں علم سے مراد عام علم ہے جس کا مصداق علم دنیا بھی ہے یاد رکھو یہ سراسر تحریف ہے اور اصطلاحات شرعیہ کا بدل دینا ہے اس سے امام غزالی کی پرانی شکایت تازہ ہوگئی وہ فرماتے ہیں منجملہ احداثات کے ایک احداث یہ بھی ہے کہ الفاظ شرعیہ کو ان کے معانی شرعیہ سے بدلا جاتا ہے چنانچہ اے عزیز تم نے فقہ کے نئے معنی گھڑ لئے ہیں کہ صرف مسائل حیض و صلوٰۃ وغیرہ کا نام فقہ رکھ لیا ہے اور اس کا نام فقہ رکھ کر تمام ان فضائل کو اپنے اوپر منطبق کر لیا جو فقہاء کے لئے وارد ہوئے ہیں حالانکہ نص میں فقہ سے مراد مجموع علم وعمل ہے اور وہ فضائل علماء عاملین کے لئے مخصوص ہیں مگر تم نے اصطلاح شرع کو بدل کر صغریٰ تو خود گھڑ لیا کہ نحن فقهاء اور کبریٰ نصوص واحادیث سے اخذ کیا۔ ومن كان فقيها فقد اراد الله به خيرا وهو كذا و كذا پھر ان سے نتیجہ نکال لیا فنحن قد اراد الله بنا خيرا ونحن كذا و نحن كذا العلماء ورثة الانبياء و فضل العالم على العابد كفضلي على ادنا كم وفقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد وغیرہ۔ یاد کر کے اپنے آپ کو بھی علماء وفقہاء میں داخل کر لیا حالانکہ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن نے بھی آپ کو عالم کہا ہے یا نہیں۔

حقیقی علم

سو سنئے قرآن نے علماء بنی اسرائیل کی نسبت اول تو: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ کہا پھر فرمایا وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اول لقد علموا ان کی اصطلاح کے موافق فرمایا کیونکہ وہ بھی محض جان لینے اور لکھ پڑھ لینے کو علم کہتے تھے پھر لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اپنی اصطلاح کے موافق فرمایا جس میں ان سے علم کی نفی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شریعت سے علم الفاظ ومعانی کا نام علم نہیں ورنہ یہ تو علماء بنی اسرائیل کو بھی حاصل تھا اس سے نفی ان سے کیونکر ہو سکتی ہے بلکہ علم الفاظ کے ساتھ جب عمل بھی ہو اس وقت وہ علم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے (حقوق وفرائض)

انبیاء کا طریق تعلیم

اس مقدمہ کے بعد واضح ہو گیا ہوگا کہ تعلیم بہ نسبت تعلم کے کونو اربانین کو زیادہ مقتضی ہے اس لئے تعلمون کو

تدرسون پر مقدم کیا گیا نیز یہ بھی نقطہ ہو سکتا ہے کہ تعلم سے مقصود تعلیم ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون
اور مقصود گو حساً مؤخر ہو مگر قصداً مقدم ہوتا ہے اس لئے تعلمون کو مقدم فرمایا کہ وہ غایت ہے تدرسون کی اس سے علماء بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ اس غایت پر تو ہمارا پورا عمل ہے کہ پڑھنے کے بعد ہم پڑھانے میں مشغول ہیں حضرات آپ خوش نہ ہوں کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں بما کنتم تدرسون العلوم و بما کنتم تدسون نہیں فرمایا بلکہ کنتم تعلمون فرمایا اور آپ درس کے بعد تدریس میں مشغول ہیں تعلیم میں مشغول نہیں ہیں تعلیم کی حقیقت وہ ہے جس کو دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے نذر سے تعبیر کیا ہے۔ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ۔

اور وہ اصل میں وعظ کا کام ہے جو میں اس وقت آپ کے سامنے کر رہا ہوں جس سے آج کل علماء متنفر ہیں اور اس کے اصل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ حضرت انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کیا طرز تھا کیا وہ کتابیں پڑھایا کرتے تھے ہرگز نہیں ان کی تعلیم کا طریقہ یہی وعظ تھا اور اصل مقصود یہی ہے مگر وعظ کہنے کے لئے ہم جیسوں کو ضبط علوم کی ضرورت ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم تو علوم وہبی تھے۔ ان کو نہ کتاب پڑھنے کی ضرورت تھی۔ نہ وہ اس کے محتاج تھے کہ کتاب کو سامنے رکھ کر دوسروں کو پڑھائیں کیونکہ وہ حقائق کو بدوں اصطلاحات کی مدد کے سمجھانے پر قادر تھے وہ معقول کو محسوس بنا دیتے تھے اس لئے ان کو کتابیں پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت نہ تھی پھر بعد میں صحابہ بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ تھے وہ بھی اس کے محتاج نہ تھے بعد میں حب حفظ میں کمی آئی اور علوم وھبیہ کی استعداد کم ہوگئی تو علوم کو کتابوں میں مدون کیا گیا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابیں پڑھی اور پڑھائی جائیں مگر اس کی ضرورت اس بات کے واسطے ہوئی کہ کتابوں سے علم حاصل کر کے عوام کو صحیح علوم کی تبلیغ کریں غلط سلط باتیں نہ بنائیں۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ

ترجمہ: یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے کہ اگر ہم تم کو کتاب و حکمت دیں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہاری کتاب کا مصدق ہو تو تم اس کی تصدیق و نصرت ضرور کرنا)

تفسیری نکات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو مفسر القرآن ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا بھی فرمائی ہے اللھم علمه الکتاب اس لئے ان کی تفسیر حجت ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں رسول سے مراد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور یہ عہد جملہ انبیاء سے حضور ﷺ کے متعلق لیا گیا ہے کہ جو نبی حضور ﷺ کا زمانہ پائے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ آپ کی تصدیق ونصرت کرے۔ پھر یہ بات ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے بھی آپ کا زمانہ نہیں پایا تو یہ عہد ان سے کیوں لیا گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں حضور ﷺ کے اتباع وتصدیق کے لئے تیار رہنا چاہیے خواہ وہ آپ کا زمانہ پائیں یا نہ پائیں مگر اپنی طرف سے ہر وقت اس کے لئے آمادہ رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھی حضور ﷺ سے کسی وقت اپنے تعلق کو قطع نہیں کرسکتے۔

دوسرے اگر یہ عہد بھی نہ لیا جائے جب بھی انبیاء علیہم السلام حضور ﷺ سے تعلق قطع نہیں کرسکتے تھے کیونکہ مسئلہ شرعیہ اصولیہ ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ (جس نے (ان) لوگوں کا شکر نہیں کیا (جو واسطہ نعمت ہیں) اس نے خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کیا)

اور پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الکمالات ہیں گو فی النبوت سہی تو اس قاعدہ کے موافق انبیاء علیہم السلام حضور سے کبھی تعلق قطع نہیں کرسکتے کیونکہ اس سے شکر الٰہی میں نقصان لازم آتا ہے جس سے وہ حضرات مبرا ہیں اور انبیاء علیہم السلام پر آپ کے تعلق کا وجوب بالقوہ تو اس حدیث سے ظاہر ہے۔

لو کان موسی حیا لماوسعہ الااتباعی اور بالفعل اس سے کہ حضرت عیسی علیہ السلام بعد نزول الی الارض کے وجوباً آپ کا اتباع فرماویں گے اور کسی کو وَاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا سے اس کے خلاف کا شبہ نہ ہو کیونکہ ملت ابراہیم خود آپ کی ملت کا بوجہ تناسب لقب ہے۔ جس میں حکمت ترغیب ہے تمام اہل ملل کی اس ملت کے اختیار کرنے پر کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی جلالت متفق علیہ تھی اس لئے اتبع ابراہیم نہیں فرمایا۔ اسی طرح بعد ذکر انبیاء علیہم السلام کے حضور کو جو خطاب کیا گیا ہے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ یوں نہیں فرمایا فبھم اقتدہ۔ پس ھداھم سے مراد ھدی اللہ ہے اس کو ملابست کے سبب ھداھم فرمادیا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: تم خیر (کامل) کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک وہ چیز خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے اور جو کچھ بھی خرچ کروگے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

خیر کامل

البر سے مراد یہاں پر خیر کامل ہے اولا اس لئے کہ المطلق اذا اطلق یرادبہ الفرد الکامل مسئلہ عقلیہ ہے دوسرے دیگر نصوص وقواعد شرعیہ سے بھی اسی کو تائید ہوتی ہے کہ یہاں خیر کامل مراد ہے۔ حَتّٰى تُنْفِقُوْا یہ غایت ہے اور عربی میں

غایات افعال کو صیغہ اثبات سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اردو میں صیغہ نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ترجمہ یہ ہوگا کہ جب تک خرچ نہ کرو الخ یہ تو ترجمہ ہے اور بظاہر لفظ انفاق خاص ہے انفاق مال کے ساتھ مگر میرے دل میں ایک بار یہ آیا تھا کہ یہ عام ہے انفاق مال و بذل نفس جاہ و بذل علم وغیرہ سب کو۔

شانِ نزول

پھر میں نے علامہ قسطلائیؒ کا ایک قول دیکھا جس سے میرے خیال کی تائید ہوئی اور قسطلانی کا قول اس طرح نظر سے گزرا کہ میں اس آیت کی تفسیر حدیث میں دیکھ رہا تھا کیونکہ حدیث میں اس کے متعلق حضرت ابوطلحہ کا قصہ مذکور ہے کہ وہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سبحان اللہ! حضرات صحابہ کا بھی کیا حال تھا کہ ہر آیت کے نزول کے بعد یہ مستعد تھے کہ ہم سے اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں دوسرا کمال یہ تھا کہ عمل میں رسول اللہ ﷺ سے مشورہ کرتے تھے چنانچہ اس مشورہ کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حضور ﷺ کبھی تو کسی صحابی کی رائے کی تصویب فرماتے اور کبھی اس میں ترمیم فرما دیتے حضرت کعب بنؓ مالک نے اپنی توبہ قبول ہونے پر اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہا اور حضور سے مشورہ لیا تو حضور ﷺ نے تمام مال کے صدقہ کرنے سے منع فرمایا۔ یہ فائدہ ہے کاملین سے مشورہ لینے میں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ طبعاً متبع سنت واقع ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے بھی ایک شخص کو تمام جائیداد کے وقف کرنے سے منع فرمایا تھا جس میں ایک سنت نبویہ سے بلا قصد موافقت ہوگئی غرض حضرت ابوطلحہؓ حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ **انی اری اللہ تعالی یقول لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون وان احب اموالی الی بیر حاء فھی صدقۃ اللہ تعالی فضعہ یارسول اللہ حیث اراک اللہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم بخ بخ مال رابح اورائح واری ان تضعہ فی عشیرتک الاقربین۔ (او کمال قال)**

یعنی یا رسول اللہ ﷺ میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے نیل بر یعنی نیکی کے حصول کو انفاق محبوب پر موقوف فرمایا ہے اور میرے اموال میں سب سے زیادہ محبوب مجھے بیر حاء ہے (جو ایک باغ کا نام ہے) تو میں اس کو اللہ کے نام پر صدقہ کرتا ہوں آپ جہاں مناسب سمجھیں اس کو صرف کر دیں حضورؐ نے فرمایا شاباش یہ مال نفع دینے والا ہے یا ختم ہونے والا (اس لئے کسی مصرف خیر میں صرف کر دینا اچھا ہے) مگر میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے قریب قرابت داروں میں تقسیم کر دو حضرت انس کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہؓ نے حضور ﷺ کے ارشاد کے موافق اس باغ کو حضرت حسان و ابی بن کعب کے درمیان تقسیم کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ان کے قریب تھے اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں ان دونوں سے زیادہ قریب تھا مگر مجھے اس میں سے کچھ نہیں دیا۔ ان روایتوں میں بظاہر تعارض ہے مگر محدثین نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضرت انسؓ باعتبار خدمت و اختلاط کے قریب تھے کیونکہ ہر وقت ایک ہی گھر میں ان کے پاس رہتے تھے۔ اور حضرت حسان و ابی بن کعب باعتبار نسب کے قریب تھے۔ سبحان اللہ خوب تطبیق ہے۔ غرض میں حدیث میں حضرت ابوطلحہؓ کا یہ قصہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی علامہ قسطلانی کا یہ قول نظر سے گزرا انفاق محبوب میں بذل جاہ و بذل

نفس وبذل علم بھی داخل ہے اس سے میرا دل بہت خوش ہوا لیکن اگر لغت سے اس کی تائید نہ ہو اور انفاق ان سب کو عام نہ ہو تو علامہ قسطلانی پر پھر بھی اعتراض نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عموم لفظ کی وجہ سے بذل نفس وبذل جاہ و بذل علم کو اس آیت میں نہیں داخل کیا بلکہ دلالۃ النص کی وجہ سے داخل کیا ہے کیونکہ مال بمقابلہ جاہ ونفس وعلم کے ادنی ہے تو جب انفاق مال سے برکامل حاصل ہوتی ہے جو ادنی ہے تو بذل اعلیٰ سے بدرجہ اولی برکامل حاصل ہوگی۔ غالباً اسی بنا پر بیضاویؒ نے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کی تفسیر میں بعض صوفیہ کا قول نقل فرمایا ہے ومن انوار المعرفة يفيضون کہ انہوں نے افاضہ انوار معرفت کو بھی انفاق میں داخل کیا کیونکہ یہ انفاق مال سے اعلی ہے تو جب ادنی کا انفاق محمود ہے اعلی کا انفاق کیوں محمود نہ ہوگا اور بیضاوی کی نقل اس بات کی کافی حجت ہے کہ یہ قول محتمل صحت ہے اب چاہے انفاق کو لغۃً عام کہا جائے یا دلالة النص کی وجہ سے عام کہا جائے بہرحال تعمیم غلط نہیں بلکہ اگلی آیت کے ربط کے لئے تعمیم ضروری ہے بغیر اس کے چارہ نہیں کیونکہ اس کے بعد یہ آیت ہے كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ قصہ جیسا مفسرین نے عام طور پر بیان کیا ہے یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو ایک دفعہ مرض عرق النساء ہوا تھا جس کے علاج میں آپ کو اونٹ کے گوشت سے بہت نفع ہوا تھا تو آپ نے نذر کی تھی کہ اگر مجھے اس مرض سے شفا ہوگئی تو اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دونگا حالانکہ وہ آپ کو محبوب تھا کیونکہ مرض میں نافع ہوا تھا مگر آپ نے ترک مرغوب کی اس لئے نذر کی کہ ترک مرغوب خدا کو محبوب ہے تو اس قصہ کا ربط سابق سے جب ہی ہوگا کہ انفاق کو عام کیا جائے اور ترک مرغوب کو بھی انفاق میں داخل کیا جائے اور اگر انفاق کو مال کے ساتھ خاص کیا گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قصہ کو لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ڛ سے ربط نہ ہوگا یعنی ربط ظاہر نہ ہوگا ورنہ ربط خفی ممکن ہے غرض بیضاوی اور قسطلانی کا قول دیکھ کر مجھے تعمیم انفاق کی ہمت ہوئی ورنہ اس سے پہلے اس خیال کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

مجاہدہ کا مقصود

مجاہدہ اس واسطے کیا جاتا ہے تاکہ ریا اختیاری کی مدافعت سہل ہو جائے۔ کیونکہ اس کا بار بار دفع کرنا قدرے دشوار ضرور ہے مجاہدہ سے یہ مشقت دفع ہو جاتی ہے۔ نیز وسوسہ ریا جو کہ مضر نہیں بعض دفعہ اعمال کے ساتھ مزاحمت کرتا ہے اور اس کے ساتھ عمل دشوار ہو جاتا ہے مجاہدہ سے وسوسہ ریا بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ بہرحال تم جن احوال غیر اختیاریہ کے طالب ہو ان کو چھوڑ دو ان کی طلب کو قطع کرو یہ بھی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ڛ میں داخل ہے کہ ان ہوسوں کو قطع کرو۔ لیکن مِمَّا تُحِبُّوْنَ ڛ کی ما اس قدر عام نہیں کہ سارے بچے اس کے اندر آجائیں کہیں تم یہ کہنے لگو کہ ہم کو جنت کی بھی ہوس ہے ہم کو رضائے حق بھی مطلوب ہے تو کیا اس کو بھی قطع کر دیں۔ اس کا جواب میں قرآن ہی سے دیتا ہوں وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے مماتحبون فرمایا ہے۔ مما احب نہیں فرمایا اور جنت ورضائے حق تو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس کا قطع کرنا مقصود نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ جو حالت تم کو محبوب ہو اور اللہ تعالیٰ کو من حیث المطلوبیت محبوب نہ ہو اس کی طلب قطع کرو

اب اشکال نہ رہا دوسری قید یہ بھی ضروری ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ ہو کہ مطلق انفاق کافی نہیں یعنی احوال و کیفیات وہو ساوس کی ترک طلب رضائے الٰہی کے واسطے ہو راحت نفس کے واسطے نہ ہو یعنی اپنے محبوب کو خدا کے محبوب پر فدا کرنا یہ ہے۔ انفاق مما تحبون ایک بات یہ بھی سمجھو کہ آیت سے کس قدر مفہوم ہوتا ہے جو چیز خرچ کرو اس کا محبوب ہونا تو ضرور ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ سب اشیاء میں احب ہو مگر حدیث ابوطلحہؓ سے ظاہراً شرط احبیت بھی مفہوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا انی اری اللہ تعالیٰ یقول لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون وان احب الاموال الی بیرحا الخ

اس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تک محبوب! چیز خرچ نہ کرو گے اس وقت تک بر کامل حاصل نہ کرسکو گے اور مجھے سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیرحا ہے تو گویا ان کی فہم میں بر کامل کا حصول احب اشیاء کے انفاق پر موقوف تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے فہم کی تقریر فرمائی اس سے احب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر کا توقف پختہ ہو گیا اس غلطی میں بہت روز تک میں بھی رہا ہوں مگر پھر خدا نے ہدایت کی اور یہ سمجھ میں آیا کہ احب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر موقوف نہیں کیونکہ نص مطلق ہے نص میں تو مما تحبون ہے احبیت کی قید نہیں اور حدیث میں جو حضرت ابوطلحہ کا قول وان احب الاموال الی بیر حاء وارد ہے تو کسی دلیل سے اس کا مما تحبون کی تفسیر ہونا ثابت نہیں بلکہ حضرت ابوطلحہ نے از خود یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گو حصول بر نفس محبوبیۃ شئے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے مگر احب الاشیاء کا انفاق کرنا چاہتا ہوں غرض مطلق محبوب کے انفاق سے بھی بر حاصل کرلو گے خواہ احب ہو یا نہ ہو ہاں رد خدل نہ ہو (افناء المحبوب)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۞ اس میں تو یہ بتلایا گیا ہے کہ کفار کو اس مال سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ اب اس کے مقابل مسلمانوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اموال سے نفع حاصل ہوگا وہ یہ کہ مسلمانوں کو انفاق مال سے خیر کامل حاصل ہوگی مگر اس کے لئے کچھ شرائط ہیں غرض حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کے ذکر کے ساتھ مسلمانوں کا ذکر فرماتے ہیں اور بالعکس اور اسی معاملہ کے متعلق ذکر ہوتا ہے جس کے متعلق کفار کا ذکر تھا۔ اور ایک کے ساتھ قہر کا خطاب اور عین اسی موقع پر دوسرے کے ساتھ لطف کا خطاب فرماتے ہیں۔

فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ (آل عمران آیت نمبر۹۱)

ترجمہ: سو ان میں سے کسی کا زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا اگرچہ وہ معاوضہ میں اسی کو دینا بھی چاہے۔

یہ آیت کفار کے بارے میں ہے مطلب یہ نہیں ہے کہ کافر سے اس کے جرم کے فدیہ میں تمام زمین بھر بھی سونا نہیں قبول کیا جائے گا اگرچہ وہ دینا چاہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیامت میں ایسا ہوگا کہ کافر زمین بھر کر سونا دیگا مگر قبول نہ کیا جائے گا بلکہ یہی مطلب ہے کہ ایسا نہ ہوگا اور بالفرض ایسا ہوتا بھی تب بھی قبول نہ کیا جاتا اور کافر کو دوزخ ہی میں ڈالا جاتا۔ (جلاء القلوب)

امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر خصوصی انعامات

پس حسب قاعدہ مذکورہ ان کو تو فضیلت ذبح ولد کی حاصل ہو گئی۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیے بیٹے کے ذبح

کرنے اور اللہ کی راہ میں نثار کرنے کا کتنا ثواب ہے تو قواعد شرعیہ سے یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ جس شئے کو خرچ کیا ہے وہ جس قدر زیادہ محبوب ہوگی اسی قدر زیادہ ثواب ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۃ (تم ہرگز بھلائی حاصل نہ کرسکو گے جب تک کہ اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر زیادہ محبوب کا انفاق ہوگا اسی قدر بر حاصل ہوگی اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے تو نفس بر کا حاصل ہونا معلوم ہوا فضیلت اس سے کیسے معلوم ہوئی جواب یہ ہے کہ بر سے مراد بر کامل ہے اور دلیل اسکی اگلی آیت ہے فرماتے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ یعنی یوں جو بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں یعنی اس کا ثواب دے ہی دیں گے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہ محبوب شئے خرچ کی جائے یا غیر محبوب ثواب تو ہر صورت میں ہوتا ہے اس لئے کہ شئے بیان ہے ما کا اور وہ عام ہے شامل ہے ہر قلیل وکثیر کو پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ نفس ثواب تو تم کو ہر شئے کے انفاق میں مل جائے گا لیکن بر خاص محبوب ہی کے انفاق میں ہے تو یہ اسلوب دال ہے اس پر کہ بر سے مراد ثواب کامل ہے پس وہ مدعا ثابت رہا کہ شئے منفق جس درجہ محبوب ہوگی اسی درجے کا ثواب زیادہ ہوگا پس جب یہ امر ثابت ہو چکا تو دیکھنا چاہیے کہ بیٹے سے آدمی کو کس قدر محبت ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹے کے ساتھ اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اپنے لئے جو کمال انسان کو محبوب ہوتا ہے وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دوسرے کو ہو لیکن بیٹے کے لئے چاہتا ہے کہ ہر کمال میں مجھ سے بڑھ جائے۔ ان مقدمات سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہم السلام نے وہ کام کیا کہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا تو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب نہایت ہی عظیم الشان ہوگا۔

اس کے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضحیہ کو سنت ابراہیم علیہ السلام فرمایا ہے حالانکہ جو عمل ابراہیم علیہ السلام نے کیا وہ اور ہے اور تضحیہ دوسرا عمل ہے ابراہیم علیہ السلام کا عمل ذبح ولد ہے اور تضحیہ ذبح حیوان ہے پھر اضحیہ سنت ابراہیمی کیسے ہوئی تو یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہم کو اضحیہ میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دونوں عملوں کی غایت کی اتحاد کی وجہ سے دونوں عمل کو ایک فرمایا گو عمل متغائر ہوں گویا یہ فرمایا اے امت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جانور کے ذبح میں وہی اجر ملے گا جو ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دیکھئے کہ کس قدر فضیلت اضحیہ کی اس حدیث سے معلوم ہوئی اور ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے ان کو ان کے مرتبے کے موافق انعام ملا کرتا ہے پھر ان سے جو کم درجے کے ہیں ان کو اسی درجے کا انعام ملے گا مثلاً وزراء وارکان دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چپڑاسیوں اور خدام کو کم۔ پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے جلیل القدر ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام ان کو دیا گیا ہوگا ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جانا چاہیے یعنی اگر یہی فعل ذبح ولد کا دوسرا کرتا تو وہ اس قدر

انعام پانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جس قدر کہا ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں فعل بھی اس فعل سے اڈن ہو وہاں تو اتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں مگر باوجود اس کے یہ عمل ہمارا ذبح ولد سے بدرجہا ادون ہے پھر وہی انعام ہمارے لئے تجویز ہوا ہے اللہ اکبر کتنا بڑا انعام ہے اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لطف وکرم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دو۔

تفسیری نکات

حسب استطاعت تقوی اختیار کرو

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اللہ تعالیٰ سے جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے خدا کی شان کے لائق تقوی کس سے ہوسکتا ہے تو آیت میں تکلیف مالا یطاق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حق تقاتہ سے مراد غایة ما تقدرون علیه (جس قدر تم اس پر قادر ہو) ہے کہ جتنا تم کر سکتے ہو اتنا تقوی کرو۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسری جگہ اس مضمون کو ایک سہل عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ ہم سے اپنی استطاعت کے موافق بھی عمل نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم استطاعت رکھتے ہو) جس میں بجائے قدرت کے استطاعت کا لفظ وارد ہے اور استطاعت کہتے ہیں قدرۃ یسیرہ کو نہ قدرت ممکنہ کو بعض مفسرین نے دوسری آیت کو پہلی کے لئے ناسخ فرمایا ہے اس سے بعض طلبہ خوش ہو گئے ہوں گے کہ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ منسوخ ہو گیا چلو چھٹی ہوئی۔ ارے منسوخ تو وہ ہو جس میں نسخ کی قابلیت بھی ہو بھلا ایمان بھی کہیں منسوخ ہوا ہے اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اس شان کا امر ہے جیسے امنوا باللّٰه (اللہ پر ایمان لاؤ) میں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی عظمت کا مقتضی یہی ہے کہ تقویٰ حق تقاتہ کیا جائے اور مقتضائے عظمت بدل نہیں سکتی بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہ کے عرف میں لفظ نسخ بیان تبدیل کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ کہتے ہیں پس قواعد شرعیہ سے اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ کا مطلب ہی یہ تھا کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو یہ تو طالب علمانہ اشکال کا جواب تھا مگر افسوس یہ ہے کہ طلبہ تو صرف تفسیر میں پڑ گئے اشکالات اور جوابات حل کرنے کے درپے ہو گئے اصل مقصود پر نظر ہی نہیں کہ یہاں امر کس چیز کا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہیے (الدوام علی الاسلام)

مسلمان کون ہے؟

یہ کیا بات ہے کہ امر میں تو تقوی کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ فرمایا گیا کہ مرتے وقت

تک مسلمان رہنا۔ پس یہ صاف دلیل ہے کہ اتقوااللہ اور مسلمون دونوں کا حاصل ایک ہی ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقوی کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں علی ہذا اسلام کامل حق تقوی ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں سو اس کے لئے حق تقوی کی تفسیر کو دیکھ لیجئے اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ہے ورنہ نہیں تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے ان یطاع و لا یعصی اور بعض نے یہ لکھا ہے ان یشکروا و لا یکفر اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں مگر ان میں کچھ تعارض نہیں سب کا اتباع مقصود ہے خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اعمال اسلام کو کامل کر لیا جائے سو اس کا ایک جز و اطاعت و ترک معصیت بھی ہے ایک جز و شکر و ترک کفر بھی ہے اور ان کی تخصیص بطور تمثیل کے ہے مقصود یہ ہے کہ سب اعمال کو جمع کرنا چاہیے۔ پس اسلام کامل تو یہ ہے مگر اس وقت لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو دوسرے طور پر سمجھ رکھا ہے اہل سائنس نے دواؤں کا ست نکالا تھا مگر اس وقت کے عقلاء نے اسلام کا ست نکالا ہے کہ اپنے خیال کے موافق کچھ چیزیں اسلام میں داخل رکھ لیں کچھ چیزوں کو خارج کر دیا مگر صاحبو ست اس چیز کا نکلا کرتا ہے جس میں کوئی فضول جز و بھی ہو تو کیا آپ کے نزدیک اسلام میں کوئی فضول جز و بھی موجود ہے اگر کسی کا یہ خیال ہے تو اس سے تو خدا تعالیٰ پر اعتراض لازم آتا ہے۔ صاحبو! اسلام کا کوئی جز و بھی قابل ترک کے نہیں حتیٰ کہ حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر میں اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف نہ ہوگا کیونکہ کچھ فرض نہیں اور توریت پر بھی عمل ہو جائے گا اس پر یہ آیت نہی شدومد کے ساتھ نازل ہوئی۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ الخ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ شیطان کے قدم بقدم مت چلو) خیال کیجئے کہ گوشت کھانا بھی کیا کوئی رکن اعظم تھا مگر اس کے ترک کو قربت سمجھنے پر کس قدر شدومد ہوا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا اتنا جز و بھی ترک کے قابل نہیں پھر ست کیسے نکل سکتا ہے اور ست اسلام کا اس طرح نکالا ہے کہ بعض نے تو صرف عقیدوں کو کافی سمجھا اور اعمال وغیرہ کی کچھ بھی ضرورت نہ سمجھی اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عہدوں میں بھی انتخاب کیا ہے لیکن وہ بہت اقل و نادر ہیں مگر ہیں چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز کی ضرورت اب نہیں رہی یہ عرب کے واسطے مقرر ہوئی تھی کہ وہ نامہذب تھے اب متمدن ہیں ہم میں کوئی توحش کی شان باقی نہیں رہی لہٰذا (نعوذ باللہ) اس کو اسلام سے حذف کر دیا جائے۔ انا للہ. اس مشورے کا سیدھا اور صحیح جواب یہ ہے کہ یہ قرآن شریف کے خلاف ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ آجکل اس جواب کی قدر نہیں کرتے اس کو عجز اور دفع الوقتی پر محمول کرتے ہیں اور علماء سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ قطع نظر حوالہ قرآن و حدیث سے ہر قانون کی لم بیان کرو۔ صاحبو! قوانین ظاہری جن میں بہت سے خلاف عقل عوام بھی ہیں ان کی لم کیوں نہیں تلاش کی جاتی۔ صرف وجہ یہ ہے کہ اس قانون کی وقعت دلوں میں ہے اور قانون اسلام کی وقعت نہیں ورنہ اگر اس کی بھی وقعت ہوتی تو ہرگز اس میں چوں و چرا نہ کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا کہ

زبان تازہ کردن باقرار تو　　　　نینگیختن علت از کار تو

(زبان کو ہر وقت تیرے ذکر سے تازہ رکھنا چاہیے تیرے کام کے لئے کوئی وجہ اور شرط نہ ہونی چاہیے) اور یہ شان ہوتی ہے کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اگر تو زندگی بخشے تو یہ تیری مہربانی ہے اور تو موت دے تو ہم خود تجھ پر فدا ہیں میری جاں تیرے حوالہ ہے جو تیری مرضی چاہے وہ کریں ہر حالت میں راضی ہوں۔ (تکمیل الاسلام)

قدر استطاعت حصول تقوی کا حکم

جب آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ نازل ہوئی تو صحابہ یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور کے واسطے ہے کہ اسی وقت اللہ سے ایسا درجہ تقوی کا حاصل کرلو۔ جو حق ہے اس کا اور قاعدہ تو یہی ہے کہ امر فور کے لئے نہیں ہوتا۔ لیکن گاہ گاہ قرائن سے فور بھی محتمل ہوتا ہے۔ پس صحابہ اسی احتمال سے کانپ اٹھے اس لئے کہ جو حق ہے تقوی کا وہ فوراً کیسے حاصل ہوسکتا ہے تو اس کے بعد یہ آیت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ بطور اس کی تفسیر کے نازل ہوئی۔ مطلب یہ ہوا کہ حق تقاتہ درجہ منتہی کا ہے اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علی الفور واجب نہیں ہے بلکہ بقدر استطاعت تقوی اختیار کرو اور بتدریج اسمیں جتنی جتنی ہو سکے ترقی کرتے رہو۔ حتی کہ جو تقوی مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے پس اس تقریر پر ان دونوں آیتوں میں نسخ اصطلاحی نہیں ہوا اور بعض روایات میں جو نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم کو بھی شامل ہے۔

تصوف کا حاصل کرنا فرض ہے

مولانا سے سوال کیا گیا کہ کیا تصوف حاصل کرنا فرض ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں ہر مسلمان کے لئے فرض ہے کیونکہ حق تعالٰی ارشاد فرماتے ہیں اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ کہ اللہ سے حق ڈرنے کا ڈرو اس کا دوسرا اصطلاحی نام تصوف ہے۔ صیغہ امر کا ہے جس سے وجوب ثابت ہوتا ہے اس پر بعض نے شبہ کیا ہے کہ یہ تو منسوخ ہے چنانچہ روایات میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ پر سخت گزری اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حق ڈرنے کا کون ڈر سکتا ہے یہ تو طاقت سے باہر ہے اس پر آیت نازل ہوئی کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ آیت پہلی کے لئے ناسخ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے منسوخ ہونا حسب اصطلاح اہل اصول کے لازم نہیں آتا کیونکہ سلف کی اصطلاح میں لفظ نسخ کا اطلاق مطلق تغیر پر آتا ہے گو وہ بیان تفسیر ہی ہو چنانچہ یہاں بیان بھی یہی ہے کہ ظاہراً اتقو اللہ حق تقاتہ سے فور مستفاد ہوتا تھا اور یہی صحابہؓ پر شاق ہوا۔ اس کی تفسیر کے لئے دوسری آیت نازل ہوئی۔ یعنی حسب استطاعت اس کا اہتمام رکھو فی الفور تحصیل درجہ کمال کا مامور نہیں۔

کامل تقوی کیلئے حسب استطاعت کوشش کا حکم

فرمایا کہ ایک جگہ تو اللہ کا ارشاد ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اور دوسری جگہ ارشاد ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ عموماً مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ دوسری آیت پہلی کی ناسخ ہے لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر مظہری میں ان آیتوں کی عجیب تفسیر لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دوسری آیت میں پہلی آیت کے حکم کی توضیح ہے نہ کہ نسخ۔

چونکہ اس میں امر کا صیغہ اختیار فرمایا گیا تھا اور امر گو اپنی حقیقت میں عموماً فور کو مقتضی نہیں ہوتا لیکن محاورات میں متبادر فور ہی ہوتا ہے اس لئے صحابہ غایت خشیت سے یہی سمجھے کہ حق تقوی اختیار کرنے کا جو حکم ہے وہ فوری ہے اور فوری طور پر حق تقوی اختیار کر لینا استطاعت سے باہر تھا لہٰذا اس آیت کو سن کر گھبرا گئے کہ فوراً اس درجہ کا تقوی کیونکر اختیار کر سکیں گے۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی جس میں یہ تفسیر کر دی گئی کہ کامل تقوی اختیار کرنے کا فوری حکم نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حسب استطاعت کوشش کرو اور رفتہ رفتہ کامل تقوی اختیار کر لو۔ رہا روایات میں اس کو نسخ کہنا سو نسخ متقدمین کی اصطلاح میں عام ہے رفع حکم و توضیح حکم کو یعنی صرف رفع حکم ہی کو نسخ نہیں کہتے بلکہ توضیح حکم کو بھی نسخ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جانیں نہ دینا۔

اسلام کی حقیقت

یہ ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خدا تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا ہے دو چیزوں کا جن میں سے ایک امر ہے اور دوسرا نہی ہے۔ امر یہ ہے کہ خدا سے ڈرو اور نہی یہ کہ بجز اسلام کے کس حالت پر مت مرو۔

یہاں چند امور قابل غور ہیں ایک یہ کہ یہ خطاب جو ایمان والوں کو ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ دوسرے لوگ نہ ڈریں بلکہ اوروں کو خطاب اس لئے نہیں کیا کہ یہ خطاب ان کے لئے قبل از وقت تھا اور اسی سے فیصلہ ہو جائے گا کہ کفار جزئیات کے مخاطب ہیں یا نہیں سو قبل از وقت وہ مخاطب جزئیات کے نہیں ہیں البتہ جب وہ اس زمرے میں داخل ہو جائیں اس وقت وہ بھی مخاطب ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کالج میں ایک کورس بنایا گیا اور یہ خطاب کر کے اس کو پیش کیا گیا کہ اے طالب علمو! اس کو سیکھو۔ تو یہاں جو خاص طالب علموں کو خطاب ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اوروں سے سیکھنے کا مطالبہ نہیں کیونکہ یہ پرنسپل اوروں کو بھی کالج میں داخل ہو کر طالب علمی کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ تو مطلوب ہر ایک سے ہوا لیکن جو شخص ہنوز کالج کا طالب نہیں بنا اس کو یہ خطاب قبل از وقت ہے اس کو یہ کہیں گے کہ تم طالب علم ہو جاؤ۔ اس کے بعد وہ نام لکھ لے گا تو اس کو یہ خطاب کیا جائے گا کہ تم فلاں کورس سیکھو۔

اسی طرح کلام مجید کے اس خاص خطاب کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اہل اسلام سے تقوی مطلوب نہیں۔ لیکن ان کو یہ خطاب کرنا قبل از وقت ہے ان سے اول یہ کہا جائے گا کہ تم ایمان لے آؤ۔ اس کے بعد تقوی کا حکم کیا جائے گا اور اگر کہیں قرآن میں خطاب عام سے اتقوا فرمایا ہے تو وہاں اتقوا سے آمنوا مراد ہے کیونکہ ایمان بھی تقوی کا ادنیٰ درجہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں ایک بات کا تو امر فرمایا ہے اور ایک سے نہی چنانچہ ترجمے سے ظاہر ہے۔ اس کا قائل ہونا ممکن نہیں کہ مضامین میں ارتباط نہیں اور یہ تو ایک ہی آیت کے دو جملے ہیں۔ خود آیتوں میں بھی اس کا قائل ہونا صحیح نہیں کیونکہ اگر آیتوں میں نہ ہوتی۔ تو ترتیب تلاوت کی ترتیب نزول کے خلاف کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ نازل تو کہیں ہوئی اور رکھی گئی کسی دوسری جگہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مناسب مضامین کے لحاظ سے ترتیب مقرر ہوئی ہے اور جب آیتوں میں ارتباط

ہے تو اجزائے آیات میں علی سبیل الاولیت ارتباط ہوگا اور جب یہ ہے تو بظاہر امر و نہی دونوں میں عنوان ایک ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیا بات ہے کہ امر میں تقوی کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ مگر در آں حالیکہ تم مسلمان ہو۔

فرمایا گیا ہے مرتے وقت تک مسلمان رہنا اور ربط کا ہونا ضروری ہے پس یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ اتقوا اللہ اور مسلمون دونوں کا حاصل ایک ہی ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقوی کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں علی ہذا اسلام کامل حق تقوے ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں۔ اس کے لئے حق تقوی کی تفسیر کو دیکھ لیجئے اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ورنہ نہیں۔ تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے ان یطاع ولا یعصیٰ یہ کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور بعض نے لکھا ہے ان یشکر واو لا یکفر شکر کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔ اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں مگر ان میں کچھ تعارض نہیں۔ سب کا اجتماع مقصود ہے۔

شان نزول

یہ آیتیں ہر چند کہ ایک خاص قصہ میں نازل ہوئی ہیں مگر مقصود اسی قصہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے ان میں ہم کو ایک دستور العمل بتلایا ہے تا کہ پھر ایسے قصے رونما نہ ہوں اور دیگر آفات سے بھی محفوظ رہیں۔ قصہ یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے دو خاندانوں میں جن کا نام اوس وخزرج ہے سخت عداوت تھی۔ جب مدینہ والے مسلمان ہو گئے تو یہ عداوت اتحاد سے اور وہ بغض ونفرت دوستی اور محبت سے مبدل ہوگئی اور جب سیدنا رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے اس وقت تو یہ اتحاد اور بھی زیادہ مستحکم ہو گیا اور یہ اتحاد یہود کو بہت ناگوار گزرا اور ایک یہودی نے جو اوس وخزرج دونوں قبیلوں کے آدمیوں کو ایک جلسہ میں باہم شیر وشکر دیکھا تو حسد سے جل مرا اور اس نے ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا کہ اوس وخزرج میں جو وقائع وحروب ہوئے ہیں اور ان کے متعلق ہر قبیلے کے شعراء نے جو اشعار کہے ہیں وہ اشعار انصار کی مجلسوں میں پڑھ دے چنانچہ اس میں وہ کسی قدر کامیاب ہو گیا کہ اشعار کا پڑھنا تھا فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی یہاں تک کہ لڑائی کا موقع اور وقت بھی مقرر ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جو اطلاع ہوئی آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا اندھیر ہے کہ میرے سامنے ہی کہ میں تمہارے اندر زندہ موجود ہوں پھر مسلمان ہو جانے اور باہم متفق ومتحد ہو جانے کے بعد یہ واہیات حرکت۔ کیا تم اسلام کے بعد پھر اسی حالت کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو۔ حضور ﷺ کے ارشاد سے سب کو تنبہ ہوا اور سمجھے کہ یہ شیطانی حرکت تھی اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی جس سے حاسدین کی کوشش اکارت گئی۔ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا) کیونکہ اب پہلے سے بھی زیادہ اتحاد ہو گیا اور صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ نفسانیت کی بناء پر باہم قتال وجدال عملی کفر ہے اس لئے ہمیشہ کے واسطے اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ جس سے دشمنوں کی تدابیر الٹی ہو گئیں اور صحابہ میں پہلے سے بھی زیادہ

محبت والفت قائم ہوگئی مضلین کو بھی بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کام کرتے ہیں اہل حق کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا انجام خیر ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ شیطان کو بھی جو رئیس المضلین ہے دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ بندہ سے ایک معصیت کرانا چاہتا ہے تاکہ خدائے تعالیٰ سے اس کو بعد ہو جائے مگر اس کو پہلے سے بھی زیادہ قرب بڑھ جاتا ہے بعض دفعہ تو اس طرح کہ وہ گناہ کا ارادہ کر کے پھر خدا کے خوف سے رک جاتا ہے اور بعض دفعہ گناہ کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد ندامت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ بندہ روتے روتے ہلاکت کے قریب ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کو یہ عجز و نیاز پسند ہے وہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ مقرب بنا لیتے ہیں پھر یہ شخص آئندہ کو اس گناہ کے وہ دروازے بالکل بند کر دیتا ہے جن کی وجہ سے شیطان کے دھوکہ میں آیا تھا غرض شیاطن الانس والجن دونوں کو بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے جیسا کہ اس یہودی کو ہوا جس نے اوس وخزرج میں نفاق وشقاق ڈالنا چاہا تھا اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میری سعی کا انجام یہ ہوگا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوشش کو صرف اسی واقعہ میں ناکام نہیں کیا بلکہ آئندہ کا بھی انتظام فرما دیا اور جدال وقتال کے دروازے بالکل بند کر دیئے چنانچہ اس سے پہلے جو آیات ہیں ان میں اول تو اہل کتاب پر ملامت ہے جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی اس فعل پر ملامت کرنے سے پہلے ان کو کفر پر ملامت کی گئی جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم خود بھی مسلمان ہو جاتے نہ یہ کہ الٹا دوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے ہو پھر مسلمانوں کو خطاب اور فہمائش ہے کہ اہل کتاب کو تمہارا اتحاد واتفاق جو ذریعہ ہے دین و دنیا کی ترقی کا سخت ناگوار ہے وہ تم کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں اور اگر تم ان کا کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے (اور دشمنوں کے فریق میں آ کر اپنا نقصان کرنا اور ان کا دل خوش کرنا سخت جہالت وحماقت ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور بھلا تم کیسے کفر کر سکتے ہو حالانکہ اسباب مانعہ عن الکفر (کفر سے روکنے والے اسباب) پورے طور پر جمع ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور (پھر) تم میں اللہ کے رسول ﷺ بھی موجود ہیں اور یہ دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کے پس تم کو چاہیے کہ کتاب اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیم کے موافق ایمان پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو اور (یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑتا ہے (یعنی اس کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے مخالف کی اطاعت نہیں کرتا) تو ایسا شخص ضرور راہ راست کی طرف مائل کیا جاتا ہے (الدوام علی الاسلام)

اس آیت میں کفر سے مراد معنی عام ہیں، جو کفر اعتقادی وعملی دونوں کو شامل ہے اور قتال وجدال کفر عملی ہے کیونکہ فعل قریب کفر ہے اس سے نااتفاقی پیدا ہوتی ہے جو گناہ بھی ہے اور قوت وترقی کی زائل کرنے والی بھی پر ان بکھیڑوں میں پڑ کر دین حق سے بعد ہو جاتا ہے۔ نااتفاقی میں ہر شخص دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن سے ممکن تدبیر کو کام میں لاتا ہے خواہ جائز ہو یا ناجائز۔ انسانیت سے قریب ہو یا بعید۔

اسی واسطے حدیث میں فساد ذات البین کو حالق فرمایا ہے کہ یہ مونڈنے والی چیز ہے پھر حضور ﷺ نے اس کی تشریح

بھی خود ہی فرمائی۔ لااقول تحلق الشعر بل تحلق الدین میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب مسلمان کو دین سے بعد ہوگا تو کفر سے قرب ہوگا (اور قاعدہ عقلیہ ہے القریب من الشیء یاخذ حکمہ کہ جو جس سے قریب ہوا اسی کا حکم لے لیتا ہے اسی وجہ سے فقہاء نے اقرب الی القعود (بیٹھنے کی طرف قریب تر) کو قاعد اور اقرب الی القیام (کھڑے ہونے کے قریب) کو قائم اور غالب الغش (کھوٹ غالب) کو مغشوش اور غالب الفضہ (چاندی غالب) کو فضہ (چاندی) فرمایا ہے۔ اس قاعدہ سے فعل قریب من الکفر (قریب کفر کے) کو کفر کہنا اور اس کے مرتکب کو عملاً کافر کہنا صحیح ہے کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے قتال وشقاق کو تکفرون سے تعبیر فرمایا ہے یہ استعمال محاورات کے موافق ہے حقیقت پر محمول نہیں۔ خوارج و معتزلہ کی جہالت ہے کہ انہوں نے محاورات کی تدقیق پر محمول کرنا شروع کر دیا اس لئے متکلمین کو علم کلام مدون کرنے کی ضرورت ہوئی اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آج کل جو ہم لوگوں میں یعنی مسلمانوں میں نا اتفاقی ہے دیکھ لیا جائے کہ یہ کیسی سخت حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ حضرات صحابہ اس کو سن کر چونکے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے ان کو دستور العمل بتلایا کہ خیر جو ہو چکا ہو چکا گزشتہ تو گذشت ہوا آئندہ کا بندوبست کرو تا کہ پھر اس معصیت کا خطرہ نہ رہے۔ چنانچہ اول تقوی اور اسلام پر مداومت کا امر ہے پھر اعتصام بحبل اللہ کا امر ہے پھر ارشاد ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے) جس میں نعمت اتفاق کے یاد کرنے کا حکم ہے کہ اس نعمت کو اور اس کی برکات کو یاد کرو اور موازنہ کرو کہ تمہاری پہلے کیا حالت تھی اور اس کا نتیجہ کیا تھا اور اتفاق کے بعد کیا حالت ہوگئی اور اس کا انجام نعیم مقیم ہے

اسلام کا مفہوم

اسلام کے معنی لغت میں سپرد کرنے کے ہیں جس کو تسلیم بھی کہتے ہیں جس کو صوفیہ نے تفویض سے تعبیر کیا ہے یہی اسلام کی حقیقت ہے مگر اب لفظ اسلام سے اس کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا قرآن میں کہیں اسلام کا ذکر مجملاً ہے کہیں مفصل ہے اور مفصل بمعنی تفویض ہی ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ الایہ (جو شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو) دوسری جگہ ہے وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (اور ایسے شخص سے اچھا زیادہ کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ شخص مخلص بھی ہو اور ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں)

اور ایک جگہ ہے وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) یہاں اسلام وجہ کے ساتھ اتباع ملت ابراہیم کا بھی ذکر ہے اور اس کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا

وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۝اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۔ اور ملت ابراہیم سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی جس سے معلوم ہوا کہ ملت ابراہیم بھی اسلام وجہ رب العالمین ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کرے جس کو ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا (میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) سے بیان فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن میں اسلام کی تفسیر اسلام وجہ ہے جس کے پورے معنی نماز روزہ کے نہیں ہیں بلکہ اسلام وجہ بمعنی تفویض ہے یعنی اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دینا اور اپنے کو ہر تصرف الٰہی کے لئے آمادہ کر دینا کہ وہ جو چاہیں کریں جو چاہیں حکم دیں سب منظور ہے نماز روزہ بھی اس تفویض کا ایک فرد ہے لیکن عین نہیں اگر قرآن میں اسلام کا استعمال اطلاق ہی کے ساتھ ہوتا اور اس کے ساتھ وجہ اللہ یا وجھہ الی اللہ مذکور نہ ہوتا تو یہ بھی احتمال تھا کہ اسلام بمعنی اطاعت ہے مگر ان قیود کے ساتھ اطاعت کے معنی نہیں بنتے بلکہ تفویض ہی کے معنی مستقیم ہوتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ آیات میں بعض بعض کی مفسر ہوتی ہیں تو اب جہاں اسلام بلا قید مذکور ہے' وہاں بھی مقید ہی مراد ہے۔ جیسے احادیث میں علم کے فضائل بلا قید مذکور ہیں حالانکہ علم مصدر ہے جس کے لئے قید کی ضرورت ہے خواہ بصورت مفعول ہو یا مضاف الیہ اس لئے لفظ کے اطلاق سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فضائل مطلق علم کے ہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ علم سے علم دین مراد ہے ایسے ہی نصوص میں اسلام سے اسلام وجہ مراد ہے یعنی تفویض یہی وہ چیز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات وفضائل ہیں جا بجا حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

پس ان آیات میں اصل مقصود وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) ہے اور اتَّقُوا اللّٰہَ (اللہ سے ڈرو) وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ (اللہ کے انعام کو یاد کرو) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو) یہ سب اسی کے لقب ہیں۔ اس لئے میں نے اس بیان کا نام الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام' تجویز کیا ہے جس میں اصل مقصود کے ساتھ اس کے دوسرے عنوانات پر بھی دلالت ہے جیسے مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی کا سجع میں نے کہا تھا ثاقب از لطف محمد اسحاق جس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام محمد ﷺ کے لطف سے روشن ہوئے ہیں مگر اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس مصرع میں مولوی محمد اسحاق صاحب اور ان کے والد کا اور دادا کا نام بھی آ گیا ہے کیونکہ ان کے والد کا نام لطف اللہ یا لطف الہدیٰ تھا اور دادا کا محمد ثاقب ایسے ہی اس وعظ کے نام میں اسلام بھی ہے اور اعتصام بھی ہے اور نعمت پر بھی دلالت ہے جس سے وہ تمام عنوانات جمع ہو گئے جو اس آیت میں اختیار کئے گئے ہیں بہرحال اس جگہ اول تو اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (تو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) فرمایا گیا ہے جس میں تفویض کی کسی قدر تفصیل ہے پھر وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اور تم اسلام کے سوا کسی حالت میں جان مت دو)

میں مجملاً تفویض کا ذکر ہے اس کے بعد پھر تفصیل ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ - وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (اللہ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو اور اللہ کے نام کو یاد کرو) میں کیونکہ مقصود کی علامت یہی ہے کہ اس کا ذکر شروع میں بھی ہو۔ درمیان میں بھی ہو تو یہاں اول ترکیب ہے پھر جمع ہے۔ پھر تحلیل ہے جس کا لطف اہل علم کو خاص طور سے حاصل ہوگا۔

موت کے وقت تفویض کامل کا حکم

بہر حال یہاں مراد داوموا علی الاسلام (اسلام پر مداومت کرو) ہے مگر اس کو لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اسلام کے علاوہ اور کسی حالت میں جان مت دو) کے عنوان سے اس لئے ظاہر کیا گیا کہ دوا موا علی الاسلام (اسلام پر مداومت کرو) کو سن کر عشاق پر مصیبت آ جاتی کہ حکم تو دوام علی التفویض کا ہے اور ہم سے اس میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس عنوان میں ان کی تسلی کر دی گئی کہ اگر موت کے وقت بھی تفویض کامل ہو جائے تو کافی ہے۔ عوام تو اس کو سن کر بے فکر ہو گئے ہوں گے کہ بس مرتے ہوئے تفویض کامل حاصل کر لیں گے۔ ارے اس کے ساتھ یہ مقدمہ بھی تو ملاؤ کہ مرتے وقت تفویض کلی عادۃً اسی کو حاصل ہوتی ہے جو زندگی بھر اس میں مشغول رہا ہو۔ ورنہ موت کا وقت تو سخت نازک ہے۔ وہ تحصیل نسبت (طے مقامات و تکمیل تفویض کا وقت تھوڑا ہی ہے کہ اسی وقت کام شروع کرو اور اسی وقت حاصل بھی کر لو اور یوں خلاف عادت حق تعالیٰ جو چاہیں کر دیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام و آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام کو بدوں ماں باپ کے بنا دیا' ورنہ عادت یہی ہے کہ بدوں مرد و عورت کے مباشرت کے بچہ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح عادۃً مرتے ہوئے انہی کو مقامات حاصل ہوتے ہیں جو زندگی بھر انہی کی فکر میں لگے رہے تھے (الدوام علی الاسلام)

اتفاق کی حقیقت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (ترجمہ: اس کا یہ ہے کہ تم سب لوگ مل کر دین اللہ کے ساتھ تمسک کرو) اور سب کے سب دین پر قائم رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود دین ہے۔ اتفاق بھی وہی مطلوب ہے جو تمسک بالدین کے ساتھ ہو۔

آج کے عقلاء نے صرف اتفاق کا نام سن لیا ہے اور اس کی رٹ میں دن رات مصروف رہتے ہیں تو ان کے نزدیک اتفاق کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے کے ہم خیال ہو جائے کہ جو شخص حق کو چھوڑ کر باطل پرست کے ساتھ ہو جائے وہ بھی اتفاق سمجھا جاتا ہے حالانکہ کوئی صحیح العقل اس کا طالب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کا اتفاق برادری کا اتفاق ہے۔ مثلاً ناچ برابر کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ برا بھی سمجھتے ہیں اگر منع کرو تو کہتے ہیں کیا کریں برادری تو نہیں بگاڑی جاتی۔ خلاف وضع کیسے کریں بزرگوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے تو ایک اتفاق یہ بھی ہے۔

قرآن پاک نے فیصلہ کر دیا کہ اتفاق مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ اتفاق کے خاص فرد کی طلب ہے یعنی باطل کے ساتھ نہ ہو اور عکس کی صورت مطرود ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ عزاسمہ نے اجتمعوا نہیں فرمایا بلکہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا فرمایا کہ وہ اتفاق مطلوب ہے جس میں زمام دین ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اس کی پوری توضیح مثالوں سے ہو جاتی ہے مثلاً دو سلطنتوں میں

جنگ ہو اور بازار گرم ہو۔ اب خواہان قوم کیا اتفاق اتفاق وہاں بھی پکاریں گے اور اتفاق کی صورت یہ تجویز کریں گے کہ ایک سلطنت بلاکسی ترجیح کے اپنی حکومت سے دستبردار ہو جائے اور دوسری سلطنت بانیل مرام واپس پھرے تو کیا یہ اتفاق ہے؟

یا ایک ظالم شخص ایک مظلوم سے لڑنے لگے۔ اب یہاں اتفاق کی صورت ایک یہ بھی ہے کہ مظلوم محض ساکت کھڑا پٹتا رہے تا کہ اتفاق ہاتھ سے نہ جائے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ اتفاق مطلوب کے معنی یہ ہیں کہ ظالم اس فعل شنیع سے باز رہے اور مظلوم کے ساتھ اتفاق کرے۔ نہ کہ مظلوم بیچارہ مصیبت میں مبتلا رہے۔

ان سب باتوں سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مطلق اتفاق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب و مرغوب فیہ وہی اتفاق ہے جس میں ناحق کو حق کے تابع کیا جائے نہ کہ بالعکس۔ لہٰذا یہ عنوان کہ آپس میں اتفاق سے رہو نہایت یہ مہمل عنوان ہے اول تعیین حق کی ضرورت ہے اس کے بعد جو ناحق پر ہو اس سے فہمائش کی جائے کہ اہل حق کے ساتھ متفق ہو کر رہے نہ کہ علی الاطلاق اتفاق اتفاق پکارنا شروع کر دیا۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا۔ سبحان اللہ! کیا قرآن پاک کی بلاغت ہے اوپر تو خود تفرق سے نفی فرمائی اب یہاں ارشاد ہے کہ تفرق کی مشابہت بھی نہ کرو کیونکہ مشابہت کرنے سے تم متفرقین کی طرح بن جاؤ گے چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے من تشبه بقوم فهو منهم گو بعض لوگوں نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے لیکن آیت تو ضعیف نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ لاتکونوا کالکفار کیونکہ الذین تفرقوا کا مصداق کفار ہی ہیں اور یہ ممانعت اعمال میں تھی جو ہر وقت مشاہد بھی نہیں اور جو امور ہر وقت مشاہد بھی ہیں (اور جو امور ہر وقت ظاہر رہتے ہیں) جیسے لباس وغیرہ اور ان میں مشابہت کیسے جائز ہو سکتی ہے۔

آیت میں اجتمعوا کا لفظ نہیں فرمایا بلکہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ فرمایا جیسے کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مطلق اجتماع مراد نہیں بلکہ وہ اجتماع جس میں دین اللہ فوت ہوتا ہو اس کو دور ہی سے سلام کرنا چاہیے اگرچہ ساری قوم کے خلاف وضع اختیار کرنی پڑے مگر دین اللہ سے ہرگز منہ نہ موڑے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

تفسیری نکات

ہر شخص امر بالمعروف کرنے کا اہل نہیں

ایک صاحب نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ ایک حافظ صاحب مسجد میں باتیں بہت کیا کرتے تھے میں نے ان سے کہا کہ آپ مسجد میں باتیں نہ کیا کریں کیا آپ کو اپنے حافظ ہونے پر گھمنڈ ہے اس پر وہ حافظ صاحب بیٹھے رہے اور دو دن تک

مسجد میں نہیں آئے مولانا نے فرمایا کہ ان کے بیٹھے رہنے کا گناہ آپ پر بھی ہوا پھر فرمایا کہ بعض مفسرین نے جو لکھا ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ میں کہ من تبعیضیہ ہے یہ مجھ کو بہت پسند آتا ہے کیونکہ امر واقعی یہ ہے کہ ہر شخص کو امر بالمعروف کا سلیقہ نہیں ہوتا اور اسی واسطے ہر شخص کا کہنا گوارا نہیں ہوتا (اشرف المقالات)

انتظام شریعت

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ یعنی ایک جماعت تم میں سے ایسی ہونی چاہیے جو داعی الی الخیر ہو۔ یعنی جو دین کی بقا میں کوشاں ہو اور شرعی امور اور دینی معاملات کا انتظام کرے اور امة منکم اس لئے فرمایا کہ اگر سب یہی کرنے لگیں تو کھیتی کون کرے گا اور نوکری تجارت وغیرہ کون کرے گا۔ یہ شریعت کا انتظام ہے کہ زراعت تجارت وغیرہ کو فرض کفایہ کیا ہے۔ اگر سب چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں کیونکہ مجموعہ کو اسباب معیشت کی بھی حاجت ہے ورنہ سب ہلاک ہو جائیں اور نہ دنیا رہے نہ دین اور جو لوگ تارک اسباب ہیں ان کی جمعیت وتوکل بھی مباشرین اسباب ہی کی بدولت ہے گو ان احاد کی تعیین نہیں مگر مجموعہ میں ایسے احاد کا ہونا ضروری ہے خصوصاً ہم جیسے ضعفاء کے لئے تو اگر ظاہری سامان نہ ہو تو تشویش سے دین ہی میں خلل پڑنے لگے۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا سے سب کو تعلق ہے کوئی سگا ہے کوئی سوتیلا اور مطلق مذموم بھی نہیں کیونکہ دنیا مطلقاً بری نہیں ہے بلکہ دنیا جو معصیت ہے صرف وہ بری ہے۔ اس لئے باری تعالیٰ نے ولتکن فرمایا کونوا نہیں فرمایا۔ جیسا کہ اوپر وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا فرمایا۔ اس لئے مقصود تو یہ کہ دین تو سب میں ہو لیکن ایک ایسی ہی جماعت ہو جو مولویت ہی کا کام کریں اور کچھ دوسرا کام نہ کریں۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ۔ لفظ منکم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کام کے لائق نہیں ہیں اور یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ اس کے اہل نہیں سمجھے جاتے۔ ان کا کہنا لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے اور جو لوگ اہل ہیں ان کا کہنا چنداں گراں نہیں گزرتا۔ نیز علماء جو کچھ کہتے ہیں تہذیب سے اور شائستگی سے کہتے ہیں۔ غرض یہ طعن وتشنیع کا شیوہ مناسب نہیں ہے اپنے کام میں لگے رہو اگر کوئی برا ہو تم اس پر ترحم کرو اور اس کے لئے دعا کرو۔

تبلیغ کا ایک درجہ سب کے ذمہ ہے

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ تو یوں فرمایا وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ کہ اے مسلمانو! تمہارے اندر ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے۔ یہاں تو دعوت کو ایک جماعت کے ساتھ خاص فرمایا اور اس کے بعد ارشاد ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ کہ اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ظاہر کئے گئے ہو۔ تم نیک کاموں کا حکم کرتے ہو بُرے کاموں سے روکتے ہو۔

یہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو سب کے لئے عام کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک درجہ ایسا بھی ہے جو سب کے ذمہ ہے اور علماء کے ساتھ خاص نہیں۔ (آداب تبلیغ)

اہل علم کی شان

جن کو اس آیت میں فرماتے ہیں وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں) اس آیت میں یدعون (بلاویں) کا مفعول ذکر نہیں فرمایا یہ ذکر نہ کرنا مشیر (اشارہ کرنے والا) ہے اس کے عموم کی طرف مطلب یہ ہے کہ یدعون الناس یعنی عام لوگوں کو خیر کی طرف بلاویں تو یہ شان اہل علم کی ہے یعنی ان لوگوں کی جنہوں نے سب علوم کا بقدر ضرورت احاطہ کیا اور فرض یہ بھی ہے مگر فرض علی الکفایہ ہے۔ کہ امت میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونا چاہئیں کہ جن سے عوام امت کا کام چلے اسی لئے محققین نے من کو اس آیت سے تبعیضہ کہا ہے یعنی تم میں بعض ایسے ہونے چاہئیں۔

دعوت عامہ کے اقسام

یہ ایک خاص جماعت کا کام ہے ساری امت کا کام نہیں ہے اور دعوت الی الخیر اور دعوت الی اللہ کے ایک ہی معنی ہیں سو اس میں تو اس کو صرف ایک خاص جماعت کا کام فرمایا گیا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کہ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف بصیرت پر ہو کر میں اور جتنے میرے متبع ہیں اور حق تعالیٰ تمام برائیوں سے پاک ہیں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ دیکھئے یہاں پر مطلقا ومن اتبعنی ہے یعنی جتنے میرے متبع ہیں سب حق کی طرف بلاتے ہیں اس میں عموم ہے۔

اس خصوص اور اس عموم سے معلوم ہوا کہ اس کے درجات و مراتب ہیں ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک درجہ کا دوسری آیت میں اور وہ درجات دو ہیں ایک دعوت عامہ ایک دعوت خاص پھر دعوت عامہ کی دو قسمیں ہیں ایک دعوت حقیقیہ اور ایک دعوت حکمیہ۔ دعوت حکمیہ وہ جو کہ معین ہو دعوت حقیقیہ میں میں نے آسانی کے لئے یہ لقب تجویز کئے ہیں ان میں اصل دو ہی قسمیں ہیں دعوت الی اللہ کی۔ دعوت عامہ دعوت خاصہ۔ اور ایک قسم معین ہے دعوت عامہ کی۔ تو اسی طرح یہ کل تین قسمیں ہوگئیں۔ تو ہر شخص کے متعلق جدا جدا مرتبہ کے لحاظ سے ایک ایک دعوت ہوگی۔ چنانچہ دعوت خاصہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور وہ وہ ہے جس میں خطاب خاص ہو اپنے اہل وعیال کو دوست احباب کو اور جہاں جہاں قدرت ہو اور خود اپنے نفس کو بھی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کلکم راع و کلکم مسئول۔ کہ تم میں ہر ایک راعی ونگران ہے اور تم میں ہر ایک (قیامت میں) پوچھا جائے گا کہ رعیت کیساتھ کیا کیا۔ یہ دعوت خاصہ ہے اور قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔

يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچاؤ۔ یہ بھی دعوت خاصہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچانے کا حکم ہے سو اس کا تو ہر شخص کو اپنے گھر میں اور تعلقات کے محل میں اہتمام کرنا چاہیے۔

عمومی دعوت میں تخصیص کا راز

ایک اور دعوت عام ہے جس میں خطاب عام ہو یہ کام ہے صرف مقتداؤں کا۔ جیسا کہ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ الایۃ سے معلوم ہو رہا ہے اور اس تخصیص میں ایک راز ہے۔ وہ یہ کہ دعوت عامہ (یعنی وعظ) اسی وقت مؤثر ہوتی ہے کہ جب مخاطب کے قلب میں داعی کی وقعت ہو۔ بلکہ مطلق دعوت میں بھی اگر داعی کی وقعت نہ ہو تو وہ مؤثر نہیں ہوتی تو عام دعوت میں عام مخاطبین کے قلب میں داعی کی وقعت ہونی چاہیے اور ظاہر ہے کہ بجز مقتداء کے کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو عام لوگوں کے دل پر اثر ڈال سکے اور ایسے لوگ کتنے ہوتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہوں کہ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال اور یہ سمجھتے ہوں کہ

مرد باید کہ گیرد اندر گوش   در نبشت است پند بر دیوار

(انسان کو چاہیے کہ نصیحت پر عمل کرے۔ وہ نصیحت کی بات خواہ دیوار پر لکھی ہوئی کیوں نہ ہو)

تو ایسے لوگ تو بہت کم ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ عموماً یہ دیکھتے ہیں کہ واعظ یا داعی باوقعت ہے یا نہیں اگر وقعت نہیں ہوتی تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ جب ہمارے برابر کا ہو کے ہم کو نصیحت کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترفع چاہتا ہے اور ہم سے بڑا بننا چاہتا ہے اور واقع میں اکثر ہوتا بھی یہی ہے۔ اس وجہ سے دعوت عامہ میں مقتداء ہونے کی ضرورت ہے۔ (دعوت الی اللہ)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے حکم کرتے ہو نیکیوں کا اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان)

فضائل امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس آیت میں اس امت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں جن میں فضیلت ایمان باللہ کی تو ہر شخص کے پاس اپنے لئے ہے اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ دوسروں کے نفع کے لئے ہیں کیونکہ اس سے دوسروں پر نفع کا اثر پہنچتا ہے اور مقتضاء قواعد کا یہ تھا کہ یہاں تو مومن باللہ کو مقدم فرماتے کیونکہ وہ اساس اعمال ہے مگر مؤخر کرنے میں غالباً یہ نکتہ ہے کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح ہمہ گیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے کیونکہ اپنی ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کر لے گا۔ ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی واجب نہیں بلکہ یہ تو محض عمل کی ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔ پھر دوسرے کی کرے یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو موخر کو بھی نہ کرے کیونکہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں اور ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو بھی ترک کرے گا تو اس کے ترک کا گناہ ہوگا اور دوسرے کو ترک کرے گا تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا اور دونوں کو ترک کرے تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔

تو یہ غلطی ہے کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کرے۔ بعض اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ (لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلاتے ہو) وہ اس سے یہی

سمجھے گا کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے۔ کیونکہ ہمزہ تامرون پر انکار کے لئے داخل ہوا ہے تو امر بالبر (نیکی کا حکم) منکر ہوا۔ یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے۔ اس آیت کا تو یہ جواب ہو گیا۔

اب ایک دوسری آیت کا مطلب بھی سنئے جس سے ان لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ بے عمل کو وعظ و نصیحت نہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (کہ تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے کہ جو کام خود نہ کرو اسے کہو) دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑ گئے، ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے کہ جو کام خود نہ کرے وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے۔

اصلاح غیر کے مدارج

البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں چنانچہ ایک درجہ یہ ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ) اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے۔

افسوس اس بات میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہو رہی ہے خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں، مگر بھی بیوی بچوں کو نوکروں کو اور متعلقین کو نہیں کہتے بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے مگر نماز قضاء کر دیں تو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے اگر کہنے سے نہ پڑھیں تو مار کے پڑھاؤ اگر کوئی دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت کی وجہ سے بے نماز ہوگا تو اس کا سرپرست گنہگار ہوگا تو اگر اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی تو قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ (اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ) میں اھلیکم کے کیا معنی ہوں گے۔

دوسرا درجہ یہ ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے) اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (ایک دوسرے کو حق کی فرمائش کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو پابندی کی فرمائش کرتے رہتے ہیں) اس میں بھی تخصیص نہیں اہل و عیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امر و نہی کی تاکید ہے۔ اسی طرح حدیث میں تاکید ہے۔ ارشاد ہے کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک تم میں سے اپنی رعیت کے بارہ میں پوچھا جاوے گا) اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے تو پھر ان آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں۔

غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے مگر کیا کروں۔ اس وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دوقومیں مرتد بنا رہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی۔ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِیَآءَ حَتّٰى یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کر کے آپ کو عبرت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے (کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ تاکہ سب برابر ہو جاویں) جیسے ایک کبڑے سے کسی نے پوچھا تھا کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کا کبڑا ہونا' کہنے لگا کہ دوسروں کا کبڑا ہونا تاکہ میں بھی دوسروں کو اس نظر سے دیکھ لوں جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔

تو کفار تو یہ چاہتے ہیں کہ تم سب ان کے برابر ہو جاؤ۔ آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ فلاتتخذو امنھم اولیا (ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو) کیونکہ جب ان کی یہ حالت ہے کہ وہ دل سے تمہارا کافر ہونا پسند کرتے ہیں تو لامحالہ وہ تم سے مل کے اس کی کوشش کریں گے۔ افسوس مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کو مسلمان بنا دیں اور وہ ہر وقت دل میں یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بنا دیں۔

ترجمہ: یہ سب برابر نہیں ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں۔ اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

کثرت تلاوت ونفل کی ترغیب

یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اور هُمْ یَسْجُدُوْنَ حقیقت تلاوت وسجدہ کی حاصل ہونے کی کوشش کرو اور اس کا طریق یہی ہے کہ حقوق ان دونوں عبادتوں کے ادا کرو۔ قبل اس کے کہ میں ان کے حقوق بیان کروں ایک بات بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک سوال اور اشکال متوجہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جن اعمال کی فضیلت بیان کی گئی ہے آیا یہ اعمال فرض ہیں یا نہیں اگر فرض نہیں ہیں تو فرض کا ذکر بہ نسبت نفل کے اہم ہے اور ذوق لسانی اور قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد نفل ہے اس لئے کہ اسلوب کلام اور الفاظ سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ مقصود کثرت تلاوت ونفل ہے تو کثرت تلاوت ونفل دونوں فرض نہیں ہیں اور اگر کہا جاوے کہ مراد صلوۃ تہجد ہے تو صلوۃ تہجد بھی فرض نہیں ہے۔ غرض بہر صورت نفل ہے پھر فرائض کو چھوڑ کر نفل کی فضیلت کیوں بیان فرمائی اور اگر کہو کہ مراد فرض ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ ذوق لسان اور قرائن اس سے آبی ہیں اس اشکال کا جواب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مراد تو نفل ہی ہے باقی رہی یہ بات کہ فرائض کی اہمیت ان کے ذکر کو مقتضی ہے یہ صحیح ہے لیکن ذکر کے انواع مختلف ہیں صریح اور لازمی۔ فرائض کی اہمیت اس نفل کی فضیلت بیان کرنے سے اور زیادہ بڑھ گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب وہ لوگ نفلوں میں کوتاہی نہیں کرتے تو فرائض میں تو بطریق اولی کوتاہی نہ کریں گے۔ پس فرائض کا ذکر گو عبارۃ النص سے نہیں ہے لیکن دلالۃ النص سے فرائض کی اہمیت زیادہ محفوظ ہوگئی ہے اور اس زمانہ کے لوگ ایسے نہ تھے جیسے آج کل بعض ہیں کہ نوافل کا تو اہتمام کریں فرائض کی پرواہ نہ کریں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے پیر کا اس قدر اتباع کرتا ہوں کہ فرض نماز چاہے قضا ہو جائے مگر پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ ناغہ نہیں ہوتا اگر ایسے ہی لوگ اس وقت بھی ہوتے تو واقعی فرض کی اہمیت پر اس آیت کی دلالت ظاہر نہ ہوتی۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں مراد نفل ہے پس اس تفسیر کے موافق اس آیت میں قیام لیل یعنی تہجد کا ذکر ہوا اور تراویح کا لقب ہے قیام رمضان۔ قیام میں تو بعینہ محفوظ رہا۔ اس میں صرف ایک مضاف الیہ اور بڑھ گیا یعنی قیام لیلۃ رمضان۔ جبکہ اس آیت کا مدلول قیام لیل ہے تو قیام لیل

رمضان بھی اس میں ضرور داخل ہوگا بس اب میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس آیت سے تراویح کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور وہ بھی مدار خیریت کا ہے پس ان کو ایسے پڑھئیے کہ آپ کی
خیریت محفوظ رہے اور جو اس میں منکرات ہیں اس سے بچئے (التہذیب)

عقائد

یعنی یہ اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں سب کو ایک لکڑی سے نہ ہانکنا۔ ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق پر قائم وثابت ہیں۔ یہ تو عقائد کی طرف اشارہ ہے آگے یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ .

اعمال

یہ اعمال کی طرف اشارہ ہے یعنی پڑھتے ہیں وہ اللہ کی آیتوں کو ساعات شب میں اور وہ نماز پڑھتے ہیں اس ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان آیتوں میں دونوں چیزوں کا ذکر ہے تلاوت قرآن کا اور نماز کا بھی لیکن مفصلا ذکر نہیں بلکہ اجتماعی طور سے ذکر ہے یعنی نماز میں قرآن پڑھنے کا ذکر ہے اس لئے کہ اس آیت کی دو تفسیریں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ

تراویح

وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ میں واؤ عاطفہ ہے۔ اس وقت تو اقتران پر یہ آیت نصف نہ ہوگی گو محتمل ہو دوسری تفسیر یہ ہے کہ واؤ حالیہ ہو اور ذوق ارجح یہی معلوم ہوتا ہے اس صورت میں اقتران اس کا مدلول ہوگا یعنی مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی آیتیں ساعات لیل میں تلاوت کرتے ہیں اس حالت میں کہ سجدہ کرتے ہیں پس اس تفسیر کے موافق اس آیت کا مضمون تراویح کے نہایت مناسب ہو گیا۔ بہر حال اس آیت سے اس عمل کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور نیز دوسری وجہ فضیلت کی یہ ہے کہ شروع رکوع۔

اعمال خیر

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ میں اس امت کی خیریت کا ذکر ہے۔ پس آگے ان اعمال کا ذکر ہوگا۔ جن کو خیریت میں دخل ہوگا اور یہاں خیریت کے معنی یہ نہ سمجھنا جو لوگ بولا کرتے ہیں کہ تمہارے یہاں خیریت ہے بلکہ خیریت کے معنی ہیں بہت اچھا ہونا خیر صیغہ افعل التفضیل کا ہے۔ پس حاصل یہ ہوگا کہ اگر تم یہ اعمال کرو گے تو بہت اچھے ہو جاؤ گے حق تعالیٰ جن کو بہت اچھا کہیں ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔ (التہذیب)

يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا اس سے معلوم ہوتا ہے بکاء اور خشوع تلاوت قرآن کے وقت ہونا چاہیے یہاں پر طالب علموں کو ایک شبہ ہوگا وہ یہ کہ رونا تو اختیاری نہیں اور سالکین کو یہ شبہ ہوگا کہ جب یہ صفت ایمان والوں کی ہے اور ہم کو رونا آتا نہیں تو ہمارے اندر ایمان نہیں ہے ایک دوست نے بھی مجھ کو لکھا تھا کہ جب سے میں حج کر کے آیا ہوں رونا نہیں آتا اور پہلے رونا آتا تھا۔ میں نے ان کو جواب لکھا کہ رونے سے مراد آنکھوں کا رونا نہیں اس لئے کہ

وہ غیر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری کی اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا بلکہ مراد دل کا رونا ہے۔ پس تم کو آنکھوں سے رونا نہیں آتا لیکن دل کا رونا تم کو حاصل ہے۔ باقی اختیار سے رونے کی عورتیں مشتاق ہیں۔ کسی کے یہاں تعزیت کے لئے جائیں گے اور اپنے کسی مردہ کو یاد کر کے بس رونا شروع کر دیں گی۔ اور ان کا کوئی تازہ مرا ہوا نہ ہوگا تو یہ حکمت کریں گی کہ کپڑے سے منہ چھپالیں گی اور جھوٹ موٹ ہوں ہوں کرنے لگیں گی۔ لیکن مردوں کا رونا اختیاری نہیں ہے اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ رونا نہ آوے تو رونے کی شکل بنالو۔ یہاں بھی دل کا ہی رونا مقصود ہے اس لئے کہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے جب رونے کی شکل بنائے گا تو دل میں بھی رونا آ ہی جائے گا۔

ترجمہ: اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ تھے شائستہ لوگوں سے ہیں۔

مدار اصلاح

اس آیت میں بعض آیات کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور آیت کے خاتمہ پر ان اعمال کو مدار اصلاح قرار دیا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ صلاحیت اور درستی حال منظور ہو تو ان اعمال کو اختیار کرنا ہے۔

علماء کی قسمیں

وحی کے بتانے والے جن کو علماء کہتے ہیں دو قسم کے ہیں علماء ظاہر اور علماء باطن ظاہر جو ہر چیز کا حکم بتاتے ہیں۔ لیکن علماء باطن کی تعلیم اثر میں ان سے بڑھی ہوئی ہے۔ علماء ظاہر دعوت عام سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ضابطہ کی تبلیغ کرتے ہیں بس اتنا بتادیتے ہیں کہ اگر یہ صورت ہے تو یہ حکم ہے اور یہ صورت ہے تو یہ حکم ہے۔ مثلاً ایک شخص اچھا کپڑا پہنتا ہے اور علماء ظاہر سے اس کا حکم پوچھے گا تو بتائیں گے کہ اگر نیت تکبر کی نہ ہو تو جائز ہے اور ہو تو ناجائز علماء باطن چونکہ خاص تربیت کا بھی تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ تعلیم میں اس کا بھی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس خاص شخص کی نیت تکبر کی ہے یا نہیں اور اس کو وہ کپڑا پہننا جائز ہے یا نہیں۔ نیز وہ اپنی تعلیم میں اصل منشاء کو دیکھتے ہیں اور اسی کا علاج کرتے ہیں اور آثار کی طرف ان کی توجہ زیادہ نہیں ہوتی اور اہل ظاہر زیادہ تر آثار کو دیکھتے ہیں اور اسی اختلاف طرز تعلیم کے سبب عملاً باطن بعض اوقات ظاہری احتساب کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے جس سے کبھی اہل ظاہر ان پر طعن کرتے ہیں کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے۔ ڈاڑھی مونڈے ان کے یہاں آتے ہیں اور کچھ روک ٹوک نہیں کرتے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ حکیم ہیں ایسا راستہ ڈھونڈتے ہیں جس سے اس منکر کا منشاء ہی ندارد ہو جاوے پھر وہ منکر ہی نہ رہے گا۔ وہ علاج پورا کرتے ہیں مگر مریض کو بھڑکاتے نہیں۔ جیسے شفیق طبیب کہ دوا بھی دیتا ہے اور بوجہ شفقت مریض کے مذاق کی بھی رعایت رکھتا ہے کہ اس کا منہ بھی کڑوا نہ ہونے پائے بتاشہ مقدر میں رکھ کر دوا کھلا دیتا ہے یا کوئی ایسی چیز ملا دیتا ہو کہ اس سے تلخی زائل ہی ہو جاتی ہے طبیبان الٰہی طبائع کی خصوصیات کو سمجھتے ہیں اور اس کی رعایت سے دوا دیتے ہیں مگر عجلت نہیں کرتے مولانا جامی فرماتے ہیں

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند ... کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندی حضرات قافلہ کے عجیب سردار ہیں کہ لوگوں کو خفیہ راستہ سے قافلہ کو حرم کی طرف لے جاتے ہیں)

تمام مشائخ کا یہی طرز ہے۔ان حضرات کے یہاں امر و نہی سب کچھ ہے لیکن تدبیر کے موافق ان کے معالجات بہت مفید اور مرض کا استیصال کرنے والے ہوتے ہیں مگر ان کے معالجات اور اہل ظاہر کے معالجات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔مثلاً کبر کا ایک مریض ہو تو اہل ظاہر اسکے عمل کو دیکھ کر جو اس شخص سے صادر ہوا کہہ دیں گے تم نے یہ فعل مذموم کیا اس کا علاج یہ ہے کہ توبہ کرلو۔یہ علاج مفید ہے کیونکہ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ دس برس کے مرض کے علاج کے لئے یہ توبہ استیصال میں کیسے کافی ہوسکتی ہے۔اس علاج سے صرف ایک خاص فعل کا گناہ جاسکتا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔آج اس فعل سے بچ گیا تو کل اس کبر سے کسی دوسرے فعل میں مبتلا ہوسکتا ہے۔اس فعل سے توبہ کرائی جائے گی تو پرسوں کو اور ایسے ہی گناہ میں طول ہو جائے گا تو ساری عمر توبہ بھی رہے گی اور گناہ بھی ہوتا رہے گا۔معالجہ ہو رہا ہے مگر مرض سے نجات نہیں ملتی اور اہل باطن کیا کریں گے کہ اس فعل کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں گے مگر کسی اور تدبیر سے اس رذیلہ کا یعنی اس کے غلبہ اور قوت کا اخراج قلب میں سے کردیں گے جو منشا ہے اس فعل کا۔جب منشا ہی نہ رہا تو یہ فعل بھی نہ رہے گا اور آئندہ کے لئے بھی اس جیسے افعال سے اطمینان ہو جائے گا یہ علاج کام کا ہے یا وہ اور یہ نہی ابلغ ہے یا وہ۔میں کیرانہ گیا تھا ایک صاحب آئے اس شان سے کہ خدمت گار ساتھ مٹھائی لئے ہوئے اور فرمائش کی مجھے بیعت کرلیجئے۔میں اس حرکت کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ان میں مرض تکبر اور ترفع کا ہے میں نے کہا جلدی نہ کیجئے مجھے اس وقت وعدہ کے سبب ایک اور جگہ جانا ہے وہاں میرے ساتھ چلئے اور یہ مٹھائی بھی لے چلئے وہ خود مٹھائی لیکر میرے ساتھ چلے دوسرے مکان پر میں اسی طرح وہاں سے ایک اور مکان پر گیا اور وہاں سے اور مکان پر۔اسی طرح بہت سے مکانوں پر گیا اور ایسی جگہ سے قصداً گذرا جو خوب آباد ہیں۔اسی طرح خوب چکر لگوایا ان کا علاج ہو گیا ترفع اور تکبر سب ملیامیٹ ہو گیا۔یہ عملی علاج ایک ہی جلسہ میں ان کے لئے اکسیر ہو گیا اور مرض کا نام ونشان بھی نہیں رہا۔دیکھئے اتنی سی دیر میں مزاج درست ہو گیا اتنی ذراسی تدبیر نافع ہو گئی۔زبان سے اس حرکت کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا گیا لیکن اس حرکت کا منشاء مع تمام اس جیسے اور حرکات کے رخصت ہوا۔دیکھئے یہ نہی ابلغ اور انفع ہوئی یا یہ نہی ہوتی کہ اس حرکت سے توبہ کرالی جاتی مگر منشاء کے باقی رہنے سے اور حرکات ترفع کی صادر ہوتی رہتی ہیں ایسے ہی موقع پر بعض وقت زبان سے کہنے کا وہ اثر نہیں ہوتا جو سکوت کا ہوتا ہے فرماتے ہیں

گرچہ تفسیر زبان روشنگراست لیک عشق بے زبان روشن تراست

(اگرچہ)(عشق کا حال) زبان سے معلوم ہونا چاہیے لیکن واقع میں بے زبان کا عشق زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ ذوقی امر ہے

اہل اللہ کی نظر بہت دقیق ہوتی ہے اس واسطے ان کے معالجات بھی بہت لطیف ہوتے ہیں لیکن اہل ظاہر کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی اس واسطے ان کے معالجات بھی اس شان کے نہیں ہوتے۔حاصل اس تمام تقریر کا یہی ہے کہ ان میں وہ دین نہ تھا جو مطلوب ہے۔دین مطلوب جبھی حاصل ہوسکتا ہے کہ وحی کا اتباع کیا جائے اور بلفظ دیگر حضور ﷺ کے آگے ارشاد ہے یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ یعنی پیش قدمی کرتے ہیں نیک کاموں میں۔یہ بھی صفت اہل کتاب کی اسی جماعت کی

ہے جس کو مذمت سے مستثنیٰ کیا اور اس میں بھی وہی کلام ہے جو پہلے صفتوں میں تھا یعنی يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں) اور يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں بری بات سے) میں۔ آگے ارشاد وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (یہی لوگ صالحین سے ہیں) اس میں اس جماعت اہل کتاب کا ذکر فرمایا جس جماعت میں یہ اوصاف ہیں یعنی وہ صالحین میں سے ہیں یہاں پر ایک اور بات قابل غور ہے اس دوسری جماعت کے واسطے جو فرمایا ہے وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ (یہی صالحین میں سے ہیں) ظاہرا صالحین کے لفظ سے کچھ ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کے لئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں کیونکہ صالحین کا درجہ مومنین کے سارے درجوں سے سب سے کم درجہ ہے جیسا کہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں کہ صالحین کے اوپر شہداء کا درجہ ہے اور ان کے اوپر صدیقین کا تو اس سے ثابت ہوا کہ یہ جماعت مومنین کے ادنیٰ درجہ میں سے شمار کی جائے گی حالانکہ واقع میں اس کے خلاف ہے اس لئے کہ جو کوئی ایمان لایا وہی مومن ہے۔ خواہ پہلے اہل کتاب رہا ہو یا بت پرست یا مجوس غرض کچھ بھی رہا ہو اسلام لانے کے بعد اسے یہ سب درجات مل سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ محاورات کے درجات سے اس قسم کے اوہام پیدا ہوا کرتے ہیں چنانچہ اس شبہ کی بناء بھی یہ ہے کہ لفظ صالحین کو اسی معنی پر محمول کیا گیا جو ایک درجہ والوں کا لقب ہے حالانکہ اس کا استعمال دوسرے معنوں میں بھی آیا ہے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں بھی اس کا استعمال قرآن میں موجود ہے وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ (دنیا میں ہم ان کو بھلائی عطا کریں گے اور بلاشک وہ آخرت میں صالحین سے ہوں گے) یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں ہے جو انبیاء علیہم السلام میں بعد حضور ﷺ کے سب سے بڑے نبی ہیں ان کو بھی صالحین میں سے فرمایا یہاں معنی صالحین کے وہ ہو ہی نہیں سکتے جو ادنی درجہ ہے نیز اس کے ساتھ فرمایا ہے فی الاخرۃ جس کے معنی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت کی صلاحیت ہے۔ علما نے اتفاق کیا ہے اس بات پر کہ انبیاء علیہم السلام کو آخرت میں بھی برابر ترقی ہوتی رہے گی اور اس سب کو حق تعالیٰ نے صلاح فرمایا تو معلوم ہوا کہ صلاح ایک ایسا مفہوم ہے جو بڑے اور چھوٹے مراتب کو شامل ہو سکتا ہے اس درجہ کے لئے بھی صلاح ثابت جو مومنین کا ادنی درجہ ہے جس سے یہ دھوکہ ہوا اور اس درجہ کو بھی حاصل ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت میں ہوگا اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کیونکہ درجات بلند ہو جائیں گے اور صلاح کا لفظ سب میں استعمال کیا جاتا ہے۔ غرض صالحین کا درجہ ادنی بلکہ بڑے بڑے مدارج کو بھی شامل ہے تو اب وہ وہم دفع ہو گیا کہ اس جماعت اہل کتاب کو کوئی بڑی فضیلت ثابت نہ ہوئی۔ ایک توجیہ یہ تو اس وہم کے دفع کی یہ ہوئی اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ المطلق اذا اطلق یرادبه الفرد الکامل (مطلق جب بولا اس سے مراد فرد کامل ہوا کرتا ہے) صالحین کے آگے یہاں کوئی قید نہیں ہے تو ہم اس صالحین سے انہیں لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو اس کے فرد کامل ہیں تو معنی آیت أُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ کے یہ ہوئے کہ اس جماعت کا شمار ان صالحین میں ہوگا جو اعلیٰ درجہ کے صالحین ہیں اب وہم جاتا رہا کہ اس جماعت کی زیادہ فضیلت ثابت نہیں ہوئی بلکہ پورے طور سے ثابت ہو گئی کہ یہ سب اعلیٰ درجہ میں شمار ہوں گے

اوراس تقریر سے غلط فہمی میں نہ پڑ جانا کہ انبیاء علیہم السلام کی مساوات لازم آ گئی کیونکہ ان کے لئے بھی مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (صالحین میں سے) کا لفظ آیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے بھی یہی لفظ مستعمل ہوا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ صالحین ایک مفہوم ہے جوادنی درجہ والوں پر بھی بولا جاسکتا ہے اور اعلیٰ درجہ والوں پر بھی۔ اس کے بعض افراد وہ بھی ہیں جومومنین کے ادنی درجہ میں ہیں اور وہ بھی ہیں جو اعلیٰ درجہ میں ہیں میں نے محض آپ لوگوں کے وہم کو دفع کرنے کے لئے (کہ ان کے لئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں ثابت ہوئی) قرآن شریف سے اس لفظ کا استعمال دکھلایا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ والے کے لئے بھی یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور ادنیٰ درجہ والے کے لئے بھی غرضیکہ جب اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (اور یہ صالحین میں سے ہیں) میں صالحین کو مطلق رکھا ہے تو ہم با قاعدہ المطلق اذا اطلق یرادبه الفرد الكامل (جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد فرد کامل ہوا کرتا ہے اعلیٰ ہی درجہ کیوں نہ مراد لیں جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے ثابت ہے اور اس استدلال سے ہمیں ان سے مساوات نہیں ثابت کرنا ہے اور نہ ہو سکتی ہے ہمارے لئے تو یہ معراج ہے ہم ان کے خدام میں شامل ہو جائیں یہ بساغنیمت ہے۔ مساوات کا تو نام ہم کیا لے سکتے ہیں ہمارے لئے تو ان کی معیت وتبعیت ہی باعث فخر ہے اور یہی ہمارے لئے اعلیٰ درجہ ہے۔ سو اتباع سے ان شاء اللہ یہ ضرور حاصل ہوگی اس لئے یہ معیت قرآن شریف کی نص قطعی سے ثابت ہے فرماتے ہیں وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں پس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین (کے ساتھ) اور یہ لوگ اچھے رفیق ہیں) اس آیت میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنیوالوں کے لئے ان حضرات کے ساتھ معیت ثابت کی گئی ہے جن پر خدا کا انعام ہوا اور منعم علیہ کون ہیں اور صدیقین وشہدا اور صالحین۔ گو بطریق تابعیت ہی ہو مگر یہ بھی کتنی بڑی بات ہے

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اگر اللہ تعالیٰ یہ معیت نصیب فرماویں تو بہت ہی بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہ درجہ کس کو نصیب ہوتا ہے الحمد للہ کہ لفظ صالحین کے لفظ کے متعلق ایک بہت بڑا وہم رفع ہوا اب میں بیان ختم کرنا چاہتا ہوں جو مدعا ہے اسے سن لیجئے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ جس کا ترجمہ یہ ہے لوگ صالحین میں سے ہیں اور لفظ اولئک کا مشارالیہ اہل کتاب کی وہ جماعت ہے جس میں یہ صفات ہوں يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ (اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے منع کرتے ہیں اور نیکیوں میں پیش قدمی کرتے ہیں) مگر اس حکم میں خصوصیت اہل کتاب کی نہ سمجھی جاوے کیونکہ گو مورد آیت کا خاص ہو مگر عموم الفاظ یا علت سے حکم عام ہوا کرتا ہے اسکا حاصل یہ ہوا کہ اصلاح کامل اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو ان صفات کے ساتھ متصف ہو گویا دوسرے کے حق میں حکم بیان کر کے اس امت کو بھی سنانا ہے کہ اگر اصلاح

کامل چاہیے ہو جس سے انبیاء علیہ السلام کی رفاقت نصیب ہو تو یہ صفات حاصل کرو جو آیت میں مذکور ہیں اور بناء ان سب کی حضور ﷺ اور وحی کی اتباع ہے چاہے وہ بواسطہ ہو یا بلا واسطہ اس طرح سے کہ کسی حالت میں اپنی رائے کا اتباع نہ کیا جائے چنانچہ اہل کتاب کی دونوں جماعت میں جو ایک کی تعریف اور ایک کی مذمت فرمائی گئی ہے ان کا منشاء یہی ہے۔ جس جماعت نے اپنی رائے کو چھوڑ کر حضور ﷺ اور وحی کا اتباع کیا اب انہیں واقعات سے لوگ اپنی حالتوں کا موازنہ کریں
جماعت نے اپنی رائے کو چھوڑ کر حضور ﷺ اور وحی کا اتباع کی اب انہیں واقعات سے لوگ اپنی حالتوں کا موازنہ کریں
کہ کہاں تک ان میں وحی الٰہی اور حضور ﷺ کا اتباع ہے اور کہاں تک خود رائی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کے سارے اعمال گندے اور قابل اصلاح ہیں اور اصلاح ہر ایک پر واجب ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہر کام میں حضور ﷺ کا اتباع کیا جائے اور اپنی رائے و ہوائے نفسانی کو چھوڑ دیا جائے بلا اس کے کام نہیں چلتا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا تواں رفت جز درپئے مصطفیٰ

(سعدی محمد ﷺ کی پیروی کے بغیر راہ صفا پر چل سکنا محال ہے)

اور فرماتے ہیں

دریں راہ جز مرد داعی نرفت گم آں شد کہ دنبال راعی نرفت

مراد داعی سے حضور ﷺ ہیں سو جس نے حضور ﷺ کا پیچھا پکڑا اور حضور ﷺ کا اتباع کیا وہ منزل مقصود کو پہنچ گیا اور جس نے حضور ﷺ کے اتباع کو چھوڑ کر اپنی رائے اور خواہشات نفسانی کو اپنا رہنما بنایا وہ گمراہ ہو کر جادہ مقصود سے بالکل دور ہو گیا۔ اب دعا کیجئے حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق اعمال صالحہ کی ہدایت عطا فرمائیں۔ (آمین)

اوصاف صالحین

اور اس میں بھی وہی کلام ہے جو پہلی صفتوں میں تھا یعنی يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ میں آگے ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ. اس میں اس جماعت اہل کتاب کا حکم بیان فرمایا جس جماعت میں یہ اوصاف ہیں یعنی وہ صالحین میں سے ہیں یہاں ایک بات اور قابل غور ہے اس دوسری جماعت کے واسطے جو فرمایا ہے وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ظاہرا صالحین کے لفظ سے کچھ ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کے لئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں کیونکہ صالحین کا درجہ مومنین کے سارے درجات میں سب سے کم درجہ ہے جیسا کہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں کہ صالحین سے اوپر شہدا کا درجہ ہے اور ان کے اوپر صدیقین کا تو اس سے ثابت ہوا کہ یہ جماعت اہل کتاب کی مومنین کے ادنی درجہ میں شمار کی جائے گی حالانکہ واقع میں ہے اس کے خلاف ہے اس لئے کہ جو کوئی ایمان لایا وہی مومن ہے خواہ وہ پہلے اہل کتاب رہا ہو یا بت پرست یا مجوسی غرض کچھ بھی رہا ہو اسلام لانے کے بعد اسے یہ سب درجات مل سکتے ہیں جواب یہ ہے محاورات کے نہ جاننے سے اس قسم کے اوہام پیدا ہوا کرتے ہیں چنانچہ اس شبہ کی بناء بھی یہی ہے کہ لفظ صالحین کو اسی معنی پر محمول کیا گیا جو ایک درجہ والوں کا لقب ہے حالانکہ اس کا استعمال دوسرے معنوں میں بھی آیا ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان

حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں بھی اس کا استعمال قرآن میں موجود ہے۔ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں ہے جو انبیاء علیہم السلام میں بعد حضور ﷺ کے سب سے بڑے نبی ہیں ان کو بھی صالحین میں سے فرمایا یعنی معنی صالحین کے وہ ہو ہی نہیں سکتے جو ادنی درجہ ہے نیز اس کے ساتھ فرمایا ہے فی الاخرۃ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت کی صلاحیت ثابت ہے۔ علماء نے اتفاق کیا ہے اس بات پر کہ انبیاء علیہم السلام کو آخرت میں بھی برابر ترقی ہوتی رہے گی اور اس صفات کو اس خاص جماعت میں موجود مانا گیا جن میں یہ صفات اس طرح موجود ہیں جس طرح ہونی چاہئیں۔ اس سے قاعدہ کا استنباط بالکل ظاہر ہے یہ بیان ہوا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کا آگے فرماتے ہیں يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں بری بات سے یہ بھی صفت ہے اہل کتاب کی اس جماعت کی جس کو مذمت سے مستثنیٰ کیا ہے اس میں وہی کلام ہے جو يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ میں تھا کہ یہ صفت اگر چہ اس دوسری جماعت میں بھی تھی جس کی مذمت کی گئی لیکن اس وجہ سے کہ ان میں یہ صفت بلا اتباع حضور ﷺ کے تھی تو اس طرح نہ ہوئی جس طرح مطلوب تھی لہٰذا اس کا وجود کالعدم ہوا اور یہ کہا جاوے گا کہ یہ صفت قبل اسلام لانے کے گو صورۃً ہو مگر حقیقتاً ان میں تھی ہی نہیں خلاصہ یہ کہ گو ان میں دین تھا مگر وہ دین جو مطلوب ہے نہ تھا اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت تھی بھی ایسے ہی گو وہ بظاہر دین کا کام کرتے تھے۔ لیکن دین کو من حیث الدین نہ کرتے تھے بلکہ ان میں اغراض کو بھی شامل کر دیتے تھے مثلاً غریب کو مسئلہ کچھ اور بتاتے تھے اور امیر کو کچھ اور جیسا کہ ایک مولوی نے ہزار روپیہ دینے والے کے لئے ساس کے ساتھ نکاح کو جائز کر دیا اگر کوئی غریب ہوتا اور کچھ نہ دیتا تو وہ شخص قیامت تک اس کے جواز کا فتویٰ نہ دیتا اس کی نسبت فرمایا گیا ہے وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؗ اگر چہ ہزار روپیہ کی رقم بظاہر کثیر معلوم ہوتی ہے۔

پھر اس کو قلیل کیسے کہا جائے مگر آخرت کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی قلیل کیا بلکہ اقل ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ دین تو حکم الٰہی کا نام ہے امیر و غریب سب اس کے بندے ہیں حکم الٰہی میں کوئی تخصیص کسی کی نہیں تو اس میں تخصیص کرنا نفس اور ہوی کا اتباع ہوا دین کا اتباع نہ ہوا حاصل اس تمام تقریر کا یہی ہے کہ ان میں وہ دین نہ تھا جو مطلوب ہے دین مطلوب جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ وحی کا اتباع کیا جائے اور بہ لفظ دیگر حضور ﷺ کا' آگے ارشاد ہے يسارعون فی الخيرات یعنی پیش قدمی کرتے ہیں نیک کاموں میں یہ بھی صفت اہل کتاب کی اسی جماعت کی ہے جس کو خصوصاً اس صورت میں کہ آیت سابقہ میں باوجود الفاظ تانیث موجود ہونے کے بھی تعمیم تھی۔ غرض وہ بیان بھی مشترک تھا مردوں اور عورتوں کے لئے اور آج کا بیان بھی مشترک ہے دونوں کے لئے یہ دوسرا تناسب ہوا۔

دونوں بیانوں میں یہ مصلحت اور وجہ نکل آئی اس آیت کے اختیار کرنے کے لئے یہ عجیب اتفاقی تناسب پیدا ہوا ہے کہ عورتیں مضمون رجال میں شریک اور رجال مضمون عورتوں میں شریک یہ تمہید ہوئی۔

اب آیت کا مضمون سنئے فرماتے ہیں يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (وہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں نیک کاموں کو بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں سبقت کرتے ہیں یہی لوگ صالحین سے ہیں) اس کے کچھ اوپر کمالات امت محمدیہ ﷺ کے بیان فرمائے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اس سے قبل کمالات امت محمدیہ کے ذکر فرماتے ہیں۔ گومومنین کے اوصاف کمال بہت ہیں مگر اس آیت میں بیان ان اوصاف کا کیا گیا ہے جوام الاوصاف ہیں وہ یہ ہیں تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ آگے اس امت کے مخالفین اہل کتاب کی مذمت کا بیان ہوا ہے لیکن عادت الٰہیہ یہ ہے کہ مخالفین کی مذمت کے ساتھ مومنین کے استثناء کو بھی ذکر فرمادیتے ہیں یعنی کسی قسم کے لئے کوئی حکم ایسا نہیں فرمادیتے کہ بس اچھوں اور بروں کو عام ہو بلکہ ان میں جو برے ہیں ان کے لئے برائی کا حکم فرماتے ہیں اور جو اچھے ہیں ان کے لئے اچھائی کا حکم فرماتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ جس قوم سے خفا ہوئے تو ایک عام حکم لگادیا کہ وہ ساری قوم ایسی ہے کسی شخص کو اس میں مستثنیٰ نہیں کرتے اور اگر کسی شخص سے خفا ہوئے تو اس کی ہر بات پر برائی کا حکم لگادیا گویا وہ سرتاپا عیب ہی عیب ہو گیا کوئی ادا اس کی پسند نہیں رہی۔ اوا گر کسی کو کسی خطا کی معافی بھی دے دیں تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ کدورت باقی رہتی ہے ایسا دل صاف نہیں ہوتا جیسا اس خطا سے پہلے تھا اور وہاں یہ شان ہے کہ چاہے کتنی ہی خطائیں کرو اور ایک دفعہ دل سے توبہ کرلو بس راضی ہوجاتے ہیں بلا کسی ناخوشی کے اور ان خطاؤں کو ایسا محو کردیتے ہیں کہ گویا اس نے کوئی خطا کی ہی نہ تھی اور کسی کو ایک خطا کی وجہ سے ہمہ عیب نہیں کردیتے اور کسی خاص فرد کی خطا سے ساری قوم پر الزام نہیں لگادیتے دیکھئے اہل کتاب کے بعض آحاد کی مذمت بیان فرمائی۔ لیکن ان آحاد کی وجہ سے تمام قوم کو مذموم نہیں کردیا بلکہ جو برے ہیں ان کی مذمت فرمائی اور جو اچھے ہیں ان کی مدح فرمائی۔

موصل الی المقصود

مقصود کے حاصل کرنے کے لئے جو تکلیفیں پیش آتی ہیں عقلمند آدمی ان کو برداشت کرتا ہے چونکہ شریعت کی پابندی موصل الی المقصود ہے پس جس شخص کی نظر مقصود پر ہے وہ اس پابندی کو چھوڑ نہیں سکتا ان آیات میں اس شریعت موصل الی المقصود کی پابندی کا ذکر فرماتے ہیں اور پابند و غیر پابند کے فرق کو بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۞ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ یعنی اہل کتاب سب برابر نہیں ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دین پر قائم ہے وہ خدائے تعالیٰ کی آیتوں کو رات کے اوقات میں پڑھتی ہیں (تو دن میں تو بدرجہ اولیٰ) اور وہ سجدہ کرتے ہیں یعنی نماز پڑھتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور امر بالمعروف و نهي عن المنكر کرتے ہیں اور نیک کاموں میں پیش قدمی کرتے ہیں اور یہ لوگ صالحین میں سے ہیں حق تعالیٰ نے

اس جماعت کو دیگر اہل کتاب میں جن کی مذمت بیان فرمائی تھی مستثنیٰ کیا اور ان کو صالحین میں سے فرمایا اسمیں سب سے پہلے سمجھنے کی قابل یہ بات ہے کہ اہل کتاب کی اس جماعت صالحین میں اور اس دوسری جماعت میں جس کی مذمت فرمائی گئی کیا فرق تھا وہ گمراہ جماعت بھی گو بعض پیغمبروں کو ابن اللہ کہتے تھے چنانچہ بعض حضرات عیسی علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے اور بعض حضرات عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے لیکن یہ عقیدہ کسی کا بھی نہ تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں اور نہ یہ کہ ابن اللہ من کل الوجوہ خدا کے مقابل ہیں۔ واجب مطلق کو سب ایک مانتے تھے مگر ہاں ایسی بات ثابت کرتے تھے جو خدائے تعالیٰ پر محال ہے یعنی بیٹے کا ہونا لیکن ان دونوں عقیدوں سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مومنین باللہ نہ تھے اللہ پر ایمان ضرور رکھتے تھے ہاں بعض ایسی باتوں کے قائل ضرور تھے جو غلط اور بے ثبوت ہیں۔ غرض وہ لوگ بھی مومن باللہ اور آخرت کے بھی قائل تھے سب جانتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کا کوئی فرد بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ قیامت نہیں آئے گی۔

اصل الاصول

حاصل یہ کہ وہ گروہ جس کی مذمت فرمائی گئی اللہ پر بھی ایمان رکھتا تھا اور قیامت کا بھی قائل تھا تو اس گروہ میں اور اس گروہ میں جن کی مدح فرمائی گئی ہے ان دونوں میں تو اختلاف نہ تھا اختلاف تھا تو اس بات میں کہ یہ گروہ جناب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آیا تھا اور وہ گروہ حضور پر ایمان نہیں لاتا تھا تو اس لحاظ سے یہاں دونوں کے فرق بیان کرنے کے لئے بظاہر یہ مناسب تھا کہ یوں فرماتے یومنون بالرسول بجائے یومنون باللہ کے کیونکہ دونوں میں یہی مابہ الفرق تھا مگر اللہ رے بلاغت قرآن شریف کی کہ ایسا عنوان اختیار کیا جس میں مخاطب کے حالات کی بے حد رعایت ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ اصلاح کا اصل الاصول یہ ہے کہ جس کی اصلاح کا قصد ہوتا ہے اس کو شرمندہ نہیں کیا کرتے یہ ایسا پاکیزہ طرز ہے کہ دشمن کو بھی دوست بنالیتا ہے کیسا ہی دشمن ہو مگر اس رعایت کو دیکھ کر وہ دشمنی سے باز آجائے گا۔ اگر یوں تصریحا فرماتے یومنون بالرسول تو وہ لوگ اس وجہ سے کہ ابھی قریب ہی زمانہ میں رسول ﷺ کی مخالفت کر چکے ہیں اور اب ایمان لائے ہیں تو اس مخالفت کو یاد کر کے آپ کے سامنے آنکھیں نیچی ہوتیں کہ ابھی تو ہم نے آپ کو ایذائیں دی تھیں اب کیا منہ لے کر آپ کے سامنے جائیں اور مطیع و دولت ہونے کا دم بھریں تو ممکن تھا کہ یہ خیال شرمندگی کا مانع عن الایمان ہوجاتا اس وجہ سے بجائے یومنون بالرسول کے یومنون باللہ جس میں اس ایذاء سے کچھ تعرض ہی نہیں بلکہ یہ تعلیم ہوگئی کہ تمہارا وہ ایمان باللہ جو اب تک رکھتے رہے کافی نہیں بلکہ دوسرے طریق سے ایمان لانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ بات ایسے شخص سے کہی جاتی ہے جو ایمان باللہ کا خود مدعی ہے تو اس کے معنی یہی ہوسکتے کہ گو تم ایمان باللہ کے مدعی ہو لیکن یہ ایمان تمہارا ایمان باللہ نہیں ہے ایمان باللہ صحیح معنی میں وہ ہے جو حضور ﷺ کے ذریعہ سے حاصل ہوا اور جس پر اہل اسلام عامل ہیں اور جس میں حضور ﷺ کی تصدیق بھی شرط ہے۔ اس عنوان میں یہ خوبی ہوئی کہ ایمان بالرسول کی تعلیم بھی کردی اور ان کی اس قدر رعایت بھی ہوگئی کہ رسول ﷺ کا نام نہیں آیا جس سے وہ شرمندہ ہوتے اور ایمان سے رہ جاتے یہ کس قدر رحمت وشفقت ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ: جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیاوی زندگانی میں اس کی حالت اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ اس کو برباد کر ڈالے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے ہیں۔

تفسیری نکات

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفار حیوۃ الدنیا میں میں جو خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسی کسی کافر قوم کی کھیتی میں پالا پڑ جائے اور اس کو تباہ کر دے۔ تو جیسے وہ کھیتی ہری بھری ہونے کے بعد بالکل ضائع ہو جاتی ہے یونہی کفار کا خرچ کیا ہوا مال بوجہ عدم ایمان کے ضائع محض ہوتا ہے یہ تو آیت کا حاصل تھا۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس مثال میں حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کیوں فرمایا۔ حالانکہ پالہ کافر کی کھیتی کو بھی تباہ کر دیتا ہے اور مسلمان کی کھیتی کو بھی تو بات یہ ہے کہ مسلمان کی کھیتی کا پالہ سے کامل طور سے نقصان نہیں ہوتا گو کھیتی برباد ہو جائے مگر اس مصیبت سے اجر صبر بڑھ جائے گا اور آخرت میں جو ثواب اس کا بدلہ ملے گا وہ اس کھیتی سے لاکھ درجہ افضل ہوگا کیونکہ اجر آخرت کی تو شان یہ ہے

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچہ درد ہمت نیایداں دہد
خود کو باید ایں چنیں بازار را کہ بیک گل می خری گلزار را

پس ضیاع اعمال کافر کے لئے کافر ہی کی کھیتی مثال ہو سکتی ہے کہ پالہ سے فنائے کامل اسی کو ہوتا ہے کیونکہ اس کا بدلہ بھی نہیں ملتا۔ مسلمان کو کامل اور حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ اس لئے ظلموا انفسهم کی قید بڑھا دی۔ واللہ یہ بڑے مزے کی قید ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ دنیا کے کسی نقصان سے بھی ان کا حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ حقیقی نقصان صرف کافر کو ہوتا ہے۔ مسلمان کے لئے ہر وقت خوشی اور مسرت ہی ہے راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی (مظاہر الاعمال) پس اس وجہ سے بھی قلق نہ ہونا چاہیے۔

البتہ اعمال صالحہ اگر فوت ہوں اس کا قلق ہونا چاہیے مگر اس میں بھی ایک تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اعمال صالحہ کے فوت ہونے کا عوام تو جس قدر چاہیں قلق کریں ان کو تو مفید ہے اور سالکین زیادہ اس کا بھی قلق نہ کریں بلکہ تھوڑی دیر تک رنج کر لیں پھر جی بھر کے توبہ کر لیں اور اپنے کام میں لگیں اور ماضی کی فکر میں نہ پڑیں کہ ہائے یہ کام کیوں فوت ہوا ہائے یہ خطا کیوں ہوئی۔ ہر وقت اسی کا شغل رکھنا سالک کو مضر ہے کیونکہ یہ فکر ترقی تعلق مع اللہ میں حجاب ہو جاتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تعلق مع اللہ بڑھتا ہے نشاط قلب سے اور یہ قلق نشاط کو کم کر دیتا ہے لیکن تھوڑی دیر تک تو قلق کرنا چاہیے اور خوب رونا دھونا چاہیے تا کہ

نفس کو کوتاہی کی سزا تو ملے۔ پھر توبہ کر کے اور اچھی طرح استغفار کر کے اس سے التفات کو قطع کرے اور کام میں لگے۔

آج کل زیادہ قلق کرنے میں ایک اور بھی نقصان ہے وہ یہ کہ قلوب اس وقت بے حد ضعیف ہیں۔ زیادہ قلق سے ان کا ضعف بڑھ جاتا ہے جس سے بعض اوقات تعطل کی نوبت آ جاتی ہے جو کھلا ضرر ہے۔ بہر حال جب بعض منافع باقیہ کا فوت بھی زیادہ محل قلق نہیں تو منافع فانیہ یعنی منافع دنیویہ تو بالکل ہی محل قلق نہ ہوں گے تو ان پر تحسر بالکل ہی بے معنی ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ مسلمان کی جو چیز بھی ضائع ہوتی ہے سب حق تعالیٰ کے ہاں جمع ہو جاتی ہے۔ جس کا اسے ثواب ملتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کانٹا بھی چبھ جائے تب بھی ثواب سے محروم نہیں رہا) جب اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے رسول ﷺ کا بھی بدل ہے تو اور کیا رہ گیا۔ اب کوئی مصیبت ایسی نہیں جس سے خدا کے ہوتے ہوئے مسلمان پریشان ہو۔ ہاں دین میں کمی ہو تو قلق ہونا چاہیے کیونکہ اس کا عوض کچھ نہیں مگر اس میں بھی اعتدال ہونا چاہیے جیسا کہ اوپر بتلایا گیا کیونکہ نقصان دین کی تلافی بھی توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری سے ہوسکتی ہے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

ترجمہ: اور خوشی سے کہا مانو اللہ اور رسول ﷺ کا تاکہ تم پر رحم کیا جائے

تفسیری نکات

حُبِ رسول

بہر حال یہ وہ آیت ہے کہ اس میں شریعت وطریقت دونوں کو بھر دیا ہے۔ یہ تمہید تھی اب ترجمہ اور مقصد بیان ہوتا ہے کہ خدا کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو۔ یہی مضمون قرآن میں جابجا مختلف طور پر مذکور ہے کہیں صرف اطیعوا اللہ (خدا کا کہنا مانو) کہیں فقط اطیعوا الرسول (رسول کا کہنا مانو) اور کہیں دونوں کو ساتھ ذکر کیا ہے اس سے ایک عجیب مسئلہ ظاہر ہو گیا کہ اطاعت تو فقط اللہ تعالیٰ کی ہے اور واسطہ اس میں حضور ہیں۔ تو جہاں اطیعوا اللہ کے ساتھ والرسول بھی فرما دیا وہاں معنی یہ ہیں کہ رسول کا کہنا مانو ان کے ذریعے سے اللہ کی اطاعت ہوگی اور کہیں اطیعوا الرسول ہی فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کو خدا کے ساتھ تعلق ہو اس کے ساتھ تعلق کرنا خدا کے ساتھ تعلق کرنا ہے۔ اس سے صاف طور پر اہل سلوک کا ایک شبہ کھل گیا وہ یہ کہ ذکر لا الہ الا اللہ (خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) میں لا الہ کہتے وقت جو ماسوائے اللہ کی محبت کو قلب سے نکالا جاتا ہے تو کیا رسول کی محبت کو بھی نکالا جائے۔

جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت خدا کی محبت کا غیر نہیں کیونکہ حضور سے محبت اسی لئے ہے کہ وہ ذریعہ ہیں وصول الی اللہ (اللہ تعالیٰ تک پہنچنے) کا تو یہ تو بعینہ خدا کی محبت ہے تو یہ لا الہ کے تصور سے خارج نہ کی جائے گی۔

مولانا نے ایک مقام پر اس کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص نے نعل سے پوچھا کہ تو کس کو زیادہ محبوب رکھتا

ہے؟ اپنے کو یا آفتاب کو۔ اس نے کہا کہ جس کو زیادہ محبوب بتلاؤں اس سے دوسرے کا محبوب ہونا لازم آتا ہے کیونکہ اگر اپنے نفس سے محبت ہے تو بوجہ لعل ہونے کے وصف کے ہے اور اس کا یہ وصف آفتاب سے آیا ہے تو آفتاب سے محبت ہوئی اور اگر آفتاب سے محبت ہے تو اسی لئے کہ اس نے یہ وصف میرے نفس کو عطا کیا ہے تو اپنے نفس کی محبت ہوئی۔

اس تمثیل سے یہ مسئلہ خوب حل ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے اسی واسطے محبت ہے کہ آپ مظہر (ظاہر ہونے کی جگہ (صفات خداوندی ہیں حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ آپ نور من انوار اللہ (انوار الٰہی کا ایک نور ہیں) آپ موصل (الی اللہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے) ہیں تو یہ بعینہ خدا ہی کی محبت ہے۔

پس اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو) سب صحیح ہو گیا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کا ثمرہ یہ بیان فرمایا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اس آیت کے متعلق دو مضمون ہیں۔ مختصر بیان کرتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اس میں اطاعت کا حکم ہے۔ لوگ اس کے معنی کہنا ماننا سمجھتے ہیں مگر اس میں ایک جزو اور بھی ہے۔ جس کو لوگ بیان نہیں کرتے یعنی اطاعت کے معنی خوشی سے کہنا ماننا ہے کیونکہ طوع اس کا مادہ ہے اور طوع کے معنی رضا و خوشی کے ہیں تو اس میں حکم صرف کہنا ماننے کا نام نہیں بلکہ خوشی اور رضامندی کے ساتھ کہنا ماننے کا ہے۔

اب ٹٹولنا چاہیے کہ رغبت اور خوشی سے کہنا ماننے والے کتنے ہیں بہت کم ہیں۔ اکثر تو اس واسطے نماز روزہ کرتے ہیں کہ اگر نہ کریں گے تو پٹیں گے عذاب ہوگا۔ اس مذاق کے لوگوں کو اگر عذاب کا ڈر نہ ہو تو کبھی کہنا نہ مانتے سو اس کا نام اطاعت نہیں یہ تو سزا کے خوف سے کام کرنا ہوا۔

تسلیم و رضا

اور دوزخ نہ ہوں تب بھی کہنا مانے۔ چاہے کچھ انعام ملے یا نہ ملے سزا کی وعید ہو یا نہ ہو۔ ہر حال میں سر تسلیم خم رہے کیونکہ اس کی ذات کی عظمت کا یہی مقتضا ہے صاحب کمال کی اطاعت کرنے کو خود بخود جی چاہا کرتا ہے اس کی طرف خود قلب مائل ہوا کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب کمال ہوگا جس میں ظاہری اور باطنی ساری خوبیاں جمع ہیں اور سب خوبیوں کے دینے والے بھی وہی ہیں۔

صاحبو! اگر غلام سے کہا جائے کہ یہ کام کرو اور وہ ساتھ ہی یہ کہے کہ کیا ملے گا۔ تو انصاف سے کہو وہ بے ہودہ ہے یا نہیں۔ بیشک ایسا غلام گردن زنی (گردن مارنے کے لائق) ہے جو بدلہ لے کر اپنے آقا کا کام کرے اس کی تو حالت یہ ہونی چاہیے تھی

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر آ گیا جو تصرف کریں میں راضی ہوں۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تم اللہ کی اطاعت مزدوروں کی طرح مزدوری کی وجہ سے مت کرو۔ یعنی ثمرات کے لئے عبادت واطاعت مت کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی وجہ سے کرو۔ ثمرات خود مرتب ہو جائیں گے۔ اس لئے آقائے حقیقی خود بندہ پروری کی روش کو جانتے ہیں۔

خدا کو خدا سمجھ کر عبادت کرو۔ یہ ہے خوشی سے کہنا ماننا اور یاد رکھو خوشی سے کہنا وہ مانے گا جس کو محبت ہو۔ ظاہراً اس مقام پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ محبت تو قلبی کیفیت ہے اور دل پر کیا اختیار ہے مگر یہ خیال غلط ہے دل کی حرکت کا ارادہ کرو۔ دیکھو حرکت ہوتی ہے یا نہیں تم نے نہ ارادہ کیا نہ سیکھا پہلے ہی سے خیال پکا لیا دل پر کیا اختیار ہے۔

دیکھو! بچہ کو پہلے پہل چلنا نہیں آتا مگر ماں باپ کو چلتا دیکھ کر وہ بھی سیکھ جاتا ہے۔ اگر ماں باپ سے نہ سیکھے تو ہرگز نہیں چل سکتا۔ آپ صاحبوں نے تحصیل کا قصد نہیں کیا۔ اگر طلب ہوتی تو ڈھونڈتے اور کامیاب ہوتے مگر افسوس کہ ناامید ہو کر بیٹھے رہے شریعت نے کم ہمتی کی تعلیم نہیں دی۔ حضور نے عالی ہمتی کا حکم فرمایا۔

ایک شخص آپ کے فیصلہ میں ہار گیا تو اس نے حسبی اللہ ونعم الوکیل (یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو کافی ہیں اور وہ اچھے کارساز ہیں) حضور نے فرمایا کہ تدبیر کرو اور جب کچھ نہ بنے تب کہو حسبی اللہ ونعم الوکیل دنیا کے بارے میں سب حضور کی اس تعلیم پر عمل کرتے ہیں کہ پہلے اپنی طرف سے انتہا درجہ کی کوشش کر لیتے ہیں' مگر دین کے بارے میں یہ حکم یاد نہیں رہتا اس میں آپ ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔

اسباب محبت

چنانچہ یہ شبہ بھی اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ دل پر کیسے اختیار ہوگا۔ تو سنو واقعی محبت کی کیفیت قلبی ہے اور براہ راست تمہارے اختیار میں نہیں مگر اس کے لئے چند اسباب ہیں۔ وہ تمہارے اختیار میں ہیں۔ تو دار مداران اسباب پر ہے اور وہ موقوف محبت پر نہیں۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ' دین میں تنگی نہیں جب محبت کا حکم ہے تو اس کی تحصیل کے اسباب بھی آسان فرمائے ہیں۔ سنئے! میں اسباب کو بیان کرتا ہوں جن سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے چند باتوں کا التزام کرنا چاہیے۔

ایک تو اس کا کہ کسی وقت خاص میں خدائے تعالیٰ کے انعامات کو سوچا کرے اور اس کے ساتھ ہی اپنی نالائق حرکتوں کا مطالعہ کرے اور غور کرے کہ اگر احکام ظاہری کی اتنی مخالفتیں کرتا تو کیا انجام ہوتا اور ان کی نگاہوں میں کیسی ذلت ہوتی۔ مگر حق تعالیٰ نے باوجود میری سرکشی کے اپنے انعامات مجھ سے بند نہیں کئے۔

ولیکن خداوند بالا وپست بعصیاں در رزق بکس نہ بست

یعنی خدائے عالی نے گناہوں کی وجہ سے کسی پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا۔

ایک جزو تو یہ ہے۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ احکام ظاہر یہ شرعیہ کو بتکلف شروع کر دے یہ تجربہ ہے کہ اعمال میں محبت کرنے کا خاصہ ہے کہ اگر اول اول محبت نہ بھی ہو تو بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے مقناطیس کی کیفیت ہے کہ لوہا جب دور۔

ہے تو کچھ نہیں اور جہاں پاس آیا تو یہ خود کھینچ لیتا ہے۔ اعمال میں بھی مقناطیسی اثر ہے۔ تیسرا جزو یہ ہے کہ کچھ وقت ذکر کے لئے بھی نکال لے خواہ تھوڑی ہی دیر ہو خواہ بلا مرید بنے ہو۔ مگر خلوت میں ہو ذرا توجہ کے ساتھ۔ چوتھا جزو یہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھا کرے۔ ان شاء اللہ ان کی صحبت کا اثر یہ ہوگا کہ بہت جلد دنیا کی محبت دل سے کم ہو جائے گی۔ اور اہل اللہ کی پہچان یہی ہے کہ ان میں دنیا کی محبت کم ہو اور ان میں خدا کی محبت ہو۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (تا کہ تم پر رحم کیا جائے) اس میں ایک بہت باریک بات ہے۔ وہ یہ کہ جتنے حکام دنیا میں ہیں ان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر اطاعت نہ کرو تو سزا ہوتی ہے اور اطاعت کرو تو کچھ انعام نہیں اور جہاں معاوضہ ہوتا ہے وہ زیادہ کام کرنے کا ہوتا ہے۔ نفس اطاعت پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ پابندی قوانین بلا معاوضہ ہر شخص کے ذمہ ہوتی ہے اگر پابندی نہ کرے تو مستحق سزا ہوتا ہے اور کوئی پابندی کرے تو اپنے فرض منصبی کو ادا کر رہا ہے۔ مستحق معاوضہ نہیں ہوتا تو کیا اس کو ظلم کہا جا سکتا ہے کیا کوئی اسے خلاف انصاف کہہ سکتا ہے جو شخص حکومت کا راز جانتا ہے وہ اس کو ظلم نہیں کہہ سکتا بلکہ خود حکومت کا حق سمجھتا ہے تو دنیا میں تو ہوتا ہے کہ کام لیا جاوے اور کچھ نہ دیا جاوے مگر یہ نہیں ہوتا کہ بغیر کام کئے صرف اطاعت پر کچھ دیا جائے۔

اب گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو نماز پڑھنے سے منتظر ہیں کہ کچھ ملے گا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی قدر دل میں نہیں وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (جیسی اللہ تعالیٰ کی قدر ہونی چاہیے ویسی انہوں نے قدر نہیں کی) اگر اتنی بھی خدا کی قدر ہوتی جتنی حکام دنیوی کی تو کیا خدا کا ہم پر حق نہیں ہے۔ پھر کیا منہ لے کر ہم معاوضہ وانعام کے متمنی ہیں۔ معلوم ہوا کہ خدا کی عظمت دل میں نہیں ہے۔ اگر عظمت ہوتی تو اگر کچھ بھی نہ ملتا تب بھی اطاعت کرتے مگر حق تعالیٰ کے قربان جایئے کہ اطاعت کا بدلہ صرف سزا نہ دینا گوارا نہ کیا بلکہ فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (تا کہ تم پر رحم کیا جائے) اور رحمت کا لفظ فرمایا جو جنت دیدار بقاء سب کو شامل ہے اور پھر شفقت تو دیکھئے کہ تُرْحَمُوْنَ فرمایا یرحمکم اللہ (اللہ تعالیٰ تم پر رحم کریں) نہیں فرمایا۔ نکتہ یہ ہے کہ اتنا بھی شرمندہ نہ کیا کہ ہم تم پر احسان کریں گے تا کہ عبادت کے ساتھ احسان کے بھی زیر بار نہ ہوں۔ بلکہ بصیغہ مجہول فرمایا کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

شاہی محاورہ

ایک نکتہ اور رہ گیا لعلکم کیوں فرمایا کیونکہ لعل تو امید وشک کے مقام پر استعمال کیا جاتا ہے اور حق تعالیٰ اس سے بری ہیں۔ تو نکتہ یہ ہے کہ شاہی محاورہ ہے۔ محاورہ میں شاید اور امید کا لفظ یقین ہی کے لئے ہوتا ہے بادشاہ یوں ہی خطاب کیا کرتے ہیں کہ تم کو امید رکھنی چاہیے اگر عظمت باری کو پیش نظر رکھا جائے تو اشکال وارد ہی نہ ہوتا۔ شاہی خطوط میں کثرت سے یہ محاورہ مستعمل ہے۔ لکھتے ہیں امیدوار بودہ بدانند (تم کو امیدوار رہنا چاہیے) اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن مجید سب کتابوں سے پہلے پڑھے جب تک طرز تصنیفی کا دماغ خوگر نہ ہو۔

یہ مضمون تو آیت کے متعلق تھا۔ مقصود یہ ہے کہ احکام خداوندی کو مانو اور ان کا ماننا ان کے جاننے کے اوپر موقوف ہے بدوں جانے قانون کی پابندی کیسے ممکن ہے۔ پس علم دین حاصل کرو۔ میں نے علم دین کی فضیلت بیان نہیں کی کیونکہ

ضرورت کا بیان کافی ہے اور ضرورت آپ کو معلوم ہوگئی کہ بدوں علم دین حاصل کئے اطاعت خدا ناممکن ہے۔

اب ایک فضیلت بھی بیان کرتا ہوں تا کہ زیادہ رغبت ہو فرماتے ہیں العلماء ورثه الانبياء علیهم السلام کے وارث ہیں) امام محمد کو کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا جب میں درگاہ رب العزت میں حاضر ہوا مجھ سے فرمایا گیا کہ کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا رب اغفر لی (اے پروردگار مجھ کو بخش) ارشاد ہوا کہ اے محمد! اگر میں نے تم کو عذاب دینا ہوتا تو تم کو یہ علم عطا نہ کرتا اور اسی سے بعض نے استنباط کیا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے بجز علماء کے کیونکہ ارشاد ہے من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتے ہیں) اب سمجھ میں آیا کتنی بڑی ضرورت ہے اور کیسی فضیلت ہے علم دین کی کہ خدا تعالیٰ بدوں اس کے خوش نہیں ہو سکتے۔ رضاء حق علم دین حاصل کرنے پر موقوف ہے۔ ہاں اگر کوئی خدا ہی کو خوش کرنے کی ضرورت نہ سمجھے تو ایسے لوگ میرے مخاطب نہیں مگر ایسا ہو نہیں سکتا جس انسان کو بیوی بچوں سے صبر نہیں وہ خدا سے صبر کر کے کیوں چین سے بیٹھ سکتا ہے عرفاً وہ شخص بہت باہمت سمجھا جاتا ہے جس کو بیوی بچوں کا صبر آ جائے مگر نہیں اس سے بڑھ کر باہمت گو مذموم سہی وہ ہے جس نے خدا کو چھوڑ دیا اور صبر آ گیا۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند وزن صبر چوں داری زرب المنن

تم کو جب بیوی بچوں سے صبر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ سے تم کو کیوں کر صبر آ گیا

اے کہ صبر نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری از نعم الماہدوں

جنت کی طرف کشش کا سبب

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ کہ جنت خدا سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقوی کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی بعد میں پیدا ہوگی اور وہ اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ ابھی سے اس کا پیدا ہونا عبث ہے اور خدا تعالیٰ فعل عبث سے پاک ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے) رد کر رہی ہے کیونکہ صیغہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں لینا مجاز ہے حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہو اور بلا وجہ معنی مجازی لینا جائز نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کیونکہ میں نے ابھی اس کی حکمت بتلا دی ہے جس کو دوبارہ اعادہ کرتا ہوں۔ وہ حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالیٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنا رہے ہیں کہ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (جنت متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے) اور اگر پیدا نہ ہوتی تو بجائے اس کے یہ فرماتے تعد للمتقين (یعنی جنت متقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعۃ میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شے موجود کی طرف راغب ہے اور اس وقت شی معدوم کی طرف رغبت ہوتی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آ گئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔

معبود ہونے کے لئے خالق ہونا ضروری ہے

حاصل استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اوران کے سوا صانع وخالق کوئی نہیں تو معبود بھی وہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ معبود کے لئے کامل الصفات و جامع الکمالات ہونا ضروری ہے اور خلق بہت بڑی صفت کمال ہے پس جو خالق نہیں وہ معبود بھی نہیں ہوسکتا اور جو خالق ہوگا وہ یقیناً تمام صفات کمال کا جامع ہوگا کیونکہ خلق کے معنی اعطاء وجود کے ہیں اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں۔ پس جوذات معطی وجود ہے یقیناً اس کے قبضہ میں خزائن وجود ہیں اور جس کے قبضہ میں وجود کے خزائن ہوں وہ تمام صفات کمال کا جامع ہوگا۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے اکثر مواقع میں توحید کی دلیل میں صفت خالقیت کو بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ صفت خالقیت تمام کمالات کو مستلزم ہے حق تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں زیادہ دقیق دلائل نہیں فرمائے بلکہ نہایت سہل سہل دلائل بیان فرمائے ہیں جن کو تھوڑی سی عقل والا بھی بہت جلدی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ صرف خالقیت سے توحید کو ثابت فرمایا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تدقیقات سے مخاطب ساکت تو ہو جاتا ہے مگر اس کی تسلی نہیں ہوتی اور سہل عنوانات سے تسلی خوب ہو جاتی ہے جیسا کہ اس آیت میں کتنا سہل عنوان ہے کہ کیا تم نے اس بات کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں تو ذہن توحید کی طرف جلد منتقل ہو جاتا ہے۔

اس میں انفاق غیظ وعفو واحسان کا بیان ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

کچھ سارا کمال اس میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کو۔ لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ تعالیٰ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کریں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی اور بیماری میں اور جنگ میں، تو یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اس میں تمام ابواب تقوی کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے جس میں اول محض صورت بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے (دل علیہ قولہ لیس البر ان تولوا وجوھکم) جیسا کہ منافقین و یہود نے تحویل قبلہ کی گفتگو کا شغل بنالیا تھا۔ اس کے بعد ایمان باللہ و ایمان بالمعاد اور ایمان بالملئکۃ اور ایمان بکتب سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے۔ یہ تو اعتقادیات کے متعلق ہے۔ پھر حب مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے (یا محبت الٰہیہ میں مال خرچ کرنے کی

ترغیب ہے) یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے۔ پھر اقامت صلوۃ کا امر ہے۔ یہ طاعت بدنیہ ہے پھر ایتاء الزکوۃ کا یہ اطاعت مالیہ ہے اور اوپر جو ایتاء مال کا ذکر ہوا ہے وہ انفاق تطوع ہے جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے۔

ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ ۔ زکوۃ کے علاوہ بھی مال میں محتاجوں کا حق ہے (اور علی حبہ اس کا قرینہ بھی ہے کیونکہ اگر اسکا مرجع مال ہے تو حب مال کے ازالہ کے لئے فقط ایتاء زکوۃ کافی نہیں کچھ زائد انفاق کرنا چاہئے اور اگر اللہ تعالیٰ مرجع ہیں تو حب الٰہی کا مقتضا بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے)

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۞

ترجمہ: اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

تفسیری نکات

عفو کی فضیلت

عفو بھی بہت بڑی فضیلت ہے۔ اگر غضب نہ ہوتا اس سے محروم رہتے۔ پس نہ یہ فضیلت ہے کہ بالکل ہی غصہ نہ آوے اور نہ یہ فضیلت ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں میں خفا ہو جائیں تحمل و عفو جانتے ہی نہ ہوں۔ فضیلت تو یہ ہے کہ اذا ما غضبوا ھم یغفرون مگر یہ واضح رہے کہ عفو اور تحمل کے مواقع ہیں ہر محل و موقع میں نہ غضب مناسب ہے اور نہ عفو بلکہ جو محل عفو کا ہے وہاں عفو کرنا چاہیے اور جو موقع غضب کا ہے وہاں غضب نافع ہے۔

غصہ کا آنا غیر اختیاری امر ہے

سخت غلطی ہے اس شخص کی جو غصہ کو بالکل دور کرنا چاہے کہ وہ بالکل ہی ملیا میٹ ہو جائے اگر یہ مطلوب ہوتا تو یوں نہ فرماتے وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ اور یہ ارشاد نہ ہوتا وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ اور لاتغضب صیغہ نہی کا ارشاد نہ ہوتا اس لئے کہ محو ہو جانے کے وقت مادہ ہی غضب کا نہ رہتا تو اس سے نہی ہی کی ضرورت نہ رہتی پس جوش اور غصہ کا آنا منہی عنہ نہیں ہے اس لئے کہ یہ امور غیر اختیاریہ میں سے ہے اور امر و نہی امور اختیاریہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور امور اختیاریہ نہ محمود ہیں نہ مذموم۔ ہاں اس اعتبار سے ان کو محمود کہا جا سکتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی قضا سے پیش آئے ہیں جیسے حافظ شیرازی اسی مضمون کی نسبت کہتے ہیں

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست　　بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

بہر حال یہ درجہ تو منہی عنہ نہیں ہے اب دو درجہ باقی رہ گئے ایک تو جوش کے موافق کارروائی کرنا دوسرے جوش کو دبا کر عقل اور شرح کی اقتضاء کے موافق عمل کرنا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۟ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

ترجمہ: اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی سخت گناہ کرتے ہیں یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں (یعنی صغائر کا ارتکاب کرتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اس کے بعد اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ صاحبو! ایسا بھی کوئی آقا اور مولی دیکھا ہے کہ اس کی نافرمانی کریں اور وہ خود تعلیم کرے کہ ہم سے معافی چاہو اور اسی پر بس نہیں۔ اگر کوئی توبہ کرنے اور بخشش چاہنے سے شرمائے کہ کس منہ سے توبہ کروں میرا کیا منہ رہا ہے جو اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگوں تو اس کو ارشاد ہے وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی شرمانے کا موقع تو جب تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا ہوتا۔ خدا کے سوا کون گناہوں کو بخشنے والا ہے۔

تعلق مع اللہ کبھی نہ چھوڑو

مولانا رومی رحمۃ اللہ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص آلودہ نجاسات چلا جا رہا تھا دریا نے کہا کہ میرے پاس آ میں تجھے پاک کر دوں۔ اس نے کہا میں تو آلودہ ہوں کیسے آؤں پاک ہو کر آؤنگا۔ دریا نے کہا کہ میاں صاحب شرم کو چھوڑو جب پاک ہو گے مجھ ہی سے یا میرے کسی جزو سے ہو گے اور اگر شرم ہی شرم میں رہو گے تو تمام عمر ناپاکی اور آلودگی میں گزر جاوے گی۔ تو صاحبو خدا تعالیٰ کا تعلق ہی ایک ایسی شے ہے کہ جو تم کو پاک صاف کرے گی پھر تعلق و توجہ میں پاکی کا انتظار کیا معنی۔ پس کیسے ہی برے ہو جاؤ مگر اللہ تعالیٰ سے تعلق نہ چھوڑو۔ گناہوں کا ہو جانا عجیب نہیں۔ مگر خدا کے ساتھ تعلق اور اللہ والوں سے تعلق یہ بھی خدا ہی سے تعلق رکھنا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

ترجمہ: اور محمدؐ نرے رسول ہی تو ہیں آپؐ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر آپ کا انتقال ہو جاوے یا آپ ﷺ شہید ہی ہو جاویں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ جلد ہی عوض دے گا حق شناس لوگوں کو۔

تفسیری نکات

ثبوت وصال رسول اکرم ﷺ

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ یہاں حق تعالیٰ نے ان شرطیہ کے ساتھ ان مات او قتل فرمایا ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ ان شرطیہ مقام شک میں لایا جاتا ہے۔ تو کیا صحابہ کو حضور ﷺ کی وفات واقع ہونے میں شک تھا کیا وہ حضور کے متعلق خلود کے معتقد تھے کہ آپ کو موت آئے ہی گی نہیں۔ ایسا گمان صحابہؓ کے متعلق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بات یہ تھی کہ غایت محبت کی وجہ سے حضور کا کسی وقت زندہ نہ ہونا ان کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ اور آپ کو جو ایک خاص امتیاز تمام مخلوق سے کمالات نبوت وغیرہ کی وجہ سے حاصل تھا۔ اس کا اثر عام طبائع پر حالاً یہ تھا کہ موت تو عوام کو آیا کرتی ہے۔ نبی کو کیا موت آتی ہے۔ گو اسکا اعتقاد نہ ہو۔ مگر تاہم حضور ﷺ کی موت ان کو کچھ مستبعد سی معلوم ہوتی تھی اور اجلہ صحابہ کو گو موت نبوی مستبعد نہ معلوم ہوتی ہو مگر ان کا خیال یہ تھا کہ حضور ﷺ اپنا کار منصبی پورا کرنے سے پہلے تشریف نہیں لے جاسکتے تکمیل دین سے پہلے آپ کا وصال نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ وفات میں حضور کی موت سے انکار کیا۔ اور تلوار لے کر کھڑے ہو گئے کہ خبردار میں کسی کے منہ سے یہ لفظ نہ سننے پاؤں کہ حضور کا وصال ہو گیا۔ ابھی حضور کا وصال نہیں ہو سکتا بلکہ آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی ہے۔ آپ اس وقت تک دنیا سے نہیں جا سکتے جب تک اسلام تمام عالم میں نہ پھیل جائے اور دین کی ہر پہلو سے تکمیل نہ ہو جائے اور منافقین کا قلع قمع نہ ہو جائے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ ابھی فروعاً دین کی تکمیل نہیں ہوئی۔ چنانچہ قرآن کی ترتیب بھی نہ ہوئی تھی۔ گو اصولاً تکمیل ہو چکی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ تکمیل فروع بھی حضور ﷺ ہی کے ہاتھوں سے ہوگی اس لئے وہ وصال نبوی کا انکار کر رہے تھے۔ اور کفار و منافقین کو دھمکا رہے تھے کہ **من قال ان محمدا مات ضربت عنقه** ۔ مگر ان کو یہ خبر نہ تھی کہ جس کام کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے میں حضور کی وفات کا انکار کر رہا ہوں حق تعالیٰ کو

وہی کام مجھ سے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لینا ہے۔ بحمد اللہ حضرات صحابہ کے زمانہ میں خصوصاً حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں اسلام کی فروعی تکمیل بھی کمال کے درجہ پر ہوگئی۔ خدا تعالیٰ کو یہ فضیلت شیخین رضی اللہ عنہما کو دینا منظور تھی۔ اس لئے حضور کو قبل تکمیل فروع بلالیا۔ واقعی اگر حضور اس وقت تک زندہ رہتے تو علماء امت سے جو کام حق تعالیٰ نے لیا ہے وہ کام ان سے کیونکر لیا جاتا۔ قتال مرتدین واصلاح اہل عرب کا فخر حضرت صدیق کو کہاں نصیب ہوتا سب کام حضور ہی کے ہاتھ سے ہوتا۔ اسی طرح حضور کے ہوتے ہوئے امام ابوحنیفہ اور شافعی کو اجتہاد کی کیا ضرورت ہوتی۔ بس ہر مسئلہ حضور سے دریافت کر کے معلوم ہو جایا کرتا۔ ان حضرات کو یہ فضائل وکمالات حضور کی وفات ہی کی بدولت حاصل ہوئے اسی کو متنبی کہتا ہے۔

ولا فضل فیھا للمساحۃ والندی و فضل الفتی لو لا لقاء شعوب

خوش اعتقادی

یہ محرک آپ کی خبر موت کے بعد کہاں باقی رہ سکتا تھا اس لئے بعض کے قدم اکھڑ گئے یہ تو واقعہ تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ الآیہ یہاں حق تعالیٰ نے ان شرطیہ کے ساتھ ان مات او قتل فرمایا اور اہل علم جانتے ہیں کہ ان شرطیہ مقام شک میں لایا جاتا ہے تو کیا صحابہ کو حضور ﷺ کی وفات کے واقع ہونے میں شک تھا کیا وہ حضور کے متعلق معتقد خلود تھے کہ آپ کو موت آئے ہی گی نہیں ایسا گمان صحابہؓ کے متعلق ہرگز نہیں کیا جا سکتا بلکہ بات یہ تھی کہ غایت محبت کی وجہ سے حضور کا کسی وقت زندہ نہ ہونا ان کے ذہن میں نہ آتا تھا اور آپ کو جو ایک خاص امتیاز تمام مخلوق سے کمالات نبوت وغیرہ کی وجہ سے حاصل تھا اس کا اثر عام طبائع پر حالانکہ یہ تھا کہ موت تو عوام کو آیا کرتی ہے نبی کو کیا موت آتی گو اس کا اعتقاد نہ ہو مگر تاہم حضور کی موت ان کو کچھ مستبعد سی معلوم ہوتی تھی جیسے ایک بیوہ عورت نے مجھ سے اپنا حال بیان کیا جس کو اپنے خاوند کے انتقال کا بہت زیادہ صدمہ تھا کہ ایسا صدمہ عموماً نہیں ہوا کرتا تو اس نے اس کا سبب یہ بیان کیا کہ میرے میاں مولوی تھے اور میرا خیال یہ تھا کہ مولوی مرا نہیں کرتے تو میں ان سے بیاہ کر کے بڑی خوش تھی کہ بس ساری عمر سہاگن ہی رہوں گی ایسے ہی صحابہ کو حضور کی موت کا تصور ہی نہ آتا تھا اس لئے ان کے ساتھ اسی طرح کلام کیا گیا جس طرح متردد اور صاحب شک کے ساتھ کیا جاتا ہے مگر یہ حالت اکثر صحابہ کی تھی سب کی یہ حالت نہ تھی چنانچہ ایک بڑھیا صحابیہ کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ وہ حضور کے پاس کسی کام کو آئی تھی حضور نے فرمایا پھر کسی وقت آنا اس نے کہا یا رسول اللہ اگر میں آپ کو نہ پاؤں تو پھر کس کے پاس جاؤں اس میں اس نے حضور ﷺ کی وفات سے کنایہ کیا تھا تو آپ نے فرمایا فان لم تجدینی فاتی ابابکر کہ اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آنا۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

ترجمہ: ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں ہول کافروں کے دلوں میں بسبب اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ایسی چیز کو شریک ٹھہرایا جس پر کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے بے انصافوں کی۔

تفسیری نکات

مراتب شرک

بعضے گناہ اور بھی ہیں جو ان تشرکوا باللہ (یعنی اللہ کا شریک کرنا اور ان تقولوا علی اللہ یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنا کے اندر داخل ہیں۔ اگر چہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ مومنین میں نہیں کفار ہی کے اندر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کفار جیسے کفر کے اندر اشد تھے اسی طرح ان کے اندر یہ گناہ بھی اعلیٰ درجہ میں تھے اور مومنین کے اندر بھی ان کی حقیقت پائی جاتی ہے گو اس درجہ کی نہ ہو مثلاً وہ قصداً شرک کرتے تھے اور مسلمان قصداً شرک نہیں کرتے گو لازم آ جاوے مثلاً نذر لغیر اللہ بعضے لوگ بزرگوں کے نام کی فاتحہ دلواتے ہیں اور ان کو حاجت روا سمجھتے ہیں یہ بحث بہت طویل ہے اس کے مراتب مختلف ہیں جس کو کچھ شبہ ہو تحقیق کر سکتے ہیں اسی طرح اور بہت سی رسوم شرکیہ ہیں جو مسلمانوں میں رائج ہیں۔ غرض شرک کے مراتب مختلف ہیں کہ اعلیٰ درجہ ان کا کفار میں پایا جاتا ہے اور یہ ادنی مرتبہ مومنین میں بھی متحقق ہے۔

اتباع ظن

اس مقام پر ایک بات طالب علموں کے کام کی یاد آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو فرمایا ہے وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا یعنی حرام فرمایا ہے اللہ کے ساتھ ایسی شئے کے شریک کرنے کو جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ اگر دلیل اتارتے تو شرک جائز ہوتا۔ حالانکہ شرک قبیح بعینہ ہے اس میں کسی وقت بھی احتمال جواز کا نہیں ہے جو سب بدعات ہیں اسی طرح یہ مشہور ہے کہ شب برات کے حلوے سے اگر پہلا روزہ افطار کیا جائے تو بہت ثواب ہے یہ بالکل غلط ہے۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ حلوے کی تین قسمیں ہیں۔ ایک اب کا ایک جب کا ایک تب کا۔ اب کا تو گڑ کا ہے جو مسجد کے ملانوں اور موذنوں کا اور جب کا شکر سفید کا ہے وہ خالہ اماں کے ہاں اور پھوپھی اماں کے ہاں جاوے گا اور تب کا وہ مصری کا ہے جو کس کے لئے ہے وہ اپنے لئے ہے اس سے پہلا روزہ افطار کیا جاوے گا واقعی انہوں نے بات بڑی سچی کہی اور لقب بھی خوب تراشے ہیں اس لئے کہ اب قریب کے لئے ہے اور جب بعید کے لئے اور تب ابعد کے لئے بولتے ہیں واللہ خوب ہی لطیفہ ہے۔

ایک اور اعتقاد ہے وہ یہ ہے کہ کسی کی افطاری سے روزہ نہ کھولو سارا ثواب اسی کو مل جاوے گا غرض اس قسم کی بہت سی بدعات ہیں جو اَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ میں داخل ہوسکتی ہیں۔ بطور فہرست کے مختصراً پھر عرض کرتا ہوں سو بات یہ ہے کہ مقصود یہ ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ جو کام کرے وہ کام ایسا ہو کہ اس پر دلیل موجود ہو اور شرک ممالا دلیل لہ سے ہے بلکہ اس کے خلاف کے دلائل بکثرت موجود ہیں پس ایسا کام کرنا جس پر دلیل نہ ہو یہ تو برا ہے ہی اور ایسا کام کرنا اور بھی زیادہ برا ہے جس کے خلاف پر دلائل ہوں پس مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا سلطاناً کنایہ ہے اس بات سے کہ اس کے خلاف پر دلائل ہیں۔

یہاں پر ایک شبہ اور ہوتا ہے کہ بہت سے احکام قیاسیه و مجتهد فیها بلکہ کل ایسے ہی ہیں کہ ان کی اللہ تعالیٰ نے دلیل نہیں اتاری پس اس سے منکرین قیاس اچھی خاصی طرح استدلال کرسکتے ہیں جواب یہ ہے کہ سلطانا عام ہے اس لئے کہ نکرہ اور تحت میں نفی کے ہے پس معنی یہ ہیں۔

مالم ینزل به سلطانا ما ای لاخاصاً به ولایرجع الیه والاحکام القاسیة و ان لم ینزل به سلطانا خاصا به ولکن ننزل به سلطانا مما یرجع الیه ای النص المقیس علیه ولهذا قالو القیاس مظهر لا مثبت

اور یہاں سے جواب ہوگیا اس شبہ کا بھی جو لاتقف ما لیس لک به علم سے ابطال قیاس پر استدلال کیا کرتے ہیں کہ جس کا علم یقینی نہ ہو اس کے درپے نہ ہونا چاہیے اور احکام قیاسیہ ظنی ہیں تقریر جواب کی یہ ہے کہ علم نکرہ ہے اور تحت میں نفی کے ہے پس فائدہ عموم کا دے گا۔ مطلب یہ ہے۔ **ولاتقف ما لیس لک به علم** یعنی اس بات کی پیروی نہ کرو جس کا کسی درجہ میں علم نہ ہو نہ یقین کے درجہ میں اور نہ ظن کے۔

اور یہاں سے ایک اور آیت کی بھی تفسیر اور ایک شبہ کا جواب ہوگیا وہ یہ ہے کہ منکرین قیاس آیت اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ سے بھی ابطال قیاس پر استدلال کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیاس بھی ظنی ہے اس کا اتباع کرنا بھی قابل ملامت و شکایت ہوگا تقریر جواب کی یہ ہے کہ جس ظن کے اتباع کی شکایت ہے وہ ظن ہے کہ **بنفسه و باصله** ہر طرح ظن ہو یعنی نہ خود یقین ہو اور نہ وہ یقینی ہو جس کی طرف یہ راجع ہے باقی جو کسی قطعی کی طرف راجع ہو گو راجع ہونا اس کا محض ظنی ہو وہ اس سے خارج ہے اور قیاس میں یہی ہے کہ **مقیس علیه** تو **فی نفسه** قطعی اور یقین ہوتا ہے اگرچہ طریق اس کا ظنی ہو اور اتباع اسی کا مقصود ہے باقی راجع ہونا اس حکم قیاسی کا اس اصل کی طرف یہ ظنی ہے اور اس کے ظنی ہونے سے کچھ اعتراض لازم نہیں آتا۔

اور ایک جواب اور ہے وہ یہ ہے کہ ظن کے معنی وہ نہیں ہیں جو ملاحسن اور قاضی میں لکھے ہیں یعنی الطراف الراجح اس لئے کہ قرآن شریف تو لغت عرب میں نازل ہوا ہے عرب ظن کا اطلاق وہم اور جانب مغلوب سب پر بھی کرتے تھے چنانچہ آیت اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا میں ظن سے وہم مراد ہے اس لئے کہ یقینی بات یہ ہے کہ ان کو قیامت کا ظن بمعنی معروف نہیں تھا پس اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ میں بھی ظن کے معنی یہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وہم پرستی میں مشغول ہیں۔ خیر یہ ایک طالب علمی تحقیق تھی۔

بدعات رمضان

اسی طرح ان تقولوا علی اللہ کے مراتب بھی مختلف ہیں۔ اعلیٰ درجہ تو اس کا کفار میں پایا جاتا ہے اور ادنیٰ درجہ اس کا بدعات ہیں جو مسلمانوں میں رائج ہیں اور اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں اس لئے داخل ہیں کہ ان کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں تو گویا لسان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتلائی ہیں منجملہ ان بدعات کے رمضان کی بدعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچھلے روزہ کو افضل سمجھتے ہیں اور اس کے کچھ احکام بھی تراش رکھے ہیں۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

ترجمہ: تم میں سے بعضے تو وہ شخص تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعضے تم میں سے وہ تھے جو آخرت کے طلب گار تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اپنی نصرت کو بند کر دیا اور پھر تم کو ان کفار سے ہٹا دیا تا کہ خدا تعالیٰ تمہاری آزمائش فرماوے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر بڑے فضل والے ہیں۔

تفسیری نکات

ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ تم میں سے بعضے تو وہ شخص تھے جو دنیا کو چاہتے تھے اور بعض تم میں وہ تھے جو آخرت کے طلب گار تھے یہ قرآن شریف کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن اعطاء اسکندری کا ہے وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب یہ ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا للدنیا اور ایک ارادہ دنیا للآخرۃ۔ پہلا ارادہ مذموم ہے۔ دوسرا مذموم نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے گئے۔ خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی۔ مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بے باک ہوا ہی کرتا ہے اس وجہ سے ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرعہ پڑھا نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد اور واپس چلے آئے۔ اور مسجد میں آکر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ میدان حشر برپا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آکر ان کو پکڑ لیا اور کہا کہ دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں تمہارے ذمے رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند پیچھا چھڑاتے ہیں۔ وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں

تنگ کرر کھا ہے ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا ہے وہ کس واسطے ہے۔ ان کے ذمے جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کر دو۔ ان کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آ رہی ہے۔ اب یہ بہت ہی مجوب ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار کرنے پر پڑھا (نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد) آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ ناتمام ہے۔ اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہیے (اگر دارد برائے دوست دارد) دنیا اگر ہو بھی تو اپنے واسطے نہ ہو دوست کے واسطے ہو۔ ایسی دنیا میں کیا حرج ہے۔ ان حضرات کے پاس جو دنیا ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم سے اس کو اپنے پاس رکھتے ہیں چنانچہ وہ اس میں مالکانہ تصرف نہیں کرتے بلکہ جہاں ان کا حکم ہوتا ہے وہاں صرف کرتے ہیں (الحیوۃ)

فرمایا۔ غزوہ احد میں جو یہ آیت نازل ہوئی مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ

ترجمہ: تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا کو چاہتے تھے اور بعض تم میں وہ تھے جو آخرت کے طلبگار تھے۔

آیت کی تفسیر لطیف

اس کی لطیف تفسیر یہ ہے کہ **منکم من یرید الدنیا للاخرۃ و منکم من یرید الاخرۃ الخالصۃ** .کیونکہ احد میں جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین مرکز کو چھوڑ گئے تھے وہ مراد ہیں یرید الدنیا سے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان سے یہ بعید ہے کہ صرف دنیا کو مقصود ہو۔ نیز قواعد سے ردہ اور مدد کو بھی غنیمت میں شریک کیا جاتا ہے تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اگر نہ جاتے تو بھی غنیمت میں شریک تھے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مرکز کو چھوڑنا اجتہادی غلطی تھی کہ اب یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ غنیمت جمع کرنے والے کی امداد کریں۔ یہ بھی دین تھا مگر بذریعہ دنیا اور جو جماعت حضور ﷺ کے فرمانے سے وہاں رکی رہی وہ دین تھا خالص۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝

ترجمہ: وہ وقت یاد کرو جب کہ تم چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول ﷺ تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہوا کرو نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا بہ سبب اس کے کہ ہمارے رسول ﷺ کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تا کہ حزن ہو نہ کہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لا زائد ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تا کہ تم کو حزن ہو۔

شانِ نزول

یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس ناکہ پر حضور ﷺ نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطا اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے۔

حضرات صحابہؓ کی کمال اطاعت

الحمدللہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لا ماننے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست ہیں وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شرماتے تھے جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی تو ساری عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ و جان فرسا تھا اس بناء پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دے دی تا کہ تم کو غم نہ ہو غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ یعلم میں اشارہ سزا کی طرف بھی ہے چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر فیجازیکم بہ فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہر حال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے عید ہے۔ (غض البصر)

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَاۤ اَصَابَكُمْؕ۔

تصفیہ باطن

اس میں مشہور تفسیر یہی ہے کہ لا زائدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا۔ کہ تم کو غم پر غم اس لئے دیا تا کہ تم کو رنج ہو اور رنج کیوں دیا؟ اس کی وجہ تھوڑی دیر آگے مذکور ہے وَ لِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ۔ جس کا حاصل وہی تصفیہ و تجلیہ باطن ہے اور تصفیہ و تجلیہ باطن سے مقصود رفع درجات ہے اور یہی اصل مقصود ہے۔ سزا بعض دفعہ رنج کم کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔

آداب اعصاب برائے دفع رنج

لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ سزا بعض دفعہ رنج کم کرنے کے لئے آداب اعصاب دی جاتی ہے تا کہ تم کو

(انتقام لینے کے بعد) اس بات پر (زیادہ) رنج نہ ہو۔ جو تم سے فوت ہوگئی تھی۔ یہ وہی بات ہے کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے اور انتقام لینے سے ندامت کم ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لئے دے دی تا کہ بدوں سزا کے معافی دینے سے تم پر ندامت و رنج کا زیادہ غلبہ نہ ہو۔ بعض مفسرین نے اس جگہ لکیلا تحزنوا میں لائے نافیہ کو زائد مانا ہے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ موقع عتاب کا ہے اور سزا تو رنج دینے ہی کے لئے دی جاتی ہے۔ پھر اس کا کیا مطلب کہ تم کو اس لئے غم دیا تا کہ تم مافات پر رنج نہ کرو ان کے نزدیک لا کو اپنے معنی پر رکھ کر مطلب نہ بن سکا اس لئے انہوں نے لا کو زائد کہہ کر یہ مطلب بیان کیا کہ تم کو غم دیا تا کہ تم کو مافات پر رنج ہو مگر جس نے اس حالت کو سمجھا ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے وہ سمجھے گا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم خدا اور رسول کے عاشق تھے۔ اگر ان کی خطا بدوں کسی انتقام کے معافی کر دی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اٹھا سکتے۔ اس لئے ان کو تھوڑی سی مصیبت دے دی گئی تا کہ زیادہ رنج غالب نہ ہو۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ سزا ہمیشہ رنج دینے ہی کے لئے ہوا کرتی ہے بلکہ بعض دفعہ رنج کم کرنے کے لئے بھی سزا دی جایا کرتی ہے۔ اس حالت پر نظر کر کے تفسیر نہایت صاف ہے اور لا کو زائد کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ (ذم النسیان)

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿ (آل عمران)

ترجمہ: اور جو کچھ ہوا اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے اور تا کہ تمہارے دلوں کی بات کو صاف کر دے اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔

شانِ نزول

اس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جب غزوہ احد میں مسلمانوں کی صف بندی کی تو ایک گھاٹی کا جو مسلمانوں کی پشت پر تھی اور وہاں سے دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا یہ انتظام فرمایا کہ ایک دستہ مختصر جماعت کا اس کی حفاظت کے لئے مقرر فرما دیا کہ تم یہاں سے بدوں میری اجازت کے نہ ہٹنا۔ گو ہمارے اور کچھ ہی گزر جائے انبیاء علیہم السلام ہر قوت میں کامل ہوتے ہیں۔ انتظام میں بھی کامل ہوتے ہیں۔ انبیاء بھولے ہیں ہوتے۔ ان میں ضروری انتظام سب کامل ہوتا ہے۔

تمحیص و ابتلا کا فرق

اس کے بعد وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ فرمانے میں نکتہ یہ ہے کہ تمحیص و ابتلاء میں فرق ہے جس کو ایک مثال سے سمجھو کہ سونے چاندی کو پرکھنے کا قاعدہ یہ ہے کہ اول کسوٹی پر پرکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سونا چاندی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد اس کو آگ پر رکھتے ہیں تا کہ میل کچیل کو الگ کر دیا جائے پس وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ کا حاصل تو یہ تھا کہ نفس ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے یا نہیں اور تمحیص کا حاصل یہ ہے کہ مصیبت کے ذریعہ سے ایمان کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔

رہا یہ کہ ایمان کے میل کچیل سے کیا مراد ہے تو سنئے بعض لوگوں کا ایمان وساوس و معاصی سے مشوب ہوتا ہے۔ مصیبت کے ذریعہ سے وساوس و معاصی کا میل دھو دیا جاتا ہے کیونکہ مصیبت کی خاصیت یہ ہے کہ دل کو اللہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور وہ غفلت جو وساوس و معاصی سے قلب میں پیدا ہوگئی تھی مصیبت کے وقت دور ہو جاتی ہے۔ یہی تمحیص ہے اور یہ تفسیر اہل سنت کے مذہب پر سب سے زیادہ منطبق ہے کیونکہ وہ ایمان خالص و ایمان غیر خالص کے قائل ہیں بخلاف معتزلہ و خوارج کے کہ وہ معاصی کو مزیل ایمان یا موجب کفر کہتے ہیں۔ پس ان کے نزدیک یا ایمان اور عدم ایمان ہے خواہ ایمان و کفر۔ وہ ایمان ناقص و کامل کا فرق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک معاصی سے ایمان زائل ہو جاتا ہے یا کفر بھی لازم آ جاتا ہے۔

غرض! مصائب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے اور ایمان کے اندر معاصی و وساوس سے جو میل کچیل آ جاتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے اور اس تمحیص سے بندہ پر عبدیت غالب ہو جاتی ہے اور دعویٰ اور غرور اور تکبر کا میل و کچیل کم ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقت منکشف ہو کر سمجھ میں آ جاتا ہے کہ آدمی کبھی دعویٰ نہ کرے۔

اصلاح قلب

خلاصہ یہ کہ مصائب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے استحضار عظمت ہوتا ہے اور عبدیت حاصل ہوتی ہے اس کی طرف لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ رہا یہ کہ اس آیت میں ایک جگہ صدورکم اور ایک جگہ قلوبکم کیوں فرمایا اس میں اسلم یہ ہے کہ تفنن پر محمول کیا جائے جیسا کشاف نے کہا ہے اور اگر نکتہ ہی کی ضرورت ہو تو احسن یہ ہے کہ کہا جاوے کہ دو لفظ اس لئے اختیار کئے گئے تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے۔ ای فعل ما فعل من واقعات جمة لمصالح کثیرة منها ان یبتلی اللہ ما فی صدورکم یعنی جو کچھ یہ واقعات ہوئے ہیں ان میں بہت سی حکمتیں ہیں منجملہ ان کے ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے تمہارے دل کی بات کا امتحان مقصود تھا۔ دل کی بات سے مراد ایمان ہے کہ ان واقعات میں تمہارے ایمان کی آزمائش تھی کہ دیکھیں مصیبت کے وقت بھی ہم سے تعلق رکھتے ہو یا نہیں کیونکہ احسان کے وقت تو ہر شخص آقا سے راضی رہتا ہے۔ ہاں! جب وہ تنخواہ بند کر دے اس وقت بھی علاقہ رہے تو کہا جائے گا کہ واقعی اس کو تعلق ہے۔

کہ صدر باعتبار اپنی حقیقت کے ظاہر ہے کہ قلب بہ اعتبار اپنی حقیقت کے باطن ہے تو اس میں اشارہ اس پر ہے کہ کبھی ظاہر کی اصلاح سے باطن کی اصلاح ہوتی ہے اور کبھی باطن کی اصلاح سے ظاہر کی اصلاح ہوتی ہے یعنی کبھی ابتلاء سے اولا صدر کی اصلاح کی جاتی ہے جو کہ جوارح ہے اور اس کا اثر باطن تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی تمحیص سے قلب کی اصلاح کی جاتی ہے جو کہ باطن ہے اور اس کا اثر ظاہر تک پہنچ جاتا ہے۔ پس دو لفظ اختیار کرنے میں اشارۃً اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ کسی جانب میں ظاہر کی اصلاح سے باطن کی سہل ہو جاتی ہے اور کسی حالت میں برعکس غرض جس طرح بھی ہو اصلاح کرنا چاہیے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝ ۔ اللہ سب باطن کی چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔ میرے ذوق میں اس جملہ سے ایک شبہ کا جواب دیا گیا ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں کو لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ سے یہ وسوسہ

ہوسکتا ہے کہ دوا سے تو علاج اسی مرض کا ہوتا ہے جس کا ہم کو علم ہو اور ہم اس کے علاج کا قصد کریں۔ اور اگر ہم نے ایک مرض کا علاج کیا جس کا ہم کو علم تھا تو اس سے دوسرے مرض کا تو ازالہ نہ ہوگا جس کا علم نہیں۔ جیسے بعض لوگوں کو استغفار میں بھی یہی خیال ہے کہ توبہ و استغفار سے وہی گناہ معاف ہوتا ہے جس کا نام لیا جائے۔ یا دل میں خیال کیا جائے اور جس گناہ کا اس وقت خیال بھی نہ ہو وہ معاف نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ ان لوگوں کو یہ وسوسہ ہوا کہ مصائب سے تمحیص کامل نہ ہوگی کیونکہ ہم کو اپنے بہت سے امراض کا علم نہیں ہوتا اور بہت سے گناہ ہم کرکے بھول جاتے ہیں تو یہ گناہ کیونکر معاف ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ میں اس شبہ کا جواب دیا ہے۔ تمہارا یہ گمان صحیح نہیں کہ علاج سے اسی مرض کا ازالہ ہوتا ہے جس کا مریض کو علم ہو بلکہ طبیب کا علم کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلوب کی پوری حالت معلوم ہے۔ تو وہ ان مصائب سے سب امراض کا علاج کردیں گے اور سارے گناہ دھودیں گے اور استغفار میں بھی یہی بات ہے کہ اجمالی استغفار سب گناہوں کی مغفرت کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح حدیث میں ہے واستغفرک مما تعلم ولا اعلم یہ دوسری رحمت ہے جو مصائب سے حاصل ہوتی ہے۔ پس ان منافع و مصالح کو پیش نظر رکھ کر مصیبت کی پریشانی کو ہلکا کرنا چاہیے اور مایوس نہ ہونا چاہیے اور آئندہ کے لئے بھی اعمال صالح کی پابندی کا عہد کرنا چاہیے کہ ہمیشہ عبدیت کا یہی برتاؤ رکھوں گا جو مصیبت میں تھا اور ان مضامین کو یاد کر کے غم و حزن کو کم کرنا چاہیے۔

وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

آیت غزوہ احد کے متعلق ہے جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جب غزوہ احد میں مسلمانوں کی صف بندی کی تو ایک گھاٹی کا جو مسلمانوں کی پشت پر تھی اور وہاں سے دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا یہ انتظام فرمایا کہ ایک دستہ مختصر جماعت کا اس کی حفاظت کے لئے مقرر فرمادیا کہ تم یہاں سے بدوں میری اجازت کے نہ ہٹنا۔ گو ہمارے اوپر کچھ ہی گزر جائے انبیاء علیہم السلام ہر قوت میں کامل ہوتے ہیں۔ انتظام میں بھی کامل ہوتے ہیں۔

غرض! حضور نے نقشہ جنگ کا اس طرح انتظام فرمایا کہ اس گھاٹی پر ایک دستہ فوج مقرر فرمادیا کہ اس طرف سے کفار نہ آسکیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کفار پر حملہ کا حکم دیا تو تھوڑی ہی دیر میں کفار کو شکست ہوئی (اور ان کا جھنڈا زمین پر گر پڑا۔ سات دفعہ اس کو اٹھایا گیا مگر ہر دفعہ سرنگوں ہوا اور کفار بری طرح بھاگے) اب اس دستہ فوج میں جو گھاٹی پر متعین تھا' اختلاف ہوا۔ اکثر کی یہ رائے ہوئی کہ اب ہم کو یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے بھائیوں کا پورا غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور وہ کفار کے تعاقب میں جارہے ہیں۔ ہم کو بھی اس جہاد و غنیمت میں حصہ لینا چاہیے۔ ان کے افسر نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور نے ہم کو یہاں سے بدوں اجازت کے ہٹنے سے منع فرمادیا ہے تم کو یہاں سے نہ ہلنا چاہیے مگر بجز دس پانچ آدمیوں کے کسی نے افسر کی رائے نہ مانی اور زیادہ تعداد وہاں سے ہٹ کر قتال و غنیمت میں مشغول ہوگئی۔

یہاں سے آپ کو کثرت رائے کی حقیقت واضح ہوگی کہ کثرت رائے کا ہمیشہ حق پر ہونا ضروری نہیں

حضرت خالد کی قابلیت

یہاں اتنی بات سمجھ لینا چاہیے کہ ان صحابہ کا یہ خیال تو نہ تھا کہ اگر ہم غنیمت جمع نہ کریں گے تو غنیمت سے ہم کو حصہ نہ ملے گا کیونکہ شرکت غنیمت کے لئے شرکت جنگ لازم نہیں۔ غنیمت میں محافظان فوج بھی شریک کئے جاتے ہیں حالانکہ وہ جنگ میں شریک نہیں ہوتے بلکہ ان حضرات کو یہ خیال ہوا کہ بدوں شرکت جنگ کے شاید ہم کو جہاد کا ثواب نہ ملے یا کم ملے۔ اس خیال سے وہ گھاٹی چھوڑ کر تعاقب میں اور مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اس وقت تک حضرت خالد بن ولیدؓ مسلمان نہ ہوئے تھے بلکہ کفار کے ساتھ تھے اور جنگ آزمودہ ہمیشہ سے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کے جاسوس بہت چھٹے ہوئے تھے (اور یہ ان کی جنگی قابلیت کی دلیل ہے کہ عین معرکہ کے وقت بھی جاسوس محکمہ کو اپنے فرائض انجام دینے پر مامور کر رکھا تھا) عین اس وقت جب کہ کفار بھاگے جا رہے تھے اور مسلمان ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ حضرت خالد کو جاسوس نے اطلاع دی کہ مسلمانو کے عقب کی گھاٹ خالی ہو چکی ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت خالد نے اپنے کافی تعداد سواروں کو ساتھ لے کر گھاٹی کا رخ کیا اور دس پانچ صحابی جو وہاں جمع ہوئے تھے ان کو تہ تیغ کر کے مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا یہ حالت دیکھ کر کفار کا باقی ماندہ لشکر بھی بھاگتے بھاگتے رک گیا اور اس نے مڑ کر مسلمانوں پر حملہ کیا۔

اجتہادی غلطی

اب مسلمان دو طرف سے گھر گئے اور سخت مصیبت کا سامنا ہوا اس حالت میں شیطان لعین نے پکار دیا الاان محمدا قد قتل کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے اس آواز کا صحابہ کے کانوں میں پڑنا تھا کہ ان کے قدم اکھڑ گئے کیونکہ قدم کا جمنا تو دل کے تابع ہے جب دل ہاتھ سے نکل گیا تو قدم کیونکر جمیں۔

پس صحابہ کے قدم اکھڑنے پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر ان کے قدم نہ اکھڑتے تو بعض کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان کے دل میں محبت نہ تھی رہا یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں عتاب فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھاگنے اور قدم اکھڑنے پر عتاب نہیں فرمایا بلکہ معصیت رسول پر عتاب فرمایا ہے جو کہ فعل اختیاری تھا اور قدم کا اکھڑ جانا مغلوب الحال لوگوں کے لئے غیر اختیاری تھا اور گو اس معصیت میں بھی اجتہادی غلطی تھی (کہ گھاٹی والے صحابہ نے ثواب کا مدار مباشرت عمل کو سمجھا حالانکہ اس کا مدار محض اطاعت پر ہے خواہ بصورت عمل ہو یا بصورت ترک عمل) مگر اجتہادی غلطی پر بھی عتاب لطیف ہو سکتا ہے ہاں عقاب نہیں ہوتا۔

اجتہادی غلطی پر عتاب کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ تم نے پوری طرح سمجھ سے کام نہیں لیا۔ بہر حال واقعہ احد کی مصیبت میں حق تعالیٰ نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ اس سے تمہارے ایمان کی آزمائش مطلوب تھی کہ کون مخلص ہے کون منافق ہے۔ کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقین میں باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ ان کو معرکہ میں آنے سے رنج تھا۔

کبھی کہتے۔ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ کہ ہمارا کچھ اختیار بھی ہے اور کبھی کہتے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ

شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا اگر ہمارا بس چلتا تو ہم یہاں اس طرح نہ قتل کئے جاتے اور صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ عین اس پریشانی میں بھی ان کو نیند آرہی تھی۔ چنانچہ ایک صحابی کے ہاتھ سے کئی بار تلوار گر پڑی۔ ایسے سو رہے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے چاروں طرف سے اسباب تخفیف جمع فرمادیئے کہ معرکہ میں مسلمانوں کو سلا بھی دیا بعد میں عتاب کر کے رلا بھی دیا پھر ہنسا بھی دیا۔

اور غور کیا جائے تو عتاب میں بھی عنایت تھی کیونکہ خطا پر اگر عاشق کو کچھ کہہ لیا جائے تو اس کے دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ بس محبوب نے دل کی بات ظاہر کر کے بدلہ لے لیا ہے۔ اب اس کے دل میں کچھ نہیں رہا اور اگر اس کو کچھ نہ کہا جائے تو سخت بے چین رہتا ہے اور بار بار یہ کہتا ہے کہ بدوں سزا کے چین نہ آئے گا۔ بدوں اس کے میری تسلی نہ ہوگی جیسے بعض صحابہ سے زنا کا صدور ہو گیا تھا۔ ان کو بدوں اجرائے حد کے چین نہ آیا۔ پس یہ عتاب بھی درحقیقت اسباب تخفیف ہی سے تھا)

اب آپ کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ ان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا کا مطلب کہ واقعی حق تعالیٰ مصیبت کے ساتھ ہی ایک راحت بھی دیتے ہیں اور اگر عسر کو واحد اور یسر کو متعدد مانو۔ جیسا مشہور قاعدہ ہے تو ایک عسر کے ساتھ دو یسر ہوئے۔

تلافی مصائب کی صورت

صاحبو! جو لوگ اہل ایمان ہیں ان کے لئے اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ عسر واحد پر یسرین کا ترتب ہوتا ہے۔ یہ آیت صحابہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سب کے لئے عام ہے۔ پس مصیبت سے پریشان نہ ہوں بلکہ اس کو ہلکا کرنے کی کوشش کرو چنانچہ ایک تدبیر تو یہ ہے کہ اس وقت اپنے اعمال کو یاد کرے کیونکہ اکثر مصائب بوجہ اعمال سیہ کے آتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ تم کو اے گنہگار و جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے۔

کہ جو مصیبت تم پر آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اس پر انبیاء کے مصائب سے شبہ نہ کیا جائے کیونکہ وہاں صرف صورتاً مصیبت ہوتی ہے حقیقتاً مصیبت نہیں ہوتی۔ کیونکہ گو انبیاء علیہم السلام کو مصیبت کے وقت بوجہ ادراک لطیف اور صفائی قلب کے رنج تو ہوتا ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ وہ معصوم ہیں ان تکالیف کا ورود معاصی کے سبب نہیں ہوتا پھر وہ پریشان کیوں ہوں پریشانی تو گناہ کا نتیجہ ہے۔

پس ہم کو مصیبت کے وقت اول تو اپنے گناہوں کو یاد کرنا چاہیے تاکہ اپنی خطا کا استحضار ہو کر مصیبت سے پریشان زیادہ نہ ہو کیونکہ اپنی خطا پر جو سزا ہوتی ہے اس سے دوسرے کی شکایت نہیں ہوتی بلکہ انسان خود نادم ہوتا ہے کہ میں اسی قابل تھا۔

پھر اجر کو یاد کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کا بہت ثواب رکھا ہے حدیث میں آتا ہے کہ مسلمان کو جو ایک کانٹا لگتا ہے وہ بھی اس کے لئے ایک حسنہ ہے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ کے گھر میں چراغ گل ہو گیا۔ آپ نے اناللہ پڑھا۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا یہ بھی مصیبت ہے فرمایا ہاں! جس چیز سے مسلمان کو تکلیف ہو وہ مصیبت ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ ہے جب ادنی ادنی

تکلیف پر ثواب کا وعدہ ہے تو زیادہ کلفت پر ثواب کیوں نہ ہوگا۔ پس ثواب کو یاد کر کے غم کو ہلکا کرنا چاہیے۔

پھر اس بات کو سوچے جو اس آیت میں بتلائی گئی ہے وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت دے کر ہمارے ایمان کو آزمایا ہے کہ اس کو مصیبت میں بھی ہم سے تعلق ہے یا نہیں۔ پس مصیبت میں ثابت قدم رہنا چاہیے خدا کی شکایت نہ کرے۔ کوئی بات ایمان کے خلاف زبان ودل پر نہ لائے۔

غزوہ احد

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

ترجمہ: پھر تم پر اتارا تنگی کے بعد امن کو۔ وہ اونگھ تھی کہ گھیر رہی تھی تم میں سے بعضوں کو اور بعضوں کو فکر پڑی تھی اپنی جان کی۔ خیال کرتے تھے اللہ پر جھوٹے خیال جاہلوں کے سے۔ کہتے تھے کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں تو کہہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے اپنے جی سے چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھوں میں تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ آپ کہہ دیجئے اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھا تھا مارا ہی جانا اپنے پڑاؤ پر۔ اور اللہ کو آزمانا تھا جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور نکھارنا تھا جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور اللہ کو معلوم ہے دل کی بات۔

سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے

یہ حاصل ہے مدلول آیات کا غزوہ احد میں اول غلبہ مسلمانوں کو تھا اور آثار فتح کے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں سے بے حکمی ہوئی اور شکست ہوئی۔ اس میں بہت سے شہید ہو گئے اور جو میدان میں باقی رہے ان پر اونگھ آئی اور اس کے بعد سب رعب ودہشت جاتی رہی۔ سب نے حضور ﷺ کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی۔ جو لوگ اس میں ضعیف الایمان تھے انہوں نے کہا ھل لنا من الامر من شیء۔ ظاہر معنی تو اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار ہے اور یہ معنی نہایت اچھے ہیں مگر ان کی نیت میں یہ نہ تھا۔ بلکہ نیت میں تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے مشورہ پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے اگر ہمارے مشورہ پر عمل کرتے تو کیوں مارے جاتے۔ حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ فرماتے ہیں يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ کہ دل کی بات آپ سے ظاہر نہیں کرتے ان کے دلوں میں تو یہ ہے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ آگے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو بھی موقع پر آ کر مارے جاتے بچ نہیں سکتے یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اس آیت میں جو یہ کلمہ ہے هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ۔ یہ کلمہ تو حق ہے (جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ نے جو چاہا سو کیا) مگر انہوں نے اس سے باطل مراد لیا کیونکہ ان کی نیت میں دوسری بات تھی کیونکہ ان کی مراد یہ تھی کہ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (پس یہ قول) هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ (کیا کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں منافقین کا ہے اور وہ علی الاطلاق کفر کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ ذو وجهین بات کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات انہوں نے ذو وجهین کہی۔

اس کا ایک عمل تو حق ہے۔ وہ عمل حق یہ ہے کہ وہ اعتقاد قدر ظاہر کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں۔ سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو اس نے چاہا وہ کیا۔ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں مگر ان کے دل میں تھا کہ اگر ہمیں اختیار ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ پس وہ ظاہر تو کچھ کر رہے تھے اور دل میں ان کے کچھ اور تھا۔ سامنے تو اعتقاد حق ظاہر کیا جو اسلام کے موافق ہے اور دل میں یہ کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا یعنی اگر ہمیں اختیار ہوتا تو مارے نہ جاتے۔ یہ اعتقاد اسباب کے مؤثر ہونے کا ہے۔ اور یہی ان کا عقیدہ تھا کہ اسباب مؤثر بالذات ہیں۔ پس اسی پر یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَکَ اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے۔ مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تو کچھ ہے اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں۔ آگے اس کو بیان فرماتے ہیں یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا کہتے ہیں کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں۔ کہ ان کے دلوں میں یہ ہے کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم مارے نہ جاتے آگے اس کا رد ہے۔ قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ الخ کہہ دیجئے اگر تم گھروں میں بھی ہوتے الخ

مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارا خیال باطل ہے۔ تم کہیں بھی ہوتے جن کے لئے قتل لکھا گیا تھا وہ یہیں آ کر قتل ہوتے، جا نہیں سکتے تھے غرض اس آیت سے ان کی تائید ہوگئی کہ سچی بات سے جھوٹی بات مراد لینا کس قدر برا ہے یہی حال ہے اس شخص کا جو المرء مع من احب سے غرض باطل یعنی عدم ضرورت عمل پر تمسک کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝

ترجمہ: یقیناً تم میں جن لوگوں نے پشت پھیر دی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دی ان کے بعض اعمال کے سبب سے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔ واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑے حلم والے ہیں۔

سابقہ گناہوں کے غم میں مبتلا رہنا مضر ہے

حاصل بیان کا یہ ہے کہ گناہوں کے غم میں مبتلا ہو جانا بعض اوقات بجائے نفع ہونے کے ضار ہو جاتا ہے اس میں مبالغہ نہ کرے ہاں ضروری توبہ کر کے کام میں لگ جاوے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم چونکہ بعد توبہ کے بھی اس غم میں

مبتلا تھے اور یہ کسی وقت میں مضر ہوتا حق تعالیٰ نے ان آیات میں اور ان کے سیاق وسباق میں اس غم کو خفیف فرمایا ہے چنانچہ ایک تسلی او پر فرمائی فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا الایۃ اور اس تقریر پر لا کو زائد لکھنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ مطلب صاف ہے کہ ہم نے تم کو غم اس لئے دیا تھا کہ اس کو پاداش سمجھ کر تمہارا حزن ہلکا ہو جاوے کیونکہ مطیع کے لئے یہ بھی ایک موت ہے کہ اس کی خطا پر سزا نہ ہو وہ اس سے کچھ ہلکا ہو جاتا ہے کچھ سزا بھی دے دی جاوے دوسری تسلی اس آیت میں فرمائی لَقَدْ عَفَا اللّٰہُ عَنْھُمْ تیسری تسلی بعد میں فرمائی فباذن اللہ الایۃ اور اگر غور کیا جاوے ان آیات میں اور بھی وجوہ تسلی کے متعدد ہیں مثلاً ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً اور مثلاً اسْتَزَلَّھُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا اور مثلاً قد اصبتم مثلیھا اور مثلاً ولیعلم المومنین الایۃ بس مقصود اس بیان سے یہ تھا اور انما استزلھم الخ سے ایک یہ فائدہ بھی ماخوذ ہوا کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب ہو جاتا ہے اس لئے جو گناہ چھوٹ جائے چھوڑ دو اس کے کچھ گناہوں کا سلسلہ تو کم ہوگا۔ اس کا انتظار نہ کرو کہ سب ہی چھوٹیں تو چھوڑوں سبحان اللہ قرآن مجید کی کیا تربیت ہے اب وعدہ فرمایئے حق تعالیٰ فہم وتوفیق دے آمین (الجناح)

تفسیر عجیب آیت اذ تصعدون

اسی بنا پر ایک آیت کی تفسیر یاد آ گئی وہ یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس نا کہ پر حضور نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطا اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا بہ سبب اس کے کہ ہمارے رسول ﷺ کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تا کہ حزن ہو نہ کہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لا زائد ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تا کہ تم کو حزن ہو لیکن الحمد للہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لا ماننے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست ہیں وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شرماتے تھے جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی تو ساری عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ وجان فرسا تھا اس بناء پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دیدی تا کہ تم کو غم نہ ہو غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ یعلم میں اشارہ کی سزا کی طرف بھی ہے چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر فیجازیکم یہ فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہرحال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے وعید ہے اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مرض نہایت اہتمام کے قابل ہے۔

بدنگاہی سے بچنے کے اہتمام کی ضرورت

اب ہم کو اپنی حالت دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو ورنہ ابتلائے عام ہے اور اس کو نہایت درجہ خفیف سمجھتے ہیں جو جوان ہیں ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہویہ ضعیف ہو گئی ان کو احساس بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت ہی نہیں اس لئے کچھ حرج نہیں ہے سو ان کو مرض کا بھی پتہ نہیں لگتا اور بعضوں کو اور دھوکہ ہوتا ہے وہ یہ کہ شیطان بہکاتا ہے کہ جیسے کسی پھول اچھے کپڑے اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے سو یہ بالکل دھوکہ ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

ترجمہ: بعد اس کے کہ خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تندخو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ ﷺ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر لو اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔

تفسیری نکات

احباب سے مشورہ

بس فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ اس کی تمہید ہے اور فاعف عنهم مقصود ہے اور سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اسی پر اقتصار نہیں فرمایا۔ آگے اس کے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ بڑھایا یعنی آپ بھی معاف فرما دیجئے کہ ہم سے بھی درخواست کیجئے کہ ہم معاف کر دیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی معاف فرما دیا تھا تو وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اب تحصیل حاصل ہے بات یہ ہے کہ وہ معافی تو قانونی ہے اس کا اثر تو یہ ہے کہ عذاب سے نجات ہو جاوے گی اب دوسری قسم جو معافی کی ہے یعنی دفع کدورت جس کا سبب فاعف عنهم ہوگا لیکن سبب کا وجود تو وجود مسبب کے لئے علت تامہ نہیں یعنی آپ کے معاف کر دینے سے بدوں حق تعالیٰ کے تصرف کے رفع کدورت تو ضروری نہیں کیونکہ وہ آپ کے اختیار میں تو نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا امر فرمایا یعنی مغفرت کی قسم دوم کے وجود کی ہم سے درخواست کیجئے اور یہاں تک قسمیں متحقق ہو گئیں لیکن اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ حالت اصلی انشراح کی لوٹ آئی مگر یہاں اور چیز کی بھی

ضرورت ہے وہ کیا یعنی اس انشراح کی ترقی کیوں کہ اعمال میں آئندہ کو ترقی موقوف ہے زیادہ انشراح پر پس رحمت پر رحمت اور نعمت پر نعمت حق تعالیٰ کی دیکھئے کہ آگے اس کی تدبیر بھی ارشاد فرماتے ہیں تا کہ ہماری یہ مقبول جماعت کسی پہلو سے ناقص نہ رہے چنانچہ فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی ان سے کام میں مشورہ بھی کیجئے اس سے ان کا انشراح ترقی پذیر ہو کر وسیلہ ترقی مراتب کا ہوگا اس لئے کہ مشورہ کے اندر جو مصلحتیں خاص نفس مشورہ کے اعتبار سے ہیں ان کے علاوہ ایک اور عجیب خاصہ ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دیکھئے مشورہ کس سے لیا کرتے ہیں مشورہ اس شخص سے لیا کرتے ہیں کہ جس میں وہ وصف پائے جاویں اول تو اس پر پورا وثوق اور نہایت اطمینان اور اعتماد ہو اور اس کو اپنا خیر خواہ اور اس سے خصوصیت سمجھی جاوے دوسرے جس امر میں مشورہ کیا جاوے اس کے اندر وہ صاحب بصیرت ہو اسی واسطے بعض مرتبہ بھائی سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ دوست سے کرتے ہیں۔

اصلاح میں نرمی اور سختی دونوں درکار ہیں

واقعہ تبوک میں اصلاح کے لئے سختی کی گئی اور واقعہ احد میں اصلاح کے بعد فاعف عنهم (پس آپ ان کو معاف کر دیجئے) فرمایا بعض مبطلین کو وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (اگر آپ تندخو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے) سے غلطی ہوگئی کہ انہوں نے مطلقاً نرمی کو مطلوب سمجھا حالانکہ نرمی مطلقاً محبوب نہیں ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ فرمانے میں حکمت

اللہ تعالیٰ نے جب عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ فرمادیا تو حضور ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی خطا کو کیوں معاف نہ فرماتے بس فقط تطییب قلب صحابہ کیلئے اس کی اطلاع کی ضرورت تھی کہ حضور ﷺ نے بھی معاف کر دیا کیونکہ صحابہ کے اس طبعی رنج کے ازالہ کا طریقہ یہی تھا کہ حضور ﷺ بھی زبان مبارک سے معاف فرمادیں کہ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ (میں نے تم کو معاف فرمادیا کیونکہ عاشق کی اس کے بغیر تسلی نہیں ہوتی)

جلالت شان رسول اکرم ﷺ

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے) میں اول حضور اکرم ﷺ کی جلالت شان کا اظہار ہے کہ مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ تمہاری معافی کی تکمیل حضور اکرم ﷺ کے استغفار کے بعد ہوگی دوسرے اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا تطییب قلب ہے کیونکہ وہ اکثر خطاؤں کیلئے حضور ﷺ سے استغفار کی درخواست کیا کرتے تھے اور اس واقعہ میں خطا ایسی ہوئی تھی جس سے حضور ﷺ ہی کو ملال پہنچا اس لئے اس واقعہ میں وہ خود استغفار کی استدعا کرتے ہوئے شرماتے مگر طبعاً ان کو یہ ضرور خیال ہوتا کہ اگر حضور ﷺ نے ہمارے لئے استغفار نہ کیا تو اس درجہ کی معافی نہ ہوگی جو حضور کے استغفار کے بعد ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ کریم کے بیٹے کی سفارش پر کچھ زائد ہی مل جاتا ہے اور حق تعالیٰ تو اولاد

سے پاک ہیں مگر حضور ﷺ سے حق تعالیٰ کو ایسی محبت ہے کہ کسی باپ کو اولاد سے بھی نہیں ہو سکتی اس لئے حضور ﷺ کی سفارش کے بعد مغفرت کاملہ کی یقینی امید ہے۔

عظمت صحابہ

واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں اس کے حروف سے بھی زیادہ علوم ہیں اور یہ بات بالکل بلا مبالغہ ہے مگر ان علوم کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے توفیق خداوندی کی۔ جس کا ایک شعبہ علم عربیت بھی ہے تو یہ علوم محض توفیق سے عطا ہوتے ہیں۔ تیسرا نکتہ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے) میں یہ ہے کہ حضور ﷺ کی معافی سے صحابہ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ نے خطا معاف کر دی مگر اس سے وہ اجنبیت کیسے دور ہو گئی جو خطا سے پیدا ہو گئی تھی اس کے لئے تو خصوصیت کی ضرورت ہے ورنہ معافی کی تو ایک یہ بھی صورت ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر کہہ دے کہ ہم نے سب خطائیں معاف کیں کیا اس معافی سے تعلقات شگفتہ ہو گئے ہرگز نہیں تو حق تعالیٰ نے فَاعْفُ عَنْهُمْ (آپ ان کو معاف کر دیجئے) کے بعد وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آپ ان کے لئے استغفار کیجئے) بڑھا کر یہ بتلایا ہے کہ صرف عفو خطا کافی نہیں بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ آپ صحابہ سے خصوصیت کا برتاؤ کریں کہ پہلے کی طرح اس واقعہ میں بھی ہم سے ان کی مغفرت کی درخواست کریں۔ و نیز ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اوپر جیسا دوسرے نکتہ میں بیان ہوا ہے کہ اس واقعہ میں صحابہ یہ خود کیسے کہتے کہ ہمارے واسطے استغفار کر دیجئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضور ﷺ ہی خود ہم سے خفا ہیں۔ پس جب وہ یہ عرض نہ کر سکے تو خدا نے ان کا کام کر دیا۔ حاصل اس نکتہ کا صحابہ کی شان تفویض کا اور اس کی برکات کا اظہار ہے جیسا کہ بچہ کے سب کام کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ خود نہیں کر سکتا۔

طفل تا گیرا تا پویا نبود مرکبش جز گردن بابا نبود

(بچہ جب تک ہاتھ سے پکڑنے کے اور پاؤں سے چلنے کے قابل نہیں ہوتا تو بابا کی گردن پر چڑھا چڑھا پھرتا ہے)

یعنی چونکہ بچہ ہاتھ پاؤں سے کچھ کام نہیں کر سکتا اس لئے حق تعالیٰ خود اس کے سارے کام بنا دیتے ہیں اور جب خود کرنے لگے اس کا بوجھ اسی پر ڈال دیتے ہیں۔ بس جس نے یہ نکتہ سمجھا وہ مفلوج ہو گیا مگر تم خود اپنی رائے سے مفلوج نہ بننا بلکہ کسی محقق شیخ کی اجازت سے ایسا کرنا چاہیے اور حضرات صحابہ پر اپنے کو قیاس نہ کرنا چاہیے کیونکہ صحابہ حدود کو جانتے تھے اس لئے ان کی خاموشی بدوں صریح اجازت کے بھی محدود تھی بہرحال وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آپ ان کے لئے استغفار کیجئے) میں خصوصیت کے برتاؤ کا امر ہے اور انہیں خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (اور آپ خاص خاص باتوں میں سے ان سے مشورہ کر لیا کیجئے) کہ بعض معاملات میں جو محل ہیں مشورہ کے ان سے مشورہ کیا کیجئے۔

یہاں الامر میں لام عہد کا ہے اس کی توضیح کے لئے ایک مسئلہ بتاتا ہوں وہ یہ کہ مشورہ ہر کام میں نہیں ہوا کرتا چنانچہ جو کام خیر محض ہو کہ اس میں کسی ضرر کا احتمال ہی نہ ہو اس میں مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں مثل مشہور ہے۔ در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست (کار خیر میں استخارہ کی کچھ ضرورت نہیں ہے) میں نے اس میں تصرف کر کے اس مصرعہ کو اس طرح بنایا ہے

درکار خیر حاجت ہیچ استشارہ نیست (کار خیر میں مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ہے) اور دونوں کا ایک ہی حکم ہے اگر شر کا احتمال نہ ہو تو استشارہ اور استخارہ دونوں مسنون ہیں ورنہ نہیں۔

مشورہ میں حکمت

غرض مشورہ کی ہر جگہ ضرورت نہیں اس لئے لام عہد سے فرمایا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ای فی بعض الامر المعلوم لک (آپ ان سے مشورہ لیتے رہا کریں یعنی بعض امور میں جو آپ کو معلوم ہیں) اور جہاں لام استغراق کا نہ ہو وہاں عہد ہی کا ہوتا ہے ائمہ فن نے اس کی تصریح کی ہے بلکہ محققین کا قول یہ ہے کہ لام میں اصل عہد ہی ہے جہاں عہد نہ بن سکے وہاں دوسرے معانی پر محمول کیا جاتا ہے اور یہاں کوئی شخص یہ سوال نہیں کر سکتا کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی حاجت تھی یا نہ تھی کیونکہ یہ امر تو صحابہ کی تطییب کیلئے تھا باقی اصل مشورہ کی ضرورت سے سکوت ہے اور اس میں روایتیں مختلف ہیں میں ان میں تطبیق دیتا ہوں۔ ایک روایت میں تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو مشورہ کی ضرورت نہیں مگر امت پر رحمت کیلئے تطییب قلب بھی اس میں داخل ہے کر لیتا ہوں اخرجه ابن عدی والبیهقی فی الشعب بسند حسن عن ابن عباس لما نزلت و شاورهم فی الامر قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اما ان الله ورسوله یغنیان ولکن جعلها الله تعالیٰ رحمة لامتی کذافی روح المعانی (ابن عدی اور بیہقی شعب الایمان میں ابن عباس سے مند حسن سے روایت کیا ہے جبکہ آیت شاورهم فی الامر نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ تو مستغنی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے رحمت اس کو بنا دیا ایسے ہی روح المعانی میں ہے) اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حاجت مشورہ کی نہ تھی اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہما کے مشورہ کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے اخرجه الامام احمد عن عبد الرحمن بن غنیم ان رسول الله ﷺ قال لابی بکر وعمر لو اجتمعتنا فی مشورة ماخالفتکما کذا فی روح المعانی ایضا (امام احمد نے عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے ابوبکر وعمر سے فرمایا اگر تم دونوں کسی مشورہ میں متفق ہو جاؤ گے تو میں تمہاری مخالفت نہ کروں گا ایسے ہی روح المعانی میں ہے) مراد انتظام و بعث عساکر وغیرہ کا کام۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ حضور ﷺ کو غالب اوقات میں تو مشورہ کی حاجت نہ ہوتی تھی کبھی کبھی اتفاقاً ضرورت پڑ جاتی تھی اور یہ بات شان نبوت کے خلاف نہیں بلکہ مناسب شان ہے۔ میں نے اس میں ایک نکتہ نکالا ہے کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی حاجت ہونے میں ولو فی بعض الاحوال (اگرچہ بعض حالتوں میں ہو) حکمت ہے کیونکہ حاجت منافی الوہیت ہے اس میں حضور ﷺ کی شان شریف کا اظہار تھا کہ حضور ﷺ نبی ہیں اللہ نہیں اور بعض علماء نے حضور ﷺ کے مشورہ کی حکمت تعلیم امت بیان کی ہے۔

اب مشورہ کے بعد حضور ﷺ کے اختیارات کی وسعت بیان فرماتے ہیں فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا پر اعتماد کیجئے) اس میں مطلقاً یہ فرمایا کہ مشورہ کے بعد جدھر آپ کا عزم ہو اپنے عزم پر عمل

کیجئے اس میں قید نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی رائے سب کے خلاف ہو یا ایک کے موافق اور اکثر کے خلاف ہو ہر حال میں تو کلا علی اللہ (اللہ پر بھروسہ کرکے) اپنے عزم پر عمل کرنے کے واسطے حکم فرمایا۔

قرآن حکیم سے سلطنت شخصی کا ثبوت

یہاں سے جڑ کٹتی ہے سلطنت جمہوری کی کیونکہ اس میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور محض مشورہ کرنے سے کثرت رائے پر فیصلہ کرنا لازم نہیں آتا اس لئے وشاورھم سے سلطنت جمہوری پر استدلال نہیں ہوسکتا اور اگر کھینچ تان کر کوئی اس سے استدلال کرتا بھی تو فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا پر اعتماد کیجئے) نے اس کو بالکل ہی اڑادیا اور اس سے مشورہ کو بیکار نہ کہا جاوے کہ جب اس پر عمل نہ کیا تو نفع ہی کیا ہوا دراصل مشورہ میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے معاملہ کے ہر پہلو پر نظر پہنچ جاتی ہے اس کے بعد جو رائے ہوگی اس میں سب مصالح کی رعایت ہوگی اسی واسطے کہا گیا ہے رایان خیر من الواحد (دو رائیں ایک رائے سے بہتر ہے) یہ حاصل ہے مشورہ کا نہ یہ کہ عوام کی رائے کو بادشاہ کی رائے پر ترجیح دی جائے جیسا کہ جمہوری سلطنت میں ہوتا ہے وہ بادشاہ ہی کیا ہوا جو رعایا کی رائے پر مجبور ہوگیا۔ اسلام میں یہ حکم نہیں بلکہ اس کو پورے اختیارات ہیں۔ ہاں البتہ انتخاب سلطان کے وقت جمہور اہل حل وعقد کی کثرت رائے معتبر ہے جبکہ وہ رائے خلاف شرع نہ ہو بہر حال وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آپ بعض بعض باتوں میں ان سے مشورہ لیتے رہا کریں) تو جمہوری سلطنت کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ البتہ ایک اور آیت سے بظاہر اس پر استدلال ہوسکتا ہے شاید وہ کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہو مگر میں اس کو بیان کرتا ہوں مع جواب کے کوئی صاحب فقط لَا تَقْرَبُوا (مت قریب جاؤ) کو نہ دیکھیں بلکہ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (اس حال میں کہ نشہ کی حالت میں ہوں) کو بھی دیکھیں یعنی جواب کو بھی ساتھ ہی ساتھ ملاحظہ فرمالیں۔ وہ آیت یہ ہے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا الایۃ (اور جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم میں نبی بنائے اور تم سب کو بادشاہ بنایا) اس میں حق تعالیٰ شانہ بنی اسرائیل پر انعام نبوت کے مضمون میں تو ارشاد فرماتے ہیں جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ یعنی تم میں نبی بنائے اور انعام سلطنت کے بارے میں ارشاد ہے جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا یعنی تم سب کو بادشاہ بنایا (اس سے معلوم ہوا کہ ان کی بادشاہت جمہوری تھی اور نہ یہاں بھی یوں فرمایا جاتا جعل فیکم ملوکا کہ تم میں بادشاہ بنائے جیسا کہ نبوت کے متعلق فرمایا یہ تو دلیل ہوئی اور اس کے دو جواب ہیں ایک عقلی ایک نقلی۔ عقلی جواب تو یہ ہے کہ فاتح قوم کا رعب شاہی عام ہوتا ہے نیز جس قوم میں بادشاہت ہوتی ہے اس کے ہر فرد کا حوصلہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے کو فاتح اور سلطان سمجھتا ہے قوم مفتوح کے مقابلہ میں اس لئے جعلکم ملوکا (تم سب کو بادشاہ بنایا) فرمایا یہ نہیں کہ وہ سب کے سب بادشاہ تھے اور نقلی دلیل یہ ہے کہ جب ہماری شریعت میں شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اگر بنی اسرائیل کے لئے جمہوری سلطنت بھی مان لیں تو وہ منسوخ ہو چکی اور ہمارے لئے حجت نہیں ہوسکتی۔ غرض قرآن شریف سے تو سلطنت شخصی ہی ثابت ہوتی ہے۔ اب جو اہل اسلام میں جمہوریت کے مدعی ہیں وہ یاد

رکھیں کہ ہمارے ذمہ شخصیت پر دلیل قائم کرنا لازم نہیں بلکہ دلیل ان کے ذمہ ہے اور ہم تو مانع ہیں پس جب وہ دلیل لاویں گے اس کا جواب بھی ان شاء اللہ ہم دیں گے اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ اپنے دعوے پر کوئی دلیل نہیں لا سکتے۔

توکل اور اس کے درجات

اور فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (خدا ہی پر اعتماد رکھئے) میں یہ بھی بتلا دیا کہ باوجود مشورہ کرنے سے جو کہ اسباب رویت صواب سے ہے خدا ہی پر اعتماد رکھئے مشورہ کے بعد کام بنانے والا وہی ہے۔ مشورہ پر اعتماد نہ کرنا چاہیے آگے فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (بے شک اللہ تعالیٰ اعتماد رکھنے والوں کو پسند فرماتے ہیں) اس میں مسلمانوں کو امر وجوبی ہے توکل کا ہر کام میں خدا ہی پر نظر رکھیں دلیل وجوب کی یہ ہے کہ یہاں یحب فرمایا ہے جس سے مقابلہ کی بناء پر لازم آیا کہ لایحب غیر المتوکلین وہ غیر اعتماد رکھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے ہیں اور قرآن کا محاورہ یہ ہے کہ لایحب اپنے لغوی معنے پر مراد نہیں بلکہ یبغض کے معنے میں ہے پس یحب المتوکلین کو یبغض غیر المتوکلین (غیر اعتماد رکھنے والے کو مبغوض رکھتے ہیں) لازم ہے اور عدم توکل کا مبغوض ہونا دلیل ہے توکل کے وجوب کی البتہ توکل کے مراتب مختلف ہیں اس کا ہر درجہ فرض نہیں اس لئے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ فرض کا درجہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل سنو توکل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ اعتقاداً ہر حال میں خالق پر نظر رہے اسی پر اعتماد ہو یہ تو فرض ہے یعنی اسباب ہوں یا نہ ہوں ہر حال میں بھروسہ خدا پر ہو اصلی کارساز اسی کو سمجھیں اسباب پر نظر نہ رکھیں۔ دوسرا درجہ توکل کا عملی ہے یعنی ترک اسباب اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ سبب کسی ضروری مقصود دینی کے لئے ہے تو اس کا ترک حرام ہے۔ جیسا کہ اسباب جنت میں سے نماز وغیرہ ہیں ان کا ترک جائز نہیں اور اگر مقصود دنیوی کا سبب ہے تو پھر اس میں بھی تفصیل ہے کہ اگر عادۃً اس مقصود کا توقف ثابت اور وہ مسبب مامور بہ ہے تو اس کا ترک بھی حرام ہے جیسے کھانا سبب شبع ہے اور پانی پینا سبب ارتوا ہے ان اسباب کا ترک جائز نہیں اور اگر سبب پر مقصود دنیوی کا ترتب ضروری اور موقوف نہیں تو اقویا کے لئے اس کا ترک جائز بلکہ بعض صورتوں میں افضل ہے اور اگر اشتغال میں کوئی دینی ضرر ہے تو اس کا ترک واجب ہے۔ مقصود آیت کا یہ ہے کہ حضور ﷺ ہمارے حق میں رحمت ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نہایت رحیم کریم بنایا ہے۔

یارب تو کریم و رسول تو کریم   صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

لیکن آیت کو ختم فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ پر جس سے مفہوم ہوا کہ تدبیر تو کریئے لیکن اصل مقصود تدبیر کے وقت بھی توکل اور خدا پر نظر رکھنا چاہیے۔ تدبیر کی مشروعیت کی علت تو محض ہمارا ضعف ہے اور اظہار ہے غایت افتکار کا کہ اے اللہ ہم ایسے مضبوط نہیں کہ آپ کی بنائی ہوئی چیزوں کے محتاج نہ ہوں (التوکل)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ: بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے۔

شان نزول

یہ دو آیتیں ہیں جو اپنی خصوصیت شان نزول کے اعتبار سے ایک خاص مقصود کے واسطے نازل ہوئی تھیں جس کا حاصل جناب رسول ﷺ سے خطا معاف کرانا ہے بعض مقصرین صحابہ رضی اللہ عنہم کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ میں سے بعض سے حضور ﷺ اس لئے ناخوش ہو گئے تھے کہ ان سے کچھ کوتاہی ہو گئی تھی جس کا حاصل کسی قدر تجاوز ہے حدود شرعیہ سے ہو گئی تھی گو صحابہ اس میں معذور تھے اس لئے کہ بقصد تجاوز ان سے وہ کوتاہی نہیں ہوئی تھی اور حضور ﷺ بھی حق بجانب تھے اس لئے کہ گو تعمد نہ تھا لیکن تاہم غفلت تو تھی اس لئے حضور ﷺ قدرے ناخوش ہو گئے تھے مگر حق تعالیٰ کی تو بڑی رحمت ہے اور نیز نظر ہے بندے کے عذروں پر بلکہ بندہ کو اپنے بعضے وہ عذر معلوم بھی نہیں جو حق تعالیٰ کو معلوم ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو اپنے نفس پر وہ رحمت نہیں ہے جو خالق تعالیٰ شانہ کو اس کے حال پر ہے۔

باری عز اسمہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول ﷺ کے صحابہ اس سے بھی پاک ہو جاویں اور یہ کیفیت ان میں نہ رہے اس لئے ارشاد ہے کہ آپ بھی معاف فرما دیں پس فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ اس کی تمہید ہے اور فَاعْفُ عَنْهُمْ مقصود ہے سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اسی پر اقتصار نہیں فرمایا آگے اس کے واستغفر لھم بڑھایا یعنی آپ ہی معاف فرما دیجئے اور ہم سے بھی درخواست کیجئے کہ ہم معاف کر دیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی معاف فرما دیا تھا تو وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اب تحصیل حاصل ہے بات یہ ہے کہ وہ معافی تو قانونی ہے اس کا اثر تو یہ ہے کہ عذاب سے نجات ہو جاوے گی اب دوسری قسم جو معافی کی ہے یعنی دفع کدورت جس کا سبب فاعف عنھم ہو گا لیکن سب کا وجود تو وجود مسبب کے لئے علت تامہ نہیں یعنی آپ کے معاف کر دینے سے بدوں حق تعالیٰ کی تصرف کی رفع کدورت تو ضرور نہیں کیونکہ وہ آپ کے اختیار میں تو نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا امر فرمایا یعنی مغفرت کی قسم دوم کے وجود کی ہم سے درخواست کیجئے اور یہاں تک دونوں قسمیں متحقق ہو گئیں لیکن اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ حالت اصلی انشراح کی لوٹ آئی مگر یہاں اور چیز کی بھی ضرورت ہے وہ کیا یعنی اس انشراح کی ترقی کیونکہ اعمال میں آئندہ کو ترقی موقوف ہے زیادہ انشراح پر پس رحمت پر اور نعمت پر نعمت حق تعالیٰ کی دیکھئے کہ آگے اس کی تدبیر بھی ارشاد فرماتے ہیں تاکہ ہماری یہ مقبول جماعت کسی پہلو سے ناقص نہ رہے چنانچہ فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی ان سے کام میں مشورہ بھی کیجئے کہ اس

سے ان کا انشراح ترقی پذیر ہو کر وسیلہ ترقی مراتب کا ہوگا اس لئے کہ مشورہ کے اندر جو مصلحتیں خاص نفس مشورہ کے اعتبار سے ہیں ان کے علاوہ ایک اور عجیب خاص ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دیکھئے مشورہ کس سے لیا کرتے ہیں مشورہ اس شخص سے لیا کرتے ہیں کہ جس میں دو وصف پائے جاویں اول تو اس پر پورا وثوق اور نہایت اطمینان اور اعتماد ہو اور اس کو اپنا خیر خواہ اور اس سے خصوصیت سمجھی جاوے دوسرے جس امر میں مشورہ کیا جاوے اس کے اندر وہ صاحب بصیرت ہو اسی واسطے بعض مرتبہ بھائی سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ دوست سے کرتے ہیں۔ غرض مشورہ ہر شخص سے نہیں لیا جاتا پس جس شخص سے مشورہ لیا جاوے گا تو اس کو پہلے سے اور زیادہ تعلق بڑھ جاوے گا اس لئے کہ وہ اس سے استدلال کرے گا کہ ہماری بات پر اس کو پورا اطمینان ہے ہماری دیانت پر اس کو اعتماد ہے اور ہم کو اس قابل سمجھتا ہے کہ ہم سے امر خاص میں مشورہ لیا جاوے اس سے دل بڑھ جاوے گا اور دل کے بڑھ جانے کو بڑا دخل ہے اعمال صالحہ کی ترقی میں پس یہ راز ہے اس کا کہ حضور ﷺ کو امر فرمایا کہ ان سے مشورہ لیجئے تا کہ وہ انشراح ان کا اور زیادہ بڑا ہو کر سبب ہو جاوے اعمال صالحہ کے اندر ترقی کا جو سبب ہے قرب کا۔

سلطنت جمہوری کا ثبوت قرآن پاک سے نہیں ملتا

غضب یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے اور دلیل ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کو پیش کرتے ہیں اس استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص نے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا سے یہ فتویٰ لکھا تھا اور وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا تھا کہ جمع ہو کر کھانا واجب ہے۔ اگر سلطنت جمہوری کی حقیقت صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ جس میں صرف مشورہ ہو تو بے شک یہ استنباط صحیح تھا سلطنت جمہوری میں تو یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی رائے دو رائے کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اس آیت سے اس کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے بعد ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ صیغہ مفرد مخاطب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشورہ تو کیجئے لیکن مشورہ کے بعد عمل اس پر کیجئے جس کا آپ عزم کرلیں اور اس میں کوئی قید ہے نہیں تو اس میں سب مختلف صورتیں آ گئیں ان صورتوں میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ سب کی رائے ایک جانب ہو اور حضور ﷺ کی رائے ایک طرف تو اس صورت میں بھی آپ ہی کے عزم اور ترجیح پر مدار رہا پس اس سے تو سلطنت جمہوری کا اثبات نہیں ہوتا بلکہ سلطنت جمہوری کی بناء ہی اس سے منہدم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایسا نہیں ہوتا غرض اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا بلکہ سلطان مشورہ کے بعد مستقل و مستعد ہے کہ اپنی بصیرت خداداد سے جس صورت کو چاہے اختیار کرلے۔

مشورہ کی مصلحت

اور مشورہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کرنے والے کی نظر سے کوئی پہلو اس امر کا مخفی نہ رہے گا اور نہ بسا اوقات ایک شخص کی نظر

تمام پہلوؤں کو محیط نہیں ہوتی ہے اور ایک دوسری آیت سے بھی سلطنت جمہوری کا ابطال اور سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ اسی اخیر جملہ سے سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے اس لئے کہ فرض کرو مجلس میں دس آدمی ہیں اور وہ دس اعلیٰ طبقہ کے ہیں اور سردار قوم ہیں ان سب آدمیوں نے اجازت چاہی تو سلطنت جمہوری کا مقتضا تو یہ ہے کہ چونکہ سب اہل مجلس ایک طرف ہو گئے تو بادشاہ کو اجازت دینا واجب ہوگا حالانکہ اس صورت میں بھی ارشاد ہے فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ کہ جس کو آپ چاہیں اجازت دیں یہ صاف دلیل ہے کہ حضور ﷺ مستقل بادشاہ ہیں اگر قرآن حدیث میں اور زیادہ غور کیا جاوے تو بہت دلائل نکلیں گے ایک فائدہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ آیت میں مشورہ کا بھی ذکر ہے اور عزم کا بھی جو کہ منجملہ تدابیر کے ہیں۔

اسلام اور جمہوریت

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کے دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشوہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے آزاد کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو خیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہوا گر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے تو حضرت بریرہ نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس مشورہ کو قبول نہیں کرتی لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو بدرجہ اولیٰ حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں۔ بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہ نے حضور ﷺ کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور ﷺ ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب ہوا تو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان

کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہوجائے تو وہ اکثریت کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حدیث بریرہ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کرکے اس پر عمل کریں۔ یہاں اذا عزمت صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور ﷺ مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے اذا عزم اکثر کم فتوکلوا علی اللہ فرماتے پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جز خود ان کے دعوے کی تردید کررہا ہے مگر ان کی حالت یہ ہے حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔

دوسرا اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کرلیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ تم از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو، چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کرسکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کردے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے۔ ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور جس آیت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں میں نے بتلادیا کہ اس سے استدلال نہیں ہوسکتا بلکہ اگر غور کریں تو اسی آیت سے شخصی حکومت کا ثبوت ہورہا ہے۔ اور اسی آیت میں فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اس میں ایک عجیب حکمت ہے۔ یہ بات اسی وقت ذہن میں آئی ہے وہ حکمت یہ ہے کہ بعض لوگوں کا جو خیال ہے کہ ایک شخص کی تنہا رائے کبھی صحیح نہیں ہوسکتی۔ ضرور اسی میں غلطی ہوگی اس کا جواب فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ میں دیا گیا ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا جس میں مادہ پرستی غالب ہوگی اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہوگا کہ شخص واحد کی رائے ضرور غلطی کرے گی۔ اس لئے پہلے ہی سے اس کا بھی جواب دے دیا اور ایسا جواب دیا جس میں گفتگو کی مجال نہیں۔ اس خیال کا ایک جواب تو یہ تھا کہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے تم تجربہ کرکے دیکھ لو معلوم ہوجائے گا بعض دفعہ ایک شخص کی رائے تمام دنیا کے خلاف صحیح ہوتی ہے مگر اس

سے گفتگو قطع نہیں ہوتی اور تُو تُو میں میں شروع ہو جاتی ہے چنانچہ آج کل یہ جواب دے کر دیکھ لو جو کبھی گفتگو قطع ہو۔ مخاطب کبھی اس کو اتفاق پر محمول کریگا۔ کبھی یہ کہے گا کہ واقع میں اکثر ہی کی رائے صحیح تھی مگر بعض موانع کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور شخص واحد کی رائے واقع میں غلط تھی۔ مگر اسباب خارجہ ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس کی رائے کامیاب ہوگئی۔ وعلی ھذا کچھ نہ کچھ تو توجیہیں نکال لی جائیں گی مگر حق تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جواب ایسا دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہو جائے۔ قرآن میں مقدمات اور صغری کبری اور قیاسی اشکال سے جواب نہیں دیا گیا کیونکہ اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی۔ مخاطب مقدمات میں گفتگو کرنے لگتا۔ بلکہ قرآن میں جواب ایسی مختصر بات سے دیا جاتا ہے جو دل میں گھس جائے اور مخاطب کو گفتگو کی جگہ نہ ملے چنانچہ اس خیال کا دوسرا جواب وہ ہے جو فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ میں دیا گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حاکم کا قلب مشورہ کے بعد جب ایک شق کی طرف مائل ہو جائے تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل شروع کر دے۔ تمہارے ہاتھ میں خزائن کامیابی نہیں ہیں بلکہ سب خزائن ہمارے ہاتھ میں ہیں تم خدا پر بھروسہ کر کے عمل کرو حق تعالیٰ شخص واحد کی رائے کو بھی کامیاب کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر وہ رائے غلط بھی ہوگی تب بھی توکل کی برکت سے صحیح ہو جائے گی اور اگر عقل اس کو تسلیم نہ کرے تو تم عقل کے فتوے پر عمل نہ کرو بلکہ ہمارے قانون پر عمل کرو۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ مشورہ کے بعد حاکم کی رائے جس طرف قائم ہو جائے اس کو اپنی رائے کے موافق عمل کرنا چاہیے اور خدا پر نظر رکھنی چاہیے۔ وہ ایک آدمی کی رائے کو بھی تمام عالم کی رائے پر غالب کر سکتے ہیں۔ عقل اگر یہ کہے کہ ایک کی رائے صحیح نہیں ہو سکتی تو اس کی بات پر التفات نہ کرو' عقل بیچاری ہے کیا چیز جو قانون خداوندی میں اس کے فتویٰ سے مزاحمت کی جائے۔ (تقلیل الاختلاط)

حضرات صحابہؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے

حق تعالیٰ نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب ان صحابہ کی غلطی اجتہادی کو قرار دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر گھاٹی سے ہٹ گئے تھے چنانچہ ارشاد ہے وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ (اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھادی گئی تھی)

اس کے بعد بطور عتاب کے فرماتے ہیں فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ یعنی پھر خدا تعالیٰ نے تم کو بھی غم دیا بدلہ (اس) غم کے (جو تم نے نافرمانی کر کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا) اس کے بعد اس انتقام کی حکمت ارشاد فرماتے ہیں لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ تاکہ تم کو (انتقام) لینے کے بعد) اس بات پر زیادہ رنج نہ ہو جو تم سے فوت ہوگئی تھی یہ وہی بات ہے جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے۔

شان رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

چونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم صفات باری ہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی شان ہے کہ آپ میں رحمت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤف رحیم فرمایا اور سخت کلامی وسنگ دلی سے آپ کی براءت کی ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ. پس خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خوسخت طبیعت ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

یہ حضور کی اصلی صفت ہے اور غضب۔ حدت آپ کی اصلی صفت نہیں بلکہ کسی عارض ومقتضی کی وجہ سے اس کا ظہور ہوا اب بتلائیے کہ حضور کا اتباع آپ کی صفات اصلیہ کا اتباع ہے یا صفات عارضیہ کا۔ یقیناً ہر شخص یہی کہے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع یہی ہے کہ صفات اصلیہ میں آپ کا اتباع کیا جائے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض دفعہ نماز فجر بھی قضا ہوئی ہے تو کیا تم بھی اس عارض کا اتباع کر کے ہر روز نماز فجر قضا کیا کرو گے ہرگز نہیں! یہ مثال عجیب ذہن میں آئی کہ جس نے راستہ کو واضح کر دیا۔

بل احیاء عند ربھم یرزقون (آل عمران)

بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق ملتا ہے۔

حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک نکتہ

فرمایا ایک شخص نے حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مجھ سے گفتگو کی میں نے کہا جو لوگ مقتول فی سبیل اللہ ہیں ان کے حق میں ارشاد ہے بل احیاء عند ربھم اور جو لوگ فی سبیل اللہ سے بڑھ کر مقتول فی اللہ ہیں وہ کیونکر زندہ نہ ہوں گے اور اس نکتہ پر مدار مسئلہ کا نہیں اس میں حدیث صریح موجود ہے اور یہ تائید کے درجہ میں ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۳۱۱)

سلطنت شخصی میں بھی مشورہ واجب ہے

فرمایا بعض لوگ آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ سلطنت شخصی ہونا خلاف قرآن کے ہے۔ شاورھم سے کثرت رائے مفہوم ہوتی ہے جو حاصل ہے سلطنت جمہوری کا۔ مگر اس استدلال کی غلطی خود اس آیت کے اگلے جزو سے ظاہر ہے فاذا عزمت فتو کل علی اللہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو مشورہ مطلوب ہے مگر بعد مشورہ مدار محض آپ کے عزم اور رائے پر ہے اس سے تو بالعکس سلطنت کا شخصی ہونا ثابت ہوا البتہ یہ ضرور ہے کہ شخص واحد پر مشورہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن مدار کثرت رائے پر نہیں رکھا گیا بلکہ اس مشیر کو اطلاق آیت سے اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ مقابلہ جماعت کے ایک کے مشورہ کو قبول کر کے اس کے موافق عزم کرے۔ (مقالات حکمت ص ۶۳)

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی
الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ
وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ
سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں اورزمین کے بنانے میں یکے بعد دیگرے رات اوردن کے آنے جانے میں اہل عقل کے لئے دلائل ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اورزمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار تونے ان کو لایعنی پیدا نہیں کیا پس ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے۔

تفسیری نکات

ترغیب ذکر وفکر

یہاں دوعملوں کی ترغیب ہے ایک ذکر کی ایک فکر کی اور ان ہی دونوں میں کوتاہی کرنا ہماری دنیوی اور دینی خرابی کا سبب ہے ہر چند کہ اس آیت میں خاص فکر کا ذکر ہے جو کہ آسمان وزمین کی پیدائش اور بناوٹ میں کیا جائے کیونکہ یہ موقع اثبات توحید کا ہے اور مقصود مقام یہی ہے اور اثبات توحید میں **تفکر فی السماء والارض** کو خاص دخل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان مخلوقات میں غور کرو کہ یہ سب حادث ہیں اور حادث کے وجود کے لئے موجد کی ضرورت ہے اگر موجد بھی حادث ہوا تو اس کے لئے پھر موجد کی ضرورت ہوگی اور سلسلہ غیر متناہی چلے گا اور تسلسل محال ہے پس ضروری ہے کہ انتہا واجب پر ہوگی اور اس کو ہم اللہ کہتے ہیں غرض فکر اس جگہ مقید ہے مگر مجموعی آیات سے جو اس باب میں وارد ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ہر چیز میں فکر ہونا چاہیے رسالت میں بھی توحید میں بھی اسی طرح اور کوئی عمل بھی فکر سے خالی نہ ہونا چاہیے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں ہمارا کیا حال ہے سو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو کسی کام میں فکر نہیں ہوتی اپنی ہر حالت کو یاد کر کے دیکھ لو کوئی وقت بھی ایسا ہوتا ہے جس سے ہم فکر کرتے ہوں یا کسی کام میں سوچ سے کام لیتے ہیں یقیناً آپ اپنے سب اوقات کو فکر سے خالی پائیں گے حالانکہ قرآن وحدیث میں تو توحید و رسالت تک بھی فکر کی تاکید ہے گو توحید و رسالت کے حاصل ہوتے ہوئے ان میں فکر نہ کرنے کی شکایت نہ ہو کیونکہ اس فکر کا نتیجہ بحمداللہ ہم سب کو حاصل ہے کیونکہ بحمداللہ سب مومن مسلمان ہیں یہ اور بات ہے کہ خلل اعمال کی وجہ سے ایمان کی نورانیت بعض میں کم ہے باقی نفس ایمان میں کمال ونقص نہیں ہے بحمداللہ نفس ایمان سب کو حاصل ہے حتیٰ کہ نفس ایمان فاسق کو بھی حاصل ہے بعض عارفین کا

قول ہے کہ ضعیف الایمان کا نور بھی اگر ظاہر ہو جائے تو آسمان وزمین سب کو چھپا لے بہرحال یہ فکر اگر نہ ہو تو کچھ شکایت نہیں کیونکہ اس فکر کا حاصل یہ ہوگا کہ شئے موجود کو قوی کیا جائے گا اور موجود کو قوی کرنا مفقود کے حاصل کرنے سے موخر ہے مقدم یہ ہے کہ مقصود کو حاصل کیا جائے۔

جزاوسزا میں فکر کی ضرورت

میں اسی فکر کو بتلانا چاہتا ہوں جس کی ہر عمل میں ضرورت ہے اور فکر یہ ہے کہ جزاوسزا میں فکر کیا جائے چنانچہ سورۃ رحمٰن میں اول سے آخر تک اسی کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور عقوبتیں بیان فرما کر بار بار سوال کیا ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ جس کا حاصل یہی ہے کہ ان نعمتوں کو اور عقوبتوں کو سوچنا اور یاد کرنا چاہیے مگر اس مقام پر کسی طالب علم کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ نعمتوں کے ساتھ تو فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ موقع پر ہے مگر عذاب کے ساتھ اس کے ذکر کا کیا موقع ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب کے ذکر سے انسان کو تنبیہ ہوتی ہے اور وہ عذاب کو سوچ کر نافرمانی سے بچتا ہے اس حیثیت سے اس کا ذکر بھی نعمت ہے اگر ہم کو فکر کی عادت ہوتی تو یہ راز معلوم ہو جاتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم منادی کراتا ہے کہ جو شخص سرکاری درخت کاٹے گا اس پر اس قدر جرمانہ ہوگا اور سزا دی جائے گی عاقل اس منادی کو بھی نعمت سمجھے گا کہ اس منادی کی وجہ سے ہم جیل خانہ سے بچ گئے اگر ہم کو خبر نہ ہوتی تو قید بھگتنا پڑتی یا طبیب کسی مضر شے کی مضرت سے ہم کو اطلاع دے۔ عاقل اس کی بھی قدر کرے گا اسی طرح یہاں سمجھو کہ عذاب گو فی نفسہ نعمت نہ ہو مگر اس سے مطلع کر دینا ضرور نعمت ہے پس اب فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کسی جگہ بے موقع نہیں ہے بہرحال سارا قرآن فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے کہیں قیامت کے بارہ میں ارشاد ہے اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ ان کو قیامت کے امکان کو سمجھنے کے لئے مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں نظر چاہئے نظر وفکر ایک ہی ہے

تفکر فی الدنیا

ایک جگہ ارشاد ہے لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ۝ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کہ اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ دنیا وآخرت میں فکر کرو۔ یہاں تفکر فی الدنیا کی بھی تاکید ہے اس پر یہ اشکال ظاہر میں ہوتا ہے کہ دنیا میں تفکر کی کیا ضرورت ہے بلکہ اس سے تو تفکر کو ہٹانا چاہیے اشکال سننے کے بعد اب دو تفسیریں سنو! جن میں ایک دوسرے سے لطیف ہے ایک تفسیر تو یہ ہے کہ دنیا کے اندر جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل دنیا کے لئے ہو اس کو مقصود بالذات سمجھے اور اگر مقصود بالذات نہ سمجھے تو وہ فکر بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے **طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ** کو اور طلب کے لئے فکر لازم ہے مگر یہ فکر مقصوداً مطلوب نہیں بلکہ تبعاً ہے کیونکہ دنیا بقدر ضرورت کو دین کی تکمیل وتحصیل میں دخل ہے دوسری تفسیر اس سے لطیف ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا وآخرت میں تفکر کرو موازنہ کے لئے ان میں کون اختیار کرنے کے لئے ہے اور کون قابل ترک ہے اور دنیا میں جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل کے لئے ہو اور جو فکر ترک دنیا

کے لئے ہو وہ تو مطلوب ہے پہلی تفسیر کا حاصل یہ تھا کہ دنیا میں تبعاً تفکر کرو اور آخرت میں مقصوداً اور دوسری تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دونوں میں مقصوداً تفکر کرو موازنہ کے لئے اہل اللہ نے دنیا میں فکر کر کے ہی اس کی حقیقت کو سمجھا ہے اسی لئے ان کو دنیا سے سخت نفرت ہے۔

باوجود وعدہ کے خوف

حاصل یہ ہے کہ باوجود وعدے کے بھی خوف ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے اسی واسطے یہ دعا سکھلائی گئی ہے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ جس کا ترجمہ ہے کہ اے اللہ جن باتوں کا آپ نے رسولوں کی زبان پر ہم سے وعدہ کیا وہ ہم کو دینا اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کرنا اس میں ظاہراً یہ اشکال ہے کہ جس چیز کا وعدہ کیا گیا اس میں خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا پھر اس کے مانگنے کی کیا ضرورت ہے جس سے وہم ہوتا ہے کیا وعدہ پورا ہونے پر ایمان نہیں۔

اور یہ دعا خود حق تعالیٰ نے تعلیم فرمائی ہے تو یہ کیا بات ہے۔

اس کی وجہ علماء نے یہی لکھی ہے کہ جس قید کے ساتھ وعدے کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ وہ قید ہم میں باقی رہے یا نہ رہے اور ہم محل وعدہ رہیں یا نہ رہیں خدانخواستہ حالت ایسی متغیر ہو جاوے کہ ہم اس وعدہ کے مصداق ہی نہ رہیں۔ مثلاً وعدہ کیا گیا ہے کہ جو کوئی ایمان لائے گا اور عمل صالح کرے گا تو اس کو جنت ملے گی۔ اس میں وعدہ ہے جنت کا مگر مقید ہے بقاء ایمان اور عمل صالح کے ساتھ فرض کر لیجئے ہم میں اس وقت ایمان بھی ہے اور عمل صالح بھی ہے اور اس وقت ہم اس وعدہ کے مصداق ہیں۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خاتمہ کے وقت یہ حالت نہ رہے اور اس وعدہ کے مصداق نہ رہیں اور جنت نہ مل سکے تو وعدہ بھی سچا رہا اور موعود ظاہری کے خلاف کا وقوع میں آنا بھی ممکن ہو گیا کیونکہ وہ حقیقۃً موعود ہی نہ تھا اس واسطے سوال کیا جاتا ہے اب اس آیت پر وہ اشکال نہ رہا کہ جس چیز کا وعدہ ہے اس کا سوال کیوں کیا جاتا ہے حاصل جواب کا یہ ہوا کہ سوال اس بات کا کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے اندر ان قیود کو پیدا کر دیں اور باقی رکھیں جن کے ساتھ وہ وعدہ مقید ہے تو اٰتنا ما وعدتنا کا حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ان لوگوں میں سے کر دیجئے جو اس وعدہ کے مصداق ہیں۔ غرض وعدہ سچا ہے لیکن کبھی واقع میں وہ وعدہ مقید ہوتا ہے اور یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ قید ہم کو بتلا بھی دی جائے۔ (الاسلام الحقیقی)

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ

اے ہمارے پروردگار جو آپ نے وعدہ کیا ہے اپنے رسول ﷺ کی معرفت وہ عنایت کیجئے اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے بلاشبہ آپ کا وعدہ خلاف نہیں۔

وعدہ کا اہل بنانا

یہ تو ظاہر ہے کہ جس امر کا وعدہ حق تعالیٰ فرما چکے ہیں وہ ملے ہی گا خدا تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے پھر کیا معنی ہیں واٰتنا ما وعدتنا کے اس کی توجیہ بعض نے یہ کی ہے کہ ہم کو اس وعدہ کے اہل بنا دیجئے مگر یہ تاویل بعید ہے کیونکہ یہ تو مومن

سے وعدہ ہے اور وہ تو اس وعدہ کا اہل ہے ہی پھر یہ کہ لاتخلف المیعاد کیوں بڑھایا گیا واقعہ یہ ہے کہ یہ تذکیر ہے نعمت کی اور عبدیت کی کہ جیسے وعدہ میں محتاج تھے وعدہ کے بعد بھی محتاج ہی رہے۔ بعد وعدہ کے بھی یونہی کہا کریں وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا اور اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔

بہر حال نصوص قرآنیہ اور احادیث مؤید ہیں اس کے کہ بعد عطا کے بھی طاعت کو نہ چھوڑا جائے جب نصوص سے ایک قاعدہ کلیہ نکل آیا تو اس کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ بعد عزم کے اگر بارش بھی ہو جائے تو نماز استسقاء کو ترک نہ کیا جائے۔ پہلے طلب کے لئے تھی اب شکر کے لئے ہے حاصل یہ ہے کہ بعد عطا کے وہ فرد ہوگی شکر کی۔ اس لئے اس کو کرنا چاہیے اور یہ بات میں عیدگاہ میں بیان کر چکا ہوں کہ سبب بارش نہ ہونے کا عصیان ہوتا ہے اس لئے گناہوں سے توبہ کرنا چاہیے اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق مرحمت فرماویں۔ (شکر العطاء ملحقہ مواعظ حقیقت عبادت ۳۶۷)

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝۱۹۵

ترجمہ: سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا خواہ کہ مرد ہو یا عورت ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے اور جہاد کیا اور شہید ہو گئے میں ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ عوض ہے اللہ کے پاس اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔

تفسیری نکات

حقیقت عمل

اول سمجھ لیجئے کہ اس سے اوپر حق تعالیٰ نے کچھ ذکر کیا ہے اہل طاعت کا اور ان کے بعض اقوال و افعال ذکر فرمائے ہیں کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ وہ ذکر کرتے ہیں حق تعالیٰ کا اور کائنات میں تفکر کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں وہ دعائیں

نقل فرمائی ہیں اور نقل کیا اور فرمائی ہیں بلکہ تعلیم فرمائی ہیں۔ نہایت پاکیزہ اور جامع دعائیں ہیں اس کے بعد یہ آیت ہے فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ الخ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دعا قبول ہوئی اور ان کی درخواست منظور کی گئی اگلے جملے میں اسی کی وجہ ارشاد ہے اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ یہاں لام مقدر ہے یعنی تقدیر لانی ہے مطلب یہ ہوا کہ درخواست ان کی اس وجہ سے منظور ہوئی کہ میری عادت یہی ہے کہ میں کسی شخص کا عمل اور کسی کام کرنے والے کا کام ضائع اور برباد نہیں کیا کرتا چونکہ دعا بھی عمل ہے اس واسطے اس کو بھی میں نے ضائع نہیں کیا بلکہ اس کو منظور کرلیا اور وہ جو سوال کرتے ہیں وہ میں پورا کروں گا۔ ایک تو یہ توجیہ ہے اور ایک یہ ہے کہ انی کی تقدیر لانی نہیں ہے اور یہ علت نہیں ہے فاستجاب کی بلکہ یہ جملہ مفعول ہے استجاب کا اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ حق تعالیٰ نے اس بات کو منظور فرمایا کہ ان کا کوئی عمل ضائع نہیں کریں گے۔ اس میں دعاء بھی آ گئی اور اعمال بھی آ گئے اور گو اوپر اعمال کے ضائع نہ کرنے کی درخواست نہیں تھی پھر استجاب کے کیا معنی مگر اعمال تو مذکور ہیں یذکرون اور یتفکرون میں جواب اعمال کو شامل ہے۔ لما قالوا کل مطیع الله فهو ذاكر. اور جو شخص عمل کرتا ہے بہ نیت قبول کے کرتا ہے تو عمل بھی درخواست ہے ضائع نہ کرنے کی پس اس طرح سے عدم اضاعۃ استجاب کا مفعول بہ ہو گیا یہ توجیہ کا اختلاف ہے لیکن ہر حال میں خلاصہ مشترک اس کا یہ ہے کہ یہ بات معلوم ہوگئی کہ خدا تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے یہ مضمون ایسا ہے کہ سب جانتے ہیں اور جا بجا آیتوں میں مذکور ہے چنانچہ کئی جگہ آیا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اور مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ بہر حال اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور اس میں کوئی اشتباہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کسی کا کام ضائع نہیں کرتے چونکہ یہ بہت ہی ظاہر اور مسلم بات ہے لہٰذا اس وقت یہ بیان سے مقصود بھی نہیں۔

ضرورت عمل

چنانچہ اللہ تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ اس وقت مقصود بیان صرف تعمیم رحمت حق کا ظاہر کرنا ہے جس پر من ذکر او انثی کا لفظ دال ہے اور اسی جزو کا مجھے بیان کرنا مقصود ہے۔ فرماتے ہیں میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت یعنی ہمارے یہاں نیک عمل ہر مومن کا مقبول ہے یہ نہیں کہ عورت کے عورت ہونے کی وجہ سے کوئی عمل مردود ہو جائے یا مرد کے مرد ہونے کی وجہ سے کوئی عمل مقبول ہو جائے۔ دوسری آیت میں فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو حیات طیبہ نصیب کریں گے اور اس کو جزا دیں گے اچھے عمل کی آپ کو معلوم ہوگا کہ اصول کا قاعدہ ہے کہ جن آیات میں کوئی تصریح عورت یا مرد کی نہیں ہوتی ان کا مضمون مردوں اور عورتوں سب کو عام ہوتا ہے اس بناء پر اس تصریح کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت پھر ان آیتوں میں لفظ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى کے لانے کا کیا سبب ہے؟ اس کا پتہ شان نزول سے چلتا ہے۔ شان نزول حسب روایت ترمذی یہ ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے ایک

دفعہ بطور حسرت کے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ قرآن شریف میں عورتوں کا ذکر کہیں نہیں آتا ان کی خاطر سے حق تعالیٰ نے بعض آیات میں صراحۃً عورتوں کا ذکر فرمادیا تا کہ یہ حسرت نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یاد نہیں فرماتے دیکھو عورتوں کی خاطر اللہ میاں کو کس قدر منظور ہے کہ باوجود ضرورت نہ ہونے کے تصریح کے ساتھ عورتوں کا ذکر بھی کر دیا اس کی قدر ہم کو اس وجہ سے نہیں کہ جب سے ہوش سنبھالا قرآن سنا تو اس میں بہت جگہ ایسے الفاظ سنے جو عورتوں کی شان میں ہیں بس سنتے سنتے مساوات ہوگئی۔ اب جب ایسی آیتیں پڑھتے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی اس کی قدر ان عورتوں کے دل سے پوچھو جن کو یہ حسرت ہو چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر نہیں فرماتے پھر ان کی حسرت کو حق تعالیٰ نے پورا کیا یہ بیچاری قرآن میں ہر جگہ مردوں کا ہی ذکر پاتی تھیں اس سے ان کا دل مرجاتا ہوگا اور یہ خیال ہوتا ہوگا کہ کیا ہم عورتیں حق تعالیٰ کے نزدیک کسی شمار میں بھی نہیں جو کہیں ہمارا ذکر نہیں فرماتے اب سوچئے کہ جس وقت ان کی تمنا کے موافق قرآن میں الفاظ اترے ہوں گے تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اس کا لطف دوسرا کوئی کب سمجھ سکتا ہے؟

جوشِ محبت

ایک صحابی ہیں حضرت ابی کعب شیخین کی روایت میں ہے کہ ان سے ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے ابن کعب خداوند تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں تم کو سورہ لم یکن پڑھ کر سناؤں۔ یہ سن کر ان کو وجد سا آ گیا اور عرض کیا اللہ سمانی یعنی کیا اللہ میاں نے میرا نام لیا' حضور ﷺ نے فرمایا' ہاں اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لیا واقعی اس وقت جو حالت بھی ان کی ہوئی ہو کم ہے سوچئے تو سہی کہ جس وقت حضور ﷺ نے یہ پیغام ان کو سنایا ہوگا۔ اگر ان کو شادی مرگ ہو جاتی تو بجا تھا پھر جب حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا نعم اللہ سماک یعنی ہاں اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لے کر فرمایا بس یہ سن کر وہ پھوٹ کر رو پڑے اس حالت کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے رہا یہ کہ پھر رونا کس لئے تھا تو حضرت نے فرمایا یہ رونا شادی کا تھا نہ رنج کا تھا بلکہ گرمی عشق کا تھا اس کی تحقیق مشکل ہے بعضے سمجھتے ہیں کہ خوشی کا رونا تھا مگر یہ بات نہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تحقیق ہے کہ یہ رونا محبت کے جوش کا تھا کہ ان کو یہ خیال ہوا کہ اے اللہ! میں اس قابل کہاں تھا کہ آپ میرا نام لیں۔ اس خیال سے محبت کا جوش اٹھا اور گریہ طاری ہوا۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

غرض اس وقت اس لفظ او انثی کی اس لئے قدر نہیں محسوس ہوتی کہ تمام عمر سے ہمیں قرآن میں یہ لفظ موجود ملا ہے اس کی قدر ان سے پوچھی جائے جن کی حسرت وتمنا کے بعد یہ لفظ نازل ہوا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عاشق کو محبوب کے دربار کے قریب تک پہنچنے کا موقع تو ملتا ہے مگر محبوب کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا دوسروں سے ہی بات چیت کرتا رہتا ہے اور یہ اس حسرت میں گھلا جاتا ہے کہ افسوس میرا نام بھی تو کبھی اس کی زبان پر آتا اس نے کسی خاص مقرب بارگاہ سے اپنی حسرت کو ظاہر کیا اس نے محبوب کے کان تک بات پہنچادی دوسرے وقت محبوب نے مجلس میں کوئی چیز مثلاً پان تقسیم کئے اور خادم سے کہا کہ سب صاحبوں کو پان دے دو اور فلاں صاحب کو ضرور دینا عاشق کا نام لے کر کہا تو آپ اندازہ کیجئے

کہ اس وقت اس عاشق کی کیا حالت ہوگی یقیناً اس کو وجد آ جاوے گا اور ناچتا پھرے گا مگر دوسرے حضار مجلس کے نزدیک یہ بات بھی کچھ نہ ہوگی وجہ یہ ہے کہ اس کو بڑی تمنا کے بعد یہ دولت نصیب ہوئی ہے اور دوسروں کو بلاتمنا کے نصیب تھی۔

خواتین اور قرآن حکیم

صاحبو! ہم لوگوں کو قرآن پورا مکمل جمع شدہ مل گیا ہے۔ ہم اس قسم کی آیتیں ہر دور میں پڑھتے ہیں اور کبھی اس طرف خیال بھی نہیں جاتا کہ ان میں کیا دولت بھری ہوئی ہے اس کو حضرت ام سلمہؓ سے یا اس وقت کی دوسری بیبیوں سے پوچھنا چاہیے کہ ان آیتوں کو سن کر ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اے بیبیو! کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو خاص طور سے یاد فرمایا اور یاد بھی کس طرح فرمایا کہ مردوں کے برابر بٹھادیا کیونکہ اس آیت میں جن باتوں کا وعدہ کیا ہے ان میں مردوں اور عورتوں میں کچھ فرق نہیں کیا تو یہ کہنا صحیح ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر بٹھادیا۔ گو بائیں طرف بٹھایا ہے کیونکہ آیت میں پہلے لفظ من ذکر ہے اس کے بعد او انثی ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ قرآن عربی زبان ہے اور عربی زبان کا خط دائیں سے بائیں طرف کو ہوتا ہے تو دائیں طرف والے کو اول اور بائیں طرف والے کو دوم کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کی تحریر انگریزی نہیں ہے کہ بائیں طرف سے دائیں طرف کو ہو اور بائیں طرف والے کو اول اور دائیں طرف والے کو دوم کہہ سکیں۔ یہ اس واسطے کہہ دیا کہ آج کل انگریزیت کا غلبہ ہے کوئی ذہین بی بی یہ استدلال نہ کر بیٹھے کہ بائیں طرف والا اول اور دائیں طرف والا دوم ہوتا ہے خیر یہ ایک لطیفہ سا ہے مگر یہ بات شریعت میں ثابت ہے کہ عورت کسی قدر مرد سے درجہ میں گھٹی ہوئی ہے (بدلیل وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ و مثلها من الايات جامع) اور گو اس آیت میں کسی بات میں مرد عورت میں فرق نہیں کیا گیا لیکن چونکہ ترتیب عبارت میں عورتیں مؤخر ہیں مردوں سے اس واسطے میں نے یہ کہا کہ ان کو بائیں طرف بٹھایا یوں سمجھ لو کہ عورتیں جسم میں بائیں آنکھ ہیں اور مرد دائیں آنکھ ہیں اور بائیں آنکھ کسی بات میں داہنی سے کم نہیں نہ ضروری ہونے میں نہ کام دینے میں باقی یہ بات ضروری ہے کہ شریعت نے عورتوں کو مردوں کے ساتھ من کل الوجوہ مساوات نہیں دی جیسا کہ اس زمانہ کے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کا خیال ہے۔

مسئلہ مساوات مرد وزن

وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ناانصافی ہے کہ ایک صنف کو دوسری صنف سے گھٹادیا جائے۔ بیبیو؟ تمہارا بائیں طرف رہنا یہ بہتر ہے ہر چیز اپنے موقع پر اچھی ہوتی ہے سر کی چیز سر ہی پر اچھی ہوتی ہے اور پاؤں کی چیز پاؤں میں اور وجہ اس میں سلامتی ہونے کی یہ ہے کہ عورت میں عقل کم ہوتی ہے اور جس میں عقل کم ہو اس سے ہر کام میں غلطی کرنیکا احتمال ہے لہٰذا اس کے واسطے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ زیادہ عقل والے کا تابع ہو اسی واسطے حق تعالیٰ نے مردوں کو ان پر حاکم بنایا چنانچہ فرماتے ہیں۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ تا کہ ان کے کام سب ان کی نگرانی میں ہوں اور غلطی سے حفاظت رہے اس کا نام سختی نہیں بلکہ یہ تو عین عدل و حکمت و شفقت ہے دیکھو بچے ناقص العقل ہوتے ہیں اب اگر ان کو خودسر بنادیا جاوے

اور وہ کسی کے تابع ہو کر نہ رہیں تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ پس یہ حق تعالیٰ کی نہایت رحمت ہے کہ عورتوں کو خودسر نہیں بنایا ورنہ ان کا کوئی کام بھی درست نہ ہوتا دین اور دنیا سب کاموں میں ان سے غلطیاں ہوا کرتیں خودسری میں بڑی مصیبت ہے حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ ۔ یعنی خوب سمجھ لو اے مسلمانو! کہ تمہارے پاس اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں ۔ اگر بہت سی باتوں میں یہ تمہارا کہنا مانتے تو تم بڑی مصیبت میں پڑ جاتے مطلب یہ ہے کہ تم کو رسول ﷺ کا تابع ہو کر رہنا چاہیے نہ یہ کہ رسول ﷺ تمہارے تابع ہوں اگر ایسا ہوتا کہ رسول ﷺ تمہارے تابع ہوتے تو تم مصیبت میں پڑ جاتے معلوم ہوا کہ عافیت اور سلامتی اسی میں ہے کہ چھوٹا بڑے کا اور ناقص العقل کامل کا تابع ہو کر رہے غور کرنے کی بات ہے کہ آیۃ میں یہ نہیں فرمایا اگر حضور ﷺ تمہارے تابع ہو کر رہیں تو حضور ﷺ کو تکلیف پہنچے گی بلکہ یہ فرمایا کہ خود تم مصیبت میں پڑ جاتے معلوم ہوا کہ چھوٹے کو بڑے کا تابع ہو کر رہنے میں خود چھوٹے کا نفع ہے اسی طرح اگر تم مردوں کے تابع رہو تو یہ تمہارے ہی واسطے سلامتی اور عافیت ہے ۔ غرض اس کو بڑی رحمت سمجھو کہ حق تعالیٰ نے تم کو خودسر نہیں بنایا ورنہ تمہارے لئے بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اول تو عورتوں میں سمجھ کم ہوتی ہے ۔ دوسرے ان میں ضد کا مادہ بھی ہے کہ جس کام پر اڑ جائیں گی اس کو کر کے ہی چھوڑیں گی تو ان کو دو وجہ سے تکلیف پہنچتی ہے ایک تو عقل کم ہونے سے کہ جو کام کرتیں بے سوچے سمجھے اور بلا غور و فکر کے کرتیں پھر ضد کا مادہ ان میں اس قدر ہے کہ جو چڑھ گئی سو چڑھ گئی گو معلوم بھی ہو جاوے کہ یہ کام مضر ہے مگر اس کو چھوڑ نہیں سکتیں (چنانچہ دیکھا ہوگا کہ ذرا ذرا سی بات پر عورتیں کنویں میں کود پڑتی ہیں ۔ اس حماقت کا منشاء کم عقلی اور ضد ہی تو ہے) پس عورتوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو تابع بنایا جاوے ان کے اوپر کوئی ایسا حاکم مسلط رہے جو ان کو ہر وقت سنبھالتا رہے ۔ جیسے پیر مرید کی اصلاح کیا کرتا ہے مگر ان کے لئے بیعت کا پیر کافی نہیں کیونکہ وہ ہر وقت ان کے پاس کیسے رہ سکتا ہے ۔ ان کے لئے بیت کا پیر چاہیے یعنی گھر کا پیر جو گھر میں ہر وقت موجود رہے وہ کون ہے؟ وہی گھر والا یعنی خاوند ۔ یہ پیر اور قسم کے پیروں سے بہتر اور افضل اور ان کے لئے انفع ہے اور اسی کا رتبہ سب سے زیادہ ہے اور بعض عورتوں کے لئے بجائے بیعت کا بیت کا پیر بہت نافع ہے یعنی جو عورتیں مہذب اور شائستہ سمجھدار ہیں ان کے لئے تو بیت کا پیر کافی ہے یعنی خاوند اور جو عورتیں غیر مہذب اور کم سمجھ اور بدتمیز ہیں ان کے واسطے بیت کا پیر ہونا چاہیے جو آلہ ضرب ہے ۔ رتبہ کے لفظ پر ایک کام کی بات یاد آ گئی عورتوں میں مشہور یہ ہے کہ پیر کا رتبہ خاوند اور باپ سب سے زیادہ ہے یہ محض غلط ہے اس میں بہت سی غلطیاں ہیں ۔

درجات مرد و زن

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے جو عورتوں کو محکوم اور خاوند کو حاکم بنایا ہے اس کو سختی اور ظلم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ عورتوں کے حق میں یہ عین رحمت و حکمت ہے کیونکہ تابع ہونے میں بڑی راحت ہے اور مساوات میں کبھی نظام اور تمدن قائم نہیں ہو سکتا ہمیشہ جھگڑا اور فساد ہی ہوتا ہے خوب یاد رکھو کہ دنیا اور دین دونوں کا نظام اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو ۔ لوگ آج کل اتفاق و اتحاد کیلئے بڑی لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں اور تجویزیں پاس کرتے ہیں مگر جڑ کو

نہیں دیکھتے یاد رکھو اتفاق واتحاد کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو بڑا مان لیا جاوے اور سب اس کے تابع ہوں جس جماعت میں متبوع اور تابع کوئی نہ ہو سب مساوات ہی کے داعی ہوں ان میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو مساوات کا خیال تو عورتوں کو اپنے دل سے نکال دینا چاہیے کیونکہ یہی فساد کی جڑ ہے۔ اب دو ہی صورتیں رہیں یا تو عورتیں متبوع ہوں یا مرد تابع یا مرد متبوع اور عورتیں تابع اس کا فیصلہ انصاف کے ساتھ خود عورتوں کو ہی اپنے دل سے کر لینا چاہیے کہ متبوع بننے کے قابل وہ ہیں یا مرد ہیں سلیم الفطرت عورتیں کبھی اس کا انکار نہیں کر سکتیں کہ عقل اور طاقت میں مرد ہی بڑھے ہوئے ہیں وہی عورتوں کی حفاظت وحمایت کر سکتے ہیں۔ عورتیں مردوں کی ہرگز حفاظت نہیں کر سکتیں۔ پس مردوں کو ہی متبوع اور عورتوں کو تابع ونا چاہیے یہی شریعت کا فیصلہ ہے اور اسی لئے اس جگہ بھی مردوں کا ذکر عورتوں سے مقدم کیا گیا چنانچہ فرماتے ہیں من ذکر او انثی اور یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ ہی عورتوں کا ذکر فرمایا آگے پیچھے کا فرق تو بہت تھوڑا فرق ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عورتوں کی قدر بہت بڑھائی ہے کہ سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مردوں کی برابر ہی ہیں گو میں نے دوسری آیتوں کی وجہ سے اصل مسئلہ کی تحقیق بیان کر دی کہ فی الجملہ دونوں کے رتبہ میں فرق ہے ورنہ اس آیت سے تو مساوات کا بھی شبہ ہو سکتا ہے گو تقدیم وتاخیر پر نظر کر کے مساوات کے استدلال کو رد کا جا سکتا ہے بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں مرد وعورت دونوں اس قانون میں برابر ہیں کہ ہم کسی کا عمل ضائع نہ کریں پھر آگے بعضکم من بعض میں اس کی اور بھی تائید فرما دی یعنی تم سب ایک دوسرے کے جزو ہو یہ جملہ بمنزلہ تعلیل کے ہے ماقبل کے لئے کہ مرد وعورت اس قانون میں برابر کیوں نہ ہوں یہ تو آپس میں سب ایک ہی ہیں ایک ہی نوع کے دونوں افراد ہیں خلقت میں بھی برابر کیونکہ مردوں کی خلقت عورتوں پر موقوف ہے اور عورتوں کی خلقت مردوں پر وہ ان کے لئے سبب ہیں اور یہ ان کے لئے۔

مساوات حقوق مرد وزن

اس مقام پر میں ایک علمی اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قرآن مجید میں بعض آیتیں اس قسم کی بھی ہیں جن سے سرسری نظر میں مردوں اور عورتوں کی مساوات ثابت ہوتی ہے مثلاً وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ جس کا حاصل یہ ہے کہ اوپر محرکات کا بیان تھا اس کے بعد بیان فرمایا کہ ان کے سوا جن عورتوں سے چار نکاح کر سکتے ہو ہاں مہر دینا ہوگا اور جن کو آزاد عورتیں میسر نہ ہوں بوجہ ان کے اخراجات زیادہ ہونے کے تو ان کو چاہئے کہ مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ اور تمہارے ایمان کا پورا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہے (لیکن ظاہری ایمان کے اعتبار سے) تم سب ایک دوسرے سے بنے ہو غرض یہاں بھی وہی لفظ ہے بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ یعنی تم سب ایک ہی ہو مگر یہ آیت اپنے سیاق سے مساوات میں بظاہر اس سے زیادہ صاف ہے پہلی آیت میں تو (جس کا بیان ہو رہا ہے یعنی فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ الخ) بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ کے ساتھ اس کا بھی بیان ہے کہ مساوات اس بات میں ہے کہ کسی کا

عمل ضائع نہ کیا جاوے گا چاہے مرد ہو یا عورت عدم اضاعت عمل میں سب مساوی ہیں مگر اس آیت میں بظاہر کوئی بھی قید نہیں کہ کس بات میں مساوات ہے بس مطلقاً فرمادیا بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ پھر مساوات بھی ایسی عام کہ لونڈی باندی کو آزاد مسلمانوں کے ساتھ غرض اس آیت سے بھی بظاہر عدم تفاوت ثابت ہوتا ہے گو جواز نکاح میں بعض ائمہ کے قول پر من کل الوجوہ مساواۃ نہ ہو کیونکہ آیت میں یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس کو آزاد عورتوں کی مقدرت نہ ہو وہ باندیوں سے نکاح کرے معلوم ہوا کہ آزاد عورت اور باندی برابر نہیں سو یہ تفاوت ایک امر خاص میں ہے یہ اس مساوات میں حارج نہیں جس کو میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ خاص خاص صفات میں تو مردوں میں بھی تفاوت ہوسکتا ہے مثلاً بڑے چھوٹے میں یا امیر غریب میں باپ بیٹے میں عالم جاہل میں وغیرہ وغیرہ سو اس قسم کا تفاوت قابل اعتبار نہیں آخر بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ کے کچھ تو معنی ہیں ایک آیت اور یاد آئی وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی عورتوں کے حقوق بھی ویسے ہی ہیں جیسے ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں یہ وہ آیات جس سے عورتوں کی مساوات مردوں سے مفہوم ہوسکتی ہے مگر اس کے ساتھ دوسری آیتوں کو بھی ملانا چاہئے جن میں مردوں کی فوقیت عورتوں پر ثابت ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ نیز ارشاد ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اور یہ آیات مردوں کی فوقیت اور فضیلت ثابت کرنے میں بالکل صریح ہیں اور جن آیات سے مساوات ثابت ہوتی ہے وہ اس مدلول میں صریح نہیں بلکہ قرائن مقامیہ سے خاص امور میں مساوات بتلاتی ہیں چنانچہ اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ میں عدم اضاعت عمل میں مساوات بتلائی گئی اور وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ میں انسانیت اور آدمیت یا ایمان میں مساوات بتلائی گئی ہے کہ باندی کو حقیر نہ سمجھو تم سب آدم وحوا کی اولاد ہو یا سب اہل ایمان ہو اور وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق بھی لزوم ووجوب میں مردوں کے حقوق کے برابر ہیں گو باعتبار نوعیت کے دونوں کے حقوق میں تفاوت ہو ورنہ مساوات کلی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورتوں پر بھی مردوں کے لئے مہر اور نان نفقہ لازم ہو حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں باقی اس سے انکار نہیں کہ بعض حقوق اور بعض امور میں یعنی حقوق مشترکہ میں عورتیں مردوں کے برابر ہیں وہ ایسی گھٹیا نہیں ہیں جیسا مردوں نے انہیں سمجھ رکھا ہے مگر افسوس آجکل عام طور سے یہ شکایت سنتے ہیں کہ غریب عورتیں

کہتی ہیں کہ مردوں کے تو کیا کچھ حقوق ہمارے اوپر ہیں اور ہم بالکل جانوروں کی طرح ان کے ہاتھ میں ہیں کہ وہ ماریں پیٹیں یا ذبح کریں ہم کچھ نہیں بول سکتیں پس سن لو کہ اللہ سبحانہ کیا فرمارہے ہیں اور مرد بھی سن لیں ذرا کان کھول لیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جیسے ان کے اوپر مردوں کے حقوق ہیں ویسے ہی ان کے بھی مردوں پر ہیں پھر یہ کہنے کی گنجائش کہاں رہی کہ ہم جانوروں کی طرح ہیں اس شکایت کی اصل وجہ یہ ہے کہ مردوں نے ان کے کان میں اتنا ہی ڈالا ہے کہ ہمارے حقوق تمہارے اوپر اس قدر ہیں اور یہ بات بالکل ان کے کان تک نہیں پہنچائی کہ تمہارے بھی کچھ حقوق ہمارے اوپر ہیں اور عام مرد تو ایسی بات ان کے کان تک کیوں ہی پہنچنے دیتے کیونکہ اپنے خلاف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

ترجمہ: اے ایمان والوخود صبر کرواور مقابلہ میں صبر کرواور مقابلہ کے لئے مستعد رہواور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہوتا کہ تم پورے کامیاب ہوجاؤ

تفسیری نکات

فلاح آخرت کے لئے ایمان شرط ہے

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا (اے ایمان والو!) سے ایمان کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن اس کو بصورت امر آمنوا (تم ایمان والو) کہہ کر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب اہل ایمان ہی ہیں ان کو امنوا (ایمان لاؤ) کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ احکام کی دو قسمیں ہیں ایک وہ احکام جو ان لوگوں سے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان قبول کر لیا ہے پہلی قسم میں اول ایمان کا حکم کیا جائے گا اور دوسری قسم میں ایمان کا حکم صیغہ امر سے نہ کیا جائے گا جیسے طلب علم کے متعلق ایک تو غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے اور ایک طالب علم کو تو جس وقت غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے گا اس وقت اسے کہنے کی ضرورت ہے کہ علم طلب کرو جس وقت طالب علم مخاطب ہو اس وقت اس شرط کے اظہار کی ضرورت نہیں قرآن میں بھی اس طرح دونوں قسم کے خطاب ہیں اور یہ مثالیں میں نے اس لئے دے دیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے

مضامین میں کوئی نئے نہیں ہیں اگر غور کیا جائے تو جس طرح ہم لوگ محاورات میں گفتگو کرتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی کلام کیا جاتا ہے ہاں طرز تعلیم اپنا عجیب ہے کہ دوسرے کسی سے ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہوتی ہے بہر حال چونکہ اس صورت میں زیادہ احکام اور اکثر خطابات مومنین کو ہیں اس لئے امنوا (ایمان لاؤ بصیغہ امر نہیں لایا مگر یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہی سے ایمان کا شرط ہونا معلوم ہو گیا جیسا کہ اوپر چند مثالوں سے میں نے اس کو سمجھا دیا ہے مجھ کو اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آجکل بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ فلاح کے لئے ایمان کو بھی شرط نہیں سمجھتے اس وقت ہم کو دنیوی فلاح سے تو بحث نہیں اس کے متعلق تو ہماری حالت یہ ہے

ماقصہ سکندرو دارانہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر وفا مپرس

ہم نے دارا اور سکندر کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے تو محبت اور وفا کے علاوہ کچھ نہ پوچھو ہم دنیوی ترقی سے منع بھی نہیں کرتے مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو اس کے احکام بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں تو ہم اس سے بحث نہیں کرتے کیونکہ دنیوی فلاح و کامیابی کے لئے بھی ایمان شرط ہے یا نہیں بلکہ اس وقت فلاح آخرت سے بحث ہے افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان فلاح آخرت اور وصول الی اللہ کے لئے بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ بہت لوگ ایسے بھنگڑوں کے پیچھے

پھرتے ہیں جن کو نہ ایمان سے ربط ہے نہ نماز روزہ سے اور کہتے ہیں کہ درویشی کا راستہ ہی دوسرا ہے چنانچہ اگر کوئی ہندو جوگی آ جائے اور دو چار شعبدے ظاہر کر دے اور کسی پر اس کی توجہ سے کچھ اثر بھی ہونے لگے تو اس کو ولی سمجھنے لگتے ہیں اور بہت سے لوگ معتقد ہو جاتے ہیں غرض یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) سے یہ مسئلہ مستنبط ہو گیا کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان یقیناً شرط ہے اور اس سے قرآن کی جامعیت معلوم ہوتی ہے کہ ذرا سے لفظ سے کتنا بڑا مسئلہ ثابت ہو گیا گو یہاں اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا نہ صیغہ امر سے اس کو تعبیر کیا گیا مگر طرز خطاب سے یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے کہ فلاح کے لئے سب سے اول ایمان شرط ہے۔ پس اول درجہ تو ایمان کا ہے۔

دنیا کی فلاح بھی اعمال صالحہ سے ہوتی ہے

دوسرا درجہ اس کے بعد مراتب متوسط کا ہے جن کو اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (صبر کرو خود تکالیف اور کفار کے مقابلہ پر صبر کرو اور مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو) میں بیان کیا گیا ہے یہ چار چیزیں ہیں اور تیسرا درجہ نتیجہ کا ہے جس کا بیان لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ فلاح پاؤ) میں ہے جو شمار میں چھٹی چیز ہے گو ترتیب کا مقتضا یہ تھا کہ میں اول مراتب متوسطہ کو بیان کرتا لیکن میں ضرورت کی وجہ سے نتیجہ کو مقدم کرتا ہوں کیونکہ آجکل ترقی و فلاح پر بہت گفتگو ہو رہی ہے اور ہر شخص اسکا طالب ہے تو سنئے حق تعالیٰ ایمان اور چند احکام کا بیان فرما کر بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کہ امید ہے تم کو فلاح حاصل ہو اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اخیر چیز اور مقصود فلاح ہے دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اسکا وعدہ ان اعمال مذکورہ پر کیا گیا ہے اور یہاں فلاح مطلق ہے جس کو فلاح دین وغیرہ کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا تو اس درجہ میں عموم الفاظ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فلاح خواہ دین کی ہو یا دنیا کی ان احکام پر ہی عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعمال شرعیہ سے مقصود تو محض فلاح دین ہے مگر ترتب فلاح دنیا کا بھی ہوتا ہے پس فلاح دین تو اس لفظ کا مدلول مطابقی اور فلاح دنیا مدلول التزامی ہے یعنی اعمال شرعیہ کے لئے فلاح دنیا لازم ہے گو مقصود نہ ہو۔ اب سنئے کہ اس زمانہ میں ہر شخص فلاح کا طالب ہے فلاح دنیوی کے طالب تو بہت کثرت سے ہیں حتیٰ کہ اس کے لئے دین کو بھی برباد کر دیا جاتا ہے اور اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک دین کو برباد نہ کریں اس وقت تک فلاح دنیوی حاصل نہیں ہو سکتی (یہ بالکل غلط ہے) آجکل زیادہ تر فلاح دنیا کے طالب ہیں تو میں نے بتلا دیا کہ فلاح دنیا بھی دین ہی کے اتباع سے مل سکتی ہے اس کے بغیر مسلمان کو تو مل نہیں سکتی۔ یہ مسئلہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (تاکہ تم کامیاب ہو) سے مستنبط ہے۔

لَعَلَّ کا مفہوم

اور یہاں لعل شک کے لئے نہیں ہے بلکہ ترجی یعنی امید دلانے کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال بجا لا کر فلاح کے امیدوار ہو لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں کوئی وعدہ تو ہے ہی نہیں تو شاید ایسا نہ بھی ہو کیونکہ یہ شاہانہ کلام ہے اور بادشاہ کسی کو امید دلا کر نا امید نہیں کیا کرتے۔ شاہانہ کلام میں امیدوار باشد (امیدوار رہو) ہزار پختہ وعدوں سے زیادہ ہوتا

ہے پھر رفع شک کے لئے بعض مقامات پر حق تعالیٰ نے پختہ وعدہ بھی فرمادیا چنانچہ ارشاد ہے حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (ہم پر مومنین کی مدد کرنا حق ہے) رہا یہ کہ پھر سب جگہ حَقًّا عَلَيْنَا (ہم پر حق ہے) ہی کیوں نہ فرمایا لیکن لعلکم کس لئے فرمایا تو اس میں ایک راز ہے جو اہل سنت نے سمجھا ہے وہ یہ کہ پختہ وعدہ کے بعد بعض جگہ لعل فرما کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ہم وعدہ کر کے مجبور نہیں ہو گئے بلکہ اب بھی جزا کا دینا نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے تمہاری مجال نہیں کہ ہم پر تقاضا کرنے لگو اور ہم کو ایفاء وعدہ پر مجبور سمجھ کر کچھ سے کچھ ہانکنے اور بکنے لگو ہماری شان یہ ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (جو وہ کرتا ہے اس سے اس کو نہ پوچھا جائے گا اور نہ ان سے دریافت کیا جائے گا) یہ اور بات ہے کہ ہم وعدہ کر کے ایفا ضرور کریں گے مگر اس پر مجبور بھی نہیں ہیں بلکہ وعدہ کے بعد بھی ویسے ہی مختار ہیں جیسے قبل وعدہ تھے اس لئے تم تو لعلکم ہی کے مفہوم پر نظر رکھو لان پر ناز نہ کرو گو ہمارے یہاں لعل بھی لان ہی کے حکم میں ہے اس نکتہ کو اہل سنت ہی نے سمجھا ہے۔

اعمال کی دو قسمیں

اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کا وقت آ گیا ایک وہ جن کا وقت نہیں آیا سو یہاں ایک حکم قسم اول کے متعلق ہے اور ایک حکم قسم دوم کے متعلق ہے۔ قسم اول کے متعلق تو اصبروا ہے یعنی جس عمل کا وقت آ جاوے اس وقت صبر سے کام لو یعنی پابندی اور استقلال سے رہو تو حق تعالیٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دینداری کے یہی معنی ہیں کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جاوے۔ آج کل بعض لوگ ولولے اور جوش میں بہت سا کام شروع کرنے میں ساتھ دیتے ہیں پھر نباہ نہیں ہوتا تو یہ دیندار کامل نہیں ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی بتلایا ہے جس پر نباہ ہو سکے واجبات و فرائض وسنن موکدہ پر نباہ کچھ دشوار نہیں اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض سے نباہ نہیں ہوتا تو انکو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہیے جس پر نباہ اور دوام ہو سکے تو اصبروا کا حکم ان اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آ گیا ہے پھر ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے دوسرے وہ جن کا تعلق دوسروں سے بھی ہے ان کے متعلق صابروا فرمایا ہے دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو بعض لوگ اپنے ذاتی کام تو کر لیتے ہیں مگر دوسروں کے متعلق باہمت نہیں ہوتے اور اگر کچھ ہمت بھی کی تو وہ اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مزاحم نہ ہو اور اگر کوئی مزاحم ہوا تو پھر مستقل نہیں رہتے جیسے نکاح وغیرہ کی رسموں میں اکثر لوگوں کی یہی حالت کہ بیٹے والا بیٹی والوں کی مزاحمت کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو نچاتا ہے پھر یہ دین پر مستقل نہیں رہ سکتے اس کے متعلق صابروا میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں بھی ثابت قدم رہو اسی طرح اگر کبھی اعداء اللہ دین میں مزاحمت کرنے لگیں تو ان کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کا صابروا میں حکم ہے۔ غرض ایک تو وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا ان پر مداومت و استقلال کرنے کا حکم تو اصبروا میں ہے اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صابروا میں ہے۔ یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آ گیا ہے اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا ان کے متعلق حکم رابطوا ہے جس کا حاصل ہے کہ ان کاموں کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہیے اور یہ میں نے اس

سے سمجھا کہ لغت میں رباط کے معنی اعداء کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑے باندھنا ہے یعنی مورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظ ماتقدم کے لئے اور پہلے سے مقابلہ کو تیار و مستعد رہنے کے واسطے کی جاتی ہے۔ عام لغت کے موافق ایک تفسیر تو رباط کی یہ ہے دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی انتظار الصلوۃ بعد الصلوۃ یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے لئے منتظر رہنا۔ حضور علیہ ﷺ نے اس کے متعلق بھی فرمایا ہے فذالکم الرباط فذالکم الرباط یہی رباط ہے یہی رباط ہے اور اس تفسیر میں اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں بلکہ اس میں حضور علیہ ﷺ نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ رباط اعداء ظاہری کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ جیسے اعداء ظاہری کے مقابلہ میں رباط ہوتا ہے اسی طرح کبھی اعدا باطنی یعنی نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے وہ مجاہدہ ظاہری کا رباط ہے اور یہ معاہدہ باطنی کا رباط ہے۔ اسی کو ایک حدیث میں حضور علیہ ﷺ نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

المجاھد من جاھد نفسه والمھاجر من ھجر الخطایا والذنوب (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور مہاجر وہ جو گناہوں اور خطاؤں سے بچتا ہے) یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کی ایک قسم مجاہدہ نفس بھی ہے اور اس کیلئے بھی ایک رباط ہے جیسے اعداء ظاہر کے مقابلہ کی پہلے سے تیاری کی جاتی ہے اسی طرح نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی مورچہ بندی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بھی بڑے سخت دشمن ہیں جو بدوں مورچہ بندی کے قابو میں نہیں آتے اسی کو فرماتے ہیں۔

اے شہاں کشتیم ما خصمے بروں ماند خصمے زوبتر دراندروں

(اے بزرگو ہم نے ظاہری دشمن کو تو ہلاک کر دیا مگر ایک دشمن جو اس سے بھی بدتر اور زیادہ ضرر رساں ہے باطن میں رہ گیا جس کو نفس کہتے ہیں) اور فرماتے ہیں

کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست شیر باطن سخرہ خرگوش نیست

(اس باطنی دشمن کو ہلاک کرنا محض عقل و ہوشیاری کا کام نہیں ہے کیونکہ شیر باطن خرگوش کے قابو کا نہیں ہے)

یعنی اس کا زیر کرنا عقل و ہوش کا کام نہیں کیونکہ شیر خرگوش کے پھندے میں نہیں آیا کرتا بلکہ ان کو زیر کرنے کے لئے شارع علیہ السلام کی تعلیم کا اتباع ضروری ہے چنانچہ اس کا ایک شعبہ یہ رباط ہے یعنی نماز کا انتظار کرنا بعد ایک نماز کے یہ نفس پر سب سے زیادہ گراں ہے کیونکہ اس میں کوئی حظ نہیں ہے۔ بس نماز پڑھ کر خالی بیٹھتے ہیں اور دوسری نماز کا انتظار کررہے ہیں۔ آج کل بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس خالی بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ میں کہتا ہوں اس میں دو فائدے ہیں ایک تو نفس کو طاعات پر جمانا دوسرے وہ فائدہ ہے جس کو حضور علیہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔

ان العبد فی الصلوۃ ما انتظر الصلوۃ کہ بندہ جب تک نماز کے انتظار میں ہے اس وقت تک وہ نماز میں رہتا ہے یعنی اس انتظار میں وہی ثواب ملتا ہے جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے۔ بہرحال اصبروا و صابروا کا تعلق تو ان اعمال سے ہے جن کا وقت آ گیا اور رابطوا کا تعلق ان اعمال سے جن کا وقت نہیں آیا اب سمجھو کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں

ایک ظاہر۔ایک باطن اعمال ظاہر کی یہ تقسیم تھی جو میں نے اب تک بیان کی کہ ان میں ایک قسم تو وہ ہے جس کا وقت آ گیا اور پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک اپنے متعلق ایک دوسرے کے متعلق اور دوسری قسم وہ ہے جس کا وقت نہیں آیا ان سب اقسام کے احکام تو اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا میں مذکور ہوئے اور اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان احکام کا تعلق تمام شریعت سے ہے کیونکہ کوئی عمل اس تقسیم سے باہر نہیں ہے۔نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مصالح دنیویہ سے ان احکام کو پورا تعلق ہے کیونکہ دنیا کے کام بھی دو ہی قسم کے ہیں ایک وہ جن کا وقت آ گیا ان میں استقلال وثبات قدم کی ضرورت ہے دوسرے وہ جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیاری ومستعدی کی ضرورت ہے۔اب ایک قسم رہ گئی یعنی اعمال باطنہ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰهَ کہ خدا سے ڈرتے رہو یہ تمام اعمال باطنہ کی جڑ ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

رَابِطُوْا کا مفہوم

ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں بھی صبر کرو۔دو لفظ اس واسطے اختیار کئے گئے کہ صبر کبھی لازم ہوتا ہے کبھی متعدی یعنی جس حالت پر صبر کیا جاوے کبھی اس کا تعلق صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے جیسے مرض وغیرہ کبھی دوسروں سے تعلق ہوتا ہے جیسے محاربہ وغیرہ تو دونوں حالتوں میں صبر کا امر ہے اس کے بعد ارشاد ہے ورابطوا اصبروا و صابروا اس کی تمہید ہے اور وَاتَّقُوا اللّٰهَ تکمیل ہے اور لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تتمیم ہے اب رابطوا کے معنی سنیے۔بیضاوی نے اس کی تفسیر داوموا اور رابطوا کی ہے یعنی عمل پر مداومت اختیار کرو کیونکہ رابط کے معنی لغت میں باندھنا ہے اور مواظبت ودوام میں بھی نفس کو باندھنا ہے اور اسی واسطے بعض نے اس کی تفسیر مرابطۃ الخیل سے بھی کی ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ حصہ میں محاجہ باللسان کا ذکر ہے اس کے مناسب رباط الخیل ہی ہے تو اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے یہاں صبر ومصابرت ومرابطت کا امر ہے اور تقوی اس کی تکمیل ہے۔صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ماتکرہ یعنی نفس کو ناگوار امور پر جمانا اور مصابرت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ناگوار امور پر نفس کو ثابت قدم رکھنا اور مرابطت کے معنی یہ ہیں کہ صبر ومصابرت پر مواظبت کی جائے۔اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ عمل ان سب میں مشترک ہے مطلب یہ ہوا کہ عمل میں مستعد رہو اور اسی پر برابر لگے رہو اب بعض اعمال تو اپنے کرنے سے ہیں جیسے نماز روزہ زکوٰۃ وغیرہ ان کو دیانات کہا جاتا ہے ان پر جمنا تو صبر ہے اور بعض اعمال میں دوسروں سے واسطہ ہے جیسے نکاح وبیع وجہاد وغیرہ یہ معاملات ہیں ان میں احکام شرعیہ پر جمار ہنا مصابرت ہے۔پھر دیانات میں تو صبر سہل ہے کیونکہ ان میں حظ نفس بھی ہے زکوٰۃ میں حظ یہ ہے کہ دوسروں پر احسان ہے حج میں حظ یہ ہے کہ سیر وتفریح ہوتی ہے (نماز میں حظ یہ ہے کہ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے جو موجب راحت ہے روزہ میں طبیعت ہلکی ہلکی رہتی ہے اس سے بھی راحت ہوتی ہے) مگر معاملات میں صبر دشوار ہے اس لئے وہاں بھی صاف طور سے مصابرت کا امر کیا گیا ہے کہ نفس کو معاملات میں بھی شریعت کے موافق عمل کرنے پر مجبور کرو اور یہ حکم صبر ومصابرت اعمال باطنیہ کو بھی

شامل ہے کیونکہ وہ بھی اعمال کی ایک قسم ہیں عمل کہتے ہیں فعل اختیاری کو اس لئے اعمال باطنیہ بھی عمل میں داخل ہیں چنانچہ ایمان کو نصوص میں عمل کہا گیا ہے پھر جس طرح نماز روزہ کا شریعت میں امر ہے اسی طرح محبت وشکر وغیرہ کا امر ہے اور جیسے چوری زنا وغیرہ سے منع کیا گیا ہے اسی طرح ریا وحسد وکبر سے ممانعت ہے۔ پھر جس طرح اعمال ظاہرہ میں بعض اعمال اپنے متعلق ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے اسی طرح اعمال باطنہ بھی دو قسم کے ہیں بعض اپنے کرنے کے ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے پس وہاں بھی صبر ومصابرت دونوں کا امر ہے بلکہ اعمال باطن میں صبر ومصابرت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ باطن میں بعض دفعہ ایسے مصائب ومصاعب پیش آتے ہیں جن کا تحمل اہل ظاہر ہرگز نہیں کر سکتے۔

تقویٰ شرعی

آگے ارشاد ہے واتقوا اللہ یعنی خدا سے ڈرو یہ تکمیل ہے مضمون سابق کی کیونکہ اگر خدا کا خوف نہ ہو تو نہ مرابطہ ہو گا نہ مشارطہ نہ معاتبہ نہ محاسبہ۔ ان سب کی بنیاد خدا کا خوف ہی ہے پس واتقوا اللہ اس لئے بڑھایا کہ مدار ان سب اعمال کا اسی پر ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب تقوی سب اعمال کی بنیاد ہے تو پھر وَاتَّقُوا اللّٰهَ کو مقدم کرنا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تقوی شرعی مراد ہے تقوی شرعی وہ ہے کہ خوف خدا کے ساتھ عمل بھی ہو اگر عمل نہ ہو محض خوف ہی ہو وہ تقوی شرعی نہ ہوگا اور قاعدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ایسی عظمت ان اعمال ہی سے قلب میں پیدا ہوتی ہے پس یہ تقوی اعمال کا اثر ہوا اس لئے وَاتَّقُوا اللّٰهَ کو مؤخر کیا گیا حاصل یہ ہوا کہ ان اعمال سے جو عظمت حق تمہارے قلب میں پیدا ہوگی اس کا استحضار رکھو تو یہ اعمال سہل ہو جائیں گے پس تقوی ان اعمال کا نتیجہ بھی ہے اور ان کو سہل کرنے والا بھی ہے اب میں یہاں بمناسبت مقام تقوی کے متعلق ایک اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں ترجمہ دیکھنے والے ذرا اس کا حل کریں وہ یہ کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں تو تحصیل حاصل ہے جو لوگ پہلے سے متقی ہیں ان کو تو ہدایت حاصل ہے پھر ان کے واسطے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں تقوی لغوی مراد ہے یعنی قرآن ان لوگوں کے واسطے ہدایت ہے جن کے دل میں خدا کا خوف ہو دوسرا جواب یہ ہے کہ مان لیا کہ تقوی شرعی ہی مراد ہے اور یہی مدار تھا اشکال کا کہ تقوی شرعی کے بعد ہدایت کے کیا معنی ہدایت تو ایسے شخص کو پہلے ہی سے حاصل ہے پس اس معنی کو تسلیم کر کے دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے ایک بار ہردوئی میں ایک مولوی صاحب کو چند جنٹلمینوں نے اس اشکال سے پریشان کر رکھا تھا اور وہ اس کو تسلیم کر رہے تھے کہ مراد تقوی شرعی ہی ہے مگر اشکال کو حل نہ کر سکے تھے میں بھی اس جلسہ میں آ گیا اور میں نے اسی کی تائید کی تا کہ مولوی صاحب کی بات نیچی نہ ہو مگر اس اشکال کو سہل عنوان سے حل کر دیا جس سے سامعین کا شبہ زائل ہو گیا وہ عنوان یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ایسا ہے جیسے آپ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ کورس بی اے کا ہے۔ تو آپ بتلائیے کہ اس قول کے کیا معنی ہیں کیا یہ مطلب ہے کہ اس کو وہ پڑھتا ہے جو بی اے کا ہو چکا کہنے لگے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کورس ایسا ہے کہ جو اس کو پڑھ لے گا وہ بی اے ہو جائے گا۔ میں نے کہا پس یہی مطلب اس کا ہے کہ یہ کورس ایسا ہے کہ جو اس کو پڑھے گا بی اے ہو جائے گا میں نے کہا پس یہی مطلب اس کا

ہے کہ یہ قرآن متقین کے واسطے ہدایت ہے یعنی جو اس پر عمل کرے گا وہ متقی بن جائے گا۔ اس تقریر سے وہ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ اس مضمون کی تعبیر کرنا چاہتے تھے مگر قادر نہ تھے میری تعبیر سن کر ان کی خوشی کی حد نہ رہی اور یہ جواب میرا گھڑا ہوا نہیں بلکہ منقول ہے جلالین میں الصائرین الی التقوی سے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے لوگ تقوی کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں مگر لوگ جلالین پڑھتے پڑھاتے تو ہیں سمجھتے نہیں ہیں۔

ترغیب فلاح

اس کے بعد اشاد ہے لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اس میں ترغیب ہے کیونکہ سہولت عمل میں دو ہی چیزوں کو زیادہ دخل ہے ایک ترہیب دوسرے ترغیب کو وَاتَّقُوا اللّٰهَ میں ترہیب تھی۔ اس جملہ میں ترغیب ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال مذکورہ کو سہل فرما دیا ہے اور اس کی اس واسطے ضرورت تھی کہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے دو طرح کا ہے ایک محکومیت کا ایک محبت کا محکومیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ تسہیل اعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے کیونکہ خود محکوم ہونا وجوب امتثال کیلئے کافی ہے مگر محبت کا مقتضا یہ ہے کہ تسہیل کا طریقہ بھی بتلا دیا جائے کیونکہ محبت خاص رعایت کو مقتضی ہوتی ہے خواہ حاکم کی جانب میں محبت ہو خواہ محکوم کی جانب میں اور دونوں طرف ہو تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ پھر اس کی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ ترغیب کے لئے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے کسی وصف کی طرف متوجہ فرماتے مثلاً یوں فرماتے کہ میں تم سے راضی ہو جاؤں گا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم کو ہمارے وصف کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے دوسری صورت اختیار فرمائی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف تو ہم سے غائب ہیں اور اپنے اوصاف کو ہم زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ تمام احکام کو ذکر کے اخیر میں ایک ایسا گر بتلاتے ہیں جو گویا تمام سورت کا موضوع ہے جس کو اس کے سب احکام سے تعلق ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

ترجمہ: اے ایمان والو (تکالیف پر) صبر کرو اور (جب کفار سے مقابلہ ہوا تو) مقابلہ میں صبر کرو اور (احتمال مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (حدود شرعیہ سے باہر نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب ہو جاؤ (آخرت میں تو ضرور ہی اور اکثر اوقات ان اعمال پر محافظت کی بدولت دنیا میں بھی پوری کامیابی ہوتی ہے)

احکام شرعیہ مصالح دنیویہ کو بھی متضمن ہیں

جن باتوں کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کو اس صورت کے احکام سے تو تعلق ہے ہی میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس قدر بھی احکام شرعیہ ہیں سب سے ان کا تعلق ہے اور اس سے آگے میں اور ترقی کرتا ہوں کہ اتفاق سے ہم کو یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ جیسے ان کو احکام شرعیہ سے تعلق ہے اسی طرح تمام دنیوی مصالح معاشیہ سے بھی ان کو تعلق ہے مگر نہ اس وجہ سے کہ یہ شریعت کا موضوع و مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ شریعت تکمیل آخرت کے ساتھ ہماری دنیا کی بھی تکمیل ساتھ ساتھ کرتی ہے۔ اس لئے احکام شرعیہ اس طور سے مقرر کئے گئے ہیں جو تبعاً مصالح دنیویہ کو بھی متضمن

ہیں۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا یعنی اے ایمان والو! صبر کرو اصبروا کا تعلق تو اعمال لازمہ سے ہے جن میں دوسروں سے کچھ تعلق نہیں۔ ان میں حکم ہے صبر کا۔ اور ایک صبر ہے دوسرے مقام پر۔ وہ یہ کہ کسی عمل میں مخالفت کی مزاحمت ہو اس کے متعلق ارشاد ہے وصابروا کہ مقابلہ میں بھی صبر کرو یعنی استقلال کے ساتھ رہو۔ آگے ارشاد ہے ورابطوا اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ سرحد کی حفاظت کرو دوسرے یہ کہ مستعد رہو۔ پہلے معنی خاص عمل کے متعلق ہیں اور دوسرے معنی سب اعمال کو عام ہو سکتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم کو فلاح حاصل ہو جائے۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوا ہو گا کہ اس مقام پر ایک تو صبر کا حکم ہے اور صبر کے دو درجے ہیں اور ایک رباط کا حکم ہے اور ایک تقوے کا تو چار حکم ہوئے۔ ایک پانچویں اور ایک چھٹی چیز اور ہے جن میں سے ایک کا اول میں ذکر ہے اور ایک کا آخر میں۔ اول تو ایمان ہے اور آخر میں فلاح ہے۔ ایک چیز بطور مبداء کے ہے اور ایک صورت نتیجہ میں ہے اور چار حکم درمیان میں ہیں کل چھ ہوئے اور ان کے مراتب میں فرق ایسا ہے جیسے سفر اور مسافت اور منزل میں فرق ہے کہ سفر کی ایک ابتداء ہوتی ہے اور ایک درمیانی مسافت ہوتی ہے جس کے بعد کے لئے کچھ مراتب ہوتے ہیں اور ایک نتیجہ ہوتا ہے یعنی منزل مقصود پر پہنچنا۔

پس یہ کلام ایسا ہے جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ اے مسافر فلاں راستہ جانا اور فلاں مقامات پر ٹھہرنا اور چوروں سے اپنی حفاظت رکھنا تو دہلی پہنچ جائے گا۔ اس کلام سے تین باتیں معلوم ہوں گی۔ ایک یہ کہ دہلی پہنچنے کے لئے سفر کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ وعدہ مسافر ہی سے کیا گیا ہے مگر اس کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ مخاطب خود ہی سفر شروع کر چکا ہے۔ اب اس سے یہ کہنا کہ اے مسافر سفر کرنا تحصیل حاصل ہے اور بلا ضرورت کلام کو طول دینا ہے۔ بس سفر کی ضرورت اس کو مسافر کہہ کر خطاب کرنے ہی سے معلوم ہوگئی۔ یہ مختصر کلام ہے اور دلالت اس کی علی التمام ہے۔ غرض ایک تو سفر کرنا ضروری ہوا اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ منازل پر سے گزرنا اور اپنی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے تیسرا وعدہ ہے کہ اس طرح تم دہلی پہنچ جاؤ گے۔ تو سفر شرط وصول ہے اور درمیانی باتیں احکام وصول ہیں اور تیسری بات نتیجہ ہے۔ ہر مقصود کے لئے ان تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اس کی ایک مثال اور لیجئے مثلاً کوئی کہے کہ اے طالب علم رات کو جاگنا اور محنت کرنا تو علم آوے گا۔ اس کلام سے اول تو طلب علم کا ضروری ہونا معلوم ہوا۔ دوسرے رات کو جاگنے اور محنت کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی۔ تیسرے نتیجہ کا وعدہ ہے کہ اس طرح کرنے سے علم حاصل ہو جائے گا مگر یہاں بھی طلب علم کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب خود ہی طلب میں مشغول ہے۔

اسی طرح یہاں بھی یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے ایمان کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن اس وقت بصورت امر امنوا کہہ کر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب اہل ایمان ہی ہیں ان کو امنوا کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ احکام جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور دوسرے وہ جو ان کے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان

قبول کرلیا ہے۔ پہلی قسم میں اول ایمان کا حکم کیا جائیگا اور دوسری قسم میں ایمان کا حکم صیغہ امر سے نہ کیا جائے گا۔ جیسے طالب علمی کے متعلق ایک تو غیر طالب کو خطاب کیا جائے اور ایک طالب علم کو۔ تو جس وقت غیر طالب کو خطاب کیا جائے اس وقت یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ علم طلب کرو اور جس وقت طالب علم مخاطب ہو اس وقت اس شرط کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں بھی اسی طرح دونوں قسم کے خطاب ہیں۔

یہ مثالیں میں نے اس لئے دے دیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے مضامین کوئی نئے نہیں ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو جس طرح ہم لوگ محاورات میں گفتگو کرتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی کلام کیا جاتا ہے۔ ہاں طرز تعلیم ایسا عجیب ہے کہ دوسرے سے ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہوتی ہے بہر حال چونکہ اس سورت میں زیادہ احکام اور اکثر خطابات مومنین کو ہیں اس لئے امنوا بصیغہ امر نہیں کہا گیا۔ مگر یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہی سے ایمان کا شرط ہونا معلوم ہو گیا جیسا کہ اوپر چند مثالوں سے میں نے اس کو سمجھا دیا ہے۔ مجھ کو اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آج کل بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ فلاح کے لئے ایمان کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اس وقت ہم کو دنیوی فلاح سے تو بحث نہیں اس کے متعلق تو ہماری حالت یہ ہے

ماقصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

فلاح آخرت کے لئے ایمان شرط

غرض یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے یہ مسئلہ مستنبط ہو گیا کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان یقیناً شرط ہے اور اس سے قرآن کی جامعیت معلوم ہوتی ہے کہ ذرا سے لفظ سے کتنا بڑا مسئلہ ثابت ہو گیا۔ گو یہاں اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا نہ صیغہ امر سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر طرز خطاب ہی سے یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے کہ فلاح کے لئے سب سے اول ایمان شرط ہے۔ پس اول درجہ تو ایمان کا ہے۔ دوسرا درجہ اس کے بعد مراتب متوسطہ کا ہے۔ جن کا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ چار چیزیں ہیں اور تیسرا درجہ نتیجہ کا ہے جس کا بیان لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ میں ہے جو شمار میں چھٹی چیز ہے۔ گو ترتیب کا مقتضا یہ تھا کہ میں اول مراتب متوسط کو بیان کرتا لیکن میں ضرورت کی وجہ سے نتیجہ کو مقدم کرتا ہوں کیونکہ آج کل ترقی وفلاح پر بہت گفتگو ہو رہی ہے اور ہر شخص اس کا طالب ہے تو سنئے! حق تعالیٰ ایمان اور چند احکام کا بیان فرما کر بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کہ امید ہے کہ تم کو فلاح حاصل ہو۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اخیر چیز اور مقصود فلاح ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس کا وعدہ ان اعمال مذکورہ پر کیا گیا ہے اور یہاں فلاح مطلق ہے جس کو فلاح دین وغیرہ کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا۔ تو اس درجہ میں عموم الفاظ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فلاح خواہ دین کی ہو یا دنیا کی ان احکام پر ہی عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعمال شرعیہ سے مقصود تو محض فلاح دین ہے مگر ترتب فلاح دنیا کا بھی ہوتا ہے پس فلاح دین تو اس لفظ کا مدلول مطابقی ہے اور فلاح دنیا مدلول التزامی ہے یعنی اعمال شرعیہ کے لئے فلاح دنیا لازم ہے گو مقصود نہ ہو۔

رسالة وجیزة ومفیدة فی ربطِ الآیات

سبق الغایات
فی
نسق الآیات

تالیف

حضرت حکیم الامت مجدد الملت جامع الکمالات منبع الحسنات ماہر العلوم القرآنیۃ، واقف الاسرار الفرقانیۃ، راس المفسرین مقدام الراسخین صاحب الشریعۃ والطریقۃ، بحر المعرفۃ والحقیقۃ کاشف الاسرار الخفی منہا والجلی اعنی بہ

مولانا محمد اشرف علی التھانوی

نور اللہ مرقدہ وجعل الجنۃ مثواہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الفاتحة

(اعلم) ان مراتب احوال الخلق خمسة اولها الخلق وثانیها التربیة فی مصالح الدنیا وثالثها التربیة فی تعریف المبدأ ورابعها التربیة فی تعریف المعاد وخامسها نقل الارواح من عالم الاجساد الی دار المعاد فاسم اللّٰہ تعالیٰ منبع الخلق والایجاد والتکوین والابداع واسم الرب یدل علی التربیة بوجوہ الفضل والاحسان واسم الرحمٰن یدل علی التربیة فی معرفة المبدأ واسم الرحیم فی معرفة المعاد حتی یحترز عما لاینبغی ویقدم علی ما ینبغی واسم الملک یدل علی انه ینقلهم من دار الدنیا الی دار الجزاء ثم عند وصول العبد الی هذہ المقامات انتقل الکلام من الغیبة الی الحضور فقال ایاک نعبد کانه یقول انک اذا انتفعت بهذہ الاسماء الخمسة فی هذہ المراتب الخمس وانتقلت الی دار الجزاء صرت بحیث تری اللّٰہ فحینئذ تکلم معه علی سبیل المشاهدة لاعلی سبیل المغائبة ثم قل ایاک نعبد وایاک نستعین کانه قال ایاک ونعبد لانک اللّٰہ الخالق وایاک نستعین لانک الرب الرازق ایاک نعبد لانک الرحمٰن وایاک نستعین لانک الرحیم ایاک نعبد لانک الملک وایاک نستعین لانک المالک واعلم ان قوله مالک یوم الدین دل علی ان العبد منقل من دار الدنیا الی دار الآخرة ومن دار الشرور الی دار السرور فقال لابد لذلک والیوم من زاد واستعداد وذلک هو العبادة فلا جرم قال ایاک نعبد ثم قال العبد الذی اکتسبة بقوتی وقدرتی قلیل لایکفینی فی ذلک الیوم الطویل فاستعان بربه فقال ما معی قلیل فاعطنی من خزائن رحمتک ما یکفینی فی ذلک الیوم الطویل فقال وایاک ونستعین ثم لما حصل الزاد لیوم المعاد قال هذا سفر طویل شاق والطرق کثیرة والخلق قد تاهوا فی هذہ البادیة

فلا طریق الا ان اطلب الطریق ممن هو بارشاد السالکین حقیق فقال اهدنا الصراط المستقیم ثم انه لابد لسالک الطریق من رفیق ومن بدرقة ودلیل فقال صراط الذین انعمت علیهم والذین انعم اللّٰه علیهم هم النبیون والصدیقون والشهداء والصّٰلحون فالانبیاء هم الادلّاء والصدیقون هم البدرقة والشهداء والصالحون هم الرفقاء ثم قال غیر المغضوب علیهم ولا الضالین وذلک لان الحجب عن اللّٰه قسمان الحجب الناریة وهی عالم الدنیا ثم الحجب النوریة وهی عالم الارواح فاعتصم باللّٰه سبحانه وتعالیٰ من هذین الامرین وهو ان لایبقی مشغول السر لابالحجب الناریة لابالحجب النوریة.

(وجه المناسبة بین آخر الفاتحة واوّل البقرة ان العبد لما سال الهدایة من اللّٰه تعالیٰ بقوله اهدنا الصراط المستقیم الخ. اجاب اللّٰه تعالیٰ سؤاله فقال ذلک الکتٰب لاریب فیه هدی للمتقین انی خذ ما سئلت من الهدایة فهٰذا الکتاب هو الهدایة الکبریٰ ۱۲ عفی عنه).

سورة البقرة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓ ذٰلک الکتٰب لاریب فیه هدی للمتقین بیانه انه نبه اولاً علی انه الکلام المتحدی به ثم اشیر الیه بانه الکتٰب المنعوت بغایة الکمال فکان تقریرا لجهة التحدی ثم نفی عنه ان یتثبت به طرف من الریب فکان شهادة بکماله ثم اخبر عنه بانه هدی للمتقین فقرر بذلک کونه یقینًا لایحوم الشک حوله الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلٰوة ومما رزقنٰهم ینفقون الاقرب ان یکون هذه الاشیاء تفسیرا لکونهم متقین وذلک لان کمال السعادة لایحصل الا بترک الا ینبغی وفعل ما ینبغی فالترک هو التقوی والفعل اما فعل القلب وهو الایمان او فعل الجوارح وهو الصلٰوة والزکٰوة والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرة هم یوقنون اعلم ان قوله الذین یؤمنون بالغیب عالم یتناول کل من آمن بمحمد صلی اللّٰه علیه وسلم سواء کان قبل ذلک مؤمنا بموسی وعیسی علیهما السلام او ما کان مؤمنا بهما ودلالة اللفظ العام علی بعض ما دخل فیه التخصیص اضعف من دلالة اللفظ الخاص علی ذلک والبعض لان العام یحتمل التخصیص والخاص لایحتمله فلما کانت هذه السورة مدینة وقد شرف اللّٰه تعالٰی المسلمین بقوله هدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب فذکر بعد ذلک اهل الکتاب الذین آمنوا بالرسول کعبد اللّٰه بن سلام وامثاله بقوله والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک لان فی هذا التخصیص بالذکر مزید تشریف لهم کما فی قوله تعالٰی من کان عدوّا للّٰه وملٰئکته ورسله وجبریل ومیکال ثم تخصیص عبد اللّٰه بن سلام وامثاله بهذا التشریف ترغیب لامثاله فی الدین فهذا هو السبب فی ذکر هذا الخاص بعد ذلک العام اولٰٓئک علی هدی من ربهم واولٰٓئک هم المفلحون فی کیفیة تعلق هذه الآیة بما قبلها وجوه ثلثة احدها ان ینوی الابتداء بالذین یؤمنون بالغیب وذلک لانه لما قیل هدی للمتقین فخصّ المتقین بان الکتٰب هدی لهم کان لسائل ان یسأل فیقول ما السبب فی اختصاص المتقین بذلک فوقع قوله الذین یؤمنون بالغیب الی قوله واولٰٓئک هم المفلحون جوابا عن السؤال کانه قیل الذی یکون مشتغلا

بالایمان واقامة الصلوة وایتاء الزکوة والفوز بافلاح والنجاة لابد ان یکون علی هدی
من ربه وثانیها ان لاینوی الابتداء به بل یجعله تابعا للمتقین ثم یقع الابتداء من قوله اولٓئک
علی هدی من ربهم کانه قیل ایّ سبب فی ان صار الموصوفون بهذه الصفات مختصّین
بالهدی فاجیب بان اولٓئک المصوفین غیر مستبعد ان یفوز وادون الناس بالهدی
ماجلا وبالفلاح آجلا وثالثها ان یجعل الموصول اللاول صفة المتقین ویرفع الثانی
علی الابتداء واولٓئک خبره ویکون المراد جعل اختصاصهم بالفلاح والهدیٰ تعریضا
باهل الکتب الذین لم یؤمنوا بنبوة رسول الله صلی الله علیه وسلم وهم ظانون انهم
علٰی الهدی وطامعون انهم ینالون الفلاح عند اللّٰه تعالٰی ان الذین کفروا سواء علیهم
ءانذرتهم ام لم تنذرهم لایؤمنون کلام مستانف سیق لشرح احوال الکفرة الغواة
المردة العتاة اثر بیان احوال اضدادهم المتصفین بنعوت الکمال الفائزین بمباغیهم
فی الحال والمآل (ربط هذه الآیة من ابی المسعود) ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم
وعلی ابصارهم غشاوة ولهم عذاب عظیم اعلم انه تعالٰی لما بین فی الآیة انهم لایؤمنون
خبر فی هذه الآیة بالسبب الذی لاجله لم یؤمنوا وهو الختم ومن الناس من یقول الخ
اعلم ان المفسرین اجمعوا علی ان ذلک فی وصف المنافقین قالوا وصف اللّٰه
الاصناف والثلاثة من المؤمنین والکافرین والمنافقین فبدأ بالمؤمنین المخلصین الذین
صحت سرائرهم وسلمت ضمائرهم ثم اتبعهم بالکافرین الذین من امتهم الاقامة
علی الجحود والعناد ثم وصف حال من یقول بلسانه انه مؤمن وضمیره یخالف ذلک
یخادعون اللّٰه الخ اعلم ان اللّٰه تعالٰی ذکر من قبائح افعال المنافقین اربعة اشیاء احدها
ما ذکره فی هذه الآیة وهو انهم یخٰدعون اللّٰه والذین آمنوا واذا قیل لهم لاتفسدوا الخ
اعلم ان هذا هو النوع الثانی من قبائح افعال المنافقین واذا قیل لهم آمنوا الخ اعلم
ان هذا هو النوع الثالث من قبائح افعال المنافقین وذلک لانه سبحانه لما نها هم
فی الآیة المتقدّمة عن الفساد فی الارض امرهم فی هذه الآیة بالایمان لان کمال حال
الانسان لایحصل الا بِمَجْمُوْعِ الامرین اولهما ترک ما لاینبغی وهو قوله لاتفسدوا
وثانیها فعل ما ینبغی وهو قوله آمنوا واذا لقوا الذین آمنوا الخ هذا هو النوع الرابع
من افعالهم القبیحة اولٓئک الذین اشتروا الضلالة الخ الجملة مسوقة لتقریر ما قبلها
وبیان لکمال جهالتهم فیما حکی عنهم من الاقوال والافعال باظهار غایت سماجتها
وتصویرها ما لایکاد یتعاطاه من له ادنی تمیز فضلا عن العقلاء (ربط هذه الآیة من

ابی السعود) مثلهم کمثل الذی استوقد الخ لما بین حقیقة صفات المنافقین عقبها بضرب مثلین زیادة فی الکشف والبیان احدهما هذا المثل او کصیّب من السماء الخ اعلم ان هذا هو المثل الثانی للمنافقین یایها الناس اعبدوا الخ ان اللّٰہ لما قدم احکام الفرق الثلثة اعنی المؤمنین والکفار والمنٰفقین اقبل علیهم بالخطاب من باب الالتفات وان کنتم فی ریب الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما اقام الدلائل القاهرة علی اثبات الصانع وابطل القول بالشریک عقبه بما یدل علی النبوة ولما کانت نبوة محمد صلی اللّٰه علیه وسلم مبنیة علی کون القرٰان معجزا اقام الدلالة علی کونه معجزا وبشر الذی اٰمنوا الخ اعلم انه سبحانه وتعالی لما تکلم فی التوحید والنبوة تکلم بعدهما فی المعاد وبین عقاب الکافر وثواب المطیع ومن عادة اللّٰه تعالٰی انه اذا ذکر آیة فی الوعید ان یعقبها بآیة فی الوعد ان اللّٰه لایستحی الخ اعلم انه تعالی لما بین بالدلیل کون القرآن معجزا او رد ههنا شبهة اوردها الکفار قدحًا فی ذلک واجاب عنها وتقریر الشبهة انه جاء فی القرآن ذکر النحل والذباب والعنکبوت والنمل وهذه الاشیاء لایلیق ذکرها بکلام الفصحاء فاشتمال القرآن علیها یقدح فی فصاحته فضلا عن کونه معجزا فاجاب اللّٰه تعالٰی عنه بان صغر هذه الاشیاء لایقدح فی الفصاحة اذا کان ذکرها مشتملا علی حکم بالغة کیف تکفرون باللّٰه الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما نکلم فی دلائل التوحید والنبوة والمعاد الی هذا الموضع فمن هذا الموضع الی قوله یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم فی شرح النعم التی عمت جمیع المکلفین وهی اربعة اولها نعمة الاحیاء وهی المذکورة فی هذه الآیة هو الذی خلق لکم الخ اعلم ان هذا هو النعمة الثانیة التب عمت المکلفین باسرهم وما احسن ما راعی اللّٰه سبحانه وتعالٰی هذا الترتیب فان الانتفاع بالارض والسماء انما یکون بعد حصول الحیاة فلهذا ذکر اللّٰه امر الحیٰوة اولاً ثم اتبعه بذکر السماء والارض واذ قال ربک الخ اعلم ان هذه الایة دالة علی کیفیة خلقة آدم علیه السلام وعلی کیفیة تعظیم اللّٰه تعالٰی ایاه فیکون ذلک انعاماعا ما علی جمیع بنی آدم فیکون هذا هو النعمة الثالثة من تلک النعم العامة التی اوردها فی هذا الموضع وعلم آدم الاسماء الخ اعلم ان الملٰئکة لما سألوا عن وجه الحکمة فی خلقة آدم علیه السلام وذریته واسکانه تعالٰی ایاهم فی الارض واخبر اللّٰه تعالٰی عن وجه الحکمة فی ذلک علی سبیل الاجمال بقوله انی اعلم ما لاتعلمون اراد تعالٰی ان یزیدهم بیانا وان یفصل لهم ذلک المجمل فبین

تعالٰی لهم من فضل آدم علیه السلام ما لم یکن ذلک معلوما لهم وذلک بان علم آدم الاسماء کلها ثمَّ عرضهم علیه لیظهر بذلک کمال فضله وقصورهم عنه فی العلم فیتأکد ذلک الجواب الاجمالی بهذا الجواب التفصیلی قالوا سبحٰنک الخ استیناف واقع موقع الجواب کانه قیل فماذا قالوا حینئذ هل خرجوا من عهدة ما کلفوه اولا فقیل قالوا (ربط هذه الایة من ابی السعود) واذ قلنا للملٰئکة اسجدوا الخ اعلم ان هذا هو النعمة الرابعة من النعم العامة علی جمیع البشر وهو انه سبحانه وتعالٰی جعل ایانا مسجودًا للملائکة وذلک لانه تعالٰی ذکر تخصیص آدم بالخلافة اولا ثم تخصیصه بالعلم الکثیر ثانیا ثم بلوغه فی العلم الی ان صارت الملائکة عاجزین عن بلوغ درجته فی العلم وذکر الامن کونه مسجودا للملائکة وقلنا یا آدم اسکن الخ ان اللّٰه تعالٰی لما امر الکل بالسجود لآدم وابٰی ابلیس السجود صیره اللّٰه ملعونا ثم امر آدم بان یسکنها مع زوجیة یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما اقام دلائل التوحید والنبوة والمعاد اولا ثم عقبها بذکر الانعامات العامة لکل البشر عقبها بذکر الانعامات الخاصة علی اسلاف الیهود کسرًا لعنادهم ولجاحتهم بتذکیر النعم السالفة واستمالةً لقلوبهم بسببها وتنبیها علٰی مَا یدل علی نبوة محمد صلی اللّٰه علیه وسلم من حیث کونها اخبارا عن الغیب واعلم انه سبحانه ذکرهم تلک النعم اولا علی سبیل الاجمال فقال یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا بعهدی اوف بعهدکم وفرع علی تذکیرها الامر بالایمان بمحمد صلی اللّٰه علیه وسلم فقال وآمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم ثم عقبها بذکر الامور التی تمنعهم عن الایمان به ثم ذکرهم تلک النعم علی سبیل الاجمال ثانیا بقوله مرة اخری یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم تنبیها علی شدة غفلتهم ثم اردف هذا التذکیر بالترغیب البالغ بقوله وانی فضلتکم علی العٰلمین مقرونا بالترهیب البالغ بقوله واتقوا یوما لاتجزی نفس عن نفس شیئا الی آخر الآیة ثم شرع بعد ذلک فی تعدید تلک النعم علی سبیل التفصیل ومن تأمل وانصف علم ان هذا هو النهایة فی حسن الترتیب لمن یرید الدعوة وتحصیل الاعتقاد فی قلب المستمع وآمنوا بما انزلت الخ اعلم ان قوله سبحانه وتعالٰی وآمنوا بما انزلت امر بترک الکفر والضلال وقوله ولاتلبسوا الحق بالباطل امر بترک الاغواء والاضلال واعلم ان اضلال الغیر لایحصل الا بطریقین وذلک لان ذلک الغیر ان کان قد سمع دلائل الحق فاضلاله لایمکن الا بتشویش

تلک الدلائل علیه وان کان ما سمعها فاضلا له انما یمکن باخفاء تلک الدلائل عنه ومنعه من الوصول الیها فقوله ولاتلبسوا الحق بالباطل اشارة الی القسم الاول وهو تشویش الدلائل علیه وقوله وتکتموا الحق اشارة الی القسم الثانی وهو منعه من الوصول الی الدلائل واقیموا الصلوة الخ اعلم ان اللّٰه سبحانه وتعالٰی لما امرهم بالایمان اولاً ثم نهاهم عن لبس الحق بالباطل وکتمان دلائل النبوة ثانیا ذکر بعد ذلک بیان ما لزمهم من الشرائع وذکر من جملة الشرائع ما کان کالمقدم والاصل فیها وهو الصلوة التی هی اعظم العبادات البدنیة والزکوة التی هی اعظم العبادات المالیة اتأمرون الناس الخ تجرید للخطاب وتوجیه له الی بعضهم بعد توجیههم الی الکل (هذا الرط لهذه الآیة من ابی السعود) واعلم انه سبحانه وتعالٰی لما امر بالایمان والشرائع بناء علی ما خصهم به من النعم رغبهم فی ذلک بناء علی ماخذ آخر وهو ان التغافل عن اعمال البر مع حث الناس علیها مستقبح فی العقول اذ المقصود من امر الناس بذلک اما النصیحة او الشفقة ولیس من العقل ان یشفق الانسان علی غیره او ان ینصح غیره ویهمل نفسه فحذرهم اللّٰه تعالٰی من ذلک بان قرعهم بهذا الکلام واستعینوا بالصبر الخ لما امرهم بالایمان ونترک الاضلال وبالتزام الشرائع وهی الصلوة والزکوة وکان ذلک شاقا علیهم لما فیه من ترک الریاسات والاعراض عن المال والجاه لاجرم عالج اللّٰه تعالٰی هذا المرض فقال واستعینوا بالصبر والصلوة کانه قیل واستعینوا علی ترک ما تحبون من الدنیا والدخول فیما تستثقله طباعکم من قبول دین محمد صلی اللّٰه علیه وسلم بالصبر ای بخمیس النفس عن اللذات فانکم اذا کلفتم انفسکم ذلک ومرّنت علیه وخف علیها ثم اذا ضممتم الصلوة الی ذلک تم الامر لان المشتغل بالصلوة لابد وان یکون مشتغلا بذکر اللّٰه عز وجل وذکر جلاله وقهره وذکر رحمته وفضله فاذا تذکر رحمته صار مائلا الی طاعته واذا تذکر عقابه ترک معصیت فیسهل عند ذلک اشتعاله بالطاعة وترکه للمعصیة یبنی اسرائیل اذکروا الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی انما اعاد هذا الکلام مرة اخری توکیدا للحجة علیهم وتحذیرًا من ترک اتباع محمد صلی اللّٰه علیه وسلم ثم قرنه بالوعید وهو قوله واتقوا یوما کانه قال ان لم تطیعونی لاجل سوالف نعمتی علیکم فاطیعونی للخوف من عقابی فی المستقبل واذ نجیناکم الخ اعلم انه تعالٰی لما قدم ذکر نعمه علی بنی اسرائیل اجمالا بین بعد ذلک اقسام تلک النعم علی سبیل التفصیل لیکون ابلغ فی التذکیر واعظم فی

الحجة فکانه قال اذکروا نعمتی واذکروا اذ نجینا کم واذکروا اذ فرقنا بکم البحر وھی انعمات والمذکور فی ھذہ الآیة ھو الانعام الاول واذ فرقنا بکم الخ ھذا ھو النعمة الثانیة واذ واعدنا الخ ان ھذا ھو الانعام الثالث واذ آتینا الخ اعلم ھذا ھو الانعام الرابع واذ قال موسی الخ اعلم ان ھذا ھو الانعام الخامس واذ قلتم یموسی الخ اعلم ان ھذا ھو الانعام السادس وظللنا الخ اعلم ان ھذا ھو الانعام السابع واذ قلنا الدخلوا الخ اعلم ان ھذا ھو الانعام الثامن واذ استسقی الخ اعلم ان ھذا ھو الانعام التاسع واذ قلتم یموسی لن نصبر الخ تذکیر بعنایة اخری لاسلافھم وکفرانھم لنعمت اللّٰہ عز وجل واخلادھم الی ما کانوا فیہ من الدناءة والخساسة (ربط ھذہ الآیة من ابی السعود) ان الذین آمنوا الخ واعلم ان عادة اللّٰہ اذا ذکر وعدا ووعیدا عقبہ بما یضادہ لیکون الکلام تاما فھھنا لما ذکر حکم الکفرة من اھل الکتاب وما حلّ بھم من العقوبة اخبر بما للمؤمنین من الاجر العظیم والثواب دالاًّ علی انہ سبحانہ وتعالٰی یجازی المحسن باحسانہ والمسیئ باساءتہ واذ اخذنا میثاقکم الخ اعلم ان ھذا ھو الانعام العاشر وذلک لانہ تعالٰی انما اخذ میثاقھم لمصلحتھم فصار ذلک من انعامہ علیھم ولقد علمتم الذین الخ اعلم انہ تعالی لما عدد وجوہ انعامہ علیھم اولاً ختم ذلک بشرح بعض ما وجہ الیھم من التشدیدات وھذا ھو النوع الاول واذ قال موسی لقومہ الخ اعلم ان ھذا ھو النوع الثانی من التشدیدات افتطمعون الخ اعلم انہ سبحانہ لما ذکر قبائح افعال اسلاف الیھود الی ھھنا شرح من ھھنا قبائح افعال الیھود الذین کانوا فی زمن محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم واذ القوا الذین اٰمنوا الخ اعلم ان ھذا ھو النوع الثانی من قبائح افعال الیھود الذین کانوا فی زمن محمد صلی اللہ علیہ وسلم ومنھم امیون الخ اعلم ان المراد بقولہ ومنھم امیون الیھود لانہ تعالٰی لما وصفھم بالعناد وازال الطمع عن ایمانھم بیّن فرقھم فالفرقة الاولی ھی الفرقة الضالة المضلة وھم الذین یحرفون الکلم عن مواضعہ والفرقة الثانیة المنافقون والفرقة الثالثة الذین یجادلون المنافقین والفرقة الرابعة ھم المذکورون فی ھذہ الآیة وھم العامة الامیون الذین لامعرفة عندھم بقراءة ولاکتابة وطریقتھم التقلید وقبول ما یقال لھم فبیّن تعالٰی ان الذین یمتنعون عن قبول الایمان لیس سبب ذلک الامتناع واحدا بل لکل قسم منھم سبب اٰخر وقالوا لن تمسنا النار الخ اعلم ان ھذا ھو النوع الثالث من قبائح اقوالھم وافعالھم وھو جزمھم بان اللّٰہ تعالٰی لایعذبھم الا ایاما قلیلة بلی من کسب الخ

جواب عن قولهم المحکی وابطال له من جهته تعالٰی وبیان لحقیقة الحال فی ضمن تشریع کلی شامل لهم ولسائر الکفرة بعد اظهار کذبهم اجمالا (ربط هذه الآیة من ابی السعود) والذین آمنوا الخ اعلم انه سبحانه وتعالی ما ذکر فی القرآن آیة فی الوعید لا وذکر بجنبها آیة فی الوعد واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل الخ اعلم ان هذا نوع آخر من انواع النعم التی خصهم اللّٰه تعالٰی بها وذلک لان التکلیف بهذه الاشیاء موصل الی اعظم النعم وهو الجنة والموصل الی النعمة نعمة فهذا التکلیف لامحالة من النعم واذ اخذنا میثاقکم الخ اعلم ان هذه الآیة تدل علی نوع آخر من نعم اللّٰه تعالٰی علیهم وهو انه تعالٰی کلفهم هذا التکلیف وانهم اقروا بصحته ثم خالفوا العهد فیه ولقد آتینا موسی الکتاب الخ اعلم ان هذا نوع آخر من النعم التی افاضها اللّٰه علیهم ثم انهم قابلوه بالکفر والافعال القبیحة ولمّا جاء هم کتب من عند اللّٰه الخ اعلم ان هذا نوع من قبائح افعال الیهود واذا قیل لهم الخ اعلم ان هذا النوع ایضا من قبائح افعالهم ولقد جاء کم موسی الخ من تمام التکبیت والتوبیخ داخل تحت الامر لاتکریر لما قص فی تضاعیف تعداد النعم التی من جملتها العفو عن عبادة العجل واذ اخذنا میثاقکم الخ توبیخ من جهة اللّٰه تعالٰی وتکذیب لهم فی ادعائهم الایمان بما انزل علیهم بتذکیر جنایاتهم الناطقة بکذبهم (ربط هاتین الآیتین من ابی السعود) قل ان کانت لکم الدار الآخرة الخ اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم وادعائهم ان الدار الآخرة خالصة لهم من دون الناس ولتجدنهم احرص الناس الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما اخبرنا عنهم فی الآیة المتقدمة انهم لایقنون الموت اخبر فی هذه الآیة انهم فی غایة الحرص علی الحیوة قل من کان عدوا لجبریل الخ اعلم ان هذا النوع ایضا من انواع قبائح الیهود ومنکرات اقوالهم وافعالهم ولقد انزلنا الیک الخ اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم وفضائحهم او کلما عاهدوا الخ اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم واتبعوا ما تتلوا الخ ان هذا نوع آخر من قبائح افعالهم وهو اشتغالهم بالسحر واقبالهم علیه ودعاءهم الناس الیه ولو انهم آمنوا الخ انه تعالٰی لما بین فیهم الوعید بقوله ولبئسما شروا به اتبعه بالوعد جامعًا بین الترهیب والترغیب لان الجمع بینهما ادعی الی الطاعة والعدول عن المعصیة یایها الذین آمنوا لاتقولوا الخ اعلم ان اللّٰه تعالٰی لما شرح قبائح افعالهم قبل مبعث محمد علیه الصلوة والسلام اراد من ههنا ان یشرح قبائح افعالهم عند مبعث محمد صلی اللّٰه علیه وسلم وجدهم واجتهادهم فی القدح فیه والطعن فی دینه

وھذا ھو النوع الاول من ھذاالباب ما یود الذین کفروا الخ واعلم انه تعالٰی لما بین حال الیھود والکفار فی العداوۃ والمعاندۃ حذر المؤمنین منھم فقال ما یودّ الذین کفروا فنفی عن قلوبھم الود والمحبة لکل ما یظھر به فضل المؤمنین ما ننسخ من آیة الخ ان اعلم ان ھذا ھو النوع الثانی من طعن الیھود فی الاسلام فقالوا الاترون الی محمد یامر اصحابه بامر ثم ینھاھم عنه ویأمرھم بخلافه ویقول الیوم قولاً وغدا یرجع عنه فنزلت ھذہ الآیة الم تعلم ان اللّٰہ له ملک الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما حکم بجواز النسخ عقبه ببیان ان ملک السموٰت والارض له لالغیرہ وھذا ھو التنبیه علی انه سبحانه وتعالٰی انما حسن الامر والنھی یکونه مالکا للخلق ام تریدون ان تسألوا الخ لما حکم بجواز النسخ فی الشرائع فلعلھم کانوا یطالبونه بتفاصیل ذلک الحکم فمنعھم اللّٰہ تعالٰی عنھا وبین انھم لیس لھم ان یشتغلوا بھذہ الاسئلة کما انه ما کان لقوم موسی ان یذکروا اسئلتھم الفاسدۃ ود کثیر من اھل الکتب الخ اعلم ان ھذا ھو النوع الثالث من کید الیھود مع المسلمین واقیموا الصلوۃ الخ اعلم انه تعالٰی امر بالعفو والصفح عن الیھود ثم عقبه بقوله تعالٰی واقیموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ تنبیھا علی انه کما الزمھم لحظ الغیر وصلاحه العفو والصفح فکذالک الزمھم لحظ انفسھم وصلاحھا القیام بالصلوۃ والزکوۃ الواجبتین ونبه بھما علی ما عداھما مِنَ الواجبات وقالوا لن یدخل الخ اعلم ان ھذا ھو النوع الرابع من تخلیط الیھود والقاء الشبه وفی قلوب المسلمین وقالت الیھود الخ بیان لتضلیل کل فریق صاحبه بخصوصة اثر بیان تضلیله کل من عداۃ علی وجه العموم (ربط ھذہ الآیة من ابی السعود) ومن اظلم ممن منع الخ فی کیفیة اتصال ھذہ الآیة بما قبلھا وجوہ فاما من حملھا علی النصاری وخراب بیت المقدس قال تتصل بما قبلھا من حیث ان النصٰری ادعوا انھم من اھل الجنة فقط فقیل لھم کیف تکونون کذلک مع ان معاملتکم فی تخریب المساجد والسعی فی خرابھا ھکذا واما من حمله علی المسجد الحرام وسائر المساجد قال جری ذکر مشرکی العرب فی قوله کذلک قال الذین لایعلمون مثل قولھم وقیل جری ذکر جمیع الکفار وذمھم فمرۃ وجه الذم الی الیھود والنصری ومرۃ الی المشرکین وللّٰہ المشرق والمغرب الخ فان منعتم من اقامة العبادۃ فی المسجد الاقصی او اسجد الحرام فاینما تولوا ای ففی ایّ مکان فعلتم تولیة وجوھکم شطر القبلة فثم وجه اللّٰہ ای ھناک جھته التی امر بھا (ربط ھذہ الآیة من ابی السعود) وقالوا اتخذ اللّٰہ ولدا

الخ اعلم ان هذا هو النوع لحادی عشر من قبائح افعال الیهود والنصٰری والمشرکین وقال الذی لا یعلمون الخ اعلم ان هذا هوا النوع لحادی عشر من قبائح الیهود والنصٰری والمشرکین انا ارسلنک بالحق الخ اعلم ان القوم لما اصروا علی العناد واللجاج الباطل واقترحوا المعجزات علی سبیل التعنت بین اللّٰہ تعالٰی لرسوله صلی اللّٰہ علیه وسلم انه لامزید علی ما فعله فی مصالح دینهم من اظهار الادلة وکما بین ذلک انه لامزید علی ما فعله الرسل فی باب الابلاغ والتنبیه لکیلا یکثر عمه بسبب اصرارهم علی کفرهم ولن ترضی عنک الخ بیان لکمال شدة شکیمة هاتین الطائفتین خاصةً اثر بیان ما یعمها والمشرکین من الاصرار علی ما هم علیه الی الموت وفیه من المبالغة فی اقناطه صلی اللّٰہ علیه وسلم من اسلامهم ما لاغایة ورا ءه (ربط هذه الایة من ابی السعود) الذین آتینا هم الکتٰب الخ لما ذم طریقتهم وحکی عنهم سوء افعالهم اتبع ذلک بمدح من ترک وطریقتهم بل تأمل التوراة وترک تحریفها وعرف مناصحة نبوة محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم یا بنی اسرائیل اذکروا الخ وتخصیصهم بتکریر التذکیر واعادة التحذیر للمبالغة فی التصح والایذان بان ذلک فذلکة القضیة والمقصود من القضیة لما ان نعم عز وجل علیهم اعظم وکفرهم بها اشد واقح (ربطها من ابی السعود) واذ ابتلی ابراهیم الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما استقصی فی شرح وجوده نعمه علی بنی اسرئیل ثم فی شرح قبائحهم فی ادیانهم واعمالهم وختم هذا الفصل بما بدء وهو قوله یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی الی قوله ولا هم ینصرون شرع سبحانه ههنا فی نوع آخر من البیان وهو ان ذکر قصة ابراهیم علیه السلام وکیفیة احواله والحکمة فیه ان ابراهیم علیه السلام شخص یعترف بفضله جمیع الطوائف والملل فالمشرکون کانوا معترفین فضله متشرفین بانهم من اولاده ومن ساکنی حرمه وخادمی بیته اهل الکتب من الیهود والنصاری کانوا ایضًا مقرین بفضله متشرفین بانهم من اولاده فحکی اللّٰہ تعالٰی عن ابراهیم غلیه السلام امورا توجب علی المشرکین وعلی الیهود والنصاری قبول قول محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم والاعتراف بدینه والانقیاد لشرعه وفی ابی السعود شروع فی تحقیق ان هدی اللّٰہ ما علیه النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم من التوحید والاسلام الذی هو ملة ابراهیم علیه السلام وان ما علیه اهل الکتابین اهواء زائغة وان ما یدعونه من انهم علی ملته علیه السلام فریة بلا مریة ببیان ما صدر عن ابراهیم وابنائه الانبیاء علیهم السلام من الاقاویل والافاعیل الناطقة بحقیقة التوحید

والاسلام وبطلان الشرک وبصحة نبوة النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وبکونه ذلک النبی الذی استدعا ابراهیم واسماعیل علیهما الصلوة والسلام بقولهما ربنا وابعث فیهم رسولا منهم الآیة واذ جعلنا البیت مثابة الخ اعلم انه تعالٰی بین کیفیة حال ابراهیم علیه السلام حین کلفه بالامامة وهذا شرح التکلف الثانی وهو التکلیف بتطهیر البیت واذ قال ابراهیم رب اجعل الخ اعلم ان هذا هو النوع الثالث من احوال ابراهیم علیه السلام التی حکاها تعالٰی ههنا واذ یرفع ابراهیم الخ اعلم ان هذا هو النوع الرابع من الامور التی حکاه اللّٰه تعالٰی عن ابراهیم واسماعیل علیهما السلام وهو انهما عند بناء البیت ذکرا ثلاثة من الدعاء ومن یرغب الخ انکار واستبعاد لان یکون فی العقلاء من یرغب عن ملته التی هی الحق الصریح والدین الصحیح (ربطها من ابی السعود) اذ قال له ربه الخ اعلم ان هذا هو النوع الخامس من الامور التی حکاها اللّٰه تعالٰی عن ابراهیم علیه السلام ووصی بها ابراهیم الخ اعلم ان هذا هو النوع السادس من الامور المستحنة التی حکاها اللّٰه تعالی ابراهیم ام کنتم شهداء الخ اعلم انه تعالٰی لما حکی عن ابراهیم علیه السلام انه بالغ فی وصیته بنیه فی الدین والاسلام ذکر عقیبه ان یعقوب وصّی بنیه بمثل ذلک تاکیدا للحجة علی الیهود والنصٰری ومبالغة فی البیان وقالوا کونوا هودا الخ اعلم انه تعالٰی لما بین بالدلائل التی تقدمت صحة دین الاسلام حکی بعدها انواعا من شبه المخالفین الطاعنین فی الاسلام الشبهة الاولی حکی عنهم انهم قالوا کونوا هودا او نصاری تهتدوا وفی ابی السعود شروع فی بیان فن آخر من فنون کفرهم وهو اضلالهم لغیرهم اثر بیان ضلالهم فی نفسهم قولوا امنا الخ لما اجاب بالجواب الجدلی اولاً ذکر بعده جوابا برهانیا فی هذه الایة وهو ان الطریق الی معرفة نبوة الانبیاء علیهم السلام ظهورا لمعجز علیهم ولما ظهر المعجز علی ید محمد صلی اللّٰه علیه وسلم وجب الاعتراف بنبوته والایمان برسالته وفی ابی السعود خطاب للمؤمنین بعد خطابه علیه السلام برد مقالتهم الشنعاء علی الاجمال وارشاد لهم الی طریق التوحید والایمان علی ضرب من التفصیل ای قولوا لهم بمقابلة ما قالوا تحقیقا وارشادا ضمنیا لهم الیه فان آمنوا بمثل ما امنتم الخ اعلم انه تعالٰی لما بین الطریق الواضح فی الدین وهو ان یعترف الانسان بنبوة من قامت الدلالة علی نبوته وان یحترز فی ذلک عن المنافقیة رغبهم فی مثل هذا الایمان فقال فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا صبغة اللّٰه الخ اعلم انه تعالٰی لما ذکر الجواب الثانی

وهو ان ذکر ما یدل علی صحة هذا الدین ذکر بعده ما یدل علی ان دلائل هذا الدین واضحة جلیة فقال صبغة اللّٰه قل اتحاجوننا الخ فی ابی السعود تجرید الخطاب للنبی صلی اللّٰه علیه وسلم عقیب الکلام الداخل تحت الامر الوارد بالخطاب العام لما ان المامور به من الوظائف الخاصة به علیه الصلوة والسلام تقولون ان ابراهیم الخ فی ابی السعود اما معادلة للهمزة فی قوله تعالٰی اتحاجوننا داخلة فی حین الامر علی معنی ای الامرین یودون اقامة الحجة وتنویر البرهان علی حقیة ما انتم علیه والحال ما ذکر ام التشبث بذیل التقلید والافتراء علی الانبیاء وتقولون ان ابراهیم الخ واما منقطعة عقررة ببل والهمزة دالة علی الاضراب والانتقال من التوبیخ علی حاجة ای التوبیخ علی الافترا علی الانبیاء علیهم السلام تلک امة قد خلت الخ فی ابی السعود تکریر للمبالغة فی لزجر عما هم علیه من الافتخار بالآباء والاتکال علی اعمالهم وقیل الخطاب السابق لهم وهذا لنا تحذیرا عن الاقتداء بهم وقیل المراد بالامة الاولی الانبیاء علیهم السلام وبالثانیة اسلاف الیهود. سیقول السفهاء الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الثانیة من الشبه التی ذکرها الیهود والنصاری طعنا فی الاسلام وکذلک الخ فی ابی السعود توجیه للخطاب الی المؤمنین بین الخطابین المختصین بالرسول صلی اللّٰه علیه وسلم التائید ما فی مضمون الکلام من التشریف وما جعلنا القبلة الخ فی ابی السعود جرد الخطاب للنبی صلی الله علیه وسلم رمزا الی ان مضمون الکلام من الاسرار الحقیقة بان یخص معرفته به علیه السلام ولئن اتیت الذین الخ اعلم انه تعالٰی لما بین فی الآیة الاولی ان الذین اوتوا الکتٰب یعلمون ان هذه القبلة حق بین بعد ذلک ان صفتهم لاتتغیر فی الاستمرار علی المعاندة الذین اتینهم الکتب الخ انه تعالی فی الأیة المتقدمة لما حذرامة محمد صلی الله علیه وسلم عن اتباع الیهود و النصٰری بقوله ولئن اتبعت اخبر المؤمنین بحال علیه السلام فی هذه الأیة فقال اعلموا یا معاشر المؤمنین ان علماء اهل الکتب یعرفون محمد او ما جاء به وصدقه ودعوته وقبلته لا یشکون فیه کما لا یشکون فی ابناء هم ولکل وجهة الخ والمراد منه ان للشرائع مصالح فلا جرم التلفت الشرائع بحسب اختلاف الاشخاص وکما اختلفت بحسب اختلاف الاشخاص لم یبعد ایضا اختلافها بحسب اختلاف الزمان بالنسة الی شخص واحد فلهذا اصح القول بالنسخ والتغییر ومن حیث خرجت الخ فی ابی السعود تاکید لحکم التحویل وتصریح بعدم تفاوت الامر فی حالتی السفر

والحضر والتکویر لما ان القبلة لها شان خطیر و النسخ من مظان الشبهة والفتنة فبالحری ان یؤکد امرها مرة غب اخری مع انه قدذکر فی کل مرّة حکمة مستقلة کما ارسلنا فیکم الخ فی ابی السعود متصل بما قبله ای ولا تم نعمتی علیکم فی امر القبلت اوفی الاٰخرة اتما ما کائنا کاتمامی لها بار سال رسول کائن منکم فان ارسال الرسول لا سیما المجانس لهم نعمة لا یکافة نعمة قط وقیل متصل بما بعده ای کما ذکرتم بالارسال فاذکرونی الخ الفاء للدلالة علی ان ترتب الامر علی ما قبله من موجباته یایها الذین اٰمنوا استعینوا الخ اعلم انه تعالی لما اوجب بقوله فاذکرونی جمیع العبادات وبقوله واشکرو الی ما یتصل بالشکر اردفه ببیان ما یعین علیها فقال استعینوا بالصبر والصلوٰة ولا تقولوا لمن یقتل الخ وجه تعلق الاٰیة بما قبلها کانه قیل استعینوا بالصبر والصلوٰة فی اقامة دینی فان احتجتم فی تلک والاقامة الی مجاهدة عدوی باموالکم وابدانکم ففعلتم ذلک فتفلت نفوسکم فلا تحسبوا انکم ضیعة انفسکم بل اعلموا ان قتلاکم احیاء عندی ولنبلونکم الخ متعلق بقوله واستعینوا بالصبر والصلوٰة ای استعینوا بالصبر والصلوٰة فانا نبلونکم بالخوف وبکذا الذین اذا اصابتهم الخ اعلم انه تعالی لما قال وبشر الصٰبرین بین فی هذه الاٰیة ان الانسان کیف یکون صابرا وان تلک البشارة کیف هی ان الصفا والمروة الخ ان اللہ تعالیٰ بین انه انما حول القبلة الی الکعبة لیتم انعامه علی محمد صلی اللہ علیه وسلم وامته باحیاء شرائع ابراهیم ودینه علی ما قال والاتم نعمتی علیکم وکان السع بین الصفا والمروة من شعائر ابراهیم علی ما ذکر فی قصة بناء الکعبة وسعی هاجر بین الجبلین فلما کان الامر کذلک وذکر اللّٰہ تعالٰی هذا الحکم عقیب تلک الآیة ان الذین یکتمون الخ قال العبد المسکین هذه مرتبطة بقوله تعالٰی الذین آتیناهم الکتٰب یعرفونه کما یعرفون ابناءهم وان فریقا منهم لیکتمون الحق الخ بین ثمه ان منهم کاتمین للحق وبین ههنا الوعید لهم الا الذین تابوا الخ اعلم انه تعالٰی لما بین عظیم الوعید فی الذین یکتمون ما انزل اللّٰہ کان یحوز ان یتوهم ان الوعید یلحقهم علی کل حال فبین تعالٰی انهم اذا تابُوا تغیر حکمهم ودخلوا فی اهل الوعد ان الذین کفروا الخ فی ابی السعود جملة مستانفة سیقت لتحقیق بقاء اللعن فیما وراء الاستثنا وتاکید دوامه واستمراره علی غیر التائبین جسما یفیده الکلام والهکم اله واحد الخ فی ابی السعود قیل کان للمشرکین حول الکعبة المکرمة ثلثمائة وستون صنما فلما سمعوا هٰذِهِ الآیة تعجبوا

وقالوا ان کنت صادقًا فأت بآیة نعرف بها صدقک فنزلت ان فی خلق الخ قال العبد المسکین فهذا مرتبط بقصة الکعبة کان المقصود ثمه ردّ زعم الذین فرطوا فی امرها بنفی صلاحیة القبلة عنها وههنا ردّ زعم الذین افرطوا فی امرها باشراک من حولها مع اللّٰہ تعالٰی فاثبت التوحید وابطل الشرک ان فی خلق السمٰوٰت الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما حکم بالفردانیة والوحدانیة ذکر ثمانیة انواع من الدلائل التی یمکن ان یستدل بها علی وجوده سبحانه اولاً وعلی توحیده وبراءته عن الاضداد والانداد ثانیًا ومن الناس من یتخذ الخ فی ابی السعود بیان لکمال رکاکة آراء المشرکین اثر تقریر وحدانیته سبحانه وتعالٰی وتحریر الآیات الباهرة الملجئة للعقلاء الی الاعتراف بها الفائضة باستحالة ان یشارکه شئ من الموجودات فی صفة من صفات الکمال فضلا عن المشارکة فی صفة الا الوهیة اذ تبرء الذین الخ اعلم انه تعالٰی لما بین حال من یتخذ من دون اللّٰہ اندادا بقوله ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب علی طریق التهدید زاد فی هذا الوعید بقوله تعالٰی اذ تبرء الذین اتبعوا من الذین اتبعوا فبین ان الذین افنوا عمرهم فی عبادتهم واعتقدوا انهم من اوکد اسباب نجاتهم فانهم یتبرؤن منهم عند احتیاجهم الیهم یایها الناس کلوا الخ قال المسکین هذا ابطال لبعض اعمال المشرکین مما یوجب الشرک من تحریم الحلال والتقلید الباطل بعد ابطال عقائدهم ومثل الذین کفروا الخ اعلم انه تعالٰی لما حکی عن الکفار انهم عند الدعاء الی اتباع ما انزل اللّٰہ ترکوا النظر والتدبر واخلدوا الی التقلید وقالوا بل نتبع ما الفینا علیه آباءنا ضرب لهم هذا المثل تنبیها للسامعین لهم انهم انما وقعوا فیما وقعوا فیه بسبب ترک الاصغاء وقلت الاهتمام بالدین فصیرهم من هذا الوجه بمنزلة الانعام یایها الذین آمنوا کلوا الخ ان اللّٰہ سبحانه وتعالٰی تکلم من اوّل السورة الی ههنا فی دلائل التوحید والنبوة واستقصی فی الرد علی الیهود والنصاری ومن هنا شرع فی بیان الاحکام انما حرم علیکم الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما امرنا فی الآیة السابقة بتناول الحلال فصّل فی هذه الآیة انواع الحرام ان الذین یکتمون الخ الحکم الثانی ان الذین الخ قال المسکین کان المقصود سابقا بیان المحرمات الحسیة وفی هذه الآیة بیان المحرم المعنوی من الرشوة ونحوها کالهدایا التی یأخذها علماء اهل الکتٰب من اتباعهم علی تبدیل الکتاب وکتمان الحق اولئک الذین اشتروا الخ اعلم انه تعالٰی لما وصف علماء الیهود بکتمان الحق وعظم فی الوعید علیه وصف ذلک الجرم

لیعلم ان ذلک العقاب انما عظم لهذا الجرم العظیم ذلک بان اللّٰه الخ لماحکم علیٰ الذی یکتمون بالوعید بیّن ان ذلک الوعید انما کان لان اللّٰه نزل الکتٰب بالحق وان هٰؤلاء الیهود والنصاری یحقونه فلا جرم استحقوا ذلک لیس البر الخ الحکم الثالث یایها الذین آمنوا کتب علیکم القصاص الخ الحکم الرابع کتب علیکم اذ حضر الخ الحکم الخامس فمن بدله الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر امر الوصیة ووجوبها وعظم امرها اتبعه بما یجری مجری الوعید فی تغییرها فمن خاف الخ اعلم انه تعالیٰ لما توعد من یبدل الوصیة بیّن ان المراد بذلک التبدیل ان یبدله عن الحق الی الباطل اما اذا غیره عن باطل الی حق علی طریق الاصلاح فقد احسن یایها الذین آمنوا کتب علیکم الصیام الخ الحکم السادس واذا سألک عبادی الخ فی ابی السعود لما امرهم اللّٰه تعالیٰ بصوم الشهر ومراعاة العدة وحثهم علی القیام بوظائف التکبیر والشکر عقبه بهذه الایة الکریمة الدالة علی انه تعالیٰ خبیر باحوالهم سمیع لاقوالهم مجیب لدعائهم مجازیهم علی اعمالهم تاکیدا له وحثا علیه ثم شرع فی بیان احکام الصیام ولا تباشروهن الخ الحکم السابع ولاتأکلوا اموالکم الخ هذا الحکم الثامن یسئلونک عن الاهلةالخ الحکم التاسع ولیس البر الخ فی ابی السعود وجه اتصاله بما قبله انهم سألوا عن الامرین او انه لما ذکر انها مواقیت للحج ذکر عقبین ما هو من انعاهم فی الحج استطرادا او انهم لما سألوا عما لایعنیهم ولا یتعلق بعلم النبوة فانه علیه الصلوة والسلام مبعوث لبیان الشرائع لا لبیان حقائق الاشیاء وترکوا السؤال عما یعنیهم ویختص بعلم الرسالة عقب بذکره جواب ما سالوا عنه تنبیها علی ان اللائق بهم ان یسألوا عن امثال ذلک ویهتموا بالعلم بها الحکم العاشر ما یتعلق بالقتال قوله تعالیٰ وقاتلوا فی سبیل اللّٰه الخ وانفقوا فی سبیل اللّٰه الخ فی ابی السعود امر بالجهاد بالمال بعد الامر به بالانفس واتموا الحج والعمرة للّٰه الخ قال المسکین هذا هو الحکم الحادی عشر فمن الناس من یقول الخ فی ابی السعود تفصیل للذاکرین الی من لایطلب بذکر اللّٰه تعالیٰ الا الدنیا والی من یطلب خیر الدارین والمراد به الحث علی الاکثار والانتظام فی سلک للآخرین ومن الناس من یعجبک الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین ان الذین یشهدون مشاعر الحج فریقان کافر وهو الذی یقول ربنا آتنا فی الدنیا و مسلم وهو الذی یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة بقی المنافق فذکره فی هذه الآیة وشرح صفاته وافعال ومن الناس من یشری الخ اعلم انه تعالیٰ لما وصف

فی الآیة المتقدمة حال من یبذل دینه لطلب الدنیا ذکر فی هذه الآیة حال من یبذل دنیاه ونفسه وماله لطلب الدین فقال ومن الناس من یشری نفسه یایها الذین آمنوا ادخلوا الخ اعلم انه تعالیٰ لما حکی عن المنافق انه یسعی فی الارض لیفسد فیها ویهلک الحرث والنسل امر المسلمین بما یضاد ذلک وهو الموافقة فی الاسلام وفی شرائعه فقال یایها الذین آمنوا ادخلوا فی السلم سل بنی اسرائیل الخ بیان هذا الکلام انه تعالیٰ قال یایها الذین آمنوا فامر بالاسلام ونهی عن الکفر ثم قال فان زللتم ای فان اعرضتم عن هذا التکلیف صرتم مستحقین للتهدید بقوله فاعلموا ثم بین ذلک التهدید بقوله هل ینظرون ثم ثلث ذلک التهدید بقوله سل بنی اسرائیل یعنی سل هؤلاء الحاضرین انا لما آتینا اسلافهم آیات بینات فانکروها لاجرم استوجبوا العقاب من اللّٰه تعالیٰ وذلک وتنبیه لهؤلاء الحاضرین علی انهم لوزلو عن آیات اللّٰه تعالیٰ لوقعوا فی العذاب کما وقع اولئک المتقدمون فیه زین للذین کفروا الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر من قبل حال من یبدل نعمة اللّٰه من بعد ما جاء ته وهم الکفار الذین کذبوا بالدلالة والانبیاء وعدلوا عنها اتبعه اللّٰه تعالیٰ بذکر السبب الذی لاجله کانت هذه طریقتهم فقال زین الخ کان الناس الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین فی هذه الآیة المتقدمة ان سبب اصرار هؤلاء الکفار علی کفرهم هو حب الدنیا بین فی هذه الآیة ان هذا المعنی غیر مختص بهذا الزمان بل کان حاصلا فی الازمنة المتقادمة لان الناس کانوا امة واحدة قائمة علی الحق ثم اختلفوا وما کان اختلافهم الا بسبب البغی والتحاسد والتنازع فی طلب الدنیا ام حسبتم الخ فی ابی السعود وخوطب به رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ومن معه من المؤمنین خالهم علی الثبات علی المصابرة علی مخالفة الکفرة وتحمل المشاق من جهتهم اثر بیان اختلاف الامم علی الانبیاء علیهم السلام وقد بین فیه مآل اختلافهم وما لقی الانبیاء ومن معهم من قبلهم من مکابدة الشدائد ومقاساة الهموم وان عاقبة امرهم النصر یسألونک ما ذا ینفقون الخ اعلم انه سبحانه وتعالیٰ لما بالغ فی بیان انه یجب علی کل مکلف ان یکون معرضا عن طلب العاجل وان یکون مشتغلا بطلب الآجل وان یکون بحیث یبذل النفس والمال فی ذلک شرع بعد ذلک فی بیان الاحکام وهو من هذه الآیة الی قوله الم تر الی الذین خرجوا لان من عادة القرآن ان یکون بیان التوحید وبیان الوعظ والنصیحة وبیان الاحکام مختلطا بعضها بالبعض لیکون کل واحد منهما مقویا للآخرومؤکدا له فالحکم الاول

هو هٰذه الآیة الحکم الثانی قوله تعالیٰ کتب علیکم القتال الخ الحکم الثالث قوله عز وجل یسئلونک عن الخمر الخ الحکم الرابع قوله ویسئلونک ما ذا ینفقون الخ الحکم الخامس قوله تعالیٰ ویسئلونک عن الیتامیٰ الخ الحکم السادس قوله تعالیٰ ولاتنکحوا المشرکات الخ الحکم السابع قوله تعالیٰ ویسئلونک عن المحیض الخ الحکم الثامن قوله تعالیٰ نساءکم حرث لکم الخ الحکم التاسع قوله تعالیٰ ولاتجعلوا اللہ عرضة الخ الحکم العاشر قوله تعالیٰ للذین یؤلون الخ الحکم الحادی عشر قوله تعالیٰ والمطلقات یتربصن الخ اعلم انه تعالیٰ ذکر فی هذا الموضع احکاما کثیرة للطلاق فالحکم الاول للطلاق وجوب العدة وبعولتهن احق الخ اعلم ان هذا هو الحکم الثانی للطلاق وهو الرجعة الطلاق مرتان الخ اعلم انه هذا هو الحکم الثالث من احکام الطلاق وهو الطلاق الذی تثبت فیه الرجعة ولایحل لکم الخ اعلم ان هذا هو الحکم الرابع من احکام الطلاق وهو بیان الخُلع فان طلقها الخ اعلم ان هذا هو الحکم الخامس من احکام الطلاق وهو بیان الطلقة الثالثة قاطعة لحق الرجعة واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فلا تعضلوهن الخ اعلم ان هذا هو الحکم السادس من احکام الطلاق وهو حکم المرأة المطلقة بعد انقضاء العدة الحکم العاشر (ینظر الی هذا العاشر بعد ای تاسع ۱۲ منه) قوله والوالدات یرضعن اولادهن الخ الحکم الحادی عشر عدة الوفاة قوله تعالیٰ والذین یتوفون منکم الخ الحکم الثانی عشر خطبة النساء قال تعالیٰ ولا جناح علیکم الخ الحکم الثالث عشرحکم المطلقة قبل الدخول قوله تعالیٰ لاجناح علیکم ان طلقتم الخ الحکم الرابع عشر قوله تعالیٰ حافظوا علی الصلوات الخ وفی ابی السعود لعل الامر بها فی تضاعیف بیان احکام الازواج والاولاد قبل الاتمام للایذان بانّها حقیقة بکمال الاعتناء بشانها والمثابرة علیها من غیر اشتغال عنها بشانهم بل بشان انفسهم ایضا کما یفصح عنه الامر بها فی حالة الخوف ولذلک امر بها فی خلال بیان ما یتعلق بهم من الاحکام الشرعیة المتشابکة الآخذ بعضها بحجزة بعض فان خفتم فرجالا الخ اعلم انه تعالیٰ لما اوجب المحافظة علی الصلوات والقیام علی ادائها بارکانها وشروطها بین من بعد ان هذه المحافظة علی هذا الحد لاتجب الا مع الامن دون الخوف فقال فان خفتم فرجالا او رکبانا الحکم الخامس عشر قوله تعالیٰ والذین یتوفون منکم الخ الحکم السادس عشر قوله تعالیٰ وللمطلقات متاع بالمعروف. الم تر الی الذین خرجوا الخ اعلم ان عادته تعالیٰ فی القرآن ان یذکر

بعد بیان الاحکام القصص لیفید الاعتبار للسامع ویحمله ذلک الاعتبار علی ترک التمر والعناد ومزید الخضوع والانقیاد فقال الم تر الخ وقاتلوا الخ فی ابی السعود عطف علی مقدّر یعیّنه ما قبله کانهٗ قیل فاشکروا فضله بالاعتبار بما قص علیکم وقاتلوا فی سبیله لما علمتم ان الفرار لاینجی من الحمام وان المقدر لامردّ له فان کان قد حان الاجل فمرت فی سبیل اللّٰہ والا فنصر عزیز وثواب من ذا الذی یقرض الخ فی ابی السعود المراد ههنا اِما الجهاد الذی هو عبارة عن بذل النفس والمال فی سبیل اللّٰہ عز وجل ابتغاء لمرضاته واِما مطلق العمل الصالح المنتظم له انتظاما اولیًا.
القصة الثانیة القصة طالوت قوله عز وجل الم تر الی الملأ الخ قوله تعالٰی تلک آیات اللّٰہ الخ فی ابی السعود اشارة ابی ما سلف من حدیث الالوف وخبر طالوت علی التفصیل المرقوم وانک لمن المرسلین فهی شهادة منه سبحانه برسالته علیه الصلوة والسلام اثر بیان ما یستوجبها تلک الرسل الخ فی ابی السعود فیه رمز الی انه علیه الصلوة والسلام من افاضل الرسل العظام علیهم الصلوة والسلام اثر بیان کونه من جملتهم وفی الکبیر عزی اللّٰہ رسوله عمار ای من قومه من التکذیب والحسد فقال هؤلاء الرسل الذین کلم اللّٰہ تعالٰی بعضهم ورفع الباقین درجات واید عیسی بروح القدس قد نالهم من قومهم ما ذکرناه بعد مشاهدة المعجزات وانت رسول مثلهم فلاتحزن علی ما تری من قومک فلو شاء اللّٰہ لم تختلفوا انتم واولئک ولکم ما قضی اللّٰہ فهو کائن یایها الذین آمنوا انفقوا الخ اعلم ان اضعف الاشیاء علی الانسان بذل النفس فی القتال وبذل المآل فی الانفاق فاما قدم الامر بالقتال عقبه بالامر بالانفاق اللّٰہ لا الٰہ الا هو الخ اعلم ان من عادته سبحانه وتعالٰی فی هذا الکتاب الکریم انه یخلط هذه الانواع الثلثة بعضها بالبعض اعنی علم التوحید وعلم الاحکام وعلم القصص والمقصود من ذکر القصص اما تقریر دلائل التوحید وامّا المبالغة فی الالزام والاحکام والتکالیف وهذا الطریق هو الطریق الاحسن لا ابقاء الانسان فی النوع الواحد لانه یوجب الملال فاما اذا انتقل من نوع من العلوم الی نوع آخر فکانه یشرح به الصدر ویفرح به القلب فکانه سافر ممن بلد الی بلد آخر وانتقل من بستان الی بستان آخر وانتقل من تناول طعام لذیذ الی تناول نوع آخر ولاشک انه یکون الذواشهی ولما ذکر فیما تقدم من علم الاحکام ومن علم القصص ما رآه مصلحة ذکر الآن ما یتعلق بالتوحید فقال اللّٰہ لا الٰہ الا هو الخ لا اکراه فی الدین الخ فی ابی السعود جملة

مستانفة جئ بها اثر بیان تفرده سبحانه وتعالٰی بالشؤن الجلیلة الموجبة للایمان به وحده ایذانا بان من حق للعاقل ان لایحتاج الی التکلیف والالزام بل یختار الدین الحق من غیر تردّد وتلعثم وقیل هو خبر فی معنی النهی ای لاتکرهوا فی الدین فقیل منسوخ بقوله تعالی جاهد الکفار وقیل خاص باهل الکتٰب حیث حصنوا انفسهم باداء الجزیة الم تر الی الذی حاج الخ اعلم انه تعالٰی ذکر ههنا قصصا ثلاثا الاولی منها فی بیان اثبات العلم بالصانع والثانیة والثالثة فی اثبات الحشر والنشر والبعث وفی ابی السعود استشهاد علی ما ذکر من ان الکفرة اولیاءهم الطاغوت وعلی ما ذکر من ولایته تعالٰی للمؤمنین مثل الذین ینفقون الخ اعلم انه سبحانه وتعالٰی لما ذکر من بیان اصول العلم بالمبدأ وبالمعاد ومن دلائل صحتهما ما اراد اتبع ذلک ببیان الشرائع والاحکام والتکالیف فالحکم الاول فی بیان التکالیف المعتبرة فی انفاق الاموال الذین ینفقون اموالهم الخ اعلم انه تعالٰی لما عظم امر الانفاق فی سبیل اللّٰه اتبعه ببیان الامور التی یجب تحصیلها حتی یبقی ذلک الثواب منها ترک والمنّ والاذی ایود احدکم الخ ان هذا مثل آخر ذکر اللّٰه تعالٰی فی حق من یتبع انفاقه بالمن والاذی یایها الذین آمنوا انفقوا من طیبات الخ اعلم انه رغب فی الانفاق ثم بین ان الانفاق علی قسمین منه ما یتبعه المن والاذی ومنه ما لایتبعه ذلک ثم انه تعالٰی شرح ما یتعلق بکل واحد من هذین القسمین وضرب لکل واحد منهما مثلا یکشف عن المعنی ویوضح المقصود منه علی ابلغ الوجوه ثم انه تعالٰی ذکر فی هذه الآیة ان المال الذی امر بانفاقه فی سبیل اللّٰه کیف ینبغی ان یکون فقال انفقوا من طیبات ما کسبتم الشیطان یعدکم الفقر. اعلم انه تعالٰی لما رغب الانسان فی انفاق اجود ما یملکه حذره بعد ذلک من وسوسة الشیطان فقال الشیطان یعدکم الفقر ای یقول ان انفقت الاجود صرت فقیرا فلا تبال بقوله فان الرحمٰن یعدکم مغفرة منه وفضلا یؤتی الحکمة الخ اعلم انه تعالٰی لما ذکر فی الآیة المتقدمة ان الشیطان یعد بالفقر ویامر بالفحشاء وان الرحمٰن یعد بالمغفرة والفضل نبه علی ان الامر الذی لاجله وجب ترجیح وعد الرحمٰن علی وعد الشیطان هو ان وعد الرحمٰن الحکمة والعقل ووعد الشیطان الشهوة والنفس من حیث انهما یامر ان بتحصیل اللذة الحاضرة واتباع احکام الخیال والوهم ولاشک ان حکم الحکمة والعقل هو الحکم الصادق المبرأ عن الزیغ والخلل وحکم الحس والشهوة والنفس یوقع الانسان فی البلاء

والمحنة فکان حکم الحکمة والعقل اولی بالقبول فهذا هو الاشارة الی وجه النظم وما انفقتم الخ فی ابی السعود بیان لحکم کلی شامل لجمیع افراد النفقات وما فی حکمها اثر بیان حکم ما کان منها فی سبیل الله ان تبدوا الصدقات الخ ذکر فی هذه الآیة ان الانفاق قد یکون ظاهرا وقد یکون خفیا وذکر حکم کل واحد من القسمین لیس علیک هداهم الخ هذا هو الحکم الرابع من احکام الانفاق وهو بیان ان الذی یجوز الانفاق علیه مَن هو للفقراء الذین احصروا الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین فی الآیة الاولی انه یجوز صرف الصدقة الی ای فقیر کان بین فی هذه الآیة ان الذی یکون اشد الناس استحقاقا بصرف الصدقة الیه من هو الذین ینفقون الخ لما بین فی الآیة المتقدمة ان اکمل من تصرف الیه النفقة من هو بین فی هذه الآیة ان اکمل وجوه الانفاق کیف هو فکلما نزلت بهم حاجة محتاج عجلوا قضاءها ولم یؤخروها ولم یعلقوها بوقت ولاحال الحکم الثانی من الاحکام الشرعیة المذکورة فی هذا الموضع من هذه السورة حکم الربا قوله تعالیٰ الذین یأکلون الربوا الخ اعلم ان بین الربیٰ وبین الصدقة مناسبة من جهة التضاد وذلک لان الصدقة عبارة عن تنقیص المال بسبب امر الله تعالیٰ بذلک والربا عبارة عن طلب الزیادة علی المال مع نهی الله عنه فکانا متضادین فلاجرم ذکر عقیب حکم الصدقات حکم الربوا یمحق الله الربوا الخ ذکر هنا ما یجری مجری الداعی الیٰ ترک الصدقات وفعل الربا وکشف عن فساده ان الذین آمنوا الخ اعلم ان عادة الله تعالیٰ فی القرآن مطردة بانه مما ذکر وعیدا ذکر بعده وعدا فلما بالغ ههنا فی وعید المرابی اتبعه بهذا الوعد یایها الذین آمنوا اتقوا الله الخ اعلم انه تعالی لما بین فی الآیة المتقدمة ان من انتهی عن الربوا فله ما سلف فقد کان یجوز ان یظن انه لافرق بین المقبوض منه وبین الباقی فی ذمة القوم فقال تعالیٰ وذروا. الحکم الثالث من الاحکام الشرعیة المذکورة فی هذا الموضع من هذه السورة آیة المدانیة قوله تعالی یایها الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الخ لما ذکر قبل هذا الحکم نوعین من الحکم احدهما الانفاق فی سبیل الله وهو یوجب تنقیص المال والثانی ترک الربوا وهو ایضا سبب تنقیص المال اتبع ذلک بان ندبه الی کیفیة حفظ المال الحلال وصونه عن الفساد والبوار فان القدرة علی الانفاق فی سبیل الله وعلی ترک الربوا وعلی ملازمة التقوی لایتم ولا یکمل الا عند حصول المال والوجه الثانی لما منع الربا اذن فی السلم مع ان جمیع المنافع المطلوبة من الربا حاصلة فی

السلم وان کنتم علی سفر الخ لما امر فی آخر الآیة المتقدمة بالکتبة والاشهاد وانه ربما تعذر ذلک فی السفر ذکر نوعا آخر من الاستیثاق وهو اخذ الرهن للّٰہ ما فی السمٰوٰت الخ اعلم انه تعالٰی لماجمع فی هذه السورة اشیاء کثیرة من علم الاصول وهو دلیل التوحید والنبوة واشیاء کثیرة من علم الاصول ببیان الشرائع والتکالیف ختم اللّٰہ تعالٰی هذه السورة بهذة الآیة علی سبیل التهد وقال الشعبی وعکرمة ومجاهد انه تعالٰی لما نهی عن کتمان الشهادة واوعد علیه بین ان له ملک السمٰوٰت والارض فیجازی علی الکتمان والاظهار آمن الرسول الخ قال المسکین وجه الارتباط ظاهر من شان النزول وفی ابی السعود لما ذکر فی فاتحة السورة الکریمة ان ما انزل الی الرسول صلی اللّٰہ علیه وسلم من الکتٰب العظیم الشان هدی للمتقین بما فصل هناک من الصفات الفاضلة التی من جملتها الایمان به وبما انزل قبله من الکتب الالهة وانهم حائزون لاثرتی الهدی والفلاح من غیر تعیین لهم بخصوصهم ولاتصریح بتحقق اتصافهم بها اذ لیس فیما یذکر فی حیز الصلة حکم بالفعل وعقب ذلک ببیان حال من کفر به من المجاهرین والمنافقین ثم شرح فی تضاعیفها من فنون الشرائع والاحکام والمواعظ والحکم واخبار سوالف الامم وغیر ذلک مما یقتضی الحکمة شرحه عیّن فی خاتمتها المتصفون بها وحکم باتصافهم بها علی طریق الشهادة لهم من جهته عز وجل بکمال الایمان وحسن الطاعة لایکلف اللّٰہ نفسا الخ فی ابی السعود جملة مستقلة جئ بها اثر تلیتهم لتکالیفه تعالٰی بحسن الطاعة اظهارا لماله تعالٰی علیهم فی ضمن التکلیف من محاسن آثار الفضل والرحمة ابتداء لابعد السؤال کما سیجئ هذا. ربنا لاتؤاخذنا الخ فی ابی السعود شروع فی حکایة بقیة دعواتهم اثر بیان سر التکلیف.

سُورۃ اٰل عِمرٰن

(وجہ تعلق اولھا بآخر ما قبلھا ان السورۃ المتقدمۃ ختمت علی سوال النصر علی الکافرین وفی مفتتح ھذہ السورۃ بین لصرتھم علی الکفار باللسان والسنان ۱۲ منہ عفی عنہ).
الم اللہ لا الہ الا ھو الخ اعلم ان مطلع ھذہ السورۃ لہ نظم لطیف عجیب وذلک لان اولٰئک النصاری الذین نازعوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانہ قیل لھم اما ان تنازعوہ فی معرفۃ الآلہ اوفی النبوۃ فان کان النزاع فی معرفۃ الآلہ وھو انکم تثبتون انہ ولدا وان محمدا لایثبت لہ ولدا فالحق معہ بالدلائل العقلیۃ القطعیۃ فانہ قد ثبت بالبرھان انہ حی قیوم والحی القیوم یستحیل عقلا ان یکوم لہ ولدا وان کان النزاع فی النبوۃ فھذا ایضا باطل لان بالطریق الذی عرفتم ان اللہ تعالٰی انزل التوراۃ والانجیل علٰی موسٰی وعیسٰی فھو بعینہ قائم فی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وما ذاک الا بالمعجزۃ وھو حاصل ھھنا فکیف یمکن منازعتہ فی صحۃ النبوۃ فھذا ھو وجہ النظم وھو مضبوط حسن جدا ان اللہ لایخفی علیہ شئ الخ قال المسکین تقریر التوحید وابطال الاُلوھیۃ عیسٰی علیہ اللاسلام ھو الذی انزل الخ فی ابی السعود شروع فی ابطال شبھتم الناشئۃ عما نطق بہ القرآن فی نعت عیسٰی علیہ السلام بطریق الاستیناف اثر بیان اختصاص الربوبیۃ ومناطھا بہ سبحانہ وتعالٰی تارۃ بعد اخری وکون کل من عداہ مقھورا تحت ملکوتہ تابعًا لمشیتہ ربنا لاتزغ قلوبنا الخ اعلم انہ تعالٰی لما حکی عن الراسخین انھم یقولون آمنا بہ حکی عنھم انھم یقولون ربنا لا تزغ انک الخ اعلم ان ھذا الدعاء من بقیۃ کلام الراسخین فی العلم ان الذین کفروا الخ اعلم ان اللہ سبحانہ وتعالٰی لما حکی عن المؤمنین دعائھم وتضرعھم حکی کیفییۃ حال الکافرین وشدید عقابھم فی ابی السعود اثر ما بین الدین الحق والتوحید وذکر احوال الکتب الناطقۃ بہ وشرح شأن القرآن العظیم وکیفیۃ ایمان العلماء الراسخین شرع فی بیان حال من کفر بہ قل للذین کفروا الخ قال المسکین ھذا بیان لعقاب الکفار فی الدنیا والآخرۃ قد کان لکم آیۃ الخ ھذہ الآیۃ

کالدلالة علی صحة قوله قل للّذین کفروا ستغلبون زین للناس الخ فی ابی السعود کلام مستانف سیق لبیان حقارة شان الحظوظ الدنیویة باصنافها وتزهید الناس بها وتوجیه رغباتهم الی ما عنده تعالیٰ اثر بیان عدم نفعها للکفرة الذین کانوا یتعززون بها قل اؤنبئکم بخیر الخ فی ابی السعود اثر ما بین شان من خرفات الدنیا وذکر ما عنده تعالیٰ من حسن المآب اجمالاً امر النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم بتفصیل ذلک المجمل للناس مبالغة فی الترغیب شهد اللّٰہ الخ اعلم انه تعالیٰ لما مدح المؤمنین واثنیٰ علیهم بقوله الذین یقولون ربنا آننا آمنا اردفه بان بین ان دلائل الایمان ظاهرة جلیة فقال شهد اللّه ان الدین عند اللّٰہ الخ فی ابی السعود جملة مستانفة مؤکدة للاولی ای لادین مرضیا للّٰہ تعالیٰ سوی الاسلام الذی هو التوحید والتدرف بالشریعة الشریفة وما اختلف الذین الخ الغرض من الایة بیان ان اللّٰہ تعالی اوضح الدلائل ازال الشبهات والقوم ما کفروا الا جل التقصیر فان حاجوک الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر من قبل ان اهل الکتاب اختلفوا من بعد ما جائهم العلم وانهم اصروا علیٰ الکفر مع ذلک بین اللّٰہ تعالیٰ للرسول صلی اللّٰہ علیه ما یقوله فی محاجتهم فقال فان حاجوک الخ ان الذین یکفرون الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر من قبل حال من یعرض ویتولی بقوله وان تولوا اردفه بصفة هذا المتولی الم تر الی الذین الخ اعلم انه تعالیٰ لما نبه علی عناد القوم بقوله فان حاجوک بین فی هذه الآیة غایة عنادهم وهو انهم یدعون الی الکتاب الذین یزعمون انهم یؤمنون به وهو التوراة ثم انهم یتمردون ویتولون وذلک یدل علی غایة عنادهم قل اللهم مالک الخ امر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بدعاء وتمجید یدل علی مبانیة طریقه وطریق اتباعه لطریقة هؤلاء الکٰفرین المعاندین المعرضین فقال معلما نبیه کیف یمجد ویعظم ویدعو ویطلب قال المسکین لعل الاقرب انه اوعد الکفار فیما قبل انهم سیغلبون فاستبعدوه وتعجبوا منه فاشار اللّٰہ تعالیٰ الی قرب وقوعه بانه تعالیٰ مالک الملک وکل شئ بمشیته وقدرته فلا غر وای یغلب المغلوب ویغلب الغالب لا یتخذ المؤمنون الخ لما بین انه تعالیٰ مالک الدنیا والآخرة بین انه ینبغی ان تکون الرغبة فیما عنده وعند اولیاءه دون اعدائه قل ان تخفوا الخ فی ابی السعود من الضمائر التی من جملتها ولایة الکفرة یوم تجد کل نفس الخ اعلم ان هذه الآیة من باب الترغیب والترهیب ومن تمام الکلام الذی تقدم قل ان کنتم

تحبون اللّٰہ الخ اعلم انه تعالیٰ لما دعا القوم الی اللایمان به والایمان برسوله علی سبیل التهدید والوعید دعاهم الی ذلک من طریق آخر وهو ان الیهود کانوا یقولون نحن ابناء اللّٰه واحباءه فنزلت هذه اللآیة ان اللّٰه اصطفیٰ الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین ان محبته لاتتم الا بمتابعة الرسل بین علو درجات الرسل وشرف مناصبهم فقال ان اللّٰه اصطفیٰ آدم فی ابی السعود لما بین اللّٰه تعالیٰ ان الذین المرضی عنده هو الاسلام والتوحید وان اختلاف اهل الکتابین فیه انما هو للبغی والحسد وان الفوز برضوانه ومغفرته ورحمته منوط باتباع الرسول صلی اللّٰه علیه وسلم واطاعته شرع فی تحقیق رسالته وکونه من اهل بیت النبوة القدیمة فبدأ ببیان جلالة اقدار الرسل علیهم الصلوة والسلام کافة واتبعه ذکر مبدأ امر عیسیٰ علیه الصلوة والسلام وامه وکیفیة دعوته للناس الی التوحید والاسلام تحقیقًا للحق وابطالاً لما علیه اهل الکتابین فی شانهما من الافراط والتفریط ثم بین بطلان محاجتهم فی ابراهیم علیه الصلوة والسلام وادعائهم الانتماء الی ملته وتره ساحته العلیة عما هم علیه من الیهودیة والنصرانیة ثم نص علی ان جمیع الرسل علیهم الصلوة والسلام دعاة الی عبادة اللّٰه عز وجل وحده وطاعته منزهون عن احتمال الدعوة الی عبادة انفسهم او غیرهم من الملٰئکة وان اممهم قاطبة مامورون بالایمان بمن جاءهم من رسول مصدق لما معهم تحقیقا لوجوب الایمان برسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وکتابه المصدق لما بین یدیه من التورٰة والانجیل وتحتم الطاعة له جسما سیأتی تفصیله اذ قالت امرأة عمران الخ فی ابی السعود لتقریر اصطفاء آل عمران وبیان کیفیته هناک الخ فی ابی السعود کلام مستأنف وقصة مستقلة سیقت فی تضاعیف حکایة مریم لما بینهما من قوة الارتباط وشدة الاشتباک مع ما فی ایرادها من تقریر ما سیقت له حکایتها من بیان اصطفاء آل عمران فان فضائل بعض الاقرباء دالة علی فضائل الآخرین واذ قالت الملٰئکة یٰمریم ان اللّٰه اصطفٰک الخ فی ابی السعود شروع فی شرح بقیة احکام اصطفاء آل عمران اثر الاشارة الی نبذ من فضائل بعض اقاربهم اذ قالت الملٰئکة یا مریم ان اللّٰه یبشرک الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین شرح حال مریم علیها السلام فی اول امرها وفی آخر امرها شرح کیفیة ولادتها بعیسیٰ علیه السلام فلما احس الخ شرع فی بیان ان عیسیٰ لما شرح لهم تلک المعجزات واظهر لهم تلک الدلائل فهم بماذا عاملوه فقال تعالیٰ فلما احس

فاما الذين كفروا الخ اعلم انه تعالىٰ لما ذكر الىّ مرجعكم بين بعد ذلك مفصلاً ما فی ذلک الاختلاف ذلک نتلوه الخ قال المسكين اشارة الى اثبات نبو ة محمد عليه السلام فی تضاعيف القصة كنظائرها فيما قبل لان المحاجّة كانت فی التوحيد و الرسالة فمن حاجک فيه الخ بعد هذه الدلائل الواضحة و الجوابات اللائحة فاقطع الكلام معهم وعاملهم بما يعامل به المعاند وهو ان تدعوهم الى الملاعنة قل يا هل الكتاب تعالوا الخ واعلم ان النبی صلى الله عليه وسلم لما اورد على نصارى نجران انواع الدلائل و انقطعوا ثم دعاهم الى المباهلة فخافوا وما شرعوا فيها وقبلوا الصغار باداء الجزية وقد كان عليه السلام حريصا على ايمانهم فكانه تعالىٰ قال يا محمد اترک ذلک المنهج من الكلام واعدل الى منهج آخر يشهد كل عقل سليم وطبع مستقيم انه كلام مبنی على الانصاف وترک الجدال قل ياهل الكتاب لم تحاجون الخ قال المسكين هو من بقية الكلام مع اهل الكتاب ودت طائفة الخ اعلم انه تعالىٰ لما بين ان من طريقة اهل الكتاب العدول عن الحق والاعراض عن قبول الحجة بين انهم لايقتصرون على هذا القدر بل يجتهدون فی اضلال من آمن بالرسول عليه السلام بالقاء الشبهات يآهل الكتٰب لم تكفرون الخ وياهل الكتاب لم تلبسون الخ اعلم ان علماء اليهود والنصارى كانت لهم حرفتان احدهما انهم كانوا يكفرون بمحمد صلى اللّٰه عليه وسلم مع انهم كانوا يعلمون بقلوبهم انه رسول حق من عند اللّٰه واللّٰه تعالىٰ نهاهم عن هذه الحرفة فی الآية الاولى وثانيتهما انهم كانوا يجتهدون فی القاء الشبهات وفی اخفاء الدلائل واللّٰه تعالىٰ نهاهم عن هذه الحرفة فی هذه الآية الثانية فالمقام الاول مقام الغواية والضلال والمقام الثانی مقام الاغواء والاضلال وقالت طائفة من اهل الكتٰب الخ اعلم انه تعالىٰ لما حكى عنهم انهم يلبسون الحق بالباطل اردف ذلک بان حكى عنهم نوعًا واحدا من انواع تلبيساتهم وهو المذكور فی هذه الآية ومن اهل الكتاب الخ فی ابی السعود شروع فی بيان خيانتهم فی المال بعد بيان خيانتهم فی الدين ان الذين يشترون بعهد اللّٰه الخ اعلم انه تعالىٰ ذكر فی الآية السابقة خيانتهم فی اموال الناس ثم ذكر فی هذه الآية خيانتهم فی عهد اللّٰه وخيانتهم فی تعظيم اسمائه حين يحلفون بها كذبا وان منهم لفريقا الخ قال المسكين هذه بقية خيانات اليهود فی الاحكام الالٰهية ما كان لبشر الخ فی ابی السعود بيان لافترائهم على الانبياء عليهم

السلام حیث قال نصاری نجران ان عیسٰی علیه السلام امرنا ان نتخذه ربا حاشاه علیه السلام وابطال له اثر بیان افترائهم علی اللّٰه سبحانه وابطاله واذ اخذ اللّٰه میثاق الخ اعلم ان المقصود منْ هذه الآیات تعدید تقریر الاشیاء المعروفة عند اهل الکتاب مما یدل علی نبوة محمد صلی اللّٰه علیه وسلم قطعا لعذرهم واظهار العنادهم ومن جملتها ما ذکره اللّٰه تعالٰی فی هذه الآیة افغیر دین اللّٰه الخ اعلم انه تعالٰی لما بین فی الآیة الاولی ان الایمان بمحمد صلی اللّٰه علیه وسلم شرع شرعه اللّٰه تعالٰی واوجبه علی جمیع من مضی من الانبیاء والامم لزم ان کل من کره ذلک فانه یکون طالبًا دینا غیر دین اللّٰه قل آمنا باللّٰه الخ اعلم انه تعالٰی لما ذکر فی الآیة المتقدمة انه انما اخذ المیثاق علی الانبیاء فی تصدیق الرسول الذی یأتی مصدقا لما معهم بین فی هذه الآیة ان من صفته صلی اللّٰه علیه وسلم کونه مصدقا لما معهم ومن یتبع غیر الاسلام الخ اعلم انه تعالٰی لما قال فی آخر الآیة المتقدمة ونحن له مسلمون اتبعه بان بین فی هذه الآیة ان الدین لیس الا اللاسلام وان کل دین سوی الاسلام فانه غیر مقبول عند اللّٰه تعالٰی کیف یهدی اللّٰه الخ اعلم انه تعالٰی لما عظم الامر الاسلام والایمان بقوله ومن یبتغ اکد ذلک التعظیم بان بین وعید من ترک الاسلام فقال کیف یهدی اللّٰه قومًا الخ الا الذین تابوا الخ وان الذین کفروا بعد ایمانهم الخ ان الذین کفروا وماتوا الخ اعلم ان الکافر علی ثلثة اقسام احدها الذی یتوب عن الکفر توبة صحیحة مقبولة وهو الذی ذکره اللّٰه تعالٰی فی قوله الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا وثانیها الذی یتوب عن ذلک الکفر توبة فاسدة وهو الذی ذکره اللّٰه تعالٰی فی الآیة المتقدمة وقال اللّٰه لن یقبل توبة وثالثها الذی یموت علی الکفر من غیر توبة البتة وهو المذکور فی هذه الآیة لن تنالوا البر الخ اعلم انه تعالٰی لما بین ان الانفاق لاینفع الکافر البتة علم المؤمنین کیفیة الانفاق الذی ینتفعون به فی الآخرة کل الطعام کان حلا الخ اعلم ان الآیات المتقدمة الی هذه الآیة کانت فی تقریر الدلائل الدالة علی نبوة محمد صلی اللّٰه علیه وسلم وفی توجیه الالزامات الواردة علی اهل الکتاب فی هذا الباب واما هذه الآیة فهی فی بیان الجواب عن شبهات القوم وفی ابی السعود وهو رد علی الیهود وتبکیت لهم فی ضنع النسخ والطعن فی دعوی الرسول صلی اللّٰه علیه وسلم موافقته لابراهیم علیه السلام بتحلیله لحوم الابل والبانها ان اول بیت وضع الخ فی

ابی السعود شروع فی بیان کفرهم ببعض آخر من شعائر ملته علیه السلام اثر بیان کفرهم بکون کل المطعومات حلاً له علیه السلام وفی الکبیر المراد منه الجواب عن شبهة اخری وذلک لانه علیه السلام لما حول الی الکعبة طعن الیهود فی نبوته فاجاب الله تعالیٰ بقوله ان اول بیت الخ وان الیهود والنصاری زعم کل فرقة منهم انه علی ملة ابراهیم وقد سبقت هذه المناظر فی الآیات المتقدمة فالله تعالیٰ بین کذبهم من حیث ان حج الکعبة کان ملة ابراهیم والیهود والنصاری لایحجون فیدل هذا علی کذبهم فی ذلک ولله علی الناس الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر فضائل البیت ومناقبه اردفه بذکر ایجاب الحج قل یاهل الکتاب لم تکفرون الخ لما اورد الدلائل علی نبوة محمد صلی الله علیه وسلم ثم ذکر عقیب ذلک شبهات القوم فالشبهة الاولی ما یتعلق بانکار النسخ واجاب عنها بقوله کل الطعام والشبهة الثانیة ما یتعلق بالکعبة ووجوب استقبالها فی الصلوة ووجوب حجها واجاب عنها بقوله وان اول بیت فعند هذا تممت وظیفة الاستدلال وکمل الجواب عن شبهات ارباب الضلال فبعد ذلک خاطبهم بالکلام اللین وقال لم تکفرون بآیات الله بعد ظهور البینات وزوال الشبهات یایها الذین آمنوا ان تطیعوا الخ واعلم انه تعالیٰ لما حذر الفریق من اهل الکتاب عن الاغواء والاضلال حذر المؤمنین عن اغوائهم واضلالهم ومنعهم عن الالتفات الی قوله یایها الذین آمنوا اتقوا الله الخ اعلم انه تعالیٰ لما حذر المؤمنین من اضلال الکفار ومن تلبیساتهم فی الآیة الاولی امر المؤمنین فی هذه الآیات بجوامع الطاعات ومعاقد الخیرات ولتکن منکم امة الخ اعلم انه تعالیٰ فی الآیات المتقدمة عاب اهل الکتاب علی شیئین احدهما انه عابهم علی الکفر ثم بعد ذلک عابهم علی سعیهم فی القاء الغیر فی الکفر فلما انتقل منه الی مخاطبة المؤمنین امرهم اولا بالتقوی والایمان ثم امرهم بالسعی فی القاء الغیر فی الایمان والطاعة فقال ولتکن الخ کنتم خیر امة الخ فی ابی السعود کلام مستانف سیق لتثبیت المؤمنین علی ما هم علیه من الانفاق علی الحق والدعوة الی الخیر ولو آمن اهل الکتٰب الخ المقصود من هذا الکلام ترغیب اهل الکتاب فی هذا الدین ضربت علیهم الذلة الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین انهم ان قاتلوا رجعوا مخذولین غیر منصورین ذکر انهم مع ذلک قد ضربت علیهم الذلة لیسوا سواء الخ فی ابی السعود جملة مستانفة سیقت تمهید التعداد محاسن مؤمن اهل

الکتاب وتذکیرا لقوله تعالٰی منهم المؤمنونَ ان الذین کفروا لن تغنی الخ لما وصف من آمن من الکفار بما تقدم من الصفات الحسنة اتبعه تعالٰی بوعید الکفار مثل ما ینفقون الخ اعلم انه تعالٰی لما بین ان اموال الکفار لاتغنی عنهم شیئا ثم انهم ربما انفقوا اموالهم فی وجوه الخیرات فیخطر ببال الانسان انهم ینتفعون بذٰلک فازال اللّٰہ تعالٰی بهذه الآیة تلک الشبهة یایها الذین آمنوا لاتتخذوا الخ اعلم انه تعالٰی لما شرح احوال المؤمنین والکفرین شرع فی تحذیر المؤمنین عن مخالطة الکفرین فی هذه الآیة هانتم اولاء الخ اعلم ان هذا نوع آخر من تحذیر المؤمنین عن مخالطة المنافقین ان تمسسکم الخ فی ابی السعود بیان لتناهی عداوتهم الخ واذ غدوت الخ اعلم انه تعالٰی لما قال وان تصبروا وتتقوا لایضرکم کیدهم شیئا اتبعه بما یدلهم علی سنة اللّٰہ فیهم فی باب النصر والمعونة ودفع مضار العدو اذاهم صبروا واتقوا وخلاف ذلک فیهم اذا لم یصبروا ولقد نصرکم اللّٰہ ببدر الخ فی ابی السعود جملة مستانفة سیقت لایجاب الصبر والتقوی بتذکیر ما ترتب علیهما من النصر اذر تذکیر ما ترتب علی ما عدمهما من الضرور وقیل لایجاب التوکل علی اللّٰہ تعالٰی بتذکیر ما یوجبه وما جعله اللّٰہ الا بشری الخ مسوق من جنابة تعالٰی لبیان ان الاسباب الظاهرة بمعزل من التاثیر وان حقیقة النصر مختص به عز وجل لیثق به المؤمنون ولایقنطوا منه عند فقد ان اسبابه لیس لک من الامر الخ فی ابی السعود اعتراض لتحقیق ان لا تاثیر للمنصورین اثر بیان ان لاتاثیر للناصرین یایها الذین آمنوا لاتأکلوا الخ فی ابی السعود کلام مبتدأ مشتمل علی ما هو ملاک الامر فی کل باب لاسیما فی باب الجهاد من التقوی والطاعة وما بعدهما من الامور المذکورة علی نهج الترغیب والترهیب جئ به فی تضاعیف القصة مسارعة ای ارشاد المخاطبین الی ما فیه وایذان بکمال وجوب المحافظة علیه فیما هم فیه من الجهاد فان الامور المذکورة فیه مع کونها مناطا للفوز فی الدارین علی الاطلاق عمدة فی امر الجهاد علیها بدر فلک النصر والغلبة کیف لا ولو حافظوا علی الصبر والتقوی وطاعة الرسول صلی اللّٰہ علیه وسلم لما لقوا ما لقوا ولعل ایراد النهی عن الربا فی اثنائها لما ان الترغیب فی تحصیل المال فکان مظنة مبادرة الناس الی طرق الاکتساب ومن جملتها الربا فنهوا عن ذلک قد خلت من قبلکم الخ فی ابی السعود رجوع الی تفصیل بقیة القصة بعد تمهیده مبادی الرشد والصلاح وترتیب

مقدمات الفوز والفلاح ولا تهنوا الخ في ابى السعود تشجيع للمؤمن وتقوية لقلوبهم وتسلية عما اصابهم يوم احد من القتل والقرح ان يمسسكم الخ هذا من اتمام قوله ولا تهنوا ام حسبتم الخ اعلم انه تعالىٰ لما بين فى الآية الاولى الوجوه التى هى الموجبات والمؤثرات فى مداولة الايام ذكر فى هذه الآية ما هو السبب الاصلى لذلک فقال ام حسبتم ان تدخلوا الجنة بدون تحمل المشاق وما كان لنفس الخ فى ابى السعود كلام مستأنف سيق للتنبيه على خطأهم فيما فعلوا حذرا من قتلهم وبناء على الارجاف بقتله عليه السلام وكاين من نبى الخ فى ابى السعود كلام مبتدأ ناع عليهم تقصيرهم وسوء صنيعهم فى صدورهم عن سنن الربانيين المجاهدين فى سبيل اللّٰه مع الرسل الخالية عليهم السلام وما كان قولهم الخ فى ابى السعود كلام مبيّن لمحاسنهم القولية معطوف على ما قبله من الجمل المبيّنة لمحاسنهم الفعلية فاتاهم اللّٰه ثواب الدنيا الخ اعلم انه تعالىٰ لما شرح طريقة الربيين فى الصبر وطريقتهم فى الدعاء ذكر ايضا ما ضمن لهم فى مقابلة ذلک فى الدنيا والآخرة يايها الذين آمنوا ان تطيعوا الخ واعلم ان هذه الآية من تمام الكلام الاول وذلک ولان الكفار لما ارجفوا ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قد قتل ودعا المنافقون بعض ضعفة المسلمين الى الكفر منع المسلمين بهذه الآية عن الالتفات الى كلام اولٰئک المنافقين سنلقى فى قلوب الخ اعلم ان هذه الآية من تمام ما تقدم ذكره فانه تعالىٰ ذكر وجوهًا كثيرة فى الترغيب فى الجهاد وعدم المبالاة بالكفار ومن جملتها ما ذكر فى هذه الآية انه تعالىٰ يلقى الخوف فى قلوب الكفار ولاشک ان ذلک مما يوجب استيلاء المسلمين عليهم ولقد صدقكم الخ لما وعدهم اللّٰه تعالىٰ فى الآية المتقدمة القاء الرعب فى قلوبهم اكد ذلک بان ذكرهم ما انجزهم من الوعد بالنصر فى واقعة احد ثم انزل عليكم الخ انه تعالىٰ لما بين انه نصر المؤمنين اولا فلما عصى بعضهم سلط الخوف عليهم ثم ذكر انه ازال ذلک الخوف عن قلب من كان صادقا فى ايمانه مستقرا على دينه بحيث غلب النعاس عليه يايها الذين آمنوا لاتكونوا الخ اعلم ان المنٰفقين كانوا يعيرون المؤمنين فى الجهاد مع الكفار بقولهم لو كانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا ثم انه لما ظهر عن بعض المؤمنين فتور وفشل فى الجهاد حتى وقع يوم احد ما وقع وعفا اللّٰه بفضله عنهم ذکر فى هذه الآية ما يدل على النهى عن ان يقول احد من المؤمنين مثل مقالتهم فبما رحمة

من اللّٰہ الخ فی ابی السعود تلوین للخطاب وتوجیه له الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم والفاء لترتیب مضمون الکلام علی ما ینبئ عنه السیاق من استحقاقهم اللائمیة والتعنیف بموجب الجبلة البشریة او من سعة مساحة مغفرته تعالٰی ان ینصرکم اللّٰہ الخ فی ابی السعود جملة مستأنفة سیقت بطریق تلوین الخطاب تشریفا للمؤمنین لایجاب توکلهم علیه تعالٰی وحثهم علی اللجا الیه وتحذیرهم عما یفضی الی خذلانه وما کان لنبی الخ اعلم انه تعالٰی لما بالغ فی الحث علی الجهاد اتبعه بذکر احکام ومن جملتها المنع من الغلول افمن اتبع الخ اعلم انه تعالٰی لما قال ثم توفی اتبعه بتفصیل هذه الجملة وبین ان جزاء المطیعین ما هو وجزاء المسیئین ما هو لقد من اللّٰہ علی المؤمنین الخ لما بین خطأهم من نسبته الی الغلول والخیانة اکد ذلک بهذه الآیة وذلک لان هذا الرسول ولد فی بلدهم ونشأ فیما بینهم ولم یظهر منه طول عمره الا الصدق والامانة والدعوة الی اللّٰہ والاعراض عن الدنیا فکیف یلیق بمن هذا حاله الخیانة او لما اصابتکم الخ فی ابی السعود کلام مبتدأ مسوق لابطال بعض ما صدر عنهم من الظنون الفاسدة والاقاویل الباطلة الناشئة منها اثر ابطال بعض آخر منها وما اصابکم الخ اعلم ان هذا متعلق بما تقدم من قوله او لما اصابتکم فذکر فی الآیة الاولی انها اصابتهم بذنبهم ومن عند انفسهم وذکر فی هذه الآیة انها اصابتهم بوجه آخر وهو ان یتمیز المؤمن عن المنافق الذین قالوا لاخوانهم الخ اعلم ان الذین حکی عنهم انهم قالوا لو حلم قتالا لاتبعناکم وصفهم اللّٰہ تعالٰی بانهم کما قعدوا واحتجوا القعود هم فکذلک ثبطوا غیرهم واحتجوا لذلک ولاتحسبن الذین قتلوا الخ فی ابی السعود کلام مستأنف مسوق لبیان ان القتل الذی یحذرونه ویحذرون الناس منه لیس مما یحذر بل هو من اجل المطالب التی یتنافس فیها المتنافسون اثر بیان ان الحذر لایجدی ولایغنی یستبشرون بنعمة الخ فی ابی السعود کر لبیان ان الاستیشار المذکور لیس بمجرد عدم الخوف والحزن بل به وبما یقارنه من نعمة عظیمة لایقادر قدرها وهی ثواب اعمالهم وقد جواز ان یکون الاول متعلق بحال اخوانهم وهذا بحال انفسهم بیانا لبعض ما اجمل فی قوله تعالٰی فرحین الذین استجابوا الخ اعلم ان اللّٰہ تعالٰی مداح المؤمنین علی غزوتین تعرف احداهما بغزوة حمراء الاسد والثانیة بغوة بدر الصغری وکلاهما متصلة بغزوة احدا ما غزوة حمراء الاسد فمهی المراد من هذه الآیة الذین قال لهم الناس الخ نزلت

فی غزوۃ بدر الصغری ولایحزنک الخ فی ابی السعود تلوین للخطاب وتوجیه له الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لتشریفة بتخصیصه بالتسلیة والا لان باصالته فی تدبیر امور الدین والاهتمام بشؤنه ولایحسبن الذین کفروا الخ قال المسکین له جواب عن ما یتوهم ان الکفار الذین اوعدو اللّٰہ تعالیٰ نراهم فی خصب وسعة فکیف هذا فاجاب عنه فی هذه الآیة ما کان اللّٰہ لیذر المؤمنین الخ هذه الآیة من بقیة الکلام فی قصة احد ولا یحسبن الذین یبخلون الخ اعلم انه تعالیٰ لما بالغ فی التحریض علی بذل النفس فی الجهاد فی الآیات المتقدمة شرع ههنا فی التحریض علی بدل المال فی الجهاد وبین الوعید الشدید لمن یبخل ببذل المال فی سبیل اللّٰہ لقد سمع اللّٰہ الخ لما امر المکلفین ببذل النفس والمال فی سبیل اللّٰہ شرع بعد ذلک فی حکایة شبهات القوم فی الطعن فی نبوته فاشبهة الاولی انه تعالیٰ لو طلب الانفاق فی تحصیل مطلوبه لکان فقیرا ولما کان الفقر علی اللّٰہ تعالیٰ محالا کان ذلک یدل علی کذب اسناد هذا الطلب الی اللّٰہ تعالی الذین قالوا الخ اعلم ان هذه هی الشبهة الثانیة للکفار فی الطعن فی نبوته صلی اللّٰہ علیه وسلم کل نفس الخ فی ابی السعود وعد ووعید للمصدق والمکذب لبتلون فی اموالکم الخ فی ابی السعود شروع فی تسلیة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ومن معه من المؤمنین عما سیلقونه من جهة الکفرة من المکارة اثر تسلیتهم عما قد وقع منهم لیوطنوا انفسهم علی احتماله عند وقوعه واذ اخذنا میثاق الخ فی ابی السعود کلام مستأنف سیق لبیان بعض اذیاتهم وهو کتمانهم من شواهد نبوته علیه السلام وغیرها لایحسبن الذین یفرحون الخ فی ابی السعود الجملة مسوقة لبیان ما تستتبعه اعمالهم المحکیة من العقاب الاخروی اثر بیان قباحتها وقد ادمج فیها بیان بعض آخر من شنائعهم وهو اصرارهم علی ما هم علیه من القبائح وفرحهم بذلک ومحبتهم لان یوصفوا بما لیس فیهم من الاوصاف الجمیلة ان فی خلق السمٰوٰت الخ اعلم ان المقصود من هذا الکتاب الکریم جذب القلوب والارواح من الاشتغال بالخلق الی الاستغراق فی معرفة الحق فلما طال الکلام فی تقریر الاحکام والجواب عن شبهات المبطلین عاد الی انارة القلوب بذکر ما یدل علی التوحید والالٰهیة والکبریاء والجلال الذین یذکرون الخ اعلم انه تعالیٰ ذکر دلائل الالٰهیة والقدرة والحکمة وهو ما یتصل بتقریر الربوبیة ذکر بعدها ما یتصل بالعبودیة فاستجاب لهم

الخ بین فی هذه الآیة انه استجاب دعاءهم لایغرنک الخ اعلم انه تعالیٰ لما وعد المؤمنین بالثواب العظیم وکانوا فی الدنیا فی نهایة الفقر والشدة والکفار کانوا فی النعم ذکر اللّٰه تعالیٰ فی هذه الآیة ما یسلیهم ویصبرهم علی تلک الشدة لکن الذین اتقوا الخ لما ذکر الوعید اتبعه بالوعد وان من اهل الکتٰب الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر المؤمنین وکان قد ذکر حال الکفار من قبل بان مصیرهم الی النّار بین فی هذه الآیة ان من آمن منهم کان داخلا فی صفة الذین اتقوا فی ابی السعود جملة مستانفة سیقت لبیان ان اهل الکتاب لیس کلهم کمن حکیت هناتهم من نبذ المیثاق وتحریف الکتاب وغیر ذلک بل منهم من له مناقب جلیلة یایها الذین آمنوا الخ فی ابی السعود اثر ما بین فی تضاعیف السورة الکریمة فنون الحکم والاحکام ختمت بما یوجب المحافظة علیها.

(جلد اول مکمل)

فہرست مضامین

سُوْرَةُ الفَاتِحَة

سُوْرَةُ البَقَرَة

قرآن کریم کے معانی ومطالب سے واقف کرانے کیلئے، واضح عربی متن تحت اللفظ
بامحاورہ آسان ترجمہ، عام فہم مختصر اور جامع تفسیر پر مشتمل آسان تعلیمی

درسِ قرآن

تسہیل شدہ ترجمہ

از حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ

تفسیر ملخص از تفسیر ابنِ کثیر، معارف القرآن، بیان القرآن ودیگر تفاسیر

اگر آپ روزانہ پندرہ بیس منٹ قرآن پاک کو دیں اور اس "درسِ قرآن" سے ایک درس پڑھیں تو انشاء اللہ آپ قرآنِ کریم کے معانی ومطالب کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اے ابوذر! اگر تو صبح کو ایک آیت کلامِ پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے، اور اگر علم کا ایک باب سیکھ لے تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے افضل ہے۔

آیئے! ہم بھی روزانہ ایک درس قرآن پڑھنے کا معمول بنائیں اور اجر وبرکات حاصل کریں۔

ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان 061-540513-519240 ©
Email:Taleefat@mul.wol.net.pk/Website: www.taleefat-e-ashrafia.co

پاکستان میں پہلی بار جدید کمپیوٹر کتابت کے ساتھ بڑے سائز میں

و

رفع الشکوک مع زوائد مسائل السلوک من کلام ملک الملوک

وجوہ المثانی مع توجیہ الکلمات والمعانی (عربی)

حضرت حکیم الامت مجدد الملت جامع الکمالات منبع الحسنات ماہر العلوم القرآنیۃ واقف الاسرار الفرقانیۃ،
راس المفسرین مقدام الراسخین صاحب الشریعۃ والطریقۃ، بحر المعرفۃ والحقیقۃ کاشف الاسرار الخفی منحاد الجلی اعنی بہ

مولانا محمد اشرف علی التھانوی

نور اللہ مرقدہ وجعل الجنۃ مثواہ

تعارف و تقدیم فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی

عبد الشکور ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ

تفسیر بیان القرآن اور اس کے متعلقہ تمام رسائل کی جدید اشاعت کے لئے کمپوزنگ و ترتیب اس قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ جو خود حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا نظر فرمودہ ہے اور اس پر حضرت کی تصدیق اور دستخط ہیں نیز حضرت مولانا شبیر علی صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دستخط موجود ہیں یہ نسخہ ۱۳۵۲ھ میں مطبع اشرف المطابع تھانہ بھون سے شائع ہوا تھا۔

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان 061-540513-519240 ©

E-mail: ishaq90@hotmail.com//Website: www.taleefat-e-ashrafia.co

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ النسآء...... تا ...... سورۃ بنی اسرآئیل

تقدیم وکاوش

شیخ الاسلام فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

نظر ثانی

عالم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ

مرتب

حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ
(خلیفہ ارشد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ)

حکیم الامت مجدد الملت
حضرت مولانا
اشرف علی تھانوی قدس سرہ
کے جملہ خطبات
ملفوظات اور تقریباً
جملہ تصانیف سے
منتخب سینکڑوں الہامی
تفسیری نکات

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-0322-6180738)

اشرف التفاسیر

تاریخ اشاعت............ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ
ناشر..........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.................سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ.....ملتان　اسلامی کتاب گھر.. خیابان سرسید عظیم مارکیٹ....راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی........لاہور　دارالاشاعت........اُردو بازار..........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.....لاہور　ادارۃ الانور.........نیو ٹاؤن..........کراچی
مکتبہ رحمانیہ........اُردو بازار .... لاہور　مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار.....پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K　119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE　BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے الہامی تفسیری نکات کے اس مجموعہ کو جو عوام و خواص میں مقبولیت ہوئی وہ محتاج بیاں نہیں۔

اہل علم اور تفسیری ذوق کے افراد نے اس مجموعہ کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور خوب استفادہ کیا۔

حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے خطبات وملفوظات سے مزید تفسیری نکات کا اضافہ کیا گیا۔

قرآنی سورتوں کی ترتیب اور ربط پر مشتمل عربی رسالہ ''سبق الغایات فی نسق الآیات'' بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں ملحق کر دیا گیا ہے۔

اس جدید ایڈیشن میں ممکنہ حد تک از سر نو تصحیح کا اہتمام کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ علم دوست حضرات اس اضافہ و تصحیح شدہ ایڈیشن کو پہلے سے بہتر پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ اس جدید ایڈیشن کو شرف قبولیت سے نوازیں۔ آمین

والسلام

احقر محمد اسحاق غفرلہ

ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ، دسمبر 2009ء

اجمالی فہرست

سُوْرَةُ النِّسَـــاء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

ترجمہ: پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو

قرآن کریم کی اس آیت پر ایک اشکال اور اس کا جواب

فرمایا سید احمد نے کہا اور پھر ڈپٹی نذیر احمد نے اس کا اتباع کیا یہ دعویٰ کیا کہ ایک عورت سے زیادہ نکاح کرنا جائز نہیں اور دلیل یہ پیش کی کہ فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة' اس سے معلوم ہوا کہ اگر عدل نہ ہو سکے تو ایک سے زائد نکاح کرنا جائز نہیں ایک مقدمہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے وہ دوسری جگہ ہے۔ ولن تستطیعوا ان تعدلو بین النساء ولو حرصتم اس سے معلوم ہوا عدل کی قدرت ہی نہیں ایک تو موٹا جواب ہے کہ اللہ میاں کو اتنے ہیر پھیر کی ضرورت ہی کیا تھی صاف کہہ دیتے کہ ایک سے زائد نکاح جائز نہیں دوسرا یہ کہ چودہ سو برس تک کسی نے اس آیت کو نہ سمجھا حتیٰ کہ حضور ﷺ نے بھی نہ سمجھا آپ ہی نے سمجھا یہ تو موٹی بات تھی۔ باقی حقیقت دلیل کی یہ ہے کہ ایک تو ہے عدل فی المعاملہ اور ایک ہے عدل فی المحبة' تو فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة جو ممانعت ہے وہ یہ کہ اگر عدل فی المعاملہ نہ ہو سکے تو ایک سے زائد نکاح نہ کرو اور دوسری آیۃ میں جو ہے ولن تستطیعوا ان تعدلوا الایہ وہاں مراد عدل فی المحبة ہے۔ جب یہ اس کی قدرت میں ہے نہیں تو اس پر دوسرا مقدمہ ملاتا ہوں۔ لا یکلف الله نفسا الا وسعها کہ عدل فی المحبة کا حکم ہی نہیں وہ غیر اختیاری ہے جب میل ہو گا ایک جانب ہو گا تو فرماتے ہیں فلا تمیلو اکل المیل' یعنی محبت کی وجہ سے بعض المیل کی تو اجازت ہے جو کہ عدل فی المعاملہ کو مانع نہیں باقی کل المیل نہ ہو جس سے عدل فی المعاملہ بھی نہ ہو سکے۔ فتذروها کا لمعلقه ضمیر حال عنها کی طرف راجع ہے کہ اس کو بالکل معلقہ چھوڑ دو فتذروها کالمعلقه صریح قرینہ ہے اس بات کی کل المیل کی ممانعت ہے بعض المیل کی اجازت ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵)

میاں بیوی کے مال پر بھی طیب نفس شرط ہے۔ یہ آیت ازواج کے متعلق ہے کہ اگر وہ اپنے مہر میں سے کچھ تم کو طیب نفس کے ساتھ دیدیں تو اس کا کھانا اور لینا جائز ہے۔ ظاہر ہے میاں بیوی کا تعلق کیسا کچھ ہوتا ہے کہ اس تعلق سے زیادہ کوئی تعلق بے تکلفی کا نہیں ہوسکتا۔ جب یہاں بھی طیب نفس کی شرط ہے تو اور جگہ طیب نفس کی ضرورت کیوں نہ ہوگی اور حدیث میں ہے۔

الا لا یحل مال امرء مسلم الابطیب نفس منه

اور اذن بطیب نفس کی حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کے عدم اذن پر بھی قدرت ہو اور تجربہ یہ ہے کہ یہاں مرید پیر کے استیذ ان کے بعد عدم اذن پر قادر نہیں ہوتا اس لئے اذن معتبر نہیں) ارضاء الحق حصہ دوم)

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾

ترجمہ: اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا پھر اگر یہ لوگ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی میں شریک ہوں گے۔ وصیت نکالنے کے بعد جس کی وصیت کر دی جائے یا دین کے بعد بشرطیکہ کسی کو ضرر نہ پہنچاوے یہ حکم کیا گیا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں۔ حکیم ہیں۔

دوسری آیت یہ ہے إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۗ

ترجمہ: اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو (اور نہ ماں باپ) اور اس کے (ایک عینی یا علاتی بہن) ہو تو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث ہوگا اور اگر (وہ بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو اور (والدین بھی نہ ہوں) اور اگر بہنیں دو ہوں یا زیادہ تو اس کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا اور اگر وارث چند بھائی بہن ہوں مرد عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر ملے گا۔

آیت کلالہ سے متعلق ایک عجیب نکتہ

قرآن مجید میں دو آیتیں فرائض کے متعلق جس میں کلالہ کا حکم مذکور ہے ایک عجیب نکتہ بیان کیا سب کا اجماع ہے کہ پہلی آیت میں اخوت واخوات اخیافیہ کا حکم مذکور ہے اور دوسری میں اعلانیہ وعلاتیہ کا اور دلیل اس کی ہمارے لئے اجماع ہے اور اہل اجماع کے لئے پہلی آیت میں قرأت بزیادہ من ام ہے نکتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ غور کرنے سے خود قرآن میں بھی اس کا قوی اور قریب قرینہ ہے وہ یہ کہ پہلی آیت سے کچھ اوپر سہام ابوین کے مذکور ہوئے ہیں۔ وَلِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ۔ السُّدُسُ پس اس میں ماں کو ہر حالت میں ذی فرض فرمایا ہے اور فرض دو قسم کا ہے سدس اور ثلث اور باپ کو ایک حالت میں ذی فرض اور ایک حالت میں عصبہ فرمایا ہے آگے آیات کلالہ میں بھی ایک جگہ اخوۃ واخوات کو ہر حال میں ذی فرض قرار دیا ہے سدساً وثلثاً اور یہی حالت تھی ان کی تو یہ قرینہ اس کا ہے کہ یہ من الام ہیں کہ ان کا حکم مستفاد ہوا ماں سے اور دوسری جگہ اخوۃ اور اخوات کو بعض حالات میں ذی فرض اور بعض حالات میں عصبہ قرار دیا ہے اور یہی حالت تھی باپ کی اور یہ قرینہ ہے اس کا کہ یہ اخوۃ واخوات باپ میں تو ضرور شریک ہیں خواہ مع الاشتراک فی الام خواہ بدونہٗ

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۷﴾

ترجمہ: توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں اور یہ اللہ خوب جانتے ہیں حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

جہالت کی حقیقت

فرمایا اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ میں صوفیہ کے نزدیک بجہالت کی قید واقعی ہے احترازی نہیں پس وہ فرماتے ہیں کہ جہالت کے بغیر کوئی گناہ ہو ہی نہیں سکتا' وہ گناہ عمد کو بھی جہالت ہی سے صادر

ہونے والا سمجھتے ہیں کیونکہ علم جو مقابل ہے جہل کا اور اس کی تعریف ان کے ہاں اعتقاد جازم مطابق للواقع مع غلبۃ الحال ہے اور گناہ کرنے کے وقت غلبہ حال مفقود ہوتا ہے اس لئے گناہ جہل ہی سے ہوگا۔ یعنی جس وقت عقوبت گناہ کا کامل استحضار ہو اس وقت گناہ ہو ہی نہیں سکتا' الزانی وھو مومن میں ایمان کی نفی اسی حال کی نفی ہے پس غلبہ حال ہی سے گناہ سے رک سکتے ہیں اور یہ شبہ کہ یہ غلبہ حال اختیاری چیز نہیں اس طرح مدفوع ہے کہ یہ غلبہ تکرار مراقبہ اور استحضار سے حاصل ہو جاتا ہے اور تکرار استحضار اختیاری ہے۔ پس اس سے جو حال پیدا ہو وہ بھی اختیاری ہے جیسا ابصار (فتح عین) تو اختیاری ہے اور نظر آنا فی نفسہٖ غیر اختیاری ہے مگر فتح العین اس کا سبب جو کہ اختیاری ہے اس لئے ابصار کو بھی اختیاری ہی کہا جا سکتا ہے (فیوض الخالق)

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ الخ (ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ان لوگوں کے لئے ہے جو جہالت سے برے کام کرتے ہیں یا پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں پس یہ لوگ ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے توجہ فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والے اور حکمت والے ہیں۔

نص کا مدلول چار طرح سے ثابت ہے

اہل علم کو معلوم ہے کہ نص کا مدلول چار طرح سے ثابت ہوتا ہے اول عبارۃ النص دوم اشارۃ النص سوم اقتضاء النص چہارم دلالۃ النص آیت میں مدلول بعبارۃ النص تو اور مضمون ہے اور اس سے میرا مدعا ثابت نہیں میرا مدعا مدلول باشارۃ النص سے ہے عبارۃ النص کو اور اشارۃ النص کو اصطلاحاً تو اہل علم جانتے ہی ہیں لیکن عوام کے فہم کے لئے یہاں صرف ان دونوں کی حقیقت مختصراً بیان کرتا ہوں جس مضمون کے لئے متکلم نے کلام کو وارد کیا ہے وہ تو مدلول بعبارۃ النص ہے اور مدلول باشارۃ النص یہ ہے کہ اس کے لئے کلام کا مسوق تو نہیں ہوا لیکن وہ مضمون نص کے الفاظ ہی سے نکلتا ہے اب سمجھئے کہ عبارۃ النص کا مدلول تو یہاں صرف یہ ہے کہ قبول توبہ کی شرط بیان کرنا منظور ہے کہ قبول توبہ جب ہوگا کہ گناہ جہالت سے ہو جاوے اور فوراً توبہ کر لے اور اس سے دوسرا مضمون اشارۃ ایک اور معلوم ہو گیا گو اس کے لئے کلام وارد نہیں کیا گیا وہ یہ کہ صدور معصیت ہمیشہ جہالت سے ہوگا اور اسی سے میرا مدعا ثابت ہوگا اور یہ مضمون بھی صریح لفظوں سے مدلول آیت کا ہے مگر عبارۃ النص سے نہیں اس لئے کلام مسوق نہیں ہے۔ بلکہ اشارۃ النص سے ثابت ہے جو قطعیت میں عبارۃ النص کے برابر ہے باقی خود یہ مضمون کہ صدور معصیت کا ہمیشہ جہالت سے ہوتا ہے اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے وہ یہ ہے کہ نص کے اندر جو یہ بجہالۃ کی قید ہے یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر قید احترازی لی جاوے گی تو اس کا قائل ہونا پڑیگا کہ اگر کوئی جان کر گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہو حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ گناہ خواہ جان کر ہو یا انجان پن سے ہو توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کفر اور شرک جو جان کر ہی کئے جاتے ہیں ان

سے بھی توبہ ہو جاتی ہے پس یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں پس معنی یہ ہیں کہ گناہ ہمیشہ جہالت سے ہوتا ہے اب اگر کوئی کہے کہ جب گناہ ہمیشہ جہالت ہی سے ہوتا ہے تو اس کے بتلانے سے کیا فائدہ۔

فائدہ اس کے بتلانے میں یہ ہے کہ بغیر اس قید کے بتلائے علاج کی طرف متنبہ نہ ہوتا یہ قید گویا مادہ مرض ہے مرض کا اگر مادہ نہ بتلایا جاوے تو معالجہ کے اندر اشکال ہوتا ہے مثلاً سوداویت کی وجہ سے مرض ہو اور اطلاع نہ کی جاوے تو ممکن ہے کہ بلغم کا مسہل پی لے اور بجائے نفع کے ضرر ہو اور اگر بتلا دیا جاوے گا تو مریض سودا ہی کی دوا پی لے گا۔ پس بجہالت کی قید سے یہ بتلا دیا کہ گناہ ہمیشہ جہالت سے ناشی ہوتا ہے۔ تا کہ معلوم ہو جاوے کہ جہل کا ازالہ گناہوں کا علاج ہے اب غور کرنا چاہئے کہ جہالت کے یہاں کیا معنی ہیں جو گناہ کے لئے لازم ہے سو قرآن مجید میں جہل کا لفظ بہت جگہ آیا ہے اور ہر جگہ ایک معنی نہیں اسی طرح علم کا لفظ بہت متعدد معانی میں آیا ہے اور علم و جہل میں تقابل ہے۔ جس قدر علم کی اقسام نکلیں گے اسی قدر جہل کی بھی اور علم کے تعین سے جہل کی بھی تعین ہو جائے گی اس لئے میں علم کی اقسام بیان کئے دیتا ہوں۔

علم و جہل کے معنی

علم کے ایک معنی تو دانستن ہیں۔ جس کو سب جانتے ہیں اس کے مقابلہ میں جہل کے معنی نادانستن ہیں دوسرے معنی علم کے عمل ہیں قرآن شریف میں اس معنی میں بھی علم کا استعمال آیا ہے چنانچہ علماء یہود کے بارہ میں ارشاد ہے وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی یہود جانتے ہیں کہ جو شخص سحر اختیار کرتا ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ان کے لئے ایک علم ثابت کیا ہے آگے ارشاد ہے وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ یعنی جس شے کے بدلہ انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے وہ بری شے ہے کاش وہ جانتے یہاں علم کی ان سے نفی فرمائی ہے معلوم ہوا کہ اس علم سے مراد دوسری قسم ہے علم کی ورنہ اجتماع نقیضین لازم آوے گا اور وہ قسم ترک عمل ہے پس معلوم ہوا کہ علم کے دو معنی ہیں، علم بمعنی دانستن اور عمل بالعلم پس جہل کے بھی دو معانی ہوئے ایک نادانستن دوسرے عدم العمل اور معنی ثانی جہل کے دوسرے مقام پر بھی آئے ہیں چنانچہ ارشاد قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ یہاں کفار کو جاہل فرمایا ہے یہاں جہل کے معنی نادانستن نہیں ہیں اس لئے کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خوب جانتے تھے پس معلوم ہوا کہ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ میں جہل سے مراد نادانستن نہیں بلکہ ترک عمل بالعلم ہے اور دیکھئے معجزات کی فرمائش کے بارہ میں ارشاد ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ یہاں بھی جہل کے مشہور معنی نہیں اس لئے کہ جہل بمعنی نادانستن تو مرتفع ہو چکا تھا اس لئے کہ حضور ﷺ کو حکم تھا بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ معلوم ہوا کہ **یجھلون** سے مراد **لا یعلمون** نہیں بلکہ **لا یعملون** ہے پس دو معنی تو علم اور جہل کے یہ تھے اب تیسرے معنے اور ہیں جس جگہ یہ دونوں معنی نہیں بن سکتے وہاں یہ تیسرے معنی مراد ہوتے ہیں اب میں کہتا ہوں کہ اس آیت

میں دونوں معنی نہیں بن سکتے اول معنی تو اس لئے نہیں ہو سکتے کہ اس سے لازم آوے گا کہ گناہ ہمیشہ نادانستگی سے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے اس لئے کہ گناہ بسا اوقات جان کر بھی ہوتا ہے اور دوسرے معنی یعنی عدم العمل اس لئے نہیں ہو سکتے کہ بجھالۃ قید یعملون السوء کی ہے۔ پس اگر بجہالۃ کے معنی علم پر عمل نہ کرنے کے ہوں گے تو مقید اور قید کا حاصل ایک ہی ہو جاوے گا اور یہ کلام قوۃ میں اس کے ہوگا یعملون السوء عاملین السوء اور قرآن پاک ہے اس سے کہ اس میں ایسا بے معنی کلام ہو۔ پس جب جہل کے دونوں معنی نہیں بن سکتے تو معنی ثالث متعین ہو گیا اب کوئی صاحب مہربانی فرما کر بتلائیں کہ وہ تیسرے معنی جہالت کے کیا ہیں جو اس آیت میں مراد ہیں ورنہ میں عرض کرتا ہوں کہ وہ معنی ثالث بجز غلبۃ الحال کے اور کچھ نہیں یعنی احکام شرعیہ کی محبت اور منہیات شرعیہ سے نفرت قلب میں رچ جائے اسی کا نام حال ہے اور اسی کو صوفیہ یقین بھی کہتے ہیں جس جگہ کتاب وسنت میں یقین کی تحصیل کا امر ہے اس سے یہی کیفیت مراد ہے پس جب گناہ صادر ہو گا اسی حال کے نہ ہونے سے ہوگا اور حال کے ہوتے ہوئے گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا اور یہی میرا مدعا تھا کہ ہماری ساری خرابیاں حال کے نہ ہونے سے ہیں یہ تو مجملاً اس کا اثبات آیت سے ہوا باقی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مومن کے اندر دو قوتیں رکھی ہوئی ہیں ایک قوت تو اس کو خیر پر حامل ہوتی ہے اور دوسری شر سے روکتی ہے اگر یہ دونوں قوتیں مغلوب ہیں اور کالعدم ہیں تو گناہ کا ہمیشہ صدور ہوگا اور اگر کسی وقت غالب ہیں اور کسی وقت مغلوب تو مغلوبیت کے وقت اس کیفیت مانعہ کا مشاہدہ نہیں ہوتا اس لئے اس وقت بھی گناہ اس سے صادر ہوگا اور غالبیت کے وقت صادر نہ ہوگا اور اگر قریب قریب ہر وقت ان کا غلبہ ہے کسی وقت مغلوبیت نہیں ہوتی الا نادراً اسی کا نام حال ہے ایسے شخص سے گناہ کا ارتکاب نہ ہوگا۔ دیکھئے ہر مسلمان جانتا ہے کہ زنا حرام ہے شراب پینا حرام ہے ترک صلوۃ حرام ہے۔ مگر یہ علم بہت سے مسلمانوں کو گناہ سے نہیں روکتا تو اس کی کیا وجہ ہے وجہ یہی ہے کہ حال نہیں ہے اور جو مغلوب الحال ہے وہ خدا کی نافرمانی نہ کرے گا۔

دوام ترک معاصی عادۃ حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے

پس معلوم ہو گیا کہ دوام ترک معاصی عادۃ حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے اور ترک معاصی علی الدوام واجب ہے اور مقدمۃ الواجب واجب تو حال کی تحصیل ہر مسلمان پر ضروری ہے دیکھو حدیث شریف سے اس مضمون کی صاف تائید ہوتی ہے ارشاد لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن معتزلہ کو اس مقام پر لغزش ہوئی وہ اس حدیث سے کہتے ہیں کہ زنا اور دیگر کبائر سے ایمان نہیں رہتا حالانکہ نصوص قطعیہ شاہد ہیں کہ عصاۃ مومنین بھی مومن ہیں چنانچہ بہت سی آیتوں میں ان کو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب ہے اس لئے اہل سنت کا عقیدہ ہے اور حق یہی ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور یہ حدیث اپنے ظاہر پر نہیں ہے اس کے معنی اور کچھ ہیں۔ محققین علمائے ظاہر نے اس معنی کو سمجھا

لیکن اس کی پوری شرح نہ کر سکے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مومن سے مراد حدیث میں مومن کامل ہے اور اس میں نفی ایمان کامل کی ہے مطلق ایمان کی نہیں ہے۔ یہ معنی نہایت لطیف اور بالکل صحیح ہیں لیکن ان حضرات نے یہ نہ بتلایا کہ وہ شے کونسی ہے کہ جس کے نہ ہونے سے اس کا ایمان ناقص ہوا اور اس کے ہونے سے کامل ہو جاتا ہے کہ جو اس کو گناہ نہ کرنے دیتی صوفیہ کرام نے اس راز سربستہ کو کھولا اور انہوں نے فرمایا کہ ہم بتلاتے ہیں ہم سے سنو وہ شے حال ہے اس کے نہ ہونے سے ایمان میں نقصان رہتا ہے اور اسی کے نہ ہونے سے آدمی گناہ سے رکتا اور سوائے حال کے کوئی اور شے نہیں ہے جو گناہ سے روک سکے اور بدوں اس کے اعمال اور عبادات کرنا ایسا ہے جیسے بے انجن کی گاڑی ہوتی ہے کہ اس کو مزدور ٹھیلتے ہیں جب تک وہ ٹھیلتے رہیں چلتی رہتی ہے اور جب ٹھیلنا موقوف کر دیں تو رک جاتی ہے اسی طرح ہمارے روزہ نماز کی گاڑی ہے کہ ہم اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس کو چلاتے ہیں اور بعض مرتبہ جب عاجز ہو جاتے ہیں تو رک جاتی ہے اور اگر انجن کے اندر چنگاری ڈال کر اس کو گاڑیوں سے متصل کر دیں پھر دیکھئے وہ روکنے سے نہ رکیں گی وہ چنگاری کیا ہے۔ حال بس وہ چنگاری ہمارے اندر نہیں ہے اگر وہ ہوتی تو اعمال شرعیہ ہم سے بے تکلف صادر ہوتے بلکہ بغیر عبادات کے ہم کو چین نہ آتا اس لئے کہ وہ آگ ہر وقت ہم کو حرکت دیتی۔

بز میں چو سجدہ کردم ز زمین ندا برآمد کہ مرا خراب کر دی تو ز سجدہ ریائی

جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریا کا سجدہ کر کے مجھے خراب کیا'

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند تو بردن درجہ کردی کہ درون خانہ آئی

(جب میں خانہ کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر بے نظیر

فرمایا اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (ا) (توبہ کرنا جس کا قبول اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے گناہ کر بیٹھتے ہیں) میں صوفیہ کے نزدیک بجہالت کی قید واقعی ہے احترازی نہیں پس وہ فرماتے ہیں کہ جہالت کے بغیر کوئی گناہ ہو ہی نہیں سکتا وہ گناہ (جو جان بوجھ کر کیئے) عمد کو بھی جہالت ہی سے صادر ہونے والا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ علم جو مقابل ہے۔ جہل کا اس کی تعریف ان کے ہاں اعتقاد جازم (سکون دینے والا یقین) مطابق للواقع مع غلبہ حال ہے اور گناہ کرنے کے وقت غلبہ حال مفقود ہوتا ہے اس لئے گناہ جہالت ہی سے ہو گا۔ یعنی جس وقت عقوبت گناہ کا کامل استحضار ہو اس وقت گناہ ہی نہیں سکتا الزانی وھو مومن میں ایمان کی نفی ہے پس غلبہ حال ہی سے گناہ سے رک سکتے ہیں (ملفوظات حکیم الامت ج۱۴ صفحہ ۶۰)

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شخص کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔

تفسیری نکات

مستورات کے لئے سفارش قرآن میں

یہ ہے کتاب اللہ کہ اس کی ایک اسی تعلیم کو دیکھ کر عقل سلیم والا کہہ اٹھے گا بے شک قرآن کتاب اللہ ہے فرماتے ہیں عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور اگر کسی وجہ سے وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت بھلائیاں رکھ دیں۔ ظاہر ہے کہ ناپسند ہونا کسی وجہ ہی سے ہوگا اور زیادہ تر عورتوں کے ناپسند ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اور یہ بات مرد کے لئے باعث اذیت ہے مگر اللہ تعالیٰ کا گویا وعدہ ہے کہ عورتوں کی بداخلاقی وغیرہ کو بھی خیر کثیر کا سبب بنادیں گے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مثلاً اس سے اولاد ہی ہو جائے گی جو قیامت میں اس شخص کی دستگیری کرے گی (کیونکہ قیامت میں ایسا بھی ہوگا کہ کسی شخص کے گناہ اس قدر ہوں گے جس کی وجہ سے اس کو دوزخ میں ڈال دینے کا حکم ہوگا مگر اس کا کوئی بچہ صغیر سن مر گیا ہوگا وہ کہے گا کہ میں اس وقت تک جنت میں نہ جاؤں گا جب تک میرا باپ نہ جائے گا چنانچہ اس کی خاطر سے باپ کو جنت مل جائے گی۔ حدیث میں اس قسم کی خبریں بکثرت آئی ہیں' کاتب) نیز عورتوں کی زبان درازی کی صورت میں خیر کثیر اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ مرد اس کی ایذارسانی پر صبر کرے اور صبر کی جزا جنت ہے ہی اور جنت کا خیر کثیر ہونا ظاہر ہے کیونکہ دنیا میں جو عورت سے تکلیف پہنچی وہ تھوڑی تھی چند روزہ تھی اور اس کے عوض جو راحت آخرت میں حاصل ہوگی وہ یقیناً زیادہ ہوگی کیونکہ وہ باقی اور دائمی ہوگی تو عورتوں کا سبب خیر کثیر ہونا صحیح ہوگیا ان صورتوں میں مرد کو چاہئے کہ حق تعالیٰ کے اس وعدہ پر نظر رکھے اور بیوی کی بداخلاقی پر نظر نہ کرے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیوی کو روک ٹوک بھی نہ کرے اصلاح ضرور کرے مگر نرمی کے ساتھ کبھی دھمکانا بھی برا نہیں مگر ستاوے نہیں اور زیادہ دھمکانا بھی اچھا نہیں جناب رسول ﷺ کے اخلاق بیبیوں کے ساتھ ایسے عجیب تھے کہ آج کل کے مدعیان تہذیب سنیں تو شاید حیرت کریں مگر ہمیں ان کی حیرت واستعجاب کی پرواہ نہیں ہم ان کی بیوقوفی پر

ہنسیں گے اور حضور ﷺ کے حالات واقعات کو کسی کی نکتہ چینی کے خوف سے مخفی نہ رکھیں گے ہمارا مذہب ایسا نہیں جس کی باتوں کو چھپا چھپا کر رکھا جاوے ہم علی رؤس الاشھاد ان کو پیش کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دنیا میں سب لوگ بے وقوف ہی نہیں بستے بہت سے اہل عقل بھی دنیا میں موجود ہیں جو ان باتوں کی قدر کریں گے۔

شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عورت کو راحت دو اس کو پریشان اور تنگ مت کرو نان نفقہ فراغت کے ساتھ اس کی دلجوئی کرو اس کی بہت سی ایذاؤں پر صبر کرو اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ پر نظر رکھو فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا۝ مسلمانوں کو بیبیوں کے ساتھ حضور ﷺ کے طرز عمل و معاشرت کے موافق عمل کرنا چاہئے متانت وغیرہ کو بالائے طاق رکھنا چاہئے متانت وہی ہے جو حضور ﷺ کے اعمال وافعال میں ہے خوب سمجھ لو۔

مسئلہ تساوی

بیان یہ ہو رہا تھا کہ قرآن میں عورتوں اور مردوں کے متعلق آیتیں مختلف مضامین کی آئی ہیں ایک وہ آیت ہے جس کا بیان ہو رہا ہے جس سے مردوں عورتوں کی تساوی معلوم ہوتی ہے اور بعض آیتوں سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے مثلاً وللرجال علیھن درجہ کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے زیادہ ہے اس کے آگے ہے۔ واللہ عزیز حکیم یہ جملہ تعلیلیہ ہے جس کا حاصل یہ ہوا اس فضیلت میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیوں کہ یہ اللہ کی دی ہوئی ہے جو غالب ہیں ان کے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں اور یہ حکم نرا حاکمانہ بھی نہیں کیونکہ وہ حکیم بھی ہیں انہوں نے جو کچھ بھی حکم دیا ہے حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا لہٰذا کچھ چوں و چرا کی گنجائش نہیں ایک آیت اور یاد آئی وہ یہ ہے وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْأَلُوا اللَّهَ جس کا شان نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ام سلمہ نے حسرت کے ساتھ تمنا کی کہ کاش ہم بھی مرد ہوتے تو مردوں کی طرح جہاد کرتے، اس پر یہ آیت اتری جس میں حق تعالیٰ نے ایسی تمنا کرنے سے منع فرمایا ہے اور ممانعت کا عنوان یہ ہے کہ ہم نے جو تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی تمنا ایک دوسرے کو نہ کرنی چاہئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اسی لئے تو حضرت ام سلمہ نے مرد ہونے کی تمنا کی تھی آگے اس آیت میں ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ یعنی مردوں کو ان کے عمل کی جزا ملے گی اور عورتوں کو ان کے عمل کی اس جملہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار عمل پر ہے اور جب مدار عمل پر ہے تو اگر عورت عمل زیادہ کرے تو مرد سے بھی بڑھ سکتی ہے حاصل یہ کہ یہ تین آیتیں ہیں ایک سے تساوی ثابت ہوتی ہے مرد وعورت میں اور ایک سے فضیلت مردوں کو عورتوں پر اور ایک سے یہ کہ عورت مرد سے بھی بڑھ سکتی ہے۔ ان آیتوں میں سے کسی ظاہر بین کو تعارض

کا شبہ ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں تعارض نہیں ہے۔ اور اس کا فیصلہ خود قرآن کی آیتوں میں موجود ہے اور یہ خاص شان ہے قرآن کی کہ یفسر بعضه بعضا یعنی قرآن اپنی شرح خود کرتا ہے اس کو دیکھ کر بے اختیار زبان پر آتا ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید ازوے رومتاب

سورج کے وجود کی دلیل یہی ہے کہ دیکھ لو سورج نکلا ہوا ہے اور دلیل کیا ہوتی ہے یہی قرآن کی شان ہے کہ جہاں کوئی اشکال پیدا ہو غور کر و وہیں اس کا حل بھی ہوگا اب آیتوں میں غور کیجئے پہلے میں ایک قاعدہ بیان کرتا ہوں اس کو سمجھ لیجئے پھر دیکھئے کہ آیتوں میں تعارض کہاں ہے......؟

اقسام فضائل

وہ قاعدہ یہ ہے کہ فضائل دو قسم کے ہیں ایک خلقی اور ایک مکتسب خلقی کہتے ہیں پیدائشی کو اور مکتسب کہتے ہیں ان صفات کو جو اختیار اور کسب سے حاصل ہوتی ہیں تو صفات خلقیہ میں تو مرد عورتوں سے بڑھے ہوئے ہیں جیسے کمال عقل شجاعت قوت عمل' تدبیر ان ملکات میں حق تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے عورت چاہے کیسی امیر زادی ہو کتنی ہی حسین و جمیل ہو چونکہ ان صفات میں وہ مردوں سے گھٹی ہوئی ہے اس لئے فرمایا لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اور جو صفات مکتسب ہیں یعنی جو حاصل ہوتی ہیں اور عمل اور اختیار سے جیسے اصلاح اخلاق و اعمال وغیرہ ان میں نہ مرد کو بڑھا ہوا کہہ سکتے ہیں نہ عورت کو بلکہ جو زیادہ کام کرے اور اخلاق فاضلہ اختیار کرے گا وہی بڑھا ہوا ہوگا اگر مرد کوشش کرے گا تو مرد بڑھ جاوے گا عورت کوشش کرے گی تو عورت بڑھ جاوے گی۔ یہ حاصل ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ کا ان دونوں کے علاوہ ایک قسم فضیلت کی اور ہے جس کو اصطلاح میں فضیلت اضافی کہنا چاہئے کیونکہ اس فضیلت کا منشاء خالق و عبد کا تعلق ہے یعنی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہ ہونا' سو یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے اس میں مرد و عورت دونوں مساوی ہیں عمل کسی کا ضائع نہ ہوگا۔

یہ اور بات ہے کہ ہر عامل میں تفاوت ہو لیکن اس قانون میں مساوات رہے گی کہ کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ تین قسم کے فضائل ہوئے فضائل خلقیہ اور فضائل مکتسبہ اور فضائل اضافیہ' اول میں مرد بڑھے ہوئے ہیں دوسرے میں کبھی مرد بڑھے ہوئے ہوں گے کبھی عورتیں' تیسرے میں دونوں برابر ہیں اب جو فضائل خلقیہ ہیں ان کی تمنا کرنا اور نہ حاصل ہونے پر دل شکستہ ہونا فضول بات ہے جیسے عورتیں یوں کہیں کہ کاش ہم بھی مرد ہوتے اور اس حسرت میں رات دن رویا کریں تو اللہ تعالیٰ اس سے منع فرماتے ہیں وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ کیونکہ جو چیز محض وہبی ہے اور ہمارے اختیار کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں نہ ہم اس کو اپنی سعی و کوشش سے حاصل کر سکتے ہیں تو اس کے لئے رونا رنج کرنا بے ہودہ حرکت نہیں تو اور کیا ہے؟ سوائے تضیع وقت کے اس میں کچھ بھی نہیں پھر

اس کی دھن میں آدمی دوسرے ضروری کاموں سے بھی رہ جاتا ہے جن کا حصول اختیاری ہے تو کون عقلمند اس صورت کو پسند کرے گا کہ وہی غیر اختیاری کے فکر میں رات دن مریں اور اس کے لئے رویا کریں اور تعطل سے مضرت میں پڑیں پس شریعت کی یہ تعلیم عین مطابق عقل اور بالکل صحیح تعلیم ہے کہ ایسی باتوں کی فکر میں مت پڑو جو تمہارے اختیار سے باہر ہیں مثلاً کوئی رات دن اس رنج میں رویا کرے کہ ہائے ہم نبی ہوتے یہ تو یقیناً احمق ہے کیونکہ نبوت تو ایک وہبی چیز ہے کسب سے کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتی رونے سے کیا فائدہ؟ اور فضائل مکتسبہ میں تمنا کرنا جائز ہے مگر صرف تمنا کرنا کافی نہیں بلکہ عمل کسب اور ہمت کی ضرورت ہے اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ کہ فضائل مکتبیہ اکتساب سے حاصل کرو کہ ان کا مدار صرف کسب پر ہے ہمت کرو نری تمنا سے کچھ نہیں ہوتا۔

امور اختیاری و غیر اختیاری

غرض خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ امور غیر اختیاریہ کی تو تمنا بھی نہ کرو اور امور اختیاریہ میں ہمت کرو اور یہ وعدہ یاد رکھو کہ کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ یہ کیسی پاکیزہ تعلیم ہے اور یہ تعلیم سالکین کے لئے نہایت کارآمد ہے سالک کو چاہئے کہ اس کو ہر وقت پیش نظر رکھے یہ ایک بڑا بھاری دستور العمل ہے کہ جو بات اس کے اختیار میں نہ ہو اس کے درپے نہ ہو اور جو بات اختیار میں ہو اس میں ہمت کرے مثلاً ذکر و شغل ہے ذوق و وجد ہے ان میں ذکر و شغل اختیاری چیزیں ہیں اور ذوق اور وجد اختیاری نہیں تو سالک کو چاہئے کہ ذکر و شغل جس قدر ہو سکے کرے یعنی جس قدر اس کا مربی تعلیم کرے اس کی پابندی رکھے اور ذوق و وجد کے پیچھے نہ پڑے بعض لوگ جب ذکر و شغل کرتے ہیں اور ذوق و وجد پیدا نہیں ہوتا دلگیر ہوتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ صاحب ہم کو ذکر و شغل کرتے ہوئے اتنے دن ہوئے اب تک کوئی بات ہی نہیں پیدا ہوئی یعنی ذوق و وجد کشف وغیرہ وغیرہ حاصل نہیں ہوا میں کہتا ہوں خدا کے بندے اگر یہ امور اختیاری ہیں (حالانکہ یہ غلط ہے) تو شکایت کیوں کرتے ہو کوشش کئے جاؤ پیدا ہو جاویں گے اور غیر اختیاری ہیں تو ان کے پیچھے کیوں پڑے اور کیوں رنج کیا۔ غرض رنج کرنا اور شکایت کرنا تو ہر حال میں بے سود ہے کام کرنا چاہئے جس کسی کو یہ امور حاصل ہوتے ہیں ان کے اختیار اور کسب کو اس میں دخل نہیں ہوتا ایسے ہی امور کے بارے میں ارشاد ہے وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ کہ ان باتوں کی تمنا مت کرو اپنا کام کئے جاؤ' غیر اختیاری امور تمنا سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ ان کے درپے ہونے سے بے حد پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔ کبھی اس پریشانی میں قبض ہو جاتا ہے پھر آدمی ذکر و شغل سب کچھ کرتا ہے مگر دل نہیں کھلتا کیونکہ یکسوئی نہیں ہوتی ہر وقت دل میں ایک بند لگا ہوا معلوم ہوتا ہے کبھی آدمی ان پریشانیوں سے گھبرا کر کام ہی کو چھوڑ بیٹھتا ہے حتیٰ کہ ضروری اعمال سے بھی محروم ہو جاتا ہے حاصل یہ کہ آیت وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ

میں یہ تعلیم ہے کہ امور غیر اختیاریہ کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے یہ بات سالکین کے لئے بڑے ہی کام کی ہے اس کی قدر کرنی چاہئے۔ یہ بات درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی۔

تمنا کی حقیقت

اصل بیان عورتوں کے متعلق ہو رہا تھا کیونکہ آیت لَا تَتَمَنَّوْا کی اصل مخاطب عورتیں ہی ہیں جیسا کہ شان نزول سے معلوم حضرت ام سلمہؓ نے تمنا کی تھی کہ ہم مرد ہوتے تو اچھا تھا اس پر یہ آیت اتری جس میں بتا دیا گیا کہ ایسی تمنا فضول ہے یہ تو قانونی جواب ہے کہ منع کر دیا گیا کہ ایسی تمنا فضول ہے۔ اور اس میں ایک راز بھی ہے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے جس کو مرد بنایا اس کے لئے یہی مناسب تھا اور جس کو عورت بنایا اس کے لئے بھی یہی مناسب تھا ہر شخص کو خدا تعالیٰ نے وہی دیا جو اس کے لئے مناسب تھا اس کی تفصیل کہاں تک کی جاوے اہل بصیرت خود سمجھ سکتے ہیں اور ذرا سے غور سے ہر موقع پر سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جس کو جیسا حق تعالیٰ نے بنا دیا ہے اس کے لئے وہی مناسب تھا۔ گو ہر شخص دوسرے کو دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ میں ایسا ہوتا اور اپنی حالت پر قناعت نہیں ہوتی لیکن غور کر کے دیکھئے اور سوچئے تو اس کو معلوم ہوا ہوگا کہ میرے مناسب وہی حالت ہے جس میں خدا نے مجھ کو رکھا ہے آج کل بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ دوسروں کی حالتوں کو سن کر تمنا کرتے ہیں کہ ہم فلاں ہوتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (النساء آیت ۱۹)

ترجمہ: اے ایمان والو تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے جبراً مالک ہو جاؤ اور ان کو اس غرض سے مقید مت کرو جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ وصول کر لو مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان کے ساتھ خوبی گزران کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بڑی منفعت رکھ دے۔

حرۃ کی مملوکیت جائز نہیں

یہ ہے اس کا ترجمہ اب دیکھئے کہ قرآن میں اس رسم کو مٹایا گیا ہے یا نہیں اور کرھا کی قید واقعی ہے۔ احترازی نہیں کیوں کہ عورتیں اس وراثت سے راضی بھی نہیں ہوتی تھیں اور اگر وہ راضی بھی ہوں تب بھی حرۃ کی مملوکیۃ جائز نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد بہو کا حصہ دے کر اس کے ماں باپ کے سپرد کر دو مگر خبردار اس کا حق مت دبانا' آگے بھی سن لو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **ولا تعضلو هن** الخ عرب میں بھی یہ رسم تھی کہ جب کوئی شخص

مال چھوڑ کر مر جاتا تو اس کی بیوی کو نکاح نہ کرنے دیتے تا کہ اس کا مال اسی کے پاس رہے اور یہ رسم ہندوستان میں بھی ہے کہ بیوہ کا نکاح نہیں کرنے دیتے تو اکثر اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کی جائیداد علیحدہ کرنی پڑے گی۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ جائیداد اچھی چیز ہے مگر صاحبو! عورت کے لئے تو حقیقت میں سخت مصیبت ہے کیونکہ ان کی جائیداد کی وجہ سے ہر شخص ان پر جال ڈالتا ہے۔ اور میں نے تو زمین کی وجہ سے عورتوں کو ہمیشہ مصیبت ہی میں دیکھا کہ ہر شخص ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو صاحبو ان کو حصہ دے کر ماں باپ کے سپرد کر دو اپنے گھر میں نہ رکھو کیونکہ جب تک اپنے گھر میں رکھو گے یہ خیال دل سے نہ نکلے گا تو واجب ہے کہ حصہ دے کر ماں باپ کے سپرد کر دو خواہ وہ اس کو بٹھلا دیں یا کہیں نکاح کر دیں اگر کوئی کہے کہ جہاں شوہر کچھ چھوڑ کر مرے یہ حکم اس کے لئے ہے اور جہاں کچھ چھوڑ کر ہی نہ مرے اس صورت میں اگر عورت کو روکا جائے تو قرآن سے ممانعت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ آیت میں نہی مقید ہے۔ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ تو جواب یہ ہے کہ جب مال کے ہوتے ہوئے روکنا جائز نہیں تو بغیر مال کے روکنا بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگا کیونکہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک تو کسی باعث سے ایک بغیر کسی باعث کے' پہلا کسی درجہ میں ہلکا ہے عقلاً بھی شرعاً بھی اور دوسرا گناہ بڑا گناہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین شخصوں کو خدا بہت ہی مبغوض رکھتا ہے ملک کذاب شیخ زانی عائل متکبر یعنی جھوٹا بادشاہ' زنا کار بڈھا' اور متکبر فقیر اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں ان معاصی کا کوئی داعی نہیں ہے اور پھر یہ لوگ گناہ کرتے ہیں بادشاہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے جھوٹ اسی واسطے لوگ بولا کرتے ہیں کہ اس سے کارروائی کریں۔ بادشاہ کی قدرت کارروائی کے لئے کافی ہے۔ اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے اسی طرح زنا بوجہ شدت باہ کے ہوتا ہے بڈھے کو کیا مستی سوار ہوئی اگر وہ ضبط کرنا چاہے تو کچھ بھی دشوار نہیں۔ اسی طرح غریب آدمی تکبر کرے تو اس کی حماقت ہے اس کے پاس بڑائی کا کونسا سامان ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو گناہ بغیر داعی کے ہو وہ زیادہ گناہ ہے تو یہ تقیید شبہ کرنے والے کو مفید نہیں بلکہ مضر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت کے پاس کچھ مال ہو تو اس وقت حرص کی وجہ سے یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ اس کو بھی حق تعالیٰ نے منع فرما دیا تو جس کے پاس مال بھی نہ ہو وہاں روکنا تو محض پابندی رسم ہے اس میں روکنے کا کوئی داعی بھی موجود نہیں تو بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيمًا ﴿۳۱﴾

ترجمہ: ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے۔

تفسیری نکات

بے برکت نیکی

اب ضرورت ہے اس حدیث اور آیت کے معنی سمجھنے کی تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفارات لما بینھن ما اجتنب الکبائر اور ما عام ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ سارے گناہوں کا کفارہ تو جب ہی ہے کہ کبائر سے بچے ورنہ سب کا نہیں بلکہ صرف صغائر کا ہوگا یہ لازم نہیں آتا کہ صغیرہ بھی معاف نہ ہو اور آیت کے معنی اس سے بھی زیادہ صاف ہیں یعنی ان تجتنبوا میں ایک شرط کی دو جزائیں ہیں نکفر اور ندخلکم مدخلا کریما '(ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے) پس اس مجموعہ کے لئے جزا میں بیشک یہی شرط ہے کہ کبائر سے بھی بچے اور اگر کبائر صادر ہوئے تو مجموعہ مرتب نہ ہوگا۔ یعنی مدخلاً کریما بمعنی دخول جنت بلا عقاب و عتاب توبہ یا فضل پر موقوف ہوگا۔ پس اب وہ شبہ نہ رہا اور یہ ثابت رہا کہ گناہ معاف ہوتے ہیں حسنات سے تو اگر نیکیاں قبول نہ ہوتیں اور اس میں یہ اثر کہاں سے ہوا' پس معلوم ہوا کہ قبول تو ہوئیں لیکن ان میں برکت نہیں ہوئی اور یہ برکت نہ ہونا اس حدیث سے ثابت ہے جس کو میں نے روزے کے باب میں پڑھا ہے چنانچہ اب میں اس حدیث سے اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اگر گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے سے کیا فائدہ' حضور ﷺ فائدہ کی نفی فرما رہے ہیں اور یہ میں پہلے بدلیل کہہ چکا ہوں کہ روزہ ہو جاتا ہے باوجود گناہوں کے بھی تو جو فائدہ منفی رہا وہ روزے کی برکت ہے اور اس سے وہ مقصود بھی ثابت ہوا جس کے لئے مقصوداً اس حدیث کو پڑھا ہے یعنی گناہ کے ترک کا اہتمام بالخصوص روزے میں ضروری ہے۔ (مضار المعصیت ملحقہ مواعظ مفاسد گناہ ص ۱۹۰)

پھوہڑ عورتوں میں ایک کمال

فرمایا عادتاً عورتیں پھوہڑ ہو جاتی ہیں وہ اکثر عفیف ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ایسے ہی امور کے متعلق فرماتے ہیں فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (ملفوظات حکیم الامت ۱۱ج)

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

ترجمہ: اور تم ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فوقیت دی ہے مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

مطلوب کی دو قسمیں

میرا ذوق یہ ہے کہ اس آیت میں مطلوب کی دو قسمیں کی گئی ہیں ایک موہوب جس کو مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ اور وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ میں فضل سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرے مکسوب جس کو لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ میں اکتساب کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے اب حاصل یہ ہوا کہ موہوب کی تمنا نہ کرنا چاہئے بلکہ مکسوب کا اہتمام وفکر کرنا چاہئے۔ مدار نجات اعمال مکسوبہ ہیں۔

اب رہا تمنائے موہوب سے جو ممانعت ہے اس میں نہی تحریم کے لئے ہے یا کراہت تحریم یا کراہت تنزیہ کے لئے اس سے مجھے بحث نہیں عشاق سے پوچھو کہ جب محبوب کسی کام سے منع کردے تو کیا عاشق محبوب سے یہ سوال کرسکتا ہے کہ حضور یہ بات آپ کو کس درجہ میں ناپسند ہے کس قدر ناگوار ہے اگر کوئی ایسا سوال کرے گا تو محبوب اس کو نکال باہر کرے گا کہ تو عاشق نہیں۔

اس کے بعد حق تعالیٰ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موہوب کے لئے ان کا دل للچائے گا ضرور اس لئے دعا کی اجازت دیتے ہیں وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ کہ دعا کرسکتے ہو آگے بعض اوقات عدم قبول دعا سے پریشان نہ ہونے کی تعلیم ہے اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو اور قبول کے آثار معلوم نہ ہوں تو گھبراؤ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو اچھی طرح جانتے ہیں یعنی وہ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ یہ نعمت موہوبہ تمہارے لئے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے (اتباع العلماء دعوت وتبلیغ)

عنایت رحمت خداوندی

حق تعالیٰ نے ہر چیز کے اندر حکمت اور مصلحت رکھ دی ہے خواہ عطاء ہو یا منع ہو اسی لئے فرماتے ہیں وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ یہ مسئلہ قرآن پاک نے طے فرمادیا ہے یعنی ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر (وہبی طور پر) فوقیت بخشی ہے آگے فرماتے ہیں لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ یعنی مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے پس جب موہوب میں دخل نہیں تو کیوں پیچھے پڑے اور فرماتے ہیں وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو یہ فرما کر تعجب سے بچایا ہے کہ اگر ایسی چیز کو جی چاہے تو مانگ لو تحصیل کے درپے مت ہو اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں دیکھئے جذبات کو روکا نہیں یہ بھی گوارا نہ فرمایا کہ جذبات کو روکا جائے کیا ٹھکانا ہے حق تعالیٰ کی اس رحمت کا یعنی اگر جی چاہے مانگ لو اگر مناسب ہوگا دے دیں گے ورنہ خیر تو دیکھئے تعب کیسا بچالیا

نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ

ترجمہ: مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر (قدرتی) فضیلت دی ہے اور سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال (عورتوں) پر خرچ کئے ہیں (اس میں بتلادیا گیا کہ عورتیں تمہارے قبضہ میں ہیں ان کی اصلاح کچھ مشکل نہیں' طلاق کی کیا ضرورت ہے اول تو خدا نے تم کو قدرتی طور پر عورتوں کا حاکم بنایا ہے' دوسرے تم ان پر مالی احسانات کرتے ہو) تو جو عورتیں نیک اور لائق ہیں مرد کی عدم موجودگی میں بھی بحفاظت وتوفیق الٰہ (اس کی آبرو اور مال کی) نگہداشت کرتی ہیں۔

عورتوں سے مساویانہ سلوک نہ کرنے کا حکم

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم دو باتوں کی رعایت کرو تو شائستہ اور نیک عورتیں تو فوراً تمہارے تابعدار ہو جائیں گی ایک یہ کہ تم حاکم بن کر رہو' برابری اور غلامی کے ساتھ نہ رہو' کیونکہ جو شخص ابتداء میں عورتوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا یا ان کی غلامی اختیار کرتا ہے تو پھر وہ ساری عمر اسی برتاؤ کی منتظر رہتی ہیں لہٰذا تم کو اول ہی سے ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جیسا کہ حاکم محکوم سے کرتا ہے۔

دوسرے تم ان کے ساتھ مالی احسانات کرو مثلاً مہر کی ادائیگی میں جلدی کرو' نفقہ اور کپڑے میں تنگی نہ کرو' ان کی دلداری اور دل جوئی کا خیال رکھو' اس برتاؤ کی خاصیت ہے کہ شریفوں کے دل کو مسخر کر لیتا ہے ہاں اگر کوئی

بہت بدطینت عورت ہو وہ ممکن ہے کہ اس برتاؤ سے مسخر نہ ہو اس کے لئے آگے دوسری تدبیر بتلاتے ہیں کہ اگر کوئی عورت بد دماغ ہے تو اس کو بھی طلاق دینے کی ضرورت نہیں بلکہ حکمت اور تدبیر سے کام لو۔

بدطینت عورت کا طریق تنبیہ

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو (قرآئن سے) ان کی بد دماغی کا احتمال (قوی) ہو (محض گمان اور خیال ہی نہ ہو) تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور (اگر اس سے نہ مانیں تو) ان کو خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو اس کا بھی عورت پر بہت اثر ہوتا ہے) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) ان کو (اعتدال سے مارو) حدیث میں اس کی تفسیر آئی ہے ضربا غیر مبرح کہ ایسا مارو جس سے ہڈی پر صدمہ نہ پہنچے خون نہ نکلے سبحان اللہ کیسی حدود ہیں) فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقعہ) مت ڈھونڈو ان الله کان علیا کبیراً کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت وعظمت والے ہیں۔

یہ عجیب مراقبہ بتلایا گیا یعنی اگر تم عورتوں پر زیادتی کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈو گے تو یہ سمجھ لو کہ تمہارے اوپر بھی ایک حاکم ہے وہ کون خدا تعالیٰ ان کے حقوق اور علم وقدرت سب سے زیادہ ہیں۔ اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنے لگیں اور تم کو مجرم بنانے کے لئے تو بہانے ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں واقعی جرائم بے انتہا ہیں تو تمہارا کہاں پتہ رہے پس تم کو اپنے محکوموں کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہئے جو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ کرتے ہیں کہ باوجود تمہاری نافرمانی کے توبہ واستغفار کے بعد سب معاف کر دیتے ہیں اور پچھلے گناہوں کا کچھ اثر نہیں رکھتے نیز چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو ویسے ہی معاف کرتے رہتے ہیں چنانچہ وضو اور نماز اور جماعت وغیرہ سے گناہ صغیرہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔

طلاق سے قبل ضرورت پنچ

اگر اس سے بھی کسی عورت کو تنبیہ نہ ہو تو اس کے لئے کیا عجیب بات بیان فرماتے ہیں وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اس میں خطاب زوجین کو نہیں ہے بلکہ اوپر والے آدمیوں کو خطاب ہے۔ کہ اگر قرآئن سے تم کو ان دونوں میں میاں بیوی کی (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (جس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں) تو تم لوگ ایک ایسا آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی ایسا ہی عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس بھیجو (کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں اور جو بے راہی پر ہو اس کو سمجھا دیں) دیکھئے یہ کیسی اچھی ترکیب ہے کہ جب تک زوجین اپنے معاملہ کو خود سلجھا سکیں اس وقت

تک خود سلجھانے کی کوشش کریں اور جب ان سے سلجھ نہ سکے تو کسی کو حکم مقرر کریں کیونکہ اپنا معاملہ فریقین سے طے نہیں ہو سکتا اس لئے پنچ کی ضرورت ہوئی۔

آگے حق تعالیٰ ان پنچوں کی بابت ارشاد فرماتے ہیں اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا اگر ان دونوں پنچوں میں اصلاح معاہدہ منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان دونوں زن و شوہر کو اصلاح کی توفیق دے دیں گے اس میں اپنی اعانت کا وعدہ ہے کہ اس صورت میں ہم بھی معاملہ سلجھنے میں امداد کریں گے مگر اس کے لئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ اگر ان دونوں پنچوں کے درمیان خوشی سے صلح اور اصلاح معاملہ منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق پیدا کریں گے (بشرطیکہ وہ ان دونوں کی رائے پر بھی عمل کریں اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا۝ بلا شبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں۔ یعنی جس طریق سے زوجین میں باہم مصالحت ہو سکتی ہے اس کو وہ خوب جانتے ہیں پس جب حکمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے وہ طریق ان کے قلب میں القا فرما دیں گے دیکھئے حق تعالیٰ نے طلاق سے بچنے کی کتنی عمدہ ترکیبیں بتلائی ہیں اگر لوگ ان طریقوں سے کام لیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی طلاق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور اگر بدوں طلاق کے چارہ ہی نہ رہے تو اس کے لئے یہ تعلیم ہے کہ اول ایک طلاق دو اس سے عورت کا ناز ٹوٹ جائے گا اور اگر اس میں کچھ بھی صلاحیت ہوگی تو وہ سنور جائے گی شریعت نے نہ تو طلاق سے ممانعت کی کہ چاہے باہم کیسا ہی اختلاف ہو طلاق دے ہی نہ سکے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو شوہر ہمیشہ اندر ہی اندر گھٹا کرتا اپنے غصہ کا بھڑاس نہ نکال سکتا اس لئے غصہ نکالنے کی اجازت دی کہ ضرورت کے وقت دے سکتے ہو مگر حدود کے ساتھ شریعت میں جذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے۔

احکام شرعیہ میں رعایت جذبات

چنانچہ ایک حدیث میں لا یحل لا حد ان یھجر اخاہ فوق ثلاثۃ ایام کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال وغیرہ موقوف رکھے دیکھئے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ چاہے آپس میں کیسا ہی رنج و تکرار ہو بولنا مت چھوڑ و حالانکہ شریعت کو یہ بھی اختیار تھا کہ ایسا حکم دے دیتی چنانچہ بعض مشائخ نے طالبین کی اصلاح کے لئے کبھی ایسا حکم دیا پھر اس میں سوال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ضعیف کیوں پیدا فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تمدن کی حفاظت ہے تاوقتیکہ ایک کو دوسرے کا تابع اور محتاج نہ بنایا جائے تمدن محفوظ نہیں رہ سکتا اور طبیعت مساوی میں ہوتی نہیں اسی واسطے فرماتے ہیں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ یعنی مرد عورتوں پر سردار ہیں اور وجہ اس کے آگے ارشاد فرمائی ہے فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔

یعنی بسبب اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور جن لوگوں نے برعکس اس حکم کے عورتوں کو متبوع بنا لیا وہاں کی خرابیاں پوشیدہ نہیں ہیں آج کل اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ

مرد عورتوں کے مزدور ہیں۔ سبحان اللہ' کیا تفسیر دانی ہے ان مفسر صاحب سے کوئی پوچھے کہ فضل اللّٰہ بعضھم (اللہ تعالیٰ نے بعض کو فضیلت دی کے کیا معنی ہیں؟ اگر جرات کر کے یہ کہیں کہ اس میں بھی بعضھم سے مراد عورتیں ہی ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے مسلم لیکن آگے جو فرماتے ہیں وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں) اس میں تو ضمیر یقیناً رجال ہی کی طرف ہے کیونکہ منفق وہی ہیں تو کیا پھر فضل اللّٰہ کی وہ تفسیر سراسر مہمل اور تحریف قرآن نہ ہوگی اگر یہ معنی ہوتے تو للنساء فرماتے ہیں' علی جو کہ تسلط کے لئے ہے نہ فرماتے'

خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر خلقۃً بھی فضیلت ہے چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ مشرکین جو ملائکہ کو بنات اللہ کہتے تھے ان کا رد اس طرح فرماتے ہیں کیا تم ایسی مخلوق کی حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہو جو کہ پست خیال ہے اور ہمیشہ بناؤ سنگار اور زیور میں نشوونما پاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان میں مقابلہ کے وقت قوت بیانیہ نہیں ہے واقعی یہ دو صفتیں جو عورتوں کی ارشاد فرمائی ہیں کھلم کھلا نظر آتی ہیں۔ زیور اور آرائش اور بناؤ سنگار میں شب و روز رہتی ہیں۔ اس سے آگے ان کا خیال ترقی ہی نہیں کرتا' غایۃ مقصود اپنا اسی کو سمجھتی ہیں۔ اور مقابلہ اور مناظرہ کے وقت ان کے دلائل میں قوت بالکل نہیں ہوتی ادھر ادھر کی باتیں بہت کریں گی لیکن کسی امر پر دلیل صحیح ہرگز نہ بیان کر سکیں گی۔

کوئی عورت یہ نہ کہے کہ یہ زیور تو ہم کو ماں باپ نے پہنا دیا اس سے عادت ہوگئی اس سے میلان کہاں ثابت ہوا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر ماں باپ بھی نہ پہناویں تب بھی ان کا طبعی میلان نمائش و آرائش کی طرف ہے چنانچہ بہت سے واقعات اس کے مشاہد ہیں اور اسی طرح اگر کوئی صاحب دوسری جزو میں یعنی قوت بیانیہ میں کمی کے بارے میں فرمادیں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہماری عورتوں کی تعلیم نہیں ہوتی اگر تعلیم و تربیت کامل ہو تو یہ نقصان ہرگز نہ رہے یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ جو عورتیں تعلیم یافتہ کہلاتی ہیں وہ بھی معلوم ہوا کہ لیکچروں میں ناقص تقریر کرتی ہیں ان کے شوہر اس لیکچر کی تکمیل کرتے ہیں یہ حکمت تبرعاً بیان کر دی گئی ورنہ یہ کہنا کافی ہے کہ خدا تعالیٰ کی کوئی حکمت ہوگی ہمارا کوئی فائدہ اس کی تعیین پر موقوف نہیں' اسی واسطے جو چیزیں فضول ہیں ان کی تحقیق و تفتیش سے منع کر دیا گیا ہے۔ ہم کو اس تحقیق سے کیا فائدہ ہے کہ فلاں ناقص کیوں ہے فلاں کامل کیوں ہم کو تو اس کے نتائج و احکام پر عمل کرنا چاہئے بہر حال تقریر سے معلوم ہو گیا کہ نقصان عقل اضطراری اور خلقی ہے اور دوسرا نقصان یعنی نقصان صلوٰۃ' جس کو نقصان دین فرمایا ہے' جس کا سبب حیض کا آنا فرمایا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے کہ خلقی ہے اور تین امر اخر ان کی طرف منسوب فرمائے کہ ان کا ازالہ ان کے اختیار میں ہے۔ وہ کفران عشیر و اذھاب لب رجل حازم و اکثار لعن چونکہ یہ اختیاری ہیں اس لئے ان کو نقص نہ کہنا

چاہئے بلکہ ان کے شر کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ عورتوں میں دو نقص اور تین شر ہیں۔ جو نقص ہیں ان کا فکر تو بے سود ہے اس لئے کہ وہ معاملے زائل ہونے والے نہیں بلکہ اس کی تو تمنا سے بھی منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ وارد ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے مردوں کے فضائل سن کر فرمایا تھا کہ یا لیتنا کنا رجالا' یعنی اے کاش ہم مرد ہوتے تو مردوں کی ہی فضیلت ہم کو بھی ملتی اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ یعنی مت تمنا کرو اس شے کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس شے سے بعض کو بعض پر فضیلت یعنی خلقی آگے فرماتے ہیں

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ یعنی مردوں کے لئے حصہ ہے اس شے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی تمنا چھوڑ و عمل میں کوشش کرو۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيْمًا ﴿٤٨﴾

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوائے اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔

تفسیری نکات

شرک کی حقیقت

فرمایا' شرک جس کی نسبت وعید ہے إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی کو مستحق عبادت سمجھنا اور عبادت کہتے ہیں کسی کے سامنے نہایت تضرع و تذلل سے پیش آنے کو چونکہ حق تعالیٰ قادر مطلق و خالق رازق ہیں ان کو غیرت آتی ہے کہ سوا ان کے کسی دوسرے کے سامنے غایت تضرع و تذلل سے پیش آئے مثلاً دو شخص ہوں ایک ان میں بڑے مرتبے کا ہے اور اس بڑے مرتبہ والے نے کسی سائل کو کچھ دیا اور سائل بجائے اپنے معطی کے دوسرے کی ایسی ہی تعریف و توصیف کرنے لگے جو اس کے لئے چاہئے تھی تو طبعی بات ہے کہ معطی کس قدر غضبناک ہوگا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے جو لوگ مزارات پر اولیاء اللہ سے سوال کرتے ہیں اب

دیکھنا چاہئے آیا محض وسیلہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں یا کوئی امر اس سے زائد ہے۔ سو مشرکین عرب بھی بتوں کی عبادت وسیلہ قرب الٰہی سمجھ کر کرتے ہیں چنانچہ مذکور ہے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى نہ خدا سمجھ کر مگر پھر بھی وہ مشرک قرار دیئے گئے سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وسیلے میں بھی دو صورتیں ہیں مثال سے فرق معلوم ہوگا مثلاً ایک کلکٹر ہے اس کے پاس ایک منشی نہایت زیرک عاقل ہے کلکٹر نے اپنا سارا کاروبار حساب و کتاب اس منشی کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے ذمہ چھوڑ دیا ہے اور ایک دوسرا کلکٹر ہے اس کے پاس بھی منشی ہے مگر کلکٹر زبردست عادل ہے اپنا کاروبار خود دیکھتا رہتا ہے منشی کے ذمہ نہیں چھوڑا اب اگر کوئی شخص اس منشی زیرک کے پاس سے جو پہلے کلکٹر کے پاس ہے جس کے سپرد سب کام ہے کوئی درخواست پیش کرے تو کیا سمجھ کر پیش کریگا یہ ظاہر ہے کہ منشی کو کاروبار میں دخیل سمجھ کر پیش کرے گا۔ اور اسی واسطے اس کو خوشامد کرے گا کہ یہ خود سب کام کر دیں گے کیونکہ ان کے کل کام سپرد ہیں۔ کلکٹر تو فارغ بیٹھا ہے گو ضابطہ کے دستخط وہی کرے گا مگر اس منشی کے خلاف کبھی دستخط نہ کرے گا اور اگر دوسرے کلکٹر کے منشی کے یہاں عرضی دی جائے گی تو محض اس خیال سے کہ کلکٹر زبردست ہے۔ رعب والا ہے اس کے سامنے کون جا سکتا ہے اس منشی کے ذریعہ سے درخواست کرنی چاہئے کیونکہ اس منشی کو تقرب حاصل ہے یہ وہاں پر پیش کر دے گا کیونکہ کل کام خود کلکٹر دیکھتا ہے اب دیکھئے ان دونوں صورتوں میں کس قدر فرق ہے عوام اہل مزار سے اکثر پہلی صورت کا سا برتاؤ کرتے ہیں ان کے افعال اعمال سے ظاہر ہے پھر شرک نہیں تو اور کیا ہے برخلاف محض وسیلہ سمجھنے کے' پس شرع شریف میں عبادت غیر اللہ جہاں صادق آئے گا گو بہ نیت توسل ہی سہی وہ شرک ہوگا غرض توسل جائز مگر تعبد التوسل شرک۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ باقی جن آیات میں افعال کبیرہ کا عقاب مذکور ہے وہاں استحقاق مراد ہے لزوم وقوع مراد نہیں یعنی کبائر سے وہ شخص عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ وقوع عقاب لازم نہیں ممکن ہے حق تعالیٰ ویسے ہی بخش دیں باقی وقوع کے متعلق آیات اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ الخ سے صاف معلوم ہو گیا کہ سب گناہوں پر عذاب لازم نہیں بجز شرک و کفر کے کہ ان پر عذاب لازم ہے (یعنی شرعاً) غرض گناہ کبیرہ تو بدوں عقاب کے معاف ہو سکتا ہے مگر کفر و شرک کا ارتکاب بدوں عذاب کے نہیں رہ سکتا اس پر عذاب لازم ہے اور وہ بھی ابدالآباد کے لئے جس کا انقطاع کبھی نہ ہوگا یہ جرم کسی طرح معاف نہ ہوگا نہ عذاب سے نہ بغیر عذاب کے۔

مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ خدا تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے اس کے سوا دوسرے گناہ جس کے لئے چاہیں معاف فرمائیں گے۔

اس آیت میں بھی حق تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم کا قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ کن کن شرطوں کے بعد یہ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں سب سے پہلے ایمان و اسلام کو بیان فرمایا ہے یہ اصل شرط ہے اس کا چھوڑنا اصولی جرم ہے یہ ہرگز معاف نہ ہوگا اور اس کے تارک کو کبھی نجات حاصل نہ ہوگی اس کے بعد دیگر فروعی شرائط مذکور ہیں جن کے پورا نہ کرنے سے انسان عذاب کا تو مستحق ہوتا ہے مگر بعد چندے نجات پا جائے گا پس جو لوگ مغفرت و اجر عظیم کے طالب ہیں وہ اس آیت کے مضمون کو بغور سن لیں کہ مغفرت کن اعمال سے حاصل ہوگی ہم لوگ صرف اسی پر اکتفا گئے بیٹھے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہم یقیناً مستحق مغفرت و اجر عظیم ہو گئے یہ بڑا دھوکہ ہے کہ جس نے ہم کو اصلی کام سے روک رکھا ہے جو کہ شرائط کو بجالانا اور پورا کرنا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾

ترجمہ: اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول ﷺ کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اولی الامر ہیں ان کا بھی، پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ و رسول ﷺ کے حوالہ کر دیا کرو، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو یہ امور سب سے بہتر ہیں اور ان کا انجام خوش تر ہے۔

تفسیری نکات

اپنی رائے کی اتباع کی مذمت

غرض ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ بجائے خدا اور رسول ﷺ کے ھوی کا اتباع کر رہے ہیں اور دنیا کو ترجیح دے رہے ہیں اور ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے اور بڑا سخت مرض یہ ہے کہ دنیا کے امور میں تو اپنی رائے لگاتے ہیں دین کے اندر بھی کہتے ہیں کہ ہماری رائے یہ ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے اور رایت شحا مطاعا وھوی متبعا و اعجات کل ذی رای بر ایه فعلیک بخاصة نفسک یعنی خواہش نفسانی کا اتباع کیا جاتا ہے اور ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے تو ایسے وقت اپنے نفس کی فکر کرو اور عوام کے حال سے تعرض چھوڑ دو (اطاعۃ الاحکام)

حدیث شریف حجت مستقلہ ہے

اب اس آیت کے اسلوب سے ایک اور امر ضروری مستنبط ہوتا ہے اس کو بھی اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں تین ذاتوں کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے اپنی ذات پاک کا اور جناب رسول ﷺ کا اور اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (جو لوگ تم میں سے جو اولی الامر ہیں) کی اطاعت کا رسول ﷺ کے لئے تو مکرر اطیعوا لائے اور اولی الامر کے لئے تکرار اطیعوا کا نہیں کیا سو اس کی وجہ یہ تو ہے نہیں کہ حق تعالیٰ کی اطاعت علیحدہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت جدا بلکہ اس اسلوب میں ایک فائدہ کی طرف اشارہ لطیف یہ ہے کہ ہر چند کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے من وجہ استقلال ظاہری کا حکم رکھتی ہے پس اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جیسے قرآن مجید حجت مستقلہ ہے اسی طرح حدیث شریف بھی حجت مستقلہ ہے اور میں قرآن مجید کے ساتھ حدیث شریف کی برابری کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں۔ لیکن اس اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ جیسے قرآن مجید کے احکام کو ماننا ضروری ہے اسی طرح احادیث سے جو احکام ثابت ہیں ان پر بھی ایمان وایقان واجب ہے کسی کو کہنا جائز نہیں کہ جو مسئلہ قرآن شریف میں نہیں ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قرآن شریف میں نہیں احادیث سے ہی ثابت ہوتے ہیں (اطاعۃ الاحکام)

غرض بہت سے احکام احادیث سے بھی ثابت ہوئے ہیں۔ اور بعض مسائل وہ ہیں جو اجماع وقیاس ملحق کتاب وسنت کے ساتھ ہیں اس لئے کہ اجماع دو طور سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ کسی مسئلہ کے متعلق خبر واحد تھی پھر اس مسئلہ پر اجماع ہو گیا اور دوسرے یہ ہے کہ وہ مسئلہ قیاس سے ثابت تھا اور اس پر اجماع ہوا پہلی صورت میں تو اجماع کا ملحق بالسنۃ ہونا ظاہر ہے اور دوسری صورت میں الحاق اس لئے ہے کہ قیاس وہی حجت ہے جو مستنبط من الکتاب والسنہ (قرآن و حدیث سے مستنبط ہے) ہو تو اگر وہ مسئلہ جس پر اجماع ہوا ہے قیاس مستنبط من الکتاب سے ثابت ہے تو یہ اجماع ملحق بالکتاب ہے اور اگر قیاس مستنبط من السنۃ سے ثابت ہوا تو ملحق بالسنۃ ہے اور اسی تقریر سے قیاس کا الحاق بھی کتاب و سنت سے معلوم ہو گیا اس لئے کہ اس میں قید استنباط من اکتاب والسنۃ کی موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے قیاس کو علماء نے مظہر کہا ہے مثبت نہیں مانا مثبت اصل میں کتاب وسنت ہی ہے پس ثابت ہو گیا کہ حدیث شریف میں من وجہ استقلال ہے بہ خلاف اجماع وقیاس کے کہ وہ محض تابع وملحق ہیں صرف کتاب وسنت کی حجیت میں صرف ہمارے اعتبار سے اس قدر فرق ہے کہ قرآن شریف چونکہ تواتر سے ثابت ہے اس لئے وہ قطعی ہے اور احادیث میں بھی جو متواتر ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے۔ البتہ بعض جو خبر واحد ہیں وہ قطعی نہیں مگر ماننا ان کا بھی واجب وضروری ہے باقی جن حضرات نے خود حضور ﷺ سے سنا ہے ان کے حق میں یہ بھی فرق نہیں بلکہ حضور ﷺ کا فرمایا ہوا بھی مثل قرآن ہی کے حجت قطعیہ ہے بہر حال نفس حجیت میں سب احادیث مشترک ہیں پس بڑی حسرت ہے ان لوگوں پر جو احادیث کو حجت نہیں مانتے وہ بڑے نور سے محروم ہیں۔ اس کا عجیب نور ہے حتیٰ کہ اس میں اور عامہ بشر کے کلام میں کھلا فرق ہے۔ عام کلام کے سامنے تو احادیث مثل کلام اللہ کے معلوم ہوتی ہیں ہاں کلام اللہ کے مقابلے میں جب رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی بندے کا کلام ہے حضرات محدثین کی شان یہ تھی کہ وہ اکثر اپنی فراست سے حدیث

موضوع کو سن کر پہچان لیتے تھے کہ یہ موضوع ہے' پھر تحقیق سے موضوع ہونا اس کا ثابت ہوتا تھا۔ (اطاعۃ الاحکام)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

ترجمہ: اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول ﷺ کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اولی الامر ہیں ان کا بھی پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ و رسول ﷺ کے حوالہ کر دیا کرو اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو بے شک وہ بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے۔

اطاعت کی دو قسمیں

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمانبرداری کا حکم فرمایا ہے وہ کون سے قسم کی فرمانبرداری ہے۔ اطاعت کی دو قسمیں ہیں ایک تو ضابطہ کی اور ایک دل سے اور خوشی سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب دوسری نوع ہے اس لئے کہ اطیعوا کا ماخذ طوع ہے اور طوع کے معنی رغبت ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت رغبت اور خوش دلی سے کرو یعنی ہر امر دین کے اندر رغبت اور خوش دلی ہو کسل اور کراہیت نہ ہو یہ تو مختصر سا بیان تھا

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (خوشی سے اللہ کا کہنا مانو اور خوشی سے رسول ﷺ کا کہنا مانو)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۶۵﴾

ترجمہ: قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔

تفسیری نکات

حضور اکرم ﷺ کی شان محبوبیت

فَلَا وَرَبِّكَ اس میں لا حرف نفی کے بعد قسم لے آئے اور منفی کا ذکر بوجہ قرینہ مقام کے چھوڑ دیا گیا یعنی یہ بات نہیں جو منافقین سمجھے ہوئے ہیں کہ باوجود دعویٰ ایمان کے تحکیم الی الطاغوت کو اختیار کریں اور حضور ﷺ کے حکم

سے اعراض کریں اور قبل از مقصود نفی کا لانا نہایت بلاغت ہے اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ قبل ذکر مقصود کے اس کی ضد کی نفی کر دیتے ہیں تا کہ اس سے یکسوئی ہو کر ذہن خالی ہو جائے اور مقصود کی طرف متوجہ ہونے کے لئے آمادہ ہو جائے (شرط الایمان)

پس فرماتے ہیں کہ اے محمد ﷺ آپ کے رب کی قسم ہے یہاں چند امور قابل غور ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قسم کھا کر کیوں فرمایا دوسرے یہ کہ اگر قسم ہی کھانا تھا تو اپنے اسماء میں سے اسم رب کو کیوں خاص فرمایا تیسرے یہ کہ اس کو حضور ﷺ کی طرف کیوں مضاف کیا بات یہ ہے کہ جو مضمون اس آیت میں ارشاد ہوا ہے وہ چونکہ نہایت قابل اہتمام ہے اور قسم کھا کر جو بات کہی جاتی ہے طبعی بات ہے کہ وہ نفس میں اچھا اثر کرتی ہے اس لئے تو قسم کھائی باقی رہی یہ بات کہ وربک کیوں فرمایا واللہ یا والرب کیوں نہ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود اصلی اس آیت کا' آپ کا مطاع یعنی واجب الاطاعت ہونا بیان کرنا ہے چنانچہ الالیطاع میں اس کی تصریح ہے اور آدمی جو دوسرے کی اطاعت کرتا ہے اس کی تین وجہ ہوا کرتی ہیں یا تو احسان کہ انسان کا طبعی امر ہے کہ محسن سے اس کو محبت ہوتی ہے اور یا عظمت شان خواہ محسن بھی نہ ہو چنانچہ حکام کی جو اطاعت کی جاتی ہے اس کا سبب ان کی عظمت ہے اور تیسری وجہ محبت ہے گو نہ احسان کچھ ہوا اور نہ حکومت و عظمت ہو مگر محبت کا بھی خود اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی اطاعت کی جائے۔ جناب باری تعالیٰ کو وربک سے حضور ﷺ کا تینوں وجہ سے مطاع ہونا بیان کرنا منظور ہے۔ (شرط الایمان)

محسن کائنات

فَلَا وَرَبِّكَ کے اس تقدیر پر یہ معنی ہوئے کہ قسم ہے آپ کے مربی کی اور تربیت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان ہے پس مربی بہ معنی محسن ہوا پس حاصل یہ ہوا کہ قسم ہے آپ کے محسن کی اور ظاہر ہے کہ آپ کی طبیعت اور فطرت ہے سلیم اور طبائع سلیمہ کا مقتضی یہ ہے کہ اس صلے میں کہ خالق کا اس پر احسان ہے وہ خلق خدا پر احسان کرتا ہے پس اس قاعدہ سے آپ خلق کے محسن ہوئے یہ تو محسن ہونا آپ کا قاعدہ عقلیہ سے ہوا دوسری وجہ بطرز فن تصوف آپ کے محسن ہونے کی اور بھی ہے وہ یہ کہ صفات حمیدہ حقیقتاً ذات باری تعالیٰ کے لئے ہیں اور مخلوق کے اندر ان کا ظل ہے مثلاً مخلوق کسی مجرم کا قصور معاف کر دے تو یہ صفت عفو کا پرتو ہے اور اگر کوئی کسی کو کچھ دے تو یہ جوادیت کا اثر ہے اور یہ مسلم ہے کہ جناب رسول ﷺ تمام افراد بنی آدم میں سے صفات باری تعالیٰ کے مظہر اکمل واتم ہیں پس صفت احسان کے بھی آپ مظہر اتم ہوئے تو آپ تمام جہان کے محسن ہوئے اور تربیت کا منشاء چونکہ ہمیشہ محبت ہوتا ہے اور اس کی اضافت ہے حضور ﷺ کی طرف تو گویا یہ فرمایا فلا و محبک (آپ کے محب کی قسم) اور

جوخدا کا محبوب ہو وہ مخلوق کا بدرجہ اولیٰ محبوب ہونا چاہئے پس آپ محبوب بھی ہوئے تو تمام مخلوق کے فلا وربک سے آپ کا عظیم الشان ہونا اور محسن ہونا اور محبوب ہونا سب ثابت ہوا (شرط الایمان)

احکام شرعیہ کے بارے میں دل میں تنگی محسوس ہونا علامت کفر ہے

اسی واسطے حق تعالیٰ نے صرف یُحَکِّمُوْكَ (یہ لوگ اپنے جھگڑے کا آپ سے تصفیہ کرائیں) پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک تو یہ فرمایا ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ یعنی حضور ﷺ کے فیصلے کے بعد اپنے دلوں میں آپ کے فیصلہ سے کوئی تنگی نہ پائیں اور پھر عدم وجدان حرج کا بڑا دعویٰ بھی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسری بات وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا اور پورے طور سے تسلیم کرلیں) بھی فرمائی یعنی علامت تنگی قلب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اس پر عمل بھی نہایت مضبوطی سے شروع کردیں ورنہ نرے دعوے سے تو کوئی شخص بھی عاجز نہیں ہے اس لئے اس کی یہ علامت بیان فرمائی یہ حاصل ہے آیت شریفہ کا' اس آیت نے اس کا فیصلہ کردیا کہ ایمان اس وقت تک میسر نہیں ہوتا جب تک کہ احکام شرعیہ کو دل سے نہ مانے اور کسی قسم کی دل میں تنگی نہ ہو اور اس طرح دل سے ماننے کی علامت یہ ہے کہ عمل شروع کردے اور اگر دل میں تنگی ہوئی یا تسلیم نہ کیا تو مومن نہیں (شرط الایمان)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عظمت وجلال محبوبیت اور محسنیت

اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ نے فَلَا وَرَبِّكَ میں حضور ﷺ کی تین شانیں بیان فرمائی ہیں عظمت وجلال محبوبیت' محسنیت چنانچہ تفصیلاً اول گذر چکا ہے اور آگے مقصود کے اندر بھی تین امر کا بیان ہے اول یُحَکِّمُوْكَ (یہ لوگ آپ کو حکم بنالیں) دوسرے ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (یعنی آپ کے فیصلہ کے بعد اپنے دل میں تنگی نہ پائیں) وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (پورے طور پر تسلیم کرلیں) یہ تینوں امر حضور ﷺ کے اوصاف ثلثہ سابقہ پر مرتب معلوم ہوتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عظمت شان پر یُحَکِّمُوْكَ (یہ لوگ آپ کو حکم بنالیں) مبنی ہے اس لئے کہ حاکم اس کو بناتے ہیں جو عظیم الشان ہو اس مقام پر ایک امر قابل غور ہے کہ آج کل لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ احکام شرعیہ کی علتیں دریافت کرتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے حالانکہ احکام سلطنت کی وجوہ دریافت نہیں کرتے سو اس کی وجہ یہی ہے کہ حکام کی عظمت قلب میں ہے اور حضور ﷺ کی عظمت نہیں ہے عظمت وہ شے ہے کہ علت کا سوال تو کیا معنی خطرہ بھی اس کا نہیں آتا۔ کبھی کسی نے اس کی وجہ دریافت نہیں کی کہ رسید کا ٹکٹ اگر خط پر لگا کر ڈاک میں چھوڑ دیا جائے تو خط بے رنگ کیوں ہوجاتا ہے۔ حالانکہ محصول پورے سے بھی زیادہ ہے اگر کوئی پوچھے بھی تو یہی جواب ملتا ہے کہ سرکاری حکم ہے۔ بخلاف احکام شرعیہ کے کہ اس میں ہر مسئلے کی علت

پوچھتے ہیں یہ صاف دلیل ہے کہ حاکم شرع کی دل میں عظمت نہیں ہے صاحبو! افسوس ہے کہ مسلمان ہو کر احکام میں چوں چرا کرو اور لَا يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (یعنی آپ کے فیصلہ کے بعد اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں) محبوبیت کا مقتضی ہے کہ محبوب محب کو اگر یہ کہے کہ اپنے سر میں جوتیاں مارتے ہوئے بازار میں نکل جاؤ تو اگر محب صادق ہے تو اس سے عار و ننگ نہ کرے گا اس لئے کہ محبت کا یہ خاصہ ہے کہ عار و ننگ نہیں رہا کرتی بلکہ یہ بھی ثابت ہو جائے کہ یہ امر عقل کے خلاف ہے تب بھی اس کے امتثال میں کوئی تنگی نہ ہوگی بلکہ تنگی تو کیا اس امر کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (پورے طور پر تسلیم کرلیں) محسنیت پر متفرع ہے کہ طبع سلیم کا مقتضی محسن کے امر کو تسلیم کرنا اور اس میں چوں و چرا نہ کرنا ہے اس مقام پر ایک طالب علمانہ شبہ یہ ہے کہ کیا اگر ان امور ثلاثہ میں سے کوئی امر کسی کے اندر مفقود ہوگا تو وہ مومن نہ ہوگا۔ بات یہ ہے کہ تحکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم کے مراتب مختلف ہیں۔ جس مرتبے کی تحکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم ہوگی اسی مرتبے کا مومن ہوگا اور مراتب تین ہیں ایک مرتبہ اعتقاد کا ہے الحمد للہ کہ سب مسلمانوں میں یہ مرتبہ امور ثلاثہ کا موجود ہے اور یہ ادنیٰ ایمان ہے اگر کسی کے اندر مرتبہ اعتقاد میں بھی یہ امور نہ ہوں تو وہ واقعی مومن نہیں دوسرا مرتبہ عمل کا ہے کہ امور ثلاثہ پر عمل بھی ہو یعنی اپنے مقدمات و منازعات میں شریعت کی طرف رجوع ہو عقلاً تنگی نہ ہو اور اس پر عمل ہو اگرچہ طبعاً تنگی ہو اور یہ اوسط درجہ ایمان کا ہے تیسرا مرتبہ طبیعت کا ہے یعنی امور ثلاثہ طبعی ہو جائیں یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اور ایسا شخص مومن اکمل ہے بہر حال جیسے ایمان کے درجات ہیں ایسے ہی ان امور کے بھی درجے ہیں اب ہر شخص کو اپنے اندر غور کر لینا چاہئے کہ میں کس درجہ کا مومن ہوں اور کس درجے کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ ضرورت تو ہر مطلوب میں کمال ہی کی ہے اب اپنی حالت دیکھ لے کہ اگر صرف درجہ اعتقاد کا ہی ہے تو اس کو گو مومن کہا جائے گا لیکن کمال ایمان کے اعتبار سے وہ مومن نہ کہلائے گا اور عرفاً بھی وہ مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے دیکھو اگر کسی کے پاس ایک روپیہ ہو تو اس کو مالدار نہیں کہتے مالدار اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس بہت سامال ہو پس ایسے شخص کو کمال کی طرف ترقی کرنا چاہئے۔ صاحبو! غضب کی بات ہے کہ مال دنیا اگر قلیل ہو تو اس پر تو قناعت نہیں اور ہر وقت یہی فکر ہے کہ یہ بڑھ جائے اور دین کی ترقی کی فکر نہیں

اری الملوك بادنى الدين قد قنعوا وما اراهم رضوا في العيش بالدون

(بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ادنیٰ و قلیل دین پر قانع ہیں اور میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ قلیل دنیا پر انہوں نے اکتفا کیا ہو)

فاستغن بالدين عن دنيا الملوك كما استغنى الملوك بدنيا هم عن الدين

(سوتم دین کی وجہ سے بادشاہوں کی دنیا سے مستغنی رہو جیسا کہ بادشاہ اپنی دنیا کی وجہ سے دین سے مستغنی ہیں)

حالانکہ دین کا کمال تو اس سے زیادہ اہتمام کے قابل ہے۔ غرض ایمان جب ہی کامل ہوگا کہ تحکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم کا درجہ کامل ہو (شرط الایمان)

کمال ایمان کی تحصیل کا طریقہ اور دستور العمل

اس پر عمل کرنے سے یہ درجہ ایمان کا میسر ہو وہ طریقہ مرکب ہے تین اجزاء سے اول تو علم دین خواہ کتب درسیہ کی تحصیل سے ہو یا اردو کے رسائل سے یا علماء سے سن کر دوسرے صحبت اہل اللہ کی تیسرے یہ کہ چوبیس گھنٹہ میں سے ایک گھنٹہ نکال کر اس میں بیٹھ کر یہ سوچا کرو کہ ہم کو ایک روز یہ دنیا چھوڑنا ہے اور قبر میں جانا ہے اور وہاں دو فرشتے آئیں گے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم بنانے کا امر

فرماتے ہیں فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا اس آیت کو سن کر ذرا مسلمانوں کے کان کھڑے ہو جانے چاہئیں اور بدن پر لرزہ پڑ جانا چاہئے اس میں ایمان مطلوب کا معیار بیان کیا گیا ہے اور اس بات کی ایک پہچان بتلائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان مطلوب ہے یا نہیں جس کو اپنی قلبی حالت ایمان کے متعلق معلوم کرنی ہو وہ اس علامت سے بہت آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتا ہے مطلب آیت مذکورہ بالا کا یہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے ہر کام میں حکم نہ بنائیں اللہ تعالیٰ نے حصر فرمایا مومن ہونے کو اس بات میں کہ آپ کو جملہ امور میں حکم بنایا جائے حکم اس کو کہتے ہیں جس کا فیصلہ بلا دلیل مان لیا جاوے اور اس میں چوں و چرا نہ کیا جاوے اب ہم غور کر لیں کہ ہم میں یہ علامت ایمان کی موجود ہے یا نہیں اگر موجود ہے تو آیا درجہ مطلوبہ میں ہے یا نہیں اگر انصاف کو دخل دیں گے تو غالباً یہی کہنا پڑے گا کہ اگر معدوم نہیں جو کہ کفر ہے مگر کالعدم تو ضرور ہے جو اگر کفر نہیں مگر ناقص ہونے میں تو شبہ ہی نہیں پھر معلوم نہیں کس بات پر ہم کو ناز ہے اور کس کرتوت پر پھولے ہوئے ہیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان حقیقی سے جو کہ مطلوب ہے ہم لوگ بالکل کورے نہیں بلکہ کور ہیں۔ اگر یہ بات محض اجمالی طور سے سمجھ میں نہ آتی ہو تو تفصیلی نظر سے دیکھئے اس سے بخوبی سمجھ میں آ جائیگا کہ میرا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی ایک ایک حالت کو لیجئے اور اس کو حضور کے ارشادات پر منطبق کرتے جایئے کہ ہم کو اس حالت میں حضور ﷺ کے ارشادات پر انشراح اور تسلیم حاصل ہے یا نہیں اس سے خود بخود پتہ چل جائے گا اور آپ خود ہی یہ کہیں گے خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم حضور ﷺ کے تمام ارشادات منضبط ہیں یہ فقہ و حدیث و تصوف اور اخلاق کی کتابیں سب آپ ہی کے ارشادات کا مجموعہ ہیں۔ اور ہمارے حالات کی تقسیم پانچ چیزوں کی طرف ہے عبادات، معاملات، عادات، اخلاق، معاشرات، ان پانچوں میں سے جس شعبہ کو کتاب پر پیش کریں گے تو یہی معلوم ہوگا کہ کتاب کہہ رہی ہے پچھم کی طرف چلنے کو اور ہم جا رہے ہیں پورب کی طرف اور کتاب کہہ رہی ہے دکھن کی طرف جانے کو ہم جا رہے ہیں اور اتر کی طرف

ہم کو جانا ہے کلکتہ اور ہم اس ریل میں بیٹھے ہیں جو شملہ کو جا رہی ہے اور جی میں خوش ہیں کہ اب کلکتہ پہنچ جائیں گے حالانکہ واقعہ میں ومبدم کلکتہ سے بعد ہو رہا ہے۔ یہ حالت کم وبیش ہر شعبہ میں نظر آئے گی اور ظاہر ہے کہ اگر انشراح وتسلیم کامل ہو تو ان شعبوں میں یہ نقصان ہرگز پیش نہ آوے مگر جب ہر ہر شعبہ میں یہ نقصان ہے تو کیسے مان لیا جائے کہ ہم میں انشراح وتسلیم کامل ہے۔ غرض تفصیل سے دیکھو اجمال سے دیکھو تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ ہم میں ایمان مطلوب کی علامت موجود ہے۔ پھر کیا فتوی ہوا ہمارے بارہ میں قرآن کا اس کا جواب ہر شخص کا دل خود ہی دے رہا ہے۔ اور حضور علیہ کے حکم بنانے کے متعلق قرآن میں جہاں تذکرہ ہے وہاں صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا کہ لوگ حضور علیہ کو محض زبانی اور ظاہری طور پر حکم بنالیں بلکہ فرماتے ہیں۔

ہمارے سارے کام ناقص ہیں

ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ یعنی صرف ظاہری حکم بنانا کافی نہیں بلکہ یہ حالت ہونی چاہئے کہ حضور نے جو حکم کیا ہو اس سے کسی قسم کی تنگی دلوں کے اندر نہ پائیں اور ذرا بھی انقباض نہ ہو پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ اس مضمون کی اور تاکید پر تاکید ہے فرماتے ہیں وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا یعنی اس حکم کو مان لیں پورا مان لینا یعنی صرف یہی نہیں کہ اس سے انقباض نہ ہو جیسا لَا يَجِدُوْا سے معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ تسلیم کامل ہو اب ہم لوگ دیکھ لیں کہ ہماری یہ حالت ہے یا نہیں کیا کہا جائے۔ سوائے اس کے کہ جواب نفی میں ہے افسوس صد افسوس اس آیت سے کمر ٹوٹ جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایمان مطلوب سے بالکل خالی ہیں اور ایسے ایمان سے خالی ہونے والے کا جو لقب ہے وہ سب کو معلوم ہے اس لفظ کو منہ سے نکالتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے یعنی غیر مومن بدرجہ خاص ہے لیکن منہ کے نہ نکالنے سے کیا ہوتا ہے اگر ہماری حالت اس کے اطلاق کے قابل ہے تو وہ ہے ہی' کانے کو کوئی زبان سے کانا نہ کہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اس نہ کہنے سے کیا عیب اس کا مٹ جائے گا جب ایک آنکھ نہیں ہے تو کانا تو ہے ہی چاہئے کوئی کہے یا نہ کہے اب یہ سمجھئے کہ ہم لوگوں نے اپنی براءت کے لئے ایک اور ترکیب نکال رکھی ہے جس سے دل کو سمجھا لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس آیت میں و نیز اس کے مثل دوسری آیتوں میں ایمان سے مراد کامل ایمان ہے تو معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ کمال ایمان اس وقت حاصل ہوگا جب یہ علامت موجود ہو اور جب یہ علامت موجود نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان کامل نہیں ہے مگر نفس ایمان تو جب بھی رہے ہی گا خدا بھلا کرے اس تاویل کا کہ اس کی بدولت ذرا سہارا تو ہے اور یہ امید ہوتی ہے کہ ہم لوگ بھی کچھ پٹ پٹا کر عذاب سے نجات پا جائیں گے کیونکہ ایمان کامل نہ سہی ناقص سہی کچھ تو موجود ہے میں اس ترکیب کو باطل نہیں کہتا مسئلہ صحیح ہے لیکن یہ حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء کا مصداق ہے یہ بھی تو دیکھو کہ تم ایمان لا کر کس ثمرہ کے طالب ہو کامل کے یا ناقص کے جواب ظاہر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ثمرہ

کامل ایمان کامل ہی پر مرتب ہو سکتا ہے اور تمام مقاصد اور ذرائع میں یہی قاعدہ ہے۔ اسی لئے عادات میں ثمرات ہی پر نظر کر کے جو طریق ترتب ثمرہ مطلوبہ میں ناقص ہو اس کو محاورات میں کالعدم ہی قرار دیا جاتا ہے چنانچہ کسی کو مالدار کہا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کسی کے پاس ایک کوڑی یا ایک پیسہ ہے تو وہ بھی مالدار ہے اگرچہ لغۃً اس حالت میں بھی مالداری کا اطلاق اس پر صحیح ہے لیکن اپنے محاورہ کو دیکھئے' آپ اس شخص کو کبھی مالدار نہیں کہیں گے۔ علیٰ ہذا جتنی صفات ہیں سب میں یہی قاعدہ جاری ہے کہ جب صفت کا اطلاق کسی چیز پر کیا جاتا ہے تو اس کا ادنی درجہ بلکہ اوسط درجہ بھی مراد نہیں ہوتا بلکہ کامل ہی درجہ مراد ہوتا ہے جیسے شجاع' سخی' حسین وغیرہ کہ ان صفتوں میں ادنی درجہ والے کو شجاع سخی حسین نہیں کہہ سکتے جب یہ بات ہے تو مومن ہونا بھی ایک صفت ہے اس کا اطلاق بھی عادات میں کسی شخص پر جبھی کیا جائے گا کہ اس میں صفت ایمان کی بدرجہ کمال موجود ہو ورنہ آپ کے محاورہ مذکور کے موافق اس پر عدم ایمان کا اطلاق اقرب ہوگا تو پھر وہی بات لوٹ آئی کہ ہم سے جس ایمان کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ ہم میں موجود نہیں تو پھر کس بات سے دل خوش کیا جائے اگر قیامت کے دن یہی سوال ہو کہ ہم نے تم سے جس صفت ایمان کا مطالبہ کیا تھا وہ تم نے حاصل کی یا نہیں تو کیا اس کے جواب میں آپ اس ضعیف اور ناقص ایمان کو جس پر آپ خود عدم کا حکم لگا چکے ہیں پیش کر سکتے ہیں۔ اور اگر آپ فرضاً پیش بھی کر دیں اور ادھر سے یہ کہا جائے کہ تم اپنے واسطے تو ہر صفت کا اطلاق اس وقت کافی سمجھتے تھے جبکہ وہ کمال کے درجہ میں موجود ہو اور ہمارے مقابلہ میں یہ صفت ناقص کس منہ سے پیش کرتے ہو تو کوئی صاحب ذہین سے ذہین مجھے بتائیں کہ اس کا کیا جواب ہوگا۔ میرے نزدیک کچھ جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض جب ہمارا ایمان باوجود ہونے کے کالعدم ہے تو وہ تو حضرت حق کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہے نہ اپنے ہی دل کی تسلی کے لئے کافی ہے مگر خیر بالکل نہ ہونے سے جیسی کفار کی حالت ہے ناقص ہی ہونا غنیمت ہے جہاں ہمارے سارے کام ناقص ہیں ایمان بھی ناقص سہی' اس طرح دل کو سمجھا لو کوئی جز تو ایمان کا ہے ہی' اگر ذرا برابر بھی ایمان موجود ہے تو ان شاء اللہ وہ بھی اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ابتداء نہ سہی سزا کے بعد تو نجات ہو ہی جائے گی اور بڑی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے اگر وہ ہمارے ضعف اور اپنی قدرت پر نظر فرما کر رحم فرما دیں تو ان کو کون روکنے والا ہے اس کے علاوہ ایک اور امید گاہ ہے وہ یہ کہ ہم کو محض اپنے فضل و کرم سے اپنے محبوب کی امت میں پیدا کیا ہے اس سے بہت کچھ امید ہوتی ہے کیا عجب ہے کہ پہلے ہی سے رحمت کا ارادہ ہو۔

رسول اکرم ﷺ کی محبوبیت کے دلائل

اور حضور ﷺ کی محبوبیت کے مستقل دلائل تو ہیں ہی خود اس آیت میں اس محبوبیت پر ایک عجیب دلالت ہے وہ یہ کہ اس آیت میں یعنی فَلَا وَرَبِّكَ میں مقسم بہ ذات حق ہے اور انہوں نے اپنی ذات کی قسم کھائی مگر ایک

عجیب عنوان سے جو حضور کی محبوبیت پر دال ہے۔ کیونکہ قسم کے لئے تو اور بھی الفاظ ہو سکتے تھے مثلاً واللہ تاللہ جیسا کہ اور دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔ تَاللّٰهِ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ یعنی یہ کہ حق تعالیٰ نے قسم کھائی اپنی یا مثلاً یوں ہی فرما دیتے ونفسی وامثال ذالک مگر سارے عنوان کو چھوڑ کر یہ عنوان اختیار کیا فَلَا وَ رَبِّكَ جس کے معنی ہیں قسم ہے آپ کے رب کی اور ظاہر ہے وہ رب خود ہی ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ مجھے اپنی قسم ہے مگر اس حیثیت سے کہ میں آپ کا رب ہوں کیا ٹھکانا ہے حضور کی محبوبیت کا کہ حضرت حق اپنی ذات کی قسم من الذات نہیں کھاتے بلکہ اس حیثیت سے قسم کھاتے ہیں کہ وہ رب ہیں۔ حضور کے اس ابلغ کون سا لفظ محبوبیت کے معنی ادا کرنے کے لئے ہوسکتا ہے۔ اور بظاہر تو یہ خیال میں آتا ہے کہ اگر اس قسم کے موقع پر ورب العلمین فرماتے تو باعتبار موقع کے بہت ابلغ ہوتا کیونکہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے وہ حضور کی ذات سے متعلق نہیں بلکہ ایک مسئلہ بتانا ہے جس میں ایمان کے معیار کو ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا تعلق عامۃ الناس سے ہے تو اس موقع پر ربوبیت عامہ کو جتلانا زیادہ مناسب تھا۔ لیکن بجائے اس کے یہ عنوان اختیار کیا گیا کہ رب العالمین کی جگہ وربک فرمایا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صحیح معیار ایمان کا یہی ہے کہ حضور کے فیصلہ کو بدل و جان تسلیم کیا جاوے سو اس کے لئے یہی زیادہ مناسب تھا کہ لوگوں پر یہ بات ظاہر کردی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضور ﷺ کا مرتبہ جس کی بناء پر آپ کے فیصلہ کو تسلیم کرانا ہے کیا ہے جب یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ حضور کا مرتبہ حق تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے تو حضور کے فیصلہ کی پوری وقعت ہوگی اور پھر کسی کی یہ مجال نہ ہوگی کہ اس کو بخوشی تسلیم نہ کرے اس واسطے وَ رَبِّكَ فرمایا گیا پس اس میں قسم کے ساتھ حضور ﷺ کی عظمت بھی ظاہر ہو گئی یعنی یہ ظاہر ہو گیا کہ حضور کا درجہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ حق تعالیٰ اپنی قسم بلحاظ اس علاقہ کے کھاتے ہیں جو حضرت حق کو حضور کے ساتھ ہے اور یہ علاقہ اتنا بڑا ہے کہ جب عامۃ الناس کو اس کی اطلاع ہو جائے گی تو پھر حضور کے فیصلہ میں ان کو کسی چون و چرا کی گنجائش نہ رہے گی۔ اس بیان سے اس کا نکتہ واضح ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم حضور کے علاقہ سے کیوں کھائی اب ایک سوال اور باقی رہتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ سے تو کئی قسم کے تعلقات ہیں مثلاً سب سے بڑا علاقہ الوہیت کا ہے جو ام العلائق ہے تو بجائے وربک کے والھک کیوں نہ فرمایا' سبحان اللہ قرآن کی بلاغت قابل ملاحظہ ہے چنانچہ اس میں بھی ایک نکتہ ہے جو اس وقت سمجھ میں آیا اور یہ آپ لوگوں کی برکت ہے بعض وقت بیان کرنے والا بالکل خالی الذہن ہوتا ہے مگر سامعین کی طلب اور کشش کی برکت سے اس کے قلب میں کسی نئے مضمون کا القا ہو جاتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ماں کی چھاتیوں میں دودھ اس وقت آتا ہے جب پینے والا ہو جاتا ہے جس کی بابت مولانا فرماتے ہیں۔

تانہ گرید ابر کے قند د چمن　　　تا نگرید طفل کے جو شد لبن

یعنی جب تک بادل نہیں برستا چمن سرسبز و شادات نہیں ہوتا اور جب تک بچہ نہیں روتا ماں کے پستانوں میں دودھ نہیں اترتا اور جب تک دودھ پینے والا نہیں ہوتا تب تک وہ بھی نہیں آتا۔

اصل موثر فضل الٰہی ہے

غرض حاصل یہ ہوا کہ پستانوں میں دودھ پینے والے کی کشش سے آیا مگر اس پر آپ غرہ نہ ہوں کہ ہم ایسے طالب صادق اور متبرک ہیں کہ ہماری طلب سے مضامین کا القا ہوتا ہے کیونکہ محض آپ کا یہ خیال کر لینا آپ کے دعوے کے لئے کافی نہیں ہوگا وجہ یہ کہ بچہ کی طلب اور کشش سے دودھ جبھی آتا ہے جب کہ چھاتی میں موجود ہو کسی بچہ کے ذریعہ سوکھی لکڑی میں سے تو دودھ نکلوا لیجیے غرض اس میں آپ کی کشش کا بھی اثر ہے مگر اصل مؤثر فضل الٰہی ہے بہرحال یہ نکتہ اس وقت سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ اگر والھک فرماتے تو اس میں اتنی لطافت نہ پیدا ہوتی جتنی کہ وَرَبِّكَ کے لفظ میں پیدا ہوئی کیونکہ صفت الوہیت کا مقتضا یہی ہے کہ تمام عالم بحیثیت عبد ہونے کے بلا چوں و چراں سارے حقوق بندگی کے ادا کریں تو الوہیت کا تعلق ایک حاکمانہ تعلق ہے۔ کوئی شفیقانہ تعلق نہیں۔ برخلاف صفت ربوبیت کے کہ وہ شفیقانہ تعلق ہے تو ربک کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اس علاقہ سے قسم کھاتے ہیں جس کی رو سے ہم تمہاری خاص رعایتیں کرتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ لفظ الھک و ربک میں کیا فرق ہوا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان محبوبیت

اب غور کیجئے کہ جب حق تعالیٰ خود ہی حضور کی خاص رعایتیں فرماتے ہیں تو عامۃ الناس کا کیا منہ ہے کہ وہ حضور کی رعایت نہ کریں اور اس رعایت کی حقیقت اور حقوق جس کا حاصل اطاعت ہے مستقل دلائل سے ثابت ہے اور خود اس آیت میں بھی ہے حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ اس سے حضور کی محبوبیت کی تاکید پر اور تاکید ہوگئی کیا بلاغت ہے قرآن کی کہ ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف اس کا موتی کی لڑی کی طرح پرویا ہوا ہے غرض یہ آیات حضور کی شان محبوبیت سے لبریز ہے جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے ایسے محبوب کی امت میں پیدا کیا ہے تو اس سے جس قدر لطف و کرم کی ہم امید رکھیں وہ ہر صورت سے کم ہے گو ہماری حالت اس قابل نہ ہو۔

یا رب تو کریمی و رسول تو کریم   صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

اے رب تو بھی کریم ہے اور تیرا رسول بھی کریم ہے سینکڑوں شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں۔

اصل بیان یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں مومن ہونے کا معیار اور دل میں ایمان ہونے کا نشان بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ یعنی یہ لوگ مومن جب ہی کہلائیں گے جب کہ آپ کو ہر بات میں اپنا حکم قرار دیں اور اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ فرماتے ہیں

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ' وہ تحکیم ظاہری حکم تھا اور یہ تسلیم باطنی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ آپ کے فیصلہ پر عمل بھی کریں اور دل سے خوشی کے ساتھ اسے تسلیم بھی کریں خواہ کوئی قضیہ ہو حضور ہی کی طرف سے اس میں رجوع کریں خواہ وہ حق سلطنت ہو یا حق دشمن اور خواہ حق مشترک ہو یا منفرد' حتی کہ حقوق بہائم میں بھی حضور ہی کی طرف رجوع کریں اور حضور ہی کے فیصلہ کا اتباع کریں جو حضور بتائیں اس کو بطیب خاطر تسلیم کریں اور اس کے موافق عمل کریں اور یہ بتلانا حضور کا صحابہ کے لئے تو بلا واسطہ تھا مگر ہمارے لئے بواسطہ ہے گو حضور ﷺ اب موجود نہیں مگر دین کا سارا کام چل رہا ہے اور قیامت تک چلا جائے گا جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں

چونکہ گل رفت و گستان شد خراب	بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب
چوں کہ شد خورشید و مارا کرد داغ	چارہ نبود در مقامش جز چراغ

جب پھول کا موسم چلا گیا اور چمن اجڑ گیا تو اب پھول کی تمنا ہی فضول ہے ہاں پھول سے اثر ایسا ہی موجود ہے جب سورج غروب ہو گیا اور ہم کو داغ دے گیا اب اس کی جگہ میں سوائے چراغ کے چارہ کار نہیں ہے۔

اسلام کیلئے صرف اعتقاد کافی نہیں

فرمایا اسلام کے لئے صرف اعتقاد کافی انقیاد اور اطاعت ہونی چاہئے یعرفونه کما یعرفون ابناء هم' ابوطالب حضرت ﷺ کے بہت معتقد تھے مگر مسلمان نہیں حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا' مما قضیت ویسلموا تسلیما یہ ہونا چاہئے جب اعتقاد ہے تو انا مسلم کیوں نہیں کہتا یہی تو کفر ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت صفحہ ۵۵)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ﴿۶۹﴾

تَرجَمہ: اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے شخص بھی ان حضرات کیساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات اچھے رفیق ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

حدیث میں ایک صحابی حضرت ثوبانؓ کا واقعہ آیا ہے کہ وہ حضرت سرور کائنات ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر ہم جنت میں گئے بھی تو ہم کو وہ درجہ تو نصیب نہیں ہو سکتا جو درجہ آپ کا ہوگا اور جب ہم اس درجہ پر نہ پہنچ سکیں گے تو آپ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوگا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے' حضور کرام ﷺ نے یہ سن کر سکوت فرمایا آخر وحی نازل ہوئی وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ الایہ (جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتا ہے وہ قیامت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا' یعنی انبیاء' صدیقین شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ جب حضور ﷺ نے ان کی تسلی فرمائی یعنی یہ ضرورت نہیں کہ اس درجہ میں عارضی طور پر پہنچنے کیلئے اسی درجہ کے اعمال کی ضرورت ہو صرف اتباع اور محبت نبی کافی ہے جیسے دربار شاہی میں خدمت گار محض معیت و خدمت شاہ کی وجہ سے دیگر رؤساء سے پہلے پہنچتا ہے اس لئے مَعَ الَّذِيْنَ فرمایا آگے ذٰلِكَ الْفَضْلُ میں بھی تصریح فرمادی ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا اثر مت سمجھنا یہ محض فضل ہے اور واقع میں اگر غور کیا جاوے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین اور ایمان ہماری دنیا اور سب سامان ہماری نماز ہمارا روزہ ہمارا ثواب درجات جو بھی کچھ ہے سب حضور ﷺ کا ہی طفیل ہے۔ چنانچہ ان آیات کے شان نزول کے انضمام سے صاف معلوم ہوتا ہے جن میں ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں یہ محض فضل خداوندی یہ ہے کہ تم کو ایک بہانہ محبت سے بازیابی کی دولت نصیب ہوگئی اور یا یہ مطلب ہے کہ ذالک الفضل سے بعض مغلوب الیاس لوگوں کی ناامیدی دور کرنا ہے کہ شاید کسی کو خیال ہو جاوے کہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ ہم اس درجہ تک پہنچ سکیں تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ اگر چہ تم اس قابل نہیں لیکن نعمت تمہارے اعمال کی جزا نہیں ہے کہ تم ان پر نظر کر کے اس نعمت سے مایوس ہو جاؤ یہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل وجود میں ہے جس کے لئے تمہارے اعمال کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سبحان اللہ قرآن پاک بھی کیا عجیب چیز ہے کہ دو متعارض شبے ایک عجب دوسرا یاس اور ایک جملہ میں دونوں کا جواب خواہ یوں کہہ لو خواہ یوں کہہ لو۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۞ ' ابورافع ایک صحابی ہیں ان کو ایک بار یہ غم ہوا کہ یہاں تو جب چاہتے

ہیں حضور اقدس ﷺ کے دیدار سے مشرف ہو جاتے ہیں مگر جنت میں آپ بڑے درجہ میں ہوں گے اور ہم چھوٹے درجہ میں جہاں ہماری رسائی کس طرح دیدار میسر ہوگا اور اس خیال سے ان کو بے حد قلق ہوا اس پر یہ آیت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ سنا تو بے حد خوش ہوئے کہ الحمدللہ جنت میں بھی حضور ﷺ کی زیارت کیا کریں گے۔ اسی طرح دوسرے دوستوں سے جن کا ذکر صدیقین وشہداء وصالحین میں ہے ملا کریں گے ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اس صورت میں تو کم درجہ والے بڑے درجوں میں پہنچ جائیں گے فرمایا کہ پہنچ جائیں تو حرج اور نقص کیا واقع ہوا یہاں پر بھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کم درجہ والے بڑے درجوں والوں کے پاس ملنے کے لئے پہنچ جاتے ہیں یہاں پر معیت کے وہ معنی نہیں جو آپ سمجھے کہ اس درجہ پر مستقلاً پہنچ جائیں گے۔ اب فرمایئے کیا شبہ ہے عرض کیا اب کوئی شبہ نہیں رہا' عرض کیا کہ کیا جنت میں پہنچ کر حسرت ہوگی اور جی چاہے گا کہ ہم بڑے درجوں میں ہوتے فرمایا کہ جی ہی نہیں چاہے گا جو جس کے لئے تجویز ہوگی اس پر دل سے راضی رہیگا۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾

ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء وصدیقین شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں)

معیت سے مراد

کہ جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء وصالحین کے ساتھ (جنت میں ہوں گے اور یہ لوگ اچھے رفیق (اور اچھے دوست) ہیں۔ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب ان کے درجہ میں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے قریب ہوں گے اور ان سے زیارت وملاقات کیا کریں گے۔ آگے ناز کو قطع کرتے ہیں کہ اپنے عمل پر ناز نہ کرنا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل ہوگا۔ اس کے بعد فضل پر تکیہ کو توڑا وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا فضل پر تکیہ کر کے بے فکر نہ ہو جانا' اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ فضل کس پر ہوگا کس پر نہیں ہوگا۔ جس کو دوسرے مقام پر صراحت کے ساتھ بتلا دیا گیا ہے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل نیکوکار بندوں سے قریب ہے)۔

ہم بہ قاعدہ المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل اعلیٰ ہی درجہ کیوں نہ مراد لیں' جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے ثابت ہے اور اس استدلال سے ہم ان سے مساوات نہیں ثابت کرنا چاہتے اور نہ ہوسکتی ہے ہمارے لئے تو یہی معراج ہے کہ ہم ان کے خدام میں شامل ہو جائیں یہ بسا غنیمت ہے مساوات کا تو نام ہم کیا

لے سکتے ہیں ہمارے لئے تو ان کی معیت وتبعیت ہی باعث فخر ہے اور یہی ہمارے لئے اعلیٰ درجہ ہے سو اتباع سے ان شاء اللہ یہ ضرور حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ یہ معیت قرآن شریف سے جو کہ نص قطعی ہے ثابت فرماتے ہیں وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا۝ اس آیت میں اللہ ورسول کی اطاعت کرنے والوں کے لئے ان حضرات کے ساتھ معیت ثابت کی گئی ہے جن پر خدا کا انعام ہوا اور منعم علیہ کون ہیں، نبیین وصدیقین وشہداء وصالحین گو بطریق تبعیت ہی ہو مگر یہ بھی کتنی بڑی بات ہے۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مر   بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

فی الجملہ تمہارے ساتھ مجھ کو نسبت ہی کافی ہے بلبل کو یہی کافی ہے کہ گل کا قافیہ ہو جائے۔

اگر اللہ یہ معیت نصیب فرمادیں تو بہت ہی بڑی خوش قسمتی ہے یہ درجہ کس کو نصیب ہوتا ہے۔

الحمد للہ کہ صالحین کے لفظ کے متعلق ایک بہت بڑا وہم رفع ہوا اب میں بیان ختم کرنا چاہتا ہوں جو اصل مدعا ہے اسے سن لیجئے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ صالحین میں سے ہیں اور لفظ اولئک کا مشار الیہ اہل کتاب کی وہ جماعت ہے جس میں یہ صفات ہوں یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۝ وَمَا یَفْعَلُوْا مگر اس حکم میں خصوصیت محض اہل کتاب کی نہ سمجھی جاوے کیونکہ گو مورد آیات کا خاص ہو مگر عموم الفاظ یا علت سے حکم عام ہوا کرتا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اصلاح کامل اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو ان صفات کے ساتھ متصف ہو گویا دوسروں کے حق میں حکم بیان کر کے اس امت کو بھی سنانا ہے کہ اگر اصلاح کامل چاہتے ہو جس سے انبیاء علیہم السلام کی رفاقت نصیب ہو تو یہ صفات حاصل کرو جو آیات میں مذکور ہیں اور بناء ان سب کی حضور ﷺ اور وحی کی اتباع ہے چاہے وہ بواسطہ ہو یا بلاواسطہ اس طرح سے کسی حالت میں اپنی رائے کا اتباع نہ کیا جائے چنانچہ اہل کتاب کی دونوں جماعتوں میں جو ایک کی تعریف اور ایک کی مذمت فرمائی گئی ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ جس جماعت کی مذمت ہوئی انہوں نے حضور کا اتباع نہ کیا اور اپنی رائے کو کافی سمجھ کر اس پر عمل کرتے رہے اور دوسری جماعت نے اپنی رائے کو چھوڑ کر حضور ﷺ و وحی کا اتباع کیا۔ اب انہیں واقعات سے لوگ اپنی حالتوں کا موازنہ کر لیں کہ کہاں تک ان میں وحی الٰہی اور حضور ﷺ کا اتباع ہے اور کہاں تک خود رائی ہے۔

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿۷۶﴾

ترجمہ: بے شک شیطانی تدبیر لچر ہوتی ہے۔

تفسیری نکات

فرمایا بعض نے استنباط کیا ہے کہ عورتوں کا مکر شیطان سے بھی بڑھا ہوا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے (۱) ان کید الشیطان کان ضعیفا (بے شک شیطان کا مکر کمزور ہے) میں شیطان کے کید کو تو ضعیف فرمایا اور (۲) ان کید کن عظیم (بیشک تمہاری چالاکیاں ہی غضب کی ہوتی) میں عورتوں کے کید کو عظیم فرمایا مگر میرے یہ استنباط درست نہیں شیطان کے کید کو حق تعالیٰ کی قوت کے مقابلہ میں ضعیف فرمایا جیسا کہ آیۃ کے شروع سے معلوم ہوتا ہے (۳) الذین امنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت فقاتلوا اولیاء الشیطان (جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے رستہ میں قتال کرتے ہیں ان کافروں سے جو شیطان کے رستہ میں لڑتے ہیں پس شیطان کے دوستوں سے قتال کرو) ورنہ عورتوں کو تو خود شیطان ہی شیطان بناتا ہے۔ تو اس کا کید ان سے زیادہ ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۴ صفحہ ۱۳۸)

چالاکی اور عقل دونوں الگ الگ ہیں

فرمایا' چالاکی اور چیز ہے اور عقل اور چیز چالاکی تو مذموم ہے اور عقل محمود ہے دیکھئے ان کید کن عظیم (۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں کید اور چالاکی بہت ہے اور باوجود اس کے ان کو ھن ناقصات العقل والدین فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

ترجمہ: اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے۔

تفسیری نکات

احوال منافقین

سو منافقین کی یہ کیفیت تھی کہ جیسی خبر ان کو پہنچی مشہور کر دیتے یہ نہ خیال کرتے کہ کون سی خبر عوام میں شائع کرنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں سب خبروں کو یکساں شائع کر دیتے ہیں حق تعالیٰ اس بات پر ان کی اس آیت میں شکایت فرماتے ہیں اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ آگے ان کو مشورہ دیتے ہیں وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ کہ ان کو یوں چاہئے تھا کہ رسول اور اُولِی الْاَمْرِ (یعنی جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے اور وہ صاحب اختیار اور تجربہ کار ہیں ان کے حوالے کر دیتے بس جن میں قوت استنباطیہ ہے وہ ان خبروں میں استنباط کرتے کہ یا یہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں اور پھر یہ منافقین ان کی رائے کے مواقع عمل کرتے۔

پس جب معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں بلکہ اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے تو جو احکام غامض اور دقیق ہیں ان میں کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ لے اور ان سے استنباط کی طرف رجوع کرنے کی اس کو ضرورت نہ ہو یہی وجہ ہے کہ احکام کے سمجھنے اور اس کے اندر استنباط کرنے کو عام طور سے جائز نہیں قرار دیا گیا کہ ہر شخص ان کو کرے پس یہ حصہ قرآن شریف کا غامض ہے اور دوسرا جو تذکیر کا حصہ ہے جس میں ترغیب ترہیب اور عقائد کا بیان ہے اس میں کچھ خفاء نہیں ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا (کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کو عمداً بلا وجہ قتل کر دے تو قاتل کی سزا یہ ہے کہ وہ قاتل ہمیشہ دوزخ میں رہے گا)

قتل عمد کی سزا

تو اس کا مطلب بعض لوگوں نے یہی سمجھا ہے جو بظاہر آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل ہمیشہ دوزخ میں رہے گا لیکن محققین نے دوسرا مطلب لیا ہے۔ یعنی اس آیت میں جو حق تعالیٰ نے فجزاء فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یعنی اس قاتل کی فی نفسہ تو سزا یہی تھی کہ قاتل ہمیشہ دوزخ میں رہے لیکن یہ سزا دی نہیں جائے گی بلکہ اس سے ہلکی سزا دی جاوے گی کہ ایک عرصہ دراز تک قاتل کو جہنم میں رکھا جاوے گا جیسے کہ دوسری نصوص قطعیہ میں تصریح ہے البتہ بقول مشہور حضرت ابن عباسؓ اسی کے قائل ہیں کہ قاتل عمد کو خلود ہوگا لیکن ان سے تاویل رجوع بھی منقول ہے یہ بات طالب علموں کے سمجھنے کی ہے۔

ہر اخبار کی اشاعت کی مضرت

میں نے یعنی جامع نے ایک مولوی صاحب سے پوچھا تھا جو بہت اخبار دیکھتے تھے تو ان مولوی صاحب نے جواب دیا کہ اس سے عقل بڑھتی ہے سیاسی امور میں معلومات پیدا ہوتی ہے میں نے کہا کہ اسی واسطے علماء منع کرتے ہیں اخبار بینی کو کہ تم سمجھتے نہیں، اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ ہر اخبار کی اشاعت کی مضرت تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ کقولہ تعالی وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ مطلب ہے کہ جب ان لوگوں کو یعنی منافقین کو کسی امر جدید کی خبر پہنچتی ہے تو خواہ وہ موجب امن ہو یا موجب خوف تو اس خبر کو فوراً مشہور کر دیتے ہیں حالانکہ وہ بعض اوقات غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہو تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا خلاف مصلحت انتظامیہ ہوتا ہے۔ اور اگر بجائے خود مشہور کرنے کے یہ لوگ اس خبر کو رسول ﷺ کی اور جو حضرات صحابہؓ ان میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کی رائے کے اوپر رکھتے اور خود دخل نہ دیتے تو صحت و غلطی ہونے کا اور قابل تشہیر ہونے نہ ہونے کا وہ پورا اندازہ کر سکتے اس کی پوری تفصیل تو تفسیر میں دیکھ لینے کے قابل ہے یا کسی عالم محقق سے سمجھنی چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اخبار کے بالعموم مشہور کرنے کی ممانعت قرآن مجید میں موجود ہے اور حدیث میں بھی وارد ہے کفا بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع (انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے کہ جو سنے (اسے آگے بغیر تحقیق کے) بیان کر دے) (ملفوظات حکیم الامت ج۱۵ صفحہ ۱۴۱)

وانھم الیہ راجعون کے مشاہدہ کا مراقبہ کیا جائے یعنی موت کا اور موت کے واقعات رات دن مشاہدے سے فرض ہے محض ظن کافی نہیں مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقاء اللہ و رجوع الی اللہ کا استحضار کیا جاسکے اور یہ استحضار درجہ

وقوع میں لازم نہیں بلکہ اس کا ظن اور تصور بھی نماز میں کافی ہے کہ گویا میں اسی وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مر گیا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں اس واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع خاص ہو جائے گا اور تمام خیالات وساوس قلب سے نکل جائیں گے واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع)

قرآن عجیب کیمیا ہے

صاحبو! قرآن عجیب کیمیا ہے۔ جس میں سارا کام مفت ہی ہے مگر ذرا سی نگہداشت ہمارے ذمہ ہے اور جتنے طریقے سلوک کے ہیں جو دوسرے مذاہب میں معمول بہا ہیں ان کی مثال اس کیمیا کے مشابہ ہے جس میں اکیس روپے خرچ کئے جائیں اور مال بیس کا بھی حاصل نہ ہو اور شریعت مقدسہ کی کیمیا ایسی ہے جس میں نفع ہی نفع ہے نقصان کچھ نہیں شریعت مقدسہ نے بڑے سے بڑے کام کو بھی ایسا آسان کر دیا ہے کہ پھول سے زیادہ ہلکا ہو گیا ہے مگر توفیق نہ ہو تو وہ بھی سخت مشکل ہے غور تو کیجئے کہ اسلام میں کیا دشواری ہے رحمت ہی رحمت اور سہولت ہی سہولت ہے مگر توفیق رفیق نہ ہو تو بہت مشکل ہے ایک تو یہ جزو ہے اجزاء ثلاثہ مذکورہ فی الحدیث میں سے جس کا بیان کرنا مقصود نہ تھا مگر چونکہ جزو مقصود الحج یھدم ما کان قبلہ کے لئے معین تھا جیسا عنقریب اس کا بیان ہوتا ہے اس لئے اس کا مفصل بیان کر دیا گیا۔

دارالکفر کی دو قسمیں

دوسرا جزو یہ ہے الھجرۃ تھدم ما کان قبلھا کہ ہجرت بھی پہلے گناہ گرا دیتی ہے ہجرت کے معنی ہجرت دار خوف سے دار امن کی طرف کیونکہ دارالکفر دو قسم کے ہیں ایک دارالخوف جس میں شعار اسلام ظاہر کرنے پر مسلمانوں کو قدرت نہ ہو بلکہ اس اظہار میں جان و مال کا خطرہ ہو دوسرا دارالامن جہاں سلطنت تو کافر کی ہے مگر مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے کہ وہ شعائر اسلام کو بے خوف و خطر ظاہر کر سکتے ہیں اور ہجرت اس دارالکفر سے فرض ہے جو دارالخوف بھی ہو اور دارالکفر جو دارالامن ہو وہاں سے ہجرت فرض نہیں تو جاہلوں کا یہ شبہ دور ہو گیا کہ اگر ہندوستان دارالکفر ہے تو یہاں سے ہجرت کیوں نہیں کی جاتی اس شبہ کا جواب ہمارے استاد محقق و مدقق مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے خوب دیا تھا کہ مکہ معظمہ سے جبکہ وہ دارالحرب تھا پہلی ہجرت صحابہ نے حبشہ کی طرف کی جہاں اس وقت تک اسلام موجود نہ تھا پس حبشہ بھی اس وقت دارالحرب تھا اور وہاں جانے والوں کو مہاجر کہا گیا اور صحابہ وہاں ہجرت کر کے اسی واسطے گئے کہ وہ دارالامن تھا اور ان کی یہ ہجرت معتبر ہوئی اور ان کو ہجرت کا ثواب بھی ملا پھر ان صحابہؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کا لقب ذوالہجرتین ہوا پس معلوم ہوا کہ دارالامن گو دارالایمان نہ ہو بلکہ دارالکفر ہی ہو وہاں سے ہجرت کرنا فرض نہیں بلکہ وہ تو خود ہجرت گاہ بن سکتا ہے

ہاں اس میں شک نہیں کہ دارالایمان کی طرف ہجرت کرنا افضل ہے مگر اداءِ فرض کے لئے دارالامن کی طرف ہجرت بھی کافی ہے جو شخص دارخوف سے دارالامن کی طرف بھی ہجرت نہ کرے وہ تارک فرض ہے اور اسی کے لئے سخت وعید ہے۔ ان الذین توفھم الملئکۃ ظالمی انفسھم قالو افیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجرو افیھا فاولئک ما واھم جھنم وساء ت مصیراً الا المستضعفین من الرجال والنسآء والولدان لایستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلا فاولئک عسی اللہ ان یعفو عنھم وکان اللہ عفواً غفورا (ترجمہ) جن لوگوں کی جانیں فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر (ترک ہجرت سے) ظلم کرنے والے تھے ان سے ملائکہ نے کہا کہ تم کس کام میں تھے انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس سرزمین میں محض مغلوب اور کمزور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس کے کسی حصہ میں ہجرت کر جاتے (اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا) ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ بازگشت ہے ہاں مگر وہ مرد اور وہ عورتیں اور بچے جو واقعی مغلوب و کمزور تھے جو نہ کوئی تدبیر (ہجرت کی) کر سکتے تھے۔ اور نہ ان کو کوئی راہ ملتی تھی ان کو امید ہے کہ خدا تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ تو معاف کرنے والے مغفرت کرنے والے ہی ہیں (وہ عذاب کے لئے بہانہ نہیں ڈھونڈھتے بلکہ اسی کو عذاب کرتے ہیں جو بلاوجہ گناہ کا مرتکب ہو ۱۲) جو لوگ محض ترجمہ دیکھ کر محقق بننے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو عسی اللہ ان یعفو عنھم میں امید کے لفظ سے یہ شبہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے اس مضمون کو شک کے ساتھ کیوں بیان فرمایا ان کو تو اپنے فعل کا یقین ہے پھر یقینی بات کو یقین کے لفظ سے بیان کرنا چاہئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ تم نے محض ترجمہ دیکھا ہے قرآن کو سمجھا نہیں اس واسطے یہ شبہ ہوا تم کو چاہئے کہ پہلے یہ بھی دیکھ لو کہ یہاں متکلم کون ہے اور مخاطب کون ہیں سو ظاہر ہے کہ متکلم حق تعالیٰ شانہ احکم الحاکمین ہیں۔

شاہانہ محاورات

پس خدا تعالیٰ کے کلام کو شاہانہ محاورات پر منطبق کر کے دیکھو یہ عامیانہ محاورات پر منطبق نہ کرو اور شاہانہ محاورات میں وعدہ جازمہ کے لئے بھی امید ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اسی سے ڈپٹی صاحب دہلوی کے ترجمہ کی غلطی معلوم ہوگئی جنہوں نے دہلی کی بازاری زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا چنانچہ ایک جگہ ٹامک ٹوئیاں مارنا استعمال کیا ہے جگہ کبڈی کھیلنا لکھا ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ الفاظ شاہی زبان میں استعمال نہیں ہوئے مترجم قرآن کو لازم ہے کہ ترجمہ میں شاہانہ طرز و انداز کو ہاتھ سے نہ جانے دے جو قرآن کا خاص طرز ہے عربی دان طبقہ خوب جانتا ہے کہ قرآن کی زبان کیسی پرشوکت اور کس قدر باسطوت ہے دوسرے یہ دیکھو کہ مخاطب کلام کے کون ہیں سو ظاہر ہے کہ مخاطب بندے ہیں اور بندہ کا فرض یہ ہے کہ اخیر دم تک امید و بیم ہی میں رہے کسی وقت

جلال شاہی سے بے خوف نہ ہو اسی لئے حکام مقدمات میں اخیر تک فریقین کو امید وہم ہی میں رکھتے ہیں فیصلہ کے دن ظاہر ہوتا ہے کہ کون کامیاب ہے اور کون ناکام ایسے ہی یہاں بھی فیصلہ کے دن سے پہلے یعنی قیامت کے دن سے پہلے بندوں کو امید وہم ہی میں رکھا گیا ہے اتنا فرق ہے کہ حکام تو اپنی غرض کے واسطے ایسا کرتے ہیں اور حق تعالیٰ نے بندوں کے فائدہ کے لئے ایسا کیا ہے کیونکہ بندے کو اگر کسی وقت اطمینان ہو جائے کہ میں جنتی ہوں تو وہ جرائم سے نڈر ہو جائے گا اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں جہنمی ہوں تو وہ ناامید ہو کر بھلائی سے بالکل دور جا پڑے گا اور اس میں علاوہ اس کے نقصان کے نظم عالم کے درہم برہم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے کیونکہ کثرت جرائم سے نظام کا درہم برہم ہونا ظاہر ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِــيْمًا ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقع کے موافق تاکہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے اور آپ ان خائنوں کی طرفداری کی بات نہ کیجئے اور آپ استغفار فرمایئے بلا شبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے جو کہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں بلا شبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے جو بڑا خیانت کرنے والا بڑا گناہ کرنیوالا ہو۔

تفسیری نکات

ایک اشکال کا جواب

اس سے ظاہری نظر میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ سے خائنین کی طرفداری صادر ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے آپ کو اس سے نہی کی گئی مگر سب کا عمدہ جواب یہ ہے کہ نہی اور امر میں زمانہ استقبال کا ہوتا ہے ماضی اور حال کا نہیں ہوتا تو لَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا، کے معنی یہ ہیں کہ آپ آئندہ کبھی ان کے طرفدار نہ ہوں جیسے کہ اب

تک نہیں ہوئے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ طرفدار ہوئے ہوں بلکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جیسے آج تک نہیں ہوئے آئندہ بھی یہ طرز رکھئے اس کی ایسی مثال ہے جیسے وَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ فرمایا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ نعوذ باللہ آپ کو شبہ تھا؟ اور آپ سے منہیات کے صادر نہ ہونے کی صاف دلیل یہ ہے جو ایک جگہ فرماتے ہیں وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا یعنی اگر ہم آپ کو نہ سنبھالے رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور کو غیر حق کی طرف کبھی میلان نہیں ہوا تو اب کیا شبہ رہا' غرض حضور ﷺ کی عصمت میں کبھی ذرا بھی فتور نہیں پڑا۔ (الفضل العظیم)

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یعنی وہ آپ کو غلطی میں کیسے ڈال سکتے ہیں آپ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور ایسی ایسی باتیں سکھلائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے اور اس آیت میں جو تین چیزوں کا علم دینا مذکور ہے کتاب اور حکمت اور مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ سمجھ میں یوں آتا ہے کہ علوم تین قسم کے ہیں ایک کا نام کتاب رکھا اور ایک کا حکمت اور ایک کو مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ سے تعبیر فرمایا تفصیل اس کی یہ ہے کہ علم کی اصل میں دو قسمیں ہیں ایک علم احکام اور ایک علم واقعات اور یہ تقسیم خصوصاً جناب رسول مقبول ﷺ کی شان میں تاویل کرنے سے بہت زیادہ سمجھ میں آ جائے گی کیونکہ حضور ﷺ صاحب سلطنت بھی تھے تو حضور کو دو قسم کے علم کی ضرورت تھی۔ ایک حکم کے علم کی اور ایک واقعات کے علم کی' جیسے حکام کو دونوں باتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے کیونکہ اگر واقعہ معلوم نہ ہو تو نرے قانون سے کیا ہوتا ہے یا اس کا عکس ہو کہ قانون نہ معلوم ہو' تو صرف واقعہ معلوم ہو جانے سے کیا ہوتا ہے۔ فیصلہ میں دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے واقعہ کا بھی علم ہو اور اس کے حکم کا بھی علم ہو لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور ﷺ کو ہر واقعہ کا علم وحی سے عطا ہوا ہو خاص خاص ضروری واقعات کا علم دینا مراد ہے جیسے یہاں اس واقعہ کا علم ہے جس میں منافقین نے چوری کا الزام بےقصور پر لگایا تھا۔ تمام واقعات کا علم مراد نہیں ہے چنانچہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے فلعل بعضكم يكون الحن بحجة من بعض فاذا امرت لاحدهم بشى فانما اقطع له بقطعة من نار (پس آپ کو تمام واقعات کا علم نہیں دیا گیا)

رسول اکرم ﷺ کی عصمت

ایک جگہ فرماتے ہیں ولو لا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیهم شیئا قلیلا یعنی اگر ہم آپ کو نہ سنبھالے رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو غیر حق کی طرف کبھی میلان نہیں ہوا تو اب کیا شبہ رہا غرض حضور ﷺ کی عصمت میں کبھی ذرا بھی فتور نہیں پڑا اس وقت مختصراً میں نے بیان کر دیا ہے اپنی تفسیر میں میں نے اس کو مفصل لکھا ہے یہ تو پہلا رکوع اور دوسرا رکوع ہے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ (اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا) اس سے بھی آپ کی عصمت میں شبہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ فرماتے ہیں یعنی اگر حق تعالیٰ کا آپ پر فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ارادہ کرتا ایک گروہ یہ کہ آپ کو غلطی میں ڈال دے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ کا مرتبہ بھی نہیں ہوا کیونکہ ھم اس کو کہتے ہیں جس کے بعد صدور فعل کا ہو جاوے اور وہ مرتبہ عزم کا ہے اور بعض نے ھم کو عزم سے قبل کہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ قرآن میں وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال عزم کے درجہ میں جم رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) بھی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ھم بالمرءۃ (آپ کے دل میں اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) اور انبیاء چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لئے عزم معصیت ان سے محقق نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اس کے قائل ہو گئے کہ ھم عزم سے پہلے ہوتا ہے۔

قرآن پاک کے ایک مشکل مقام کی تفسیر

مگر محققین نے کہا ہے کہ اس کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ آگے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) ہے جو شرط موخر ہے هَمَّ بِهَا کی یعنی اگر برہان رب نہ دیکھتے تو ارادہ کر لیتے تو یہاں ھم کا اثبات ہی نہیں جو اس کی ضرورت ہو کہ ھم کو عزم سے قبل مانا جاوے بلکہ ھم کی نفی مقصود ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ (اسی طرح ہم نے ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں) تو اس میں ان سے صغائر اور کبائر کی نفی فرما رہے ہیں یہ قرینہ ہے اس کا کہ ھم کی یہاں نفی کی جارہی ہے نہ کہ اثبات اور گو بعض نے کہا کہ لولا کی جزا مقدم نہیں ہوتی لیکن اول تو اس میں اختلاف ہے دوسرے اگر مان بھی لیں کہ لولا کی جزا مقدم نہیں ہوتی تو یہ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) دال علی الشرط (شرط پر دلالت کرنے والا) ہوگا اور شرط محذوف مقدم ہوگی بہر حال یہاں ھم کا اثبات نہیں اس لئے ہم کو عزم سے قبل ماننے کی بھی ضرورت نہیں غرض ھم کا مرتبہ اکثر علماء کے نزدیک وہ ہے جس کے بعد فعل کا صدور ہوتا ہے لیکن حضور ﷺ کے متعلق اس کا تحقق نہیں ہوا کیونکہ یہ فرمایا جارہا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا آپ پر فضل نہ ہوتا تو ایک جماعت ان میں سے ایسا ارادہ کر لیتی تو حق تعالیٰ کا فضل مانع ہے پھر مجال ہی کیا ہے کہ کوئی ایسا ارادہ کر سکے اور اگر کسی مفسر نے اس کے خلاف کہا ہے تو ہم قرآن کے مقابلہ میں اس کا اعتبار نہ کریں گے بعض تفاسیر میں بعض باتیں بلا سند نقل ہو گئی ہیں وہ قابل اعتبار نہیں اسی طرح افک کے قصہ میں بھی بعض تفاسیر محض بے سند نقل ہو گئی ہیں۔ چند مقامات

قرآن شریف میں مشکل ہیں ان میں سے ایک یہ مقام بھی ہے چنانچہ اس مقام پر جو اشکال تھا وہ رفع ہو گیا۔
غرض ان آیات میں ان منافقین کی شرارت اور ان کی تدابیر کا بے سود ہونا بیان کیا گیا ہے آگے اس کی تتمیم ہے
وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (الآیہ) یعنی وہ آپ کو غلطی میں کیسے ڈال سکتے ہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور ایسی باتیں سکھلائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے اور اس آیت میں جو تین چیزوں کا علم دینا مذکور ہے کتاب اور حکمت اور مالم تکن تعلم (اور باتیں جن کا آپ کو علم نہ تھا) سمجھ میں یوں آتا ہے کہ علوم تین قسم کے ہیں ایک کا نام کتاب رکھا اور ایک کا حکمت اور ایک کو مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ (وہ باتیں جن کا آپ کو علم نہ تھا) سے تعبیر فرمایا:

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر کتاب اور علم کی باتیں بھی نازل فرمائیں اور آپ کو وہ باتیں بتلائی ہیں جو آپ ﷺ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔

مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ کی جو تصوف کے خاص شعبہ اسرار سے تفسیر کی گئی ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ اب تو قواعد سے معلوم ہو گیا کہ اس سے وہ علوم مراد ہیں جو مقصود ہیں شریعت کے چنانچہ حق تعالیٰ رسول مقبول ﷺ سے فرماتے ہیں وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ظاہر ہے کہ انزل سے مقصود ان علوم کا سکھانا ہے جو کتاب و حکمت میں موجود ہیں پس مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ (وہ باتیں جن کی آپ کو خبر نہ تھی) میں اس کتاب و حکمت کے متعلق اس کا بیان ہے کہ یہ آپ کو پہلے سے معلوم نہ تھا انزل کے بعد معلوم ہوا اسی طرح ایک مقام پر امت کو خطاب ہے۔ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ؁ کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول کو کہ تلاوت ہماری آیتوں کی تمہارے سامنے کرتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور وہ چیزیں تم کو بتلاتا ہے جن کو تم نہیں جانتے ہو) یعنی اے امتیو تمہیں سکھاتے ہیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے) ان دونوں کا ایک ہی مقصد ہے اور مضمون و مدلول بھی دونوں کا ایک ہی ہے اور جس طرح يُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ (تم کو وہ چیزیں بتلائی جن کی آپ کو خبر نہیں) کو بعض نے تصوف پر محمول کیا ہے یہاں بھی يُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ (وہ چیزیں تم کو بتلاتے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں ہے) تصوف پر محمول کیا ہے مگر واقع میں وہاں بھی علمک (سکھائی تجھ کو) سے علم مکاشفہ مراد نہیں کہ وہ مقصود نہیں بلکہ ایسا علم مراد ہے جس کی اشاعت کا اور نشر کا اہتمام واجب ہے اور یہاں یعلمکم (سکھاتا ہے تم کو) سے یہی علوم مقصود مراد ہیں۔ اب معلوم ہو گیا کہ علوم مکاشفہ سے تفسیر کرنا صحیح نہیں کیونکہ علم تصوف باعتبار اپنے ایک شعبہ خاص یعنی علوم معاملہ کے گو علوم مقصودہ میں سے ہے کیونکہ یہ بھی نص کا مدلول ہے جیسا اہل فن جانتے ہیں مگر ان لوگوں نے غلطی کی کہ تصوف کی جو حقیقت یہ سمجھے ہیں یعنی علوم مکاشفہ و اسرار وہ نہ نص کا مدلول ہے اور نہ تصوف کا اور اسی لئے

(ان لوگوں کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ اس کو کتاب و حکمت میں داخل کرتے تو انہوں نے کہا لاؤ اسے مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (وہ باتیں جن کی تم کو خبر نہ تھی) میں داخل کردو اب اس کا حاصل انہی کی تسلیم پر یہ ہوا کہ تصوف کتاب وحکمت میں بلا واسطہ بھی داخل نہیں اور بواسطہ بھی ان کا مدلول نہیں حالانکہ تصوف میں جو اصل چیز ہے یعنی علم معاملہ وہ یقیناً کتاب وحکمت کا مدلول ہے کیونکہ تصوف کا علم معاملہ کے سب مسائل اور احکام اور آداب اور قواعد یہ سب قرآن وحدیث ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنے معاملہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ درست کرنا تعمیر الظاہر والباطن یعنی اپنے ظاہر وباطن کی اصلاح کرنا درحقیقت یہ سب فقہ ہی میں داخل ہے جس کا کتاب وحکمت میں داخل ہونا معلوم ومسلم ہے چنانچہ امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تعریف یہی کی ہے معرفۃ النفس مالھا وما علیھا کہ نفس کا یہ پہچاننا کہ اس کے لئے کیا چیزیں نافع ہیں کیا چیزیں مضر ہیں سو یہ تعریف ظاہر وباطن دونوں قسم کے احکام کو عام ہے البتہ علم مکاشفہ نہ تو نافع ہے نہ مضر مثلاً کسی کو تجدد امثال' توحید وجودی' تنزلات ستہ وغیرہ منکشف نہ ہوں تو ذرا بھی قرب الٰہی میں مانع نہیں لیکن اگر معاملہ درست نہ ہو تو قرب حاصل نہیں ہوسکتا چنانچہ حضرت جنید کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا گزری فرمایا کہ فنیت الرموز و الاشارات و نفدت الحقائق و العبادات وما نفعنا الا رکیعات فی جوف الیل (یعنی حقائق ومعارف متعارفہ سب فیل ہوگئے صرف چند رکعتیں جو پچھلی رات میں پڑھ لیا کرتا تھا وہ کام آئیں اور علمی تحقیقات کچھ کام نہ آئیں حالانکہ ان کے پاس کتنے بڑے علوم تھے مگر وہ فقہ نہیں تھے بلکہ علوم مکاشفہ تھے جو کچھ بھی کارآمد نہیں ہوئے علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ کی ایسی مثال ہے جیسے دیوار سے پیچھے ایک بادشاہ ہے اور کسی طریقہ سے ہماری نگاہ دیوار توڑ کے اس تک جاسکتی ہے جیسے اس زمانہ میں بجلی کے ذریعہ سے بکس کے اندر کا پرکار نظر آتا ہے اور بکس نظر نہیں آتا۔ بجلی شعاع کو اجسام ثقیلہ کے پار کردیتی ہے اس لئے درمیانی چیز نہیں دکھائی دیتی اور جو اس کے آگے ہے وہ نظر آئے گا چنانچہ یوں ہی کسی طریقہ سے دیوار کے پیچھے بادشاہ نظر آنے لگا اور ایک شخص وہ ہے جسے بادشاہ تو نظر نہیں آتا مگر وہ خالی نام سن کر اطاعت کرتا ہے اور وہ پہلا شخص بادشاہ کو دیکھ کر اطاعت کرتا ہے تو ان دونوں میں بتلایئے کون زیادہ مقبول ہوگا آیا وہ جو بغیر دیکھے اطاعت کرتا ہے یا وہ صاحبو! بادشاہ کے دیکھنے سے گو حظ تو زیادہ ہوگا مگر قرب نہیں بڑھے گا کیونکہ قرب دو قسم کا ہوتا ہے ایک رضا ومقبولیت کا' دوسرا معائنہ کا سو یہ دوسرا درجہ خود مقصود بالتحصیل نہیں کیونکہ یہ اس کا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے قبضہ واختیار سے باہر ہے گو اس کے بعض افراد جو موہوب ہیں بدلالت نصوص سب درجات مکسوبہ سے افضل ہوں جیسے نبوت وولایت موہوبہ مگر مامور بہ نہیں اور یہ مکلف ہے امور اختیاریہ کا ہاں اسے ایک اصطلاح پر وصول کہہ سکتے ہیں تحصیل نہیں کہہ سکتے۔ اور مامور بہ تحصیل ہے وصول مامور بہ نہیں اور جو قرب بمعنی مقبولیت واجبۃ التحصیل ہیں تحصیل مامور بہ پر مرتب ہوتا ہے سو دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات وصفات

کے اسرار کا منکشف ہونا یہ قرب مقصود نہیں نہ اس پر ثمرہ مرتب ہوگا جو قرب مقصود و مامور بہ جو وہ اطاعت و اعمال میں ہوتا ہے اور ان کا ثمرہ آخرت میں مرتب ہوگا غرض قرب کی اس قسم میں مقصودیت بالکل نہیں ہے مقصود تو وہ شئی ہے جس کی تحصیل کے لئے کوئی طریقہ شرعاً وضع کیا گیا ہو اور اس کی تحصیل کے لئے طریقہ وضع نہیں کیا گیا اس لئے یہ مقصود نہیں ہوسکتا اور اگر یہ مکاشفہ مقصود ہوتا تو عالم ملکوت مومنین کو نظر آتا نافرمانوں کو نظر نہ آتا۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ جنگ بدر میں شیطان مثل انسان آیا اور اس نے کفار کو بہکایا لیکن فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ یعنی جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں اور شیطان نے فرشتوں کو دیکھا تو بھاگا کہ انی اری مالا ترون میں وہ شئے دیکھ رہا ہوں جو تمہیں دکھائی نہیں دیتی تو دیکھئے ملائکہ کے منکشف ہونے سے ابو بکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی محروم رہے اور شیطان لعین کو یہ مکاشفہ حاصل ہوا اس سے معلوم ہوا کہ کشف مقصود نہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قیامت میں حقائق منکشف ہوجائیں گے اور قیامت میں وہ خوب آنکھوں والے ہو جائیں گے چنانچہ ارشاد ہے اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (کیسے شنوا ہو جائیں گے لیکن یہ ظالم آج صریح غلطی میں ہیں) اگر مکاشفات مقصود ہوتے تو مسلمانوں کو خوب حاصل ہوتے اس سے معلوم ہوا کہ مقصود صرف اعمال ظاہری و باطنی یعنی نماز روزہ وغیرہ اور توکل وغیرہ ہیں کہ قلب کو اعمال باطنہ سے اور جوارح کو اعمال ظاہرہ سے آراستہ کیا جاوے بس یہی تصوف ہے گو بعض نے اپنی اصطلاح و عرف میں تصوف صرف فن اصلاح باطن کا نام رکھ لیا ہے جو لوگ علوم دینیہ اور اس کے حاملین یعنی علماء کو نظر تحقیر سے دیکھتے ہیں وہ ذرا اس آیت کو تو دیکھیں جس کو میں نے تلاوت کیا ہے دیکھو اس میں حق تعالیٰ نے علم کتاب و حکمت کو فضل عظیم فرمایا ہے اس سے مراد یقیناً علوم دینیہ ہیں جو تمام علوم دنیا سے افضل ہیں اور افضل العلوم اور اشرف العلوم ان ہی کو کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ علوم افضل ہیں تو اس علم کے علماء بھی افضل ہوں گے۔ اب جو لوگ علماء کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں وہ ذرا بتلائیں تو کہ ان بیچاروں نے ان کا کیا قصور کیا ہے کچھ نہیں بلکہ وہی بات ہے جس کو حق تعالیٰ نے فرمایا وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ یعنی کافروں نے مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو غالب اور سزاوار حمد ہے وہ کہ اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی تو مطلب یہ ہوا کہ وہ بلاوجہ محض عناد کی بناء پر ان پر طعن کرتے ہیں اسی مضمون پر کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

ولا عیب فیھم غیر ان سیوفھم　　بھن فلول من قراع الکتائب

(ان میں سوائے اس کے کوئی عیب نہیں ہے کہ ان کی تلواروں کی دھار شمشیر زنی سے گر گئی ہے) صاحبو! اسی طرح علماء کا بس یہی جرم ہے کہ انہوں نے علم دین حاصل کر لیا ہے اور آج کل لوگوں نے علم دین کو حقیر سمجھ

رکھا ہے افسوس اس تحقیر کی وجہ سے لوگوں کی مشغولی علم دین سے ٹوٹ گئی ہے اور جو بچارے اللہ کے نیک بندے مشغول بھی ہوتے ہیں تو ان پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ مولوی تنگ خیال ہیں علماء کو وسیع الخیال ہونا چاہئے۔

اور جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا بعد اس کے اس کو امر حق واضح ہو چکا تھا۔

اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے

حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے یا نہیں اس کے جواب کے لئے آپ نے چار دفعہ کلام مجید ختم کیا جب یہ آیات خیال میں آئی وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى جس سے اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا ثابت ہوتا ہے بس جو کچھ محنت اس آیت کے ڈھونڈنے میں پڑی وہ صرف حضرت امام شافعیؒ پر پڑی اس کے بعد سب کے لئے راستہ صاف ہو گیا اور اب تک اس مسئلہ میں ہر عالم اسی آیات کو پیش کرتا چلا آتا ہے کسی کو پھر کوئی زحمت ہی نہیں اٹھانی پڑی۔

فرماتے ہیں وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا۝

دوسری جگہ ارشاد ہے فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۝

بعثت محمدیہ ﷺ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان مواقع میں فضل اللہ علیکم ورحمتہ کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر محمد ﷺ کو مبعوث فرما کر خدا تعالیٰ تم پر اپنا فضل ورحمت نہ فرماتے تو تم ناکام اور محروم رہتے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعثت محمدیہ سے تم پر رحم وکرم نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے اس جگہ ایک اشکال طالب علمی ہو سکتا ہے کہ الا قلیلا کے بڑھا دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بدوں بعثت محمدیہ کے بھی راہ مستقیم پا لیتے ہیں جواب یہ ہے کہ اتباع سے مراد اتباع مطلق ہے نہ کہ مطلق اتباع، پس معنی یہ ہوئے کہ تم شیطان کے پورے متبع ہوتے۔ صرف بعضے لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عقل کامل وسلیم عطا فرمائی ہے وہ البتہ کامل اتباع شیطان کا نہ کرتے یعنی ایسے امور میں جن میں عقل کام دے سکتی ہے صرف ان میں اتباع شیطان کا خاص ایسے لوگ نہ کرتے گو مطلق اتباع شیطان سے یہ بھی نہ بچتے کیونکہ جن میں عقل کام نہیں دیتی ان میں کوئی مانع اتباع شیطان سے نہ تھی (راس الاربعین)

تفصیل امور مذکورہ کی یہ ہے کہ بعض احکام شریعت کے بدیہی اور ظاہر بھی ہیں تو ذکر کے لئے آسان ہے اجتہاد کے لئے ہر ایک کو آسان نہیں اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ واقعات جو کہ احکام کی برابر غامض

(باریک) نہیں ان کے باب میں فرماتے ہیں وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ منافقین کی یہ عادت تھی کہ حضور ﷺ جب کہیں لشکر بھیجتے اور وہاں سے کوئی خبر آتی تو وہ اس کو مشہور کر دیتے اس پر یہ آیات نازل ہوئی یعنی جب ان کے پاس کوئی خبر امن کی یا ڈر کی پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو رسول اور اپنے اہل حکومت کے حوالے کرتے تو اہل تحقیق ان میں سے ان کی تحقیق کر لیتے (کہ یہ خبر قابل اشاعت ہے یا نہیں) پس جبکہ معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں تو احکام جو کہ غامض (باریک) اور دقیق ہیں ان میں کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ لے اب یہ سمجھنا کیا کوئی آسان بات ہے قرآن شریف میں مہاجرین کی نسبت جنہوں نے مکہ سے مدینے کو ہجرت کی تھی فقراء کا لفظ وارد ہوا تھا۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ (ان حاجت مندوں مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں) اس سے فقہانے استنباط کیا کہ استیلا (غالب آنا) کفار سبب ہوتا ہے اس کی ملک کا کیونکہ مہاجرین کے اموال اہل مکہ کے پاس رہ گئے تھے تو اگر وہ ان کی ملک نہ ہو جاتے بلکہ انہیں کی ملک میں رہتے تو ان کو فقراء کیوں کہا جاتا۔ فقیر تو اسی کو کہتے ہیں جس کی ملک میں کچھ نہ ہو یہ ایک جزئی مثال کے طور پر ہے ورنہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ اجتہاد اور استنباط بہت مشکل ہے غرض علوم اجتہادیہ بھی علم دین ہیں اور اس سے ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ علوم اجتہادیہ بھی نازل من اللہ (اللہ کی طرف سے اترے) ہیں اور اس کی شرح فقہاء کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ **القیاس مظهر لا مثبت** (قیاس حکم شرعی کو ظاہر کر دیتا ہے اس کے لئے مثبت نہیں) تو یہ بھی منزل من اللہ ہے (اللہ کی طرف سے نازل کیا ہوا) اور ایک اور مسئلہ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ (یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو ایک گروہ ان میں سے آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا) تو [illegible] بچانے والے کو فضل کو فرمایا اور اس آیت سے کہ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) معلوم ہوا کہ فضل علم دین ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا تو ثابت ہوا کہ علم دین میں یہ خاصیت ہے کہ وہ گمراہی سے بچاتا ہے اور جو علم دین جان کر بھی عملی غلطی کرے تو اس کو صاحب علم نہ کہا جاوے گا۔

علم دین سے دین و دنیا کا نفع

اور ایک مسئلہ یہ مستنبط ہوا کہ علم دین سے دین اور دنیا دونوں کو نفع ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ اول آپ کو اس واقعہ میں علم دینے کا ذکر فرمایا اور پھر اس کے لئے دو لفظ فرمائے ایک فضل اور ایک رحمت چنانچہ ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ الخ اور نصوص کے تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فضل کا استعمال تو اکثر منافع دنیویہ

میں آیا ہے اور رحمت کا استعمال منافع اخروی میں چنانچہ مسجد میں داخل ہونے کا وقت جو کہ منافع آخرت حاصل کرنے کا ہے اس کا ذکر رحمت کے لفظ سے وارد ہے اللھم انی اسئلک من رحمتک (یعنی اے اللہ آپ سے آپ کی رحمت کی درخواست کرتا ہوں) اور مسجد سے نکلنے کا وقت جو کہ منافع دنیوی حاصل کرنے کا ہے اس کا ذکر لفظ فضل سے ہے اللھم انی اسئلک من فضلک (اے اللہ آپ سے آپ کا فضل مانگتا ہوں) اور ارشاد ہے فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله (پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت اجازت ہے کہ تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو) اور لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پرودگار کی طرف سے ہے) تو جب فضل سے مراد منافع دنیوی ہوئے اور رحمت سے مراد منافع اخروی اور علم دین کے لئے دونوں لفظ لائے گئے تو معلوم ہوا کہ علم دین سے دین اور دنیا دونوں کو نفع ہوتا ہے مگر اس میں ایک غلطی ہوتی ہے اس کو میں ذکر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگ ان منافع دنیا کو بھی احکام کا ثمرہ مقصود سمجھتے ہیں یہ غلط ہے اور اگر اس سے شبہ ہو کہ بعض علماء نے کہا کہ احکام کے اندر منافع دینویہ بھی ہیں تو سمجھ لو کہ ان کی یہ غرض نہیں ہے کہ احکام سے دنیا کے منافع مقصود ہیں ہرگز نہیں بلکہ مقصود تو احکام سے صرف حق تعالیٰ کی رضا اور جنت ہی ہے ہاں دنیا کے منافع بھی بطور خاصیت کے خود بخود اس سے حاصل ہو جاتے ہیں۔

تنزیل کتاب کا مفہوم

حق تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی اس سے مقصود محض تنزیل ہی نہ تھی بلکہ تنزیل سے مقصود تعلیم تھی یہ نکتہ ہے عنوان کے جدا جدا ہونے میں آگے فرماتے ہیں الکتاب و الحکمة ایک عنوان یہ ہے کہ اس کے بعد اسی کو مالم تکن تعلم سے تعبیر فرمایا ایک عنوان یہ ہے اول عنوان میں ذات کا بیان ہے کہ وہ ایک کتاب حکمت کی اور دوسرے میں اس کے ایک وصف کا اول عنوان سے معطی کی وقعت و عظمت بتلانا ہے اس کے لئے اس کو کتاب و حکمت فرمایا اور دوسرے عنوان سے اس کے ایک خاص وصف یعنی مالم تکن تعلم سے ایک خاص امتنان پر دلالت کرتا ہے کہ ہم نے آپ کو ایسی چیز دی ہے کہ اس کے قبل آپ کو اس کی خبر بھی نہ تھی ہمارے خبر کرنے سے خبر ہوئی تو پھر ذات میں بھی دو عنوان ہیں۔

کتاب و حکمت

کتاب اور حکمت بعض نے اس کا فرق یہ بیان کیا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سنت (حدیث) پھر اس پر ایک سوال پیدا ہوا ہے کہ اس پر انزل کا حکم فرمایا گیا ہے اور حکمت کو اگر سنت کہا جاوے تو یہ

نازل نہیں ہوئی پھر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تنزل عام ہے نزول ظاہری ونزول باطنی کو میں کہتا ہوں کہ ایک توجیہ یہ بھی لطیف ہے کہ خود کتاب ہی کو عام کہا جاوے قرآن وحدیث دونوں کے لئے چنانچہ حدیث میں ہے کہ اقض بیننا بکتاب اللہ یعنی ایک صحابی نے حضور ﷺ سے ایک مقدمہ میں عرض کیا تھا کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے موافق فیصلہ فرمادیجئے پھر آپ نے جو فیصلہ فرمایا قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں مگر اس پر بھی آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ بھائی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز قرآن میں ہو سو آپ نے یہ نہیں فرمایا بلکہ خود ہی فیصلہ فرمادیا اور پھر فیصلہ کرانے والے نے بھی کوئی شبہ نہیں کیا کہ یہ فیصلہ تو قرآن میں نہیں اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ دونوں کو عام ہے۔ قرآن کو بھی حدیث کو بھی اسی طرح حکمت کو بھی سنت کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی دونوں کو عام ہے اور یہ عطف تفسیری ہے کتاب کا کہ ایسے علوم دیئے جو کتاب وحکمت دونوں کے ساتھ متصف ہیں رہا یہ کہ جب کتاب وحکمت دونوں کو عام ہے تو سنت پر انزلنا کیسے صادق آوے گا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ انزال کو بھی عام کہا جاوے گا کہ انزال دو قسم کا ہے حسی اور معنوی چنانچہ اس بناء پر وحی کی بھی دو قسمیں ہیں ایک جلی جو بواسطہ جبرئیل کے آتی ہے اور ایک معنوی کہ براہ راست قلب پر القاء ہوتا تھا۔ بس اسی طرح تنزیل کی بھی دو قسمیں کہیں گے اور جس طرح قرآن وحدیث کو اس میں اشتراک ہے دونوں پر تنزیل کا حکم صحیح ہے جیسا ابھی مذکور ہوا اسی طرح ان دونوں کو ایک اور وصف میں بھی اشتراک ہے وہ یہ کہ حدیث کا محل ورود تو سب کے نزدیک قلب ہی ہے مگر ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا محل ورود بھی قلب ہی ہے وہ آیت یہ ہے فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ پس حکم تنزیل اور محل تنزیل یعنی قلب قرآن وحدیث دونوں کو شامل ہو گیا اور نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ پر ایک شبہ کیا ہے ملحدین نے جو کہتے ہیں کہ الفاظ قرآن کے نزل نہیں کیونکہ الفاظ کا محل و مورد تو مسامع ہیں نہ کہ قلب قلب پر صرف معنی کا ورود ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے معانی تو منزل من اللہ ہیں الفاظ خود حضور اقدس ﷺ کے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیل علی القلب کے حکم سے نفی لازم نہیں آتی تنزیل علی السامع کی دونوں جمع ہو سکتے ہیں باقی تنزیل علی القلب کا عنوان کیوں اختیار کیا گیا۔

زبانوں کی دو قسمیں

سو اس میں نکتہ یہ ہے کہ زبانیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک مادری، اور ایک مکتسب ان دونوں کے احکام میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ زبان جو کہ مکتسب ہوتی ہے اس کی خاصیت تو یہ ہے کہ جب اس زبان میں آپ سے کوئی گفتگو کرتا ہے تو اول التفات اس میں الفاظ کی طرف ہوتا ہے، جس کا مدرک سمع ہے اور اس کے بعد معانی کی طرف، اور مادری زبان میں اس کے برعکس ہوتا ہے کہ اول ہی سے التفات معانی کی طرف ہوتا ہے۔ پھر بعض

اوقات الفاظ کی طرف چنانچہ میں جو مضمون اس وقت آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں یہ آپ کی مادری زبان میں ہے اس لئے اول التفات آپ کو معانی کی طرف ہو رہا ہے اور پھر الفاظ کی طرف قصد کرنے سے ہوتا ہے تو نکتہ عَلٰی قَلْبِكَ میں اس پر دلالت ہے کہ قرآن آپ کی مادری زبان یعنی عربی میں ہے تا کہ آپ کے فہم میں کوئی کمی نہ رہے اور گو عربیا بھی اس معنیٰ کو مفید ہو سکتا تھا مگر یہ خاص بات نہ پیدا ہوتی جو عَلٰی قَلْبِكَ میں پیدا ہوئی کہ تصریح ہوگئی کہ اول التفات آپ کے قلب کو ہوتا ہے اس لئے فہم میں کوئی کمی نہیں رہ سکتی غرض کتاب و حکمت دونوں میں تعمیم ہوگئی قرآن و حدیث دونوں کے لئے چنانچہ قرآن کو ایک جگہ کتاب حکیم بھی فرمایا ہے اور یہاں زید عدل کے قاعدہ سے الحکمۃ کہہ دیا رہ گئی یہ بات کہ حکمت کیا چیز ہے سو حکمت کا مفہوم تو وہی چیز ہے جو حکماء نے بیان کیا ہے یعنی **العلم بحقائق الاشیاء علی ماھی علیه بقدر الطاقة البشریة** البتہ اس حکمت اور اس حکمت کے مصداق میں ضرور فرق ہے وہ فرق یہ ہے کہ قرآن میں تو اصالۃ ان اشیاء کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے جن کو نجات و قرب میں دخل ہے اور اس حکمت میں مطلق اعیان خارجیہ سے بدوں قید مذکور بحث کی گئی ہے تو اب حکمتیں دو ہوگئیں ایک وہ جس میں امور تشریعیہ سے بحث کی جاوے اور ایک وہ جس میں امور تکوینیہ سے بحث کی جاوے مثلاً فلسفہ ریاض منطق اقلیدس وغیرہ کہ سب حکمۃ تکوینیہ ہیں اور گو فلاسفہ بھی اپنی حکمت میں الٰہیات سے بحث کرتے ہیں اور اس کو علم اعلیٰ کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عقول و واجب کے ساتھ جس حکمت کا تعلق ہے وہ سب سے افضل ہے مگر ان کی بحث کی حیثیت وہ نہیں جو شریعت کی بحث کی ہے بلکہ دلائل صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے بعض مباحث خلاف حق بھی ہیں مثلاً عقول کا قابل ہونا گو بعض نادانوں نے ان کی حمایت کی ہے کہ عقول کی تفسیر ملائکہ سے لے کر ان مباحث کو شریعت پر منطبق کیا ہے مگر واقع میں عقول کا ترجمہ ملائکہ سے کرنا خود بھی صحیح نہیں کیونکہ شریعت کے نزدیک ملائکہ اجسام ہیں ان میں حرکت بھی ہے اور حکماء عقول کو مجرد اور منزہ عن الحرکۃ مانتے ہیں تو دونوں کی حقیقت متحد کیسے ہوئی البتہ عقول کی نفی سے مطلق مجردات کے استحالہ کا حکم صحیح نہیں جیسا بعض نے کہا ہے کہ کیونکہ بکثرت صوفیہ نے بھی روح اور قلب اور لطائف کو مانا ہے اور ان کے نزدیک عالم امر عالم مجرد کہتے ہیں گو بعض متکلمین نے اس شخص کی تکفیر کی ہے جو ان کے تجرد کا قائل ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ مقدمہ مسلمہ ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے اور ظاہر ہے کہ اخص صفات باری میں کسی کو شریک ماننا محض کفر ہے۔ مگر صوفیہ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے بلکہ اخص صفات حکماء کے نزدیک تو صرف وجوب بالذات ہے اور اہل حق کے نزدیک وجوب بالذات کی طرح قدم بھی اخص صفات میں سے ہے بلکہ وجوب بالذات اور قدم دونوں متلازم ہیں اور یہ جو فلاسفہ کہتے ہیں کہ قدم کی دو قسمیں ہیں قدم بالذات اور قدم بالزمان اور قدم بالزمان کو

واجب کے ساتھ خاص نہیں کہتے تو میں کہتا ہوں کہ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ قدم بالزمان ممکن کے لئے کوئی چیز نہیں اسی لئے تو کہتا ہوں ممکن چیز قدیم بالزمان بھی نہیں بہرحال حکماء بھی اس کے قائل ہیں کہ جس حکمت کا تعلق واجب کی ذات وصفات واحکام سے ہے وہ سب سے افضل ہے مگر واقع میں وہ حقائق صحیحہ تک نہیں پہنچے اس لئے ان کی حکمت کو حکمت الٰہیہ کہنا بھی صحیح نہیں اسی طرح گوانہوں نے اپنے یہاں اخلاق سے بھی بحث کی ہے مگر شریعت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ شریعت مصطفویہ نے علم اخلاق کی حاجت کو پورا کر دیا اور اس کی بحث سے ہم کو مستغنی کر دیا بہرحال انہوں نے تکوین کے احکام وآثار بیان کئے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر مادیات کے متعلق اور اس میں بھی بہت غلطیاں کی ہیں اور تشریعیات میں تو حکماء بالکل چل ہی نہیں سکے کیونکہ اس کا تعلق وحی سے ہے اور وہ اس کے اتباع سے محروم ہیں۔ غرض یہ حاصل تھا حکمت کا جو بقدر ضرورت بیان کیا گیا۔

حاصل آیت

اب حاصل آیت کا یہی ہوا کہ ایسے علوم عطا فرمائے جنہیں نجات وقرب میں دخل ہے پھر اس کے بعد فرماتے ہیں وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ یعنی آپ پر خدا تعالیٰ کا بڑا فضل ہے یوں تو تمام نعماء فضل ہی ہیں چنانچہ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ میں رزق کو فضل فرمایا ہے کیونکہ اسی آیت میں فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ بھی ہے اور انتشار فی الارض پر جس فضل کی طلب مرتب ہوتی ہے ظاہر ہے کہ وہ طلب رزق ہی ہے لیکن سب افراد فضل کے برابر نہیں اسی لئے اس امر کو یعنی وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ کو مفسرین نے اباحت پر محمول کیا ہے کیونکہ اس کے اوپر ہے و ذروا البیع اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید ترک بیع کا امر مستمر ہو پس فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ سے بتلا دیا گیا کہ بعد فراغ صلوۃ کے وہ اب جائز ہو گیا ہے کیونکہ امر بعد الحظر اباحت کے لئے ہوتا ہے غرض یہاں سب کے نزدیک تفسیر فضل کی رزق ہی ہے اسی لئے اس کے بعد یوں بھی فرمایا کہ واذ کروا اللّٰه کہ خدا کی بھی یاد رکھو یہ نہ ہو کہ رزق کو فضل مقصود بالذات سمجھ کر اس کی تلاش میں خدا کو بھول جاؤ نہیں بلکہ دنیا غالب نہ ہو

حق تعالیٰ رسول ﷺ سے فرماتے ہیں وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ (اور نازل کی حق تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور وہ چیزیں بتائیں جن کی آپ کو خبر نہ تھی اور حق تعالیٰ کا آپ پر بڑا فضل ہے وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ یہ تنزیل ہے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ آپ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی۔ یہی کتاب حکمت فضل ہے حق تعالیٰ کا یعنی انزل اللّٰه سے والحکمة تک پر علمک سے تعلم تک کا عطف تفسیری ہے اگرچہ علمک میں

مادہ علم کا ہے اور علم ہی کے لئے نزول بھی ہو تو واقع میں عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ عطف تفسیری ہے کہ جو معنی اور جو مقصود اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ سے ہے وہی اس سے بھی مقصود ہے۔ گو اس میں اور اقوال بھی ہیں یعنی بعض لوگوں نے یہاں واؤ کو عطف تفسیری کے لئے نہیں مانا بلکہ تغایر کے لئے لیا اور کہا ہے کہ نازل کی اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت اور وہ علوم جن کی آپ کو خبر نہ تھی یعنی تین چیزیں نازل فرمائیں کتاب، حکمت، علوم غیر معلومہ، اور یہ تیسری چیز جو مالم تکن تعلم میں مذکور ہے وہ تصوف ہے۔

قال یبنو م لا تاخذ بلحیتی ولا براسیؕ (طه آیت ۹۵)

ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میرے ماں جائے میری داڑھی مت پکڑو اور نہ سر پکڑو،

کسی نے داڑھی کا ثبوت قرآن سے دیا

ایک صاحب نے داڑھی کا ثبوت قرآن شریف سے دیا اس لفظ سے لاتاخذ بلحیتی ولا براسی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میری داڑھی نہ پکڑئے معلوم ہوا کہ حضرت ہارون کی داڑھی تھی میں نے کہا جناب اس سے وجود لحیہ کا ثبوت ہوا نہ وجوب لحیہ کا اور وجود کے لئے اتنا تکلف ناحق کیا اپنی داڑھی دکھا دینی تھی۔ وجود کا ثبوت ہو جاتا اور اگر وجود کا ثبوت دیا ہے تو وہ تو آیت سے بھی نہ ہوا۔

(ملفوظات حکیم الامت ج۲ صفحہ ۱۸۵)

ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا و نحشرہ یوم القیمة اعمیٰ

یعنی جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں، اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

غفلت ذکر کا انجام

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت وہاں بھی مصیبت چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے یہ حال ہے کہ مال و دولت تو ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ میسر نہیں، بعض اوقات تو انکی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ سے حال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی، اصلی مال اس کو کہنا چاہئے دنیوی مال کو تو مال اسی لئے کہتے ہیں یمیل الیه القلب یعنی اس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب ان کی طرف مائل ہو۔ (خیر المال للرجال ملحقہ مواعظ حقیقت مال وجان صفحہ ۲۸۹)

اب رہی بات یہ کہ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ○ (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) میں صرف ایک

لفظ کیوں فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس کو عام لے لیا ہے جو شامل ہے دونوں کو علمک مالک تکن تعلم (جو باتیں آپ نہ جانتے تھے ان کا بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا کر دیا۔) میں بعض نے لفظ ما کو عام لیا ہے کہ تمام مجہولات کا آپ کو علم دے دیا تو اول تو آیت میں کوئی دلیل نہیں عموم کی رہا لفظ ما کا کلمات عموم میں سے ہونا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عموم اس کے لئے لازم نہیں ما مخصوص میں بھی مستعمل ہوا ہے جیسے يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان باتوں کا علم دیا جن کو تم نہ جانتے تھے) اور عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا) دوسرے اگر لفظ ما یہاں عام بھی ہو تو عموم ان ہی امور کا ہوگا جو اس مقام کے مناسب ہیں مثلاً امور متعلقہ نبوت وسیاست۔

تنبیہ ثانی

علم کو فضل فرمانا اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علم میں محض اکتساب ہی کافی نہیں فضل خداوندی کی بھی ضرورت ہے۔ وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ تفسیری ہے کہ معطوف علیہ ومعطوف کا مصداق ایک ہے۔

تنزیل اور تعلیم

اور عنوان دو ہیں اسی طرح انزل وعلم میں بھی باوجود معنوں کے اتحاد کے ایک خاص نکتہ کے لئے دو جداگانہ عنوان ہیں وہ نکتہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہم نے محض تنزیل ہی پر بس نہیں کیا بلکہ تعلیم بھی فرمادی۔

فضل عظیم صرف علوم دینیہ ہیں

صاحبو! واللہ اگر تم آزادی چاہتے ہو تو خدا کی غلامی کرو کہ اس غلامی میں تمہیں دوسرے ہم جنسوں کی غلامی سے آزادی ہو جائے گی۔ اور فطری طور پر تم غلامی سے تو کسی حال میں بچ نہیں سکتے اور جب نہیں بچ سکتے تو انہیں کی غلامی کیوں نہ قبول کرو جن کی غلامی سے بادشاہوں کو بھی فخر ہے ان کی غلامی کے یہ معنی ہیں کہ شریعت سے آزاد نہ ہو اب میں اس مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت خوش عیشی وغیرہ ہے تو سب فضل، مگر فضل عظیم نہیں ہے فضل عظیم صرف علوم دینیہ ہی ہیں البتہ جب کمائی مطلق فضل ہے تو اس کے حاصل کرنے کے لئے اسی کے مناسب علوم کی بھی ضرورت ہوگی بشرطیکہ وہ شریعت کے اندر ہوں تو اسے علوم کا حاصل کرنا بھی جائز بلکہ لغیرہ مستحسن ہوگا مگر ان علوم شریعت سے اعظم واہم نہ سمجھو کیونکہ رزق کو مطلق فضل فرمانے اور علوم شریعہ کو فضل عظیم فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علوم شریعت افضل ہیں ان علوم سے اور راز اس میں یہ ہے کہ وہاں بھی علوم سے خاص اعمال پیدا ہوتے ہیں اور یہاں بھی تو علوم واعمال تو دونوں جگہ ایک

دوسرے سے وابستہ ہیں مگر اب دیکھ لو کہ علوم شریعت سے کون سے اعمال پیدا ہوتے ہیں اور علوم معاش سے کون سے اعمال ظاہر ہے کہ علوم شرعیہ سے اعمال آخرت پیدا ہوتے ہیں اور علوم معاش سے اعمال دنیا اور اعمال آخرت یقیناً مقدم ہیں اعمال دنیا سے کیونکہ مسلمان کے نزدیک دین یقیناً دنیا سے مقدم ہے نیز اعمال آخرت کا ثمرہ دائم اور عظیم ہے۔ اعمال دنیا کا ثمرہ فانی اور حقیر ہے اور اسباب کی فضیلت مسببات کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے جب علوم شرعیہ کا مسبب علوم دنیا کے مسبب سے افضل ہے تو یقیناً علوم شرعیہ علوم دنیا سے افضل ہیں۔ نیز دنیا واسطہ ہے آخرت کے لئے خود مقصود نہیں ہے اور مقصود واسطہ سے افضل ہوتا ہے۔ تو مقصود کا علم بھی واسطہ کے علم سے افضل ہوگا اور یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ دنیا کے علوم وہی جائز ہوں گے جو مقصود کے لئے مزاحم نہ ہوں اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جب یہ علوم افضل ہیں تو اس علم کے علماء بھی افضل ہوں گے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ؀ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ؀

ترجمہ: نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا اور اس شخص کو خدا تعالیٰ کے سوا نہ کوئی یار ملے گا اور نہ مدد گار ملے گا اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

تفسیری نکات

شان نزول

شان نزول آیت کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہود اور اہل اسلام میں قبلہ کے تقدم و تاخر پر تفاخر ہو رہا تھا یہود کہتے تھے کہ ہمارا قبلہ مقدم ہے مسلمان کہتے تھے ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ خدا کا قرب اور دخول جنت نہ تمہاری تمناؤں سے حاصل ہو سکتا ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے بلکہ ہمارے یہاں تو یہ قانون ہے کہ جو کوئی

برا کام کرے گا اس کو اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اور جو نیک کام کرے گا اس کو جنت ملے گی۔ تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ عمل کا اہتمام کرو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ نری تمنا سے کام نہیں چل سکتا اور نری تمنا کا درجہ وہی ہے جس کے ساتھ عمل کا اہتمام نہ ہو' معلوم ہوا ہے کہ مقصود اعمال ہیں ان کو اختیار کرنا چاہئے اس کے بعد جو تمنا ہو گی وہ رجاء کا درجہ ہو گا خلاصہ یہ ہے کہ جب عمل کا مقصود ہونا ثابت ہو گیا تو اس کا اہتمام سب مسلمانوں کو کرنا چاہئے رہا' اس کا طریقہ تو اس کے لئے ساری شریعت موجود ہے شریعت سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو' اور اعمال پر مداومت واستقامت کی سہولت اور ان کی اصلاح وتکمیل یہ موقوف ہے اہل اللہ کی صحبت پر چنانچہ اسی آیات لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا اور اس شخص سے اچھا کون ہے جو اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دے دراں حالیکہ وہ صاحب اخلاص ہو اور ملۃ ابراہیم کا متبع ہو جو کہ حنیف تھے یعنی ماسوائے اللہ سے یکسو تھے یہاں اسلام وجہ سے مراد فنا ہے کیونکہ کامل سپردگی اسی سے ہوتی ہے جس کے بعد نسبت احسان عطاء ہو جاتی ہے چنانچہ وھو محسن میں نسبت احسان ہی کی طرف اشارہ ہے۔ مقام اخلاص جب کامل ہو جاتا ہے تو اسی کو نسبت احسان سے صوفیہ کی اصطلاح میں تعبیر کیا جاتا ہے۔

آگے بتلاتے ہیں کہ یہ دولت کس طرح حاصل ہو گی۔ ارشاد ہے وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا یعنی جو شخص ملۃ ابراہیم کا اتباع کرے گا اسے یہ دولت عطا ہو گی اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اتباع ابراہیم علیہ السلام سے یہ نعمت عطا ہو گی حتیٰ کہ یہ شبہ ہو کہ بس جو لوگ ابراہیم علیہ السلام کی امت میں نہیں ان کو یہ دولت نہ ملے گی بلکہ اتباع ملت ابراہیم پر اس نعمت کو موقوف کیا گیا ہے۔ جس سے مراد ان کے مذاق کا اتباع ہے اور ان کا مذاق فنا تھا اور یہ دولت ہر نبی کو عطا ہوتی ہے (الالباب لاولی الالباب)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا

بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو منزل مقصود یعنی بہشت کا راستہ دکھائیں گے۔

ارتداد کی خاصیت

حالانکہ ثُمَّ ازْدَادُوا کے بعد بھی ثم امنوا کی گنجائش تھی مگر اس کے بعد حق تعالیٰ نے ثم امنوا نہیں فرمایا کیونکہ اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ اس فعل میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے بعد اکثر توفیق ایمان نہیں ہوتی پس ایمان کی قدر کرو اور اس کی حفاظت کی کوشش کرو۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۧ﴿۱۴۱﴾

ترجمہ: منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے جن کی یہ حالت ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں سو اعزاز تو سارا خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جبکہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کر دیں کہ اس حالت میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع کر دیں گے وہ ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر رہتے ہیں پھر اگر تمہاری فتح منجانب اللہ ہوگی تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل گیا تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا سو اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرما دیں گے اور (اس فیصلہ میں) ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے۔

تفسیری نکات

منافقین کو ملامت

اس مقام پر جن لوگوں کی یہ شکایت ہے وہ جماعت منافقین کی ہے کہ گو وہ زبان سے کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے مگر وہ واقع میں مومن نہ تھے اسی وجہ سے ان کو فروع کا مکلف نہ کہا جائے گا پس باوجود غیر مکلف ہونے کے جس امر پر ان کی شکایت کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ جرم بہت شدید ہے تو جو مدعی اطاعت ہیں یہ اگر مرتکب اس جرم کے ہوں تو بہت زیادہ قابل شکایت ہیں پس وہ امر کہ جس پر منافقین کو اس آیت میں ملامت کی گئی ہے افسوس ہے کہ وہ ہم میں بھی موجود ہے اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہوا کہ اس مضمون کو اختیار کیا جاوے پس تین حیثیتوں سے اس مضمون کی ضرورت ثابت ہوئی اول تو فی نفسہ ضروری ہونا دوسرے اس میں غلطی واقع ہونا تیسرے ہم میں وہ غلطی ہونا اب سنئے کہ وہ مضمون کیا ہے ارشاد ہے اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ یعنی کیا یہ منافقین کفار کے پاس جا کر عزت کے طالب ہوتے ہیں عزت تو تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کی ملک ہے یہ ترجمہ ہے۔ آیت کا قصہ اس کے نزول کا یہ تھا کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک جماعت تھی منافقین کی وہ بظاہر مومن تھے اور واقع میں کافر تھے تو ان کا یہ شیوہ تھا کہ مسلمانوں کے فریق کے مقابل بن کر کفار سے میل جول رکھتے تھے اس لئے کہ اپنے زعم فاسد میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اسلام بڑھنے والا تو ہے نہیں یہ دو چار دن کا شور وغل ہے پھر بدستور کفار کا ہی پلہ بھاری رہے گا تو کیا ضرورت ہے کہ ہم ان سے بگاڑیں اور پھر مسلمانوں سے اس لئے ملتے تھے کہ ان کے حملوں سے محفوظ رہیں اور شاید ان کو غلبہ ہو جائے تو کہنے کو موقعہ رہے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی شکایت فرماتے ہیں اور ان کی رائے کا غلط ہونا ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا یہ منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ کفار کے پاس عزت ہے اس لئے ان سے میل جول رکھ کر عزت کے طالب ہیں خوب سمجھ رکھو کہ غلبہ اور عزت تو ہماری ملک ہے پس جو اس کا طالب ہو وہ ہم سے میل جول کرے اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ جو شے جس کی ملک ہو اور تم اس کے طالب ہو تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی اطاعت کرو یہ عجیب بات اور قلب موضوع ہے کہ اس کو ناراض کر کے اس سے وہ لینا چاہیں یہ دوسری بات ہے کہ کسی مصلحت سے وہ شے پھر بھی اس کو دیدے مقصود یہ ہے کہ طریقہ اس کا یہی ہے کہ اس کی اطاعت بھی اختیار کی جاوے یہاں سے یہ شبہ رفع ہو گیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مومنین کو بھی عزت اور غلبہ حاصل ہے تقریر اندفاع کی یہ ہے کہ لام اللہ میں ملک کا ہے تو حاصل یہ ہے کہ عزت اور غلبہ اللہ کی ملک ہے یہ مطلب نہیں کہ عزت اور غلبہ ہم کسی کو نہیں دیتے ممکن ہے کہ کسی مصلحت اور حکمت کی وجہ سے غیر مطیع کو بھی دے دیں اور وہ حکمت یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان اور ابتلاء کا گھر ہے پس اگر دنیا میں مسلمانوں ہی کو غلبہ ہوتا تو یہ

حکمت ابتلاء فوت ہو جاتی اس لئے کہ اسلام قبول کرنے والوں کا کوئی امتحان اور ابتلاء نہ ہوتا اس واسطے کہ جب کہ غلبہ انہیں کو ہوتا تو پھر مسلمان ہونا کوئی کمال نہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسا ملا جلا قصہ رکھا ہے کہ ظاہری نظر میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ کبھی کسی قوم کو غلبہ دے دیا کبھی کسی کو تا کہ اس کا امتحان ہو کہ دیکھیں ہمارے بندے کس طرف رخ کرتے ہیں آیا دنیا کی شان وشوکت پر مائل ہوتے ہیں یا ہماری طرف آتے ہیں۔ پس باوجود اس کے اگر کوئی اسلام قبول کرتا ہے اس کا منشاء محض اخلاص ہوتا ہے کوئی دوسری غرض نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو یعنی خانہ کعبہ کو وادی غیر ذی زرع میں بنایا ہے کہ وہاں نہ کھیتی باڑی ہوتی ہے نہ سرسبزی کا نام و نشان ہے نہ نہریں اور چشمے اور کنوئیں ہیں بجز خشک میدانوں اور پہاڑوں کے کوئی شے نہیں اگر بیت اللہ شریف خطہ کشمیر میں ہوتا تو وہاں مسلمانوں کا جانا کوئی کمال نہ تھا۔ حق تعالیٰ نے ایسی جگہ بنایا کہ وہاں ہر شے کی کمی ہے تا کہ جو کوئی وہاں جاوے ہماری ہی محبت کی وجہ سے جاوے چنانچہ مسلمان وہاں مشقتیں اٹھا اٹھا کر مال خرچ کر کے جاتے ہیں اس کا منشاء سوائے اخلاص اور حق تعالیٰ کی محبت کے کوئی شے نہیں ہے اسی واسطے حضور ﷺ نے اپنی اولاد کے لئے زکوۃ کو حرام فرما دیا ورنہ کم فہموں کو یہ شبہ ہوتا کہ یہ سب ترغیب اور دعوۃ الاسلام اپنی غرض کے لئے ہے کہ ہم اور ہماری اولاد کو دنیا حاصل ہو اب یہ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو صدقات واجبہ ہیں جیسے زکوۃ عشر فدیہ وغیرہ یہ تو سب اپنے خاندان پر حرام ہی فرما دیئے ہیں اب رہ گئے صدقات نافلہ کہ ان میں اختیار ہے خواہ دو یا نہ دو ان میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صدقات ہی خود ضروری نہیں کہ ضرور دیئے جائیں۔ پس حق تعالیٰ کی یہ حکمت اور شان ہے کہ جہاں ذرا بھی خود غرضی کا شبہ ہوا ہے اسی کو دفع فرما دیا ہے پس اگر تنعم اور عیش و دولت اور عزت و جاہ غلبہ اسلام کے ساتھ مخصوص ہوتا تو اسلام لانے میں پھر کوئی کمال نہ ہوتا اور مخلص وغیر مخلص میں اشتباہ ہو جاتا اور اب جو کوئی ادھر آتا ہے وہ اخلاص ہی کی وجہ سے آتا ہے۔

قیامت میں مسلمانوں ہی کو کفار پر غلبہ حاصل ہوگا

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور اچھا جواب ہے کہ غلبہ سے غلبہ فی الحجت مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی بھی غلبہ نہ ہوگا اور یہ مشاہدہ کے موافق ہے۔ حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گو یہ جواب فی نفسہ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور جملہ اسی فیصلہ کے متعلق ہے پوری آیت یوں ہے۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا یعنی پس اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے قیامت کے دن اور (اس فیصلہ میں) حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے۔ دیکھئے سباق میں نظر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے۔ (فناء النفوس)

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا' اس میں شبہ ہوتا ہے کہ ہم تو کفار کو مسلمانوں پر مسلط غالب ہوتا ہوا دیکھتے ہیں پھر اس آیت کے کیا معانی اس شبہ کا منشاء یہی ہے کہ اوپر سے غور نہیں کیا گیا اس سے پہلے ارشاد ہے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا معلوم ہوا کہ یہ حکم فیصلہ قیامت کے متعلق ہے عام نہیں ہے اور یہ شبہ ہوا غور نہ کرنے سے اور غور نہ کرنے کا سبب یہ ہوا کہ یوم القیمۃ پر وقف کیا جاتا ہے جس سے وہ متانف کلام سمجھا گیا کاش کہ یہاں طا نہ لکھی ہوتی تو یہ شبہ نہ پڑتا اسی طرح لاریب فیـــہ میں جو شبہ واقع ہوتا ہے کہ قرآن میں تو بہت کفار نے شبہات کئے ہیں اس کا جواب مولانا کی طرف سے مشہور ہے کہ حق تعالیٰ نے لاریب فیہ ہی تو فرمایا ہے لاریـب فیھم تو نہیں فرمایا تو کفار بے شک شبہ کرتے تھے مگر اس کا منشا خود ان کے اندر تھا یعنی حسن وعناد و جہل وغیرہ قرآن میں منشاء ریب کچھ نہیں ہے اس کی توضیح میں نے اس طرح کی ہے کہ جیسے یرقان والا ہر چیز کو زرد دیکھتا ہے مگر باوجود اس کے یہ کہنا صحیح ہے لا صفرۃ فیہ کیونکہ منشاء صفرۃ کا رائی میں ہے اسی طرح یہاں سمجھو علی ھذا لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون میں شبہ واقع ہوتا ہے مولانا نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے لا خوف لھم و بھم تو نہیں فرمایا بلکہ لا خوف علیھم فرمایا مطلب یہ ہے کہ ہماری طرف سے ان پر کوئی واقعہ اندیشناک واقع نہ ہوگا گو وہ خود اپنی سعادت مندی سے ڈرتے رہیں تو اس کی نفی نہیں کی جاتی اسی طرح امیر شاہ خان صاحب نے امیر الروایات میں مولانا کی ایک حکایت لکھوائی ہے کہ کسی نے مولانا سے آ کر عرض کیا کہ ایک پادری کہتا تھا کہ مسلمان خواہ مخواہ انجیل وتورات کو محرف مبدل کہتے تھے حالانکہ قرآن سے خود اس کی نفی ہوتی ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ کلام اللہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی اور انجیل وتورات کا کلام اللہ ہونا مسلمانوں کو مسلم ہے۔ پھر وہ ان میں تبدیلی کے قائل کیونکر ہوسکتے ہیں امیر شاہ خان صاحب نے یہ اشکال تو لکھوایا ہے مگر جواب کچھ نہیں لکھوایا کہ مولانا نے اس کا کیا جواب دیا نیز وہ آیت بھی اس کی جگہ منقول نہ تھی جس میں عدم تبدیلی فی کلام اللہ کا دعویٰ ہے اس لئے یہاں پر حاشیہ لکھنے کی ضرورت ہوئی چنانچہ غور کرنے سے آیت بھی مل گئی جو پارہ ولو اننا میں ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۗ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ اور جواب اشکال کا یہ ہے کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے اوپر سے قرآن کی حقانیت کا بیان فرمایا چنانچہ اس سے اوپر کی آیت یہ ہے

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۗ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ الآیۃ

آیت اولی میں اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ میں کتاب سے مراد یقیناً قرآن ہے (کیونکہ حضور کے مخاطبین اولین پر اسی کا نزول ہوا ہے اور اسی کے متعلق جا بجا یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اہل کتاب کو اس کے منزل بالحق ہونے کا خوب علم ہے وہی دعوی یہاں بھی ہے پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ سے بھی قرآن ہی مراد ہے اور مثل اوصاف سابقہ کے یہ عدم تبدیلی بھی اسی کی صفت ہے اب کچھ اشکال نہیں رہا اس کا ایک جواب ہماری جماعت کے بعض اکابر سے دوسری طرح منقول ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ کلام اللہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی اور کتاب اللہ میں ہوسکتی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن تو کلام اللہ ہے اور دوسری کتابیں کلام اللہ نہیں بلکہ محض کتاب اللہ ہیں۔ یہ جواب میری سمجھ میں نہیں آیا اس لئے میں اس کو بیان کرنا بھی پسند نہیں کرتا ممکن ہے کہ اصل مجیب کی دلیل کے تمام مقدمات ملا کر یہ جواب صحیح ہو جائے اور راوی نے سب مقدمات نقل نہ کئے ہوں مگر چونکہ ہم کو یہ جواب ناتمام ہی پہنچا ہے اس لئے ہمیں اس سے تسلی نہیں ہوئی غرض یہاں بھی اشکال کا منشاء یہی ہوا کہ سیاق سباق میں غور نہیں کیا یا صرف لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ کو دیکھ کر عموم سمجھ لیا گیا (اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی لیس من البر الصیام فی السفر کو عام سمجھ لے حالانکہ قرآن سے اس کا حکم سفر مشقت کے ساتھ مخصوص ہونا ظاہر ہے) اگر اس سے اوپر کی آیت کو دیکھ لیا جاتا تو اشکال واقع نہ ہوتا اور معلوم ہوتا کہ یہ حکم عام نہیں بلکہ قرآن کے ساتھ خاص ہے۔

قرآن سمجھنے کیلئے ضروری علوم

فرمایا' درسیات پڑھو' سمجھ پیدا ہو جائے گی اس سلسلہ میں فرمایا قواعد صرف ونحو سمجھ کر پڑھنے کے بعد قرآن شریف پڑھا جائے اس کے بعد صرف ایک کتاب فقہ کی پڑھ لی جائے تو بس کافی ہے اور جو خود عالم متبحر و محقق نہ ہو اس کو تو دوسرے کی تقلید و اتباع کرنی چاہئے زمخشری نے لکھا ہے کہ چودہ علم پڑھنے کے بعد یعنی تمام علوم سے فارغ ہونے کے بعد قرآن پاک پڑھا جائے یہ اس کی رائے ہے فرمایا میری رائے تو یہ ہے کہ قرآن وفقہ احادیث کا سمجھنا منطق کے بغیر مشکل ہے اس لئے منطق پڑھنی ضروری ہے فرمایا اوامر ونواہی کا سمجھنا تو آسان ہے لیکن استنباط مسائل اور تحقیق کے لحاظ سے قرآن کا سمجھنا بدوں منطق اور علوم آلیہ کے دشوار ہے اس لئے علوم عالیہ کے لئے علوم آلیہ کی ضرورت ہے بعدہ اصطلاحات منطق کے ماتحت حضرت والا نے چند آیات قرآن سے اس کی توضیح فرمائی مثلاً آیۃ کریمہ (پ۹)

ولو علم اللہ فیھم خیر الا سمعھم ولو اسمعھم لتولوا وھم معرضون (انفال)

(اور گر اللہ تعالیٰ ان میں خوبی دیکھتے تو ان کو سننے کی توفیق دیتے اگر ان کو اب سنا دیں تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے)

اس میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ قیاس منطقی کی ایک شکل ہے اور حد اوسط حذف ہونے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے ولو علم الله فیهم خیر التولوا' لیکن ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ بالکل غلط ہے تو اب اشکال یہ ہے کہ نتیجہ غلط کیوں نکلا تو پھر فرمایا کہ ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ حد اوسط کا مکرر ہونا جو شرط انتاج ہے وہ اس شکل میں موجود نہیں کیونکہ پہلا اسمعهم سماع بمعنے القبول سے مشتق ہے اور دوسرا اسمعهم سماع حاسہ کے معنی میں ہے اس لئے دو جگہ اسمعهم کا لفظ اگرچہ مکرر ہے مگر معنے الگ الگ ہیں اس لئے حقیقۃً تکرار اوسط نہیں ہوا اس لئے نتیجہ غلط نکلا' اب اگر کسی کو منطق نہ آتی ہو تو اشکال کا حل سمجھنا اس کو دشوار ہے۔

(آیة) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون (پ ۱۷)

(اور ہم کتابوں میں لوح محفوظ کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے) کے متعلق ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ آج کل یہ واقعہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ عموماً زمین پر کفار و فجار کا تسلط ہے سوال کرنے والے ایک مولوی صاحب تھے میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سا قضیہ ہے محصورہ یا مہملہ' کہنے لگے مہملہ ہے میں نے کہا کہ قضیہ مہملہ حکم میں جزیہ کے ہوتا ہے کلیہ نہیں ہوتا اس لئے اس آیت کا یہ مفہوم ہی نہیں کہ ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر زمانہ میں یہی حال رہیگا کہ صالحین زمین کے وارث ہوں گے بعض مرتبہ ایسا ہونا اس قضیہ کے صدق کے لئے کافی ہے (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ صفحہ ۱۹۴ تا ۱۹۶)

اسی طرح ایک اور آیت ہے ولن یجعل الله للکافرین علی المومنین سبیلا بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ کافر مسلمانوں پر کبھی غالب نہ آئیں گے پھر اس پر بڑا اشکال کہ قرآن شریف میں تو یہ ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے وہ یہ کہ کفار کو بہت دفعہ دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ ہوا ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا مشاہدہ کا کیا انکار مگر حقیقت میں آیت کا یہ مطلب ہی نہیں جو سمجھا گیا ہے یہ آیت دنیا کے متعلق ہے ہی نہیں یہ تو آخرت کے متعلق ہے کیونکہ اوپر ذکر منافقین کا ہے ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں فالله یحکم بینکم یوم القیمة ولن یجعل الله للکافرین علی المومنین سبیلا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں فیصلہ کے وقت ڈگری مومنین کی ہوگی اور منافقین ہاریں گے خود فالله یحکم بینکم یوم القیمة بتلا رہا ہے کہ یہ حکم آخرت کے متعلق ہے یعنی قیامت میں جب مقدمہ پیش ہوگا تو اس میں مسلمان مغلوب نہ ہوں گے اب کوئی اشکال نہیں (المال والجاہ ملحقہ مواعظ حقیقت حال وجاہ صفحہ ۱۸۳)

ایک اشکال ترجمہ پڑھنے والوں کو اس آیت پر ہوتا ہے۔ ولن یجعل الله للکافرین علی المومنین سبیلا اور ہرگز نہیں دیں گے حق تعالیٰ مسلمانوں پر کوئی راہ یعنی غلبہ

اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بارہا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہو جاتے ہیں اس کے بہت سے جواب علماء نے دیئے ہیں لیکن اگر قرآن کے ساتھ ذوق و مناسبت ہو تو وہ ضرور یہ سمجھے گا کہ کلام اللہ غیر مرتبط نہیں ہے پھر جب اس کو مرتبط سمجھے گا تو ہر مقام پر سیاق و سباق کو بھی دیکھے گا چنانچہ اس آیت پر اشکال اس لئے ہوا کہ لوگوں نے لن یجعل الله للكافرين على المومنين سبيلا کے سباق کو نہ دیکھا اس میں یہ حکم آخرت کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہے فالله يحكم بينكم يوم القيمة حق تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے یعنی قیامت میں کفار و مسلمان کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا کون ناحق پر اس کے بعد فرماتے ہیں ولن يجعل الله للكافرين على المومنين سبيلا اور اللہ تعالیٰ کفار کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے یعنی اس فیصلہ میں جو آخرت میں ہوگا اب کوئی اشکال نہ رہا' (تعلیم التعلیم ملحقہ مواعظ علم و عمل صفحہ ۲۱۸)

الفاظ کو صحیح معنوں میں محمول کرنے سے بہت جگہ قرآن مجید میں مجاز وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں رہتی مثلاً ومكروا ومكر الله میں قبیح کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہیں لازم آتی جس کے لئے تاویل کی ضرورت ہو کیونکہ مکر اور کید کی حقیقت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ یہاں یہ فرماتے تھے کہ مکر و کید کہتے ہیں تدبیر خفی کو تدبیر خفی کبھی محمود بھی ہوتی ہے کبھی مذموم بھی نہ کسی مجاز کی ضرورت نہ توجیہ کی ضرورت۔

اسی اصل کی ایک فرع یہ ہے کہ الا ان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون کے متعلق یہ اشکال ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ تو اکثر بہت خائف اور محزون رہتے ہیں اس اشکال کا جواب بھی اسی اصل پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لا خوف لهم یا لا خوف بهم نہیں فرمایا بلکہ لا خوف عليهم فرمایا یعنی ان پر آخرۃ میں خوف واقع نہیں ہوگا یہ نہیں کہ ان میں خوف نہیں خلاصہ اس توجیہ کا یہ ہے کہ ان میں خوف ہے ان پر خوف نہیں اسی طرح ذالک الكتاب لاریب فيه پر جو اشکال ہوتا ہے قرآن مجید میں تو بہت لوگوں کو شک ہے پھر یہ کیوں فرمایا گیا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں اس کی توجیہ بھی مولانا نے اسی اصل پر یہ فرمائی کہ وہ شک اس کتاب میں نہیں ہے بلکہ جن کو شک ہے خود ان میں خباثت ہے درحقیقت ان کے فہم میں کھوٹ ہے اس کتاب میں کوئی کھوٹ نہیں یہ تو حضرت مولانا کی تحقیق ہے اور مجھ کو اس کی ایک مثال مل گئی جس سے مولانا کا مقصود اور واضح ہو گیا وہ مثال یہ ہے کہ یرقان اصفر والے کو جو سب چیزیں زرد ہی زرد نظر آتی ہیں تو اس کی آنکھوں میں زردی ہوتی ہے نہ کہ ان چیزوں میں جب وہ کسی چیز کو دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ اس میں زردی ہے تو اس سے یہی کہا جاتا ہے کہ لاصفرة فيه کہ اس چیز میں زردی نہیں ہے تیری آنکھوں میں ہے۔ اسی طرح درحقیقت قرآن میں کوئی شک نہیں ہے اور جو اس میں شک کرتا ہے اس کے فہم کا قصور ہے۔ مولانا یوں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں کوئی شبہ ہو وہیں ایک لفظ ایسا ہے جس میں اس شبہ کا جواب ہے جیسے تکوین

نظام میں جہاں...... ڈنک کا درخت ہوتا ہے اسی کی جڑ میں ایک اور درخت نکلتا ہے جو اس کا علاج ہے اور اسی کے پاس ہوتا ہے اسی طرح چونکہ آم ثقیل ہوتا ہے اس لئے اسی موسم میں جامن بھی ہوتی ہے جو اس کی مصلح ہے اور خود جامن میں بھی جو ایک ثقل ہے اس کا آم میں علاج ہے غرض آم کی مصلح جامن ہے اور جامن کا مصلح آم ہے چنانچہ اس آیۃ پر بھی ایک اشکال مشہور ہے۔ لن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا یعنی مومنین پر کافروں کا ہرگز غلبہ نہ ہوگا حالانکہ

کافروں کا غلبہ بہت جلد مشاہد ہے اس اشکال کا بھی جواب وہیں موجود ہے چنانچہ جس سلسلہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے فاللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت میں کفار اور مومنین کے درمیان جو فیصلہ کیا جائے گا اس فیصلہ میں مومن پر کافر غالب نہ ہوں گے پوری آیۃ اگر پڑھی جاوے تو وہیں اس اشکال کا جواب بھی موجود ہے۔ اسی لئے غیر محقق کا قرآن مجید سے استدلال سراسر بے محل اور مضر ہو گا چنانچہ قصبہ رام پور میں حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک واقعہ میں طلاق کے متعلق کوئی فتویٰ دیا تھا کسی عورت نے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اس کے خلاف یہ فتویٰ دیدیا کہ قرآن میں یہ لکھا ہے کہ حکیم ضیاء الدین صاحبؒ سے کسی نے بیان کیا فرمایا کہ وہ کیا جانے مسئلہ چڈو کہیں کی کہدو اس سے کہ اگر زبان درازی کرے گی تو ناک چوٹی کاٹ دی جائیں گی۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۱۴۲﴾

ترجمہ: بلا شبہ منافق لوگ چال بازی کرتے ہیں اللہ سے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں صرف آدمیوں کو دکھلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر۔

تفسیری نکات

اعمال صالحہ میں ہمیشہ مشقت رہتی ہے

بہرحال خوب سمجھ لو کہ اعمال صالحہ میں مشقت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ وہ اعمال نفس کی خواہش کے خلاف ہیں

نفس ان میں منازعت ضرور کرتا ہے قلیل یا کثیر اس لئے مخالفت نفس کی عمر بھر ضرورت ہے اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ اور یہاں سے بعض واعظین کی غلطی معلوم ہوگئی کہ وہ یہ آیت یعنی وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى کو مسلمانوں کے حق میں پڑھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو نماز میں کسل کرے وہ منافق ہے بات یہ ہے ان لوگوں کو قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ کسل کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ عمل میں مشقت کا سامنا ہو مگر عقیدہ میں ضعف یا شک نہ ہو تو یہ وہ کسل نہیں ہے جو منافقین کی شان تھی یہ تو کسل طبعی ہے اور طبعی کسل اعمال شرعیہ میں مخلصین کو بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اعمال نفس پر گراں ہیں نفس ان میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اور اعمال شرعیہ میں مشقت کا سامنا ہونا آیت وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ کے خلاف نہیں کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین فی نفسہ آسان ہے دشوار نہیں یہ اور بات ہے کہ منازعت نفس کی وجہ سے اس میں دشواری آجائے کیونکہ یہ ضرور ہے کہ اعمال شرعیہ میں نفس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور یہ نفس کو ضرور گراں ہے تو اس منازعت و کشاکشی کی وجہ سے دشواری آجانا یسر فی نفسہ کے خلاف نہیں اسی لئے قرآن میں وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ سے پہلے وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ بھی آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ دین میں مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے پس ایک جزو ہی کو مت دیکھو دونوں جزوں کو ملاؤ تو حاصل وہی نکلے گا جو میں نے عرض کیا ہے اب سنئے ایک تو طبعی کسل ہے جس کا منشا منازعت نفس ہے یہ منافقین کے ساتھ خاص نہیں اور ایک اعتقادی کسل ہے کہ اس شخص کو نماز کی فرضیت پر اور خدا اور رسول ﷺ پر ہی ایمان نہیں ہے محض کسی مصلحت کی وجہ سے نماز پڑھ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دل سے نہ پڑھے گا بلکہ بیگار سی ٹالے گا اور کسل کے ساتھ نماز ادا کرے گا یہ کسل منافقین کی شان ہے اور خدا نہ کرے کہ کسی مسلمان کی ایسی شان ہو۔

کسل اعتقادی

فرمایا کہ کلام مجید میں جو ارشاد ہے اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى اس میں کسل سے مراد وہ کسل ہے جو ضعف اعتقاد سے ہو جیسا کہ منافقین میں تھا کہ چونکہ نماز کو فرض نہ سمجھتے تھے صرف مصلحت دنیوی کی وجہ سے پڑھتے تھے اس لئے وہ ان کو ثقیل معلوم ہوتی تھی کسل طبعی مراد نہیں پس کسی مسلمان کی حالت پر اس کو پڑھ دینا صحیح نہیں جیسا بعض کم فہم واعظ کرتے ہیں کیونکہ مسلمان اگر عبادت میں کسل بھی کرے تو وہ طبعی ہوگا اعتقادی نہ ہوگا۔

غیر محقق واعظین کی ایک غلطی

واعظین میں بعضے غیر محقق واعظ ایسی چھری پھیرتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے چلے جاتے ہیں چنانچہ جو لوگ نماز میں سستی کرتے ہیں ان کو منافق کہہ دیتے ہیں اور یہ آیت پڑھ دیتے ہیں وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى

یہ آیت منافقین کی شکایت میں ہے کہ جب وہ نماز کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں تو اس حالت میں کھڑے ہوتے ہیں کہ کاہل ہوتے ہیں خوب سمجھ لو کسل اعتقادی اور شے ہے اور کسل طبعی جدا' منافقین میں کسل اعتقادی تھا یعنی ان کو نماز کے فرض نہ سمجھنے کے سبب کسل تھا اور مسلمانوں میں کسل طبعی ہے فرض ہونے میں تردد نہیں اس کو دوسرے عنوان سے سمجھئے کہ بعض مرتبہ لازم اعم ہوتا ہے اس کا تعلق ملزومات متعددہ سے ہوتا ہے کسل ایک لازم ہے منافقین میں اس کا ملزوم اعتقادی سستی ہے اور مسلمانوں میں طبعی ہے مسلمان کیسا ہی ضعیف الایمان ہو اس کو کسل اعتقادی کبھی نہ ہوگا تو یہاں مطلق کسل مراد نہیں ہے لیکن ہمارے واعظین سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیتے ہیں۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

ترجمہ: حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے اگر تم خدا کا شکر کرو یعنی ایمان (کامل اختیار کرو)

تفسیری نکات

شکر کی اہمیت

سبحان اللہ اس آیت میں یہ لفظ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اس قابل ہے کہ اس پر جان قربان کر دی جائے فرماتے ہیں کہ ہم کو تمہارے عذاب کرنے میں کیا نفع ہے ہم تو تم پر رحمت ہی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر تم نافرمانی کر کے خود ہی عذاب کو مول لیتے ہو تو اس عنوان سے کس درجہ شفقت ٹپکتی ہے یہاں ایک ضروری تنبیہ بطور جملہ معترضہ کے ہے بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ حق تعالیٰ کو مخلوق سے بے پرواہ بے معنی بے توجہ سمجھتے ہیں اور اس غلطی کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے غناء کا مطلب غلط سمجھا اس میں تو شک نہیں کہ غناء حق تعالیٰ کی صفت یقیناً ہے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ لیکن لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ان آیات میں مستغنی کے معنی وہ مراد لیتے ہیں جو ہمارے محاورہ میں مستعمل ہیں کہ ہمارے محاورہ میں مستغنی اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں سے بالکل بے پرواہ جو کسی کے نفع نقصان کی اسے رعایت نہ ہو حالانکہ مستغنی کے معنی آیات میں صرف یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کو کسی کی احتیاج نہیں وہ کسی کا محتاج نہیں پس محتاج نہ ہونا اور بات ہے اور بے پرواہ ہونا اور رعایت مصالح نہ کرنا دوسری بات ہے غناء جو حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے معنی عدم احتیاج کے ہیں اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو لوگ محض ترجمے دیکھ کر محقق بن جاتے ہیں وہ کیسا ستم ڈھاتے ہیں پھر غضب یہ کہ یہ لوگ ترجمے دیکھ کر محققین سے مزاحمت کرتے ہیں اور معارضہ میں کہتے ہیں کہ صاحب مشارق الانوار میں تو یہ لکھا ہے مظاہر حق میں یہ لکھا ہے میں کہتا ہوں کہ اس میں

وہی لکھا ہے جو محقق بیان کرتا ہے مگر تم ترجمہ دیکھ کر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے

تفسیری نکات

غیر محبوب کا مبغوض ہونا مسلم ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا اور لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۝ اور لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ وغیرہ وغیرہ

ظاہر ہے کہ یہ سب اعمال مبغوض ہی ہیں تو لایحب کے معنی صرف یہی نہیں کہ یہ محبوب نہیں گو مبغوض بھی نہیں جیسا امور مباحہ ہوتے ہیں بلکہ یہی مراد ہے کہ یہ مبغوض ہیں پس جب ترک دوام کا غیر محبوب ہونا ثابت ہوا تو اس محاورہ سے معلوم ہوا کہ ترک دوام غیر محبوب بمعنی مبغوض ہے اور جو شے خدا تعالیٰ کو مبغوض ہو وہ حرام ہے اور حرام کی ضد واجب ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مستحبات پر دوام واجب ہے تو ترک دوام پر رنج کرنا بھی مثل ترک واجب کے جائز ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ غیر محبوب کا مبغوض ہونا تو مسلم ہے مگر ہر مبغوض کا حرام ہونا مسلم نہیں یہ کبریٰ کلیہ نہیں بلکہ بعض مبغوض مباح بھی ہوتے ہیں جیسے ابغض الحلال عنداللہ الطلاق' اس میں طلاق کو حلال بھی فرمایا اور ابغض بھی فرمایا ہے معلوم ہوا ہے کہ بغض کا اجتماع اباحت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے میاں کے لئے طلاق دینا فی نفسہ تو جائز ہے مگر بلا ضرورت طلاق دینا خدا تعالیٰ کو پسند نہیں اسی طرح یہاں سمجھئے کہ اعمال مستحبہ پر دوام کرنا حق تعالیٰ کو محبوب ہے اور ترک دوام غیر محبوب ہے یعنی مبغوض ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فی نفسہ گو ترک دوام جائز ہے مگر بلا ضرورت شرعیہ یا طبعیہ دوام کا ترک کرنا حق تعالیٰ کو پسند نہیں۔

تکبر کی صورتیں

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۝ اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے) اور ان اللہ لا یحب المستکبرین (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے) یہ تین صیغے ہیں مختال اور فخور اور مستکبرین اور تینوں کی نسبت لا یحب (نہیں پسند کرتے) کا لفظ ہے کیا یہ جامع کلام ہے ان تین لفظوں کی شرح یہ ہے کہ

کبر کے آثار کبھی تو ظاہر ہو جاتے ہیں اور کبھی تہذیب کی وجہ سے دل میں رہتے ہیں تو یہ مستکبر ہیں کیونکہ استکبار کے معنی بڑا سمجھنا اور یہ دل سے ہوتا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں ان اللہ لا یحب المستکبرین یعنی جن لوگوں کے دل میں تکبر ہے خواہ وہ ظاہر نہ ہو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی مبغوض ہیں اور کبھی تہذیب کم ہوئی تو کبر کا اثر ظاہر بھی ہو جاتا ہے مثلاً کوئی آدمی فیشن بناتا اور طرح طرح کی وضع اختیار کرتا ہے جس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے اس کے متعلق ارشاد ہے لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ ایسا آدمی بعض دفعہ اس دھوکے میں رہتا ہے کہ مجھ میں تکبر نہیں ہے کیونکہ ان لوگوں نے اسی کا نام تکبر رکھا ہے کہ زبان سے بڑائی کا کلمہ کہا جائے، حالانکہ یہ فیشن اور وضع بنانا سب تکبر ہی ہے زبان سے نہ سہی مگر ان کی ہر ہر ادا سے تکبر ٹپکتا ہے بعضوں کی حال تو فیشن میں آ کر بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسے لقا کبوتر اپنی دم کو سنبھال سنبھال کر حرکت کرتا ہے ایسی ہی چال یہ لوگ چلتے ہیں کہ قدم قدم پر دیکھتے جاتے ہیں کہ کہیں سے فیشن تو نہیں بگڑ گیا غرضیکہ ان افعال کا کرنے والا گو خود ان کو تکبر نہ سمجھے لیکن واقع میں ہی سب تکبر ہے اور ان کے تکبر ہونے کو کیسا ہی چھپا دے مگر اہل فہم کو معلوم ہو جاتا ہے یہ سب مختال کے اندر داخل ہیں اور بعضوں کی زبان سے بھی تکبر کے کلمات نکلنے لگتے ہیں ان کو فخور فرمایا پس مختال تو وہ ہے جس کے دل میں تکبر ہو اور افعال سے بھی ظاہر ہو مگر اقوال سے ظاہر نہ ہو اور فخور وہ ہے جس کی زبان سے بھی ظاہر ہونے لگے تو تین مرتبہ ہوئے ایک مستکبرین ایک مختال اور ایک فخور تینوں کے واسطے لفظ لا یحب فرمایا خلاصہ یہ ہے کہ تکبر کا ظہور ہو یا نہ ہو یعنی زبان سے تکبر ہو یا قلب سے افعال سے ان سب کو اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ ' (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے) اور ان اللہ لا یحب المستکبرین (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) سے منع فرمادیا ان میں سے ایک درجہ کی بھی اجازت نہیں دی اب یہ سمجھے کہ اس مقام پر اس پر کسی عذاب کی وعید نہیں فرمایا صرف لا یحب فرمادیا سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اس آیت نہ سہی دوسری آیتوں میں تکبر پر عذاب کی وعید بھی موجود ہے۔ مثلاً اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (کیا غرور کرنے والوں کا دوزخ میں ٹھکانہ نہیں ہے) دوسرے یہ کہ یہ وعید کیا تھوڑی وعید ہے کہ لا یحب فرمایا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہو غور سے دیکھئے تو وعید کی اصل یہی ہے کیونکہ وعید اسی پر ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو مرضی کے خلاف ہونا کسی کام کا اور ناپسند ہونا ایک ہی بات ہے پس لا یحب اصل ہوگئی توحید کی بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کو دشمنی ہے اس شخص سے جو متکبر ہے یا مختال ہے یا فخور ہے کیونکہ محبت گو لغت کے اعتبار سے عداوت کی ضد ہے نقیض نہیں، لیکن محاورات میں جس پر اطلاقات قرآنیہ مبنی ہیں وہ عداوت کی نقیض ہے لا یحب میں محبت کی نفی کر کے اس کی نقیض کا اثبات ہے تو یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ اس پر کوئی وعید نہیں آئی کیا عداوت کا اثبات وعید نہیں بلکہ یہ تو وعیدوں کا

اصل الاصول ہے اگر کسی ایک معین عذاب کی وعید ہوتی وہ وعید کا ایک فرد خاص ہوتا اور اس میں تو کسی فرد کو عذاب کی خصوصیت نہیں رہی بلکہ وہ وعید فرمائی جو جڑ ہے تمام وعیدوں کی یعنی عداوت تو اس سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ اس کی جزا میں کسی فرد عذاب کی خصوصیت نہیں ہر قسم کا عذاب بلکہ بڑے بڑا عذاب اس جرم پر ہو سکتا ہے۔

حب اور بغض

رہی یہ بات کہ لا یحب سے اگر عداوت کا ثابت کرنا مقصود ہے تو پھر بجائے لا یحب کے یبغض کیوں نہ فرما دیا تا کہ تصریح ہو جاتی سو اس میں ایک نکتہ ہے جو اسی وقت قلب پر وارد ہوا کہ جو زیادہ تر طالب علموں کے کام کا ہے اور سمجھ میں آ جائے تو سب کے کام بھی ہے بات یہ ہے کہ افعال کے تین مرتبہ ہیں ایک محبوب ایک غیر محبوب گو مبغوض بھی نہ ہو ایک مبغوض یعنی ایک تو کسی کا پسند ہونا اور ایک کسی کام کا نہ پسند ہونا گو نا گوار بھی نہ ہو اور ایک نا گوار ہونا ظاہر ہے کہ تکبر قسم اول کا عمل تو نہیں ہے یعنی محبوب قسمین اخیرین میں سے کسی ایک قسم کا عمل ہے اور دوسری آیتوں اور نیز حدیثوں پر نظر کرنے کے بعد یہ ظاہر ہے کہ قسم آخیر ہی کا عمل ہے۔ یعنی مبغوض ہے اس لئے کوئی طالب علم یہ کہہ سکتا ہے کہ اس جگہ لا یحب کے بدلے یبغض ہونا چاہئے تھا سو اتنا تو مفسرین نے بھی لکھا کہ بناء علی المحاورات مراد لا یحب سے یبغض ہے مگر یہ کہ اس میں نکتہ کیا ہے لفظ یبغض ہی کیوں نہ لایا گیا یہ کہیں نظر سے نہیں گزرا وہ نکتہ اس وقت سمجھ میں آیا جس کو وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو مذاق محبت رکھتا ہو دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا اور قریب علم میں کوئی سمجھ بھی لے تو اس کو حظ نہیں آ سکتا اس کا پورا حظ وہی شخص پا سکتا ہے جس کے دل میں محبت کی آگ لگی ہوئی ہو اس ہلکے لفظ کو اختیار کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ مبغوض ہونا تو بڑی بات ہے عاشق کے لئے تو لا یحب کا لفظ بھی مر جانے کی بات ہے۔ ہائے وہ بندہ کیسے زندگی بسر کرتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کو محبت نہیں ہے واللہ مر جانے کی بات ہے دنیا میں آدمی احکام کی اور محبوبین کی نظروں میں محبوب ہونے کے لئے کیا کچھ مصیبتیں اٹھاتا ہے دیکھئے سپاہی بادشاہ کے حکم سے جان بازی کرتے ہیں اور سر کٹواتے ہیں صرف اس امید پر کہ بادشاہ ہم سے خوش رہے کسی نمک حلال نوکر کو جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ آقا کو مجھ سے آج کل ہمدردی اور محبت نہیں تو کیسا قلق ہوتا ہے خاص اس نوکر کو جس سے آقا کو پہلے محبت رہی ہو اس کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھ سے محبت کچھ کم ہو گئی ہے تو دیکھئے اس پر کیا گزرتی ہے حالانکہ اسے یہ تھوڑا ہی ثابت ہو گیا ہے کہ مجھ سے آقا کو دشمنی ہو گئی ہے بلکہ صرف اسی مرتبہ کی نوبت آئی ہے جس کے واسطے لفظ لا یحب بولا جاتا مگر یہی درجہ اس کی پریشانی کے لئے کافی ہے تو ایسے شخص کو اگر آقا کسی فعل سے منع کرنا چاہتا ہے تو ایسا لفظ نہیں اختیار کرنا چاہتا جو یبغض کے مرادف ہو بلکہ یہی لفظ انتہائی لفظ ہے کہ ہم کو یہ کام پسند نہیں

اورانتہائی اس واسطے کے اکثر تو ایسے نوکر کے لئے جس سے محبت کا برتاؤ رہا ہو اس لفظ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی لفظ کی بھی ضرورت نہیں صرف آقا کی نظر کا پھرا ہوا ہونا کافی ہوتا ہے اسی سے اس کا دم فنا ہو جاتا ہے یہ واقعات دن رات نظروں میں ہیں دیکھئے ایک پیش کار ایسا ہو جس سے کلکٹر کسی قدر انس ہو وہ اگر ایک دن اجلاس میں صرف اتنی بات نئی دیکھے کہ آج کلکٹر صاحب نے انس سے بات نہیں کی تو سہم کر رہ جاتا ہے اور احباب میں کہتا پھرتا ہے کہ آج صاحب کی نظریں کچھ پھر ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ خدا خیر کرے معلوم نہیں کیا بات خلاف طبع ہوئی اس صورت میں اگر کلکٹر صاحب زبان سے کہہ دیں کہ ہم کو تمہارا فعل پسند نہیں پھر تو کیا کہنا مر ہی تو جائے گا اور کبھی بھی اس کام کے پاس نہیں جائے گا اور یہ لفظ کہ ہم کو تمہارا فلانا کام پسند نہیں لا یحب ہی تو ترجمہ ہے جو حقیقت لغویہ کے اعتبار سے یبغض سے کم مرتبے کا لفظ ہے مگر یہ اتنا اثر کیوں رکھتا ہے بات یہی ہے کہ جس کو تعلق ہے اس کے لئے تو یہی لفظ سب کچھ ہے اور تعلق نہ ہو تو کوئی لفظ بھی موثر نہیں۔

کبر قلبی

اور قرآن شریف میں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۝ (اللہ تعالیٰ متکبر شیخی باز کو پسند نہیں کرتے) اور ان الله لا يحب المستكبرين (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے) یہ تین لفظ اس واسطے ہیں کہ کبر قلبی کبھی تہذیب کی وجہ سے مخفی رہتا ہے اس کے واسطے لفظ مستکبرین ہے اور تہذیب کی کمی سے اس کا ظہور ہونے لگتا ہے پھر اگر زبان سے ظہور ہو تو اس کی نسبت لفظ فخور ہے اور اگر صرف افعال سے ہو تو اس کے لئے مختال ہے فیشن بنانا بھی مختال میں داخل ہے۔ اس تکبر پر وعیدیں بہت ہیں مگر اس آیت میں لا یحب آیا ہے یہ بھی کچھ کم نہیں بلکہ سب سے زیادہ ہے کیونکہ تمام وعیدوں کی انتہا اسی پر ہوتی ہے اور اس میں بجائے یبغض کے لا یحب فرمایا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ جملہ کاموں میں تین مرتبے ہیں پسند ہونا اور پسند نہ ہونا اور گو برا بھی نہ سمجھا جائے اور برا سمجھنا ظاہر ہے کہ کبر قسم اول کا عمل تو یہ ہے نہیں اور قسمیں اخیرین میں سے بھی اخیر کا ہے مگر اس کے واسطے بجائے یبغض کے درمیانی قسم کا لفظ یعنی لا یحب فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ محب خدا کو تیسری قسم کے لفظ سنانے کی نوبت ہی نہیں آسکتی درمیانی لفظ بھی اس کے مرجانے کے لئے کافی ہے۔ دیکھئے حکام کی نظر پھری ہوئی دیکھ کر اہلکاروں پر کیا گزرتی ہے اور محب خدا ہر مسلمان ہے خواہ وہ کیسا ہی عاصی اور گناہ گار کیوں نہ ہو اس محبت کا ظہور عوام سے بھی جان بازی کے وقت ہوتا ہے کہ خواص سے بھی زیادہ کام کر جاتے ہیں تو مسلمان کے لئے لا یحب انتہائی لفظ ہے کیا بلاغت ہے اور ہر مسلمان کو جو میں نے محب خدا کہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اول حق تعالیٰ کو عبد سے محبت ہوتی ہے پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عبد کو حق تعالیٰ سے محبت ہو جاتی

ہے اور اس اولیت کی دو دلیلیں ہوتی ہیں ایک نقلی اور ایک عقلی نقلی تو یہ ارشاد ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (ہم نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ چاہیں) تو اول ادھر سے توجہ ہوئی اور عقلی اس طرح کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور معرفت نامہ حق تعالیٰ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ مرئی نہیں نہ اس کا کوئی نمونہ ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں) اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ انسان میں محبت خدا ضرور ہے تو ضرور وہ بااراده وتوجہ باری تعالیٰ ہوئی یہاں سے اہل ظاہر کا بھی جواب ہو گیا۔ انہوں نے محبت خدا کا انکار کیا ہے بدلیل مذکور یعنی وہ مرئی نہیں ہے نہ اس کا کوئی مماثل ومشابہ ہے نیز اس واسطے کہ محبت نام ہے خاص تعلق کا جو موقوف ہے طرفین کی مناسبت پر اور ممکن اور واجب میں مناسبت نہیں تو ان کی محبت کیسے ہو سکتی ہے جواب یہ ہوا کہ محبت محال جب ہی ہے کہ بندہ کی طرف سے مانی جاوے اور جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے مانی جاوے تو محال نہیں تو قدرت کے سامنے کوئی چیز محال نہیں اور حق تعالیٰ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ سے محبت بھی انہی کی طرف سے شروع ہوتی ہے اس کا شاہد یہ ہے کہ مرید کو اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا ان کو ہوتا ہے۔ غرض محبت حق بندہ کی غذا ہے تو اس کی ضد یعنی بغض تو بہت دور ہے بندہ کے مر جانے کے لئے تو عدم محبت بھی کافی ہے جو ترجمہ ہے لایحب کا جیسے مرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ظاہر کھایا جاوے بلکہ منع غذا بھی قاتل ہے۔ یہ بیان ہے لایحب کے انتہائی لفظ ہونے کا پس جبکہ کبر مبغوض ہو تو اس کی ضد یعنی تواضع محبوب اور محمود ہوئی نیز تواضع علاج بھی ہے کبر کا اس وجہ بھی ضروری ہے مگر تواضع کے معنی سے لوگ علی العموم ناواقف ہیں جہلاء تو خاطر داری کو کہتے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ اکثر تو لفظ تک بھی صحیح نہیں جانتے اور جو جانتے بھی ہیں تو وہ تصنع اور جھک جھک کر سلام کرنے کو سمجھتے ہیں حالانکہ تصنع تواضع نہیں بلکہ درحقیقت تکبر ہے جو ضد ہے تواضع کی، تواضع کے حقیقی معنی پستی اور انکسار اختیار کرنا نہ صرف ظاہراً بلکہ قلب سے اسی لئے متواضعین جھک جھک کر سلام نہیں کرتے بلکہ کوئی ان کی مدح کرے تو اس پر بھی انکار نہیں کرتے۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾
ترجمہ: اور موسیٰ علیہ اسلام کو ہم نے بڑا رعب دیا

تفسیری نکات

سلطاناً کے معنی اور آیت کا صحیح مفہوم

فرمایا وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا کے معنی اقبال اور ہیبت جیسے بعض بزرگوں کو اللہ تعالیٰ عنایت فرماتے ہیں۔

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ

ترجمہ: یعنی اے اہل کتاب تم لوگ اپنے دین میں حد سے مت بڑھو اور اللہ پر بجز حق بات کے مت کہو

تفسیری نکات

مخلوق کی شان میں تجاوز اللہ تعالیٰ کی تنقیص ہے

اور ولا تقولو اعلی اللہ الا الحق میں ایک نکتہ عجیب اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور وہ میرے مقصد کی پوری دلیل ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ عیسیٰ علیہ اسلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے تو اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ یہ فرماتے لا تقول علی عیسی الا الحق "یعنی عیسیٰ پر سوائے حق بات کے مت کہو" پھر علی اللہ کیوں فرمایا؟ پس سمجھئے کہ علی اللہ فرمانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ جب مخلوق کی شان میں حد سے تجاوز کرو گے تو یہ ضرور خدا تعالیٰ کی تنقیص ہوگی پس عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا یہ تنقیص ہے باری تعالیٰ کی' یہاں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہم لوگ جو بدنام ہیں کہ یہ رسول کی مدح سے منع کرتے ہیں تو جو مدح حد کے اندر ہو اس کو ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں ہاں ہم خدا تعالیٰ کی تنقیص کو منع کرتے ہیں پس رسول کی اتنی مدح کرنا کہ جس سے حق تعالیٰ کی شان میں بے ادبی ہو یہ رسول کی تو ظاہرا مدح ہوگی لیکن واقع میں اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی۔ ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کسی کی اتنی مدح کرے کہ اس کے باپ کی اہانت ہو جاوے پس ایسی مدح کو وہ بیٹا بھی پسند نہ کرے گا بلکہ اس سے ناراض ہوگا۔

پس لا تقولوا علی اللہ الا الحق سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مدح کے اندر حد شرعی سے بڑھنا یہ خدا تعالیٰ کی تنقیص ہے آگے جو ارشاد ہے اس سے میرا مقصود جو نکتہ کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ بہت صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ لا تقولو اعلیٰ اللہ الا الحق بھی اس مدح عیسوی ہی کے متعلق ہے اور وہ ارشاد یہ ہے کہ

انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ

"یعنی مسیح عیسیٰ ابن مریم اور کچھ نہیں ہیں صرف اللہ کے رسول ہیں"

پس اگر آیت کے یہ معنی نہ ہوں جو میں نے بیان کئے ہیں تو درمیان میں لا تقولوا علی اللہ الا الحق بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اول و آخر میں تو عیسیٰ علیہ السلام کا بیان ہے اور درمیان میں لا تقولوا علی اللہ الا الحق کے کیا معنی ہیں' پس صاف ظاہر ہے کہ مدعا یہی ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ اسلام کی جزئیت کے قائل ہو گے تو اللہ تعالیٰ پر بہتان ہوگا اور اس سے تنقیص جناب باری تعالیٰ کی لازم آئے گی۔ پس مدح بھی اسی وقت تک جائز ہوگی کہ حد سے نہ گزرے۔

حدود مدح

اسی طرح حضورﷺ کی شان میں بھی سمجھ لو کہ حضور کی نعت اسی حد تک جائز ہوگی کہ حد شرعی سے متجاوز نہ ہو' باقی اس کی حد کیا ہے اس کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے بہت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ یہ ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یعنی خواص ربوبیت کے علاوہ سب کمالات حضور کے لئے امکاناً تو سب ثابت اور وقوعاً جس میں روایت وارد ہو وہ ثابت' اور خواص ربوبیت کے علاوہ اگر کوئی ایسا امر ثابت کرو گے جو روایت سے ثابت نہ ہو تو یہ کذب اور گناہ تو ہوگا لیکن اس سے تنقیص حق تعالیٰ کی لازم نہ آوے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدح نبوی کے اندر دو چیزوں کی رعایت رکھو' ایک تو یہ کہ حضور کو خدا کے درجہ مت پہنچاؤ'

دوسرے یہ کہ وہ امر ثابت کرو کہ روایات ثابتہ اس کی مساعد ہوں ان دو امروں کی رعایت کے بعد جو چاہو ثابت کرو کوئی منع نہیں کرتا۔ مختصر یہ ہے کہ اس باب میں نسبت الوہیت اور کذب سے احتراز رکھو لیکن چونکہ ابنائے زماں ان دونوں باتوں سے اجتناب نہیں کرتے حضور کی شان کو ایسا بڑھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتے ہیں اور حکایات و واقعات وہ بیان کرتے ہیں کہ روایات صحیحہ میں ان کا پتہ بھی نہیں' اور اس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس لئے ہم حکایات و واقعات سے زیادہ ضروری مضمون بیان کرتے ہیں جس کو میں نے راز ولادت سے تعبیر کیا ہے اور اگر یہ غلو ہم نہ دیکھتے تو ہم بھی صرف واقعات صحیحہ بیان کرتے اس لئے کہ

اذکر نعمان لنا ان ذکره هو المسک ما کررته یتضرع

(نعمان کے ذکر کا اعادہ کر اس لئے کہ اس کا ذکر مشک ہے جتنا اس کو مکرر کرو گے مہکے گا)

اور اس لئے کہ محبوب کا ذکر بھی مایۂ تسلی ہے بحوائے حکایت

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم — می نمودے بہرکس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم — خاطر خود را تسلی میدہم

پس حقیقت یہ ہے کہ محبوب کا ذکر بھی محبوب ہے لیکن کیا کیا جاوے اسی محبوب کے آمر کی وجہ سے یہ بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ محبوب کے احکام کا ذکر زیادہ اہتمام سے ہو اس لئے واقعات بیان نہ کروں گا نیز وقت بھی نہیں اور ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ بفضلہ تعالیٰ وہ واقعات جو علماء محققین نے صحیح روایات سے مدون کر دیئے ہیں مشہور اور السنہ پر مذکور ہیں اس لئے میں بجائے حضور کی تشریف آوری کے واقعات کے وہ حکمت اور راز بیان

کرنا چاہتا ہوں جو حضور کے تشریف لانے سے مقصود ہے اور نیز حضور کے واقعات اور حکایات کا بھی مقصود اور غایت اصلی وہی ہے۔

غایات قصص القرآن

اور قرآن مجید کے اندر بھی غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جتنے واقعات اور قصص حق تعالی نے بیان فرمائے ہیں مطمع نظر ان سے ان کی غایات ہی ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

کتاب انزلنه الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور

(یعنی یہ کتاب ہے، ہم نے اس کو آپ کی طرف اس لئے نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالیں)

ارشاد ہے **هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ**

(یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا کہ اس دین کو تمام دینوں پر غلبہ دے دیں)

اور فرماتے ہیں: **قد انزل الله علیکم ذکرا رسولا یتلوا علیکم ایت الله مبینت لیخرج الذین امنوا و عملوا الصلحت من الظلمت الی النور** (یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے ایک یادداشت یعنی رسول کو کہ وہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں کہ وہ آیات (حق کو ظاہر کرنے والی ہیں) تا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کئے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالیں)

آیت مؤخر الذکر میں اللہ تعالیٰ نے ذکر اور رسول کو مبدل منہ اور بدل واقع کر کے گویا ایک قرار دیا ہے اس سے عقلاء سمجھ سکتے ہیں کہ حضور کی ذات مقدس سے مقصود ذکر ہے بہر حال قرآن شریف کے اندر جہاں حضور کا ذکر ہے وہاں غایت بھی حق تعالیٰ نے بیان فرمائی اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور کی ذات بابرکات سے اور آپ کے واقعات سے وہ غایت ہی مطلوب ہے۔

پس الحمد للہ میرا یہ بیان اور دعوی بے دلیل نہیں رہا پس راز و غایت کو بیان کرنا عین امتثال ہے اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا، اور نیز یہ اس حیثیت سے افضل ہوگا صرف واقعات کو بیان کرنے سے یہ تو اجمالی تعین تھی مقصود کی۔

(الظہور ملحقہ مواعظ عید میلاد النبی)

سُوْرَةُ الْمَائِدَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۟ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

ترجمہ: تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو اور جو گلہ گھٹنے سے مر جائے اور جو کسی ضرب سے مر جائے اور جو اونچے سے گر کر مر جائے اور جو کسی کی ٹکر سے مر جائے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے لیکن جس کو ذبح کر ڈالو اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے اور یہ کہ تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ ہیں آج کے دن ناامید ہو گئے کافر لوگ تمہارے دین سے سو ان سے مت ڈرنا مجھ سے ڈرتے رہنا آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کر لیا ہے پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جاوے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

شرک کی حقیقت

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت جو لوگ اولیاء اللہ کے نام کسی جانور کو ذبح کرتے ہیں یا ان کے مزار پر نذر و نیاز کی مٹھائی وغیرہ چڑھاتے ہیں اس میں دو قسم کے عقائد کے لوگ ہیں ایک تو یہ کہ ان کو حاجت روا سمجھ کر ایسا کرتے ہیں اس کے تو شرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ایک صورت یہ ہے کہ ذبح تو کرتے ہیں اللہ ہی کے نام پر مگر اولیاء کو ایصال ثواب کرتے ہیں اور ان کو مقبول سمجھ کر ان سے دعا کے طالب ہوتے ہیں اس میں کیا حکم ہے فرمایا کہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہیں مگر عوام کا کچھ اعتبار نہیں اس لئے اس میں بھی احتیاط ضروری ہے سو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہے حکم میں اختلاف نہیں وہ کہتے ہیں کہ سب عوام کی نیت شرک نہیں ہوتی اور ہم کہتے ہیں قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کی نیت شرک کی ہوتی ہے تو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہوا حکم میں اختلاف نہیں باقی غالب واقعہ یہی ہے کہ نیت عوام کی یہی ہوتی ہے کہ وہ راضی ہو کر خوش ہو کر ہماری حاجت کو پورا کر دیں گے بس یہی شرک ہے اور بعضے اہل کی تفسیر ذبح سے کر کے اس مذبوح بہ نیت تقرب الی غیر اللہ وعلی اسم اللہ کو حلال کہتے ہیں سو یہ ان کی غلطی ہے اور اگر ان کی تفسیر کو مان لیا جاوے اور مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ (اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) میں داخل نہ مانا جاوے تب بھی وہ ذبح علی النصب (اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) میں داخل ہونا تو قطعی ہے اس لئے کہ وہ عام ہے ہر منوی لغیر اللہ (جس میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی رضا مقصود ہو) کو۔

تفسیر مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ

احقر اشرف علی کہتا ہے کہ ضابطہ ملفوظات اس مضمون کو کافی طور پر ضبط نہیں کر سکے اس لئے میں خلاصہ لکھ دیتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ کو بعض نے خاص کیا ہے اس جانور کے ساتھ جس کو غیر اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جاوے اور جو اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جاوے گو اس میں نیت تقرب الی غیر اللہ کی ہو اس کو حلال کہا ہے اور منشا اس کا یہ ہے کہ بعض مفسرین نے اہل میں عند الذبح (ذبح کے وقت) کی قید لگادی ہے مگر یہ قول محض غلط ہے دوسری آیت مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ میں ما عام ہے اور وہاں کوئی قید نہیں اور مذبوح باسم اللہ کو بھی شامل ہے سو اس کی حرمت کی علت بجز نیت تقرب کے کیا ہے پس اسی طرح وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بھی عام ہوگا اور دونوں کے مفہوم میں اتنا فرق ہوگا کہ مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں غیر اللہ کے لئے نامزد ہونا قرینہ ہوگا قصد تقرب

لغیر اللہ کا اگرچہ انصاب (بتوں) پر ذبح نہ کیا جاوے اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ میں ذبح علی الانصاب اس مقصد کا قرینہ ہوگا اگرچہ غیر اللہ کے لئے نامزد نہ کیا گیا ہو پس دونوں میں عموم وخصوص من وجہ ہوگا اور یہی تغائر بنی ہو گا ایک کے دوسرے پر معطوف ہونے کا سورہ مائدہ میں پس علت حرمت کی قصد مذکور ہوگا یہ تو قرآن مجید سے استدلال ہے مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں عندالذبح کی قید نہ ہونے کی اور فقہاء نے مذبوح لقدوم الامیر (جو امیر کے آنے کے وقت اس کے تقرب کے لئے ذبح کیا ہو) کی حرمت میں اس کی تصریح کی ہے وان ذبح علی اسم اللہ تعالیٰ (اگرچہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو) اور یہ علت بیان کی ہے لانہ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بس معلوم ہوا کہ عند الذبح کی قید اتفاقی جریا علی العادۃ ہے یا اس قید سے یہ مقصود ہے کہ ذبح کے وقت تک وہ نیت تقرب کی رہی ہو یعنی اگر ذبح کے قبل توبہ کر لی تو پھر حرمت نہ رہے گی اور تفسیر احمدی میں جو بقر منذورۃ الاولیاء (اولیاء اللہ کو ثواب پہنچانے کے لئے جو جانور ذبح کیا جاوے) کو حلال کہا ہے وہ اس تحقیق کے خلاف نہیں ہے کیونکہ منیہ میں یہ تاویل کی ہے کہ ذبح للہ ہے اور نذر سے مقصود ان کو ایصال ثواب ہے تو یہ اختلاف واقعہ تحقیق میں ہوا کہ ان کے نزدیک عوام کی نیت تقرب کی نہیں نہ کہ منوی للتقرب (جس میں تقرب کی نیت کی گئی ہو) کی حرمت میں اس تاویل سے خود ظاہر ہے کہ منوی للتقرب کو بھی حرام سمجھتے ہیں اور بعض نے ما اهل به کو ایسا عام کہا ہے کہ حیوان اور غیر حیوان دونوں کو شامل ہے یعنی طعام وشیرنی بھی اس میں داخل ہے مگر تامل وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصود بیان کرنا احکام حیوان کا ہے رہا ما کے عام ہونے سے استدلال سو محقق یہ ہے کہ اس عموم میں ایک قید بھی ہے وہ یہ کہ مراد تکلم سے متجاوز نہ ہو اور یہاں متجاوز ہو جائے گا مگر اس سے حلت لازم نہیں آتی بلکہ اشتراک علت سے حکم بھی مشترک ہوگا حیوان میں نص قطعی سے اور غیر حیوان میں قیاس ظنی سے۔ واللہ اعلم

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

امراض روحانی کا انجام

امراض قلب کے واسطے اس سے بھی امراض باطنہ کا اثبات ہوتا ہے غرض یہ جہل بھی ایک مرض ہے اور مرض بھی شدید بلکہ اشد کیونکہ امراض جسمانی کا انجام تو صرف ہلاک دنیوی ہی ہے اور ہلاک دنیوی کی حقیقت کیا ہے کچھ بھی نہیں بلکہ وہ تو دراصل جملہ امراض سے فارغ ہو جانا ہے اس کے بعد وہ حیات ہے جو بنا پر اخبار صادقہ منقطع ہی نہیں ہو سکتی بخلاف مرض روحانی کے کہ اس کا انجام اخروی ہے جو یا ابدی ہے یا غیر ابدی ممتد ارشاد ہے...... وہاں تو ایک دن کی سزائے قید ہزار برس کے برابر ہے اور پھر امتداد کے ساتھ وہاں کی قید

میں امتداد بھی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ وہاں کی آگ یہاں کی آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے جب اسی آگ کی برداشت نہیں ہو سکتی تو اس کی کیسے ہوگی۔ تمام بدن تو درکنار ایک دیا سلائی کی آگ انگلی تک پہنچ جائے تو تحمل نہیں ہوتا اور وہ آگ تو محیط ہوگی کہ انسان اس میں غرق ہوگا اور رگ و پے تک آگ پہنچے گی اس کی برداشت کیسے ہو سکتی ہے اور کون برداشت کر سکتا ہے اور کافر کے لئے تو عذاب ابدی ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ہرگز ہرگز کسی طرح نہ ہو سکے گی۔

دین کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے

اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کافر وہ ہے جو کفر کا کام کرے یا کفر کی بات کہے اگرچہ عقائد کفریہ نہ ہو کہ پس اگر کوئی مسلمان کفر کا کام کرے گا جیسے بلا عذر زنار پہن لینا وہ بھی کافر ہو جاوے گا یا جب زبان سے کلمہ کفر کا کہا فوراً کفر عائد ہو جائے گا اس سے بھی آج کل نہایت بے پروائی ہو رہی ہے مثلاً بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے جس کے پاس کھانے کو نہ ہو اور کچھ خیال نہیں ہوتا کہ ہم نے کس درجہ کا گناہ کیا حالانکہ وہ کافر ہو گیا اب یا تو اس کو اپنے کفر کی خبر نہیں یا خبر ہے تو کفر کو خفیف خیال کرتا ہے اور درحقیقت یہ کلمہ بہت شدید اور سخت ہے۔

وقت نزول آیت مذکور

حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ کہ آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے یعنی اس بات سے کہ اس کو مٹائیں یا اس پر غالب آ جائیں یہاں بدل اشتمال محذوف ہے ای الیوم یئس الذی کفروا من دینکم ان یغلبوه یا ان یمحقوه اور وہ کیوں مایوس ہوئے لکثرة شیوعه ولنصرته تعالی یعنی بحمد اللہ اس وقت اسلام اس قدر پھیل بھی گیا ہے کہ عادت الٰہیہ میں اب مٹ نہیں سکتا اور نیز اللہ تعالیٰ نے وعدہ بھی فرما لیا ہے کہ یہ قیامت تک قائم رہے گا چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے چند دعائیں کی تھیں کہ میری امت عامہ عذاب سے ہلاک نہ ہو یہ دعا قبول ہو گئی۔ دوسری یہ دعاء کی تھی کہ اس پر قحط مہلک نہ ہو یہ بھی دعاء قبول ہوئی۔ تو اس میں وعدہ ہو گیا قیامت تک بقاء دین کا۔ تیسرے یہ کہ میری امت میں نا اتفاقی نہ ہو یہ قبول نہ ہوئی تو فرماتے ہیں کہ آج کے دن کفار مایوس ہو گئے تمہارے دین سے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حدیث میں ہے کہ وہ دن حجۃ الوداع کا تھا یعنی نویں تاریخ ذی الحجہ کو عرفہ کے میدان میں جمعہ کے روز نازل ہوئی وقت بھی عصر کا تھا۔ تو گویا جب یہ آیت نازل ہوئی وہ وقت تقریباً سال کا بھی آخر تھا دن کا بھی آخر تھا حضور کی عمر شریف کا بھی آخر تھا کیونکہ حجۃ الوداع کے بعد محرم، صفر اور ربیع الاول کی چند تاریخوں تک آپ زندہ رہے۔

ابتداع فی الدین

کسی یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ پہلے یہ مرض یہودیوں میں تھا۔ اب مسلمانوں میں بھی یہ مرض ہوگیا ہے کہ ہر بات کی یادگار میں عید کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیت کب نازل ہوئی اور کس جگہ نازل ہوئی یعنی عرفات میں حجۃ الوداع میں جمعہ کے روز نازل ہوئی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاں یہ آیت نازل ہوئی ہے وہ مقام ہمیشہ سے من جانب اللہ جائے عید ہے اور جس وقت نازل ہوئی ہے وہ زمانہ بھی من جانب اللہ عید کا ہے۔ ہمیں اور عید کی ضرورت نہیں۔ بس یہی عید کافی ہے یہ تو حقیقت تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمادی۔ مگر اب مسلمانوں میں ایک یہ رسم پیدا ہوگئی ہے کہ وہ یہود کی طرح ہر بات کی عید اور ہر چیز کی ایک یادگار بنانا چاہتے ہیں یاد رکھو یہ ابتداع فی الدین ہے۔ جن ایام کو شریعت نے عید بنادیا ہے ان کے علاوہ کسی دن کو عید بنانا حرام و بدعت ہے اور پہلے تو صرف یادگار کا یہی طریقہ تھا کہ اس دن کو عید بناتے تھے حتیٰ کہ کسی کے مرنے کے دن کو بھی عرس کا دن بناتے تھے اور اب اس کے علاوہ ایک نئی ایجاد ہوئی ہے کہ یادگار کے لئے ہڑتال کردیتے نہ معلوم یہ ہڑتال کیسا نام ہے ہڑتال سے تو بال صاف کئے جاتے ہیں ہڑتال تو ان کی اور سر منڈتا ہے غریبوں اور مزدوروں کا کہ وہ بیچارے اس دن کھائیں کہاں سے کمائیں کیسے۔ کیونکہ اس دن بازار اور تمام کاروبار بند ہوجاتا ہے جس سے غریبوں اور مزدوروں کو بے حد تکلیف ہوتی ہے مگر ان کو اس کی ذرا پرواہ نہیں۔

یہ رسم بھی بعض کفار ہی سے لے لی ہے۔ نہ معلوم مسلمانوں میں اتباع طریقہ کفار کا اتنا شوق کیوں پیدا ہوگیا اپنے بزرگوں کی حالت نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کر گئے ہیں اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت سال کا آخر تھا' ہفتہ کا آخر تھا دن کا بھی آخر تھا' حضور ﷺ کی عمر کا بھی آخر تھا۔ ان سب چیزوں کا آخر تھا۔ اس کے متعلق ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اس آخر سے آخر حقیقی مراد نہیں بلکہ قریب آخر کے مراد ہے۔ چنانچہ سال بھی قریب آخر کے تھا۔ حضور کی عمر بھی قریب آخر کے تھی' دن بھی قریب آخر کے تھا اور جیسے یہ چیزیں قریب آخر کے تھیں اسی طرح اس آیات کو بھی جو آخر آیات کہا جاتا ہے وہ بھی قریب آخر کے ہے آخر حقیقی نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ نازل ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہوجائے۔ بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحم کرنے والے ہیں تو ان سب میں (آخر حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ قریب آخر مراد ہے)

احکام کی آخری آیت

اور مجھ کو اس سے ایک فائدہ نکالنا مقصود ہے وہ یہ کہ یہاں پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب دین کامل اور تام ہو چکا تو پھر حکم اضطرار اور مخمصہ کا اس کے بعد کیسا اور اس کا یہ جواب نہیں دیا جا سکتا ہے کہ احکام کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں یہ آخر ہے اس کے بعد کوئی اور حکم نازل نہیں ہوا کیونکہ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ (الآیۃ) تو احکام ہی میں سے ہے اور یہ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ کے بعد میں نازل ہوا ہے تو پھر آخر کہاں ہوا پس جواب صحیح وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ آخر سے مراد قریب آخر ہے اس پر کوئی خدشہ نہیں وارد ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ قرآن کو اصطلاحات منطقیہ پر اتارتے ہیں محاورہ کو نہیں دیکھتے۔ محاورہ میں قریب آخر کو بھی آخر کہا جاتا ہے مثلاً کوئی کسی دوست سے ملنے جاتا ہے تو کہتا ہے اب تمہارے ساتھ میری یہ آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد دو گھنٹہ تک بیٹھتا رہتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں جس پر یہ شبہ ہو کہ جب آج اکمال دین ہو گیا تو اس کے بعد کوئی حکم نازل نہ ہونا چاہئے اور آیات احکام میں یہ آخری آیت اور آخر احکام ہونا چاہئے سو یہ شبہ اس لئے وارد نہیں ہوتا کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں بلکہ الیوم سے مراد زمانہ حاضرہ مع متصل ما قبل و ما بعد کے ہے اور محاورہ میں اس مجموعہ کو زمانہ حاضرہ کے منافی نہیں۔ الغرض حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کہ آج سے کافر مایوس ہو گئے تمہارے دن سے کہ اسکو مٹا دیں یا اس پر غالب آ جائیں جب یہ بات ہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ تو تم ان سے ڈرو مت تمہارا کچھ کر نہیں سکتے۔ اگر اسلام سے تم کو محبت ہے تو اس میں پختہ رہو کسی سے مت ڈرو۔

افسوس اب بہت لوگوں کو دعویٰ ہے محبت اسلام کا اور کفار سے ڈر کر ان سے دوستی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ ساتھ نہ ہوں تو ہمارا دین قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ان سے مدد لیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کا رد فرماتا ہے کہ اب وہ تمہارے دین سے مایوس ہو گئے۔ پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ افسوس کفار تو سمجھ گئے کہ ہم اس دین کو دنیا سے نہیں مٹا سکتے۔ چنانچہ ان کا یاس اس سمجھنے کی دلیل ہے اور مسلمان نہیں سمجھتے پس ارشاد ہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ تو تم ان سے مت ڈرو مجھ سے ڈرو یعنی ان کی خوشامد میں شریعت کے خلاف نہ کرو دین کو تباہ مت کرو کوئی اس دین کو مٹا ہی نہیں سکتا اسلام تو وہ چیز ہے کہ

؎ چراغے را کہ ایزد بر فروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

اسلام کا معجزہ

کیا یہ اسلام کا معجزہ نہیں کہ فتنہ تاتار میں چنگیز خان نے اپنے نزدیک اسلام کو فنا کر دیا تھا کیونکہ خلافت کی

جڑ اکھاڑ دی تھی مگر یہ اس کی حماقت تھی کہ خلافت کے مٹانے کو اسلام کا مٹانا سمجھا۔ آخر خلافت کیا ہے وہ تو اسلام کی ایک شاخ ہے خدانخواستہ خلافت کے مٹ جانے سے اسلام نہیں مٹ سکتا بلکہ کبھی پیڑ کی ایک شاخ کٹنے سے ایک اور شاخ نکل آتی ہے جو پہلی شاخ سے اچھی ہوتی ہے خلافت تو فرع ہے اسلام کی۔ اس کے جانے سے کہیں اسلام مٹ سکتا ہے؟ غرض چنگیز خاں نے خلافت کی جڑ کاٹ ڈالی تھی مگر خدا نے یہ کیا کہ جنہوں نے اسلام کو مٹانا چاہا تھا انہیں سے اسلام کی خدمت کرائی۔ چنانچہ وہی اب اسلام کو مخالفین کے حملوں سے بچا رہے ہیں یعنی ترک جو چنگیز خاں کی اولاد اور خاندان اور قوم سے ہیں میں نے بعض مورخین سے سنا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر کوئی ترک نہیں جو مسلمان نہ ہو اور انہوں نے اتنی بڑی خدمت اسلام کی کی ہے جس سے لوگوں کو ان کے متعلق گمان ہو گیا خلافت کا کہ وہ خلیفہ ہیں اسی لئے کہتے ہیں

چراغے راہ کہ ایزد بر فروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو خدا روشن کرے وہ گل نہ ہوگا اس کی بیخ کنی کوئی کر ہی نہیں سکتا اور یاد رکھو جس دن یہ ڈوبے گا اس دن سب ڈوب جائیں گے۔ اسلام وہ مذہب نہیں جو دنیا سے تنہا رخصت ہو بلکہ اس کا مٹنا تمام مذاہب اور تمام عالم کا مٹنا ہے اس کی تو وہ شان ہے کہ ؎ ہم تو ڈوبیں گے مگر تم کو بھی لے ڈوبیں گے

صاحبو! جس روز اسلام نہ رہے گا اس دن عالم فنا ہو جائے گا اور راز اس کا یہ ہے کہ اگر کسی شہر میں سب باغی نہ ہوں بلکہ مطیع بھی ہوں تو بادشاہ ایک طرف سے اس شہر کو نہیں اڑایا کرتا بلکہ پہلے مطیعین کو وہاں سے الگ کرتا ہے پھر شہر کو اڑاتا ہے تو جب تک شہر میں مطیعین موجود ہیں اس وقت تک اطمینان رہتا ہے کہ یہ شہر ابھی نہیں اڑایا جائے اور جس دن مطیعین کو وہاں سے الگ کر لیا جائے پھر بستی کی خیر نہیں کیونکہ اب اس میں سارے باغی ہی باغی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس کی رعایت سے شہر کو باقی رکھا جائے چنانچہ قرآن میں لوط علیہ السلام کے قصہ میں بھی اسی اصل کا ذکر ہے لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚۖ ابراہیم علیہ السلام سے فرشتوں نے کہا کہ ہم اس بستی کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے باشندے بڑے ظالم و شریر ہیں قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ان میں لوط علیہ السلام بھی تو موجود ہیں اس حالت میں بستی کو کیسے ہلاک کرو گے قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا فرشتوں نے کہا کہ جو وہاں رہتے ہیں ہم کو سب معلوم ہیں لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین متبعین کو بچالیں گے۔ مگر ان کی عورت کو کیونکہ وہ بھی نافرمانوں میں تھی۔ دوسری جگہ اس تجیہ کی صورت فرماتے ہیں فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ کہ ہم نے جتنے ایماندار تھے۔ سب کو وہاں سے نکال دیا علیحدہ کر دیا

اور مسلمانوں کا بجز ایک گھر کے اور کوئی گھر نہ پایا جب ان کو الگ کر دیا اب قہر خدا نازل ہوا۔ غرض یہ خدا کی رحمت ہے کہ اگر کسی بستی میں ایک مطیع بھی موجود ہو تو وہاں قہر عام نازل نہیں فرماتے یہ ان کی عنایت ہے رحمت ہے۔ جب یہ سمجھ گئے تو اگر دنیا میں ایک اللہ اللہ کہنے والا بھی موجود ہوگا تو حق تعالیٰ عالم کو فنا نہ کریں گے عالم باقی رہے گا اور اگر ایک بھی مسلمان نہ رہے تو پھر اسی دم عالم کو فنا کر دیں گے جب بقائے عالم بقائے اہل اسلام پر موقوف ہے تو تمام دنیا کو اس کی خوشامد کرنا چاہئے نہ کہ مسلمان کسی کی خوشامد کریں اس لئے فرماتے ہیں فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ یعنی کفار کی خوشامد کر کے اور ان سے دوستی بڑھا کر اسلام کو مت کھو بیٹھو۔ ہماری خوشامد کرو ہم سے ڈرو وہ ہیں کیا چیز۔ آگے اس کے بعد فرماتے ہیں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ اب ہم نے دین کو کامل کر دیا دین ایسا کامل ہو گیا کہ اس کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوگی اس کے مٹانے کی وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ یعنی تم پر اپنی نعت پوری کر دی دو اعتبار سے ایک قوت سے دوسرے قواعد و احکام سے قوت کے اعتبار سے تو اتنا مضبوط کر دیا کہ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کفار مایوس ہو گئے ان کے اندر اتنی قوت نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکیں سو اب اس کو مٹانے کی ان کو ہمت نہ ہوگی اور قواعد کے اعتبار سے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ یعنی قواعد و احکام کے اعتبار سے اتنا کامل کر دیا کہ قیامت تک کے جتنے احکام ہیں سب اس سے نکل سکتے ہیں کوئی حادثہ ایسا پیش نہ آوے گا جس کا حکم اس میں نہ ملے اگر کوئی کہے پھر اور دلائل کی کیا ضرورت ہے حدیث و اجماع امت و قیاس تو یہ بات نہیں حدیث تو خود دین کا جزو ہے اور دینکم میں داخل ہے دینکم کا مقابل نہیں باقی قیاس مظہر ہے مثبت نہیں وہ احکام قیاسیہ بھی قرآن و حدیث ہی سے ثابت ہیں۔ رہا اجماع امت سو وہ اجماع کسی آیت یا حدیث ہی کے مضمون پر ہوتا ہے تو یہ سب حقیقت میں ایک ہی چیز ہوئے یعنی دین صرف نام الگ الگ ہیں ایک لحاظ سے اس کا نام قرآن ہے اور ایک اعتبار سے حدیث ایک اعتبار سے اجماع امت ایک اعتبار سے قیاس

عبار اتنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر
بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش من از رفتار پایت مے شناسم

دین اسلام کبھی ناسخ ہونے والا نہیں

یہ سب ایک ہی چیز ہے کسی وقت کسی رنگ میں ہے کسی وقت کسی لباس میں اسی کی نسبت فرماتے ہیں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ یعنی تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی ظاہرا بھی اور باطنا بھی کسی قسم کا نقص کوئی کمی اس میں نہیں رہی وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا اور پسند کیا میں نے تمہارے

لئے دین اسلام کو یہی دین خدا کے نزدیک مرضی اور پسندیدہ ہے یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ رضیت کا عطف ظاہر ہے کہ اکملت و اتممت پر ہے اور معطوف علیہ مقید ہے الیوم کے ساتھ یعنی اکمال اور اتمام دین اب ہوا تو رضیت معطوف میں بھی وہ قید ہوگئی ہے معطوف علیہ میں تو کچھ اشکال نہیں کیونکہ وہ واقعی ابھی متحقق ہوا لیکن رضیت میں کیا کہا جاوے گا۔کیا یہ رضا بالاسلام بھی آج ہی ہوئی کیونکہ عطف کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ جیسے اکمال واتمام اب ہوا ایسے ہی یہ رضا بالاسلام بھی ابھی ہوئی' حالانکہ اسلام کو ان کے لئے پسند کرنا پہلے سے ہے یہ اشکال ہے اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ اکملت پر عطف نہیں بلکہ الیوم پر ہے اب کوئی اشکال نہیں مگر یہ ضعیف توجیہ ہے کیونکہ اس میں متبادر کا ترک لازم آتا ہے محققین کہتے ہیں کہ اس تکلیف کی ضرورت نہیں کہ الیوم پر عطف ہے بلکہ سہل تفسیر یہ ہے کہ یہاں ایک قید ہے یعنی رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا مطلب یہ کہ ہمیشہ کے لئے ہم نے اسی کو پسند کیا ہے یہ دنیا سے کبھی زائل نہ ہوگا کوئی اسکا مٹانے والا نہیں' کوئی اس کا ناسخ نہیں جیسے اور ادیان یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتے گئے یہ ایسا نہ ہوگا ہمیشہ رہے گا۔سو یہ خبر بقاء الی یوم القیامہ کی تصریحاً آج ہی ارشاد فرمائی گئی اگرچہ ختم نبوت کی خبر سے لزوماً یہ بھی معلوم ہوگیا تھا یہاں شائد کسی کو وہم ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام تو آخر زمانہ میں آویں گے اور وہ اپنے خاص احکام جاری کریں گے۔مثلاً جزیہ کا قانون اٹھادیں گے جو کہ حکم اسلام ہے یا خنزیر کی نسل کو مٹادینے کا حکم فرمادیں گے اور یہ سب ظاہراً نسخ ہے جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس حیثیت سے نہ آویں گے کہ ان کو اس وقت نئی نبوت یا شریعت اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا ہوگی لانبی بعدی کے یہی معنی ہیں کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی جدید نبوت نہیں۔یعنی بعد حضور کی وفات کے کسی کو جدید نبوت یا شریعت اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا نہ ہوگی یہ مطلب نہیں کہ کوئی پہلے کی نبوت عطا کیا ہوا نبی بھی شریعت اسلامیہ کا متبع ہو کر بھی دنیا میں نہ آوے گا۔عیسیٰ علیہ السلام تو پہلے سے نبی تھے اور شریعۃ اسلامیہ ہی کے تابع ہو کر تشریف لائیں گے ان کا حضور کے بعد آنا اور متبع ہو کر آنا لا نبی بعدی کے خلاف نہیں سو وہ آکر حضور ہی کی شریعت کے موافق عمل کریں گے تو لانبی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی پرانا نبی بھی حضور کے دین کی خدمت کے لئے نہ آوے گا۔

غرض عیسیٰ علیہ السلام نازل بھی ہونگے اور اس وقت نبی بھی ہوں گے' مگر اعطائے نبوت ان کے لئے پہلے ہو چکی ہے اور آپ ﷺ کی نیابت کے طور پر آویں گے نہ کہ مستقل بنکر اور حاکم ہو کر بلکہ حضور ﷺ کے محکوم ہو کر آویں گے۔

اس میں تو حضور کی اور فضیلت بڑھ گئی کہ نبی بھی حضور کے خادم ہوں گے۔حدیث میں ہے لو کان موسی حیا لما وسعه الا اتباعی کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو وہ سوائے میری اتباع کے

اور کچھ نہ کرتے آپ نے یہ نہیں فرمایا لسلبت نبوته کہ ان کی نبوت چھن جاتی بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ متبع ہو کر
رہتے غرض مرضیات کے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے اسی دین کو پسند کیا ہے پس حدیث میں جو ہے کہ
عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر جزیہ کو موقوف کر دیں گے اور اس وقت دو ہی باتیں رہ جائیں گی یا اسلام لاؤ یا قتال کرو
تو وہ نسخ نہیں ہے بلکہ اس وقت کے لئے شریعت محمدیہ کا یہی قانون ہوگا جس کو عیسیٰ علیہ السلام جاری فرمادیں گے
اور بڑے مزہ کا لطیفہ ہے کہ عیسائی لوگ مسئلہ جہاد کے اوپر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اس کو کیوں رکھا میں
کہتا ہوں کہ اپنے پیغمبر سے ہی پوچھو وہ عنقریب آنے والے ہیں وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ حضور نے تو پھر بھی
تمہاری رعایت کی ہے کہ جزیہ دے کر بچ سکتے ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تو اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ ان کے عہد
میں دو ہی باتیں ہوں گی یا اسلام یا سیف' غرض عیسیٰ علیہ السلام حکم اسلامی قدیم کو منسوخ نہ فرمائیں گے کہ پہلے
جزیہ کا حکم تھا اور آپ اس کو اٹھادیں گے تا کہ ان کو ناسخ کہا جاوے۔

پھر رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا تابید پر شبہ کیا جائے کہ تابید تو جب ہوتی ہے کہ اسلام کا ہر حکم قیامت تک
رہتا۔ سو جواب ظاہر ہے کہ اس حکم کو عیسیٰ علیہ السلام نے منسوخ نہیں کیا بلکہ حضور ہی نے منسوخ کیا ہے پس اس
حدیث میں کہ یضع الجزیۃ خبر بمعنے انشاء ہے۔ یعنی حضور ہی خود یہ حد مقرر کر گئے ہیں کہ اے عیسیٰ جب تم آؤ اس
وقت کفار کے ساتھ یہ معاملہ برتنا اس کی مثال ایسی ہے کہ طبیب نے کسی مریض کو مسہل دیا اور اس سے کہہ دیا کہ
مسہل لینے کے بعد یہ ٹھنڈائی پیئے گا تو اب مریض جو ٹھنڈائی پیتا ہے یہ اس کی ایجاد نہیں بلکہ طبیب ہی کا کہنا پورا
کرتا ہے طبیب ہی نے بتلا دیا تھا کہ تین روز کے بعد تدبیر تجویز ہوگی اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہے کہ اس
وقت آپ جزیہ کو موقوف کر دیں عیسیٰ علیہ السلام اپنی طرف سے ایجاد نہیں کریں گے بلکہ آپ ہی کے فرمان کو
بجا لاویں گے غرض اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین پسندیدہ اسلام ہی ہے) اور
رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا کے معنی یہی ہیں کہ ہمیشہ یہی دین رہے گا آگے ایک نکتہ ہے اہل علم کے لئے وہ یہ کہ
فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ یہ حکم یہاں بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے ماقبل کے ساتھ اس آیت کا ربط نہیں معلوم ہوتا
کہ یا تو اوپر تکمیل اسلام کی بشارت دی جا رہی ہے یا اب فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ کا حکم نازل فرمادیا اور پھر اس
مضمون کو فاء کے ساتھ لائے جو ترتیب کے لئے آتا ہے تو بعض نے تو اس اشکال سے گھبرا کر یہ کہہ دیا کہ فاء
ترتیب ذکری کے لئے ہے ترتیب حکمی کے لئے نہیں لہٰذا حکم مرتب ہونا اور مسلسل ہونا ضروری نہیں مگر الحمد للہ
میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ یہاں پر فاء ترتیب حکمی ہی کے لئے ہے اور پھر بھی اشکال نہیں چنانچہ عنقریب مذکور
ہوگا باقی جن لوگوں نے فاء کو ترتیب ذکری کے لئے قرار دیا ہے ان پر ایک اشکال پھر بھی باقی رہتا ہے وہ یہ کہ
اس مضمون کو ماقبل سے کیا جوڑ ہوا اس بے ربطی کا کیا جواب ہے انہوں نے اس کا بھی ایک جواب دیا وہ یہ کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ یہ بیچ میں آ گیا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ ہے کہ اول میں حلال وحرام چیزوں کا ذکر تھا حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ یہ احکام حق تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمائے ہیں ان احکام کے ساتھ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ مرتبط ہے کہ یہ چیزیں جو ہم نے بیان کی یہ ہیں تو حرام مگر مضطر کے لئے جائز ہیں اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ بیچ میں جملہ معترضہ ہے اور جملہ معترضہ کو بھی اول سے کچھ مناسبت ہوتی ہے وہ مناسبت یہ ہے کہ دیکھو اسلام میں کیسے کیسے قواعد ہیں اور چونکہ خدا تعالیٰ کو اسلام کا اکمال مقصود ہے۔ اس لئے دیکھو اللہ میاں نے سارے ضروری احکام بتا دیئے تا کہ کسی طرح کمی نہ رہ جاوے یہ تو مشہور جواب ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر فاء ترتیب حکمی ہی کے لئے ہو پھر بھی کچھ اشکال نہیں اور جو اشکال کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ متجانف لاثم کا ترتب اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ پر ہوسکتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے تمہارے دین کو مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا اور تمہارے لئے اس دین کو ہمیشہ کے لئے پسند کیا آگے ارشاد ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ یعنی ہم اتنے کامل النعمۃ ہیں اور تم سے اتنے خوش ہیں اور ہماری اس قدر تم پر رحمت ہے بعض حالات میں تمہاری راحت وسہولت ومصلحت کے لئے حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں اس پر فاء کا ترتب نہایت لطیف اور چسپاں ہوگیا اور اس میں ایک اور لطیفہ بھی حاصل ہوگیا وہ یہ کہ اسمیں اشارہ ہے سبقت رحمتی علی غضبی کی طرف چنانچہ آیت کو ختم بھی رحمت پر کیا ہے یعنی غفور رحیم پر گویا اشارہ ہے اس طرف کہ اے بندو! ہمارے احکام کو تنگ مت سمجھو احکام میں کوئی تنگی نہیں ہے جہاں تنگی کا وہم ہے جیسے تحریک محرمات وہاں بھی رحم کی رعایت ہوتی ہے۔ بخدا میں دعوے سے کہتا ہوں کہ دین میں کوئی تنگی اور حرج نہیں ہے۔ میرا ایک وعظ ہے نفی الحرج وہ چھپ گیا ہے اس میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ دین میں تنگی بالکل نہیں ہے کسی قسم کی رکاوٹ اس میں نہیں ہے۔ اس کا جواب دے کر بیان کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ میں نے تو کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت پر اپنے کلام کو ختم فرمایا ہے چنانچہ تکمیل دین کے مضمون کو اس پر ختم کیا ہے کہ ہماری اتنی رحمت ہے کہ کبھی حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں اور غفور رحیم میں رحمت کی تصریح فرما دی۔ مگر یہ ثابت ہے کہ سب سے آخری آیت قرآن کی یہ ہے وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ یعنی ڈرو تم اس دن سے جس روز تم اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اپنے کئے ہوئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا اور اس میں ظاہر ہے کہ وعید کا مضمون ہے سو اس سے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو وعید پر ختم کیا ہے۔

اور یہاں کلام کو وعید پر ختم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی علماء نے لکھی ہے کہ جو کلام آخر میں ہوتا ہے وہی نقش دل رہتا ہے اور اس کا اثر قلوب پر زیادہ رہتا ہے تو اس نقل میں اور میرے قول میں تعارض ہو گیا کیونکہ میں نے تو لکھا تھا کہ مضمون رحمت پر کلام ختم ہوا ہے اور اس نقل سے معلوم ہوا وعید پر ختم ہوا ہے۔ سو رفع اس تعارض کا یہ ہے کہ کلام تو رحمت ہی پر ختم ہوا ہے مگر اس مصلحت سے کہ اس رحمت پر نظر کر کے کوئی بالکل لاپرواہی نہ کرنے لگے ذرا سی دھمکی بھی دے دی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے احکام میں تو بالکل تنگی نہیں بہت آسان احکام ہیں لیکن اگر سہل سہل احکام پر بھی عمل نہ کرو گے تو تمہاری کمبختی آوے گی کہ اتنی تو تم پر رحمت کی کہ بالکل ہلکے ہلکے احکام نازل کئے پھر اگر اس میں بھی کاہلی برتو گے تو بس جان تباہی میں آ جائے گی تو یہ آیت ہماری تقریر کے مخالف نہ ہوئی بلکہ اس سے رحمت کی اور تائید ہوگئی اسکی ایسی مثال ہے کہ بچہ کو سبق آسان بتلا دیا اور اس کی یاد کی بھی آسان صورت بتلا دی پھر اگر اس میں بھی وہ شوخی اور سستی کرے تو اس کے کان کھینچ لئے تا کہ اس ڈر کے مارے سبق جلدی یاد کر لے اور پھر دس روپیہ انعام کے لئے اس صورت میں سبق تو اس کا بالکل آسان تھا مگر وہ لاپروائی سے یاد نہیں کرتا اس لئے تنبیہاً اس کے کان کھینچ لئے تا کہ اس کو یاد کرے تو یہ گوشمالی بھی رحمت ہی کا اثر ہے بہر حال تعارض نہ رہا۔

حاصل آیت

خلاصہ اس آیت کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نعمت اسلام کا کامل اور تام ہونا ذکر فرمایا ہے تا کہ اس نعمت پر متنبہ ہو کر اس کا شکر بجالاویں اور شکر یہ ہے کہ اس کے فضائل و برکات خود بھی حاصل کریں اور دوسروں کو بھی اس سے بہرہ ور کریں دوسروں کے سامنے بھی اس کے فضائل و برکات بیان کریں تبلیغ کریں جس کی خصوصاً اس وقت سخت ضرورت ہے خلاصہ یہ کہ اپنی بھی اصلاح کریں اور دوسروں کی بھی اصلاح کریں ان کو ترغیب دیں ادھر متوجہ کریں قرآن میں جہاں نماز روزہ زکوٰۃ کا حکم ہے وہاں امر بالمعروف کا بھی حکم ہے اس لئے امر بالمعروف بھی کریں مگر خوبصورتی کے ساتھ کسی سے لڑے بھڑے نہیں اور جیسے نماز باوجود فرض ہونے کے کبھی کبھی کسی عذر سے ساقط ہو جاتی ہے جیسے حائض سے نماز ساقط ہو جاتی ہے اسی طرح یہاں بھی اعذار و قیود ہیں اسی لئے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کرو علماء سے پوچھ کر کرو۔ وہ ہر ایک کے مناسب کام بتا دیں گے۔ کسی کو تصنیف کا کام سپرد کر دیں گے۔ کسی کو زبانی تبلیغ و اشاعت کے لئے تجویز کریں گے کسی کو مالی امداد کا مشورہ دیں گے۔ کسی کو زبانی تبلیغ و اشاعت کے لئے تجویز کریں گے کسی کو دعا کا حکم کریں گے کہ تم دعا ہی کرتے رہو اور دعا کا کام تو سب ہی کر سکتے ہیں اور کام کرنے والے بھی اس میں شریک رہیں گے اب دعا کیجئے کہ خداوند کریم فہم سلیم عطا فرما دیں اور ہم کو ظاہری و باطنی اصلاح کی توفیق بخشیں۔ آمین

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ اگر کسی کا روحانی مرض لاعلاج ہوتا اور کوئی مریض روحانی مایوس العلاج ہوتا تو سب سے زیادہ مستحق اس کے وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ نازل ہوا ہے مگر ان کا کفر بھی فی نفسہ لاعلاج نہ تھا۔ بلکہ ان کی بد پرہیزی کی وجہ سے یہ پیشین گوئی کی گئی ہے۔

خاتمہ کا حال

بعض مفسرین کا قول تو یہ ہے کہ یہ آیات خاص خاص لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن کا نام حضور اقدس ﷺ کو بتلا دیا گیا تھا اور بعض کا قول یہ ہے کہ بلاتعیین یہ ان سب لوگوں کے بارے میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے اور خاتمہ سے پہلے کسی کو بھی حتیٰ کہ ابوجہل کو بھی علی الاطلاق کافر نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شاید اخیر میں اسلام لے آتا۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کافر رانجواری منگرید که مسلمان بودنش باشد امید

مگر اس وقت وحی کا زمانہ تھا اس وقت خاتمہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا کہ کس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے اس لئے جن کفار کی نسبت صحابہ کو رسول ﷺ کے ارشاد سے یہ معلوم ہو گیا ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے ان کے نام صحابہ نے اس آیت کی تفسیر میں تمثیلا بیان کر دیئے۔

بے ہوشی کا قول و فعل شرعاً معاف ہے

اور مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ان جیسے لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہوگا سب کافروں کے بارہ میں نہیں ہے مگر اب تو خاتمہ کا حال معلوم ہونا دشوار ہے اگر ظاہر میں کسی کا کفر ہی پر خاتمہ ہو جب بھی یقینی طور پر کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم کو دل کا حال کیا معلوم ہے شاید وہ دل میں مسلمان ہو اور زبان سے اقرار کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو یا ملا ہو اور اس نے تساہل کیا ہو تو بہت سے بہت گنہگار ہوگا مگر کافر نہ ہوگا۔ بلکہ عند اللہ ایسا شخص مسلمان ہے اسی طرح اگر کوئی مسلمان مرتے ہوئے کلمہ کفر کہتا ہوا جائے جب بھی کفر کا حکم مشکل ہے فقہاء نے اس کا راز سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرتے ہوئے کسی کے منہ سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے شاید نزع کی وجہ سے اس کی عقل درست نہ ہو اور بے ہوشی کی غفلت میں یہ کلمہ زبان سے نکلا ہو اور شریعت میں ایسا شخص مکلف نہیں رہتا بے ہوشی میں جو فعل و قول بھی صادر ہو شرعاً معاف ہے یا ممکن ہے کوئی ہوش ہی میں کلمہ کفر کہہ رہا ہو مگر اس کا مطلب وہ نہ ہو جو تم سمجھے بلکہ کچھ اور مطلب ہو پھر اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے حکم کفر کیونکر لگایا جا سکتا ہے۔

روحانی مطب میں کوئی مرض لاعلاج نہیں

غرض اس وقت تو کسی کے کفر پر تیقن نہیں ہوسکتا مگر جس زمانہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کا مشاہدہ ہوسکتا تھا اس وقت بھی یہ لوگ مایوس العلاج اوران کا کفر لاعلاج نہ تھا۔ بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں تھا اس طرح سے کہ ایمان لے آتے گو اس کا عدم وقوع حق تعالیٰ کو معلوم تھا مگر عدم وقوع کے یقینی ہونے سے اس کا اختیاری ہونا منفی نہیں ہوا اور میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوانہیں دیا کرتا اور اگر دیتا بھی ہے تو مریض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مریض بچے گا نہیں اس کو دوا مت دو اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبرا دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں وہ اپنے قواعد ظنیہ سے اس مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے مگر یہ سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں وہ قدرت خدا تعالیٰ پر نظر کر کے امیدوار ہے۔

عقل در اسباب میدارد نظر   عشق میگوید مسبب رانگر

مگر حق تعالیٰ کو تو علم غیب ہے اگر ختم الله على قلوبهم سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے متعلق علم ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے خلاف ہے تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے کیونکہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جسمیں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع بھی ہے کہ ابوجہل وابوطالب وغیرہ ایمان کے مکلّف تھے اگر وہ ایمان کے مکلّف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ نازل فرما دیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے ساتھ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلّف وہ بھی تھے اس سے مستثنیٰ نہ تھے اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ نازل ہوا ان کا مرض روحانی لاعلاج نہ تھا اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کبھی لاعلاج نہیں۔

کلام اللہ میں صیغہ واحد اور جمع کے استعمال کی حکمت

فرمایا کلام اللہ میں کہیں صیغہ واحد متکلم کا ہے کہیں جمع کا مثلاً اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ میں واحد متکلم ہے وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ میں جمع متکلم ہے غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس مقام پر رحمت اور شفقت کا مضمون ہے وہاں واحد متکلم کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں تکمیل دین کا ذکر تھا جو سراسر نعمت ہے اس لئے اکملت فرمایا اور جہاں شان جلال واستغناء عظمت کا بیان ہے وہاں جمع کا صیغہ آیا ہے کہ تم نے ایسا کیا ہم ایسا کریں گے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ

ترجمہ: اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو بھی کہنیوں سمیت اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو اور دھوؤ اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت۔

تفسیری نکات

نحوی قاعدہ سے ایک اشکال کا جواب

بعض اشکالات کا جواب نحوی قاعدہ سے دیا جاتا ہے چنانچہ میرے پاس ایک ملاجی آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں پاؤں دھونا جو فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے قرآن میں تو پیروں کے واسطے مسح کا حکم ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں کہاں ہے۔ کہنے لگے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ مترجم قرآن میرے پاس لائے اور آیت دکھائی۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ

ترجمہ: یہ لکھا ہوا تھا پس دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو دو ٹخنوں تک شاہ صاحب نے یہاں فعل مقدر کو ظاہر نہ کیا تھا اور مسح کا ترجمہ محاورہ کے موافق کر دیا ورنہ بعضے تراجم میں تقدیر فعل کو ظاہر کر کے اس طرح ترجمہ کیا ہے اور دھوؤ اپنے پیروں کو دو ٹخنوں تک اور بعض ترجموں میں مسح کا ترجمہ مسح ہی سے کیا ہے اس طرح کہ مسح کرو اپنے سروں کا تو اس میں لفظ کو نہیں آیا۔ اس ترجمہ پر کچھ

اشکال نہیں ہو سکتا مگر شاہ صاحب کے ترجمہ میں ملاجی کو یہ شبہ ہوا کہ پیروں کے لئے بھی مسح کا حکم ہے میں بہت پریشان ہوا کہ اس اشکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ٹھہرا اگر میں ان کو نحوی قاعدہ سے جواب دوں تو اس کے یہ معنی ہیں ان کے سامنے عطف اور تقدیر کی تحقیق بیان کروں جس کو یہ سمجھ ہی نہیں سکتے آخر میں نے ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے بولے کہ علماء کے کہنے سے معلوم ہوا میں نے کہا افسوس یا تو علماء اتنے ایمان دار ہیں کہ وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہہ دیں تو سچے اور یا اتنے بے ایمان ہیں کہ اگر وہ ایک فعل کو مرض کہیں تو جھوٹے اس پر چپ ہوئے میں نے کہا خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھا ایسوں کو ترجمہ دیکھنا بیشک ناجائز ہے۔

اسی طرح بہت سے اشکالات ہیں جن کے جواب علوم الیہ پر موقوف ہیں اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عوام کو ترجمہ خود نہ دیکھنا چاہئے۔ بلکہ اگر شوق ہو تو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہئے غرض اس اشکال کا جواب یہ تھا کہ یہاں ارجلکم کا عطف وجوھکم پر ہے خیر یہ اشکال تو کچھ نہیں بڑا اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قراءت متواترہ میں وارجلکم بالجر بھی آیا ہے اور اس صورت میں بظاہر اس کا عطف رؤسکم کے اوپر اور فامسحوا کے تحت میں ہے اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس میں جر جوار ہے ورنہ حقیقت میں اس کا عطف فاغسلوا کے تحت میں ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عطف فامسحوا کے تحت میں ہے جب بھی پیروں کے لئے مسح کا حکم لازم نہیں آتا کیونکہ محاورات میں بعض دفعہ دو ایسی چیزوں کو جن کے ساتھ دو فعل متعلق ہوتے ہیں اختصار کے لئے ایک ہی فعل کے تحت میں بیان کر دیتے ہیں۔

مثلاً دعوت کے موقعہ پر کہا کرتے ہیں کہ کچھ دانا پانی ہمارے یہاں بھی کھا لیجئے گا حالانکہ پانی تو پینے کی چیز ہے کھانے کی چیز نہیں اصل کلام اس طرح تھا کچھ دانا کھا لیجئے گا پانی پی لیجئے گا مگر اختصار کیلئے ایک فعل کو حذف کر کے دونوں چیزوں کو ایک فعل کے تحت میں ذکر کر دیتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی پوچھے کہ تم نے دعوت میں کیا کھایا تھا' تو جواب میں کہا کرتے ہیں پلاؤ زردہ دودھ' دہی' گوشت کھایا تھا حالانکہ دودھ پینے کی چیز ہے یوں کہنا چاہئے تھا کہ دودھ پیا تھا باقی چیزیں کھائی تھیں جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھو ارجلکم کا عطف اگر فامسحوا کے تحت میں بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ پیروں کے لئے مسح کا حکم ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ رؤس' وارجل کا تعلق اصل میں دو فعلوں سے تھا مجازاً ایک فعل کو حذف کر دیا گیا اور ظاہر میں دونوں کو فامسحوا کے متعلق کر دیا گیا اور مطلب وہی ہے کہ سر کا مسح کرو اور پیروں کو دھوؤ عربی میں اس کی نظیر یہ کلام ہے علفته تبنا وماء باردا ۔اور اگر وامسحوا کے حکم کو بھی ارجلکم کے متعلق مان لیا جائے تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو قراءتیں بمنزلہ

دو آیتوں کے ہوا کرتی ہیں جس طرح دو آیتیں اپنے اپنے حکم کو مستقلاً ثابت کرتی ہیں اور دونوں پر عمل ضروری ہے اسی طرح دو قراءتیں بھی معمول بہا ہوتی ہیں پس ارجلکم میں قراءت بالجر ہونے سے معلوم ہوا کہ پیروں کے لئے مسح کا بھی حکم ہے۔

رہا یہ کہ غسل کا حکم نہیں ہے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کیونکہ قراءت نصب غسل کو لازم کر رہی ہے تو مجموع قراءتیں سے یہ ثابت ہوا کہ پیروں کے لئے مسح اور غسل دونوں کا حکم ہے اس طرح کہ قراءت جر بحال لبس خف ہے اور قراءت نصب بحالت عدم خف ہے یہ تاویل بھی بہت عمدہ ہے۔

اور ایک توجیہ میرے ذہن میں ایک سوال کے وقت آئی۔ وہ یہ کہ مسح کے معنے ملنے ہیں خواہ بدوں غسل کے یا مع غسل کے پس دھونا تو ایک قراءت سے حدیث متواتر سے فرض ہوا اور ملنا قراءت جر سے مامور بہ ہوا بمعنی مستحب اس کی وجہ یہ ہے کہ پیروں کی کھال سخت ہوتی ہے تو عادۃً اکثر اس پر پانی بہانا کافی نہیں ہوتا ملنے سے پانی پہنچتا ہے چنانچہ فقہا نے اسی اہتمام کے لئے اس کو بھی مندوب کہا ہے کہ وضو کے قبل پاؤں کو تر کر لیا جاوے پھر آخر وضو میں دھویا جاوے غرض آپ نے معلوم کر لیا کہ نحو کی کس قدر ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات اسی سے رفع ہوتے ہیں۔

نکتہ در مسح ارجل

سوال: ایک مجتہد شیعہ میرے شناسا ہیں ایک دن وہ ایک آبشار کے کنارے پاؤں سکھلا رہے تھے تا کہ وضو کریں میرا ان سے ذرا مذاق بھی ہے میں نے مذاقیہ کہا کہ کیوں تمام دنیا سے الٹا وضو کرتے ہو سیدھے ہو جاؤ اس نے فوراً کھڑے ہو کر کہا کہ اس مسئلہ کو تم لوگوں نے نہیں سمجھا لو۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ الایہ پڑھ کر کہا کہ چار فرض ہیں دو کا دھونا فرض اور دو کا مسح کرنا فرض ہے اس کی تشریح تیمم کے مسئلہ نے کر دی جن کا دھونا فرض تھا وہ تیمم میں رہ گئے اور جن کا مسح فرض تھا وہ معاف کئے گئے اگر پاؤں کا دھونا فرض ہوتا تو تیمم میں معاف نہ ہوتے چونکہ سر کا مسح معاف ہے معلوم ہوا کہ پاؤں کا بھی مسح تھا جو سر کی طرح معاف ہو گیا انتہی کلامہ اس کی اس گفتگو کا مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا مذاق میں ٹلانا پڑا البتہ اس وقت سے ایک کھٹک سی دل میں ہے۔

جواب: یہ تو محض ایک نکتہ تھا جو خود موقوف ہے پاؤں کے ممسوح ہونے کے ثبوت پر پھر اس کے ثبوت پر پھر اس کے ثبوت کو اس نکتہ پر مبنی کرنا دور صریح ہے کیا اس استلزام کی کوئی دلیل ہے کہ ساقط ہونا مستلزم ہے ممسوحیت کو تعجب ہے ایسے صریح تحکم سے آپ متاثر ہو گئے۔ (ماخوذ بوادر النوادر)

اختلاف قراءۃ

اگر ہم جر جوار کے بھی قائل نہ ہوں اور ارجل کے مسح ہی کو مان لیں تب بھی اس کا غیر مغسول ہونا لازم نہیں آتا بلکہ احتمال ہے کہ یہ وہ مسح ہو جو عین غسل کے وقت کیا جاوے یعنی دلک بوجہ اس کے کہ پاؤں کی جلد سخت ہوتی ہے اس لئے غسل کے ساتھ کہ مفہوم ہے ایک قراءۃ کا دلک کا حکم کہ مفہوم ہے دوسری قراءت کا فرمایا ہو (ماخوذ بوادر النوادر)

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى
ترجمہ: عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

کفار و مشرکین سے بھی عدل کا حکم

کفار کو نوکر رکھنا یا انکی نوکری کرنا یا انکو قرض دینا یا ان سے قرض لینا قال اللہ تعالیٰ لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے کفار کی یہاں مزدوری کرنا ثابت ہے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار سے قرض لینا اور مثلاً مظلوم کی دادرسی کہ یہ نہ صرف مباح ہے بلکہ مستحسن اور واجب اور ضروری ہے قال اللہ تعالیٰ واذا قلتم فاعدلوا الخ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان کو ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا اور مثلاً احسان کا بدلا احسان کے ساتھ دینا قال تعالیٰ ھل جزاء الاحسان الخ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کافر لونڈی سے پانی لیا تھا تو اسکو کھجوریں دیں اور اس کے تمام گانوں کو قتال سے چھوڑ دیا حالانکہ اس لونڈی کا کچھ احسان بھی نہ ہوا تھا حضور کے اعجاز سے پانی اس کا اتنا ہی رہا تھا اسی جنس سے نرم گفتاری بھی ہے قال تعالی ولو کنت فظا غلیظ القلب الخ اسلام میں جس قدر اسکی تعلیم ہے دنیا پر آشکارا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگ کیسے کیسے برے لفظ کہتے تھے ان تتبعون الا رجلا الخ مگر کبھی حضور ﷺ نے برے لفظ کے جواب میں برا لفظ نہیں کہا غایت سے غایت یہ لفظ تھا لا حجۃ بیننا الخ غرض نرم برتاؤ کے قسم اول کے سب مراتب محمود ہیں۔ الا آنکہ مقتضی الی الشر ہو جاویں مثلاً کفار سے امداد لینا جبکہ اپنی توہین یا توہین اسلام کی موجب ہو جیسے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جب غزوہ تبوک سے رہ گئے اور حضور ﷺ نے ان سے بولنے چالنے کو منع فرما دیا تو شاہ غسان نے ان کے پاس رقعہ بھیجا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے، کہ تمہارے صاحب نے (ﷺ) تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا

ہے اور تمہاری قدر نہیں جانی آپ یہاں آ جایئے آپ کی قدر افزائی کی جائے گی تو انہوں نے اس رقعہ کو تنور میں جھونک دیا یا مثلاً کفار کا احسان لینے میں اندیشہ ہوا کہ ان کے ساتھ بھی بے موقعہ شرکت کرنا پڑے گی مثلاً وہ کسی مدرسہ یا مسجد کے چندہ میں شریک ہونا چاہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی ان کے مندر میں شریک ہونا پڑے گا تو یہ عمل درست نہیں جیسے ایک مرتبہ ہندو مسلمانوں میں اتفاق کی ہوا چلی تھی کہ ہندو تعزیہ داری میں شریک ہوئے اور مسلمان ہولی میں یہ سب قصور فہم ہے اور **ولا تعاونو علی الاثم والعدوان** کے خلاف ہے اور **من کثر سواد قوم فھو منھم** کا مصداق ہے یا کفار سے بے موقعہ نرم بولنا جیسے بروقت مناظرہ ضرورت سے زیادہ نرمی اختیار کی جائے جس کا انجام خود بھی ذلیل ہونا اور دین کو بھی ذلیل کرنا ہے ایسے ہی موقعہ کے لئے وارد ہے **واغلظ علیھم** حضور ﷺ نے باجود رحمت مجسم ہونے کے مرتدین عرنیین کو یہ سزا دی کہ ان کو ہاتھ پیر کٹوا کر اور آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا دیں کہ آنکھیں پھوٹ گئیں اور ان کو گرم زمین پر ڈلوا دیا یہاں تک کہ مر گئے کیونکہ انہوں نے چرواہوں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔

نکوئی بابدان کردن چنان است که بد کردن بجائے نیک مرداں

اور قسم دوم یعنی زائد از ضرورت کفار کی طرف میلان کے بھی چند مراتب یہ ہیں مثلاً تشبہ بالکفار ان کے رسوم قبیحہ میں شرکت بیجا خوشامد متعصب کفار کی چاپلوسی اور ابلہ فریبیوں میں آ جانا کہ **من تشبہ بقوم فھو منھم** اور **من کثر سواد قوم فھو منھم** اور **ھا انتم ھؤلاء تحبونھم ولا یحبونکم** اور **فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشی ان تصیبنا دائرۃ** ان کے بارہ میں وارد ہیں یہ سب قبیح اور ممنوع ہیں حال آنکہ کوئی ضرورت شدید یا اکراہ داعی ہو تو مجبوری ہے۔ اختیار اور ارادہ سے اور ان افعال کو جائز سمجھ کر کرنا کسی حالت میں درست نہیں الغرض حسن خلق اور چیز ہے اور مودۃ و محبت اور تولی اور حسن خلق کی نسبت وارد ہے **وانک لعلی خلق عظیم** اور مودۃ اور تولی کی نسبت وارد ہے **لایتخذون المؤمنون اولیاء من دون المومنین ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شئی الا ان تتقوا منھم تقۃ ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظلمین** حسن خلق کفار کے ساتھ مندوب و مستحسن ہے اور مودہ و محبت ممنوع اور مذموم ہندوؤں سے ملنا اور مزاج پرسی وغیرہ کرنا جیسے حضرت والا نے کیا حسن خلق ہے اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا اور ان سے نفرت ظاہر کرنا سوء خلق اور تکبر بلکہ تصنع ہے کہ درحقیقت تو مقصود ان کو اور راغب کرنا اور ان پر اپنا اثر بٹھانا ہے اور صورت بے نیازی سے کیسے اختیار کی جاتی ہے اور اگر کوئی ہندو کوئی رقم دینے لگے تو انکار نہ ہو اور سو حیلوں سے اس کو جائز کر لیا جاوے۔

عارف کو حقیقت پر نظر چاہئے نہ کہ صورت پر مکانوں پر بلانے کی صورت تو تبرک تھی مگر حقیقت صرف پابندی رسم

۴- ہر ایک ہدیہ یہی لے لینا سنت نہیں جو ہدیہ کسی دینی و دنیاوی خرابی کو مستلزم نہ ہو اس کا قبول کرنا سنت ہے دینی خرابی جیسے طمع حرام وحلال میں تمیز کرنا حق پوشی میں مبتلا ہونا وغیرہ اور دنیاوی جیسے نظروں میں ذلیل ہونا وغیرہ ایسے ہی ہدیہ کی نسبت عارف شیرازی کا قول ہے

مابروے صبر و قناعت نمے بریم   بابادشہ بگوے کہ روزی مقدار است

ہدیہ کے شرائط حضرت والا کے مواعظ میں بارہا ذکر ہوئے ہیں۔

(۵) دعا مانگنا ہر حاجت کے لئے مندوب و مستحسن ہے ایک شخص نے مدتوں ایک حاجت کے لئے دعا مانگی حالانکہ کبھی وہ حاجت پوری نہیں ہوئی کسی نے کہا کہ جب مدت گزر گئی اور حاجت پوری نہیں ہوئی تو معلوم ہوتا ہے کہ منظور خدا نہیں ہے کہ وہ حاجت پوری ہو پھر دعا سے کیا فائدہ بلکہ گونہ گستاخی ہے اگر دینا ہوتا تو اب تک دیدی ہوتی اور جب نہیں دی تو اب دعا مانگنا مجبور کرنا ہے اور یہ گستاخی ہے اس نے کہا میرا کام یہی ہے کہ میں مانگوں دینا نہ دینا ان کا کام ہے میں اپنے کام کا ذمہ دار ہوں ان کے کام کا ذمہ دار نہیں اگر وہ کام میرا ہو جاتا تو مانگنا ختم ہو جاتا اور جب وہ کام نہیں ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھے منگوانا ہی منظور ہے مجھے اسی میں حظ آتا ہے کہ جو کام مجھ سے وہ چاہیں وہ مجھ سے ہوتا ہے اور وہ مجھے تڑپا دیں میں تڑپتا رہوں۔

بوقت ذبح اپنا اپنا انکے زیر پائے ہے   کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

خدا کرے کہ مزا انتظار کا نہ مٹے   مرے سوال کا دیں وہ جواب برسوں میں

تڑپ میں اس سے زیادہ حظ حاصل ہے جو اس کام کے پورا ہونے میں ہوتا ہے

جو مزا انتظار میں دیکھا   پھر وہ وصل یار میں دیکھا

اور حدیث میں وعدہ ہے کہ جس دعا کی قبولیت ظاہر نہیں ہوتی وہ ذخیرہ ہو جاتا ہے آخرت کے لئے تو فانی کی جگہ باقی کے ملنے کی ان شاء اللہ تعالیٰ امید ہے جس کو حاجت کی طرف سے اطمینان بھی ہو اس کو بھی دعا مانگنی چاہئے۔ ثواب مفت ہاتھ آتا ہے۔ (مجالس الحکمت صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۷)

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴿۱۵﴾

ترجمہ: تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح (یعنی قرآن مجید)

تفسیری نکات

دو نعمتیں

یہ ایک مختصر سی آیت ہے اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی دو نعمتوں کا عطا فرمانا اور ان دونوں نعمتوں پر اپنا احسان ظاہر فرمانا بیان فرمایا ہے ان دونوں نعمتوں میں ایک تو حضور ﷺ کا وجود با جود ہے اور دوسری نعمت قرآن مجید کا نزول ہے۔ ایک کو لفظ نور سے ذکر فرمایا ہے اور دوسرے کو کتاب کے عنوان سے ارشاد فرمایا ہے اور یہ توجیہ اس آیت کی ایک تفسیر کی بناء پر ہے یعنی جب کہ نور سے حضور ﷺ کا وجود با جود مراد لیا جائے اور اگر دوسری تفسیر اختیار کی جاوے یعنی نور اور کتاب دونوں سے قرآن مجید ہی مراد لیا جاوے تو توجیہ بدل جاوے گی اور اس صورت میں عطف کتاب کا نور پر باوجود اتحاد ذات کے تغائر حیثیت وصفت کے اعتبار سے ہوگا کہ ایسی کتاب عطا فرمائی کہ اس میں ایک صفت نوریت کی ہے اور دوسری صفت کتابیت کی ہے اور اس توجیہ کی بناء پر بھی وہ تعداد نعمت فوت نہ ہوگی یعنی وہ دو نعمتیں اب بھی رہیں گی لیکن ایک پر دلالت مطابقی ہوگی اور دوسری پر دلالت التزامی، یعنی قرآن پر تو دلالت مطابقی ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور چونکہ قرآن کا نزول حضور ﷺ پر ہوا اور حضور ﷺ کی برکت سے ہم کو یہ نعمت عطا ہوئی ہے اس لئے بہر حال دونوں بطریق مطابقت مذکور ہوں یا ایک بطریق مطابق اور دوسری بطریق لزوم، مگر ہر حال میں اس آیت میں دو نعمتوں کا ذکر ہے۔ الفاظ دانی کا نام علم ہوتا تو وہ معاصی کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا بلکہ کفر کے ساتھ بھی ورنہ بیروت اور جرمن میں عیسائی عرب کے ادیب کیسے ہوتے۔ ان کا حافظہ بھی قوی ہے ذہن بھی تیز ہے۔

حقیقت علم

حقیقت میں علم کی حقیقت نور ہے جس کی نسبت قرآن میں ہے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴿۱۵﴾ ان کو روح بھی فرمایا وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ بس حقیقت میں یہی چیز علم ہے امام ابو حنیفہؒ نے کتابیں زیادہ نہیں پڑھی تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے قلب میں ایک نور بخشا تھا کہ جس چیز کو بیان فرماتے تھے بالکل صحیح فرماتے تھے۔ اور اب کسی کو کتنا ہی متبحر ہو جاوے مگر وہ علم نصیب نہیں جو امام صاحب کو حاصل تھا اس حالت میں اگر کوئی کہنے لگے

کہ میں ابو حنیفہؒ سے علم میں زیادہ ہوں تو وہ جاہل ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صراط مستقیم بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور اور کتاب آئی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضامندی کا اتباع کرتے ہیں سلامتی کے راستے بتلاتے ہیں اور اپنی مشیت سے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتے اور سیدھے راستے کی ہدایت کرتے ہیں۔

نور سے کیا مراد ہے

اس آیت کی دو تفسیریں ہیں جن کی طرف پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے اس میں بعض نے نور سے بھی قرآن ہی مراد لیا ہے اور ان کے پاس وجہ ترجیح یہ ہے کہ آگے يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ میں ضمیر واحد ہے اگر نور سے مراد حضور اور کتاب سے مراد قرآن ہوتو یھدی بھما اللہ بصیغہ تثنیہ ہوتا گو دوسرے حضرات یہ جواب دے سکتے ہیں کہ چونکہ حضور ﷺ اور قرآن باہم متلازم ہیں اس لئے ان میں سے ایک کی ضمیر میں لزوماً دوسرے کا ذکر بھی ہو گیا۔ دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ نور سے حضور ﷺ مراد ہیں ان کی وجہ ترجیح یہ ہے کہ یہاں نور کی طرف جاء کی اسناد کی گئی ہے اور اصل میں یہ ہے کہ مجی کی اسناد ذوی العقول کی طرف ہو چنانچہ اسی بناء پر دوسری ایک آیت ہے يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا سے مراد رسول ﷺ ہیں اور نور سے مراد قرآن ہے کیونکہ انزال کی اسناد میں اصل یہ ہے کہ کتاب کی طرف ہو اور اس سے معلوم ہوا کہ نور قرآن کی بھی صفت ہے اور حضور کی بھی اسی طرح برہان قرآن کی بھی صفت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی بھی بہر حال یہ وجوہ ترجیحات ہیں ہر قول کی گو ان میں یہ احتمال باقی ہے کہ بعض جگہ اسناد مجی قرآن کی طرف ہے۔ جیسے قد جاء کم الحق من ربکم میں اور بعض جگہ انزال کی اسناد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے جیسے قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ میں اور اس کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ اسناد مجازی ہے اور اصل وہی ہے کہ اسناد مجی کی حضور کی طرف ہو اور اسناد انزال کی قرآن کی طرف اب اس اصل کو کسی قرینہ صارفہ کی وجہ سے چھوڑا جا سکتا ہے جو اس جگہ موجود نہیں تو گو تفسیریں سب صحیح ہیں مگر جی یہ چاہتا ہے کہ نور سے مراد حضور ﷺ ہوں لیکن میں اس پر زور نہیں دیتا کیونکہ ہر قول کی طرف مفسرین کی ایک جماعت ہے اور ہر ایک کے پاس وجوہ ترجیح ہیں مگر اس جگہ میرے ذوق میں ترجیح ان حضرات کے قول کو ہے جو نور سے حضور کو مراد لیتے ہیں مگر اس پر زور دینے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ہمارا مطلب ہر طرح حاصل ہے خواہ حضور نور کے مصداق ہوں یا قرآن ہر ایک کا نور ہونا دوسرے

کے نور ہونے کو مستلزم ہے میں پھر وہی کہوں گا۔

بخت اگر مدد کنا دامنش آورم بکف　　گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اور یوں کہوں گا۔

عبار اتنا شتی و حسنک واحد　　وکل الی ذاک الجمال یشیر

اور جب حضور بھی نور ہیں اور قرآن بھی نور ہے تو اب ہمارے پاس نور علی نور ہے جیسا کہا گیا ہے۔

نبی خود نور اور قرآن ملا نور　　نہ ہو پھر مل کے کیوں نور علی نور

اس حالت میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو حضور سے محبت زیادہ ہے یا قرآن سے ہر اک کی محبت دیکھو اپنی طرف کھینچتی ہے ہم کو تو حضور علیہ ﷺ سے بھی تعلق محبت ہے اور قرآن سے بھی وہ اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ اپنی طرف بس ہمارا تو وہ حال ہے کہ لعل سے کسی نے پوچھا کہ تو اپنے کو چاہتا ہے یا آفتاب کو کہا کچھ نہ پوچھو اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اپنے سے محبت ہے تو وہ بھی آفتاب ہی کی محبت ہے کیونکہ میرے اندر جو کچھ نور اور رونق ہے سب اس کی بدولت ہے اور اگر کہوں کہ آفتاب سے محبت ہے تو یہ بھی اپنے ہی ساتھ محبت ہے کیونکہ آفتاب سے اسی لئے محبت ہے کہ اس نے مجھ کو لعل بنایا تو وہ اپنی ہی محبت ہوئی تو بعض جگہ دونوں طرف سے تلازم ہوتا ہے وہاں ہر ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے اس پر کسی عاشق کا شعر یاد آتا ہے واقعی تلازم محبتیں کو خوب ہی ظاہر کیا۔

قاصد رسید و نامہ رسید و خبر رسید　　در حیرتم کہ جاں بکدامی کنم نثار

ہائے قاصد بھی محبوب کا ہے اور نامہ بھی محبوب کا ہے اب کیا کہیں کہ کسی سے مسرت زیادہ ہے یہی حال یہاں ہے حضور علیہ ﷺ قاصد ہیں اور قرآن نامہ حق ہے ہر ایک اپنی طرف دل کو کھینچ رہے ہیں بس یوں کہنا چاہئے کہ ہمارے لئے ہر ایک میں دوسرا موجود ہے حضور نہ ہوتے تو ہم کو قرآن کیسے ملتا اور قرآن ملنے والا نہ ہوتا تو حضور کیوں تشریف لاتے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں دونوں شانیں موجود ہیں قرآن میں حضور کی بھی شان ہے یعنی نور کی اور حضور میں قرآن کی شان موجود ہے یعنی کتاب مبین کی شاید تم کہو کہ حضور میں کتاب کی شان کیونکر ہے میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ حضرت علیؓ تو ہر انسان کے متعلق فرماتے ہیں۔

دوائک فیک و ما تشعر　　ودائک منک وامـا تبصر

وانت الکتاب المبین الذی　　با حرفه یظهر المضمر

وتزعم انک جرم صغیره　　وفیک الطوی العالم الاکبر

سو حضرت علیؓ تو ہر شخص کی نسبت فرماتے ہیں کہ تم کتاب مبین ہو کیونکہ انسان مظہر اتم ہے الٰہیات کا اور ملکوت کا اس میں ہر شے کی نظیر موجود ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَٰقَوْمِ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَءَاتَىٰكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب پیدا کئے تم میں نبی اور کر دیا تم کو بادشاہ اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں۔

تفسیری نکات

ارشاد فرمایا کہ جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو فرماتے ہیں کہ جَعَلَ فِيكُمْ أَنۢبِيَآءَ اور اس کے آگے فرماتے ہیں وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا یعنی ملوک تو سب کو فرمایا اور انبیاء میں فیکم فرمایا کہ انبیاء بعض ہیں اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت تو بعض افراد کے ساتھ خاص ہوتی ہے مگر سلطنت جس قوم کی ہوتی ہے اس کا ہر فرد عرفاً صاحب سلطنت سمجھا جاتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱبْتَغُوٓا۟ إِلَيْهِ ٱلْوَسِيلَةَ وَجَٰهِدُوا۟ فِى سَبِيلِهِۦ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ضرورت شیخ نص کی روشنی میں

فرمایا کہ لوگ شیخ طریقت کی ضرورت میں یہ آیت پیش کیا کرتے ہیں وابتغوا الیه الوسیلة حالانکہ اس میں شیخ مراد نہیں بلکہ اعمال صالحہ مراد ہیں البتہ ضرورت شیخ دوسری آیت سے ثابت ہو سکتی ہے واتبع سبیل من اناب الی الایته اور یہ جو مشہور ہے (۲) الشیخ فی قومه النبی فی امته (شیخ اپنی قوم میں ایسا ہے جیسا نبی اپنی امت میں) اس سے مراد شیخ طریقت نہیں بلکہ بوڑھا آدمی مراد ہے۔ کیونکہ یہ مقولہ حدیث کہا جاتا ہے اور اس زمانہ میں شیخ کا لفظ شیخ طریقت کے معنی میں قطعاً استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ حرف بالکل مستحدث ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت جلد نمبر ۱۴ ص ۳۷-۳۸)

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

ترجمہ: اور ہم نے ان میں باہم قیامت تک عداوت اور بغض ڈال دیا۔

تفسیری نکات

اہل کتاب کے اتحاد کی غرض

اور اہل کتاب میں آج کل بظاہر بہت اتحاد اور اتفاق دیکھا جاتا ہے اس واقعہ کی تکذیب تو ہو نہیں سکتی تو اس سے اس آیات میں شبہ ہو سکتا ہے جواب یہ ہے کہ اس سے اوپر یہود کا ذکر ہے تو اول تو جب تک ان میں اتحاد ثابت نہ کیا جائے آیت کے مضمون پر کوئی شبہ نہیں دوسرے اگر اس کے قبل اہل کتاب کا ذکر ہونے کی وجہ سے مطلق اہل کتاب کی طرف بھی ضمیر کو راجع کیا جائے تو جواب یہ ہے کہ اس عداوت سے مراد مذہبی عداوت ہے اور اب جن لوگوں میں اتحاد دیکھا جاتا ہے وہ مذہب سے بالکل علیحدہ ہیں۔ ان میں جو اتحاد ہے وہ اغراض دینوی ہی میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٦٧﴾

ترجمہ: اے رسول پہنچا دے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ تجھ کو بچا لے گا لوگوں سے بیشک اللہ راستہ نہیں دکھلاتا قوم کفار کو۔

تفسیری نکات

عجیب و غریب ربط

پھر چونکہ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ فرمانے سے آپ کو غایت حرص علی ایمان الکفار سے طمع ہو سکتی تھی کہ بس اب تو سب کافر مسلمان ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو میں ہر کافر کو قرآن سناؤں گا اور وہ بھی آپ کی زبان سے بھلا کون کافر ہے۔ مگر ایسا ہونا مقدر نہیں تھا اس لئے آگے تسلی کے لئے فرماتے ہیں إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٦٧﴾ کہ سب کے اسلام کی طمع نہ کیجئے بعضوں کو حق تعالیٰ ہدایت نہ کریں گے اس اخیر جملہ کا یہ ربط ہے ماقبل سے جو شاید بہت لوگوں کے ذہن میں نہ آیا ہو۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ: نہیں ہے مسیح مریم کا بیٹا مگر رسول گذر چکے اس سے پہلے بہت رسول اور اس کی ماں ولی ہے دونوں کھاتے تھے کھانا دیکھ ہم کیسے بتلاتے ہیں ان کو دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں الٹے جارہے ہیں۔

تفسیری نکات

اسی لئے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کی نسبت كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ فرمایا یتغوطان و یبولان نہیں فرمایا کیونکہ اکل و شرب ان کا جد امجد ہے جو بول و براز کرے گا وہ پہلے کھائے پئے گا بھی ضرور تو اکل و شراب ہی سبب ہے بول و براز کا اس لئے حق تعالیٰ نے سبب کو بیان فرمادیا کہ اس سے مسبب پر خود دلالت ہو جائے گی صریح نہ فرمانا اس وجہ سے ہے کہ قرآن میں تہذیب کی بہت رعایت کی گئی ہے اسی لئے بول و براز کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ سبب کے ذکر سے اسی پر دلالت کردی گئی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جنت میں تو اکل کو بول براز سے مفارقت ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ یہ نہیں کہ اکل بول و براز سے مفارق نہیں بلکہ دعوی یہ کہ بول و براز اکل سے مفارق نہیں دوسرے یہاں گفتگو اکل و شرب فی الدنیا میں ہے اور دنیا میں طرفین سے تلازم ہے اور یہاں عیسیٰ و مریم علیہما السلام کے متعلق دنیا ہی میں اکل طعام کا ذکر ہے پس اس بول و براز پر کنایہ صحیح ہے علاوہ ازیں یہ کہ اگر اس طعام کے بعد بول و براز دنیا میں بھی نہ ہوتا جب بھی اکل و شرب صفات نقص ہے تو اس لئے ہے کہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند تا تو نانے بکف آری بہ غفلت نہ خوری

یعنی اس میں احتیاج سب سے زیادہ ہے۔ سارے عالم کو چکر لگنے کے بعد انسان کی غذا حاصل ہوتی ہے دوسرے جیسا اوپر مذکور ہوا تو شہادت حالیہ اس کے ادون ہونے پر دال رہی ہے کہ انسان اس کو خود حقیر سمجھتا ہے اور دوسروں کے سامنے کھانے پینے سے ایسا شرماتا ہے گویا کوئی عیب کا کام کر رہا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

ترجمہ: ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم کو فلاح ہو شیطان کی جوئے اور شراب سے یہ غرض ہے کہ آپس میں دشمنی ڈال دے اور ذکر اللہ سے اور نماز سے روک دے حق تعالیٰ نے اس آیت میں جوئے اور شراب کے دو نقصان بتلائے ہیں ایک یہ ہے کہ شیطان اس کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں نفاق ڈال دے گا دوسرے یہ کہ خدائے تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے روک دے گا۔ سو اب بھی باز نہ آ ؤ گے۔

تفسیری نکات

ایک غلطی کا ازالہ

یہ ایک آیۃ ہے لیکن جملہ خاص اس کے پہلے جزو کی تفسیر کرنا اور جس بارے میں یہ جزو آیت ہے خصوصیت سے اسی کو بیان کرنا مقصود ہے اور مجھ کو اس سے ایک غلطی کے رفع کا استنباط کرنا منظور ہے جس کو میں عرض کروں گا اول بطور تمہید کے اس جزو آیت کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسول ﷺ سے لوگوں نے خمر اور قمار کا حکم پوچھا تھا اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے ان میں منافع بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے بعض مفسرین نے کہا کہ یہ آیات تحریم خمر و میسر سے پہلے کی ہے اور اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن لفظوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ تسامح ہوا ہے اس لئے کہ باوجود لفظ اثم کبیر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا پس بظاہر یہ آیت بھی تحریم کے بعد ہی کی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے بعد والی آیات يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ الخ (یعنی اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں) اس کی زیادہ تاکید ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیۃ کو سن کر بعض لوگوں نے لفظ منافع پر نظر کر کے شراب کے

ترک میں سستی کی ہو اور فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں) میں کچھ تاویل کرلی ہو مثلاً یہ کہ ان کو خود اثم نہیں فرمایا بلکہ متضمن اثم فرمایا ہے اس طرح سے کہ کبھی یہ مفضی الی المعاصی ہو جاتے ہیں تو جب ایسا انتظام کرلیا جائے کہ یہ احتمال نہ رہے تو جائز ہوگا جیسے فتیح لغیرہ کی شان ہوتی ہے مگر یہ تاویل بہت بعید ہے اس لئے نہایت شدومد سے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا الخ نازل ہوئی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے قبل تحریم نہیں ہوئی تھی اور منافع للناس سے جواز پر تمسک نہیں ہوسکتا اس لئے کہ کسی محرم شے میں منافع کے وجود سے اس کی اباحت پر استدلال نہیں ہوسکتا بلکہ منافع کا ذکر منشاء شبہ کو رفع کرنے کے واسطے ہے یعنی اگرچہ ان دونوں میں منافع بھی ہیں چنانچہ خمر میں قوۃ عریزیہ اور میسر میں تکثیر مال بہ سہولت لیکن مفاسد ان کے منافع سے زیادہ ہیں اس لئے حرام ہیں۔ یہ حاصل ہے۔

دور حاضر کی رسومات کا حال

صاف ظاہر ہے کہ عداوۃ اور بغضاء اور نماز اور ذکر اللہ سے غافل کرنے کے لئے یہ دونوں چیزیں آلہ ہیں اور آلہ اور علت ایک ہی چیز ہیں اسی واسطے اس کی شرح میں فرماتے ہیں جناب رسول ﷺ کل ما الھاک عن ذکر اللہ فھو میسر یعنی جو چیز تجھ کو ذکر اللہ سے غافل کرے وہ سب جوا ہے۔ ظاہر ہے کہ لفظ میں تو اس کو جوا نہیں کہتے حدیث میں جو اس کو فرمایا گیا وہ باشتراک علت ہے اس میں تصریح ہوگئی کہ نھی عن الخمر و المیسر کی علت الہاء عن ذکر اللہ ہے۔

پس جہاں الہاء عن ذکر اللہ پایا جاوے گا وہ سب حکماً خمر اور میسر ہوگا اب اس سے اپنی رسموں کا حکم نکال لیجئے۔

حدیث کے الفاظ صاف کہتے ہیں کہ ان کا حکم بھی شراب اور جوئے کا سا ہے کیونکہ نماز سے غافل ہونے کا سبب ہوگئیں اگر اور دلیلوں سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو یہ دلیل میں نے ایسی پیش کی ہے کہ اس کے سامنے کسی دلیل کی حاجت نہیں اور اس کا جواب آپ کچھ بھی نہیں دے سکتے جب چاہے مشاہدہ کرلیجئے کہ جہاں یہ رسمیں روا ہوتی ہیں وہاں نماز کی گت نہیں ہوتی' تو بموجب ارشاد حضور ﷺ کے میسر یعنی جوئے کے حکم میں ہوئیں اور میسر کو قرآن شریف میں رجس اور عمل شیطان فرمایا گیا ہے تو میں نہیں کہتا بلکہ قرآن ان کو عمل شیطان کہتا ہے

پس اور دلیلوں کو جانے دیجئے یہی کیا کم خرابی ہے کہ اس کا نام عمل شیطان ہوا حکم شرعی تو یہی ہے جس کے لئے ایسی دلیل بتلائی گئی کہ موٹی سے موٹی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے لیکن سمجھے تو وہ جس کی طبیعت میں یہ کچھ کھٹکیں۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ: ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اُس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جبکہ وہ لوگ پرہیز رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

شان نزول آیت کا یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے شراب کو مسلمانوں پر حرام کر دیا تو بعض صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ہم میں جو لوگ تحریم سے پہلے شراب پیتے تھے مر گئے ہیں کہیں ان کو گناہ نہ ہوا ہو (یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس وقت تک شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی تو انہوں نے حرام کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا پھر صحابہ کو ان پر گناہ کا وہم کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو صحابہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت حرمت خمر کا نزول نہ ہوا تھا لیکن ممکن ہے ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ نا معلوم اس وقت تک جو شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ ہے کہ شراب اب تک واقع میں حلال تھی یا یہ سبب ہے کہ واقع میں تو وہ پہلے بھی حرام تھی لیکن چونکہ ہم لوگ اس کے عادی بہت زیادہ تھے تو دفعۃً اس کی تحریم اس وجہ سے نازل نہیں کی گئی کہ ہم اس پر عمل نہ کر سکیں گے پھر تدریجاً جب ہمارے اندر قابلیت عمل زیادہ ہوگئی اس وقت حکم تحریم نازل ہو گیا پس صورت اول میں جن لوگوں نے تحریم سے پہلے شراب پی تھی انہوں نے حلال ارتکاب کیا لیکن دوسری صورت میں حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے گو بوجہ نص نازل نہ ہونے کے ان کو گناہ نہ ہوا ہو لیکن شاید ان کے درجات میں کچھ کمی اس لئے ہوگئی کہ وہ حرام فی نفسہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں۔)

اس شبہ کا ازالہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کچھ گناہ نہیں ہے اس چیز میں جو انہوں نے) اب تک) کھایا پیا ہے (یعنی حکم تحریم سے پہلے شراب پینے میں تو ان پر کچھ گناہ

نہیں ہوا) جب کہ وہ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور نیک اعمال کرتے رہے ہوں پھر وہ تقوی کرتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور اخلاص سے کام لیتے رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ اہل اخلاص سے محبت رکھتے ہیں۔

اس جگہ اصل مقصود تو یہ بتلانا تھا کہ نزول تحریم سے پہلے جن لوگوں نے شراب پی ہے ان پر اس فعل کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا لیکن لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا سے چونکہ بظاہر گناہ کی نفی مطلقاً ہو رہی ہے اس لئے آگے قاعدہ کلیہ کے طور پر وہ شرائط بھی بیان فرما دیں جن کے اجتماع کے بعد گناہ کی نفی مطلقاً صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ اگر کسی شخص نے تحریم خمر سے پہلے شراب بھی پی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو یہ کہنا صحیح ہے کہ شراب کی وجہ سے اس کو گناہ نہیں ہوا لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو کچھ بھی گناہ نہیں ہوا پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جب وہ لوگ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں جن کی حرمت اس وقت نازل ہو چکی تھی نیز ان اعمال صالحہ کو بھی بجا لاتے رہے ہوں جن کا امر اس وقت نازل ہو چکا تھا تو پھر ان کو شراب پینے کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔

اب اس جگہ ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقوی اور ایمان کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے جب ان کو ایک بار مومن کہہ دیا گیا اور اس کے بعد تقوی سے ان کو موصوف کر دیا گیا تو پھر دوبار امنو و اتقوا کے ذکر سے کیا مقصود ہے یہ ایمان کے بعد ایمان لانا اور تقوی کے بعد پھر تقوی کرنا کیسا ہے تکرار ایمان کا جواب تو یہ ہے کہ ایمان کے مختلف مراتب ہیں ایک مرتبہ ایمان کا یہ ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کرے یہ درجہ تو ایمان کا وہ ہے جو صحت کے لئے شرط ہے کہ اس کے بغیر کوئی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا اور ایک مرتبہ ایمان کا وہ ہے جو اعمال صالحہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس کے دل میں پیوستہ اور جاگزین ہو جانا اور اس پر ثبات استقامت حاصل ہو جانا دوبارہ لفظ امنوا اس درجہ کی طرف اشارہ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایمان لا کر وہ اعمال صالحہ کرتے رہے اور محرمات سے بچتے رہے تو اس سے ان کو ایمان پر مداومت و استقامت حاصل ہوئی پھر اس کے بعد جیسے اعمال ہوتے ہیں ویسا ہی ایمان ان سے پیدا ہوتا ہے مطلق مداومت و ثبات علی الایمان کہ اعمال صالحہ کے ہمیشہ بجالانے سے ہر شخص کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس شخص کے اعمال ناقص ہیں ان سے جو ایمان پیدا ہو گا وہ بھی ناقص ہو گا اور جس کے اعمال کامل ہیں ان سے کامل ایمان پیدا ہو گا۔

تیسری مرتبہ ذکر ایمان سے اس درجہ کی طرف اشارہ ہے کہ بعد ثبات علی الایمان کے حسب اعمال ان سے ایمان میں ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے اس کے بعد پھر ایمان کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ احسان کا ذکر فرمایا جس کے معنی شریعت میں اخلاص کے ہیں اور یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اسی کو صدق سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور صدیق بھی

صاحب احسان ہی کو بولتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے بعد ترقی اعمال سے درجہ احسان کا عطا ہوتا ہے اور یہی درجہ ایمان کا مطلوب ہے اور جو شخص اس درجہ میں فائز ہوتا ہے وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے پھر اس کو کچھ عذاب اور گناہ نہیں ہوتا کیونکہ محبوب مطیع کو کوئی بھی عذاب نہیں دیا کرتا یہ جواب تو تکرار ایمان کے اشکال کا ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: اے ایمان والو لازم پکڑو اپنے نفسوں کو نہ نقصان پہنچا سکے گا تمہارا وہ شخص جو گمراہ ہے جبکہ تم نے ہدایت پائی اللہ تعالیٰ کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے پس اللہ تعالیٰ تم کو آگاہ کرے گا جو تم لوگ عمل کرتے ہو۔

تفسیری نکات

علوم کی دو قسمیں

ایک جملہ انشائیہ ہے اور دوسرا جملہ خبریہ جو کہ معنی انشائیہ ہے کیونکہ ہر جگہ خبر مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

حاصل یہ ہے کہ علوم دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ خود وہ علوم ہی مقصود بالذات ہیں جیسے عقائد مثلاً قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اور وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ آپ فرما دیجئے اللہ تعالیٰ ایک ہے وزن (اعمال کا تولا جانا) اس دن حق ہے اس میں تو خود خبر ہی مقصود ہوتی ہے کیونکہ ان کے متعلق کوئی عمل نہیں ہوتا دوسرے وہ علوم ہیں کہ خود وہ علم مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس علم سے عمل مقصود ہوتا ہے خواہ وہ امر ہو یا نہی ایسے مقام پر اگر خبریہ ہو تو وہ معنی انشاء ہوگا جس کی تعیین قرائن سے ہو جائے گی مثلاً اس مقام پر خدا تعالیٰ نے اول ایک جملہ ذکر فرمایا ہے اس کے بعد جملہ خبریہ ذکر فرمایا ہے جس سے مقصود اس امر کی تاکید ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ اس امر کی مخالفت نہ کرو پس معلوم ہوا کہ اعمال میں وہ خود مقصود نہیں ہوتی لہذا میں اس خبر سے تعرض نہیں کرتا بلکہ صرف دو مضمونوں کو لیتا ہوں ایک امر کو دوسرے نہی کو جو کہ جملہ خبریہ سے مقصود ہے یعنی لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ سے کیونکہ مقصود یہ ہے کہ تم دوسروں کی فکر میں نہ پڑو لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ **علیکم انفسکم** کے بیان کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ مسوق لہ الکلام صرف **لایضرکم** ہے لیکن جملہ **الی اللہ مرجعکم جمیعاً** کا زیادہ تعلق عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ سے ہے کیونکہ دوسروں کی فکر کرنا کچھ ایسا گناہ نہیں جس پر اس جملہ **الی اللہ مرجعکم** کو مرتب فرمایا جائے پس علیکم انفسکم کے ساتھ مرتبط ہے اور اس پر مرتب ہے اور اس ترتب سے

معلوم ہوتا ہے کہ علیکم بھی مقصود ہے کیونکہ حاصل اس کا یہ ہے کہ چونکہ تم کو خدا کے پاس جانا ہے اس لئے تم اپنی فکر کرو اور غفلت میں نہ پڑو اپنی اصلاح کرو۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ

ترجمہ: وہ وقت قابل یاد ہے جبکہ حواریین نے عرض کیا کہ اے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا نازل فرمائیں؟

آیت هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ کے ایک لطیف معنی

پوچھا گیا آیت هل يستطيع ربک ان ينزل علينا مائدة من السماء کے کیا معنی ہیں ظاہراً تو ثابت ہوتا ہے کہ حواریین خدا تعالیٰ کو اتنا بھی قادر نہ مانتے تھے کہ مائدہ کو اتارے اس سے تو ان کے ایمان میں بھی شبہ ہوتا ہے فرمایا اس کا بیان باقاعدہ تو یہ ہے کہ دو معنی ہیں ایک بمعنی قدرت جو قبل الفعل ہے۔ دوسرا استطاعت حقیقہ جو مع الفعل ہے جس کے بعد وجود فعل لازم آتا ہے یہاں مراد یہ دوسرے معنی ہیں یعنی ہر اہل ينزل ربک علينا مائدة اور اس مضمون کو عام فہم کرنے کے لئے مجھے یہ نیا محاورہ بہت کار آمد معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اوپر مائدہ اتار سکتا ہے یہ ایسا ہے جیسے آج کل کہتے ہیں کیا آپ میرے یہاں آ سکتے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۲ صفحہ ۲۵۳)

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

ترجمہ: عیسیٰ بن مریم نے دعا کی کہ اے اللہ اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمایئے کہ وہ ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اول ہیں اور جو بعد میں سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے اور آپ ہم کو عطا فرمایئے اور آپ سب عطا کرنیوالوں سے اچھے ہیں۔

تفسیری نکات

روح عید

اس آیات سے بعض نے عید میلاد النبی بھی استدلال کیا ہے مگر چونکہ اس کا جواب وعظ السرور میں بیان ہو چکا ہے اس لئے اس وقت اس کے متعلق بیان کرنا مقصود نہیں ہے اس وقت اس سے صرف یہ استنباط کرنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عید کو نزول مائدہ پر مرتب کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عید کا مقتضا ایک درجہ میں اقتران ہے عید اور نزول مائدہ کا' چنانچہ امت عیسیٰ علیہ السلام کو مائدہ کے نزول پر عید ملی پس اس امت کو عید عطا ہونے سے بھی باقتضائے مذکور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی ایک مائدہ ملا ہے جس کی ایک صورت ہے کھانا پینا خوشی کرنا اور ایک معنی ہے مشاہدہ' پس اس طرح سے یہ آیات دال ہے روح عید پر مگر بنی اسرائیل کے مائدہ میں اور ہمارے مائدہ میں یہ فرق ہے کہ ان کو محض مائدہ صوری ملا تھا جس میں احتمال ردونکس (لوٹنا ۱۲) کا تھا اور چونکہ ہمارا مائدہ مقرون ہے مائدہ معنوی کے ساتھ اس لئے اس میں کوئی ردونکس رجوع وسقوط وحور نہیں ہو سکتا' چنانچہ بنی اسرائیل کو اسی لئے ارشاد ہوا تھا قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ' کہ ہم مائدہ نازل تو کر دیں گے لیکن اس کے بعد جو کوئی ناشکری کرے گا اس کو ایسا سخت عذاب ہوگا کہ کبھی کسی کو نہ ہوا ہوگا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ناشکری کی اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے الحمد للہ ہم کو دو مائدے عطا ہوئے ایک جسمانی ایک روحانی' یا ایک صوری ایک معنوی یا ایک ظاہری ایک باطنی تا کہ اگر مائدہ جسمانی سے کم ناشکری کرنا چاہیں تو روحانی ہم کو سنبھالے رہے اور ناشکری نہ کرنے دے اور وہ روحانی مائدہ کیا چیز ہے وہ محبت و معرفت ہے حق تعالیٰ کی جس کا دوسرا عنوان مشاہدہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

سُوْرَةُ الْاَنْعَام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور جی بہلانا اور آخرت کا گھر بہتر ہے پرہیزگاروں کے لئے کیا تم نہیں سمجھتے۔

تفسیری نکات

لہو اور لعب کا مفہوم

یہاں حق تعالیٰ نے دنیا کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں ایک لہو اور ایک لعب' اور دونوں کے مفہوم میں لغۃً کچھ فرق ہے وہ یہ کہ لہو کہتے ہیں شغل کو اور لعب کہتے ہیں عبث کو اس سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ اس میں دو صفتیں ہیں ایک تو لہو ہونے کی کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف لبھاتی اور مشغول کرتی ہے اور دوسرے لعب یعنی عبث ہونے کی کہ اس میں مشغول ہونا عبث یعنی بے نتیجہ ہے۔ اس پر کوئی معتد بہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا جیسے بچوں کا کھیل کہ اس پر بھی کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

اصلاح زاہد خشک

اس سے ایک اور دقیق علم کی طرف بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ تمام حیات دنیا مذموم نہیں' بلکہ وہ حیات دنیا مذموم ہے جس میں محض لہو و لعب ہو' یعنی جو بے نتیجہ ہو اور اس کا کوئی معتد بہ ثمرہ نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ دنیا

صوری کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب ہو اور ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو کہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو وہ مذموم ہے اور جس پر ثمرہ مرتب ہو وہ واقع میں دنیا ہی نہیں۔

یہاں سے اصلاح ہے غالی فی الزہد اور زاہد خشک کی' کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے عمدہ کپڑا' اچھا کھانا' ٹھنڈا پانی سب مذموم ہے بعض لوگ اسی خیال سے نکاح بھی نہیں کرتے کہ عورت بھی دنیا ہے اور بعض کر بھی لیتے ہیں تو نان ونفقہ نہیں دیتے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتے کیونکہ وہ بیوی کی طرف التفات کرنے کو التفات الی الدنیا سمجھتے ہیں۔

اور ایک دفعہ کفار نے کوئی خاص معجزہ مانگا تھا کہ ایسا نشان ظاہر ہو ہم مانیں آپ ﷺ کا دل چاہا کہ ان کی درخواست کے مطابق ہی معجزہ ظاہر ہو جائے تو اچھا ہے اس پر حق تعالیٰ نہایت تشدید کے ساتھ فرماتے ہیں۔

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝

یعنی اگر آپ پر ان کافروں کا اعراض اور انکار ایسا ہی گراں ہے (اور اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ کسی طرح مان ہی جائیں) تو اگر آپ سے ہو سکے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ (ان کی خواہش کے موافق لے آیئے ہم تو ایسا نہ کریں گے)

ضرورت زبان دانی

آگے فرماتے ہیں فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ یہاں زبان دانی کی ضرورت ہے اس جگہ ہمارے محاورہ کے اعتبار سے جاہل کے ساتھ ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ یہاں ترجمہ یہ ہے کہ بس آپ نادان نہ بنئے بچوں کی سی ضد نہ کیجئے دیکھئے اس ترجمہ سے کیسی شفقت ٹپکتی ہے جو اس ترجمہ سے ہرگز ظاہر نہ ہوتی کہ بس آپ جاہلوں کیسی باتیں نہ کیجئے بات ایک ہی ہے نادان اور جاہل لغۃً مرادف ہیں مگر ہمارے محاورہ میں جاہل تحقیر کے موقع میں اور نادان شفقت کی جگہ بولا جاتا ہے اور یہ مقام شفقت ہی کا ہے اس لئے یہاں جاہل کا ترجمہ نادان ہی کرنا ضروری ہے۔

آگے آپ کی نیت کا جواب دیتے ہیں کہ آپ خود ان کی خواہش کے موافق معجزہ کو اس لئے چاہتے ہیں کہ یہ لوگ مان جائیں گے تو اس خیال کو دل سے دور کیجئے یہ ماننے والے نہیں ہیں۔

إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ بات تو وہی مانتے ہیں جو (کان لگا کر) سنیں بھی اور یہ کم بخت تو مردوں کی طرح سنتے ہی نہیں اگر یہ توجہ سے قرآن کو سن لیں تو پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے معجزے کی بھی ان کو ضرورت نہ رہے پھر خیال ہو سکتا تھا کہ جب یہ ایسے ہیں تو پھر ان کم بختوں کو سزا ہی دی جائے تو فرماتے ہیں

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ اور مردوں کو خدا تعالیٰ (ایک دن) اٹھائیں گے پھر سب اس کے پاس لوٹ کر جائیں گے (اسی دن ان مردوں کو بھی دیکھ لیا جائے گا) آپ سزا کی فکر میں کیوں پڑتے ہیں ہمارا ان کا معاملہ ہے ہم خود دیکھ لیں گے چاہے ہم جلدی سزا دیں یا دیر میں آپ کو اس سے کچھ مطلب نہیں۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی تمنا کو پسند نہیں کیا بلکہ آپ کے حزن وفکر کو پسند نہ فرمایا کہ آپ اپنی پھول سی جان کو کیوں پریشانی میں ڈالتے ہیں بس ان کا معاملہ ہمارے سپرد کر کے بے فکر ہو جایئے۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ

نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ

ترجمہ: اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ ھ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو۔

تفسیری نکات

آیات تسلی

حتی کہ آپ کے غلبہ غم کی وجہ سے آپ کو تسلی دینے کے لئے خاص اس مضمون کی بار بار آیتیں نازل فرمائیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین (جس کا حاصل یہ ہے کہ اے محمد ﷺ آپ کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے لا تسئل عن اصحاب الجحیم کہ آپ سے ان لوگوں کی حالت کا سوال نہ کیا جائے گا یعنی پھر آپ کیوں غم کرتے ہیں اگر یہ ایمان نہیں لاتے نہ لائیں ایک اور جگہ ارشاد ہے لست علیھم بمصیطر کہ آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ ضرور ہی ان سے تعمیل کرا لیں آپ کا کام صرف تبلیغ ہے کیونکہ آپ مبلغ ہیں رہا عمل کرانا یہ کام مصیطر کا ہے اور آپ مصیطر مقرر نہیں ہوئے پھر اگر یہ لوگ عمل نہیں کرتے اور تبلیغ کو نہیں مانتے تو آپ کو کیا غم ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بایة (اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین کی کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ) ایک جگہ فرماتے ہیں ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین' کہ آپ زبردستی تو ان کو ایمان دار نہیں بنا سکتے گو ان کی قسمت میں

دولت ایمان نہ ہوا یک اور جگہ ارشاد ہے ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون' کہ آپ ان کی حالت پر غم نہ کیجئے اور ان کے مکروں سے تنگدل نہ ہو جائیں۔ایک جگہ ارشاد ہے ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون فسبح بحمد ربک وکن من السجدین' کہ ہم جانتے ہیں ان لوگوں کے اقوال سے جو تنگدلی آپ کو ہوتی ہے۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی شانِ عشق کے مطابق ایک آیت کی تفسیر

حق تعالیٰ فرماتے ہیں قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانھم لا یکذبونک ولکن الظلمین بایات اللہ یجحدون ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے آگے مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ اور میں نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ فانھم لا یکذبونک علت ہے ایک جملہ محذوفہ کی تقریر یوں ہے فلا تحزن وکل امر ھم الی اللہ فانھم لا یکذبونک الخ یعنی آپ غم نہ کیجئے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجئے کیونکہ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے (کیونکہ آپ کو تو محمد امین کہتے ہیں صادق مانتے تھے) بلکہ یہ ظالم تو خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (سو آپ کس لئے رنج کرتے ہیں وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہتے ہماری آیتوں سے' (الانعام ۳۳)

سو آپ تسبیح وتحمید میں لگ جایئے اور عبادت کو اپنا مشغلہ بنالیجئے کہ اس سے یہ تنگدلی دفع ہو جائے گی اور یہ غم ہلکا ہو جائیگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غم وحزن کا منشاء

غرض بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کفار کی حالت پر بہت ہی حزن وغم تھا نیز ان آیات سے اس کے منی کا بھی پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں اور اپنے کفر وضلالت سے باز آجائیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو ان لوگوں سے نفسانی عداوت اور بغض نہ تھا بلکہ ان کی اس ردی حالت پر رحم آتا تھا اور دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کیونکہ اگر آپ کو ان کے ساتھ اس قسم کی عداوت اور بغض ہوتا تو آپ ہرگز ان کے ایمان لانے اور راہ راست پر آجانے کی تمنا نہ کرتے بلکہ یوں چاہتے کہ یہ لوگ ساری عمر اس کفر وگمراہی کے تیرہ وتاریک غار میں پڑے رہیں اور کبھی ان کو اس سے نکلنا نصیب نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے دشمن کے لئے انسان خیر خواہی نہیں کیا کرتا بلکہ عادۃ اس کی بدخواہی کے درپے ہوتا ہے اور اگر بدخواہی کے درپے بھی نہ ہو تو خیر خواہی کی تو گنجائش نہیں ہوتی اور آپ کی یہ حالت تھی کہ یوں چاہتے تھے گو مجھے تکلیف ہو لیکن ان لوگوں کو تکلیف نہ ہونے پائے حتی کہ جس معجزے کے وہ طالب ہوتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ وہ معجزہ ہو ہی جائے تاکہ اسی کو دیکھ کر یہ لوگ سنبھل جائیں درست کرلیں پس معلوم ہوا کہ نماز میں ایسا قوی قرب ومشاہدہ ہوتا ہے جو کسی اور امر سے نہیں ہوتا ورنہ حق تعالیٰ تسلی کے لئے اسی امر کی تعلیم کو اختیار فرماتے

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ واذا خربیه امر فزع الصلوة کہ جب حضور کو کوئی بڑا فکر پیش آیا تو آپ جلدی سے نماز میں مشغول ہو جاتے کیوں اسی لئے تاکہ حق تعالیٰ سے باتیں کر کے دل بہلائیں اور تسلی و سکون حاصل کریں واقعی تجربہ و مشاہدہ ہے کہ رنج و فکر میں نماز میں مشغول ہو جانے سے رنج بہت کم ہو جاتا ہے اور اگر موانع قرب کم ہوں تو بالکل رنج کا ازالہ ہو جاتا ہے تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے زیادہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال نماز میں جو حق تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی ہے اور ان کی تسبیح اور تقدیس ہے یہی مشاہدہ کافی ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اگر اس میں کمی ہو تو البتہ مشاہدہ میں کمی ہے اس کی تلافی کرنا چاہئے پھر جب یہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا کہ نماز میں حق تعالیٰ کے سوا کسی طرف توجہ نہ رہے تو آپ کو خود ہی اس کا لطف حاصل ہوگا اور اس وقت آپ سمجھیں گے کہ میں نے جو اس مشاہدہ کو کافی کہا ہے یہ صحیح تھا دنیا میں بڑی کامیابی بندہ کی یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف یکسوئی کے ساتھ نماز میں توجہ نصیب ہو جائے۔ (الصلات فی الصلوت صفحہ ۲۷)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: اور ہم نے امتوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزر چکی ہیں پیغمبر بھیجے تھے سو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے لیکن ان کے قلوب تو سخت ہی رہے اور شیطان ان کے اعمال کو ان کے خیال میں آراستہ کر کے دکھلاتا رہا پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیئے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھی وہ اترا گئے ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا تو وہ بالکل حیرت زدہ ہو گئے پھر وہ ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گی اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی تعریف کے لائق ہیں جو تمام عالم کے پرودگار ہیں۔

تفسیری نکات

کلفتوں کی قسمیں

کلفتیں اور مصیبتیں دو طرح کی ہوتی ہیں داخلی دوسری خارجی یا یوں کہو کہ ایک انفسی ایک آفاقی آفاقی یہ ہے کہ مثلاً کوئی دشمن چڑھائی کر کے چلا آوے انفسی وہ کہ خود اپنے بدن میں کوئی مرض ہو باساء سے مراد آفاقی ہے اور ضراء سے مراد نفسی بلیات ہیں اور یہاں ایجاز ہے اصل کلام اس طرح ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں اور ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔

تفسیری نکات

لغو قصے

فرمایا کہ بعضے قصے جو مشہور ہیں کہ کوئی شخص مر گیا اور تھوڑی دیر میں وہ زندہ ہو گیا اور دوسرا اس نام کا مر گیا اور اس زندہ ہونے والے نے بیان کیا کہ مجھ کو کسی مقام پر لے گئے وہاں حکم ہوا کہ نہیں اس کو نہیں بلایا بلکہ فلانے کو بلایا تھا تو فرمایا کہ بالکل لغو قصے ہیں عزرائیل غلطی نہیں کر سکتے اگر یہ ممکن ہو تو پھر جبرئیل سے بھی ایسی غلطی ممکن ہوگی تو شیعہ کے اس قول کے صحیح ہونے کا بھی احتمال ہوگا کہ جبرئیل غلط کردہ ومقصود علی بود نیز کلام مجید میں ہے حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ میں نے چار عالموں کو شبہ میں مبتلا دیکھا ایک تو مر چکے تھے اور ان کی تصنیف میں یہ مضمون تھا اور ایک کے زمانے میں میں بچہ تھا اور دو کی خدمت میں میں نے عرض کیا اور انہوں نے قبول کر لیا باقی ایسے قصے کا راوی مریض اگر کوئی ثقہ ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اس مریض کو سرسام ہو گیا تھا اس میں ایسے خیالات نظر آ گئے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٨﴾

ترجمہ: پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں' پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے یہ تو سب سے بڑا ہے سو جب وہ غروب ہو گیا آپ نے فرمایا اے میری قوم بے شک میں تمہارے شرک سے بے زار ہوں۔

تفسیری نکات

مراۃ خداوندی

مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ یہ ارخاء عنان بطور الزام ہے کہ ستاروں کو دیکھ کر فرمایا' ہاں بھائی ہاں' لو یہ خدا ہے' پھر جب وہ غروب ہو گئے تو ان کے نقائص کو ظاہر کر کے توحید کو ثابت کیا کہ خدا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی عالی کبھی سافل

مگر ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ ابراہیمؑ کو کوکب میں اول ظاہر پر نظر پڑی اس کی نسبت فرمایا ھذا ربی پھر مظہر کی طرف التفات ہوا اس کی نسبت فرمایا لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ مطلب یہ تھا کہ اس کوکب کے اندر جو مجھے نظر آ رہا ہے وہ میرا خدا ہے اور تم جو کوکب کی پرستش کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔

غرض عارفین مخلوق کو مراۃ سمجھتے ہیں۔ سو دوسرے لوگ تو اول مراۃ کو دیکھتے ہیں اور عارفین اول مراۃ کے اندر محبوب کو دیکھتے ہیں تبعاً مراۃ پر بھی نظر پڑ جاتی ہے۔

عاقل اور حقیقت شناس ابراہیمی المشرب لوگ ہیں یعنی اہل ایمان میں کہ وہ متبع ہیں ابراہیم علیہ السلام کے چنانچہ خود حضور کو ارشاد ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے اور ابراہیم علیہ السلام کا مشرب یہ تھا کہ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا جب رات ہوئی ایک ستارہ کو دیکھا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ تو کہا کہ میں نے فرض کیا کہ یہ رب ہے یہ بطور مجازات خصم کے فرمایا' فَلَمَّآ اَفَلَ جب وہ چھپ گیا قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ' وہ خدا کیسا جس کو زوال ہو میں ایسے خدا کو پسند نہیں کرتا۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ جب چاند کو دیکھا تو کہا فرض کرو۔ شاید یہ رب ہو۔ فَلَمَّآ اَفَلَ جب وہ بھی ڈھل گیا' قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ معلوم ہوا یہ بھی خدا نہیں فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ جب سورج کو دیکھا تو کہا یہ سب سے بڑا ہے۔ اگر اس کی خدائی باطل کر دی تو سب کو پکڑ لیا' فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ حضرت اسی طرح ہر مومن کی نظر مصداق اس قول کا ہے۔ اول ما آخر ہر منتہی است۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ: اور اسی نے اتارا آسمانوں سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز پھر نکالی اس میں سے سبز کھیتی جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے ہیں جدا جدا بھی دیکھو ہر ایک درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو ان چیزوں میں نشانیاں ہیں۔ واسطے ایمان والوں کے۔

تفسیری نکات

تقسیم مال و عقل میں حکمت خداوندی

پس حق تعالیٰ کی یہ تقسیم عین حکمت ہے کہ اہل عقل کو مال کم کر دیا اور کم عقلوں کو مالدار بنا دیا۔ کیونکہ کم عقل جب اتنی بڑی دولت سے محروم ہیں تو کیا وہ چند روز دنیا میں بھی بہار نہ دیکھیں پس قارون کے خیال کی غلطی آپ کو معلوم ہوگئی کہ اس نے مال و دولت کو اپنی سعی سے پیدا کیا ہوا سمجھا' حالانکہ نہ یہ سعی پر ہے نہ علم و سلیقہ پر بلکہ خدا کی عطاء پر ہے اور نقد میں تو کسب کے سبب کچھ دھوکا بھی ہے زمین کی پیداوار کو تو عام طور پر کوئی بھی اپنا پیدا کیا ہوا نہیں سمجھتا۔ اس کے اسباب تو ظاہراً بھی غیر اختیاری ہیں۔

حقوق اللہ

اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو چیز ہماری دی ہوئی ہماری پیدا کی ہوئی ہے اس کو ہمارے نام پر خرچ کرتے ہوئے کیوں جان نکلتی ہے۔

اس کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مجموعہ کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ کیونکہ زیتون اور انار کے پتے تو یکساں ہیں مگر پھل مختلف ہیں اور بعض کا یہ قول ہے کہ یہ ہر واحد کے اعتبار سے فرمایا کہ زیتون زیتون میں بھی تشابہ اور اختلاف ہوتا ہے اور انار انار میں بھی اس کے بعد ارشاد ہے کہ جب پھل آجائے تو اس کو کھاؤ کام میں لاؤ اور اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرو پھل کاٹنے کے وقت' کیونکہ جب سب کچھ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے تو پھر اس کے نام پر خرچ کرتے ہوئے کیوں جان نکلتی ہے۔

ارے بے وقوف' اگر یہ کھیتی اور پھل پیدا ہی نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس وقت تم اپنے گھر میں کیا لے آتے؟ ابھی کا قصہ ہے کہ ایک گاؤں میں آگ لگ گئی تو ساری کھیتی جل کر خاک سیاہ ہوگئی۔ اسی لئے اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝

(بتلاؤ جو کھیتی کرتے ہو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں اگر ہم چاہیں تو اس کو (جلا پھونک کر سکھا کر) ریزہ ریزہ کر دیں' پھر حیرت زدہ ہو کر کہنے لگو کہ اب کے تو بڑے خسارے میں رہے بلکہ محروم ہی رہ گئے)

واقعی آدمی کیا کر سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں' خصوصاً زراعت میں کہ اس کا معاملہ تو بالکل توکل پر ہے آدمی روپیہ جمع کر سکتا ہے بیج کا انتظام کر سکتا ہے بالدی کیرے لگا سکتا ہے مگر ٹڈیوں کا کیا انتظام کر سکتا ہے۔ پالے

اور اولے کا کیا بندوبست کر سکتا ہے اسی طرح باغ کا کہر کبھی اندھا ہو جاتا ہے اس کا کیا انتظام کر سکتا ہے غرض کھیت اور باغ کا معاملہ اور مدار بالکل توکل پر ہے اگر تم خدا کے حق میں کوتاہی کرو گے تو ڈرتے رہو کہیں خدا تعالیٰ بھی تمہارے حق میں کمی نہ کر دیں اور جو کچھ صدقہ زکوٰۃ تم دیتے ہو وہ تو مجازاً خدا کا حق کہلاتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ تمہارے ہی نفع کے واسطے مقرر کیا گیا ہے تاکہ دنیا میں تمہارے مال میں برکت ہو اور آخرت میں ثواب ملے۔ قرآن کریم میں ایک واقعہ بھی ایسے لوگوں کا مذکور ہے۔ جو خدا کا حق ادا کرنے میں جان چراتے تھے۔

عشر ادا نہ کرنے کا عبرتناک واقعہ

قصہ یہ ہے کہ ایک شخص کھیتی باڑی اور باغ والا تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب کھیت کاٹتا یا باغ کا پھل توڑتا تو غریبوں کے واسطے ایک حصہ الگ کر دیتا جو اللہ واسطے تقسیم کیا جاتا جب غریبوں کو اس کی یہ عادت معلوم ہو گئی تو وقت پر خود ہی اس کے کھیت اور باغ پر جمع ہو جاتے اور وہ خوشی کے ساتھ ان کا حق نکال کر دے دیتا۔ ایک عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹوں نے کہا کہ ہمارا باپ بے وقوف تھا جو مسکینوں کو اپنی محنت کی پیداوار میں سے ایک معقول حصہ دے دیا کرتا تھا ہم ایسا نہیں کریں گے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم تو محنت کریں مشقت کریں اور بڑی مصیبت کے بعد محنت کا پھل دیکھیں اور یہ غریب لوگ بیٹھے بٹھائے ہمارے مال میں حق دار بن جائیں۔

مگر اس زمانہ میں کچھ آنکھ میں شرم ولحاظ بہت تھا اس لئے ان لڑکوں کو یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اگر غرباء حسب عادت جمع ہو گئے منہ توڑ کے جواب دینا بھی ممکن نہیں اس لئے کوئی ایسی صورت اختیار کرنا چاہئے کہ غریبوں کے آنے سے پہلے ہی باغ اور کھیت کے کاٹنے سے فراغت ہو جائے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ صبح کو سویرے چلیں گے تاکہ غریبوں کے آنے سے پہلے خفیہ طور پر غلہ کاٹ کر لے آئیں اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا مگر ایک لڑکے نے اختلاف کیا اس نے کہا کہ باپ کے طریقہ کو نہ بدلنا چاہئے کیونکہ غرباء کو خیرات دینے سے اپنا ہی بھلا ہے اور اس سے کچھ کمی نہیں آتی آخر ہمارا باپ بھی تو خیرات ہمیشہ کرتا رہا اور کبھی اس کو پریشانی کا سامنا نہیں ہوا لیکن اس ایک کی رائے نہ چلی کثرت رائے پر یہی فیصلہ ہوا کہ سویرے چل کر غریبوں کے آنے سے پہلے باغ اور کھیت کاٹ لینا چاہئے یہ رائے طے کر کے چلے مگر وہاں یہ معاملہ ہوا کہ نیت بدلتے ہی خدا تعالیٰ کا معاملہ بدل گیا اور راتوں رات باغ اور کھیت پر عذاب نازل ہوا کہ ایک آگ آئی اور ساری کھیت اور باغات کو جلا پھونک کر رکھ گئی۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور باغ اور کھیت کو جلا ہوا پایا تو اول تو خیال کیا شاید راستہ بھول کر کسی دوسرے کھیت پر آ گئے ہمارا کھیت یہ نہیں ہے مگر جب صبح کی روشنی پھیل گئی تو معلوم ہوا کہ اپنا ہی کھیت اور اپنا ہی باغ ہے مگر جلا ہوا ہے۔

اب کہنے لگے کہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی پھر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ کہ تیری برائی کا نتیجہ ہے۔ دوسری نے کہا تیرے مشورہ کا ثمرہ ہے۔ اب وہ لڑکا بولا جس نے اس تدبیر سے مخالفت کی تھی اور کہنے لگا کہ آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے کیا نفع' اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو تو امید ہے کہ خدا اس سے بہتر کھیت اور باغ ہم کو دے دے۔ اب سب نے توبہ کی اور آئندہ کے لئے باپ کے طریقہ پر چلنے کا عہد کیا تو دفعتاً سارا باغ کھیت ہرا بھرا ہو گیا۔

صاحبو! صدقہ خیرات سے مال کم نہیں ہوتا۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کنواں کہ اگر اس میں سے پانی نکلتا رہے بھرائی ہوتی رہے تو پانی کی آمد ہوتی رہتی ہے اور اگر بھرائی نہ ہو تو کچھ دنوں کے بعد سوت بند ہو جاتا اور کنواں سوکھ جاتا ہے۔

اسراف کی حقیقت

اب میں ایک جملہ نہی کی تفسیر عرض کر کے وعظ ختم کرنا چاہتا ہوں تا کہ لطف کامل ہو جائے وہ جملہ یہ ہے
وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝

یہ جملہ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ سے متصل ہے ترجمہ یہ ہے کہ (اسراف نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) ترجمہ تو سب کی سمجھ میں آ گیا ہو گا مگر قابل غور یہ ہے کہ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ سے اس کا کیا ربط ہے۔

عام طور پر مفسرین نے فرمایا ہے کہ ربط یہ ہے کہ اوپر حکم ہے فقراء کو دینے کا' اس جملہ میں یہ فرمایا گیا ہے فقراء کو اتنا نہ دو کہ اپنا بھی خیال نہ رکھو بلکہ کچھ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے واسطے بھی بچا لو' اگر ایسا نہ کرو گے بلکہ سب خیرات کر دو گے تو یہ اسراف ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں کرتے۔

میں اس تفسیر کی صحت میں کلام نہیں کرتا' واقعی یہ مسئلہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ فقراء کو زیادہ دے دینا یا کل پیداوار دے دینا اسراف میں داخل ہوتا ہے۔ جبکہ دینے والے میں قوت توکل کامل نہ ہو اور پریشانی کا اندیشہ ہو مگر یہ حکم کلی نہیں کہ ہر شخص کے لئے کل مال کا خیرات کرنا اسراف میں داخل ہو کیونکہ حدیث سے حضرت صدیق کا واقعہ ثابت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنا کل مال خیرات کر دیا اور حضور ﷺ نے ان کی مدح فرمائی' جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سارا مال خیرات کر دینا علی الاطلاق اسراف نہیں پس جو ربط مفسرین نے عموماً بیان کیا ہے۔ وہ بعض صورتوں میں ترجیح ہے مگر بعض صورتوں پر منطبق نہیں دوسرے خود نص میں موجود ہے۔ ومن تطوع خیراً فھو خیرلہ' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حد معین سے زیادہ خیرات کرنا مطلقاً مذموم نہیں اس لئے میں ان دو جملوں میں دوسرا ربط بیان کرتا ہوں جو عام تفسیر سے الطف ہے اور ان شاء اللہ قواعد سے صحیح ہے۔

ربط ماسبق

میرے نزدیک ربط یہ ہے کہ جملہ امر میں تو فقراء کے حق ادا کرنے کا امر ہے اور جملہ نہی میں فقراء کا حق کھا جانے کی ممانعت ہے۔ (واقعی حضرت حکیم الامت بیان کرنے کے امام ہیں حضرت کو ایسا ربط القاء ہوتا ہے جو کتابوں میں تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اور خوبی یہ ہے کہ بے تکلف ربط ارشاد فرماتے ہیں جو دل کو لگ جائے وھذا من ایات ذوقہ فی القرآن فللہ در' حاصل یہ ہوا کہ پیداوار میں سے فقراء کا حق ادا کرو اور سارا کا سارا خود ہی نہ کھا جاؤ کہ مسکینوں کا حق بھی کھالو کہ یہ اسراف ہے اور حق تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں فرماتے اور یہ اسراف اس لئے ہے کہ اس میں حد شرعی سے تجاوز ہے اور اسراف کی حقیقت یہی ہے تجاوز عن الحد' پس مطلب یہ ہوا کہ مساکین کا حق ادا کرو اور اتنا نہ کھاؤ کہ مسکینوں کا حق بھی نہ بچے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جملہ نہی میں زیادہ خیرات کرنے کی ممانعت نہیں بلکہ زیادہ کھا جانے کی ممانعت ہے۔ اور اسراف جیسے انفاق میں ہوتا ہے اکل میں بھی ہوتا ہے چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔ اور ایک آیت میں دوسرے کا مال کھا جانے کو خصوصیت کے ساتھ اسراف فرمایا ہے وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا اور گو عرف میں دوسرے کا حق نہ دینا اور خود ہی سارا مال کھا جانا اسراف نہیں کہلاتا بلکہ اس کو بخل کہتے ہیں مگر لغتہ و شرعا یہ بھی اسراف ہی کا فرد ہے اور عرفی بخل کو اسراف سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ نفس انسانی کو مال سے محبت زیادہ ہے اس لئے اس کو اسراف کی مذمت زیادہ معلوم ہے بخل کی مذمت اس کی نظر میں زیادہ نہیں' اس لئے حق تعالیٰ نے بخل کو بھی اسی عنوان سے بیان فرمایا جس سے نفس انسانی کو کراہت زیادہ ہے۔ اس لئے میرے خیال میں یہ تفسیر الطف ہے امید ہے کہ اہل علم اس سے محفوظ ہوں گے (سبحان اللہ یہ ربط تو سنا نہ کتابوں میں دیکھا عجیب بے تکلف ربط ہے جس سے آیت کی تفسیر بالکل آئینہ ہوگئی)

ادراک کی قسمیں

فرمایا آیت لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار سے جو معتزلہ نے استدلال کیا ہے اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں ایک یہ کہ ادراک بالکنہ نہیں ہوتا ایک یہ کہ ادراک دو قسم پر ہے ایک یہ کہ رائی مرئی تک چلا وے۔ دوسرے یہ کہ مرئی رائی کے قریب آ جاوے آیت میں پہلی قسم کی نفی ہے اور دعویٰ دوسری کے ثبوت کا ہے۔ اور آیت کا آخری حصہ اس کے نہایت مناسب ہے کیونکہ آخری حصہ ہے وھوا للطیف الخبیر فرمایا ہے پس لطیف لا تدرکہ الابصار کے مناسب ہے اور خبیر یدرک الابصار کے مطابق ہے۔ (الکلام الحسن جلد ا صفحہ ۸۵)

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ: اور تم برا نہ کہوان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا پس وہ برا کہنے لگیں اللہ کو بے ادبی سے بدوں سمجھے اسی طرح ہم نے مزین کر دیا ہر ایک فرقہ کی نظر میں ان کے اعمال کو پھر ان سب کو اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ جتلا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے۔

تفسیری نکات

سبب معصیت ممنوع ہے

دیکھئے بتوں کی برائی کرنا مباح بلکہ طاعت ہے تاکہ لوگوں کو ان سے نفرت ہو مگر جب احتمال اس کا ہو کہ یہ سبب ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کو برا کہنے کا اس حالت میں منہی عنہ ہے یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ جو مباح بلکہ مندوب بھی سبب ہو جاوے گا معصیت کا وہ بھی معصیت ہے اس سے زیادہ کون سی دلیل ہوگی کہ سب اصنام عین طاعت تھا اور وہ ممنوع ہو گیا۔ اور حدیث لیجئے حدیث میں ہے کہ جناب رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب سے برا وہ شخص ہے جو اپنے ماں باپ کو گالی دے' صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ماں باپ کو کون گالی دیا کرتا ہے۔ فرمایا کہ یہ کسی کے ماں باپ کو گالی دے اور وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے معلوم ہوا کہ جو فعل سبب معصیت کا ہو وہ بھی اسی کے حکم میں ہے یہاں کوئی طالب علم شبہ نہ کرے کہ اس حدیث سے اس مسئلہ پر تو استدلال جب ہو سکتا جبکہ وہ فعل مباح ہو اور حدیث میں تو کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینا ہے جو خود بھی معصیت ہے بات یہ ہے کہ میرا مطلب قاعدہ کو ثابت کرنا ہے اور قاعدہ کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ معصیت کا سبب من حیث السببیت معصیت ہے خواہ پہلے سے مباح ہو یا معصیت اس سے بحث نہیں علاوہ اس حدیث و آیت کے اگر میں غور کروں تو بہت احادیث و آیات اس مدعا پر ملیں گی غرض قرآن سے حدیث سے فقہ سے یہ مسئلہ ثابت ہے۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ۝

ترجمہ: تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ بلا شبہ جو لوگ گناہ کرتے ہیں ان کو ان کے کئے کی سزا عنقریب ملے گی۔

تفسیری نکات

گناہ کی دو قسمیں

پس اس میں یہ بات بھی بتلا دی کہ بڑی بات یہ ہے کہ گناہ کو چھوڑا جائے اور سب کو چھوڑا جائے اور یہ بھی بتلا دیا کہ گناہ دو قسم کے ہیں ظاہری اور باطنی یعنی جوارح کے متعلق بھی اور قلب کے متعلق بھی گناہ کی فہرست تو بہت بڑی ہے مگر میں مثال کے طور پر مختصراً کہتا ہوں کہ مثلاً آنکھ کا گناہ ہے کسی نامحرم کو دیکھنا امرد کو دیکھنا یا اجنبی کا ایسا بدن دیکھنا کہ اس کا دیکھنا شرعاً ناجائز ہے جیسے عورت کے سر کے بال اور یہ مسئلہ عورتوں کو بھی بتلانا چاہئے کیونکہ وہ اس میں بہت مبتلا ہیں ایک گناہ آنکھ کا یہ ہے کہ کسی کی چیز دیکھ کر حرص کرے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ (ہرگز مت اٹھاؤ اپنی آنکھوں کو اس چیز کی طرف جو ہم نے کفار کو ان کی آزمائش کے لئے نفع کے واسطے دی ہیں یعنی دنیا کی رونق وغیرہ) اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ مال حاصل نہ کرو بلکہ مطلب یہی ہے کہ مال کو قبلہ و کعبہ نہ بناؤ کہ اس کی بدولت دین ہی ہاتھ سے جاتا رہے اسی طرح زبان کا گناہ چغل خوری ہے غیبت ہے جھوٹ بولنا ہے آج کل کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں الا ماشاء اللہ اس کا علاج یہ ہے کہ جو کچھ بولو سوچ کر بولو کہ میں کیا کہوں گا اور وہ بات خلاف مرضی حق تو نہ ہوگی پھر ان شاء اللہ تعالیٰ زبان کا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ کان کا گناہ یہ ہے کہ چھپ چھپ کر کسی کی بات سنے گانا سنے ہاتھ کا گناہ یہ ہے کہ کسی نامحرم کو چھوئے کوئی ناجائز مضمون لکھے پیر کا گناہ یہ ہے کہ کسی ناجائز موقع پر چلا جائے اور ایک پیٹ کا گناہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روزی حلال مل ہی نہیں سکتی جب حلال نہیں مل سکتی تو حرام حلال سب برابر پھر کہاں تک بچیں صاحبو! یہ گمان بالکل غلط ہے جس کو فقہ حلال کہہ دے وہ بلا شبہ حلال ہے وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں ظاہری گناہ اور باطنی گناہ ظاہر گناہ کی تفسیر یہ ہے کہ جو محسوس ہو دوسروں کو اور باطنی گناہ وہ ہے جو دوسروں کو محسوس نہ ہو پس معلوم ہوا کہ یہ جو ظاہر گناہ ہیں صرف یہی گناہ نہیں ہیں بلکہ اور بھی گناہ ہیں جو محسوس نہیں اور یہ جو محسوس گناہ ہیں ظاہر کے یہ محسوس کیوں ہیں' محسوس اس لئے ہیں کہ ان کا محل محسوس ہے یعنی ہاتھ پاؤں' آنکھ' زبان وغیرہ ان جوارح سے جو گناہ ہوتے ہیں چونکہ یہ جوارح محسوس ہیں اس واسطے ان کے افعال بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اور باطنی گناہ ایسے محل کے ہیں جو خود محسوس نہیں اس لئے وہ بھی غیر محسوس ہیں۔ وہ محل کون ہے وہ محل ہے قلب اور نفس تو معلوم ہوا کہ بعضے گناہ قلب اور نفس کے بھی ہیں۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ: سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈالتا ہے اور یہی تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کر دیا۔

تفسیری نکات

صراط مستقیم فقط اسلام ہے

پہلی آیت میں تو اسلام کا لفظ ہی موجود ہے اور دوسری آیت میں اسلام کا لقب صراط مستقیم ہے اور تیسری آیت میں ثمرہ مذکور ہے۔ پہلی آیت فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ' میں صریح لفظ اسلام موجود ہے اور دوسری آیت هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا میں هذا اسم اشارہ ہے اس کے لئے مشار الیہ چاہئے وہ مشار الیہ یہاں سوائے اسلام کے کچھ نہیں جس سے معلوم ہوا کہ جو اسلام ہے وہی صراط مستقیم ہے۔

حاصل آیت

تیسری آیت لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ میں تفریع کے طور پر یہ نتیجہ بیان کیا گیا اس میں ضمیریں جمع کی ہیں جو راجع ہیں من کی طرف، من گو لفظ مفرد ہے مگر معنی جمع ہیں لہذا جمع کی ضمیر اس کی طرف پھیرنا جائز ہے جیسا کہ نحو جاننے والے سمجھتے ہوں گے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جس کو ہدایت کرنا حق تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے اس کو اسلام کے متعلق شرح صدر دیتے ہیں اور دوسرے جملہ میں اس کا مقابل مذکور ہے کہ جس کو گمراہ کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے دل کو تنگ کر دیتے ہیں۔

دار السلام کی عجیب وغریب تفسیر

تو اب دار السلام کو لیجئے کہ وہ گھر بنایا ہے آفات سے محفوظ ہونے کے لئے دار السلام کے معنی یہ ہوں گے کہ سلامت وحفظ عن الآفات کی صفت میں وہ کامل ہے اور پھر اس کے ساتھ یہ دیکھا جائے کہ وہ گھر بنایا کس نے ہے حق تعالیٰ نے جس کو تکمیل سے کوئی مانع نہیں کیونکہ مانع دو ہوتے ہیں علم نہ ہونا یا قدرت نہ ہونا اور وہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں حق تعالیٰ کا علم بھی کامل اور قدرت بھی کامل پھر یہ کیسے خیال کیا جاتا ہے کہ جس گھر کو حق تعالیٰ نے سلامتی اور حفاظت عن الآفات کے لئے بنایا ہے اس میں کوئی بھی وہ چیز چھوٹ گئی ہوگی جس کو اس موضوع میں دخل ہو تو ثابت ہوا وہاں ہر قسم کی تکالیف سے حفاظت رہے گی کہ جو تکالیف اس وقت ہمارے خیال میں بھی ہوا ور کبھی آئندہ ہو سکتی ہوں جس کا علم حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نہیں وہ بھی نہیں ہیں۔

اصل مقصود یہ تھا کہ دنیا میں جب ادنیٰ ثمرہ پر اکتفا نہیں کرتے تو وہاں کے ثمرات کے درجہ کامل کو کیوں نہیں طلب کرتے اور یہاں تو معطی کا کرم محدود ہوتا ہے اس لئے بعض اوقات زیادہ طلبی ناگوار ہونے لگتی ہے اور وہاں تو معطی وہ ذات ہے جس کا کرم غیر محدود ہے کماً بھی کہ جتنا زیادہ لو خوش ہوتے ہیں وہ کیفاً بھی چنانچہ ایک کرم یہ بھی ہے کہ جہاں ثمرات کا وعدہ کیا ہے وہاں یہ بھی کہتے جاتے ہیں۔

اعمال کا صلہ

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً تا کہ بندہ شرمندہ نہ ہو چنانچہ خود اس آیات میں بھی جس کا بیان ہو رہا ہے هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور جا بجا اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آخرت میں جو کچھ درجات اور نعمتیں ملیں گی وہ سب مومنین کے اعمال کا صلہ ہے یہ غایت کرم ہے کہ خود نعمتیں دیتے ہیں لیکن احسان جتلانا نہیں چاہتے ایسے موقع پر بھی کوئی چوک جائے تو بڑا ہی کم

قسمت ہے سچ تو یہ ہے کہ ایسی جگہ تو لوٹ مچانی چاہئے قناعت چہ معنی الا یہ دارالعمل ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ثمرات کی سندیں ایک جگہ تیار کر کے رکھ دی ہیں اور اذن عام دے دیا ہے کہ جتنے چاہو لو اور ثمرات بے تعداد لوٹ لو پھر حیرت ہے کہ آدمی کیوں نہ لے اور کیوں بڑھ کر ہاتھ نہ مارے اور کیوں کامل درجہ کی کوشش نہ کرے ادنیٰ درجہ پر بس کر کے کیوں بیٹھ رہے یا اتنی ہمت کیوں ہارے کہ کچھ عذاب ہی بھگت کر جنت مل رہے گی۔ کامل درجہ کیوں نہ حاصل کرے۔ کہ جنت ابتداء اور بلا عذاب ملے یہ بیان ہوا لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ کا خلاصہ یہ ہوا کہ اس کے معنی ہیں کامل سلامتی کا گھر' لفظ دارالسلام ہی اس کمال پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ اول تو سلام مطلق ہے اور مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے پھر دار کے لفظ کو اس کی طرف مضاف کیا گیا ہے جو محاورہ کے اعتبار سے اسی معنی کو مفید ہے اور مراد اس سے جنت ہے جس کو حق تعالیٰ نے کامل امن کا گھر بنایا ہے وہاں خوف وخطر کا نام بھی نہیں آگے عندر بهم کو سمجھئے اس کے معنی ہیں ان کے رب کے پاس مراد اس سے فی الآخرة تو معنی یہ ہوئے کہ ان کو دارالسلام ملے گا آخرت میں اس کو میں بیان کروں گا کہ عندر بهم سے مراد دار آخرت قرآن کے محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں نے جس بناء پر اس کا ترجمہ دار آخرت کیا ہے وہ آگے بیان کروں گا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عندر بهم کا اطلاق متعدد معانی پر آتا ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

ترجمہ: اور حکم کیا کہ یہ راہ ہے میری سیدھی سو اس پر چلو اور مت چلو اور راستوں پر کہ وہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ کے راستے سے اور یہ حکم کر دیا ہے تم کو تا کہ تم بچتے رہو۔

تفسیری نکات

ترجمہ سے معلوم ہوا کہ راستے بہت ہیں جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا راستہ ہے اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں پس ان سب رستوں میں ایک تو اتباع کے قابل ہوگا باقی سب ترک کے قابل لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الٰہی کو دوسرے طرق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہم کو معلوم ہو سکے کہ فلاں راستہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اس کے سوا دوسرے قابل ترک

جس طرح معاملات حکام ورعایا میں معیار تعیین وتصحیح کا قانون ہے اسی طرح طریق نجات کے لئے بھی معیار صحیح قانون الٰہی ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ

الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ کہ جو آپ پر وحی ہوا ہے اس کو پڑھئے تو خلاصہ دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اور هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا میں صراط کو جو اپنی طرف منسوب ومضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہنچانے والا اور میرا بتلایا ہوا راستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو راستہ خدا تک پہنچانے والا ہوگا وہ مستقیم ہی ہوگا مستقیماً فرمایا اور مستقیم کے یہ معانی نہیں کہ کوئی خط مستقیم ہے نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم راستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفت مستقیم لائے ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک ہی راستہ بتلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے تو آج کل چونکہ لوگوں نے اس طریق کو معیار نہیں بنایا اس لئے بہت سے فرقے ہوگئے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ فرقوں سے مراد مسلمانوں کے فرقے ہیں۔

ترجمۂ اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ ' کہ واقعی یہ میرا راستہ ہے ھذا کا اشارہ اوپر کے احکام کی طرف ہے۔ جو امہات احکام ہیں جو تمام دین کا خلاصہ ہیں مگر وہ تو اجمال بصورت تفصیل تھی اور یہ یعنی آیت اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا اجمال بعد تفصیل ہے۔

رفع اشکال

قبل ازیں کہ میں اس آیت کے عنوان میں طرز شفقت کو واضح کروں ایک اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید کسی ذہین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہے کہ ہم کو بدوں ابتلاء بالا حکام کے جنت عطا فرما دیں اور شفقت کا مقتضی بھی بظاہر یہی تھا کہ ابتلاء سے محفوظ رکھ کر ہم کو نجات عطا فرماتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدوں ابتلاء وامتحان کے سب کچھ عطا فرما دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلاء وتکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرما دیتے ہیں۔ اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق وبعد کا نام ہے۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت — فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر — کنایتی ست کہ از روزگار ہجراں گفت

محبت کا اثر

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا جس میں اس راستہ کو اپنی طرف اس لئے

منسوب فرمایا کہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے اس عنوان سے سب کو اس کی طرف حرکت ہوگی خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا میرا بتلایا ہوا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اس پر چل کر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہنچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی ہو جائے گا تو اس کو اس کام میں سب مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو مگر اس کا علم ہو جاوے کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی یہی اثر ہوتا ہے چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا۔ اور ذرا اف نہ کرتا ننانوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ ننانوے کوڑوں پر آہ نہ کی اخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا میری حالت کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت میں مجھ پر یہ مصیبت آئی تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا۔

کرم عشق تو ام می کشد وغو غایست   تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہوگا۔ اسی بناء پر جب یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے یہ سن کر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا سا ہلکا کر دیا یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے اول تو دین کو فی نفسہ آسان کیا پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور مشقت آ جاتی ہے نہ اس کو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہوگئی کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔

بعض سنیاسیوں پر ذکر و شغل کا اثر

اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا کو سن کر ایک دفعہ تو کافر کو بھی اس کی طرف حرکت ہوگی اور وہ اس راستہ پر چلنا چاہئے گا کیونکہ خدا سے محبت کافر کو بھی ہے چنانچہ میں دیکھتا ہوں اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ بعض سنیاسی ذکر و شغل کرتے ہیں اور لذائذ کو ترک کر دیتے ہیں اس کا منشاء وہی محبت ہے گو وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور یہاں سے ایک بات اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ کفار کو ذکر الٰہی سے گو آخرت میں کچھ نفع نہ ہو اور یہ ذکر وہاں

ان کے لئے نجات کا سبب نہ ہو مگر دنیا میں ان کو بھی کچھ مل جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ کہ وہ کسی اچھے کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے بلکہ اگر ذاکر طالب آخرت ہے تو اس کو آخرت میں بھی اجر عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی طالب دنیا ہے تو اس کو دنیا میں کیفیات نفسانیہ ذوق وشوق وغیرہ عطا ہو جاتا ہے یہ اس کا اجر ہے۔

ترجمہ: یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے سو اس پر چلو جو کہ مستقیم ہے دوسری راہوں پر مت چلو وہ تم کو اللہ کی راہوں سے جدا کر دیں گی۔

ضرورت تدبیر

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس سے اوپر خدا تعالیٰ نے بعض احکام اعتقادیہ اور بعض احکام عملیہ بیان فرمائے ہیں ان کے بعد یہ جملہ ارشاد ہوا ہے ترجمہ اس کا یہ ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے اس کا اتباع کرو دوسرے طریقوں کا اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے دور کر دیں گے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ○ ترجمہ: یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کے اوپر نازل کیا تا کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں تا کہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

دوسری جگہ شکایت فرماتے ہیں۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں میں قفل لگ گیا ہے۔ یہ لوگ قرآن میں غور ہی نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ گئے ہیں کہ تدبر کی قدرت ہی نہیں رہی کیونکہ تدبر کرتے تو یہ حالت ہرگز نہ رہتی تدبر کا خاصہ ہے کہ اس سے رحمت کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور بغیر اس کے کچھ نہیں ہوتا' چنانچہ فرماتے ہیں۔

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ○ یعنی کیا ہم ان کو زبردستی اپنی رحمت چمٹا دیں گے اگرچہ وہ کراہت کرتے ہیں۔

سو اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ کیا ہمارے یہاں اس کے رکھنے کی جگہ نہیں اگر ہزار بار چاہیں تو ہم بھی متوجہ ہوں گے اور تمہاری توجہ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اور کام بھی ہماری ہی توجہ سے چلتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بچہ کو آپ لینا چاہئیں اور لینے کو ہاتھ بڑھائیں تو اگر بچہ اپنی بساط کے بموجب دوڑے اور کوشش کرے اگرچہ گر ہی جائے تو آپ خود دوڑ کر اٹھا لیتے ہیں اور یہ مسافت آپ ہی کے بڑھ کر اٹھا لینے سے طے ہوتی ہے ورنہ اس بچے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ خود مسافت کو طے کر سکے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی طرف بلاتے ہیں اگر یہ بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائے اور کوشش کرے تو اس جانب سے جذب ہوتا ہے اور اس جذب کی بدولت یہ وہاں پہنچتا ہے اور یہ فرلانگ دو فرلانگ کی مسافت تو

ممکن ہے کہ بچہ قطع کرے برخلاف اس بعد کے جو ممکن اور واجب میں ہے کہ اگر ادھر سے جذب نہ ہو تو کبھی یہ مسافت طے ہی نہیں ہو سکتی لیکن ادھر سے جذب ہونا آپ کی طلب پر موقوف ہے جس کو افسوس ہے کہ آپ نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہر وقت ہدایت دینے کو تیار ہیں مگر افسوس کہ ہم ہی قاصر ہیں اور وہ طلب یہی ہے کہ ہم تدبر کریں اور سوچ لیا کریں اس سے خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوتا ہے۔

ایک مشترک مرض

غرض خدا تعالیٰ اس مقام پر فرماتے ہیں اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ -- هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا میں عامل اشیر ہے جو کہ ھذا سے مفہوم ہے ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ میرے اس سیدھے راستہ کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا کر دیں گے۔ جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا راستہ ہے اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں پس ان سب راستوں میں ایک تو یہ اتباع کے قابل ہو گا باقی سب ترک کے قابل لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الٰہی کو دوسرے طریق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہم کو یہ بات معلوم ہو سکے کہ فلاں راستہ خدا کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اور اس کے سوا دوسرے قابل ترک اگر غور کیا جائے تو اسی آیت کے پورے مضمون سے اس معیار کا پتہ چل جائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ اس معیار کو چھوڑ دینے ہی سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی کہ بعض لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ ہم نے طریق الٰہی کو چھوڑ دیا یا لئے ہوئے ہیں چنانچہ اس جزو آیت سے اوپر کا جزو اس کے ساتھ ملایا جائے تو اس سے معلوم ہو جائے گا فرماتے ہیں قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ آؤ میں تم کو احکام خداوندی بتلاؤں اور وہ فلاں اور فلاں ہیں اس ارتباط باہمی سے اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ معیار طریق خداوندی کے دوسرے طریق سے ممتاز ہو جانے کا یہ ہے کہ جس بات کو نبی کریم ﷺ فرمائیں اور پڑھ کر سنائیں اور طریق خداوندی ہو گا اور حضور جو کچھ فرمائیں وہ وحی ہوتا ہے تو خلاصہ یہ نکلا کہ وحی سے جو ثابت ہو وہ طریق الٰہی ہے تو وحی معیار ہوئی مختلف طریق کے ممتاز کرنے کی اور اسی پر دار و مدار ہوا۔

اب میں اس مضمون کا انطباق آیت متلوہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو) یہ معنی معطوف ہے قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ (آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے) جو قل کے

تحت میں ہے تقدیر یہ ہوئی قُلْ تَعَالَوْا الخ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الخ (آپ کہہ دیجئے یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس جگہ ان مکسورہ ہوتا کیونکہ قول کے تحت میں ان مکسورہ ہی آیا کرتا ہے اور ایک قراءت میں مکسورہ ہے بھی مگر ہماری قراءت میں ان مفتوحہ ہے جن کی وجہ صحت یہ ہے کہ اس قراءت میں یہاں اخبر (خبر دے دیجئے) مقدر ہے جس کے ملانے کے بعد لفظاً یہ قل کے اوپر معطوف ہے اس لئے منصوب ہو گیا گو معناً تعالوا پر عطف ہے ترجمۂ آیت کا یہ ہے کہ (لوگوں کو) بتلا دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو۔ ھذا سے مذکور سابق کی طرف اشارہ ہے اور تقریباً دس احکام اوامر و نواہی کا مجموعہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۞ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا

ترجمہ: آپ (ان سے) کہئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور دوسرے یہ کہ ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو (زمانہ جاہلیت میں اس کی عادت تھی کہ اولاد کو زندہ درگور کر دیتے تھے (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو دونوں کو رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمہارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں پھر کیوں قتل کرتے ہو۔ پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ اور (پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق (شرعی) پر قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا اس سب کا تم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے) جو شرعاً مستحسن ہے (مثلاً اس کے کام میں لگانا اس کی حفاظت کرنا اور بعض اولیاء و اوصیاء کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے جس کا حکم فقہ میں مذکور ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جاوے (اس کے بعد اس کا مال اس کو دیدیا جائے گا بشرطیکہ سفید یعنی بے وقوف نہ ہو پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور ساتویں یہ کہ ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو

انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے اور نہ آوے پس آپس میں دغا کرنا حرام ہوا اور آگے بتلاتے ہیں کہ یہ احکام کچھ دشوار نہیں جن پر عمل دشوار ہو کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کی کیا وجہ) اور آٹھویں یہ کہ جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق) کوئی بات کیا کرو تو (اس میں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو جیسے قسم یا نذر اس کو پورا کیا کرو (بشرطیکہ وہ نذر و قسم خلاف شرع نہ ہو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس گو ھذا کا مرجع یہ امور مذکورہ ہیں لیکن یہ اشارہ علی سبیل التخصیص نہیں بلکہ علی سبیل التعمیم ہے یعنی وہ دین جس کے یہ احکام بطور نمونہ کے ہیں سب کا سب واجب الاتباع ہے اور اشارہ میں تعمیم کی وجہ ظاہر ہے کہ وجوب اتباع کچھ انہی احکام میں منحصر نہیں اور نہ حضور علیہ السلام کا راستہ انہی کے ساتھ مخصوص ہے پس ھذا کے بعد صراطی فرمانا خود تعمیم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس صراط کا دیگر احکام پر مشتمل ہونا سب کو معلوم ہے خود قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سے احکام مذکور ہیں اور احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں سے بھی کہہ دیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ دین اسلام اور اس کے سب احکام جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے ہیں میرا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو پس ہذا سے حقیقت میں دین اسلام کی طرف اشارہ ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن میں اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اور ان احکام تسعہ مذکورہ کے ذکر کے بعد ھذا سے مجموعہ دین کی طرف اشارہ کی وجہ صحت یہ بھی ہے کہ یہ احکام مذکورہ گو ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں یہ سارے اسلام کا خلاصہ ہے کیونکہ ان میں عقائد و معاملات و معاشرات و عبادات کے مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام سب محکموم ہیں جو کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہے پھر اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے) میں صراحتہ تعمیم کر دی گئی جس سے بقیہ احکام غیر محکمہ بھی اجمالاً سب مذکور ہو گئے اور صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حق تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ حضور علیہ السلام ہیں کیونکہ یہاں حضور علیہ السلام کو حکم ہو رہا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ یہ آیت معنی تعالو پر معطوف ہے جو قل کے تحت میں ہے اور لفظاً یہاں اخبر محذوف ہے پس خطاب قل و خبر (آپ کہہ دیں اور خبر دیدیں) کے بعد ضمیر متکلم کا مرجع قائل ہی ہو سکتا ہے اور قائل حضور علیہ السلام ہیں تو اس ضمیر کا مرجع بھی آپ ہی ہیں چنانچہ اس کی نظیر دوسری جگہ بھی مذکور ہے کہ وہاں بھی دین اسلام کو حضور علیہ السلام کا راستہ کہا گیا ہے۔

صراط الرسول علیہ وسلم صلی اللہ دراصل صراط اللہ ہے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (آپ فرما دیجئے یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی) اور اسلام کو حضور علیہ صلی اللہ کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہے کہ آپ اس طریق کے داعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے چنانچہ بعض جگہ حقیقت کے موافق ارشاد ہے۔ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کر رہے ہیں یعنی اس خدا کے راستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) اس پر یہ سوال وارد ہوگا کہ جب حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے تو پھر ہر جگہ حقیقت کے موافق کلام کیوں نہ فرمایا بعض جگہ مجازاً اس کو صراط رسول علیہ صلی اللہ اور بعض جگہ حقیقت کے موافق صراط اللہ کیوں فرمایا تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض جگہ حضور علیہ صلی اللہ کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تا کہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں اگر پہلے ہی یہ فرما دیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے۔

تفسیری نکتہ

ایک بات یہاں اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلے تو صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حضور علیہ صلی اللہ تھے جس میں اس راستہ کی طرف اضافت حضور علیہ صلی اللہ کی طرف تھی اور یہاں عن سبیلہ بضمیر غائب فرمایا گیا ہے اس کا مرجع حق تعالیٰ ہیں حضور علیہ صلی اللہ نہیں ہیں ورنہ سبیلی بیاء متکلم فرماتے سو اس کی توجیہ کی اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ اضافت تو حقیقت کے موافق ہے۔ توجیہ کی ضرورت تو صراطی میں تھی جس کا نکتہ میں بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ارشاد ہے

وَصّٰكُمْ کا مفہوم

ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس کی خدا تعالیٰ نے تم کو وصیت فرمائی ہے تا کہ تم تقوی حاصل کرسکو وصیت کرنے سے مراد تاکیدی حکم دینا ہے کیونکہ وصیت اصل میں اس بات کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مرنے کے وقت عزیزوں اور وارثوں سے کہا کرتا ہے چونکہ وہ انسان کا آخری وقت ہوتا ہے اس لئے اس وقت جو بات کہتا ہے وہ خاص ضرورت کی باتیں ہوتی ہیں جن کی تعمیل کو وہ بہت مؤکد ولازم کیا کرتا ہے چونکہ حق تعالیٰ عدم وفنا سے پاک ہیں اس لئے یہاں پر وصیت کے معنی متعارف تو ہو نہیں سکتے بلکہ اس کا لازم مراد ہے یعنی حکم تاکیدی

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یہ نتیجہ ہے اتباع صراط مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستہ پر چلو تو امید ہے کہ تم کو وصال مقصود حاصل ہو جائے گا اس طرح سے تم نجات آخرت سے کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ تقوی کے معنے لغت میں بچنے کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ تم عذاب سے بچے رہو گے۔

خلاصہ نجات

اور یہی خلاصہ ہے نجات کا اور شریعت کی اصطلاح میں تقوی کمال دین کو کہتے ہیں چنانچہ موارد نصوص میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اس تفسیر پر مطلب یہ ہوا کہ اس راستہ پر چلنے سے تم کو کمال دین حاصل ہو جائے گا اور یہی حاصل ہے مقصود پر پہنچنے اور منزل پر وصول ہو جانے کا اس کے بعد میں اس آیت کو مضمون پر منطبق کرنا چاہتا ہوں گو اس تفصیل کے بعد تقریر انطباق کی ضرورت نہیں رہی مگر میں تبرعاً اس کو بھی بیان کئے دیتا ہوں تا کہ پوری تسلی ہو جائے کہ آیت مضمون مقصود پر بسہولت منطبق ہے سو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ھذا صراطی سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اسلام گو نالغۃ ہے مجموعہ اعمال کا اور عقائد اس میں مجازاً داخل ہیں اور حقیقۃً عقائد ایمان کا مدلول ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور اسلام فعل جوارح اور یہ اصطلاح لغوی ہے کیونکہ ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں جو اولاً بالذات قلب سے صادر ہوتی ہے اور اسلام کے معانی گردن نہادن بطاعت ہیں جس کا محل جوارح ہیں اور بعض نصوص میں بھی اسلام و ایمان کا اطلاق اس حقیقت کے موافق وارد ہے۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے) لیکن یہ حقیقت لغویہ ہے اصطلاح شرعی میں اسلام نام ہے۔ مجموعہ عقائد و اعمال کا اور ایمان نام ہے مجموعہ عقائد کا تو شرعاً اسلام عام ہے اور ایمان خاص اور یہاں پر ھذا صراطی سے جو اسلام کی طرف اشارہ ہے اس سے یہی اسلام شرعی مراد ہے جو عقائد و اعمال سب کو شامل ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ اوپر قل تعالوا (آپ کہیے کہ آؤ) میں عقائد و اعمال دونوں کا ذکر ہے اس کے بعد وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) فرمایا گیا ہے تو اس میں مجموعہ عقائد و اعمال کی طرف اشارہ ہونا مناسب ہے اور ان اعمال و عقائد کو جو صراط فرمایا گیا تو تخصیص ان ہی اعمال و عقائد کی مقصود نہیں یہ تو بطور تمثل کے فرمایا ہے مقصود اتباع صراط اسلام کا ہے جو تمام اصول و فروع کو شامل ہے البتہ ایک تحقیق سمجھنے کی یہاں ضرورت ہو گی وہ یہ کہ اوپر بعض نواہی کا ذکر ہے جیسے لا تشرکوا — ولا تقتلوا — ولا تقربوا (مت شریک کرو اور مت قتل کرو اور نہ قریب جاؤ اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو) اور بعض مامورات کا ذکر ہے جیسے بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا - وَاَوْفُوا الْكَيْلَ - وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (والدین کے ساتھ احسان کرو ناپ تول پوری کرو) اور ان سب کو صراطی فرمایا اس کے اتباع کا امر فرمایا تو

صراط کہیں فعل ہوگا کہیں ترک اور اتباع فعل سے ہوگا کہیں ترک سے غرض ھذا صراطی سے مراد تمام وہ اعمال و مامورات ہیں جو معین آخرت ومفید مقصود ہیں جن کا مفید ہونا مستقیما میں مدلول ہے کہ استقامت کے لئے موصل الی المقصود ہونا لازم ہے اور وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهٖ (دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی) میں تمام وہ اعمال آ گئے جو مانع عن الاخرت ومضر للمقصود ہیں اور مضر ہونا فتفرق سے ظاہر ہے۔ پس ان مقدمات سے حاصل یہ ہوا کہ وہ ہم کو ہر کام میں دیکھنا چاہئے کہ یہ فعل معین آخرت ہے یا مضر آخرت ہے اب اس میں تمام شریعت آ گئی کوئی مضمون شریعت کا اس سے خارج نہیں رہا۔

آگے فرماتے ہیں مستقیما یعنی یہ راستہ مستقیم ہے لفظ مستقیم کے معنی ایک تو لغوی ہیں یعنی اقصر الخطوط الواصلة بين النقطتين (دو نقطوں کے درمیان میں جو خطوط واصل ہو سکیں ان میں جو سب سے چھوٹا ہو وہ مستقیم لغوی ہے) اور ایک معنی عرفی ہیں یعنی بے خوف وخطر راستہ عرف میں راہ راست کو کہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں گاؤں کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ اس کو چلے جاؤ حالانکہ اس میں موڑ بھی آتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ بے خطر ہے اس میں تم کو غلطی پیش نہ آئے گی۔ صاف سڑک پڑی ہوئی ہے اور یہی عرفی معنی اس شعر میں مراد ہیں۔

راہ راست برو اگرچہ دور است (بے خطر راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو)

بے خطر راستہ صراط حق ہے

اگر راہ راست کے معنی عرفی نہ لئے جائیں تو لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ دور راست (اگرچہ دور ہو) نہیں بن سکتا کیونکہ جو راستہ لغۃً مستقیم ہوگا وہ اوروں سے دور کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے اقصر الطرق ہونا لازم ہے جن لوگوں کو مستقیم کے لغوی اور عرفی معنی میں فرق معلوم نہیں وہ اس شعر کو حل نہیں کر سکتے مگر اس تحقیق کے بعد مطلب صاف ہے کہ بے خطر راستہ کو اختیار کرو اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو یہ تو لفظ کی تحقیق تھی اب میں کہتا ہوں کہ صراط حق یعنی اسلام کے متعلق یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صراط مستقیم بے خطر بھی ہے اور وصول الی اللہ میں وہ تمام طرق سے اقرب واقصر بھی ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ چاہے مستقیم کو لغوی معنی پر محمول کیجئے یا عربی پر (یا دونوں پر ۱۲) یہاں سب کی گنجائش ہے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهٖ یعنی اس راستہ (اسلام) کا اتباع کرو اور دوسرے مختلف راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا اور دور کر دیں گے اور دور ہونا اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ وہ موصل تو ہوتے ہیں نقطہ مقصود سے دور تو نہیں کرتے بلکہ اس طرح کی دوری ہے جیسے مثلث کی ایک ساق کو چھوڑ کر اگر دوسری ساق پر چلنے لگے تو ساق اول سے وقتاً

فوقتاً بعد ہی بڑھتا جاتا ہے جیسے اقصر الخطوط کے سوا تمام خطوط واصلہ دور دراز ہوا کرتے ہیں اور جدا ہونا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ بے خطر راستہ کو چھوڑ کر خطرناک راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مقصود تک وصول میسر نہیں ہوتا بیچ ہی میں ہلاک ہو جاتا ہے۔

تینوں آیات کے آخر میں ذالکم وصکم کا عجیب نکتہ

اب یہاں آیت کے متعلق ایک نکتہ ہے اس کو بیان کر کے میں ختم کئے دیتا ہوں نکتہ یہ ہے کہ اس جگہ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (آپ کہہ دیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) سے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) تک تین آیتیں ہیں اور ہر آیت کے ختم پر حق تعالیٰ نے ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تا کہ تم سمجھو) فرمایا ہے لیکن پہلی آیت کے اخیر میں تو وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تا کہ تم سمجھو) فرمایا اور دوسری آیت کے ختم پر ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو) فرمایا اور اس تیسری آیت کے اخیر میں ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ فرمایا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وصیت سب کی مقصود ہے تو اس تفرق عنوان کی کیا ضرورت ہے گو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود تفنن کلام ہے جو ایک شعبہ ہے بلاغت کا اور کسی نکتہ کے بیان کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر بعض لوگ چلبلے ہوتے ہیں وہ اتنی بات پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ان کا ذہن اس سے آگے چلتا ہے تو انہوں نے اس تفرق عنوان میں یہ نکتہ بتلایا ہے کہ پہلی آیت میں جن پانچ امور کا ذکر ہے ان میں سے بجز اساءۃ بالوالدین یعنی ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرنے) کو اعتقاداً اچھا نہ سمجھتے تھے اس کے سوا سب میں ان کی اعتقادی غلطی تھی اس لئے باعتبار اکثر کے وہاں تعقلون فرمایا کیونکہ اعتقادیات کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے اور دوسری آیت میں مخاطبین کی کوئی اعتقادی غلطی نہ تھی بلکہ وہ احکام عمل کے متعلق ہیں جن میں وہ تغافل و سہو کرتے تھے اس لئے وہاں تذکرون مناسب ہوا اور تیسری آیت میں کسی خاص حکم کا بیان نہیں بلکہ عام حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا تو وہاں تتقون مناسب ہوا کیونکہ تقوی بھی شرعاً عام ہے جس کا تعلق عقائد و اعمال وغیرہ سب سے یکساں ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسروں کی راہوں پر مت چلو کہ وہاں راہیں تم کو اللہ کی راہوں سے جدا کر دیں گی۔

محبت کا اثر

اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اس لئے اس مقام پر فرماتے ہیں **وان ھذا صراطی مستقیما** کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا جس میں اس راستہ کو اپنی طرف اس لئے منسوب فرمایا کہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے اس عنوان سے سب کو اس کی طرف حرکت ہوگی خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا میرا بتلایا ہوا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اس پر چل کر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہنچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی ہو جائے گا تو اس کو اس کام میں سب مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو مگر اس کا علم ہو جائے کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی یہی اثر ہوتا ہے چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا اور ذرا اف نہ کرتا نانوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ ناوے کوڑوں پر آہ نہ کی آخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی کہا نانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا میری حالت کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت میں مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا

بجرم عشق تو ام می کشند و غو غائیست ۔۔۔ تو نیز بر سر بام آ کہ خوشنما شائیست

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہوگا۔ اسی بناء پر جب یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے یہ سن کر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہوگی کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا سا ہلکا کر دیا۔ یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے کہ اول تو دین کو فی نفسہ آسان کیا پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور مشقت آ جاتی ہے نہ اس کو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہو گئی کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا۔ اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ

ترجمہ: یعنی جو شخص نیکی لائے اسکے لئے اسکی دس مثل اور جو برائی کرے تو اسکے برابر جزا ملے گی۔

اس سے مضاعفت اور خیریت مذکور آیت سابقہ کی تعیین ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قانون عام ہے اس لئے لفظ من عام ہے کوئی اس سے مخصوص نہیں پس مضاعفت دس سے کم تو کسی حال میں نہ ہوگی اور جو حدیث میں نے اول پڑھی تھی اس سے منتہائے اکثری بھی اس مضاعفت کا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اخلاص کے تفاوت سے سات سو تک مضاعفت ہوتی ہے یعنی اگر کوئی ایک پیسہ دے تو سات سو پیسوں کا اگر ایک روزہ رکھے تو سات سو روزوں کا ثواب لگتا ہے علیٰ ہذا ایک آیت پڑھے تو سات سو آیت کا' ایک قرآن ختم کرے تو سات سو قرآن کا ثواب ملتا ہے۔

اس منتہا کو جو میں نے اکثری کہا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ لیکن یہ کثرت اضافی نہیں بلکہ فی نفسہ کثرت مراد ہے کہ قرآن و حدیث میں غور کرنے سے سات سو کی تحدید معلوم نہیں ہوتی بلکہ غیر متناہی مضاعفت ہوتی ہے اور متناہی سے مراد غیر متناہی بالفعل مراد نہیں بلکہ بمعنی لا تقف عند حد (یعنی کسی پر موقوف نہیں) مراد ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کی ایک مثال ارشاد فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضاعفت کا انتہا نہیں' چنانچہ ارشاد ہے مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة' جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے ایک دانہ ہو وہ سات بالیں اگا دے اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔

اس کے آخر میں ارشاد ہے: واللّٰہ یضاعف لمن یشاء والله واسع علیم

یعنی اللہ جس کے واسطے چاہیں اس سے بھی زیادہ بڑھا دیں اللہ تعالیٰ وسعت والے علم والے ہیں۔

یہ جملہ ماسبق کی علت ہے کہ اس مضاعفت سے حیرت اور تعجب نہ کرو اللہ تعالیٰ صاحب وسعت ہیں ان کے یہاں تنگی نہیں اور اس کے ساتھ ہی دھوکا میں پڑنے والے کا علاج بھی ارشاد فرما دیا کہ وسعت پر مغرور مت ہو جاؤ اور یہ مت سمجھو کہ ہماری نیکی قابل مضاعفت ہے اس کے لئے وہ علیم بھی ہیں یعنی یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی کی نیکی مضاعفت کے قابل ہے اور کسی کی نہیں۔ جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر مضاعفت ہوتی جائے گی اور چونکہ اخلاص کی کوئی حد نہیں لہٰذا اس مضاعفت کی بھی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے۔

نیکی کا قانون

الحاصل نیکی کا قانون عام کہ جس سے کوئی مومن مخصوص و مستثنیٰ نہیں یہ ہوا کہ ایک نیکی کے بدلے دس ملتی

ہیں اور باعتبار اکثر کے سات سو تک مضاعفت ہوتی ہے اور سات سو سے آگے (غیر حد تک) مضاعفت ہو سکتی ہے یہ تو آیت سے مضاعفت کا غیر محدود ہونا معلوم ہوا ہے۔

اب حدیث لیجئے حدیث میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص ایک چھوہارا صدقہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دست مبارک میں لیتے ہیں اور اس کی پرورش فرماتے ہیں کما یربی احد کم فلوہ یعنی ایسے پرورش فرماتے ہیں یعنی اس کو بڑھاتے ہیں جیسے ایک تمہارا اپنے بچھیرے کو پرورش کرتا ہے اور بڑھاتا ہے۔

بچھیرے کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ عرب کے لوگ گھوڑوں کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ ایک جنگ جو اور بہادر قوم ہے اور گھوڑا جنگ میں بڑا کام آنے والا ہے قرار میں بھی اور فرار میں بھی اگر میدان میں قائم رہ کر حرب میں مشغول رہیں تو اس میں بھی گھوڑا کام دینے والا ہے۔ اور اگر مغلوب ہونے کی حالت میں بھاگنے کی ضرورت ہو تو اس موقع پر بھی گھوڑے سے زیادہ کوئی جانور کام کا نہیں اور حرب میں یہی دو موقع ہوتے ہیں کبھی قرار ہوتا ہے اور کبھی فرار، اور جیسے قرار فی الحرب (لڑائی میں برقرار رہنا) شجاعت شمار ہوتی ہے اس لئے موقع سے اپنی جان بچا کر نکل بھاگنا یہ بھی درستی حواس سے ہوتا ہے اور درستی حواس جب ہی ہوگی جب کہ قلب ضعیف نہ ہو، آدمی دلیر اور بہادر ہو چنانچہ عرب جہاں اشعار میں قرار پر یعنی جمع رہنے پر فخر کرتے ہیں اسی طرح فرار یعنی میدان سے بھاگ جانے پر بھی فخر و ناز کرتے ہیں اس لئے کہ عرب کی شاعری نہایت سادہ رنگ لئے ہوئے ہے عجم کے تکلفات وہاں نہیں ہیں۔ غرض گھوڑا قرار اور فرار دونوں وقت میں چونکہ کام آتا ہے اس لئے وہ عرب کو بہت محبوب تھا اور ظاہر ہے کہ بچہ تو ہر شے کا پیارا معلوم ہوتا ہے خاص کر محبوب کا بچہ تو اور بھی زیادہ محبوب ہوگا۔ اس لئے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جیسے تم بچھیرے کو پالا کرتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ اس چھوارہ کو پرورش فرماتے ہیں آگے فرماتے ہیں۔

حتی یکون اعظم من احد یعنی اس چھوارہ کی اتنی تربیت فرماتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہو جاتا ہے۔

اس حدیث کے اندر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سات سو کی تخصیص تحدید کے لئے نہیں اس لئے کہ چھوہارہ کے برابر احد پہاڑ کے ٹکڑے کئے جائیں تو سات سو کیا سنکھوں مہاسنکھوں سے بھی زیادہ پر نوبت پہنچے گی اور وزن کے اعتبار سے اگر چھوارہ کے برابر حصے کئے جائیں تو اور بھی زیادہ ہو جائیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں

خود یابد ایں چنیں بازار را ۔۔۔ کہ بیک گل مے خری گزار را

نیم جاں بستاند وصد جان دہد ہرچہ درو ہمت نیا یدآں دہد

(الصوم ملحقہ مواعظ فضائل صوم وصلوۃ صفحہ ۸۹تا۹۱)

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ سو اس کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے' ان کا طریقہ یہ ہے ابھمو ما ابھمه الله کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدوں ابتلاء مقصود ہوتی تو اسکے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے۔ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ میں اطاعت بدوں ابتلاء ہی ہے ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاومت ومنازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے۔

ترجمہ اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس پر چلو

تمام دین کا خلاصہ

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام دین کا خلاصہ ارشاد فرمایا ہے دین اس کی تفسیر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اس کو سن کر عمل کی رغبت ہوتی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ وہ احکام جو فی نفسہ آسان ہیں مگر مخالفت نفس اور منازعت نفس کے عارض سے دشوار ہو گئے ہیں ان کو نہایت سہل عنوان سے بلکہ شوق دلانے والے عنوان سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ عارضی دشواری شوق کی حرکت سے مغلوب ہو جائے اور یہ دلیل ہے حق تعالیٰ کے شفیق ہونے کی' حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا ہے اور جتنے ضوابط وقواعد حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بندوں کی مصلحت کے لئے ہیں۔ وہ ضابطہ محضہ نہیں بلکہ عین شفقت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بچہ کنویں میں گرنے لگے تو اس کو گرنے سے اس طرح روکتے ہیں کہ ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور دو چار طمانچہ لگا کر وہاں سے ہٹا دیتے ہیں شفقت کا ہٹانا یہی ہے نہ یہ کہ اہل حکومت کی طرح ضابطہ سنا دیا جائے جسے حکام وسلاطین اور ان کے نواب کا طریقہ ہے کہ منادی کرنے والا ایک طرف سے

منادی کرتا چلا گیا چاہے کوئی سنے یا نہ سنے سمجھے یا نہ سمجھے اور رغبت ہو یا نہ ہو سو یہ ضوابط ہیں اور حق تعالیٰ کے احکام میں ایسے ضوابط نہیں ہیں ہاں صورت ضوابط کی ہے سو اس کی ایسی مثال ہے جیسے حکیم دوا کی مقدار معین کرتا ہے وقت مقرر کرتا ہے پرہیز متعین کرتا ہے تو ظاہر میں یہ بھی ضوابط ہیں مگر حقیقت میں یہ محض ضوابط نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ ضوابط مرتفع ہو جائیں تو حقیقت میں اہلاک ہوگا۔ طبیب یہ قیدیں صرف مریض کی مصلحت سے لگاتا ہے اپنی مصلحت کے لئے نہیں لگاتا اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنی شان حکومت کے لحاظ سے ضوابط مقرر نہیں فرمائے بلکہ بندوں کی مصالح اور منافع کے لئے متعین فرمائے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا تو بندوں ہی کا ضرر تھا پس احکام میں بظاہر جو کچھ قواعد وضوابط ہیں ان کا مبنیٰ شفقت ہے اور اسی شفقت کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام کو ایسے عنوان سے بیان فرماتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو ان کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوئی اور شوق پیدا ہو جاتا ہے جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اس کی رعایت کرتا ہے کہ بیٹا سمجھ لے اور اس کی سمجھ میں بات آ جائے چنانچہ اس آیت میں بھی اس طرز شفقت کی پوری رعایت ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾

ترجمہ: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا' اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اس طرح حکم ہوتا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔

تفسیری نکات

اسلام کامل کی تفسیر

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو ارشاد فرمایا ہے کہ اپنا مشرب ظاہر کر دیجئے اس واسطے کہ صیغہ امر لایا گیا ہے اور حضور ﷺ کو ایسا امر کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہم لوگ بھی امتثال کریں۔

بحمد للہ ہم صفت اسلام کے ساتھ متصف تو ہیں اور اسلام ہم میں موجود ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کامل ہے یا ناقص؟ تو اب پہلے کامل کو سمجھئے اس سے خود معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں وہ درجہ ہے یا نہیں' فرماتے ہیں اپنا

مسلک ظاہر کر دیجئے کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لاشریک لہ میں اس کا ترجمہ کرتا ہوں کہ (میرا مسلک تو یہ ہے کہ) میری نماز عبادت مرنا جینا سب اللہ کے لئے ہے (وہ کیسے ہیں) وہ رب العلمین ہیں ان کا کوئی شریک نہیں ہے وبذالک امرت اور مجھ کو اسی کا حکم کیا گیا ہے وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہوں۔ یہ لفظ مسلمین کو خوب مل گیا ہے یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اسلام ہی کی شرح کی گئی ہے کیونکہ مامور بہ باجزاء بیان کرنے کے بعد اس کی تعمیل کرنے والوں کا لقب مسلمین فرمایا گیا ہے تو اس کے یہی معانی ہوئے کہ اس مامور بہ کے اجزاء جمع کرنے سے یہ لقب مسلم حاصل ہوتا ہے اور مسلم وہی ہے جس میں یہ امور ہوں جن کا یہاں ذکر ہے تو یہ معنی ہوئے کہ یہ مامور بہ کا مجموعہ عین اسلام ہے لیجئے تصریح ہوگئی کہ آیت میں اسلام کامل کی تفسیر بتائی گئی ہے۔ فالحمد لله علی ذلک

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کو تعلیم کی جاوے کہ کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہو پھر الحمد اور سورت پڑھو پھر کمر جھکاؤ پھر کھڑے ہو پھر زمین پر ماتھا رکھو پھر کھڑے ہو جاؤ اور اسی ترکیب سے چار دفعہ ان سب کاموں کو کرو اور بعد میں کہہ دیا جائے کہ جب تم چار دفعہ ایسا کر لو گے تو سمجھ لینا کہ نمازی بن گئے تو اس تعلیم میں گو اس نے شروع سے یہ نہیں کہا کہ میں تم کو نماز سکھلاتا ہوں لیکن اخیر میں یہ لفظ کہہ دینے سے کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے۔ صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان افعال کا کرنے والا نمازی ہے اور ان افعال کا مجموعہ نماز ہے۔ اور یہ سب اجزاء نماز کے ارکان ہیں اسی طرح یہ تعلیم فرما کر کہ اپنا مسلک یہ رکھئے کہ نماز بھی خدا کے لئے ہو اور ہر عبادت بھی خدا کے لئے ہو اور مرنا بھی خدا کے لئے ہو اور جینا بھی خدا کے لئے ہو اس کے بعد یہ فرمانا کہ بس مجھے اسی کا امر ہے اور میں اپنے آپ کو سب سے پہلا مسلم کہتا ہوں یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے مثال میں کہا گیا تھا کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلک اختیار کرنا مسلم بننا ہے اور یہ مسلک اسلام ہے اور یہ اجزاء اسلام کے اجزاء ہیں اور اول کا لفظ صاف بتلاتا ہے کہ اسلام کامل مراد ہے کیونکہ اولیت سے مراد اولیت زمانی نہیں ہے بلکہ اولیت فی الرتبہ ہے جس کا ترجمہ ہے سب سے بڑھ کر مسلمان ہونا یہی بعینہ ترجمہ ہے اسلام کامل کا جیسا کہ ظاہر ہے لیجئے اب تو میرے مدعا کے لئے بالکل صاف صاف الفاظ مل گئے۔

اسلام کامل کے اجزاء

اب سمجھئے کہ یہاں اسلام کامل کی حقیقت چار اجزا میں بیان فرمائی گئی ہے کہ یہ چار چیزیں اللہ ہی کے

لئے خالص کر دو نماز' عبادت' موت' حیات ان سب کو اللہ ہی کا کر دو بس اتنی حقیقت ہے اسلام کامل کی اجمال تو یہ ہے جو بہت ہی ذرا سا ہے مگر اس کی تفصیل کچھ شرح اور طول چاہتی ہے اور تفصیل بھی ایک تو اختصار کے ساتھ ہو سکتی ہے اور ایک طول وبسط کے ساتھ' اختیار کے ساتھ تو یہ ہے کہ یہاں جو حقیقت اسلام کامل کی چار اجزاء میں بتلائی گئی ہے کہ ان چار کو یعنی نماز اور عبادت اور موت اور حیات کو اللہ ہی کے لئے خالص کر دو اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ ان چاروں کو صرف عقیدہ کے مرتبہ میں اللہ کی سمجھتے رہو کیونکہ اس سے تو کوئی ادنی درجہ کا مسلمان بھی خالی نہیں ہر مسلمان ان چار چیزوں کو ہی کیا بلکہ ہر چیز کو اعتقاداً اللہ ہی کی سمجھتا ہے تو پھر کامل اور ناقص میں فرق ہی کیا ہوا؟ بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان چار چیزوں کو اعتقاداً اللہ کی سمجھ کر حالاً بھی ان کو ان کے ہی سپرد اور تابع کر دو' جب اپنے کو اللہ کی ملک سمجھا تو ان کو اعتقاداً بھی تصرف کا مستحق سمجھو اور حالاً بھی منقاد ہو جاؤ یعنی دل سے عقیدہ یہ رکھو کہ یہ سب چیزیں خدا کی ہیں اور حالاً بھی ان کے تصرف کو تسلیم کر کے بالکل منقاد اور مطیع اور فرماں بردار بن جاؤ کہ ان چاروں میں جس طرف چلائیں اسی طرف کو چلو تو حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ جو تصرف بندہ کی نماز میں عبادت میں حیات میں موت میں کریں اس کا اعتقاداً وحالاً منقاد اور فرماں بردار ہونا اسلام کامل ہے۔ یہ تفصیل ہوئی اختصار کے ساتھ

کمال اسلام کے بارے میں تفصیل

اب قدرے طول اور بسط کے ساتھ تفصیل سنئے وہ یہ ہے کہ یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں چنانچہ میں نے ابھی کہا ہے کہ حق تعالیٰ کو تصرف کا مستحق سمجھو اور تم انقیاد کرو تو یہ چیزیں دو ہوئیں تصرف اور انقیاد تصرف تو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور انقیاد ہمارا فعل ہے اب خدا کے فعل یعنی تصرف کی حقیقت بھی سمجھنا اور اس کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت معلوم کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے تو چار چیزیں ہوئیں تصرف کی حقیقت سمجھنا' اور عقیدہ رکھنا تصرف پر اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت سمجھنا اور عمل کرنا اس پر بس اسی سے اسلام کامل ہوگا ان چاروں کو ترتیب وار سن لیجئے اول حقیقت سمجھنا تصرف حق کی ان چار چیزوں میں یعنی نماز میں عبادت میں موت میں حیات میں اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے مگر اس کے قبل اس کے متعلق ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ یہ جو چار چیزیں بتلائی گئیں یہ چار برائے نام ہیں۔ عنوانات چار ہیں ورنہ معنوی حقیقت میں تین ہیں یا دو اس طرح کہ صلوۃ کے معنی ہیں نماز اور نسک کے معنی ہیں عبادتیں اور نماز بھی عبادت میں داخل ہے تو یہ تعمیم بعد تخصیص ہے اس کے لئے دراصل صرف نسک کا لفظ بھی کافی تھا نماز بھی اس میں آ جاتی لیکن نماز کا نام جدا لیا گیا بغرض اہتمام کے تو یہ معنی ہو گئے کہ ساری عبادتیں ملک ہیں اللہ کی' تو اب ان دو جزو

میں سے ایک جزو رہ گیا یعنی عبادت جس میں نماز بھی آ گئی جب چار جزو میں سے ایک کم ہو گیا تو تین جزو رہ گئے یہ تو تین جزو ہونے کی تقریر ہوئی اور دو جزو ہونے کی تقریر یہ ہے کہ اس کے بعد و محیای و مماتی آیا ہے اس کے معنی ہیں میرا مرنا اور میرا جینا اس میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ ہے کہ ان سے حالت حیات اور حالت موت مراد ہو دوسرا یہ کہ حیات و موت کے احکام مراد ہوں اگر حالت حیات اور حالت موت مراد ہو تو پھر یہ دونوں مل کر ایک ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ دنوں غیر اختیاری امور ہیں اور صفت غیر اختیاری دونوں میں مشترک ہے اور پیشتر صلوتی و نسکی کا متحد ہونا معلوم ہو چکا ہے تو معنوں کے درجہ میں بجائے چار کے دو جزو رہ گئے اس طرح کہ موت اور حیات تو حالت غیر اختیاری ہوئی اور عبادت فعل اختیاری ہے تو معنی آیت کے یہ ہو جائیں گے کہ ہمارے تمام حالات اختیاریہ و غیر اختیاریہ اللہ تعالیٰ کے ملک ہیں اور دوسری شق پر یعنی جب کہ حیات اور موت سے مراد احکام ہیں جو بعد موت کے جاری ہوتے ہیں اور احکام حیات تمام ان احکام کو شامل ہے جو زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اس میں تمام عبادتیں آ گئیں نماز بھی آ گئی اور بقیہ احکام متعلقہ حیات بھی آ گئے۔ تو اس طرح سے تین چیزیں تو احکام حیات میں آ گئیں یعنی نماز اور عبادتیں اور بقیہ احکام متعلقہ حیات' اور ایک چیز احکام موت میں آ گئی تو پھر بھی دو چیزیں ہو گئیں۔ غرض تین چیزیں کہو یا دو کہو سب کا حاصل یہ ہوا کہ ہمارے حالات اختیاریہ اور غیر اختیاریہ پھر وہ حالات موت کے ہوں یا حیات کے سب ملک اللہ کے ہیں یہ حاصل ہے آیت کا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مضمون بہت مختصر الفاظ میں بھی آ سکتا تھا مثلاً یوں ہوتا کہ احوالنا الاختیاریۃ وغیرہ الاختیاریۃ للہ' پھر ان سب کو الگ الگ کیوں بیان کیا گیا ایجاز کی جگہ اطناب کو کیوں اختیار کیا گیا اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں اور ان سب مذاقوں پر اصلاح مقصود ہے سو ایک مذاق جو آج کل غالب ہے یہ بھی ہے کہ ان کے خیال میں عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور ان میں ہر طرح اللہ کو اختیار تصرف کا ہے جس فعل کو چاہیں عبادت قرار دے دیں اور جس کیفیت سے چاہیں اس کو مقرر فرما دیں نماز میں چار رکعتیں رکھ دیں تو یہی ٹھیک ہے اور تین رکھ دیں تو وہی ٹھیک ہے اور دو رکھ دیں تو وہی ٹھیک ہے۔ غرض عبادات میں ہر قسم کے تصرف کا حق تعالیٰ کو حق حاصل ہے۔

آیت کی بلاغت

حاصل یہ ہے کہ مقصود بیان کرنا اس بات کا ہے کہ ہمارے حالات اختیاریہ و غیر اختیاریہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں اس کے واسطے اتنے لمبے الفاظ کو کیوں اختیار کیا۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ کیوں کہ اس کے لئے کوئی مختصر لفظ بھی ہو سکتا تھا مثلاً کوئی ایسا لفظ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمارے حالات

اللہ کے ملک ہیں کافی ہو جاتا تو اس کو اتنا طول کیوں دیا اس کے لئے دو توجیہیں بیان کی گئی ہیں خلاصہ ان کا یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں ایک مذاق یہ ہے کہ عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور ان میں حق تعالیٰ کو تصرف کا اختیار ہے اور اس کے احکام کا نام دین ہے رہے احکام موت وحیات یعنی معاشرت اور تمدن تو ان سے دین کو کچھ علاقہ نہیں اس مذاق کی تردید کے لئے لفظ محیای ومماتی بڑھایا۔ اس صورت میں محیای ومماتی سے مراد احکام حیات وموت ہوں گے اور دوسرا مذاق یہ ہے کہ موت اور حیات میں تو تصرف حق تعالیٰ کا مانتے ہیں کیونکہ مشاہد ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس صورت میں محیای ومماتی سے نفس حیات اور موت مراد ہے احکام حیات وموت مراد نہیں مگر یہ لوگ احکام اور عبادات میں حق تعالیٰ کے تصرف کو نہیں مانتے اور اس کے معنی میں نے بیان کر دیئے ہیں کہ گو زبان سے اس تصرف کا انکار نہیں کرتے اور حق تعالیٰ کو حاکم مانتے ہیں مگر ان احکام کی بناء اپنی اختراعی مصالح پر مانتے ہیں جس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی حکم کا اختیار نہیں ہے بلکہ حکم ہمیشہ مصلحت کے موافق ہوتا ہے اور مصلحت ہی پر احکام کی بنا ہے۔ اس مذاق کی تردید کے لئے صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ کو بڑھایا تو ایک توجیہ پر محیای ومماتی کو بڑھایا اور ایک توجیہ پر صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ بڑھایا تو کیا مزہ کا مضمون ہو گیا جس کے ہر جملہ سے ایک ایک مذاق فاسد کی تردید ہو رہی ہے یہ بات اختصار میں حاصل نہ ہوتی اس واسطے ایجاز کو چھوڑ کر اطناب کو اختیار کیا گیا حاصل یہ ہے کہ ان چاروں اجزاء میں حق تعالیٰ کو تصرف کا حق ہے ان چاروں کے نام یہ ہیں صلاتی اور نسکی اور محیای اور مماتی ان کا خلاصہ دو لفظوں میں بھی آ جاتا ہے وہ دو لفظ یہ ہیں حالات اختیاریہ وغیر اختیاریہ' اختیاریہ میں نماز وغیرہ آ گئیں۔ اور موت وحیات غیر اختیاریہ میں۔

غرض ہمارے تمام حالات حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اور ان کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے میں نے بیان کیا تھا کہ اسلام کامل کے دو جزو ہیں ایک یہ کہ ان چاروں باتوں میں حق تعالیٰ کے تصرف کو ماننا یہ تو فعل حق تعالیٰ کا ہے دوسرے اس تصرف کو ماننے کا حق ادا کرنا ہے جس کا نام انقیاد ہے یہ فعل بندہ کا ہے۔

رب العٰلمین کو ذکر کرنے کا فائدہ

حق تعالیٰ یہ حالت نصیب کریں کہ حقیقت سمجھ میں آ جائے اور ہر وقت یہ امر منکشف ہوتا رہے کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے ہے دیکھئے قرآن شریف میں کیا بلاغت ہے یہاں رب العالمین کا لفظ موقع سے بڑھایا ہے جس کے معنی ہیں تمام جہانوں کا پالنے والا اور وہ رب العالمین ہیں ہمارے بدخواہ نہیں ہیں جو کچھ امر تکوینی کرتے ہیں یا تشریعی وہ سب ہمارے لئے خیر ہی خیر ہے اگر اس حقیقت کا انکشاف ہو جاوے تو آدمی دل وجان سے کہہ

اٹھے گا اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور تشریعیات کو بہت خوشی سے سر پر رکھے گا اور تکوینیات میں بھی دل و جان سے تفویض کرے گا یہ فائدہ ہوا لفظ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا اب ایک وسوسہ یہ ہو سکتا ہے کہ کیا کسی اور بادشاہ کی سلطنت بھی ایسی ہے جس میں عنایت ہی عنایت ہو اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

لفظ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی حکمت

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ان کا کوئی شریک نہیں کسی بات میں کوئی ان کا مماثل نہیں تو اس صفت ربوبیت میں بھی جس کا مقتضیٰ رافت اور رحمت اور خواہی تھا کوئی ان کے برابر نہیں بلفظ دیگر یوں کہئے کوئی بھی ہمارے واسطے اتنا رؤف و رحیم اور بھی خواہ نہیں ہو سکتا جتنے حق تعالیٰ ہیں جب یہ بات ہے تو ان کے تجویز کردہ احکام کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ اب سارے شبہات دور ہو گئے اور کوئی داعیہ ایسا نہ رہا جو مانع عن الانقیاد ہو۔

آگے فرماتے ہیں وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ الخ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ میں تو بیان تھا مشرب کا اس میں تصریح ہے اس کے مامور بہ ہونے کی حاصل یہ ہے کہ پہلے ارشاد فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میرا مشرب اور طریقہ یہ ہے کہ میں اپنے تمام حالات اختیاریہ اور غیر اختیاریہ کو حق تعالیٰ کی ملک سمجھتا ہوں مومنین کو تحریض کے لئے یہی بات کافی تھی حضور ﷺ کے ساتھ مومنین کو تعلق عشق و محبت کا ہے ان کو صرف اتنا معلوم ہو جانا ہی کافی ہے کہ یہ بات حضور کو پسند ہے اور یہ وہ طریقہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس کو خود بھی اختیار کیا ہے محبت کا مذاق رکھنے والوں کے لئے تو اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن بہت سے آدمی ضابطہ کے متبع اور قانونی بھی ہوتے ہیں ان کے واسطے تصریح بھی کر دی کہ اس مشرب کا رکھنے کا مجھ کو حکم بھی ہوا یعنی میں نے از خود یہ مشرب اختیار نہیں کیا بلکہ بامر خداوندی اختیار کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ حضور ﷺ کو حکم ہو اور ہم کو نہ ہو کیونکہ آپ محبوب تھے جب محبوب سے احکام میں تخفیف نہیں کی گئی تو ہم سے کیسے ہو سکتی ہے۔

اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کا مطلب

اس کے آگے ارشاد ہے وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ترجمہ اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں ظاہر ہے کہ اپنے دور میں سب سے پہلے مسلمان آپ ہی ہیں دوسرا جو کوئی بھی مسلمان ہوا وہ آپ ہی کی بدولت ہوا اس قول پر تو حضور ﷺ کے لئے اولیت فی الاسلام اس امت میں ثابت ہوئی ہے جس کو اولیت زمانی اضافی کہنا چاہئے۔

اور اہل لطائف کا قول یہ ہے کہ حضور کو اولیت فی الاسلام بالمعنی الحقیقی بھی حاصل ہے کیونکہ روز الست

میں جب ارشاد ہوا الست بربکم تو سب سے پہلے حضور ﷺ ہی نے جواب دیا بلٰی تو حضور ﷺ تمام اولین وآخرین سب سے اول ہوئے اسلام میں اور یہ تو اولیت ہے اسلام تشریعی میں اور بھی دلائل سے ثابت ہے کہ حضور تکوین میں بھی سب سے یعنی سب انسانوں سے بلکہ تمام کائنات سے اول ہیں کیونکہ سب سے پہلے حق تعالیٰ نے حضور ﷺ ہی کے نور کو پیدا کیا اور تمام کائنات کو حضور ﷺ ہی کے نور سے بنایا اور ہر سکون کے لئے انقیاد تکوینی لازم ہے تو سب سے پہلے اسلام وانقیاد تکوین کے ساتھ بھی حضور ﷺ ہی متصف ہوئے یہ اولیت ہے اسلام تکوینی میں آپ اول ہیں اسلام تشریعی میں بھی اور اسلام تکوینی میں بھی' بلفظ دیگر درجہ حال میں بھی آپ اول ہیں اور درجہ قال میں بھی آپ ہی اول ہیں اور جملہ انا اول المسلمین کے لانے سے یہ مقصود نہیں کہ تم بھی اس اولیت فی الاسلام میں میری تقلید کرو کیونکہ اس میں تو تقلید ہو ہی نہیں سکتی بلکہ تحریض مقصود ہے۔

یہ ایسا ہے جیسا چندہ مانگنے کے وقت کوئی بڑا آدمی کہے کہ پہلے میں دیتا ہوں کہ اس سے تحریض مقصود ہوتی ہے دوسروں کو اور اس سے ایک عام تحریک پیدا ہو جاتی ہے یا جیسے ایک فوج کو کوئی حکم ہوتا ہے اور اس کا سردار بول اٹھے کہ اس حکم کی تعمیل کے لئے سب سے پہلے میں تیار ہوں تو اس سے یہ اثر ہوتا ہے کہ اس حکم کو سب خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ آیت میں ایسے بلیغ انداز میں تعلیم کی گئی کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔

سُوْرَةُ الْاَعْرَاف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾

تفسیری نکات

قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں

اس لئے اہل علم کو چاہئے کہ محاورہ کو دیکھ کر قرآن کو سمجھا کریں کیونکہ قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں ہے اور اگر اصطلاح ہے بھی تو اصطلاحات شرعیہ پر ہے اور نہ فنون کی اصطلاح پر ہے مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کے ہر ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں مثلاً اگر کسی نے الم پڑھا تو اس کی تیس نیکیاں مل گئیں آگے حضور علیہ فرماتے ہیں لا اقول الم حرف بل الف حرف ولام حرف ومیم حرف تو دیکھئے الف اور لام اور میم کو حرف فرمایا گیا حالانکہ اصطلاح نحاۃ کے نزدیک حرف ہے اور الم میں جو الف ہے وہ اسم ہے مگر محاورہ یا اصطلاح شرع کے اعتبار سے یہ الف بھی حرف ہے یہ ایسی اصطلاح ہے جیسے عام محاورہ ہے یہ محاورہ حضور علیہ کے ارشاد کے موافق ہے غرض شارع علیہ السلام کی کلام میں الف حرف ہی ہے گو نحاۃ کے نزدیک اسم ہو بعض اہل علم حدیث میں اس الف سے بھی مسمی سمجھ گئے اور مسمی بالالف مراد لیا یعنی الف جو نام ہے حرف کا اس میں جو تین جزو ہیں الف اور لام اور فا حدیث میں یہ الف مراد ہے اور اس پر محمول کر کے کہنے لگے کہ اس حساب سے الم میں نوے نیکیاں ہوئیں او یہ محض تکلف ہے اگر حساب بڑھانے کے لئے یہ توجیہ کی ہے تو میاں وہاں کا تو تھوڑا بھی کافی ہے اس تکلف کی کیا ضرورت ہے حاجی صاحب فرماتے ہیں۔

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت نالہ وفریاد ہم

اور ذوق سے اگر کام لیا جاتا تو صاف معلوم ہوتا ہے اگر الف سے مسمی مراد ہوتا تو حضور علیہ اس طرح فرماتے بل الف حرف لام حرف فا حرف اسی طرح لام حرف والف ومیم حرف ایسا ہی میم حرف ویا حرف ومیم

حرف جب آپ نے اس طرح نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ مراد شارع کی وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو اور اگر اختصار کی وجہ سے تین ہی حرف کا بتلانا تھا اور پورے نو کو بیان فرمانا تطویل کی وجہ سے مدنظر نہیں تھا تو اسم اول ہی کے تین حرف بیان فرمادیتے یہ کیا کہ ہر ایک سے ایک ایک حرف لیا گیا کہ الف سے الف لیا اور لام سے لام اور میم سے میم یہ تو کچھ جی کو نہیں لگتا اور یوں تو ملاں آں باشد کہ چپ نہ شود' کچھ نہ کچھ جواب نکال ہی لیں گے مگر ہمارے جی کو تو نہیں لگتا ہمارے جی کو تو وہی لگتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہاں مسمی کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اسم کا ذکر فرمایا ہے اور محاورہ کے لحاظ سے اسم نحوی کو حرف فرمایا گیا ہے غرض محاورہ اور اصطلاح کے خلط سے یہ ہوتا ہے کہ مطلب اور مراد متکلم میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کون سا امر مانع ہے کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے حق تعالیٰ نے فرمایا تو اس (آسمان) سے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر سے اس (آسمان) میں رہ سو نکل تو بے شک ذلیلوں میں شمار ہونے لگا۔

تفسیری نکات

شیطان کو حاکمانہ جواب

قرآن میں زیادہ تر حاکمانہ ہی جواب دیئے گئے ہیں چنانچہ شیطان سے جب انکار سجدہ کی وجہ پوچھی گئی اور اس نے جواب دیا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (پ ۸) تو اس کی اس دلیل کا حاکمانہ ہی جواب دیا گیا فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔

اسی طرح مقبولین کو بھی حاکمانہ جواب دیا ہے یعنی فرشتوں کو جب کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کی خلافت پر سوال کیا تو فرمایا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (پ ۱) کہ تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں اور یہی تو قرآن کی خاص بات ہے جس سے اس کا کلام الٰہی اور شاہانہ کلام ہونا معلوم ہوتا ہے ورنہ اگر ہر سوال کا حکیمانہ جواب دیا جاتا تو شاہانہ کلام نہ معلوم ہوتا بلکہ فلسفی کا کلام معلوم ہوتا اس لئے حکیمانہ جوابات کم دیئے گئے ہیں اور اگر دیئے بھی ہیں تو

حاکمانہ جواب کے ساتھ دیئے ہیں۔
مگر افسوس طلباء مصنفین کی کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں اور اس میں بھی وہی طرز ڈھونڈتے ہیں اس لئے ان کو قرآن کا پورا لطف نہیں آتا اور نہ عجیب پر لطف کلام ہے پس اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ۱۱) میں اس شبہ کا حاکمانہ جواب دیا گیا ہے۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: یعنی اے بنی آدم تم کو شیطان گمراہی میں نہ ڈالے جیسا کہ تمہارے ماں باپ کو اس نے جنت سے نکالا یعنی ایسا کام کرایا جس سے وہ جنت سے نکلے اور اس حالت میں کہ ان سے ان کا لباس اتار اتھا تا کہ ان کو ان کے مستور بدن دکھلائے وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو ہم شیطانوں کو انہیں لوگوں کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لائے۔

تفسیری نکات

خطا اجتہادی

اس میں حق تعالیٰ نے کئی باتیں بیان فرمائیں ایک تو یہ کہ شیطان تمہارا بہت پرانا آبائی دشمن ہے اس سے بہت بچنا چاہئے دوسرے یہ کہ گناہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جنتی کپڑے بدن سے اتر جائیں اور لیریھما لام عاقبت کا ہے یعنی انجام شیطان کے کہنا ماننے کا یہ ہوا کہ آدم وحوا کو ان کا ستر دکھلا دے اس میں ایک باریک مسئلہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہے کہ آدم وحوا علیہا السلام دونوں میاں بیوی ہیں اور یہ بھی کہ اپنا بدن دیکھنا جائز ہے اور نیز اپنی بیوی کا بدن دیکھنا بھی جائز ہے پھر اس میں کیا حرج تھا کہ آدم وحوا نے آپس میں اپنا یا دوسرے کا بدن دیکھا انجام تو کوئی ایسا امر بیان فرمانا چاہئے تھا کہ جو کوئی امر مذموم ہوتا یہ تو امر مباح ہے تو بات یہ ہے بعض مباحات ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے انسان کو طبعی نفرت ہوتی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آدم وحوا علیہا السلام کا گیہوں کھانا خطا اجتہادی تھی گناہ نہیں تھا لیکن بمصداق مقربان را بیش بود حیرانی عتاب

اس پر ہوا کہ عزم اور احتیاط کا درجہ کیوں فروگذاشت ہوا اس لئے اس کا انجام واثر بھی ایسا ہی امر ہوا کہ وہ فی نفسہ مباح تھا قبیح و شنیع نہیں تھا لیکن ان کی شان کے خلاف تھا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدم وحوا تقدس کے اس درجہ میں تھے کہ ان کے لئے یہ امر مباح بھی باعث تکدر ہوا اور نیز یہ مسئلہ بھی مستفاد ہوا کہ اراءۃ عورۃ زوجین میں گو جائز ہے لیکن ادب کے خلاف ہے۔ اور بلا ضرورت ایسا کرنا نامناسب ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: آپ ﷺ کپڑوں کو جن کو اس اللہ نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ یہ اشیاء اس طور پر کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں دنیوی زندگی میں بھی خاص اہل ایمان ہی کے لئے ہیں۔ ہم اس طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

دنیا کی نعمتوں کو اہل ایمان کیلئے پیدا کیا گیا

دیکھئے یہاں کافروں کا ذکر ہی نہیں اس سے معلوم ہوا کہ حیات دنیا میں بھی یہ نعمتیں اصل میں اہل ایمان ہی کے لئے پیدا فرمائی گئی ہیں اوروں کو انہیں کے طفیل میں مل جاتی ہیں مگر اہل ایمان کے لئے ان طیبات کا خاص ہونا مقید ہے ایک قید کے ساتھ اور وہ یہ ہے خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی اس قید کے ساتھ ان کے لئے مخصوص ہیں کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں کدورات سے تو مومنین کے ساتھ یہ نعمتیں حیات دنیا میں اس طرح خاص ہیں کہ وہ ان کو اس طرح برتیں کہ وہ قیامت میں بھی کدورات سے خالص رہیں اور ان سے وہاں کوئی ضرر نہ ہو اور کفار جو ان چیزوں کو برتتے ہیں تو وہ اس قید سے نہیں برتتے پس خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ کے مصداق مومنین ہی ہیں جو برتنے میں یہ قید بھی ملحوظ رکھتے ہیں پھر جو اس کی تحریم کا اعتقاد رکھے اس کی اللہ تعالیٰ ہی مذمت فرماتے ہیں پھر آگے فرماتے ہیں کہ اور کون سی چیزیں ممنوع ہیں قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ غرض ان سے بچو کھانے پینے سے کس نے منع کیا ہے۔ دیکھئے قرآن کی تو یہ تعلیم ہے تو اس تفسیر کے سمجھنے سے پہلے خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ کی ترکیب میں میں بہت پریشان تھا اللہ کا شکر ہے کہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آ گیا کہ مومنین کی تخصیص اس قید کے ساتھ ہے کہ ان کے لئے قیامت کے روز بھی یہ نعمتیں کدورات سے خالی اور بے خطر ہوں گی۔ یہ بات اور کسی کو نصیب نہیں پس یہ حال ہے اور حال قید ہوتی ہے۔ عامل کی

زینت کی دو قسمیں

ایک روز سالکین میں سے ایک شخص سیاہ پائجامہ اور سیاہ عمامہ اور سیاہ صدری پہن کر آئے جو کہ ہیئت تزئین کی تھی مولانا نے فرمایا کہ تم لوگ جس غرض کے لئے یہاں آئے ہو یہ وضع اس کے مناسب نہیں بالکل اس کے بالکل خلاف ہے اس ہیئت سے تکبر کی شان پیدا ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑے رئیس ہیں پھر فرمایا کہ صدری پہننے کی کیا غرض ہے سوائے اس کے کہ زینت ہو خاص کر اس وقت کہ گرمی کا بھی وقت ہے اس شخص نے اقرار کیا کہ میں نے زینت کے لئے پہنی ہے فرمایا کہ جاؤ اور اس وضع کو بدلو اور فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے **البذاذة من الایمان** یعنی سادگی ایمان کی بات ہے اس طرف کسی کو خیال نہیں ہوتا اور فرمایا کہ یہ ہیئت اگرچہ نصاً مذموم نہیں ہے لیکن وجدان سلیم سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کون سی ہیئت کس نیت سے بنائی ہے فرمایا کہ لباس فاخر اگر اپنی تفریح طبع کے لئے ہو تو جائز ہے اور وہ اس آیت کے تحت میں داخل ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ الخ اور اگر تفاخر عند الناس کی غرض سے ہو تو حرام ہے اور اس آیت کے تحت میں داخل ہے **وزینة و تفاخر بینکم** اس تقریر سے معلوم ہوا کہ زینت کی دو قسمیں ہیں۔

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے کہ یہ نعمتیں اہل ایمان کے لئے ہیں دنیا میں اس سے معلوم ہوا جب ہمارے لئے تیار کی گئیں تو ہم اگر نہ کھائیں گے تو یقیناً یہ نامرضی اور غیر پسندیدہ ہوگا۔

دیکھو اگر کوئی میزبان بڑے اہتمام سے مہمان کے لئے کھانے تیار کرائے اور وہ مہمان نہ کھائے تو میزبان کا دل ضرور ناخوش ہوگا۔

انتفاع طیبات

یہاں پر ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں تو مومن اور کافر سب کے لئے ہیں پھر یہ کیوں فرمایا۔

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس کا جواب موقوف ہے اس آیت کی ترکیب سمجھنے پر اس آیت کی ترکیب میں بہت سے اقوال ہیں اور ان اقوال ہی کے اعتبار سے تفسیر بھی آیت کی بدلے گی میرے ذہن میں جو اس آیت کی ترکیب و تفسیر آتی ہے وہ یہ ہے کہ خالصة حال ہے ھی ضمیر مقدر سے جو ھی ملفوظ کی خبر ثانیة

میں مقدر ہے اور فاعل ہے ثابتۃ کی اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حال ذی الحال کے لئے بمنزلہ قید کے ہوتا ہے پس یہ تخصیص مومنین کی مطلق انتفاع کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ مطلق انتفاع تو عام ہے مومن و کافر سب کو پس یہ تخصیص انتفاع کی اس قید خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ کے لحاظ سے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ طیبات جس حال میں کہ کدورات وتبعات ومعاتبات قیامت سے خالص ہوں یہ مومنین کے ساتھ دنیا میں مخصوص ہیں اور کفار جو ان سے متمتع ہوتے ہیں وہ معاقبات وتبعات قیامت کے ساتھ مشوب ہیں یعنی مومنین کو ان طیبات کے متعلقہ کوئی سزا وعقاب نہ ہوگا اور کفار کو ہوگا اور یہ خلوص عن العقاب تو آخرت کے اعتبار سے ہے جو یہاں مذکور ہے باقی مشاہدہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں بھی خالص لذت از کدورت مومنین ہی کے لئے ہے اور کفار کے لئے کدورت سے خالی نہیں گو ان کو اس کدورت کا احساس نہ ہو اور غایت بے حسی سے ان کی ایسی مثال ہو گئی ہے جیسے ایک شخص کل مثلاً پھانسی ہوگی آج سلطان وقت کی طرف سے اس کو کھانے پینے کو دیا جا رہا ہے اور اس کو خبر نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور مومنین کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ ان سے راضی ہے اور ان کو اپنی عطا سے سرفراز فرما رہا ہے پس اب واضح ہو گیا کہ طیبات کو اللہ تعالیٰ نے مومنین ہی کے لئے پیدا کیا ہے پس ترک کرنا ان کا افضل نہ ہوا بلکہ کھانا ہی افضل ہے اور اسی واسطے اس سے پہلے جو كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ہے اس کے معنی میرے نزدیک یہ ہے **ولا تسرفوا عن حدود الشرع ای تحریم الحلال** غرض سیاق و سباق دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنگی نہیں ہے بلکہ توسیع ہے خوب کھاؤ پیو اگر حلال کو حرام سمجھو گے تو اسراف ہو جاوے گا مجھ کو اس تفسیر پر بالکل اطمینان ہے اس لئے اسی کو میں نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے یہاں تک ذکر تھا ان چیزوں کا جو حلال تھیں اور وہ لوگ ان کو حرام سمجھتے تھے اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حصر اضافی مراد ہے یعنی اے اہل مکہ وہ اشیاء حرام نہیں جن کو تم حرام کرتے ہو بلکہ میرے رب نے تو وہ چیزیں حرام کی ہیں جن کو تم حلال سمجھتے ہو یہ مطلب نہیں کہ یہی چیزیں حرام ہیں اور کوئی شے حرام نہیں ہے۔

مفتاح سعادات

اور ربی میں عجیب رحمت کا ظہور ہے وہ یہ ہے کہ حرم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اشیاء مرغوب نفس کو ہم سے روکتے ہیں تو اس میں محبت کی کمی کا شبہ ہو سکتا تھا جیسے کوئی کہے کہ دیکھو جی ایک روپیہ لینا زیادہ مت لینا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کم ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو حرم فرمایا تو بس بدگمانی معلوم ہوتی ہے ہماری آزادی سلب کی جاتی ہے حالانکہ

بدگمانی کردن و حرص آوری کفر باشد نزد خوان مہتری

پس ربی سے اس کو دفع فرماتے ہیں کہ ارے وہ حرام کرنے والی ایسی ذات ہے جس نے تم کو پالا ہے تمہارا مربی ہے تمہارا وجود نہ تھا وہ تم کو وجود میں لایا ہے تم نہ تھے اور پھر تم پر رحمت فرمائی۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: آپ ﷺ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو ان میں جو اعلانیہ ہیں وہ بھی اور ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کو تم نہیں جانتے۔

شانِ نزول

سبب نزول اس کا ایک خاص قصہ ہے وہ یہ ہے کہ اہل جاہلیت میں منجملہ دیگر رسوم جہالت کے یہ بھی ایک بے حیائی کی رسم تھی کہ وہ بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نافرمانی کرتے ہیں ان میں طواف نہیں کرتے دیکھئے ظاہر میں تو کیسی خوبصورت بات ہے لیکن ان احمقوں نے جہالت میں یہ نہ سمجھا کہ برہنہ طواف کرنے میں کس قدر بے حیائی اور بیت اللہ شریف کی بے ادبی ہے۔

اہل نظر کو گناہ کا ادراک ہو جاتا ہے

اور نیز کپڑوں کے اتارنے سے کیا ہوتا ہے چاہئے کہ کھال اتار دیا کریں اس لئے کہ اصل اثر تو گناہ کا بدن کے اندر ہے گو اس شخص کو ادراک اس کا نہ ہو چنانچہ بعض اہل نظر آنکھ کی پتلی کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص بدنگاہی میں مبتلا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھ رہے تھے چند آدمی آئے اور وہ کسی کو بری نظر سے دیکھ کر آئے تھے آپ نے فرمایا کہ کیا حال ہے لوگوں کا کہ مسجد میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ صحابہ کی شان تو بڑی ہے طاعت کا نور اور معصیت کی ظلمت گورے چٹے یا کالے ہونے پر موقوف نہیں وہ نور و ظلمت دوسرا ہے بعضے لوگ رنگ کے کالے ہوتے ہیں لیکن چہرہ پر ان کے ایسا نور طاعت چمکتا ہے کہ بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں حق تعالیٰ نے اسی نور کی نسبت ارشاد فرمایا ہے۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ اور

مولانا اسی نور کی نسبت فرماتے ہیں۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی　　نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(ولی کے اندر نور حق ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو تو بھی اس نور کو دیکھ لے)

غرض گناہ کا اثر کپڑوں پر اتنا نہیں ہوتا جس قدر کہ بدن میں ہوتا ہے تو اگر ایسا ہی ادب تھا تو بدن سے کھال اتارنا چاہئے تھا اور جن اعضاء سے گناہ کئے تھے ان کو پارہ پارہ کرنا تھا اور وہ اپنی اس بے حیائی کی نسبت یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا ہے۔

زینت کا لباس پہننے کی اجازت

حق تعالیٰ اس سب کا رد فرماتے ہیں اول بطور تمہید ارشاد ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا یعنی اے اولاد آدم ہم نے تم پر لباس اتارا ہے جو تمہارے شرمگاہوں کو چھپاتا ہے اور زینت کا لباس بھی اتارا ہے حق تعالیٰ کی رحمت تو دیکھئے کہ کس قدر ہے گویا ارشاد ہے کہ ارے ظالمو اللہ تعالیٰ کپڑے اتارنے کی اجازت تو کیا دیتے انہوں نے تو تمہارے لئے زینت کا لباس عطا فرمایا ہے اور زینت کی بھی اجازت دی ہے سبحان اللہ کیا بلاغت ہے آگے لباس کی مناسبت سے ایک دوسرے مہتم بالشان لباس کی طرف انتقال فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع دیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَیْرٌ یعنی جبکہ ہم لباس باطنی کے اتارنے کو پسند نہیں کرتے جس کا اترنا اعلانیہ بے حیائی بھی نہیں تو اس لباس ظاہر کے اتارنے کو کیسے پسند کریں گے اور نیز اس تمہاری حرکت سے لباس حقیقی و لباس ظاہری دونوں اترتے ہیں۔ کیونکہ ظاہری لباس کا اتارنا تقویٰ میں بھی مخل ہے اس مضمون کو حق تعالیٰ نے اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا میں ایک عام اور عقلی عنوان سے ذکر فرمایا ہے کہ جس سے یہ مسئلہ عقلی ہو گیا حاصل اس کا یہ ہے کہ لباس کو جب ہم نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے یعنی یہ امر فطری ہے تو فطرۃ بھی عقل اس کو گوارہ نہیں کرتی کہ اس کو اتارا جاوے اور اس کے ضمن میں تقویٰ کی تاکید جو کہ اصل مبحث ہے قرآن شریف کا اور روح ہے شریعت کی نیز بعنوان لباس ایک نہایت عجیب طریقہ ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى میں ارشاد فرمائی کہ جس میں لفظاً بھی رعایت مقصود مقام کی رہی گویا نہ جزی مقصود کو چھوڑا اور نہ کلی مقصود کو اس میں بے حد بلاغت ہے کہ زبان اس کے بیان سے کوتاہ ہے اگر اہل علم غور کریں گے تو سمجھ لیں گے یہاں تک تو لباس سے اپنے بدن کو چھپانے کو محبوب عند الحق ہونے کا بیان تھا۔ اب آگے نزع لباس کا محبوب عند الشیطان ہونا بیان فرماتے ہیں۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ یعنی اے بنی آدم تم کو شیطان گمراہی میں نہ ڈالے جیسا کہ تمہارے ماں باپ کو اس نے جنت سے نکالا یعنی ایسا کام کرایا جس سے وہ جنت سے نکلے اور اس

حالت میں کہ ان سے ان کا لباس اتارتا تھا تا کہ ان کو ان کے مستور بدن دکھائے اس میں حق تعالیٰ نے کئی باتیں بیان فرمائیں ایک تو یہ کہ شیطان تمہارا بہت پرانا آبائی دشمن ہے۔ اس سے بہت بچنا چاہئے دوسرے یہ کہ گناہ کا مقتضی یہ ہے کہ جتنی کپڑے بدن سے اتر جائیں اور لیریھما میں لام عاقبت کا ہے یعنی انجام شیطان کے کہنا ماننے کا یہ ہوا کہ آدم وحوا علیہم السلام کو ان کا ستر دکھلا دے اس میں ایک باریک مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ آدم وحوا علیہما السلام دونوں میاں بیوی ہیں یہ بھی ہے کہ اپنا بدن دیکھنا جائز ہے اور نیز بیوی کا بدن دیکھنا بھی جائز ہے پھر اس میں کیا حرج تھا کہ آدم وحوا علیہما السلام نے آپس میں اپنا یا دوسرے کا بدن دیکھا یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ آدم وحوا تقدس کے اس درجہ میں تھے کہ ان کے لئے یہ امر مباح بھی باعث تکدر ہوا اور نیز یہ مسئلہ بھی مستفاد ہوا اراءۃ سورۃ زوجین گو جائز ہے مگر ادب کے خلاف ہے۔ بوقت صحبت اللهم جنبنا الشيطان وجنب الشيطان ما رزقتنا اور کوئی سمجھے اس دعا پڑھنے میں شیطان کا خیال ضرور آئے گا بات یہ ہے کہ ایک تو کسی شے کا خیال اس کو مقصود ومرغوب بنا کر لانا ہے اور ایک مہروب عنہ بنا کر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس دعا کا حاصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا گیا ہے کہ اے اللہ ہم کو اور ہماری اولاد کو شیطان سے بچایئے تو اس کا تصور بحیثیت تنفر کے ہوا۔ پس اثر اسی کے مناسب ہوگا چنانچہ اس دعا کا اثر یہ آیا ہے فانه لن يضره الشيطن یعنی شیطان اس کو ضرر نہ پہنچائے گا اولاد پاک اور مقدس ہوگی اور یوں اپنے ہاتھوں بگڑیں وہ دوسری بات ہے پس ہم کو اس تصویر کے ہوتے ہوئے کسی اور تصویر کی حاجت نہیں بہر حال بیوی کو برہنہ دیکھنے سے اخلاق پر اولاد کے اثر پڑتا ہے اور اس میں آدم وحوا کے رتبہ کی طرف بھی اشارہ ہوگیا۔

لفظ قل لانے میں حکمت

آگے اس تمہید کے بعد صراحۃً عنوان عام میں ان کا رد فرماتے ہیں وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی جب وہ کوئی بے حیائی کی بات کرتے ہیں جیسے برہنہ طواف کرنا تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کا حکم کیا ہے آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں فرماتے آگے ارشاد ہے۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ الخ اس میں مامورات کی تقسیم ہے اور قل سے اشارہ نہایت اہتمام کی طرف ہے اس لئے کہ حضور ﷺ تو بغیر قل کے بھی تبلیغ فرماتے پس قل لانا نہایت اہتمام کی دلیل ہے۔

مامورات کی تین قسمیں

قسط میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے اور اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ میں حقوق اللہ آ گئے اور

وَادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ میں عقائد داخل ہو گئے مامورات کی بھی تین قسمیں ہیں تینوں کو جمع فرمادیا آگے اصل مقصود کو بیان فرماتے ہیں يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ یعنی اے اولاد آدم اپنی زینت یعنی کپڑے پہنا کرو مسجد کے وقت یعنی طواف کے وقت جو کہ مسجد میں ہوتا ہے اور چونکہ کفار نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس برہنہ ہونے کا حکم دیا ہے تو اس تقریب سے آگے فرماتے ہیں قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِيۡۤ اور اگرچہ مامورات کے ضمن میں منہیات بھی آگئے تھے اس لئے کہ مامور بہ پر عمل کرنے سے منہیات سے خود ہی احتراز ہوگا اور کسی منہی کا ارتکاب کرنے سے کسی واجب العمل مامور بہ پر عمل ضرور ترک ہوگا لیکن چونکہ کفار نے کہا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس بے حیائی کا حکم فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ میں منہیات کی فہرست مصرحاً بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تو یہ چیزیں حرام کی ہیں یہ تمام تمہید اس لئے بیان کی گئی تا کہ اس مضمون کی وقعت ذہن نشین ہو جائے غرض ارشاد ہوتا ہے قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ الخ قل لانے کی وجہ تو وہی اہتمام شان ہے اور انما حصر کے لئے ہے اس میں بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ کیا یہی چیزیں حرام ہیں اور ان کے علاوہ سب حلال ہیں جواب اس کا یہ ہے کہ حصر کی دو قسمیں ہیں ایک حصر حقیقی دوسرے حصر اضافی' یہاں حصر اضافی مراد ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل مکہ دو بلاؤں میں مبتلا تھے تحریم حلال اور تحلیل حرام کپڑا پہننا حلال تھا اس کی تحریم کرتے تھے ایسے ہی بعض حیوانات کو حرام سمجھتے تھے اور ننگا پھرنا اور شرک کرنا حرام تھا اس کو حلال جانتے تھے اور لڑنا بھڑنا تو ان کی شب و روز کی دال روٹی تھی اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے اول تو تحریم حلال کی نسبت ارشاد فرمایا قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِيۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے بندوں کے لئے پیدا کی ہے یہ تو ملبوسات کی نسبت ہے وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ یعنی کس نے حرام کی ہیں پاکیزہ چیزیں رزق سے' یہ ماکولات کی نسبت ارشاد فرمایا حاصل یہ ہے کہ پہننے اور کھانے پینے کی چیزیں خواہ درجہ حاجت میں ہوں یا درجہ لذت میں حرام نہیں یعنی اچھا کپڑا اور اچھا کھانا حرام نہیں ہے یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ کے اندر غلو کرنا مناسب نہیں بعض اہل مجاہدہ اس میں حد سے آگے نکل جاتے ہیں پھل چھوڑ دیتے ہیں بعضے گوشت کھانا ترک کر دیتے ہیں بعضوں کی شہرت کی جاتی ہے کہ فلاں بزرگ اناج نہیں کھاتے لیکن ان کو یہ خبر نہیں کہ انہوں نے ایک غذا کو تو چھوڑا جو کہ حلال تھی اور ایک دوسری غذائے حرام یعنی عجب اور حب شہرت کو اختیار کیا چاروں طرف سے جب شہرت ہوگی اور سب کی نظریں پڑیں گی تو نفس کو بڑی غذا ملے گی اور نفس موٹا ہوگا مولانا فرماتے ہیں۔

آدمی فربہ شود از راہ گوش ۔۔۔ جانور فربہ شود از نادے نوش

مجاہدہ میں غلو مذموم ہے

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے کہ یہ نعمتیں اہل ایمان کے لئے ہیں دنیا میں اس سے معلوم ہوا کہ ترک کرنا مناسب نہیں بلکہ افضل واولیٰ استعمال ہی کرنا ہے اس لئے کہ جب ہمارے لئے تیار کی گئی تو ہم اگر نہ کھائیں گے تو یقیناً یہ نامرضی اور غیر پسندیدہ ہوگا دیکھو اگر کوئی میزبان بڑے اہتمام سے مہمان کے لئے کھانے تیار کرائے اور وہ مہمان نہ کھائے تو میزبان کا دل ضرور ناخوش ہوگا۔

اشیاء حرام کی پانچ اقسام

اب آگے آیت میں چند چیزیں مذکور ہیں جن پر تحریم وارد ہوئی ہے فواحش، اثم، بغی، شرک، اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ظاہر میں تو یہ پانچ قسمیں ہیں لیکن جیسے اوامر کی تین قسمیں تھیں واقع میں یہ پانچ بھی تین قسموں کی طرف راجع ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اوامر میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کل تین قسمیں ہیں۔ عقائد، حقوق اللہ حقوق العباد یہاں بھی یہی قسمیں ہیں فواحش ما ظہر ہوں یا ما بطن ہوں اثم میں داخل ہیں اور اثم کا اطلاق اعمال متعلقہ دیانات پر زیادہ آتا ہے۔ اس لئے یہ حقوق اللہ ہوئے یعنی ان کا ارتکاب کرنے سے اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور بغی کے معنی کسی پر ظلم کرنا ہے یہ حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے اور ان تشرکوا میں ان کے عقائد فاسدہ آ گئے۔ باقی فواحش کو جداگانہ لائے حالانکہ الاثم کے اندر داخل ہے اس لئے کہ خصوصیت مقام اور سبب نزول اس کو مقتضی ہے اور نیز اسی اہتمام کی وجہ سے اس کی تقسیم بھی فرمائی۔ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ - مَا ظَهَرَ میں تو کھلی بے حیائی داخل ہے جیسے برہنہ رہنا اور برہنہ طواف کرنا، اور ما بطن میں وہ بے حیائیاں ہیں جو چھپ کر کرتے تھے جیسے زنا کرنا، اور اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کا منشا بھی فساد عقیدہ ہے اس لئے یہ بھی حکماً ان تشرکوا میں داخل ہے یہ تو تفسیر ہے الفاظ آیت کی اس آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے سب قسم کے گناہ اور سب زمانوں میں حرام فرمائے ہیں۔ رمضان شریف کی کوئی تخصیص نہیں مگر فرق اتنا ہے کہ رمضان المبارک میں حرمت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ جیسے کہ شرف مکان وزمان سے نیکی کا ثواب بڑھ جاتا ہے اسی طرح گناہ کے اندر بھی شدت زیادہ ہو جاتی ہے بعضے گناہ اور بھی ہیں جو ان تشرکوا باللہ (یعنی اللہ کا شریک کرنا اور اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنا کے اندر داخل ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ مومنین میں نہیں ہیں کفار ہی کے اندر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کفار جیسے کفر کے اندر اشد تھے اسی طرح ان کے اندر یہ گناہ بھی اعلیٰ درجہ میں تھے اور مومنین کے اندر بھی ان کی حقیقت پائی جاتی ہے گو اس درجہ کی نہ ہو مثلاً وہ قصداً شرک کرتے تھے اور مسلمان قصد سے شرک نہیں کرتے گو لازم آ جاوے مثلاً نذر غیر اللہ

ترجمہ: اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تمہارے میں سے کچھ رسول آئیں جو میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھیں تو پھر جو شخص (ان کے حکم کے موافق) تقوی اختیار کرے اور (اعمال کی) اصلاح کریگا ان پر کچھ اندیشہ نہ ہوگا۔ نہ وہ غمگین ہوں گے (سورہ اعراف رکوع ۴)

خطابات قدیم

اس آیت کے الفاظ پر نظر کر کے بعض اہل باطل نے استدلال کیا ہے کہ ارسال رسل کا باب منقطع نہیں ہوا۔ کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ جملہ بنی آدم کو جن میں امت محمدیہ بھی داخل ہے خطاب فرمارہے ہیں کہ اگر تمہارے پاس رسول آئیں الخ اگر باب رسالت مسدود ہو چکا ہے تو اب اس قسم کے خطاب کے کیا معنی ہوئے یہ اشکال اس لئے ہوا کہ ان لوگوں نے محض اسی آیت کے الفاظ کو دیکھا اگر سباق پر نظر کی جائے تو پھر قصہ سہل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ اوپر سے آیات میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے اوپر آدم علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ وہ پیدا کئے گئے پھر جنت میں رکھے گئے۔

پھر وہاں سے زمین پر اتارے گئے اور اس وقت آدم علیہ السلام کو اور ان کی ذریت کو کچھ خطابات ہوئے چنانچہ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ۝ میں آدم ذریت آدم دونوں کو خطاب ہے اسی وقت اولاد آدم کو خطاب ہوا ہے اسی وقت کے خطاب کا یہ بھی تتمہ ہے يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا ۖ وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا (الآیہ) يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ میں پس یہ سب خطابات قصہ ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت یا اس کے متصل ہی ارواح بنی آدم کو ہوئے ہیں جن کو اس وقت اس لئے نقل کر دیا گیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ عہود ہم سے قدیم زمانہ میں لے لئے گئے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں اور اس وقت باب رسالت بند تھا لہٰذا اب کوئی اشکال نہیں اور اس خطاب کے قدیم ہونے کی تائید آثار سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ بیان القرآن میں بروایت ابن جریر ابویسار سلمی کا قول نقل کیا گیا ہے دوسرے القرآن يفسر بعضه بعضا کے قاعدہ سے سورۃ بقر کی آیت بھی اس کی موید ہے کیونکہ وہاں ارسال رسل کا مضمون حکم ہبوط کے ساتھ متصل ہی بیان ہوا ہے فرماتے ہیں قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ اس خطاب میں بجز اس وقت کا خطاب ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا پس ایسے ہی یہاں بھی یہ خطاب يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ الخ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ سے مربوط ہے گو بیچ میں اور مضامین بھی آ گئے ہیں اس کا کچھ مضائقہ

نہیں کیونکہ بات میں سے بات نکل آیا ہی کرتی ہے بلاغت کا مسئلہ ہے الکلام یجر بعضہ بعضا چنانچہ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ ایک بات کو شروع کرتے ہیں اس سے دوسری بات نکل آئی تو تبعاً اس کو بھی بیان کر دیا اس کے بعد پھر دوسری بات کی طرف عود کرتے ہیں قرآن کا نزول اسی طرز محاورہ پر ہوا ہے۔ معقولیین یا مصنفین کے طرز پر نہیں ہوا لہذا یہاں ربط سمجھنے اور تفسیر دریافت کرنے کے لئے دور تک آیات کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لطف تفسیر کا اسی میں ہے اور اس سے سب اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اسی حکمت کی بناء پر ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ نے پانی پی کر مجھے خاص خطاب کیا کہ میاں اشرف علی جب پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پیو تا کہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے ورنہ گرم پانی پینے پر زبان تو کہتی ہے الحمد للہ لیکن قلب نہیں کہتا آہ حضرت حاجی صاحب کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈا پانی اور گرم کھانا اپنے بندوں ہی کے لئے تو پیدا فرمایا ہے یا صرف یہود و نصاریٰ کے لئے' خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده و الطيبات من الرزق قل هي للذين امنو ا في الحيوة' الدنيا خالصة يوم القيمه** دیکھئے یہاں کافروں کا ذکر ہی نہیں اس سے معلوم ہوا کہ حیات دنیا میں بھی یہ نعمتیں اصل میں اہل ایمان ہی کے لئے پیدا فرمائی گئی ہیں اوروں کو انہیں کے طفیل میں مل جاتی ہیں۔ مگر اہل ایمان کے لئے ان طیبات کا خاص ہونا مقید ہے۔ ایک قید کی ساتھ اور وہ ہے **خالصة يوم القيامه** یعنی اس قید کی ساتھ ان کے لئے مخصوص ہیں کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں کدورات سے تو مومنین کے ساتھ یہ نعمتیں حیات دنیا میں اس طرح خاص ہیں کہ وہ ان کو اس طرح برتیں کہ وہ قیامت میں بھی کدورات سے خالص رہیں اور ان سے وہاں کوئی ضرر نہ ہو' اور کفار جو ان چیزوں کو برتتے ہیں تو وہ اس قید سے نہیں برتتے پس **خالصة يوم القيامة** کے مصداق مومنین ہی ہیں جو برتنے میں یہ قید بھی ملحوظ رکھتے ہیں پھر جو اس کی تحریم کا اعتقاد رکھے اس کی اللہ تعالیٰ ہی مذمت فرماتے ہیں پھر آگے فرماتے ہیں کہ اور کونسی چیزیں ممنوع ہیں **قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن والا ثم والبغي بغير الحق وان تشركوا بالله ما لم ينزل به سلطانا وان تقولوا على الله مالا تعلمون** غرض ان سے بچو کھانے پینے سے کس نے منع کیا ہے دیکھئے قرآن کی تو یہ تعلیم ہے تو اس تفسیر کے سمجھنے سے پہلے **خالصة يوم القيامة** کی ترکیب میں میں بہت پریشان تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آ گیا کہ مومنین کی تخصیص اس قید کے ساتھ ہے کہ ان کے لئے قیامت کے روز بھی یہ نعمتیں کدورات سے خالی اور بے خطر ہوں گی یہ بات اور کس کو نصیب نہیں پس یہ حال ہے اور حال قید ہوتی ہے عامل کی جس کی کافی تقریر ابھی گزری' جب علماء کی یہ تحقیق قرآن مجید سے ہے تو ان پر یہ شبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ مطلقاً تحصیل دنیا سے منع کرتے ہیں مگر اس پر بھی معترضین کی یہ حالت اور جہالت ہے کہ دنیا میں کوئی کمی

ہو کوئی کوتاہی ہو کوئی پستی ہو ہر معاملہ کو مولویوں ہی کے ذمہ تھوپتے ہیں بس وہی مثل صادق آتی ہے کرے گا کوئی پٹے گا کوئی، لیکن اہل علم کو اس ملامت سے رنج ہرگز نہ کرنا چاہئے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ خوش ہونا چاہئے کیونکہ تجربہ ہے کہ ملامت سے آدمی دین میں زیادہ پختہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ حمیت ضد اور پچ انسان کا طبعی امر ہے۔ جب چاروں طرف سے لتاڑ پڑتی ہے تو اپنی بات کی پچ پڑ جاتی ہے کہ اب تو یہی کریں گے اس لئے لوگوں کی ملامت سے علماء کو دل گیر نہ ہونا چاہئے اس سے ان کا دین پختہ ہو جائے گا۔ میں نے تو اسی ملکہ پر نظر کر کے ایک خاص علاج کیا تھا جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ ایک بریلی کے خان صاحب کا پوتا علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا۔ خان صاحب نے میرے سامنے اسے پیش کیا کہ یہ نماز نہیں پڑھتا اس کو سمجھا دیجئے' میں نے بلا کسی تمہید کے سادگی اور ہمدردی کے ساتھ پوچھا کہ بھائی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے تو اس نے بے تکلف کہا کہ سچ کہہ دوں میں نے کہا ہاں سچ ہی کہہ دو' کہنے لگا بات یہ ہے کہ میں خدا ہی کا قائل نہیں نماز کس کی پڑھوں اور اس کہنے کے ساتھ ہی رونے لگا اور کہنے لگا کہ اس کے ذمہ دار خود میرے والدین ہیں جنہوں نے شروع ہی سے مجھے انگریزی میں لگا دیا اور دین کی کوئی تعلیم ہی نہ دی میں نے خان صاحب سے کہا کہ اجی آپ تو نماز کو لئے پھرتے ہیں اس شخص میں تو ایمان بھی نہیں پہلے اس کے ایمان کی فکر کیجئے خواہ بے نمازی ہی ہے۔ وہ بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ اس کا کیا علاج' میں نے کہا کہ اس کا علاج تو ہے لیکن اگر اس کی لم نہ پوچھی جاوے اور بلا دلیل اس پر عمل کیا جاوے تو بتاؤں انہوں نے یہ شرط مان لی میں نے کہا کہ ان کو علی گڑھ کالج سے ہٹا کر کسی سرکاری سکول میں داخل کرا دیا جاوے چنانچہ انہوں نے یہی کیا تقریباً سال بھر کے بعد پھر جب بریلی جانے کا اتفاق ہوا وہ پھر ملے اور بیان کیا کہ اب وہ لڑکا پکا دیندار اور نمازی ہو گیا اس وقت خان صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب تو اس کی وجہ بتا دیجئے میں نے کہا کہ علی گڑھ کالج میں تو سب آزاد خیال مسلمان ہی لڑکوں کا مجمع تھا آزادی سے جو چاہتے تھے بک دیتے تھے۔ اسلامی جذبہ کا کوئی محرک نہ تھا جب سرکاری اسکول میں داخل ہو گیا تو وہاں زیادہ تر ہندوؤں کے لڑکوں سے سابقہ پڑا اور ان میں عادت چھیڑ چھاڑ کی ہوتی ہے وہ مذہبی گفتگو اسلام کے خلاف کرتے تھے۔ یہ حمیت قومی میں جواب دیتا تھا اس ضد میں آ کر یہ دین پر پختہ ہو گیا اس کو سن کر خان صاحب کہنے لگے کہ جی ہاں یہ ہی واقعہ بھی ہے پھر تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ اس نے مجھ سے بیعت ہونے کی درخواست کی گو میں نے مرید نہیں کیا کیونکہ میں ایسی جلدی کسی کو بیعت نہیں کیا کرتا مگر وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا تو میری اسی پر نظر ہو گئی کہ انسان کے اندر پچ کا مادہ ہے چنانچہ اس موقع پر یہ پچ ہی کام آئی جو ملامت اور اعتراض سے ابھری تو علماء کو بھی جہلاء کے ملامت سے بددل نہ ہونا چاہئے اور اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی دستگیری ہے کہ اس کے لئے جو تجویز نافع تھی وہ ہی ذہن میں آئی حالانکہ بظاہر یہ الٹی سی

بات تھی اور قبل عمل دوسروں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی اسی لئے میں اس پر تفریعاً یہ ایک بات بھی کہا کرتا ہوں کہ جس پر اعتماد ہو اس سے قیل وقال نہیں کرنا چاہئے کہ اس کی کیا وجہ اس کی کیا وجہ' اگر مریض طبیب سے ہر نسخہ کی وجہ پوچھے گا تو طبیب بددل ہو جائے گا البتہ اگر کسی طبیب پر اعتماد نہ رہے تو اس کو چھوڑ دینا تو برا نہیں لیکن اس سے ہر ہر دوا کی وجہ پوچھنا یہ بالکل خلاف معمول ہے اور ہرگز مناسب نہیں اب آپ اسی علاج کو دیکھئے جو اس ز کے کا میں نے کیا بھلا آپ عقلاء زمانہ سے سن تو لیں یہ علاج' بس اس کی مرض کی لم منجانب اللہ سمجھ میں آ گئی مگر یہ بھی نہیں ہے کہ ہر جگہ اسی علاج کو برتنے لگے بعض جگہ یہی پچ مضر بھی ہو جاتی ہے یہ طبیب ہی کا کام ہے کہ نبض دیکھ کر ذوقی طور پر مرض کی تشخیص کرے تشخیص ایک ذوقی چیز ہے اسی طرح امراض روحانی کی تشخیص بھی ایک ذوقی چیز ہے۔ (الاضافات الیومیہ ج ۱۰ ص ۹۱)

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ﴿۴۸﴾

ترجمہ: اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو کہ ان کو پہچانتے ہیں ان کی نشانی سے کہیں گے نہ کام آئی تمہارے جماعت تمہاری اور جو تم تکبر کیا کرتے تھے۔

تفسیری نکات

اہل اعراف

بہر حال قرآن محاورہ پر نازل ہوا ہے محاورہ کے موافق کسی کافر کو عذاب خفیف نہیں ہوگا کیونکہ محاورہ میں خفیف وہی ہے جس کی برداشت ہو سکے اور وہاں برداشت نہیں ہوگی۔ اسی معنی کو ہلکا کسی کا بھی عذاب نہ ہوگا۔ نیز یہاں دنیا میں تو کسی کو کوئی تکلیف زیادہ دنوں سے ہو تو کچھ دنوں کے بعد ایک عادت سی ہو جاتی ہے اس سے برداشت ہونے لگتی ہے مگر وہاں یہ بھی نہیں ہو سکے گی۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا یعنی وہاں ایک کھال ہی نہ رہے گی بلکہ جہاں ایک گلی معاً دوسری کھال نئی پیدا کر دی جائے گی تا کہ احساس زیادہ ہو ورنہ پہلی کھال جلتے جلتے عادت ہو جاتی پھر تکلیف نہ ہوتی مگر وہاں تو یہ بھی نہیں آگے تبدیل کی وجہ بتلاتے ہیں لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ تا کہ عذاب کو چکھیں بلکہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ یعنی عذاب زیادہ ہی ہوتا چلا جائے گا مگر پھر بھی شدید واشد کا فرق ضرور ہوگا گو نفی تخفیف مشترک ہو تو کسی مسلمان کی نیکیاں جو کافر کو ملیں گی یہ نہیں کہ وہ عبث اور بے کار رہوں گی نہیں ہر چیز کا ایک اثر ہے ان سے عذاب میں کچھ کمی

ہو گی مگر اس کی سے وہ خفیف نہ ہو گا لہٰذا نہ اس کا بھلا ہوا نہ اُس کا بھلا۔ اور اگر مسلمان کو یہ نیکی ملتی تو نفع ہوتا اس واسطے کہ قیامت میں تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ جن کی نیکیاں زیادہ ہوں اور بدی کم ہو وہ تو جنتی ہے اور ایک وہ جن کی نیکی کم اور بدی زیادہ وہ دوزخی ہے۔

تیسرے وہ جن کی نیکی اور بدی دونوں برابر ہوں گی وہ اہل اعراف ہیں چنانچہ ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں اہل اعراف وہ ہیں کہ من استوت حسناته وسیئاته چندروز اعراف میں رہ کر ان کی نجات ہو جائے گی کیونکہ جب بہت سے اہل نار کو نجات ملے گی اور وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اہل اعراف کو تو بدرجہ اولی نجات و دخول جنت ہونا چاہئے۔

کفار ذی اخلاق کے اہل اعراف ہونے کی کوئی دلیل نہیں

بعض لوگوں نے بلا دلیل کہہ دیا کہ اعراف میں کفار ذی اخلاق جائیں گے اور ان میں سے نوشیرواں اور رستم اور حاتم کو بھی شمار کر لیا ہے کیونکہ نوشیرواں عادل تھا اور رستم شجاع اور حاتم کی سخاوت کے سب ہی معتقد ہیں مگر یہ سب واہیات ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے رستم میں اول تو جو کچھ کمال ہے صرف شاہ نامہ اس کی دلیل ہے لو سنئے خود ہی شاہ نامہ والے نے اس کا فیصلہ کیا ہے کہتے ہیں کہ

منش کردہ ام رستم پہلواں — وگرنہ یلے بود در سیتاں

تو اس کے کمال کی حقیقت اس شعر ہی سے ظاہر ہے کہ رستم کس قدر شجاع تھا دوسرے شجاعت کا نفع تو عدل و سخاوت کے برابر بھی نہیں اب عدل و سخاوت کو سنو نوشیرواں کی بابت کہا جاتا ہے کہ بڑا عادل تھا تو دیکھنا یہ ہے کہ عدل کہتے کس کو ہیں عدل کے معنی ہیں حقوق کو حدود پر رکھنا پھر یہ دیکھو کہ حدود کیا ہیں سو حدود وہ ہیں جن کو خدا اور رسول نے بتلایا ہے کیونکہ بغیر ان کے بتلائے ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ حدود ہیں یا نہیں تو جو ان حدود سے متجاوز ہو گا وہ عادل نہیں بلکہ ظالم ہے اس کو عادل کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہاں ظلم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظالم بقصد ظلم دوسرا ظالم بلا قصد ظلم تو اگرچہ نوشیرواں ظالم بقصد ظلم تو نہیں مگر عادل بھی نہیں ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ نیت سے عادل تھا اور عمل سے ظالم تو نیت سے حقیقت تو نہ بدلی رہی سخاوت حاتم تو اس کے مخالف کوئی روایت اب تک نظر سے نہیں گذری۔

انفاق کے لئے محل کا ہونا ضروری ہے

لیکن یہ دیکھنا چاہئے کہ سخاوت کی حقیقت کیا ہے آیا مطلق انفاق سخاوت ہے یا اس کا کوئی محل بھی ہے اگر اس کے لئے کوئی محل نہیں تو اگر دریا میں کوئی شخص ایک لاکھ روپیہ پھینک دے تو کیا اس کو بھی سخی کہو گے حالانکہ

اس کو کوئی سخی نہیں کہتا بلکہ جاہل محض سمجھتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ انفاق کے لئے محل کا ہونا ضروری ہے اگر محل میں خرچ ہو تو سخی ہے۔ والا فلا اور محل معلوم ہوتا ہے شریعت سے جب اس کو محل ہی معلوم نہ تھا اور شریعت کی اس کو خبر ہی نہ تھی تو وہ سخی کیسے ہوا پس اول تو وہ سخی نہیں اور اگر ہو بھی تو کیا ہوا جب باغی تھا اور باغی کا کوئی کمال کمال نہیں پھر وہ سخاوت کس کام کی دیکھئے اب جو شورش ہوئی تھی اس میں اگر کوئی باغی ہوا اور وہ بہت بڑا تعلیم یافتہ تبحر عالم ہو تو کیا سرکار کے نزدیک اس کے کمال کی کوئی وقعت ہوئی تھی ہرگز نہیں بلکہ اس پر تو اور زیادہ غیض ہوا کہ جان بوجھ کر اس نے بغاوت کی ایسے ہی جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے اس کا کوئی کمال مقبول نہیں جب تک کہ ایمان نہ ہو پھر وہ دوزخ سے کیوں بچے گا اور جب اس سے نہ بچا پھر اعراف میں کیوں جائے گا بس اعراف میں تو وہی لوگ جائیں گے جن کو دوزخ سے نجات مل چکی ہے اور جنت میں جلدی جانے کا سرمایہ پاس نہیں چنانچہ ابن عباسؓ سے روایت ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور وہ روایت غیر مدرک بالقیاس ہے اس لئے وہ حکم میں مرفوع کے ہے اور اہل اعراف کی مغفرت کی ایک عام دلیل تو اوپر مذکور ہوئی ہے کہ جب اہل نار کی مغفرت ایمان کے سبب ہو جائے گی تو اہل اعراف کی بدرجہ اولی ہوگی دوسری خاص دلیل قرآن کی ایک آیت ہے ایک خاص تفسیر پر وہ یہ ہے وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ الاية کہ اہل اعراف پکاریں گے چند لوگوں کو جن کو وہ پہچانتے ہیں ان کے نشان سے اس کے آگے ہے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ایک تفسیر اس کی یہ ہے کہ قیل لھم ادخلو الجنة کہ اہل اعراف کو کہا جائے گا کہ جنت میں چلے جاؤ تو وہ جنت میں چلے جائیں گے علماء نے اس تفسیر پر بھی نکیر نہیں کیا تو عدم نکیر (انکار نہ کرنا) سے اجماع ہوگا ان کے دخول جنت پر یہ مضمون مناسبت کے سبب مذکور ہو گیا اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کسی مسلمان کو نیکی ملے تو خیر اپنے ایک بھائی کا تو بھلا ہو گیا ممکن ہے کوئی مسلمان ایسا ہو جس کے حسنات وسیئات برابر ہوں اور وہ ایک نیکی تم سے لے کر بہشت میں فوراً چلا جائے گا۔ چنانچہ قیامت میں ایک شخص ایسا بھی آئے گا جس کی نیکی بدی بالکل برابر ہوں گی کہ اگر ایک نیکی مل جائے تو وہ فوراً جنت میں چلا جائے وہ بیچارہ سب کے پاس جائے گا کوئی اسے نیکی نہ دے گا کہ تیرا تو ایک نیکی کی کمی کی وجہ سے یہ حال ہے اور یہاں تو کتنے گناہ کے انبار ہیں ہم پر نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں آنے والی ہیں ہم کیونکر نیکی دے دیں آخر اس کو ایک شخص صاحب درد ملے گا وہ کہے گا کہ میرے پاس کل ایک ہی نیکی ہے اس کو تو ہی لے جا کیونکہ جب تیرا ایک نیکی کے کم ہو جانے سے کام نہیں چلا پھر میرا ایک نیکی سے کیا بھلا ہو گا اتنے معاصی کے مقابلہ میں لے بھائی اسے تو ہی لے جا تیرا تو بھلا ہو جائے وہ نیکی لائے گا اور جنت میں چلا جائے گا اس واقعہ میں اس دینے والے کی بھی اس سخاوت کی وجہ سے بخشش ہو جائے گی کیونکہ اس نے بہت بڑی ہمت

اور ہمدردی کی تو دیکھوایک نیکی کے مل جانے سے وہ مسلمان پار ہوگیا غرض وہاں پر نیکیاں مومنین کے کام آئیں گی کفار کو کچھ کام نہ دیں گی اس کا یہ مطلب نہیں کہ لہذا کفار کے حق دبا لینے کی بجائے مسلمانوں کے ہاں چوری شروع کردو بلکہ مطلب یہ ہے کہ چوری دغابازی تو مسلمانوں کے مال میں بھی کرنا بہت بری بات ہے مگر کفار کے مال کی اس سے بھی زیادہ برا ہے۔

قرآن حکیم میں صرف دوفریق کا ذکر ہے

فرمایا اور اس سے بھی صاف لیجئے کہ فریق فی الجنة و فریق فی السعیر ایک فریق جنت میں ہوگا ایک فریق دوزخ میں ہوگا تو دوفریق فرماتے ہیں تیسرا فریق نہیں فرمایا اور یہ یقین ہے کہ دوزخ سے بچے رہیں گے تو اب اگر وہ جنت میں نہ جاویں تو تیسرا فریق ہونا لازم آتا ہے نہ وہ فریق فی الجنة (جنت کے فریق) میں داخل ہوئے نہ فریق فی السعیر (دوزخ کے فریق) میں اب رہی یہ بات کہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اعراف میں بھی رہیں پس تیسرے فریق کا بھی ثبوت ہوا مگر یہ شبہ بہت جلد زائل ہو جاوے گا کیونکہ اسی مقام پر فرماتے ہیں ادخلوا الجنة لا خوف علیکم و لا انتم تحزنون (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں نہ تم رنجیدہ ہوگے) اس میں دو تفسیریں ہیں۔ایک تو وہ جو میں اختیار کرتا ہوں کہ یہ اہل اعراف کا قول ہے اور دوزخیوں کو چڑانے کے لئے اہل جنت کے بارہ میں کہیں گے۔

اہل اعراف امیدوار جنت ہوں گے

اھو لاء الذین اقسمتم لا ینالھم اللہ برحمة' (کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے گا۔قیل لھم ادخلوا الجنة الخ دیکھو انہیں تو یہ کہہ دیا گیا کہ تم جنت میں چلے جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہوگے دوسرا ایک قول اور ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اہل اعراف کے لئے ادخلوا الجنة یعنی تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ' سو اس آیت میں تو دونوں احتمال ہیں مگر میں دوسری آیت سے استدلال کرتا ہوں فرماتے ہیں بینھما حجاب و علی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیما ھم ونادوا اصحاب الجنة ان سلام علیکم لم یدخلو ھا وھم یطمعون (ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے السلام علیکم' ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے) اس سے معلوم ہوا کہ اہل اعراف کو جنت میں داخل ہونے کی امید ہوگی اور عالم آخرت عالم انکشاف حقائق ہے وہاں غلط امید نہیں ہوسکتی دوسرا استدلال اور ہے کہ سورة

حدیث میں ہے فضرب بینھم بسور له باب باطنه فیه الرحمة و ظاهره من قبله العذاب (پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کردی جاوے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا کہ اس کے اندرونی جانب میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب میں عذاب ہوگا۔)

اہل اعراف

مگر اس سے قبل سمجھتے کہ حدیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ کہ ان کے حسنات زیادہ ہوں گے سیئات سے وہ تو جنت میں جائیں گے یہ لوگ اعراف میں ہوں گے اب سنئے بسور له باب، کو مفسرین نے بالا جماع اعراف کہا ہے تو اس کے دورخ ہیں ایک طرف عذاب ہے اور ایک طرف رحمت ہے تو وہاں دونوں طرف کا اثر ہے اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ مومن میں سے جو جاویں گے وہ گناہوں کی سزا ملنے کے بعد جنت میں جاویں گے تو اہل اعراف جو ان سے اصلح حالاً ہیں وہ کیوں جنت میں نہ جاویں گے اور گفتگو ان جنوں میں ہو رہی ہے جو صالح ہوں ہاں اس کے ہم بھی قائل ہوں گے کہ جنوں میں بھی تین قسم کے لوگ ہوں گے اس میں سے ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہیں جن کے حسنات وسیئات برابر ہوں گے اور وہ اولاً اعراف میں ہوں گے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر جنت میں جاویں گے اور اعراف کے متعلق ایک اور بات یاد آئی جو عوام میں مشہور ہے اور بالکل غلط ہے وہ یہ کہ رستم اور نوشیرواں اور حاتم طائی یہ سب اعراف میں رہیں گے لوگوں کی بھی عجیب حالت ہے اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں گویا یہ اس محکمہ کے حاکم ہیں کہ ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں بھیج دیں خوب سمجھ لو کہ اگر ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے تو محض سخاوت یا شجاعت یا عدالت کی وجہ سے جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ کسی کے اندر کتنی ہی خوبیاں ہوں جب تک ایمان نہ ہوگا بیکار ہیں۔ مجھے یہ شعر یاد آتا ہے۔

شاید آں نیست کہ موئے ومیانے دارد   بندہ طلعت آن باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جو پتلی کمر اور عمدہ بال رکھتا ہو بلکہ محبوبیت ایک آن اور ادا میں ہوتی ہے)

آج کل بعض لوگ کفار کی ظاہری خوبیاں دیکھ کر ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں مگر سمجھئے کہ ان کا ایک ایمان سب کے مقابلہ میں ہے ان میں ایک ایمان کی آن ایسی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دوسروں کی ساری خوبیاں ہیچ ہیں کیونکہ

شاہداں نیست کہ موئی ومیانے دارد   بندہ طلعت آن باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جس کے عمدہ بال اور پتلی کمر ہو بلکہ محبوب وہ ہے جس کے ایک آن اور ادا ہو)

(اجابت الداعی ملحقہ مواعظ جلد)

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: یادرکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔

تفسیری نکات

اصطلاحات قرآن

اس میں الا تو تنبیہ کے لئے ہے اور لہ کو حصر کے لئے مقدم کیا گیا ہے کیونکہ تقدیم ما حقہ التاخیر حصر کو مفید ہے اور خلق وامر کی تفسیر لغۃً ظاہر ہے خلق کے معنی پیدا کرنا اور امر کے معنی حکم کرنا حاصل یہ ہوا کہ تکوین وتشریع دونوں قسم کے تصرفات اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں وہی خالق ہیں وہی حاکم ہیں پس ہر قسم کے تصرفات انہی کے لئے مخصوص ہیں یہ تو لغت کے اعتبار سے خلق وامر کی تفسیر ہے جو ظاہر بھی ہے اور صحیح بھی مگر بعض لوگوں میں یہ مرض ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کو قرآن میں ٹھونستے ہیں یہ بڑی جہالت ہے چنانچہ صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے عالم مادی کو عالم خلق کہتے ہیں اور مجردات کو عالم امر جس کی تفصیل یہ ہے کہ تجرد عالم کے بارہ میں تین مذاہب ہیں متکلمین کے یہاں تو اشیاء عالم میں مجرد کوئی نہیں سب مادی ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور زیادہ مادی ہیں مگر مجردات کو قدیم مانتے ہیں تیسرا مذہب صوفیہ کا ہے کہ عالم میں بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور مادی بھی مگر سب حادث ہیں کوئی مجرد قدیم نہیں متکلمین نے نفی تجرد پر یہ استدلال کیا ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے حکماء وصوفیہ نے اس مقدمہ کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قول میں خود مصادرہ علی المطلوب ہے کہ چونکہ تم کسی شے کو مجرد نہیں مانتے اس لئے تجرد کو اخص صفات سے کہتے ہو ورنہ اس مقدمہ کی کوئی دلیل نہیں صوفیہ وحکماء کہتے ہیں کہ اخص صفات باری سے وجوب بالذات ہے واجب بالذات بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اور مجرد عن المادہ مخلوقات میں بھی ہیں مگر صوفیہ اور فلاسفہ میں فرق یہ ہے کہ صوفیہ مجردات کو حادث مانتے ہیں اور فلاسفہ قدیم کہتے ہیں بہرحال صوفیہ کا مذہب یہ ہے کہ بعض اجزاء عالم مجرد عن المادہ ہیں چنانچہ روح کو وہ مجرد کہتے ہیں اور اس کے علاوہ انسان میں بعض لطیفے ان کو اور مکشوف ہوئے ہیں اور ان کے نزدیک حقیقت انسان ان مجردات اور جسد مادی سے مرکب ہے ان لطائف کو بھی صوفیہ نے مجرد کہا ہے اور یہ ان کو کشف صحیح سے معلوم ہوا ہے بجز کشف کے اس کی اور کوئی دلیل نہیں مگر ان میں نفس مادی ہے بمعنے حال فی المادی اس کو لطائف میں تغلیباً شمار کر لیا ہے نیز صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ان کا مقام فوق العرش ہے اور اس کا یہ

مطلب نہیں کہ فوق العرش انکا حیز ہے تا کہ مجرد کے لئے مکان و حیز لازم آئے بلکہ فوق العرش سے مراد یہ ہے کہ ان کا کوئی مکان نہیں تو جیہ اس ارادہ کی یہ ہے کہ عرش منتہی ہے امکنہ کا اور فوق کے لئے خارج ہونا لازم ہے پس فوق العرش کے معنی یہ ہوئے خارج عن الامکنہ باقی رہی یہ تحقیق کہ وراء العرش مکان تو نہیں لیکن پھر کیا ہے آیا خلاء ہے یا خلاء بھی نہیں تو دونوں امر ممکن ہیں لیکن حکماء نے بلا دلیل دعویٰ کیا ہے کہ محدود جہات کے ادھر نہ خلاء ہے نہ ملا خلا تو اس لئے نہیں کہ محال ہے اور یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے اور ملا اس لئے نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت نہیں یہ عجیب دلیل ہے کہ جس شے کی آپ کو ضرورت نہ ہو وہ معدوم محض ہے یہ حال ہے ان کے دلائل کا جو مضحکہ خیز ہیں غرض صوفیہ نے عالم کی تقسیم مجردات و مادیات کی طرف کر کے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ مجردات کو عالم امر سے تعبیر کرتے ہیں اور مادیات کو عالم خلق کہتے ہیں سو اول تو یہ ایک اصطلاح ہے ولا مشاحۃ فی الاصطلاح لیکن اس تسمیہ میں ایک مناسبت بھی ہے وہ یہ کہ خلق کے معنی لغت میں مادہ میں صورت پیدا کرنا اور اس کے مقابل ہے ابداع یعنی خود مادہ کو پیدا کرنا جس کا ذکر اس آیت میں ہے **بدیع السموات والارض** چنانچہ اس کے متصل ہی **واذا قضی امرا فانما یقول له کن فیکون** اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ قضاء محض کن سے ہے اس میں مادہ کا توسط نہیں اور اللہ تعالیٰ تو مادہ کے بھی خالق ہیں اور صورت و ہیئت کے بھی باقی مادہ میں صورت بنانا یہ ایک درجہ میں بندہ سے بھی ممکن ہے چنانچہ رات دن ایجادات میں یہی ہوتا ہے کہ مادہ کے اندر نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں مگر مادہ کا خالق سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اسی واسطے قرآن میں فتبارک اللہ احسن الخالقین فرمایا ہے احسن المبدعین نہیں فرمایا کیونکہ مبدع بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں بہر حال مادیات کو عالم خلق اس لئے کہا کہ ان کا وجود مادہ اور صورت کے ملانے سے ہوا ہے ان میں مادہ اور صورت کی ترکیب ہوتی رہتی ہے اور مجردات کو عالم امر اس لئے کہا کہ وہاں مادہ وصورت کی ترکیب نہیں ان کا وجود صرف کلمہ امر اور خلق کو متقابل ٹھہرایا گیا ہے یہ قرینہ ہے اس کا کہ امر سے مراد امر تکوین نہیں بلکہ تشریعی ہے یہاں تک **الحمد لله الا له الخلق و الامر** کی تفسیر تو واضح ہوگی۔

علمی اشکال

اب میں تتمیم فائدہ کے لئے اس کے بعد کی آیات کی بھی تفسیر کرتا ہوں کیونکہ ان کو اس مضمون کی تتمیم میں دخل ہے اور اس سے پہلے ایک شبہ کو جو کلام سابق کے متعلق ہے رفع کرتا ہوں جو کہ خلق پر وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جو معدوم کو موجود کرتے ہیں تو اس کی صورت دوسری آیات میں یہ وارد ہے کہ کن کہہ دیا اور موجود ہو گیا تو کن میں خطاب کس کو ہے کیا معدوم کو امر ہے میرے پاس ابھی ایک خط آیا تھا جس میں یہ سوال تھا کہ کن

کس کو کہا جاتا ہے میں نے اس کو تو یہ جواب لکھ دیا کہ

؎ آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

یعنی سوال اپنی حیثیت کے موافق کرنا چاہئے یہ سوال تمہاری قابلیت سے زیادہ ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سوال لاجواب نہیں بلکہ اگر آپ اپنی قابلیت کے بعد ہم سے کہیں کہ لاجواب (لا امر کا صیغہ یعنی پیش کر اس میں صنعت کی رعایت ہے) تو ہم اس کا جواب دیں گے کہ موجود علمی کو یہ خطاب کیا گیا ہے کہ موجود خارجی ہو جا۔ یعنی جو شی خارج میں معدوم ہے وہ معدوم محض نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہے پس ایجاد تو معدوم کا ہے اور خطاب اس شئے کا ہے جو موجود ہے اور اس جواب کی ضرورت ایجاد اوّل میں ہے اور ایجاد ثانی یعنی قیامت کے بعث ونشر میں تو خطاب ایسی شئے کو ہے جو موجود خارجی بھی ہے اور علمی بھی کیونکہ قیامت میں جو عالم معدوم ہوگا تو وہ عدم محض نہ ہوگا بلکہ عدم خاص ہوگا۔ کہ صورت عالم فنا ہو جائے گی مادہ باقی رہے گا اس کا یہ مطلب نہیں کہ عدم محض محال عقلی ہے ہرگز نہیں عدم محض بھی حق تعالیٰ کی قدرت سے خارج نہیں وہ اس پر بھی قادر ہیں کہ صورت و مادہ دونوں کو فنا کر دیں پھر ایجاد کر دیں جیسا ایجاد اول میں ہوا مگر عادۃ اللہ یوں ہی واقع ہے کہ ایجاد اول کے بعد وہ موجود کو معدوم محض نہیں کرتے یہ عادت نہ نصوص سے معلوم ہوئی کہ قیامت میں جو عالم فنا ہوگا وہ فنائے صوت ہے فناء محض نہیں' چنانچہ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ہے ان الانسان یفنی ولا یبقی منه شئی الاجب الذنب (اوکما قال) کے انسان کے کل اجزاء فنا ہو جائیں گے مگر ریڑھ کی ھڈی فنا نہ ہوگی قیامت میں اسی ہڈی سے انسان کا تمام جسم بن جائے گا جیسا کہ گٹھلی سے درخت پیدا ہو جاتا ہے گویا یہ جزو بمنزلہ تخم کے ہے شاید کسی کو شبہ ہو کہ جب انسان کو جلا دیا جاوے گا جیسا کہ بعض اقوام مردہ کو جلاتے ہیں تو اس وقت تو ہڈی بھی راکھ ہو جاتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مسلم نہیں کہ سب ہڈیاں راکھ ہو جاتی ہیں کیونکہ مرگھٹوں میں ہڈیاں دستیاب ہوتی ہیں اور مان بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ ہڈیوں کی راکھ میں جو جزو ریڑھ کی ہڈی کا ہے وہ قیامت تک محفوظ رہے گا اور ممکن ہے کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ محسوس بھی نہ ہوتا ہو جیسا جزو لایتجزی سو حدیث تو یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت یا قیامت سے فناء محض نہ ہوگا۔

خلق وامر

فرمایا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ کے معنی اس وقت یہ سمجھ میں آئے کہ اس کے قبل حق تعالیٰ نے تفصیلاً عالم کو پیدا کرنا اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ میں اور عالم میں امر کا جاری ہونا یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ میں بیان فرمایا تھا۔ اب اس تفصیل سابق کو بطور اجمال کے فرما رہے ہیں کہ خلق اور امر جس کا ذکر سابق میں ہوا وہ تو میرے قبضہ میں ہے۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: اور دنیا میں بعد اسکے کہ درستی کردی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار ہوتے ہوئے بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے۔ نیک کام کرنیوالوں سے۔

تفسیری نکات

فساد فی الارض

اس میں ایک امر ہے اور ایک نہی' نہی ہے فساد فی الارض سے اور امر ہے طاعت کا ادعوا مشتق ہے دعا سے اور دعا ایک فرد ہے طاعت کا پس مراد طاعت ہے۔ بعض خصوصیات کی وجہ سے ایک فرد کو یہاں ذکر کیا گیا جو اکمل افراد ہے اس وقت ان خصوصیات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے اصل مدعا یہ ہے کہ ان دونوں نہی اور امر میں ارتباط کیا ہے جس کی وجہ سے دونوں یکجا لائے گئے ظاہراً بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے کہ فساد سے منع کر کے فرماتے ہیں اور خدا کا نام لیا کرو' (عبادت کیا کرو) سو ان میں جوڑ یہی ہے کہ ایک سبب ہے اور اصل ہے اور دوسرا مسبب اور فرع ہے یعنی عبادت سبب اور اصل ہے عدم فساد کا اس لئے فساد سے منع کر کے عبادت وطاعت کا امر کیا گیا کہ فساد فی الارض سے بچنا چاہتے ہو تو طاعت کو اختیار کرو پس اصل مقصود وادعوہ ہے یعنی عبادت اس کی کمی سے فساد پیدا ہوتا ہے اور اس کے ترک سے انسداد فساد یعنی اصلاح کو ترقی ہوتی ہے پس معصیت وفساد میں باہم تعلق ہے اور طاعت اور اصلاح میں باہم ارتباط اور ان دونوں کے تعلق میں کچھ وسائط نہیں ہیں بہت کھلی ہوئی بات ہے وہ یہ کہ عبادت صرف روزہ اور نماز ہی کا نام نہیں ہے عبادت جملہ نیک کاموں کو شامل ہے اس میں معاملات بھی داخل ہیں اور معاشرت بھی اور عادات بھی اور اخلاق بھی اگر یہ سب طریق پر پورے ادا کئے جاویں یعنی اس طریق سے جس کی شریعت نے تعلیم کی ہے تو ان کا لازمی نتیجہ ہے کہ فساد نہ رہے اسی لئے آگے وادعوہ سے بھی بڑھ کر ایک چیز لائے ہیں اور فرماتے ہیں اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی رحمت اللہ تعالیٰ کی قریب ہے ان سے جو عبادت میں عمل احسان بھی اختیار کرتے ہیں احسان کے معنی وہی ہیں جو حدیث میں آئے ہیں کہ ان تعبد اللہ کانک تراہ یعنی خدا تعالیٰ کو حاضر وناظر جان کر عبادت کرو جس کے لئے

مختصر لفظ خلوص ہے تو مطلب یہ ہوا کہ نری عبادت پر بھی یہ وعدہ نہیں کہ رحمت قریب ہے بلکہ اس عبادت پر ہے جس میں خلوص محض ہو اب آپ انصاف سے دیکھیں کہ اگر ایک جماعت ایسی ہو جو سب کے سب خلوص محض کے ساتھ شریعت کی تعلیم کے موافق عبادات کے اور عادات کے معاملات کے معاشرات کے اخلاق کے پابند ہوں تو کیا ان میں کبھی فساد ہوگا یا کسی کو ان سے اذیت پہنچے گی حاشاوکلا وہ فرشتہ صفت انسان ہوں گے اور کسی کو ان سے ناگواری تو کیسی وہ ہر دلعزیز ہوں گے چنانچہ جو افراد اس کے مصداق ہوئے ہیں یعنی اہل اللہ ان کے حالات تواریخ میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کا وجود دنیا میں کیسا تھا کیا ان سے کسی کو تکلیف پہنچتی تھی یا ان کا وجود باعث فساد تھا نہیں بلکہ ان کا وجود باعث رحمت اور باعث رفع فساد ہوتا ہے اسی وجہ سے عالم کا عالم ان پر فدا ہوتا ہے اور ہر شخص کا قلب ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے یہ بات ان میں کا ہے سے پیدا ہوئی اسی چیز سے جس کا نام عبادت یا طاعت ہے اس سے ثابت ہوا کہ طاعت کو رفع فساد میں ضرور دخل ہے اور فساد اسی کے نہ ہونے سے ہوتا ہے یہ علاقہ ہوا لا تفسدوا اور ادعوا میں کہ طاعت کو دخل ہے رفع فساد میں۔

فساد اور اصلاح کا مفہوم

اب ان آیتوں سے اس کو ثابت کرتا ہوں تو سمجھئے کہ ان دو آیتوں میں یہ بھی ارشاد ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اور یہی جزو ہے جو اس وقت مقصود بالبیان ہے یعنی اصلاح کے بعد زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

اب یہ دیکھئے کہ فساد کیا ہے اور اصلاح کیا ہے۔ اسی کے فیصلے کے لئے میں نے یہ دونوں آیتیں پوری پڑھ دی ہیں تاکہ سیاق وسباق سے اس کی تعیین ہو جائے تو پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اور بعد میں یہ فرمایا کہ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا اور دعا میں دو احتمال ہیں یا تو دعا کے وہی معنی ہوں جس کو عرف میں دعا کہتے ہیں یا دعا کے معنی عبادت کے ہوں کیونکہ قرآن میں دعا کے معنے عبادت کے بھی آئے ہیں چنانچہ بعض نے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں عبادت کے معانی لئے ہیں اور بعض نے دعا کو اپنے معنی میں رکھ کر لفظ عبادت کو جو اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ میں ہے دعا کے معنوں میں لیا ہے نیز دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہاں دعا بمعنے عبادت ہے غرض دعا دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اگر عبادت کے معنے لئے جائیں تب تو خلاصہ یہ ہوگا کہ اول بھی عبادت کا حکم ہے اور بعد میں بھی اور درمیان میں فساد کی ممانعت ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبادت نہ کرنا فساد ہے اور اس سے اصلاح کی بھی تعیین ہوگئی کہ بعد انتظام عبادت ترک عبادت نہ کرو

اگر دعا کے معنی عبادت کے نہ لئے جائیں بلکہ اپنے ظاہری معنی پر رکھا جائے تو اس وقت بظاہر یہ آیت اس دعویٰ کے اثبات کے لئے مفید نہ ہوگی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس صورت میں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ عبادت دوقسم کی ہیں ایک تو وہ عبادت جس سے مقصود دین ہی ہے اور ایک وہ عبادت جس سے کبھی دنیا بھی مقصود ہوتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی عبادت اپنے عبادت ہونے میں زیادہ قوی ہے۔

اب سمجھئے کہ دعا عبادت کی ایسی فرد ہے کہ اس سے دنیا کی بھی طلب ہوسکتی ہے تو اس اعتبار سے دعا دوسرے درجے کی عبادت ہوگی۔ تو جب اس کے ترک کو فساد فرمایا گیا ہے تو جو عبادت خالصہ ہے اس کا ترک تو کیوں موجب فساد نہ ہوگا تو قرآن اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ عبادت کا ترک کرنا موجب فساد فی الارض ہے اور انتظام عبادت کو اصلاح فی الارض فرمارہا ہے۔

باقی یہ کہ جس وقت یہ ارشاد ہورہا ہے اس وقت بہمہ وجوہ اصلاح کہاں تھی جس کے بعد فساد سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی کثرت تھی جو ہر وقت فساد میں ہی رہتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اصلاح سے سامان اصلاح ہے کہ نبی کریم ﷺ کو بھیج کر سامان اصلاح کر دیا اگر تم ان کو چھوڑو گے تو تم فساد کرو گے' یہ تو آیت کا مدلول ہوا جس کا حاصل یہ ہوا کہ عبادت یعنی دین نہ ہونا موجب فساد ہے۔

دین کی حقیقت

لیکن اول اس کو سمجھئے کہ دین کیا چیز ہے تا کہ آپ کو پھر مدلول آیت میں تعجب نہ ہو تو دین حقیقت میں چند چیزوں کے مجموعے کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے اس وقت دین کا یہ ست نکالا ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور بس بعض نے تو یہ بھی نہیں رکھا بلکہ محض من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ اپنی مزعوم تفسیر کے اعتبار سے ان کا مذہب ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ بعض نے محمد رسول ﷺ کی بھی ضرورت نہیں سمجھی میں نے اس کی تفسیر دیکھی ہے کہ (نعوذ باللہ) رسالت کا ماننا نجات کا موقوف علیہ نہیں۔

صاحبو مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے لیکن آپ کو خبر نہیں صاحبو: غضب ہے کہ غیر قومیں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی جاتی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے دین واقع میں چند چیزوں کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں۔

۱۔عقائد ۲۔عبادات ۳۔معاملات ۴۔آداب معاشرت ۵۔اخلاق باطنی

یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو ریا نہ ہو' تواضع ہو' اخلاص ہو' قناعت ہو' شکر ہو' صبر ہو وعلی ہذا' پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے حاصل آیت کا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچ کے اخلال کو افساد فی الارض میں دخل ہے۔

تصرف وحکمت

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ سے ثابت ہو چکا ہے کہ خالق بھی اللہ تعالیٰ ہیں حاکم بھی وہی ہیں یعنی پس ان کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے کیونکہ ان کو ہر تصرف کا اختیار ہے اس پر یہ ایہام ہوتا ہے کہ ہر تصرف پر راضی ہونا جب ممکن ہے جب کہ ہر تصرف مفید اور گوارا اور موافق مصلحت ہو اور اگر کوئی تصرف مضر یا خلاف حکمت ہو تو اس پر کون راضی ہوگا ہر چند کہ اس شبہ کا ایک جواب اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ میں بھی آ گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ غالب علی الحکمت ہیں مغلوب عن الحکمت نہیں وہ اپنے تصرفات واحکام میں حکمتوں کے تابع نہیں بلکہ حکمت ان کی تصرف کے تابع ہے یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ حکمت کو سوچ کر تصرف کریں بلکہ وہ جو تصرف کرتے ہیں حکمت خود ادھر ہی ہو جاتی ہے مگر یہ جواب اذہان عامہ سے بالا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق گفتگو فرمایا کرتے ہیں۔ اس لئے آگے اس شبہ کا دوسرا جواب دیتے ہیں جو اذہان عامہ کے قریب ہے فتبارک اللہ رب العلمین یعنی اللہ تعالیٰ خوبیوں سے بھرے ہیں ان کا کوئی قول وفعل حکمت سے خالی یا حکمت کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے آگے اس کی دلیل مذکور ہے کہ وہ رب ہیں پالنے والے ہیں یعنی ان کو تمہارے ساتھ بے پناہ کی محبت ہے پھر یہ احتمال کیوں ہے کہ ان کا کوئی تصرف خلاف حکمت یا مضر ہوگا پھر یہاں ربکم کی جگہ رب العلمین فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسے پروردگار ہیں کہ انہوں نے تمہاری تربیت کی یہ صورت کی کہ محض تمہارے واسطے تمام عالم کی پرورش کرتے ہیں بلا شبہ یہ شان ہے۔

کشند از برائے دلے بار ہا   خورند از برائے گلے خارہا

خدا تعالیٰ بار و خار سے منزہ ہیں یہ شعر صرف اسی معنی کی تشبیہ وتوضیح کے لئے پڑھ دیا ہے کہ ایک انسان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا سامان پیدا کیا ہے اور اتنا بڑا کارخانہ جاری کیا ہے۔

دعا وتفویض

پھر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہر تصرف حق تعالیٰ کا حکمت کے موافق ہے تو اب تفویض کے ساتھ دعا کیونکر جمع ہوگی بس دعا کو چھوڑ دینا چاہئے چنانچہ بعض صوفیہ کو جن پر تفویض غالب ہے یہ شبہ ہوا کہ تفویض ودعا جمع نہیں ہو سکتا میں کہتا ہوں کہ دونوں جمع نہ ہو سکتے تو یہاں تفویض ودعا کو جمع کیونکہ کیا جاتا ہے کہ اول تعلیم تفویض کی گئی پھر دعا کا امر کیا گیا۔

غرض آگے اس شبہ کو دفع کیا جاتا ہے کہ تفویض سے ترک دعا لازم نہیں آتا بلکہ ہم حکم دیتے ہیں کہ

تفویض کے ساتھ دعا بھی کرو اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اپنے پرودگار سے الحاح کے ساتھ دعا کرو ذلت ظاہر کرتے ہوئے بھی اور آہستہ آہستہ بھی میرے نزدیک تضرع وخفیہ دونوں کے مجموعہ سے الحاح واظہار عبدیت مقصود ہے کیونکہ الحاح اور اظہار بندگی کے وقت لہجہ ایک نہیں رہتا کبھی آواز بلند ہوتی ہے کبھی آہستہ ہوتی ہے اس لئے دو لفظ لائے گئے جس سے اس پر تنبیہ کردی گئی کہ ایک لہجہ اور ایک وضع کے پابند نہ ہو کیونکہ تقیید سے عبدیت سے خشوع فوت ہو جاتا ہے اس میں تنبیہ کردی گئی کہ دعا تفویض کے منافی نہیں کیونکہ تفویض کا منشا بھی عبدیت ہے اور دعا کا منشاء بھی عبدیت ہے بلکہ دعا میں شکستگی اور عجز و نیاز زیادہ ظاہر ہوتا ہے جو عین مقتضائے عبدیت ہے پھر یہ تفویض کے خلاف کیونکر ہو تفویض کے خلاف تو وہ دعا ہے جس سے مقصود یہ ہو کہ جو ہم نے تجویز کرلیا ہے جو ہم مانگ رہے ہیں وہی ہو جائے تو راضی ہیں ورنہ ناراض ہیں اور جس دعا سے محض اظہار عبدیت مقصود ہو اور دعا کرنے والا دل سے ہر شق پر راضی ہو کہ خواہ دعا منظور ہو یا نہ ہو یعنی جو مانگا جا رہا ہے وہ عطا ہو یا نہ ہو میں ہر صورت میں راضی ہوں تو یہ دعا تفویض کے خلاف کیونکر ہو سکتی ہے پس تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً کے بڑھانے سے متنبہ کر دیا گیا کہ دعا اظہار عجز و عبدیت کے لئے ہونا چاہئے اور خفیہ کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تضرع سے مراد اعلان ہے۔ مگر بعض دفعہ اعلان میں بے ادبی کا لہجہ ہو جاتا ہے اسی لئے رفع صوت عند النبی کی ممانعت ہے تو اعلان کو تضرع سے تعبیر کر کے بتلا دیا گیا کہ دعا اعلاناً ہو تو تذلل کے ساتھ ہو۔

خلاف تفویض دعاء

آگے ارشاد ہے اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ اس میں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ دعا کے لئے حدود ہیں ان سے تجاوز کرنا چاہیے مثلاً دعا میں استعجال نہ کرے عدم ظہور اثر سے گھبرائے نہیں اور حرام چیزوں کی دعا نہ کرے اور مستحیل عادی و عقلی کی دعا نہ کرے جیسے یوں کہنے لگے کہ اے اللہ مجھے نبی کر دے وغیرہ وغیرہ کیونکہ نبوت مانگنے سے نہیں ملا کرتی۔

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب تفویض کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے تو پھر گناہ بھی ترک نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ بھی تصرف حق ہی ہے اس شبہ کو رفع کرتے ہیں کہ خبردار گناہ مت کرنا وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا کہ زمین میں فساد نہ کرنا بعد اس کے کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے مطلب یہ کہ گناہ موجب فساد ہے اور ہم نے فساد کو نبوت اور تشریع احکام کے ذریعہ سے ممنوع قرار دیا ہے پس اب تم اصلاح کے بعد فساد نہ کرو اور گو گناہ بھی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے کیونکہ خالق خیر و شر وہی ہے مگر یہ تصرف بلاواسطہ حق تعالیٰ کا تصرف نہیں بلکہ اس کے اندر تم واسطہ ہو کیونکہ بندہ کاسب افعال ہے اور واسطہ مذموم ہے اور گناہ میں بندہ کے واسطہ ہونے پر لا تفسدوا میں خطاب کے صیغہ سے بھی دلالت ہو رہی ہے جس سے معلوم ہوا کہ فساد و گناہ

میں بندوں کے ارادہ واختیار کو بھی دخل ہے خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ تفویض کے معنی یہ ہیں کہ جو تصرف حق تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ ہو اس پر راضی رہو اور جو تصرف ایسا ہو جس میں تمہارے فعل قبیح کا واسطہ ہو اس پر راضی ہونا بایں معنی کہ گناہوں پر جرات کرنے لگو اور ان سے بچنے کا اہتمام نہ کرو تفویض نہیں۔

امن عامہ

اور اوپر جو میں نے کہا ہے کہ بعد اصلاحها کے معنی یہ ہیں کہ اوامر ونواہی کے نزول اور نبی کے مبعوث ہونے سے زمین کی اصلاح کردی گئی اس میں ایک بڑے مسئلہ کا فیصلہ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ اوامر شرعیہ پر عمل کرنا اور نواہی شرع سے بچنا یہ جڑ ہے امن کی اور یہی رافع ہے فساد کا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام سے ساحروں نے پوچھا کہ تم اپنا عصا ڈالتے ہو یا ہم ڈالیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ہی ڈالو۔ پس جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا۔

تفسیری نکات

ساحران کو عاجز کرنے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجازت دی

موسیٰ علیہ السلام نے ساحران فرعون سے فرمایا تھا اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ (جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ڈالو) بظاہر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ساحران فرعون کا سحر تو کفر یا معصیت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس سحر کی اجازت کیوں دی جواب یہ ہے کہ یہ اجازت ابقاء کفر کے لئے نہ تھی بلکہ اس سے احقاق حق اور ابطال باطل مقصود تھا کیونکہ

جب وہ لوگ اولا اپنا سحر ظاہر کریں گے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا سب کو فنا کر دے گا تو اس طرح اظہار حق کامل طور سے ہوگا۔ اس مصلحت اظہار حق کے لئے انہوں نے فرمایا تھا۔ اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ وعندی جواب اخرو هو ان الامر هناک للتعجیز القوا ما انتم ملقون فانی لا اعباء به فافعلوا ما شئتم کما فی قوله تعالیٰ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ

(میرے نزدیک ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں پر اجازت دینا ان کو عاجز کرنے کے لئے تھا یعنی تم جو کچھ سحر بندی کر سکتے ہو کرو میں پہلے سے تم کو روکتا نہیں تا کہ ان کی کامل سحر بندی کے بعد اس کو تار عنکبوت کی طرح ختم کر دیں اور وہ عاجز ہو کر اقرار کریں حق کا) تو یہ اجازت ابقاء سحر کو مٹانے کے لئے تھی کیونکہ اس کے مٹانے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا کہ اول وہ اپنی کوشش کو ظاہر کریں بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا نہایت سہولت سے دفعۃً سب کو مٹا دے یہ آیت صوفیہ کے اس طرز عمل کی دلیل ہے جس سے بعض اہل ظاہر متوحش ہوتے ہیں کہ انہوں نے منکر شرعی کی اجازت دی حالانکہ وہ منکر کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اس کو جڑ سے مٹانا چاہتے ہیں جس کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔

سحر عظیم اور نظر بندی

فرمایا کہ یہ تو مسلم ہے کہ جادو میں حق تعالیٰ نے اثر رکھا ہے مگر اب اس میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ اثر کیا ہے آیا جادو کے ذریعہ سے کسی چیز کے عین کی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے یا صرف نظر بندی تک ہی جادو کا اثر محدود ہے تو جو لوگ اس کے قائل ہوئے ہیں کہ تبدیل عین نہیں ہوتی صرف نظر بندی ہوتی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے سحران فرعون کے متعلق فرمایا ہے۔ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝ جس میں نظر بندی کو بڑا جادو فرمایا گیا سو اگر تبدیل عین سحر سے ممکن ہوتا تو سحر عظیم وہ ہوتا اور جو لوگ سحر سے تبدل عین کے قائل ہیں وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے سحران فرعون کے اس سحر کو عظیم ہی تو فرمایا ہے ممکن ہے کہ اس سے بھی کوئی اعظم ہو اور وہ تبدیل عین ہے تو اس کے عظیم ہونے سے اعظم کی کیسے نفی ہوئی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا وَکَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَکَ تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے وقت (موعود) پر آئے اور ان کے رب نے ان سے بہت ہی (لطف وعنایت کی) باتیں کیں تو عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو سو اگر یہ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اس کے پرخچے اُڑا دیئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر جب آفاقہ میں آئے تو عرض کیا بے شک آپ کی ذات منزہ ہے میں آپ کی جناب میں معذرت کرتا ہوں اور سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں۔

تفسیری نکات

لَنْ تَرٰىنِیْ کی عجیب تفسیر

جب موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا اور تجلی کی درخواست کی اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ یعنی تم ہم کو نہیں دیکھ سکتے ہم میں تو مرئی ہونے کی قابلیت تام ہے کوئی شئے ہماری رویۃ سے مانع نہیں اس لئے لن اری (ہرگز مجھ کو دیکھا نہیں جا سکتا) نہیں فرمایا مگر تم میں اس وقت رائی کی قابلیت نہیں کیونکہ ہم نور محض ہیں اور تم جسم کثیف سے متلبس ہو جو ہمارے نور کا متحمل نہیں ہو سکتا گویا بتلا دیا کہ اس وقت تم میں اتنی استعداد نہیں کہ ہم کو دیکھنے کے بعد صحیح وسالم رہو اور ہر چند کہ یہ یہاں بھی نہ ہونے کے سب کو صاف سے بتلا رہا تھا اور اس کے سن لینے کے بعد ہر ایک مومن کو عقیدہ اپنی عدم قابلیت کا کافی طور سے ہونا لازم ہے چہ جائیکہ موسیٰ علیہ السلام چونکہ موسیٰ علیہ السلام عاشق تھے اس لئے گو عقیدہ کے اعتبار گردان کو اپنی عدم استعداد کا ہو گیا تھا لیکن شوق اور جذبہ رویت الٰہی کا حد سے بڑھا ہوا تھا اس کی اب تک کمی نہ ہوئی تھی لہٰذا آگے خود ہی

ان کی اس حالت کی رعایت سے ارشاد فرماتے ہیں کہ لیکن اگر تمہیں اب یہی شوق ہے تو اُنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ الاٰیۃ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو اگر یہ پہاڑ صحیح وسالم رہا اور ہماری تجلی کا متحمل ہو گیا تو تم کو اس سے نہ محروم رکھا جائے گا۔ چنانچہ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ جب اس پر تجلی فرمائی پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر گئے اور اطمینان وافی ہو گیا اور عدم قابلیت کا مشاہدہ بھی ہو گیا کہ جب پہاڑ باوجود اس قدر حجم جثہ اور شدت کے نہ ٹھہر سکا تو میں کیا ٹھہر سکوں گا۔ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ پہاڑ کو موسیٰ علیہ السلام سے کیا نسبت تھی یہ جماد محض وہ ایک انسان باکمال صاحب نبوۃ کلیم اللہ لہذا یہ قیاس اور تلازم سمجھ میں نہیں آتا جو کہ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ (سو اگر اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے) میں استقرار جبل ورویت موسیٰ کے درمیان ثابت کیا گیا ہے ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی روحانی قوت کی وجہ سے تجلی کے متحمل ہو جاتے تو جواب اس کا یہ ہے کہ جس تجلی کا موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ سے زیادہ تحمل تھا وہ تو ان کو اس درخواست سے پہلے ہی حاصل تھی یعنی تجلی با قلب بالروح مگر اس وقت تو انہوں نے آنکھ سے دیکھنے کی درخواست کی تھی اور آنکھ کی رویت تجلی بالروح نہیں بلکہ بالجسم ہے تو اس صورت میں تجلی خداوند تعالیٰ کی موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ آنکھ کے ہوتی اور آنکھ ایک جسمانی شے ہے مگر نہایت ضعیف اور نازک عضو ہے اور پہاڑ بھی ایک جسم ہے اگرچہ غیر جاندار ہی سہی مگر آخر جسمیت میں آنکھ مشارک ہے ہی اور پہاڑ باوجود اس کے نہایت ثقیل وقوی ہے کہ ہر ایک بھاری بھاری بوجھ کو سہہ سکتا ہے اس صفت میں یہ تمام جسم انسانی اور اس کے جمیع افراد سے بڑھا ہوا ہے چنانچہ خود خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا (بھلا تمہارا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بڑا) اور فرماتے ہیں لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (اللہ تعالیٰ کا آسمان اور باعتبار زمین پیدا کرنا سخت تر ہے لوگوں کے پیدا کرنے سے) اشدیت و اکبریت سماوات اور ارضین سے اس آیت سے ظاہر ہے کہ باعتبار مادہ کے آسمان وزمین انسان سے سخت تر ہیں اور جلال و جمال خداوندی کے جلوہ کا تحمل جب ایک ایسا جسم سخت وقوی نہ کر سکا تو موسیٰ علیہ السلام کی آنکھ تو کیا جمال جہاں آراء کی تاب لا سکتی تھی اور وہ خود کیونکہ قائم رہ سکے لہذا اپنے ضعف اور پہاڑ کی شدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب انہوں نے پہاڑ کا حال دیکھا تو ان کو مشاہدہ سے اطمینان اپنے غیر متحمل ہونے کا ہو گیا اور یہاں بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ تجلی نہ ہوئی لیکن لفظ تجلی جو آیت میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تجلی ہوئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تجلی کے بعد بے ہوش ہوئے آیت میں فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ (پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اس کے پرخچے اڑائے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے) سے صاف ظاہر ہے کہ اول تجلی ہوئی اور اس کے بعد

پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور موسیٰ علیہ السلام بھی بے ہوش ہوئے لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کیلئے ثبوت تجلی اس آیۃ سے واضح ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہونا تجلی سے موخر ہے موخر کی دو قسمیں ہیں ایک زمانی دوسرے ذاتی تو موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہونا تجلی سے موخر ہے ذاتاً نہ کہ زماناً لہٰذا زمان میں بجائے تاخر کے اقتران تھا اگر تاخر زمانی کا ثبوت ہو جاتا تو تجلی کا ثبوت ہوتا مگر محض تاخر ذاتی سے اس کا ثبوت دشوار ہے کیونکہ زماناً معیت پر تجلی کے معنی ظہور کے ہیں اور ظہور مستلزم ادراک و رویت کو نہیں پس ذات خداوندی کا ظہور تو ضرور ہوا چنانچہ اس کے اثر سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا لیکن اس کا موسیٰ علیہ السلام کو ادراک نہیں ہوا بلکہ آپ فوراً بے ہوش ہو گئے لہٰذا تجلی خداوند تعالیٰ کی فی نفسہ ممکن ہے اور ہو سکتی ہے مگر ہمیں ابھی اتنی قابلیت نہیں کہ ہم اس کے متحمل ہو سکیں بلکہ وہاں تجلی کا خود تقاضا ہے چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں۔

نکور و تاب مستوری ندارد چودر بندی سر از روزن برارد

(حسین مستور سونے کی تاب نہیں رکھتے اگر تم دروازہ بند کر لو تو روزن سے سر نکالتے ہیں)

ان الفاظ کا ظاہر مدلول مراد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ادھر سے تو ظہور ہی کا تقاضا جاری ہے بوجہ غایت رحمت و رافت کے کہ آؤ اور ہماری تجلی سے مستفیض ہو مگر کیا کریں ہم مجبور ہیں ہم میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں اگر ہم میں ہمت ہوتی تو ضرور مستفیض ہوتے چنانچہ تجلی کلامی لفظ کے تحمل کی طاقت ہم میں تھی لہٰذا ہم کو اس سے فیض یاب کیا گیا لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہ ہماری ذاتی قابلیت کا طفیل ہے اور ہمارے اندر بھی کوئی جوہر اگرچہ بقدر قلیل ہو رکھا ہوا ہے جس سے ہم خود اس کے متحمل ہو گئے بلکہ در حقیقت شدت اور طاقت بھی خداوند تعالیٰ ہی نے ہم کو دی ہے یہ بھی انہیں کی عنایات کا ثمرہ ہے اس نور کی بدولت ہمارے قلوب روشن ہیں نیز اس تحمل سے یہ بھی نہ خیال کرنا چاہئے کہ اس نے اپنی عظمت کو چھوڑ کر نقص اختیار کر لیا ہے جس کی بناء پر ہم متحمل ہوئے بلکہ وہ اسی شدت و صلوت پر باقی ہے جیسے اصل میں تھی جس کا یہ اثر ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر سر رکھے ہوئے بیٹھے تھے کہ نزول وحی ہونا شروع ہوا وہ صحابی فرماتے ہیں کہ اس وقت ثقل سے یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ میرا زانو پھٹ جاوے ایک مرتبہ آپ اونٹنی پر سوار تھے کہ آپ پر نزول وحی ہوا اور اونٹنی اس شدت کو برداشت نہ کر سکی اور بیٹھ گئی۔

تقدم ذاتی

ایک صاحب علم نے سوال کیا فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ الی خَرَّ مُوْسٰی سے معلوم ہوتا ہے کہ خرور بعد تجلی کے ہوا۔ پس رویت ثابت ہوئی پھر لن ترانی کے کیا معنی جواب یہ دیا کہ یہ تقدم زمانی نہیں تقدم ذاتی ہے پس تجلی اور خرور میں کوئی زمانہ نہیں ہوا جس میں رویت ہو۔

نور مخلوق

آیت میں یہ سوال کیا گیا کہ وادی ایمن میں موسیٰ کو جو نور نظر آیا وہ اگر نور مخلوق نہ تھا تو رویت میسر ہوگئی تھی پھر رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ کی درخواست کی کیا وجہ اور اگر نور مخلوق تھا تو موسیٰ علیہ السلام میں اور ہم میں کہ دوسرے انوار مخلوقہ کو مثل نور شمس وقمر دیکھتے ہیں کیا فرق ہوا۔

جواب دیا کہ وہ نور غیر مخلوق نہ تھا مخلوق تھا مگر چونکہ مخلوق بلا واسطہ تھا اس لئے اس کو یہ نسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس وتعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو یہ نسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس وتعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا یعنی ایک معنی میں نور حق کہنا بھی صحیح ہے جیسے کلام لفظی کہ ماتریدیہ کے نزدیک گو مخلوق ہے مگر اس خاص تلبس کی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہنا صحیح ہے بخلاف کلام زید وعمرو کے کہ اس کو کلام اللہ کہنا جائز نہیں پس سب اشکالات رفع ہوگئے۔

غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر کا سبب ہوسکتا ہے

بس حق تعالیٰ کی یہی بڑی رحمت ہے کہ سب کام اپنے قبضہ میں رکھا اور ہم کو کچھ بھی خبر نہیں دی کہ کل کو کیا ہونے والا ہے۔ لوگ علم غیب کی تمنا کیا کرتے کشف کو کمال سمجھتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ وبال جان ہو جاتی ہے غیب کا علم محیط شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں تو علم غیب کو استکثار خیر ودفع مضرت کا سبب بتلایا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ کشف بعض دفعہ وبال جان ہو جاتا ہے قرآن کی آیت یہ ہے وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو خیر بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی مضرت نہ پہنچتی' اس کے چند جوابات ہیں اول تو یہ کہ آیت میں قضیہ کلیہ نہیں ہے بلکہ جزئیہ ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ خیر ہی خیر حاصل ہوتی اور شر مس بھی نہ کرتا (دوسرے یہ کہ آیت میں غیب سے مراد جمیع الغیب ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر مجھ کو غیب کا علم محیط حاصل ہوتا الخ اور ظاہر ہے کہ غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر ورفع مضرت کا ضرور سبب ہوسکتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ

ترجمہ: عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے

تفسیری نکات

رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ میں یہ سوال کیا گیا کہ وادی ایمن میں موسی کو جونور نظر آیا وہ اگر نور مخلوق نہ تھا تو رویت میسر ہوگئی تھی پھر قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ کی درخواست کی کیا وجہ اور اگر نور مخلوق تھا تو موسیٰ علیہ السلام میں اور ہم میں کہ دوسرے انوار مخلوقہ کو مثل نور شمس وقمر دیکھتے ہیں کیا فرق ہوا۔ جواب دیا کہ وہ نور غیر مخلوق نہ تھا مخلوق تھا۔ مگر چونکہ مخلوق بلاواسطہ تھا اس لئے اس کو بہ نسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس و تعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا یعنی ایک معنی میں نور حق کہنا بھی صحیح ہے جیسے کلام لفظی کہ ماتریدیہ کے نزدیک گو مخلوق ہے مگر اس خاص تلبس کی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہنا صحیح ہے بخلاف کلام زید وعمرو کے کہ اس کو کلام اللہ کہنا جائز نہیں پس سب اشکالات رفع ہو گئے۔ (مقالات حکمت ۱۴۳)

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ

ترجمہ: اور (جلدی سے) تختیاں ایک طرف رکھ دیں۔

تفسیری نکات

قذف کے معنی اور عجیب وغریب تفسیر

فرمایا کہ بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مغلوب الغضب تھے تختیاں پھینک دیں جواب یہ ہے کہ "القاء" اور "قذف" کے معنی ایک ہی ہیں فاقذفیہ میں قذف کے معنی یہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو پھینک دیا بلکہ معنی یہ ہے کہ جلدی سے دریا میں رکھ دیا اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے الواح کو جلدی سے رکھ دیا تھا۔

وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۨاللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ‌ؕ قَالُوۡا مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ: اوراس وقت کا حال جبکہ ان میں سے ایک جماعت نے یوں کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن کو اللہ تعالیٰ بالکل ہلاک کرنے والے ہیں یا سخت سزا دینے والے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے رب کے روبرو عذر کرنے کے لئے اور اس لئے شاید یہ ڈر جاویں۔

تفسیری نکات

تبلیغ میں دو نیتیں

ہمیں اس سے کیا بحث قرآن مجید میں حکایت ہے وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۨاللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ؕ کہ اصحاب السبت میں سے ایک جماعت نے دوسری جماعت سے کہا کہ تم ایسی جماعت کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو خدا تعالیٰ ہلاک کرنے والے ہیں۔ یا جن پر عذاب شدید نازل فرمانے والے ہیں ایسے لوگوں کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ؟ قَالُوۡا مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ انہوں نے کہا کہ صاحب ہم اس لئے نصیحت کرتے ہیں تا کہ ہمارے لئے ایک عذر ہو خدا کے نزدیک کہ یا اللہ ہم نے تو کہا تھا انہوں نے مانا نہیں جو ہمارا کام تھا وہ ہم نے ادا کر دیا تھا ایک تو یہ بات ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ کہ ممکن ہے یہ لوگ ڈریں شاید ان میں سے کسی کو ہدایت ہو جاوے کیونکہ نرمی کے ساتھ سمجھانے سے امید تو ہے ان کے ایمان کی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں یہ حکایت ہے۔ بس یہی دو نیتیں آپ بھی تبلیغ میں رکھئے ایک معذرت عند اللہ اور دوسری ان کے ایمان لانے کی توقع جن میں سے پہلا مقصود تو قطعی الحصول ہے ان شاء اللہ تعالیٰ اور دوسرا محتمل و متوقع ہے۔ بس تم ان کو اسلامی محاسن سناتے رہو ان شاء اللہ بہت کچھ اصلاح کی امید ہے اور اس سے بہت اصلاح ہوئی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

ترجمہ: یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے پیش آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں۔ سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

تفسیری نکات

خوف کی حقیقت

خوف کے یہ معنی نہیں کہ گناہ کی طرف میلان ہی نہ ہو بلکہ یہ معنی ہیں کہ جب میلان ہو تو فوراً عذاب کا تصور کر کے گناہ سے رک جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فرمایا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ نہیں فرمایا سو یہ تو خوف عقلی تھا۔ اور ایک خوف ہے بمعنے دل دھڑکنے کے سو یہ غیر اختیاری ہے یہ کسی وقت بھی مطلوب نہیں گو محمود اور مفید ہے اور نہ بندہ اس کا مکلف ہے مگر لوگ آج کل اسی کو مطلوب سمجھتے ہیں اور یہ ساری خرابی واعظوں کی ہے انہوں نے عوام کا ناس کیا ہے چنانچہ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ تم لوگ تھانہ دار سے تو ڈرتے ہو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے' حالانکہ تھانیدار سے جو خوف ہے وہ طبعی ہے جیسا سانپ بچھو سے خوف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے عقلی خوف ہے کیونکہ وہ نظر نہیں آتے بلکہ ان کی صفات کو یاد کر کے ان سے ڈرا جاتا ہے۔ اور غائب سے خوف عقلی ہی ہو سکتا ہے پھر خدا تعالیٰ سے طبعی خوف کا مکلف انسان کو کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

ترجمہ: یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

متقین کی شان

جو لوگ اہل علم ہیں اور علم معانی سے مس رکھتے ہیں وہ اس آیت کے الفاظ میں غور فرمائیں کہ اذا اور ان میں فرق یہ ہے کہ اذا شرط یقینی پر آتا ہے اور ان شرط مشکوک پر ثابت ہوا کہ مس شیطان متقین کے لئے بھی یقینی الوقوع ہے ایک تو یہ اور دوسرے فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) کو خیال فرمایئے وہاں تو مس فرمایا اور نتیجہ میں فرمایا مبصرون معنی یہ ہوئے کہ متقین کی شان یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا

ذرا بھی اثر ہو جائے تو فوراً ہی متنبہ ہو جاتے ہیں غیر متقین اور متقین میں یہ فرق ہو گیا کہ مس شیطان تو دونوں میں موجود ہے مگر متقین میں تنبہ بھی ہے غیر متقین میں تنبہ نہیں بلکہ مس کا لفظ بتلاتا ہے کہ متقین شیطان کے ذرا سے اثر سے بھی کامل طور پر متنبہ ہو جاتے ہیں مس چھونے کو کہتے ہیں اور غیر متقین ہم جیسے چھونے سے تو کیا متنبہ ہوں گے صریح گناہ کرنے سے بھی ڈکار نہیں لیتے غرض اس آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نفس و شیطان کے داؤں میں متقین کا آ جانا بھی تعجب کی بات نہیں اسی بناء پر حضرت ماعز بن مالک سے گناہ ہو گیا اس سے ان کی شان میں کوئی نقص لازم نہیں آتا بلکہ اَلَّذِیْنَ اتَّقَوْا (جو لوگ خدا ترس ہیں) کی بشارت ان کے واسطے ثابت ہے کیونکہ مس شیطان کے ساتھ ان میں فاذا هم مبصرون (سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) کا وجود بھی ہوا اور یہی شان یہ متقین کی ہے اور ایسا تنبہ ہوا کہ گناہ کی توبہ میں بدوں جان دیئے چین ان کو نہ آیا حتیٰ کہ حضور ﷺ فرما اٹھے کہ ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ستر گناہ گاروں پر ڈال دی جائے تو سب کو کافی ہو جائے۔

اہل تقویٰ کی حالت

حق تعالیٰ نے اس آیت میں اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا یعنی اہل تقویٰ کی حالت یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہو جاتا ہے (میں بتا چکا ہوں کہ وہ اثر غفلت ہے بقرینہ تذکروا تو وہ تذکر اختیار کرتے ہیں تو علاج غفلت کا تذکر ٹھہرا' تذکروا کا مفعول یہاں مذکور نہیں میں اس کی حکمت تو شروع میں بیان کر چکا ہوں اب میں اس کی تعیین بتاؤں گا کہ وہ مفعول کیا محذوف ہے پہلے آیت کا خلاصہ سمجھ لیجئے وہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ بندگان خدا کی شان یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہوتا ہے یعنی غفلت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ تذکر سے اس کا علاج کرتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ فاذا هم مبصرون پس ناگہاں ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اس میں گناہ کی مذمومیت اور اثر کا بھی بیان ہو گیا اس طرح کہ جب علاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھیں کھل گئیں معلوم ہوا کہ گناہ سے نہیں بند ہو گئیں تھیں اور معصیت کے تقاضے کے وقت اندھے ہو گئے تھے واقعی گناہ میں یہی اثر ہے آدمی تقاضے کے وقت اندھا ہو جاتا ہے قتل تک کر گزرتا ہے حالانکہ معلوم ہے کہ پھانسی ہوگی اس وقت اس سے ذہول ہو جاتا ہے نیز فاذا هم مبصرون سے یہ بھی معنی پیدا ہوتے ہیں وہ چیز فی نفسہ مخفی نہ تھی بلکہ یہ اثر جو ہو گیا تھا یہ اس کی آنکھ کا قصور ہے کہ اس میں شعاع نہ رہی تھی جو اس پر پڑتی اور دیکھ لیتی تذکر سے شعائیں پیدا ہو گئیں اور وہ آنکھوں والے ہو گئے اور وہ چیز تو اس کی موجود تھی ہی اب نظر آنے لگی اور امتناع عن المعصیت اس پر مرتب ہو گیا اور وہ چیز جو مفعول ہے تذکر کو جس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے اب اس کی تعیین بتلاتا ہوں اس کا دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے وہ آیت یہ ہے وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا

اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ
اس میں بھی متقین کی شان کا بیان ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ گناہوں سے استغفار کرتے ہیں اور گناہوں کا بخشنے والا سوائے اللہ کے کون ہے اور وہ اپنے اس فعل پر (جان بوجھ کر) اصرار نہیں کرتے۔ دیکھئے اس میں صاف مذکور ہے کہ وہ یاد کرنے کی چیز کیا ہے وہ بس ایک چیز ہے اللہ مفسرین نے ذکروا اللہ کی تفسیر کی ہے ذکروا عذاب اللہ کیونکہ عذاب ہی کا خوف سبب ہوتا ہے استغفار اور کف عن المعصیت کا میں کہتا ہوں لفظ عذاب محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں اس میں کیا اشکال ہے کہ اللہ کو یاد کرتے ہیں یاد خدا کافی معصیت سے روکنے کو بلکہ عذاب کا خوف اتنا مانع نہیں ہو سکتا جتنا کہ خدا کی یاد مانع ہوتی ہے اہل بصیرت اس کو خوب سمجھتے ہیں یہ تو جب ہے کہ ذات کی طرف توجہ مراد لی جاوے اور خدا کی یاد کی ایک توجیہ اور بھی ہو سکتی ہے جس میں اس یاد کی کسی نوع کی تخصیص ہی نہ رہے اور وہ توجیہ یہ ہے کہ دیکھئے خدا کی یاد کس کو کہتے ہیں کیا صرف اللہ اللہ زبان سے کہنے کو کہتے ہیں نہیں بلکہ خدا کی ہر بات کی یاد کو خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں توجہ الی الذت کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں لفظ اللہ اللہ زبان سے کہنے کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں اور عذاب اور دوزخ کی یاد کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں کیونکہ خدا نے اس کو یاد دلایا ہے اور ثواب اور نعمائے آخرت اور جنت کی یاد کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں (اسی لئے صاحب حصن حصین نے کہا ہے کہ کل مطیع للہ فھو ذاکر ۱۲ ظ) تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہو جاتا ہے تو وہ خدا کی یاد کرتے ہیں یعنی خدا کی کسی چیز کو یاد کر لیتے ہیں خواہ ذات کو یاد کرتے ہیں خواہ ذکر اللہ بلسان سے کرنے لگتے ہیں یا عذاب کو یاد کرتے ہیں یا ثواب اور جنت کو یاد کرتے ہیں یہ اپنا اپنا مذاق ہے بعضوں کو تقاضائے معصیت مغلوب کرنے کے لئے صرف ذکر اللہ ہی بالمعنی التبادر کافی ہوتا ہے اور بعضوں کو عذاب کے استحضار کی ضرور پڑتی ہے۔ اور بعضوں کو جنت کا یاد کرنا مفید ہوتا ہے بلکہ میں یہاں تک تعمیم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو یاد کرنا یہ بھی اللہ ہی کی یاد ہے کیونکہ جس طرح جنت دوزخ اللہ ہی کی چیزیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مذکر ہیں اسی طرح مقبولین وصلحاء اللہ کی چیزیں ہیں اور اس کی مذکر ہیں چنانچہ مشاہدہ ہے کہ صلحائے کے اقوال افعال اخلاق کے ذکر سے طاعت کی رغبت اور معصیت سے نفرت ہوتی ہے اور اس تعمیم سے ایک بڑا مسئلہ حل ہوا وہ یہ کہ ایک ذاکر نے مجھ سے پوچھا کہ ذکر لا الہ الا اللہ میں تعلیم کی جاتی ہے کہ لا الہ کے ساتھ سب غیر اللہ کی نفی کی جاوے تو غیر اللہ میں تو حضور ﷺ بھی آ گئے تو مطلب یہ ہوا کہ ذاکر کو اللہ سے بھی قطع تعلق کرنا چاہئے وہ حل یہ ہے کہ غیر اللہ سے مراد وہ ہے جو حق تعالیٰ سے حاجب ہو اور حضور ﷺ کا تعلق ہادی اصل ہونے کا ہے اس لئے آپ اس نفی میں داخل نہیں اس خاص تعلق کے سبب حضور ﷺ کا

ذکر غیر اللہ کا ذکر نہیں بلکہ اللہ ہی کا ذکر ہے غرض خدا تعالیٰ کے تعلق کی چیزوں کا ذکر ذکر اللہ ہی ہے (اسی لئے حدیث میں ہے الدنیا معلونة و ملعون مافیها الاذکر الله و ما والاه جمله والاه میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو ذکر اللہ میں معین ہیں پس وہ بھی ذکر اللہ کے حکم میں ہیں ۱۲ ظ) تو ذکروا اللہ میں جنت اور دوزخ اور ذکر لسانی وغیرہ یہ سب آ گئے تو کوئی ضرورت لفظ عذاب کے تخصیص کی نہ رہی کیونکہ اس میں مانع کی تخصیص ہوئی جاتی ہے کہ صرف ترہیب ہی مانع عن المعصیت ہوتی ہے حالانکہ یہ واقع کے خلاف ہے بعضوں کو ترغیب زیادہ نافع ہوتی ہے اس لئے ذکر اللہ کو عام ہی رکھا جاوے جس میں سب داخل رہیں' ترغیب بھی اور ترہیب بھی اور خود یاد خدا بھی چنانچہ بعضوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کو ترغیب کام دے نہ ترہیب' جس پر غلبہ ہوتا ہے فناء کا اور توحید کا وہ جو معصیت سے رکتا ہے اس کو نہ جنت روکتی ہے نہ دوزخ اس کو صرف یاد خدا روکتی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ بے حیائی کا کام باپ کے سامنے بیٹے سے نہیں ہوسکتا۔ گو اس کو یہ بھی ڈر نہ ہو کہ یہ مجھے مارے پیٹے گا۔ یہاں خوف نے نہیں روکا بلکہ باپ کی عظمت سے روکا اسی طرح بعضوں کا علاقہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ خیال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دیکھ رہے ہیں تو شرما جاتے ہیں اور اس وقت ان سے معصیت ہو ہی نہیں سکتی یہاں صرف ذکر اللہ مانع ہوا اور بعضے ایسے حیادار نہیں ہوتے بلکہ محتاج ہوتے ہیں ترغیب کے ان کے لئے یہی کار آمد ہے کہ تقاضائے نفس کے وقت عذاب الٰہی کو یاد کریں اور بعضے ترہیب سے متوحش ہوتے ہیں ان سے اگر ترغیب سے کام لیا جائے تو رجوع ہوتے ہیں تو ان کو جنت کا ذکر چاہئے بعضوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ احسان کا اثر ان پر بہت زیادہ ہوتا ہے اگر وہ حق تعالیٰ کی نعمتیں یاد کریں تو شرماتے ہیں احسان سے دبے جاتے ہیں ان کے واسطے حق تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہی گناہ سے رکنے کے لئے طریق نافع ہے کیونکہ وہ نعمتوں کو گناہ میں استعمال کرنے سے شرماتے ہیں۔

غرض اس کو بھی یاد کر کے بعض لوگ شرما سکتے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ذکروا اللہ کو بمعنے ذکروا عذاب اللہ کے لیں غرض جب کسی کو عذاب کے تذکر سے نفع ہوتا ہے اور کسی کو ثواب کے اور کسی کو احسان کے تذکر سے لہٰذا تذکر کو بلاقید ہی رکھنا چاہئے اب ایک دوسری بات سمجھو کہ آیت میں تذکروا فرمایا اور اس کی کچھ حد نہیں فرمائی سو باب تفعل تدریج کو چاہتا ہے پس تذکر کے معنی یہ ہوئے کہ بتدریج تذکر میں بڑھتے چلے جائیں اور حد نہ ہونے سے اس تدریج کا قطع نہ ہونا مفہوم ہوا پس دو مسئلہ کی طرف اشارہ ہو گیا ایک تو یہ کہ اضطراب نہ کریں سکون کے ساتھ چلتے رہیں دوسرا یہ کہ سلوک کو کہیں ختم نہ کریں ہمیشہ چلتے ہی رہیں اس میں سالکین دو غلطیاں کرتے ہیں ایک اضطراب دوسری اس سے بڑھ کر انقطاع یعنی کسی مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں اور قناعت کر لیتے ہیں مثلاً حضور قلب حاصل ہو گیا اور مجاہدہ کرنے سے یہ ملکہ پیدا ہو گیا کہ جب چاہیں خیال کو ایک طرف کر

لیں تو بس حضور قلب کو چھوڑ بیٹھے اس اعتبار پر کہ ہم کو قدرت تو حاصل ہے ہی' کیوں صاحب وہ قدرت کس کام کے لئے حاصل ہوئی ہے قوت سے فعل میں لانے کے لئے یا فقط دل کو سمجھانے کے لئے۔

مجاہدہ سے مادہ قطع نہیں ہوتا

خود اس آیت سے بھی میری اس تقریر کا ثبوت ملتا ہے کہ مجاہدہ سے مادہ کا قطع نہیں ہو جاتا کیونکہ آیت میں صاف موجود ہے کہ تقویٰ کے بعد بھی مس شیطان ہو جاتا ہے فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ یعنی متقیوں پر بھی مس واقع ہوتا ہے مگر فرق ہوتا ہے اس مس میں اور اس مس میں جو غیر متقین پر واقع ہوتا ہے غیر متقین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور متقین پر یہ اثر ہوتا ہے کہ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ یعنی وہ فوراً چونک اٹھتے ہیں اور صاحب بصیرت ہو جاتے ہیں دیکھئے کتنا بڑا فرق ہے ڈاکو ایک اناڑی اور غافل پر چھاپہ مارتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب مال واسباب لوٹ کر لے جاتے ہیں بلکہ اس کو بھی مار کر ڈال دیتے ہیں یا باندھ کر لے جاتے ہیں اور کبھی ایک کار کردہ اور تجربہ کار اور ہوشیار پر چھاپہ مارتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے غل تو مچ جاتا ہے اور تماشائیوں کا مجمع ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ہوشیار ہو کر پھر سے چوکی کو اور درست کر لیتا ہے بلکہ کبھی ڈاکوؤں کو بھی باندھ لیتا ہے چھاپہ مارنا دونوں جگہ ہوا مگر اثر میں فرق ہے اسی طرح فرق ہے متقین پر مس شیطان کے اثر میں اور غیر متقین پر اثر میں اور اس آیت میں تو مس شیطان کو مجملاً ہی بیان فرمایا ہے اور اس کے کسی خاص اثر کا بیان نہیں کیا کہ اس مس سے کچھ اثر بھی ہوتا ہے یا نہیں بس اتنا فرمایا ہے کہ مس شیطان متقین کو بھی ہوتا ہے مگر ایک دوسری جگہ اس اثر کے بعض افراد کی تعیین بھی فرما دی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ یہ بھی متقین کی شان میں ہے ترجمہ یہ ہے کہ جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں یہاں مس شیطان کا ایک اثر غضب مذکور ہے کہ جب ان کو غصہ آتا ہے جو شیطان کا اثر ہے تو وہ شیطان کے کہنے پر عمل کر کے مقتضائے غضب پر عمل نہیں کرتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں یہاں سے معلوم ہوا کہ متقین کو غصہ بھی آ جایا کرتا ہے کیونکہ اذا اور ان میں فرق ہے اذا یقینیات پر آتا ہے اور ان محتملات پر اور یہاں لفظ اذا لایا گیا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ متقین کو بھی غصہ آنا غالب ہے مگر اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہوتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں غصہ مس شیطان کا ایک فرد ہے اس آیت میں اس کی تصریح ہو گئی۔

اس تحقیق کی بناء اس پر ہے کہ مادہ شر کا سلب مطلوب نہیں ہے بلکہ اس پر غلبہ حاصل کر لینا مطلوب ہے جس سے وہ اعتدال پر رہے اور یہی کمال ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ تقویٰ کے بعد

مس شیطان ہی نہیں ہوتا اور ان کو معصیت کا خیال ہی نہیں آتا بلکہ تذکروا فرمایا کیا معنی کہ وہ سنبھل جاتے ہیں اور ہوشیار ہو جاتے ہیں حاصل یہ کہ مس تو ہوتا ہے مگر اس مس کو قیام نہیں ہوتا اور اس مس کرنے والی چیز کو طائف سے تعبیر فرمایا اس کے معنی ہیں گرد پھرنے والا یعنی آیا اور بھاگ گیا بس متقی کی حالت تو یہ ہے کہ وساوس اس کے دل میں جمتے نہیں اور غیر متقی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں وہ خیالات جمتے ہیں اور طائف کا ترجمہ جو میں نے گرد پھرنے والا کیا اس میں ایک اور اشارہ بھی ہے کہ اس کو قدرت آس پاس ہی پھرنے کی ہے قلب کے اندر نہیں جاسکتا یہ ایسا ہے جیسے ایک شاعر نے کہا ہے

عذل العو اذل حول قلب التاءہ وھوی الاحبة منه فی سوداءہ

یہ حالت تو وساوس کی ہے اور تقویٰ کی شان یہ ہے کہ وہ اندرون قلب میں جاگزیں ہوتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے الا ان التقویٰ ھھنا واشار الی صدرہ یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے اور سینہ کی طرف اشارہ کیا یعنی قلب کے اندر ہے اور طائف کے معنی آس پاس پھرنے والے کے ہیں تو آیت اور حدیث کو ملا کر یہ بات ثابت ہوگئی کہ متقی کے دل میں تقویٰ ہی کا غلبہ ہوتا ہے اور شیطان اندر نہیں جاسکتا اس میں شیطان کے ضعیف ہونے کو بیان فرمایا اور سالک کو تسلی دی کہ اے قلعہ دار ڈرنا نہیں خندق کے باہر ہی شیطان ہے اسی واسطے عارف شیطان کی بالکل پروا نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کے دفع کی طرف بھی زیادہ التفات نہیں کرتا ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ اعوذ باللہ پڑھتے تو شیطان کو مخاطب کر کے کہتے کہ چونکہ شریعت کی تعلیم ہے ایسے موقع پر اعوذ پڑھنے کی سو اس واسطے پڑھتا ہوں تیرے ڈر سے نہیں پڑھتا تجھ سے کیا خوف قرآن شریف میں موجود ہے۔ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہ شیطان کو کسی قسم کی قدرت اور اختیار نہیں ایمان والوں پر بلکہ عارف کو بعض وقت بجائے نقصان کے شیطان سے الٹا نفع پہنچ جاتا ہے عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد اور شیطان گو بڑا ہی عاقل اور تجربہ کار ہے مگر کبھی اس سے غلطی بھی ہو جاتی ہے وہ اس لالچ سے کہ انسان اس کے کہنے میں آجاوے گا بہکاتا برابر ہے کبھی اس سے نہیں چوکتا مگر کبھی اس کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ کسی کو خوب بہکاتا اور اس میں بڑا وقت صرف کیا اور اس میں ایسا مشغول ہوا کہ اور کاموں سے رہ گیا اور یہاں اس شخص کو جس پر اتنی محنت کی تھی تذکر ہو گیا بس ساری محنت ضائع گئی بلکہ اتنا اور نقصان پہنچا کہ وہ شخص بمقتضائے فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ کے اور صاحب بصیرت ہو گیا اور آئندہ کو بھی اس کے فریب میں آنے کی امید کم ہوگئی اس وقت شیطان پچھتاتا ہے کہ میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت اور کاموں سے بھی نہ رہ جاتا اور آئندہ کو اس سے امید تو مغالطہ میں آنے کی رہتی اور ہمت اس کی ٹوٹ جاتی ہے مگر بے حیا ہے کہ پھر تھوڑی دیر میں آتا ہے اور گو کامیابی کی امید نہیں مگر پھر بھی اپنا کام کرتا ہی ہے ہمت میں تو شیطان استاد بنانے کے قابل ہے کہ تھکتا ہی نہیں۔

تذکر کی اہمیت

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا جو لوگ متقی ہیں ان کی شان یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ جب ان کو شیطان کا ذرا سا بھی اثر ہو جاتا ہے تو تذکر واوہ یاد کر لیتے ہیں اور ہوشیار ہو جاتے ہیں تذکروا کا مفعول ذکر نہیں کیا اس میں اشارہ ہے کہ یاد کر لینے کی چیز کو یاد کر لیتے ہیں اس کے بیان کی ضرورت نہیں مقصود یہ ہے کہ اس وقت یاد سے کام لیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس وقت کا علاج یاد ہے مطلقاً قطع نظر اس کے کسی خاص فرد سے اور اس کے افراد وغیرہ کی تعیین مستقل مسئلہ ہے اگر کسی فرد کو یہاں ذکر کر دیتے تو وہی متعین ہو جاتا باقی افراد کی نفی ہو جاتی مگر کسی فرد کی تعیین نہیں کی گئی اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی فرد کا بھی ذکر ہوتا تو بے محل ہوتا کیونکہ محط فائدہ یہاں صرف ضرورت تذکر ہے نہ کہ تعیین افراد کی اس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ علاج بالضد ہوتا ہے مثلاً حرارت کا علاج برودت سے اور برودت کا حرارت سے ہوتا ہے۔ یہاں دیکھنا چاہئے کہ شیطان کے اثر سے کیا مرض پیدا ہوا جو مرض پیدا ہوا ہو اس کی ضد کا پیدا کرنا علاج ہوگا سو شیطان کے اثر سے بہت سے امراض پیدا ہوتے ہیں مگر ان سب امراض کی جڑ غفلت ہے یعنی شیطان کے اثر سے اولاً غفلت ہی پیدا ہوتی ہے مگر آیت میں اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے اور اس کی وجہ دو ہیں ایک تو یہ کہ یہ بہت ظاہر ہے دوسرے یہ کہ تذکروا کے لفظ سے اس کا پتہ چل جاویگا کیونکہ ایک مقابل سے دوسرے مقابل پر تنبیہ ہو جاتی ہے اور خود بخود دوسری کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے جیسے اندھے کا ذکر سن کر بینا کی طرف خود ذہن چلا جاتا ہے اسی طرح تذکر سے غفلت خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے تو چنداں حاجت اس کے بیان کی نہ رہی اور کلام کی بلاغت اسی میں ہے کہ زائد از کار بات بالکل نہ ہو پس آیت میں مقابلہ ہے غفلت اور یاد کا باقی اس سے بحث نہیں کہ کس کی یاد یہ ایسا ہے جیسے اگر بھوکے کو علاج بتاویں تو کہیں گے کہ کچھ کھاؤ اور اس وقت یہ کہنا بے موقع ہوگا کہ پلاؤ یا قورمہ یا فیرینی کھاؤ اس وقت اجمال میں جو بلاغت ہوگی تفصیل میں ہرگز نہ ہوگی بلکہ جتنی تفصیل بڑھتی جاویگی کلام بلاغت سے گرتا جاویگا مثلاً کوئی بھوکے سے یوں کہنے لگے کہ علاج تمہارا یہ ہے کہ گوشت کو لے کر پانی سے دھو کر یخنی پکاؤ اور اس میں سونف دھنیاں گرم مصالحہ اتنا اتنا ڈالو اور اتنی دیر تک پکاؤ پھر ہاتھ تین دفعہ دھوؤ اور دستر خوان بچھا کر بیٹھو اور اس پلاؤ کو کھاؤ، تو ظاہر ہے کہ اس طویل تقریر کو کوئی بھی نظر استحسان سے نہ دیکھے گا اس وقت بلیغ جواب یہی ہے کہ بھوک کا علاج یہ ہے کہ کچھ کھاؤ اور یہ مستقل بات ہے کہ کیا کھاؤ اس کے لئے مستقل علم موجود ہے یعنی علم طب غرض آیت پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ تذکروا کے مفعول کی تعیین نہیں کی جواب یہی ہے کہ مقصود کی اہمیت کی وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا اور یہاں مقصود نفس تذکر ہے دوسرے تذکر کی اہمیت جتلانا بھی مقصود ہے یہ نکتہ ہوا تذکروا کے مفعول کے حذف ہونے کا۔

از یں یہ کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمل میں اصل جملہ انشائیہ ہی ہے وہی مقصود ہوتا ہے جملہ خبر یہ خود مقصود نہیں ہوا اور جس خبر سے محض خبر مقصود ہو اور کسی معنی انشائی پر دلالت نہ ہو وہ عقلاء کے نزدیک مہمل ہے پس یہاں ان دونوں قسموں کے بیان کرنے سے صرف ایک واقعی بات کی خبر دینا مقصود نہیں ہو سکتی کہ معلوم کر لو کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں کیونکہ یہ تو فعل زائد ہے جو کسی ادنی عاقل سے بھی بعید ہے چہ جائیکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ایسا ہو بلکہ مقصود انشاء ہے یعنی امر کرنا اس بات کا کہ تم اول گروہ کے موافق بنو اور دوسرے کے موافق نہ بنو اور گناہ کے ترک کی ترکیب بتانا اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے سبب پر مطلع کرنا منظور ہے کہ اس طرح گناہ سے بچ سکتے ہیں اور فلاں طریق اختیار کرنے سے گناہ میں پڑ جاتے ہیں سو متقین کی حالت یہ بیان کی کہ جب ان کو ذرا سا بھی اثر شیطان محسوس ہوتا ہے تو وہ تذکر اختیار کرتے ہیں۔

فرمایا آج رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک طالب علم میرے پاس یہ آیت شریف پڑھ رہا ہے هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ' آیت آخر سورہ اعراف میں نے خواب ہی میں اس سے پوچھا کہ بصائر کو جمع کیوں لائے ہیں اور ہدی و رحمۃ کو مفرد کیوں لائے ہیں اس نے جواب دیا تا کہ راستہ چلنے والے پریشان نہ ہوں میں نے کہا کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہوا اس کے بعد میں نے خود کہا کہ راستہ چلنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے ایک ضیاء کی' دوسرے طریق کی تیسرے منزل کی لیکن ضیاء سے کام لینے کے لئے آنکھیں شرط ہیں اور آنکھیں ہر شخص کے لئے علیحدہ ہونی چاہئے اس کے لئے بصائر کو جمع لایا گیا اور ہدی مثل طریق کے واحد ہے اس لئے وہ مفرد لایا گیا اور رحمت مثل ثمرہ طریق یعنی منزل کے ہے وہ بھی متعین اور واحد ہے اس واسطے اس کو بھی واحد لایا گیا۔

سُوْرَةُ الْاَنْفَال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے تو ان کو سننے کی توفیق دیتے اور اگر ان کو سنا دیں تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔

تفسیری نکات

وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ کا مفہوم

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ بظاہر اس آیت میں شکل اول کی صورت معلوم ہوتی ہے ترجمہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ان (کفار) میں کچھ بھلائی اور خیر دیکھتے تو ان کو (دین کی باتیں) سنا دیتے اور اگر ان کو سنا دیتے تو وہ اعتراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ دیتے۔ شکل اول کے قاعدہ پر اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے لو علم الله فیهم خیراً لتولوا یعنی اگر حق تعالیٰ ان میں بھلائی دیکھتے تو وہ پیٹھ موڑ دیتے حالانکہ یہ نتیجہ محال کو مستلزم ہے کیونکہ جس صورت میں حق تعالیٰ کو ان کے اندر بھلائی معلوم ہوتی ہے اس صورت میں تو وہ حق بات کو قبول کرتے اس حالت میں اعراض کیونکر ممکن تھا کیونکہ اعراض تو شر ہے خیر کے ساتھ اس کا اجتماع نہیں ہوسکتا ورنہ لازم آئے گا کہ ان میں خیر ہی نہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں شکل اول ہی نہیں کیونکہ یہاں حد اوسط مکرر نہیں،

لاسمعهم اول سے مراد تو یہ ہے لاسمعهم فی حالة علم الخیر فیهم اور ثانی سے مراد یہ ہے کہ لو اسمعهم فی حال عدم علیم الله فیهم خیرا، حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ کو ان میں بھلائی کا

ہونا معلوم ہوتا تو وہ ضرور ان کو دین کی باتیں سنا دیتے اور وہ ان کو قبول بھی کر لیتے اور اگر اس حالت میں کہ خدا کو معلوم ہے کہ ان میں بھلائی نہیں ہے سرسری طور پر ان کو دین کی باتیں سنا دی جائیں تو وہ اعراض ہی کریں گے۔ اب وہ اشکال رفع ہو گیا اس سے آپ کو منطق کی ضرورت معلوم ہو گئی ہو گی۔

مذمت کفار

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ؁ اس آیت میں کفار کی مذمت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ علم خیر کے لئے اسماع لازم ہے اور اسماع کے لئے تولی لازم ہے اور قاعدہ عقلیہ ہے کہ لازم کا لازم لازم ہوا کرتا ہے تو علم خیر کے لئے تولی لازم ہوئی جس کا مطلب اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ کو ان کفار کے متعلق خیر اور بھلائی کا علم ہوتا تو ان کفار سے تولی اور اعراض کا صدور ہوتا اور اس کا استحالہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے علم کا واقع کے مطابق نہ ہونا لازم آتا ہے جو محال ہے اب اس شبہ کا رفع کرنا اس شخص کے لئے جو علوم درسیہ سے واقف نہ ہو بہت دشوار ہے اور جو علوم درسیہ پڑھ چکا ہو اس کے لئے ایک اشارہ کافی ہے وہ یہ کہ یہ شبہ تو جب صحیح ہوتا کہ یہاں اسماع حد اوسط ہوتا حالانکہ اسماع حد اوسط نہیں اس لئے کہ وہ مکرر نہیں کیونکہ پہلا اسماع اور ہے اور دوسرا اسماع اور ہے۔ لہذا تولی کو جو لازم کا لازم سمجھا گیا اور اس بناء علم خیر کے لئے تولی کو لازم قرار دیا گیا خود یہی غلط ہوا پس حق تعالیٰ کے علم کے متعلق واقعہ کے غیر مطابق ہونے کا جو شبہ ہوا تھا وہ رفع ہو گیا اب آیت کا صحیح مطلب یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ ان کے اندر کوئی خیر دیکھتے تو ان کو باسماع قبول سناتے مگر جبکہ حق تعالیٰ کے علم میں ان کے اندر کوئی خیر نہیں ہے ایسی حالت میں اگر ان کو نصیحت سنا دیں جو اسماع قبول نہ ہوگا کیونکہ یہ اسماع حالت عدم خیر میں ہوگا تو وہ لوگ اس کو ہرگز قبول نہ کریں گے بلکہ تولی اور اعراض کریں گے اسی طرح قرآن کی آیت پر ایک دوسرا شبہ اور اس کا جواب یاد آیا اس کا واقعہ یہ ہے کہ جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ایڈریانوپل پر کفار کا قبضہ ہوا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت پریشانی ہوئی اور طرح طرح کے خیالات فاسدہ آنے لگے حتیٰ کہ بعض کو نصوص پر کچھ شبہات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر دہلی کے مسلمانوں نے ایک بڑا جلسہ کیا اور مجھ کو اس جلسہ کے اندر مدعو کیا اور صدر بنایا اور لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی نیت سے مجھ سے وعظ کی درخواست کی چنانچہ میری اس جلسہ میں تقریر ہوئی جب وعظ ہو چکا تو بآواز بلند میں نے کہا کہ اگر کسی کو کوئی شبہ ہو یا کسی کو کچھ دریافت کرنا ہو تو دریافت کرے تا کہ بعد میں کوئی شخص یہ نہ کہے کہ مجھ کو یہ پوچھنا تھا اور نہ پوچھ سکا۔ یہ سن کر ایک ولایتی منتہی طالب علم کھڑے ہوئے یہ لوگ معقول زیادہ پڑھتے ہیں قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ معقولی ہیں کہنے لگے کہ قرآن شریف میں وعدہ ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ' مگر باوجود اس کے پھر ایڈریانوپل پر کفار کا قبضہ ہو گیا تو اس کی کیا وجہ میں نے کہا کہ مولانا یہ تو بتلائیے کہ

موجبات میں سے یہ کونسا قضیہ ہے بس میرے اس کہنے پر ہی وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے پھر میں نے ہی خود ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ شبہ ہوا کہ یہ قضیہ ضروریہ یا دائمہ ہے تو اس کی کیا دلیل ہے ممکن ہے کہ مطلقہ عامہ ہو جس کا ایک بار بھی وقوع کافی ہوتا ہے جو ہو چکا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو گیا اس کے بعد پھر کوئی شخص نہیں کھڑا ہوا تو دیکھئے چونکہ یہ طالب علم علوم درسیہ پڑھے ہوئے تھے اور مبادی ان کے ذہن میں تھے اس لئے میرے ایک لفظ سے ان کا شبہ حل ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور مولوی صاحب کو قرآن شریف کی ایک آیت کے متعلق شبہ تھا وہ یہ کہ آٹھویں پارہ میں ارشاد ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اول کفار مشرکین کا مقولہ نقل فرمایا ہے کہ اگر حق تعالیٰ یہ چاہتے کہ ہم سے شرک کا وقوع نہ ہو تو ہم شرک نہ کرتے (مگر جب ہم سے شرک کا وقوع ہوا تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہی نے چاہا ہے کہ ہم سے شرک ہو تو پھر ہم پر کیوں ملامت کی جاتی ہے کیونکہ ہم نے وہ کام کیا ہے جو حق تعالیٰ کا چاہا ہوا تھا) پھر اس مقولہ کے نقل فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے کذلک سے تخرصون تک کفار کے اس مقولہ کا رد فرمایا اور ساتویں پارہ میں ہے ولو شاء الله ما اشر کوا یعنی حق تعالیٰ حضور ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں کہ ان مشرکین کی حالت پر اتنا رنج و غم نہ کیجئے کیونکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں ہماری مشیت سے کر رہے ہیں اگر ہم چاہتے کہ یہ شرک نہ کریں تو یہ شرک نہ کرتے تو آٹھویں پارہ میں جو آیت ہے وہاں تو شرک کے متعلق مشیت کی نفی فرمائی اور اس دوسری آیت میں اس مشیت کا اثبات فرما رہے ہیں تو ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے وہ مولوی صاحب مجھ سے اس کے جواب کے طالب ہوئے اب وہ لوگ جو بلا علوم درسیہ پڑھے ہوئے محض ترجمہ قرآن کو بطور خود دیکھ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو سمجھ لیا ذرا اس شبہ کا تو جواب دیں میں نے یہ جواب دیا کہ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ تعارض تو جب ہوتا کہ جس مشیت کی ایک جگہ نفی کی گئی ہے اسی مشیت کا دوسری جگہ اثبات کیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مشیت کی دو قسمیں ہیں ایک مشیت تشریعی جس کا دوسرا نام رضا اور دوسرے مشیت تکوینی جس کا نام ارادہ ہے تو آٹھویں پارے میں جس مشیت کا اثبات کیا گیا ہے اس سے مراد مشیت تکوینی یعنی ارادہ ہے کیونکہ پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کا عقیدہ بیان فرمایا ہے تو کفار اپنے سے شرک کے متعلق مشیت تشریعی یعنی حق تعالیٰ کی رضاء کے معتقد تھے اور دوسری آیت میں ایک عقیدہ شرعیہ بیان فرما کر حق تعالیٰ حضور ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں اور وہ عقیدہ شرعیہ یہی ہے کہ عالم میں جس سے بھی کفر و شرک کا وقوع ہو رہا ہے وہ حق تعالیٰ کے علم و ارادہ سے ہو رہا ہے گو مشیت تشریعی نہ ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کرے گا۔ اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے

اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایہ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اسی لئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے جو لوگ حق پر ہوں۔ ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کے ساتھ فصل کا حکم ہے پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آج کل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مورد ملامت بنانے لگتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بددین ہو جانا چاہئے اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرلے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو اول یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون جب حق متعین ہو جائے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جائے بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے۔ **فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیئ الی امر اللہ**

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾

ترجمہ: پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔

تفسیری نکات

کشف بلا اتباع شریعت شیطانی چیز ہے

اب دیکھ لیجئے کہ بہت سے صحابہ تو ﷺ کو نہ دیکھ سکے اور شیطان نے دیکھ لیا قبر میں جب عذاب ہوتا

ہے تو جانوروں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ کتوں اور بلیوں کو کشف قبور ہوتا ہے مگر آج کل پیری کی یہ خاص علامت ہے بھلا جو چیز حیوانات تک میں مشترک ہو وہ کیسے انسانی کمال ہو سکتی ہے افسوس یہ لوگ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ شیطان کفار کے ساتھ تھا بلکہ جنگ میں شیطان ہی بڑھاوے دے کر کفار کو مقابلہ میں لایا تھا لیکن جب دونوں طرف سے صف بندی ہوئی اور شیطان کی نظر ان فرشتوں پر پڑی جو مسلمانوں کی تائید کے واسطے بھیجے گئے تھے تو نکص علی عقبیہ الٹے پیروں بھاگا۔ خدا تعالیٰ کا جلال اور عظمت تو بڑی چیز ہے فرشتوں کے سامنے بھی ٹھیرنے کی تاب نہ لا سکا یہاں کوئی طالب علمانہ اشکال یہ نہ کرے کہ شیطان کو کیا خوف پڑا فرشتے اس کا کیا کرتے۔ اسے خدا تعالیٰ نے قیامت تک کی مہلت دی ہے پھر فرشتے اسے مار تھوڑا ہی ڈالتے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ خوف عقلی کے دفعہ کرنے کیلئے یہ دلیل کافی ہے لیکن خوف طبعی اس سے نہیں جا سکتا چاہے کتنی ہی دلیلیں قائم ہوں اس کی مثال یہ ہے کہ جب آدمی زمین پر چلتا ہے تو ایک ہاتھ بھر چوڑا راستہ اس کے چلنے کے لئے بہت کافی ہے بلکہ اس سے کم میں بھی چل سکتا ہے لیکن اگر ایک دیوار بہت اونچی بنائی جاوے کہ وہ ہاتھ بھر سے بھی بہت زیادہ چوڑی ہو اور اس پر کوئی چلنا چاہے تو دلیل عقلی اور تجربہ اور مشاہدہ سب ہی کچھ موجود ہے کہ اس پر چلنے میں کوئی خوف نہیں اور گر پڑنے کی کچھ وجہ نہیں مگر خوف طبعی غالب آ جائے گا اور دیوار پر چلا نہ جائے گا۔ یہاں ایک مسئلہ اور زبان پر آ گیا وہ طالب علموں کے خاص کر کام کا ہے اور میری تقریر سے کچھ زیادہ بے جوڑ بھی نہیں وہ یہ ہے کہ اس بدر کے قصہ سے معلوم ہوا کہ شیطان صاحب کشف ہے کفار نے بلکہ بہت سے صحابہ نے بھی فرشتوں کو نہیں دیکھا اور شیطان نے دیکھ لیا یہی کشف کہلاتا ہے اور باوجود اس کے سب جانتے ہیں کہ شیطان ملعون ہے اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ کشف بلا اتباع شریعت شیطانی چیز ہے اور ذرا بھی فضیلت کی چیز نہیں۔

هُوَ الَّذِىْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ

ترجمہ: وہ اللہ وہی ہے جس نے آپ کو اپنی امداد سے اور مسلمانوں سے قوت دی اور ان کے قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا۔

تفسیری نکات

اتفاق کا تعلق تدابیر سے نہیں

ملفوظ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک صاحب تھے ندوہ کے فاضل ان کا خیال تھا کہ اگر کوشش کی

جائے تو تدبیر سے مسلمانوں میں اتفاق ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ نری تدبیر سے مسلمانوں میں اتفاق نہیں ہوسکتا اور میں نے یہ آیت پڑھی ھو الذی ایدک بنصرہ و بالمومنین والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم' دیکھئے حضور ﷺ جیسے مدبر اور تدبیر کا اتنا بڑا سامان کہ تمام ما فی الارض کا انفاق' مگر ان سب تدبیروں کا نتیجہ اور حاصل دیکھئے کیا ارشاد ہے کہ ما الفت بین قلوبھم وہ فاضل بیحد مطمئن ہوئے کہنے لگے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کبھی میری نظر سے نہ گزری تھی اور چونکہ اتفاق کا تعلق تدابیر سے نہیں اسی لئے میں نے اس اتفاق کا بیان آج تک وعظوں میں مستقلاً بیان نہیں کیا اس لئے کہ بیکار ہے جو چیز اصل ہے اتفاق کی وہ اعمال صالحہ ہیں اگر مسلمان ان کو اختیار کریں خود بخود اتفاق ہو جائے گا۔

عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ مل کر کام ہوتا ہے دیکھئے ھو الذی ایدک بنصرہ میں وبالمومنین بھی بڑھا دیا گیا ہے ورنہ مومنین کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی اس میں حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اتنی بڑی ہستی کی نصرت میں سنت یہی ہے کہ مل کر کام کیا جائے غرض ہر حال میں کام کرنے کی ضرورت ہے محض زبانی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا

(الافاضات الیومیہ ص۳۸ ج۷)

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾

ترجمہ: اگر خدائے تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا تو جو عمل تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔

تفسیری نکات

کثرت رائے کے غیر صحیح ہونے کی دلیل

کثرت رائے کے غیر صحیح ہونے کی ایک خاص دلیل نہایت قوی یہ ہے کہ جنگ بدر میں سترہ قیدی حضور ﷺ کے حضور میں لائے گئے اس وقت تک اس کے متعلق کوئی نص تھی نہیں کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاوے حضور نے صحابہ سے مشورہ کیا خود حضور ﷺ کی رائے مبارک یہ تھی کہ کچھ فدیہ لے کر سب کو چھوڑ دیا جائے آپ تو بڑے رحیم و کریم تھے۔ خود صحابہ کی بھی زیادہ تر یہی رائے ہوئی کیونکہ اسی میں مصلحت معلوم ہوئی اور مصلحت کھلی ہوئی تھی کیونکہ وہ سب قیدی بڑے بڑے سردار تھے۔ یہ خیال ہوا کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے گا تو اس کی تالیف قلب ہوگی ممکن ہے کہ حضور کی شان کرم کو دیکھ کر ان لوگوں کو محبت ہو اور اسلام لے آئیں اور یہ

رائے محض اس وجہ سے نہ تھی کہ خود حضور اقدس ﷺ کی بھی رائے مبارک یہی تھی بلکہ خود صحابہ کی بھی آزادانہ رائے اس مصلحت سے جس کا ابھی ذکر کیا گیا یہی تھی اور مشورہ اسی لئے کیا بھی جاتا ہے کہ مختلف رائیں معلوم ہوں جن میں سے پھر مستشیر یا امیر ایک کو ترجیح دے سکے اور مشورہ کا حاصل یہی ہے کہ سب کی رائے ظاہر ہو جائے اس لئے سب صحابہ نے آزادانہ اپنی رائے پیش کی تھی اتنی بڑی جماعت میں صرف حضرت عمرؓ اور سعد بن معاذ اس رائے میں موافق نہ تھے کہ ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ سارے مجمع میں ان دو بزرگوں کی یہ رائے تھی کہ یہ بڑے بڑے سردار ہیں ان سب کو قتل کر دیا جائے تا کہ کفر کی شوکت ٹوٹ جائے اور مسلمانوں کی یہ دھاک بیٹھ جائے کہ افوہ ان میں اتنی قوت ہے کہ کسی جماعت کی پرواہ نہیں کی اور کسی کو تدبیر وتالیف سے اپنے میں مدغم کرنا نہیں چاہتے سب سے مستغنی ہیں جب رائے کا انتخاب ہوا تو یہی رائے منتخب ہوئی کہ فدیہ لے کر سب کو چھوڑ دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اس وقت دیکھئے صرف اسی کثرت رائے کی صورت تھی اگر یہ طریقہ کثرت رائے کا حق ہوتا تو اس کے خلاف آیت کیوں نازل فرمائی گئی اور آیت بھی کیسی سخت۔ ارشاد ہوا لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝ یعنی اگر تمہاری تقدیر میں پہلے سے خیر نہ لکھ دی گئی ہوتی تو تم نے جو عمل کیا اس پر عذاب عظیم آتا' جب یہ آیت نازل ہو چکی تو حضور کو دیکھا گیا کہ رو رہے ہیں' حضرات صحابہؓ نے پریشان ہو کر پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب قریب آ گیا تھا لیکن رک گیا اور اگر نازل ہو جاتا تو سوائے عمر اور سعد بن معاذ کے کوئی نہ بچتا سب ہلاک ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ نے غلطی دکھلانے کے لئے عذاب دکھلا دیا اور یہ دکھلانے کے لئے اجتہادی غلطی معاف ہے عذاب کو ٹال دیا۔ اور حضرت عمرؓ بجائے اس کے کہ فخر کرتے کہ میری رائے کے مطابق وحی نازل ہوئی بہت مغموم اور شرمندہ تھے کہ میں اس قابل کہاں کہ میری رائے کے موافق وحی نازل ہوئی خیر یہ قصہ تو ہوا لیکن جن کو فدیہ دے کر چھوڑ دیا گیا ان میں سے اکثر نے بعد کو اسلام قبول کر لیا انہیں میں حضرت عباسؓ بھی تھے اگر وہ قتل کر دیئے جاتے تو ان کے اولاد کہاں ہوتی اور بنو عباس کی خلافت کہاں ہوتی اور جو ان سے اسلام کی رونق اور قوت ہوئی وہ کہاں ہوتی بہر حال کثرت رائے کا باطل ہونا اس سے زیادہ کسی دلیل سے ثابت ہو سکتا ہے۔ ترجمہ' اے پیغمبر ﷺ آپ کے قبضہ میں جو قیدی ہیں اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلب میں ایمان معلوم ہو گا تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے دنیا میں تم کو اس سے بہتر دے دے گا۔ اور آخرت میں تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

مصیبت کی حقیقت

جو تم سے (اس وقت فدیہ میں) لیا گیا ہے اور تمہاری مغفرت فرما دیں گے مراد یہ ہے کہ اس جملہ میں

اعطاء فی الدنیا مراد ہے اور جملہ ثانیہ میں اجر آخرت مراد ہے **ویغفر لکم** یعنی آخرت میں تمہاری مغفرت فرما دیں گے واللہ غفور رحیم کہ اللہ تعالیٰ تو بہت مغفرت فرمانے والے اور رحم فرمانے والے ہیں (اس لئے تم کو اس وعدہ میں تردد نہ کرنا چاہیے)

حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر تمہارے دل میں ایمان ہو تو تم کو اس مالی نقصان کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے جو فدیہ سے اس وقت پہنچا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تم کو دنیا و آخرت میں اس کا نعم البدل عطا فرمائیں گے اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر نقصان و مصیبت کا نعم البدل ملتا ہے۔ اور ہر چند کہ مورد آیت کا خاص ہے مگر جس امر پر اس وعدہ کو مرتب فرمایا ہے وہ مورد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اس لئے آیت سے یہ قاعدہ مفہوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر مصیبت کا نعم البدل ملتا ہے۔ یہاں تو تعمیم پر کوئی صیغہ صراحۃً دال نہیں مگر دوسری نصوص سے اس تعمیم کی تائید ہوتی ہے اس وعدہ اور قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ وہ یہ کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے یہی حقیقت ہماری نظر سے غائب ہوتی ہے اس لئے مصیبت سے رنج زیادہ ہوتا ہے۔

اب دیکھو کہ تجارت میں انسان یہ چاہا کرتا ہے کہ میرے مال کی نکاسی ہو کہ جو چیزیں میرے ہاتھ کے تلے ہیں کوئی ان کا لینے والا خریدنے والا ہو۔ اگر خریدار کوئی نہ آئے تو تاجر گھبرا جاتا ہے خاص کر ایسی اشیاء میں جو باقی رہنے والی نہیں جیسے کل کے روز برف بہت ارزاں دہلی کے بھاؤ پر مل گئی تھی۔ کیونکہ خریدار کم ہوئے اور برف کا رہنا دشوار تھا اس لئے دہلی کے بھاؤ پر یعنی اپنی خریداری پر ہی دے گیا شہروں میں تو ایسا بہت ہوتا ہے کہ شام کو برف نہایت ارزاں ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تاجر اپنے مال تجارت پڑا رہنے پر رنجیدہ ہوتا ہے نکل جانے پر رنجیدہ نہیں ہوتا حالانکہ وہ اپنے خریداروں کے ہاتھ ایک محدود نفع پر بیچتا ہے مگر پھر بھی وہ خریداروں کا مشتاق رہا ہے کہ کوئی میرا مال لے لے مرابحہ نہ ہو تو تولیہ ہی ہو تولیہ نہ ہو تو میلی کچیلی صافی ہی سہی لیکن نفع نہ ہو تو کچھ خسارہ ہی سہی چنانچہ بعض دفعہ ایسے مال کو جس کا خریدار کوئی نہ ہو کسی قدر خسارہ سے بھی فروخت کر دیتا ہے۔

جب تجارت کی یہ حقیقت ہے تو صاحبو! اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ یہ واقعات رنج و مصیبت تمام تر تجارت ہی ہیں اور تجارت بھی ایسی جس سے بڑھ کر نفع کسی تجارت میں نہیں ہوتا تو کیا پھر بھی نالہ و شیون باقی رہے گا میں رنج طبعی کا منکر یا مانع نہیں جو فطری طور پر ہوتا ہے بلکہ میں آگے اس کی ضرورت پر کلام کروں گا کہ طبعی رنج تو ہونا چاہئے ورنہ ثواب و اجر ہی نہ ہوگا۔ مگر میں اس وقت رنج عقلی کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں کہ واقعات رنج و مصیبت کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد رنج عقلی نہ ہونا چاہئے۔

عمل صبر و شکر

خلاصہ یہ ہے کہ حالات کی دو قسمیں ہیں گوار و ناگوار پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اختیاری و غیر

اختیاری' یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جن میں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں اور مومن اگر ان کے حقوق ادا کرتا رہے تو اس کو نعم البدل ملتا ہے اسی لئے مومن کسی حالت میں نقصان میں نہیں بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے اس لئے حدیث میں ہے۔

نعم الرجل المومن ان اصابته سراء حمد وان اصابته ضراء صبرو فی کل اجر او کما قال

یعنی مومن آدمی بڑی اچھی حالت میں ہے اگر اس کو راحت پہنچتی ہے حمد و شکر کرتا ہے اگر تکلیف پہنچتی ہے صبر کرتا ہے اور ہر ایک میں اس کو اجر ملتا ہے یعنی شکر میں بھی اجر ہے اور صبر میں بھی'

اس حدیث سے بھی یہ معلوم ہوا گیا کہ امور غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے وہ ان اعمال کی وجہ سے جو اختیاراً اس وقت مومن سے صادر ہوتے ہیں یعنی راحت میں حمد۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ

ترجمہ: کہ ان قیدیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمہارے دلوں میں خیر ہوگی (یعنی ایمان) تو اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر چیز دیں گے جو تم سے لی گئی ہے

تفسیری نکات

مؤمن کی بشارت

یہاں مومن کو بشارت بھی نقصان مالی پر نعم البدل کا وعدہ ہے جس کو ایمان کے ساتھ مشورہ کیا گیا ہے حاصل یہ ہوا کہ مومن کو ہر نقصان کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے اور ان نصوص مذکورہ پر نظر کر کے ہم کو اس نص اخیر کی تعمیم کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ دوسری نصوص سے تعمیم ثابت ہے گو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اخذ منکم میں ما عام ہے مال کو اور غیر مال کو جس میں سب مال اور اعیان داخل ہیں خصوصاً جبکہ قاعدہ فقہیہ یہ ہے کہ اعتبار عموم نص ہے خصوص مورود کا اعتبار نہیں مگر مجھے خود اس قاعدہ ہی کے عموم میں کلام ہے اس لئے میں اس آیت پر تعمیم کا مدار نہیں کرتا بلکہ مجموعہ نصوص کے اعتبار سے اس مضمون کو عام کرتا ہوں۔ مگر اس کی تلاوت اس لحاظ سے ہوئی ہے کہ ایک مناسب سے دوسرے مناسب کی طرف اشارہ کرنا ابلغ ہے اور تمام نصوص کا پڑھنا دشوار تھا۔

کسی ایک کا اختیار ضروری تھا جس کے لئے وجہ مرجح میں نے بالکل تمہید کے بیان کر دی۔

خلاصہ یہ کہ معاملات تشریعیہ کا تجارت ہونا تو ظاہر ہے کہ ایک عمل ہم نے پیش کیا ادھر سے اس کی قیمت مل گئی

مگر اس کے علاوہ ہمارے ساتھ جس قدر معاملات تکوین میں بھی ہوتے ہیں ان سب کی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر غم بہت ہلکا ہو جائے گا باقی طبعی میں انکار نہیں کرتا وہ تو ہوگا اور ہونا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے اجر ملتا ہے اور اس سے شان عبدیت ظاہر ہوتی ہے اگر انسان پر رنج وغم وارد نہ ہو فرعون بے سامان ہو جائے مگر ضرورت اس کی ہے اس غم کو ہلکا کیا جائے غم کا بڑھنا خود مصیبت ہے جس سے راحت فوت ہونے کے علاوہ بعض اوقات جو اصل دولت ہے اجر' وہ بھی ضائع ہو جاتی ہے اور غم ہلکا ہونے کی وہی تدبیر ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی جب انسان یہ سمجھے گا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ مجھ کو نعم البدل عطا فرماتے ہیں تو غم ہلکا ہو جائے گا۔ پھر وہ نعم البدل بھی اس قدر کہ اس کا اندازہ لکھنا دشوار ہے اور مصائب پر صبر کرنا تو نہایت دشوار ہے اس پر تو وہ غیر متناہی ملے تو کیا عجب ہے جس پر آیت

انما یوفی الصبرون اجرھم بغیر حساب (مستقل رہنے والوں کا صلہ بے شمار ہی ملے گا)

میں متنبہ بھی فرمایا ہے وہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا ہے چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان و زمین کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزان عمل بھر جاتی ہے۔

یہ اس لئے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سن کر یہ احتمال ہو کہ نہ معلوم میزان عمل بھی کسی چیز سے بھری ہوگی۔ کیونکہ ممکن ہے وہ آسمان و زمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہے تو ممکن ہے وہ آسمان و زمین بھرنے کے لئے کافی نہ ہو اور ہم کو سابقہ پڑے گا میزان ہی سے۔ خصوص طالب علموں کو ایسے احتمالات بہت ہوتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تو کٹورا بھی حوض کے برابر ہو سکتا ہے۔

سُوْرَۃُ التَّوْبَۃ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَیْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین (اسلام) پر طعن کریں تو تم لوگ اس قصد سے کہ یہ باز آ جائیں ان پیشوایان کفر سے (خوب) لڑو ان کی قسمیں نہیں رہیں۔

تفسیری نکات

کفر سے حربی نہیں ہوتا

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اس میں اختلاف ہے کہ ذمی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی یا کسی قسم کی اہانت کرے تو وہ حربی ہو جاتا ہے یا نہیں، میں اس کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ گستاخی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ بطریق مناظرہ رسالت کی نفی کرے سو یہ کفر تو ہے مگر کفر سے حربی نہیں ہوتا اور ایک صورت یہ ہے کہ بطریق طعن و استہزاء کے رسالت کی نفی کرے اس صورت میں عہد ٹوٹ جاتا ہے اس باب میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ اس تفصیل سے اقوال مختلفہ میں تطبیق ہو گئی۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ

ترجمہ: کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور (اللہ کے واسطے) انہوں نے ترک وطن کیا ہو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو یہ لوگ برابر نہیں اللہ کے نزدیک۔

تفسیری نکات

سبب افضلیت معیار ایمان ہے

تو آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ افضلیت کی اور اس کا معیار ایمان ہے۔ یعنی جس چیز کو ایمان سے زیادہ تلبس ہوگا وہ زیادہ افضل ہوگی اور اسی وجہ سے ایمان کے ساتھ ایک دوسری صفت یعنی جاھد فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں اس نے جہاد کیا) کو بھی ذکر کر دیا کیونکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث اور اسلام کے پھیلانے میں معین ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کوئی عمل ایسا نہیں کہ بدوں اس کے دوسرے عمل بالکل مقبول نہ ہوں مثلاً ایسا نہیں کہ نماز بدوں زکوۃ کے قبول نہ ہو اور زکوٰۃ بدوں حج کے بجز ایمان کے کہ اس پر تمام اعمال موقوف ہیں پس اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ متعدی کو من کل الوجوہ افضل کہنا غلطی ہے چنانچہ ایمان عمل متعدی نہیں اور پھر سب سے افضل ہے اور یہیں سے یعنی ایمان کے افضل الاعمال ہونے سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو کہ غیر ایمان کو اہل ایمان پر فضیلت دیتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے فلاں قوم اچھی ہے البتہ اگر ایسے مضامین سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہو تو مضائقہ نہیں بعض لوگ بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص مسلمان ہو کر بھی فلاں عیب کو نہیں چھوڑتا اس سے تو مسلمان ہی نہ ہوتا تو بہتر تھا یہ سخت غلطی اور جہل ہے۔ ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ رنڈیوں کو مسلمان نہ کرنا چاہئے اسلام کو ایسے مسلمانوں سے عیب لگتا ہے میں نے کہا کہ اگر ایسے مسلمانوں کو نکالے تو تم کو ان سے پیشتر نکال دے گا تمہارے اعمال کہاں کے اچھے ہیں بعضے لوگ چمار بھنگی کے مسلمان ہونے کو بوجہ تحقیر کے پسند نہیں کرتے مگر یاد رکھو جب قیامت کا دن ہوگا اس روز معلوم ہو جائے گا کہ ہم جن کو ذلیل سمجھتے تھے ان کی کیا حالت ہے اور ہماری کیا گت

؎ فسوف تری اذا انکشف الغبار افرس تحت رجلک ام حمار

(پس عنقریب تو اے مخاطب دیکھ لے گا جس وقت کہ غبار ختم ہو جائے کہ آیا تیرے پیروں کے نیچے

گھوڑا ہے یا کہ گدھا میدان جنگ میں کس قسم کے سوار پر فتح پائی ہے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی ایک قسم کا غبار جب موت واقع ہوگی اور دنیاوی پردہ ختم ہو جائے گا۔ اس وقت حقیقت حال ظاہر ہو جائے گی۔

اسی طرح مومن عیب دار کو کافر باکمال کے مقابلے میں آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص جو صرف ایمان لایا تھا اور کوئی عمل اس نے اچھا نہیں کیا اس کو تھوڑی مدت کے بعد عذاب سے نجات ملے گی اور کہا جائے گا اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (جنت میں داخل ہو جاؤ اب نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا نہ کسی کا غم) اور اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص جو کہ دنیا میں بڑا خلیق مہربان باکمال تھا لیکن دولت ایمان سے محروم تھا وہ ابدالآباد جہنم میں رہے گا اور کبھی اس کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

مسلمان اور کافر کی مثال

اس کو واضح طور سے یوں سمجھو کہ اگر گورنمنٹ کی رعایا میں دو شخص ارتکاب جرم کریں ایک تو چوری میں ماخوذ ہو اور دوسرا بغاوت میں تو اگرچہ سزا دونوں کو دی جائے گی لیکن چور کی سزا محدود اور کم ہوگی ایک دن ایسا ضرور ہوگا کہ وہ سزا بھگت کر پھر اپنے گھر آئے اور چین سے بسر کرے پر وہ باغی کبھی عذاب سے نجات نہیں پائے گا اور زندگی بھر سزا کی تکلیف میں رہے گا یا فوراً پھانسی کا حکم ہوگا کہ زندگی ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ گو وہ کتنا ہی بڑا لائق فائق ہو اور وہ چور بالکل جاہل کندہ ناتراش ہو۔

صاحبو! ایمان ایک آفتاب ہے اگر ہزاروں بدلی کے ٹکڑے اس پر حائل ہوں تب بھی اس کا نور فائض ہو کر رہے گا اور جھلک جھلک کر روشنی پڑے گی اور کفر کی خوش اخلاقی آئینہ کی سی چمک ہے جو کہ بالکل عارضی ہے۔

دوسری مثال لیجئے اگر ایک گلاب کی شاخیں کسی گملہ میں لگا دی جائیں اور اس کے مقابل کاغذ کے ویسے ہی پھول بنا کر رکھ دیئے جائیں تو اگرچہ اس وقت کاغذ کے پھولوں میں زیادہ رونق اور شادابی ہے اصل گلاب کی وہ حالت نہیں لیکن چھینٹا بارش ہو جائے پھر دیکھئے کہ گلاب کیا رنگ لاتا ہے اور کاغذ کے پھول کیسے بد رنگ ہوتے ہیں پس اگر مسلمان اگرچہ دنیا میں کسی حالت میں ہوں لیکن قیامت میں جب ابر رحمت برسے گا تو دیکھنا کہ اس کا اصلی رنگ کیسا کچھ نکھرتا ہے اور کافر کی زرق برق حالت پر کیا پانی پڑتا ہے صاحبو! غیرت آنی چاہئے کہ مسلمان ہو کر اسلام کی حقیقت جان کر اپنے منہ سے کافر کو مسلمان پر فضیلت دو اور مسلمان کی مذمت اور کافر کی تعریف کرو۔ جب معلوم ہوا کہ ایمان ایسی بڑی چیز ہے تو اس کے ساتھ جن چیزوں کو زیادہ تلبس ہوگا وہ افضل ہوں گی لیکن تلبس بالایمان کو سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ کیونکہ بعض ایسے اعمال ہیں کہ وہ خود اسلام کا مبنیٰ ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ وہ اسلام پر مبنی ہیں۔

تو معیار وہ اعمال ہیں جو کہ مبنیٰ ہوں اسلام کا چنانچہ آیت میں ایمان کے ساتھ اسی عمل کو ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اسلام کو قوت پہنچتی ہے۔ اور مسجد حرام کی تعمیر خود اسلام پر مبنی ہے۔ پس یہاں سے معلوم ہوگا کہ مسجد کی خدمت سے دین کی مدد اور اس کو قوی بنانا زیادہ افضل ہے اسی طرح اور جس قدر اعمال ہیں سب میں یہی دیکھنا چاہئے جیسے تعلیم و تعلم وعظ ارشاد یعنی اصلاح خلق۔

پس وظیفہ وظائف سے اصلاح خلق میں زیادہ فضیلت ہوگی کیونکہ یہ مبنی ہے ایمان کی تکمیل کا مگر یہ افضلیت باعتبار معیار مذکور کے فی نفسہ ہے ورنہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو عمل فی نفسہ افضل نہیں وہ کسی عارض کی وجہ سے زیادہ قابل توجہ ہو جائے اور کسی خاص وقت میں اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ افضل ہے جیسے وضوء کہ نماز سے افضل نہیں لیکن بعض اوقات بوجہ شرطیت نماز کے زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً وعظ کہنا کہ فی نفسہ تخلیہ للعبادۃ سے افضل ہے۔

لیکن جبکہ وعظ پر مقصود بقدر ضرورت مرتب ہو چکے تو بلا ضرورت ہر وقت اس میں مشغول رہنے سے یہ بہتر ہوگا کہ کسی وقت عبادت کے لئے تخلیہ بھی تیار کرے اور کسی وقت اپنی بھی فکر کرے اور خدا کی یاد میں لگے اور اسی کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔

واقیموا الصلوة و لا تکونو امن المشر کین (الروم آیت ۳۱)

(اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہو)

تارک نماز کے لئے وعید

آگے فرماتے ہیں **ولا تکونوا من المشر کین** جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مشرکین میں سے مت ہو اس میں غور کرنے کی یہ بات ہے کہ نماز کے حکم میں اور اسی نہی میں جوڑ کیا ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ مشرکین عرب حج کرتے تھے مگر نماز نہ پڑھتے تھے چنانچہ حج کرنے والوں کو نہ روکتے تھے اور نماز پڑھنے والوں کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے سو وہ حج کے تو خلاف نہ تھے مگر نماز کے بالکل خلاف تھے اور یہود و نصاریٰ نماز پڑھتے تھے۔ حج نہ کرتے تھے اس لئے حج نہ کرنے پر حدیث میں یہودی یا نصرانی ہو کر مرنے کی وعید کی گئی ہے۔ اور یہاں آیت میں بے نمازی کو مشرک سے تشبیہ دی گئی اور گو یہ دونوں فرقے ہیں کافر لیکن یہود و نصاریٰ سے مشرک اور زیادہ برے ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ موحد تو ہیں گو ان کی توحید کار آمد اور کافی نہیں اور عدم مغفرت میں دونوں برابر ہیں تو نماز کا ترک کرنا دوسرے عبادات کے ترک سے زیادہ برا ہوا۔ پس مطلب یہ ہوا کہ نماز چھوڑ کر مشرکوں کے مشابہ نہ بنو اور اس عنوان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہئے جس میں کفار کے ساتھ مشابہت ہو اب رہا یہ کہ آیت میں **اقیموا الصلوة** پر کیوں نہیں اکتفا کیا تو اس میں نکتہ یہ

ہے کہ مسلمان بے نمازی سے نفرت پیدا ہو کیونکہ کوئی ایسا نہیں جس کو شرک سے نفرت نہ ہو کیونکہ توحید ہر شخص کو محبوب ہے اور توحید کی ضد مبغوض ہے۔ جب فرمایا کہ نماز پڑھو اور مشرک نہ بنو تو اس لفظ سے وحشت ہو گی یہ ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ اطاعت اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے کہ اطاعت اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اطاعت اختیار کرنا بغاوت سے بچنا ہے اور ترک اطاعت بغاوت ہے ایسے ہی نماز پڑھنا شرک سے بچنا ہے۔ اور نہ پڑھنا مشرک بننا ہے۔ گو اس کے معنی یہ نہیں کہ نماز نہ پڑھنے سے آدمی کافر اور مشرک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ عقیدہ اہل سنت کے خلاف ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ یہ عمل مشرکوں کا سا ہے جیسے حدیث میں وارد ہے من ترک الصلوة متعمد افقد کفر عملاً یعنی کام کافروں کا سا کیا جیسے کہتے ہیں کہ فلانا چمار ہو گیا اس کے یہ معنی نہیں کہ واقعی چمار ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چماروں کے سے کام کرنے لگا تو نماز نہ پڑھنے والے کو مشرک فرمانا بمعنی حقیقی تو نہیں ہے مگر جس معنی میں بھی ہو لفظ نہایت موحش ہے مشرک سے برا کوئی نہیں اس واسطے اللہ تعالیٰ نے نفرت دلانے کے لئے اقیموا الصلوة کے ساتھ ولا تکونوا من المشرکین بھی بڑھا دیا۔ کیونکہ صرف نماز کے حکم سے اتنی تاکید نہ ہوتی اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مشرک بننا ترک نماز سے بہت زیادہ برا ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وجہ شبہ مشبہ بہ میں زیادہ ہوتی ہے خواہ زیادتی کسی حیثیت سے ہو مثلاً کہتے ہیں کہ زید شیر ہے۔ یعنی ایسا بہادر ہے جیسا شیر تو اس میں ضرور ہے کہ بہادری شیر میں زید سے زیادہ ہے۔ ایسے ہی جب ترک نماز کو مشرک بننے کے ساتھ تشبیہ دی گئی تو یہ بات مسلم ہوئی کہ شرک ترک نماز سے بھی زیادہ برا ہے۔ تو شرک کس قدر بری چیز ہوئی۔ (ادب الاسلام ملحقہ مواعظ خیر الاعمال)

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ کہ ایک وقت ایسا بھی نکالئے کہ صرف خدا ہی کی یاد میں اس وقت مشغول ہوں کوئی دوسرا کام نہ ہو

بفراغ دل زمانے نظر بماہ روے — بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(ایک زمانہ فراغ دلی کے ساتھ نظر کرنا اس خوبصورت کی طرف بہتر ہے چتر شاہی سے اور تمام دن کی ہاؤ سے)

اور

خوشا وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

(مبارک ہے وہ وقت اور گھڑیاں جب ایک محبّ اپنے محبوب کے وصل سے سرفراز ہو)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر شے کے بقاء کے لئے ایک سبب ہوتا ہے اور نسبت جس کی بدولت وعظ بھی مؤثر ہو گیا ہے اس کی بقاء کا سبب یہ ہے کہ کسی وقت صرف شغل مع اللہ رہے اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی بھی

معلوم ہوگئی ہوگی جو کہ مشیخت تک پہنچ کر اپنا کام بالکل چھوڑ دیتے ہیں اس سے ان کی نسبت ضعیف ہو جاتی ہے اور فیض بند ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو اعمال اسلام کا مبنی ہوں وہ افضل ہوں گے اس قاعدہ کو محفوظ کر کے اعمال میں فیصلہ کر لینا چاہئے اور جس کو اس قدر قوت نہ ہو کہ خود فیصلہ کر سکے وہ کسی عالم سے پوچھ لے کیونکہ ہر شخص کچھ نہ کچھ عمل کرتا تو ضرور ہے اور ہر شخص کو اس کی تمیز نہیں ہو سکتی جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ بعض اوقات اعمال غیر فاضلہ بھی کسی عارض کی وجہ سے افضل ہو جاتے ہیں تو ایسے مواقع پر دریافت کر لینا چاہئے کہ البتہ اگر کوئی عمل ایسا ہو کہ اس کی ضرورت محسوس ہو اور کوئی دوسرا عمل اس وقت اس کے مقابلے میں ایسا ضروری نہ ہو تو اگرچہ یہ مفضول ہی ہو اس کو کرنا چاہئے مثلاً ایک آباد مسجد گرگئی اور نمازی پریشان ہیں یا عیدگاہ گرگئی تو ایسے موقع پر اس کا کرنا زیادہ ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن اعمال کی ضرورت متعین ہو اور وہ معلوم بھی ہو جائے وہاں تو اس کو کر لینا چاہئے اگرچہ مفضول ہو اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں اپنی رائے سے ایک عمل کو دوسرے عمل پر ترجیح نہ دینا چاہئے۔ بلکہ کسی عالم سے استفتاء کرنا چاہئے جیسے مثلاً بخاری شریف کا وقف کرنا یا کسی غریب کو کھانا کھلا دینا۔ اب اس کے مقابلے کے لئے یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ جس طرح حسنات میں تفاضل ہے اسی طرح گناہوں میں بھی تفاوت ہے۔

لیکن جس طرح حسنات میں استفتاء کرنے کی ضرورت ہے کہ کس عمل کو کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے اسی طرح سیئات میں استفتا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سب کو چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ چھوٹے بڑے گناہ سب گناہ ہیں اور حرام ہیں۔ اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ فلاں کام بہت ہی گناہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر چھوٹا ہو تو ہم کر لیں یاد رکھو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی ایک چنگاری کی نسبت پوچھے کہ کیا یہ چنگاری بہت بڑی ہے یا انگارا تو صاحبو جس طرح ایک بڑا انگارا مکان بھر کو پھونک دے گا اسی طرح ایک چنگاری بھی گھر بھر کو پھونک دے گی تو ایمان کے قصر کو ایک چھوٹا گناہ بھی ویسا ہی برباد کر دے گا جس طرح بہت بڑا گناہ تو سب سے بچنا چاہئے بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ رشوت لینا زیادہ گناہ یا سود کھانا میں کہتا ہوں کہ یہ کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ پیشاب زیادہ گندہ ہوتا ہے یا پاخانہ تاکہ جو کم گندہ ہو اس کو تناول فرمائیں غرض یہ ہے کہ حسنات میں تو تفاضل کو دریافت کرو اور گناہ سب چھوڑ دو

افضل الاعمال

اب مناسب ہے کہ اصلی اور صحیح معیار بیان کر دیا جائے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اَجَعَلۡتُمۡ سِقَايَةَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَةَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ كَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ لَا يَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ؕ (کیا تم نے

حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ان لوگوں کے برابر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں)

اس کے شان نزول میں مختلف قصے آئے ہیں جن کی تفصیل اس وقت مستحضر نہیں اتنی قدر مشترک ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بعض لوگوں میں گفتگو ہوگئی تھی کہ ایک جماعت اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے کو افضل سمجھتی تھی دوسری جماعت اپنے تئیں خدا تعالیٰ اس آیت میں افضل اعمال کا فیصلہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ کونسی جماعت افضل ہے ترجمہ آیت کا یہ ہے۔

کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر کرنے کو اس شخص کے اعمال کے برابر کرتے ہو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے دین کو نفع پہنچایا ہو یہ دونوں جماعتیں ہرگز برابر نہیں مطلب یہ ہے کہ عمارت مسجد اور سقایۃ حاج ایمان باللہ واعلائے کلمۃ اللہ کی برابر نہیں ہے کیونکہ جعلتم کا مفعول سقایۃ کو قرار دیا ہے جو کہ عمل ہے تو مقصود اعمال کا تفاضل بیان کرنا ہے رہی یہ بات کہ ایک جانب میں تو جعلتم کا مفعول اعمال کو بنایا اور دوسری جانب میں کاف کا مدخول مومنین کی ذات کو قرار دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بھی ذہن میں آئی کہ جو لوگ معمرین مسجد تھے وہ اس وقت تک کافر تھے اور عمل ان کا نیک تھا اگرچہ خصوصیت محل کی وجہ سے اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں تھا تو اس جانب میں اعمال کو ذکر کرکے یہ بتلا دیا کہ اب بوجہ عامل کے مومن نہ ہونے کے یہ اعمال مقبول ہی نہیں لیکن اگر اس سے قطع نظر بھی کی جائے اور نفس اعمال کو دیکھا جائے تب بھی اپنے مقابل اعمال سے کم ہیں اور دوسری جانب میں ذات کو کاف کا مدخول بنا کر یہ بتلا دیا کہ ان اعمال کی یہ حالت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے خود عمل کرنے والا بھی مقبول ہو جاتا ہے الغرض اس آیت میں افضلیت سقایۃ وعمارت کے دعوے کی تغلیط ہے اور مبنی اس دعوی کا وہی تھا جو آج کل عوام الناس میں ہے یعنی عمل کا نفع عاجل ہو اور عام ہو اور عمل کی صورت عبادت کی سی ہو سقایۃ الحاج میں تو نفع عام اور نفع عاجل تھا اور تعمیر مسجد کی صورت عبادت کی تھی اس لئے ظاہراً معنی فضیلت کے اس میں زیادہ تھے اور اس کی تغلیط کرکے خدا تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ فضیلت فلاں فلاں عمل میں ہے لیکن اس میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے افضل بتایا ہے ان میں وجہ اس افضلیت کی کیا ہے اور اس میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ نفع لازم سے نفع متعدی افضل ہے یا نہیں اور تعدیہ یا لزوم پر افضلیت کی بنا ہوسکتی ہے یا نہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: یعنی فرما دیجئے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے والے اور وہ مال جس کو تم نے محنت کیا ہے اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور وہ گھر جو تمہیں محبوب ہیں تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے یہاں تک کہ اللہ اپنے حکم کو لاوے اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

تفسیری نکات

یہ محل وعید میں ہے مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں مذکور ہوئی ہیں خدا سے اور اس کے احکام سے زیادہ محبوب ہیں تو ان کا حکم اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ محض حب مساکین پر اور نہ رضا بالساکن پر وعید ہے یعنی مکان کو پسند کرنے پر بھی وعید نہیں ہے اس لئے کہ اچھا اور پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت ہے اب وعید کا ہے پر صرف احب پر ہے کہ وہ خدا سے زیادہ محبوب ہوں تب محل وعید ہیں اس میں بھی مطلق محبوب ہوئے تو مکان کا نہ مرضی پر ہونا محل وعید ہے نہ محبوب ہونا بلکہ احب من اللہ ہونا (یعنی اللہ سے زیادہ محبوب ہونا) محل وعید ہے۔ اگر کوئی شخص بقدر ضرورت مکان بنوالے جس میں اسراف نہ ہو تو کوئی حرج نہیں اور یہ ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس کو کتنا مکان ضروری ہے کیونکہ ضرورت کے درجات مختلف ہیں اور انہیں درجات کے لحاظ سے ضروریات بھی مختلف حجرہ آسائش و راحت کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور کسی کو ایک بڑا مکان بھی مسئلہ ہوتا ہے بہر حال عمدہ پختہ اور بڑا مکان بنانا شرعاً ماذون فیہ (اس میں اجازت ہے چنانچہ اس کے عدم جواز کا کسی کا بھی مذہب نہیں ہے ایک شخص زیادہ سردی میں لحاف اوڑھتا ہے اور ایک شخص کا جاڑا ہلکی ہلکی رضائی میں چلا جاتا ہے دونوں کا سال گزر جاتا ہے بہر حال ہر شخص اپنی ضرورت کو خود ہی سمجھ سکتا ہے وہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں اسراف اور حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو اور عجب کا اختلاط نہ ہو کیونکہ یہ درجہ نمائش کا ہے جو

ناجائز ہے اوراسراف میں کہ منہی عنہ کاارتکاب نہ ہواور جوخرچ بھی ہووہ معصیت میں خرچ نہ ہواس میں یہی تفصیل ہے بعض دفعہ ایک ہی شی ایک شخص کے اعتبار سے اسراف اور دوسرے شخص کے اعتبار سے اسراف نہیں ہوتی مثلاً ایک شخص کوعمدہ کپڑا پہننے کی وسعت ہے اور ایک شخص کوایک روپیہ گز کے کپڑے کی بھی وسعت نہیں یہ اگردس روپیہ گز کا کپڑا خریدے گا تو ضرور قرض دار ہوگا اب دونوں نے کام تو ایک ہی کیا لیکن جس کو وسعت ہے اس کے لئے تو کچھ حرج نہیں نہ اس پر اسراف کا الزام اور جس نے بے ضرورت گردن پھنسانے کی کوشش کی وہ گناہ گار ہوگا مسرف شمار ہوگا کیونکہ بلاضرورت گناہ ہے دیکھئے دس روپیہ گز کا کپڑا خریدنا ایک ہی فعل ہے مگر ایک کے لئے جائز ہے اور ایک کے لئے گناہ ہے بات یہ ہے کہ واقع میں تو وہ فعل مباح ہے مگر اس کی وجہ سے اس کے لئے موجب گناہ بن گیا اور وہ عارض کیا تھا بلاضرورت اگر یہ اس قدر قیمتی لباس نہ پہنتا تو بے ضرورت قرض کی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا اس لئے اس کے لئے اتنا اچھا اور قیمتی پہننا بھی گناہ ہے کیونکہ مقدمہ گناہ بھی گناہ ہے بہرحال ہر چیز میں تین درجے ہیں۔ایک آسائش اور ایک آرائش ایک نمائش ہر ایک کے لئے مستحب ہے اور آسائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلاضرورت کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے گو اس کا ترک اولی ہے اور نمائش کروعجب وفخر ہوتا ہے یہ حرام ہے اب اس کا فیصلہ ہر شخص کے تدین پر ہے کہ وہ کیا ہے اگر دل میں غور کر کے یہ یکھے کہ یہ کام میں نے نمائش کے لئے کیا ہے تو اس کے لئے وبال ہے مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ ان میں داخل نہ کرے کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے بلکہ حسن ظن کا یہ ہوا کہ مساکن مرضیہ اگر احب من اللہ (اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب) ہوں تب اور نہ نہیں سو مدار وعید مساکن مرضیہ نہیں پس قید ترضونہا (وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو) بیان فرما کر پھر اس پر وعید کا مدار نہ رکھ کر اپنے پسند کا مکان بنانے کی اجازت مستنبط ہوتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پھر اس سے محبت کرنے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ محبت اللہ اور رسول اکرم ﷺ کی محبت سے زیادہ نہ ہو ورنہ گناہ ہوگا۔اس پر فرماتے ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

فرمادیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جن کو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو خطرہ رہتا ہے اور وہ گھر جن کو پسند کرتے ہیں تم کو اللہ اور رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی حکم (تمہاری سزا کے متعلق) بھیجیں۔

رضا بالمسکن پر وعید نہیں

اور اس میں بیوی بچوں اور مال و دولت کی مطلق محبت پر وعید نہیں فرمائی بلکہ احبیت پر وعید ہے کہ یہ

چیزیں اللہ اور رسول ﷺ سے زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں اور ان کی محبت اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مانع نہ ہونا چاہئے چنانچہ مساکن ترضونھا فرمانے کے بعد احب الیکم من اللہ و رسولہ فرمانا اس کا صریح قرینہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ رضا بالمسکن پر وعید نہیں بلکہ اس کے بعد احبیت من اللہ ورسولہ پر ملامت ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں رضا بالحیوۃ الدنیا میں وعید نہ تھی بلکہ اطمینان و دلبستگی پر وعید تھی اور اس میں اطمینان واحبیت کا منشا وہی موت سے غفلت ہے اگر موت کا خیال رہے تو ان چیزوں کے ساتھ اطمینان اور دلبستگی اور احبیت کا درجہ تو ہرگز نہ پیدا ہوگا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ

ترجمہ: یعنی حق تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد فرمائی ہے اور غزوہ حنین میں بھی جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے۔

تفسیری نکات

حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو غزوہ حنین میں عجب وغرور پیدا ہو گیا تھا کہ ہم اتنے زائد ہیں اسی لئے عجب کی وجہ سے شکست ہوئی اور جب اس گناہ سے توبہ کر لی اور معافی مانگ لی تو اسی میدان میں یہ ہزیمت خوردہ لشکر اسلام غالب آ گیا جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ

ترجمہ: یعنی شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول مقبول ﷺ اور مسلمانوں پر اپنی خاص تسلی نازل فرمائی اور قلوب کی تقویت کے لئے فرشتوں کا لشکر بھیجا جو نظر نہیں آتا تھا۔

تفسیری نکات

کس قسم کی حب دنیا مذموم ہے

ان سب حالات اور آیات واحادیث ملا کر پھر علماء کے کلام کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی ممانعت سے

علماء کی بھی یہی مراد ہے کہ جو دنیا مضر دین ہے اس کو چھوڑ و پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ علماء کی ممانعت کو ایک ہی جلسہ میں سن کر فیصلہ کر لیا گیا انہوں نے کسی دوسرے جلسہ میں یہ بھی تو کہا ہوگا کہ حب دنیا وہ مذموم ہے جو غالب ہو حب دین پر اور جو تابع ہو وہ مذموم نہیں چنانچہ خود قرآن ہی میں ہے قل ان کان ابائکم و ابناء کم واخوانکم الٰی قولہ احب الیکم من اللہ و رسولہ الآیہ دیکھئے خود قرآن ہی کی تصریح سے حب دنیا منع نہیں بلکہ احبیت دنیا یعنی اللہ ورسول سے زیادہ محبوب ہونا منع ہے تو علماء اس کے خلاف کب تعلیم دے سکتے ہیں بعضوں کو یہ غلطی ہوگئی کہ مطلق محبت کو مذموم سمجھا چنانچہ ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ بیوی بچوں کی محبت دل سے نہیں جاتی میں نے لکھا کہ بیوی بچوں کی محبت سے تو گھبراتے ہو لیکن بہت سی اور چیزیں بھی تو ہیں جن سے محبت ہے ان کو کیوں نہیں چھوڑتے یا چھوڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔ پیاس میں پانی سے محبت ہے بھوک میں کھانے سے محبت ہے نیند میں سونے سے محبت ہے ان چیزوں کے بارہ میں کبھی نہ پوچھا کہ ان کی محبت نہیں جاتی کیا بیوی بچے ہی عشق کے لئے رہ گئے ہیں اگر تمہارے نزدیک عارف وہی ہے جس کو غیر اللہ کی محبت بالکل نہ رہی ہو تو عارف تو تم بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھی نہ ہوئے کیا اور ضروریات زندگی سے محبت ہوتے ہوئے تم اپنے معیار کے مطابق عارف ہو سکتے ہو بس تو معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی بھی مطلق محبت ہونے کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ اللہ اور رسول کے محبت کے مزاحم اور مصادم نہ ہو یہ سب موٹی موٹی باتیں ہیں کوئی الجھن کی بات نہیں ہے دیکھئے حضرت عمرؓ سے بڑھ کر تو ہم زاہد اور تارک غیر اللہ ہو نہیں سکتے لیکن جب فارس کی سلطنت پر قبضہ ہوا ہے اور وہ اتنی بڑی اور دولت مند سلطنت تھی کہ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کی سلطنت کی کوئی حقیقت نہ تھی جس کا ظاہری سبب یہی تھا کہ وہاں ایک ہی خاندان میں سلطنت مدت دراز سے برابر چلی آرہی تھی اور جگہ تو غارت وتاراج سے حکومتیں بدلتی رہیں لیکن وہاں کیانیوں ہی کی سلطنت برابر قائم رہی اور انقلابات سے محفوظ رہی غرض وہ بڑی پرانی سلطنت تھی جب وہ فتح ہوئی تو وہاں سے ایسی عجیب وغریب چیزیں مال غنیمت میں آئیں کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں بھی نہیں آئی تھیں بڑے بڑے ذخائر وغنائم مسجد نبوی میں لاکر ڈھیر کئے گئے جن کو دیکھ کر بھی آنکھیں چکا چوند ہوتی تھیں۔ ان میں ایک قالین ایسا تھا کہ جس میں پھول بوٹے ایسے خوشنما بنے ہوئے تھے کہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ قالین ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک نہایت سرسبز وشاداب باغ ہے جس میں طرح طرح کے درخت ہیں اور اس میں پھل لگے ہوئے ہیں پھول کھلے ہوئے ہیں معلوم تو باغ ہوتا تھا اور تھا قالین کی صنعتیں پہلے بھی تھیں لیکن پہلے وہ آلہ تجارت نہیں تھیں بلکہ ان کو کمال سمجھا جاتا تھا اور بجائے اس کے کہ ان کو بازاروں میں لاکر بیچا جائے اور نفع حاصل کیا جائے ان کو چھپایا جاتا تھا دوسروں کو سکھانے اور بتانے سے بخل کیا جاتا تھا تو اس ڈھیر میں ایسی ایسی صنعتوں کی چیزیں تھیں حضرت عمرؓ نے ان چیزوں کو دیکھا تو جو اثر ان پر ہوا اور جو رائے انہوں نے ظاہر کی وہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد کیا

ان پر یا ان کے پیروؤں پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مطلقاً ترک دنیا سکھاتی ہیں پہلے تو آپ ان ذخائر و غنائم کو دیکھ کر روئے اور پھر یہ دعا کی کہ اے اللہ یہ تو ہم نہیں عرض کرتے کہ آپ ان چیزوں کی محبت ہمارے دل سے نکال دیجئے کیونکہ آپ کا ارشاد ہے زین للناس حب الشھوات من النساء و النبیین و القناطیر المقنطرة من الذھب والفضة والخیل المسومة والانعام و الحرث جب آپ نے خود ان چیزوں کی محبت کو ہمارے قلوب میں مزین فرما دیا ہے تو اس کے زائل ہونے کی دعا کرنا تو سخت گستاخی ہے لیکن یہ عرض ہے کہ ان چیزوں کی محبت کو آپ اپنی محبت کی معین بنا دیجئے سبحان اللہ کیا اچھی دعا فرمائی اور کیسا حقیقت کو سمجھا زین کی دو مختلف تفسیریں ہیں اور وہ اختلاف اس میں ہے کہ زین جو مبنی لمفعول ہے اس کا فاعل کون ہے ان چیزوں کو جو محبت مزید (بفتح الیاء) کر دی گئی تو اس کا مزید (بکسر الیاء) کون ہے یعنی اس تزئین کا فاعل کون ہے یعنی اس میں اختلاف ہے کہ اس تزئین کے فاعل حق تعالیٰ ہیں یا شیطان ہے اب یہاں ضرورت علم کی ہے افعال میں ایک مرتبہ تو خلق کا ہے اور ایک کسب کا، سو مرتبہ خلق میں تو اللہ تعالیٰ فاعل ہیں اور مرتبہ کسب میں شیطان، یعنی اس زینت کے پیدا کرنے والے اور خالق تو حق تعالیٰ ہیں انہوں نے یہ چیز قلب میں پیدا فرما دی اگر تم اس کو اپنے محل میں استعمال کرو تو وہ خیر ہے اور اگر غیر محل میں استعمال کرو تو وہی شر ہے۔ یہ استعمال مرتبہ کسب کا ہے اور اس مرتبہ میں شیطان متصرف ہوتا ہے (الافاضات الیومیہ ج ۱۰ص ۲۳۶-۲۳۷)

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ

ترجمہ: بلاشبہ مشرک نرے ناپاک ہیں سو یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں۔

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ الخ کی عجیب تحقیق

فرمایا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ اس کے معنی ہیں ان کے قلوب ناپاک ہیں کیونکہ اگر کسی کافر کو خوب نہلا دیں پھر بھی یہ آیت صادق ہے اور کلمہ پڑھ لے تو نجس نہیں کہا جاوے گا اس سے معلوم ہوا نجاست ظاہری مراد نہیں بلکہ اعتقادی مراد ہے جیسے محاورات میں کہتے ہیں تم بڑے ناپاک ہو یعنی تمہارے عقائد خراب ہیں دوسرے قرینہ یہ ہے کہ اگر فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا اگر نجس العین ہے تو اس ایک سالہ کی قید کیسی اس کے بعد فرمایا کہ ہندو سے کھانا لینا تو جائز ہے لیکن اگر ان سے نہ لیا جاوے تو میں بڑا خوش ہوں سچی بات یہ ہے کہ ہماری قوم میں نہ دنیا کی لیاقت رہی نہ دین کی۔ اگر ان میں قابلیت ہو تو کیا خدا بخیل ہے۔ ان کو سلطنت نہ دیتا، جب ان میں قابلیت تھی اس وقت کسی کی آنکھ نہ اٹھتی تھی اور اب کچھ نہیں رہی۔ (ملفوظات حکیم الامت ۱۷ج ۱۵صفحہ ۳۷)

اسلامی لشکر کے شکست کی علت

بارہ ہزار کا لشکر کسی علت کے سبب شکست کھا سکتا ہے فرمایا ایک بار حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ

لن یغلب اثنا عشر الفاً عن قلة

یعنی حضرت رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر قلت تعداد کی وجہ سے کبھی دشمنوں کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہوگا اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا حالانکہ ثابت ہے کہ بارہ ہزار مسلمانوں کی تعداد کی وجہ سے بھی شکست کھا گئے۔

حضرت مولاناؒ کی برکت سے میرے ذہن میں فوراً جواب آ گیا میں نے عرض کیا کہ حدیث شریف کا مضمون بالکل بے غبار ہے آنحضرت ﷺ عن قلة فرمایا ہے کہ قلت کی وجہ سے مغلوب نہ ہوگا عن علة نہیں فرمایا کہ کسی اور سبب سے بھی مغلوب نہ ہوگا لہذا جہاں بارہ ہزار یا بارہ ہزار سے زائد کے لشکر شکست کھا گئے اس کی وجہ قلت نہیں بلکہ کوئی دوسری علت ہوگی۔

چنانچہ اس کی تائید کتب حدیث وتاریخ سے بھی ہوتی ہے بلکہ قرآن شریف میں بھی مسلمانوں کا غزوہ حنین میں اولاً مغلوب ہونا بالتصریح مذکور ہے حالانکہ غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار تھے لیکن پھر بھی اولاً مغلوب ہو گئے اور اس کی وجہ قلت نہیں تھی بلکہ ایک قلبی مرض خود پسندی وعجب تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے۔

يُضَاهِـُٔونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝

ترجمہ: یعنی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں خدا ان کو غارت کرے یہ کدھر جا رہے ہیں۔

تفسیری نکات

کلام الٰہی میں جذبات انسانی کی رعایت

اللہ تعالیٰ نے احکام میں ہمارے جذبات کی کیسی رعایت فرمائی ہے ایک بات اور یاد آئی جو مجھ سے لڑکیوں نے ترجمہ قرآن کے درس میں پوچھی تھی میں ان کو سورۃ براءت کا ترجمہ پڑھا رہا تھا جب یہ آیت آئی یضاهئون یئوفکون (یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں خدا ان کو غارت کرے یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں) خدا ان مدعیان فرزندی مسیح وعزیر کو تباہ کرے یہ کہاں الٹے جا رہے ہیں تو ایک لڑکی نے سوال کیا کہ یہ تو کوسنا ہے اللہ میاں جب سب کچھ کر سکتے ہیں پھر وہ کیوں کوستے ہیں؟ یہ سوال اس

سے پہلے کسی نے مجھ سے نہ کیا تھا نہ کسی کتاب میں اس کا جواب دیکھا تھا مگر الحمدللہ کہ سوال کے ساتھ ہی معاً میرے دل پر جواب القا ہو گیا میں نے کہا کہ اللہ میاں تو کوسنا نہیں دیتے مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے جذبات کی بہت رعایت فرمائی ہے۔ تو اوپر جو یہود و نصاریٰ کا حال مذکور ہے اس کو قرآن میں پڑھ کر سن کر انسان کو غصہ آتا ہے جس سے کوسنا منہ سے نکلنے کو ہوتا ہے مگر قرآن پڑھتے ہوئے غیر قرآن میں داخل کرنا پڑتا جو ان کے خلاف تھا اس لئے انسان اپنے اس جذبہ کو پورا نہ کر سکتا اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف سے خود ہی کوسنے کا مضمون بڑھا دیا تا کہ پڑھنے والے کو اپنا جذبہ دبانا نہ پڑے اور وہ دل کھول کر اس تقاضا کو پورا کر لے اور یہ کہہ دے قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ اور واقعی اس جواب کے بعد جو قرآن پر نظر کی جاتی ہے تو جا بجا رعایت جذبات کی نظریں قرآن میں کثرت سے ملتی ہیں چنانچہ قرآن میں جہاں کبھی لفظ عسی ولعل فرمایا ہے اس میں بھی ہمارے جذبات ہی کی رعایت ہے کہ جہاں ہم لوگ اپنے محاورہ میں عسی ولعل کہتے ہیں وہاں حق تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا گویا حق تعالیٰ کے علم کامل کے لحاظ سے وہاں ان اور لام تاکید کا موقعہ تھا اور یہ رعایت ایسی ہے جیسے بچہ کے ساتھ ابا جان بھی پانی کو مم اور روٹی کو روتی کہنے لگتے ہیں اور اس سے زیادہ عجیب ایک دوسرا قصہ ہے اور یہ کہ میں نے ایک مساۃ سے آیت وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں کا ترجمہ پڑھاتے ہوئے سوال کیا کہ حق تعالیٰ نے جو یہاں فرمایا ہے کہ زمینیں سب اللہ کی مٹھی میں ہوں گی اور آسمان داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے ظاہر ہے کہ اس کی حقیقت تو مراد نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ مٹھی سے اور اعضاء سے پاک ہیں بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی قدرت کی تحت میں ہوں گی مگر قبضہ کی تعبیر میں جو اختلاف ہے کہ جب زمین کے ساتھ قبضۃ اور سموات کے ساتھ بیمینہ کا عنوان اختیار کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے ایک ہی عنوان کافی تھا یہ سوال بہت دقیق تھا مگر اس کا جواب اس مستورہ نے عجیب حیرت انگیز دیا کہا کہ یہاں حق تعالیٰ نے ہماری عادت کے موافق کلام فرمایا ہے اور عادت یہی ہے کہ ہم چھوٹی چیز کو مٹھی میں لیتے ہیں اور بڑی کو ہاتھ میں بدوں مٹھی بند کئے لے لیتے ہیں پس چونکہ زمین آسمان سے چھوٹی ہے اس لئے وہاں قبضۃ فرمایا اور آسمان بڑا ہے اس کے لئے بیمینہ فرمایا مجھے یہ جواب بہت ہی پسند آیا چنانچہ میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو لکھ دیا ہے تو یہ بھی وہی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے مفسرین نے بھی افراد ارض اور جمع سموات میں بھی نکتہ بیان کیا ہے کہ اس میں ہمارے جذبات کی رعایت ہے کہ تعدد سمٰوٰت تو اذہان عامہ میں پہلے سے تھا تعدد ارض لوگوں کے ذہن میں نہ تھا تو حق تعالیٰ نے بھی ان کے ذہن کو مانوس کرنے کے لئے سارے قرآن میں ارض کو بصیغہ مفرد اور سموات کو جمع استعمال کیا ہے البتہ تعدد ارض کی حقیقت واضح کرنے کیلئے ایک مقام پر اس طرح مقصوداً ظاہر فرما دیا۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ

سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے سات آسمان اور مثل ان کی سات زمین بنائیں)

نبی را نبی مے شناسد

اسی طرح بعض مصنفین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان معی ربی کہنے کے مفضولیت اور آپ کے ان اللہ معانا کہنے کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے ایسے وجوہ بیان کئے جن سے موسیٰ علیہ السلام کی نظر کا حقائق سے قاصر ہونا مترشح ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ اگر یہ مصنف ایسی مجلس میں حاضر ہوں جس میں رسول ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام تشریف رکھتے ہوں تو کیا اس شخص کی یہ جرات ہوگی کہ اس مضمون کو ان کے سامنے بیان کر سکے۔ ہرگز نہیں علاوہ اس کے کہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف مزاج ہو خود آنحضرت کے بھی خلاف ہو حقیقت اس امر کی یہ ہے کہ اس موقع پر آنحضرت پر اور وارد تھا اور اس مقام کا بھی مقتضاء تھا اور یہ سالک اور عارف کے اختیار میں نہیں اگر وہ وارد جو موسیٰ علیہ السلام پر تھا ہمارے آنحضرت پر بھی اس وقت وہ وارد ہوتا تو آنحضرت بھی یہی اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ فرماتے اور اگر موسیٰ علیہ السلام پر وہ ہوتا جو ہمارے آنحضرت پر تھا تو وہ بھی ان اللہ معانا فرماتے باقی ان واردوں کی تعیین اس میں بھی ظن وتخمین سے کلام مناسب نہیں اس لئے کہ شیخ اکبر کا ارشاد ہے کہ چونکہ ہم نبی نہیں اس لئے انبیاء کے مذاق کا ادراک ہم نہیں کر سکتے پس جیسا کہ ولی را ولی می شناسد مسلم ہے اسی طرح نبی را نبی می شناسد واجب التسلیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کوچ کرو تو تم زمین کو سختی سے تھام لیتے ہو کیا تمہیں آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پسند ہے سو آخرت کے حساب میں دنیا کی زندگی بالکل کم درجہ ہے۔

تفسیری نکات

جہاد میں سستی کا ایک سبب

یہ ایک آیت ہے جس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے دین کے ایک خاص کام میں سستی کرنے پر ملامت فرمائی ہے۔
ہر عمل کی کوتاہی کو فرماتے ہیں تم دین کے کام میں سستی کرتے ہو کیا حیات دنیا پر راضی ہو گئے ہو اور یہ سستی جو تم میں آ گئی ہے تو کیا آخرت کی ضرورت اور خیال تم کو نہیں رہا پھر فرماتے ہیں کہ آخرت کے مقابلے میں حیات دنیا کی متاع تو بالکل ہی قلیل ہے کچھ بھی نہیں اور باوجود اس کے تم دنیا پر پھر راضی ہو یعنی اس سے اتنی محبت ہے کہ اس کو اپنا قرار گاہ سمجھتے ہو اور اسی لئے اس دینی کام سے گھبراتے ہو سو یہ تو ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس کی حیات پر راضی ہو جائے یہ ہے مضمون اس علت کا اور اسی کو بیان کرنا مقصود ہے اس کا حاصل اس کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں پر ملامت کر رہے ہیں جنہوں نے دنیا پر قناعت کر لی ہے اور آخرت کو بھول گئے ہیں اور دنیا کو محبوب سمجھتے ہیں مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے آخرت کی وہ محبت اور اس کا اتنا شوق نہیں ہے چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ ہم یوں رہیں گے یوں بسیں گے بہو آئے گی جائیداد ہوگی یوں ہم ملازم ہوں گے ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ اب انصاف سے دیکھ لو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوئی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے جنت ہوگی اس میں باغات اور مکانات ہوں گے یوں حوریں ہوں گی غالباً کبھی بھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے۔
غم خلاف امید ہونے سے ہوتا ہے تو جو شخص کسی چیز کے بارے میں یہ امید رکھے کہ یہ ہم سے جدا نہ ہوگی اس کو اس چیز کے جدا ہونے کا غم ہوگا ورنہ کوئی بھی غم نہ ہونا چاہئے ہاں طبعی رنج دوسری بات ہے میں پریشانی کے غم کی نفی کر رہا ہوں۔ یہ ہے فرق ان لوگوں میں جو دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ان میں جو دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے' اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ساری خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے اس کو دل سے نکالنا چاہئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کو کثرت سے یاد کیا جائے اس سے دنیا کی محبت دل سے نکل جائے گی اور آخرت کی نعمت کی محبت اور آخرت کے عذاب سے خوف یوں پیدا کرو کہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہم کو مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے پھر ایک دن ہمارا حساب ہوگا اگر اچھی حالت ہے تو بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی ورنہ سخت سخت

عذاب ہوں گے اور نفس سے کہا کرو کہ اے نفس تو دنیا کو چھوڑنے والا قبر میں تجھ سے سوال ہوگا اگر اچھے جواب دے سکا تو ابد الآباد کا چین ہے ورنہ سدا کی تکلیف ہے پھر تجھے قیامت کو اٹھنا ہے اور اس روز تمام نامہ اعمال اڑائے جائیں گے تجھے پل صراط سے گزرنا ہوگا پھر آگے یا جنت ہے اور یا دوزخ ہے اس کو روزانہ سوچا کرو اس سے آخرت کے ساتھ تعلق ہوگا اور دنیا سے دل سرد ہو جائے گا اور موت کے مراقبے سے ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان ہو کہ اس سے تو وحشت ہوگی اور جی گھبرائے گا اس کا علاج یہ ہے کہ جب وحشت ہونے لگے تو خدا تعالیٰ کی رحمت کو یاد کیا کرو اور سوچا کرو کہ اس کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ ماں کو بھی اپنے بچے سے اتنی محبت نہیں ہے تو اس کے پاس جانے سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں اور اگر اس مراقبے کے بعد پھر کبھی دنیا کی طرف دل راغب ہو اور گناہ کو جی چاہے اور کوئی گناہ صادر ہو چکا ہو تو مراقبے کی تجدید کے ساتھ توبہ کر لیا کرو اور توبہ کا تتمہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا حق تمہارے ذمے ہو اس کو بہت جلدی ادا کر دو اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کر دے گا پھر ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آخرت کا دائمی عیش ہوگا اور آخرت کا شوق پیدا ہونے کی میں نے ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے شوق وطن' اس کا مطالبہ بھی بہت مفید ہوگا حاصل سب کا یہ ہوا کہ دنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے اور اس کا علاج موت کی یاد ہے اور اس سے توحش سے بچنے کے لئے خدا کی رحمت کامل یقین اور اس کا استحضار ہے۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: یہ لوگ تمہارے سامنے (جھوٹی قسمیں) کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کر لیں (جس میں مال وجان محفوظ رہے) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کر لیں۔

تفسیری نکات

ارضاء رسول ﷺ کی دو جہتیں

آیت میں وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ' فرمایا کیونکہ حضور ﷺ میں دو جہتیں ہیں ایک نسبت مع اللہ ایک خصوصیت ذات اور مقصود فی الدین آپ کا راضی کرنا بحیثیت رسالت ہے نہ بلحاظ ذات گو یہ ارضا بہ لحاظ نسبت رسالت کے حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ بھی محبت کو مستلزم ہوگا اور اس وقت آپ کی

ذات من حیث ہی کے ارضاء کو بھی دل چاہے گا مگر واسطہ اس ثانی کا بھی وہ اول ہی ہے غرض بہ لحاظ نسبت رسالت کے آپ کا ارضاء عین ارضاء حق ہے اور اسی وجہ سے یرضوہ میں ضمیر واحد کی لائی گئی ہے جو راجع ہے حق تعالیٰ کی طرف اور یہاں عین سے مراد معنی فلسفی نہیں جس میں اتحاد من کل وجہ کا تحقق مثل انسان و حیوان ناطق کے شرط ہے بلکہ یہ صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے ان کے نزدیک حق کا عین وہ ہے جس کو وصول الی الحق میں دخل ہو اور غیر وہ ہے جو وصول الی الحق میں مخل ہو مولانا فرماتے ہیں ؎ اصطلا حائیست مرابدال را

رضائے معتبر

ہاں اس جگہ یہ ایک شبہ ہوسکتا ہے کہ منافقین تو رسول اللہ ﷺ ہی کی رضاء کے واسطے قسمیں کھاتے تھے پھر وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ يُّرۡضُوۡهُ میں رسول کا ذکر کیوں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول ﷺ کو راضی کرنے کا اہتمام نہ کرتے تھے اس شبہ کا جواب سمجھ لیجئے مشہور جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی رضا حق تعالیٰ کی رضاء کو مستلزم ہے تو جب انہوں نے حق تعالیٰ کو راضی کرنا نہیں چاہا تو گویا حضور ﷺ کو بھی راضی کرنا نہیں چاہا کیونکہ انتفاء لازم سے ملزوم کا انتفاء لازم ہے۔

دوسرے چونکہ حضور ﷺ ان کی شرارتوں سے واقف تھے اس لئے آپ ظاہر میں بھی ان سے راضی نہ ہوتے تھے لیکن ان کی قسموں کے بعد آپ گرفت کو موقوف کر دیتے تھے وہ لوگ اسی کو کافی سمجھتے تھے ورنہ دل میں وہ بھی جانتے تھے کہ حضور ﷺ ہماری قسموں سے راضی نہیں ہوئے۔

مگر میرے نزدیک سہل جواب یہ ہے کہ رسول کی ارضاء کی دو حیثیتیں ہیں ایک ارضاء بہ حیثیت سلطنت دوسرا ارضاء بہ حیثیت نبوت و رسالت اس کے بعد سمجھئے کہ منافقین کا قصد یہ تو ضرور تھا کہ حضور ﷺ ہم سے راضی رہیں مگر یہ قصد محض بہ حیثیت سلطنت اس غرض سے تھا کہ ان کے اموال و انفس محفوظ رہیں اور اس حیثیت سے آپ کی رضا مثل دوسرے مسلمانوں کے رضاء کے خلق تھی اور یرضوکم میں داخل نہ کہ رضائے خالق اور حضور ﷺ میں جو دوسری حیثیت رسالت اور مظہر حق ہونے کی تھی اور اسی حیثیت سے آپ ﷺ کی رضا عین رضاء حق ہے اس کی ان کو پرواہ نہ تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ مخلوق کی رضاء کو رضائے خالق پر ترجیح دیتے تھے اور وہ رسول ﷺ کو بھی بہ حیثیت مخلوق محض ہونے کے راضی کرنا چاہتے تھے حالانکہ حضور ﷺ کی رضاء شرعاً بہ حیثیت نائب حق ہونے کے مطلوب ہے جس کی منافقوں کو پرواہ نہ تھی اسی لئے وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ يُّرۡضُوۡهُ میں رسول ﷺ کا ذکر کیا گیا اور بتلا دیا گیا کہ جس حیثیت سے تم حضور ﷺ کو راضی کرنا چاہتے ہو وہ مطلوب نہیں اور جو مطلوب ہے اس حیثیت سے تم ان کو راضی نہیں کرنا چاہتے پس اللہ و رسول من حیث ہو رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ

ان کو راضی کرو پس اب اشکال رفع ہو گیا۔

اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رسول ﷺ کی رضاء محبت وہی محبت مطلوب ہے جو اس حیثیت سے ہو کہ آپ رسول ﷺ اور مظہر حق ہیں دوسری حیثیت سے آپ کی رضاء و محبت مطلوب نہیں۔

ہاں اگر پہلی حیثیت کے ساتھ دوسری حیثیات بھی جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہے ورنہ صرف دوسری حیثیات کافی نہیں مثلاً ابو طالب کو حضور ﷺ سے بہت محبت تھی مگر وہ صرف اس حیثیت سے تھی کہ آپ ان کے بھتیجے تھے یا بعض کفار کو آپ سے اس لئے محبت تھی کہ آپ عاقل کامل تھے اور اب بھی بعض مصنفان یورپ آپ کی عقل و ہمت استقلال وغیرہ کی تعریف بہت شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں ان حیثیات سے آپ ﷺ کی محبت و رضاء شرعاً کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ رسول ﷺ ہونے کی حیثیت سے آپ کے ساتھ محبت کی جائے اور اس ہی حیثیت سے آپ کی رضا شرعاً مطلوب ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۗ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: یہ ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جن کو بجز محنت و مزدوری کے اور کچھ میسر نہیں ہوتا یعنی اُن سے تمسخر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو اس تمسخر کا بدلہ دے گا اور اُن کے لئے دردناک سزا ہوگی۔

تفسیری نکات

شانِ نزول

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے چندہ کی ترغیب دی تھی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تو اتنا لائے کہ اٹھ بھی نہ سکا اور ایک صحابی جو کہ دانے لائے۔ منافقین دونوں پر ہنسے۔ ایک کو ریا کار بنایا' ایک کو بے شرم' حق تعالیٰ اُن کو بھلا کیا دیکھ سکتے تھے ایک حدیث قدسی میں فرماتے ہیں میں نے تفسیر مظہری میں یہ حدیث

دیکھی ہے کہ مجھے اپنے مقبول بندے کو چھیڑنے پر ایسا غصہ آتا ہے جیسے شیر کے بچوں کے چھیڑنے پر شیر کو۔ دوسری حدیث قدسی میں ہے: من عادلی ولیاً فقد اذنته بالحرب (کہ جو میرے ولی سے عداوت رکھے اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے)

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات   بادرد کشاں ہر کہ در افتاد برافتاد

اور فرماتے ہیں

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد   تادل صاحب دلے نامد بدرد

ایک مقبول بندے کے ستانے پر شہر کے شہر تباہ کر دیئے گئے ہیں حق تعالیٰ اپنے مقبول بندے پر طعن کو نہیں دیکھ سکتے۔ فوراً اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ اسی طعن کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ؀ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ

کہ جو لوگ طعن کرتے ہیں ان لوگوں پر بھی جو رغبت ظاہر کرتے ہیں صدقات میں اور وہ مومن ہیں اور ان لوگوں پر بھی جو نہیں پاتے خرچ کرنے کو مگر اپنی طاقت کے موافق۔ تو جو ان سے تمسخر کرتے ہیں، خدا ان کے تمسخر کا بدلہ لے گا اور وہ بدلہ یہ ہے۔ ولھم عذاب الیم۔ کہ ان کو سخت عذاب ہوگا۔ آگے اس کو اچھی طرح موکد فرماتے ہیں کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو خدا تعالیٰ ان کو نہ بخشیں گے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھیں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے کہ وہ توبہ و استغفار سے بھی نہیں بخشا جا سکتا۔ کیونکہ اس آیت میں تو حضور کو ارشاد ہے کہ آپ ان کے واسطے کتنا ہی استغفار کریں ہم نہ بخشیں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ خود استغفار نہ کرتے تھے اور حضور ﷺ کی دعا و استغفار اسی وقت مفید ہو سکتی ہے کہ گناہ کرنیوالا خود بھی توبہ کرنا چاہے۔ حق تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ یہ لوگ استغفار کریں یا نہ کریں ہم نہ بخشیں گے۔ اگر یہ فرماتے تو شبہ کی گنجائش تھی کہ کیا بعضے گناہ استغفار سے بھی معاف نہیں ہو سکتے تو اگر وہ خود استغفار کرتے تو ایک مرتبہ اللّٰھم اغفرلی کہنا بارود کی طرح گناہوں کو اڑا دیتا ہے (حقوق السراء والضراء ملحقہ مواعظ حقوق و فرائض ص ۳۷۲ تا ۳۷۴)

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

ترجمہ: آپ چاہے ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں اگر آپ ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہ کریں گے کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

تفسیری نکات

یہاں عدد سبعین سے مراد کثرت ہے

یہاں ایک اشکال طالب علمانہ رہ گیا ساتھ میں اس کو بھی حل کئے دیتا ہوں اشکال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کو تخییر پر محمول فرمایا حالانکہ سیاق کلام سے یہ جملہ تسویہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ چاہے آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ استغفار کریں اگر آپ ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کبھی نہ کریں گے یعنی دونوں باتیں ان کے حق میں مساوی ہیں چنانچہ اہل محاورات اس کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیز اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً میں عدد سبعین سے کثرت مراد ہے عدد خاص مراد نہیں اور مطلب یہ ہے کہ چاہے آپ کتنا ہی استغفار کریں ان کی مغفرت نہ ہوگی مگر حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میں ستر سے زیادہ استغفار کرلوں گا اس کی کیا وجہ ہے آپ تو افصح العرب ہیں آپ نے آیت کو تخییر پر اور عدد کو تحدید پر کیوں محمول فرمایا۔

اس اشکال کا جواب شافی میں نے کہیں منقول تو دیکھا نہیں اور نہ کتابوں پر میری نظر زیادہ ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے میں نے جو جواب سنا ہے وہ بیان کرتا ہوں ممکن ہے کہ نقل سے بھی اس کی تائید ہو جائے اور اگر نقل سے تائید نہ بھی ہو تو حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے فن تفسیر سے خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ ان کے جواب کو ہم حجت سمجھتے ہیں۔ مولانا نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ بے شک اسلوب کلام تو تسویہ ہی کے لئے ہے اور عدد سبعین سے بھی خصوصیت عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے۔ مگر حضور ﷺ پر اس وقت رحمت کا

حال غالب تھا غلبہ رحمت سے آپ نے صورت کلام تمسک فرمایا تو اس جواب سے اشکال تو رفع ہو گیا مگر اس سے صوفیہ کے ایک قول کو مقید کرنا پڑے گا۔ وہ یہ کہ صوفیہ کا قول ہے کہ کاملین پر غلبہ حال نہیں ہوتا تو اس میں یہ قید لگانا پڑے گی یعنی اکثر نہیں ہوتا کبھی کبھی ہوتا ہے اور یہ تقید محض مولانا کے جواب کی وجہ سے نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہیں

چنانچہ واقعہ بدر میں جب مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہونے والا تھا حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت رسول ﷺ عریش مبارک میں نہایت الحاح کے ساتھ دعا فرما رہے تھے کہ اے اللہ اپنے وعدہ نصرۃ کو پورا فرمایئے اور مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایئے حتیٰ کہ جوش میں یہ بھی فرمایا

اللهم ان تهلك هذه العصابة لم تعبد بعد اليوم

(اے اللہ اگر یہ تھوڑی سی جماعت (مسلمانوں کی) ہلاک ہو گئی تو پھر زمین میں آپ کی عبادت نہ ہو گی۔

اللہ اکبر خدا تعالیٰ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر مسلمان اس واقعہ میں مغلوب ہو گئے تو پھر کوئی آپ کا نام نہ لے گا صاحبو آخر یہ کیا تھا علماء قشر تو تھک جائیں گے تاویلیں کرتے کرتے مگر ان سے کچھ جواب نہ آئے گا ہاں صوفیہ اس کا جواب نہایت سہولت سے دے دیں گے کہ اس وقت آپ پر غلبہ حال تھا مقام ناز کی کیفیت غالب تھی لیجئے سارا اشکال مرتفع ہو گیا مگر یہ جواب اس کو مقتضی ہے کہ صوفیاء کے اس قول مشہور کو مقید کیا جائے۔

محرومی ایمان کا اثر

اب ایک اشکال اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ ہم نے تسلیم کیا کہ آیت کی صورت تخییر کو متحمل نہیں مگر اس سے محض جواز معلوم ہوا وجوب تو نہیں معلوم ہوا تخییر سے جس طرح منافقین کی نماز پڑھنے کا جواز نکلتا ہے ترک صلوۃ کا جواب بھی نکلتا ہے پھر حضور ﷺ نے صلوۃ کو ترک صلوۃ پر کیوں ترجیح دی آپ نے نماز پڑھی کیوں اس کے لئے کوئی مرجح بتلانا چاہئے ورنہ آپ کے فعل کا عبث ہونا لازم آئے گا۔

اس کا جواب ایک تو مورخین نے دیا ہے کہ اس دن حضور ﷺ کی اپنے سخت ترین دشمن پر یہ رحمت و شفقت دیکھ کر بہت لوگ مسلمان ہو گئے تھے تو گویا آپ کے فعل میں یہ فائدہ اور یہ حکمت تھی اور دشمنوں کو یہ دکھلانا منظور تھا کہ رسول ﷺ کو اپنے نفس کے لئے کسی سے بھی عداوت نہیں بلکہ وہ دل سے اپنے دشمنوں کے لئے بھی رحمت و مغفرت کے خواہاں ہیں (جب تک حق تعالیٰ ممانعت نہ فرما دیں) اگر نفس کے لئے کسی سے آپ کو دشمنی ہوتی تو عبداللہ بن ابی کے کفن میں اپنا قمیص مبارک ہرگز نہ دیتے نہ اس کی نماز پڑھتے نہ دفن میں شریک ہوتے کیونکہ شرعاً آپ کے ذمہ ان میں سے ایک کام بھی نہ تھا مگر آپ نے شفقت و رحمت سے سب کچھ کیا اور اس کی دشمنی پر کچھ بھی التفات نہیں فرمایا۔

ایک جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے دیا ہے کہ حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے واقعہ میں اس مسئلہ کو حل فرمایا ہے کہ تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے بدوں ایمان کے سب بے کار ہیں چنانچہ دیکھ لو کہ ابن ابی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے تھے حضور ﷺ نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا بھلا یہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے آج کل کوئی بہت کرے گا غلاف کعبہ کا ٹکڑا رکھ دے گا مگر غلاف کو حضور ﷺ کی قمیص سے کیا نسبت، حضور ﷺ کا جسد اطہر عرش و کعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلاف کعبہ کو قمیص نبوی کے برابر مان بھی لیا جائے تو یہ دولت کس کو نصیب ہوسکتی ہے کہ حضور ﷺ کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے، عبداللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنا لعاب بھی اس کے منہ میں ڈال دیا تھا وہ تو آپ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے پھر آپ نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گویا اس کے لئے دعائے مغفرت فرمائی بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ صحابہ کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبداللہ بن ابی کو ان تبرکات سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا۔ حق تعالیٰ نے صاف فرما دیا۔ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

سَبْعِيْنَ مَرَّةً تکثیر کے لئے وارد ہے

حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے عبداللہ ابن ابی منافق کے جنازہ کی نماز پڑھائی حضرت عمر فاروقؓ نے ادب کے ساتھ اختلاف کیا اور عرض کیا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ حضور نے جواب ارشاد فرمایا خیرنی فاخترت یعنی مجھ کو اللہ تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا بلکہ اختیار دیا ہے اور فرمایا سازید علی السبعین یعنی میں ستر سے زیادہ استغفار کروں گا۔ اب یہاں پر دو اشکال ہیں ایک اشکال یہ ہے کہ حضور تو اہل زبان ہیں اور افصح العرب اس درجہ کے ہیں کہ کفار خدا تعالیٰ کے کلام کی فصاحت و بلاغت کو حضور کی طرف نسبت کرتے تھے کہ یہ آپ کا کلام ہے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ تخییر کے لئے نہیں بلکہ تسویہ کے لئے ہے جس کی تصریح سورہ منافقون میں کر دی گئی ہے سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اس طرح سبعین تحدید کے لئے نہیں تکثیر کے لئے ہے چنانچہ سورہ منافقون ہی میں اس کی بھی تصریح ہے بدوں عدد کے لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ واقع ہے جب معمولی اہل زبان اس کو سمجھ سکتا ہے تو حضور نے تخییر و تحدید کیسے سمجھی اس کا جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے یہ ارشاد فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ نے غایت رحمت کی وجہ سے لفظوں سے تمسک فرمایا معنی کی طرف التفات نہیں فرمایا۔

واعظین کی ایک غلطی پر تنبیہ

عام واعظوں کی ایک غلطی یاد آئی وہ یہ کہ قرآن مجید میں ہے فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا (پس چاہئے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) واعظین اس کو امر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم واجب کو ترک کرتے ہو قرآن میں تو کثرت بکا کا امر ہے اور تم بالکل نہیں روتے مگر یہ ان واعظین کی غلطی ہے یہاں معنی امر مراد نہیں بلکہ امر بمعنے خبر ہے جس میں کفار کی سزا اور عذاب کا ذکر ہے جس کی دلیل سیاق وسباق ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے (کہ تم گرمی میں مت نکلو کہ جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے اور اس کے بعد ارشاد ہے (پس چاہئے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ بکاء سزا ہے اور ظاہر ہے کہ سزا وہ چیز ہو سکتی ہے جو سزا پانے والے کے اختیار میں نہ ہو بلکہ سزا دینے والے کے اختیار میں ہو اگر یہاں معنی انشاء مراد ہوں گے تو ضحک و بکاء مخاطب کے اختیار میں ہوگا اور وہ جزاء نہیں ہو سکتا پس ثابت ہو گیا کہ یہاں معنی انشاء مراد نہیں بلکہ خبر دینا مقصود ہے کہ ان مشرکین کی سزا یہ ہے کہ وہ تھوڑے دنوں میں ہنس کھیل لیں اور اس کے بعد زیادہ روئیں گے اپنے اعمال کی سزا میں اور خبر کو انشاء کی صورت میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسا کہ ہمارے محاورہ میں بھی کہا کرتے ہیں کہ اب سر پکڑ کر روؤ تمہاری یہی سزا ہے یعنی اب روؤ گے اور اپنے کئے کی سزا بھگتو گے۔ پس اسی طرح قرآن کا یہ محاورہ ہے جس سے معنی امر مقصود نہیں اور اگر بفرض محال امر ہی مقصود ہوتا تو سیاق وسباق کی وجہ سے مخاطب کفار ہی ہوتے مسلمانوں کو پھر بھی خطاب نہ ہوتا اس لئے واعظین کا اس سے مسلمانوں کے لئے کثرت بکاء کا مامور بہ ہونا ثابت کرنا غلط ہے یہ بیچ میں استطرادًا ایک فائدہ تفسیریہ پر بیان کر دیا گیا ہے۔

شریعت میں ہنسنے کی ممانعت نہیں

بعض لوگوں نے فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا سے یہ سمجھا ہے کہ شریعت میں ہنسنے کی ممانعت ہے یہ استدلال غلط ہے کیونکہ یہاں ضحک وبکاء دنیا مراد نہیں بلکہ فی الاخرۃ مقدر ہے اور فَلْيَضْحَكُوا امر بمعنی خبر ہے کہ آخرت میں یہ لوگ زیادہ روئیں گے جیسے ہمارے محاورہ میں بولا کرتے ہیں اب سر پکڑ کے روؤ یعنی اب روؤ گے یہ بھی خبر ہے امر بمعنی طلب نہیں اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ مذکور ہے جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں وہ ضحک قلیل وبکاء کثیر مراد ہے جو ان کے اعمال پر بطور جزاء کے مرتب ہوگا ضحک وبکاء دنیوی مراد نہیں۔

علاوہ ازیں یہ کہ دوسری نصوص بھی اس معنی کی نفی کر رہی ہیں جو ان لوگوں نے اس آیت سے سمجھے ہیں

کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضرات صحابہ اپنی مجالس میں ہنستے بھی تھے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ رات کو خلوت میں رویا کرتے تھے۔ کانو الیوث النھار و رھبان اللیل

نیز حضور ﷺ بھی ہنستے تھے مگر حضور ﷺ کی آواز ہنسی کے وقت نہ نکلتی تھی صرف دندان مبارک نمایاں ہو جاتے تھے۔ کان جل ضحکہ التبسم اور اس کا منشاء میرے خیال میں یہ ہے کہ حضور ﷺ پر غم کا غلبہ تھا کان متواصل الحزان دائم الفکرۃ اور غلبہ حزن میں کھل کر ہنسی نہیں آیا کرتی ہے۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ کہ ہنسا کم چاہئے اور رونا بہت چاہئے۔

اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں' یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے۔ انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آ رہا ہے فلیضحکوا میں ھم کی ضمیر منافقین کی طرف ہے اور خبر بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنستے رہیں پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے یہ مطلب تھا آیت کا نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت جیسا آج کل کے مدعی سمجھتے ہیں اور قلیلاً سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور اس کے ماقبل کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روؤ گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ اس کا قرینہ ہے غرض یہ آیت آخرت کے متعلق ہے فلیضحکوا، و لیبکوا امر ہے لفظاً اور خبر ہے معنیً۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا نہ ماقبل کی خبر ہے نہ ما بعد کی اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے بعد آیت نازل ہوئی۔

جس میں منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے اور ان کے دفن وغیرہ میں شرکت کرنے کی صاف صاف ممانعت ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے بعد میں بڑی ندامت و شرمندگی ہوئی کہ میں نے حضور ﷺ کے ساتھ کیسی جرات کی' آپ کو ایک کام سے روکنے لگا (میرا کیا منصب تھا حضور ﷺ تو سب سے زیادہ ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں)

حضور ﷺ نے منافق کے منہ میں لعاب مبارک کیوں ڈالا؟

خیر یہ تو واقعہ تھا۔ اس میں بہت گفتگو اور کلام ہے کہ آپ ﷺ نے باوجود لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ وارد ہو چکنے کے پھر اس منافق کی نماز کیوں پڑھی مگر یہ تو طالب علمانہ مباحث ہیں طالب علم ان کو خود حل کر لیں گے مگر اس میں اس بات کا بتلانا مقصود ہے کہ حضور ﷺ نے اس منافق کو اپنا کرتہ کیوں پہنایا اور اس کے منہ میں لعاب دہن مبارک کیوں ڈالا۔

شراح حدیث نے تو یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے اس کے بیٹے کی خاطر سے جو مخلص مومن تھے یہ سب کچھ کیا (تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ حضور ﷺ کی طرف سے اس کی نجات کی سعی میں کوئی کوتاہی نہیں رہی آپ نے دعا بھی کر دی نماز بھی پڑھ دی اپنے تبرکات بھی عطا فرما دیئے اب بھی اگر اس کی مغفرت نہ ہو تو یہ خود اسی کا قصور ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ اس منافق نے جنگ بدر کے موقع پر حضرت عباسؓ (عم رسول ﷺ) کو ایک کرتہ پہنایا تھا۔ آپ نے اس کی مکافات میں مرنے کے بعد اسے کرتہ پہنا دیا (بلکہ مع شے زائد)

یہ سب توجیہات شراح نے کی ہیں مگر ان باتوں سے ہم کو شفا نہیں ہوئی ہمیں تو اپنے استاد علیہ الرحمۃ کی بات پسند آئی کہ حضور ﷺ نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے فرمایا تا کہ امت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسول ﷺ جیسا شخص اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسول ہی کا قمیص اس کا کفن ہو جائے اور حضور ﷺ کا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہو سکتی اس لئے تنہا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے۔

شان نزول

یہ ایک آیت ہے سورہ توبہ کی اس کا شان نزول ایک خاص قصہ ہے مگر مجھ کو اس سے ایک عام مضمون استنباط کرنا مقصود ہے اور وہ مضمون ہے فی نفسہ قدیم' مگر چونکہ کانوں میں اس عنوان اور طرز خاص سے نہیں پڑا اس لئے نیا معلوم ہوگا اور یہ میں نے اس لئے کہہ دیا ہے کہ عوام کو عادت ہو گئی ہے کہ سن کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں تو میں اول ہی کہہ دیتا ہوں کہ گو باعتبار معنوں کے یہ مضمون نیا ہو لیکن یہ مضمون جو کہ ان کی امیدوں کے باغ کو سرسبز کرنے والا اور کوتاہیوں کی اصلاح کرنے والا اور شکستہ دلوں کو قوی کرنے والا ہے اس معنی کو جدید ہوگا کہ اس اسلوب خاص سے ان کے کان اس کے آشنا نہیں ہوئے اولاً میں اس آیت کا شان نزول بیان کرتا ہوں۔ اس کے بعد اس مقصود کو مصرحاً بیان کروں گا مصرحاً اس لئے کہا کہ شان نزول سے اس کی اشارۃً تعیین ہو جاوے گی اور نیز شان نزول سے یہ آیت حل بھی ہو جاوے گی اور اسی پر میرا مقصود موقوف ہے قصہ یہ ہوا تھا کہ جناب رسول ﷺ نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے مقام تبوک کا سفر فرمایا تھا۔ یہ مقام مدینہ طیبہ سے دور ہے شام کی جانب ہے اور گرمی کی اس زمانہ میں شدت تھی اور نیز مسلمانوں پر اس وقت تنگی بھی تھی غرض بہت سے موانع جمع تھے اس لئے حضور ﷺ نے اس غزوہ میں معمول سے زیادہ اہتمام فرمایا اور روانگی اس طرف ہو گئی بہت سے صحابہؓ ساتھ گئے اور بعض رہ گئے رہنے والے اکثر تو منافقین تھے ان کے رہنے کی وجہ تو نفاق تھا اور بعض صحابہ بھی بوجہ کسل کے رہ گئے اور نیز بعضے کام کرنے والے بوجہ قرآئن مقامیہ و حالیہ یہ بھی سمجھا کرتے ہیں کہ سب کی شرکت اس واقعہ میں ضروری نہیں لیکن چونکہ حضور ﷺ نے اس سفر کا مزید اہتمام

فرمایا تھا اس لئے متخلفین پر ملامت بھی ہوئی لیکن منافقین پر تو اور قسم کی ملامت ہوئی اور متخلفین پر ملامت بطور شکوہ کے ہوئی اس لئے کہ شکایت محل ود پر ہی ہوا کرتی ہے لیکن اس سے متخلفین کی شان میں کسی قسم کا شبہ نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ایسا عتاب منافی محبت کے نہیں۔ خود حضور ﷺ جو کہ احب الخلق الی اللہ ہیں کہ ملائکہ اور جنات اور انسانوں میں کوئی آپ سے افضل نہیں۔ خود آپ کے بھی ایسے شکوے ہوئے ہیں اور چونکہ اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کی رسالت کو تسلیم کئے ہوئے ہیں یعنی اہل اسلام اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو صحابہ کے بارے میں شبہات نکالتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں اس لئے ان پر احتجاج کے لئے حضور کی اس قسم کا شکایت کا ہونا کافی ہے چنانچہ سورہ عبس میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف ملتفت نہ ہونے پر حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی پھر جب حضرت عبداللہ تشریف لاتے تو حضور فرماتے مرحبا بمن عاتبنی فیه ربی یعنی آیئے آیئے میاں تمہاری وجہ سے تو مجھ پر میرے رب کا عتاب ہوا تھا۔ پس ایسا عتاب موجب نقص شان تو کیا ہوتا بلکہ زیادتی خصوصیت کی علامت ہے اور اس میں بڑا لطف ہے وہ شخص خوب جانتا ہے جو محبت کی چاشنی سے آشنا ہے کہ محبوب کے عتاب وشکایت میں کیا مزہ ہوتا ہے۔ بنوسلمہ و بنوحارثہ دو قبیلے ہیں غزوہ احد میں جبکہ ہزیمت ہوئی تو کچھ ان میں بھی سستی آئی تھی لیکن ظاہر میں کوئی امر مقتضاء سستی کا واقع نہ ہوا تھا حق تعالیٰ نے ان کے بارہ میں نازل فرمایا اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا یعنی یاد کرو جبکہ دو جماعتوں نے تم میں سے ارادہ کم ہمتی اور بزدلی کا کیا تھا اور اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے یعنی ان سے اس کا ظہور نہیں ہونے دیا۔

شانِ مرادیت

یہاں سے بطور جملہ معترضہ کے ایک کام کی بات سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ اس سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے جس کو صوفیہ کرام نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ بعض بزرگوں کے اندر مرادیت کی شان ہوتی ہے اس کا مقتضی یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ گناہ کرنا بھی چاہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔ گناہ کا صدور ان سے ہونے نہیں دیتے ایسے حضرات کو محفوظ کہا جاتا ہے بنوسلمہ اور بنوحارثہ کی بھی یہی شان معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یوں نہیں فرمایا اذ فشلت بلکہ یہ فرمایا ہمت ان تفشلا یعنی ان سے فشل کا وقوع نہیں ہوا بلکہ ہم فشل ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے اس لئے ان کی حفاظت فرمائی۔ پس اس آیت میں ان پر ایک عتاب کی صورت اور بظاہر ان کے ایک نقص کا اظہار ہے مگر وہ واللہ ولیھما کے نزول سے اس قدر بشاش تھے کہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم سے ہم فشل نہ ہوتا اور یہ آیت نازل نہ ہوتی تو ہم کو اس قدر مسرت نہ ہوتی جس قدر کہ اب ہے پس ایسا عتاب اور ایسے شکوے شکایت سے تو ان حضرات کی اور زیادہ علو شان ثابت ہوتی ہے حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارہ میں حضور ﷺ نے فرمایا وان رغم

انف ابی ذر یعنی ضرور ایسا ہی ہوگا اگر چہ ابوذر کی ناک مٹی میں ملے یعنی گو تمہاری مراد کے خلاف ہو جب ابوذر یہ حدیث بیان فرماتے تو مزہ لینے کے لئے وان رغم انف ابی ذر بھی فرمادیا کرتے تھے۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا کہ ہنسنا کم چاہئے اور رونا بہت چاہئے' یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں' یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آرہا ہے فلیضحکوا میں ھم کی ضمیر منافقین کی طرف ہے اور یہ خبر ہے بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنستے رہیں پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے یہ مطلب تھا آیت کا نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت جیسا آج کل کے مدعی سمجھتے ہیں اور قلیلا سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور اس کے مقابل کثیر سے آخرت کی زندگی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روؤ گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہو گا۔ جزاء بما کانو ا یعملون' خود اس کا قرینہ ہے غرض یہ آیت آخرت کے متعلق فلیضحکوا ولیبکوا امر ہے لفظاً اور خبر ہے معنیً۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا نہ ماقبل کی خبر ہے نہ ما بعد کی اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔(المال والجاہ ملحقہ مواعظ حقیقت مال وجاہ)

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقر ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے اور کچھ برے' سو اللہ سے امید ہے کہ ان کے حال پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمادیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے جس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک صاف کر دیں گے اور ان کے لئے دعا کیجئے بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان ہے اور اللہ سنتے ہیں اور جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

شروع رکوع سے ان متخلفین کی فضیلت کا بیان کہ جو ہمراہ حضور ﷺ کے گئے اور اس کے بعد منافقین کا ذکر ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جس کا حاصل یہ ہے اور ایک گروہ اور ہے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا گو فعلاً سہی انہوں نے عمل صالح اور عمل بد دونوں کو خلط کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرما دیں گے اور اللہ بخشنے والے رحم فرمانے والے ہیں اور بعضے ایسے تھے کہ پہلے سے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کریں مگر تشریف آوری کے بعد سچ کہہ دیا اور ان کو مہلت دی گئی ان کی شان میں ارشاد ہے وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ یعنی ایک گروہ اور ایسا ہے کہ اللہ کے حکم کے واسطے میعاد دیئے گئے ہیں یا تو ان پر اللہ تعالیٰ رجوع فرما دیں یعنی ان کی توبہ قبول فرما دیں اور یا ان کو عذاب دیں اور ان کیلئے یہ حکم ہوا کہ ان سے کوئی نہ بولے نہ بیوی نہ بچے نہ دوست اب جدھر جاتے ہیں سناٹا ہے۔ جماعت کی نماز پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ لیکن کوئی ان سے نہ بولتا تھا۔

حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے احباب کے واقعات

ان میں سے ایک کعب بن مالکؓ اور ان کے دو دوست تھے کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ میں تو جری تھا اپنے سب کام کرتا تھا۔ اور سب جگہ آتا جاتا تھا' اور حضور ﷺ کی خدمت میں بھی جاتا تھا۔ حضور ﷺ منہ پھیر لیتے تھے لیکن جس وقت میں نہ دیکھتا تھا تو حضور مجھ کو دیکھتے تھے اور میرے جو دو دوست تھے وہ ذرا ضعیف تھے انہوں نے یہ کیا کہ بس گھر میں بیٹھ کر رونا شروع کیا اور فرماتے ہیں کہ مجھ کو زیادہ فکر اس کا تھا کہ اگر اس مدت میں میں مر گیا تو کیا حشر ہوگا اور حضور کی اگر اس میعاد میں وفات ہوگئی تو پھر اس حکم کا منسوخ کرنے والا کون ہوگا۔ یہ تصور بندھ کر سخت قلق تھا۔ حق تعالیٰ نے بھی ان کی اس حالت کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ یعنی ان پر تنگ ہوگئی زمین باوجود اس کی کشادگی کے اور تنگ ہوگئی ان پر ان کی جانیں اور انہوں نے یقین کر لیا کہ کوئی ٹھکانہ نہیں اللہ سے مگر اس کی ہی طرف اللہ اکبر ان حضرات کو کیا عشق تھا اور کیا استقامت تھی اسی مدت میں شاہ غسان کو اس واقعہ کی خبر ہوئی اس نے کعب بن مالکؓ کے نام خط لکھا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہے اور تمہاری قدر نہیں جانی آپ یہاں آ جایئے آپ کی قدر افزائی کی جاوے گی اور منشا اس کا یہ تھا کہ یہ سازش تھی اس بات کے لئے کہ ان میں سے بڑے بڑے آدمیوں کو میں

توڑلوں پس جب آدمی خط لے کر آیا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کعب بن مالکؓ کہاں ہیں تو لوگ بولے نہیں اللہ اکبر اتباع اور اطاعت اور احتیاط اس کو کہتے ہیں کہ ان کے متعلق بھی اگر کوئی شخص پوچھتا تو جواب نہ دیتے تھے اشارہ کر دیا کہ یہ ہیں اس طرح کعب بن مالکؓ ایک اور قصہ بیان فرماتے ہیں کہ میرا ایک چچازاد بھائی تھا ایک مرتبہ وہ باغ میں تھا میں بھی وہاں جا پہنچا تو مجھ سے بولے نہیں مجھ کو سخت رنج ہوا پس جب انہوں نے یہ خط دیکھا تو بہت پھوٹ کر روئے کہ اللہ اکبر اب میں اس حالت کو پہنچ گیا کہ غیر لوگ میرے بارہ میں طمع کرنے لگے ہیں اور کچھ جواب نہیں دیا اور خط تنور میں جھونک دیا غرض اس طرح پچاس دن گزرے اس کے بعد حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی چنانچہ آیت وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ کے بعد آیت لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ الخ میں ان ہی کی قبول توبہ کا ذکر ہے اور آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا الخ میں ان ستون سے بندھنے والوں کے لئے قبول توبہ کی بشارت ہے اخرون اس آیت میں مبتدا ہے اور صحیح ابتدائیت کے لئے قوم مقدر ہے خلطوا حال ہے اعترافوا کی ضمیر سے ترجمہ آیت کا پہلے گزر چکا ہے یہاں اس کی کچھ تفسیر عرض کی جاتی ہے اعتراف یہاں اعتراف فعلی کو فرمادیا کہ ستونوں سے اپنے آپ کو بندھوا دیا عملاً دکھلا دیا کہ ہم سے بڑا جرم ہوا ہے اور حالت ان کی یہ ہے کہ عمل صالح یعنی اعتراف ذنوب کو عمل بد یعنی تخلف عن غزوہ تبوک کے ساتھ ملا دیا۔

جہاد فرض عین اور فرض کفایہ

اس مقام پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاد میں جانا تو فرض کفایہ ہے جب ایک جماعت نے اس فرض کو ادا کر لیا تو سب کی طرف سے ادا ہو گیا پھر واخر سیئا کے کیا معنی ہیں جواب اس کا یہ ہے کہ حضور نے اس غزوہ کے لئے امر عام فرمایا تھا اس لئے وہ فرض عین ہو گیا تھا اور حضور کی شان تو اعلیٰ وارفع ہے اگر امام المسلمین کسی امر مباح کا بھی امر کر دے تو وہ فرض عین ہو جاتا ہے آگے ارشاد ہے عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رجوع فرمادیں گے۔ یہ شاہی محاورہ ہے چنانچہ حکام کہتے ہیں کہ تم کو امید رکھنا چاہئے اور کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ تمہارا یہ کام ہو جاوے اور مقصود وعدہ حتمی ہوتا ہے اور یہاں تو وعدہ سے بڑھ کر وقوع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ستونوں سے کھلوا دیئے گئے تھے اور اس محاورہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بادشاہی عطا فرماتے ہیں اس میں ایک خاص شان اور آن پیدا ہو جاتی ہے۔

کلام الٰہی کی ایک عجیب شان

جس کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے فعل اور قول میں ایک انداز حاکمانہ ہوتا ہے پس وعدہ بھی اگر کسی سے کرتے ہیں تو وعدہ کے صیغہ سے نہیں کرتے اس لئے کہ وعدہ ہو تو پھر دوسروں کو مطالبہ کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور یہ ایک

قسم کی مغلوبیت ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ تم کو امید رکھنا چاہئے اور کہتے ہیں کہ شاید ہم ایسا کردیں اور چونکہ حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین اور سب بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اس لئے یہی ان کے کلام کا بھی انداز ہے بلکہ مخلوق کے کلام میں خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو کسی نہ کسی جگہ مغلوبیت اور مقصودیت کا انداز ضرور آ جائے گا۔ اس لئے کہ وہ فطرۃً ایک زبردست قوت کا مغلوب ہے اور حق تعالیٰ کے کلام میں اول سے آخر تک دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا متکلم کسی سے دبنے والا نہیں اور سب پر غالب ہے۔

تفسیری نکتہ

الحاصل جن حضرات کی توبہ قبول ہوئی تھی اس خوشی میں وہ اپنا سب مال روپیہ پیسہ بٹور لائے اور حضور کی خدمت میں جمع کر دیا۔ حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے فوراً آیت نازل فرمائی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ' یعنی ان کے مالوں میں سے تھوڑا سا صدقہ لے لیجئے کہ اس سے آپ ان کو پاک کریں اور ان کو صاف کر دیں بِهَا اس آیت میں علی سبیل التنازع تطہر اور تزکی دونوں کے متعلق ہے یہاں پر ایک سوال ہوتا ہے کہ تطہیر اور تزکیہ تو ایک ہی شے ہے اگر صرف تطہر پر ہی اکتفا فرماتے تو کافی تھا تزکی میں کیا نکتہ ہے نکتہ اس میں یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں ایک تو آگ دوسرے آگ کا اثر یا یوں کہو کہ دیا سلائی اور ایک اس سے آگ نکلنا یعنی ایک تو معصیت ہے جو آگ ہے اس کا ازالہ تو تطہیر ہے اور دوسرے معصیت کا مادہ ہے اس کا ازالہ تزکیہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ صدقہ قبول کرنے سے ان کے گناہ بھی پاک کیجئے اور گناہوں کا مادہ بھی دور کر دیجئے آگے ارشاد ہے وصل علیھم اور ان کے لئے دعا بھی کیجئے' یہاں سے ایک بات کام کی معلوم ہوئی وہ یہ کہ آج کل جو یہ رواج ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مصرف خیر میں کچھ روپیہ دیتا ہے تو کھڑے ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں یہ بالکل بے موقع ہے ہم کو ایسے موقع میں اس کے لئے دعا سکھلائی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا وصل علیھم اس کے لئے شکریہ وہ ادا کرے جس کے ساتھ احسان کیا ہو وہ شخص ہم کو نہیں دیتا اسلام کی خدمت کرتا ہے اور اسلام کے ساتھ اس کو ہم کو برابر تعلق ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ یعنی بیشک حسنات سیئات کو دور کر دیتی ہیں اس پر نظر کرنے سے بھی اس شبہ کو تقویت ہوتی ہے بلکہ اس آیت کے معنے اگر یہ مان لئے جاویں کہ ملکہ اور مادہ گناہ کا جاتا رہتا ہے تو شبہ اور زیادہ قوی ہوتا ہے اور ارشاد ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ اور حدیث شریف میں ہے ان رحمتي سبقت علی غضبي ان آیات سے اور اس حدیث کے عموم سے یہ شبہ بہت ہی قوی ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ حسنات کے ہوتے ہوئے سیئات کیوں رہتے ہیں حسنات کا مقتضا تو یہ ہے کہ سب دور ہو جائیں چنانچہ صحابہؓ کے اندر وہ خلط نہیں تھا پس ایسی تدبیر کون سی ہے جس سے یہ خلط کی حالت نہ رہے اور

حسنات کو غلبہ ہو جائے سو دلائل شرعیہ اور نیز اس آیت میں غور کرنے سے اس کا معالجہ سمجھ میں آتا ہے اگر قرآن مجید کو تدبر سے نہیں دیکھتے تو حق تعالیٰ نے اس کی شکایت بھی فرمائی چنانچہ ارشاد ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ قرآن شریف ہی میں سب کچھ ہے جہاں امراض کا ذکر ہے وہاں ہی اس کا معالجہ بھی ہے۔

مرض خلط کا علاج

تھوڑے سے غور کی ضرورت ہے سنئے اور غور سے سنئے کہ اس کا معالجہ بھی خود اسی آیت میں ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس میں غور فرمایئے کہ عسی اللہ ان یتوب کا ترتب اللہ تعالیٰ نے کس شے پر کیا ہے وہ کیا شے ہے کہ جس پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے جب تم اس پر عمل درآمد کرو گے یقیناً مورد رحمت ہو گے اور ہرگز تخلف نہ ہوگا اور وہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ذنوب اور سیئات کے ساتھ تو اعترفوا فرمایا اور اس ترکیب کو صالحا کے ساتھ مقید فرمایا ہے پس حاصل معالجہ کا یہ ہوا کہ ذنوب کے ساتھ تو اعتراف ہونا چاہئے اور عمل کے اندر صلاحیت کی صفت ہونا ضروری ہے۔ پس معالجہ دو جزو سے مرکب ہوا عمل صالح اور اعتراف ذنوب شاید کسی کو شبہ ہو کہ ہمارے اندر تو یہ دونوں صفتیں ہیں پھر بھی مرض نہیں جاتا صاحبو میں اس واسطے کہتا ہوں کہ تدبر سے کام نہیں لیتے واقع میں ہمارے اندر دونوں جزو مفقود ہیں اگر یہ دونوں جزو ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ کا ظہور نہ ہوتا غور کیجئے کہ صالح عمل کی صفت ہے اب دیکھنا چاہئے کہ صالح کس کو کہتے ہیں صالح صلاح سے مشتق ہے اور صلاح کے معنی درستی کے ہیں درست شے وہ ہے کہ اس کے کسی جزو میں کسر نہ ہو درست گاڑی وہ کہلائے گی جس کے پہیے اور تمام کل پرزے درست ہوں۔ اگر ایک جزو کے اندر بھی خرابی ہے تو پھر وہ درستی کے ساتھ موصوف نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ ناقص اور کامل کا مجموعہ ناقص ہی ہے اگر کسی کو ذرا زکام یا سر میں درد ہو تو کہتے ہیں کہ آج طبیعت درست نہیں پس عمل کو صالح جب کہیں گے جب کہ وہ من کل الوجوہ درست ہو۔ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ عمل کس شے سے درست ہوتا ہے سو اس کے معنی بھی کلام اللہ ہی سے تلاش کرنا چاہئے حق تعالیٰ نے اس کو دو لفظوں میں بیان فرما دیا ہے اگر جنید و شبلی جیسے بھی جمع ہو کر برسوں فکر کر کے بیان کرتے تو ایسا جامع بیان نہ کر سکتے ارشاد ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضامندی اور اپنے نفسوں کے اندر استقلال پیدا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے کی ٹیلہ پر ایک باغ ہو کہ اس پر بارش ہووے تو وہ اپنا پھل دو چند دے ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یہ دونوں ینفقون کے مفعول لہ ہیں اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ بواسطہ من کے تَثْبِيْتًا مصدر کا مفعول بہ ہے حاصل یہ ہے کہ درستی عمل کے دو جزو ہیں جب وہ دونوں پائے جاویں تو صلاحیت

کامل ہوگی وہ دو جزو ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اور تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ہیں یعنی جو عمل کرے اس میں دو باتوں کی نیت ہونا چاہئے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوں دوسرے یہ کہ نفس کے اندر اس عمل کا ملکہ ہو جائے کہ جس سے نفس کے اندر استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کی خوشنودی تو مقصود اصلی ہے اور تثبت اس کا ذریعہ ہے اب ہم لوگ اپنا حال دیکھیں کہ نماز پڑھتے ہیں تلاوت قرآن بھی کرتے ہیں روزہ بھی رکھتے ہیں صدقہ خیرات بھی بقدر وسعت دیتے ہیں لیکن ان اعمال میں ہماری نیت کچھ بھی نہیں ہوتی پس اعمال تو ہیں لیکن صلاحیت ان میں نہیں ہے۔

صدقات واجبہ کا امر

چنانچہ ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً یعنی اے ایمان والو جب تم جناب رسول ﷺ سے پوشیدہ بات کرنا چاہو تو پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو مناجات رسول ﷺ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں سے ہے پس اس کے ارادہ پر صدقہ دینے کا حکم ہوا اور سبحان اللہ کیا بلاغت ہے یوں نہیں فرمایا فقد موا بين يديكم نفقة اس لئے کہ اس میں کسی ملحد کو یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ ان کے رسول ﷺ نے بھی اپنی کمائی کے بھی خوب ڈھنگ نکال رکھے تھے۔ اب یہ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ صدقات واجبہ کا مال جیسا کہ صیغہ امر سے اس صدقہ کا وجوب معلوم ہوتا ہے۔ حضور ﷺ اور حضور ﷺ کی اولاد کے لئے بلکہ مطلق بنی ہاشم کے لئے حرام تھا اس لئے کہ صدقہ کو اوساخ الناس فرمایا ہے ہاں صدقات نافلہ بنی ہاشم کے لئے جائز ہیں اور آپ کے لئے وہ بھی حرام تھے۔

تطہیر اور تزکیہ

الحاصل جن حضرات کی توبہ قبول ہوئی تھی اس خوشی میں وہ اپنا سب مال روپیہ پیسہ بٹور لائے اور حضور ﷺ کی خدمت میں جمع کر دیا حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے فوراً آیت نازل فرمائی۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا یعنی ان کے مالوں میں سے تھوڑا سا صدقہ لے لیجئے کہ اس سے آپ ان کو پاک کریں اور ان کو صاف کریں۔

آیت میں علی سبیل التنازع تطہر اور تزکی دونوں کے متعلق ہے یہاں پر ایک سوال ہوتا ہے کہ تطہیر اور تزکیہ تو ایک ہی شے ہے اگر صرف تطہر پر ہی اکتفا فرماتے تو کافی تھا۔ تزکی میں کیا نکتہ ہے اس میں یہ ہے کہ دونوں چیزیں ہیں ایک تو آگ دوسرے آگ کا اثر یا یوں کہو کہ دیا سلائی اور اس سے آگ نکلنا یعنی ایک تو معصیت ہے جو آگ ہے اس کا ازالہ تو تطہیر ہے اور دوسرے معصیت کا مادہ ہے اس کا ازالہ تزکیہ ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ صدقہ قبول کرنے سے ان کے گناہ بھی پاک کیجئے اور گناہوں کا مادہ بھی دور کر دیجئے آگے

ارشاد ہے وصل علیھم اوران کے لئے دعا بھی کیجئے یہاں سے ایک بات کام کی معمول ہوئی وہ یہ کہ آج کل جو یہ رواج ہے اگر کوئی شخص کسی مصرف خیر میں کچھ روپیہ دیتا ہے تو کھڑے ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں یہ بالکل بے موقع ہے۔ہم کو ایسے موقع میں اس کے لئے دعا سکھلائی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا وصل علیھم اس لئے کہ شکریہ وہ ادا کرے جس کے ساتھ احسان کیا ہو وہ شخص ہم کو نہیں دیتا ہے اسلام کی خدمت کرتا ہے اور اسلام کے ساتھ اس کو اور ہم کو برابر تعلق ہے۔اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک باپ کے چند بیٹیوں اور ایک بیٹا باپ کی کچھ خدمت کرے اور بیٹے اس کا شکریہ ادا نہ کریں گے اس لئے کہ جیسا ہمارا باپ ہے ایسے ہی اس کا بھی ہے۔ہم پر اس نے کیا احسان کیا ہے۔جو شکریہ ادا کریں پس شکریہ ایسے موقع پر بالکل بے محل ہے شکریہ تو جب ادا کیا جاوے جب کہ ان کو کوئی کچھ دے شکریہ ادا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے یا شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسلام میرا ہے دوسرا مسلمان ہی نہیں یہ اہل یورپ کی تقلید ہے کہ وہ اپنے جلسوں میں شکریہ ادا کرتے ہیں تو ان کی دیکھا دیکھی یہ بھی ایسا ہی کرنے لگے اور اس پر کیا منحصر ہے۔اب تو ہر کام انہیں کے طریقہ پر کرنا چاہتے ہیں چنانچہ کسی کی تقریر میں جب کوئی مضمون پسند آتا ہے تو اس پر تالیاں بجاتے ہیں حالانکہ تالیاں تو اہانت کے موقع پر بجائی جاتی ہیں۔یہ اچھی تہذیب ہے تہذیب کیا تعذیب ہے۔

ترجمہ: آپ ﷺ ان کے مالوں سے صدقہ (جس کو یہ لائے ہیں) لے لیجئے جس کے لینے کے ذریعے سے آپ ﷺ ان کو گناہ کے آثار سے معاف کرنے والے ہیں بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں اور خوب جانتے ہیں۔

آیت متلو کا شان نزول

کہ رسول ﷺ غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے تھے۔اور بجز معذورین کے سب کو ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔مگر کچھ لوگ غزوہ میں نہیں گئے مدینہ ہی میں رہ گئے جن میں زیادہ تر تو منافقین تھے اور دو چار مخلصین بھی تھے۔آپ کی واپسی پر منافقین نے تو آ کر جھوٹے بہانے کر دیئے کہ ہم کو فلاں عذر مانع تھے۔یہ سبب پیش آ گیا تھا مگر مخلصین نے اپنے خطا کا صاف صاف اقرار کر دیا کہ ہم کو کوئی عذر مانع نہ تھا۔محض کاہلی اور سستی سے پیچھے رہ گئے حضور ﷺ نے منافقین کا عذر سن کر ان کو تو معذورین میں داخل کر کے رخصت فرما دیا اور ان مخلصین سے فرمایا کہ تمہارا معاملہ خدا کے سپرد ہے خواہ معاف فرما دیں یا سزا تجویز کر دیں چنانچہ پچاس روز تک سب مسلمانوں کو ان سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا کہ کوئی ان سے بات چیت اور سلام وکلام نہ کرے پچاس دن کے بعد ان کی توبہ نازل ہوئی تو یہ حضرات خوش خوش حضور ﷺ کے پاس آئے اور شکریہ قبول توبہ میں اپنا مال حضور ﷺ کے پاس لائے کہ اس کو کار خیر میں سے صرف فرما دیا جائے حضور ﷺ کو ان کا مال قبول کرنے

میں سوچ ہوئی آپ ﷺ نے فوراً نہیں لیا کیونکہ آپ ﷺ کو کیا خبر کہ ان کی حالت کیسی ہے اس وقت محض جوش میں دے رہے ہیں کہ بعد کو پچھتائیں گے یا اخلاص قلب سے دے رہے ہیں تو حق تعالیٰ ان مخلصین کی سفارش فرماتے ہیں کہ ان کے اموال سے صدقہ وصول فرمالیجئے کہ یہ لوگ مخلص ہیں۔

اور **من اموالھم** میں ظاہر یہ ہے کہ من تبعیضیہ ہے گو احتمال یہ بھی ہے کہ بیانیہ ہو تو من تبعیضیہ کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کا کوئی جز و قبول کرلیا جائے جس سے معلوم ہوا کہ کل مال نہ لیا جائے کیونکہ یہ ہر شخص کی حالت کے مناسب نہیں۔ صدیق اکبرؓ کی اور شان ہے وہ تو عاشق تھے۔ ان کی سخاوت تو جان دینا ہے پھر ان کا کل مال لینے سے کیا انکار ہے مولانا فرماتے ہیں۔

مال دادن خود سخائے صادق ست جان دادن خود سخائے عاشق ست

صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا ' جس میں حضور ﷺ کو ارشاد ہے کہ صدقہ اتنا لیا جائے کہ ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے آپ ان کو پاک کریں اور طاہر کریں **بھا** میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ **تزکیھم** کے متعلق ہو **تطھرھم** کے متعلق نہ ہو۔ اس صورت میں تطہرھم میں خطاب نہ ہوگا بلکہ یہ صیغہ غائب کا ہے جو صدقۃً کی صفت ہے کہ وہ صدقہ ایسا ہو کہ گناہوں سے پاک کرنے والا ہو اور آپ ﷺ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تزکیہ فرمائیں اور صورت میں اولاً صدقہ کی صفت مذکور ہوئی پھر حضور ﷺ کا فعل مذکور ہوا اور آپ ﷺ جو مسلمانوں کے صدقات قبول کر لیتے ہیں تو نہ اپنی مصلحت کے لئے بلکہ مسلمانوں کے تزکیہ کے لئے اور ظاہر ہے کہ تزکیہ اسی کا ہوسکتا ہے جو خود بھی طالب تزکیہ ہو تو اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص صدقہ سے طالب تزکیہ نہ ہو اس کا صدقہ قبول نہ کیا جائے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ **بھا** دونوں کے متعلق ہو **تطھرھم** کے بھی اور **تزکیھم** کے بھی اور یہی میرے نزدیک ظاہر ہے کہ دونوں صیغے خطاب کے ہیں اور **بھا** دونوں کے متعلق ہے اس میں تناسب و تناسق کلام بھی باقی رہے گا۔ بہر حال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ پاک صاف ہونا کوئی ضروری چیز ہے دوسرے یہ کہ مال خرچ کرنے کو پاکی میں دخل ہے۔

تبلیغ اور سوال

چنانچہ جابجا انجمنیں بھی ہیں جن میں ایک صدر ہے ایک سیکرٹری ہے کوئی ناظم اور اور کوئی کیا خاک بلا ہے۔ سو ان لوگوں سے کام کچھ نہیں ہوتا البتہ سب سے پہلے چندہ مانگنے کو تیار ہیں حالانکہ اس طرح چندہ مانگنے سے ہم کو روکا گیا ہے خود حضور ﷺ کو حکم ہے اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ (الآیۃ) اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ارشاد ہے لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا کہ ہمیں تبلیغ کے معاوضہ میں مال نہیں چاہئے کہ ہم تم سے روپے پیسے نہیں

مانگتے ہیں اور جہاں مال لینے کا حکم ہے مثلاً ارشاد ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ یعنی ان کے مال سے صدقہ لے لیجئے انہیں کے تزکیہ اور تطہیر کے لئے یعنی اس میں آپ کا کوئی نفع نہیں ہے تو اگر کسی کو خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ (الایۃ) سے شبہ چندہ کا ہو تو اس کا شان نزول دیکھ لیجئے اسی سے معلوم ہو جائے گا کہ غزوہ تبوک میں بعضوں سے کوتاہی ہو گئی تھی جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے کچھ مال حاضر کر کے اس کے قبول کی درخواست کی اس پر یہ ارشاد ہوا سو اس سے چندہ مانگنے کا کیا تعلق کہاں اخذ اور کہاں سوال اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر وہ خود لا دیں تو لے لو انکار نہ کرو اور سوال یہ ہے کہ مانگ مانگ کر لوگوں سے روپیہ جمع کیا جاوے سو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی بطیب خاطر کوئی چیز لا دے تو لے لو تو خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ سے چندہ مانگنا کیسے نکلا' اللہ میاں نے تو خذ فرمایا ہے اسئل تو نہیں فرمایا اور چندہ تو سوال ہے نہ کہ اخذ اگر اسئل فرماتے تو تمہارا مدعا حاصل ہو جاتا مگر سوال کے متعلق تو یہ آیا ہے۔ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ' اگر تم ایمان لاؤ اور خدا سے ڈرو تو اپنے پاس سے اجر دیں گے اور تم سے تمہارا مال نہیں مانگیں گے بے فکر رہو آگے فرماتے ہیں اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ کیونکہ اگر تم سے اصرار کے ساتھ مانگا جائے تو تم بخل کرنے لگو واقعی یہ خدا ہی کا کلام ہے کیونکہ وہ تو تمہارے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر یہ رسول کا بھی کلام محض رائے سے ہوتا تو اس میں اتنی گہری گہری باتیں نہ ہوتیں فرماتے ہیں ہم تم سے کیا مانگتے اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ دیکھئے یہاں سوال میں فیحفکم بڑھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں عادۃً اخفاء ہوتا ہے چنانچہ مانگنا اسی کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کو لپٹ جائیں اور شریعت میں یہ حرام ہے تو فرماتے ہیں کہ اگر ہم مانگنے لگیں تو تم بخل کرنے لگو گے اور تمہاری دلی کدورت ظاہر ہو جائے گی۔ ضغینہ کے اصل معنی کینہ کے ہیں۔ یہاں مراد کدورت ہے یعنی انفاق میں جو دل پر تنگی ہوتی ہے وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اس لئے ہم تم سے سوال نہیں کرتے اگر سوال کریں تو یہ خرابیاں ہوں گی یہ حاصل ہے آیت کا ہاں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان کر دینا اور بات ہے یہ سوال میں داخل نہیں اس لئے ہم اس کو نصوص میں جا بجا بتلا چکے ہیں اگر کسی کو ثواب لینا ہو لے لے' اسی کو فرماتے ہیں هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَاۤءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ہم بے شک تمہیں اس طرف بلاتے ہیں کہ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں اس میں تمہارا ہی نفع ہے مگر مانگتے تب ہیں ہم تو تم سے ایک کوڑی بھی نہیں مانگتے البتہ خرچ کا راستہ بتلائے دیتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو کسی سے کہا دس روپے لاؤ یہ تو سوال ہے اور ایک یہ کہ کسی کو رائے دی کہ میاں دس روپے سے فلاں چیز لے لو تو نفع ہو گا یہ مشورہ ہے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے بلکہ خود اس کے نفع کی

ایک صورت بتلا دی ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے تو فرماتے ہیں کہ نصوص میں اس کی ترغیب تو ہے کہ خرچ کرو اگر خرچ کرو گے تو اس کا ثواب یہ ہے کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ایک دو اور سات سو بلکہ اس سے بھی زیادہ ؎

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را کہ بیک گل میخری گلزار را

اور فرماتے ہیں

نیم جاں بستا ند و صد جاں دہد انچہ در وہمت نیاید آں دہد

تو یہ ایک تجارت سکھلائی تھی کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو بڑے منافع حاصل ہوں گے مگر تم کنجوس ہو تجارت میں بھی کنجوسی کرتے ہو اس کا خمیازہ تم ہی بھگتو گے ہمارا کیا نقصان ہم نے تو تمہارے نفع کی بات بتلائی تھی نہیں مانتے مت مانو ایسی تیسی میں جاؤ' اسی کو ارشاد فرماتے ہیں فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُۚ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ یعنی اس بخل سے خدا کا کچھ ضرر نہیں تمہارا ہی ضرر ہے۔ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ خدا غنی ہے اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہاں تم محتاج ہو تمہاری حاجت ہی کو دیکھ کر یہ رائے دی گئی تھی کہ اللہ کے راستہ میں دو گے تو مالا مال ہو جاؤ گے۔نہیں مانتے تو تمہارا ہی نقصان ہے ہمارا کیا بگڑا' اس آیت کی یہ تقریر ایک عالم صاحب نے سن کر بہت خوشی ظاہر کی اور دعائیں دیں اور کہا آج اس کا مطلب سمجھا ہوں۔ پہلے تو بڑے تردد میں تھا کہ اس آیت میں یہ کیسا تعارض ہے کہ اول آیت میں تو سوال کی نفی معلوم ہوتی ہے اور آخر میں خود سوال ہے اب معلوم ہوا کہ کوئی تعارض نہیں کیونکہ دوسری آیت میں سوال نہیں ہے بلکہ ترغیب ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی اور پہلی آیت میں نفی ہے سوال کی اس ترغیب سے سب مشکلات ختم ہو گئے مگر ایک شبہ رہ گیا تھا وہ یہ کہ اگر ہم خرچ نہ کریں تو دین کا سب کام چوپٹ ہو جاوے یہ مدارس کیسے قائم رہیں اور مسجدوں کی خدمت کون کرے۔ اگر ہم خرچ نہ کریں تو رفتہ رفتہ دنیا سے دین رخصت ہو جاوے تو اس اعتبار سے ہم محتاج الیہ ٹھہرے۔ اس ناز کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہاں بے شک بظاہر تمہاری ہی مدد سے یہ کام چلتے ہیں اگر روپیہ نہ ہو تو مثلاً مدرسے قائم نہ رہیں روپیہ کی اور دینے والے کی تو واقعی ضرورت ہے مگر خاص تمہاری ذات شریف کی خدا کو ضرورت نہیں۔ اگر تم اس کام کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو بدل دیں گے کہ بجائے تمہارے وہ اس دینی خدمت کو کرے گی۔ اسی مضمون کو فرماتے ہیں وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ مطلب یہ ہے کہ واقعی دین کا کام خرچ کرنے سے چلتا ہے مگر وہ خرچ کرنا تم پر موقوف نہیں سبحان اللہ کیا بلاغت ہے یستبدل میں اشارہ ہے اس طرف کہ یہ خرچ کرنا ایک عہدہ ہے تم مالک نہیں ہو۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: پھر آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد خدا سے ڈرنے اور خدا کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی (یعنی غار) کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو پھر وہ (عمارت) اس (بانی) کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑے اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (دین کی) سمجھ نہیں دیتا ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (کانٹا سا) کھٹکتی رہے گی ہاں مگر ان کے (وہ) دل ہی اگر فنا ہو جائیں تو خیر اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى یہ آیت ایک خاص قصہ اور ایک خاص مسجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر مجھے اس علت مشترکہ نکال کر دیگر مساجد اور مدارس کی تعمیر کا حکم بیان کرنا ہے اور اس پر پھر تعمیرات کو قیاس کرنا ہے غرض یہ آیت مسجد خاص کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔

ملخص قصہ کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک محلہ ہے قبا اس کا نام ہے رسول ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو اول اسی محلہ میں قیام فرمایا۔ پھر شہر میں تشریف لائے تھے تو زمانہ قیام میں جس جگہ آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے وہاں اس محلہ کے مومنین مخلصین نے ایک مسجد بنالی اور اس میں نماز پڑھا کرتے کسی نے خوب کہا ہے کہ

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد ۔۔۔ باخاک آستانش داریم مرحبائے

منافقین نے جو کہ اسلام کی بیخ کنی کی تدبیروں میں ہروقت لگے رہتے تھے یہ سوچا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے جداگانہ بنایا جاوے اور ظاہر میں وہ مسجد کی شکل ہو اور واقع میں انجمن ہو اور اس کا پریذیڈنٹ ابو عامر راہب بنایا گیا جو کہ اسلام کا سخت دشمن تھا اور ابو عامر کا ہرقل شاہ روم سے میل جول تھا ابو عامر نے مسلمانوں کے ضعف پر نظر کر کے یہ کہا کہ میں ہرقل سے اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے لشکر لاؤں گا۔ جس سے اسلام نیست و نابود ہو جاوے گا۔

ان لوگوں نے اپنی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر یہ خیال پختہ کر لیا تھا مگر یہ نہ سمجھے کہ خربوزوں کی چاہے کتنی ہی کثرت ہو مگر چھریوں کی قلت بھی ان کے نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہے مسلمانوں کے ساتھ تو ایک چھری ان اللہ معنا کی تھی کہ کفار کسی صورت سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور افسوس کہ آج کل یہی چھری مسلمانوں کے پاس نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو تیز نہیں ہے کند ہو رہی ہے۔ کیونکہ مرضیات الٰہی سے مسلمان بہت کچھ ہٹ رہے ہیں اس لئے مخالفوں کا کبھی ان پر غلبہ ہو جاتا ہے اگر مسلمان اس چھری کو تیز کر لیں یعنی خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو پھر وہی نمونہ سامنے آ جائے جو کبھی پہلے تھا۔

غرض ان لوگوں نے انجمن کی نیت سے مسجد کی شکل میں ایک مکان اس غرض سے بنایا کہ اس میں تخریب اسلام کا مشورہ کیا کریں گے۔ مسجد کی نیت سے نہیں بنایا تھا۔ صرف صورۃ مسجد کی شکل تھی غرض جب وہ مکان تیار ہوا تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک بار وہاں چل کر نماز پڑھ لیجئے تو پھر وہاں نماز ہونے لگے گی۔ تو گویا مقصود رجسٹری کرانا تھا جیسے بیع نامہ کی رجسٹری کرائی جاتی ہے۔

حضور ﷺ نے جداگانہ مسجد بنانے کی وجہ پوچھی کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے۔ محض عام مسلمانوں کی آسائش کی غرض سے بنائی تھی تا کہ وسعت و سہولت ہو، گرمی سردی میں سایہ کی ضرورت ہوتی ہے ایک مسجد میں سب سما نہیں سکتے۔ اس سے گنجائش ہو گئی۔ نیز کوئی بیمار ضعیف دور نہ جا سکے تو پاس کے پاس اس میں نماز پڑھ لے حضور ﷺ نے بناء بر حسن ظن تصدیق فرما کر وعدہ کر لیا۔ غرض حضور ﷺ نے وعدہ فرما لیا کہ تبوک سے آ کر اس میں نماز پڑھوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقیقت حال کی اطلاع کر دی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اور بعضے ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان اغراض کیلئے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں

اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا اور رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے ہماری اور کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ ﷺ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض آیت میں خدا کے یہاں سے اس مسجد کی مذمت ظاہر کی گئی ہے کہ یہ مسجد صرف صورۃ ہے اور واقع میں کفر کی قوت کے واسطے اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے اور ان میں تفریق ڈالنے کے واسطے تیار ہوئی ہے اور ابو عامر راہب کے ٹھہرنے کے لئے اور اس کی پناہ کے واسطے تیار کی گئی ہے اور یہ لوگ قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور کچھ نیت نہیں حالانکہ یہ لوگ جھوٹے ہیں آپ اس مسجد میں نہ کھڑے ہو جایئے اور نہ نماز پڑھیئے۔ البتہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھیے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس میں ایسے آدمی ہیں کہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض اس مسجد میں نماز کی نیت سے جانے سے ممانعت ہو گئی چنانچہ حضور ﷺ نے بوجہ اس کے کہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ مفاسد کثیرہ اس سے ناشی ہوتے تھے چند صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوا دی اور منہدم کرا دی اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے کیونکہ وہ اضرار کے لئے بنائی گئی تھی۔

قرآنی طرز نصیحت

اس سے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ۔ ہمزہ استفہام کا ہے اور فا تفریع کا ہے اوپر دو قسم کی مساجد کا ذکر فرمایا ہے اب یہ بتلا کر کہ ان میں سے ایک کی تو بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور دوسری کی کفر پر اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان میں سے کون افضل ہے جب بناؤں کہ حالت معلوم ہو گئی تو اس سے بانی کی بھی فضیلت معلوم ہو گئی اور بنیان مصدر ہے مبنی کے معنی میں اور ھا کی ضمیر من کی طرف راجع ہے اور من اللہ تقویٰ کی قید ہے تاکہ کوئی متقی ایسی پاکی پر ناز نہ کرے کہ ہم نے پاکی حاصل کی اس واسطے کہ تقویٰ من جانب اللہ اور رضوان بھی مقید ہے من اللہ کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا و خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو یہ طرز بلاغت ہے کہ فیصلہ مخاطب کے اوپر چھوڑ دیا پس دونوں کے افعال بیان کر دیئے۔ اور مخاطب کے ذمہ فیصلہ چھوڑ دیا کہ تم سوچ لو یہ بہتر ہے یا یہ

بہتر ہے۔ یہ طرز نصیحت کا بڑا مؤثر ہے اور اگر ناصح خود ہی فیصلہ کردے تو اس سے مخاطب پر گرانی ہوتی ہے۔

ایک طرز تو یہ ہے کہ ان کے اقوال وافعال اجنبیانہ طور پر بیان کردیئے جائیں اور کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے پھر خود ان سے ہی فیصلہ دریافت کرلیا جائے تو یہ طرز زیادہ موثر ہوتا ہے اور ایک طرز یہ ہے کہ خود فیصلہ کر کے حکم لگا دو کہ تم ملعون ہو'

تو حق سبحانہ تعالیٰ بھی یہی پہلا طرز اختیار فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان دونوں میں کون خیر ہے یعنی جس شخص نے اپنی بنیاد تقویٰ اور خدا کی رضا پر رکھی ایک شخص تو یہ ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ پر جو گرنے ہی کو ہو رکھی ہو یعنی ڈھانگ پر رکھی ہو جس کی عمارت میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ ڈھانگ پر رکھی ہے اور پھر یہ خرابی ہے کہ وہ ڈھانگ گرنے ہی کو ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ بانی کو لے کر گرے گی جب مکان گرا تو بانی جو اس میں رہتا تھا وہ بھی گر گیا یہ سب سے زیادہ ضرر ہے اور اگر بانی سلامت رہے تو کیا غم ہے۔

اگر بانی رہ جاوے اور مکان گر جاوے تو ایسا ضرر نہیں مکان بہت بن سکتے ہیں اصل ضرر یہ ہے کہ بانی کو لے کر مکان بیٹھ گیا۔

ختم آیت پر فرماتے ہیں وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ○ کہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ہدایت نہیں کرتے۔

یہ اپنے عموم سے اس کو بھی شامل ہے آگے ان منافقوں کی عمارت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ اس کے گرنے کے بعد ان کے قلب کی کیا حالت ہونے والی ہے۔ فرماتے ہیں لَا یَزَالُ بُنْیَانُھُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِھِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُھُمْ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ان کی یہ عمارت یعنی وہ مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور نیت کی قلعی کھل گئی وہ الگ اور پھر اوپر سے منہدم کردی گئی غرض کوئی ارمان نہ نکلا' اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا ہاں ان کے وہ دل جن میں یہ ارمان ہے اگر وہی فنا ہو جاویں تو وہ ارمان بھی اس وقت ختم جاوے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں۔ ان کی مخفی شرارتوں کو جانتے ہیں حکمت والے ہیں مناسب سزا دیں گے تو آدمی جس چیز کو مقصود سمجھتا ہے اس کے عدم حصول سے جو حالت ہوتی ہے وہی حالت ان کی تھی جنہوں نے یہ انجمن تخریب اسلام کے لئے بنائی تھی اور یہ علت بھی مشترک ہے تمام عمارات میں کہ جن لوگوں نے اپنی عمارات ایسے ناپاک اغراض کے لئے ایسے مواقع پر بنائی ہیں وہ سب برباد بھی ہوئیں اور ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بے چینی ان کے لازم حال ہوگئی چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بری نیت سے جو عمارت بنائی گئی ہے اس کو قیام نہیں ہوتا۔ اب میں اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُھُمْ ؕ کے متعلق ایک نکتہ بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔

قلب اور موت

اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ ارمان ان لوگوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا بجز اس کے کہ ان کے دل ہی قطع ہو جاویں اور یہ مرجاویں تب تو یہ حسرت نکل سکتی ہے کیونکہ جب دل نہ رہے گا جو محل ہے حسرت کا تو پھر ارمان اور حسرت کس طور سے باقی رہے گا۔ پس ایک تو یہ توجیہ ہے اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ کی کہ بعد فنا وموت کے اس خاص حسرت سے راحت ہو جاوے گی۔

ایک توجیہ یہ بھی بیان ہو سکتی ہے اور یہ نہایت لطیف ہے کہ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ تاکید ہے الم حسرت اور ارمان کی کہ ان کو حسرت اور ارمان ہمیشہ رہے گا اور یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی۔ موت سے بھی یہ کھٹک دور نہ ہوگی کیونکہ قلب کو موت نہیں آسکتی اس لئے کہ قلب کی دو قسمیں ہیں ایک تو قلب جو مضغہ صنوبری ہے۔

دوسرا قلب حقیقی جو محل ادراکات ہے عقائد وغیرہ کا حصول بھی اسی قلب سے ہوتا ہے۔

یہ قلب جس چیز کو ادراک کرتا ہے اس کی بقاء ضروری ہے اس وجہ سے کہ یہ قلب ہمیشہ باقی رہتا ہے اس لئے کفر بھی باقی رہتا ہے اخلاق جو ناپاک ہیں وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں عشق کاذب بھی باقی رہتا ہے اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جاوے تو یہ عشق مرنے سے چھوٹتا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے بعض عشاق مرنے کے بعد اس غم سے دستگار ہو جانے کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں بالکل غلط ہے اس غم سے واقع میں جدائی مشکل ہے کیونکہ قلب حقیقی پر موت نہیں آتی اور نہ اس کی کیفیات زائل ہوتی ہیں غرض کہ اگر قلب کی تفسیر قلب حقیقی کی جاوے تو چونکہ قلب حقیقی کو موت نہیں۔ اس لئے اس کے ارمان اور حسرت کو بھی دوام رہے گا۔ اس تقدیر پر اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ میں استثناء ایسا ہوگا جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ولا عیب فیھم غیران سیوفھم   بھم فلول من قراع الکتائب

ای ان کان فیھم فھو ذاک   وھذا لیس بعیب فلاعیب فیھم اصلا

اسی طرح یہاں پر مطلب ہے کہ ان کے ارمان جب نکلیں جب کہ قلب ہلاک ہو جاوے اور عدم ہلاک قلب ثابت ہے لہٰذا دوام حسرت وارمان بھی دواماً ثابت ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ان کی عمارت کے غیر تقویٰ ورضوان حق کے لئے ہونے کا' تو جو عمارات غیر تقویٰ رضوان حق پر مبنی ہوں گی ان کے بانیوں کے لئے بے چینی لازم حال رہے گی۔ مگر تقویٰ اور رضوان اور جس عمارت کی بنیاد تقویٰ اور رضوان پر وہ البتہ خیر ہی خیر بہتر ہے واللہ علیم اور اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں کہ کس شخص کی کیا نیت ہے اور وہ حکیم بھی ہیں کہ قوانین حکمت سے مقرر کرتے ہیں اور عامل وتارک کو مناسب جزا وسزا دیتے ہیں۔

ترجمہ: کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔

عارفین کی محبت و معرفت میں اضافہ

تو دیکھئے اپنے کو مشتری قرار دیا اور خریدنے والا ظاہر ہے کہ پہلے سے مالک نہیں ہوتا تو گویا یوں فرماتے ہیں کہ جان و مال سب تمہارا ہی ہے مگر ہمارے ہاتھ فروخت کر دو اللہ اکبر آپ نے شفقت خداوندی کو دیکھ لیا ایسی شفقت کسی کو بھی ہو سکتی ہے ہرگز نہیں اس جگہ عارفین نے ایک نکتہ خوب بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو اپنے آپ کو خریدار ٹھہرایا اس کو سن کر عوام تو خوش ہوئے کہ اس جان و مال کے بدلے بڑی دولت ہم کو ملے گی مگر اہل تحقیق اس آیت کو سن کر شرمندہ ہو گئے کہ حق تعالیٰ اپنی مملوک جان اور مال کو ہماری جان و مال فرماتے ہیں اس سے شرمندہ اس لئے ہوئے کہ ہم لوگ ان چیزوں کو چونکہ اپنا سمجھتے ہیں حق تعالیٰ نے بھی اسی کے موافق کلام فرمایا اور پردہ پوشی کی ہمارے خیال کی غلطی ظاہر کر کے ہم کو رسوا نہیں فرمایا فضیحت نہیں کیا بلکہ رحمت سے اس خیال کو بظاہر صحیح کر دیا کہ ہاں یہ جان و مال تمہارا ہی ہے ہم اپنا نہیں کہتے مگر تم اس کو جنت کے بدلے ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو عارفین پر یہ اثر ہوا اس آیت کا جس سے مارے شرمندگی کے ان کے سر اوپر نہیں اٹھتے اور اس سے حق تعالیٰ کی محبت اور معرفت ان کو زیادہ ہو گئی۔

بذل نفس

اب میں طالب علموں کے کام کی ایک بات بتلاتا ہوں کہ اس مقام پر شبہ ہو سکتا ہے کہ بذل نفس تو خاص خاص کاموں میں ہوتا ہے یعنی قتال میں جس کا آگے ذکر بھی ہے **یقاتلون فی سبیل الله** تو بذل نفس کیسے ہوا تو سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے خود آگے چل کر فرما دیا ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ وہ ایسے ہیں جو کہ توبہ کرنیوالے ہیں حمد کرنے والے روزہ رکھنے والے رکوع کرنے والے۔

یہ آیت اس شبہ کو بالکل زائل کر کے بتلا رہی ہے کہ یہ سب کام بذل نفس ہی میں داخل ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ دلیل ہے کہ آگے ارشاد ہوتا ہے **وبشر المومنین** مسلمانوں کو بشارت دیجئے۔

یہ المومنین اسی من المومنین سابق کا اعادہ ہے۔ پس ان اعمال کے بعد یہ حکم دینا کہ اے محمد ﷺ ان مومنین مذکورین کو بشارت دے دیجئے صریح طور سے دال ہے۔ کہ جس اشتراء انفس و اموال کا اوپر ذکر تھا وہ یہ اعمال ہیں پس یہ سب بذل نفس ہو گیا اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ تمام شریعت مطہرہ بذل نفس اور بذل مال کی تفصیل ہے۔

توبہ عبادات پر مقدم ہے

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔) یہ تو معاملہ کا بیان ہوا کہ حق تعالیٰ نے مومنین سے بیع وشرا کا معاملہ کیا ہے۔اور بدلین کا ذکر بھی ہے آگے ان کی اس حالت کی تفصیل ہے وہ یہ ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ (وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے حمد کرنے والے ہیں) اس میں تائبون کو مقدم کیا سب صفات پر حتیٰ کہ عابدوں پر بھی قرآن شریف ابلغ کلام ہے اس کی ترتیب کے اندر بھی ضرور کوئی بات ہے وہ یہی ہے کہ توبہ مقدم ہے تمام صفات پر اور تمام صفات کمال اور جمیع عبادات کا لطف اور کمال بھی توبہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے ایک آیت اور یاد آئی اس میں بھی یہی مضمون ہے وہ یہ ہے عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ○ (اگر پیغمبر ﷺ تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پرودگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں' اس میں بھی تائبات مقدم ہے عابدات پر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ عبادات پر مقدم ہے اور ظاہر ہے کہ توبہ بھی عمل ہے اور عبادات بھی اعمال ہیں اور یہ عبادات سے مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی اس آیت پر ایک شبہ ہے وہ یہ کہ اس میں تائبات کا لفظ عابدات پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیونکہ آیت میں اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں اور توبہ کا اعمال اول ہونا جب مستفیض ہوتا جب کہ آیت التائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التائبات ہوتا اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے تصریح کردی ہے کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بجز ایمان و اسلام کے سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے ان کے بغیر تو اعمال کیسے بھی اچھے ہوں مگر ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ سلطنت کی امداد بھی کرتا ہے اور رفاہ عام کے کام بھی بہت کرتا ہے مگر ہے باغی تو یہ سب کام اس کے بیکار ہیں اسی طرح ایمان و اسلام ہے کہ کوئی عمل بدوں ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی اب ایک شبہ اور ہے کہ مسلمان اور مومنات کا تقدم تو تائبات پر صحیح ہوگیا مگر آیت میں ایک لفظ قانتات بھی تائبات پر مقدم ہے جس سے توبہ کا اول اعمال ہونا پھر باطل ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت فعل قلب ہے یہ بھی توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جبھی ہوگی جبکہ قنوت ہو کیونکہ جب تک نرمی جھک جانا عجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ

ہے قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہوگیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے اس واسطے قانتات کو بھی اس آیت میں تائبات پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول الاعمال ہونے کا کہ اعمال مامور بہا میں سے جن اعمال پر توبہ مبنی نہیں ان سب سے مقدم توبہ ہے سو قنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہٰذا وہ توبہ پر مقدم ہوئی ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی طاعت صحیح نہ ہوگی بلا توبہ کے گو بعض افراد توبہ کے ایسے بھی ہیں جو شرط صحت ہیں تمام اعمال کے لئے او وہ توبہ عن الکفر ہے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ بلا اس کے کوئی عمل بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔

تفسیری نکات

نفس و مال

اسی وقت اس میں ایک لطیفہ ذہن میں آیا فرماتے ہیں **أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ** یہ نہیں فرمایا اعمالهم- واموالهم' اشارہ اس طرف ہے کہ اعمال تو نہیں نفس و مال تو ہے زکوٰۃ دی مال خرچ ہوا نماز پڑھی نفس پر تعب ہوا بس وہی خرید لیا گو وہ نفس و مال عبادت معتد بہا نہ سہی مگر بشرطیکہ تم انہیں اعمال میں مصروف کرو پھر چاہئے وہ عمل کامل نہ ہو کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ گھوڑا مر گیا جھول کے وہ دام دیئے جو گھوڑے کے تھے انفسهم میں یہ لطیفہ اسی وقت سمجھ میں آیا بہر حال یہ چاہے اس کی تفسیر نہ ہو مگر میری تقریر اس تفسیر پر موقوف بھی نہیں دوسری نصوص میں بھی یہ مضمون موجود ہے يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ سیئات کو حسنات سے بدل دیں گے۔

وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ

ترجمہ: اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے

تفسیری نکات

ہر کام میں حفظ حدود کی اہمیت

فرمایا کہ حق تعالیٰ نے صلحاء کی بہت سی تعریفیں سورہ توبہ کی اس ایک آیت میں جمع فرمائی ہیں جس میں التائبون الحمدون سے شروع ہو کر بہت سی صفات محمودہ بیان فرمانے کے بعد فرمایا (الحفظون لحدود الله) اس سے معلوم ہوا کہ تمام صفات محمودہ اس وقت محمودہ ہیں جبکہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہیں ان میں افراط وتفریط یا غلو ہو گیا تو صفت محمودہ نہیں رہتی' اور ہر کام اس وقت صحیح و مقبول ہوگا جبکہ وہ حفظ حدود کیساتھ ہو۔

توبہ عبادات پر مقدم ہے

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی) یہ تو معاملہ کا بیان ہوا کہ حق تعالیٰ نے مومنین سے بیع و شرا کا معاملہ کیا ہے اور بدلین کا ذکر بھی ہے آگے ان کی اس حالت کی تفصیل ہے وہ یہ ہے التائبون العابدون الحامدون' (وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے حمد کرنے والے ہیں) اس میں تائبون کو مقدم کیا سب صفات پر حتیٰ کہ عابدوں پر بھی قرآن شریف ابلغ کلام ہے اس کی ترتیب کے اندر بھی ضرور کوئی بات ہے وہ یہی ہے کہ توبہ مقدم ہے تمام صفات پر اور تمام صفات کمال اور جمیع عبادات کا لطف اور کمال بھی توبہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے ایک آیت اور یاد آئی اس میں بھی یہی مضمون ہے وہ یہ ہے عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ (اگر پیغمبر ﷺ تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی۔ کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں اس میں بھی تائبات مقدم ہے۔ عابدات پر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ عبادات پر مقدم ہے اور ظاہر ہے کہ توبہ بھی عمل ہے اور عبادات بھی اعمال ہیں۔ اور یہ عبادات سے مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی اس آیت پر ایک شبہ ہے وہ یہ کہ اس میں تائبات کا لفظ عابدات پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا

ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیوں کہ آیت میں اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں اور وہ یہ ہے مسلمات مومنات قانتات ترتیب کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ چوتھا مرتبہ تائبات کا ہے توبہ کا اعمال اول ہونا جب مستفیض ہوتا جب کہ آیت التائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التائبات ہوتا اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے تشریح کر دی ہے کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنے یہ ہیں کہ بجز ایمان واسلام کے سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے ان کے بغیر تو اعمال کیسے بھی اچھے ہوں مگر ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ سلطان کی امداد بھی کرتا ہے اور رفاہ عام کے کام بھی بہت کرتا ہے مگر ہے باغی تو یہ کام اس کے بیکار ہیں اسی طرح ایمان واسلام ہے کوئی عمل بدوں ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی اب ایک شبہ اور ہے کہ مسلمات اور مومنات کا تقدم تو تائبات پر صحیح ہو گیا مگر آیت میں ایک لفظ قانتات بھی تائبات پر مقدم ہے جس سے توبہ کا اول ہونا پھر باطل ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت فعل قلب ہے یہ بھی توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جبھی ہوگی جبکہ قنوت ہے کیونکہ جب تک نرمی جھک جانا عجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہو گیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے۔ اس واسطے قانتات کو بھی اس آیت میں تائبات پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول الاعمال ہونے کا کہ اعمال مامور بہا میں سے جن اعمال پر توبہ مبنی نہیں ان سے مقدم توبہ ہے سو قنوت چونکہ توبہ کی شرط عقلی ہے لہٰذا وہ تو توبہ پر مقدم ہوئی ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی طاعت صحیح نہ ہوگی۔ بلا توبہ کے گو بعض افراد توبہ کے ایسے بھی ہیں جو شرط صحت ہیں تمام اعمال کے لئے اور وہ توبہ عن الکفر ہے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ بلا اس کے کوئی عمل بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

توبہ عن المعاصی شرط کمال ہے

لیکن باقی افراد توبہ کے یعنی توبہ عن المعاصی[۱] محققین کے نزدیک شرط کمال ہیں یعنی نورانیت کسی عمل کی بلا اس کے نہیں ہوتی گو عمل قبول ہو جائے جیسے ایک باورچی ہو کہ وہ آقا کی نافرمانی کرتا ہے اور آقا اس سے کشیدہ ہے لیکن آقا مخیّر ایسا ہے کہ کھانا اس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھا لیتا ہے۔ یہ صفت رحم اور عفو کی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آقا دل میں کشیدہ ہے۔ اور خود باورچی کا دل بھی رکا ہوا ہے کھانا کھلاتا ہے مگر کھل کر بات بھی نہیں کر سکتا اور جب یہ ہے کہ جب اس کو محبت ہو آقا سے ورنہ اگر ضابطہ کا نوکر ہے تب تو غیرت چہ کنی است کہ پیش مرداں بیاید[۲] اس کو اپنی نوکری پوری کرنے کا خیال ہوگا آقا انبساط[۳] کے ساتھ کھانا کھائے یا انقباض کے ساتھ اسے تنخواہ لینے سے مطلب خیر ایسے آدمی کا تو ذکر نہیں ذکر اس کا ہے جو غیرت اور محبت ہو سو ایسا شخص آقا کے سامنے غیر

---

۱ گناہوں سے توبہ ۲ غیرت کیا کہتی ہے کہ آدمیوں کے سامنے آئے ۳ خوشی

مطیع ہونے کی حالت میں خدمت میں حلاوت اور انبساط اور شگفتگی اور راحت فرحت اور نشاط بدوں توبہ اور تقصیرات کے معانی ملے ہوئے نہیں پاسکتا اور یہ بات ثابت ہے کہ خدمت اس کی ویسے بھی قبول ہوگئی جیسے آقا نے کھانا کھا تو لیا ہے اور پھینک نہیں دیا اس کو یہ حکم نہیں کیا کہ توبہ کر کے پھر دوبارہ پکاوے اور اس نفس عمل کی مقبولیت پر نص موجود ہے میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں۔ من یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ' (پس جو شخص ذرا برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) اس میں حق تعالیٰ نے شرط نہیں کی توبہ کی برخلاف اس کے ایمان کو بہت جگہ شرط بنایا ہے صحت اعمال کے لئے اور توبہ عن المعاصی کو کہیں شرط نہیں کیا۔

بلا توبہ کے عمل میں نورانیت نہیں ہوتی

جس سے یہ حاصل ہوا کہ نفس عمل تو قبول مگر نورانیت اس میں نہیں ہوسکتی اور اسی نورانیت نہ ہونے کو بعض نصوص میں حبط سے تعبیر فرمادیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے من فاتته صلاۃ العصر فقد وترا اهله وماله (جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہوگئی تو گویا اس کے اہل وعیال تباہ ہوگئے۔) اور ایک روایت میں اس کی تفسیر ہے حبط عمله (یعنی اس کے اعمال ہی ضائع ہوگئے۔) اور حبط عمل ظاہراً خاصہ کفر ہے مگر یہاں ایک عمل فرعی کو بھی حابط فرمایا اسی طرح اور بعض اعمال کو بھی حابط فرمایا ہے۔ (اول الاعمال ملحقہ مواعظ راہ نجات)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت کے بعد گمراہ کردے جب تک کہ ان کے لئے مایتقون کو بیان نہ کردے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

ایک شبہ کا جواب

اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ حنفیہ کے یہاں تو توحید بدوں ارسال رسول کے بھی واجب ہے اور اس کے ترک سے ضلال وعذاب کا وقوع ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ یہاں پر یبین فرمایا ہے یوحی تو نہیں فرمایا اور بیان ارسال رسول پر موقوف نہیں عقل سے بھی ہوسکتا ہے پھر اس کے متعلق بعض فروع ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی شخص کی عقل کامل نہ ہو اور وہ مجنون ومعتوہ بھی

نہیں لیکن اس کی عقل تنہا بدوں رسول کے توحید کے پہچاننے کو کافی نہیں اس کو عذاب ہوگا یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ بعض اس طرف گئے ہیں کہ ایسے شخص کو عذاب نہ ہوگا گو وہ عاقل ہے مگر قلت عقل کی وجہ سے معذور ہے اور بعض نے کہا کہ عذاب ہوگا اور یہ مسئلہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (پ۱۵) کے معارض نہیں کیونکہ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اس میں عذاب دنیا مراد ہے اور گفتگو عذاب آخرت میں ہے گو یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ نفی عذاب دنیا بدرجہ اول مستلزم ہے نفی عذاب آخرت کو کیونکہ عذاب دنیا اہون ہے جب بدوں بعث رسل کے عذاب دنیا نہیں ہوتا تو عذاب آخرت بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا اور جواب ثانی یہ ہے کہ یہاں رسول عام عقل کو بھی اور پیغمبر کو بھی یہ مسئلہ کے چند فروع ہیں ان کے علاوہ اور بھی فروع ہیں مگر میں نے اجمالاً اشارہ کر دیا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

ترجمہ: بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی وہی جلاتا اور مارتا ہے اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار۔

تفسیری نکات

احکام تکوینیہ وتشریعیہ کا پورا اختیار حق سبحانہ وتعالیٰ کے قبضہ میں ہے

إِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ سے ثابت ہوا کہ احکام تشریعیہ کے مقرر کرنے کا حق تعالیٰ کو پورا اختیار ہے کیونکہ وہ صاحب سلطنت ہیں اور اسی سے دوسرا مقدمہ یہ مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو احکام تکوینیہ کے مقرر کرنے کا بھی پورا اختیار ہے کیونکہ إِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ہر قسم کے احکام کو عام ہے تشریعیہ کو بھی اور تکوینیہ کو بھی مگر کوئی شاید عموم کو تسلیم نہ کرے کیونکہ عموم وخصوص کا سمجھنا مجتہد ہی کا کام ہے مگر اس آیت میں ایک جملہ ایسا موجود ہے جس سے آیت کا عموم واضح ہو گیا اور وہ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ ہے کیونکہ احیاء وامات تو احکام تکوینیہ ہی سے ہیں۔

تمام غموم وافکار کا علاج

اس آیت میں تمام غموم وافکار کا علاج بتلایا ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر طرح تصرف کا حق ہے تم کو کسی تجویز کا کوئی حق نہیں تو اس آیت میں ہم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم کو تشریعیات کو تکوینیات کے مطابق کوئی تجویز اپنی طرف سے نہ کرنا چاہئے۔

وہ جب چاہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں تم کو اس میں دخل در معقول کا کوئی حق نہیں یہی تعلیم ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اس پر عمل کرنے سے غم کی جڑ ہی کٹ جائے گی ہاں طبعی غم ہوگا مگر وہ دیر پا نہیں ہوتا اور طبعی غم بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں حکمتیں ہیں ہمارے لئے بڑی حکمت یہ ہے کہ غم سے شکستگی کی شان پیدا ہوتی ہے جس سے تکبر و غرور وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں ہیں۔

غرض اولاد کو بھی خدا تعالیٰ کی چیز سمجھو کہ اس کی امانت چند روز ہمارے پاس ہے پھر اس کے فوت ہونے پر زیادہ ملال نہ ہوگا۔

ربط آیات

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ میرے خیال میں اس کا ربط وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ (پ۱۱) سے بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ جملہ آیت سابقہ کے مضمون کی دلیل ہے کہ تم کو قبل نہی کے استغفار کرنے سے گناہ اس لئے نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست یا مددگار نہیں ہے اور یہ بات محبت وولایت کے خلاف ہے کہ نہی سے پہلے کسی فعل کے ارتکاب پر عذاب کیا جائے گا یا گناہ کی فرد جرم قائم کی جاوے نیز اس میں ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو کسی کے گھمنڈ پر مناہی کا ارتکاب کرے کہ ہم فلاں کی شفاعت یا استغفار سے بچ جائیں گے۔

جواب کا حاصل یہ ہوا کہ خدا کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں دوست نہیں اس لئے کسی دوسرے کے بھروسہ اور گھمنڈ پر گناہوں کا ارتکاب نہ کرنا چاہئے۔ مگر اس سے شفاعت کی نفی لازم نہیں آتی کیونکہ شفاعت تو خدا تعالیٰ کے اذن سے ہوگی۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (پ۳) تو اجازت اسی شخص کے متعلق ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ خود بخشنا چاہیں گے اور جس کی ولایت ونصرت وہ نہ چاہیں گے اس کے لئے اذن شفاعت ہی کیوں دیں گے۔ نیز اس آیت میں اس شبہ کا حکیمانہ جواب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو اور مسلمانوں کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ ان کو استغفار کرنے دیتے اور خود استغفار کو قبول کرتے یا نہ کرتے۔ اس کا حکیمانہ جواب اس طرح دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست ومددگار نہیں پس تم بھی دوستی اسی سے کرو جو خدا کا دوست ہو اور جو خدا کا دشمن ہو اس سے دشمنی کرو پس کفار سے دوستی نہ کرو اور استغفار بھی اسی کی فرد ہے۔ اس لئے کفار کے واسطے استغفار ہرگز نہ کرو کیونکہ اعداء اللہ ہیں تم بھی ان سے عداوت ظاہر کرو

غرض یہاں تین مضمون تھے یعنی نہی عن الاستغفار بحیثیت حاکمیت ونہی عن الاستغفار بحیثیت حکمت وعدم تاثیم قبل النہی تینوں پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ۱۱) بے شک اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی۔

اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ اس جگہ یہ سوال ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ وصحابہ کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ یوں ہوتا ہے کہ وہ استغفار کرتے رہتے پھر اللہ تعالیٰ چاہے اس کو قبول کرتے یا نہ کرتے اور مشرکین کو بخشتے یا نہ بخشتے اس سوال کا جواب اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ میں دیا گیا ہے اور جواب حاکمانہ ہے کہ ہماری سلطنت آسمانوں اور زمینوں میں ہے اس لئے ہم کو حق ہے کہ تم کو استغفار سے روک دیں۔

مالکیت اور ملکیت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ یعنی مالک بھی وہی ہے ملک بھی انہی کا ہے یہاں ملک سے ملک کامل مراد ہے جس کے ساتھ ملک بھی جمع ہو کیونکہ بدوں اس کے ملک ناقص ہے اور خدا نقصان سے بری ہے اسی لئے ملک یوم الدین میں مالکیت اور ملکیت دونوں کو جمع کیا گیا ہے دونوں قراءتوں میں اور قراء تین بمنزلہ آیتین کے ہیں۔

ہر ایک کا مفہوم ثابت کرنا لازم ہے کیونکہ ضرورت دونوں کی ہے ایک جہت سے ملکیت میں قوت ہے اور ایک جہت سے مالکیت میں اس لئے مقصود دونوں کو جمع کرنا ہے اسی لئے میں نے کہا کہ یہاں ملک سے مراد ملک کامل ہے یا یوں کہو کہ لام لہ میں ملک کے لئے ہے تو مالک ہونا اسی سے ثابت اور ملک ہونا لفظ ملک سے ثابت اور ایک آیت میں دو قراءتوں کو ایک ساتھ عمل میں جمع کرنا فقہا کے عمل سے ثابت ہے۔

چنانچہ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ میں فقہا نے دونوں قراءتوں کو جمع کر کے احکام مستنبط کئے ہیں اسی طرح میں نے وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ میں دونوں قراءتوں کو جمع کیا ہے کہ دونوں کے مجموعہ کا مطلب یہ ہوا کہ پیروں کو مل مل کر دھویا کرو کیونکہ ان پر پانی بہالینا عموماً کافی نہیں ہوتا۔ اسی لئے فقہا نے دلک کو مطلقاً اور دلک رجلین کو خصوصاً مستحب کہا ہے اسی طرح مالک یوم الدین میں دونوں کو جمع کیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ مالک بھی ہیں ملک بھی ہیں۔

تو اب جہاں اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ملک مطلق آیا ہے وہاں یہی مجموعہ مراد ہوگا ورنہ محض ایک کے اعتبار میں نقص لازم آتا ہے اور یہی نکتہ ہے مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ میں دو لفظوں کے جمع کرنے میں کیونکہ ولی دوست کو کہتے ہیں خواہ وہ نصرت پر قادر ہو یا عاجز ہو اور نصیر مددگار و معاون کو کہتے ہیں خواہ دوست ہو یا نہ ہو اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر کے بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کو تم سے تعلق بھی ہے اور وہ تمہاری نصرت و اعانت پر بھی قادر ہیں اور اس مضمون کو صیغہ حصر کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی یار و مددگار نہیں اس حصر میں اس طرف اشارہ ہے کہ بس اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق رکھو اور کسی سے بالذات تعلق نہ رکھو۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

ترجمہ: اوران تین شخصوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب (ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ) زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ (اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے) پھر ان کے حال پر (بھی خاص) توجہ فرمائی تا کہ وہ آئندہ بھی رجوع رہا کریں بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان پر بہت ہی شفیق مہربان ہے۔

تین صحابہؓ کا واقعہ توبہ

اس آیت میں ان حضرات کی توبہ قبول ہونے کی بشارت بھی دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کی دردناک حالت کو بھی بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان تین صاحبوں کی توبہ بھی قبول کر لی جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان کے اوپر زمین باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہوگئی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے تو حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور دوبارہ ان کے حال پر توجہ کی تا کہ وہ آئندہ بھی ایسے مواقع میں توبہ کرتے رہیں بیشک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان ہیں حضرت کعبؓ کی اس بات پر کہ مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس حالت میں اگر مر گیا تو حضور ﷺ میری نماز نہ پڑھیں گے حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب کی ایک تقریر یاد آئی مولانا نے حدیث سوال قبر کے اس جملہ کی شرح میں کہ میت سے پوچھا جائے گا من ھذا الرجل یہ کون صاحب ہیں اور بعض اہل کشف کے اس قول کی حکمت میں کہ قبر میں حضور ﷺ کی صورت ہر شخص کے سامنے پیش کی جائے گی اور دکھلا کر سوال کیا جائے گا کہ یہ کون صاحب ہیں مسلمان تو صورت دیکھتے ہی تعلق قلبی کی وجہ سے پہچان لے گا اور بے ساختہ کہے گا **ھذا محمد نبینا جآئنا با لبینت و الھدی**

کہ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ ہیں جو ہمارے پاس معجزات و ہدایات لے کر تشریف لائے تھے یہ فرمایا کہ دراصل ہماری محبت کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہم سب حضور ﷺ کے سامنے مرتے اور حضور ﷺ ہمارے جنازے کی نماز پڑھتے مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ صورت مقدر نہ ہوئی تو اب کم از کم محبت کا یہ اثر تو ہونا چاہئے کہ حضور ﷺ ہماری قبر ہی میں تشریف لائیں گے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو۔

تفسیری نکات

اس آیت کے دو جزو ہیں۔

اعجاز قرآن

۱- اتَّقُوا اللَّهَ ۲- كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ دو جملوں میں دریا کو بھر دیا چنانچہ ابھی تفصیل معلوم کر لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان دو جملوں میں کتنے بڑے مضمون کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے قرآن کے جملوں کی تفسیر مختلف عنوانات سے ہو سکتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت میں بھی کسی مفسر نے دوسرا عنوان اختیار کیا ہو مگر وہ اختلاف محض عنوان ہی کا ہوتا ہے معنوں میں ایک ہوتا ہے اس آیت کے معنی جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہیں کہ اتقوا اللہ میں مقصود کا ذکر ہے اور كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ میں اس مقصود کے طریق کا ذکر ہے کیونکہ جن لوگوں نے قرآن کو بنظر غائر دیکھا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ قرآن میں مقاصد کے ساتھ طرق کا ذکر بھی اکثر فرمادیا کرتے ہیں اور یہ ان کی غایت شفقت ورحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کسی بات کا حکم فرما کر حیران وپریشان نہیں چھوڑتے بلکہ اس کا طریق بھی ساتھ کے ساتھ بتلا دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح سے ہوگا یہ طریقہ اختیار کرو اس عادت پر نظر کر کے میرا ذوق یہ بتلاتا ہے کہ اس آیت میں بھی جملہ اولیٰ میں مقصود کا بیان ہے اور ثانیہ میں طریق کا، یعنی تقویٰ مقصود ہے اور معیت صادقین اس کے حصول کا طریق ہے بعبارت دیگر یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا امر فرمایا ہے اور معیت کاملین اس کا طریق بتلایا ہے۔

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو

امر تقویٰ

اس میں اول تقویٰ کا امر ہے یہ بات تو اوپر ثابت ہو چکی کہ ہر مقصود میں درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے اب یہ بات ثابت کرنا رہی کہ تقویٰ کمال دین ہے یا نہیں، نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ تقویٰ کا امر اور فضل قرآن میں جس قدر ہے غالباً کسی چیز کا اتنا نہیں۔ اس سے اس کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوا اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تقویٰ کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے ایک ڈرنا دوسرے بچنا،

اور تامل کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو بچنا ہی ہے یعنی معاصی سے، مگر سبب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے۔ جبھی اس سے بچا جاتا ہے۔ تقویٰ کا معنی اول میں استعمال اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً میں ہے اور بچنے کے معنی میں استعمال نصوص کثیرہ میں اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اتقوا النار ولو بشق تمرة، بچو جہنم سے اگر چہ ایک ٹکڑا چھوہارے کا دے کر یہاں بچنے ہی کے معنی بن سکتے ہیں ڈرنے کے معنی نہیں بن سکتے۔

غرض استعمال دونوں معنی میں وارد ہے لیکن اصل مقصود احتراز عن المعاصی ہے اور خوف علی الاطلاق مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ ذریعہ اور سبب ہے احتراز عن المعاصی کا۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اصل مقصود تقویٰ بمعنے احتراز عن المعاصی ہے۔ اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا کمال دین ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس میں ادائے فرائض و واجبات واجتناب عن المحرمات سب داخل ہیں کوئی مقصود شرعی اس سے خارج نہیں، مطلب یہ ہوا کہ نماز بھی پڑھو کیونکہ ترک صلوۃ معصیت ہے۔ زکوٰۃ بھی دو کیونکہ ترک زکوٰۃ معصیت ہے۔ اسی طرح تمام مامورات کا چھوڑنا معصیت ہے تو اس میں مامورات کے ادا کا حکم بھی ہے اور محرمات کے ترک کا بھی، اور کمال دین کے یہی دو اجزاء ہیں تو تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل ایک اور ہے جس سے تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے **الا ان التقوی ههنا و اشار الی صدره**،

رسول ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سن لو تقویٰ یہاں ہے یعنی تقویٰ کا محل قلب ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ دوسری حدیث کو ملا یئے۔

الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله الا و هی القلب

یعنی جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ قلب ہے۔

(اس حدیث سے بعض جاہل صوفیوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس اصل مقصود اصلاح قلب ہے اعمال ظاہرہ کی کچھ ضرورت نہیں، یہ بالکل غلط اور صریح زندقہ ہے اور اس کا غلط ہونا خود اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ جب دل صالح ہوتا ہے تو تمام بدن صالح ہو جاتا ہے اور جب دل بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ظاہرہ صلاحیت قلب و فساد قلب کی دلیل ہیں پس جس شخص سے اعمال صالحہ صادر ہوں یہ اس کے قلب کی صلاحیت کی دلیل ہے اور جس سے اعمال سیئہ صادر ہوں یہ اس کے

قلب کے فساد کی دلیل ہے پس صلاحیت قلب کے بعد اعمال صالحہ کا ترک ممکن نہیں اور جو شخص اعمال صالحہ کو ترک کر کے صلاحیت قلب کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے پس یہ مسلم کہ اصل مقصود اصلاح قلب ہے مگر وہ اعمال صالحہ کی مداومت اور اعمال سیئہ سے اجتناب سے متفق نہیں ہوسکتی ہے لہذا اعمال ظاہرہ ہرگز بیکار نہیں (فافہم ۱۲ جامع)

اس حدیث سے اصلاح قلب کا صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہے اور پہلی حدیث سے یہ معلوم ہو چکا کہ تقویٰ کا اصل محل اور موصوف قلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تقویٰ سے اول اصلاح قلب کی ہوتی ہے تو ان دونوں مقدموں سے تقویٰ کا مستلزم صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہو گیا اور صلاحیت کاملہ یہی کمال دین ہے۔ پس یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ تقویٰ کمال دین ہے اور (قلب کو محل تقویٰ اس حدیث میں اس لئے فرمایا کہ تقویٰ بمعنے الاجتناب عن المعصیت کا سبب خوف خداوندی ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کا اصلی محل قلب ہے) یہاں تک جملہ اولیٰ کے متعلق کلام تھا۔

صادقین کی تشریح

دوسرے جملہ کی بابت میں نے یہ کہا تھا کونوا مع الصدقین بیان ہے۔ مقصود مذکور کے طریق کار کہ حاصل اس کا معیت مع المتقین ہے۔ پس صادقین اسی کا ایک عنوان ہے اور متقی کے معنی کاملین فی الدین کی معیت ہے پس صادقین کے بھی وہی معنی ہوں گے یعنی کمال فی الدین کا طریق کاملین فی الدین کی معیت ہے پس کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کی توجیہ کونوا مع الکاملین ہوئی ہے کیونکہ صادقین سے معنی مشہور صادقین فی القول مراد نہیں بلکہ راسخ فی الدین مراد ہیں۔ جیسے ہمارے محاورہ میں بھی پکے آدمی کو سچا کہتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو صدیق فرمایا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا اور اسی صدیقیت کا درجہ بعد نبوت کے ہے پھر شہداء و صالحین کا درجہ چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اسی ترتیب سے ان درجات کو بیان فرمایا ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا

اور رسوخ فی الدین بھی کمال فی الدین ہے پس مع الصدقین کی توجیہ مع الکاملین ثابت ہوگئی نیز اس کی دلیل ایک اور آیت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لیس البران تولوا وجوھکم بلکہ یہ آیت اتفاق سے میرے دونوں دعوؤں کو ثابت کر رہی ہے یعنی اس سے تقویٰ اور صدق دونوں کے معنی کمال دین ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ

بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

کچھ ساری خوبی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف لیکن (اصل خوبی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی (ذات وصفات) پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور (سب) کتب (سماویہ) پر بھی اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو اور دوسرے غریب محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کرلیں اور وہ لوگ مستقل مزاج رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آ گیا ہے دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا پس یہ اوصاف کمال دین کو متضمن ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان اوصاف سے متصف ہیں وہی صادق اور وہی متقین ہیں۔ اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت کمال دین ہونا ثابت ہوگیا۔

تفسیر آیت البر

اس آیت میں تمام اجزاء دین کا ذکر آ گیا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں۔

ا۔عقائد ۲۔اعمال ۳۔اخلاق

اور تمام جزئیات انہی کلیات کے تحت میں داخل ہیں اور اس آیت میں اقسام ثلثہ کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت منجملہ جوامع کلم کے ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ ' بر کے معنی بھلائی کے ہیں اور لام عہد کا ہے۔ معنی یہ ہوئے **لیس البر الکافی أن تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب** یعنی مشرق و مغرب کی طرف نماز میں منہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے کہ اسی پر قناعت کرلی جائے اس توجیہ سے یہ اشکال رفع ہوگیا کہ استقبال قبلہ بھی تو مامور بہ شرعاً اور مامور بہ شرعی کا بر ہونا لازم ہے پھر اس کی نسبت لیس البر کیوں فرمایا۔ اس اشکال کے جواب لوگوں نے مختلف وجوہ سے دیئے ہیں لیکن جو توجیہ میں نے بیان کی ہے یہ بہت آسان ہے اور یہ توجیہ اسی وقت سمجھ میں آئی ہے۔ حاصل اس کا

یہ ہے کہ اس میں استقبال سے مطلق خیریت کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے بر کافی ہونے کی نفی مراد ہے۔

رہا یہ کہ اس مضمون کی اس جگہ ضرورت کیا تھی۔ استقبال مشرق و مغرب سے بر کافی کی نفی کیوں کی گئی۔ سو بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تحویل قبلہ کا مسئلہ مذکور ہوا ہے۔ جس میں کفار و مشرکین نے بہت شور و غل کیا تھا اور اس وقت ان کی تمام تر بحث اسی میں رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کا بھی عجب دین ہے کبھی کسی طرف منہ کرتے ہیں کبھی کسی طرف' تو حق تعالیٰ ان کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ تم تو اس بحث میں ایسے پڑ گئے کہ گویا مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا کوئی بڑا مقصود ہے۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں بلکہ شرائط و وسائل مقصود میں ہے پس یہ حماقت ہے کہ مقاصد کو چھوڑ کر غیر مقاصد کی بحث پر اکتفا کر لیا جاوے۔ مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا یہ بر کافی نہیں بلکہ بر کافی وہ ہے جس کا آگے بیان آتا ہے اس کا اہتمام کرو۔

مشرق و مغرب کے ذکر میں نکتہ

مشرق و مغرب کی تخصیص ذکر میں ایک نکتہ کی وجہ سے ہے اس سے قبلہ کا مشرق و مغرب میں منحصر کرنا' مقصود نہیں کیونکہ جن لوگوں سے مکہ معظمہ کا رخ جانب شمال میں ہے ان کا قبلہ شمال ہے۔ اور جس جگہ سے مکہ کا رخ جنوب میں ہے اس جگہ کا قبلہ سمت جنوب ہے چنانچہ مدینہ والوں کا قبلہ جنوب ہے اسی لئے حدیث میں اہل مدینہ کو فرمایا گیا ہے ولکن شرقوا او غربوا کہ استنجا کے وقت تم لوگ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کیا کرو اس سے معلوم ہو گیا کہ قبلہ مشرق و مغرب میں منحصر نہیں پس اس جگہ مشرق و مغرب کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے کہ تمام جہات میں سے یہی دونوں جہتیں عرفاً زیادہ مشہور ہیں جب ان کا غیر مقصود ہونا بیان کر دیا تو دوسری جہات کا مقصود نہ ہونا بھی اس سے واضح ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی جہت میں امتیاز بوجہ تقابل حسی کے زیادہ محسوس ہے۔ پس اولاً و بالذات انہی دو جہات کا علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری جہات کا علم ان کے واسطے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی جہت کا سمجھنا شمال و جنوب کے جاننے پر موقوف نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ مشرق وہ جہت ہے جدھر سے آفتاب نکلتا ہے اور مغرب وہ ہے جدھر آفتاب ڈوبتا ہے اور شمال و جنوب کی معرفت بدوں مشرق و مغرب کے نہیں ہو سکتی چنانچہ شمال و جنوب کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونے سے داہنے ہاتھ کی سمت جنوب ہے اور بائیں ہاتھ کی سمت شمال ہے پس یہ دونوں جہتیں اصل ہوئیں اور جنوب و شمال ان کی فرع ہیں اور ظاہر ہے کہ اصل کے غیر مقصود ہونے سے فرع کا غیر مقصود ہونا خود ہی سمجھ میں آ جاتا ہے علاوہ ازیں یہ کہ شریعت میں قلیل انحراف مفسد صلوۃ نہیں تو مشرق و مغرب جن کا قبلہ ہے وہ اگر قدرے شمال و جنوب کی طرف مائل ہو جاویں نماز فاسد نہ ہو گی اس طرح گویا مشرق و مغرب میں شمال و جنوب بھی آ گئے۔

پس مطلب صرف یہ ہے کہ کسی جہت کی طرف بھی منہ کرنا بر کافی نہیں بلکہ بر کافی وہ ہے جس کا آگے ذکر ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الخ' یہاں دونوں جہتیں جائز ہیں ایک یہ کہ مسند الیہ کی جانب میں مضاف کو مقدر کیا جائے۔ ولکن ذرا البر من امن باللہ الخ' ایک یہ کہ مسند کی طرف مضاف مقدر مانا جاوے یعنی ولکن البر بر من امن باللہ الخ' اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔

عقائد کا بیان

خواہ یہ کہا جائے کہ بھلائی کافی اس شخص کی بھلائی ہے یا کافی بھلائی والا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ذات وصفات کے متعلق جس قدر احکام ہیں سب آ گئے۔ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے میں جزاوسزاوحساب وکتاب وجنت ودوزخ وغیرہ کے سب احکام آ گئے۔ والملئکۃ اور فرشتوں پر ایمان لائے یعنی ان کے وجود کا قائل ہو اس میں تمام مغیبات داخل ہیں اور فرشتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ شریعت کے معلوم ہونے کا مدار و واسطہ ملائکہ ہی ہیں والکتب اور کتاب پر ایمان لائے یہاں کتاب بصیغہ مفرد لایا گیا ہے حالانکہ کتب سماویہ متعدد ہیں اور ایمان لانا سب پر واجب ہے (گو عمل منسوخ پر جائز نہیں) اور اسی وجہ سے دوسری آیتوں میں صیغہ جمع اختیار کیا گیا ہے۔ کل امن باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ الخ' لیکن یہاں صیغہ مفرد اختیار کرنے میں اشارہ ہے ایک امر کی طرف وہ یہ کہ قرآن ایسا جامع ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ پر حاوی ہے اس لئے اس پر ایمان لانا گویا سب پر ایمان لانا ہے یا یہ کہا جاوے کہ کتب سماویہ میں سے ہر کتاب دوسری کتاب پر ایمان لانے کا امر کرتی ہے پس وہ سب مل کر بمنزلہ کتاب واحد کے ہیں ان سب پر ایمان لانا بمنزلہ کتاب واحد پر ایمان لانے کے ہے (اور جو شخص ایک کتاب کو مان کر دوسری کا انکار کر دے وہ حقیقت میں پہلی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتا) لیکن یہ حکم ایمان کا ہے اور عمل کرنا سب کتابوں پر جائز نہیں بلکہ عمل صرف مؤخر پر ہوگا کیونکہ وہ مقدم کے لئے ناسخ ہے والنبیین اور پیغمبروں پر ایمان لائے یہاں تک تو امہات عقائد مذکور ہیں آگے اخلاق واعمال کا ذکر ہے۔

اعمال شرعیہ کی اقسام

اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ طاعات دیانات دوسرے معاملات (معاملات کی پھر دو قسمیں ہیں ایک متعلق اموال کے دوسرے متعلق غیر اموال کے ہیں۔ ان میں نکاح وطلاق وعتاق وحدود وغیرہ داخل ہیں) اور دیانات کی بھی دو قسمیں ہیں ایک طاعات بدنیہ دوسرے طاعات مالیہ' اسی طرح اخلاق کی دو قسمیں ہیں حسنہ وسیئہ' اخلاق حسنہ کے ساتھ موصوف ہونا مقصود شرعی ہے اور اخلاق سیئہ سے خالی ومنزہ ہونا مطلوب

ہے۔عقائد سے آگے ان سب کے اصول مذکور ہیں جن میں طاعات مالیہ کا ذکر مقدم کیا گیا کیونکہ بہت لوگ طاعات بدنیہ میں ہمت والے ہوتے ہیں اور طاعات مالیہ میں ان کا یہ حال ہوتا ہے۔

گرجاں طلبی مضائقہ نیست گرزر طلبی سخن دریں ست

چنانچہ ارشاد ہے وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ اور دیتا ہو مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو' علی حبہ کی ضمیر اگر اللہ کی طرف راجع ہو جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو اس علم اخلاق کا بھی ایک اصل عظیم مذکور ہوگا یعنی مال خدا کے راستہ میں محبت الٰہی کی وجہ سے دینا چاہیئے۔اس میں ایک تو محبت الٰہی کے حاصل کرنے کی تعلیم ہوئی کہ خدا سے محبت پیدا کرنی چاہیئے محض ضابطہ کا تعلق نہ ہونا چاہیئے دوسرے اخلاص کی تعلیم اور ریاونا موری کی ممانعت ظاہر ہوئی کہ مال خرچ کرنے میں کسی کی مدح وثنا وشکریہ وغیرہ کا منتظر نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہونا چاہیئے اور اخلاص بھی اخلاق باطنیہ کا ایک بڑا رکن ہے۔

اگر مرجع ضمیر مال ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ایسا مال جس سے محبت ہو اور دل کو تعلق ہو خدا کے لئے خرچ کر دے اس میں ایک تو خرچ کرنے کا ادب مذکور ہوا کہ اللہ کے واسطے عمدہ مال خرچ کرنا چاہیئے ردی مال نہ دینا چاہیئے دوسرے علم سلوک کا یہ مسئلہ بھی اشارۃً مذکور ہوا کہ محبت مال جو کہ خلیق ذمیم ہے اس کا علاج یہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کردے دو چار بار ایسا کرنے سے حب مال کا مرض جاتا رہے گا۔

ذَوِي الْقُرْبٰى میں تمام قرابت دار داخل ہیں۔بیوی بچے بھی ان میں آ گئے۔جن کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے اور دوسرے غریب رشتہ دار بھی آ گئے جن کو کچھ دیتے رہنا اور ان کا خیال رکھنا مستحب ہے۔

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ' اور یتیموں کو بھی دے اور مسکینوں کو بھی دے اور مسافروں کو بھی' یہ سب صدقات نافلہ ہیں کیونکہ زکوٰۃ کا بیان آگے آ رہا ہے۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ طاعات مالیہ کا ذکر طاعات بدنیہ سے کیوں مقدم ہوا۔اس کا جواب تو میں نے دے دیا کہ بعض طبائع میں بخل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ طاعات بدنیہ کی ہمت خوب کر لیتے ہیں اور مال دینے سے جان چراتے ہیں اس لئے طاعات مالیہ کو اہتماماً مقدم کر دیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ طاعات مالیہ میں سے صدقہ نافلہ کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ پر کیوں مقدم کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے ایسا ضابطہ کا تعلق رکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مفروضہ کے علاوہ اور کچھ خیرات نہیں کرتے۔اس میں گناہ نہیں مگر ضعف تعلق مع الحق کی دلیل ضرور ہے۔اس لئے حق تعالیٰ نے صدقات نافلہ کو زکوٰۃ سے مقدم فرمایا جس سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ زکوٰۃ واجب ہے وہ تو تم ادا کرو ہی گے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ صدقہ خیرات موقع بموقع کرتے رہنا چاہیئے۔

دیکھئے اگر کوئی محبوب یا کوئی بادشاہ ہم سے یہ کہہ دے کہ اس موقع میں تم دو روپیہ خرچ کر دو تو غور کیجئے اس وقت ہمارے دل کی کیا حالت ہو گی کیا ہم دو روپیہ ہی پر اکتفا کریں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ محبوب کو خوش کرنے یا بادشاہ کی نگاہ میں جانثار بننے کے لئے ہم دو کی جگہ دس خرچ کریں گے ورنہ چار تو دے ہی ڈالیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے ضابطہ کا تعلق نہ رکھنا چاہئے۔

اس نکتہ کی وجہ سے صدقات نافلہ کو صدقہ مفروضہ مالیہ سے مقدم کیا بلکہ طاعت بدنیہ یعنی صلوٰۃ سے بھی مقدم کر دیا لیکن بعد میں جب زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو نماز کو اس سے مقدم کیا تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ رتبہ کے اعتبار سے نماز ہی مقدم ہے چنانچہ دیکھ لو ہم نے زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا ہے اور جن صدقات مالیہ کو نماز اور زکوٰۃ سے پہلے بیان کیا ہے وہاں تقدیم کی وجہ محض اہتمام بالشان ہے نہ کہ رتبہ کا زیادہ ہونا رتبہ نماز کا طاعات مالیہ سے بڑھا ہوا ہے اور زکوٰۃ کا رتبہ صدقات نافلہ سے بڑھا ہوا ہے سبحان اللہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ہر چیز کے درجہ کا کتنا لحاظ ہے۔ یہی تو باتیں ہیں جن کی وجہ سے بشر کی عقل اس کلام کو دیکھ کر چکراتی ہے کہ اتنی رعایتیں انسان ہرگز نہیں کر سکتا۔

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ اور مانگنے والوں کو بھی دے اور گردن چھڑانے میں بھی یہ بھی صدقات نافلہ کی ایک فرد ہے اس میں اس قدر تفصیل ضروری ہے کہ دیگر نصوص شرعیہ سے سائلین کا لفظ ان سوال کرنے والوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرتے ہوں جن کا پیشہ سوال نہ ہو گیا ہو جو لوگ مضبوط ہٹے کٹے سوال کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں ان کو دینا جائز نہیں نہ ان کو سوال کرنا جائز ہے۔

وَفِي الرِّقَابِ اور گردن چھڑانے میں یہ قیدیوں اور غلاموں کے متعلق ہے اور اسی کے حکم میں یہ صورت بھی ہے کہ جو شخص قرض کے اندر بندھا ہوا ہو اس کی اعانت کر دی جائے کہ یہ بھی گردن چھڑانے میں داخل ہیں۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے یہاں زکوٰۃ کو نماز سے اصل کے مطابق موخر کر دیا جس کا نکتہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

حقوق العباد کی اقسام

یہاں تک طاعات بدنیہ وطاعات مالیہ کے اصول عظام مذکور ہوئے۔ آگے حقوق العباد کا بیان ہے۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا اور وہ لوگ عہد کو پورا کرنیوالے ہیں جب عہد کر لیتے ہیں ہر چند کہ حقوق العباد میں بعض حقوق ایسے ہیں جو ایفائے عہد سے مقدم ہیں مثلاً قرض کا ادا کر دینا امانت میں خیانت نہ کرنا لیکن اس جگہ حق تعالیٰ نے صرف ایفائے عہد کو بیان فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ لوگ ایسے حقوق العباد کو ادا کرتے ہیں جن کا مطالبہ کرنے والا ان سے کوئی بھی نہیں (کیونکہ ایفائے عہد قضاء لازم نہیں گو دیانۃ بعض

کے نزدیک واجب ہے) تو اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہوگئی کہ جن حقوق کا مطالبہ کرنے والا موجود ہو ان کو تو ضرور ادا کریں گے اور اسی نکتہ کی وجہ سے مواریث میں وصیت کو دین پر مقدم فرمایا ہے اس سے حقوق العباد کا درجہ معلوم ہوگیا کہ جب حق تعالیٰ کو ان حقوق کا بھی اہتمام ہے جس کا مطالب کوئی نہ ہو تو جن حقوق کا مطالب بھی موجود ہو وہ تو کس قدر قابل اہتمام ہوں اور یہاں بطور مثال کے بعض حقوق کا ذکر فرمایا گیا ہے ورنہ حقوق العباد اور بھی ہیں۔ اگرچہ لوگ فقط مال کو حقوق العباد سمجھتے ہیں۔

صبر کی حقیقت اور اس کے اقسام

آگے اخلاق کا ذکر ہے۔ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اور وہ لوگ صبر کرنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال کے وقت۔

ہر چند کہ اخلاق باطنیہ بہت ہیں لیکن حق تعالیٰ نے ان میں سے اس مقام پر صرف صبر کو بیان فرمایا ہے اور اس کے تین مواقع بیان فرمائے ہیں وجہ اس تخصیص کی یہ ہے کہ صبر ایسی صفت ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد بقیہ اخلاق کا حصول خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ صبر کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ عزیز وقریب کے مرنے پر مستقل مزاج رہے یہ بھی صبر کی ایک فرد ہے لیکن صبر کی حقیقت اس سے عام ہے صبر کے معنی لغت میں حبس کے ہیں۔ یعنی روکنا اور یہی معنی شریعت میں بھی ہیں۔ صرف ایک قید زیادہ ہے یعنی **حبس النفس علے ما تکرہ** انسان کا اپنے نفس کو اس کی ناگوار بات پر روکنا اور ناگواری کے اقسام پر شرعاً صبر کی تین قسمیں ہیں۔

صبر کی اقسام

۱۔ صبر علی العمل ۲۔ صبر عن العمل ۳۔ صبر فی العمل

صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا، یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا مثلاً نماز زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا ناغہ ان کو ادا کرتے رہنا۔

صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجالانا، مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ بچہ جی اتنی دیر تک تم سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہئے۔ جب یہ ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو سب اعمال ٹھیک ٹھیک ادا ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو فرائض شرعیہ کی پابندی تو نصیب ہے اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو صبر علی العمل کا درجہ حاصل ہے لیکن اعمال کو بجالاتے وقت وہ ان کے آداب وحقوق کی رعایت نہیں کرتے گڑبڑ کر دیتے ہیں جس

کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صبر فی العمل حاصل نہیں ہوا۔

تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو مانہی اللہ عنہ سے روکنا شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رکنا جن میں سب سے اہم صبر عن الشہوت ہے کہ نفس کے تقاضائے شہوت کو روکا جاوے اور یہ سب سے اہم اس لئے ہے کہ نفس کے دوسرے تقاضے تو ایسے ہیں کہ ان سے اگر نہ روکا جاوے تو بعد میں اس کو خود ہی بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت کا خیال کر کے نفس ان تقاضوں سے خود ہی رک جاتا ہے آگے صبر کے چند مواقع جو مہتم بالشان ہیں بیان فرماتے ہیں۔

فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ ؕ یعنی وہ صبر کرتے ہیں باساء میں اور ضراء میں اور باس کے وقت' ان الفاظ کی تفسیر مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ باساء سے فقر و تنگدستی مراد ہے اور ضراء سے بیماری اور باس سے حرب' لیکن عموم الفاظ پر نظر کر کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باساء سے تو فقر و تنگدستی ہی مراد ہو' جس کا حاصل یہ ہوگا کہ فقر و تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے مخلوق کے مال و دولت پر نظر نہ کرے نہ ان سے کچھ توقع رکھے اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہوگئی۔

اور ضراء سے مطلق بیماری مراد ہو خواہ ظاہری ہو یا باطنی' ظاہری مرض میں تو صبر یہ ہے کہ لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے' خدا سے دل میں تکدر نہ ہو اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہوگئی اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراض قلبیہ کے مقتضا پر عمل نہ کرے۔ اور ہمت سے ان کا مقابلہ کرے۔ مثلاً کسی میں شہوت بالنساء یا بالرجال کا مرض ہے تو اس کے مقتضاء پر عمل نہ کرے اور ہمت کر کے عورتوں اور امردوں کی طرف نگاہ نہ اٹھائے۔ ان سے اختلاط نہ کرے بلکہ بعد اختیار کرے اسی طرح بخل کا مرض ہو تو اس کے مقتضاء پر عمل نہ کرے بتکلف خدا کے راستہ میں مال خرچ کر دیا کرے وعلیٰ ہذا تمام امراض کو اسی پر قیاس کر لیا جاوے۔

اور باس سے مراد مطلق شدت و پریشانی ہو تو یہ تعمیم بعد تخصیص کے ہو جائیگی۔ یعنی فقر و فاقہ اور امراض ظاہریہ و باطنیہ میں بھی ہمت سے کام لے اور اسی طرح جو پریشانی بھی لاحق ہو اس میں مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے پس اب صبر کا حاصل یہ ہوا کہ موحد کامل بن جانا چاہئے جس کی یہ شان ہوتی

موحد چہ برپائے ریزی زرش	چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس	ہمیں ست بنیاد توحید و بس

جب مقام صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے ان تمام اجزاء شریعت کو بیان فرما کر آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ یہی لوگ ہیں جو صادق ہیں اور یہی

لوگ متقی ہیں یہ جملہ گویا بمنزلہ مہر کے ہے کہ سارا مضمون بیان فرما کر اخیر میں مہر لگا دی کہ یہی لوگ صادق و متقی ہیں چونکہ تفصیل سابق سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں جو اوصاف مذکور ہیں وہ تمام اجزاء دین کو جامع ہیں تو اب جملہ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ' سے یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ صادق و متقی کامل فی الدین کو کہتے ہیں اور یہ کہ تقویٰ وصدق کمال فی الدین کا نام ہے لہٰذا آیت مذکورہ میں جو میں نے دعویٰ کیا تھا کہ اتقوا اللہ و کونوا مع الصدقین کے یہ معنی ہیں اکملوا فی الدین و کونوا مع الکاملین ' یہ دعویٰ بالکل بے غبار ہو گیا اور قرآن ہی سے اس دعویٰ کی تائید مل گئی۔ (اور ظاہر ہے کہ جس تفسیر کی تائید قرآن کی دوسری آیتوں سے ہو جائے وہ زیادہ اولیٰ ہے)

کامل بننے کا طریقہ

معنے آیت کے یہ ہوئے کہ اے مسلمانوں دین میں کامل ہو جاؤ جس کا طریقہ بھی آگے بتلاتے ہیں کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاملین کے ساتھ ہو جاؤ' صاحبو جو طریقہ کمال حاصل کرنے کا حق تعالیٰ نے بتایا ہے واللہ کوئی سالک کوئی محقق ہرگز نہیں بتلا سکتا یہ بات کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ کاملین کی معیت سے بھی کمال حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاملین کی معیت ہی معیت حصول کمال کے لئے کافی ہے ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص سالہا سال کاملین کے ساتھ رہے اور خود کچھ نہ کرے تو اس کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا حقیقت یہ ہے کہ اصل طریق تو کمال فی الدین حاصل کرنے کا یہ ہے کہ کہ اعمال میں کمال حاصل کرو' اعمال میں کمال حاصل کرنا یہ ہے کہ طاعت کو بجا لاؤ اور معاصی سے اجتناب کرو چنانچہ آیت لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ الخ میں انہی اعمال کو بر کافی فرمایا ہے اور ان کو بیان فرمایا کہ ان لوگوں کو متقی اور صادق ہونا بتلایا ہے جو ان اعمال کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس سے اعمال پر مدار کمال ہونا بخوبی ظاہر ہے۔

صادق کے معنی و تفسیر

اس آیت میں صدق سے مراد محض زبان سے سچ بولنا نہیں ہے کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جس صدق کو کمال دین بتلایا ہے وہ تو ہم کو حاصل ہے کیونکہ ہم سچ بولتے ہیں پس سمجھ لیجئے کہ صدق کے معنی پختگی کے ہیں اور اسی سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال وافعال واقوال میں مرتبہ رسوخ حاصل کر چکتا ہے صدق کے معنی جو اصطلاح لغاۃ و بلغاء میں بیان کئے گئے ہیں مطابقة الخبر للمحکیے عنه' یہ معنی اصطلاح شرعی سے خاص ہیں شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی اقوال کو بھی۔ احوال کو بھی

اقوال کا صدق تو یہی ہے کہ بات پکی ہو یعنی واقع کے مطابق ہو کچی بات نہ ہو جو کہ واقع کے خلاف ہو

جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں۔

افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو حکم شرعی کے خلاف نہ ہو پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔

احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہوں۔ پس جو احوال خلاف سنت ہوں وہ احوال کاذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے موافق ہوتے ہوں اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔

نیز صدق احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا جیسا کہ بعض لوگوں کو کسی وقت خوف کا یا توکل کا غلبہ اپنے اوپر معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا' اس کو صادق الاحوال نہ کہیں گے یہ مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہئے کہ جو حالت طاری ہو وہ بعد میں مقام ہو جائے اس میں سالکین کو بہت دھوکا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ محض وہم سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو تسلیم و رضا یا توکل و رجا کا حال حاصل ہے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا جس سے اس حالت کا ان کا وہم ہونا ظاہر ہو جاتا ہے غرض صدق شریعت میں صرف اقوال کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس سمجھنے سے بہت سے اغلاط میں ابتلا ہو جاتا ہے۔

اب ایک بات یہ رہ گئی کہ جب تقویٰ اور صدق دونوں کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ کا ذکر مقدم اور صدق کو موخر کیوں کیا گیا کیونکہ آیت کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ یوں فرما دیتے' یایھا الذین امنوا صدقوا و کونوا مع المتقین۔

اس کے بھی وہی معنی ہوئے کہ اے مسلمانو' دین کامل حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو' جب یہ مضمون صدق کو مقدم اور تقویٰ کو مؤخر کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا تو پھر تقویٰ کو مقدم کیوں کیا گیا ہے؟

میرے نزدیک اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کے تتبع سے تقویٰ کے تو درجات چند در چند معلوم ہوتے ہیں اور صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے۔

عورتوں اور مردوں کو حکم مشترک

جس طرح مردوں کو کمال دین حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کا حکم فرمایا ہے وہ حکم عورتوں میں بھی مشترک ہے گو خطاب صیغہ کے اعتبار سے بظاہر مردوں کو ہے۔ لیکن حکم مشترک ہے۔ پس کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حق تعالیٰ کو مردوں ہی کی طرف توجہ ہے عورتوں کا اعتناء نہیں ہے یہ وہم پہلے بھی ہو چکا ہے اور منشاء اس وہم کا محبت ہے حدیث میں آتا ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں دیکھتی ہوں

کہ حق تعالیٰ احکام میں مردوں ہی کا ذکر فرماتے ہیں ہمارا (یعنی عورتوں کا) ذکر نہیں فرماتے ازواج مطہرات کو یہ خیال اس لئے بھی ہوا کہ وہ صاحب زبان تھیں عربی زبان کو خوب سمجھتی تھیں اور عربی میں مذکر و مونث کے لئے جدا جدا صیغے استعمال کئے جاتے ہیں تو ان کو تمام احکام میں مذکر صیغے دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ حق تعالیٰ ہم کو خطاب نہیں فرماتے نہ ہمارا ذکر فرماتے ہیں اور ہماری مستورات تو عربی زبان حاصل ہی نہیں کرتیں اور یہ بھی ایک بڑی کمی ہے جس کا افسوس ہوتا ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں عورتیں بھی مثل مردوں کے عربی کی تحصیل کرتی تھیں تو عربی زبان سے ناواقف ہونے کے سبب مذکر و مونث کے صیغوں کا فرق وہ نہیں سمجھ سکتیں اور اگر ترجمہ پڑھیں گی تو اس میں ان صیغوں کا اردو ترجمہ نظر سے گزرے گا اور اردو میں خطاب میں صیغہ مردوں و عورتوں میں مشترک ہے دونوں کے لئے الگ الگ صیغہ موضوع نہیں مثلاً واتقین اللّٰہ واتقوا اللّٰہ کا ترجمہ یکساں ہوگا دونوں جگہ اردو میں یہی بولتے ہیں کہ خدا سے ڈرو خواہ اس کے مخاطب مرد ہوں یا عورتیں اس لئے اوامر ونواہی کے صیغوں میں وہ ترجمہ دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ خطاب خاص مردوں کو ہے لیکن پھر بھی بعض جگہ اردو ترجمہ سے بھی مردوں کی تخصیص سمجھ میں آسکتی ہے مثلاً یا یھا الناس کا ترجمہ ہے اے لوگو اور یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا ترجمہ اے ایمان والو یہ لفظ اردو میں بھی مردوں کے لئے مخصوص ہے عورتوں کو اے لوگوں یا اے ایمان والو کہہ کر ندا نہیں کر سکتے بلکہ اگر ان کو خطاب خاص ہوگا تو اے عورتو! اے ایمان والیو کہا جائے گا پس ہر چند کہ اوامر ونواہی کے صیغوں میں ترجمہ دیکھ کر ان کو تخصیص رجال کا وہم نہیں ہوسکتا مگر ندا کے صیغوں میں ان کو بھی وہم ہوسکتا ہے اور ازواج مطہرات تو اس فرق کو خطاب کے مواقع میں بھی سمجھتی تھیں اس لئے ان کو غایت محبت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہائے اللہ تعالیٰ ہم کو خاص طور پر خطاب نہیں فرماتے جیسا مردوں کو خطاب فرماتے ہیں، دیکھئے وہ عورتیں کیسی تھیں اللہ اکبر! ان کا کیسا مذاق تھا اگر آج کل کی عورتوں جیسی وہ سست اور کم ہمت اور کام چور ہوتیں تو یوں سمجھتیں کہ اچھا ہوا ہم ان احکام سے بچ گئے کیونکہ ان میں تو خاص مردوں کو مخاطب بنایا گیا ہے مگر اس زمانہ میں مستورات کو اس کا وہم بھی نہیں ہوا کہ یہ احکام ہمارے لئے نہیں ہیں بلکہ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ احکام سب کو عام ہیں (بجز چند مخصوص باتوں کے جن کا مردوں کے ساتھ خاص ہونا دوسرے دلائل سے ان کو معلوم ہوگیا تھا اور ایسی خصوصیت عورتوں کے لئے بھی ہے کیونکہ بعض احکام صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہیں مردوں کے لئے نہیں ہیں ان کے علاوہ بقیہ احکام میں جن کا کسی کے لئے خاص ہونا دلائل سے معلوم نہ ہوا تھا انہوں نے یہی سمجھا کہ مردوں اور عورتوں سب کے لئے مشترک ہیں گو لفظاً خطاب خاص مردوں کو کیا گیا ہے ۱۲) اور عموم احکام پر نظر کر کے پھر ان کو یہ تمنا ہوئی کہ جب یہ احکام سب کو عام ہیں تو ان میں ہمارا تذکرہ بھی ہوتا تو اچھا تھا ان کے دل نے اس کو گوارا نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ تمام احکام میں مردوں کے واسطہ ہی سے ان کو خطاب فرمادیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کبھی کبھی ہم کو مردوں سے جدا کر کے بھی خطاب

فرمادیا کریں اور وجہ اس تمنا کی یہ تھی کہ ان کو خدا تعالیٰ سے محبت تھی (اور عاشق کا دل چاہا کرتا ہے کہ اس کا تذکرہ کبھی تو محبوب کی زبان پر آجایا کرے۔

ے ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے ۱۲ جامع)

خدا تعالیٰ کا کسی کو اپنے احکام کا مخاطب بنانا ایک بڑا اشرف ہے جو مردوں کو حاصل تھا تو ازواج مطہرات کو اس کی تمنا ہوئی کہ اس شرف سے ہم بھی محروم نہ رہیں۔

غرض وہ عورتیں دین کی عاشق تھیں وہ اپنے اوپر بوجھ لادنا چاہتی تھیں وہ یہ نہ چاہتی تھیں کہ ہم احکام کے مخاطب نہ بنیں تو اچھا ہے کیونکہ ان کو دین کے ثمرا پر اطلاع تھی اور وہ جانتی تھیں کہ دین کے ثمرات ایسے ہیں کہ ان کے لئے محنت کرنا کوئی چیز نہیں اسی پر یہ آیات نازل ہوئی فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ یعنی احکام میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں جو کوئی بھی عمل کرے مرد ہو یا عورت سب کو اجر ملے گا۔ اور کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ باقی رہی خصوصیت خطاب کی وجہ سو وہ یہ ہے بعضکم من بعض، کہ تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو پس حکم بھی دونوں کا یکساں ہے اس لئے ضرورت جدا خطاب کرنے کی نہیں اس کے بعد بعض جگہ خاص عورتوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جیسے يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ الخ، میں دور تک ازواج مطہرات کو خطاب ہے اور وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ میں سب مسلمان عورتوں کو ایک خاص حکم کا مخاطب بنایا گیا ہے اس سے اس وہم کا ازالہ من کل الوجوہ ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ مردوں کی طرح حق تعالیٰ کو عورتوں پر بھی عنایت ہے اور بعض جگہ مذکر و مونث کے دونوں صیغے مخلوط لائے گئے ہیں۔

قرآن اور ذکر نسواں

چنانچہ اس آیت میں إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ: بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے

والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے اس آیت میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر دوش بدوش کیا گیا ہے (اور عورتوں کی تمنا کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ صرف عورتوں ہی کا ذکر ہوتا' مردوں کا ذکر ان کے ساتھ مخلوط نہ کیا جاتا مگر اس خلط میں اشارہ ہو گیا جواب کی طرف چونکہ اکثر احکام مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں چنانچہ یہی احکام دیکھ لو کہ ان میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں اس لئے عورتوں کا ذکر جدا کرنے کی ضرورت نہیں جو احکام مردوں کے لئے ہیں وہی عورتوں کے لئے ہیں ۱۲ جامع)

رہی یہ بات کہ ہر جگہ ایسا ہی کیوں نہ کیا گیا جیسا اس آیت میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے اس کی دو وجہ ہیں ایک وجہ تصحیح کی' اور ایک وجہ ترجیح کی تصحیح کی وجہ تغلیب ہے تغلیب کے معنے یہ ہیں کہ ایک نوع کو دوسری نوع پر غلبہ دے کر ایک کو ذکر کر کے دونوں کا ارادہ کر لیا جائے ۱۲ جامع) مثلاً باپ ماں کو والدین یا ابوین کہا کرتے ہیں اسی طرح اہل عرب چاند اور سورج کو قمرین کہہ دیتے ہیں حالانکہ ابوین کا لفظی ترجمہ ہے دو باپ اور قمرین کا ترجمہ ہے دو چاند ظاہر میں باپ ماں کو ابوین کہنا غلط معلوم ہوتا ہے ان کو اب و ام کہنا چاہئے اسی طرح چاند اور سورج کو قمرین کہنا بھی بظاہر غلط ہے ان کو شمس و قمر کہنا چاہئے۔ لیکن چونکہ اس طرح عبارت طویل ہو جاتی ہے اس لئے اہل زبان اب و ام کی جگہ تغلیباً بغرض اختصار ابوین اور شمس و قمر کی جگہ قمرین کہہ دیتے ہیں اسی طرح اگر قرآن میں مردوں اور عورتوں کے لئے جدا جدا صیغہ استعمال کیا جاتا تو کلام میں طول ہو جاتا اس لئے تغلیباً صیغہ مذکر ہی میں مونث کو بھی داخل کر لیا گیا جس سے کلام میں اختصار پیدا ہو گیا البتہ ایک دو جگہ عورتوں کے وہم مذکور کو دفع کرنے کے لئے ان کے واسطے جدا صیغے بھی استعمال کئے گئے تا کہ ان کی تسلی ہو جائے اور اتنی مقدار سے ایجاز کلام بھی فوت نہیں ہوتا۔

درجات مرد و زن

اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں تابع ہیں مردوں کی ہر طرح سے خلقت کے اعتبار سے بھی چنانچہ آدم علیہ السلام کے ایک جزو سے حوا علیہا السلام کی پیدائش ہوئی ہے۔

یعنی حق تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی میں سے کوئی مادہ نکالا پھر اس مادہ سے حوا علیہا السلام کو پیدا کیا جس کا اثر یہ ہے کہ عورتیں عموماً مردوں سے خلقۃً کمزور ہوتی ہیں ان کے تمام قویٰ جسمانی اور دماغی مردوں کے برابر نہیں ہوتے نیز تربیت کے اعتبار سے بھی وہ مردوں کے تابع ہیں چنانچہ کمانا اور کھیتی کرنا تجارت کرنا محنت و مشقت کے کام کرنا مردوں کے متعلق ہے اور پکانا کھانا عورتوں کے متعلق ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی اصل یہ ہے کہ وہ پردہ دار ہوں اور تعلقات انتظامیہ کے لئے پردہ مانع ہے اس لئے امور انتظامیہ ان کے متعلق نہیں ہو سکتے انتظام کا تعلق مردوں ہی سے ہو سکتا ہے اس وجہ سے تمام تر تعلق انتظام کا مردوں کے سپرد کیا گیا پس جہاں دیگر انتظامات ان کے متعلق ہیں وہاں عورتوں کی اصلاح کا انتظام بھی مردوں کے سپرد کیا گیا اور

جب مردوں کے متعلق عورتوں کی اصلاح کا انتظام ہے تو وہ ان کے سردار ہوئے اور یہ قاعدہ ہے کہ سلطنت کی طرف سے جو احکام صادر ہوا کرتے ہیں ان کے مخاطب سردار ہوتے ہیں رعایا کو مخاطب نہیں کیا جاتا نہ اس کی کچھ ضرورت سمجھی جاتی ہے کیونکہ لوگ خود سمجھ لیں گے کہ جب سرداران احکام کے مخاطب ہیں تو چھوٹے بھی ان کے ساتھ ضرور شریک ہیں پھر سردار اپنے ماتحت لوگوں کو ان احکام کی اطلاع بھی کر دیتے ہیں اور ان سے کام بھی لیتے ہیں اسی طرح قرآن میں اکثر مردوں کو احکام کا مخاطب بنایا گیا ہے چونکہ وہ عورتوں پر سردار ہیں تو ان کے مخاطب ہونے سے عورتوں کا ان احکام میں شریک ہونا خود سمجھ میں آ جاتا ہے پھر مردوں کے ذمہ ہے کہ عورتوں کو احکام سے بھی اطلاع کریں اور ان سے کام بھی لیں۔

کیونکہ سرداروں کے ذمہ یہ کام ہمیشہ ہوتا ہے کہ اپنے ماتحت لوگوں کو احکام سلطنت سے مطلع کرتے رہیں اور ان سے کام لیں اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو ان سے بھی باز پرس ہوگی افسوس ہے کہ آج کل مردوں نے یہ بات تو یاد کر لی ہے کہ ہم عورتوں کے سردار ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ سردار کے فرائض کیا ہوتے ہیں وہ نہ تو عورتوں کو احکام سے مطلع کریں اور مطلع کریں کس طرح، سردار صاحب کو خود ہی خبر نہیں اور نہ ان سے کام لیں یعنی جن کو احکام معلوم بھی ہیں اور وہ عورتوں کو احکام سے مطلع بھی کرتے ہیں اور اس کی نگہداشت نہیں کرتے کہ ہمارے گھروں میں ان احکام پر عمل بھی ہو رہا ہے یا نہیں، غرض جو احکام ایسے ہیں جن میں اشتراک کی خاصیت ہے جیسے نماز روزہ وغیرہ ان میں مردوں کو خطاب کافی ہے۔

دین و خواتین

اس تمہید کے بعد یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ اس آیت میں جو کہ میں نے اس وقت تلاوت کی تھی جس طرح حق تعالیٰ نے مردوں کو تکمیل دین کا حکم فرمایا ہے اسی طرح وہ حکم عورتوں کے لئے بھی ہے اور جو طریق کمال دین کے حاصل کرنے کا مردوں کے لئے اس میں مذکور ہے وہ طریق عورتوں کے لئے بھی ہے پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

ترجمہ: اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو (خدا سے ڈرو) اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ

یہ تو اس آیت کا ترجمہ ہے اور پہلے بیان میں اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ تقویٰ اور صدق سے کمال دین مراد ہے۔

پس حاصل یہ ہوا کہ اے مسلمانو! دین میں کمال حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو پس اس میں اولاً حق تعالیٰ نے تکمیل دین کا حکم فرمایا ہے پھر اس کا طریق بتلایا ہے کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ راسخ فی الدین ہیں ان کی صحبت حاصل کرو (احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اس آیت سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جب تک دنیا میں قرآن اور اسلام کا وجود ہے اس وقت تک ہر زمانہ میں کاملین کا بھی وجود ضرور

رہے گا کیونکہ جب تک دنیا میں قرآن ہے اس وقت تک ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے اور اس آیت میں کمال دین کا طریقہ صحبت کاملین بتلایا گیا ہے بصورت امر جس کا امتثال بدوں تحقق کاملین کے نہیں ہوسکتا اور اوامر شرعیہ کے لئے متعذر الامتثال ہونا خلاف اصل ہے اس لئے یہ مدعی ثابت ہوگیا کہ ہر زمانہ میں کاملین کا وجود ضرور رہے گا گو وہ قلیل ہی ہوں پس جو لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب آج کل اہل کمال کہاں ہیں اب تو کمال کا حاصل ہونا دشوار ہے۔ یہ آیت اشارۃً پر رد کرتی ہے فافہم ۱۲ جامع) کیونکہ کاملین کی صحبت سے اعمال میں سہولت بھی ہوتی ہے اس طرح سے کہ ان کی برکت سے تقاضائے نفس مضمحل ہوجاتا ہے جو کہ اکثر اعمال میں مزاحم ہوتا ہے نیز ان کی صحبت سے طریق عملی بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ کس عمل کو کس طرح ادا کرنا چاہئے یہ بات محض مسائل جاننے سے حاصل نہیں ہوتی جب تک کسی کو عمل کرتے ہوئے نہ دیکھا جاوے اور یہ بات کچھ دین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیوی کاموں میں بھی طریق عمل معلوم کرنے کے لئے اہل کمال کی صحبت ضروری ہے اگر کوئی شخص یوں چاہے کہ محض کتاب دیکھ کر قسم قسم کے کھانے پکانے سیکھ لے تو ایسا نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی ماہر فن سے ہر کھانے کی ترکیب عملی نہ سیکھے گا۔ اس وقت تک کبھی اس کو کھانا پکانے کا طریقہ معلوم نہ ہوگا اور اگر کسی نے کتاب دیکھ کر عمل شروع بھی کر دیا تو اس کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی چنانچہ جب چاہے اس کا تجربہ کر لیا جائے اور یہی حال ہر عمل کا ہے کہ محض ترکیب جان لینے سے کسی عمل میں کمال حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ استاد سے سیکھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ: اور کیا ان کو نہیں دکھلائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں مگر پھر بھی باز نہیں آتے اور نہ کچھ سمجھتے ہیں۔

تفسیری نکات

شامت گناہ

مگر لوگ اس قسم کے مصائب کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے چنانچہ اکثر ایسے وقت کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کون سا گناہ ہوا تھا جس کے سبب یہ تکلیف جھیلنی پڑی اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ تکلیف گناہ کے سبب ہوا کرتی ہے مگر تعجب صرف اس پر ہے کہ کونسا گناہ ہم سے ہوگیا تھا مجھے لوگوں

کے اس تعجب ہی پر تعجب ہے کیوں کہ ہم میں وہ ایسا کون ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا نہیں رہتا اور جب ہر وقت گناہ میں مبتلا رہیں تو تعجب تو آفات میں مبتلا نہ ہونے پر کرنا چاہئے تھا بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ گناہ کرنے سے دنیا کی بھی پریشانی ہوتی ہے اور آخرت کی الگ رہی اب خدا تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے کہ فرماتے ہیں کہ اس مضرت سے بچو وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ (تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو) آپ نے دیکھا کہ کتنی بڑی مضرت سے خدا تعالیٰ نے بچایا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس میں سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

رؤف رحیم کا مفہوم

اس آیت جو حق تعالیٰ شانہ دو لفظ ارشاد فرمائے رؤف کا مصدر ہے رافت جس کے معنی ہیں شدت رحمت اور شدت ایک کیفیت ہے تو اس میں مبالغہ کیفاً ہے اور رحیم میں بھی مبالغہ ہے اور بوجہ تقابل کے شاید اس میں ہو کماً پس مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ آپ میں رحمت کیفاً بھی زیادہ ہے اور کماً بھی۔

سُوۡرۃ یُونس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ﴿۷﴾ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸﴾

ترجمہ: جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں (آخرت کی طلب اصلا نہیں کرتے) اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے۔

تفسیری نکات

چار افعال پر لتاڑ

اب وہ باتیں بھی سن لیجئے جن پر اس آیت میں لتاڑا گیا ہے فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایسے ہیں کہ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے سو اس سے تو ہم بری ہیں لیکن اس سے بے فکری نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے نہ ہونے سے گو سزا کم ہو لیکن ہو گی تو ضرور' اور دوسری بات یہ فرمائی کہ وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ کو جو حیواۃ الدنیا پر راضی ہیں اور اس پر مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہمارے احکام سے غافل ہیں یہ کل چار چیزیں ہیں ان پر فرماتے ہیں اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ ' ترجمے سے معلوم ہوا ہو گا کہ چار پر سزا ہے تو ان چاروں کا مذموم ہونا ثابت ہوا اور احتمال نہ کیا جائے کہ شاید مجموعہ پر یہ سزا ہو گی اور ہم مجموعہ سے بری ہیں کیونکہ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ' یہ جزو ہم میں نہیں پایا جاتا سو بات یہ ہے کہ یہاں اول تو اس

احتمال کی کوئی دلیل نہیں اور عطف بالواو میں ہی ہر واحد بھی مقصود بالا فادہ ہوتا ہے۔ اور شاید اس سے بے فکری ہونہیں سکتی دوسرے اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی لا یرجون پر اکتفانہ کرنا اور دوسرے اعمال کا بھی ذکر کرنا ظاہر ہے کہ عبث تو نہیں ہے اور اگر ان کو حکم جزی میں کچھ دخل نہ ہو تو محض عبث ہونا لازم آئے گا پس سب دخل ہوا پس سب کا مذموم اور مؤثر فی العفو ہونا ثابت ہو گیا ان چار چیزوں میں سے ایک تو یقیناً ہم میں نہیں ہے اس دفعہ سے تو ہم یقیناً بری ہیں اور ایک میں شبہ ہے یعنی اخیر کا جرم اس میں شک ہے کہ ہم میں ہے یا نہیں کیونکہ اس کی تفسیریں دو ہیں ایک تو یہ کہ عقیدہ نہیں اس لئے غفلت ہے اور التفات نہیں ہوتا اس سے تو ہم بچے ہیں یا مطلق غفلت مراد ہو تو اس میں ہم مبتلا ہیں رہے بیچ کے دو جرم ان میں ہم یقیناً مبتلا ہیں اور وہ دونوں ایک ہیں مگر قدرے تفاوت ہے یعنی ایک تو مرتبہ عقل کا ہے اور ایک مرتبہ طبع کا کیونکہ رضا تو امر عقلی ہے اور اطمینان امر طبعی ہے تو بعض دفعہ تو ایک فعل کو عقلاً پسند کرتا ہے مگر دلچسپی نہیں ہوتی جیسے کڑوی دوا یا شہادت کے لئے سفر کہ عقلاً تو پسند ہے مگر اس کے ساتھ دلچسپی نہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دلچسپی تو ہوتی ہے مگر عقلاً ناپسند کرتا ہے جیسے زنا وغیرہ غرض کبھی رضا ہوتی ہے اور اطمینان نہیں ہوتا اور کبھی بالعکس لیکن وہ حالت نہایت سخت ہے کہ رضا اور اطمینان دونوں ہوں تو کفار کو تو علی العموم یہ بات ہے مگر اکثر مسلمانوں کو ہے چنانچہ پسند کی تو کھلی دلیل یہ ہے کہ اگر دنیا اور دین میں تزاحم ہو جیسے مقدمات میں یا رشوت لینے میں یا جیسے بعضوں کے پاس زمینیں دبی ہوئی ہیں تو ان سب کو جانتے ہیں کہ گناہ ہے مگر دل سے پسند ہے کہ جی برا نہیں ہوتا بلکہ جب ان کی اصلاح کی رائے دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ ریاست کے معاملے میں ناصح کیا جانیں غرض عقل سے پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں اگرچہ عقیدہ ایسا نہیں ہے۔

رضا بالدنیا سے بہت کم لوگ خالی ہیں

خلاصہ یہ کہ رضا بالدنیا کی ان خرابیوں سے بہت کم لوگ خالی ہیں حتیٰ کہ مولوی اور درویش بھی اور مولویوں اور درویشوں سے ایسا ہونا زیادہ برا ہے کیونکہ یہ دھوکہ دے کر کماتے ہیں مگر ہر جماعت میں کچھ لوگ مستثنیٰ بھی ہیں دنیاداروں میں بھی اور دینداروں میں بھی یہ تو رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا تھا آگے فرماتے ہیں وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا کہ دنیا میں جی بھی لگایا اور دنیا ان کے دل میں گھس گئی اس کا ازالہ ذرا مشکل ہے دنیا سے تو دل گھبرانا چاہئے مگر ہر مسلمان بتلائے کہ روزانہ کتنی مرتبہ دنیا میں رہنے سے اس کا جی گھبراتا ہے اور کب وحشت ہوتی ہے ہاں اگر وحشت ہوتی ہے تو آخرت میں جانے سے ہوتی ہے حالانکہ دنیا سے وہ تعلق ہونا چاہئے کہ جو مظفر نگر کی سرائے سے کہ اگرچہ وہاں سارے کام کرنے ہوتے ہیں مگر دل جلال آباد میں پڑا رہتا ہے۔ اس کا مطلب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ بالکل غلط ہے بلکہ مولوی یہ کہتے ہیں کہ دنیا سے سرائے کا تعلق رکھو۔

رضا بالدنیا کا حکم

جو امور اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں اگرچہ سارے ہمارے اندر موجود نہ ہوں مگر بعض کا پایا جانا محقق ہے گو کفار کی برابر نہ پائے جاتے ہوں چنانچہ آیت کے جزو اول یعنی اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا، سے تو مسلمان بے شک بری ہیں کیونکہ حق سبحانہ تعالیٰ کی لقا کا تو ہر مسلمان کو اعتقاد ہے یہ جزو تو بحمد للہ تعالیٰ مسلمانوں میں ہے۔ نہیں، مگر دوسرا جزو یعنی رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا' تو موجود ہے گو کفار سے کم درجہ میں ہو مگر ہے ضرور اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ جس رضا بالدنیا پر وعید ہے شاید یہ مشروط بعدم رجاء اللقاء یعنی مشروط بالکفر ہو پھر مسلمان اس کا مورد نہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ذوق لسان کے بالکل خلاف ہے ہر اہل لسان سن کر یہی سمجھے گا کہ ان اعمال کی بھی تقبیح مقصود ہے بلا شرط اقتران بالکفر کے آگے ارشاد ہے وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا یہ رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کی تفسیر ہے اور عجیب پر شفقت موقعہ ہے تفسیر کا کیونکہ رضا بحیات دنیا انسان کا امر طبعی ہے جو اختیار میں نہیں اگر مطلق رضا بحیات دنیا معصیت ہوتی تو کوئی فرد انسانی بھی اس سے نہ بچ سکتا کیونکہ دنیا کی زندگی سے کون راضی نہیں اس لئے ضرورت واقع ہوئی تفسیر کی اگر تفسیر ساتھ کے ساتھ نہ ہوتی تو اس آیت سے لوگوں کی کمر ٹوٹ جاتی پس شفقت اسی میں ہے کہ ساتھ کے ساتھ تفسیر کر دی جائے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا۔ اس قید کے بڑھانے سے معلوم ہو گیا کہ رضا بحیات دنیا معصیت و مذموم وہ ہے جس کے ساتھ اطمینان بھی ہو ورنہ معصیت نہیں کیونکہ یہ تو امر طبعی ہے چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تصریح ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ الخ، یعنی آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں تمہارے قبیلے اور تمہارے وہ اموال جن کو تم نے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہوں الخ، یہاں وعید اس پر ہے کہ یہ چیزیں اللہ و رسول علیہ ﷺ سے زیادہ محبوب نہ ہوں تو ان پر وعید نہیں کیونکہ ان چیزوں کا محبوب ہونا امر طبعی ہے معلوم ہوا کہ ان چیزوں کو پسند کرنا اور ان پر خوش ہونا اور مطلق رضا محل وعید نہیں البتہ حیات دنیا پر مطمئن ہونا محل وعید ہے اگر اطمینان کی حالت ہو تو قابل علاج ہے ورنہ نہیں اب یہ سمجھنا چاہئے کہ اطمینان کس کو کہتے ہیں کہ جس پر وعید وارد ہے اطمینان کے معنی سکون کے ہیں جو مقابل ہے حرکت کا مطلب یہ ہوگا کہ حیواۃ دنیا پر اتنا قرار ہو گیا ہے کہ اس سے قلب و ذہن کو آگے حرکت ہی نہیں ہوتی آگے خیال ہی نہیں چلتا جیسے کوئی چیز مرکز پر ٹھہر جاتی ہے کہ آگے نہیں بڑھتی اس پر وعید ہے سو آج کل اکثر ہماری یہی حالت ہو رہی

ہے کہ جو جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے آگے قدم ہی نہیں بڑھاتا ہم کو ساری فکر حیات دنیا ہی کی ہے منہمکین فی الدنیا کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی تذکرہ کرتے ہیں تو دنیا ہی کا حتیٰ کہ ریل میں ہوتے ہیں تب بھی دنیا ہی کا تذکرہ ہے یہی پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں اناج کا کیا حال ہے بارش کیسی ہوئی نرخ کیا ہے غرض ہر مجلس میں دنیا کا ہی تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ ریل کا موقع تو بے فکری اور فرحت کا ہے مگر ان کو اس میں بھی دنیا ہی کی فکر ہے اس سے آگے حرکت ہی نہیں ہوتی دنیا ہی پر سکون وقرار ہو گیا ہے حاصل یہ ہے کہ آخرت کی فکر نہیں آگے ارشاد ہے هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ' یہ ہے کہ باوجود یکہ ہماری نشانیوں کو دیکھتے ہیں مگر پھر غافل ہیں ان تینوں جملوں کا یہ حاصل تھا جس سے اصل جرم یہ ثابت ہوا کہ ہم کو حیات دنیا پر اطمینان ہو گیا یعنی حرکت الی الآخرت نہیں ہوتی اب یہ سمجھئے کہ حرکت الی الآخرت جو کہ مقابل ہے سکون کا تین قسم کی ہوتی ہے ایک حرکت اعتقادی دوسری عملی تیسری حالی یعنی آخرت کی دھن میں ہر وقت بے چین رہنا اور اسی کاوش ہونا کفار کو تو کسی قسم کی حرکت بھی نہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہی درست نہیں مسلمانوں کو حرکت اعتقادی تو حاصل ہے مگر حرکت عملی اور حالی نہیں یعنی نہ اعمال آخرت کا اہتمام ہے نہ اس کی دھن ہے اس کی کاوش ہی نہیں یہ مرض قریب قریب عام ہے اور عوام تو عوام خود لکھے پڑھوں کی حالت یہ ہے کہ ہمارے قلوب آخرت کے لئے بے چین نہیں ہیں جیسے کسی پر کوئی مقدمہ دائر ہوتا ہے اور اس وقت بے چینی ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی قلب کو قرار نہیں ہوتا ہر وقت اس کی دھن اور اسی کا فکر اور خیال ہوتا ہے۔

بڑا علاج اس کا یہی ہے کہ آخرت کے تمام امور کو سوچا کرو کہ میں مر کر قبر میں جاؤں گا وہاں سوالات ہوں گے اگر ٹھیک جواب دے دیا تو راحت ہوگی ورنہ عذاب ہوگا اسی طرح میدان قیامت کی سختیوں کو سوچے کہ اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب کے لئے کھڑا کیا جاؤں گا اس کے بعد پل صراط پر چلنا ہوگا پھر جنت یا دوزخ میں ڈالا جاؤں گا غرض سارے امور کو سوچا کرے اور اس کے ساتھ ہی کسی بزرگ سے تعلق قائم کرے اور اگر ممکن ہو سکے تو اس کی صحبت میں رہو اور اس کے حقوق صحبت ادا کرو۔

حب دنیا کے مراتب

حب دنیا کے بھی مراتب مختلف ہیں کسی میں کم ہے کسی میں زیادہ کفار میں زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں کم مگر ہیں ضرور اور یہی جڑ ہے تمام گناہوں کی کیونکہ حب دنیا میں فکر دین کم ہوتی ہے۔ جس درجہ کی حب دنیا ہوگی اسی درجہ کی فکر دین کم ہوگی اگر کامل درجہ کی حب دنیا ہے تو کامل درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی جیسا کہ کفار میں متحقق ہے اور مسلمانوں میں جس درجہ کی حب دنیا ہے اسی درجہ کی دین سے بے فکری ہے تو یہ دخل ہے حب دنیا کو ان امور میں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں اور کفار میں تو یہ مرض ہے ہی افسوس یہ ہے کہ ہم میں بھی پایا جاتا ہے۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جاوے کہ اس آیت کو کیوں اختیار کیا گیا۔ یہ کفار کے بارہ میں ہے چنانچہ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا اس میں صریح ہے مسلمانوں کو اس سے کیا علاقہ؟ یہ شبہ بہت لوگوں کو ہوا ہوگا کیونکہ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جو آیتیں کفار کے بارہ میں ہیں مسلمانوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں اور اسی لئے لوگ بے فکر بھی ہو گئے میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ جو وعیدیں کفار کے بارہ میں وارد ہیں ان وعیدوں کی بناء کیا ہے آیا کفار کی ذات ہے یا کفار کے اعمال ہیں۔ ظاہر ہے کہ بناء ان وعیدوں کی اعمال ہی ہیں جو کفار میں پائے جاتے ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ تو کسی کی ذات سے محبت ہے نہ کسی کی ذات سے بغض ہے من حیث الذات خدا تعالیٰ کے نزدیک سب برابر ہیں۔

طالب علمانہ اشکال کا جواب

یہاں ایک اور طالب علمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ آیت کفار کے بارہ میں ہے اور وعید جن اعمال پر وارد ہے ان میں بعضے فرعی بھی ہیں اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار مکلف بالفروع ہوں حالانکہ فقہاء اصولین کے نزدیک کفار مکلف بالفروع نہیں اسی لئے انھوں نے تصریح کی ہے کہ اگر کافر قبل اسلام لانے کے نماز پڑھے تو اس کی نماز نہ ہوگی کیونکہ وہ مکلف ہی نہیں اسی طرح بعد اسلام کے ان نمازوں کی قضاء واجب نہیں اس سے کفار کا مکلف بالفروع ہونا لازم نہیں آتا وہ اس طرح کہ کفار کو جو عذاب ہوگا وہ اصل میں نفس کفر پر ہوگا بخلاف مسلمان کے کہ اس کو جو سزا ہوگی وہ ترک فروع پر ہوگی ہاں کافر کی سزا میں بوجہ ترک فروع کے اضافہ ہو جائے گا اور عقوبت بڑھ جائے گی یہ نہیں کہ نفس ترک فروع پر سزا ہوگی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو باغی ہوں جو حکومت کی اطاعت نہیں کرتے مگر ان میں ایک تو وہ ہے کہ بغاوت بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ملک میں شورش بھی کرتا ہے اور دوسرا باغی تو ہے مگر نافرمانی اس کی ذات ہی تک ہے شورش نہیں کرتا ظاہر ہے کہ بغاوت پر سزا دونوں کو ہوگی مگر جو بغاوت کے ساتھ شورش بھی کرتا ہے اس کی سزا میں بہ نسبت شورش نہ کرنے والے کے اضافہ ہوگا اس صورت میں اصل سزا تو بغاوت پر ہے مگر بوجہ شورش کے اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کافر تارک فروع کی مثال شورش کرنے والے باغی کی سی ہے کہ کفر تو کرتا ہی ہے لیکن باوجود کفر کے فروع کو بھی بجا نہیں لاتا تو اس کو اصل سزا تو کفر پر ہوگی مگر ترک فروع کی وجہ سے سزا میں زیادتی ہو جائے گی اور اس کافر کی مثال جو بعض فروع کو ادا کرتا ہے جو مشروط بالایمان نہیں جیسے عدل و تواضع و سخاوت اس باغی کی سی ہے جو شورش نہیں کرتا اس کو اصل سزا کفر پر ہوگی ترک فروع سے اضافہ اور زیادتی نہ ہوگی اب شبہ کفار کے مکلف ہونے کا جاتا رہا اور مسلمان کی مثال اس مجرم کی سی ہے جو باغی نہیں اس کو صرف ترک فروع پر سزا ہوگی

بغاوت کی سزا اس کو نہ ہوگی کیونکہ وہ باغی نہیں ہے آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار گو فروع کے مکلف نہیں مگر پھر بھی ترک فروع پر عتاب ہوگا گو تقویت ہی کے لئے سہی تو مسلمان جو کہ فروع کے مکلف ہیں وہ آیت سے زیادہ مورد وعید ثابت ہوں گے کیونکہ جب غیر مکلف بالفروع کو بھی ان فروع کے ترک سے ضرر ہوتا ہے تو جو ان فروع کا مکلف ہے اس کو ان کے ترک سے کیوں ضرر نہ ہوگا۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی بیٹھے بھی کھڑے بھی پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال ان کو اچھی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔

تفسیری نکات

مصیبت کے وقت انسان کا حال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کافر سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا سات ہیں چھ زمین میں اور ایک آسمان میں آپ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت کا خدا کون ہے اس نے کہا کہ آسمان والا تو مشرکین عرب بھی مصیبت کے وقت ایک خدا کو ہی پکارتے تھے مگر ہندوستان میں مصیبت کے وقت بھی دوسروں ہی کو پکارتے ہیں تیسری قسم وہ ہے کہ گناہ کو یاد کر کے تدارک بھی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن وہ حالت ہوتی ہے

اہلکاراں بوقت معزولی شبلی وقت وبا یزید شوند
باز چوں مے رسند برسرکار شمر ذی الجوش و یزید شوند

(سرکاری ملازم نوکری سے علیحدہ کر دیئے جائیں تو وہ ایسے نیک بن جاتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اپنے زمانہ کے حضرت شبلی اور بایزید کے جیسے بہت بڑے ولی ہیں اور پھر جب اپنی ملازمت پر آ جاتے

ہیں تو اس قدر برے اعمال کرتے ہیں جیسے کہ شمر جس نے حضرت امام حسین کو شہید کیا اور جیسا کہ یزید تھا کہ جس کی اس وقت حکومت تھی۔)

یعنی جب تک مصیبت رہے اللہ بھی یاد رہے رسول بھی یاد رہے اور جب مصیبت ٹلی تو ایسے آزاد کہ گویا خدا تعالیٰ کی حدود حکومت ہی سے نکل گئے اسی کو فرماتے ہیں اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا کہ مصیبت کے وقت تو خوب پکارتا ہے اور جب مصیبت دور کر دیتے ہیں تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ گویا تعلق ہی نہ رہا اور اس کی وجہ فرماتے ہیں۔ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۲﴾ یعنی وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حدود سے باہر ہو گئے ہیں اور یہ خاصیت ہے کہ نیک عمل میں بصیرت ٹھیک رہتی ہے اور جب گناہ کرتا ہے تو بینش جاتی رہتی ہے اسی لئے فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اعمال خوش معلوم ہوتے ہیں پس علت اس کی اسراف ہے کہ اس کی وجہ سے بری باتیں مزین معلوم ہونے لگتی ہے اس کو سن کر ہر شخص اپنی حالت کو لے کم وبیش سب کی یہ حالت ہے اور دوسری جگہ بھی ایسا ہی مضمون ارشاد ہے وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ یعنی جب مصیبت آتی ہے اس وقت تو سب کو بھلا کر کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس سے نجات ہو جائے تو ہم خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں گے مگر جب اس سے نجات ہو جاتی ہے تو اعراض کرنے لگتے ہیں آگے فرماتے ہیں وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا۔ کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا﴿۶۸﴾ یعنی تم کیا اس سے امن میں ہو گئے ہو کہ تم کو زمین ہی میں دھنسا دیں (یا تم پر کوئی ایسی تند ہوا بھیج دیویں جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ) چنانچہ قارون کو دھنسا دیا گیا تھا اور اس واقعہ پر گو سب کو ایمان تھا لیکن عین الیقین نہ تھا مگر اب چند ہی سال ہوئے کہ کانگڑہ کے قریب زلزلہ میں ایک بہت بڑے حصے کو دھنسا دیا گیا کہ لوگ اب بھی دیکھ لیں آگے فرماتے ہیں یا تم پر تند ہوائیں بھیج دیں کہ پھر تم اپنے لئے کوئی وکیل نہ پاؤ غرض ہر طرح تم ہمارے قبضے میں ہو کسی طرح بچ نہیں سکتے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دریائی اندیشہ تو کٹ گیا اس کو فرماتے ہیں اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لے جاویں) دیکھو روزمرہ یہ بات پیش آتی ہے کہ انسان ایک جگہ نہ جانے کی قسم کھاتا ہے مگر پھر مجبوراً جانا پڑتا ہے اور یہ اوپر بتلا دیا ہے کہ اگر دریا میں بھی نہ جانا ہو تو دوسری جگہ بھی تو ہلاک کر دینا ممکن ہے کیونکہ اس کی قدرت خشکی اور دریا میں برابر ہے مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک ملاح سے ایک شخص نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے اس نے کہا دریا میں ڈوب کر کہنے لگا اور دادا کہا کہ دریا میں کہنے لگا کہ پھر بھی تم دریا میں رہتے ہو ڈرتے نہیں ملاح نے کہا کہ تمہارے باپ کہاں مرے کہنے لگا کہ گھر میں پوچھا اور دادا کہنے لگا گھر میں ملاح نے کہا کہ پھر بھی تم گھر میں رہتے ہو ڈرتے نہیں تو

خدا تعالیٰ کی قدرت ہر جگہ موجود ہے بلکہ دریا میں تو بہت سی تدابیر بچنے کی ممکن بھی ہیں خشکی میں اگر کوئی آفت آئے تو اس سے بچنے کی تو کوئی تدبیر ہی نہیں مثلاً اگر دو ریل گاڑیوں میں تصادم ہو جائے تو کوئی صوت بچنے کی ہو ہی نہیں سکتی برخلاف جہاز کے کہ اگر ٹوٹ جائے تو غرق ہوتے ہوئے بھی اس کو بہت دیر لگ جاتی ہے۔ دوسرے جہاز اکثر کنارے کے قریب ہی ہوتا ہے کہ وہاں سے مدد کا آ جانا بھی ممکن ہوتا ہے تو جو شخص سمندر میں خدا سے ڈرے اور خشکی میں نہ ڈرے وہ کس قدر نادان ہے دوسرے اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ سمندر میں زیادہ خطرہ ہے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ دوبارہ سمندر ہی میں بھیج دیں اور اگر ایسی ہوا کو مسلط کر دیں کہ وہ کشتی کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے کر دے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى اور یہ کچھ اسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر صاحب مصیبت کو کہا جا سکتا ہے کہ کیا پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ پھر اسی قصہ میں تم کو پھنسا دیں صاحبو اپنے کو کسی وقت خدا تعالیٰ کے قبضہ سے نکلا ہوا نہ سمجھو سب گناہوں کو چھوڑ دو دیکھو گناہ میں مصیبت اس لئے آتی ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ ناراض ہیں اور یہ بات سب گناہوں کو عام ہے اگر چہ وہ کسی قسم کا گناہ ہو تو جب خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور ہر قصہ ان کے قبضہ میں ہے تو ممکن ہے کہ پھر کسی قصہ میں مبتلا کر دے دیکھو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوا تو نمرود کو ایک مچھر سے پریشان کر دیا اہل سیر نے لکھا ہے کہ نمرود کی یہ حالت تھی کہ سر پر چوٹ لگتی تھی تو چین آتا تھا تو وہ مچھر اب بھی تو موجود ہے اور خدا تعالیٰ کو اب بھی تو وہی قدرت ہے دیکھو کہاں نمرود اور کہاں مچھر مگر خدا تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ ہمارا ایک معمولی سپاہی بھی کافی ہے ایک چونٹی اگر چہ بظاہر نہایت چھوٹی اور معمولی چیز ہے لیکن جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں تو اسی سے ہلاک کر دیتے ہیں اور جب ان کی حفاظت ہوتی ہے تو کسی سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا میں نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے کہ سر میں تیل ڈال کر سر کے نیچے رومال رکھ کر سو گیا ہوں اٹھ کر دیکھا رومال پر چیونٹیاں چڑھی ملیں لیکن سر میں ایک چیونٹی بھی نہیں پائی گئی سو اس سے بچانے والا کون ہے بجز خدا کے اور اگر وہ نہ بچائے تو ادنیٰ ذرہ پریشان کرنے کو کافی ہے ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس کی ناک پر بار بار ایک مکھی آ کر بیٹھتی تھی اس نے تنگ آ کر کہا کہ معلوم نہیں مکھی کو کیوں پیدا کیا ہو گا وزیر نے کہا کہ اس واسطے پیدا کیا ہے کہ متکبرین کا تکبر ٹوٹے حاصل یہ ہے کہ ذرا سنبھل کر خدا تعالیٰ کی مخالفت کرو تم میں تو ایک مکھی کی مقاومت کی بھی تاب نہیں بس اگر بچنے کی کوئی صورت ہے تو یہی کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

خلاصہ آیت

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا تو کوئی انسان نہیں جس کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ اور کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو انسان تحت القدرۃ ہے مستقل نہیں ہے اگر چہ ہر امر میں انسان کی ایک مستقل تجویز ضرور ہوتی

ہے جیسے اس کا ذہن اختراع کر لیتا ہے۔ مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہر امر اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ' یعنی انسان کو اس کی ہر تمنا نہیں ملتی تمنائیں انسان کی بہت کچھ ہوتی ہیں مگر ملتی کم ہیں بلکہ جو خدا تعالیٰ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے وہی انسان کے لئے بہتر ہوتا ہے اگرچہ اول نظر میں اس کی بہتری انسان کو محسوس نہ ہو لیکن اس کے نتیجہ پر اگر غور کیا جائے تو اس کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے اور اول نظر میں چونکہ حکمت پر نظر نہیں ہوتی اس لئے خلاف تمنا کو مصیبت کہتے ہیں ورنہ اگر مصلحت اور حکمت پر نظر نہیں ہوتی اس لئے خلاف تمنا کو مصیبت کہتے ہیں ورنہ اگر مصلحت اور حکمت پر نظر ہو تو کوئی مصیبت مصیبت نہیں بلکہ ہر مصیبت نعمت ہے مگر مراد مصیبت غیر اختیاریہ ہے اور اسی میں گفتگو ہو رہی ہے برخلاف ان کے جن کو اپنے ہاتھوں اختیار کرتے ہیں یعنی گناہ کہ ان کو انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے سو اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اس کو گناہ اور معصیت قرار دیا گیا یعنی اس سے روکا گیا اور یہی فرق ہے درمیان فعل عبد فعل حق کے کہ کوئی فعل شر کا خدا تعالیٰ سے صادر نہیں ہوتا فعل شر وہی ہے جو اپنے اختیار سے خلاف رضائے حق کرتا ہے تو امور اختیاریہ عبد تو خیر اور شر دونوں ہیں اور غیر اختیاری جو محض منجانب اللہ ہے وہ خیر محض ہے۔

مسلمانوں کی ایک قابل اصلاح کمی

ایک دوست نے پوچھا تھا کہ حق تعالیٰ نے کفار کے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ' تو یہی حالت بعینہ مسلمانوں کی ہے کہ جب کوئی مصبت ہوتی ہے تو خدا کو پکارتے ہیں اور جب وہ مصیبت جاتی رہتی ہے پھر غفلت میں پڑ جاتے ہیں تو کیا مسلمان بھی اس آیت میں داخل ہیں اگر داخل ہیں تو مفسرین الانسان کی تفسیر کفار کے ساتھ کیوں کرتے ہیں۔ میں نے اس کا یہی جواب دیا کہ مسلمان کے اندر اس کا منشاء اور ہے کافر کے اندر اور کافرین کا منشاء تو اس سے اعراض اور غفلت اور انکار اور کفر ہے اور مسلمین کا طبعیت ہے اگرچہ ہے یہ بھی کمی اور قابل اصلاح لیکن کلام اس میں ہے کہ اس غفلت سے کفر لازم نہیں آتا غرض احکام عقلیہ اور طبعیہ میں جب تعارض ہوگا تو جزائے شرعی میں ترجیح عقل کو ہوگی اس لئے اشتراک حالت سے جو آیتیں منافقین و کفار کے بارہ میں ہیں وہ مسلمانوں پر جاری نہ کی جاویں گی اور اس سے کفر و نفاق کا حکم نہ کیا جاوے گا۔

اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ جب ان کی معیاد (معلوم یعنی موت) آ جائے گی تو اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

تفسیری نکات

موت کا ایک وقت معین ہے

جس کا حاصل یہ ہوا کہ موت کے وقت سے نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اور مقصود یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے کوئی بچ نہیں سکتا اب یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ اس آیت سے جو مضمون مقصود ہے یعنی موت سے محفوظ نہ ہوسکنا اس سے لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً کا دخل تو ظاہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کا وقت آنے کے بعد اس سے بچ نہیں سکتے اور بچنے میں تاخیر کو دخل ہوسکتا ہے مگر لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ' کو اس میں کیا دخل ہے یہ جملہ کیوں بڑھایا گیا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں مرسکتا سو یہ حکم تو صحیح ہے مگر جو مقصود ہے اس میں کیا دخل کیونکہ تقدیم میں نافع ہونے کا کیا احتمال ہے وہ تو اور الٹا مضر ہوگا پھر خصوص مجئی اجل کے بعد تو عقلاً بھی اس کا احتمال نہیں ہاں تاخیر کا احتمال ہو سکتا تھا اس لئے اس کی نفی بے شک مفید ہے تو یہ جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں مگر حضرت استاد رحمۃ اللہ نے ایک عجیب جواب دیا تھا جو میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا ممکن ہے کسی نے لکھا ہو مگر میری نظر سے نہیں گزرا اور نہ مجھ کو اس کی تلاش کا اہتمام ہے ہمیں تو خدا تعالیٰ نے مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جن کی باتوں سے ایسی تسلی ہو جاتی تھی جس سے کتب بینی سے استغنا ہو گیا مولانا نے فرمایا کہ اس اشکال کا مبنی تو یہی ہے کہ تقدیم نافع نہیں ہوسکتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقدیم ممکن ہوتی تو وہ بھی نافع ہوسکتی اسی طرح موت سے بچنے کی دو صورتیں ہوسکتی تھیں ایک یہ کہ وقت موت سے مقدم وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن موت کے لئے مقرر ہوا وہ وقت آیا اور یہ شخص جمعرات کے دن میں داخل ہو جائے دوسرے یہ کہ وقت سے موخر وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن آنے کے بعد موت کے آثار دیکھ کر سنیچر کے دن میں پہنچ جائے تو دونوں صوت میں موت نہ آئے گی لیکن وقت مقررہ تو جمعہ کا تھا اور جمعہ سے دونوں صورتوں میں فرار ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ دونوں صورتیں نافع ہوسکتی تھیں مگر چونکہ حرکت من الزمان ممکن نہیں اس لئے کسی صورت کا وقوع نہیں ہوتا خیر یہ تو لطائف ہیں جو ضمناً بیان کر دیئے ورنہ

اصل مقصودیت کا صرف یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے بچنا ناممکن ہے جس کو محاورہ میں اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ۔ وَلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ جیسے وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ میں ابداء و اعادہ کے معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ باطل کارآمد نہیں ہوتا اس مقصود کو اس عبارت میں محاورہ کے موافق بیان کر دیا گیا اسی طرح یہاں بھی کر سکتے ہیں کہ تاخر تقدم کی حقیقۃً نفی مراد نہیں بلکہ حاصل مراد ہے اور محاورات میں کسی شے سے نہ بچ سکنے کو اسی طرح بیان کیا کرتے ہیں اس تقدیر پر آیت کو حرکت زمانی فی الزمان کی بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ یہ محض ایک لطیفہ ہوگا مگر قرآن میں ایسی جامعیت ہے کہ

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

سلوک میں ہر حال میں ترقی کرنے کی ضرورت

یہی مضمون قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ۝ (ان لوگوں سے ان کا حساب نزدیک آ پہنچا اور یہ غفلت میں ہیں) اور ایک تفسیر یہ بھی ہے حافظ کے اس شعر کی

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

(مجھ کو منزل محبوب میں امن وسکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو)

اس کی ایک تفسیر یہی کی گئی ہے کہ دنیا میں امن وعیش کہاں جبکہ ہر دم دنیا کی حالت یہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسباب باندھ لو اور چلنے کی تیاری کرو کیونکہ واقعی ہمارا ہر سانس جو گزر رہا ہے وہ اس کی خبر دے رہا ہے کہ تم آخرت کی طرف اتنے نزدیک ہو گئے ہو جس کی عمر بیس سال کی ہے اس نے آخرت کی طرف بیس سال کی مسافت طے کر کے قرب حاصل کر لیا جس کی عمر زیادہ اس نے زیادہ قرب حاصل کر لیا ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۝

ترجمہ: یعنی اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے کہ اللہ کے فضل اور رحمت ہی کے ساتھ بس صرف چاہئے کہ خوش ہوں (اس لئے) کہ وہ بہتر ہے اس شے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

ایک عجیب نکتہ

یعنی متاع دنیا سے یہ بہتر ہے اور عجیب بلاغت ہے کہ پہلے مضمون کا تو حق تعالیٰ نے خود اپنی طرف سے خطاب فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ الخ اور اس دوسرے مضمون کی نسبت حضور کو حکم دیا کہ آپ کہئے۔

اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ کہ یہ طبعی بات ہے کہ احکام یعنی امر و نہی انسان کو ناگوار اور گراں ہوتے ہیں اس لئے احکام تو خود ارشاد فرمائے تا کہ حضور کی محبوبیت محفوظ رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ فرحت کے امر کو حضور کے سپرد فرمایا کہ اس سے حضور کے ساتھ اور زیادہ محبت مخلوق کو بڑھے باقی اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ بہت جگہ حضور کو بھی احکام پہنچانے کا حکم ہے' اس لئے کہ یہ نکتہ اس مقام کے متعلق ہے اور دوسری جگہ دوسرا نکتہ اور حکمت ہو سکتی ہے۔

بہرحال دو چیز پر خوش ہونے کا حکم ہے فضل اور رحمت اور یہ فضل بھی رحمت ہی کے افراد میں سے ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ فضل کے اندر معنی زیادتی کے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ رحمت بمعنی مہربانی کے دو مرتبہ ہیں ایک نفس مہربانی اور ایک زائد۔ یا یوں کہو کہ ایک وہ مرتبہ ہے جس کا بندہ بحیثیت جزاء کے اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اور ایک زائد' اگرچہ پہلے مرتبہ رحمت کا اپنے کو مستحق سمجھنا بندہ کی جہالت ہے اور وجہ اس زعم استحقاق کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر ہر شخص کو ایک ناز ہوتا ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو ہم لوگوں میں ناز ہی کی شان رہ گئی ہے نیاز بالکل نہیں رہا' اس لئے اگر نیاز ہوتا تو ہم سے نافرمانی نہ ہوتی دیکھ لیجئے کہ حکام دنیا کے ساتھ نیاز ہے اس لئے اس کی نافرمانی نہیں کرتے نہ ان پر نخرے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ بالعکس ہے جس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ رحمت ہی کی انتہا ہے حتیٰ کہ فوری سزا نہیں دی جاتی' سو جس قدر رحمت بڑھتی جاتی ہے اس رحمت وعنایت کو معلوم کر کے اسی قدر اعراض ان حضرات کا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

لیکن حق تعالیٰ کے کرم اور رحمت بے انتہا سے ہماری عادتیں بگڑ گئی ہیں چاہیے تو یہ تھا کہ جس قدر رحمت ہوتی شرماتے اور تضرع و نیاز زیادہ ہوتی مگر یہاں معاملہ برعکس ہے۔

اب قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو جاننا چاہئے کہ قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ بکثرت آئے ہیں کہیں دونوں سے ایک معنی مراد ہیں کہیں جدا جدا' چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک فضل اور رحمت سے حضور کا وجود باجود مراد ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ یہاں بھی بقول اکثر مفسرین حضور ہی مراد ہیں۔

ایک مقام پر ارشاد ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ یہاں مراد فضل اور رحمت سے قرآن مجید ہے اور بعض آیات میں فضل سے مراد رحمت دنیوی اور رحمت سے رحمت دینی مراد ہے چنانچہ فضل بمعنی رزق و نفع دنیوی قرآن مجید میں آیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ یہاں فضل سے مراد تجارت ہے اس لئے کہ یہ آیت حج کے موقع کی ہے۔ بعض لوگ مال تجارت حج کے سفر میں ساتھ لے جانے کو مکروہ جانتے تھے ان کو ارشاد ہے کہ اس میں کچھ گناہ نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل طلب کرو حدیث شریف میں بھی رحمت سے رحمت دینی اور فضل سے رحمت دنیوی یعنی رزق یا اسباب رزق مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو یہ کہو اللھم افتح لنا ابواب رحمتک یہاں رحمت سے رحمت دینی مراد ہے اس لئے کہ مسجد میں وہی مطلوب ہے جب مسجد سے نکلو تو یہ کہو اللھم افتح لنا ابواب فضلک اس لئے کہ مسجد سے باہر جا کر تحصیل معاش میں لگ جاتے ہیں تو وہاں اس کی طلب ہے اور لیجئے سورۃ جمعہ میں ارشاد ہے

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ یہاں فضل سے مراد رزق ہے پس مجموعہ تمام تفاسیر کا تمام دنیوی رحمتیں اور دینی رحمتیں ہوا اس مقام پر ہر چند کہ آیت کے سباق پر نظر کرنے کے اعتبار سے قرآن مجید مراد ہے لیکن اگر ایسے معنی عام مراد لئے جائیں کہ قرآن مجید بھی اس کا ایک فرد رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے وہ یہ ہے کہ فضل اور رحمت سے مراد حضور کا قدوم مبارک لیا جائے اس تفسیر کے موافق جتنی نعمتیں اور رحمتیں ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا دینی اور اس میں قرآن بھی ہے سب اس میں داخل ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ حضور کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور مادہ ہے تمام رحمتوں اور فضل کا پس یہ تفسیر اجمع التفاسیر ہو جائے گی۔ (السرور ملحقہ مواعظ میلاد النبی ﷺ ص ۶۸، ۷۳، ۷۴)

خوشی کی دو قسمیں

ایک مولوی صاحب نے استفسار کیا کہ بعض دفعہ غسل یا جدید کپڑا پہننے سے خوشی معلوم ہوتی ہے سو یہ عجب تو نہیں فرمایا خوشی دو قسم کی ہوتی ہے ایک فرح بطر جس کی نسبت ارشاد ہے لاتفرح اور ایک فرح شکر جس کی نسبت ارشاد ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا سو اگر یہ خوشی بطور اظہار و شکر نعمت کے ہے تو محمود ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہئے اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ خدا پسند نہیں کرتا زیادہ خوش ہونے والوں کو۔

مسرت کی دو قسمیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نہ ہونا چاہئے پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر دراصل

ان میں تعارض نہیں بلکہ یہ دونوں حالتیں جدا جدا ہیں۔ جن کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے ایک خوشی اضطراری ہے جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپے یا اشرافیوں کی کھوگئی جس سے آپ بہت پریشانی میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ دفعۃً کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی ایک خوشی تو اس وقت ہے یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہوگی اور ایک یہ صورت ہے کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پیٹا اب خدا جانے وہ ان کو ملی یا نہیں مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لا کر دے دی ایک خوشی اس پر ہے یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی وہ اترانے کی نہ ہوگی بلکہ شکر کی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کھوئی ہوئی چیز مل گئی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی ورنہ یہ ہمیانی کیسے ملتی۔

عید میلاد النبی ﷺ کے دلائل اور ان کے جوابات

اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور اس کا جواب سنئے اور ان کی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کر دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے بلکہ اگر وہ تو برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو اسی واسطے جی تو نہ چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جائیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش نہ رہے اس لئے میں ان دلائل کو بھی مع جواب نقل کئے دیتا ہوں۔

اول یہ آیت قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا سے استدلال کر سکتے ہیں کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا ثابت ہوا اور یہ عید میلاد النبی ﷺ بھی اظہار فرحت ہے لہذا جائز ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا نکلا اور گفتگو اس ہیئت خاص میں ہے لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح ہو تو فقہاء نے کتب فقہ میں جن بدعات کو روکا ہے وہ بھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہیں چاہئے کہ وہ بھی جائز ہو جاویں حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرحاً مذکور ہے اور ان اہل زیغ کو ہمیشہ یہ دھوکا ہوتا ہے اور یہ تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہے اسی بناء پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں وہ ہیبت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت فلیفرحوا سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ صحیح نہیں بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں اس لئے کہ یہ موجدین تو سال بھر میں ایک ہی مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش

ہیں پس جوفرح کو منقطع کر دیں وہ آیت کے تارک ہیں ہم توکسی وقت بھی قطع نہیں کرتے' پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی عمل کرتے ہیں اور دلائل منع بدعات پر بھی عامل ہیں اور اہل بدعت کو دونوں امر نصیب نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں۔ ۱-افراط ۲-تفریط ۳-اعتدال

تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحاء المہملہ کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ختم ہوگئی جیسا بعض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہوگیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جاری رکھیں مگر حدود شرعیہ سے تجاوز کریں جیسا اہل تجدید بالجیم المعجمہ کا طریق متعارف ہوگیا اور اعتدال ادامتہ میں ہے پس ہم نہ محدد ہیں نہ مجدد بلکہ مدیم ہیں **والحمد للہ علی ذالک**'

دوسرا استدلال موجدین کا اس حدیث سے ہوسکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور ﷺ کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی میں آ کر ایک باندی آزاد کردی تھی اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہوگئی۔ پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز و موجب برکت ہے۔

جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں۔ گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے

تیسرا استدلال اس آیت سے ہوسکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الی قولہ) رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسی ابن مریم! کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادیں (عیسی علیہ السلام کی اس دعا تک) کہ اے اللہ! ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جاوے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا کہ امم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالیٰ ہم پر نقل فرما کر ان پر انکار نہ فرمادیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے۔ اور حضور ﷺ کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظیمہ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو جہاں وہ منقول ہے دیکھئے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ میں سجدہ تحیۃ منقول ہے اور سجدہ تحیۃ وسجدہ تعظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں اس پر انکار منقول نہیں۔ اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت واحادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں۔

یہ جواب تو اس تقریر پر ہے جب کہ آیت کے معنی یہی ہیں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول مائدہ کی تاریخ کو عید بنا دیں۔ اس لئے کہ تکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے۔ پس اس سے یوم نزول المائدہ لینا مجاز ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا پس معنی یہ ہیں تکون المائدة سرورالنا یعنی وہ مائدہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جاوے عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی ﷺ ہی مراد ہو۔

جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م ت ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک گویا شیخ سعدی کے شعر ۔ تمتع زہر گوشہ یافتم

سے بھی متعہ نکلتا ہے اور آیت رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے رب! ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع ی د آوے اس سے عید میلاد النبی ﷺ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

چوتھا استدلال اس قصہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے ہی دن نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے نزلت عنی یوم جمعة ویوم عرفة یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس حدیث سے یہ ہے کہ حضرت عمر و ابن عباسؓ نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا' معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگر چہ یہ استدلال ان کو قیامت تک بھی نہ سوجھتا لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔

اس کے دو جواب ہیں ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو' چنانچہ ہمارے فقہاء نے تعریف یعنی یوم عرفہ میں حجاج کی مشابہت سے جمع ہونے پر انکار فرمایا ہے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں نیز حضرت ابن عباسؓ نے تحصیب کو لیس بشیء کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے یہ انکار فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھنا تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا اور حضرت عمرؓ کا انکار اجتماع علی شجرة الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہو گیا کہ ہر ہر مقام پر منقول نہ ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا اس کو خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے

یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنانا جائز نہیں یعنی مطلب حضرت عمرؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چونکہ تعید جائز نہیں ہے اس لئے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے مگر خدا تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ یہ کر سکتے ہیں کہ جناب رسول ﷺ نے پیر کے دن روزہ رکھا کسی نے وجہ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا ذالک الیوم الذی ولدت فیہ یعنی "اس دن پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادۃ عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت وسرور علی الولادۃ قربت ہے لہٰذا یہ جائز ہے۔ اس کے بھی دو جواب ہیں اول تو یہ کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش ہوں اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم کی عرض اعمال ہے پس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہو تو تم نے حکمت اصل علت کو ٹھہرا دیا حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہما کیوں منقول نہیں اور نیز مثل صوم یوم الاثنین کے کہ یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہئے دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت فتح مکہ معارج وغیرہ آپ نے ان کی علت سے کوئی عبادت کیوں نہ فرمائی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام نہیں ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا ورنہ دوسری نعمتوں کے دن بھی روزہ وتعید چاہئے اور اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص کی گئی تو ہم کہتے ہیں کہ حمل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہئے۔

پھر حیرت یہ ہے کہ یوم الولادۃ دوشنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ الولادۃ یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید منا دیں یوم الاثنین میں تو حضور ﷺ نے ایک عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس دلیل کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہر پیر کو عید کیا کریں غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین عید کا ثابت نہیں ہوتا' یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔

عقلی تردید

اب ہم اس بات میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں سے بعضے عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے ہیں جو راجع ہیں ملک اور قوم کی طرف اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ جس قدر عبادات شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے مامور بہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں۔ اول تو یہ کہ سبب میں بھی تکرار ہو یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو تو سبب کے مکرر ہونے سے مسبب بھی مکرر پایا جاوے گا۔ مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت آوے گا صلوٰۃ بھی واجب ہوگی اسی طرح صیام رمضان کے لئے سبب ہے جو شہود شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کے لئے فطر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ مسبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے چونکہ سبب ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل ہیں' اس لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحد سے مسبب متکرر اور متوحد ہو۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب اراءۃ قوت تھی اب وہ اراءۃ قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو یثرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا ہے تو حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شانے ہلاتے ہوئے اکڑ کر طواف کرو تا کہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہد ہو اب وہ سبب تو نہیں لیکن مامور بہ یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے۔ یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو امر خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ عید میلاد النبی کا سبب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت کی تاریخ ہونا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گزر گئی یا بار بار آتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ ختم ہوگئی کیونکہ اب جو ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے وہ اس خاص یوم الولادۃ کے مثل ہوتی ہے۔ نہ کہ عین؟ اور یہ ظاہر ہے پس مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا۔

لیکن یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولدت سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ یوم الولادۃ گزر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم اصل کا کیوں ہوا جواب یہ ہے کہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

ترجمہ: یادرکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ (خطرناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ وہ (کسی مطلوب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں وہ اللہ کے دوست) ہیں جو ایمان لائے اور (معاصی سے) پرہیز رکھتے ہیں۔

تفسیری نکات

ولایت کی دو قسمیں

فرمایا ولایت دو قسم کی ہے ایک عامہ دوسری خاصہ ولایت عامہ کو اس آیت میں اللّٰہ ولی اللذین آمنو ! الآیۃ میں بیان فرمایا یہ ولایت عامہ صرف ایمان سے حاصل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اس آیت میں عمل صالح کی بھی قید نہیں اور ولایت خاصہ اس آیت میں اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ بیان فرمایا اس ولایت خاصہ کے دو لوازم ہیں۔

۱- کثرت ذکر ۲- دوام طاعت اور ذکر میں بجائے دوام کے کثرت اس لئے کی گئی کہ دوام کی تکلیف سخت مشقت ہے جو مدفوع ہے (صوفی الخالق)

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: حق تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی سو تم (اپنے منصبی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔

تفسیری نکات

دعا کو فوراً قبول ہونا ضروری نہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بددعاء کی تھی اور اس پر اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا بھی فرمادیا گیا تھا مگر

موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کی اس قبولیت کا ظہور چالیس برس بعد ہوا تھا۔ بڑی ہی دلیری کی بات ہے کہ ادھر دعاء کی اور ادھر مستعجلانہ انتظار یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی نہیں ہوئی جن کی شان یہ تھی کہ مستجاب الدعوات تھے۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا حَتّٰىٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا الَّذِيٓ اٰمَنَتْ بِهِ بَنُوٓا إِسْرَآءِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۹۰﴾ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۹۱﴾

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو اس دریا سے پار کر دیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون ہے۔ اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادے سے (دریا میں) چلا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا (اور ملائکہ عذاب کے نظر آنے لگے) تو (سراسیمہ ہوکر) کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں جواب دیا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے اور (معائنہ آخرت کے) پہلے سے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے)

تفسیری نکات

فرعون نے صرف تکلم بکلمۃ الایمان کیا

فرمایا آیت سورہ یونس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے تکلم بکلمۃ الایمان کیا وجود تصدیق پر کوئی کلمہ دال نہیں سو اس سے عنداللہ اس ایمان کا مقبول ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر مان لیا جاوے کہ تصدیق بھی تھی تو یہ تصدیق اضطراری تھی جو کہ اکثر کفار کو حاصل ہے کما قال اللہ تعالیٰ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَآءَهُمْ اور خود فرعون کو بھی قبل سے تھی وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا مگر فرق اتنا تھا کہ اس سے پہلے تکلم نہیں کیا تھا اس وقت تکلم کیا سو یہ تکلم ممکن ہے کہ عذاب غرق سے بچنے کے لئے ہو نہ انقیاد و تسلیم کے طور پر جس طرح اس کی نظیر پہلے بھی ہوئی تھی۔ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ الی آخرہ اور ایمان مامور بہ اور مقبول وہ ہے جس میں تصدیق اختیاری ہو اور تکلم انقیادی ہو اس لئے اس آیت سے اس کا مومن مقبول الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا اور جو قول حضرت شیخ اکبر قدس اللہ سرہ کی طرف منسوب ہے حسب تحقیق شیخ عبدالوہاب شعرانی جیسا کہ

الیواقیت والجواہر میں ہے وہ شیخ اکبر کے کلام میں مدسوس ہے دوسرے نصوص سے اس کا ناری ہونا صاف ثابت ہوتا ہے جس میں تاویلات کی گنجائش نہیں اور خود شیخ کی آخری تصنیفات میں فرعون کا ناری ابدی ہونا درج ہے۔ جیسا کہ الیواقیت والجواہر میں ہے اور ایسے احتمالات وتاویلات سے تو کوئی کلام خالی نہیں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بغض فرعون

نیز احادیث سے بھی ملائکہ میں عشق ومحبت کے وجود کا پتہ چلتا ہے چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونسنا غلبہ محبت حق ہی کی وجہ سے تھا۔ جس سے فرعون کے ساتھ بغض فی اللہ بدرجہ غلبہ پیدا ہو گیا کیونکہ جب وہ ڈوبنے لگا تو کہنے لگا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو غصہ آیا کہ کم بخت نے ساری عمر تو خدائی کا دعویٰ کیا۔ اب مرتے ہوئے ایمان لاتا ہے وہ اس کم بخت کے لئے رحمت کو گوارا نہ کرتے تھے اس لئے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا تاکہ زبان سے پوری طرح بات نہ نکل سکے مبادا کہیں رحمت متوجہ ہو جائے چنانچہ ترمذی کی روایت میں خود حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے **فادسه فی فیه مخافة ان تدرکه الرحمة**

حضرت جبرئیل نے اس کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا مبادا رحمت خدا اس کی طرف متوجہ ہو جاوے۔

اور اگر اس پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت جبرائیل نے ایک شخص کو اسلام سے روکا' حالانکہ اسلام سے روکنا جائز نہیں۔ سو اس کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سو ان کو ان کا یہ ایمان لانا نافع نہ ہوا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا۔

تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گو رحمت فی الآخرۃ مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل واسر سے محفوظ رہے اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق واہلاک سے بچ جاتا۔

پھر اس پر اگر کوئی سوال کرے کہ اس آیت میں باسنا سے مراد عذاب دنیا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دنیا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں اور ظاہراً یہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے چنانچہ بعض محتضرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں

تم ان سے پردہ کرو تو ابتداء انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے اور فرعون کے واقعہ سے ظاہراً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول امنت بالذی امنت به بنوا اسرائیل بتلا رہا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کا حق پر ہونا اور ان کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کا ہوش ضرور تھا لیکن اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے پس اس دلیل سے انکشاف آخرت کی نفی نہیں ہوسکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے پس اشکال رفع ہو گیا۔

اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان سے اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ تھی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جائے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہئے اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو اور یہاں عجز ہو گیا کیچڑ کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید متحقق ہو گیا پھر کیچڑ ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا؟

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ جبرائیل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہر کا ایک گونہ ظہور نعش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا جیسا کہ ارشاد ہے فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ الایه آج ہم تیرا بدن مثال کے لئے قائم رکھتے ہیں۔

مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اسی ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا۔ اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشاء غلبہ بغض فی اللہ تھا اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا اس مبغوض حق سے ایسا بغض بدوں غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔ اسی طور پر حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ملائکہ میں محبت عشقیہ ہے اور شیطان میں یہ محبت نہ تھی اس لئے وہ کم بخت سجدہ نہ کر سکا پس محبت کا ہونا ضروری ہوا بغیر محبت کے نری طاعات و عبادات و علوم کافی نہیں کیونکہ ان کا بھروسہ کچھ نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ محبت طبعی ہی کا غلبہ ہو بلکہ محبت عقلی کا غلبہ بھی کافی ہے۔

سُوْرَۃ ھُوْد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا

ترجمہ: اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو۔

تفسیری نکات

اس جگہ ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

ہر شخص کی روزی اللہ کے ذمہ ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا رزق خدا کے ذمہ ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قحط کے زمانہ میں بھوکوں مر جاتے ہیں اس کا جواب یہ ہے رزقھا من اضافت ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کا رزق مقدر ہے اس کا پہنچانا خدا کے ذمہ ہے اب جو لوگ بھوکوں مر جاتے ہیں ان کا رزق ہی نہ رہا تھا۔ اس لئے وہ فاقہ سے مر گئے اگر ان کا رزق باقی ہوتا تو کبھی فاقہ سے مرتے۔

واعظین کی ایک غلطی

اور اسی طرح بعض واعظین کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے وعدہ رزق کا فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا تو پھر لوگ پریشان کیوں ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اس آیت پر ایمان نہیں ہے سو یاد رکھو کہ یہ الزام بھی محض غلط ہے کہ اس آیت پر مسلمانوں کا ایمان نہیں ہے نہیں ضرور سب کا ایمان ہے اور باوجود ایمان ہونے کے پریشانی بھی اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے تفصیل

اس اجمال کی یہ ہے کہ وعدے دو قسم کے ہیں۔ ایک مبہم اور ایک معین اللہ تعالیٰ نے مبہم وعدہ فرمایا ہے کہ رزق ملے گا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ کب ملے گا اور کہاں سے ملے گا اور کس طریق سے ملے گا اور کتنا ملے گا تو پریشانی بوجہ ابہام کے ہے اور ساتھ ہی اس مبہم وعدے پر پورا یقین ہے کہ وقت مقدر پر ضرور ملے گا بعض واعظین اسی الزام کے موکد کرنے کے لئے مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر کوئی دوست دعوت کردے تو اطمینان ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اطمینان نہیں یہ بھی غلط اور قیاس مع الفارق ہے اور خواہ مخواہ مسلمانوں کو کافر بنانا ہے واللہ العظیم اگر حق تعالیٰ کے کلام مجید میں معین وعدہ ہوتا تو ہرگز ہرگز کسی کو بھی پریشانی نہ ہوتی اور اگر دعوت میں وقت معین نہ کیا جاوے مبہما کہہ دیا جاوے کہ کسی وقت کی دعوت ہے تو وہاں بھی اطمینان نہ ہوتا یہی بات فرمائی ہے کہ رزق ملے گا اس پر ایمان ہے شریعت میں غلو نہ کرنا چاہئے۔ جس قدر جو بات ثابت ہو اس پر رہنا چاہئے اہل کتاب کو ارشاد ہے یاهل الكتاب لا تغلوا في دينكم یعنی اے اہل کتاب دین میں غلو نہ کرو باوجود ان کے غیر مکلف بالفروع ہونے کے ان کو خطاب کیا گیا تو ہم تو بطریق اولیٰ اس مامور بہ کے مکلف ہوں گے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا

اتباع دین میں ضرورت سعی

ہر جاندار کی روزی خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے جو بدوں سعی کے بھی اس کو مل سکتی ہے مگر اس پر بھی لوگ دنیوی مقاصد میں سعی کو ضرور سمجھتے ہیں اور آخرت کے ثمرات کا وعدہ تو بدوں سعی کے ہے ہی نہیں چنانچہ صاف ارشاد ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا۔

یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا جیسا کریگا ویسا بھرے گا پھر تعجب ہے کہ لوگ دین میں سعی کو کس لئے ضروری نہیں سمجھتے جب کہ بدوں سعی کے اس کے حصول کا وعدہ نہیں اہل اللہ نے اس فرق پر نظر کر کے دنیوی مقاصد کے لئے سعی کو ترک کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ روزی کا ذمہ تو حق تعالیٰ نے لے لیا ہے اس کے لئے سعی کی کیا ضرورت ہے اور دین کے کاموں کو ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے ہم کو اس کے لئے سعی کرنا چاہئے۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ دنیا خدا کا ایک گھر ہے اور ہم یہاں مہمان ہیں اور حدیث میں وارد ہے الضيافة ثلاثة ايام کہ مہمانی تین دن تک کرنی چاہئے جب ہم دنیا میں آئے تو تین دن تک تو ہم خدا تعالیٰ کے مہمان ہیں اور خدا تعالیٰ کے یہاں ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وان يوما عند ربك كالف سنة مما تعدون تو ہم کو تین ہزار سال کے لئے تو بالکل بے فکری ہے اگر اس سے زیادہ عمر ہوئی تو پھر کچھ انتظام سوچ لیا جائے گا۔

طبعی و عقلی خوف کا فرق

اب یہاں سے واعظین کی غلطی معلوم ہوگئی کہ وہ اپنے وعظوں میں اس قسم کے مضامین بیان کیا کرتے ہیں کہ افسوس ہے مسلمانوں کو خدا پر اتنا توکل بھی نہیں جتنا ایک دوست پر بھروسہ ہوتا ہے اگر ایک دوست یہ کہہ دے کہ شام کو تمہاری دعوت ہے تو فوراً چولہا ٹھنڈا کر دیں گے اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو مگر خدا کے وعدہ پر ایسا اطمینان نہیں ہوتا یہ ان کی غلطی ہے اس لئے کہ دوست کی دعوت پر اس واسطے چولہا ٹھنڈا کیا ہے کہ اس نے وقت کی تعیین کر دی تھی کہ شام کو دعوت ہے اور تعیین میں یہ خاصہ طبعی ہے اور خدا تعالیٰ کا وعدہ مطلق ہے کسی وقت کی اس میں تعیین نہیں ہے اگر یہاں بھی تعیین ہوتی تو کوئی مسلمان ہرگز چولہا گرم نہ کرتا۔ یہاں اہل توکل کو بھی عقلی توکل ہے۔

خوف طبعی

یہاں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے انبیاء کی نسبت فرمایا ہے **یخشونه ولا یخشون احدا الا اللـه** کہ وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں آیا ہے کہ وہ اژدہا سے ڈر گئے تھے جواب یہ ہے کہ وہ خوف طبعی تھا۔ اور نص میں خوف عقلی مراد ہے اور خوف عقلی انبیاء کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ہوتا کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کہ بدوں خدا کے حکم کے کوئی چیز ضرر نہیں دے سکتی۔ وہ ضار و نافع حق تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں۔

اس آیت میں صراحۃً بیان فرمایا ہے جو سورہ ہود کی آیت ہے

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

(اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا (اب) وہ اترانے لگتا ہے اور شیخی بگھارنے لگتا ہے۔ مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (اور وہ ان کی طرح نہیں ہوتے ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے)

رحمت ظاہرہ و باطنہ

اس میں حق تعالیٰ نے انسان کا ایک طبعی خاصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کی حالت یہ ہے کہ اگر ہم اس کو کسی

رحمت کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے یہاں رحمت عام ہے رحمت ظاہرہ و باطنہ دونوں کو کیونکہ اس جگہ اس کو اطلاق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

رحمت کی دو قسمیں

دوسری جگہ تصریح فرمائی ہے کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اپنی نعمتوں کو کامل کیا ہے ظاہری بھی اور باطنی بھی نعمت ظاہرہ کے معنی یہ ہیں کہ محسوس ہو اور باطنہ وہ ہے جو محسوس نہ ہو خواہ دینی نعمت ہو یا دنیوی نعمت باطنہ دینیہ کی مثال تو شوق و ذوق وغیرہ سے ایسے ہی انس واطمینان وغیرہ رنگ مختلف ہیں کسی نعمت کا رنگ کیفیت عشقیہ جذبیہ کے ساتھ ہے اور کسی کا سلوک و معرفت عقلیہ کے طور پر باقی نعمت ہونے میں دونوں برابر ہیں اور نعمت باطنہ دنیویہ کی مثال عقل وشعور وادراک وتمیز وذکاوت وفطنت وعلم وغیرہ ہے بہر حال یہاں نعمت باطنہ سے اصطلاح تصوف تو مراد ہے نہیں مگر صوفیہ جن کو نعم باطنہ کہتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ضرور ہیں گو ان میں انحصار نہ ہو اور منا کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رحمت غیر مکتسبہ موہوبہ مراد ہے جس میں اختیار انسان کو دخل نہ ہو۔ کیونکہ نعمت مکتسبہ اختیاریہ کے سلب پر رنج کرنے کی ممانعت نہیں نہ اس پر یہ وعید ہے مثلاً کوئی شخص نماز پڑھتا روزے رکھتا ہے پھر کسی دن یہ نعمت سلب ہو جائے کہ نماز روزہ فوت کر دے تو اس پر رنج ہونا چاہئے اور اس رنج کرنے پر کوئی وعید نہیں ہے یہ وعید تو رحمت موہوبہ غیر مکتسبہ کے سلب پر رنج و پریشانی کرنے کے متعلق ہے چنانچہ منا رحمۃ اس کا قرینہ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہے نہ سلباً نہ وجوداً اگر کوئی نعمت موہوبہ بدوں اس کے اختیار کے سلب ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا نہ قرب میں کمی ہوگی اور اگر کوئی مصیبت ونقمت بدوں اس کے اختیار کے پیدا ہو جائے تو اس پر بھی مواخذہ نہ ہوگا نہ قرب میں کمی آئے گی بشرطیکہ اپنے اختیار کو ذرا دخل نہ دے مثلاً برے برے وسوسے از خود آنے لگیں۔

آگے فرماتے ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ، اس میں اول مغفرت کو مقدم فرمایا اس کا مزہ عشاق سے پوچھو غیر عشاق کو اس کی زیادہ قدر نہ ہوگی وہ تو سمجھیں گے کہ بس صبر اور اعمال صالحہ کا صلہ کیا ملا کہ گناہ بخش دیئے گئے نہ جنت کا ذکر ہے نہ حور وقصور کا مگر عشاق کے دل سے اس کی قدر پوچھو کہ وہ اس کو سنتے ہی زندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو طلب رضا ہی میں مرتے ہیں اور جنت کی طلب بھی ورضا ہی کے لئے کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

با تو دوزخ جنت است اے دلربا بے تو جنت دوزخ ست اے جانفزا

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ

ترجمہ: کیا (اس دعویٰ یا دلیل کو) تمہارے گلے مڑھ دیں گے اور تم نفرت کئے جاؤ'

تفسیری نکات

نفی جبر

کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ میں مشہور یہ ہے کہ یشاء کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے کہ اللہ میاں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور یہ عقیدہ بالکل حق ہے مگر بعضے کج فہم اس سے جبر پر اور ترک سعی پر استدلال کرنے لگے گو جواب ظاہر ہے کہ اس مشیت سے مشیت عبد کی نفی لازم نہیں آئی کہ جبر پر استدلال ہو سکے لیکن ایک دوسرا جواب بھی جو ایسے اغبیاء کے لئے زیادہ سہل ہے میرے خیال میں آیا کہ یشاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو یعنی جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کر دیتے ہیں اور یہ امر مشاہد ہے کہ جو شخص ہدایت چاہتا ہے اس کو ہدایت فرما ہی دیتے ہیں

اگر چہ یہ تفسیر کسی سے منقول نہ ہو مگر تائید اس کی دوسری آیت سے ہوتی ہے

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ یعنی عادت خداوندی یہی ہے کہ جب آدمی ارادہ کرتا ہے اس وقت حق تعالیٰ کی مشیت بھی متعلق ہو جاتی ہے۔

مسئلہ تقدیر

پھر اگر کوئی اس پر اشکال وارد کرے کہ خود ارادہ اس کا بھی تو مشیت حق پر موقوف ہے یعنی ہم نے یہ مانا کہ جب یہ ارادہ کرتا ہے اس وقت خدا تعالیٰ چاہتے ہیں بلا اس کے ارادہ کئے ہوئے خدا تعالیٰ کسی پر اپنی ہدایت کو نہیں چمٹاتے مگر خود اس کا ارادہ بھی تو خدا تعالیٰ ہی کی مشیت پر موقوف ہے یعنی بدوں خدا کی مشیت کے تو یہ ارادہ بھی نہیں کر سکتا بلکہ پہلے خدا کی مشیت ہوگی پھر بندہ کا ارادہ ہوگا چنانچہ صاف ارشاد ہے

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ تو اصل یہ ہے کہ بے شک بندہ ارادہ اسی وقت کرتا ہے جب خدا کی مشیت ہو اور بدوں خدا کی مشیت کے بندہ ارادہ نہیں کر سکتا۔ مگر تم کو تو پہلے سے معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کی مشیت نہ ہوگی بس تم مشیت کر کے تو دیکھو اور چاہ کر دیکھو جب تم اپنی مشیت پوری کر لو اور اس وقت بھی اگر خدا کی مشیت نہ ہو تب بے شک تم مجبور سمجھے جاؤ گے بس تمہاری مشیت خدا تعالیٰ کی مشیت کی دلیل انی ہوگی یعنی قبل سے تمہیں کیا معلوم کہ خدا کی مشیت نہیں ہوگی یہ تو بعد میں معلوم ہوگا اور معلوم نہ ہونے کی صوت میں اس

وقت تمہاری طرف تمہارا کام نہ کرنا یہ دلیل لمی ہے تمہاری بد معاشی اور شیطنت کی کیونکہ اس وقت تمہیں خدا کی عدم مشیت کی کیا خبر، غرض اگر مشیت کے وجود یا عدم کی ایسی ہی تحقیق مطلوب ہے تو تم مشیت کر کے دیکھو کہ خدا کی مشیت ہوئی یا نہیں اس وقت معلوم ہوگا کہ مشیت ہوئی اور بدوں اپنی مشیت کے تم نے مشیت حق کی نفی کا کیسے حکم لگا دیا یہ تو تحقیقی جواب ہے۔

اور الزامی جواب یہ ہے کہ مشیت الٰہی عام ہے دنیوی اور اخروی تمام افعال کو تو جیسا اخروی افعال میں یہ عذر ہے کہ اگر حکم خداوندی ہوگا اور خدا کی مشیت ہوگی تو کار خیر کر لیں گے تو دنیاوی افعال میں بھی ایسا ہی کیا کرو مگر دنیاوی افعال میں تو ایسا نہیں کرتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق مقصود نہیں ہے محض شرارت ہے۔

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ قرآن میں نے اپنی طرف سے بنالیا ہے تو اس کا جرم میرے ذمہ ہے اور میں تمہارے جرموں سے بری ہوں یعنی جو کرے گا بھرے گا نہ تم میرے ذمہ دار ہو نہ میں تمہارا۔

مسئلہ کی دلیل بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں

فرمایا جب کوئی ہم سے مسئلہ پوچھتا ہے تو ہم بتا دیتے ہیں اور خوب سمجھا دیتے ہیں اور دلیل نہیں بیان کرتے کیونکہ دین کا بتانا جس قدر واجب ہے جس کے کتمان پر وعید ہے وصرف فتوی ہے دلیل کا بیان کرنا واجب نہیں 22 شوال روز دوشنبہ در مسجد

فوائد و نتائج ا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت والا مسئلہ کی دلیل کبھی بیان نہیں فرماتے تمام تصانیف مواعظ حضرت والا کے اس کے شاہد ہیں کہ کس وضاحت اور ثبوت کے ساتھ ہر بات کو بیان فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ دلیل کے بیان کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے بہت سے موقع پر اسے بھی ہوتے ہیں کہ دلیل کا بیان کرنا بیکار ہوتا ہے بلکہ بعض جگہ مضر ہوتا ہے تو حال یہ ہوا کہ مفتی کو موقع و محل کا سمجھنا اور مستفتی کی حالت کا اندازہ کرنا از حد ضروری ہے تکلموا الناس علی قدر عقولھم جہاں دلیل کے بیان کرنے سے نفع ہو بیان کرے ورنہ نہ کرے بلکہ بعض موقعوں پر نفس مسئلہ کا جواب دینا بھی غیر ضروری بلکہ مضر ہوتا ہے علماء کو اس کا بہت خیال چاہئے جیسا کہ رائج ہے کہ جو کچھ بھی پوچھا جاوے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا جاتا ہے جو سوال سینکڑوں دفعہ کئے گئے اور وہ مسائل ضرورت سے زیادہ منقح ہو چکے لوگ پھر بار بار پوچھتے ہیں اور ناتجربہ کار عالم اس کی از سر نو تنقیح کرنے لگتے ہیں گڑا ہوا فتنہ پھرا کھڑا آتا ہے اور سوائے تو تو میں میں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا راقم سے ایک جگہ پوچھا گیا کہ کوے کی نسبت تیرا کیا خیال ہے راقم کو معلوم تھا کہ یہ لوگ صرف بک بک

کرنے والے ہیں نہ تحقیق کی قابلیت ہے نہ تحقیق مقصود جواب دیا کہ اس باب میں دو فریق ہیں محرم اور مبیح ایک کے ساتھ مجھے بھی سمجھ لیجئے' اور اگر دوبارہ پوچھو گے تو جواب یہ ہے کہ میں نہیں بتاتا کہ میرا کیا خیال ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی سوال کا جواب نہ دینا **من سئل عن علم فکتمه الجم بلجام من النار** کے مصداق بنتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے سوال سوال بھی علم ہی نہیں کیونکہ مقصود علم نہیں مقصود فتنہ پردازی ہے مجادلین کے جواب میں خود حضور ﷺ کو حکم ہوا کہ سوال جیسا جواب دے کر ٹال دیجئے کہیں فرماتے ہیں **لا حجة بيننا و بينكم** اور کہیں **افتريته فعلي اجرامي وانا بری ما تجرمون** اور کہیں **قل ان افتريته فلا تملكون لی من الله شيئا** وغیرہ من الآیات ہاں طالب علموں اور سمجھدار لوگوں سے اور تحقیق پسندوں سے دلیل بیان کرنا اور تشفی کر دینا مناسب ہے واجب یہ بھی نہیں حالانکہ معلم تنخواہ اسی کی پاتا ہو حضرت والا کے پاس ایک سال آیا کہ اوج بن عنق اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کا عصا کتنے کتنے لمبے لمبے تھے جواب لکھا کہ جیسا یہ سوال غیر ضروری ہے جواب کی بھی ضرورت نہیں کسی سال کے جواب میں تحریر فرما دیتے ہیں مجھے فرصت نہیں کسی کو لکھ دیتے ہیں کسی اور عالم سے پوچھ لو کسی کا جواب نہیں دیتے اور اگر جواب کے لئے ٹکٹ بھیجا ہو تو اس کو واپس کر دیتے ہیں۔ کسی کو لکھ دیتے ہیں کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق منظور نہیں لہٰذا تضیع وقت سمجھ کر سکوت کیا جاتا ہے کسی سے ایک دفعہ اصل مسئلہ کی تقریر کر کے فرما دیا اس سے زیادہ مجھ کو معلوم نہیں آپ کی تشفی محبہ سے۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ

ترجمہ: حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں لیکن جس پر وہی رحم کرے۔

تفسیری نکات

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ایک آیت کی تفسیر

فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں جو یہ آیت آتی ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اس کی تفسیر میں اکثر آئمہ تفسیر نے یہ فرمایا ہے کہ یہاں عاصم بمعنے معصوم ہے فرمایا کہ اس میں تکلف ہے اور بے تکلف تفسیر یہ ہے کہ یہاں اصل میں دو جملے تھے ایک لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ دوسرا **لا معصوم الا من رحم** ان دونوں کو ملا کر ایک جملہ میں ادا کر دیا گیا۔ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ: اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر وشرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاو) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارش برسادے گا اور (ایمان وعمل کی برکت سے) تم کو اور قوت دے کر تمہاری (موجودہ) قوت میں ترقی کر دے گا۔ (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو۱۲۔

تفسیری نکات

اصلاح کے دو درجے

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کو ارشاد فرماتے ہیں اے میری قوم اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ خلاصہ ارشاد کا اصلاح کے دو درجے ہیں اول اپنے گناہ معاف کرانا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف طاعت کے ساتھ متوجہ ہونا اس پر کیا ثمرہ مرتب ہوگا يُرْسِلِ السَّمَآءَ الخ یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ کا ثمرہ دنیا میں تم کو یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر بارش بھیجیں گے اور تمہاری قوت موجودہ کے اندر اور قوت بڑھا دیں گے قوم عاد قوت کے اندر مشہور ہیں آگے ارشاد ہے اور خدا تعالیٰ کے حکم سے روگردانی مت کرو جرم کرتے ہوئے یہ آیت کا ترجمہ ہوا ترجمہ سے مضمون کی اجمالی تعیین ہوگئی ہوگی کہ اس کے دو جز ہیں اول مغفرت مانگنا دوسرے طاعت کی طرف رجوع کرنا خلاصہ حاصل یہ ہے کہ آیت میں دو مامور بہ ہیں استغفار اور رجوع الی الطاعۃ اور دو اس کے ثمرے ہیں۔

اصلاح کے دو ثمرات

اور دو اس کے ثمرے ہیں بارش ہونا اور قوت بڑھ جانا اور کمزوری اور ضعف کا جاتا رہنا اور ایک منہی عنہ ہے وہ مجرم ہو کر اعراض کرنا ہے ہود علیہ السلام نے جو اس میں فرمایا باعتبار مقصود ایراد کے یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا ہم کو ارشاد ہے گویا اللہ تعالیٰ ہم کو ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم کو کسی قسم کی شکایت قحط کی یا کمزوری یا اور بار یا تنزل کی ہو تو اس کی تدبیر اور اس کا علاج وہ ہے جو ہم نے بتلایا ہے۔

توبہ کے لوازم

اب دوسرا جزو اصلاح کا جو آیت میں مذکور ہے یہ ہے ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ یعنی پھر بعد استغفار کے حق تعالیٰ

کی طرف طاعت کے ساتھ رجوع ہو جاؤ' یہ بھی توبہ کے لوازم سے ہے۔

اصلاح کا ثمرہ

آ گے اس اصلاح کا ثمرہ بیان فرماتے ہیں یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا یعنی تم پر بارش بہت برسنے والی بھیجیں گے یہ بارش خواہ ظاہر میں ہو یا اگر ظاہر میں دیر بھی ہوگئی تو اس بارش کی روح تو ضرور ہی ہوگی اور اس کو باطن کی بارش کہنا چاہئے یعنی قلب پر رحمت کی بارش ہوگی جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے کہ کامیابی کی غایت طمانیت قلب وراحت روح ہے وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ یعنی دوسرا ثمرہ یہ ہوگا کہ تمہاری موجودہ قوت کو بڑھا دیں گے اس وقت تو قوت مالی و جاہی ہے اصلاح کے بعد قوت قلب عطا فرما دیں گے پھر جو بھی مصیبت آوے گی وہ صورت مصیبت ہوگی اور حقیقت میں یہ حالت ہوگی کہ اس مصیبت پر ہزار راحتیں قربان کرو گے اور زبان حال سے کہو گے۔

ہر چہ از دوست میر سد نیکوست

(جو کچھ محبوب کی جانب سے پیش آئے وہ خیر ہی ہوتا ہے)

آ گے ارشاد ہے وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ یعنی اعراض مت کرو مجرم ہو کر مطلق ولا تتولوا نہیں فرمایا۔

تولی کی قسمیں

اس سے معلوم ہوا کہ تولی کی دو قسمیں ہیں ایک صورت تولی ایک حقیقت تولی صورۃً تو یہ کہ بشریت سے غلطی ہوگئی ایسی غلطیوں سے انسان بچ نہیں سکتا اور حقیقت تولی ہوتی ہے مقابلانہ و باغیانہ تو فرماتے ہیں کہ باغیانہ تولی مت کرو یعنی باغی مت بنو اور گناہ سے تو کیسے پاک ہو سکتے ہو لیکن اگر گناہ ہو جائے تو ساتھ کے ساتھ توبہ کر لو حدیث شریف میں ہے کلکم خطاؤن و خیر الخطائین التواہون یعنی تم سب خطاوار ہو اور بہتر خطاوار توبہ کرنے والے ہیں۔ یہ تعلیم ہے حق تعالیٰ کی اور یہ طریق وہ ہے کہ جس سے قومی مالی جسمی دینی دنیوی ترقی ہوتی ہے اس کو پلے باندھو یاد رکھو کہ ہماری دینی دنیوی فلاح دین کے ساتھ وابستہ ہے جب بھی اس کے خلاف ہوا ہے تنزل او پستی اور ادبار اور قحط سب ہی بلائیں مسلط ہو جاتی ہیں۔

ترجمہ: اور اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ۔ (یعنی ایمان لاؤ) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارشیں برسا دے گا اور (ایمان وعمل کی برکت سے) تم کو اور قوت دے کر تمہاری (قوت) موجودہ میں ترقی دے گا (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو'

خلاصہ آیت

حضرت ہود علیہ السلام کا ارشاد نقل کرنے میں ایک خاص مصلحت ہے وہ یہ کہ آپ صاحب کو معلوم ہو جاوے کہ یہ مضمون بہت ہی اہتمام کے قابل ہے اس لئے کہ قوم عاد بہت پرانی قوم ہے پس جبکہ وہ بھی اس مضمون کے مخالف ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات ہے کہ ہمیشہ سے انبیاء اپنی اپنی قوم کو کہتے آئے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۤءَ رَبُّكَ ۗ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۤءَ رَبُّكَ ۗ عَطَاۤءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ: سو جو لوگ شقی ہیں وہ دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ پکار پڑی رہے گی ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ آسمان وزمین قائم ہیں اگر خدا ہی کو منظور ہو تو دوسری بات ہے آپ کا رب جو کچھ چاہے اس کو پورے طور سے کرسکتا ہے۔ اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔

آخرت میں دوام تحت المشیت ہوگا

یہاں دو سوال ہیں ایک یہ کہ آیت میں خداوند تعالیٰ نے دونوں مقام میں خٰلِدِيْنَ فِيْهَا کے بعد مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ فرمایا ہے یعنی خلود ودوام جب تک ہوگا جب تک آسمان وزمین باقی ہیں اور ظاہر ہے کہ حشر ونشر کے وقت جب صور پھونکا جائے گا تو جمیع مخلوقات کی طرح آسمان وزمین بھی فنا ہو جائیں گے۔ تو جبکہ سموات والارض فنا ہوئے اور ان کے واسطے دوام نہ ہوا تو جو خلود اس کے ساتھ ہوگا وہ خلود غیر محدود نہ ہوا تو یہ خلود نہ کفار کے واسطے دوزخ میں ہوا نہ مومنین کے واسطے جنت میں اس کا جواب یہ ہے کہ

جن آسمان وزمین کے ساتھ تحدید اور ظرفیت دوام کی اس جگہ فرمائی گئی ہے وہ آسمان وزمین ہمارے اس عالم فانی کے سموات والارض نہیں ہیں بلکہ ان سے اس عالم کے سموات والارض مراد ہیں اور ان کا دوام غیر محدود ہے اور اس پر تعجب نہ کرو کہ کیا وہاں بھی آسمان وزمین ہوں گے۔ سو سمجھ لو کہ وہاں کے آسمان وزمین تو یہاں کے آسمان وزمین سے بھی بڑے ہیں اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں۔

غیب را ابرے و بادے دیگرست آسمانے آفتابے دیگرست

وہاں کا بادل اور پانی اور ہی پانی ہے وہاں کا آسمان وآفتاب ہی جدا ہے بلکہ میں اس سے بھی زیادہ عجیب بات سناؤں خود اس عالم میں ایسی چیز موجود ہے یعنی روح میں آسمان وزمین اس آسمان وزمین سے زیادہ عجیب موجود ہیں اس کو حکیم سنائی فرماتے ہیں۔

آسماں ہاست در ولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں

یہاں مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا جنت میں اور کافرین کا دوزخ میں ہمیشہ رہنا یقینی نہیں مشیت سے ہے اس میں استثناء بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اگر چاہیں نکال بھی دیں گے ساری عمر کا وعدہ نہیں ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ جس سے جنتیوں کی تو کمر ٹوٹ گئی ہوگی کہ ہماری ساری تمناؤں اور آرزوؤں کا مدار یہی دوام تھا لیکن قسمت سے یہاں پر بھی دوام سے محروم اور خلود کو ترستے رہے۔ اور دوزخیوں کے غنچہ آرزو کھل گئے ہوں گے کہ بھائی خلود فی النار کو سن کر تمام دنیا کے مزے تلخ ہو رہے تھے چلو اس کھٹکے سے نجات ملی سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں پر ما مصدر یہ بمعنی ظرف ہے پس ماشاء ربک کے معانی یہ ہیں الا ان یشاء ربک یعنی خلود تو ہمیشہ رہے لیکن اگر خدا تعالیٰ کی مشیت اس کے خلاف کے ساتھ متعلق ہو جاوے تو خلود نہیں ہوگا لیکن چونکہ دلائل سے یہ امر یقینی ہے کہ مشیت رب کبھی اس کی مقتضی نہ ہوگی کہ مومنین کو جنت سے یا مشرکین کو دوزخ سے نکالا جاوے لہٰذا خلود کے خلاف کبھی واقع نہ ہوگا تو خلود ثابت رہا اور کوئی خدشہ خلود میں نہیں رہا باقی یہ کہ نکتہ اس استثناء میں کیا ہوا اور الا ماشاء ربک کے زائد کرنے کا فائدہ کیا ہوا تو وہ فائدہ یہ ہے کہ اس سے مخلوق کے بقاء اور رب العزت کے بقاء میں فرق ظاہر ہوگیا تا کہ کسی غیر محقق کو یہ خیال نہ ہو کہ اوفوہ اب تو ہم کو بھی دوام کا سرٹیفکیٹ مل گیا چلو اب تک جو ہم وجوب کے درہ سے گرے ہوئے تھے اس فرق کی علت یہ ہے کہ گرانمایہ موتی دوام کا تھا جو آج ان کی فیاضی سے ہم کو مل گیا جس کے باعث آج امتیاز کا پردہ اٹھ گیا اور آج سے ہم بھی واجب بن گئے اور ان تخیلات وتوہمات کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں لہٰذا اس قسم کے تخیلات موجبہ للشرک سے بچانے کے لئے الا ماشاء ربک فرمایا کہ اس عنوان خالدین فیها کے معنوں دوام سے بھول نہ جانا یہ نہ سمجھنا کہ ہم مساوی واجب کے ہو کر

ممکنیت کے پیراہن سے خارج ہو گئے نہیں بلکہ تم ممکن ہی ہو اور ہم واجب ہی ہیں دوام اگرچہ تمہارے حصہ میں بھی آ گیا لیکن تمہارا یہ دوام تو داخل تحت المشیۃ ہے ہمارے ارادہ پر موقوف ہے کہ جب تک ہم چاہیں تم کو اس دوام میں رکھیں اور جب چاہیں کان پکڑ کے نکال باہر کریں گو نکالیں گے نہیں مگر پھر بھی تحت المشیۃ ہے بخلاف ہمارے دوام کے کہ ہمارا دوام مستقل بالذات ہے کسی کی مشیت پر موقوف نہیں کوئی احتمال اس دوام کے فنا ہونے کا نہیں ہے اس نکتہ کی طرف شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سہل عنوان سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس سے مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ یہ دوام تحت المشیۃ ہے۔

ترجمہ: اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہو گا۔

سعادت و نحوست کی حقیقت

سعادت کی حقیقت لغت میں نیک بختی ہے جس کے معنی ہیں خوش قسمتی مطلب ہی ہوا کہ جو لوگ اچھے نصیب والے ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور اس حقیقت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دخول جنت میں عمل کو دخل نہیں بلکہ جس کا نصیب اچھا ہے جس کی تقدیر بھلی ہے وہی جنت میں جائے گا سو یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جنت میں جانے کے لئے عمل کی ضرورت نہیں اگر ایسا ہوتا تو قرآن و حدیث دو قومی کی تاکید اور گناہوں پر وعید کیوں ہوتی؟ کیا یہ تاکید و وعید بے کار ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ جس کے نصیب اچھے ہیں جس کی تقدیر بھلی ہے اس کے متعلق وہاں یہی لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص چونکہ عمل نیک کرے گا اس لئے جنت میں جائے گا پس صاحب نصیب وہی ہے جو نیک عمل کرتا ہے اور بد نصیب وہ ہے جو برے عمل کرتا ہے نصیب کا اچھا ہونا تقدیر کا بھی ہونا عمل صالح پر موقوف ہے قانون اور قاعدہ یہی ہے۔

یوں خلاف قاعدہ کسی پر فضل ہو جائے وہ اور بات ہے مگر وہ بھی صرف ہمارے نزدیک خلاف قاعدہ ہو گا کیونکہ ہم کو اس کے عمل کی خبر نہیں باقی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی خلاف قاعدہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر شخص کی پوری خبر ہے تو جس کو باوجود بد عملی کے بدوں عذاب جنت میں بھیجا جائے گا اس کے پاس کوئی عمل صالح اتنا بڑا ہو گا جو تمام گناہوں پر غالب آ گیا ہے جس کی خبر خدا تعالیٰ کو تھی ہم کو خبر نہ تھی۔

سعادت کے دوسرے معنی اور بھی ہیں جو نحوست کے مقابل ہیں یعنی بابرکت ہونا' اس کے اعتبار سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ بابرکت ہیں وہ جنت میں جائیں گے اور جو منحوس ہیں وہ جہنم میں جائیں گے اس سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ حقیقی منحوس کون ہیں؟ صرف وہ ہیں جو کہ جہنم میں جائیں گے۔ اور یہ جو مشہور ہے نحوست کہ بعض لوگ قمری کو یا الو کو یا کیلے کے درخت کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں یہ کوئی چیز نہیں میرٹھ

میں ایک بنیا منحوس گھوڑوں کو خریدتا تھا اور بہت نفع کماتا تھا اس کے حق میں وہی بابرکت تھے بعض لوگوں کو قرآن کی اس آیت فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ تو ہم نے ان پر ایک ہوائے تند ایسے دنوں میں بھیجی جو (ان کے حق میں) منحوس تھے سے شبہ ہو گیا ہے کہ بعض ایام بھی منحوس ہوتے ہیں مگر انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ایام نحسات کی تفسیر دوسری آیت میں سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ وارد ہوئی ہے تو اس کو ملا کر یہ لازم آئے گا کہ کوئی دن بھی مسعود نہیں بلکہ سب ایام منحوس ہی ہیں اور اس کا کوئی قائل نہیں لہذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہوسکتا دراصل ایام میں سعد و نحس کا مسئلہ اہل نجوم کا اختراع ہے اور شیعہ نے حضرت علیؓ کی طرف بھی اس کو منسوب کیا ہے مگر وہ روایت موضوع ہے شریعت میں بعض ایام متبرک تو ہیں مگر منحوس کوئی دن نہیں رہا یہ سوال کہ پھر ایام نحسات کے کیا معنی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے معانی نحسات علیہم ہیں یعنی قوم عاد کے حق میں وہ ایام منحوس تھے کیونکہ ان پر ان ایام میں عذاب آیا تھا اور وہ عذاب مسبب تھا کفر و معصیت سے پس معلوم ہوا کہ اصل نحوست کی چیز معصیت ہے بہر حال خود اس آیت سے معلوم ہوا کہ سعادت نام ہے طاعت کا اور نحوست نام ہے معصیت کا' اب بتلاؤ کہ منحوس ہم ہیں یا الو اور قمری اور کیلا' ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معصیت سے مبرا ہیں تو یہ کیسی غلطی ہے کہ ہم اپنی نحوست کو دوسری چیزوں پر ٹالتے ہیں بس ہماری وہ حالت ہے۔

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچوں آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

سعدوا میں نکتہ

اب میں اس آیت کے متعلق چند علمی نکات بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں میرے خیال میں اس جگہ سعدوا بصیغہ مجہول میں ایک راز یہ سمجھ آتا ہے بشرطیکہ لغت سے اس کی تائید ہو جائے اور مسعد کا متعدی ہونا معلوم ہو جائے مجھے یہاں قاموس نہیں ملی ورنہ تحقیق کر لیتا (لغت سے اس کی تائید نہیں ملی سعد و سعد بالفتح و بالضم بمعنی واحد ہے متعدی اسعد اللہ ہے مگر مفعول نہیں بلکہ مسعود ہے کما فی القاموس میں کہتا ہوں کہ اس تحقیق کے بعد اس نکتہ کو اس طرح بدل دیا جائے گو سعدوا متعدی نہیں مگر صورت متعدی کی رکھتا ہے اس صورت میں اس نقطہ کا الہام ہے گو دلالت نہیں (اشرف علی) کہ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ تم جو کامیاب اور نیک بخت کئے گئے ہو یہ تمہارا کیا ہوا نہیں بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے محض عنایت ہی عنایت ہے کیونکہ ہر چند کہ سعادت کا مدار عمل صالحہ پر ہے مگر عمل صالح کی توفیق محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہے یہ جو آپ کو نماز کا شوق ہے اور رات کو تہجد میں اٹھتے ہیں یہ آپ کا کام نہیں بلکہ کوئی اور ہی اٹھا رہا ہے بس ہماری حالت یہ ہے۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ است

یہ تو سعدوا میں نکتہ تھا۔

دو علمی نکتے

اس کے بعد مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ کے متعلق دو علمی نکتے عرض کرتا ہوں کیونکہ اس پر بظاہر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت کا جنت میں خلود آسمان وزمین کے دوام کے برابر ہوگا اور آسمان وزمین کا دوام محدود ہے تو اہل جنت کا خلود بھی محدود ہوا۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہاں پر سموت والارض سے مراد جنت کے آسمان وزمین ہیں دنیا کے آسمان وزمین مراد نہیں مطلب یہ ہوا کہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک جنت کی زمین وآسمان رہے اور جنت کی زمین وآسمان کا دوام غیر محدود ہے ان کے لئے کبھی فنا نہیں تو اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کی دلیل کہ جنت کی زمین وآسمان کا دوام محدود نہیں وہ آیات ہیں جن میں خٰلدین فیھا ابدا وارد ہے اور احادیث ہیں جن میں یا اھل الجنة خلود ولا موت و یا اھل النار خلود ولا موت وغیرہ وارد ہے۔

رہا یہ سوال کہ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسا جیسے کسی کو انعام میں کوئی گاؤں دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ جب تک یہ گاؤں باقی ہے اس وقت تک تم اس کے مالک ہو تو اسی طرز سے مخاطب کی پوری تسلی ہو جاتی ہے کہ مجھ سے اس کا چھیننے والا کوئی نہیں یہی مقصود اس جگہ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کے بڑھانے میں ہے۔

اس کے بعد اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ کے متعلق ایک اشکال کو دفع کرنا چاہتا ہوں بظاہر اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا سے استثناء ہے ترجمہ یہ ہوا کہ اہل سعادت جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر جب خدا چاہے تو اسی سے شبہ ہوتا ہے کہ کسی وقت اہل جنت کا خلود منقطع بھی ہو جائے گا یا انقطاع کا احتمال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ خالدین سے مستثنیٰ نہیں بلکہ الذین سعدوا سے استثناء ہے اور ما بمعنی مــن ہے حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ اہل سعادت ہیں وہ جنت میں جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے وہ جنت میں نہ جائے گا یعنی بعض اہل سعادت ایسے بھی ہیں جن کو ہم لوگ سعید سمجھتے ہیں مگر خدا کے نزدیک وہ سعید نہیں ہیں واللہ یہ بات قاصمۃ الظھر ہے اس نے عارفین کی کمر توڑ دی ہے کیونکہ اس کی کسی کو خبر نہیں ہے کہ ہم خدا کے نزدیک کیسے ہیں۔

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

ابن عباسؓ نے دوسری جگہ سورہ اعراف میں اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ میں ما کو بمعنی من فرمایا ہے اس میں اور اس میں بظاہر کچھ فرق نہیں اس لئے یہاں بھی ما کو بمعنی من کہنے میں کچھ حرج نہیں اور اس کے بعد خلود اہل جنت میں کچھ اشکال باقی نہیں رہتا کیونکہ اس میں خلود سے استثناء نہیں ہے۔

مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس کی ایک اور تفسیر کی ہے جو بہت ہی عجیب ہے وہاں تک کسی کا ذہن نہیں پہنچ سکتا اس کا حاصل یہ ہے کہ الا ماشاء ربک سے اللہ تعالیٰ کو فرق کرنا منظور ہے اپنی ابدیت اور اہل جنت کی ابدیت سے کہ خدا تعالیٰ کی ابدیت کسی کی مشیت کے تابع نہیں اور اہل جنت کی ابدیت داخل مشیت ہے اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ سے فقط یہ بات بتلانا مقصود ہے کہ اہل جنت کی ابدیت مستقل نہیں بلکہ تابع مشیت الٰہیہ ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ ابدیت کسی وقت منقطع ہو جائے گی کیونکہ دوسری نصوص سے یہ امر معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی مشیت جو خلود اہل جنت کے متعلق ہے وہ کبھی منقطع نہ ہوگی یہ حاصل ہے شاہ صاحب کی تفسیر کا۔

مگر ان کی عبارت سے یہ مضمون ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ وہی سمجھے گا جس کو یہ معلوم ہو کہ اس مقام پر ایک اشکال ہے جس کو شاہ صاحب رفع کرنا چاہتے ہیں واقعی شاہ صاحب نے اس کو بہت سہل اور مختصر عنوان سے رفع کر دیا ہے جو ان کے تبحر علم کی دلیل ہے۔

ایک آریہ نے یہ اعتراض دوسرے عنوان سے شائع کیا تھا کہ خدا کا وجود بھی غیر متناہی ہے اور جنتیوں کا وجود بھی غیر متناہی ہے تو دونوں برابر ہو گئے۔

میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالفعل ہے اور جنتیوں کا وجود غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد ہے مگر شاہ صاحب کا جواب سب سے عمدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالذات ہے اور اہل جنت کا وجود غیر متناہی بالغیر ہے یعنی مشیت کے تابع ہے یہ چند نکات تھے جو اس آیت کے متعلق تھے اب میں آیات کا خلاصہ عرض کر کے بیان کو ختم کر دوں گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو آخرت کی راحتوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے تا کہ ان کو مستحضر کر کے ہم آخرت کی طرف رغبت کریں اور اس کے لئے سعی کریں اور طریقہ راحت اخرویہ حاصل کرنے کا یہ بتلایا ہے کہ سعادت حاصل کریں جس کا خلاصہ عمل صالح ہے۔

اور یہاں سے میں اہل علم کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اہل علم آج کل علم حاصل کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں عمل کا اہتمام اور تکمیل عمل کی کوشش نہیں کرتے اور حیرت ہے کہ اس پر وہ اپنے آپ کو نائب رسول ﷺ سمجھتے ہیں کیا یہی علم مجرد عن العمل وہ شے ہے جس سے تم نیابت رسول ﷺ چاہتے ہو اس علم خالی عن العمل کی تو وہ حالت ہے جس کے متعلق اہل تحقیق یوں فرماتے ہیں۔

علم رسمی سربسر قیل است قال — نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آں کہ رہ بنمایدت — زنگ گمراہی زدل بزد ایدت
ایں ہوس ہا از سرت بیروں کند — خوف وخشیت در دلت افزوں کند

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز! خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
علم ہنود ٔ غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی!
علم چوں بردل زنی یارے شود علم چوں برتن زنی مارے شود

حقیقی علم

حقیقی علم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ بدوں عمل کے نہیں ہوسکتی پس علم بدوں عمل کے جہالت کی مثل ہے۔ ؎ علمے کے رہ حق نہ نماید جہالت ست

غرض علم محض پر کفایت کرنا بڑی غلطی ہے۔ علماء وطلباء کو عمل کا پورا اہتمام کرنا چاہئے جب ہی ان کو سعادت حاصل ہوگی چونکہ اس بیان میں اہل علم وطلباء بھی شریک ہیں اس لئے یہ مضمون طالب علموں کی ضرورت کا بیان کر دیا گیا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا وآخرت کا چین چاہتے ہو تو سعادت حاصل کرو اور ایسی سعادت جس سے جنت کا دخول اولی حاصل ہو اور حق تعالیٰ کا قرب کامل عطا ہو علم دین مع العمل ہے گو سعادت کا ایک درجہ مجرد علم سے اور مجرد عمل سے بھی حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ نجات مطلق کے لئے نفس ایمان واسلام بھی کافی ہے مگر ناقص درجہ پر کفایت کرنا غلطی ہے۔

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ۝ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ۝

اس میں اہل جنت واہل جہنم دونوں کے لئے خَالِدِينَ فِيهَا کے ساتھ مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ کی قید ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ جنت ونار میں خلود مطلق نہ ہوگا بلکہ مقید ببقاء سموات وارض ہوگا اور اگر اس میں کچھ تاویل بھی کرلی جائے تو آگے إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ میں دوام سے استثناء ہے یہ بھی خلود کو مقید بالمشیت کر رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خلود لازم نہیں بلکہ مشیت پر ہے کہ جب چاہیں باہر نکال دیں۔

لطیفہ قلب

اب سنئے کہ مادامت السموات والارض کی تو دو توجیہیں ہیں ایک علماء ظاہر کے قول پر ایک صوفیہ کے قول پر یہ مطلب نہیں کہ جواب ثانی میں کچھ اصول تصوف کو دخل ہے بلکہ چونکہ وہ توجیہ علماء صوفیہ سے منقول تھی اس لئے میں نے علماء صوفیہ کی طرف اس کو منسوب کر دیا علماء ظاہر نے تو یہ کہا ہے کہ سموات وارض سے اس آیت میں یہ آسمان وزمین مراد نہیں بلکہ جنت ودوزخ کے آسمان وزمین مراد ہیں کیونکہ عالم آخرت میں بھی آسمان وزمین

موجود ہیں مولانا فرماتے ہیں

غیب را ابرے و آبے دیگراست آسمانے آفتابے دیگرست

حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آسمان ہاست در ولایت جان کار فرمائے امان جہاں

در رہ روح پست و بالا ہاست کوہائے بلند و صحرا ہاست

گوان اشعار میں جنت ودوزخ کا بیان نہیں بلکہ لطیفہ قلب کی وسعت کا ذکر ہے کہ اس میں بھی عالم محسوس کا نمونہ موجود ہے مگر میں نے مناسبت کی وجہ سے ان کو پڑھ دیا ہے کیونکہ اس کو عالم آخرت سے بہت مناسبت ہے بہرحال اب وہ اشکال مرتفع ہوگیا کیونکہ جب جنت ودوزخ کے لئے خلود ثابت ہے تو ان کے سماوات وارض کے لئے بھی خلود ہوگا فنا نہ ہوگا پس اب سعداء واشقیاء کے خلود فی الجنۃ والنار کو مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کے ساتھ محدود کرنے سے اشکال تحدید کا نہیں ہوسکتا رہا یہ شبہ کہ سموات وارض کا لفظ تو عربی لفظ ہے عربی لفظ سے وہی معنی مراد ہوسکتے ہیں جو لغۃ اس سے مفہوم ہوسکیں اور ان الفاظ سے تو لغۃ عالم ناسوت کے آسمان وزمین مفہوم ہوتے ہیں نہ کہ جنت ودوزخ کے پھر یہ تاویل کیونکر صحیح ہوگی جواب یہ ہے کہ سماء وارض کا اطلاق لغۃ ان پر ہو سکتا ہے گو اہل لغت نے اس کو نہ لکھا ہو کیونکہ لفظ عام ہے فالسماء ما یضلک والارض ما یقلک (اور عموم کی دلیل یہ ہے کہ سماء وارض کو اہل لغت نے اس آسمان اور اس زمین کا علم نہیں قرار دیا ورنہ پھر چاہئے کہ آسمان دوم وسوم تا ہفتم کو اور اس طرح طبقات ستہ ارض کو سماء وارض نہ کہہ سکیں کیونکہ اول اول تو لوگوں کو ایک ہی آسمان اور ایک ہی زمین کا علم ہوا تھا تو سماء وارض انہی کے علم ہوگئے بقیہ سموات وارضین کا علم تو بعد میں ہوا پھر ان پر یہ لفظ کیونکر صادق آیا بس جس طرح ان پر صادق آنا لغۃ صحیح ہے اسی طرح اگر اور کوئی فرد سماء یا ارض کا محقق ہوجائے اس پر بھی ان لفظوں کا اطلاق لغۃ صحیح ہوگا۔۱۲ظ) دوسرے اسی میں اختلاف ہے کہ واضع لغت کون ہے راجح یہ ہے کہ حق تعالیٰ واضع لغت ہیں اور انہوں نے آدم علیہ السلام کو سب اسماء کی تعلیم فرمادی تھی وعلم ادم الاسماء کلھا تو حق تعالیٰ نے سماء وارض کو بمعنی عام ہی وضع فرمایا ہے جس میں جنت ونار کے سماء وارض بھی داخل ہیں گو اہل لغت کو ان افراد کا علم نہ ہو چنانچہ جنت کے متعلق ارض کا اطلاق تو خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ اور بقیہ اطلاعات کی تصحیح کے لئے یہ نظیر کافی ہے رہا یہ کہ اس تقیید سے فائدہ کیا ہوا کہ اول مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کی قید لگائی پھر اس پر شبہ وارد ہوا پھر جواب کی ضرورت ہوئی تو بات یہ ہے کہ اس قید کا فائدہ محاورات میں غور کرنے سے معلوم ہوگا مگر افسوس یہ ہے کہ لوگ آج کل علوم درسیہ پہلے پڑھتے ہیں پھر قرآن کے الفاظ کو اصطلاحات درسیہ پر محمول کرنا چاہتے ہیں اس لئے اشکالات میں مبتلا ہوتے ہیں حالانکہ نزول قرآن کا محاورات پر ہے (اس وقت ان درسی اصلاحات کا کہیں وجود بھی نہ تھا۱۲)

فنا اور بقاء

اب محاورات میں غور کر کے دیکھئے کہ اگر ہم کسی شخص کو اپنا مکان رہنے کے لئے دیں اور وہ یہ کہے کہ جناب! یہ مکان مجھے کتنی مدت کے واسطے دیا گیا ہے اور یہ میرے پاس کب تک رہے گا اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ مکان رہے گا اس وقت تک تمہارے پاس رہے گا بتلایئے کیا محاورات میں اس سے زیادہ کوئی عنوان دوام و بقاء سکونت کو ظاہر کر سکتا ہے ہرگز نہیں گو اس جگہ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس مکان کو فی نفسہ دوام و بقاء ہے یا نہیں مگر سائل کو جو یہ تردد ہوا تھا کہ شاید ایسا بھی ہو کہ یہ مکان رہے اور ہم اس میں نہ رہیں یہ شبہ اس جواب سے بالکل رفع ہو گیا اور اس عنوان سے زیادہ کوئی صورت تسلی کی نہیں اسی طرح یہاں بتلایا گیا ہے کہ جب تک جنت و دوزخ موجود ہیں کیونکہ وجود عمارت کا سقف وارض ہی سے ہوتا ہے تو سموات والارض جنت و نار کا وجود خود ان کا وجود ہے ۱۲۔ اس وقت تک اہل جنت جنت میں اور اہل نار نار میں رہیں گے یہ نہیں ہو سکتا کہ جنت کے ہوتے ہوئے جنتی اس سے نکال دیئے جائیں یا دوزخ کے ہوتے ہوئے دوزخ والے (یعنی کفار ۱۲) اس میں نہ رہیں اس عنوان سے اہل دار کا لزوم دار کے ساتھ بتلا دیا گیا جو اس کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتا تھا رہا یہ کہ لزوم دائم و مستمر ہے یا محدود اس سے دوسرے مقام پر تعرض کیا گیا ہے اور جہاں خالدین فیھا کے ساتھ ابدا کی بھی تصریح ہے یہ توجیہ تو علماء سے منقول ہے اور بعض صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ سموات وارض سے مراد سموات وارض ملکوت نہیں بلکہ یہی عالم ناسوت کے سموات وارض مراد ہیں مگر بحالت موجودہ نہیں بلکہ بعد تبدیل کے کیونکہ جس طرح قیامت میں اموات زندہ ہوں گے اور مردے قبروں سے اٹھیں گے اسی طرح آسمان و زمین بھی دوبارہ پیدا ہوں گے۔ ارشاد ہے یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (اور ظاہر ہے کہ مردے جو زندہ ہوں گے وہ بعینہ وہی ہوں گے جو مرنے سے پہلے تھے اسی طرح آسمان و زمین بھی سعد حشر و نشر کے بعینہ یہی ہوں گے اور زمین کو جو نص میں غیر الارض کہا گیا ہے اس سے مغایرت بعض صفات میں مراد ہے مثلاً اس وقت جبال و اشجار اور پستی و بلندی نہ ہوگی بلکہ ساری زمین ہموار ہوگی اور مغایرت وصف سے تغایر ذات لازم نہیں آتا دیکھو اگر کوئی کالا آدمی گورا ہو جائے تو یہ نہ کہیں گے کہ یہ دوسرا آدمی ہو گیا وہ نہیں رہا ۱۲) اور شیخ اکبر کا کشف ہے کہ یہ سموات وارض ناسوت بعد حشر و نشر کے پھر فنا نہ ہوں گے جیسے اہل سموات وارض یعنی جن و انس بھی بعد حشر و نشر کے فنا نہ ہوں گے پس خلود کو مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کے ساتھ نص میں مقید کرنا عدم خلود اھل جنت وغیرہ کو مستلزم نہیں ہے کیونکہ خالد مذکورہ کے بعد یہ سموات وارض بھی دائم و مستمر ہوں گے اور نص میں ان کی اسی حالت کے ساتھ خلود اہل جنت و نار کو مقید کیا گیا ہے۔ فاندفع الاشکال اور شیخ اکبر کا

یہ کشف کسی نص کے بھی خلاف نہیں اور کوئی نص اس کی مصادم بھی نہیں اس لئے اس کے مان لینے کا مضائقہ نہیں مگر میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ہر کشف اپنی ذات سے ظنی ہے اس پر جزم نہ کیا جائے کیونکہ اس میں امر غیر مجزوم فی نفسہ کے ساتھ جزم ہوگا جو کہ شرعاً جائز نہیں۔

ارضاءِ رسول

ایک جواب مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کے اشکال کا یہ بھی دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے کلام اللہ میں ہمارے جذبات کا بہت لحاظ فرمایا ہے چنانچہ اس بناء پر حق تعالیٰ نے لفظ ارض کو سارے قرآن میں بصیغہ مفرد بیان فرمایا ہے حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ ارض بھی مثل سموات کے متعدد ہیں مگر قرآن میں سموات تو بصیغہ جمع ہیں اور ارض ہر جگہ بصیغہ مفرد ہے اس کا یہی جواب دیا گیا ہے کہ جو بہت لطیف ہے کہ حق تعالیٰ نے سموات وارض کا ذکر اثبات توحید کے لئے مقام استدلال میں فرمایا اور اہل عرب کو سموات کا تعدد تو معلوم تھا زمین کا تعدد معلوم نہ تھا اگر ارض کو بصیغہ جمع لایا جاتا تو آپس میں شور وشغب شروع ہو جاتا اور مقدمات ہی میں خلط مبحث ہو جاتا اور ہدایت میں تاخیر ہوتی یا کمی رہتی اس لئے حق تعالیٰ نے مخاطبین کے مذاق کی رعایت فرما کر تمام قرآن میں ارض بصیغہ مفرد ہی بیان کیا سبحان اللہ کتنی بڑی عنایت ہے حق تعالیٰ کی کہ وہ زائد باتوں میں ہدایت کو مؤخر کرنا نہیں چاہتے جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ یہاں بھی حق تعالیٰ نے ہمارے مذاق کے موافق دوام واستمرار کو بیان فرمایا ہے یعنی سموات وارض سے یہی آسمان زمین بحالت موجودہ مراد ہیں پھر بھی اشکال کچھ نہیں کیونکہ گو یہ زمین وآسمان فنا ہونے والے ہیں مگر اذہان عامہ میں ان کا فنا متحضر نہیں ہے چونکہ اس کی ابتداء کسی نے دیکھی نہیں اور قرن گزر گئے کہ اس پر ابھی تک فنا بھی طاری نہیں ہوا اس لئے اذہان عامہ میں اس کا فنا ہونا متحضر نہیں ہوتا گو اعتقاد دوام بھی نہ ہو پس اس صوت میں خلود اہل جنت کی بقاء سموت وارض کے ساتھ تحدید کرنا اس اثر کے اعتبار سے جو اذہان عامہ پر ہے دوام واستمرار ہی کو مستلزم ومفید ہوگا کیونکہ عوام کے مذاق میں بیان تام کی یہی صورت ہے اسی لئے شیطان کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (تجھ پر قیامت تک میری لعنت ہے) اس سے مراد یہ نہیں کہ قیامت کے بعد لعنت نہ رہے گی بلکہ دوام مراد ہے اور محاورات میں دوام کو یوں ہی تعبیر کیا کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ بخدا میں قیامت تک یہ کام نہ کروں گا اسی طرح الی یوم الدین اس نص میں بیان دوام واستمرار کے لئے ہے اور ایسے ہی مادامت السموات والارض عام بول چال اور عام محاورہ کے اعتبار سے دوام ہی کو مقید ہے گو اہل معقول کے نزدیک مفید نہ ہو۔

بہرحال مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کی قید کے تو متعدد جواب دیئے گے ہیں مگر الا ماشاء ربک کی تاویل میں لوگ بہت چکرا گئے ہیں بعض نے تو کمال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ استثناء زیادت کے لئے ہے نقص و

اخراج کے لئے نہیں مطلب یہ ہوا کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں بقاسموات وارض تک رہیں گے مگر یہ کہ خدا چاہئے تو اور بھی زیادہ رکھے کیونکہ بقاسموات وارض تو محدود ہے اور خلود جنت غیر محدود ہے اور ثانی کا اول سے زائد ہونا ظاہر ہے مگر نہ معلوم یہ زیادت علی المستثنی منہ استثناء کی کونسی قسم ہے اور میرے نزدیک صحیح جواب اور لطیف وہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب نے بیان فرمایا ہے جس کو میں اصطلاحی الفاظ میں بیان کرتا ہوں ورنہ شاہ صاحب نے تو ایسے سلیس عنوان سے بیان کیا ہے کہ عامی دیکھنے والا یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس جگہ شاہ صاحب نے اتنا بڑا مضمون حل کیا ہے۔

خلود اور مشیت

حاصل اس کا یہ ہے کہ الا ماشاء ربک میں ما مصدریہ ہے ای **الا وقت مشیئة کما فی قوله اتیتک خفوق النجم ای وقت خفوقه** پس معنی یہ ہوئے کہ **یخلدون فیها الا ان یشاء ربک عدم خلودهم فینقطع خلودهم**' رہی یہ بات کہ اس قید کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کا جواب شاہ صاحب نے دیا ہے کہ اس میں توحید کی حفاظت کی گئی' کہ خلود واجب اور خلود ممکن میں فرق ظاہر کر دیا گیا تا کہ کوئی خلود کی خبر سن کر بقاء دائم میں شریک ہو کر مساوات مع الواجب کا دعویٰ نہ کرنے لگے کہ گو ہم جہنم میں جائیں گے سہی مگر یہ فخر تو ہمارے لئے ثابت ہو گیا کہ ہم مثل واجب کے خلود دوام کے ساتھ متصف ہو جائیں گے۔ تو بتلا دیا گیا کہ مساوات کا دعویٰ کیا لئے پھرتے ہو تمہارے خلود میں اور واجب کے خلود میں زمین آسمان کا فرق ہوگا واجب کا خلود کسی کی مشیت کے تابع نہیں اور تمہارا خلود ہماری مشیت کے تحت میں ہے جب چاہیں سب کو کان پکڑ کر نکال سکتے ہیں اور سب کو فنا کر سکتے ہیں گو ایسا نہ کریں مگر ایسا نہ کرنے کی صورت میں بھی تم کو وہ خلود اس طرح نصیب ہوگا کہ ہر دم ہماری طرف سے افاضہ وجود ہوگا ورنہ تم کیا وجود اپنے باپ کے گھر سے لائے تھے۔

نیاور دم از خانہ چیزے نخست   تو وادی ہمہ چیز دمن چیز تست

تو حاصل یہ ہوا کہ خلود تو ہوگا لیکن اگر ہم چاہیں تو خلود نہ رہے' سبحان اللہ کیسی عجیب بات فرمائی ہے اور آپ کو حیرت ہوگی اگر شاہ صاحب کے الفاظ دیکھیں کہ انہوں نے اصطلاحی الفاظ کو چھوڑ کر سلیس لفظوں میں کس طرح اس دقیق مضمون کو بیان فرمایا ہے اور یہ واقعی بڑا کمال ہے۔

اور دوسرا جواب میرے ذہن میں آیا ہے کہ ماشاء ربک میں ما بمعنی من ہے اور محققین نے لکھا ہے کہ لفظ ما اصل لغت میں ذوی العقول وغیر ذوی العقول دونوں کے لئے عام ہے اردو کی ماں بھی تو عام ہے (کہ انسان کی ماں بھی ماں ہے اور جانور کی ماں بھی ماں ہے ہاں من ذوی العقول کے لئے خاص ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ غیر ذوی العقول کے لئے خاص ہے صحیح نہیں پس الا ماشاء ربک کے معنی ہیں الا من شاء ربک ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ ما بمعنی من ہے۔

سعید اور شقی

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ متکلمین نے عقائد میں یہ مسئلہ طے کر دیا ہے السعید قدیشقی والشقی قدیسعد شرح عقائد میں اس کی تصریح ہے اور اس میں شقی وسعید سے وہ مراد نہیں جو علم الٰہی میں شقی یا سعید ہو بلکہ ظاہری سعید وشقی مراد ہے جس کو خاص حالات سے شریعت کا فرد مومن کہتی ہے تو ایسا شقی یعنی کافر کبھی علم الٰہی میں سعید یعنی مومن ہوتا ہے اور اسی طرح کبھی سعید علم الٰہی میں شقی ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص ظاہر میں کافر معلوم ہوتا ہے ہمارے نزدیک تو وہ خالدین فی النار سے ہے لیکن ممکن ہے کہ مرتے ہوئے اس کو اسلام نصیب ہو جائے اور علم الٰہی میں وہ سعید ہو جیسے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے نانوتہ میں ایک بنیا مرا مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس کو خواب میں دیکھا کہ جنت میں پھر رہا ہے پوچھا لالہ جی تم یہاں کہاں کہا مولوی جی میں نے مرتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھ لیا تھا وہ قبول ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا تو دیکھئے ساری عمر تو لالہ جی نے سود بٹا کھایا اور سود ہی میں جنت بھی لے مرا ایسی نظیریں اور بھی نہ معلوم کتنی ہوں گی اب آیت کا حل یوں ہوگا۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا (و کفر وافی الظاهر) فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (ای الا من شاء ربک من الاشقیا فیسعد ویومن ویدخل جنة ۱۲) واما الذین سعدوا (فی الظاهر ۱۲) ففی جنة خالدین فیها ما دامت السموات والارض الا ما شاء ربک (ای الا من شاء من السعداء فیشقی ویدخل النار ۱۲)

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ ظاہر میں سعداء ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر جس کو خدا چاہے گا کہ بعضے سعید علم الٰہی میں شقی ہیں ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے وہ جنت میں نہ رہیں گے اور جو لوگ ظاہر میں اشقیاء ہیں وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے مگر جس کو خدا چاہے کیونکہ بعضے شقی علم الٰہی میں سعید ہیں ان کا خاتمہ اسلام پر ہونے والا ہے وہ جہنم میں نہ رہیں گے اب اشکال کچھ نہیں رہا مگر میں یہ پھر کہوں گا کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا جواب بہت عجیب اور نہایت زور دار ہے اور میں نے جو ما کو بمعنی من لیا ہے یہ کچھ تاویل بعید نہیں بلکہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا وغیرہ میں خود مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہاں ما بمعنی من ہے دوسرے ابن عباسؓ سے ایک ایسی ہی آیت کی تفسیر میں ما کا بمعنی من کے ہونا منقول ہے پارہ ولو اننا کے دوسرے رکوع کے اخیر میں یہ آیات ہے وَقَالَ اَوْلِيٰٓـؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ یہاں بھی کفار کے لئے خلود کو ثابت کر کے الا ما شاء اللہ سے استثناء کیا گیا ہے پس یہاں بھی بعینہ وہی اشکال ہے جو خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ پر ہے جب وہاں ما بمعنی من صحیح ہو سکتا ہے تو یہاں صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں پر میرا جواب ابن عباسؓ کے قول سے موید ہے اور مجھے اس کی بہت مسرت ہوتی ہے کہ

اپنے قول کی تائید سلف کے اقوال میں مل جائے بعض لوگ تو سلف سے اپنا علم منقول دیکھ کر افسردہ ہوجاتے ہیں کہ ہائے ہمارا تفرد باطل ہوگیا اور میں خوش ہوتا ہوں کہ الحمدللہ وہیں ذہن گیا جہاں مقبولان الٰہی کا ذہن گیا تھا۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ: اور اے مسلمانو ان ظالموں کی طرف مت جھکو کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جائے اور خدا کے سوا کوئی تمہارا رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر حمایت تو تمہاری ذرا بھی نہ ہو۔

تفسیری نکات

تشبہ میلان باطنی کے بغیر نہیں ہوتا

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بعض اہل لطائف نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص مکاری سے صوفی بنے اور صوفیوں کی وضع اختیار کرے اس کی بھی تحقیر نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ تشبہ علامت اس کی ہے کہ اس کے قلب میں اس جماعت کی عظمت ہے کیونکہ تشبہ اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے جس کی قلب میں عظمت اور وقعت ہوتی ہے اور اسی سے تشبہ باہل باطل کا مسئلہ حل ہوگیا اور اس بناء پر علاوہ حدیث میں ہونے کے وہ مسئلہ خود نص قرآنی میں موجود ہے ارشاد فرماتے ہیں وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ یعنی مائل مت ہو تم ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا کبھی تم کو بھی آگ پہنچ جائے اس سے معلوم ہوا کہ اہل باطل کی طرف میلان حرام ہے اور تشبہ بدوں میلان قلبی کے ہوتا نہیں قلب میں اول اس کی عظمت آتی ہے اور اس کے استحسان کا درجہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی طرف میلان ہوتا ہے اس کے اثر سے تشبہ ہوتا ہے پس جب یہ میلان حرام ہے تو تشبہ بھی حرام ہے یہ ہے وہ مسئلہ جس کو آج کل نیچری کہتے ہیں کہ من تشبہ بقوم فھو منھم سمجھ میں نہیں آتا گھور کھپور میں ایک مرتبہ جانا ہوا وہاں پر بیان کیا گیا بڑا مجمع تھا میں نے کہا کہ صاحبو یہ مسئلہ تشبہ کا صرف نقلی ہی نہیں عقلی بھی ہے اگر کوئی جنٹل مین اپنی بیگم صاحبہ کا زنانہ رنگین جوڑا پہن کر اجلاس میں کرسی پر آ بیٹھے کیا خود اس کو یا دوسرے دیکھنے والوں کو ناگوار نہ ہوگا تو آخر ناگواری کی وجہ بجز تشبہ کے کیا سوا ایک عورت مسلمان جو دینداری میں شاید تم سے بھی بڑھی ہوئی ہو اس کی تشبہ سے تو ناگواری ہوتی ہے اور کفار فجار کے تشبہ سے ناگواری کیوں نہ ہو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ جب ہم نے ترکی ٹوپی پہن لی تو سب لباس میں تو تشبہ نہ ہوا میں نے کہا کہ ترکی ٹوپی پہن کر باقی لباس زنانہ پہن لو اور کہہ دو کہ ٹوپی تو ترکی ہے تو شبہ کہاں بات یہ ہے کہ تشبہ کبھی ناقص ہوتا ہے کبھی کامل اور دونوں مذموم ہیں گو دونوں کے درجہ میں تفاوت ہو۔

سُوْرَۃ یُوسُف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ؁

ترجمہ: بلاشبہ شیطان آدمی کا صریح دشمن ہے۔

تفسیری نکات

مسلمانوں نے دوست دشمن کونہیں پہچانا

ملفوظ' ایک سلسلہ گفتگو میں بعض طواغیت کفر کی نسبت فرمایا کہ بڑا ہی چالاک اور دشمن اسلام ہے اس نے مسلمانوں کودھوکا دیا یہ بات تو معمولی ہے کہ دشمن اپنی سی کیا ہی کرتا ہے۔اس کا کام تو نقصان پہنچانے کا ہوتا ہے حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ مگر افسوس تو مسلمانوں کی حالت پر ہے کہ انہوں نے دوست دشمن کو نہ پہچانا' مسلمانوں کی قوم بہت ہی بھولی ہے اور زیادہ تر دھوکہ عام مسلمانوں کو ان لیڈروں کی وجہ سے ہوا یہ ناعاقبت اندیش مسلمانوں کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں ان کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کے ایمان کو تباہ اور برباد کر دیا دیکھ لیجئے مشاہدات اور واقعات اس کے شاہد ہیں جس کے نعرے لگائے قشقے پیشانی پر لگائے ہندوؤں کی ارتھی کو کندھا دیا ان کے مذہبی تہوار دن کا انتظام مسلمان والنٹیریوں نے کیا یہ تو ایمانی نقصان ہوا اور جانی نقصان سنئے ہزاروں مسلمان ان قصوں کی بدولت موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ہجرت کرائی ہزاروں مسلمان بے خانماں ہو گئے مکان جائیداد غارت ہو گئیں بڑی بڑی ملازمتیں چھوڑ دیں موپلوں کی قوم کو تباہ کرا دینے کا ان ہی کا کام تھا اب پچاسوں برس بھی وہ نہیں سنبھل سکتے اور جس بری طرح وہ پسے گئے ہیں سن کر دل کانپ اٹھتا ہے یہ سب ان لیڈروں کی بدولت مسلمانوں کو نقصانات کا شکار ہونا پڑا مگر ان کے کیک بسکٹ انڈے چائے اور فسٹ کلاس کے سفر میں کوئی فرق

نہ آیا لاکھوں روپیہ جو بیوہ عورتوں نے چکی پیس پیس کر اور مسلمانوں نے اپنے اخراجات میں تنگی کر کے دیا سب غتر بود کر دیا جلسے بدوں بنڈالوں کے نہیں ہو سکتے ان میں ہزاروں روپیہ مسلمانوں کے خون پسینے کی کمائی کا برباد کیا اور پھر دوسروں پر طعن ہے کہ یہ قوم کی خبر گیری نہیں کرتے رہبری نہیں کرتے ایسوں ہی کی بدولت ملک اور قوم تباہ ہوا کسی نے خوب کہا

گربہ میر سگ وزیر و موش را دیوان کنند ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویران کنند

انا ذهبنا نستبق (ہم آپس میں دوڑنے بھی لگ گئے)

نستبق کا ترجمہ

ذهبنا نستبق ہم آپس میں دوڑنے لگے۔

استباق: کا ترجمہ ان مترجم صاحب نے کبڈی کھیلنا کیا ہے۔ یہ ترجمہ نقلاً بھی بالکل غلط ہے۔ اور عقلاً بھی نقلاً تو اس لئے کہ لغت میں دیکھ لیجئے کہ استباق کے کیا معنی کیا خلاف لغت ترجمہ بھی معتبر ہوگا استباق کے معنی آپس میں دوڑنا ہیں کہ دیکھیں کون آگے نکلے اور چونکہ عقل پرستی کا آج کل زور ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ عقلاً بھی یہ ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دور نہیں جایا کرتے کہ جس سے محافظ بچہ کی نسبت بھیڑئے کے کھا جانے کا احتمال ہوا گر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام ضرور جرح فرماتے۔

بہر حال **وعلى الذين يطيقونه** کی یہ تفسیر نہیں ہے اور نہ فدیہ دینے والے بری ہو سکتے ہیں اور نہ یہ کہہ کر بری ہو سکتے ہیں کہ روزہ تہذیب نفس کے لئے ہے ہم تو خود مہذب ہیں اس لئے کہ اول تو یہ کہنا غلط ہے کہ ہم مہذب ہیں اور دوسرے تہذیب نفس روزہ کی حکمت ہے نہ کہ مناہ و علت یہ خرابی اس کی ہے احکام کی مخترع حکمتوں پر مبنی کرتے ہیں یہ تو ان کا ذکر ہے جو تاویلیں کر کے روزہ رکھتے ہی نہیں۔ (الصوم ملحقہ مواعظ فضائل صوم وصلوٰۃ صفحہ ۹۱۰۳)

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا تو زیادہ خیال ہو جانا عجب نہ تھا ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

تفسیری نکات

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکی کا ثبوت اور وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر بدیع

سوء کہتے ہیں صغیرہ کو اور فحشاء سے مراد کبیرہ ہے بس صاف دلالت ہے کہ یوسفؑ سے نہ صرف صغیرہ صادر ہوا نہ کبیرہ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ

یوسفؑ نے ارادہ گناہ کا کیا تھا اور یہ آیۃ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا سے استدلال کرتے ہیں ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ پر کلام ختم ہو گیا اور هَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ علیحدہ کلام ہے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ حضرت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ برائی کا کیا اور یوسف بھی کر لیتے اگر اپنے رب کا برہان نہ دیکھتے اور اسی واسطے مولانا فرماتے تھے کہ وھم بھا پر میں وقف نہیں کرتا پس اس سے ھم کی نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے کذالک لنصرف عنه السوء و الفحشاء کہ اس میں صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی ہے اور جو لوگ ھم بھا پر وقف کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ھم کے مراتب مختلف زلیخان نے جو ھم کیا وہ ان کے مرتبہ کے موافق تھا اور یوسف علیہ السلام سے جو ھم ہوا وہ ان کے مرتبہ کے موافق ہے جو صغیرہ سے بھی بمراتب کم ہے غرض صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہونا سب کا متفق علیہ ہے یوسف علیہ السلام سے کوئی عمل ایسا کہ جس سے گناہ لکھا جاوے ظہور میں نہیں آیا جمہور کی تفسیر پر وسوسہ گناہ ہوا کہ وہ گناہ نہیں ہے۔

یوسف علیہ السلام کے تبریہ پر ایک بزرگ کا لطیفہ

ایک بزرگ نے عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ اے عزیز یوسف علیہ السلام کی آلودگی کا وہم بھی مت کر ان کے دامن عصمت کو ذرہ برابر بھی داغ نہیں لگا اور اگر تجھ کو اس کی شہادت چاہئے تو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔
كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اور اگر مخلوق کی شہادت چاہتا ہے تو اس شیر خوار لڑکے کی شہادۃ کافی ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی براءۃ کی گواہی دی اور اگر اس کی شہادت قبول نہیں کرتا تو خود زلیخان کی شہادت موجود ہے وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ یعنی میں نے یوسف علیہ السلام سے ان کے نفس کی درخواست کی تھی وہ باز رہے اور ان کی شہادت بھی منظور نہیں تو زنان مصر کی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے کہا مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ یعنی ہم نے ان پر کوئی برائی معلوم نہیں کی اور اگر ان کی شہادت بھی تیرے نزدیک قابل قبول نہیں تو شیطان کی شہادت موجود ہے اس نے کہا تھا لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ یعنی میں ضرور ان سب کو بھکاؤں گا مگر جو ان میں سے تیرے مخلص بندے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ وہ مخلصین میں سے ہیں۔
چنانچہ ارشاد ہے اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ مگر باوجود اس قدر تقدس اور پاکی کے پھر یہ فرماتے ہیں وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ یعنی میں اپنے نفس کی براءۃ کا دعویٰ نہیں کرتا نفس تو برائی کا کثرت سے امر کرتا ہے لیکن تواضع چونکہ بعض مرتبہ ناشکری کی طرف مفضی ہو جاتی ہے اس لئے آگے بطور استثناء کے فرماتے ہیں اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ یعنی مگر وہ شخص جس پر میرا رب رحم کرے اور ان کا مرحوم ہونا یقینی ہے۔
یوسف علیہ السلام نے کہا یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کی پھلاتی تھی اور (اس موقع پر اس عورت کے خاندان میں سے ایک نے گواہی دی کہ ان کا کرتہ دیکھو کہاں سے پھٹا ہے اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹے اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے (تو عادۃً یقینی یہ ہے کہ عورت جھوٹی اور یہ سچے)

قرینہ پر مجرم قرار دینا جائز نہیں

راندیر میں مولوی غلام محمد صاحب ایک عالم تھے وہ ابن تیمیہ و ابن قیم وغیرہ کے بہت معتقد تھے معتقد تو ہم بھی ہیں مگر بڑے معتقد نہیں ہیں انہوں نے مجھ کو ابن تیمیہ کی ایک کتاب دکھائی جس میں انہوں نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے اس مسئلہ پر استدلال کیا تھا کیونکہ شاہد زلیخا نے براءت یوسفی کا طریقہ قرینہ سے بتلایا تھا اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ

وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ﴿۲۷﴾ اس سے معلوم ہوا کہ قرینہ پر کسی کو مجرم قرار دینا جائز ہے اور یہاں حق تعالیٰ نے اس امر پر کوئی انکار نہیں فرمایا اس کا جواب میری تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ گو اس جگہ انکار نہیں مگر دوسری جگہ انکار موجود ہے چنانچہ ارشاد لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اور ارشاد ہے فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ اس میں صدق و کذب مدعی کا مدار محض شہادت شرعیہ پر رکھا گیا ہے لہٰذا نص میں نکتہ موجود ہوتے ہوئے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا (علاوہ ازیں یہ کہ یہاں جو قرینہ شاہد زلیخا نے بتلایا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس واقعہ خاص میں جس کے اندر قرینہ اور علامت موجود ہو وہ یقیناً کاذب یا صادق اس لئے ہے کہ میرا بیان منجانب اللہ بطور اعجاز کے ہے نہ یہ کہ یہ قرینہ ہر جگہ مفید علم ہو سکتا ہے ۱۲ اص) اسی لئے ہمارے علماء سب اس پر متفق ہیں کہ قرائن سے عقوبت کرنا صحیح نہیں ہاں متابع نے تعزیز متہم کو جائز کہا ہے مگر یہ مسئلہ ظالموں کو بتلانے کا نہیں ہے (پھر اس میں بھی اول حبس کا حکم ہے جرمانہ اور ضرب نہیں ہے اس کے بعد جب ثبوت ہو جائے تو سزا دینے کا حکم ہے کذا احفظ واللہ اعلم ۱۲ اور تحکیم قد قمیص کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اگر مدعیٰ علیہ کسی ایسے ظنی پر راضی ہو جاوے تو اس نے اپنا خود حق چھوڑ دیا۔

ھمّ کا مفہوم

ھـمّ اس کو کہتے ہیں جس کے بعد صدور فعل کا ہو جاوے اور وہ مرتبہ عزم کا ہے اور بعض نے ہم کو عزم سے قبل کہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ قرآن میں ولقد همت به وهم بها (اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال عزم کے درجہ میں جم رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) بھی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ھم بالمراۃ (آپ کے دل میں اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) اور انبیاء چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لئے عزم معصیت ان سے محقق نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اس کے قائل ہو گئے کہ ہم عزم سے پہلے ہوتا ہے۔

قرآن پاک کے ایک مشکل مقام کی تفسیر

مگر محققین نے کہا ہے کہ اس کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ آگے لولا ان رای برهان ربه (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) ہے جو شرط موخر ہے ھم بھا کی یعنی اگر برہان رب نہ دیکھتے تو ارادہ کر لیتے تو یہاں ھم کا اثبات ہی نہیں جو اس کی ضرورت ہو کہ ھم کو عزم سے قبل مانا جاوے بلکہ ھم کی نفی مقصود ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں کذالک لنصرف عنه السوء والفحشاء (اسی طرح ہم نے ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں) تو اس میں ان سے صغائر اور کبائر کی نفی فرما رہے ہیں یہ قرینہ ہے اس کا کہ ھم کی یہاں نفی کی جا رہی ہے نہ کہ اثبات اور گو بعض نے کہا کہ

لولا کی جزا مقدم نہیں ہوتی۔ لیکن اول تو اس میں اختلاف ہے دوسرے اگر مان بھی لیں کہ لولا کی جزا مقدم نہیں ہوتی لیکن اول تو اس میں اختلاف ہے دوسرے اگر مان بھی لیں کہ لولا کی جزا مقدم نہیں ہوتی تو یہ لولا ان رای برهان ربه (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) دل علی الشرط (شرط پہ دلالت کرنے والا) ہوگا اور شرط محذوف مقدم ہوگی۔ بہرحال یہاں ھم کا اثبات نہیں اس لئے ہم کو عزم سے قبل ماننے کی بھی ضرورت نہیں' (الفضل العظیم ملحقہ مواعظ فضائل علم صفحہ ۲۶۷)

قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝

ترجمہ: کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے۔ بے شک تمہاری چالاکیاں بھی غضب ہی کی ہیں۔

عورتوں کا مکر عظیم

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ مسلمانوں کے برابر کوئی بھی نہیں گو بعضے بھولے ہیں یعنی چالاک نہیں مکار نہیں عاقل ہونا اور بات ہے چالاک ہونا اور بات ہے جو اس کی حقیقت نہیں جانتے انہوں نے ایک طاغوت کو مشہور کیا ہے کہ بڑا عاقل ہے مگر عقل کی تو اس کو ہوا بھی نہیں لگی ہاں چالاک ہے دونوں میں فرق کی سمعی دلیل قرآن پاک میں ہے جس میں عورتوں کے بارہ میں ان کیدکن عظیم فرمایا باوجود اس کے کہ حدیث میں ان کو ناقص العقل کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ چالاکی اور کید کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ایک مولوی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ حدیث شریف میں مومن کی مدح آئی ہے المومن غر کریم میں نے کہا کہ حدیث میں احمق ہونے کی مدح نہیں آئی اگر یہ معنے ہوتے تو قرآن شریف میں جابجا ارشاد ہے اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ۔ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ عاقل ہونے کی مدح کیوں فرمائی جاتی۔

اور یہ دشمنی محض مسلمانوں کے مال اور جان ہی تک محدود نہیں بلکہ ایمان سے بھی دشمنی ہے اگر کوئی غیر مسلم عاقل ہوتا جیسا کہ خیال ہے تو وہ پہلے اپنی آخرت کی فکر کرتا ایمان لاتا جب یہ نہیں تو عقل کہاں چالاک ہے تو چالاکی اور عقل سے کیا واسطہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ عورتوں کے مکر کو عظیم فرمارہے ہیں اور دوسری طرف حدیث میں ان کو ناقص العقل فرمایا گیا ہے معلوم ہوگیا کہ عقل اور چیز ہے اور کید اور چیز ہے وہ یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ بعض کی نسبت ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ.

قدرت خداوندی

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص کنعان سے مصر میں قحط کے زمانہ میں قافلے آتے جاتے تھے۔

چنانچہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر غلہ لینے کے لئے پہنچے اور چوری کے قصہ میں وہاں ایک بھائی روک لئے گئے تو بقیہ بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام سے آ کر عرض کیا **واسئل القریة التی کنا فیها والعیر التی اقبلنا فیها وانا لصدقون** یعنی آپ پوچھ لیجئے ان بستی والوں سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے مصر کو برابر آمد و رفت تھی بس جس حالت میں کہ اس قدر ذرائع علم کے یعقوب علیہ السلام کے پاس موجود تھے اس پر بھی یعقوب علیہ السلام کو پتہ نہ لگا اور یہی فرمایا۔ **یا بنی اذهبوا فتحسسوا من یوسف واخیه ولا تایئسوا من روح الله** بتلائیے وہ کشف کہاں گیا' اس قدرت کا نام خدائی ہے۔

غیبی رہنمائی

اور اس مقام پر ایک اور کام کی بات سمجھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ برا ارادہ کیا تو اس قصہ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **ولقد همت به وهم بها لولا ان را برهان ربه** یعنی بے شک زلیخا نے ارادہ کرلیا یوسف علیہ السلام کے ساتھ اور یوسف علیہ السلام بھی ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے برھان ربہ کی تفسیر میں مفسرین اور اہل سیر نے لکھا ہے **رای صورة یعقوب علیه السلام** یعنی یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا' اور شرما گئے۔

تو اس قصہ سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دشواری کے وقت بعض لوگ جو اپنے شیخ کی صورت دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے اس وقت ہماری دستگیری کی اور ان کو ہماری اس مصیبت کا علم ہو گیا یہ اعتقاد صحیح نہیں' شیخ کو خبر تک بھی نہیں ہوتی' جیسے اس قصہ میں یعقوب علیہ السلام کو اطلاع تک نہ ہوئی۔ ورنہ اس قدر پریشان نہ ہوتے بلکہ اس شخص کی تسلی اور رہبری کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتہ کو کسی ایسے مقبول بندہ کی صورت میں متمثل کر کے دکھاتے ہیں جس کے ساتھ اس شخص کو انس اور اعتقاد ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک مشکل میں مبتلا تھا سر کی طرف سے حضرت حاجی صاحبؒ کی آواز آئی کہ اس کام کو اس طرح کرلو اس کے بعد فرمانے لگے کہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ آواز حضرت حاجی صاحبؒ کی نہیں ہے حضرت کو تو خبر بھی نہیں' ایسے ہی یوسف علیہ السلام کو خود یعقوب علیہ السلام نظر نہیں آئے۔ ورنہ اگر یعقوبؑ تھے تو پھر ان کی بے خبری اور پریشانی کے کیا معنی' حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ سے کسی نے عرض کیا کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا اور راستہ بھول گیا آپ نے مجھ کو رہبری فرمائی سید صاحب نے قسم کھا کر فرمایا کہ میں نہیں تھا' مجھ کو تو خبر بھی نہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے میری صورت میں کسی کو بھیج کر تم کو راہ دکھلا دیا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چین بستہ اند

کام کوئی کرتا ہے نام کسی کا ہو جاتا ہے اگر آج کل کے کوئی دکاندار پیر ہوتے تو سن کر اور زیادہ خوش ہوتے اور پھولے نہ سماتے اور اس قصہ کو اپنی کرامت شمار کرتے اور سچے پیروں کے ہاں یہ حلت ہے کہ جو سچی اور واقعی کرامتیں اور تصرفات ہیں ان کی طرف بھی التفات نہیں فرماتے بلکہ روک دیتے ہیں۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس (ہر ایک کا) بری بات بتلاتا ہے۔ بجز اس (نفس) کے جس پر میرا پروردگار رحم کرے بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے

تفسیری نکات

نفس کے میلان الی الشر ہونے کا ثبوت

یعنی نفس کی دو قسمیں نہیں بتائیں ایک امارہ بالسوء اور ایک امارہ بالخیر یہ بتایا نفس کی ایک ہی قسم ہے کہ وہ امارہ بالسوء ہے یعنی نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم کرنے والا ہے مگر جب خدا تعالیٰ رحم فرمائیں یعنی جب خدا کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو اس وقت اس عارض وقوی کی وجہ سے نفس برائی کا حکم نہیں کرتا اور جب یہ رحمت متوجہ نہیں ہوتی تو پھر بدستور اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے یعنی برائی کا امر کرنے لگتا ہے بہر حال استثناء سے نفس کی کوئی جداگانہ قسم بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ امر بالسوء کے اوقات میں سے ایک وقت کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے حاصل یہ ہوا کہ

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ و مصدریته ای وقت رحمة تعالیٰ علیها (بلاشبہ نفس بری بات کا حکم کرنے والا ہر وقت میں مگر اللہ تعالیٰ کے اس پر رحم کرنے کے وقت میں یہاں ماصدر یہ ہے)

شاید کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے کہ ان النفس لا مارة بالسوء الا ما امر بالسوء (بلاشبہ نفس نیکی کا حکم کرنے والا ہے) تو کیا حرج تھا۔

جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ معنی نہ پیدا ہوتے جواب ہوئے کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ مغلوب حالت کو غالب حالت سے استثناء کیا کرتے ہیں مثلاً اگر زیادہ جماعت نے کھانا کھالیا تو یوں کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے کھانا کھالیا، مگر زید و عمر نے اس جملہ سے یہ سمجھا گیا کہ جماعت کثیر کھانا کھا چکی اور قلیل یعنی دو شخص باقی رہ گئے اور اگر اسی

کو یوں تعبیر کریں کہ فلاں فلاں نے کھانا نہیں کھایا مگر سب نے تو محاورہ کے اعتبار سے یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ مستثنیٰ مغلوب نہ تھا بلکہ مستثنیٰ منہ پر غالب تھا تو معلوم ہوگیا کہ غالب حالت سے مغلوب حالت کو استثناء کیا جاتا ہے اگر کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے بہرحال غالب حالت کا اعتبار استثناء میں ضروری ہے۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (برائی کا حکم کرنے والا ہے) یہاں پر مستثنیٰ منہ ہے اس لئے بقاعدہ مذکورہ غالب حالت یعنی امر بالسوء کو مستثنیٰ منہ اور مغلوب یعنی عدم امر بالسوء کو مستثنیٰ بنانا چاہئے سو قرآن میں ایسا ہی ہے کیونکہ غالب صفت نفس کی امارہ بالسوء ہی ہے۔

واقعی قرآن کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ زبان کو ذوق بھی ہو اور عادات ومحاورات میں بھی کامل دخل ہو محض علوم عقلیہ سے قرآن حل نہیں ہوسکتا بلکہ عرف وعادات کو حکم بنا کر تب قرآن کو دیکھنا چاہئے ورنہ غلطی ہوجانے کا قوی احتمال بلکہ یقین ہے کیونکہ قرآن کا نزول عرف ومحاورات کی رعایت کے ساتھ ہوا ہے۔

بہرحال نفس کی حالت غالبہ امر بالسوء ہے اس لئے جب اس کو کام میں نہ لگایا جاوے تو یہ اپنے لئے خود مشغلہ تجویز کرے گا اور جو مشغلہ یہ خود اپنے لئے تجویز کرے گا چونکہ اس میں غلبہ ہے شر کا اس لئے وہ اکثر برا ہی ہوگا اور مضر ہی کو تجویز کرے گا۔

اسی واسطے مالایعنی کے ترک کو جناب رسول مقبول ﷺ نے حسن اسلام فرمایا کیونکہ مضر کو تو ہر شخص مضر سمجھتا ہے ہی خفا صرف لایعنی میں ہے پس مقصود حضور ﷺ کا یہ ہے کہ مضر کے چھوڑنے کے بعد لایعنی سے بچے اور وہ تجربہ سے موقوف ہے اس پر کہ مالایعنی میں نفس کو لگادے پس اس ترک کے لئے یہ فعل بھی لازم ہے۔

بہرحال نفس کا میلان الی الشر (برائی کی طرف مائل ہونا) تو قرآن سے ثابت ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ نفس جب خالی ہوگا تو معصیت ہی تجویز کرے گا اور جب یہ بے کار ہوگا تو کسی نہ کسی بلا ہی میں مبتلا ہوگا تو ان دونوں مقدموں سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی کہ ترک مضر کے بعد اشغال بالنافع ضروری ہے سو قرآن مجید کی تعلیم کا یہی حاصل ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اپنے نفوس کا تبریہ نہیں فرماتے

اور اولیاء تو علیحدہ انبیاء علیہم السلام بھی باوجود معصوم ہونے کے اپنے نفوس کا تبریہ نہیں فرماتے۔ دیکھئے یوسف صدیق علیہ السلام کیا فرماتے ہیں وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ جن کی نزاہت کی خود حق تعالیٰ گواہی دے رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ سوء کہتے ہیں صغیرہ کو اور فحشاء سے مراد کبیرہ ہے بس صاف دلالت ہے کہ یوسف علیہ السلام سے نہ صغیرہ صادر ہوا نہ کبیرہ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ گناہ کا کیا تھا اور یہ آیۃ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا سے استدلال کرتے ہیں

ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ پر کلام ختم ہو گیا اور هَمَّ بِهَا ۚ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ علیحدہ کلام ہے۔

حاصل آیت کا یہ ہوا کہ حضرت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ برائی کا کیا اور یوسف علیہ السلام بھی کر لیتے اگر اپنے رب کا برہان نہ دیکھتے' اور اسی واسطے مولانا فرماتے تھے کہ وھم بھا پر میں وقف نہیں کرتا پس اس سے ھم کی نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات' اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ کہ اس میں صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی ہے اور جو لوگ ھم بھا پر وقف کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ھم کے مراتب مختلف ہیں زلیخاں نے جو ھم کیا وہ ان کے مرتبہ کے موافق تھا اور یوسف علیہ السلام سے جو ھم ہوا وہ ان کے رتبہ کے موافق ہے جو صغیرہ سے بھی بمراتب کم ہے غرض صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہونا سب کا متفق علیہ ہے۔ یوسف علیہ السلام سے کوئی عمل ایسا کہ جس سے گناہ لکھا جاوے ظہور میں نہیں آیا۔ جمہور کی تفسیر پر وسوسہ گناہ ہوا کہ وہ گناہ نہیں ہے۔

براءت یوسف علیہ السلام کا عجیب استدلال

ایک بزرگ نے عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ اے عزیز! یوسف علیہ السلام کی آلودگی کا وہم بھی مت کر ان کے دامن عصمت کو ذرہ برابر بھی داغ نہیں لگا اور اگر تجھ کو اس کی شہادت چاہئے تو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اور اگر مخلوق کی شہادت چاہتا ہے تو اس شیر خوار لڑکے کی شہادت کافی ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی براءت کی گواہی دی اور اگر اس کی شہادت قبول نہیں کرتا تو خود زلیخا کی شہادت موجود ہے وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ یعنی میں نے یوسف علیہ السلام سے ان کے نفس کی درخواست کی تھی مگر وہ باز رہے اور ان کی شہادت بھی منظور نہیں تو زنان مصر کی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے کہا مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ یعنی ہم نے ان پر کوئی برائی معلوم نہیں کی اور اگر ان کی شہادت بھی تیرے نزدیک قابل قبول نہیں تو شیطان کی شہادت موجود ہے اس نے کہا تھا لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ یعنی میں ضرور ان سب کو بہکاؤں گا مگر جو ان میں سے تیرے مخلص بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ وہ مخلصین میں سے ہیں چنانچہ ارشاد ہے اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ مگر باوجود اس قدر تقدس اور پاکی کے پھر یہ فرماتے ہیں وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ ، یعنی میں اپنے نفس کی براءۃ کا دعویٰ نہیں کرتا نفس تو برائی کا کثرت سے امر کرتا ہے لیکن تواضع چونکہ بعض مرتبہ ناشکری کی طرف مفضی ہو جاتی ہے اس لئے آگے بطور استثناء کے فرماتے ہیں الا ما رحم ربی یعنی مگر وہ شخص جس پر میرا رب رحم کرے اور ان کا مرحوم ہونا یقینی ہے۔

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾

ترجمہ: یعنی مجھ کو ملک کے غلہ کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے میں اس کی خوب نگرانی کروں گا میں اس کے طریقوں کو جانتا ہوں۔

تفسیری نکات

احکام مال وجاہ

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے کہ جب بادشاہ نے ان سے کہا تھا کہ اتنا بڑا کام یعنی قحط عام کا انتظار کون سر دھرے تو انہوں نے فرمایا کہ میں کرسکتا ہوں۔ چنانچہ ان کا مقولہ یہ ہے کہ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ تو گو اس موقع پر یوسف علیہ السلام اپنی تعریف خود کر رہے ہیں میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں' لاؤ حکومت مجھ کو دے دو مگر آپ کو یہ یقینی طور سے معلوم تھا کہ یہ کام ضروری اور عظیم الشان ہے اور انتظام کا اہل کوئی ہے نہیں اس لئے آپ نے اس موقع پر تواضع سے کام نہیں لیا ورنہ ساری مخلوق تباہ ہو جاتی۔ بلکہ آپ نے اظہار نعمت کے طور پر اپنے واقعی اوصاف بیان فرما دیئے تا کہ بادشاہ کو پورا اطمینان ہو جاوے کہ یہاں یہ کام آپ خود کر سکتے ہیں آپ کو بھروسہ تھا کہ میں اس کام کو بخوبی کرسکتا ہوں اس لئے آپ نے خود درخواست کی پس اگر کسی زمانہ میں کسی شخص کو اپنی نسبت یہ معلوم ہو کہ میں اپنے بھائیوں کو راحت پہنچا سکتا ہوں اور مخلوق اگر کسی دوسرے کے قبضہ میں پہنچے گی تو راحت نہیں مل سکتی اور اس کو بھروسہ ہو کہ میں آرام پہنچا سکتا ہوں اور شریعت کے موافق حکومت وانتظام کرسکتا ہوں اور اس کو مال وجاہ کی بالکل پروانہ ہو' تو ایسے شخص کو اب بھی حکومت کی درخواست کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے اور ہمارے نزدیک عالمگیرؒ کا اپنی سلطنت کے لئے سعی کرنا بھی اسی وجہ سے تھا یا یہ صورت ہو کہ کوئی حاکم نہ ہو تو غیر قوم سے ہو جائے گا اور اس صورت میں مسلمانوں کی بری گت بنائی جائے گی۔ تو درخواست کرنا حکومت کی اس صورت میں بھی جائز ہے مگر اس میں بھی دو شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ مال مقصود نہ ہو۔ دوسرے جاہ مقصود نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ مال وجاہ از خود حاصل ہو جائے مگر مقصود نہیں

وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِیۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾

ترجمہ: اور جب قافلہ چلا تو ان کے باپ نے کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف علیہ السلام کی خوشبو آ رہی ہے۔

تفسیری نکات

کشف امر غیر اختیاری ہے

حضرت یعقوب علیہ السلام کی شیخ شیرازی نے یہ حالت لکھی ہے۔

گہے برطارم اعلیٰ نشینم گہے برپشت پائے خود نہ بینم

ایک تو وہ وقت تھا کہ مصر سے قاصد پیراہن یوسفی لے کر چلا اور کنعان میں آپ کو اس کی خوشبو پہنچ گئی اور حاضرین مجلس سے فرما دیا اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ﴿۹۴﴾ یعنی اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے سے حواس میں فتور آ گیا ہے تو میں ایک بات کہوں وہ یہ کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے یہاں تو مصر سے پیراہن کی خوشبو کا احساس ہو گیا اور ایک وہ وقت تھا کہ خود یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنعان کے جنگل میں ایک کنوئیں کے اندر قید کر دیا اور چند روز تک وہ اسی میں رہے مگر یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی یہ بھی خبر نہ تھی کہ یوسف زندہ ہیں یا نہیں صدمہ فراق میں اتنا روئے کہ آنکھیں جاتی رہنے کے قریب ہو گئیں۔

یعقوب علیہ السلام کے متعلق بعض محققین کی رائے یہی ہے کہ وہ نابینا نہ ہوئے تھے بلکہ روتے روتے بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ انہوں نے اَبۡیَضَّتۡ عَیۡنٰهُ کو ضعف بصر پر محمول کیا ہے اور فَارۡتَدَّ بَصِیۡرًا سے اسی ضعف کا زوال مراد لیا ہے ولا یبعد ارادته للحكمة التي ذكرناها پس بعید نہیں لوٹ آنا بینائی کا بوجہ حکمت کے ہو جو ہم نے ذکر کی تو دیکھئے یعقوب علیہ السلام کو بتداء میں یوسف علیہ السلام کی اطلاع نہ ہوئی کہ وہ کس حال میں ہیں حالانکہ وہ اس وقت کنعان ہی کے کنوئیں میں تھے پھر اس کے بعد عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں اور بعد میں مصر سے قمیص کے روانہ ہوتے ہی خوشبو پہنچ گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی ایک وقت میں اور شان تھی اور ایک وقت میں اور شان تھی۔ یہی میں کہہ رہا تھا کہ تلوین انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آئی ہے ایک نبی کو مختلف اوقات میں مختلف حالات پیش آتے تھے اور بہت سے سالکین کو بھی پیش آتے ہیں۔

حالت یعقوب علیہ السلام

یاد رکھو! اول تو کشف ہونا ہر بزرگ کو ضروری نہیں انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہیں اور بڑے صاحب کشف ہیں جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر سے بھائیوں کو قمیص دیا ہے کہ اس کو باپ کی آنکھوں پر ڈال دو اور ادھر وہ کرتہ لے کر چلے اور درمیان میں سینکڑوں مراحل اس لئے کہ کہاں شہر کنعان یعقوب علیہ السلام کا مسکن اور کہاں مصر بہت دور دراز کی مسافت درمیان میں ہے لیکن آپ فرماتے ہیں اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ یعنی بے شک میں یوسف کی بو پاتا ہوں اگر تم مجھ کو بہکا ہوا نہ کہو قالوا تاللہ انک لفی ضلالک القدیم بیٹوں نے کہا قسم ہے خدا کی کہ آپ بے شک اپنی پرانی غلطی میں ہیں۔ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی جب خوش خبری دینے والا آیا کرتا کو یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ بینا ہو گئے اور فرمایا میں نے تم کو کہا نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ذرائع علم کے باوجود یعقوب علیہ السلام کا عدم علم

اللہ اکبر! اتنا بڑا کشف اور باوجود اس کے یوسف علیہ السلام نے مصر میں سالہا سال سلطنت کی اور صاحب سلطنت کے واقعات اور اس کے حالات سے دور دور تک واقفیت ہوتی ہے اور یوسف علیہ السلام یوسف ہی کے نام سے مصر میں مشہور تھے۔ یہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ نام بدل لیا ہوگا چنانچہ عزیز مصر نے زلیخا کے قصہ میں یوسف علیہ السلام کو اس طرح خطاب کیا یوسف اعرض عن ھذا اور دوسری جگہ ارشاد ہے یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا ان آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یوسف کے ہی نام سے مشہور تھے اور یہ بھی نہ تھا کہ آمد و رفت ایک ملک سے دوسرے ملک میں نہ ہوتی ہو برابر قافلے آتے جاتے تھے چنانچہ ارشاد ہے جَآءَتْ سَیَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ الخ خصوص قحط کے زمانہ میں تو قوافل کی آمد و شد بہت ہی تھی قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص کنعان سے مصر میں قحط کے زمانہ میں قافلے آتے جاتے تھے چنانچہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر غلہ لینے کے لئے پہنچے اور چوری کے قصہ میں وہاں ایک بھائی روک لئے گئے تو بقیہ بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام سے آ کر عرض کیا وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْٓ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ یعنی آپ پوچھ لیجئے ان بستی والوں سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جن میں ہم آئے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے مصر کو برابر آمد و رفت تھی۔ بس جس حالت میں کہ اس قدر ذرائع علم کے یعقوب علیہ السلام کے پاس موجود تھے اس پر بھی یعقوب علیہ السلام کو پتہ نہ لگا اور یہی فرمایا

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ بتلائیے وہ کشف کہاں گیا۔ اس قدرت کا نام خدائی ہے۔

اوراس مقام پر ایک اور کام کی بات سمجھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ برا ارادہ کیا تو اس قصہ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ یعنی بے شک زلیخا نے ارادہ کر لیا یوسف کے ساتھ اور یوسف بھی ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے۔ بُرْهَانَ رَبِّهٖ کی تفسیر میں مفسرین اور اہل سیر نے لکھا ہے رای صورۃ یعقوب علیہ السلام یعنی یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا اور شرما گئے۔

اعتقاد صحیح

تو اس قصہ سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہ ہے کہ دشواری کے وقت بعض لوگ جو اپنے شیخ کی صورت دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے اس وقت ہماری دستگیری کی اور ان کو ہماری اس مصیبت کا علم ہو گیا یہ اعتقاد صحیح نہیں شیخ کو خبر تک بھی نہیں ہوتی جیسے اس قصہ میں یعقوب علیہ السلام کو اطلاع تک نہ ہوئی ورنہ اس قدر پریشان نہ ہوتے بلکہ اس شخص کی تسلی اور رہبری کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتہ کو کسی ایسے مقبول بندہ کی صورت میں متمثل کر کے دکھاتے ہیں جس کے ساتھ اس شخص کو انس اور اعتقاد ہوتا ہے۔

واقعہ مولانا یعقوب وسید بریلویؒ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک مشکل میں مبتلا تھا سر کی طرف سے حضرت حاجی صاحبؒ کی آواز آئی کہ اس کام کو اس طرح کر لو اس کے بعد فرمانے لگے کہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ آواز حضرت حاجی صاحبؒ کی نہیں ہے حضرت کو تو خبر بھی نہیں ایسے ہی یوسف علیہ السلام کو خود یعقوب علیہ السلام نظر نہیں آئے ورنہ اگر یعقوب علیہ السلام تھے تو پھر ان کی بے خبری اور پریشانی کے کیا معنیٰ، حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ سے کسی نے عرض کیا کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا اور راستہ بھول گیا آپ نے مجھ کو رہبری فرمائی سید صاحب نے قسم کھا کر فرمایا کہ میں نہیں تھا مجھ کو تو خبر بھی نہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ میری صورت میں کسی کو بھیج کر تم کو راہ دکھلا دیا۔

انبیاء علیہم السلام کو ہر امر پر مطلع ہونا ضروری نہیں

بہر حال یعقوب علیہ السلام کے قصہ سے ثابت ہو گیا کہ کشف ضروری نہیں ہے اور دیکھئے یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں رہے لیکن یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی جب بیٹوں نے کہا یَاْكُلَهُ الذِّئْبُ تو

اجمالاً یہ معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے ہیں بھیڑیئے نے نہیں کھایا۔ لیکن مفصلاً یہ معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں چنانچہ فرمایا قال بل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل بس جب انبیاء کو اطلاع ہونا ہر امر کی ضروری نہیں تو پیروں پر بھروسہ کرنا کہ ان کو ہمارے حال کی اطلاع ہے نہایت جہل اور شائبہ شرک کا ہے۔

ایک تفسیر برھان

اس برہان رب کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس تنہائی میں سامنے انگشت بدنداں دیکھا یہی برہان رب تھی جس کی وجہ سے ان کی حفاظت ہوئی اگر یہ تفسیر صحیح ہو تو یہ بات ظاہر ہے کہ یہ یعقوب علیہ السلام کی کرامت یا معجزہ تھا مگر یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر بھی تھی کیونکہ اگر یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کا یہ پتہ نشان معلوم ہو جاتا کہ وہ عزیز مصر کے گھر میں ہیں تو بعد میں یہ نہ فرماتے۔

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ یعنی اے میرے بیٹو! جاؤ تم یوسف اور اسکے بھائی کو تلاش کرو۔

وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ○

ترجمہ: اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں جن پر ان کا گزر رہتا ہے اور وہ ان کی طرف اصلاً توجہ نہیں کرتے۔

عالم میں حق کا آئینہ بننے کی استعداد ہے

یہی معنی ہیں اس آیت کے وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ○ شکایت فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ بہت سی نشانیاں عالم میں ایسی ہیں کہ لوگ ان پر نظر ڈالتے چلے جاتے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے یعنی ان کو آیات اللہ اور مراۃ حق (حق کا آئینہ) نہیں بناتے معلوم ہوا کہ اگر ان کو مراۃ حق بنانا چاہتے تو بنا سکتے تھے کیونکہ شکایت امور اختیاریہ ہی میں ہوتی ہے معلوم ہوا کہ عالم میں قابلیت مراۃ حق بننے کی ہے اگر بنانے والا چاہیے پس ثابت کہ عالم کی طرف توجہ اس حیثیت مذکورہ سے مذموم نہیں بلکہ محمود اور مطلوب ہے کیونکہ اس کے خلاف پر یعنی اعراض پر شکایت کی گئی ہے ہاں جانچ لیا جائے کہ آیا یہ حیثیت حاصل بھی ہے جب طبعاً و ذوقاً یہ بات پیدا ہو جائے کہ

حسن خوشی از روئے خوباں آشکار کردہ پس بچشم عاشقاں خود راتما شا کردہ

(تو نے اپنی خودی کو خوبصورتی کے چہروں سے ظاہر کر دیا ہے مگر عاشقوں کی نظر میں تماشا بن گیا ہے)

تو پھر اس کے لئے ہر چیز میں نظر کی اجازت ہوگی اور توجہ الی العالم اس کے لئے توجہ الی اللہ ہی ہوگی۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ

ترجمہ: ان (انبیاء و امم سابقین) کے قصہ میں سمجھ دار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔

مصیبت گناہوں کی ہی وجہ سے آتی ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (یعنی انبیاء علیہم السلام وامم سابقین کے قصے میں سمجھدار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے) حالانکہ قصہ یوسف علیہ السلام سے کوئی نتیجہ لفظوں میں نہیں بتلایا تھا مگر پھر بھی فرمایا دیا کہ یہ قصہ عبرت ہے تو جہاں نتیجہ نصاً مذکور ہو وہ یقیناً عبرت ہی کے لئے ہے چنانچہ اس آیت میں جو قصہ مذکور ہے اس پر یہ نتیجہ مرتب فرمایا کہ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا کہ ان لوگوں نے بعد نزول عذاب تضرع کیوں نہ کیا صاف صاف شکایت فرمارہے ہیں اور ہم نے اور امتوں کی طرف بھی جواب سے پہلے گذر چکیں رسول بھیجے تھے سو ہم نے ان کو پکڑ لیا) تا کہ تضرعوا کے مقابل کوئی شے مذکور ہو یعنی ان لوگوں نے تضرع نہ کیا بلکہ تکذیب کی تو ہم نے اس کو عذاب دیا جب انہوں نے سرکشی کی تو ہم نے ان کو مصائب میں گرفتار کیا اس سے ایک فائدہ مستقلہ نکل آیا وہ یہ کہ مصیبت جب آتی ہے تو گناہ کی وجہ سے آتی ہے خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے پہلی امتوں کے پاس رسول بھیجے تو انہوں نے سرکشی کی ہم نے ان کو مصائب میں بتلا کیا تا کہ وہ تضرع کریں یہ تو بیان تھا مصائب کے آنے کا اس کے بعد ان مصائب سے ان کے متاثر نہ ہونے کا ذکر مع الشکایت ہے کہ اس وقت انہوں نے تضرع کیوں نہ کیا جبکہ ہم نے ان کو باساء میں گرفتار کیا تھا باساء یہاں عام ہے یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ بعد بلا آنے کے تضرع کرتے اور زاری کرتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ ان کے دل اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر دیا یعنی اپنے اعمال سیئہ کی طرف ان مصائب کو منسوب نہیں کیا۔

حکایت حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ

فرمایا شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ایک مرید کے گھر شادی تھی حضرت شیخ امتحان کے لئے رات کے وقت لباس تبدیل کر کے فقراء کی صف میں جا بیٹھے جب گھر والے نے خیرات تقسیم کی تو پیر (حضرت شیخ عبدالقدوس) کو بھی ایک فقیر سمجھ کر دے دی صبح کو اس سے سخت ناراض ہوئے فرمایا کہ اگر تم کو میری محبت ہوتی تو تم کو میری خوشبو آجاتی اور خوشبو۔ سے مجھ کو پہچانتے چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی خوشبو سے یہ فرمایا تھا (۱) انی لا جلدیح یوسف لولا ان تفندون (سورہ یوسف) اس پر شبہ نہ کیا جاوے کہ محبت کے لئے خوشبو کا آنا لازم ہے بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہر بندہ کے ساتھ جدا ہے ممکن ہے کہ شیخ کے لئے عادت اللہ

یہی ہو کہ ان کے محب کو ان میں سے خوشبو کا آنا ضروری ہو۔ (الافاضات الیومیہ ج ۹۴ صفحہ ۲۳۴۳۳)

علم اعتبار کی حقیقت

اور جو سچے معتقد اور محقق تھے انہوں نے یہ کہا کہ صوفیہ کی مراد تفسیر کرنا نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اے قرآن پڑھنے والے تو قرآن کے قصوں کو محض قصہ سمجھ کر نہ پڑھ بلکہ ان سے سبق حاصل کر کیوں کہ قرآن میں جو قصے مذکور ہیں وہ عبرت حاصل کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں جیسا خود قرآن میں ارشاد ہے

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿ (سورۂ یوسف آیت)

پس جب تو موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو اس سے یہ سبق حاصل کر کہ تیرے اندر بھی ایک چیز موسیٰ کے اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی روح اور نفس دوسری عبارت میں یوں ہوئے کہ انسان کے اندر دو قوتیں ہیں ایک داعی الی الخیر جو مشابہ موسیٰ علیہ السلام کے ہے دوسری داعی الی الشر جو مشابہ فرعون ملعون کے ہے پس تو بھی اپنی روح کو نفس پر غالب کر جس کا طریقہ مجاہدہ اور تبلیغ ہے پس تو نفس کو آیات الٰہیہ یاد دلاتا کہ اس کو خوف الٰہی پیدا ہو اور نافرمانی سے باز آ جائے یہ علم اعتبار ہے کہ دوسرے کے قصہ کو اپنی حالت پر منطبق کر کے سبق حاصل کیا جائے پس اس آیت سے روح و نفس کی حالت پر حکم کرنا استدلال کے طور پر نہیں بلکہ بطور اعتبار کے ہے استدلال تو مفہوم لغوی سے ہوتا ہے ان طرق کے ساتھ جو اہل معانی واصول نے بیان کئے ہیں اور اعتبار تشبہ واشارہ کے طور پر ہوتا ہے اور ان دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے لیکن قرآن میں دلیل واستدلال کا لفظ صراحۃً نہیں آیا بلکہ اس کے مرادفات آئے ہیں چنانچہ ارشاد ہے قل ھاتوا برھانکم اور ارشاد ہے قل ھل عندکم من علم چونکہ برھان اور علم دلیل کے معنی میں ہے اس لئے اس کا نام استدلال رکھنا صحیح ہو گیا جیسے اقیموا الصلوۃ کے معنی میں یوں کہنا کہ حق تعالیٰ نے نماز کو فرض کیا ہے صحیح ہے حالانکہ اقیموا الصلوۃ میں اللہ اور فرض کا لفظ صراحۃً نہیں مگر اس کا قائم مقام موجود ہے اور دوسرے طریق کا نام خود قرآن ہی میں اعتبار آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فاعتبروا یا ولی الابصار' اس سے اوپر بنی نضیر کے (جو یہود کا ایک قبیلہ ہے) جلاوطن کئے جانے کا قصہ مذکورہ ہے جس کے بیان کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ اے بصیرت والو اس سے عبرت حاصل کرو یعنی اگر تم ایسی حرکت کرو گے جو ان لوگوں نے کی تو اپنے واسطے بھی اس عذاب کو تیار سمجھو اور یہی تو علم اعتبار ہے کہ دو چیزوں میں مشابہت ہو تو ایک نظیر سے دوسری نظیر کا استحضار کیا جائے اور یہی عبرت حاصل کرنے کے لئے معنی ہیں کہ دوسرے کی حالت کو اپنے اوپر منطبق کیا جائے کہ اگر ہم نے اس کے جیسے اعمال کئے تو ہمارا بھی وہی حال ہو گا جو اس کا ہوا ہے رہا یہ سوال کہ جس طرح صوفیہ نے علم اعتبار کا استعمال کیا

ہے کیا نصوص میں بھی ایسا استعمال آیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ بحمد اللہ اس کی نظیر نصوص میں بھی موجود ہے اور میں یہ بات خودنہیں کہتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے قول سے میں اس کا ثبوت دیتا ہوں اور وہ اتنے بڑے محقق ہیں کہ بعض لوگوں نے ان کو غیر مقلد سمجھ لیا ہے کہ وہ ائمہ کی تقلید بھی نہ کرتے تھے۔ مگر یہ غلط ہے وہ مقلد ہی ہیں مگر مقلد محقق ہیں لکیر کے فقیر نہیں جیسے سالکین و مجذوبین کے سلوک و جذب میں مراتب ہیں کہ بعض سالک مجذوب ہیں بعض مجذوب سالک محض ہیں بعض سالک محقق ہیں۔ ایسے ہی تقلید و تحقیق کے بھی مرتب ہیں کہ بعض مقلد محض ہیں بعض محقق محض یعنی مجتہد ہیں اور بعض مقلد محقق ہیں بعض محقق مقلد ہیں تو شاہ صاحب مقلد محض نہ تھے بلکہ مقلد محقق تھے اسی لئے بعض کو ان پر غیر مقلدی کا شبہ ہوا تو اتنے بڑے محقق نے دو حدیثوں کے متعلق فوز اُالکبیر میں یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے صحیحین میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ تقدیر کا مسئلہ ارشاد فرمایا۔

امامنکم من احد الا وقد کتب له مقعده من النار و معقده من الجنة قالوا یا رسول الله افلانتکل علی کتابنا وندع العمل یعنی ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں یا دوزخ میں پہلے ہی سے لکھ دیا گیا ہے۔ اس پر حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا **اعلموا فکل میسر لما خلق له اما من کان من اهل السعاده فسیسروا بعمل السعاده و اما من کان من اهل الشقاوة فسیسرو العمل الشقاوة ثم قراء فاما من اعطی و اتقیٰ صدق بالحسنی (الایه متفق علیه مشکوة صفحه ۱۱)**

کہ عمل کرتے رہو ہر شخص کے لئے وہ عمل آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے جو شخص اہل سعادت سے ہوگا اس کے لئے عمل سعادت آسان ہوگا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے جو شخص اہل سعادت سے ہوگا اس کے لئے عمل سعادت آسان ہوگا جو اہل شقاوت سے ہوگا اس کے لئے عمل شقاوت آسان ہوگا اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی۔

فاما من اعطی واتقی و صدق بالحسنی فسنیسر ہٗ للیسری و اما من بخل و استغنی و کذب بالحسنی فسنیسر ہٗ للعسریٰ

(ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو شخص (اللہ کی راہ میں) صدقہ دے اور تقویٰ اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تصدیق کرے تو ہم اس کے لئے راحت کی چیز (یعنی جنت) کا سامان کر دیں گے اور جو بخل کرے اور بے پروائی اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تکذیب کرے ہم اس کے لئے تکلیف کی چیز (یعنی جہنم) کا سامان کر دیں گے ۱۲۷)

اب اس پر سوال ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقدیر کا ذکر کہاں ہے آیت مدلول تو یہ ہے کہ اعطاء وتقویٰ

سے جنت آسان ہو جاتی ہے اور بخل واستغناء سے دوزخ آسان ہو جاتی ہے اس کا جواب شاہ صاحبؒ نے یہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بطور علم اعتبار کے اس آیت کے مضمون سے حدیث کے مضمون پر استشہاد فرمایا اور مقصود تشبیہ دینا ہے کہ جیسے بواسطہ اعمال کے بعض کے لئے جنت اور بعض کیلئے دوزخ کو آسان کر دیا ہے اسی طرح بواسطہ تقدیر کے بعض کے لئے اعمال صالحہ کو بعض کیلئے معاصی کو آسان کر دیا ہے اور یہ تشبہ محض توضیح کے لئے ہے کہ تقدیر سے تیسیر وہی ہو جاتی ہے جیسی اس آیت میں تیسیر اعمال سے مذکور ہے پس مقصود تشبیہ سے توضیح ہے مشبہ کی اسی لئے تشبیہ میں شرط ہے کہ مشبہ بہ میں وہ صفت اوضح واشہر ہو گواقوی نہ ہو اب یہاں سے تشبیہ کے متعلق ایک مشہور سوال کا بھی حل ہو گیا وہ یہ کہ اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم میں جو صلوٰۃ علی رسول اللہ نبینا ﷺ کو صلوٰۃ علی ابراہیم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

تشبہ میں مشبہ کا افضل ہونا ضروری نہیں

تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے صلوٰۃ ابراہیمیہ کے افضل واکمل ہونے کا صلوٰۃ محمدیہ سے اور منشا اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ وافضل ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے بلکہ صرف اوضح واشہر ہونا ضروری ہے افضل واکمل ہونا ضروری نہیں اور اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں۔

اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن میں پہلے سے حاضر ہے اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن تو نور شمس وقمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقویٰ ہے مگر سورج میں ایک عیب کہ اس پر نگاہ نہیں جمتی اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا کہ اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور قمر سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس تو ان کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہوتا کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے۔ پھر چراغ میں ایک صفت شمس وقمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور شمس وقمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہنچتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شے نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے۔ (غایت النکاح فی آیت النکاح ملحقہ)

سُوْرَةُ الرَّعْد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

ترجمہ: مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کا اطمینان ہو جاتا ہے۔

تفسیری نکات

اطمینان قلب صرف ذکر اللہ میں ہے

یاد رکھو سمجھ رکھو (یہ مدلول ہے کلمہ الا کا) حصر کے ساتھ فرماتے ہیں (یہ مدلول سے تقدیم محمول کا کہ خدا ہی کی یاد کے ساتھ دلوں کو چین ملتا ہے تمام عالم میں چراغ لے کر ڈھونڈھ آؤ کوئی دوسری چیز نہ ملے گی کیونکہ ظاہر حصر سے حقیقی ہی ہے

خلاصہ بیان کا یہ ہوا کہ بس ذکر اللہ ہی ایک چیز ٹھہری جس میں چین اور اطمینان ہے۔

تکرار ذکر سے عذاب غم سے نجات ہوگی

اور جس مرتبہ کا ذکر ہوگا اسی مرتبہ کا اطمینان عطا ہوگا۔ اور اس اطمینان کا حاصل یہ نہ ہوگا کہ غم بالکل زائل ہو جائے گا بلکہ یہ حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ ہوگا عاقل اس پر راضی ہو جائے گا یہ سمجھے گا کہ جو ہوا عین حکمت ہوا۔ اسی ذکر کے تکرار سے غم کا غلبہ کم ہو جائے گا جس سے تکلیف کا درجہ جاتا رہے گا تو کیا ٹھکانہ ہے رحمت کا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا طریقہ بتلایا کہ عذاب غم سے بھی بچ جاؤ اور ثواب سے بھی محروم نہ ہو مگر تم یہ چاہتے

ہو کہ غم ہی نہ رہے جس کے معنی یہ ہیں کہ صبر کا ثواب نہ ملے۔

بیماری میں آہ کا منہ سے نکلنا خلاف صبر نہیں

جیسے یعقوب علیہ السلام کا قول ہے انما اشکوبثی و حزنی الی اللہ اسی طرح آنسو بہانا آہ آہ منہ سے نکلنا بھی خلاف صبر نہیں ورنہ حضور ﷺ سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی زیادہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے تو دل میں خدا سے شکایت پیدا نہیں ہوتی بعض لوگوں کو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے وہ بیماری میں آہ آہ کرنے کو خلاف صبر سمجھتے ہیں اس لئے اللہ اللہ کرتے ہیں تاکہ قوت قلب ظاہر ہو مگر یہ معرفت کے خلاف ہے اس پر مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کی شکایت مجھے یاد آئی کہ ایک بار وہ بیماری میں اللہ اللہ کر رہے تھے کہ اس کے بھائی آ گئے وہ بھی بڑے بزرگ تھے انہوں نے فرمایا بھائی جی آہ آہ کرو کیونکہ اللہ اللہ مظہر الوہیت ہے اور آہ آہ مظہر عبدیت ہے اور اس وقت وہ عبدیت کو دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے آہ آہ شروع کی اور بہت جلد صحت ہو گئی کیونکہ مقصود پورا ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ کو عجز و نیاز اور تضرع زاری بہت پسند ہے اور یہ بات آہ ہی میں ہے اللہ کرنے میں نہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

تا نگرید کودک حلوا فروش بحر بخشائش نمی آید بجوش

جب تک حلوائی کا لڑکا نہ روئے اس کی بخشش کا دریا جوش میں نہیں آتا۔

(الفصل والانفصال فی الفعل والانفصال ملحقہ مواعظ تدبیر و توکل ۱۹۶)

تدریجی تعلیم

فرماتے الذین آمنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ

ترجمہ: یعنی جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کے دلوں کو چین ہوتا ہے خدا کے ذکر سے اور اس میں حصر اس لئے نہیں کہ خدا ہی کا ذکر ہے۔

چین ہوتا ہے۔ کیونکہ مخاطب ابھی سمجھ رہا تھا کہ چین اور چیزوں سے ہوتا ہے تو اسے بالفعل صرف اتنا ہی بتا دیا کہ چین خدا کے ذکر سے بھی ہوتا ہے۔

سبحان اللہ! کیا تدریجی تعلیم ہے کہ مخاطب قبول ہی کرے۔ اگر ابتداء ہی سے حصر کے طور پر فرماتے تو ایک قسم کا معارضہ ہو جاتا۔ یہ نہیں کیا پہلے یہ بتایا کہ اور چیزوں سے چین ہونے کی ہم نفی نہیں کرتے مگر خدا کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے۔ جب مخاطب نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے۔ تو آگے فرمایا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کہ آگاہ ہو جاؤ۔ اور خبردار ہو جاؤ کہ خدا کے ذکر سے دلوں کو چین ہوتا ہے اور کسی چیز سے چین نہیں ہوتا پہلے جملہ میں تو بذکر اللہ جو ظرف ہے تطمئن کا اپنی جگہ پر ہے یعنی مؤثر ہے اور آگے

بذکر اللہ کی تقدیم فرمائی تا کہ حصر کو مفید ہو کہ تقدیم ماحقہ التاخیر مفید حصر ہوتا ہے اور پھر اس کو الاحرف تنبیہ سے موکد بھی کر دیا کہ ہوشیار ہو جاؤ کہ خدا ہی کی یاد سے دلوں کو چین ہوتا ہے۔

اعمال آخرت میں دنیاوی منافع

چنانچہ حق تعالیٰ نے جابجا جہاں ثمرات آخرت کا ذکر فرمایا ہے وہاں طاعات پر جو دنیاوی ثمرات مرتب ہوتے ہیں ان کو بھی بیان فرمایا ہے ارشاد ہے **ولو انهم اقاموا التوراة والانجيل وما انزل اليهم من ربهم لا كلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم الاية** یعنی اگر یہ لوگ احکام کا پورا اتباع کرتے تو ان کو اوپر سے بھی کھانے کو ملتا اور نیچے سے بھی کھانے کو ملتا یعنی اوپر سے بارش نیچے سے پیداوار تو دیکھئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کھانے پینے کے لئے نہیں ہے کھانا تو کافروں کو بھی ملتا ہے بلکہ بہائم کو بھی کسی قدر بلا مشقت مگر پھر بھی کیوں ذکر فرمایا اسی واسطے کہ خیر کوئی کھانے پینے کا لالچی اس طرح آ جائے اس طرف دیکھئے ارشاد خداوندی سے معلوم ہوا اعمال آخرت کے اندر دنیاوی منافع بھی ہیں۔

گناہوں سے دنیا کا نقصان

اسی طرح معاصی کے اندر دنیا کی مضرت بھی ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے **ان العبد ليحرم الرزق بخطيئته يعملها** دیکھئے بسبب گناہ کے رزق کا گھاٹا بھی ہو جاتا ہے۔اس سے تمام حدیثیں بھری ہوئی ہیں۔اس میں یہ دکھلا دیا گیا ہے کہ طاعات میں دنیا کے کیا کیا نفع ہیں اور معاصی میں دنیا کی کیا کیا مضرت ہے اس کے لکھنے سے میری یہی غرض تھی کہ لوگ دنیا ہی کے نفع نقصان کو سوچ کر دین کی طرف متوجہ ہو جائیں اسی طور پر حق تعالیٰ نے یہاں بھی ایک چیز بتلائی ہے جو دنیا کے نفع کی ہو وہ بڑی ہی ضرورت اور کام کی چیز ہوگی۔

فرماتے ہیں **الا بذكر الله تطمئن القلوب** یاد رکھو سمجھ رکھو (یہ مدلول ہے کلمہ آلا کا) حصر کے ساتھ فرماتے ہیں (یہ مدلول ہے تقدیم معلول کا) یہ خدا ہی کی یاد کے ساتھ دلوں کو چین ملتا ہے۔فقط ایک چیز ہے۔جس سے دلوں کو چین ملتا ہے۔فقط ایک چیز ہے۔جس سے دلوں کو چین ملتا ہے۔تمام عالم میں چراغ لے کر ڈھونڈھ آ ؤ کوئی دوسری چیز نہ ملے گی کیونکہ ظاہراً حصر سے مراد حقیقی ہی ہے اس کے بعد حصر حقیقی اور حصر اضافی کی نفیس بحث تھی اور اصل حصر میں حقیقی ہی ہوتا ہے بلا ضرورت دلیل اضافی مراد نہیں لیا جاتا اور یہاں حصر کے اضافی ہونے کی کوئی دلیل ہے نہیں نیز اور کسی چیز کا موجب اطمینان ہونا بھی ثابت نہیں۔ جب مشاہدہ ہے حصر کے حقیقی ہونے کا ہو گیا تو پھر اضافی کیونکر ہوا۔غرض یہاں کوئی دلیل نہیں کہ عدول کیا جائے حصر کے حقیقی ہونے سے جب کوئی دلیل نہیں اور مشاہدہ بھی اس کا موید ہے تو اس کو حقیقی ہی کہا جائے گا۔

قرار وسکون صرف ذکر اللہ میں ہے

لہٰذا خدا کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ سوائے اس کی یاد کے چین کی کوئی چیز ہے ہی نہیں قرار وسکون اگر ملتا ہے تو خدا ہی کی یاد سے اس کے بیان فرمانے میں بہت اہتمام فرمایا ہے چنانچہ الا سے کلام شروع کیا یعنی دیکھو ہوشیار ہو کر سن لو اور سمجھ لو یاد رکھو خدا ہی کی یاد ایک ایسی چیز ہے جس سے قلوب کو چین ملتا ہے دنیا بھر میں کوئی اور چیز ایسی نہیں جو قلب کو راحت پہنچا سکے واقعی بہت بڑا دعویٰ ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس میں قلوب کا چین منحصر ہے غرض حصر کے ساتھ فرماتے ہیں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴿۲۸﴾ کہ سوائے یاد خدا کے کسی چیز میں قلوب کا چین نہیں۔ اور ہر چند کہ ترجمہ سے مقصود ترغیب ہی ہے ذکر کی لیکن قرینہ مقام سے خود ترغیب سے مقصود اس کا امر کرنا اور اس کا ضروری بتلانا ہے دو چیزوں کو جاننا یہاں ضروری ہے ایک تو یہ کہ ذکر اللہ ضروری چیز ہے دوسرے یہ کہ اس کے سوائے اور کوئی چیز ایسی نہیں جسمیں قلوب کو چین حاصل ہو سکے اول جز ضروری ہوتا ہے سو ضرورت اس کی بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس میں دنیا کا بھی نفع ہے اور دین کا بھی نفع ہے پھر اس سے زیادہ کیا ضرورت کی چیز ہوگی۔

سُوْرَةُ ابْرَاهِيم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴﴾

ترجمہ: اور ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ تا کہ ان سے (احکام الٰہیہ کو) بیان کریں پھر جس کو اللہ تعالیٰ چاہیں گمراہ کرتے ہیں اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں اور وہی (سب امور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

قرآن پاک رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی زبان میں اترا ہے

ارشاد فرمایا کہ الہ آباد میں ایک دفعہ جانا ہوا اور سید اکبر حسین جج اس زمانہ میں کسی منتہی طالب علم سے عربی پڑھتے تھے انہوں نے طالب علم مذکور سے سوال کیا کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر رسول کی زبان اس کی قوم کی زبان ہوتی ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی تھی اس بنا پر یہ ہونا چاہئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم یعنی جن کی طرف آپ مبعوث ہوئے صرف اہل عرب ہوں حالانکہ خود قرآن میں آپ کا رسول الی کافۃ للناس ہونا مصرح ہے اور عقیدہ بھی یہی ہے اور یہ صریح تعارض ہے طالب علم مذکور نے جواب دیا مگر ان کی تشفی نہ ہوئی اس طالب علم نے آکر مجھ سے ذکر کیا میں نے اس کی زبانی کہلا بھیجا کہ قرآن میں بلسان قومہ آیا ہے بلسان امۃ نہیں آیا جو یہ شبہ ہو اور

قوم کہتے ہیں برادری اور خاندان کو پس وہ امت کا مرادف نہیں ہے اور قوم رسول ﷺ کی بلاشک عرب قریش ہی تھے مگر اس سے امت کا خاص عرب ہونا کیسے لازم آیا پس رسالت عام ہے قوم اور غیر قوم کو اس جواب کو انہوں نے بہت ہی پسند کیا۔

دو آیات اور ان میں تعارض کے شبہ کا حل

(ملفوظ) ایک صاحب نے سید اکبر حسین صاحب جج مرحوم کا تذکرہ کیا فرمایا کہ جی ہاں وہ بڑے متین آدمی تھے اور اچھے شاعر تھے ان کے اکثر اشعار حکمت پر مشتمل ہیں اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے ان اشعار کے اندر معائب بیان ہوتے ہیں خود وہی لوگ ان اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں میرے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور ان کے میرے تعلقات کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک صاحب مولوی یعقوب تھے سید صاحب ان سے ایک زمانہ میں عربی پڑھا کرتے تھے اور گو سید اکبر حسین صاحب نے عربی زیادہ نہ پڑھی تھی مگر چونکہ ذہین آدمی تھے اس لئے اچھی قابلیت پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہ تو یوں کہا کرتے تھے کہ انگریزی کے اندر جو قابلیت مجھ کو حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ یہی تعلیم عربی ہی ہے ایک بار میں الہ آباد گیا ہوا تھا مولوی یعقوب میرے پاس آئے اور کہا کہ آج میں سید صاحب کو سبق پڑھا رہا تھا انہوں نے قرآن کی ایک آیت پر ایسا شبہ پیش کیا کہ جس کا مجھ سے جواب نہیں بن پڑا۔ میں نے کہا کہ وہ شبہ کیا ہے۔ کہنے لگے کہ قرآن میں آیا ہے **وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ** اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اور اس کی قوم کی زبان ایک ہوتی ہے اور حضور کی ہم زبان صرف قوم عرب تھی تو معلوم ہوا کہ حضور کی قوم صرف اہل عرب تھے پس اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور کی بعثت صرف قوم عرب کی طرف تھی عام نہ تھی اور ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے **وما ارسلناک الا کافۃ للناس** اس سے معلوم ہوا کہ حضور کی بعثت عام تھی تو ان دونوں آیتوں میں تعارض ہو رہا ہے میں نے کہا کہ کچھ بھی تعارض نہیں' کیونکہ قرآن میں تو یہ آیا ہے **وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ** یہ تو نہیں فرمایا بلسان امتہ اور لفظ قوم ایک عربی لفظ ہے اس کے معنی برادری اور خاندان کے ہیں بلسان قومہ سے صرف اتنا ثابت ہوا کہ حضور کی برادری جو تھی وہ اہل عرب تھی عجمی آپ کی برادری نہ تھے مگر اس سے دوسری قوموں کے امتی ہونے کی کیسے نفی ہو گئی اور دوسری آیات میں سب کے امتی ہونے کا اثبات ہے پہلی آیت میں ایک بات کا ذکر ہے اور دوسری میں دوسری بات کا تو دونوں آیتوں میں تعارض کہاں ہوا تب ان مولوی صاحب کو اطمینان ہوا اور جا کر انہوں نے سید صاحب سے یہ جواب نقل کیا تو سید صاحب اس جواب کو سن کر بہت خوش ہوئے اور دریافت کیا کہ یہ جواب کس نے دیا ہے انہوں نے میرا نام لیا تو فوراً گاڑی میں سوار ہو کر میرے پاس آئے اور بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اس کے بعد سے سید صاحب برابر

شبہات مجھ سے بیان کیا کرتے اور میں جواب دیا کرتا تھا جس سے ان کو شفا ہوتی تھی۔ ایک واقعہ ان کے انتقال کے بعد کا یاد آیا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نے ان کا دیوان مرتب کرنا چاہا تو ان کے دو شعر میرے پاس بھیجے اور لکھا کہ ان اشعار کو میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے شعراء کے پاس بھیجا کہ اس کی شرح کرو مگر کوئی بھی ان اشعار کی شرح پر قادر نہ ہو سکا بلکہ یہ جواب دیا کہ یہ اشعار مہمل ہیں۔ میں نے ان کو لکھا کہ اگر یہ شعر اور کسی کے ہوتے تو میں بھی ان کو مہمل کہتا مگر سید صاحب کو میں جانتا ہوں کہ وہ ایسے نہ تھے کہ مہمل شعر کہتے لہٰذا ان کا کلام مہمل نہیں ہو سکتا اس کے بعد میں نے ان اشعار کی شرح لکھ کر ان کو بھیج دی سنا ہے کہ اس شرح کو بے حد پسند کیا گیا بعینہ وہ شرح انہوں نے شائع کر دی۔ (الافاضات الیومیہ ج ۱۰ صفحہ ۲۶)

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝

ترجمہ: اگر تم شکر کرو گے تو تم کو زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

تفسیری نکات

نعمت اسلام پر اظہار تشکر

اشارتاً بتلایا گیا ہے کہ تم ایسے نہیں ہو جو مستقلاً اسلام کا شکر ادا کرو اس لئے بچوں کی طرح روٹیوں کے بعد شکر اسلام کی تعلیم فرمائی کہ میاں اور کسی وقت شکر نہ کرو تو روٹیاں کھانے کے بعد تو اسلام کا شکر ادا کر لیا کرو کیونکہ اس وقت ایک ظاہری نعمت تمہارے سامنے ہوتی ہے اس کا شکر تو تم طبعاً ادا کرو ہی ہو گے اس کے ساتھ ساتھ نعمت اسلام کا شکر بھی ادا کرو جس سے یہ سب کھانا پینا بھی نعمت ہو گیا اور اسلام کی بدولت آخرت میں بھی تم کو یہ نعمتیں نصیب ہوں گی اگر نعمت اسلام نہ ہوتی تو کھانا پینا سب وبال جان ہوتا اور اس کی لذت چند روزہ ہوتی پس روٹیوں کے ساتھ شکر اسلام تعلیم فرمانا ایسا ہے جیسے بچوں کو بتاشہ میں دوا دیتے ہیں افسوس ہم ایسے غافل ہیں کہ حضور ہم کو بچوں کی طرح بہلا پھسلا کر شکر اسلام کی تعلیم فرما رہے ہیں اور اسی طرح اپنے کھانے کے میل میں کھانے کے بعد حضور نے ایک اور مفید دعا بھی تعلیم فرمائی ہے کہ جب کسی دوسرے کے گھر کھانا کھاؤ تو یوں کہو اللھم اطعم من اطعمنی واسق من سقانی یعنی دعوت کرنے والے کو دعا دو کہ اے اللہ جس طرح اس نے ہم کو کھلایا پلایا ہے آپ بھی اس کو ہمیشہ کھلاتے پلاتے رہیں (یا جنت کے طعام و شراب سے ممتاز فرمائیں۔ حضور کی تو یہ تعلیم ہے مگر یہاں یہ عادت ہے کہ کھلانیوالے کو دعا تو کیا دیتے اس کا شکر تو کیا ادا کرتے الٹا کھانے میں عیب نکالتے ہیں خصوصاً رسوم کے کھانوں میں تو اکثر یہی ہوتا ہے ایک بنیے نے اپنی لڑکی کی شادی میں بہت بڑی بارات بلائی تھی اور دعوت کا سامان بہت بڑھیا کیا تھا اس کے علاوہ چلتے ہوئے ہر

باراتی کو ایک ایک اشرفی بھی دی تھی یہ سب کچھ کر کے اس کو خیال ہوا کہ آج بارات والے میری خوب تعریف کرتے جائیں گے وہ اپنی تعریف سننے کے لئے اس راستہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جہاں سے بارات گزر رہی تھی مگر وہاں بالکل سناٹا تھا کسی نے بھی تو بنئے کی دریا دلی کی داد نہ دی آخر بہت دیر کے بعد ایک گاڑی میں سے آواز آئی کہ کوئی شخص دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ بھائی! لالہ جی نے بڑی حوصلہ کی دعوت کی اچھے اچھے کھانے کھلائے اور چلتے ہوئے ایک ایک اشرفی دی تو دوسرا کیا کہتا ہے کہ میاں کیا کیا؟ سسرے کے یہاں اشرفیوں کے کوٹھے بھرے پڑے ہیں۔ دو دو بانٹ دیتا تو اس کے کیا کمی آ جاتی' لیجئے ایک ایک اشرفی بانٹ کر تو سسرے کا خطاب ملا' زیادہ بانٹتا تو معلوم کیا خطاب ملتا؟

حب جاہ کی حقیقت

اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ اس شخص سے زیادہ کوئی احمق نہیں جو طالب جاہ ہو کیونکہ یہ کمال محض وہمی انتزاعی ہے اور انتزاعی بھی ایسا جو اس شخص کے ساتھ خود قائم نہیں بلکہ دوسرے کے خیال کے ساتھ قائم ہے کیونکہ جاہ نام ہے دوسروں کی نظروں میں معزز ہونے کا جس کا مدار محض دوسرے کے خیال پر ہے جو کہ اپنے وجود میں خود اس دوسرے کے تابع ہے وہ جب چاہے بدل دے تو ساری جاہ خاک میں مل جاتی ہے مگر طالب جاہ خوش ہے کہ آہا لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں جیسے چوہا خوش ہوتا کہ بنئے کی دکان میں میرے واسطے غلہ آیا ہے؟ جی ہاں' ذرا منہ تو ڈالو' ابھی تو چوہے دان آتا ہے جس سے ساری خوشی کرکری ہو جائے گی۔

اسی طرح دوسرے شخص کا اپنا خیال بدل دینا یہ جاہ کے لئے چوہے دان ہے۔ ایک نقص تو جاہ میں یہ ہے کہ وہ سراسر دوسرے کے تابع ہے وہ ایسا کمال نہیں جو اپنے قبضہ کا ہو دوسرا نقص یہ ہے کہ اس سے نفع جو حاصل ہوتا ہے وہ محض وہمی ہے یعنی بڑائی اور عزت؟ کیونکہ عزت و بڑائی سے نہ گھر میں روپیہ آتا ہے نہ جائیداد بڑھتی ہے۔ محض دل خوش کر لو ورنہ جاہ سے تو اچکن میں ایک بٹن بھی نہیں لگتا اور جو لوگ جاہ سے نفع مالی حاصل کرتے ہیں جیسے بعض لوگ بڑا بن کر غریبوں سے بیگار لیتے ہیں یا جا و بیجا فرمائشیں کرتے رہتے ہیں ان کی جاہ بہت جلد زائل ہو جاتی ہے غرض اس سے بدوں خیالی نفع کے اور کچھ فائدہ نہیں

ایک رئیس نے دیوبند میں بڑی دھوم کی دعوت کی تھی جس میں بڑا روپیہ صرف ہوا تھا حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے دعوت کے بعد ان رئیس صاحب کو اس فراخ حوصلگی کی داد اس طرح دی کہ شیخ صاحب! واقعی آپ نے بڑے حوصلہ کا کام کیا مگر افسوس یہ ہے کہ اتنا روپیہ خرچ کر کے آپ نے ایسی چیز خریدی جو بازار میں پھوٹی کوڑی کو بھی نہیں بک سکتی' یعنی نام' اور اگر بدنامی ہوگئی تو وہ خیال جاہ بھی جاتی رہی بس جاہ کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی منہار پوٹلا باندھے ہوئے چوڑیوں کا لیجا رہا تھا ایک گنوار نے لاٹھی کا کھوادا مار کر پوچھا کہ

میاں اس میں کیا ہے؟ (گانوں والوں کی عادت ہے کہ وہ لاٹھی مار کر پوچھا کرتے ہیں) اس منہار نے جواب دیا کہ اس میں ایسی چیز ہے کہ ایک ہوا اور مار دو تو کچھ بھی نہیں' اسی طرح جاہ ایسی چیز ہے کہ ذرا سی ٹھیس میں جاتی رہتی ہے اس لئے جو لوگ نام کے واسطے روپیہ برباد کرتے ہیں وہ بڑی غلطی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر غلطی کھانے والوں کی ہے کہ وہ دوسروں کا مال کھا کر شکر نہیں ادا کرتے نہ اسے دعا دیتے ہیں۔

ہاں آج کل مردوں کو فاتحہ میں دعا دی جاتی ہے وہاں بھی کھلانے والوں کو کوئی دعا نہیں دیتا حالانکہ پہلے کھلانیوالے کو دعا دینی چاہئے اگر وہ نہ کھلاتا تو مردوں کو ثواب کیسے پہنچتا بلکہ کھانیوالوں کو بھی دعا دینی چاہئے اور ان کا مشکور ہونا چاہئے کیونکہ وہ نہ کھاویں تب بھی مردوں کو ثواب نہیں پہنچ سکتا۔

میرٹھ میں ایک لطیفہ ہوا کسی جگہ مردوں کی فاتحہ دی جا رہی تھی اور ایک لمبی فہرست پڑھی جا رہی تھی جس میں نمبروار مردوں کے نام درج تھے جب فہرست کے ختم ہونے میں دیر لگی تو ایک صاحب بولے کہ میاں اس میں ہمارا نام بھی تو لکھا ہوتا کیونکہ خدا کی قسم اگر ہم نہ کھاویں تو ان میں سے ایک کو بھی تو ثواب نہ ملے گا اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور وہ فہرست مختصر کی گئی۔

ان رسوم میں ایک بات ایسی ضرور موجود ہوتی ہے جو ان کے لغو و باطل ہونے پر خود دلالت کرتی ہے چنانچہ کھانے سے پہلے مردوں کے نام ترتیب وار لیا جانا' یہ محض لغو حرکت ہے آخر یہ نام کے سنائے جا رہے ہیں اگر کھانے والوں کو سنائے جاتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی نیت کر کے کھانا' تو ظاہر ہے کہ کھانے والے جب ہاتھ دھو کر بیٹھتے ہیں ان کو سوا کھانے کے اور کچھ یاد نہیں رہتا اور نہ اتنی لمبی فہرست یاد رہ سکتی ہے اور اگر خدا کو سنانا ہے تو اس کا لغو ہونا بالکل ظاہر ہے خدا تعالیٰ کو تو ہر شخص کی نیت کا حال معلوم ہے ان کو سنانے کی کیا ضرورت ہے مگر پھر بھی بعض لوگ اپنی اغراض کے لئے فاتحہ وغیرہ کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولوی خواہ مخواہ فاتحہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ سورۂ فاتحہ خاص اسی واسطے اتری ہے چنانچہ اس کا نام ہی فاتحہ ہے' سبحان اللہ' کیا پاکیزہ دلیل ہے پھر یہ لوگ علماء سے بحث کر کے وقائق علمیہ کو سمجھنا چاہتے ہیں اور جب نہیں سمجھتے تو علماء پر الزام لگاتے ہیں یہ ہم کو سمجھا نہیں سکتے غرض حضور ﷺ نے ہم کو کھانے کے بھی سب آداب بتلائے ہیں جن میں ضمناً اسلام پر بھی شکر کی تعلیم فرمائی۔

شکر کے معنی

اب سمجھئے کہ شکر کے معنی ہیں قدر دانی کے' اسی واسطے خدا تعالیٰ کا نام شکور ہے کہ وہ اعمال کی قدر کرتے ہیں قدر کی دو صورتیں ہیں اگر یہ شخص حاجت مند ہے تو اس کی قدر تو یہ ہے کہ اس سے منفعت حاصل کرے اور منعم کا احسان مند رہے اور اگر حاجت مند نہیں ہے تو اس کی قدر یہ ہے کہ اس فعل کی جزا و صلہ عطا کرے چنانچہ

حق تعالیٰ کو شکور اسی معانی کے اعتبار سے کہتے ہیں ان کی قدر دانی یہ ہی ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کا صلہ دیتے ہیں اور بندہ کی قدر دانی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے وہ منافع حاصل کرے جن کے لئے وہ موضوع ہیں مثلاً روٹی کی قدر یہ ہے کہ اسے کھاؤ پانی کی قدر یہ ہے کہ پیو اور برف کی قدر یہ ہے کہ اس سے ٹھنڈک حاصل کرو اگر کوئی شخص برف کو پانی میں گھول کر معمولی برتن کے اندر رکھ دے تو کہا جاتا ہے کہ اسے برف کی قدر نہیں ہے یعنی جس منفعت کے لئے وہ موضوع تھی اس سے وہ نفع حاصل نہ کیا' اس لئے ناقدری کی اسی طرح اسلام کا شکریہ ہے کہ اس کی قدر کرو اور قدر یہ ہے کہ اس کی برکات و منافع حاصل کرو۔ (محاسن اسلام ۳ ملحقہ مواعظ محاسن الاسلام صفحہ ۲۵ تا ۲۶)

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٥﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿٢٧﴾

ترجمہ: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ (توحید و ایمان) کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے' جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں۔ وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہو اور اللہ تعالیٰ (ایسی) مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جاوے اس کو کچھ ثبات نہ ہو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمہ طیبہ کی برکت) سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں (یعنی کافروں) کو (دین میں اور امتحان میں) گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

تفسیری نکات

شجرہ طیبہ سے شجرہ نخلہ مراد ہے

اس میں کلمہ طیبہ کی مثال بیان فرمائی ہے جس سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔

حدیث میں اس کی تصریح ہے اور محمد رسول ﷺ کے تابع ہے وہ بھی مراد ہی ہے کیونکہ متبوع کے ساتھ تابع کا ہونا لازم ہے مگر چونکہ اہل ایمان اس امت سے پہلے بھی گذرے ہیں اور جو فضائل ایمان کے ہیں وہ ان کے لئے بھی ثابت ہیں اور لا الہ الا اللہ کا قرین ہر امت میں بدلتا رہا ہے کوئی لا الہ الا اللہ کے ساتھ نوح نبی اللہ کوئی ابراہیم خلیل اللہ کہتا تھا کوئی موسیٰ کلیم اللہ کوئی عیسیٰ روح اللہ اور ہم محمد رسول اللہ کہتے ہیں تو یہ جملہ متبدل ہے اور لا الہ الا اللہ غیر متبدل ہے جس میں تمام اہل ایمان مشترک ہیں اس لئے اکثر احادیث میں لا الہ الا اللہ پر اکتفا کیا گیا ہے باقی مطلب وہی ہے کہ لا الہ الا اللہ مع اپنے قریب کے جو ہر امت مسلمہ کے لئے الگ الگ ہے اور صوفیہ کا ادب دیکھئے کہ وہ جب اپنے مریدوں کو ذکر لا الہ الا اللہ کی تعلیم کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کا ذکر تو اتنی مقدار میں کیا کرو دو سو یا پانچ سو دفعہ اور کبھی کبھی محمد رسول اللہ ﷺ بھی کہہ لیا کرو یہ نہیں بتلاتے کہ ہر دفعہ پورا کلمہ کہا کرو اس طرح انہوں نے تابع و متبوع دونوں کا حق ادا کر دیا تو فرماتے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے شجر طیبہ (پاکیزہ درخت) شجرہ طیبہ سے مراد شجر نخلہ ہے اس کو مثال کے لئے یا تو اس واسطے خاص کیا کہ اہل عرب کے نزدیک وہ اطیب الاشجار ہے مگر میرے نزدیک حقیقت میں وہ عرب و عجم سب میں اطیب شجرہ ہے ایک تو اس کی پیدائش سہل ہے بعض دفعہ تو خود ہی اگ آتا ہے چنانچہ سینکڑوں درخت کھجور کے خود رو موجود ہیں پھر اس کی خدمت کی جائے تو ان کا پھل نہایت عمدہ اور لذیذ ہے پھر اس کی کوئی چیز ضائع نہیں ہر ایک میں منافع بینہ موجود ہیں لکڑی کڑیوں میں کام آتی ہے پتوں سے پنکھے اور بوریئے بنتے ہیں جیسے گنے کا رس نکالا جاتا ہے) اور بینہ کی قید اس لئے لگائی کہ منافع خفیہ تو ان چیزوں میں بھی ہیں جن کو ہم بیکار سمجھتے ہیں جیسا کہ گلزار ابراہیم میں ایک حکیم کا قصہ لکھا ہے کہ اس کو ایک دن پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے خیال ہوا کہ یہ پاخانہ کا کیڑا کس کام آتا ہے اس میں ظاہر ہے کوئی منفعت نہیں معلوم ہوتی اس خیال کا آنا تھا کہ چند روز میں اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں بڑا گھبرایا بہت علاج کئے مگر کچھ نفع نہ ہوا اتفاق سے ایک دفعہ کوئی دوسرا حکیم اس کی بستی میں آیا جو آنکھوں کا علاج کرتا تھا اس اندھے حکیم نے بھی اس سے رجوع کیا اس نے کوئی دوا اس کی آنکھ میں لگا دی جس سے بہت جلد آنکھیں کھل گئیں اور اچھی طرح نظر آنے لگا اس نے حکیم سے پوچھا کہ اس دوا کے کیا اجزا ہیں دوسرے حکیم نے کہا کہ اس کا

جزاعظم گوہ کا کیڑا ہے اس وقت اس کو تنبہ ہوا کہ یہ غیب سے مجھ کو سزا دی گئی تھی کیونکہ میں نے اس کو بیکار خیال کیا تھا حق تعالیٰ نے اس طرح مجھ کو اس کا نفع بتلایا پس منافع خفیہ سے تو کوئی چیز بھی خالی نہیں گو ہم کو علم نہ ہو مگر کھجور کے تو ہر جزو میں منافع بینہ ہیں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس لئے وہ عرب وعجم سب کے نزدیک اطیب شجر ہے آگے فرماتے ہیں اَصْلُهَا ثَابِتٌ کہ اس کی جڑ تو جمی ہوئی ہے یعنی زمین میں وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ نخلہ میں اس صفت کا ہونا تو ظاہر ہے اور کلمہ طیبہ کے لئے یہ صفت اس طرح ثابت ہے کہ اس کی بھی ایک جڑ ہے جو مومن کے قلب میں جمی ہوئی ہے پس قلب مومن منزلہ ارض کے ہے اور اعتقاد توحید جو اس میں راسخ ہے وہ کلمہ طیبہ کی جڑ ہے اور قلب مومن کو ارض سے تشبیہ قرآن میں دوسری جگہ مصرح ہے سورہ حدید میں ہے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝

ترجمہ: کیا مسلمانوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور اس دین حق پر عمل کے لئے جھک جائیں جو اللہ کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور زیادہ تر ان میں سے فاسق ہیں جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو مردہ ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تفسیر میں صراحتاً فرمایا ہے کہ ارض سے قلب مراد ہے اوپر جو اہل کتاب کی قساوت کا ذکر تھا جس سے ان کے مایوس اور ناامید ہو جانے کا احتمال تھا اس آیت سے مایوسی کو قطع کیا گیا ہے۔ کہ گو تمہارے دل سخت تو ہو گئے مگر ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں

ایمان قبول عمل کیلئے شرط ہے

اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو بھی زندہ کر دیتے ہیں اور وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ یہ ہے کہ وہ عالم ملکوت کی طرف بلند ہوتا ہے جس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے (یعنی حق تعالیٰ ہی اس کو قبول فرماتے ہیں اور اچھا کام اس کو بلند کرتا اور پہنچاتا ہے صعود سے مراد تو قبول اور رفع سے مراد ذریعہ قبول بنتا ہے اب اگر عمل صالح سے مراد ایمان ہے تب تو قبول سے مراد نفس قبول ہے کیونکہ ایمان ہر عمل کے قبول کیلئے شرط ہے اور اگر دیگر اعمال صالحہ مراد ہیں تو وہ نفس قبول کے لئے شرط نہیں مگر کمال قبول کے لئے شرط ہیں آگے فرماتے ہیں وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ چونکہ مثال عجب تھی اس لئے اس کی حکمت بتلاتے ہیں کہ حق تعالیٰ لوگوں کے واسطے مثالیں اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں کیونکہ مثال سے توضیح مقصود خوب ہو جاتی ہے آگے کلمہ کفر کی مثال ہے

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر وشرک کی) ایسی مثال ہے جیسے خبیث درخت ہو (حدیث میں اس کی تفسیر آئی ہے کہ وہ حنظل کا درخت ہے) جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اس کو کچھ ثبات ہی نہ ہو (چنانچہ حنظل کے درخت کی جڑ تک نہیں ہوتی نیز حنظل اور اس کا پھل بو اور مزہ میں بھی تلخ ہوتا ہے اسی طرح کلمہ کفر سے دل کو بے چینی ہوتی ہے راحت نہیں ملتی اور اس کی جڑ گو کافر کے دل میں ہے مگر حق کے سامنے باطل ایسا مضمحل ومغلوب ہے کہ گویا اس کے جڑ ہی نہیں اور جب اس کے جڑ ہی نہیں تو پھل وغیرہ کیا ہوتے اس لئے نہ یہاں شاخوں کا ذکر فرمایا نہ پھل کا اور یہ عجب نکتہ ہے اس مقام میں کہ چونکہ کفر کا کچھ تو وجود اس لئے اس کا کچھ ذکر فرمادیا اور چونکہ اس کا معتد بہ وجود نہیں اس لئے بقیہ آثار کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ذکر اس شے کا ہوتا ہے جو کچھ تو ہو اور یہ فی الجملہ وجود بھی دنیا میں ہے اور آخرت میں تو کفر معدوم ہی ہو جائے گا کیونکہ وہاں سب کو ایمان حاصل ہو جائے گا گو کفار کا وہ ایمان معتبر نہیں کیونکہ بالاضطرار ہوگا اختیار سے نہ ہوگا آگے اس آیت میں کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کے اثر کا ذکر ہے۔
اوپر تو دونوں کی مثال تھی یہاں دونوں کے اثر کا بیان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات کی برکت سے (مراد کلمہ طیبہ ہے جس کی جڑ مضبوط ہے) دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں مضبوط رکھتا ہے دنیا میں تو اس طرح کہ مومن کلمہ کی برکت سے شیاطین الانس والجن کے اغوا سے محفوظ رہتا ہے اور مرتے دم تک ایمان پر قائم رہتا ہے اور آخرت میں اس طرح کہ قبر میں نکیرین کے سوال کا صحیح صحیح جواب دے دے گا آگے کلمہ کفر کے اثر کا بیان ہے وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ یعنی اس کلمہ خبیثہ کی نحوست سے کافروں کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں بچلا دیتے ہیں دنیا میں تو ان کا بچلنا ظاہر ہے اور آخرت میں بچلنا یہ ہے کہ قبر میں ان سے نکیرین کے سوال کا جواب نہ بن پڑیگا۔ بلکہ حیرت زدہ ہو کر کہیں گے افسوس ہم کچھ نہیں جانتے غرض قول ثابت سے مراد کلمہ طیبہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں تھا اسی کی بدولت آخرت میں نجات ہوگی جس کی ایک جڑ ہے اور کچھ شاخیں ہیں جڑ تو عقیدہ توحید ہے اور شاخیں اعمال صالحہ ہیں ان سب کا مجموعہ قول ثابت ہے پس عقیدہ توحید کو پختہ کرو جس کا طریقہ کثرت ذکر ہے اور اعمال کو صالحہ کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ علم دین حاصل کرو مسائل کی کتابیں دیکھو وعظ کی کتابوں کا مطالعہ کرو اور ان کے موافق عمل شروع کرو جس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے کہ دین پر عمل کرنے میں اگر کوئی ملامت کرے تو کسی کی پرواہ نہ کرو پھر ان شاء اللہ آپ کو وہ دولت ملے گی کہ تمہارے اقوال واعمال واحوال میں نورانیت ہوگی اور کثرت ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کو تربیت وتعلیم حاصل ہے تب تو اس سے پوچھ کر کوئی ذکر شروع کرو اور اگر کسی کی تربیت نہیں ہے تو چلتے پھرتے لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے رہو کام کے وقت زبان سے کسی قدر جہر کرتے رہو تا کہ یاد رہے اور خالی وقت میں تسبیح ہاتھ میں رکھو یہ مذکرہ ہے اس سے ذکر یاد رہتا ہے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بعد کمال کے تسبیح ہاتھ میں رکھتے تھے

کسی نے کہا حضرت اب تو آپ کو اس کی ضرورت نہیں رہی فرمایا جس رفیق کی بدولت یہ بات حاصل ہوئی ہے کیا اب اس کو چھوڑ دوں یہ تو بڑی بے مروتی ہے۔ غرض تسبیح سے غفلت نہیں ہوتی ذکر کا دھیان رہتا ہے اس کو ہاتھ میں رکھو اور کسی طعن کی پرواہ نہ کرو لوگوں میں مرض ہے کہ جہاں کسی نے تسبیح ہاتھ میں لی اور اس پر طعن شروع کیا مگر جب تم کو تسبیح سے دولت ملتی ہو تو مخلوق کو بکنے دو کیا کسی کے طعن سے ڈر کر اپنا نقصان کرلو گے یہ تو قول ثابت کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔

عالم برزخ

سید اکبر حسین صاحب جج نے عالم برزخ کے متعلق دریافت کیا کہ جو لوگ توپ وتفنگ سے اڑا دیئے گئے ہیں ان کی قبر کہاں ہے؟ فرمایا کہ قبر نام ہے عالم برزخ کا اور وہ ایک حیات ہے مثل نوم کے کہ اس میں بھی ادراک ہوتا ہے الم ونعیم کا پھر سید صاحب نے دریافت کیا کہ کیا وہاں مثل نوم کے عدم ادراک و ذہول بھی ہوسکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ وہاں ذہول نہیں پھر پوچھا کہ کیا قبر کا افتتان قرآن سے بھی ثابت ہوتا ہے فرمایا قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ اس کی بابت حضور ﷺ نے فرمایا نزلت فی عذاب القبر دوسری آیت ہے اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ تو یعرضون یوم تقوم الساعة سے پہلے ہے۔

علیین سے مراد

سید صاحب نے فرمایا کہ قرآن میں ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ اس میں علیین کتاب کو کہا گیا ہے حالانکہ وہ مقام کا نام ہے مولانا نے فرمایا کہ کتاب کا نام بھی ہے اور مقام کا بھی پھر سید صاحب نے کہا کہ کیا میں اس کتاب کو علم الٰہی سمجھوں یا کتاب ذی جسم؟ مولانا نے فرمایا کہ وہ کتاب ذی جسم ہے اور عالم آخرت بھی مادی ہے مثل عالم دنیا کے اور عالم برزخ بھی آخرت میں داخل ہے گو عالم برزخ کا مادہ لطیف ہے بلکہ عالم آخرت میں بہ نسبت دنیا کے مادیت زیادہ ہے کیونکہ دنیا کا مادہ تو متغیر فانی ہے اور وہ باقی ہے تو اس کا مادہ زیادہ شدید ہے گو لطافت کے ساتھ ہے۔

مراقبہ کی ضرورت وحقیقت

گو حق تعالیٰ نے صراحتاً یہاں کسی مراقبہ کا ذکر نہیں فرمایا مگر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کیونکہ یہاں صراحتہ تو کسی خاص عمل کے امر کا ذکر نہیں بلکہ محض ایک خبر مذکور ہے مگر اس پر علماء ومفسرین کا اجماع ہے کہ اخبار قرآنیہ سے محض خبر ہی مقصود نہیں بلکہ مقصود کوئی انشاء ہوتا ہے اور اخبار قرآنیہ ہی کی کیا تخصیص ہے میرے

نزدیک تو خبر من حیث ہو خبر کسی عاقل کے کلام میں بھی مقصود نہیں ہوتی بلکہ عقلاء کو ہر جملہ خبریہ سے کوئی انشاء ہی مقصود ہوتا ہے اور جس جملہ خبریہ سے کوئی انشا مقصود نہ ہو وہ لغو ہوتا ہے جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو یہاں خبر سے محض خبر مقصود نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ چونکہ ایسا ایسا ہونے والا ہے لہذا اس واقعہ سے ڈرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں یعنی ایمان والوں میں داخل ہونا چاہئے ظالمین میں سے نہ ہونا چاہئے پس یہاں بھی تصریح تو اس کی ہے کہ حق تعالیٰ کے خاص بندوں کی یہ فضیلت ہے کہ دنیا و آخرت میں حق تعالیٰ ان کو ثابت رکھتا ہے اور کافروں کی یہ مذمت ہے کہ ان کو بچلا دیتا ہے اس سے ایک مراقبہ کی طرف اشارہ بھی ہو گیا کہ اس وقت سے ڈرنا چاہئے جس میں کافر بچیں گے اس لئے ایمان وعمل کا اہتمام کیا جائے بظاہر اس آیت پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ہی ثابت رکھتے ہیں اور وہی بچلا دیتے ہیں تو الزام کس پر؟ اس کا جواب ظالمین کے لفظ سے ہو گیا کہ انہوں نے ظلم کیا تھا اس لئے اس کی نحوست سے بچ گئے یہ تو حکیمانہ جواب تھا مگر اس پر بھی کوئی شغب کرے تو آگے حاکمانہ جواب بھی دیدیا۔ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ کہ کسی کے باوا کا کچھ اجارہ نہیں جاؤ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کرتے ہیں حکیمانہ جواب سے بعض دفعہ شور شغب قطع نہیں ہوتا اس لئے حاکمانہ جواب بھی بیان فرمادیا اب سب کی زبانیں بند ہوگئیں یہ تو ترجمہ آیت کا تھا مگر اس سے وہ واقعہ معلوم نہیں ہوا جس کی نسبت تثبیت واضلال کی خبر دی گئی ہے۔ اس کے لئے تفسیر کی ضرورت ہے۔ اور قرآن کی تفسیر کہیں تو قرآن ہی سے ہوتی ہے اور کہیں حدیث سے اس آیت کی تفسیر حدیث سے معلوم ہوئی ہے حدیث کیا ہے ارشاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جن کی شان یہ ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود　　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس لئے حدیث بھی بمنزلہ قرآن ہی کے ہے سو حدیث میں آ چکا ہے کہ یہ آیت عذاب قبر کے متعلق ہے پس ثابت ہو گیا کہ یہاں عذاب قبر سے ڈرنے کا اور اس کے استحضار کا امر ہے مگر اس پر ایک طالب علمانہ اشکال ہوتا ہے میں اس کا بھی جواب دئے دیتا ہوں وہ یہ کہ یہ سورت مکی ہے اور احادیث صحاح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ کو عذاب قبر کا علم مدینہ میں ہوا ہے پھر یہ آیت عذاب قبر کے متعلق کیونکر ہوسکتی ہے اگر اس میں عذاب قبر کا ذکر ہوتا تو حضور علیہ کو مکہ ہی میں اس کا علم ہو جاتا اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ اس سورت کی خاص اس آیت کو مدنی مانا جاوے مگر میں نے اس کو کہیں منقول نہیں دیکھا اس لئے میرے نزدیک دوسرا اسہل جواب یہ ہے کہ حضور علیہ کو تثبیت واضلال فی الاخرۃ کی تفسیر کا ایک جزو تو مکہ میں منکشف ہو گیا تھا یعنی قیامت میں حساب وکتاب کے وقت مسلمانوں کا ثابت قدم رہنا اور کفار کا بچلنا اور ایک جزو یعنی تثبیت و اضلال فی القبر مدینہ میں منکشف ہوا کیونکہ آیت میں لفظ فی الاخرۃ وارد ہے اور آخرت دو ہیں ایک حقیقی یعنی

قیامت اور ایک اضافی یعنی قبر پس مکہ میں آپ کو تثبیت واضلال فی الاخرة کا پہلا جز و منکشف ہو گیا جو قیامت کے متعلق تھا اور دوسرا جزو مدینہ میں منکشف ہوا یعنی عذاب ونعیم قبر پس اب آیت کے مکی ہونے اور عذاب قبر کے متعلق نازل ہونے میں کچھ تنافی نہیں کیونکہ دراصل یہ آیت قیامت اور قبر دونوں کے متعلق تھی مگر مکہ میں آپ کو اس کا علم نہ تھا مدینہ پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ اس آیت میں عذاب قبر کا بھی ذکر ہے اور لفظ آخرت اس کو بھی عام ہے حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ نے فرمایا کہ قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ سوال کرتے ہیں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی بہر حال حدیث سے اس کا عذاب قبر کے متعلق ہونا صراحۃً ہو رہا ہے اور اس پر جو اشکالات تھے وہ بھی سب رفع ہو گئے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں کو بچلا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ایمان پر ثابت قدم رکھنے کا وعدہ

اب یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ یہ آیت عذاب قبر کے متعلق تو ہے لیکن اس میں تثبیت کا وعدہ دنیا اور آخرت دونوں کے بارہ میں ہے چنانچہ ارشاد ہے يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ اب سوال یہ ہے کہ حضور علیہ نے جو اس پوری آیت کو تلاوت فرما کر عذاب قبر کے متعلق فرمایا ہے تو آپ نے معاملہ قبر کو حیات دنیا میں داخل فرمایا یا آخرت میں سو احتمال دونوں طرف سے ہے۔ قبر کو حیات دنیا میں بھی داخل کیا جا سکتا ہے اور آخرت میں بھی دوسرا احتمال تو محتاج تاویل نہیں کیونکہ موت سے حیات دنیا منقطع ہو جاتی ہے اس لئے مابعد الموت حیات دنیا میں داخل نہیں بلکہ وہ آخرت میں داخل ہونا چاہئے البتہ پہلا احتمال محتاج تاویل ہے اس پر کہہ سکتے ہیں کہ گو موت سے حیات دنیا منقطع ہو جاتی ہے مگر حیات اخرویہ بھی شروع نہیں ہوتی کیونکہ حیات اخرویہ وہ ہے جبکہ یہی جسد عنصری دوبارہ زندہ ہوگا اور یہ قیامت میں ہوگا۔ قبر میں جسد عنصری زندہ نہیں ہوتا گو روح کو اس سے تعلق رہتا ہے پس گو موت کے بعد انسان کو نہ حیات اخرویہ حاصل ہوتی ہے نہ حیات دنیویہ بلکہ حیات برزخیہ ہوتی ہے مگر حیات برزخیہ کو حیات دنیا سے بہ نسبت آخرت کے قرب زیادہ ہے اس لئے حکماً وہ حیات دنیا میں داخل ہو سکتی ہے لیکن یاد آیا درمنثور میں ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ حضور علیہ نے فی الاخرة کی تفسیر عذاب قبر سے فرمائی ہے اب کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہی نہ دوسرا احتمال رہا البتہ ایک اور اشکال وارد ہوگا۔

وہ یہ کہ ایک حدیث میں آتا ہے روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النار کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے حالانکہ دخول جنت یا دخول

نار قیامت کے بعد ہوگا عالم برزخ میں دخول جنت و نار نہ ہوگا اس کا ایک جواب تو علماء نے دیا ہے وہ یہ کہ برزخ میں جو مسلمانوں کو راحت اور کفار کو عذاب ہوگا حضور ﷺ نے اس کو نعیم جنت اور عذاب جہنم سے تشبیہ دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو برزخ میں ایسی راحت ہوگی کہ گویا وہ جنت کے باغ میں ہیں اور کفار کو ایسی تکلیف ہوگی کہ گویا جہنم کے گڑھے میں ہیں اور صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ جنت و جہنم دو ہیں ایک حقیقی اور ایک مثالی اس قول کو مان لیا جائے تو پھر اس حدیث میں تاویل نہ کرنا پڑے گی صوفیہ کہتے ہیں کہ قبر میں مومن کے لئے جس جنت کی طرف کھڑکی کھولی جائے گی وہ جنت مثالیہ ہے اسی طرح کافر کے لئے جس جہنم کی طرف کھڑکی کھلے گی وہ بھی مثالی جہنم ہے پھر قیامت کے بعد حقیقی جنت و جہنم میں دخول ہوگا اور یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مومن اور کافر کے لئے جنت و جہنم میں داخل ہونے کے بعد تو پھر خروج نہ ہوگا پھر مسلمان اور کافر اس جنت مثالیہ و جہنم مثالیہ سے قیامت کے دن کیونکر نکلیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ عدم خروج وغیرہ یہ احکام جنت و جہنم حقیقیہ کے ہیں مثالیہ کے یہ احکام نہیں اس سے خروج ہوسکتا ہے بلکہ صوفیہ نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا میں بھی کفار کو جہنم اور مومنین کو جنت محیط ہے کیونکہ اعمال سیئہ جہنم ہیں اور اعمال صالحہ جنت ہیں اور حقیقی جنت و دوزخ کا ثواب وعذاب انہی اعمال کی صورت جوہر یہ ہے بس دنیا میں بھی ہر شخص یا جنت میں ہے یا دوزخ میں مگر اعمال کے بعد تو یہ احاطہ معلوم ہوسکتا ہے بدوں اعمال کے اس احاطہ کا ادراک دشوار ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝

ترجمہ: اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہیں کر سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف اور بڑا ہی ناشکر ہے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ وتعالیٰ کے لامحدود احسانات

اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بعض غریب مفلس ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس گنی چنی چیزیں ہی ہوتی ہیں جو شمار میں آسکتی ہیں تو ان کے حق میں لا تحصوھا کا حکم کیسے صحیح ہوگا اس کا جواب تو کھلا ہوا ہے کہ ہر آفت سے محفوظ رہنا بھی تو ایک مستقل نعمت ہے اور آفتوں اور تکلیفوں کا احصاء و شمار کوئی نہیں کر سکتا اس لئے غریب سے غریب انسان پر اللہ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ وہ شمار کرنا چاہے تو شمار نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی دل میں آتی ہے وہ یہ کہ لفظ احصاء کے معنے جیسے

شمار کرنے کے معروف و مشہور ہیں اسی طرح ایک معنی احصاء کے پورا پورا استعمال کر لینے کے بھی آتے ہیں یعنی احصاء استعمالاً اس معنی کے اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے جتنی نعمتیں دی ہوئی ہیں وہ ان سب کو بیک وقت استعمال بھی نہیں کر سکتا بلکہ کچھ نہ کچھ نعمتیں اس کے استعمال سے فاضل رہتی ہیں خود انسان کے وجود میں جو نعمتیں عطا کی گئی ہیں وہ اس کی ضرورت سے کچھ زائد رہ گئی ہیں اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دو عطا فرمائیں حالانکہ دیکھنے کا کام ایک آنکھ سے بھی چل سکتا ہے کان دو دیئے اور کام ایک سے بھی چل سکتا ہے ہاتھ پاؤں دوہرے عطا فرمائے جن میں سے انسان ہر وقت دونوں کو استعمال نہیں کرتا سردی کا سامان گرمی میں اور گرمی کا سامان سردی میں مشغول کار نہیں ہوتا اس لئے ہر غریب سے غریب انسان پر یہ بات صادق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو پورا پورا استعمال بھی نہیں کر سکتا۔

آیت کی یہ تفسیر خیال میں گزرا کرتی تھی مگر کوئی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے ذکر نہ کرتا تھا۔ آج الحمدللہ اس کی دلیل ایک حدیث سے سمجھ میں آ گئی کہ اسماء اللہ الحسنیٰ کے متعلق حدیث میں ہے۔

من احصها دخل الجنة یعنی جو شخص ان اسماء الہیہ کا احصاء کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔

اس حدیث میں لفظ احصاء کے متعلق علماء کے دونوں قول ہیں احصاء حفظاً مراد ہے یعنی ناموں کا حفظ کر لینا یا احصاء استعمالاً مراد ہے۔ کہ ان ناموں کے مقتضیٰ پر عمل کرنا'

تو جس طرح لفظ احصاء کی ایک حدیث میں دو تفسیریں کی گئیں ہیں اسی طرح آیت قرآن لاتحصوھا میں بھی دونوں تفسیریں ہو سکتی ہیں۔

وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ تم یاد سے نعمتوں کا احصار نہیں کر سکتے۔

انعامات الٰہیہ کا شمار ناممکن ہے

اور ایک محمل اور ہے جو دل کو زیادہ لگتا ہے کہ ضرورت اور حاجت کی صفت سے تم اس کا احصار نہیں کر سکتے بلکہ بہت چیزیں تم کو بے ضرورت معلوم ہوں گی واقعی بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ انسان سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کس کام میں لاؤں تو جیسا کہ اس سے خدا تعالیٰ کا منعم ہونا ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی ہماری حرص بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں جن کے لئے کوئی مصرف بھی ذہن میں نہیں آتا یہ مادہ عورتوں میں خصوصاً زیادہ ہے۔

مکانات بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

(ملفوظ) ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی لامتناہی نعمتیں ہیں کہاں تک انسان شکر ادا کر سکتا ہے اسی کو فرماتے ہیں وان تعدو انعمة الله لا تحصوها اب میں ان میں سے صرف ایک نعمت کا ذکر کرتا ہوں

والـلـه جعل لكم من بيوتكم سكنا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیوت سے تمہارے لئے مسکن بنایا یعنی اللہ نے تم کو ایک ایسی چیز دی جس میں تم رہتے ہو میں نے شہروں میں دیکھا کہ چھوٹی سی کوٹھڑی تاریک' آگے صحن نہیں وہیں کھانا وہیں ہگنا' قصبہ اور گاؤں کے لوگ تو پھر بڑے بڑے مکانات میں رہتے ہیں پھر خود وہ کوٹھریاں بھی بالکل نہ ہونے کے اعتبار سے نعمت ہیں اور ان چھوٹے بڑے بیوت کا نعمت ہونا ان لوگوں سے پوچھئے کہ جن کے پاس مکان نہ ہو یا اس کرایہ دار سے پوچھئے کہ برسات میں جس سے مکان خالی کر دیا جائے خصوصی جگہ اس کے پاس کافی سامان بھی ہو جس کا نقل کرنا بھی مصیبت ہو (الافاضات الیومیہ جلد ۷ صفحہ ۱۵۷ تا ۱۵۸)

بغیر حساب

اسی طرح حق تعالیٰ ہم سے عبادات کا کام لیتے ہیں وہ ان حرکات کو پسند کرتے ہیں لیکن تحمل سے زیادہ خود نہیں کرنے دیتے کتنی بڑی رحمت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنابه

اے ہمارے پرودگار ہم پر ایسے مصائب اور واقعات نہ ڈالئے جس کی ہم کو برداشت نہیں ہے۔

اس تعلیم کے ضمن میں جتلایا ہے کہ ہم طاقت سے زیادہ کام نہیں لیا کرتے ہیں یہ معاملات بھی خدا تعالیٰ کے ہیں کوئی شخص واقعات دیکھے پھر کتاب اللہ میں غور کرے تو ہر جگہ رحمت ہی رحمت نظر آئے گی غرض وہ ہمارے تحمل سے زیادہ ہم کو کام کی اجازت نہیں دیتے چنانچہ اگر مجاہدہ کی حرص میں کوئی دوپہر کو نماز پڑھے تو مواخذہ ہوگا غرض خدا تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے عمل میں تو حد سے زیادہ ممنوع اور اجر میں زیادتی موجود' اسی لئے بغیر حساب بڑھا دیا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر اجر ملے گا جو ہمارے حساب سے باہر ہے اس لئے کہ فرماتے ہیں

و كل شيء احصينه في امام مبين یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر دیا ہے ان کے احاطہ علمی سے کوئی شے خارج نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم نہیں شمار کر سکتے جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا یعنی اگر تم نعمت خداوندی کو شمار کرنا چاہو تو نہ شمار کر سکو گے۔

پس جس طرح یہ عدم احصاء (نہ احاطہ کرنا نہ شمار کرنا) بندہ کے اعتبار سے ہے چنانچہ خصوصاً نہیں احاطہ کر سکتے تو ان کا) میں عدم احصاء کی اسناد مخاطب کی اس طرف سے کرنا واضح دلیل ہے اسی طرح اس آیت میں بغیر حساب کے یہ معنی ہیں کہ تم حساب نہیں کر سکتے۔ ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندازہ سے باہر نہیں ہے وہ تو خوب بالتفصیل جانتے ہیں۔

حاصل یہ کہ عمل محدود اور متناہی ہے اور اجر غیر محدود اور غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد (کسی پر موقوف نہیں ہے) یہ تو اس آیت کے متعلق بیان تھا۔ (الفطر ملحقہ مواعظ فضائل صوم وصلوٰۃ ص ۱۵۷)

سُوْرَةُ الحِجْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ①

ترجمہ: الٓرٰ یہ آیتیں ہیں (کامل) کتاب اور قرآن واضح کی۔

تفسیری نکات

قرآن اور کتاب کے لغوی معنی

اس جگہ آیات کے دولقب بیان کئے گئے ہیں ایک قرآن دوسرے کتاب' قرآن کے معنی ہیں ما یقراء یعنی پڑھنے کی چیز اور کتاب کے معنی ہیں ما یکتب یعنی لکھنے کی چیز اور ظاہر ہے کہ پڑھنے اور لکھنے کی چیز کیا ہے الفاظ ہی تو ہیں معانی کو کون پڑھ سکتا یا کون لکھ سکتا ہے اور ایک مضمون ابھی ذہن میں آیا ہے جو شروع میں نہ آیا تھا اب تک تو ذہن میں یہ بات تھی کہ الفاظ ہی پڑھنے لکھنے کی چیز ہیں معانی کو پڑھ لکھ نہیں سکتے اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ نحویین نے کہا ہے کہ ضرب میں ضمیر ہو مستتر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ظاہر میں ضمیر مذکور نہیں لیکن سمجھنے میں آتی ہے مگر ایک طالب علم یہ سمجھے کہ ضرب کے اندر ضمیر ہو چھپی ہوئی بیٹھی ہے تو آپ نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا یہاں تک کہ کاغذ پھٹ گیا اور اتفاق سے دوسرے ورق میں اس جگہ ہو لکھا ہوا تھا یہ بڑے خوش ہوئے کہ واقعی استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کے اندر ہو پوشیدہ ہے دیکھو چھیلنے سے نکل آیا۔ پھر دوڑے ہوئے استاد کے پاس آئے کہ دیکھئے میں نے ضرب کو چھیلا تھا یہ ہو نکل آیا جو اس میں چھپا ہوا تھا استاد بہت ہنسے اور ان کو مطلب دوبارہ سمجھایا غرض یہ طالب علم یوں سمجھتا تھا کہ معانی بھی کتابت میں آسکتے ہیں۔ مگر یہ اس کی غلطی ہے معانی قراءت و کتابت میں نہیں آسکتے ان کا محل صرف ذہن ہے لوگ بے تار کی خبر پر تعجب کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے اس کو پہلے سے پیدا کر رکھا ہے کیونکہ الفاظ سے معانی کا سمجھنا یہ بے تار کے ہی تو خبر ہے

کیونکہ معانی کا مرکز قلب ہے اور جہاں الفاظ کسی کی زبان سے نکلے معاً وہاں معانی سمجھے گئے غرض ان آیتوں میں اشارہ کیا بلکہ صراحت ہے کہ قرآن کے ساتھ پڑھنے کا تعلق رکھو کیونکہ لفظ قرآن کے معانی یہی ہیں اور ظاہر ہے کہ قراءت الفاظ ہی کی ہوتی ہے نہ کہ معانی کی' دوسری صفت اس جگہ کتاب ہے جس کے معنی لکھنے کی چیز ہیں اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ قرآن کے ساتھ قراءت کے علاوہ ضبط و کتابت کا بھی رکھنا چاہئے دوسری جو بات اسی وقت ذہن میں آئی یہ ہے کہ کتاب کا مصداق حقیقۃً نہ الفاظ ہیں نہ معانی کیونکہ الفاظ تو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کا محل زبان ہے لفظ کے معنے لغت میں پھینکنے کے ہیں کہ الفاظ زبان سے پھینکے جاتے ہیں یعنی نکالے جاتے ہیں' اس لئے ان کو الفاظ کہا جاتا ہے معانی کا محل صرف ذہن ہے وہ تو کتاب کا مصداق کسی طرح ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مذاق دوسری چیز ہے یعنی نقوش جن کو عوام کرم کانٹے کہتے ہیں کیونکہ ان پڑھ آدمی لکھ پڑھ نہیں سکتا نہ سمجھ سکتا ہے اس لئے وہ ان کو کرم کانٹے کہتے ہیں مگر کتاب کا مصداق خلق نقوش نہیں بلکہ وضعی نقوش ہیں جیسا کہ الفاظ کی دلالت معانی پر وضعی ہے طبعی نہیں کیونکہ غیر اہل زبان اس کو نہیں سمجھ سکتا اسی طرح نقوش بھی وضعی ہیں اور ان کی دلالت بھی الفاظ پر وضعی ہے اسی لئے پڑھے ہوئے آدمی ان کو سمجھتے ہیں ان پڑھ نہیں سمجھ سکتے جب یہ معلوم ہو گیا کہ کتاب کا حقیقی مصداق نقوش ہیں تو آپ تو الفاظ ہی کو غیر مقصود بتلاتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نقوش قرآن بھی قابل حفاظت و مستحق تعظیم ہیں تو الٹی پڑی کہ گئے تھے نماز بخشوانے روزے بھی گلے پڑ گئے مگر صاحبو یہ گلے نہیں پڑے کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ کسی شخص کو اشرفیاں اور جواہرات دے کر اس سے کہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو قفل اور تالہ لگاؤ اگر اس شخص کو روپیہ اور جواہرات کی قدر معلوم ہے تو اس حکم کی قدر کرے گا اور کہے گا۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرابا جان جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزا دے تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب حقیقی کے ساتھ ہمراز کر دیا)

اور جس کو روپیہ کی قدر نہ ہوگی وہ کہے گا کہ یہ اچھی بلا میرے سر پڑی کہ حفاظت کرو اور قفل لگاؤ اسی طرح جو لوگ معانی کی قدر کرتے ہیں وہ ان الفاظ و نقوش کی بھی قدر کریں گے کیونکہ یہ انہی کی حفاظت کا سامان ہے اور جو قدر نہیں کرتے وہ اس کو سر پڑی بلا سمجھیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ جو نو تعلیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں درحقیقت وہ معانی قرآن کی قدر نہیں کرتے ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی صاحبو الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں۔

الفاظ و معانی قرآن دونوں مقصود ہیں

اب میں آیت کی طرف عود کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس غلطی کو رفع فرمایا ہے جو بعض لوگ

سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن سے صرف معانی مقصود ہیں یہ خیال غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیات کو قرآن و کتاب فرمایا ہے کہ یہ لکھنے پڑھنے کی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ لکھنا پڑھنا الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی محضہ کے اب یہاں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ ایک جگہ تو لفظ قرآن کو مقدم کیا ہے لفظ کتاب سے اور ایک جگہ اس کا عکس ہے جس سے معلوم ہوا کہ من وجہ الفاظ میں مقصودیت زیادہ ہے اور من وجہ معانی میں مقصودیت زیادہ ہے اور یہ نکتہ اس طرح حاصل ہوا کہ قراءت الفاظ کی ہوتی ہے اور الفاظ کا مدلول قریب معانی ہیں اور کتابت نقوش کی ہوتی ہے اور اس کا مدلول قریب الفاظ ہیں اور معانی مدلول بعید' پس قراءت کی حالت میں معانی کی طرف اول ہی توجہ ہو جاتی ہے اور کتابت میں اول الفاظ کی طرف اور ان کے واسطہ سے معانی کی طرف اور مقصودیت سے مراد بھی مدلولیت ہے پس قراءت میں زیادہ مقصودیت معانی میں ہوئی اور کتابت میں زیادہ مقصودیت الفاظ میں ہوئی پس اس مجموعہ میں اشارہ ہو گیا کہ الفاظ بھی اس درجہ میں مقصود ہیں کہ معانی میں من کل الوجوہ مقصودیت بڑھی ہوئی نہیں بلکہ بعض وجوہ سے الفاظ میں بھی مقصودیت بڑھی ہوئی ہے۔

اور اسی مقام سے ایک اور مسئلہ بھی حاصل ہو گیا جس میں علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن کو دیکھ کر مصحف میں پڑھنا افضل ہے یا حفظ پڑھنا افضل ہے جو حضرات حفظ پڑھنے کو افضل کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس میں تدبر زیادہ ہوتا ہے الفاظ سے بلا واسطہ معانی کی طرف التفات ہو جاتا ہے اور نقوش سے التفات بواسطہ ہوتا ہے اور بعض نے مصحف سے پڑھنے کو افضل کہا ہے اس لئے کہ اس میں محل توجہ متعدد ہوتے ہیں الفاظ تو بلا واسطہ نقوش اور معانی بواسطہ الفاظ تو اس میں عبادت متعدد ہوتی ہے یہ تعدد تو باعتبار مدلول کے ہے اور دال کے اعتبار سے بھی تعدد ہے ایک نقوش کے اعتبار سے یعنی عبادت بصر دوسرے الفاظ کے اعتبار سے یعنی عبادت لسان' پس اس میں دو عبادتیں مجتمع ہو جاتی ہیں۔

اور ایک نکتہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ قرآن کے محفوظ ہونے میں من وجہ الفاظ مقررہ کو زیادہ دخل ہے کہ خدانہ کردہ اگر جمیع مصاحف تلف ہو جائیں تو حفاظ قرآن الفاظ از سر نو قرآن کو مدون کر سکتے ہیں اور من وجہ نقوش کو زیادہ دخل ہے کہ اختلاف فی الالفاظ کے وقت مکتوب کی طرف مراجعت کر کے فیصلہ کر سکتے ہیں اس کے بعد مبین کی قید ہے اس میں یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قرآن کی قراءت و کتابت دونوں واضح اور ظاہر ہونی چاہئیں۔ اسی لئے فقہاء نے قرآن کی تقطیع چھوٹی کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ مستحب یہ ہے کہ قرآن کی تقطیع بڑی ہوتا کہ کتابت واضح اور صاف ہو لیکن متوسط تقطیع کا مضائقہ نہیں جیسے حمائل کی تقطیع بڑی ہوتا کہ کتابت واضح اور صاف ہو لیکن متوسط تقطیع کا مضائقہ نہیں جیسے حمائل کی تقطیع ہے کہ اس سے سفر میں سہولت ہوتی ہے ہاں یہ جو آج کل بعض تعویذی قرآن شائع ہوئے ہیں یہ بے شک مکروہ ہے۔

اب حروف مقطعات کا نکتہ بیان کرتا ہوں جو ان آیات کے شروع میں وارد ہیں اور میں ان سے بھی اپنا مدعا بیان کروں گا جیسا کہ میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا حروف مقطعات میں بہت سے نکات ہیں ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ اسرار ہیں درمیان اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے، حضور ﷺ ان کے معانی سے واقف تھے مگر دوسروں پر آپ نے ان کے معانی ظاہر نہیں فرمائے کیونکہ ان کا تعلق محکمہ شرائع عالیہ سے نہیں بلکہ دوسرے محکمہ سے ہے ان اسرار کو اسی محکمہ کے آدمیوں پر ظاہر کیا جاتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو ان سے واقف کیا گیا ہے چونکہ امت کو اس محکمہ سے تعلق نہیں اس لئے ہم لوگوں کو ان اسرار سے مطلع نہیں کیا گیا۔

ایک مرتبہ میں نے درس میں یہی تقریر کی تھی اور اس وقت ایک کورٹ انسپکٹر موجود تھے وہ کہنے لگے آپ سچ کہتے ہیں واقع ہر محکمہ کے خاص اسرار ہوتے ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا آپ تو ایسی تصدیق کر رہے ہیں جیسے آپ پر یہ بات گزری ہو کہنے لگے جی ہاں مجھے آج کل ہی میں یہ بات پیش آئی ہے میں ایک دن سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی پر گیا ہوا تھا ان کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی میں اس کو دیکھنے لگا تو صاحب نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا کہ یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے اس میں محکمہ خفیہ پولیس کے اسرار ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا اور وہ اسرار کچھ اصطلاحات ہیں کہ سی آئی ڈی والے ان اصلاحات میں ایک دوسرے کو تار کے ذریعہ سے خبر دیتے ہیں اور دوسرے لوگ ان اخبار پر مطلع نہیں ہوتے اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا کہ حسیات میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

الفاظ قرآنی بھی مقصود ہیں

دوسرا نکتہ اس میں ابھی میرے ذہن میں آیا ہے وہ یہ کہ ممکن ہے اس میں اس مضمون پر تنبیہ مقصود ہو کہ قرآن سے محض معانی مقصود نہیں بلکہ الفاظ بھی مقصود ہیں کیونکہ بعض الفاظ قرآن میں غیر معلوم المعنی ہیں اگر صرف معانی مقصود ہوتے تو قرآن میں یہ ایسے الفاظ کیوں ہوتے حالانکہ وہ جزو قرآن ہیں جن کی قرآنیت کا انکار کفر ہے ایک نکتہ اس میں یہ ہے کہ حروف مقطعات میں احاد و عشرات و مآت کو جمع کیا گیا ہے جس سے بعض اہل کشف نے بعض حوادث پر بطور پیشین گوئی کے استدلال کیا ہے جو ایک مستقل علم ہے اس کے علاوہ اور بہت سے نکات ہیں۔

قرآن کے دو اوصاف

ارشاد ہے تلک ایات الکتاب و قرآن مبین ظاہر ہے کہ آیات الکتاب اور قرآن مبین دونوں کا مطلب ایک ہی ہے صرف لقب دو ہیں اور نکتہ دو عنوانوں کے اختیار کرنے میں یہ ہے کہ اس سے قرآن کا دو وصفوں کے لئے جامع ہونا ثابت ہوتا ہے ایک وصف کتاب ایک وصف قرآن،

حاصل یہ کہ قرآن میں دو حیثیتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ مکتوب ہونے کے قابل ہے جس پر لفظ کتاب دلالت کررہا ہے اور دوسری یہ کہ وہ مقرر ہونے کے قابل ہے جس پر لفظ کتاب قرآن دلالت کررہا ہے اور لفظ کتاب میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس کو اپنے پاس لکھ کر رکھو تا کہ عمل کے لئے محفوظ رہے اور لفظ قرآن میں یہ اشارہ ہے کہ اس کو پڑھا بھی کرو تا کہ اس کے استحضار سے عمل کا اہتمام کیا جاوے خالی چھپوا کر یا لکھ کر رکھ لینا کافی نہیں ہے۔

یہ نکتہ ہے تلک آیات الکتب و قرآن مبین میں کتاب وقرآن دو لفظ اختیار کرنے کا ورنہ مصداق دونوں کا ایک ہی ہے گو اصل عطف میں تغائر ہی ہے مگر وہ تغائر عام ہے خواہ ذات کا ذات سے تغائر ہو یا وصف کا وصف سے تغائر ہو چنانچہ عطف تفسیری میں یہ اصل دوسری تغایر کے ساتھ صادق آتی ہے کیونکہ جائز ہے کہ مفہوم معطوف علیہ کا اور ہو اور معطوف کا اور ہو مگر مصداق دونوں کا ایک ہی ہو۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝
ترجمہ: ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ (اور نگہبان) ہیں۔

تفسیری نکات

حفاظت قرآن کا مفہوم

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود قرآن مجید کے محافظ ہیں تو اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ جب خدا تعالیٰ خود قرآن مجید کے محافظ ہیں تو پھر قرآن پاک کا پڑھنا لکھنا چھپوانا بھی چھوڑ دو تو کیا آج تک مسلمانوں نے ایسا کیا ہے میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں کہ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانہ میں ایسے لوگ اور ایسی جماعت پیدا فرماتے رہیں گے کہ اس کی حفاظت کرتی رہے گی اسی طرح پر دین کے سب کاموں کو سمجھ لیا جاوے کہ ان میں توکل کرنا تدابیر سے مانع نہیں بلکہ توکل کے یہ معنی ہیں کہ تدابیر کرو اور اللہ تعالیٰ کو کارساز سمجھو کیونکہ تدبیر کا حکم بھی انہوں ہی نے کیا ہے جیسا قرآن مجید کی حفاظت کی تدابیر کی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو محافظ اعتقاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس حفاظت کا حکم بھی انہوں ہی نے فرمایا ہے باقی دنیا کی تدبیر کرنا اور دین کو محض تقدیر و توکل پر چھوڑ دینا یہ بے ڈھنگا پن ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: میرے بندوں کوخبر کر دو کہ میں غفور الرحیم ہوں اور تحقیق میرا عذاب دردناک ہے۔

تفسیری نکات

اس آیت میں حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم فرمایا ہے کہ میرے بندوں کو دو باتیں پہنچا دو اور ظاہر ہے کہ ہر فعل اختیاری کسی غایت کے لئے ہوتا ہے تو اس فعل اختیاری کی بھی کوئی غایت ہونا چاہئے یعنی یہ کہ ان باتوں کے پہنچانے سے کیا مقصود ہے اور اس وقت یہ بات میری زبان سے بڑے کام کی نکلی ہے کہ ہر کام اور ہر فعل اختیاری کسی نہ کسی غایت کے لئے مطلوب ہوتا ہے پس ہر بات اور ہر کام میں سوچنا چاہئے کہ اس کی غایت کیا ہے جس بات اور جس کام کی کچھ غایت معلوم نہ ہو وہ فضول ہے اور غایت معلوم ہو مگر مفید نہ ہو وہ بھی فضول ہے اور اگر وہ غایت کوئی ضرر ہو لازم یا متعدی تو وہ کام مضر ہے اس قاعدے سے آپ کو اپنے افعال واقوال کا حسن وقبح اور لغو یا مفید ہونا آسانی سے معلوم ہو جائیگا۔

اس کے بعد ارشاد ہے وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾ کہ یہ خبر بھی دے دیجئے کہ میرا عذاب بھی بہت سخت ہے یہ تکمیل ترغیب کے لئے بڑھایا گیا ہے کیونکہ ترغیب کی تکمیل ترہیب سے ہوتی ہے جیسا کہ ترہیب کی تکمیل ترغیب سے ہوتی ہے بدوں ایک دوسرے کے ہر ایک ناقص ہے کیونکہ رجاء احتمال نفع ہے اور احتمال کا مفہوم خود مستلزم ہو رہا ہے۔ دوسرے احتمال کو اسی طرح خوف احتمال ضرر ہے اور اسی طرح یہ بھی مستلزم ہو رہا ہے دوسرے احتمال کو پس کسی کا تحقق بدوں دوسرے کے نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ترغیب وترہیب دوش بدوش چلتے ہیں پس خوف ورجاء ہی سے مل کر ایمان کامل ہوتا ہے اس لئے مومن کو خوف کے ساتھ رجاء اور رجاء کے ساتھ خوف کا ملانا ضروری ہے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر حشر میں یہ ندا ہو کہ جنت میں ایک ہی آدمی جائے گا لرجوت ان اکون هو تو میں یہ سمجھوں گا کہ وہ ایک میں ہی ہوں اور اگر یہ ندا ہو کہ جہنم میں ایک ہی جائے گا لخفت ان اکون هو تو میں ڈروں گا کہ شاید وہ ایک میں ہی نہ ہوں گویا رجاء وخوف دونوں کامل درجہ کے تھے بس یہی حاصل ہے آیت کا کہ بندوں کو رغبت ورہبت دونوں جمع کرنا چاہئیں یہ تو مقصود تھا جو ختم ہو گیا اب ایک بات زائد از مقصود اور رہ گئی جو تفسیر کے متعلق ہے بلکہ دو ایک طلبۂ علم کے لئے ایک طلبۃ العمل کے لئے یعنی ذاکرین کے لئے کیونکہ یہ لوگ عمل کے طالب ہیں جو بات طلبۃ العمل کے لئے ہے وہ تو یہ ہے کہ اس آیت

کے بعد دو قصے مذکور ہیں ایک ابراہیمؑ کا جس میں ان کے لئے بڑھاپے کی حالت میں بشارت ولد مذکور ہے دوسرا قصہ قوم لوط کا ہے جس میں ان پر نزول عذاب کا ذکر ہے۔ تو ان قصوں کو اس آیت سے کیا ربط ہے میرے نزدیک ان دونوں قصوں میں نَبِّئْ عِبَادِيٓ اَنِّيٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (میرے بندوں کو خبر دیدیجئے بلاشک میں بڑا بخشنے والا مہربان ہوں اور میرا عذاب بھی دردناک ہے) کی تائید ہے پہلے جزو سے پہلے قصہ کو تعلق ہے اور دوسرے جزو سے دوسرے قصہ کو جس میں بتلایا گیا ہے کہ جب اعمال صالحہ پر ہماری رحمت اور اعمال سیۂ پر ہمارا عذاب دنیا میں بھی آ جاتا ہے جو کہ دارالجزاء نہیں بلکہ دارالعمل ہے تو آخرت میں تو ان کا ظہور کیوں نہ ہوگا جو کہ دارالجزا ہے اگر حق تعالیٰ آخرت میں کسی کو عذاب نہ فرماتے تو دنیا میں بدرجہ اولیٰ کسی پر بھی عذاب نہ آتا کیونکہ یہ دارالجزا نہیں جب یہاں بھی بعض دفعہ وجہ اعمال سیۂ کے عذاب آتا ہے تو سمجھ لو کہ آخرت میں تو اس کا ظہور ضرور ہی ہوگا پس رحمت کی وسعت وسبقت کو سن کر عذاب سے بےفکر ہرگز نہ ہونا اور عذاب کی شدت سن کر رحمت سے بھی مایوس نہ ہونا کیونکہ حق تعالیٰ دنیا میں بھی بعض دفعہ ایسی حالت میں رحمت فرماتے ہیں جبکہ اسباب ظاہرہ سے اس کی امید کچھ نہیں رہتی جیسے ابراہیمؑ کی حالت امید اولاد سے بعید ہوگئی تھی۔ اسی طرح قوم لوط کی ظاہری حالت عیش وعشرت نے ان کو احتمال عذاب سے بےفکر کر دیا تھا (سبحان اللہ کیا خوب ربط ہے فللہ درہ ۱۲ ط) دوسرا نکتہ طلبۃ العلم کے لئے یہ ہے کہ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (بلاشک میرا عذاب بھی سخت ہے) میں حق تعالیٰ نے طرز عنوان کو بدل دیا ہے کہ انی انا معذب العظیم (بلاشک میں عذاب دینے والا بھی عظیم ہوں) نہیں فرمایا یعنی صفت تعذیب کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا جیسا کہ اَنِّيٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ بلاشک میں بڑا بخشنے والا مہربان ہوں۔ میں مغفرت ورحمت کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے میرے نزدیک اس میں سبقت رحمتی علی غضبی (میری رحمت میرے غضب سے سبقت کرگئی) کا مضمون مخفی ہے جو حدیث میں تو ظاہر ہے مگر قرآن میں مخفی ہے۔

کہ ہر فعل کے لئے ایک غایت ہوتی ہے تو اس فعل کی بھی کچھ غایت ہونا چاہئے جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی اخبار نَبِّئْ عِبَادِيٓ اَنِّيٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ وہ غایت یہ ہے کہ رسول ﷺ کو حق تعالیٰ تعلیم فرماتے ہیں کہ بندوں کی اصلاح میں ترغیب وترہیب کو بڑا دخل ہے اور امت کو تعلیم ہے کہ تم کو رغبت ورہبت دونوں کو جمع کرنا چاہئے اس سے تم ہم تک پہنچ سکتے ہو اور جنت میں پہنچنے اور جہنم سے بچنے میں اسی کو بڑا دخل ہے اور اس مضمون کے مقصود آیت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اوپر شیطان کے انکار سجود کا ذکر ہے پھر جنت ودوزخ کا ذکر ہے اس کے بعد یہ ارشاد ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جنت میں پہنچنے اور جہنم سے بچنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿ۙ﴾ کی تعلیم سے اصل مقصود یہ ہے کہ لوگ اعمال صالحہ میں ترقی کریں مگر آج کل بہت لوگوں نے اس کو گناہ میں ترقی کے لئے یاد کر رکھا ہے توبہ توبہ میرا تو رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے جس موقع میں یہ بے باک لوگ غفور الرحیم کو استعمال کرتے ہیں یعنی جب کوئی گناہ کے عذاب سے ڈراتا ہے تو اس وقت بجائے ندامت کے نہایت بے پروائی سے کہتے ہیں کہ ارے میاں وہ غفور رحیم ہیں یعنی ڈر کی کوئی بات نہیں وہ کچھ بھی نہ کہیں گے جب گناہوں پر حق تعالیٰ کا غضب اور غیرت کرنا منصوص ہے تو اس کی نفی کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

مفہوم سبقت رحمتی علی غضبی

اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ میں حق تعالیٰ نے طرز عنوان کو بدل دیا ہے کہ انی انا المعذب العظیم نہیں فرمایا یعنی صفت تعذیب کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا جیسا کہ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ میں مغفرت و رحمت کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے میرے نزدیک اس میں سبقت رحمتی علی غضبی کا مضمون مخفی ہے جو حدیث میں تو ظاہر ہے مگر قرآن میں مخفی ہے جیسا عنقریب اس کی تقریر آتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ باطن بھی ہیں ان کے کلام میں صفت باطن کی بھی رعایت ہے جیسا کہ پہلی آیت میں اسی صفت رحمت پر دلالت کرتے ہیں اور ظاہر کی رعایت ہے اسی لئے قرآن سے اہل ظاہر و باطن سب کو حظ آتا ہے گو اہل باطن کو زیادہ حظ آتا ہے اسی کو کسی نے یوں کہا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد ۔۔۔ برنگ اصحاب صورت راہ بو ارباب معنی را

غرض حق تعالیٰ نے مغفرت و رحمت کا بیان تو اس طرح فرمایا کہ میرے بندوں سے کہہ دو میں بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہوں۔ اور عذاب کی نسبت یوں نہیں فرمایا کہ میں بہت عذاب کرنے والا ہوں بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ میرا عذاب بہت سخت ہے میری سزا بہت دردناک ہے اس میں تعذیب کو اپنی صفت کے صیغہ کے طور پر نہیں فرمایا تو اس میں سبقت رحمتی علی غضبی پر دلالت ہے رحمت چونکہ سابق ہے اس لئے صفت کے رنگ میں مذکور ہوئی اور غضب صفت کے رنگ میں مذکور نہیں ہوا یہ نکتہ تو میرے ذہن میں اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے کے اول ہی وہلہ میں آ گیا تھا اس کے بعد ایک دوسرے مضمون کی طرف ذہن منتقل ہوا وہ بہت عجیب ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کے لئے ایک تو افعال ہیں اور ایک صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ صفات کا قرب بہ نسبت افعال کے ذات سے زیادہ ہے کیونکہ صفات لاعین لاغیر ہیں اور افعال اتفاقاً غیر ذات ہیں۔ اس لئے افعال کو بہ نسبت صفات کے ذات سے بعد ہے اور اسماء الٰہیہ میں بعض اسماء تو صفات پر دال ہیں اور بعض اسماء افعال پر دال ہیں پھر آج میں نے بہت غور کیا تو اسماء الٰہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں پایا جو مرتبہ صفت میں غضب پر دال ہو بہت سے بہت قہار و جبار کو پیش کریں گے تو جبار کے معنی تو غضب کے نہیں

بلکہ حق تعالیٰ کی جو صفت جبار ہے وہ جبر کرکے معنی میں ہے جس کا حاصل ہے تلافی کرنا شکستگی کو جوڑنا تو اس کی تو دلالت تو خود رحمت ہی پر ہے اور قہار میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ اسم فعلی ہو جو فعل پر دال ہو اسم وضعی نہ ہو جیسے محی و ممیت و خالق و رازق ہے تو اس صورت میں تو شبہ ہی نہیں ہوسکتا دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسم صفت ہو مگر لغت عربی میں قہر کے معنی غصہ و غضب کے ثابت نہیں بلکہ غلبہ کے معنی ہیں پس یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غضب حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ حق تعالیٰ سے صدور غضب کا نہیں ہوتا' ہوتا ہے لیکن درجہ فعل میں ہوتا ہے نہ کہ درجہ صفت میں اور رحمت کا ثبوت درجہ صفت میں ہوتا ہے۔ جو قدیم ہے اور اس تقدم کے سبب صفت و موصوف کے تعلق میں ارادہ کو دخل نہیں کیونکہ لازم ذات و ملزوم میں تخلل جعل نہیں ہوا کرتا گو رحمت کا تعلق عباد سے تو بالارادہ ہی ہوگا مگر ذات کی طرف اس کا انتساب بلا ارادہ ہے اور غضب کا انتساب بھی ذات حق کی طرف بالارادہ ہے اور یہ ایک دوسری توجیہ ہے سبقت رحمتی علی غضبی کی کہ رحمت کو غضب پر سبقت بایں معنی ہے کہ وہ صفت ہے اور یہ فعل ہے اور صفت سابق ہوتی ہے فعل پر یہی وجہ ہے کہ رحمت تو بلا سبب بھی ہوجاتی ہے کیونکہ وہ مقتضی ذات کا ہے اور غضب بلا سبب نہیں ہوتا۔

اور ایک توجیہ سبقت رحمتی علی غضبی کی وہ ہے جو میں نے حضرت استاد علیہ الرحمۃ سے سنی ہے کہ جس شخص میں مقتضیات رحمت و غضب دونوں مجتمع ہوں اس پر رحمت ہوتی ہے اور ایک صورت سبق کی یہ ہے کہ اعمال حسنہ میں تضاعف ہوتا ہے کہ ایک حسنہ کو دس حسنات اور الی مالا یتناہی بمعنے لاتقف عند حد بڑھایا جاتا ہے چنانچہ صوم کے بارے میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کے ثواب کا تضاعف مالانہایت بمعنے لاتقف عند حد تک ہوتا ہے۔ اور اعمال سیئہ میں تضاعف نہیں ہوتا بلکہ ہر گناہ ایک ہی گناہ شمار ہوتا ہے یہ توجیہ بھی لطیف ہے (مگر آج کی توجیہ الطف و اشرف ہے ۱۲ ظ) اور اس سے معلوم ہوا کہ رجاء و خوف میں رجاء اصل ہے کیونکہ اس کا تعلق رحمت سے ہے جو صفت حق ہے اور خوف اصل نہیں اس کا تعلق غضب سے ہے جو صفت نہیں بلکہ فعل ہے اور ظاہر ہے کہ صفت بمقابلہ فعل کے اصل ہے اس لئے لازم ہے کہ ان دونوں کی فروع میں بھی جو شئے فرع کی صفت ہے وہ اصل ہو اور جو غضب کی فرع ہے وہ اصل نہ ہو پس رجاء و خوف کی ایسی مثال ہے جیسے غذا و دواء کہ غذا اصل ہے اور دعاء عارض پس رجا غذا ب ہے اور خوف دوا ہے۔

خوف کی حد

دوسری وجہ اصالت و ترجیح رجاء کی یہ ہے کہ طریق کا مدار عمل پر ہے اور رجاء سے نشاط پیدا ہوتا ہے اور نشاط موجب ازدیاد عمل ہے اور خوف سے انقباض ہوتا ہے اور انقباض موجب عمل ہے گو اصل متعلق خوف کا اعمال سیئہ ہیں جس کا مقتضی یہ تھا کہ خوف سے اعمال سیئہ کی تقلیل ہوا کرتی مگر تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ غلبہ خوف

سے جبکہ وہ مفرط ہوجاوے اعمال صالحہ میں بھی تقلیل کا اندیشہ ہو جاتا ہے بلکہ تقلیل کا وقوع ہو جاتا ہے تو جو چیز تقلیل عمل کی طرف مفضی ہو سکے وہ اصل نہیں ہوسکتی اسی لئے حضور ﷺ نے رجا کے لئے کوئی حد نہیں بیان فرمائی اور خوف کے لئے حد بیان فرمائی جو ابھی آتی ہے اور یہی کافی دلیل ہے حضور ﷺ کے اعقل الناس و رئیس العقلاء ہونے کی کیونکہ آپ نے جو خوف کی حد بیان فرمائی ہے وہ کسی عاقل کے کلام میں نہیں مل سکتی (الا ان یکون نبیا مثلہ) آپ فرماتے ہیں واسئلک من خشیتک ما تحول بینی و بین معاصیک کہ اے اللہ میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں کہ جس سے گناہوں میں آڑے بنے یہ حد آپ نے اس لئے بیان کی ہے کہ غلبہ خوف سے تعطل کا اندیشہ ہے ہم نے تجربہ کیا ہے کہ زیادہ خوف سے مایوسی ہو جاتی ہے کانپور میں ایک وکیل میرے ہم نام تھے انہوں نے احیاء العلوم کا باب الخوف دیکھا تھا ان کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ نیک خاتمہ ہونے سے مایوس ہو چلے اور اس کا نام سن کر تھراتے اور کانپتے تھے ایک دن وہ میرے پاس کتاب لے کر آئے اور حالت یہ تھی کہ کتاب کو کھولتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپتا آخر میں نے تسلی دی جب کچھ ان کے ہوش وحواس درست ہوئے اور مجھ سے اس تقریر کے ضبط کرنے کی درخواست کی چنانچہ وہ ضبط اور شائع ہو چکی اس کا نام خاتمہ بالخیر ہے اسی طرح ایک انسپکٹر پولیس پر خوف غالب ہو گیا تھا اور وہ اس غلبہ سے اپنی مغفرت سے مایوس تھا آخر کہنے لگا کہ دوزخ میں تو ضرور جاؤں ہی گا پھر ظلم ورشوت میں بھی کیوں کمی کروں مگر نہ معلوم حق تعالیٰ کو اس کا کون سا فعل پسند آ گیا ہوگا کہ آخر میں توبہ نصیب ہوئی اور خاتمہ اچھا ہو گیا۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝
ترجمہ: آپ ﷺ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

تفسیری نکات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ کی قسم

یہ آیت قوم لوط (علیہ السلام) کے بارے میں ہے اوپر سے ان کا قصہ چلا آتا ہے۔ پس اسی قصہ کے متعلق حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ یعنی اے محمد ﷺ آپ کی حیات اور جان کی قسم ہے وہ یعنی قوم لوط اپنی مستی اور نشہ میں بھٹک رہے تھے اس قسم سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات شریف کی عظمت اور شان بیان فرمادی اور بیان بھی ایسے طور سے کہ سننے والوں کو حضور ﷺ کی شان محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

فضیلت کی انواع

بعض لوگ لکھے پڑھے تو ہوتے نہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم قرآن کو سمجھ لیں اور چونکہ موقوف ہے دوسرے علوم پر اس لئے شبہات پیدا ہوتے ہیں پھران شبہات کو لے کر علماء سے الجھتے ہیں چنانچہ یہ شبہ بھی کہ جب قرآن میں انجیر وغیرہ کی بھی قسم ہے تو اللہ تعالیٰ کا قسم کھانا دلیل عظمت ورفعت شان مقسم بہ کی نہیں اس کم علمی ہی سے پیدا ہوا ہے۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ عقلی سمجھئے۔ وہ یہ ہے کہ ہر شے کا شرف اسی کی نوع کے اعتبار سے ہوتا ہے تو مقسم بہ ہونا بے شک دلیل ہے شرف کی لیکن نہ مطلقاً بلکہ فی نوعہ یعنی یہ سمجھا جاوے گا کہ یہ شے اپنی نوع میں سب افراد سے افضل ہے اس کو میں اور واضح کرتا ہوں امام غزالی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ کھانا افضل ہے یا پانی تو وہ مجنون ہے یہ سوال ہی غلط ہے کہ افضلیت اور مفضولیت ایک نوع کے افراد میں ہوتی ہے مثلاً یہ سوال صحیح ہے کہ پلاؤ افضل ہے یا بریانی پانی افضل ہے یا دودھ ہاں اگر انواع ہی میں گفتگو ہو تو وہ دوسری بات ہے لیکن اگر افراد میں ہو تو اس میں یہ رعایت ضرور ہوگی کہ ایک نوع کے تحت میں داخل ہوں مثلاً یوں نہ کہیں گے کہ مسجد افضل یا فلاں کتاب یوں کہیں گے یہ مسجد افضل ہے یا فلاں مسجد یا فلاں گھر'

جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا تو اب جواب سمجھئے کہ مقسم بہ ہونا بے شک دلیل اس کے شرف کی ہے یہ مراد نہیں کہ وہ سب انبیاء سے افضل ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی نوع میں افضل ہے پس انجیر بے شک افضل ہے لیکن ثمرات میں اور فجر بلا شبہ اشرف ہے مگر وقت میں پس اس بناء پر آپ کی حیات کے مقسم بہ ہونے کی حضور کی جو فضیلت وعظمت ثابت ہوئی وہ اپنے اخوان یعنی انبیاء میں ثابت ہوئی پس اس سے تمام پیغمبروں سے افضل ہونا ثابت ہوا اور انبیاء سب انسانوں سے افضل ہیں پس حضور ﷺ کا سید وولد آدم ہونا معلوم ہوا۔

اب رہی یہ بات کہ فضیلت مطلقہ کیسے ثابت ہوئی تو وہ بدیں طور پر کہ باتفاق عقلاً انسان اشرف المخلوقات ہے اور نیز حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ پس جب کہ نوع انسان تمام انواع سے افضل ہے اور انواع انسان میں انبیاء افضل ہیں اور حضور افضل المرسلین وسید الانبیاء ہیں پس حضور افضل الخلق ہوئے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی دو قسمیں فرمائیں ہیں عرب وعجم ان میں عرب کو فضیلت عطا فرمائی پھر عرب میں قریش کو افضل فرمایا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب فرمایا پھر ان میں مجھ کو پیدا کیا پس میں افضل ہوں نسباً بھی پس اب وہ شبہ رفع ہو گیا اور لعمرک سے فضیلت و محبوبیت حضور ﷺ کی ثابت ہو گئی۔

ترجمہ: آپ (ﷺ) کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

حیات برزخی رسول اکرم ﷺ

جاننا چاہئے کہ قسم معمولی شے کی نہیں کھائی جاتی مقسم بہ کوئی عجیب اور ذی شرف شے ہونا چاہئے اب دیکھنا چاہئے کہ مقسم بہ یہاں کیا ہے تو مقسم بہ یہاں حضور ﷺ کی حیات ہے اس لئے کہ عمر بفتح وضم نام ہے حیات اور بقاء کا اور حیات کہتے ہیں ذی حیات کی اس حالت کو جو تولد سے لے کر وفات تک ہے اور اگر نظر کو اور وسیع کیا جاوے تو حضور ﷺ کے لئے بعد وفات کے بھی حیات برزخی ثابت ہے اور وہ حیات شہداء کی حیات برزخی سے بھی بڑھ کر ہے اور اتنی قوی ہے کہ حیات ناسوتی کے قریب قریب ہے چنانچہ بہت سے احکام ناسوت کے اس پر متفرع بھی ہیں دیکھئے زندہ مرد کی بیوی سے نکاح جائز نہیں ہے حضور ﷺ کی ازواج مطہرات سے بھی نکاح جائز نہیں اور زندہ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی حضور ﷺ کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور حدیثوں میں صلوٰۃ وسلام کا سماع وارد ہوا ہے سو یہ تحقیقات ہیں اہل اسرار کی اس سے اصلی راز ان احکام یعنی لا تنکحوا ازواجه من بعده اور لا نورث ماترکناه صدقة کا معلوم ہو گیا پھر حیات برزخی کے بعد حیات اخروی ہے وہ تو سب کو شامل ہے تو انبیاء کو بطریق اولیٰ حاصل ہوگی پس حیات کا مصداق حضور ﷺ کی ولادت شریف سے لے کر جنت کے دخول وخلود تک ہے یہ کلام تو منتہی کی جانب میں ہے اور اگر ابتداء کی جانب نظر کو وسعت دی جاوے تو آپ کی نورانیت کی جو حالت عالم ارواح سے بھی پہلے تھی اس کو بھی حیات کہہ سکتے ہیں جس کی نسبت ارشاد ہے کنت نبیا وادم بین الروح و الجسد اور عالم ارواح میں جب الست کا عہد لیا گیا اور پوچھا گیا الست بربکم تو سب نے حضور ﷺ کی طرف دیکھا کہ دیکھیں آپ کیا جواب دیتے ہیں تو سب سے اول حضور ﷺ نے جواب دیا۔ بلی انت ربنا اس کے بعد اوروں نے بھی کہا اوروں کی علم ومعرفت کے مربی بھی حضور ﷺ ہوئے اور تربیت فی العلوم حیات پر موقوف ہے پس جب سے نور مخلوق ہوا ہے اس وقت سے حیات لی جاسکتی ہے پس اس تقریر پر حضور ﷺ کی حیات کی چار حالتیں ہو گئیں۔

ایک تو نور شریف کے پیدا ہونے سے ولادت شریف تک

دوسرے ولادت شریف سے وفات تک

تیسرے وفات سے حشر ونشر تک

چوتھے اس سے خلود جنت تک

پس اگر لعمرک سے یہ حیات جس کے چار حصے ہیں مراد لی جاوے تو مجھ کو ہر حصہ کے متعلق مفصل بیان کرنا پڑے گا اور وقت اتنا وسیع نہیں اس لئے میں وہی حصہ حیات کا لیتا ہوں جس کو اہل عرف حیات کہتے ہیں یعنی ولادت شریف سے لے کر وفات تک پس معنی لعمرک کے یہ ہوئے کہ آپ کی اس حصہ عمر کی قسم ہے۔

مدعیان محبت نبویہ کی غلطی

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا یہ حصہ عمر اتنا رفیع الشان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقسم بہ بنا اور اس حصہ عمر و حیات کا ایک جزو ولادت شریفہ بھی ہے تو اس کا بھی عظیم القدر و رفیع الشان ہونا ثابت ہوا اسی طرح اس کا دوسرا حصہ قوت استعداد و حصول کمالات کا ہے تیسرا حصہ تبلیغ و دعوت کا ہے چوتھا حصہ تکمیل امت کا ہے اور یہ تیسرا چوتھا حصہ بعض احوال میں متعانق بھی ہے پھر تکمیل کی دو حیثیتیں ہیں ایک تکمیل حاضر کی خود اس کی اصلاح کے لئے دوسری تکمیل حاضر کی اصلاح غایت کے لئے پس ان سب حصص کی رفعت و عظمت ثابت ہوئی اور عظمت و رفعت شے کی جس طرح باعتبار اس کی ذات کے ہوتی ہے اسی طرح باعتبار اس کی غایت کے بھی ہوتی ہے بلکہ زیادہ مقصودیت شے کی اس کی غایت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

پس حضور ﷺ کی تشریف آوری عالم ناسوت میں بجمیع الحصص کی بھی کوئی غایت ضرور ہوگی اور وہ غایت ایسی ہے کہ اس کو سن کر مدعیان محبت کی بھی اصلاح ہوگی۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: اور ہم نے آپ (ﷺ) کو سات آیتیں دیں جو نماز میں مقرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔

تفسیری نکات

اہل علم کی ہوس زر پر اظہار افسوس

ایک روز فرمایا کہ ایسے شخص کی حالت پر نہایت افسوس ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث پڑھ کر جاہ و مال کی محبت رکھے تو اس نے اس کی تعلیمات پر نظر ہی نہیں کی کما یدل علیه قوله تعالیٰ وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ الخ علی ماذکره الزمخشری فی الکشاف والغزالی فی المنهاج و الحدیث من لم یتغن بالقرآن فلیس منا او کما قال علی تفسیر الغنی بالاستغنال کما فسره العلامة الزمخشری غفرله خادم العلماء و الفقراء السید احمد حسن الجشتی عفی عنه'

ترجمہ: اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں پس اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے پرودگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے۔

خلاصہ مفہوم

خلاصہ یہ کہ جب تنگی ہو یعنی خدا کے ساتھ مشغول ہو اس مشغولی بحق سے تنگی جاتی رہے گی اور یہاں جمعیت سے وہ مراد نہیں جو ایک دوسری آیت میں مذکور ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یہاں پر اس کی تفسیر سیاق وسباق سے معلوم ہوتی ہے کہ اطمینان سے وہ اطمینان مراد نہیں جو ضیق کا مقابل ہے یہاں پر دوسرا اطمینان مراد ہے جس کا نام ایمان ہے چنانچہ قرینہ سیاق بالمورد یہ ہے کہ فرماتے ہیں وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ آگے فرماتے ہیں بطور مبدل منہ الا بذکر اللہ طمئن القلوب

جب یہ من اناب کا بدل ہے تو اس کے ساتھ متحد ہے اور من اناب بوجہ تقابل خیال کے بمعنے مہتدی ومومن ہے پس یہ اطمینان متحد ہوا ایمان کے ساتھ اور سیاق بالتحیۃ یہ ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ.

اور اصل معنی اطمینان کے سکون کے ہیں اور سکون دو طرح کا ہوتا ہے ایک سکون عقلی دوسرا سکون طبعی پس یہاں اطمینان سکون عقلی کے معنی میں ہے۔

پس مقابل ضیق کا نہیں کیونکہ ضیق امر طبعی ہے پس وہ تو اطمینان کفر کے مقابل ہے پس طبعی نہیں، اور قرآن میں دونوں استعمال موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ ۢ بِالْاِيْمَانِ یہاں سکون عقلی ہے اور ایک جگہ طبعی ہے ابراہیم کے قصے دعائے احیائے موتی میں۔

بعضے اس کی تفسیر نہ جاننے سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں ایک کورٹ انسپکٹر یہ آیت دیکھ کر کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۭ کہنے لگے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو احیاء میں اطمینان نہ تھا شک تھا ان کے اس شبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اس آیت میں اطمینان کو مقابل سچ کے سمجھے یعنی اطمینان عقلی سمجھ گئے سو یہاں بمعنی اطمینان طبعی مستعمل ہے اور شک کی نفی تو اولم تومن کے جواب میں ان کے بلی کہنے سے ہوگئی۔

حاصل اس بے اطمینانی طبعی کا یہ ہے کہ ان کو یہ تو یقین تھا کہ احیاء ہوگا مگر اس کی کیفیت میں جو کہ کئی احتمال تھے اور کسی کیفیت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا اس لئے اس کی تعیین میں تردد تھا اس کو عدم اطمینان فرمایا کیونکہ یہ اطمینان مشاہدہ ہی سے ہوتا ہے کہ طبعا سکون ہو جاوے یہ کیفیت واقع ہوئی میں نے ان کو یہی جواب دیا بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی ترجمہ سے قرآن سمجھنا بہت دشوار ہے۔

یہ اثر پیدا ہوتا ہے محققین کے پاس رہنے سے ورنہ کتنا بڑا شبہ تھا ابراہیم علیہ السلام کو تو اطمینان نہ تھا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ سے اور وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ ۢ بِالْاِيْمَانِ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادنی مومن کو اطمینان حاصل ہے تو اس کو اتنا بڑا درجہ ملا کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی حاصل نہ تھا۔

اطمینان کے درجات

تو اس تحقیق سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اطمینان کے دو درجہ ہیں پس ان الذین امنوا میں اطمینان عقلی مراد ہے ولکن لیطمئن قلبی میں اطمینان طبعی اور ضیق کا علاج یہی اطمینان طبعی ہے جو مشغولی بحق سے پریشانی کے رفع کرنے میں مؤثر ہے گو اور بہت امور میں تردد کو رفع نہ کرے مثلاً احیاء موتی کی کیفیت میں۔

اب ایک اور قوی شبہ باقی رہ گیا وہ یہ کہ فرماتے ہیں الم نشرح لک صدرک، تو کیا شرح صدر کے بعد بھی حضور ﷺ کو تنگی معلوم ہوئی سو سمجھ لو کہ یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

ضیق کی دو قسمیں

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ سو ضیق کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ جیسے عوام کو ہوتا ہے حضور ﷺ کو ایسا کبھی نہیں ہوا اور یہ کہ نہایت ضعیف ہو سو یہ ہوا مگر یہ شرح صدر کے منافی نہیں۔

دیکھو آپ کو زکام ہو گیا اور وہ بھی معمولی تو آپ بھی مریض ہیں اور ایک مدقوقہ ہے وہ بھی مریض ہے مگر آپ کی بیماری عادت صحت کے منافی نہیں کیونکہ صحت غالب ہے پس حضور ﷺ کا ضیق بھی نہایت خفیف ہوتا تھا جو شرح صدر کے منافی نہیں۔

اب ایک بات اور عجیب قابل تحقیق باقی رہی وہ یہ کہ اطمینان جب حاصل ہو گا تو آیا ضیق زائل ہو جائے گا یا مغلوب ہو جاوے گا تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ ضیق زائل نہیں ہوتا بلکہ مغلوب ہو جاتا ہے جس طرح انسان کے اندر سب اخلاط موجود ہیں تو جب صفرا بڑھ جاتا ہے مسہل کی ضرورت پڑتی ہے مگر مسہل صفرا کو بالکل نہیں نکال دیتا اور اگر بالکل صفراویت نہ رہے تو پھر خیریت نہیں۔

حق تعالیٰ نے جب طبیعت عطا فرمائی ہے تو اس کے خواص لازمہ بھی عطا فرمائے ہیں ورنہ انتفاء لازم سے انتفا ملزوم ہو جاتا ہے غرض زائل نہیں ہوتا ہاں مغلوب ہو جاتا ہے اور اس تحقیق سے ایک بڑا تردد سالکین کا دفع ہوا وہ یہ کہ بعض اوقات بعد مجاہدہ کے بھی بعضے امور طبعیہ سے مذمومہ کا اثر اپنے اندر پاتے ہیں اور اس سے مجاہدہ کے بیکار ہونے کا گمان کر کے مایوس ہو جاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اخلاق ذمیمہ مغلوب ہو جائیں کہ ان کے اقتضاء پر عمل کرنے کو بآسانی ترک کر سکیں یہ کافی ہے زوال کی توقع نہ رکھیں ورنہ پھر ثواب اور فضیلت ہی کیا ہے یہ امور ذوقیہ تھے جو درمیان میں عرض کر دیئے گئے۔

خلاصہ اور اصل مسئلہ یہی ہے کہ ضیق کا مشغولی بحق سے علاج کیا گیا ہے آپ خود بھی دیکھ لیجئے کہ مشغولی حق سے پہلا واقعہ بھول جائیں گے یا نہیں اور میں یہ بتلا چکا ہوں کہ واقعات محزون و پریشان نہیں بناتے بلکہ مشغولی بواقعات پریشان کرتی ہے اور مشغولی بحق سے وہ مشغولی و توجہ نہیں رہتی اس لئے پریشانی نہ رہے گی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا دل ان کے اقوال سے تنگ ہوتا ہے سو آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتے رہیے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہیے اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیئے یہاں تک کہ آپ کو موت آ جاوے۔

تفسیری نکات

علاج غم

آگے علاج بتاتے ہیں کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی تسبیح کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اللہ کا نام لیجئے نفل پڑھئے یا ذکر کیجئے وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ بالخصوص سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیے اور یہ جو ہم نے بتلایا یہ تو دوا تھی چنانچہ فاء تفریعیہ اس کا قرینہ ہے۔

اب آگے فرماتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایک غذا بھی ہے کہ اگر تم پر اور تنگ دلی بھی نہ ہو تب بھی اس کو کرتے رہو یعنی وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ پس یہ غذا ہے کہ موت آنے تک عبادت کرتے رہو غرض اس آیت سے علاج وغذا دونوں باتیں معلوم ہوئیں باری تعالیٰ نے یہاں تین صیغے اختیار کئے ہیں اور سب کا حاصل قریب قریب ایک ہے یہ صرف اختلاف عنوان ہے اور حاصل سب کا ایک ہے۔

عبارا تنا شتے و حسنک واحد و کل الے ذاک الجمال یشر

بس عبارتیں مختلف ہیں اور حاصل سب کا ایک ہے یعنی مشغولی بحق خلاصہ یہ کہ اگر آپ پر تنگی آوے اور آپ کا دل تنگ ہو تو مشغول بحق ہو جائیے یہ اس کا علاج ہے۔

سُوْرَةُ النَّحل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ وہ وہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کو تم نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

جدید مصنوعات کا ذکر قرآن مجید میں

مطلب یہ ہے کہ مخلوقات الٰہی کا تمہاری معلومات ہی میں انحصار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں مثلاً زمین کے اندر بعض جراثیم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو انسان وحیوان کے لئے قاتل ہیں اور بعض مواد ایسے پیدا ہوتے ہیں جو موذیات کو فنا کرنے والے ہیں ہم کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سا مادہ کب پیدا ہوا اور کب فنا ہو گیا یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب میں اس کے متعلق چند فوائد ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک فائدہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ایک سواری ریل ایجاد ہوئی بعض ذہنوں کو اس کے متعلق اس کی تلاش ہے کہ ریل کا ذکر بھی قرآن شریف میں کہیں ہے یا نہیں ہر چند کہ اس کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ قرآن حرفت وصنائع اور ایجادات کے بیان کرنے کو نازل نہیں ہوا جیسا کہ بارہا میں نے اس پر متنبہ کیا ہے اور قرآن کو جو تبیانا لکل شی کہا گیا ہے تو وہاں کل شی سے مراد کل شی عن امور الدین ہے نہ کہ کل شی ولو عن امور الدنیا اس لئے یہ تحقیق مذکور محض ایک امر زائد ہے لیکن تبرعاً میں اس کو بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اس وقت یہ بیان ایک ایسی ہی نعمت کے شکریہ میں ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریل کے متعلق ہم کو عطا فرمائی اور جس کو دوسرے مرکوبات کے ساتھ وصف مرکوبیت میں مشارکت بھی ہے سو بعض ذہنوں نے اس سورۃ یس کی اس آیت وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ۝ میں داخل کیا

ہے کہ اس میں ریل کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اس بات میں بھی ہماری قدرت کی دلیل موجود ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری بھری کشتیوں میں سوار کیا اور ہم نے ان کے لئے کشتی کے مثل اور چیزیں بھی پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اور ریل سب سے زیادہ کشتی اور جہاز کے مشابہ ہے کہ جیسے جہاز میں انسان اپنی تمام ضروریات کو ساتھ لے کر سفر کرتا ہے ایسے ہی ریل میں کرسکتا ہے مگر یہ قرآن کی تحریف ہے کیونکہ یہاں خلقنا لھم صیغہ ماضی کا ہے تو لازم آئے گا کہ ریل کا وجود حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی ہو اور اس کا بطلان ظاہر ہے بلکہ اس سے مراد بعض کے نزدیک تو اونٹ ہے اور اس کا لطف عربیت کے جاننے سے زیادہ آئے گا کیونکہ اہل عرب اونٹ کو سفائن البر یعنی خشکی کا جہاز کہتے تھے چنانچہ یہ مصرعہ مشہور ہے **سفائن البرو السراب.**

اور میرے نزدیک اس سے مطلق انعام مراد ہیں کیونکہ سورہ زخرف میں ہے **وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ** یہاں فلک اور انعام دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انعام و کشتی باہم متناسب ہیں مگر مماثلت کی صورت جب ذہن میں آئے گی کہ کشتی تو چھوٹی لو اور جانور بڑا یہ نہیں کہ جانور چھوٹا لو اور جہاز سے اس کا موازنہ کرو جیسے بیربل اور اکبر شاہ کا قصہ ہے کہ اکبر نے بیربل سے کہا تھا کہ مثل مشہور ہے راج ہٹ تریا ہٹ بالک ہٹ سو اول کی دو ضدیں تو واقعی سخت ہیں باقی تیسری کیا مشکل ہے بیربل نے کہا حضور سب سے سخت تو یہی ہے البتہ اگر عقل ہو تو پھر مشکل نہیں اکبر شاہ نے کہا اس میں عقل کی کون ضرورت ہے۔ بیربل نے کہا بہت اچھا میں بچہ بنتا ہوں آپ میری ضد پوری کیجئے بادشاہ نے کہا اچھا تم بچہ بنو اور ضد کرو ہم ہر ضد کو پورا کریں گے بیربل نے بچوں کی طرح رونا شروع کیا اور کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اکبر نے فیل خانہ سے ہاتھی منگوا دیا اس نے پھر رونا شروع کیا اور کہا ہم تو کلیا لیں گے اکبر نے کلیا بھی منگوا دی وہ پھر رونے لگے اور کہا کہ ہاتھی کو کلیا میں رکھو یہاں اکبر عاجز ہو گیا اور کہا اچھا تم جو کہتے تھے کہ اگر انسان عاقل ہو تو بچوں کی ضد پوری کرسکتا ہے یہاں عقل کیا کام دے گی۔ بیربل نے کہا حضور عقل کے ساتھ بچہ کی ضد ضرور پوری کی جاسکتی ہے اکبر نے کہا اچھا لو ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو چنانچہ آپ نے اسی سبق کو دہرایا کہ ہم تو ہاتھی لیں گے بیربل نے بازار سے مٹی کا ننھا سا ہاتھی منگوا دیا پھر کہا ہم تو کلیا لیں گے اس نے بڑی سے کلیا منگا دی پھر کہا ہاتھی کو اس میں بند کرو بیربل نے ہاتھی کو کلیا میں رکھ دیا اور کہا حضور نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی ضد پر فیل خانہ سے ہاتھی منگایا آپ کو بچہ ہی کے مناسب ہاتھی منگوانا چاہئے تھا اسی طرح یہاں فلک و انعام میں مناسبت کا لحاظ کر کے کشتی چھوٹی اور جانور بڑا لینا چاہئے اور بعض حضرات نے ریل کو سورہ نحل کی اس آیت **وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** میں داخل کیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کرے گا جن کو تم نہیں

جانتے) گو یہ تحریف تو نہیں ہے مگر بعید ضرور ہے کیونکہ یخلق بظاہر صیغہ حال ہے اور ظاہر ہے کہ ان سواریوں میں جو آج کل ایجاد ہوئی ہیں صحابہ کے زمانہ میں کوئی پیدا نہیں ہوئی اور اگر اس کو مستقبل لیا جائے تو صحابہ کچھ سمجھے ہی نہ ہوں گے پھر یہ ایجادات خلق کے بعد تو معلوم ہو گئیں اور اس آیت کے تحت میں وہی اشیاء داخل ہو سکتی ہیں جو بعد خلق کے بھی معلوم نہ ہو اس لئے اس کی تفسیر میں سہل بات وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کے لئے مثل نعم مذکورہ کے نافع ہیں اور تم کو ان کی خبر بھی نہیں جیسے مواد ارضیہ جو موذیات کو فنا کرتے رہتے ہیں اور نافع ہونے کی قید بمقتضاء مقام ہے کہ اشیاء نافعہ کا ذکر ہو رہا ہے پس حاصل مقام کا یہ ہوا کہ ہم ایسے نفع رساں ہیں کہ بعض چیزوں کی تم کو خبر بھی نہیں اور ہم ان سے تم کو نفع پہنچا رہے ہیں یہ نہ سمجھو کہ بس وہی چیزیں تمہارے نفع کی پیدا کی ہیں جو تم کو معلوم ہیں جیسے نعم مذکورہ اور اس تقریر پر **یخلق مالا تعلمون** کا ربط بھی نعم مذکورہ سے ظاہر ہو گیا یعنی ربط تقابل۔

اور بعض حضرات نے مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا میں ریل کو داخل کیا ہے کیونکہ بعض سلف نے فرمایا ہے کہ من رحمۃ میں ہر وہ نعمت داخل ہے جو بندوں کی راحت و آسانی کے لئے ایجاد ہوئی ہے چنانچہ شغدف وغیرہ کو بھی انہوں نے اس میں داخل کیا ہے اس میں البتہ زیادہ بعد نہیں اسی واسطے میں نے بھی اپنی تفسیر کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھ دیا ہے کہ من رحمۃ کے عموم میں ریل بھی داخل ہے اور اتفاق عجیب یہ ہوا کہ جس دن میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا اسی دن پہلے پہل ہمارے قصبے کے سامنے سے ریل گزری ہے اس لئے میں نے تفسیر کے حاشیہ میں یہ بھی لکھ دیا کہ بحمد اللہ آج ہماری بستی کے سامنے سے عیدگاہ کے قریب ریل گزری ہے۔ اور اس کے ساتھ ریل کے جاری ہونے کا سن اور تاریخ بھی لکھ دی تاکہ محفوظ رہے غرض اس آیت میں ریل کا داخل کرنا بعید نہیں اور خود میں نے بھی اسی میں اس کو داخل کیا تھا لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک بات اس سے بھی زیادہ قریب آئی ہے وہ یہ کہ اگر ذکر کو حقیقی اور حکمی کے لئے عام لیا جائے تو میرے نزدیک ریل کا ذکر وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ میں سب سے اقرب طرق کے ساتھ ہو جاوے گا کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں مراکب میں وجہ نعمت اس غایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارا بوجھ ایسے بلاد تک پہنچاتے ہیں جہاں تم بدوں مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے تو جس سواری میں بھی یہ رعایت موجود ہو گی وہ حکماً اس نعمت میں داخل ہو کر مثل انعام کے نعمت کی ایک فرد ہو گی اور ریل میں یہ غایت سب سے زیادہ موجود ہے تو وہ بھی حکماً اس نعمت میں داخل ہے۔

میں نے بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحبؒ کا (جو تھانہ بھون کے بڑے علماء میں سے تھے ۱۲) ایک وعظ سنا تھا اس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی مگر مولانا سے مجھے محبت تھی اور مولانا کو مجھ سے محبت تھی اس لئے میں کوشش کر

کے وعظ میں شرکت کیا کرتا تھا اس لئے مجھے مولانا کے مواعظ کی کچھ کچھ باتیں اب تک یاد ہیں چنانچہ ایک بار مولانا نے وعظ میں فرمایا کہ مجھے ریل کا نعمت ہونا ابھی تک محسوس نہ ہوا تھا یعنی اس طرف التفات نہ ہوا تھا مگر ایک دن جو ریل میں بیٹھا اور جلدی سے منزل پر پہنچ گیا تو اس وقت اس نعمت کی بڑی قدر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ریل بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو ہم لوگوں کو عطا ہوئی ہے پس میں آپ صاحبوں کو بھی مطلع کرتا ہوں کہ اس کو نعمت سمجھو اور اس کا شکر ادا کرو تو جب بڑے بڑے علماء کو اس کا نعمت ہونا جلدی معلوم نہیں ہوا تو عوام کو اگر اس کا نعمت ہونا معلوم نہ ہو تو زیادہ شکایت نہیں مگر تنبیہ کے بعد تو احساس ہونا چاہئے اس لئے میں بھی مولانا شیخ محمد صاحب کی طرح کہتا ہوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھو اور اس پر شکر کرو اور شکر مراکب کے دو صیغے قرآن میں وارد ہیں۔ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقۡرِنِيۡنَ ۙ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ۝ جو رکوب انعام کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہم کو تعلیم فرمایا ہے اور دوسرے بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖٮٰهَا وَمُرۡسٰٮهَا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝ جو رکوب سفینہ کے وقت نوح علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا اور چونکہ ریل کو حمل اثقال میں انعام کے ساتھ بھی مشابہت ہے اور سرعت سیر وغیرہ میں کشتی کے ساتھ اس لئے بہتر ہے کہ دونوں کو جمع کر لیا جائے۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا تھا کہ ریل کو دیکھ کر مجھے جہنم یاد آتا ہے کیونکہ اس کا انجن جہنم کی صفت کا مصداق ہے وَهِىَ تَفُوۡرُ ۙ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الۡغَيۡظِ کہ اس قدر جوش کھاتا ہے گویا غصہ اور قہر سے ابھی پھٹ پڑے گا اور ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے کہ ریل کے تیسرے درجہ جہنم کی اس صفت کا مذکر ہوتا ہے كُلَّمَا دَخَلَتۡ اُمَّةٌ لَّعَنَتۡ اُخۡتَهَا کہ جیسے جہنم میں ایک جماعت دوسری جماعت پر لعنت کرے گی ایسے ہی ریل میں تیسرے درجہ والے آپس میں خوب لڑتے ہیں جب کسی اسٹیشن پر نئے نئے مسافر تھرڈ میں بھرتے ہیں تو پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں وہ انہیں کو سب برا بھلا کہتے ہیں کہ سارے اسی گاڑی میں آ جاؤ تمہارے واسطے اور کہیں جگہ نہیں رہی منہ پر آنکھیں نہیں کہ یہ تو پہلے ہی سے اسی گاڑی میں آ جاؤ تمہاری سزا یہ ہے کہ کھڑے رہو اور جواب میں کہتے ہیں کہ جگہ تو بہت ہے سیدھے ہو کر بیٹھو کیا تم ہی نے کرایہ دیا ہے تم ریل کے مالک ہو پھر خوب گالم گلوچ اور جھگڑا فساد ہوتا ہے اس وقت بالکل یہی منظر ہوتا ہے كُلَّمَا دَخَلَتۡ اُمَّةٌ لَّعَنَتۡ اُخۡتَهَا اور جب کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو ٹکٹ لیا ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے لکل ضعف اور جب کہتے ہیں کہ تم کو ہم پر کیا ترجیح اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے فَمَا كَانَ لَكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ اور ایک شان اس میں جنت کی بھی ہے وہ یہ کہ جنت میں جس چیز کو دل چاہے گا وہ جلدی مل جائے گی اس بات میں ریل جنت کے مشابہ ہے کہ جس چیز کو دل چاہتا ہے ریل کے ذریعہ سے جلدی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ کلکتہ اور پشاور کے میوے یہاں دوسرے دن پہنچ جاتے ہیں بڑے شہروں میں ہر ملک کی چیزیں ہر وقت ملتی ہیں نیز جیسے جنت

میں جہاں جانے کو دل چاہا فوراً پہنچ گئے اسی کا نمونہ گو ادنیٰ ہی نمونہ ہو اس میں بھی ہے چنانچہ ظاہر ہے او اس کے متعلق اسٹیشنوں کا انداز سے تقارب اور ہر اسٹیشن پر ضرورت کی چیزیں ملنا بالکل بلاد سبا کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ اور گو یہ نعمت دنیوی تھی مگر اس پر ناشکری کی مذمت اس طرح فرمائی گئی فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (الایۃ) پس اسی طرح یہ ریل بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کا شکر کرنا چاہئے اور اس کے اندر جو مشابہتیں جنت و دوزخ کی مذکور ہوئیں ان پر اگر نظر کی جائے تو نعمت ظاہرہ کے ساتھ اس سے نعمت باطنیہ یعنی تذکرآ خرت بھی حاصل ہوگی۔

مقدم و تالی میں عجیب ربط

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ (اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر موجودہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے)

اس آیت میں بظاہر مقدم و تالی میں ربط نہیں کیونکہ آدمیوں کے افعال پر مواخذہ کرے۔ نتیجہ ظاہر میں آدمیوں ہی کی ہلاکت ہوسکتی ہے نہ کہ تمام حیوانات کی ہاں اگر یہ فرماتے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ (اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتی ہے تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے)

یا یوں فرماتے ولو یواخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علیھا من الانسان (اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی انسان کو نہ چھوڑتے)

تو اس صورت میں ربط ظاہر تھا لیکن آیت اس طرح وارد نہیں ہوئی وہاں تو مواخذہ اعمال انسان پر تمام حیوانات اور جاندار چیزوں کی ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ کہ انسان کے گناہوں سے تمام مخلوق ہلاک ہو ان دونوں مقدموں میں جوڑ کیا ہے مگر تقریر گذشتہ کے ملانے سے اب اس اشکال کا جواب ظاہر ہے اس آیت کے ساتھ وہ مقدمہ ملا لیجئے کہ انسان کے لئے سب کائنات پیدا ہوئے ہیں بس اب ربط پیدا ہو گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ انسان تو اس صورت میں اپنے گناہوں کی وجہ ہلاک ہوتا اور بقیہ مخلوقات اس لئے ہلاک ہوتیں کہ وہ سب انسان کے لئے پیدا ہوئی تھیں اور قاعدہ الشیء اذا خلا عن غایت انتفی (چیز جب غرض و غایت سے خالی ہوتی ہے تو منتفی ہو جاتی ہے)

جب انسان ہی نہ رہا جس کے لئے یہ سب پیدا ہوئے تھے تو اب ان کے باقی رہنے میں کیا فائدہ اس لئے یہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (ترجمہ) سواگر تم کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھو دیکھو (النحل آیت ۴۳)

فتویٰ کی دلیل پوچھنا خلاف اصول ہے

کی تشریح میں فرمایا کہ بیچ کا جملہ معترضہ ہے اور بالبینات اور فسئلوا کے متعلق نہیں بلکہ ارسلنا کے متعلق ہے اس سلسلہ میں فرمایا کہ سائل مجتہد ہوگا یا غیر مجتہد ہوگا مجتہد تو سوال نہیں کرتا اور غیر مجتہد دلیل نہیں پوچھتا اب جو عام لوگوں نے دستور کر رکھا ہے کہ فتویٰ کی دلیل پوچھتے ہیں یہ خلاف عقل اور خلاف اصول ہے۔

(ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۵ صفحہ ۱۲۷)

ریل کا ثبوت آیت قرآن سے

فرمایا' ریل قرآن میں اس آیت کے تحت میں داخل ہوسکتی ہے وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بلغیه الا بشق الانفس لیکن بوجہ اشتراک علت کے نہ کہ بوجہ مدلول ہونے کے کیونکہ تحمل کا مرجع ظاہر ہے کہ انعام ہیں لیکن علت میں اشتراک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انعام کے متعلق احسان میں فرمایا ہے تحمل اثقالکم الخ یعنی وہ انعام ایسے بوجھ کو دوسرے شہروں کی طرف لے جاتے ہیں کہ تم ان کو نہیں لے جاسکتے تھے اور بوجھ سب سے زیادہ ریل پر جاتے ہیں اس واسطے یہ بھی ویسے ہی نعمت ہوئی (الکلام الحسن ج۱ صفحہ ۱۰۸)

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

ترجمہ: اور جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

تفسیری نکات

دنیا کی کوئی چیز قابل محبت نہیں ہے

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے بھی قابل محبت کے نہیں اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے ایسا عیب سب چیزوں کا بیان فرمایا کہ جو ظاہر الاشتراک اور بدیہی ہے یعنی جو چیز تمہارے پاس ہے وہ فنا ہونے والی ہے جب فنا ہونے والی ہے تو اس قابل نہیں ہے کہ اس سے جی لگایا جاوے

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے پہلا جز و یعنی مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ تو ہم کو کھلم کھلا نظر آتا ہے کہ کل فلاں مرا تھا آج فلاں اس کے لئے ضرورت اس کی نہیں کہ ایمان والا ہی اس کو سمجھے مومن کافر مشرک سب کھلی آنکھوں فنا اور تغیرات کا مشاہدہ کر رہے ہیں باقی اس دوسرے جز و کے مضمون کا یقین اس شخص کو ہوگا جس کو ایمان ہوگا اور کلام الٰہی کو سچا سمجھے گا وہ یقین کرلے گا کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والی ہیں لیکن اس جملہ خبریہ سے غرض اخبار نہیں جیسے کہ پہلے جملہ سے بھی یہ مقصود نہیں بلکہ غایت اس کی دوسری شئے ہے وہ یہ ہے کہ ماعند اللہ سے جی لگاؤ اس سے ایک کلیہ مستنبط ہوا وہ یہ ہے کہ جو شئے باقی رہنے والی ہے وہ قابل دل لگانے کے ہے اور یہ اہل دنیا کا بھی مسلمہ ہے کہ دل لگنے کا مبنی وہ بقاء کو مانے ہوئے ہیں اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھئے مثلاً دو مکان ہمارے پاس ہیں ایک تو عاریت کا ہے اور ایک ہم کو ہبۃً ملا ہے کہ ہم کو اس کا مالک بنا دیا گیا ہے مگر دونوں مکان کو اندر جا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ خراب وخستہ پڑے ہیں دیواریں ٹوٹی ہوئی ہیں کڑیاں گری ہوئی ہیں دونوں مرمت طلب ہیں اب ایک ہزار روپیہ مرمت کے لئے تجویز کیا لیکن اب کلام اس میں ہے کہ یہ ایک ہزار روپیہ کہاں لگانا چاہئے عاریت کے مکان میں یا مکان موہوب میں ظاہر ہے کہ ہر عاقل یہی تجویز کرے گا کہ جو اپنا مکان ہے اس میں لگانا چاہئے اس لئے کہ وہ تو پاس باقی رہنے والی ہے اور مستعار تو قبضہ سے نکلنے والا ہے اس میں روپیہ لگا کر کیا کرنا ہے معلوم ہوا کہ کوشش وسعی کا کرنا اور مال کا خرچ کرنا اسی شئے کے ساتھ ہوتا ہے کہ جو شئے باقی رہنے والی ہے اور اپنے پاس رہنے والی ہے اگرچہ وہ اچھا محض خیال ہی کے درجہ میں ہو اور جو شئے اپنے پاس باقی رہنے والی نہ ہو بلکہ جلدی سے نکل جانے والی ہو اس میں اگر کوئی اپنی ہمت وسعی خرچ کرے تو اس کو بے وقوف کہا جاتا ہے مثلاً ایک شخص سرائے میں ایک شب کے لئے ٹھہرا اور ہزار روپیہ کما کر بیوی بچوں کو جا کر دیں گے اتفاق سے جو کوٹھڑی سرائے میں اس کو ملی وہ خراب تھی اس نے اسی وقت معماروں کو بلا کر وہ ہزار روپیہ اس کوٹھڑی کی مرمت میں خرچ کر ڈالے بیوی بچے منتظر ہیں کہ میاں باہر سے کمائی لاویں گے میاں صاحب نے یہ حرکت کی تو تم اس شخص کو بیوقوف کہو گے یا عقلمند ظاہر ہے کہ بے وقوف ہے تو یہ بے وقوف کیوں ہے صرف اس وجہ سے کہ جلدی قبضہ سے نکل جانے والی شے میں اس نے اپنا سارا سرمایہ غارت کیا۔

اسی طرح تم کو بھی ایک ذخیرہ وسرمایہ عمر کا حق تعالیٰ کے یہاں سے ملا تھا کہ اس کا ایک ایک منٹ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے اور دلیل قیمتی ہونے کی یہ ہے کہ اگر کسی کا دم نکلنے لگے اور اس سے کوئی یہ کہے کہ ہم فی گھنٹہ دس لاکھ روپے لیں گے اور اتنی مہلت تم کو دی جاتی ہے اگر اس کے پاس روپیہ ہوگا تو ہرگز دریغ نہ کریگا بلکہ اس سے زیادہ بھی دریغ نہ ہوگی سلطنت دینے سے بھی انکار نہ ہوگا چنانچہ ایک بزرگ تھے ان کو کسی بادشاہ کو

نصیحت کرنا منظور تھا اس لئے انہوں نے اس بادشاہ سے کہا کہ کیوں جی اگر تم جنگل میں ہو اور رفیقوں سے بچھڑ جاؤ اور پیاس تم کو لگے اور کہیں پانی اس جنگل میں نہ ملے یہاں تک کہ پیاس کے مارے مرنے لگو اور اس وقت کوئی شخص ایک کٹورہ پانی کا تمہارے سامنے لاوے اور یہ کہے کہ آدھی سلطنت دو تو میں یہ کٹورہ پانی کا تم کو دوں تم اس وقت کیا کرو گے' بادشاہ نے کہا میں فوراً دے دوں گا۔ پھر کہا کہ اگر خدانخواستہ تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور تمام اطباء اور حکماء علاج سے عاجز ہو جائیں اور کوئی تدبیر نہ ہو اور کوئی شخص یہ کہے کہ اگر نصف سلطنت مجھ کو دے دو تو تمہارے پیشاب ابھی کھل جائے تم دے دو گے تو اس نے کہا کہ بے شک دیدوں گا ان بزرگ نے فرمایا کہ بس دیکھ لو آپ کی سلطنت کا یہ نرخ ہے یعنی ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ موت معلوم ہوا کہ عمر ہفت اقلیم کی سلطنت سے بھی زیادہ قیمتی ہے پھر دیکھو کے اس بے بہا سرمایہ کو تم نے کہاں خرچ کیا سرائے کی کوٹھڑی میں کوٹھڑی تو اس واسطے تھی کہ سرائے میں ایک دورات اس میں بسر ہو جائے تم نے سارا سرمایہ ہی اس میں خرچ کر ڈالا اب جب گھر پہنچو گے تو خالی ہاتھ جاؤ گے اس لئے کہ سرمایہ تو کوٹھڑی ہی میں اڑا دیا جس وقت قیامت کے دن بازار لگے گا وہاں حسرت ہوگی۔

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر — تہید ست رادل پرگندہ تر

(بازار جس قدر مال ومتاع سے بھرا ہوگا اسی قدر تنگدست کا دل پراگندہ ہوگا۔)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ: اس آیت شریف کا یہ ہے جو شخص عمل نیک کرے مرد یا عورت اور وہ مومن ہو پس بیشک ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا فرمادیں گے اور بیشک ہم ان کو ان کا اجر بدلہ میں دیں گے بسبب ان کے اچھے اعمال کے۔

تفسیری نکات

ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شئے ہے

اس آیت شریف میں حق تعالیٰ نے اپنے مطیع بندوں کے لئے اطاعت پر دو بڑی دولت کے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اور نیز اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے اول ایک مضمون بطور مقدمہ سمجھنا چاہئے اس کے بعد آیت کریمہ کا مضمون بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا دنیا میں جس قدر عقلاء ہیں کہ جن کے افعال کی

غایت ہوتی ہے ان میں ہر ایک شخص ایک شئے کا طالب ہے کوئی مال کا طالب کوئی جاہ کا کوئی صحت کا کسی کو درویشی مطلوب ہے کوئی علم کا دیوانہ ہے کسی کو تجارت میں لطف آ رہا ہے کوئی اولاد کی دھن میں ہے کوئی مکانات کی تعمیر کا شوق رکھتا ہے کسی کو باغ لگانے کی حرص ہے غرض کوئی ایسا نہیں جو طلب سے خالی ہو بعضے ان میں ہی خدا کے بھی طالب ہیں ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اشیائے متعددہ مختلفہ کے طالب ہیں لیکن اگر غور کیا جائے اور نظر کو عمیق کر کے دیکھا جائے تو فی الواقع ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شئے ہے۔

صرف اختلاف اس کے تعیین طرق میں ہے کسی نے سمجھا کہ وہ شئے تجارت سے حاصل ہوگی وہ تجارت میں مشغول ہو گیا کسی نے خیال کیا کہ علم سے اس کی تحصیل ہوگی وہ علم کا طالب بن گیا کسی نے اولاد میں اس مطلوب کو گمان کیا وہ اولاد کا شیفتہ ہو گیا آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کا مقصد جدا ہے اور تم کہتے ہو کہ سب کا ایک ہی مقصد ہے اختلاف طرق میں ہے اس لئے اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے ایک شخص کے پاس دس سائل آئے ایک نے روٹی طلب کی دوسرے نے چاول پختہ مانگے تیسرے نے پیسہ مانگا چوتھے نے روپیہ پانچویں نے غلہ چھٹے نے آٹا ساتویں نے کوڑیاں آٹھویں نے چنے بھنے ہوئے نویں نے کچے چاول دسویں نے حلوا پس اس مثال میں بظاہر مطلوب ہر ایک کا جدا ہے لیکن در حقیقت مقصود واحد ہے طرق مختلف ہیں مقصود پیٹ بھرنا ہے کسی نے سمجھا پکانے کا کوئی قصہ کرے اس نے پکی ہوئی روٹی مانگی کسی نے خیال کیا کہ کچی جنس ملے گی تو اپنی مرضی کے موافق پکا کر کھائیں گے کسی نے یوں ہوس کی کہ روپیہ پیسہ ملے گا تو جنس بھی اپنی خواہش کے موافق خرید کر پکائیں گے اس مثال سے آپ کو مختلفات کا جمع کرنا آسان ہو گیا ہوگا اسی طرح ان لوگوں کے مطلوب کو دیکھنا چاہئے کہ ان کا مقصود کیا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کو شی واحد مقصود ہے اور وہ لذت و راحت ہے طرق کا اختلاف ہے۔ کسی نے سمجھا کہ روپے حاصل ہونے میں مزہ ہے وہ اس کا طالب ہو گیا کسی نے سمجھا کہ جاہ میں مزہ ہے کسی نے اولاد میں کسی نے تجارت میں کسی کی سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مزے تو سب فانی ہیں مزہ اصلی تو آخرت میں ہے مگر حال سب کا ایک ہے کہ قلب کو چین ہو چنانچہ کلام اللہ کی ان آیات میں ان دونوں امروں کا فیصلہ فرما دیا کہ بطور حاصل ارشاد ہے کہ اے بندو تم جو اپنے مقصود یعنی راحت کو مختلف چیزوں میں ڈھونڈتے ہو کوئی مال میں راحت و لذت کا طالب ہے کوئی بیوی بچوں میں اپنے مطلوب کو تلاش کرتا ہے کوئی جاہ میں کوئی مکانات میں مشغول ہے۔

راحت حقیقی

ہم تم کو راحت حقیقی کی تحصیل کا طریقہ بتلاتے ہیں وہ یہ ہے **من عمل صالحا الخ** مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک کام کرتا ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو یعنی عقیدہ اس کا درست ہو ہم اس کو مزہ دار زندگی عطا

فرمادیں گے اور ہم ان کو جزادیں گے بسبب احسن ان اعمال کے جو کیا کرتے تھے اس ترجمہ سے دونوں امر تنقیح طلب جواوپر مذکور ہوئے معلوم ہو گئے یعنی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود معتبر کیا ہے اور اس کا طریق تحصیل کیا ہے مقصود دو چیزیں ہیں حیات طیبہ اور اجر اور اس کا طریق بھی دو چیزوں کا حاصل کرنا ہے عمل صالح اور عقائد صحیحہ۔

حیات طیبہ کا مصداق

بہرحال اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ ایک عالم اور ہے جس کا نام برزخ ہے کل تین عالم ہوئے عالم دنیا' عالم برزخ' عالم آخرۃ' اس میں اختلاف ہے کہ حیوۃ طیبہ سے مراد کون سی حیات ہے حیات برزخیہ یا حیات دنیویہ' میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہوں اور لنجزینھم کو آخرۃ کے ساتھ خاص کیا جاوے اس تقدیر پر حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کرے اور عقائد بھی اس کے صحیح ہوں اس کو ہم دنیا میں اور بعد مرنے کے برزخ میں مزہ دار زندگی عطا فرمادیں گے اور آخرۃ میں بعد قیامت کے ان کے نیک اعمال کی وجہ سے اجر کی جزادیں گے اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حیات طیبہ سے مراد حیات دنیویہ ہو اور برزخ اور آخرت لنجزینھم میں داخل ہو کیونکہ برزخ میں جو کچھ ہوگا وہ بھی جزاء ہوگا خلاصہ یہ کہ دو چیزوں کا وعدہ ہے اول حیات طیبہ دوسرے اجر کہ جو مکمل ہے حیات طیبہ کا۔

ان میں سے ایک شیٔ یعنی حیات طیبہ کو تو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں بلکہ مشاہدہ کرا سکتے ہیں دلیل تو یہ ہے کہ قاعدہ عقلی ہے کہ تجربے سے جب ایک شخص کا صدق ثابت ہو جائے تو اس کو ہر امر میں صادق مانا جائے گا ہر امر پر دلیل کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے گا جب کہ حق تعالیٰ کے اخبار کا صدہا ہزار ہا جگہ صدق ہم نے مشاہدہ کر لیا تو یہ خبر بھی بلا تامل صادق ہے مشاہدہ یہ کہ لوگ دو قسم کے ہیں مطیع اور غیر مطیع دیکھ لیجئے کہ ان میں سے راحت اور آرام میں کون ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ غیر مطیعین طالبین دنیا ہر وقت پریشانی میں ہیں کسی وقت ان کو چین نہیں بخلاف مطیعین کے کہ وہ جس حالت میں ہیں راحت میں ہیں شاید ہر شخص کہے کہ میں مطیع ہوں اس لئے کہ نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں بہت خوبصورت ہے کیونکہ اس کے رخسار ایسے ہیں سر ایسا ہے آنکھیں ایسی ہیں ایک شخص دور سے دیکھنے آوے دیکھا تو میاں نک کٹے ہیں تو ان کا سارا حسن و جمال اس ناک نہ ہونے سے کالعدم ہے اور عقلاء اس کو ہرگز حسین نہ سمجھیں گے ایسے ہی ہم لوگوں کا دین ہے کہ دو چار باتیں اسلام کی لے کر سمجھتے ہیں کہ ہم دین دار ہیں تو ایسے دین داروں کی نسبت یہ وعدہ نہیں ہے اگر کوئی پورا دین دار ہو ایمان اور عمل اس کا کامل ہو تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کو مزہ دار زندگی عطا ہوتی ہے بلکہ کامل الاطاعت کے پاس تک پریشانی نہیں آتی۔

حیات طیبہ سے مراد حیات ناسوتی نہیں

من عمل صالحا من ذکر او انثی فلنحیینه حیوٰة طیبة (جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو پس اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)

وہ حیوٰۃ ناسوتی مراد نہیں جو فنا سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ حیات ناسوتی ہر شخص کی طیبہ نہیں ہوتی بلکہ بعض کی حیات معیشت ضنک (یعنی تنگ زندگی) ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے گھر خیریت ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہا تم مجھے کوستے ہو خیریت ہوگی تمہارے یہاں کہ نہ کچھ آگے کو نہ پیچھے کو ہمارے یہاں خیریت کیوں ہوتی کہ ماشاء اللہ بیٹوں' پوتوں' بہو' بیٹیوں سے گھر بھرا ہوا ہے آج کسی کے سر میں درد ہے کسی کے پیٹ میں درد ہے کسی کو بخار آتا ہے کسی کو دست آ رہے ہیں کسی کے چوٹ لگ گئی ہے تو ہمارے یہاں جب اتنا کنبہ ہے وہاں خیریت کیوں ہونے لگی خیریت تم جیسے کے یہاں ہوگی جس کے اولاد نہ بنیاد سارے گھر منہمک ہوتے ہیں کہ ان کا مذاق بھی بدل جاتا ہے وہ ان تعلقات کو جو حقیقت میں عذاب میں راحت سمجھتے ہیں اور راحت کو کلفت چنانچہ اس شخص نے خیریت کے سوال کو کوسنا سمجھا اور صاف کہہ دیا کہ ہمارے یہاں اللہ نہ کرے جو خیریت ہو خیریت تمہارے یہاں ہوگی اہل دنیا قیود وعلائق میں خود پھنستے جاتے ہیں جس کے ساتھ خدا نے کوئی بھی قید اور تعلق نہ لگایا ہو وہ خود اپنے سر ہزار جھگڑے باندھ لیتا ہے وہی حال ہے ان کا غم نداری بز بخر (غم نہ رکھے تو بکری خرید) مگر اس وقت تو بوجہ مذاق بدل جانے کے ان کو ان تعلقات کی کلفت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا گو حقیقت اب بھی معلوم ہے ایسا بے حس کوئی نہیں ہوسکتا ہے جس کو کلفت کا کلفت ہونا بھی معلوم نہ ہو مگر چونکہ زیادت انہماک سے اب ان کی عادت ہوگئی ہے اس لئے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا (جیسے کسی شخص کے دو تین سال تک کھجلی رہے تو عادت کی وجہ سے اس کو کلفت کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ابتداء میں تھا اب اسے ہر وقت کھجلانے ہی میں مزا آتا ہے مگر حقیقت تو اسے بھی ضرور معلوم ہے۔۱۲ جامع)

علائق دنیا کی عبرت انگیز مثال

مگر جب اہل دنیا مرنے لگتے ہیں اس وقت حقائق پوری طرح منکشف ہوتی ہیں اور ان کا عذاب ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اس وقت تو وہ ان تعلقات سے خوش نظر آتے ہیں اور آزاد لوگوں پر ہنستے ہیں مگر جب پردہ اٹھے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ جن تعلقات سے ہم نے دل لگایا تھا وہ مار آستین تھے بس وہی قصہ ہوگا۔

که باکه باخته عشق درشب دیجور

(کس کے ساتھ محبت میں مشغول ہوا اندھیری رات میں)

کوئی شخص اندھیری رات میں کسی عورت سے مشغول ہوا اس وقت تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں حسین پری

پیکر کو بغل میں لئے ہوئے ہوں مگر جب صبح ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ ساری رات ایک بڑھیا چڑیل کے ساتھ مشغول رہا تھا اب اس کی حسرت قابل دید ہے کہ وہ اپنے اوپر ہزار نفریں کرتا ہے اور رات کے قصہ کو یاد کر کے اسے خود قے آتی ہے خوب کہا ہے۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار افرس تحت رجلک ام حمار

(غبار ہٹ جانے دو تم کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ایک شخص آندھی غبار میں گدھے پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں دوسرا شخص متنبہ کرتا ہے کہ کم بخت تو گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ گدھے پر سوار ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور ناصح کو بے وقوف بتلاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی تو یہی سمجھتا رہ ابھی غبار کھلنے پر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیری ران کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا اسی طرح جو لوگ تعلقات دنیا میں پھنس کر خوش ہیں اور ان کو راحت سمجھتے ہیں ان سے عارفین یہی کہتے ہیں **فسوف تری اذا انکشف الغبار** (غبار ہٹ جانے دو عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا) حق تعالیٰ اہل دنیا کے ان ہی تعلقات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

عذاب دنیا

فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم کفرون یعنی اے مخاطب تجھے ان منافقین کے اموال واولاد (اولاد دنیوی ترقی وعروج ۱۲) اچھے نہ معلوم ہونے چاہئیں کیونکہ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں (اور ان کی جان کفر کی حالت میں نکل جائے) واقعی اہل دنیا کے لئے تو مال واولاد عذاب ہی ہے کیونکہ ان کو ان چیزوں سے تعلق اس قدر ہوتا ہے کہ مارے فکر کے رات دن نیند نہیں آتی ہر وقت اسی توڑ جوڑ میں لگے رہتے ہیں کہ آج اتنے روپے ہیں کل کو اتنے ہو جائیں گے فلاں پر اتنا قرض ہے اس کا اتنا سود آئے گا رات کو سوتے ہیں تو روپیوں کے فکر سے بار بار آنکھ کھل جاتی ہے تو یہ خاک راحت ہے وبال جان ہے بعضوں کو اولاد سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے ان کے لئے کبھی زمین خریدتے ہیں کبھی باغ لگاتے ہیں کبھی جائیداد بڑھاتے ہیں جس میں سینکڑوں مقدمے کرنے پڑتے ہیں وصول باقی کے لئے رات دن نالشیں ہوتی ہیں گرمی اور برسات میں مصیبت کے ساتھ سفر کرتے ہیں پھر ذرا کسی بچہ کا کام گرم ہو گیا تو بھاگے بھاگے پھرتے ہیں نہ کھانے کے نہ پینے کے نہ نماز کے نہ روزہ کے ہر وقت فکر میں گھلے جاتے ہیں مسلمان کو تو خدا پر بھی نظر ہوتی ہے کافر تو ہر وقت بے چین رہتا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم اموال واولاد سے ان منافقین کو دنیا میں عذاب دینا چاہتے ہیں تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے اور یہ عذاب دنیا میں ہی ہوتا ہے آخرت کا عذاب الگ ہے۔

إِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

إِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: یقیناً اس کا قانون ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر دل سے بھروسہ رکھتے ہیں پس اس کا قابو تو صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر جو اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

اللہ والوں پر شیطان کا قابو نہیں

لیس له سلطان میں نکرہ تحت النفی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر نظر رکھنے والوں پر اسکا ذرا بھی قابو نہیں تم اس کو منہ لگا کر اس کا قبضہ اپنے اوپر بڑھاتے ہو۔

لغو باتیں

فرمایا کہ اسی طرح ایک اور قصہ مشہور ہے کہ ایک جاہل فقیر نے اپنے مرید کو یہ تعلیم کیا کہ یا شیطن یا شیطن کا وظیفہ پڑھا کرو اور چالیس دن تک اس کو پڑھو چنانچہ اس نے پڑھا جب چالیس روز پورے ہو گئے تو شیطان اس کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ کو کیوں پکارا کرتے ہو اس نے کہا کہ کل بتلاؤں گا اور اپنے پیر سے پوچھا کہ شیطان آیا تھا اب میں اس سے کیا کہوں پیر صاحب نے کہا کہ اول تو اس کو خدا کی قسم دینا اس کے بعد کہنا کہ نزع کے وقت میرے پاس نہ آنا چنانچہ اس مرید نے ایسا ہی کیا شیطان بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ خیر اب تو میں نے قسم کھالی ہے اس کے خلاف نہ کروں گا اور نزع کے وقت تمہارے پاس نہ آؤں گا وہ بہت خوش ہوئے کہ اب سلب ایمان کا خوف نہیں رہا مولانا نے فرمایا کہ یہ سب لغو باتیں ہیں اس واسطے کہ قرآن مجید میں ہے إِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ إِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ پس اگر کوئی شخص ایمان لائے اور توکل کرے اور شیطان کے ساتھ دوستی نہ کرے اس پر شیطان کا غلبہ ہرگز نہ ہوگا بس یہ ہے شیطان کے عدم تسلط کی تدبیر نہ یہ کہ اس کے نام کا وظیفہ پڑھ کر اس کو بلایا جائے اور پھر اس کو قسم دے کر اس پر بھروسہ کیا جائے جہل سے یہ سب مہملات پیدا ہوتے ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (النحل آیت ۱۱۲)

اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ امن واطمینان میں تھے۔

انعامات الٰہیہ کی ناشکری

ایک مرتبہ بمبئی میں وعظ کا اتفاق ہوا مجھ کو بڑا تردد ہوا کہ کیا بیان کروں اگر مسائل اختلافیہ بیان کرتا ہوں تو وحشت ہوگی متفق علیہ بیان کروں تو ان کو سب جانتے ہیں یعنی نماز روزہ وغیرہ تو ضرورت کا بیان کونسا کیا جاوے پھر سوچ کر میں نے آیت

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً

(اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیب بیان فرماتے ہیں کہ وہ امن واطمینان میں تھے)

پڑھ کر اس کا بیان کیا کہ اللہ نے آپ کو بہت نعمتیں دی ہیں مگر آپ ان کا شکر ادا نہیں کرتے یہ بیان کبھی ان کے بڑوں نے بھی نہ سنا ہوگا اس کو میں نے بہت اچھی طرح ثابت کیا میں نے بیان کرنے میں ایک شرط یہ بھی لگائی تھی کہ عوام الناس کو وعظ میں اجتماع نہ ہو ہاں جو عمائد اور خوش فہم ہوں ان کو بلایا جاوے اس لئے کہ بڑے درجہ کے لوگ خواہ وہ دوسرے ہی مذہب کے ہوں عالی حوصلہ ہوتے ہیں اگر ان کے خلاف بھی بیان کیا جاوے وہ ناگواری کا اثر نہیں لیتے اور عوام الناس جاہل اکثر مفسد ہوتے ہیں خصوص بمبئی کے عوام الناس تو نہایت ہی مفسد ہیں ایسی جگہوں میں بیان کر کے دل خوش نہیں ہوتا اگر سامعین خالی الذہن ہوں نہ اعتقاد ہو نہ عناد ہو تو بھی مضائقہ نہیں مگر وہاں تو کثرت سے معاندین ہیں۔ (الافاضات الیومیہ ج۵ ۱۷۵ تا ۱۸۱)

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ لَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾ وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: آپ ﷺ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور اگر بحث آن پڑے تو ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے (کہ اس میں شدت وخشونت نہ ہو) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہوا ہے اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے اور اگر صبر کرو گے تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہوں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیز گار ہوتے ہیں۔

تفسیری نکات

آداب تبلیغ

اس میں پورے آداب تبلیغ کے مذکور ہیں حق تعالیٰ نے اس میں شرائط وآداب تبلیغ کو مفصل طور پر بیان فرما دیا ہے چنانچہ اول تو امر ہے اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ سبحان اللہ کیا فصاحت ہے ایک ہی آیت میں سب فرقوں کی اصلاح فرماتے ہیں چنانچہ بعض تو وہ لوگ ہیں کہ دعوت کو ضروری نہیں سمجھتے اور بعض وہ ہیں کہ ضروری تو سمجھتے ہیں مگر جنگ وجدال کرنے لگتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کی اصلاح فرمائی ہے کہ دعوت تو کرنا چاہئے وہ تو ضروری ہے اس میں فرقہ اول کی اصلاح ہوگئی آگے فرماتے ہیں

کہ دعوت تو ہو مگر ایک خاص طریقہ سے آگے وہ طریقہ بتلاتے ہیں کہ طریقہ دعوت کا یہ ہے کہ حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ' نرمی سے سمجھاتے رہو' یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا امر فرمایا ہے ایک حکمت دوسرے موعظت حسنہ۔

موعظہ حسنہ کا مفہوم

اول یہ سمجھو کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے سو حکمت تو کہتے ہیں علم کو اور موعظت حسنہ کہتے ہیں ترغیب و ترہیب وترقیق قلب کو یعنی ان کو علمی مضامین سے بلاؤ مضامین علمیہ ان کے کانوں میں ڈالتے جاؤ اور ان مضامین کو ترغیب وترہیب سے مؤثر بناؤ اسی کو فرماتے ہیں کہ حکمت وموعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ اور یہ حکمت مقابل ہے مناظرہ وجدال کا گو وہ بھی علمی مباحث سے ہوتا ہے مگر وہ حکمت نہیں بلکہ حکمت اثبات مدعا کا نام ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک تو ہوتا ہے اثبات مدعا اور ایک جواب ہوتا ہے نقیض مدعا کا' یعنی ایک تو ہے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا دوسرے معترض کے اعتراض کا جواب دینا اس کے خدشات کو دفع کرنا تو حکمت تو اثبات مدعا ہے اور جواب دینا نقیض مدعا کا یہ جدال ہے تو اصل مفید چیز تو دعوت کرنا ہے حکمت کے ساتھ لیکن اس میں اگر کبھی جدال واقع ہو جاوے تو اس کے بھی خاص طریقے ہیں سو آگے ان طریقوں سے خصم کے اعتراض دفع کرنے کی تاکید ہے غرض دعوت الی الاسلام کے لئے حکمت تو لازم ہے بلا حکمت کے دعوت ہوتی ہی نہیں باقی جدال لازم نہیں یہ ضروری نہیں کہ جہاں دعوت ہو وہاں جدال بھی ہو تو مطلب یہ ہے کہ دعوت میں مضامین علمی بیان کرو فوائد علمیہ سناتے جاؤ اپنے دعوے کو دلائل علمیہ وعقلیہ سے ثابت کرو اس کی خوبی اس کے محاسن بیان کرو لیکن اگر اس میں کوئی دوسرا اعتراض کرے کوئی نقص وارد کرے تو اس وقت ضرورت ہوگی مباحثہ کی تو اس وقت مباحثہ کرو مگر احسن طریقہ سے اسی کو فرماتے ہیں وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی اس طرح جواب دو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو' لعن وطعن نہ ہو' خشونت نہ ہو کسی پر طعن نہ کرو' کسی کو ملامت نہ کرو کسی کی ہجو نہ ہو' ایسے مباحثہ حسنہ سے مخاطب کو رنج وملال نہ ہوگا بلکہ وہ اثر پذیر ہوگا یعنی مضامین کے بیان میں کبھی خشونت ہو جاتی ہے کبھی غصہ اور تیزی کے لہجہ سے بیان کیا جاتا ہے اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ ایسے طرق اختیار نہ کرو جس سے مخاطب بھڑک اٹھے اس کے بدن میں آگ لگ جائے سو ایک تقریر تو مقام کی یہ ہوئی۔

دوسری تقریر یہ ہے کہ موعظت بھی ایک مستقل طریق ہے تو اس وقت حاصل مقام کا یہ ہوگا کہ اگر مخاطب میں علمی قابلیت دیکھو اس کے اندر سمجھ کا مادہ ہو تو وہاں حکمت کے ساتھ بلاؤ اس کو مضامین علمیہ سناؤ اور اگر استعداد علمی نہ ہو تو موعظت سے کام لو کیونکہ وعظ کے لئے چنداں ذہین فہیم ہونے کی ضرورت نہیں وعظ کا اکثر مضمون عام فہم ہوتا ہے کیونکہ موعظہ حسنہ اس کو کہتے ہیں جس سے قلب میں نرمی پیدا ہو رقت طاری ہو تو معنی یہ ہوئے کہ جنت کی ترغیب دو دوزخ سے ترہیب کرو نعمائے جنت وآسائش وراحت بہشت کو بیان کرو اس سے رغبت پیدا ہوگی اور دوزخ کے درکات اور تکالیف وعذاب سے ڈراتے رہو اور اس کے بعد بھی اگر کوئی شبہ کرے تو اس

کے لئے حکم ہے وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کہ ان سے مجادلہ کرو احسن طریقہ سے جس کی تفسیر اوپر گزر چکی۔

آگے اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ الخ بڑھا کر مجموعہ میں ایک باریک بات بتلادی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ طرز تعلیم فرمایا ہے کہ ان کو حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ یعنی نرمی سے سمجھاؤ کوئی خشونت نہ ہو درشتی نہ ہو ظاہر ہے کہ یہ طرز وہی اختیار کر سکتا ہے جس کے اندر شفقت ہو اگر وہ شفیق نہیں تو اس کو منت سماجت کی کیا پڑی؟ دیکھو جب استاد شفیق ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ پڑھ لے طرح طرح سے اس کو سمجھاتا ہے کبھی پیسہ دیتا ہے کبھی مٹھائی کھلاتا ہے پیار کرتا ہے چمکارتا ہے کہ میاں تمہارا ہی فائدہ ہے سبق پڑھو دیکھو اگر پڑھ گئے تو درجات ملیں گے تو اس طریق کی تعلیم فرمانا گویا شفقت کا حکم فرمانا ہے مگر اس حکم شفقت میں ایک اشکال بھی تھا وہ یہ کہ شفقت کی وجہ سے جس طرح ابتدائے تعلیم میں نرمی اختیار کرتا ہے ایسے ہی انتہا میں ناکامی سے رنج بھی زیادہ ہوتا ہے چنانچہ اگر کسی بچہ کے ساتھ محنت اور جان کاہی کی جاوے اور پھر بھی ناکامی ہو تو بڑا رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہماری ساری محنت برباد گئی خاک ہی میں مل گئی پھر رنجیدہ ہو کر کام سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اس لئے اس اشکال کے عمل علاج کے لئے آگے اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ میں اس شفقت کو اعتدال پر لانے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔

شفقت کو اعتدال پر لانے کا طریقہ

اور وہ طریقہ ایک مراقبہ ہے واقعی اخلاق کی میزان سوائے خدا کے کسی نے نہیں بتائی ان کی تعلیم میں افراط تفریط نہیں ہے بالکل اعتدال ہی اعتدال ہے کیونکہ افراط بھی مضر ہے اور تفریط بھی چنانچہ اگر حد سے زیادہ شفقت ہو تو یہ بھی مضر' کیونکہ اس سے آخر کو بددل ہو جاوے گا اور کام بھی چھوڑ بیٹھے گا اور اگر تفریط ہے یہ بھی مضر کیونکہ شفقت کی تعلیم کا اور اثر ہوتا ہے اور بے شفقت کا اور اثر' تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اس کی ایک میزان بتا دی تاکہ کسی جانب میں کمی بیشی نہ ہو' دونوں پہلو برابر رہیں چنانچہ اول فرماتے ہیں اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اس میں تو شفقت کے ساتھ تعلیم کا امر ہے کیونکہ اگر ابتداء میں شفقت نہ ہو تو ایسی تعلیم کم نفع دے گی اور اس کے بعد افراط فی الشفقت کی ممانعت ہے اس کے لئے یہ مراقبہ بتلاتے ہیں کہ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ لاتحزن علیهم ان لم یومنوا یعنی آپ کا فرض منصبی تو دعوت کرنا ہے وہ آپ نے کر دی اب اگر وہ ایمان نہیں لاتے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تو آپ غمگین نہ ہوں کیونکہ ایمان لانا یا نہ لانا یہ تو خدا کے قبضہ قدرت میں ہے آپ کے اختیار میں نہیں پھر آپ غمگین کیوں ہیں؟

اس مضمون کے استحضار سے غلو فی الشفقت نہ ہوگا جو کہ مضر ہے اور اس کے مضر ہونے کا ایک راز ہے وہ یہ کہ شفقت سے حزن ہوگا اور حزن کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے قلب ضعیف ہو جاتا ہے اور بددل ہو کر آدمی کام

چھوڑ دیتا ہے کہ اتنا تو سر مارا اور پھر بھی نا کامی ہوئی چھوڑو اور اس قصہ ہی کو الگ کرو اس سے کیا فائدہ؟ تو شدت شفقت کی وجہ سے یہ بات ہوگی اور اس سے سلسلہ تبلیغ کا بند ہو جائے گا اس لئے غلو کا بھی علاج کر دیا خلاصہ یہ کہ مسلم کی تبلیغ کا کام شفقت سے ہوتا ہے مگر شفقت سے تبلیغ صرف تکمیل ہوتی ہے یہ خود بنفسہ مقصود نہیں

اصل مقصود تبلیغ ہے

بلکہ اصل مقصود تبلیغ ہے۔ اگر شفقت سے تبلیغ ہی جاتی رہے تو شفقت کی ایسی تیسی ایسی شفقت سے کیا فائدہ؟ کیا اس کو لے کر چاٹیں گے اس کے بعد اس میں ایک اور شبہ رہا وہ یہ کہ ساری دنیا تو مہذب نہیں جو اس طریق کو مان لیں دنیا میں سب قسم کے لوگ ہیں اگر مبلغ سے کوئی لڑنے لگے مار پٹائی ہونے لگے تو کیا کریں؟ اس کے لئے فرماتے ہیں وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ سبحان اللہ دیکھئے اس میں کیسی بلاغت ہے کہ حضور ﷺ کو مخاطب نہیں بنایا جس میں بتلا دیا کہ آپ کو تو تبلیغ میں اس کی نوبت ہی نہ آوے گی کہ آپ سے تبلیغ میں کوئی لڑے جھگڑے یا آپ اس کا بدلہ لیں آپ ﷺ کے ساتھ حق تعالیٰ کی اعانت خاصہ ہے ہاں اگر تابعین اور ان کے خدام ان کے غلاموں کو یہ بات پیش آ جاوے تو ممکن ہے اس لئے تمہیں مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ جتنی تکلیف کسی سے تمہیں ہوئی ہو اتنی ہی اس کو دیجیو' زیادتی نہ کرنا' وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ سبحان اللہ واقعی یہ خدا کا کلام ہے۔ اگر مخلوق کا کلام ہوتا تو وہ صبر کو مقدم کرتا اور معاقبہ کو موخر کرتا مگر خدا تعالیٰ نے صبر کو مقدم نہ کیا اس میں بندہ کی حاجت کی رعایت ہے کیونکہ بشریت کا خاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی غصہ میں بھڑک رہا ہو اس وقت اس کی موافقت کرنے سے غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور مخالفت کی جائے تو وہ اور زیادہ گرم ہو جاتا ہے بالکل آگ ہو جاتا ہے مثلاً کسی کو آپ نے لڑتے دیکھا اور اس سے کہا کہ تو بھی اس کے چار دھول لگا دے یہ کہتے ہی وہ ٹھنڈ ہو جائے گا اور اگر تم نے یوں کہا کہ کیا نا معقول حرکت ہے کیوں لڑ رہے ہو صبر وتحمل سے رہنا چاہئے تو وہ ایک تو اس پر دانت پیس رہا تھا اب آپ کی طرف بھی گھورنے لگے گا۔ کہ سبحان اللہ کچھ سمجھے نہ سمجھائے یوں یہ صبر وتحمل کی ہانکنے لگے تو اللہ میاں ۔نے مخاطب کی رعایت کی کہ اگر کوئی تم سے لڑے بھڑے تو تم بھی اس کے چار جوتے لگا دو اب یہ سن کر جب ذرا جی ٹھنڈا ہو گیا تو آگے فرماتے ہیں کہ اگر صبر کرو تو وہ بہت ہی اچھا ہے پھر آگے حضور ﷺ کو خاص طور پر صبر کا خطاب ہے وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ کہ آپ تو بالضرور صبر کریں یہ اور صبر ہے جس کا حضور ﷺ سے خطاب ہو رہا ہے اور اس سے پہلے وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ میں اور صبر مراد تھا یعنی آپ ﷺ کو جو رنج ہوتا تھا ان کے برا بھلا کہنے سے واصبر میں تو اس پر صبر کرنا مراد ہے ولئن صبرتم میں لڑائی بھڑائی نہ کرنا اور بدلہ نہ

لینا مراد ہے اور اس واصبر کے بڑھانے میں کیا دوسرا نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ مسلمانو سمجھو صبر جس کے لئے تم کو مشورہ دیا گیا ہے ولئن صبرتم میں یہ وہ چیز ہے کہ حضور ﷺ کو بھی باوجودیکہ آپ ﷺ اعلیٰ درجے کے اخلاق پر ہیں اس کا حکم ہوا کہ صبر کیجئے پھر تم کس شمار میں ہو؟ تو اس سے مخاطبین کو صبر سہل ہو جائے گا۔ اس سے آگے ایک اور مرض کا علاج فرماتے ہیں وہ مرض یہ ہے کہ صبر سے دعویٰ پیدا نہ ہو جائے کہ صابر ہیں کہ ہم نے ایسے موقع پر صبر کیا ہم بڑے کامل ہیں اس طرح ازالہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللهِ جس میں آپ ﷺ کے خادموں کو سنانا ہے کہ میاں کیا دعویٰ کر سکتے ہو تم بے چارے کیا چیز ہو خود رسول کا صبر بھی جب واقع ہو گا وہ بھی خدا ہی کی توفیق سے ہو گا پھر تمہارا ان کے سامنے دعویٰ کرنے کا کیا منہ ہے؟ تم ہو کیا چیز ان کے کمال کے سامنے تمہارا کمال معدوم ہے ان کے صبر کے مقابلہ میں تمہارا صبر کچھ حقیقت نہیں رکھتا جب ان کا صبر بھی بغیر توفیق مولیٰ نہیں ہو سکتا پھر تم کیا دعویٰ کر سکتے ہو؟

آگے فرماتے ہیں وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ اگر ناکامی ہو تو دل میں تنگی نہ ہونا چاہئے آگے اس تنگی کو رفع کرنے کے لئے مراقبہ بتلاتے ہیں اگر یہ مراقبہ پیش نظر رہے تو کبھی تنگی نہ ہو گی' پس فرماتے ہیں إِنَّ اللهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ یعنی یہ سوچو کہ مقصود تبلیغ سے کیا ہے کیا دوسروں کو خاص مسلمان بنانا مقصود ہے اگر کسی کو یہ مقصود ہو گا تو اگر ایک بھی کافر رہے گا تو رنج ہو گا پس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تبلیغ سے خاص یہ مقصود نہیں کہ آپ ﷺ کی حسب دلخواہ مراد پوری ہو جایا کرے کہ سب کے سب ولی اور ابدال بن جاویں بلکہ مقصود تبلیغ سے خدا تعالیٰ کا قرب اور معیت حاصل کرنا ہے اگر وہ تم کو حاصل ہو جاوے تو خواہ ساری عمر میں ایک بھی مسلمان نہ ہو ایک جگہ بھی کامیابی نہ ہو کچھ حرج نہیں اور اگر یہ نہیں تو ساری دنیا کی اصلاح سے تمہارا کیا نفع ہوا اس کو فرماتے ہیں إِنَّ اللهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ یعنی اللہ تعالیٰ تو متقین اور محسنین کے ساتھ ہے اگر تقویٰ اور احسان حاصل ہے چنانچہ تبلیغ کی بجا آوری سے یہ حاصل ہو گیا تو معیت خدا نصیب ہو گئی اور یہی کافی ہے اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں اب خواہ کوئی بگڑے یا سنورے تم کو اس کی پرواہ نہیں ہونا چاہئے فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَّمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ یہ احکام ہیں اسلام کے اور یہ آداب ہیں تبلیغ کے صاحبو' افسوس ہے کہ عرصہ سے ہم اتنی بڑی چیزوں کو چھوڑ بیٹھے ہیں کہ نہ اپنے اسلام کی تکمیل کی فکر ہے نہ دوسروں تک تبلیغ اسلام کی فکر ہے لوگ چونکہ اس سے غافل ہیں اس لئے اس وقت اس کے متعلق بیان کیا گیا کیونکہ حلوا نہ تنہا بباید خورد' پس اب اپنی بھی تکمیل کرو اور تبلیغ بھی کرو اور اس طرح کرو جیسے قرآن میں ہے نومسلموں اور کافروں کو نرمی سے سمجھاؤ کسی سے لڑو بھڑو مت' مناظرہ مروجہ مت کرو کہ یہ آداب تبلیغ کے خلاف ہے اور اس سے نفع بھی نہیں ہوتا تجربہ ہو چکا ہے حتیٰ کہ اس کا غیر قوموں نے بھی تجربہ کر لیا ہے وہ بھی اب مناظروں سے کنارہ کش ہونے لگے

بس اسلامی مضامین کان میں ڈالے جاؤ بار بار اسلام کی خوبیاں سناتے رہو یہی طرز قرآن کا ہے چنانچہ جا بجا فرماتے ہیں صرفنا الایات صرفنا فی ھذا القرآن وامثالھما یعنی بار بار مضامین کو دھراتے ہیں اگر ہم لوگ اس طرز کو اختیار کریں یعنی وقتاً فوقتاً احکام پہنچاتے رہیں تو ان شاء اللہ بہت نفع ہو اور اگر نفع نہ بھی ہو ہمارا کیا بگڑا ہم نے تو اپنا فرض اتار دیا جو کام ہمارے ذمہ تھا وہ ادا کر دیا اب نفع ہو یا نہ ہو وہ جانیں اور ان کا کام۔

ترجمہ: آپ ﷺ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور اگر بحث آن پڑے) تو ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے (کہ اس میں شدت وخشونت نہ ہو) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہو اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

گو یہاں ادع کا خطاب حضور ﷺ کو ہے مگر حکم میں حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین سب اس کے مخاطب ہیں ہاں حضور ﷺ کو خطاب اولاً ہے اور دوسروں کو ثانیاً۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ یعنی حکمت سے بلائیے معلوم ہوا کہ اس میں حکمت کی ضرورت ہے ورنہ مطلق فرماتے بالحکمۃ نہ فرماتے' بہرحال اس کے شرائط ضرور ہیں مگر وہ اسی کے لئے ہیں جو کام کرنے کا قصد کرے اور وہ تین چیزیں ہیں دعوت بالحکمۃ دعوت بالموعظۃ الحسنۃ اور مجادلہ

دعوت کی تین قسمیں

یعنی ایک قسم تو دعوت کی یہ ہے کہ حکمت کے ساتھ کی جائے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ موعظۃ حسنۃ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ حسنہ کیا جائے۔ اس کی توجیہ مختلف ہو سکتی ہے جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں جب کسی کو سبیل رب کی طرف دعوت ہو گی تو اس میں ایک تو دعویٰ خاص داعی کا مطلب ہو گا اور ایک اس کی نقیض ہو گی جو کہ مذہب مخالف کا ہے پھر گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک اپنے دعویٰ کا اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کا ابطال تو حکمت یہ ہے کہ اپنے دعویٰ پر علمی دلائل قائم کئے جاویں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعی کو باطل کیا جاوے اصلی مقصود تو یہ دونوں ہیں باقی تیسری ایک چیز اور ہے وہ موعظۃ حسنۃ

چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لئے موعظۃ حسنۃ بھی ایک ایک طریق بتلا دیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پری کر دیتا ہے دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے۔ مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے صرف حکم کا پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے اب تم مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس

بات کو مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوالوں اس لئے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں پھر حضور ﷺ جیسا کوئی خیر خواہ نہیں تو محض شفقت ہی کے مقتضا سے اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور ﷺ کو اور ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو جس کی حقیقت تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ حکمت سے جب علمی دلائل مراد ہیں تو موعظ حسنہ سے دلائل کے علاوہ کچھ اور مراد ہوگا سو وہ ایسے مضامین مؤثرہ ہیں جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو دل پگھل جاوے اور ان مضامین مرقعہ کا مصداق ترغیب وترہیب ہے کہ درجات جنت کی ترغیب اور درکات جہنم سے ترہیب کرنا ونحو ذلک غرض اصل مقصود تو احکام کا سنانا ہے خواہ اصل ہوں یا فروع

باقی ایک درجہ مخاطب کے متاثر کرنے کے لئے ترغیب وترہیب کا بھی ہے گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے مثلاً جنت اور دوزخ کا مضمون عقیدہ کے درجہ میں تو احکام ہی میں داخل ہے اور اصول میں ہے مگر دوسری حیثیت سے ترغیب وترہیب ہے یعنی جہاں احکام سنانا اور جنت و دوزخ کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو صرف ترقیق قلب مقصود ہو وہاں ترغیب وترہیب ہے۔ مثلاً کسی کو کہا کہ اگر نماز پڑھو گے تو ایسی جنت ملے گی جس کی یہ شان ہے یہ حالات ہیں اس کے اندر ایسی ایسی آسائشیں ہیں اور اگر نہیں پڑھو گے تو دوزخ میں جاؤ گے جس کے یہ واقعات ہیں تو یہ مضمون ترغیب وترہیب کی حیثیت سے محض مرقق ہے قلب کا' اس سے مخاطب کے قلب میں صلاحیت احکام قبول کی پیدا ہوگی پھر عمل کرنے کی توفیق ہوگی کیونکہ عمل اول اول تکلف سے ہوتا ہے کیوں کہ طبیعت کے خلاف کام ہے اس واسطے کوئی امر آمادہ کرنے والا اور ابھارنے والا ہونا چاہئے طبیعت کے خلاف دنیا کا کوئی کام بھی بلا طمع یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا پھر عادت ہو جاتی ہے تو ترغیب و ترہیب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اس لئے ترغیب کی بھی ضرورت ہوئی اور ترہیب کی بھی شفیق کی تعلیم ایسی ہی ہوتی ہے مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی مضر سے روکتا ہے تو اتنا کہہ دینا کہ یہ چیز مت کھانا' حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے مگر باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ شفقت کیوجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے دست آور ہے اسے مت کھانا' یہ پیٹ میں درد پیدا کردے گی اس کے کھانے سے پھنسیاں نکل آئیں گی تو اتنا لگنا لپٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لوگے تو تم کو یہ دوں گا۔

خود میرا ایک واقعہ ہے بچپن میں ایک دفعہ بیمار ہوا تو حکیم صاحب نے مسہل تجویز کیا مگر میں پیتا نہ تھا تو

والد صاحب نے کہا اگر دوا پی لو گے تو تم کو ایک روپیہ دوں گا بس روپے کے لالچ میں پی گیا تو اس واسطے ضرورت ہے ترغیب وترہیب کی کیونکہ ایسے آدمی بہت کم نکلیں گے جو بالا ترغیب وترہیب کے امتثال امر کر لیں گو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا ترغیب وترغیب کے بھی کر لیتے ہیں جیسے ایک صحابی کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا لو لم یخف اللہ لم یعص' کہ اگر اس کے دل میں خوف خدا بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتا تو بعض کو تو فطری طور پر خدا سے تعلق ہوتا ہے مگر اکثر تو خوف ہی سے کچھ رکتے ہیں پھر وہ درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے لیکن اول ہی سے ایسے کم ہوتے ہیں مثلاً بچہ پہلے پہلے مار دھاڑ سے پڑھتا ہے اور پھر تو اگر سبق کے لئے اپنے پاس سے بھی خرچ کرنا پڑے جب بھی نہ چھوڑے تو اس لئے ترغیب وترہیب کی ضرورت ہے یہ موعظۃ حسنۃ ہے

سبحان اللہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی شفقت ہے کہ حضور ﷺ کو اور امت کو یہ ترکیب بتلائی کہ آپ اس طریقہ سے کام کیجئے کس قدر رحمت ہے کہ دشوار عمل کو کس طرح آسان کر دیا۔

رعایت مخالف

اس کے بعد ارشاد ہے جادلھم یعنی ان سے مجادلہ کیجئے اس میں دو احتمال تھے ایک مجادلہ حسنہ کا ایک سیئہ کا اس لئے احسن کی قید لگا دی اور مجادلہ سیئہ سے ممانعت کر دی رہا یہ کہ مجادلہ میں تو احسن کی قید لگائی اور حکمت کے ساتھ حسنہ کی قید کیوں نہیں لگائی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر حسنہ کا احتمال ہی نہیں کیوں کہ اپنے دعوے کی دلیل بیان کرنے میں کسی کو ناگواری نہیں ہوتی اور دوسرے کے دعویٰ کو رد کرنے میں اسے کبھی انقباض ہوتا ہے اس لئے وہاں قید نہیں لگائی اور یہاں قید لگائی کہ رد اگر ہو احسن طریقہ سے ہو جس سے کسی کو رنج اور کلفت نہ ہو سبحان اللہ کس قدر شفقت ہے عباد پر کہ مخالف کی اتنی رعایت کہ اس کا رد اگر ہو ایسے طریقہ سے ہو کہ اس پر حقیقت تو منکشف ہو جائے مگر برا بھلا کسی کو نہ کہا جائے۔

اور میں نے جو رد میں یہ قید لگائی کہ حقیقت ظاہر ہو جائے یہ اس لئے ہے کہ بعض دفعہ جواب ایسا گول مول ہوتا ہے کہ خصم پر حقیقت بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے اس لئے چاہئے کہ کہے تو صاف صاف مگر احسن طریقہ سے چنانچہ فاصدع بما تومر کا یہی مطلب ہے کہ کھول کے صاف صاف بیان کرو ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی جو شخص گول مول بات کرتا ہے اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے مگر اس کا اثر برا ہوتا ہے۔ کہ مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ بات صاف ہو مگر الفاظ سخت نہ ہوں۔

قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کا یہی مطلب ہے کہ سخت الفاظ سے بچو

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ یعنی تبلیغ کر کے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے یہ بھی ایک درجہ ربط ہے ماقبل کو مابعد سے تو گویا اس مقام

میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے اس کے تدارک کے لئے فرمایا ادع الی سبیل ربک اور ایک افراط فی التبلیغ سے اس کے تدارک کے لئے فرمایا ان ربک ھو اعلم

غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہو جاتا ہے کبھی تفریط یہ دونوں مضر ہیں اور حضور ﷺ میں شفقت کی کمی کا تو احتمال نہ تھا یہ تو مجموعی انتظام ہم لوگوں کے لئے فرمایا کہ تبلیغ میں افراط کرنا نہ تفریط

طریق تبلیغ

اس کام کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ سبحان اللہ کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی ولطافت سے اللہ کی سبیل کی طرف بلاؤ اور راہ راست پر لاؤ' یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے یا مکاتب ومدارس کے ذریعہ سے ہونا چاہئے یعنی مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جا کر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب ومدارس وہاں پر قائم کر دیئے جائیں ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہوا اسے اختیار کرنا چاہئے بس یہ تو ہمارا کام ہے۔اسے پورا کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کردو۔

پس سنئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی کی حالت کے متعلق دوارشاد ہیں قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے خوش ہونا چاہئے) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہئے۔

اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین (بہت مت خوش ہو خدا پسند نہیں کرتا' زیادہ خوش ہونے والوں کو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نہ ہونا چاہئے پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر دراصل اس میں تعارض نہیں بلکہ یہ دو حالتیں جدا جدا ہیں جن کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔

ایک خوشی اضطراری ہے جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپے یا اشرفیوں کی کوئی جس سے آپ بہت پریشان ہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ دفعۃً کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی ایک خوشی تو اس وقت ہے یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہوگی۔

ایک صورت ہے کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پیٹا' اب خدا جانے وہ ان کو ملی یا نہیں مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لا کر دے دی ایک خوشی اس پر ہے یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی وہ اترانے کی نہ ہوگی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز وتکبر کی ہوگی کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی ورنہ ہمیانی کیسے ملتی تو ان دونوں میں پہلی خوشی محمود ہے اور دوسری مذموم اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا مضائقہ نہیں باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا کہ ہم نے یوں کیا تو اچھا اثر ہوا یہ

مذموم ہے بہر حال ہم کو کوشش کرنی چاہئے اور نتیجہ خدا کے سپرد کرنا چاہئے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہئے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہئے کام شروع کردو اس کے سب راستے خود کھل جائیں گے۔ بقول مولانا رومی

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگر چہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا یعنی کوشش تو کرنی چاہئے۔)

بس ہمیں تو یہ طریقہ بتلایا گیا ہے اور وہی ہم کو اختیار کرنا چاہئے یعنی

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

حکم عام

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ میں عام حکم دے دیا ہے اور یہاں جو بظاہر خطاب حضور کو ہے تو مقصود خاص حضور ہی کو خطاب کرنا نہیں ہے بلکہ عام ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ کہ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت کرتے ہیں اس تفسیر پر انا ضمیر ادعو کی تاکید ہے اور من اتبعنی اس پر معطوف اور گو علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے متبعین بھی اس صورت میں یہ مستقل جملہ ہوگا یعنی علی بصیرۃ خبر مقدم اور انا مع اپنے معطوف کے متبداء مؤخر اور ادعو کا معمول نہ ہوگا مگر چونکہ دوسری نصوص میں وعید عدم دعوت کی عام ہے چنانچہ ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان کو عتاب عام کرے گا اور آپ نے استشہاد کے لئے یہ آیت پڑھی وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۔

تو اس کے انضمام سے معلوم ہوا کہ امت کا ہر فرد بھی وجوب دعوت کے حکم میں داخل ہے

تفریط فی التبلیغ کا تدارک

اللہ تعالیٰ اس آیت میں جادلھم کے بعد اس ضرر کا تدارک کیا عجیب فرماتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ یعنی تبلیغ کر کے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے یہ بھی ایک درجہ ربط ہے ماقبل کو مابعد سے اور ممکن ہے

اور کوئی وجہ ربط اس سے بھی عمدہ کسی کی سمجھ میں آ جاوے تو گویا اس مقام میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے اس کے تدارک کے لئے فرمایا ادع الی سبیل ربک الایۃ اور ایک افراط فی التبلیغ سے اس کی ممانعت اس جزو میں مذکور ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہو جاتا ہے کبھی تفریط' یہ دونوں مضر ہیں اور حضور ﷺ میں شفقت کی کمی کا تو احتمال ہی نہ تھا یہ تو مجموعی انتظام ہم لوگوں کے واسطے فرمایا گیا ہے کہ تبلیغ میں نہ افراط کرو نہ تفریط چنانچہ اول میں تفریط کا انسداد ہے اور آخر میں افراط کا جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک درجہ تبلیغ کا یہ بھی ہے آخر میں ناکامیابی سے اتنا غم سوار ہوتا ہے کہ یا اس کی نوبت آ جاتی ہے اس کے بعد تعطل ہو جاتا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ کو اس سے کیا بحث ثمرہ ہو یا نہ ہو آپ اپنا کام کئے جایئے ثمرات کا مرتب کرنا ہمارا کام ہے ہم جانتے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت میں ہے۔

ایک اور جگہ لطیف عنوان سے اسکو بیان فرمایا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ.

جن کے اندر شفقت ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مخاطب کے عدم تاثیر سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے سو نفس حزن کی ممانعت نہیں وہ تو طبعی اور غیر اختیاری ہے اس میں انسان مجبور ہے بلکہ ممانعت اس کی ہے جو حد ضیق تک پہنچے اس لئے فرماتے ہیں

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

آپ کو اس سے کیا کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا اس کو اللہ جانتا ہے آپ اس کی فکر نہ کیجئے اس کو خدا کے سپرد کر دیجئے اور جہاں اتنی شفقت نہ ہوا اور اس لئے تیز لہجہ اور سختی سے تبلیغ کرنے لگیں اس کی بھی ممانعت فرما دی ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِىْ يَقُوْلُوا الَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ؕ غرض ایک ہی مقام کی آیتیں افراط تفریط دونوں کی ممانعت کے لئے کافی ہو گئیں امید ہے کہ اب بقدر ضرورت یہاں کافی ہو گیا ہے۔

اسباب حزن کی ممانعت

حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو غم سے منع فرمایا ہے وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ.

کہ آپ کفار کو تبلیغ احکام کیجئے اور ان کے اعراض سے مغموم نہ ہو جایئے حالانکہ آپ کا حزن شفقت کی وجہ سے تھا اور شفقت سے تبلیغ زیادہ ہوتی ہے تو ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ یہاں حضور ﷺ کو تبلیغ کی زیادت سے روکا گیا ہے لیکن حقیقت میں زیادت سے نہیں روکا گیا بلکہ اس کی تقلیل سے منع کیا گیا ہے کیونکہ غم سے طبیعت پژمردہ ہو جاتی ہے اور اس سے تعطل ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تبلیغ کے وقت خود نفس تبلیغ کو مطلوب

سمجھئے ترتب ثمرات کو مقصود نہ سمجھئے کیونکہ جو شخص ثمرات کو مقصود سمجھ کر عمل کریگا اس کو عدم ترتب ثمرہ سے رنج و غم ہو گا اور حزن و غم کی خاصیت ہے کہ اس سے طبیعت شکستہ پژمردہ ہو جاتی ہے پھر کام نہیں ہوتا

اب بتلاؤ یہاں زیادت تبلیغ سے کیا گیا ہے یا اس کی تقلیل سے روکا گیا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص خود عمل کو مقصود سمجھے گا اور ثمرہ پر نظر نہ کریگا وہ اس شخص سے زیادہ کام کرے گا جو ثمرہ پر نظر کر کے کام کرتا ہے کیونکہ یہ دوسرا شخص جب ثمرہ مرتب ہوتا نہ دیکھے گا عمل میں کوتاہی کر دیگا بخلاف پہلے شخص کے کہ وہ ہر حال میں برابر کام کرتا رہے گا کیونکہ اس کا مقصود عمل ہی ہے اور وہ راہ وقت حاصل ہے کیونکہ اپنے اختیار میں ہے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو امر غیر اختیاری پر نظر کرنے سے منع کیا ہے کہ جو کام آپ کے اختیار میں ہے یعنی تبلیغ آپ اس میں مشغول رہیں اور اسی کو مقصود سمجھیں اور جو آپ کے اختیار میں نہیں یعنی (ترتب ثمرہ) اس پر التفات نہ کریں بلکہ اس کو ہمارے حوالے کیجئے۔

اس تقریر سے یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ حزن و سرور تو غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ میں امر و نہی وارد نہیں ہوا کرتی پھر یہاں لاتحزن کیوں فرمایا گیا۔

جواب کا حاصل یہ ہے یہاں حقیقت میں حزن پر نہی وارد نہیں بلکہ اسباب حزن سے روکنا مقصود ہے اور اسباب حزن اختیاری ہیں گو حزن اختیاری نہ ہو چنانچہ میں نے بتلا دیا کہ تبلیغ میں حزن کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ثمرہ پر نظر کی جائے اور ثمرہ کو مقصود سمجھ کر عمل کیا جائے اس سے ممانعت مقصود ہے اور یہیں سے سالکین کو سبق لینا چاہئے کہ وہ جو ذکر و شغل اور اطاعت و عبادت کرتے ہیں اس میں خود عمل کو مقصود سمجھا کریں جو اختیار میں ہے ثمرہ کو مقصود نہ سمجھیں جو غیر اختیاری ہیں ورنہ جس شخص نے ثمرات کو مقصود سمجھ کر چند روز کے بعد وہ عمل میں کوتاہی کر دے گا جبکہ ثمرات کا ترتب نظر نہ آئے گا اور جو ثمرات پر نظر نہ کرے گا وہ برابر کام میں لگا رہے گا اور روز بروز ترقی کرتا چلا جائے گا۔

سُوْرَۃ بنیٓ اسرآءِیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

ترجمہ: وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اُن کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلاویں بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں۔

آیت معراج کی ایک تحقیق

شب معراج میں ایک سفر تو زمین پر ہوا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک دوسرا سفر وہاں سے آسمانوں کی طرف ہوا مگر قرآن کی آیت اسریٰ بعبدہ لیلاً میں صرف پہلے زمینی سفر کا ذکر ہے آسمانی سفر کا ذکر نہیں وجہ یہ ہے کہ آیت میں لیلاً کی قید لگی ہوئی اور دن اور رات صرف اس زمینی تضاد سے متعلق ہیں آسمانوں میں اس طرح کا دن رات نہیں جو آفتاب کے طلوع وغروب سے متعلق ہو تو لفظ اسراء اور لیل کے مقتضی سے صرف زمینی سفر کے ذکر پر اکتفاء کیا اور سورہ نجم میں آسمانی سفر کا ذکر فرمایا۔ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی۔

ارضی بلائیں

ایک مہمان رئیس کی طرف جو بعض شبہات کی تحقیق کر رہے تھے مخاطب ہو کر یہ بھی فرمایا کہ حضرت یہ

بلائیں ارضی ہیں سماوی نہیں ہیں یہ خودلوگوں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہیں سماوی بلاؤں کا رنگ ہی اور ہوتا ہے یہ وہ بلائیں ہیں جن کے واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم' اور رہا یہ شبہ کہ اللہ میاں بھی کافروں کے مددگار ہیں جیسا کہ بعض گستاخوں سے جنگ طرابلس میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی تثلیث کی طرف دار ہیں نعوذ باللہ تو حضرت سنئے نافرمانی وہ چیز ہے کہ بھنگی سے شہزادے کے چابک لگوائے جاتے ہیں تو کیا اس صورت میں بادشاہ بھنگی کا طرف دار ہے اور کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ بھنگی مقبول ہے بلکہ بات یوں ہے کہ شہزادہ اپنے مردود ہونے کی وجہ سے مغلوب ہے (چونکہ عصر کی جماعت کھڑی ہوگئی اس لئے ملفوظ بند ہوگیا۔) پھر بعد نماز فرمایا کہ مجھے ایک آیت شریف یاد آئی سورہ بنی اسرائیل میں ہے اور یہ بنی اسرائیل کافر نہیں تھے اہل کتاب تھے انبیاء کے قائل تھے حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں ایک دو پیشین گوئیاں ان کی کتاب میں بیان فرمائیں ہیں وہ کلام اللہ میں منقول ہیں۔ وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیراً فاذا جاء وعد اولا هما بعثنا علیکم عبادا لنا اولی باس شدید فجاسوا خلل الدیار ط و کان وعدا مفعولا' مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بتلادی تھی کہ تم سرزمین میں دوبارہ فساد مچاؤ گے اور بڑا زور چلانے لگو گے پھر جب ان دو باتوں میں سے پہلی مرتبہ کی میعاد آئے گی یعنی تم اول مرتبہ شرارت کرو گے تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کریں گے جو بڑے خونخوار ہوں گے پھر وہ گھروں میں گھس پڑیں گے اور یہ ایک وعدہ ہے کہ جو ضرور ہو کر رہے گا اب اس دیکھنے کی چند باتیں ہیں ایک تو یہ کہ لتفسدن فی الارض میں دیکھنا چاہئے کہ ان لوگوں کو جو کہ اہل کتاب ہیں مفسد اور حد سے گزرنے والا فرمایا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جن کو عبادالنا فرمایا ہے یہ کون لوگ ہیں۔ یہ مشرک ہیں بت پرست ہیں ان کو اپنا بندہ فرمارہے ہیں اس حیثیت سے کہ ہماری مملوک ہیں اور ہمارا آلہ عذاب ہیں نہ اس حیثیت سے کہ مقبول ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ تمہارے مردود ہونے کی وجہ سے ان کو تم پر مسلط کردیا ہے اسی طرح دوسرے وعدہ کو فرماتے ہیں قوله تعالیٰ فاذا جاء وعدالاخرة لیسؤ وجوهکم ولیدخلوا المسجد کما دخلوه اول مرة ولیتبروا ما علوا تتبیرا. فرماتے ہیں کہ (پھر جب دوسری میعاد آئے گی یعنی دوبارہ شرارت کرو گے ہم پھر دوسروں کو مسلط کریں گے تاکہ وہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور جس طرح وہ لوگ تمہاری مسجد میں گھسے تھے یہ لوگ بھی اس میں گھس پڑیں۔ اور جس جس طرح پر ان کا زور چلے سب کو برباد کر ڈالیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی مقامات مقدسہ کی بے حرمتی ہمارے ہاتھوں ہو چکی ہے اور اب بھی ہمارے ہاتھوں ہی ہو رہی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ اللہ میاں کو یہ کیسے گوارا ہو سو ان کے نزدیک تمام زمین برابر ہے۔ خدا کے اوپر تھوڑا ہی قانون چلتا ہے یہ تو ہمیں حکم ہے کہ ہم ان

کی تعظیم کریں خدا پر لازم نہیں کہ کسی کی تعظیم کریں دیکھئے اگر ٹوپی پر نجاست پڑ جاتی ہے تو اسے اتار کر پھینک دیتے ہیں ایک منٹ سر پر نہیں رکھتے اور جوتا اگر نجاست میں بھر جائے تو اسے کوئی نہیں پھینکتا جانتے ہیں کہ یہ تو نجس ہی ہے اگر اور نجاست میں بھر گئی تو کیا ہوا۔ اسی طرح کافر اور مسلم کی مثال ہے کہ مومن مثل ٹوپی کے ہے کہ اگر اس میں ایک دھبہ بھی پڑ جاتا ہے تو ناگوار ہوتا ہے اور کافر مثل پاپوش کے ہے کہ اگر سب بھی بھر جائے تو ناگوار نہیں ہوتا تو کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ جوتا کلاہ سے افضل ہے ان رئیس صاحب نے بعض اہل غلو کے عذر کے طور پر کہا کہ مصیبت کے وقت عقل بھی جاتی رہتی ہے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ سچ ہے مگر کس کی عقل جاتی رہتی ہے جو نافرمان ہے اس کی عقل جاتی رہتی ہے بلکہ اس کی حالت راحت میں بھی ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ راحت کو اپنی ہی عقل کا ثمرہ سمجھتا ہے اور مصیبت کو اوروں کے سر تھوپتا پھرتا ہے۔ اور مطیع مصیبت کے وقت اور بھی زیادہ عاقل اور بیدار ہو جاتا ہے کیونکہ بوجہ طاعت اور تابعداری کے حق تعالیٰ اس میں عرفان کی شان پیدا کر دیتے ہیں اور فوراً رجوع بحق پیدا ہو جاتا ہے اس کو راحت اور مصیبت دونوں مذکر حق ہوتے ہیں (جامع جیسا کہ حضرت عارف معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔

ازیں مصائب دوراں مثال شاداں باد　　　که تیر دوست به پهلوئے دوست می آید

اور حضرت بوعلیؒ فرماتے ہیں

کفر وا ایمان ہر دورا برہم بزن .... بعد ازیں دریاب معنی رابہ فن

یعنی اے خدا کے بندے جب تو طاعت حق ہے تو تجھے راحت اور مصیبت سے بالکل قطع نظر کر لینی چاہئے)

اور حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ آپ اب اس کا تجربہ کر لیں دو عالموں کے پاس جائیے ایک ان میں متدین اور متقی ہے اور ایک فقط عالم ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ متقی کو عاقل اور فہیم پائیں گے اور غیر متقی کو نہایت خشک اور کورا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ایک شخص ان پڑھ اور متقی ہو اور دوسرا فقط عالم' آپ اس ان پڑھ میں جو فہم دیکھیں گے وہ اس عالم میں ہرگز نہ ہوگی چنانچہ حضرات صحابہؓ میں اکثر وہ لوگ تھے کہ پڑھنا جانتے تھے نہ لکھنا مگر جب باشاہوں کے دربار میں دعوت اسلام دینے جاتے تھے اور شاہان دنیا سے خطاب کرتے تھے بڑے بڑے بادشاہ ان کی باتیں سن کر حیران ہو جاتے ہیں حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب سفیر اسلام ہرقل کے دربار میں تشریف لے گئے ہیں اور اس نے حضرت عمرؓ کے حالات دریافت کئے ہیں کہ تم اپنے خلیفہ کے حالات سناؤ وہ کیسے ہیں اور کیا کرتے ہیں تو ایک شخص ان پڑھ معمولی لباس میں سے جواب دیتے ہیں کہ ہمارے خلیفہ کا مختصر یہ حال ہے کہ لا یخدع و لا یخدع دیکھئے ایک ان پڑھ شخص نے دو جملوں میں وہ جواب دیا ہے کہ بادشاہ حیران ہو گیا تو بات کیا تھی طاعت کی برکت سے عرفان حق حاصل تھا حق تعالیٰ ان

کے حامی اور مددگار تھے مسلم ہے من کان للہ کان اللہ لہ حضرت وہ تعلیم حق تھی اور انہیں طاعات کی بدولت تھی جن کو آج ہم چھوڑ رکھا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج۴ صفحہ ۱۵۹ تا ۱۶۱)

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جتنی سعی کرنی چاہئے ویسی ہی سعی بھی کرے گا جبکہ وہ شخص مومن بھی ہو پس ایسے لوگوں کے لئے یہ سعی مقبول ہو گی۔

تفسیری نکات

محض تمنائے آخرت کافی نہیں

بہت لوگ ارادہ آخرت کے بارے میں اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ زبان سے یوں کہہ لیا جائے کہ نیت کرتا ہوں میں طلب آخرت کی اللہ اکبر یعنی بہت لوگ محض تمنائے آخرت کو طلب آخرت سمجھتے ہیں اور اس کے اسباب کو اختیار نہیں کرتے (اور یہ حالت آخرت ہی کے ساتھ ہے دنیا کے ساتھ یہ کسی کا برتاؤ نہیں کہ محض تمنا کو کافی سمجھ لے اسی واسطے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ (جو شخص محض دنیا ہی کا طالب ہو) کے بعد وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا (اور اس کے لئے کما ینبغی کوشش بھی کرے) نہیں بڑھایا گیا کیونکہ وہاں تو ارادہ کے معنی بھی عام طور پر یہ ہیں کہ خوب سعی کی جائے پس اب یہ شبہ نہ رہا کہ ارادہ عاجلہ میں تو سعی کی قید نہیں اور یہاں سعی کی قید ہے۔ تو آخرت کی فضیلت دنیا پر پوری طرح واضح نہ ہوئی اگر یہاں بھی محض ارادہ سے بحث ہوتی تو مقابلہ کامل ہوتا جواب کا حاصل یہ ہے کہ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا دونوں جگہ مراد ہے مگر وہاں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں ارادہ کے معنی میں لوگوں نے غلطی نہیں کی اور یہاں بیان کی ضرورت تھی کیونکہ یہاں معنی ارادہ میں غلطی کا وقوع ہو رہا ہے ۱۲ ظ) اور سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا (اس کے لئے اس کی موافق کما ینبغی کوشش بھی کرے) فرمایا سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا (اس کے لئے اپنی ہمت کے موافق کوشش بھی کرے) نہیں فرمایا کہ آخرت کے لئے اپنی سی کوشش کرے کیونکہ اس میں کم ہمتوں کو موقع مل جاتا ہے کہ ہر شخص ذرا سا کام کر کے کہہ دیتا کہ بس میری ہمت تو اتنی ہی ہے تو ان کم ہمتوں کے بہانے قطع کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ آخرت کے لئے آخرت کے مناسب کوشش کرے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کرے جیسا کہ ظاہر میں شان آخرت کی عظمت سے مفہوم ہوتا ہے بلکہ مطلب وہی ہے کہ اپنی سی کوشش کرے اور اپنی

ہمت کے موافق سعی کرے چنانچہ دوسری جگہ اس کی تفسیر فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اپنی ہمت کے موافق) سے کی گئی ہے پس حاصل سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا سعی کرے اس کی سعی کرنے کے موافق) وسعی لها سعیه (اور سعی کرے اپنی کوشش کے موافق) کا ایک ہی ہے لیکن سعی لها سعیها کے بعد سعی لها سعیه کا مفہوم جو ذہن میں آئے گا وہ یہ ہوگا کہ اپنی سی کوشش ختم کردے اور اسکے بغیر کم ہمتوں کو بہانہ کا موقع مل جاتا ہے خوب سمجھ لو چنانچہ اس حکمت کی وجہ سے حق تعالیٰ نے فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اپنی استطاعت کے موافق) کو اول نازل نہیں فرمایا بلکہ اول اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) کا نزول ہوا جس سے صحابہ گھبرا گئے کہ حق تعالیٰ کی شان کے مناسب تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے تب تسلی کے لئے فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ نازل ہوا اور یہ اس کے لئے ناسخ نہیں بلکہ مفسر ہے کہ اتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو اور سلف کے کلام میں اگر اس کو کہیں ناسخ کہا گیا ہے تو اس سے بھی مراد تفسیر ہی ہے لیکن سلف کے کلام میں بیان تبدیل و بیان تفسیر سب کو نسخ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے بہرحال مقصود تو تقویٰ بقدر استطاعت ہے لیکن اس کو اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) کے بعد اس کی تفسیر میں بیان فرمانے سے کم ہمتوں کے بہانے قطع ہو گئے اور اول ہی اس کا نزول ہو جاتا تو کم ہمتوں کو بہانہ ڈھونڈھنے کا موقع مل جاتا ایسا ہی یہاں سمجھو کہ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا کو فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کا حاصل سعی لها سعیة کی طرف لوٹتا ہے مگر سعیٰ لها سعیه نہ فرمانے میں حکمت وہ ہے جو ابھی بیان ہوئی واللہ اعلم باسرار کلامہ بہرحال ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آخرت کا طالب ہو تو اس کی جزا یہ ہے کہ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۝ ان کی سعی کی قدر کی جائے گی بظاہر یہاں کچھ انعام کا ذکر نہیں مگر قرآن شاہی کلام ہے اس میں شاہانہ محاورات کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے اور شاہی محاورہ میں یہ لفظ بہت بڑا ہے یہ ہزاروں تفاصیل سے بڑھا ہوا ہے جب بادشاہ کسی سے یہ کہہ دے کہ ہم نے تمہاری خدمت کی قدر کی ہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ بہت کچھ ملے گا۔ اور امید سے زائد ملے گا اب سمجھ لو کہ جس کی سعی کی احکم الحکمین قدردانی فرمائیں اس کو تو کیا کچھ ملے گا۔

علم صرف ونحو کی ضرورت

ایک آیت میں تو طلب دنیا پر بھی ترتب ثمرہ کا وعدہ ہے فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا (جو شخص

آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا میں دیدیں گے) اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں وعدہ ہے تو منہا کے ساتھ ہے جس میں من تبعیضیہ ہے تو کل کا وعدہ کہاں ہوا جز وقلیل کا وعدہ ہوا اس پر شاید یہ سوال ہو کہ ایک آیت میں آخرت کے متعلق بھی منہا آیا ہے وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (اور جو شخص دنیاوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ دیدیتے ہیں اور جو شخص اخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو آخرت کا حصہ دیں گے اور ہم بہت جلدی عوض دیں گے حق شناسوں کو) جواب یہ ہے کہ وہاں قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ من ابتدائیہ ہے تبعیضیہ نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث سمجھنے کے لئے نحو وصرف کی بھی ضرورت ہے۔

ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں

طلبہ کو ایک اشکال ہوگا وہ یہ کہ قرآن میں تو ارادہ دنیا کی مطلقاً مذمت وارد ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا اور ایک جگہ ہے وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (وامثالها من الایات)

سوان آیات میں ارادہ دنیا پر وعید وارد ہے طلب اور سعی تو ارادہ سے بھی آگے ہے وہ تو بدرجہ اولیٰ مذموم ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً پس دیگر نصوص کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مطلق ارادہ پر وعید کا ترتب نہیں ورنہ پھر اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کے کیا معنی ہوں گے اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہے تو بیع وشرا کی اجازت کیوں ہے اور شریعت نے کھیتی پر عشر وغیرہ کیوں واجب کیا اموال میں اور جانوروں میں زکوٰۃ کیوں مقرر کی۔ کیونکہ جب دنیا رکھنا ہی جائز نہ ہوگا تو ان حقوق کے وجوب کی نوبت ہی کہاں آوے گی بلکہ اس تقدیر پر تو صاف یہ کہہ دیا جاتا تجارت بھی ممنوع ہے اور زیادہ مال جمع کرنا اور بہت سے جانور پالنا بھی حرام ہے حالانکہ نصوص میں زراعت وتجارت اور زیادہ مال جمع کرنے کی کہیں ممانعت نہیں ہاں ممانعت کے بجائے ان کے لئے احکام زکوۃ وغیرہ مشروع ہیں پس دیگر نصوص کے ملانے سے ان آیات کا مطلب یہ ہے من کان یرید محض العاجلة جو شخص صرف دنیا کا ارادہ کرے اس کے لئے یہ وعید ہے یعنی ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں ایک تو دنیائے محض کا ارادہ کرنا کہ اس کے ساتھ آخرت کا ارادہ بالکل نہ ہو یہ مذموم ہے اور موجب وعید دوسرے دنیا کا ارادہ کرنا آخرت کے لئے کہ تجارت وزراعت وملازمت بطریق حلال اس کے لئے کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور اطمینان سے آخرت کے کام بجالائے اس صورت میں اصل ارادہ آخرت کا ہے اور دنیا کا ارادہ اس کے تابع ہے اس کی مذمت نہیں نہ یہ

موجب وعید ہے بلکہ یہ ارادہ تو ایک درجہ میں فرض ہے جس کو یہ حدیث بیان کرتی ہے **طلب الحلال فریضة بعد الفریضة** (رواہ البیھقی و الطبرانی و دیلمی عن ابن مسعود و انس و ابن السخاوی و بعضھا یوقد بعضا لا سیما و شواھد ھا کثیرۃ مقاصد و حسنہ ص ۱۴۸ از حضرت مولانا مولوی ظفر احمد صاحب دامت فیوضھم) اور اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہوتا تو قرآن میں صحابہ کی طرف اس کو منسوب نہ کیا جاتا حالانکہ غزوہ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو حق تعالیٰ نے صحابہ کو اس کے سبب پر متنبہ فرماتے ہوئے بتلایا کہ یہ شکست اس لئے ہوئی کہ ایک جماعت نے جس کو رسول ﷺ نے درہ کوہ پر متعین فرما کر یہ حکم دیا تھا کہ تم یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم غالب ہوں یا مغلوب اس حکم کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو غالب اور کفار کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر درہ کوہ پر ٹھہرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور غنیمت کا مال لوٹنے میں مشغول ہو گئے اس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ کہ تم سے (یعنی صحابہ میں سے) بعض دنیا کا قصد کرتے تھے اور بعض آخرۃ کا قصد کرتے تھے اس میں صحابہ کی طرف دنیا کی نسبت کی گئی ہے اور جو شخص صحابہ کے فضائل و مقامات سے واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ارادہ مذمومہ کی نسبت صحابہ کی طرف دشوار ہے صحابہ محض دنیا کا ارادہ بھی نہیں کر سکتے پھر یہاں کیا مطلب ہے ابن عطاء نے اس کی تفسیر بیان کی ہے یعنی منکم من یرید الدنیا للاخرۃ و منکم من یرید الاخرۃ الصرفة کہ تم میں سے بعضے دنیا کا آخرۃ کے لئے ارادہ کرتے تھے اور بعضے محض آخرۃ کا قصد کرتے تھے۔ اس پر یہ سوال ہوگا کہ جب صحابہ کا ارادہ دنیا آخرۃ کے لئے تھا تو وہ مذموم نہ تھا پھر اس کو شکست کا سبب کیوں بنایا گیا جواب یہ ہے کہ وہ ارادہ تو فی نفسہ مذموم نہ تھا لیکن وہ اجتہادی غلطی سے مفضی ہو گیا تھا مخالفت حکم رسول کی طرف اس لئے عتاب ہوا اب یہ مسئلہ بالکل منقح ہو گیا کہ مذمت ارادۃ الدنیا کی ہے ارادۃ الدنیا للآخرۃ مذموم نہیں۔

اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہئے ویسی ہی سعی بھی کرے گا جبکہ وہ شخص مومن بھی ہو پس ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی آپ کے رب کی عطا میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی اور آپ کے رب کی عطا بند نہیں آپ دیکھ لیجئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے اور البتہ آخرت آخرت کے درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔

ثمرہ ارادہ آخرت

مگر طلب دنیا کے ساتھ آخرت اس طرح نہیں مل سکتی اب بتلایئے کہ طالب دنیا ہونا عقل مندی ہے یا طالب آخرت ہونا حالانکہ آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایسی حقیر ہے کہ اگر آخرت سے محرومی کی صورت میں اس کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی نہ ہو کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا

لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ یعنی جو کوئی دنیائے عاجلہ کا ارادہ (وطلب) کرلے ہم اس کو دنیا ہی میں فی الحال جس قدر چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں پھر اس کے لئے جہنم مقرر کردیتے ہیں جس میں وہ برائی اور ذلت کے ساتھ داخل ہوگا اور جو لوگ کہ آخرت کا ارادہ کریں اور اس کے لئے سعی کریں جو اس کیلئے ہوا کرتی ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہوں تو ان لوگوں کی کوشش کی قدر کی جائے گی اب ذرا دونوں مضمونوں میں غور کرلیا جائے کہ طلب دنیا وطلب آخرت دونوں کے ثمرات کو کس طرح بیان کیا گیا ہے طالب دنیا کی بابت تو ارشاد ہے عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ یعنی ہم طالبان دنیا میں سے جس کو چاہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں دے دیتے ہیں معلوم ہوا کہ نہ سب کا کامیاب ہونا ضروری کہ جو وہ چاہا کریں وہی مل جایا کرے۔ بلکہ جو حق تعالیٰ چاہیں گے دیدیں گے اور طالبان آخرت کے متعلق ارشاد ہے فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ کہ جو آخرت کی طلب کی کوشش عملی اور ایمان کے ساتھ کرتے ہیں ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی ایمان اور سعی کی قید احترازی نہیں اور یہ دراصل بیان ہے مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ کا کہ ارادہ آخرت کہتے ہی ہیں ایمان اور عمل صالح میں سعی کرنے کو کیونکہ اس کے بدوں طلب آخرت متحقق ہی نہیں ہوسکتی ہے اور یہاں سے رد ہوگیا ان لوگوں کا جو کہ اپنے کو طالب آخرت سمجھتے ہیں مگر عمل صالح نہیں کرتے کہ دراصل یہ لوگ طالب آخرت ہی نہیں طلب کے لئے علامت بھی چاہئے طلب آخرت کی علامت یہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح اختیار کیا جائے اور میں نے یہ مضمون کہ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ (اس کے لئے سعی کریں جو اس کے لئے ہوا کرتی ہے درانحالیکہ وہ مومن بھی ہوں) قید واقعی ہے اسی لئے بیان کیا تاکہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت میں جو ثمرہ ارادہ آخرت کے متعلق مذکور ہے وہ صرف ارادہ کا ثمرہ کہاں ہے بلکہ سعی اور ایمان اور ارادہ اس سب مجموعہ کا ثمرہ ہے اور دعویٰ تمہارا ارادہ آخرت کے ثمرہ کا ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ زائل ہوگیا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ یہ قید واقعی ہے اور یہ ارادہ کا بیان اور اس کی شرح ہے رہا یہ سوال کہ پھر اس کے مقابل ارادہ عاجلہ کی تفسیر کیوں نہ بیان کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ آخرت کی اس تفسیر سے مقصود یہ ہے کہ تاکہ ارادہ آخرت کا سہل ہونا معلوم ہوجائے کہ اس میں معمولی سعی اور ایمان کی ضرورت ہے تاکہ اس کے بعد آخرت کی طلب کے لئے رغبت دل میں پیدا ہو بخلاف ارادہ دنیا کے کہ اس کی ترغیب مقصود نہیں اس لئے اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی علاوہ ازیں یہ کہ ارادہ آخرت کی تفسیر کے متعلق تو لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کوئی کسی طریقہ کو طلب آخرت سمجھتا ہے کوئی کسی طریقہ کو اس لئے اس کی تفسیر کی ضرورت تھی اور ارادہ دنیا کو تو ہر شخص سمجھتا ہے اس کے بیان کی حاجت نہ تھی پس ارادہ دنیا و آخرت میں ایک تو فرق یہاں یہ بتلایا کیونکہ طلب دنیا سے یہ کچھ

ضروری نہیں کہ وہ مطلوب حاصل ہی ہو جاوے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کو حاصل ہو جائے اور طلب آخرت کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے وہ ضائع نہیں ہو سکتی دوسرا ایک لطیف اشارہ ایک خاص فرق کی طرف اس آیت میں اور بھی ہے جو اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور ابھی تک اس آیت کی تفسیر میں نظر سے نہیں گزرا ممکن ہے کسی نے لکھا بھی ہو وہ یہ کہ اس جگہ دو جملے شرطیہ ہیں اور ہر ایک میں تعلق شرط کا جزاء کے ساتھ مختلف عنوان سے بیان کیا گیا ہے ارادہ دنیا کی تو ارشاد ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ یہ صیغہ استمرار کا ہے ترجمہ یہ ہوا کہ جو کوئی دنیا کو طلب کرتا ہے اور ہمیشہ طلب میں منہمک رہے تب کچھ ملتا ہے اور ارادہ آخرت کے متعلق من ارادہ بدوں لفظ کان کے ارشاد فرمایا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ ثمرہ اخروی حاصل ہونے کے لئے طلب میں مرنا کھپنا نہیں پڑتا بلکہ کچھ ارادہ کرنے سے بھی وہ ثمرہ حاصل ہو جاتا ہے اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ طالب آخرت کا ارادہ اور طلب مستمر نہیں ہوتا کچھ دنوں کے بعد ارادہ وطلب زائل ہو جاتا ہے نہیں حقیقت میں تو وہ بھی مستمر رہتا ہے مگر تھوڑی سی سعی وطلب کے بعد وہ حکم میں خبر مستمر کے ہو جاتا ہے کیونکہ محبت الٰہی پیدا ہو جانے کے بعد وہ ارادہ اتنا سہل ہو جاتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کے لئے اہتمام کرنا نہیں پڑتا وہ ارادہ خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے مگر بوجہ اعانت غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بدوں اختیار کے پیدا ہو رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آخرت کی طلب محبوب سرکار ہے اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے جس سے وہ بالکل سہل ہو جاتی ہے حدیث شریف میں ہے من تقرب الی شبراً جئت الیه ذراعاً ومن تقرب الی ذراعاً تقربت الیه باعا ومن اتانی یمشی اتیته هرولة اور دنیا مردود بارگاہ الٰہی ہے اس میں ہمیشہ دقت وتعب ہی رہتا ہے اس کے لئے ہمیشہ اہتمام وانہاک از خود کرنا پڑتا ہے اور یہ طلب ہمیشہ بتکلف از سر نو پیدا کرنی پڑتی ہے پس حقیقۃً تو دونوں ارادے مستمر ہوتے ہیں مگر بوجہ سہولت واعانت غیبی کے ارادہ آخرت یا مستمر نہیں رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا خود بخود اس کے دل میں ان اعمال کا تقاضا پیدا کر دیتا ہے اور ارادہ دنیا حقیقۃً اور حکم دونوں کے اعتبار سے مستمر ہے اسی لئے اس کے ساتھ کان استمرار کے لئے بڑھایا گیا اور ارادہ آخرت کے بیان میں کان نہیں بڑھایا گیا اور شرح اس سہولت واعانت کی یہ ہے کہ طلب آخرت میں قدر سعی کرنے سے جب نسبۃ مع اللہ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ایک کیف اور حال ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے اسی کو عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی — کہ دراز و دور دیدم رہ درسم پارسائی

(طریق زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں چلائے)

رہ قلندر سے یہی طریق عشق ونسبت مع اللہ مراد ہے اور رسم پارسائی سے وہ طریق عبادت جو بدوں

نسبت ومحبت ہومراد ہے جس میں اعمال کی یہ حالت ہوتی ہے جو بعد میں مذکور ہے۔

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند ۔ تو بروں درچہ کردی کہ درون خانہ آئی

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد ۔ کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

(کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا تو نے حرم سے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریا کا سجدہ کر کے مجھ کو بھی خراب کیا۔)

وہ کیف نسبت مع اللہ کا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کام نہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کام کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا اور اس طریق میں کچھ باطنی مشقت بھی پیش آتی ہے مگر وہ اس سے بددل نہیں ہوتے بلکہ اس میں بھی ان کو بڑا لطف آتا ہے اسی کی بابت ارشاد ہے ؎ از محبت تلخہا شریں بود

اور ارشاد ہے

ناخوش تو خوش بود بر جان من ۔ دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو طبیعت ناگوار ہی کیوں نہ ہو میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں۔)

اور کہا گیا کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اور کہا

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

اور اس نسبت مع اللہ سے اور سب کام تو آسان ہو ہی جاتے ہیں جو سب سے بڑی خوفناک چیز ہے جس سے سب لوگ ڈرتے ہیں یعنی موت وہ بھی ان کے لئے ایسی خوشگوار ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ لوگ تمنائیں کرتے ہیں عارف شیرازی فرماتے ہیں

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔ راحت جاں طلبم وز پے جاں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روز ۔ تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جان طلب کروں)

دنیوی مراد کا حصول مشیت حق پر موقوف ہے

کہ حق تعالیٰ نے دین کے کاموں میں ثمرہ کا وعدہ فرمایا ہے اور اسباب دنیویہ میں اس کا وعدہ نہیں فرمایا' چنانچہ دنیا کے متعلق ارشاد ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ یعنی جو کوئی دنیا کا قصد کرے گا ہم اس کو دنیا میں جس قدر ہم چاہیں گے اور جس کے لئے چاہیں گے سردست دے دیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیوی مراد کا حصول مشیت پر موقوف ہے یہ وعدہ نہیں کہ جو تم چاہو وہی مل جائے اور یہ بھی وعدہ نہیں کہ ہر ایک کا مقصود پورا ہو جائے بلکہ بعض کا مقصود حسب مشیت الٰہی حاصل ہو جاتا ہے اور بعض کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوتا۔

اور اعمال آخرت کے متعلق ارشاد ہے

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۝

اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرے اور مومن بن کر اس کے لئے وہ کوشش کرے جو اس کے مناسب ہے تو ان لوگوں کی کوشش مشکور ہے یعنی حق تعالیٰ اس کی قدر فرمائیں گے۔ اس آیت میں وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا ارادہ کا بیان ہے یعنی اردہ سے مراد محض تمنا نہیں کیونکہ خالی تمنا کافی نہیں بلکہ ارادہ سے مراد قصد جازم ہے جس کے لئے سعی لازم ہے۔ آگے اس کے جزا مذکور ہے فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۝ کہ ان کی سعی کی قدر کی جائے گی اور ظاہر ہے کہ شاہی محاورہ میں یہ جملہ بہت امید افزا ہے جب کوئی بادشاہ اپنے کسی خادم سے یہ کہہ دے کہ ہم تمہاری خدمات کے قدر دان ہیں تو اس کو انعامات جلیلہ کی پختہ امید ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھ کو میری خدمات سے بدر جہا زائد صلہ ملے گا۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ حاکم کے کلام میں ایسے جملہ سے بہت کچھ امیدیں پختہ ہو جاتی ہیں تو احکم الحاکمین کے کلام میں اس جملہ سے کیا کچھ امیدیں پیدا ہونی چاہئیں اس کا فیصلہ اہل ذوق خود کر سکتے ہیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا

دنیا کے متعلق نؤتہ منھا فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا قصد کرتا ہے اس کو ہم کچھ دے دیتے ہیں یہ وعدہ نہیں کہ جو وہ چاہے وہی دے دیں اور آیت سابقہ کی قید لمن یشاء یہاں بھی ہے اور آخرت کے متعلق ترقی کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی اطلاق کے ساتھ ہے جس میں مشیت وغیرہ کی قید مذکور نہیں نہ من تبعیضیہ لایا گیا ہے جس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ارادہ آخرت کے بعد تو مراد ضرور حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عطا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ دنیا کے متعلق تو یہ بھی وعدہ نہیں کہ جو مانگے وہی مل جائے اور یہاں

زیادہ کا بھی وعدہ ہے اور یہ ترقی محض آخرت ہی میں نہیں بلکہ دین اختیار کرنے والوں کو دنیا میں بھی ان کے اعمال سے زیادہ جزاء مل جاتی ہے دین داروں کو دنیا میں بھی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ان کو پہلے سے خبر بھی نہیں تھی۔ آخرت کے متعلق تو مسلمانوں کو اس کا عمل عام طور پر ہے سب جانتے ہیں کہ آخرت میں عمل سے زیادہ صلہ ملے گا کیونکہ وہ یہ حدیث سنے ہوئے ہے۔

اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر کے دل پر ان کا خطرہ گزرا لیکن دنیا میں زیادت اور ترقی کا علم بہت لوگوں کو نہیں ہے۔

رموز ونکات

ایک نکتہ یہ ہے کہ طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے **عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ** کہ طالبان دنیا میں سے ہم جس کو چاہیں اور جس قدر چاہیں عطا کر دیتے ہیں اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لئے یہ فرمایا جاتا **اعطیناہ ما یشاء** کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا وہی دیں گے کیونکہ جب دنیا والوں کے لئے یہ فرمایا گیا کہ ان کو جو ہم چاہیں گے وہ دیں گے تو بظاہر اس کے مقابل طالبین آخرت کے لئے فضیلت پوری اس طرح معلوم ہوگی کہ ان کو ان کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے۔ مگر بخلاف اس کے اس آیت میں مایشاء نہیں فرمایا گیا بلکہ بجائے اس کے **فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا** فرمایا گیا تو بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ حق تعالیٰ اہل آخرت کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو جو کچھ وہ چاہیں گے وہی دیا جائے گا تو اس میں درحقیقت کچھ زیادتی نہ ہوتی بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ نعمائے آخرت کی شان یہ ہے۔

مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر یعنی نہ ان کو آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر کے قلب پر خیال گزرا۔

تو بتلایئے کہ جب وہاں کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ طالبین آخرت کو جو کچھ وہ چاہیں گے دیا جائے گا اس سے زیادتی ہوتی یا کمی؟ بہت کمی ہو جاتی کیونکہ وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہوسکتا پھر ہماری خواہش کے موافق جو ہم کو ملتا وہ تو بہت ہی کم ہوتا حق تعالیٰ شانہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے انہوں نے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ہم کو خطرہ بھی نہیں ہوسکتا اور وہاں کا ثواب ہماری خواہش پر موقوف نہیں فرمایا بلکہ اپنی رحمت سے خواہش سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے اسی کے بارہ میں مولانا کا ارشاد ہے۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل مے خری گلزار را
نیم جاں بستاند وصد جاں دہد — آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

اب آپ نے سمجھا کہ ماشاءنہ فرمانا ہی ہمارے لئے رحمت ہے اس وجہ سے حق تعالیٰ شانہ نے اجمالاً فرما دیا فَأُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُورًا۝ یعنی ان لوگوں کی کوشش کی اس دربار میں قدر ہوگی اسی سے سمجھ جاؤ کہ جن کی کوشش کی قدر دانی ایسے عظیم الشان قدردان بادشاہ کے دربار میں ہوان کو کیا کچھ ملے گا۔اس کا اندازہ اس سے کرلو کہ بادشاہان دنیا جب کسی کی قدردانی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں وہ یہ نہیں کیا کرتے کہ خدمت کی حیثیت پر انعام واکرام کریں بلکہ وہ اپنی حیثیت کے موافق انعام واکرم کیا کرتے ہیں جس کا اس کو وہم بھی نہیں ہوتا پھر جس کی قدردانی حق تعالیٰ شانہ اپنی عظمت کے موافق فرمائیں گے اندازہ کرلو اسے کیا کچھ ملے گا اس وقت اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی۔

دوسرا اشارہ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا میں ہے کہ یہ کلام اس سعی کے سہل ہونے پر دال ہے۔جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے جو تدبیر ہے وہ کرنی چاہئے اس تدبیر کو بیان نہ کرنا اور اجمالاً کہہ دینا کہ جو تدبیر اس کی ہے وہ کرنی چاہئے اس سے اس تدبیر کا معلوم اور سہل ہونا معلوم ہوجاتا ہے اسی طرح یہ کلام یہاں پر وارد ہوا ہے کہ ''جو لوگ طالب آخرت ہیں اور اس کے لئے وہ سعی کرتے ہیں جو اس کی سعی ہے ان کی کوشش کی قدر ہوگی'' اس طرز کلام سے اس سعی کا معلوم ہونا اور سہل ہونا سمجھا جاتا ہے مطلب یہ کہ وہ سعی مختصر اور مشتہر ہے بیان کی ضرورت نہیں۔

تیسرا اشارہ مشکورا میں اس بات کی طرف ہے کہ جو کچھ آخرت میں ملے گا وہ محض قدردانی ہے عمل کو اس میں دخل نہیں، اس سے ناز کرنے والوں کو تنبیہ مقصود ہے کہ اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہئے جو کچھ وہاں ملے گا محض انعام ہوگا ورنہ تم عمل سے اس کے مستحق نہیں ہوسکتے وجہ یہ کہ طاعت ادائے حق خداوندی اور اس کے حقوق غیر متناہی ہیں اور حقوق غیر متناہی کا ادا کرنا موقوف ہے عمل غیر متناہی پر اور ہم بوجہ حادث ومتناہی ہونے کے عمل غیر متناہی سے عاجز ہیں تو عقلاً انسان ادائے حق خداوندی سے عاجز ہے تو اب جو کچھ بھی اسے ملے وہ محض قدردانی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں سے یہ شبہ بھی دور ہوگیا ہوگا جو بعض رحم دل لوگوں کے دلوں میں آیا کرتا ہے کہ کافروں کے لئے ہمیشہ کیلئے خلود فی النار کیوں مقرر ہوا کفر تو اس نے کیا تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم یہ تو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالیٰ کے ساتھ جب شرک وکفر کیا تو اس نے حق تعالیٰ شانہ کے حقوق غیر متناہیہ کو ضائع کیا اور حقوق غیر متناہیہ ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہیہ ضائع ہوجاتے ہیں پس عمل متناہی کے بدلے جزا غیر متناہی جو مومنین کو عطا ہوگی یہ البتہ عقل سے آگے ہے عقل یوں کہتی ہے کہ جب عمل متناہی ہے تو جزا بھی متناہی ہونی چاہئے۔ لوگ آج کل عقل عقل گاتے پھرتے ہیں مگر یہ عقل ان کی خیر خواہ نہیں دشمن ہے۔

؎ آزمودم عقل دور اندیش را ۔ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را
یہ لوگ ہمیں بے عقل بتلاتے ہیں مگر ہمیں ایسی عقل کی ضرورت نہیں اس سے ہم بے عقل ہی اچھے مگر خبر بھی ہے یہ بے عقلی کس کے لئے ہے۔
؎ ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم
خدا کا دیوانہ ہزار عاقلوں سے بہتر ہے۔ ؎ اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
پس مشکورا فرمانے سے بتلا دیا کہ عمل تو چاہتی ہے کہ تمہارا اجر کم ہوتا مگر یہ ہماری قدر دانی ہے ایک حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہ جائے گا ہاں رحمت الٰہی ہو جائے تو اور بات ہے حضرت عائشہؓ نے عرض کیا اور اس سوال کی ہمت بھی انہیں کو تھی یا رسول اللہ ﷺ ولا انت کیا آپ بھی اپنے عمل سے جنت میں تشریف نہ لے جاویں گے؟ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے اس سوال پر حضور ﷺ پر خوف غالب ہو گیا اور آپ نے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا و لا انا الا ان یتغمد نی اللہ برحمۃ کہ میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا مگر یہ کہ خدا کی رحمت میری دست گیری کرے۔
صاحبو! اب کس کی ہمت ہے جو اپنے عمل کو کچھ سمجھے ہماری تو وہ مثال ہے جو کسی بزرگ نے بیان فرمائی ہے
چوآں کرمے کہ درسنگے نہانست زمین و آسمان دے ہمانست
مولانا نے اس کی مثال میں ایک اور حکایت بیان فرمائی ہے ایک بدوی کی جس نے بجز اپنے گاؤں کے گڑھوں کے کبھی پانی نہ دیکھا تھا اور قحط میں ان کے خشک ہو جانے سے دنیا سے پانی کو ناپید سمجھتا تھا کہ وہ کسی خلیفہ بغدادی کے پاس زمانہ خشک سالی میں ایک گھڑا شیریں پانی کا لے گیا تھا۔ بڑی دور دراز مسافت سے وہ گھڑا سر پر رکھے ہوئے جب پہنچا تو خلیفہ کے دربار میں اس کو پہنچا دیا گیا خلیفہ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ اے امیر المومنین! یہ جنت کا پانی ہے' خلیفہ نے بہت قدر دانی سے وہ گھڑا لے لیا اور حکم کیا کہ سونے سے پر کر کے اس گھڑے کو واپس کر دیا جائے اور حکم دیا کہ اس کو نہر دجلہ کی طرف واپس کیا جائے تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ یہ ہم نے محض اس کی محبت کی قدر کی ہے ورنہ آب شیریں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔
اسی طرح قیامت میں جب ہم اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے کہ اس قدر بے شمار نعمت ہے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب محض قدر دانی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ اپنے مومن بندے کا حساب چھپا کر لیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے تم پر یہ یہ انعام فرمائے تھے تم نے پھر بھی نافرمانی کی فلاں گناہ کو یاد کرو تم نے فلاں دن یہ کام کیا تھا۔ اس دن یہ کیا تھا غرض گناہوں کی فہرست شمار فرمائیں گے یہاں تک کہ مومن یہ سمجھے گا کہ بس میں ہلاک ہوا اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب دیکھے گا اس وقت حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے

کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی ہم پردہ پوشی کرتے ہیں پھر اس کے نامہ اعمال میں سے گناہوں کو محو فرما دیں گے اور ان کی جگہ اعمال حسنہ درج فرما دیں گے یہ ہے فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ کا مضمون کچھ ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ مسلمانوں کو اپنی رحمت سے دوسروں کے سامنے ذلیل نہ فرمائیں گے بلکہ دوسروں کے سامنے اس کی عزت بڑھائی جائے گی اور یوں ظاہر کیا جائے گا کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

صاحبو! ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو' کیا اس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں جو یوں نافرمانی پر کمر بستہ ہوئے ہو ایسے رحیم و کریم خدا کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا کرو اور اس کی محبت میں کوشش کرو بس اب میں وہ ترکیب بتلا کر جس سے حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا ہو۔

اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ ہے چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ

"یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے دیتے ہیں پھر ہم اس کا ٹھکانہ جہنم کو بناتے ہیں"

ارادہ خاص برائے آخرت

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے فرماتے ہیں **ومن اراد الاخرة** پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے جو مقابل ہے ارادہ آخرۃ کے یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو پس ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوئیں ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ لم یرد الاخرۃ ہو پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے ایک اور موقع پر ہے **من کان یرید حرث الاخرة نزدله فی حرثه ومن کان یرید حرث الدنیا نؤته منها وما له فی الاخرة من نصیب**

یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ **من کان یرید حرث الدنیا ولم یرد حرث الاخرة** تقابل قرینہ ہے اس کا' اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور ہو تو اس کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا **من کان یرید الحیوة الدنیا وزینتها نوف الیهم اعمالهم فیها وهم فیها لا یبخسون اولئک الذین لیس لهم فی الاخرة و لا النار وحبط ما صنعوا فیها وباطل ما کانوا یعملون** گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے **من کان یرید الحیوة الدنیا وزینتها ولم یرد الاخر** پس یہ معلوم ہو گیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کسب دنیا مذموم نہیں' سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھڑوانا چاہتے ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معترفین بھی اتنے معتقد نہیں آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری کہتے ہیں لہذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے مگر ضروری ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے وہ یہ کہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے سو دنیا ہے ضرورت کی چیز مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہئے بس بقدر ضرورت اس کو حاصل کرلو اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت ہے نہیں اس لئے وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں جو قاعدہ مذکورہ کی بناء پر قابل ترک ہے آیت میں بھی وزینتھا کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے بھی اس کا مذموم ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

بس طلب کے دو درجے ہوئے ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو سو اول کی مذمت نہیں ثانی کی مذمت ہے۔ کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے۔ اب جو دنیا اس کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھے گا تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا یہی قابل مذمت ہے۔ (الحیاۃ ملحقہ مواعظ حقیقت مال و جاہ صفحہ ۴۵۵ تا ۴۵۷)

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَـقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝۲۳ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝۲۴ۭ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝۲۵

ترجمہ: اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو اگر تیرے ان میں سے ایک یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کو پہنچ جاویں تو ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا ہے تمہارا رب تمہارے مافی الضمیر کو خوب جانتا ہے اگر تم سعادت مند ہو تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

تفسیری نکات

حقوق والدین

اس کے علاوہ حق تعالیٰ نے والدین کا ایسا حق رکھا ہے جس کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو خبر نہیں ہوتی وہ کیا ہے؟ دعا چنانچہ ارشاد ہے وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝۲۴

دعا بھی ایسی تعلیم فرمائی ہے جس میں اولاد کے زمانہ احتیاج کو یاد دلایا ہے کہ اس طرح دعا کرو کہ اے پرودگار میرے والدین پر رحم کیجئے جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا اور شفقت و رحمت سے) پرورش کیا ہے اس میں بتلا دیا کہ والدین کے زمانہ احتیاج میں تم اپنے زمانہ احتیاج کو یاد کرو کہ کبھی تم بھی نہایت کمزور ضعیف تھے نہ اپنے ہاتھ سے کھا سکتے تھے نہ پی سکتے تھے نہ چلنے پھرنے کی طاقت تھی پھر بھی والدین نے اس

وقت کس محبت وشفقت سے تمہارے ناز نخر اٹھائے اور کس شفقت سے پالا کہ آج تم اس قابل ہوئے کہ دوسروں کی خدمت کرو اب تم ان کی ضعیفی میں بات بات پر کیوں جھلاتے ہو پھر الفضل للمتقدم تمہارے اندر جو آج خدمت کی صلاحیت آ گئی ہے اس میں تو والدین کو دخل ہے اور ان کی خادمیت میں تم کو کوئی دخل نہ تھا مگر باینہمہ وہ تو تمہاری خدمت سے ایک دن بھی نہ گھبرائے اور تم گھبرا گئے۔

بڑھاپے کی قید اس لئے لگائی کہ جوانی میں تو تمہاری خدمت کے محتاج نہ ہوں گے بلکہ خود تم ہی ان کے محتاج ہو گے کیونکہ ماں باپ کی جوانی میں اولاد کا بچپن ہوتا ہے ہاں جب اولاد جوان ہوتی ہے تو اس وقت والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں اب اولاد کو ان کی خدمت کرنا چاہئے

شریعت یہ نہیں کہتی کہ طبعی ناگواری بھی نہ ہو بلکہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ اگر بوڑھے ماں باپ کی باتوں سے طبعاً ناگواری ہو تو اس کو ظاہر نہ کرنا چاہئے عقل سے کام لے کر ان کو معذور سمجھنا چاہئے اس طرح سے عقلی ناگواری نہ ہو گی چنانچہ حق تعالیٰ کی کیسی عنایت ہے چونکہ وہ جانتے ہیں کہ انسان میں طبعاً بوڑھے آدمی کی بے ڈھنگی بات سے تغیر آ ہی جاتا ہے اس لئے آگے فرماتے ہیں۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۝

یعنی حق تعالیٰ تمہارے دلوں کے حال کو خوب جانتے ہیں۔ (کہ تم کو بعض دفعہ طبعاً ناگواری ضروری ہو گی اس لئے اس کے متعلق قانون بتلاتے ہیں کہ) اگر تم صالح ہو گے (یعنی اس طبعی اقتضا پر عمل نہ کرو گے) تو حق تعالیٰ معذرت کرنے والوں کو بخش دیں گے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ للاوابین میں للتوابین سے ایک فائدہ مہمہ زائدہ ہے وہ یہ کہ توابین میں صرف معذرت پر دلالت ہے اور اوابین میں خاص تعلق پر دلالت ہے یعنی جو حالت محبت وخدمت کی پہلے تھی وہی اختیار کر لی' مطلب یہ کہ فوراً ہی معذرت کر لی جائے تو مواخذہ نہ ہو گا۔

نیز رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ میں بڑی رحمت کا اظہار کیا گیا ہے کہ خدائے تعالیٰ تو دلوں کو دیکھتے ہیں اگر تمہارے دل میں اختیاراً وعقلاً ادب وتعظیم کی صفت موجود ہو اور ظاہر میں کسی وقت غلطی سے سختی ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ ہو گا۔

ناظر قلبیم گر خاشع بود　　　گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

خدا تعالیٰ تو دل کو دیکھتے ہیں اگرچہ کسی وقت غلطی سے نامناسب لفظ ادا ہو جاوے

ماہ بروں را ننگریم وقال را　　　ما دروں را بنگریم و حال را

ہم ظاہری حالت اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن کو اور حال دیکھتے ہیں

ترجمہ: تمہارا رب تمہارے مافی الضمیر کو خوب جانتا ہے اگر تم سعادت مند ہو تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

امر طبعی میں بندہ معذور ہے

پارہ سبحان الذی میں حقوق والدین کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۝ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجیوں سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے یہ تو امر طبعی ہے اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جاوے اس میں معذور ہو لیکن خدائے تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخش دیتا ہے صاحبو! ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۝۲۷

ترجمہ: بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔

تفسیری نکات

مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب

مسلمانو کیا حالت ہے تمہاری اپنے ہاتھوں اس قدر تباہی مول لی ہے کہ دن بدن گرتے جاتے ہو یہ واویلا تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ مسلمان تباہ حال ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس مال کی اتنی کمی نہیں ہے جتنا شور وغل ہے ہاں خرچ زیادہ ہے اس کی کمی کرنی چاہئے اور اس کیلئے معیار شریعت سے اچھا کوئی بھی نہیں ہے شریعت کے موافق چلئے دیکھئے پھر کتنی شکایت کم ہو جاتی ہے غرض کہ مال کو غنیمت سمجھو اور اس کو عطیہ الٰہی خیال کرو جس کے خرچ کا حساب دینا ہوگا بے دھڑک اور بے سوچے سمجھے خرچ مت کرو میری تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مال کو عطیہ الٰہی نہ سمجھنا یہی سبب ہے اس کے مفاسد کا اسی طرح قرآن کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (اور زیادہ فضول

خرچی مت کرو یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے) مبذرین کو اخوان الشیاطین فرمایا اور شیطان کی صفت کفور فرمائی تو مبذرین کے لئے بھی یہ صفت کفور ثابت ہو گئی اور کفور کفران سے مشتق ہے جس کے معنی ناشکری کے ہیں اس کا مقابل شکر ہے جب ناشکری سبب ہوئی اسراف و اضاعت مال کی تو شکر سبب ہوگا حفظ مال کا اور ناشکری کی مذمت ہے اور اس سے نہی ہوئی ہے تو شکری کی مدح ہوئی اور اس پر تحریض ہو گئی دیکھئے آیت میں میرے قول کی تائید موجود ہے کہ قلت شکر سبب ہے اسراف کا اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۝

نہ اپنے ہاتھوں کو گردن سے باندھ لو (کچھ خرچ ہی نہ کرو) اور نہ پوری طرح کھول دو پھر تم نشانہ ملامت ہو جاؤ گے (یعنی بخل کی صورت میں) اور مفلس کنگال ہو جاؤ گے (اسراف کی صورت میں) دوسری جگہ فرماتے ہیں

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا

اور (وہ نیک بندے) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

انفاق و اقتار میں اعتدال مطلوب ہے

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ نہ انفاق مطلقاً محمود ہے نہ اقتار بلکہ دونوں میں اعتدال مطلوب ہے جس کی تفصیل فقہاء کے کلام میں ملتی ہے۔ فضول خرچی یہ ہے کہ معصیت میں خرچ کیا جائے اسراف میں صرف رنڈی بھڑووں میں خرچ کرنا ہی داخل نہیں بلکہ تفاخر اور ناموری کے لئے خرچ کرنا بھی معصیت کی فرد ہے اس طرح مباحات میں بلا ضرورت اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف میں داخل ہے اسی طرح طاعات ضروریہ میں استطاعت سے زیادہ صرف کرنا جس کا انجام اخیر میں بے صبری اور حرص و بدنیتی ہو یہ بھی اسراف ہے کیونکہ حرص و بدنیتی اور بے صبری یہ امور معصیت ہیں اور اس کا سبب ہوا استطاعت سے زیادہ صرف کرنا اور مفضی الی المعصیت (گناہ کی طرف پہنچانے والا) بھی معصیت ہوتا ہے لہٰذا یہ انفاق معصیت ہوا۔

خلاصہ یہ کہ معصیت میں خرچ کرنا تو مطلقاً اسراف ہے اور طاعات ضروریہ میں بالکل خرچ نہ کیا جائے یا حکم شرعی سے کم ادا کیا جائے اسی طرح مستحبات و مباحات میں اتنی تنگی کی جائے جس سے اپنے کو یا اہل و عیال کو تکلیف ہو یہ بھی ناجائز ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝

ترجمہ: مت اتباع کر اس شے کی جس کی تجھ کو تحقیق نہیں بے شک کان اور آنکھ اور قلب ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔

تفسیری نکات

چار چیزوں کی حفاظت کا حکم

اس آیت کے سیاق وسباق میں بعض ضروری نصائح ومواعظ مفیدہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں اور سب کے آخر میں بطور امتنان کے فرمایا ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ یعنی اے محمد ﷺ یہ سب مذکورہ نصائح ان حکمۃ کی باتوں سے ہیں کہ تمہارے رب نے تمہاری طرف وحی فرمائی ہے اس امتنان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام نصائح جو یہاں مذکور ہیں نہایت اہتمام کے قابل ہیں منجملہ ان کے یہ آیات ہے۔

اس آیت میں چار چیزوں کی حفاظت کا حکم کیا ہے قلب' آنکھ' کان یہ تین چیزیں تو بالتصریح بیان فرمائیں چوتھی چیز بقیہ جوارح یعنی ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ کی حفاظت ہے وہ بالتصریح اس آیۃ میں مذکور نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کی حفاظت کو وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ میں دلالۃ ذکر فرمایا ہے چنانچہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کی حقیقت میں بلاتحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تمام جوارح کی حفاظت بھی آ گئی ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے بلاتحقیق کسی امر کا اتباع کرنا اب اس کی تحقیق کی چند صورتیں ہیں مثلاً کوئی شے گم ہو جائے بلاتحقیق قرائن موہومہ پر کسی کو چور کہہ دیا چور کہنا زبان کا گناہ ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اس گناہ سے روکتا ہے دیکھئے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ پر عمل نہ ہونے سے زبان کا گناہ ہو گیا۔

حاصل یہ ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ میں بطریق مذکور زبان کی حفاظت کا حکم بھی داخل ہو گیا ہے اور ہاتھ کی حفاظت اس طور سے داخل ہوئی کہ بلاتحقیق جرم کسی پر ظلم کرنا حرام ہے۔ اور اس میں بھی مخالفت ہوئی وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ الایۃ کی اسی طرح پاؤں کی حفاظت اس طرح داخل ہے کہ بلاتحقیق ضرورت از شرعی کسی ناجائز مجمع میں جانا حرام ہے اسی طرح سب جوارح کی حفاظت اس میں داخل ہو گئی اور سمع وبصر وفواد کی حفاظت تو بالتصریح ہے اس میں مذکور ہے مثلاً کان کو غیر مشروع اصوات ومضامین سے بچانا آنکھ کو

غیر محارم کی طرف نظر کرنے سے بچانا قلب کو گمان بد وغیرہ سے بچانا اور اس سے کسی کو شبہ قیاس فقہی کے بطلان کا نہ ہو کہ ظاہراً وہاں بھی اتباع ہے ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں کیونکہ حکم مجتہد فیہ ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے خصوص جب کہ دوسری آیت میں بھی اتباع ظن کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً وہ لوگ اتباع کرتے ہیں مگر خیالی باتوں کا اور خیالی چیز ان پر حق سے علیحدہ اور مطمئن نہیں ہو سکتے) جواب شبہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے یہ مسئلہ تحقیق کو پہنچ گیا کہ قیام سے اجتہاد جائز اور واجب العمل ہے تو اس پر مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ صادق نہ آوے گا بلکہ وہ مالیس لک بہ علم کا مصداق ہوگا کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلیہ مشتبہ حجۃ قیاس بالیقین داخل ہیں اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بے شک اس کا اتباع مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع مالک بہ علم کا ہو گیا خوب سمجھ لو اور اتباع ظن کی جو مذمت آئی ہے وہاں ظن کے معنی مصطلح فقہی نہیں ہیں بلکہ ظن اصطلاح قرآن میں عام ہیں باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی چنانچہ منکیرین کے قول میں ان نظن الا ظناً آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کا احتمال بھی نہ تھا چہ جائے کہ احتمال راجح بلکہ وہ اس کو اپنے زعم میں علم صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا پس ثابت ہوا کہ اصطلاح قرآن میں ظن عام ہے امور باطلہ کو بھی پس آیۃ ذم ظن کے یہ ہیں ان یتبعون الا ما خالف الدلیل اقطعی و کل ما خالف الدلیل اقطعی لا یغني من الحق شیئا بل ھو باطل قطعاً (وہ نہیں پیروی کرتے ہیں مگر اس چیز کی جو دلیل کے خلاف ہو اور جو قطعی دلیل کے خلاف ہو وہ حق بات سے بے پرواہ نہیں کر سکتا بلکہ باطل ہے۔) پس اس آیت سے بھی شبہ کی گنجائش نہ رہے فقط جامع التماس کرتا ہے کہ بعض عوارض سے میں پورا نہ لکھ سکا جس قدر ضبط ہوا اس کو صاف کر دیا کہ خالی از نفع نہ تھا خصوص تحقیق اخیر کی بے حد لطیف و نافع ہے خصوص طلبہ کے لئے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اور ارشاد ہے اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا اس آیت پر بھی بعض اشکالات علمیہ واقع ہوتے ہیں میں ان کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں اور ان کا منشا بھی وہی اتباع اصطلاعات درسیہ ہے حاصل اشکال کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً

ظن مسائل شرعیہ میں حجت ہے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظن مفید حق نہیں ہے حالانکہ ظن مسائل شرعیہ میں مفید بلکہ حجت ہے جیسے خبر واحد و قیاس ان معترضین نے ظن کے معنی یہاں وہ مراد لئے جو ملا حسن میں انہوں نے پڑھے تھے یعنی کسی حکم کی جانب راجح پھر استاد پر اشکال کیا کہ یہ ظن تو مفید ہے وہ غریب بھی اصطلاحات درسیہ کا متبع تھا اس لئے بغلیں جھانکنے لگا حالانکہ یہاں منشاء اشکال ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ قرآن کا نزول محاورات میں ہوا ہے اصطلاحات درسیہ میں

نہیں ہوا پس قرآن کو محاورات سے سمجھنا چاہئے اور محاورات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظن کے معنی صرف وہ نہیں ہیں جو ملا حسن وغیرہ میں مذکور ہیں اور گو میں اہل عربیت کے کلام پر زیادہ نظر نہیں رکھتا مگر قرآن ہی کے چند مقامات کو دیکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ محاورات میں ظن کے معنی عام ہیں محض حکم کی جانب راجح کے ساتھ مختص نہیں چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ یہاں ظن سے مراد یقین ہے کیونکہ لقاء رب کا یقین جازم واجب ہے اور ایک جگہ حق تعالیٰ نے قیامت کے متعلق کفار کا مقولہ نقل فرمایا ہے۔ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ' یہاں بھی ظن سے مراد یعنی اصطلاحی نہیں ہیں کیونکہ کفار کو وقوع معاد کا ظن غالب وراجح بھی نہ تھا وہ تو بالکل منکر و مکذب تھے چنانچہ خود قرآن ہی میں ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا اور ارشاد ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ، پس یہاں ظن سے مراد جانب مرجوح یعنی وہم ہے کہ کفار یوں کہتے ہیں کہ ہم کو قیامت کا کچھ یوں ہی وہم سا ہوتا ہے بلکہ غور کیا جاوے تو یہاں تصدیق کا کوئی درجہ نہیں یعنی جانب مرجوح بھی مراد نہیں کیونکہ ان کو تو قیامت کا احتمال بھی نہ تھا بلکہ محض تصور ہی مراد نہیں جس میں کوئی حکم ہی نہیں ان سب موارد کو دیکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ محاورہ میں اسی کے معنی خیال ہیں خواہ وہ خیال صحیح ہو یا باطل قوی ہو یا ضعیف اس کو پیش نظر رکھ کر آیات کو دیکھئے سب حل ہو جائیں گے اور کوئی اشکال نہ رہے گا چنانچہ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا میں بھی ظن سے مراد مجرد خیال بلا دلیل ہے کہ اس سے ثبوت حق میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور ظن اصطلاحی جو کہ مفید ہے وہ خیال مع الدلیل ہے کہ اس کا مفید ہونا اس آیت کے معارض نہیں۔

علوم مکاشفات میں خطرہ ہے

فرمایا علوم معاملات (شرعی احکام) نافع ہیں اور علوم مکاشفات (تکوینی میں خطرہ ہے خصوصاً مکاشفات الٰہیہ بہ نسبت مکاشفات کونیہ زیادہ خطرناک ہیں۔ کیونکہ یہ ظنی ہیں ان کے مقتضاء پر عمل کرنا آیت'

لا تقف ما لیس لک به علم' جس کا تجھ کو علم نہ ہو اس پر مت ٹھہر'

کے خلاف ہے اسی واسطے علم کلام میں جو مباحث ہیں وہ حقیقتاً درجہ منع میں ہیں اور وہ فلاسفہ کے جوابات ہیں کہ تم جو کہتے ہو وہ غلط ہے کیونکہ اس میں تمہارے قول کے علاوہ اور بھی چنداں احتمال ہیں تو تمہارا کہنا معیار اور قطعی نہ ہوا اور اگر مباحث کلامیہ درجہ منع میں نہ ہوں تو ان مباحث کے یقینی ہونے کا دعویٰ کرنا نہایت خطرناک ہے کیونکہ نسبت کا علم موضوع کے علم پر موقوف ہے اور موضوع کا علم چونکہ ہے نہیں اس واسطے نسبت کا علم بھی نہ ہوگا اور جب نسبت کا علم نہیں تو علم کا دعویٰ کرنا لا تقف ما لیس لک به علم کے خلاف ہوگا مثلاً اس کلام میں کہ '' کلام اللہ لا عین ولا غیراً '' اس میں علم نسبت موقوف ہے علم موضوع پر اور موضوع اس قول میں کلام اللہ ہے ہم موضوع ہی کو نہیں جانتے تو لا عین ولا غیر کا قطعی ثبوت اسی کے لئے کیسے ہوگا؟ اسی

واسطے سلف نے ایسے مباحث میں گفتگو نہیں کی اور نہ ان کو حاجت ہوئی متکلمین نے ضرورت کے لئے گفتگو کی ہے وہ بھی حق یہ ہے کہ درجہ منع میں ہونی چاہئے اوران کو مستقل دعویٰ نہ قرار دیا جاوے کیونکہ یہ نہایت خطرناک ہے لیکن متکلمین متاخرین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مباحث کلام کو مستقل دعویٰ قرار دے کران پر دلائل قائم کئے ہیں مگر یہ ہے کہ نہایت خطرناک' اور صفات کے بارے میں ابن عربیؒ نے فرمایا ہے کہ صفات کو عین ذات کہنا اقرب ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر صفات میں کوئی کلام کرے تو لا عین ولا غیر سے عین کہنا اقرب ہے ورنہ اسلم ان کے نزدیک بھی یہی ہے کہ اس میں گفتگو نہ کی جائے۔(الکلام الحسن ج ۲ صفحہ ۱۳۴'۱۳۵)

فلا یسرف فی القتل انه کان منصوراً (بنی اسرائیل) سواس قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہئے وہ شخص طرفداری کے قابل ہے۔

عہد نصرت بوجہ مظلوم ہونے کے ہے

فرمایا فلا یسرف فی القتل (سواس کو قتل کے بارہ میں حد (شرع) سے تجاوز نہ کرنا چاہئے۔کے بعد انه کان منصوراً (وہ شخص طرفداری کے قابل ہے) فرمانے میں اشارہ ہے کہ عہد نصرت (مدد کا وعدہ) بوجہ مظلوم ہونے کے ہے اس میں ترغیب ہے کہ تم اسراف سے عہد نصرت کو ضائع مت کرو'

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

ترجمہ: یعنی ہم نے قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تا کہ لوگ نصیحت پکڑیں تا کہ وہ سمجھیں

تفسیری نکات

حق تعالیٰ شانہ کا شفقت کا برتاؤ

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ضابطہ کا برتاؤ کرنا نہیں ہے بلکہ دل میں اتار دینا منظور ہے۔ اور اس شفقت کے دو اثر ہیں کہ اس بناء پر ایک بات کو بار بار دہراتے ہیں دوسرا عمل کرنے کیلئے دستور العمل بھی ارشاد فرماتے ہیں۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴿۸۰﴾

ترجمہ: اور آپ یوں دعا کیجئے کہ اے رب مجھ کو خوبی کے ساتھ پہنچائیو اور مجھ کو خوبی کے ساتھ لیجائیو اور مجھ کو اپنے پاس سے ایسا غلبہ دیجیو جس کے ساتھ نصرت ہو۔

تفسیری نکات

تبادلہ کرانے کا عمل

ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ملازمت کے لئے فرمایا رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴿۸۰﴾ مع اول و آخر سات سات بار درود شریف ستر بار بعد نماز عشاء پڑھا کریں اور مدخل صدق پر جہاں کا تبادلہ مطلوب ہو تصور کریں اور مخرج صدق پر جہاں سے جانا مطلوب ہو اور سلطاناً نصیراً پر یہ کہ عزت کے ساتھ تبادلہ ہو۔

وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴿۸۵﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ آپ سے روح کو (امتحاناً) پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

تفسیری نکات

حقیقت روح

فرمایا کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ میں جہلاء صوفیہ نے عجب گڑبڑ کی ہے جبھی تو ابن تیمیہ وغیرہ صوفیہ پر خفا ہوتے ہیں ایک اصطلاح ہے کہ عالم دو ہیں عالم امر یعنی مجردات اور عالم خلق یعنی مادیات اس اصطلاح پر آیت کی تفسیر کرلی کہ روح عالم امر سے ہے یعنی مجرد ہے تو اس کا تجرد قرآن سے ثابت کیا مگر یہ استدلال محض لغو ہے کیونکہ اصطلاح خود مقرر کی اور پھر قرآن کو اس کا تابع بنایا قل الروح من امر ربی سے تو مقصود یہ ہے کہ تم روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے اتنا سمجھ لو کہ روح اللہ تعالیٰ کے امر سے پیدا ہوئی بس اس سے آگے کسی تفسیر کا دعویٰ محض گھڑت ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾

ترجمہ: اور اگر چاہیں تو اس وحی کو بالکل سلب کرلیں جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو کارساز نہ پائیں۔

تفسیری نکات

دعویٰ سے بچنے کی ضرورت

آنحضور ﷺ کو ایسا خطاب دلیل ہے قرآن کے کلام اللہ ہونے کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی ہمت نہیں کہ حضور ﷺ کو ایسا خطاب کرسکے نہ حضور ﷺ مضمون خود بنا سکتے تھے۔ جس سے آپ کے کمالات کے زوال کا امکان ظاہر ہو پھر چونکہ اس سے حضور ﷺ کے کانپ اٹھنے کا موقعہ تھا اس لئے آگے تسلی فرماتے ہیں اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ یعنی صرف رحمت کارسازی کرسکتی ہے پھر چونکہ رحمت مشیت کے تابع ہے اور مشیت ہر مقدور کے ساتھ متعلق ہوسکتی ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں مشیت کا تعلق بصورت رحمت ہی ہوگا اس لئے آگے تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا بے شک خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے حال پر بہت کچھ ہے اب پوری تسلی ہوگئی کہ گو حق تعالیٰ کو سلب وحی پر پوری قدرت ہے مگر بوجہ کمال فضل کے سلب کا وقوع کبھی نہ ہوگا۔ پس وہ ممتنع بالذات نہیں تو ممتنع بالغیر ضرور ہے اور فضل و رحمت کے ساتھ سلب پر قدرت ہونا یہی علامت ہے غایت رحمت و فضل کی کہ ایک بات پر قدرت ہے مگر فضل و انعام کی وجہ سے قدرت کو ظاہر نہیں کرتے اور اگر سلب پر قدرت نہ ہوتی تو اضطرار ہوتا اور اضطرار کی صورت میں وحی کا سلب نہ ہونا دلیل رحمت و فضل نہ ہوتی غرض ایک دفعہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے بھی فرمادیا کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ آپ جیسے کامل و اکمل کے کمالات بھی سلب کرسکتے ہیں گو کریں گے کبھی نہیں، جب حضور ﷺ کے لئے یہ ارشاد ہے پھر ہم تو کیا چیز ہیں۔ جو دعویٰ کرسکیں ہماری نماز کیا اور ہمارا علم کیا اگر حق تعالیٰ چاہیں تو دم بھر میں سب سلب کرلیں۔

حق تعالیٰ حضور ﷺ سے فرماتے ہیں

ترجمہ: اگر ہم چاہیں تو جتنی وحی آپ کی طرف بھیجی ہے سب کو سلب کرلیں پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا کارساز و مددگار نہ پائیں گے۔

کلام الٰہی کی شوکت وصولت

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے کیونکہ اتنی شوکت وصولت سوائے کلام الٰہی کے کسی کلام میں نہیں ہوسکتی کہ ایسی معظم ہستی کو کس طرح بے دھڑک خطاب ہے۔ اب سوچئے کہ حضور ﷺ کے دل پر اس کو سن کر کیا کچھ گزری ہوگی کیونکہ وہاں شرطیات کا وہ اثر نہ تھا جو ہم پر ہے تو قضایا شرطیہ کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ صدق شرطیہ کے لئے وقوع مقدم ضروری نہیں مگر حضور ﷺ پر عظمت حق منکشف تھی آپ جانتے تھے کہ حق تعالیٰ کے چاہنے ہی میں کیا دیر لگ سکتی ہے کچھ بھی نہیں اس لئے آپ تو نہ معلوم یہ سن کر کیا کچھ نہ سہم گئے ہوں گے مگر آگے فوراً تسلی دی گئی کہ ہم کو اس پر قدرت ہے مگر اس کا وقوع نہ ہوگا۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا کیونکہ آپ پر خدا کا فضل بہت بڑا ہے ایک جگہ اسی طرح اپنی عظمت وقدرت ظاہر کرنے کے لئے فرماتے ہیں فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰي قَلْبِكَ.

اللہ اللہ کہنا سخت کلمہ ہے مگر آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ نعوذ باللہ حضور ﷺ کو خدا بنا دیں میں کہتا ہوں کہ تم حضور ﷺ کی تنقیص کرتے ہو کیونکہ ہم آپ کو عبداللہ کہتے ہیں اور عبد بھی کیا عبد کامل صاحبو! نہ معلوم فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰي قَلْبِكَ سن کر حضور ﷺ کے دل پر کیا گزری ہوگی اس کو اہل نسبت خوب سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان پر یہ حالت خوب گزرتی ہے ان کو رات دن ایسے چرکے لگتے رہتے ہیں جن سے ان کی اصلاح وتنبیہ مقصود ہوتی ہے پھر جو ان پر گزرتی ہے ان کو وہی جانتے ہیں۔

عبادت پر ناز مناسب نہیں

اکثر لوگوں کو جو اپنی عبادت یا کسی اپنی حالت پر ناز ہو جاتا ہے اس کی بابت فرمایا کہ جب خداوند کریم حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝ یعنی اگر ہم چاہیں تو یہ سب علوم جو وحی کے ذریعے آپ کو عطا کئے ہیں آپ سے سلب کرلیں تو دوسرا کون شخص ہے کہ اپنی کسی حالت پر ناز کرسکے بلکہ ہر وقت تغیر و زوال سے ترساں لرزاں رہنا چاہئے۔

فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی میں دو خوف جمع نہ ہوں گے جو شخص دنیا میں خائف رہے گا اور قیامت میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ کا مصداق ہوگا اور جو دنیا میں بے باک رہے گا وہ آخرت میں خوف میں مبتلا ہوگا تو انسان کو چاہئے کہ خائف اور امیدوار رہے۔

رسالۃ وجیزۃ و مفیدۃ فی ربطِ الآیات

سبق الغایات
فی
نسق الآیات

تالیف

حضرت حکیم الامت مجدد الملت جامع الکمالات منبع الحسنات ماہر العلوم القرآنیۃ، واقف الاسرار الفرقانیۃ،
راس المفسرین مقدام الراسخین صاحب الشریعۃ والطریقۃ، بحر المعرفۃ والحقیقۃ کاشف الاسرار الخفی منہا والجلی اعنی بہ

مولانا محمد اشرف علی التھانوی

نور اللہ مرقدہٗ وجعل الجنۃ مثواہ

سورۃ النساء

یایها الناس اتقوا الخ اعلم ان هذه السورة مشتملة علی انواع کثیرة من التکالیف و ذلک لانه تعالیٰ امر الناس فی اول هذه السورة بالتعطف علی الاولاد والنساء والایتام والرافة بهم وایصال حقوقهم الیهم و حفظ اموالهم علیهم و بهذا المعنی ختمت السورة و هو قوله تعالیٰ یستفتونک و ذکر فی اثناء هذه السورة انواعا اٰخرمن التکالیف و هی الامر بالطهارة والصلوة و قتال المشرکین و لماکانت هذه التکالیف شاقة علی النفس لثقلها علی الطباع لاجرم افتتح السورة بالعلة التی لاجلها یجب حمل هذه التکالیف الشاقة و هی تقوی الرب الذی خلقنا والاله الذی او جدنا فلهذا قال یایهاالناس اتقوا الخ واٰتواالیتٰمی الخ اعلم انه تعالیٰ لما افتتح السورة بذکر مایدل علی انه یجب علی العبدان یکون منقاداً لتکالیف الله تعالیٰ محترز اعن مساخطة شرع بعد ذلک فی شرح اقسام التکلیف فالنوع الاول مایتلق باموال الیتامی و هو هذه الأیة و ان خفتم ان لا تقسطوا الخ اعلم ان هذا هوالنوع الثانی من الاحکام التی ذکرها فی هذه السورة هو حکم الانکحة ولاتوتوا السفهاء الخ واعلم ان هذا هوالنوع الثالث من الاحکام المذکورة فی هذه السورة فی ابی السعود رجوع الی بیان بقیة الاحکام المتعلقة باموال الیتامی وتفصیل مااجمل فیما سبق من شرط ایتاء ها ووقته و کیفیة وابتلوا الخ اعلم انه تعالیٰ لما امرمن قبل بدفع مال الیتیم الیه بقوله و اٰتواالیتامی بین فی هذه الأیة متی یؤتیهم اموالهم للرجال نصیب الخ اعلم ان هذا هوالنوع الرابع من الاحکام المذکورة فی هذه السورة و هوما یتعلق بالمواریث والفرائض ولیخش الذین الخ فی ابی السعود امرللاوصیاء بان نحشوا الله تعالی ان الذین یاکلون الخ فی ابی السعود استیناف جیء به لتقریر مضمون مافصل من الاوامر والنواهی یوصیکم الله الخ فی ابی السعود شروع فی تفصیل احکام المواریث لجملة فی قوله تعالیٰ للرجال نصیب الخ تلک حدود الله الخ انه تعالیٰ بعد بیان سهام المواریث ذکرالوعدوالوعید ترغیبا فی الطاعة و ترهیباً عن المعصیة واللاتی یاتین الخ فی ابی السعود شروع فی بعض اٰخرمن الاحکام المتعلقة بالنساء اثر بیان احکام المواریث انما التوبة الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر فی الأیة الاولی ان المرتکبین للفاحشة اذا تاباواصلحا زال الاذی عنهماواخبر علی الاطلاق ایضاانه تواب رحیم ذکر وقت التوبة و شرطها و

ل وجه تعلق اولها ما حرمها قبلها ان کلیهما مشترک فی الامر بالتقوی ۱۲ منه

رغبهم فی تعجیلها لئلایأتیهم الموت و هم مصرون فلاتنفعهم التوبة ولیست التوبة الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر شرائط التوبة المقبولة اردفها بشرح التوبة التی لاتکون مقبولة یایها الذین اٰمنوا الخ اعلم انه تعالیٰ بعد وصف التوبة عادالی احکام النساء و اعلم ان اهل الجاهلیة کانوا یؤذون النساء بانواع کثیرة من الایذاء و یظلمونهن بضروب من الظلم فالله تعالیٰ نهاهم عنها فی هذه الاٰیات فالنوع الاول قوله تعالیٰ یحل لکم النوع الثانی ولاتعضلوهن الخ النوع الثالث وعاشروهن الخ والنوع الرابع قوله تعالی و ان اردتم الخ النوع الخامس من الامور المتعلقة بالنساء ولاتنکحوا ما نکح الخ النوع السادس قوله تعالیٰ حرمت علیکم امهاتکم الخ

النوع السابع قوله تعالیٰ و من لم یستطع یرید الله الخ فی ابی السعود استیناف مسوق لتقریر ماسبق من الاحکام و بیان کونها جاریة علی مناهج المهتدین من الانبیاء والصالحین والله یرید الخ فی ابی السعود جملة مبتدأة مسوقة لبیان کمال منفعة مااراده الله تعالیٰ و کمال مضرة مایرید الفجرة لالبیان اراد تعالیٰ التوبته علیهم حتی یکون من باب التکریر للتقریر النوع الثامن قوله تعالیٰ یایها الذین اٰمنوا لاتاکلوا الخ لما شرح کیفیة التصرف فی النفوس بسبب النکاح ذکر بعده کیفیة التصرف فی الاموال ولا تقتلوا انفسکم الخ فی ابی السعود قدجمع فی التوصیة بین حفظ النفس وحفظ المال لما انه شقیقها من حیث انه سبب لقوامها و تحصیل کمالاتها ان تجتنبوا الخ اعلم انه تعالی لما قدم ذکر الوعید اتبعه بتفصیل مایتعلق به ولا تتمنوا ما فضل الخ فی ابی السعود قال القفال لما نهاهم الله تعالیٰ عن اکل اموال الناس بالباطل وقتل الانفس عقبه بالنهی عمایؤدی الیه من الطمع فی اموالهم و تمنیها و قیل نهاهم اولاعن التعرض لاموالهم بالجوارح ثم عن التعرض لهابالقلب علی سبیل الحسد تطهیرا اعمالهم الظاهرة والباطنة للرجال نصیب الخ فی ابی السعود لکل من الفریقین فی المیراث نصیب معین المقدار مما اصابه بحسب استعداده و لکل جعلنا موالی الخ فی ابی السعود جملة مبتدأة مقررة لمضمون ماقبلها الرجال قوامون الخ فی ابی السعود کلام مستانف مسوق لبیان سبب استحقاق الرجال الزیادة فی المیراث تفصیلا اثر بیان تفاوت استحقاقهم اجمالا النوع التاسع واعبدواالله الخ اعلم انه تعالیٰ لما ارشد کل واحد من الزوجین الی المعاملة الحسنة مع الاٰخروالی ازالة الخصومة و الخشونة ارشد فی هذه الاٰیة الی سائرالاخلاق الحسنة و ماذا علیهم الخ فی ابی السعوداي علی من ذکر من الطوائف قال المسکین ای غیرالمؤمنین و غیر المخلفین فی الانفاق ان الله لایظلم الخ اعلم ان تعلق هذه الاٰیة هو بقوله تعالی ماذا علیهم فکیف اذا الخ وجه النظم هوانه تعالیٰ بین ان فی الاٰخرة لایجری علی احدظلم و انه تعالی یجازی المحسن علی احسانه و یزیده علی قدر حقه فبین تعالی فی هذه الاٰیة ان ذلک یجری بشهادة الرسل الذین جعلهم الله

الحجة علی الخلق و یکون هذا و عیداللکفار ووعداللمطیعین النوع العاشر یایها الذین اٰمنوا لاتقربوا الصلوٰة الخ قوله تعالی الم ترالی الذین اوتوانصیبا الخ قال المسکین لعله مرتبط بقوله تعالی و یکتمون مااٰتاهم الله من فضله ای من العلم و نعت النبی صلی الله علیه وسلم بقرینة قوله تعالیٰ ثمه و اعتدنا للکافرین لان کتمانهم هذا کفرلاکتمان الاموال فقرر فی هذه الاٰیة مایتعلق بهذا الکتمان من اخذحطام الدنیا علیه و تحریف الکتاب و معاداة صاحب النعت یایها الذین اوتواالکتٰب الخ بعد ان حکی عن الیهودانواع مکرهم و ایذاء هم امرهم بالایمان و قرن بهذا الامر الوعید الشدید علی الترک ان الله لایغفرالخ فی ابی السعود کلام مستأنف مسوق لتقریر ماقبله من الوعید فان الشرح قدنص علی اشراک اهل الکتٰب قاطبة الم ترالی الذین یزکون الخ اعلم انه تعالیٰ لماهدداالیهود بقوله ان الله لایغفرقالوا لسنامن المشرکین بل نحن من خواطر الله تعالیٰ کما حکی تعالیٰ عنهم انهم قالوا نحن ابناء الله واحباوه فذکر تعالی فی هذه الاٰیة انه لاعبرة بتزکیة الانسان نفسه و انما العبرة بتزکیة الله الم ترالی الذین اوتوا الخ اعلم انه تعالیٰ حکی عن الیهود نوعا اخرمن المکروهوانهم کانوا یفضلون عبدة الاصنام علی المؤمنین ولا شک انهم کانواعٰلمین بان ذلک باطل فکان اقدامهم علی هذا القول بحض العناد والتعصب ام لهم نصیب الخ اعلم انه تعالی وصف الیهود فی الاٰیة المتقدمة بالجهل الشدید و هواعتقادهم ان عبادة الاوثان افضل من عبادة الله و وصفهم فی هذه الاٰیة بالبخل والحسد فمنهم من اٰمن الخ والمعنی ان اولئک الانبیاء مع ماخصصتهم به من النبوة والملک جرت عادة انهم فیهم ان بعضهم اٰمن به و بعضهم بقواعلی الکفرفاتت یامحمد لاتتعجب مما علیه هؤلاء و ذلک تسلیة من الله ان الذین کفروا الخ اعلم انه تعالیٰ بعد ما ذکرالوعید بالطائفة الخاصة من اهل الکتاب بین مایعلم الکافرین من الوعید والذین اٰمنوا الخ اعلم انه قد جرت عادة الله تعالی فی هٰذا الکتٰب الکریم بان الوعد والوعید یتلازمان فی الذکر علی سبیل الاغلب ان الله یأمرکم الخ لما حکی عن اهل الکتٰب انهم کتموا الحق امرالمؤمنین فی هذه الاٰیة باداء الامانات فی جمیع الامور سواء کانت تلک الامور من باب المذاهب والدیانات اومن باب الدنیا والمعاملات یایها الذین الخ اعلم انه تعالیٰ لما امرالرعاة والولاة بالعدل فی الرعیة امرالرعیة بطاعة الولاة الم ترالی الذین الخ اعلم انه تعالیٰ لما اوجب فی الاٰیة الاولی علی جمیع المکلفین ان یطیعوا الله و طیعوالرسول ذکر فی هذه الاٰیة ان المنافقین والذین فی قلوبهم مرض لایطیعون الرسول ولایرضون بحکمه و انما یریدون حکم غیره و ما ارسلنامن رسول الخ اعلم انه تعالیٰ لما امربطاعة الرسول فی قوله واطیعوا الرسول رغب فی هذه الاٰیة مرة اخری فی طاعة الرسول ولوانا کتبنا الخ اعلم ان هذه الاٰیة متصلة بماتقدم من امرالمنافقین و ترغیبهم فی الاخلاص و ترک النفاق والمعنی انا لوشددنا

التکلیف علی الناس لصعب ذلک علیھم و حینئذیظھر کفرھم و عنادھم فلما لم نفعل ذلک رحمة منا علی عبادنا بل اکتفینابتکلیفھم فی الامور السھلة فلیقبلوھا بالاخلاص حتی ینالوا خیرالدارین و من یطع اللہ الخ اکدارالامربطاعة اللہ و طاعة الرسول فی ھذہ الأیة مرة اخری یایھا الذین اٰمنوا خذوا الخ اعلم انه تعالی عاد بعد الترغیب فی طاعة اللہ و طاعة الرسول الی ذکرالجھاد الذی تقدم لانه اشق الطاعات ولانه اعظم الامور التی بھایحصل تقویة الدین فلیقاتل الخ اعلم انه تعالی لمادم المبطئین فی الجھاد عاد الی الترغیب فیه ومالکم لاتقاتلون الخ اعلم انه المراد منه انکارہ تعالی لترکھم القتال فصار ذلک توکیدالماتقدم من الامر بالجھاد الذین اٰمنوایقاتلون الخ قال ابوالسعود کلام مبتدأ سیق لترغیب المؤمنین فی القتال وتشجیعھم بیان کمال قوتھم بامداد اللہ تعالی و نصرته و غایة ضعف اعدائھم الم ترالی الذین قیل لھم الخ قال ابوالسعود تعجیب لرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من احجامھم عن القتالی مع انھم کانوا قبل ذلک راغبین فیه حراصاً علیه این ماتکونوا الخ والمقصود من ھذا الکلام تکبیت من حکی عنھم انھم عند فرض القتال یخشون الناس الخ فبین تعالی انه لاخلاص لھم من الموت فبان یقع علی وجه یکون مستعقبا للسعادة الابدیة کان اولی و ان تصبھم الخ لما حکی عن المنافقین کونھم متشاقلین عن الجھاد حکی عنھم فی ھذہ الأیة خصلة اخری قبیحة اقبح من الاولی وارسلنک للناس الخ قال ابوالسعود بان لحلاله منصه علیه السلام و مکانته عنداللہ عزوجل لعله بیان بطلان زعمھم الفاسد فی حقه علیه الصلوة والسلام بناء علی جھلھم بشانه الجلیل من یطع الرسول الخ قال ابوالسعود بیان لاحکام رسالة علیه الصلوة والسلام اثر بیان تحققھا و ثبوتھا و یقولون طاعة الخ قال ابوالسعود شروع فی بیان معاملتھم مع الرسول صلی اللہ علیه وسلم بعد بیان وجوب طاعة افلا یتدبرون القرأن الخ اعلم انه تعالی لما حکی عن المنافقین انواع مکرھم و کیدھم و کان کل ذلک لاجل انھم کانوا یعتقدون کونه محقافی اداء الرسالة صادقا فیه بل کانوایعتقدون انه مفترمتخرص فلاجرم امرھم اللہ تعالی بان ینظرو اویتفکروا فی الدلائل الدالة علی صحة نبوته واذاجاء ھم امر من الامن اوالخوف الخ اعلم انه تعالیٰ حکی عن المنافقین فی ھذہ الأیة نوعا اٰخرمن الاعمال الفاسدة وھوانه اذاجاء ھم الخ فقاتل فی سبیل اللہ الخ اعلم انه تعالی لما امربالجھاد و رغب فیه اشدالترغیب فی الأیات المتقدمة عاد فی ھذہ الأیة الی الامربالجھاد من یشفع شفاعةً الخ قال ابوالسعود جملة سیقت لبیان انه له علیه الصلوة والسلام فیما امربه من تحریض المؤمنین حظامو فوراً واذا حییتم الخ فی النظم وجھان الاول انه لما امر المؤمنین بالجھاد امرھم ایضابان الاعداء لورضوابالمسالمة فکونوا انتم راضین بھاالثانی ان الرجل فی الجھاد کان یلقی الرجل فی دارالحرب اوما یقار بھا فیسلم علیه فقد لایلتفت الی سلامه علیه و

یقتله وربما ظہرانه کان مسلما فمنع الله المؤمن عنه الله لااله الا ھو الخ اکدبالوعید فی قوله ان الله کان علی کل شیء حسیبا ثم بالغ فی تاکید ذلک الوعید بھذه الأیة فمالکم فی المنافقین الخ اعلم ان ھذانوع اٰخرمن احوال المنافقین ودوالوتکفرون الخ لما قال قبل ھذه الأیة اتریدون قررذلک الاستعباد بان قال انھم بلغوا فی الکفرالی انھم یتمنون ان تصیروا ایھا المسلمون کفارا فلما بلغوا فی تعصبھم فی الکفرالی ھذا الحد فکیف تطمعون فی ایمانھم وماکان لمؤمن الخ اعلم انه تعالیٰ لما رغب فی مقابلة الکفار و حرض علیھا ذکر بعد ذلک ما یتعلق بھذه المحاربة فمنھا انه قدیتفق ان یری الرجل رجلا یظنه کافراحربیا فیقتله ثم یتبین انه کان مسلما فذکرالله تعالی حکم ھذه الواقعة فی ھذا الأیة ومن یقتل مؤمنًا الخ اعلم انه تعات لما ذکر حکم القتل الخطاء ذکر بعده بیان حکم القتل العمدوله احکام و قد ذکر تعالی ذلک فی سورة البقرة فلاجرم ھمنااقتصر علی بیان ما فیه من الاثم والوعید یایھا الذین اٰمنوا اذا ضربتم الخ اعلم انّ المقصود من ھذة الایة المبالغة فی تحریم قتل المؤمنین وامرالمجاھدین بالتثبت فیه لئلایسفکوادما حراماتاویل ضعیف لایسوی القاعدون الخ قال ابوالسعود بیان لتفاوت طبقات المؤمنین بحسب تفاوت درجات مساعیھم فی الجھاد بعدما مرمن الامریه و تحریض المؤمنین علیه لیانف القاعد عنه و یترفع بنفسه عن انحطاط رتبته فیھتزله رغبته فی ارتفاع طبقته ان الذین توفاھم الخ قال ابوالسعود بیان لحال القاعدین عن الھجرة اثر بیان حال القاعدین عن الجھاد ومن یھاجر الخ قال ابوالسعود ترغیب فی المھاجرة وتانیس لھاواذا ضربتم فی الارض الخ اعلم ان احدالامور التی یحتاج المجاھدالیھا معرفة کیفة اداء الصلوة فی زمان الخوف والاشتغال بمحاربة العدو فلھذا المعنی ذکره الله تعالی فی ھذه الأیةواذا کنت فیھم الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین فی الأیة المتقدمة حال قصرالصلوة بحسب الکمیة فی العدد بین فی ھذه الأیة حالھا فی الکیفیة ولاتھنوا الخ اعلم انه تعالی لما ذکر بعض الاحکام التی یحتاج المجاھد الی معرفتھا عادمرة اخری الی الحث علی الجھاد انا انزلنا الیک الخ لما شرح احوال المنافقین علی سبیل الاستقصاء ثم اتصل بذلک امرالمحاربة واتصل بذکر المحاربة مایتعلق بھامن الاحکام الشرعیة رجع الکلام بعد ذلک الی احوال المنافقین و ذکرانھم کانوایحاولون ان یحملوا الرسول علیه الصلوة والسلام علی ان یحکم بالباطل و یذرالحکم الحق فاطلع الله رسوله علیه وامره بان لایلتفت الیھم ولا یقبل قولھم فی ھذا الباب و من یشاقق الرسول الخ اعلم ان تعلق ھذه الأیة بما قبلھا ھو ما روی ان طعمة بن ابیرق لما رای ان الله تعالیٰ ھتک ستره و براٴ الیھودی عن تھمة السرقة ارتدوذھب الی مکة و نقب جدارانسان لاجل السرقة فتھدم الجدارعلیه ومات فنزلت ھذه الأیة ان الله لا یغفرالخ انما یحسن اتصالھا بما قبلھا لوکان المرادان ذلک السارق لو لم یرتدلم یصرمحروما

عن رحمتی ولکنه لما ارتدواشرک باللہ صارمحروما قطعاً عن رحمة الله ثم انه تعالیٰ بین کون المشرک ضلالابعیدافقال ان یدعون الخ لیس بامانیکم الخ قال المسکین ابطال للامانی المذکورة سابقا فی قوله تعالی یعدهم و یمنیهم وذکرامافی اهل الکتٰب استطراد اوتتمیما للفائدة ثم ذکر کون الایمان والاعمال معتبرا بقوله من یعمل الخ و من احسن دینا الخ اعلم انه تعالیٰ لما شرط حصول النجاة والفوزبالجنة بکون الانسان مؤمنا شرح الایمان و بین فضله و یستفتونک فی النساء الخ اعلم ان عادة الله تعالی فی ترتیب هذا الکتاب الکریم وقع علی احسن الوجوه و هوانه یذکر شیئا من الاحکام ثم یذکر عقبیه اٰیات کثیرة فی الوعد والوعید والترغیب والترهیب و یخلط بما اٰیات دالته علی کبریاء الله وجلال قدرته و عظمة الٰهیة ثم یعودمرة اخری الی بیان الاحکام و هذا احسن انواع الترتیب واقربها الی التاثیر فی القلوب لان التکلیف بالاعمال الشاقة لایقع فی موقع القبول الااذاکان مقرونا بالوعدوالوعید والوعد والوعید لایؤثر فی القلب الاعند القطع بغایة کمال من صدر عنه الوعدالوعید فظهر ان هذاالترتیب احسن الترتیبات اللائقة بالدعوة الی الدین الحق اذا عرفت هذا فنقول انه سبحانه ذکر فی اول هذه السورة انواعا کثیرة من الشرائع والتکالیف ثم اتبعها بشرح احوال الکافرین والمنافقین و استقصے فی ذلک ثم ختم تلک الأیات الدالة علی عظمة جلال الله و کمال کبریاء ہ ثم عاد بعد ذلک الی بیان الاحکام فقال و یستفتونک الخ و ان امرأة خافت الخ اعلم ان هذا من جملة ما اخبرالله تعالیٰ انه یفتیهم به فی النساء ممالم یتقدم ذکره فی هذه السورة ولله ما فی السمٰوٰت الخ لما ذکر انه یغنی کلامن سعة و انه واسع اشارة الی ماهو کالتفسیر لکونه واسعاً یایها الذین اٰمنوا کونوا الخ تقدم فی هذه السورة امرالناس بالقسط وامرهم بالاشهاد عنددفع اموال الیتامی الیهم وامرهم بعد ذلک ببذل النفس والمال فی سبیل الله و اجری فی هذه السورة قصة طعمة بن ابیرق و اجتماع قومه علی الذب عنه بالکذب و الشهادة علی الیهودی بالباطل ثم انه تعالیٰ امر فی هذه الأیة بالمصالحة مع الزوجة ومعلوم ان ذلک امر من الله لعباده بان یکونوا قائمین بالقسط شاهدین لله علی کل احد بل و علی انفسهم فکانت هذه الأیة کالموکد لکل ماجری ذکره فی هذه السورة من انواع التکالیف یایها الذین اٰمنوا الخ لما بین الاحکام الکثیرة فی هذه السورة ذکر عقیبها اٰیته الامر بالایمان ان الذین اٰمنوا الخ اعلم انه تعالی لاامربالایمان و رغب فیه بین فساد طریقة من یکفربعد الایمان بشرالمنافقین الخ قال المسکین ذکر المنافقین اثر ذکرالکافرین یایها الذین اٰمنوالاتتخذواالکفرین الخ اعلم انه تعالی لماذم المنافقین بانهم مرة الی الکفرة ومرة الی المسلمین من غیران یستقروا مع احدالفریقین نهی المسلمین فی هذه الایة ان یفعلوامثل فعلهم لایحب الله الجهر الخ

قال المسکین نهی الله تعالی فیما سبق عن موالاة الکفار و نهی فی هذه الأیة عن معاداتهم بمالم یاذن به الشرع ان الذین یکفرون بالله ورسله الخ اعلم انه تعالیٰ لما تکلم علی طریقة المنافقین عادیکلم علی مذاهب الیهود والنصری و مناقضاتهم و ذکر فی اٰخر هذه السورة من هذا الجنس انواعا النوع الاول من اباطیلهم ایمانهم ببعض الانبیاء دون البعض والذین اٰمنوا الخ لما ذکر الوعید اردفه بالوعد یسألک اهل الکتاب الخ اعلم ان هذا هوالنوع الثانی من جهالات الیهود فبظلم الخ اعلم انه تعالی لما شرح فضائح اعمال الیهود و قبائح الکٰفرین ذکر عقیبه تشدیده تعالیٰ علیهم فی الدنیا والأخرة لکن الراسخون الخ اعلم انه تعالیٰ لما وصف طریقة الکفار والجهال من الیهود وصف طریقة المؤمنین منهم انا اوحینا الیک الخ اعلم انه تعالی لما حکی ان الیهود سالوا الرسول صلی الله علیه وسلم ان ینزل علیهم کتابامن السماء و ذکر تعالی بعده انهم لایطلبون ذلک لاجل الاسترشاد ولکن لاجل العناد واللجاج و حکی انواعا کثیرة من فضائحهم و قبائحهم و امتدالکلام الی هذا المقام شرع الأن فی الجواب عن تلک الشبهة فقال انا اوحینا الخ والمعنے انا توافقناعلی نبوة نوح و ابراهیم واسمٰعیل و جمیع المذکورین فی هذه الأیة و علی ان الله تعالیٰ اوحی الیهم ولاطریق الی العلم بکونهم انبیاء الله ورسل الاطهور المعجزات علیهم ولکل واحد منهم نوع اٰخرمن المعجزات علی التعیین وما انزل الله علی کل واحدمن هؤلاء المذکورین کتابا بتمامه مثل ماانزل الی موسیٰ فلما لم یکن عدم انزال الکتاب علی هؤلاء دفعة واحدة قادحا فی نبوتهم بل کفی فی اثبات نبوتهم ظهور نوع واحد من انواع المعجزات علیهم علمنا ان هذه الشبهة زائلة و ان اصرارالیهود علی طلب هذه المعجزة باطل لکن الله یشهد الخ لما قال انا اوحینا الیک قال القوم نحن لانشهد لک بذلک فنزل لکن الله یشهد ان الذین کفرواوصدوا الخ اعلم ان هذا من صفات الیهود الذین تقدم ذکرهم یایهاالناس قدجاء کم الرسول الخ اعلم انه تعالیٰ لما اجاب عن شبهة الیهود علی الوجود الکثیرة و بین فساد طریقة هم ذکر خطاباعاما یعمهم و یعم غیرهم فی الدعوة الی دین محمد علیه الصلوة والسلام یا اهل الکتاب لاتغلوا الخ واعلم انه تعالی لما اجاب عن شبهات الیهود تکلم بعد ذلک مع النصاری فی هذه الأیة یایها الناس قدجاء کم برهان الخ اعلم انه تعالی لما اوردالحجة علی جمیع الفرق من المنافقین والکفار والیهود والنصاری واجاب عن جمیع شبهاتهم عمهم الخطاب ودعا جمیع الناس الی الاعتراف برسالة محمد علیه الصلوة والسلام یستفتونک الخ اعلم انه تعالی تکلم فی اول السورة فی احکام الاموال و ختم اٰخرها بذلک یکون الأخر مشاکلاللاول ووسط السورة مشتمل علی المناظرة مع الفرق المخالفین للدین.

سورة المائدة

احلت لکم الخ اعلم انه تعالی لماقرربالآیة الاولی جمیع المکلفین انه یلزمهم الانقیاد لجمیع تکالیف الله تعالی و ذلک و کالاصل الکلی والقاعدة الجملیة شرع بعد ذلک فی ذکر التکالیف المفصلة فبدأ بذکر ما یحل و ما یحرم من المطعومات یایها الذین اٰمنو لاتحلوا الخ اعلم انه تعالی لما حرم الصید علی المحرم فی الأیة الاولی اکد ذلک بالمنهی فی هذه الأیة عن مخالفة تکالیف الله تعالی حرمت علیکم الخ اعلم انه تعالی قال فی الاول السورة احلت لکم بهیمة الانعام ثم ذکر فیه استثناء اشیاء تتلی علیکم فههنا ذکر الله تعالی تلک الصور المستثناة عن ذلک العموم الیوم یئس الذین الخ لماعد فیما مضی ما حرمه و ما احله حرضهم علی التمسک بما شرع لهم باکمل ما یکون یسألونک ما ذا احل الخ و هذا ایضا متصل بماتقدم من ذکر المطاعم والماکل الیوم احل لکم الخ اعلم انه تعالی اخبر فی الأیة المتقدمة انه احل الطیبات و کان المقصود من ذکره الاخبار عن الحکم ثم اعاد ذکره فی هذه الأیة والغرض من ذکره انه قال الیوم اکملت لکم الخ فبین انه کما اکمل الدین و اتم النعمة فی کل ما یتعلق بالدین فکذلک اتم النعمة فی کل مایتعلق بالدنیا و منها احلال الطیبات والغرض من الاعادة رعایة هذه النکتة و من یکفر الخ المقصود منه الترغیب فیما تقدم من التکالیف والاحکام یایها الذین اٰمنوا اذا قمتم الخ قال ابوالسعود شروع فی بیان الشرائع المتعلقة بدینهم بعد بیان مایتعلق بدنیاهم واذکروا نعمة الله الخ لما ذکر هذا التکلیف اردفه بما یوجب علیهم القبول والانقیاد وذلک من وجهین الاول کثرة نعمة الله علیهم والثانی هوالمیثاق یایها الذین اٰمنوا کونوا الخ قال ابوالسعود شروع فی بیان الشرائع المتعلقة بما یجری بینهم و بین غیرهم اثر بیان ما یتعلق بانفسهم یایها الذین اٰمنوا اذکروا الخ قال السعودتذکیر لنعمة الانجاء من الشرائر بعد تذکیر نعمة ایصال الخیرالذی هو نعمة الاسلام و ما یتبعها من المیثاق و لقداخذالله میثاق بنی اسرائیل الخ لما خاطب المؤمنین فیما تقدم فقال والذکروانعمة الله علیکم و میثاقه ثم ذکرا لأن انه اخذالمیثاق من بنی اسرائیل لکنهم نقضوه وترکوا الوفاء به فلا تکونوا ایهاالمؤمنون مثل اولئک الیهود فی هذا الخلق مالدیهم لئلا تصیروا امثلهم فیما نزل بهم من المن والذلة والمسکنة ومن الذین قالوا انانصاری الخ

لـه وجه الارتباط بین اولها واخرما قبلها ان الله تعالی ختم السورة المتقدمة بقوله یبین الله لکم ان تضلوا او فی هذه السورة بین الاحکام الضروریة ۱۲ منه عفی عنه

المراد ان سبیل النصاری مثل سبیل الیهود فی نقض المواثیق یااھل الکتاب قدجاء کم رسولنا الخ اعلم أنه تعالیٰ لما حکی عن الیهود و عن النصاری نقضهم العهد و ترکهم ما امروا به دعاهم عقیب ذلک الی الایمان محمد صلی الله علیه وسلم واذ قال موسی لقومه الخ قال ابو السعود جملة مستأنفة مسوقة لبیان مافعلت بنو اسرائیل بعداخذ المیثاق منهم و کیفیة نقضهم له واتل علیهم نبا ابنی ادم الخ قال المسکین هذا توطئته لما هو المقصود ههنا من ذکر جنایات بنی اسرائیل کما قال ابو السعود عند قوله تعالی من اجل ذلک کتبنا علی بنی اسرائیل الخ شروع فیما هو المقصود من تلاوة النبأمن بیان بعض اٰخر من جنایات بنی اسرائیل و معاصیهم انما جزاء الذین یحاربون الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذکر فی الأیة الاولی تغلیظ الاثم فی قتل النفس بغیر قتل نفس ولا فساد فی الارض اتبعه ببیان ان الفساد فی الارض الذی یوجب القتل ماهو فان بعض مایکون فسادا فی الارض لا یوجب القتل یایهاالذین اٰمنوا اتقوالله الخ قال ابو السعود لما ذکر عظم شان القتل والفساد و بین حکمها واشیر فی تضاعیف ذلک الی مغفرته تعالی لمن تاب من جنایة امر المؤمنون بان یتقره تعالی فی کل مایاتون و ما یذرون بترک ما یجب اتقاء ہ من المعاصی التی من جملتها ماذکر من القتل والفساد و یفعل الطاعات التی من زمرتها السعی فی احیاء النفوس و دفع الفساد والمسارعة الی التوبة والاستغفار ان الذین کفروا الخ قال ابو السعود کلام مسوق لتاکید و جوب الامتثال بالاوامر السابقة و ترغیب المومنین فی المسارة الی تحصیل الوسیلة الیه عزوجل قبل انقضاء او انه والسارق والسارقة الخ قال ابو السعود شروع فی بیان حکم السرقتة الصغری بعد بیان احکام الکبری و قد عرفت اقتضاء المال لا یراد ما توسط بینهما من المقال الم تعلم ان الله الخ اعلم انه تعالیٰ لما اوجب قطع الید و عقاب الأخرة علی السارق قبل التوبه ثم ذکر انه یقبل توبة ان تاب اردفه ببیان ان له ان یفعل مایشاء و یحکم مایرید یایهاالرسول لا یحزنک الخ اعلم انه تعالی لما بین بعض التکالیف والشرائع و کان قدعلم من بعض الناس کونهم متسارعین الی الکفر لاجرم صبر رسوله علی تحمل ذلک فان جاء وک الخ قال ابو السعود لما بین تفاصیل امورهم الواهیة واحوالهم المختلفة الموجبة لعدم مبالاة بهم وبافاعیلهم جسما امربه علیه السلام خوطب علیه الصلوة والسلام ببعض ما یبتنی علیه من الاحکام بطریق التفریع والفاء فصیحة ای و اذاکان حالهم کما شرح فان جاء وک الخ و کیف یحکمونک الخ قال ابو السعود تعجیب من تحکیمهم لمن لایؤمنون به و بکتابه والحال ان الحکم منصوص علیه فی کتابهم الذی یدعون الایمان به وتنبیه علی انهم ما قصدوا بالتحکیم معرفة الحق و اقامة الشرع وافاطلبوا به مامراهون علیهم و ان لم یکن ذلک حکم الله علی زعمهم انا انزلنا التورة الخ اعلم ان هذا تنبیه من الله تعالیٰ للیهود المنکرین لوجوب الرجم وترغیب لهم فی ان یکونو

اکمتقدمیهم من مسلمی احبارهم والانبیاء المبعوثین الیهم و کتبنا علیهم فیها الخ المعنی انه تعالیٰ بین فی التورٰۃ ان حکم الزانی المحصن هوالرجم والیهود غیره وبدلوه و بین فی هذه الأیة ایضا انه تعالی بین فی التوراة ان النفس بالنفس و هؤلاء الیهود غیرو اهذا الحکم ایضاً ففضلوا بنی النضیر علی بنی قریظة و خصصوا ایجاب القودببنی قریظة دون بنی النضیر و قفینا علی اٰثارهم الخ قال ابوالسعود شروع فی بیان احکام الانجیل اثر بیان احکام التورٰۃ و انزلنا الیک الکتاب بالحق الخ قال المسکین شروع فی بیان احکام القراٰن اثر بیان احکام الکتابین لکل جعلنا الخ قال ابوالسعود کلام مستأنف جئ به لحمل اهل الکتابین من معاصربه علیه الصلوة والسلام علی الانقیاد لحکمه بما انزل الیه من القراٰن الکریم ببیان انه هوالذی کلفوا الحمل به دون غیره من الکتابین و انما الذین کلفوا الحمل بهما من مضی قبل نسخهما من الامم السالفة یایها الذین اٰمنوا لاتتخذوا الخ قال المسکین نهی المؤمنین عن موالاة اهل الکتابین اثر ذکر اوصاف الفریقین التی هی ضد لصفات المؤمنین و من اقوی الزواجر عن موالاتهما فتری الذین الخ قال المسکین بیان المداهنة المنافقین فی موالاة الکفار واعتذارهم الباطل فی ذلک یایها الذین اٰمنوامن یرتد الخ قال ابوالسعود شروع فی بیان حال المرتدین علی الاطلاق انما ولیکم الله الخ لما نهی فی الأیات المتقدمة عن موالاة الکفار امر فی هذه الأیة بموالاة من یجب موالاة یایها الذین اٰمنوالاتتخذوا الذین اتخذوا الخ اعلم انه تعالی نهی فی الأیتا لمتقدمة عن اتحاذالیهود والنصاری اولیاء و ساق الکلام فی تقریره ثم ذکرههنا النهی العام عن موالاة جمیع الکفار واذا نادیتم الخ لما حکی فی الأیة الاولی عنهم انهم اتخذوا دین المسلمین هزواولعبا ذکرههنا بعض مایتخذونه من هذا الذین هزوا ولعبا قل یاهل الکتٰب هل تنقمون الخ لما حکی عنهم انهم اتخذوا دین الاسلام هزوا ولعبا قال لهم ما الذی تنقمون من هذا الدین وما الذی تجدون فیه همایوجب اتخاذه هزوا والعباً قل هل انبئکم الخ لما امر علیه السلام بالزامهم ان ملارنقمهم الدین انما هواشتماله علی مایوجب ارتضاء ہ عندهم ایضاو کفرهم بما هو مسلم لهم امر علیه الصلوة والسلام عقیبه بان یبکتهم ببیان ان الحقیق بانقم والعیب حقیقة ما هم علیه و اذا جاء و کم قالوا الخ قال المسکین ذم لمن نافق من المذکورین و تری کثیرا منهم الخ قال المسکین ذم لبعض اٰخر منهم یایها الرسول الخ امرالرسول بان لاینظر الی قلة المقتصدین و کثرة الفاسقین ولا یخشے مکروههم یاهل الکتاب لستم الخ قال المسکین من حملة التبلیغ ان الذین اٰمنوا الخ قال المسکین لما امر بالایمان فیما قبل بین فضیلة الایمان ههنا لقد اخذنا میثاق الخ قال ابوالسعود کلام مبتداء مسوق لبیان بعض اٰخرمن جنایاتهم المنادیة باستبعاد الایمان منهم لقد کفرالذین قالوا الخ اعلم انه تعالی لما استفصی الکلام مع الیهود شرع ههنا فی الکلام مع النصاری

قل اتعبدون الخ و ھذا دلیل اخر علی فساد قول النصاری قل یاھل الکتاب لاتغلوا الخ لما تکلم اولا علی اباطیل الیھود ثم تکلم ثانیا علی اباطیل النصاری فعند ذلک خاطب مجموع الفریقین لعن الذین کفروا الخ لما خاطب اھل الکتاب بھذا الخطاب وصف السلافھم تری کثیرا منھم الخ اعلم انہ تعالی لما وصف اسلافھم بما تقدم وصف الحاضرین منھم بانھم یتولون الکفار و عبدۃ الاوثان لتجدن اشدالناس الخ لما ذکر من احوال اھل الکتاب من الیھود والنصٰری ماذکرہ ذکر فی ھذہ الاٰیۃ ان الیھود فی غایۃ العداوۃ مع المسلمین یایھا الذین اٰمنوا الا تحرموا الخ اعلم انہ تعالیٰ لما استقصے فی المناظرۃ مع الیھود و النصاری عاد بعدہ الی بیان الاحکام و ذکر جملۃ منھا النوع الاول ما یتعلق بحل المطاعم و المشارب واللذات النوع الثانی من الاحکام المذکورۃ فی ھذا الموضع قولہ تعالی لا یؤاخذکم اللہ الخ قال المسکین اخذامن الکبیر وجہ المناسبۃ بینہ و بین ما قبلہ قول الصحابۃ فکیف نصنع بایماننا ای علی ترک الطیبات قولہ تعالی یایھاالذین اٰمنوا انما الخمر الخ اعلم ان ھذاھوالنوع الثالث من الاحکام المذکورۃ فی ھذا الموضع ووجہ اتصالہ بما قبلہ انہ تعالی قال فیما تقدم لا تحرموا طیبات الخ وکلوا مما رزقکم اللہ الخ ثم مما کان من جملۃ الامور المستطابۃ الخمروالمیسر لاجرم انہ تعالی بین انھما غیر داخلین فی المحللات بل فی المحرمات و قال المسکین لعل الاقرب ان یقال کان ما تقدم نھیاً عن تحریم الحلال و ھذا نھی عن تحلیل الحرام الی قولہ تعالی ما جعل اللہ من بحیرۃ الخ بل لا یبعدان قیل الی حکم الایصاء و ما یتعلق بہ لیس علی الذین اٰمنوا الخ روی انہ لما نزلت اٰیۃ تحریم الخمر قالت الصحابۃ ان اخواننا کانوا قد شربواالخمر یوم احد ثم قتلوافکیف حالھم فنزلت ھذہ الاٰیۃ یایھا الذین اٰمنوا لیبلونکم الخ اعلم ان ھذا نوع اٰخرمن الاحکام ووجہ النظم انہ تعالی لما قال لاتحرمو الطیبات ثم استثنے الخمر والمیسر عن ذلک و فکذلک استثنے ھذا النوع من الصید عن المحللات و بین دخولہ فی المحرمات جعل اللہ الکعبۃ الخ اعلم ان اتصال ھذہ الاٰیۃ بما قبلھا ھو ان اللہ تعالی حرم فی الایۃ المتقدمۃ الاصطیاد علی المحرم فبین ان الحرم کما انہ سبب لامن الوحش والطیر فکذلک ھو سبب لامن الناس عن الاٰفات و المخافات و سبب لحصول الخیرات والسعادات فی الدنیا والاٰخرۃ اعلموا الخ قال ابوالسعود و عید لمن انتھک محارمہ ووعلالمن حافظ علی مراعاۃ حرماۃ ما علی الرسول الخ قال ابوالسعود تشدید فی ایجاب القیام بما امربہ ای الرسول قداتی بما وجب علیہ من التبلیغ بمالا مزید علیہ و قامت علیکم الحجۃ ولزمتکم الطاعۃ فلا عذرلکم من بعد فی التفریط قل لا یستوی الخ قال ابوالسعود حکم عام فی نفی المساواۃ عنداللہ تعالیٰ بین الردی من الاشخاص والاعمال والاموال و بین جیدھا قصد بہ الترغیب فی جید کل منھا والتحذیر عن ردئیھا یایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا الخ

لما قال ما علی الرسول الا البلاغ صار التقدیر کانه قال ما بلغه الرسول الیکم فخذوه و کونوا منقادین له وما لم یلغه الرسول الیکم فلا تسئلوا عنه ولا تخوضوا فیه ما جعل الله من بجیرة الخ قال المسکین اخذا من ابی السعود رد و ابطال لما ابتدعه اهل الجاهلیة اثرابطال بعض اعمالهم من تناولهم الخمر والمیسر و غیرهما یایها الذین اٰمنوا علیکم انفسکم الخ لما بین انواع التکالیف والشرائع والاحکام ثم قال ما علی الرسول الا البلغ الی قوله واذا قیل لهم تعالوا الخ فکانه تعالی قال ان هؤلاء الجهال مع ماتقدم من انواع المبالغة فی الاعذار والانذار والترغیب والترهیب لم ینتفعوا بشیء منه بل بقوا مصرین علی جهلهم مجدین علی جهالتهم وضلالتهم فلا تبالوا ایها المؤمنون بجهالتهم و ضلالاتهم بل کونوا منقادین لتکالیف الله مطیعین لا وامره و نواهیه فلایضرکم ضلالتهم و جهالتهم یایها الذین اٰمنو اشهادة بینکم الخ قال ابوالسعود استیناف مسوق لبیان الاحکام المتعلقة بامور دنیا هم اثر بیان الاحوال المتعلقة بامور دینهم یوم یجمع الله الرسل الخ اعلم ان عادة الله تعالیٰ جاریة فی هذا الکتاب الکریم انه اذا ذکر انواعاً کثیرة من الشرائع و التکالیف والاحکام اتبعها اما بالالٰهیات و اما بشرح احوال الانبیاء او بشرح احوال القیامة لیصیر ذلک مؤکدالماتقدم ذکره من التکالیف والشرائع فلا جرم لما ذکر فیما تقدم انواعاً کثیرة من الشرائع ابتعها بوصف احوال القیامة اولا ثم ذکر احوال عیسیٰ علیه السلام اذ قال الله یعیسی ابن مریم اذکر الخ اعلم انا بینا ان الغرض من قوله للرسل ماذااجبتم تو بیخ من تمرد امهم و استدالامم افتقارالی التوبیخ والملامة النصاری لان طعن سائرالامم کان مقصودا اعلی الانبیاء و طعن هؤلاء تعدی الی جلال الله و کبریاء ہ فلاجرم ذکرتعالی انه یعدد انواع نعمه علی عیسی فان کل واحدة من تلک النعم المعدودة تدل علی انه عبدولیس باله اذ قال الحواریون الخ قال ابوالسعود کلام مستانف مسوق لبیان بعض ماجری بینه علیه السلام و بین قومه منقطع عما قبله و اذقال الله یعیسی ابن مریم ء انت الخ قال ابوالسعود ای اذکر وقت قول الله تعالی علیه السلام فی الأخرة تو بیخا للکفرة و تبکیتالهم باقراره علیه السلام علی رؤس الاشهاد بالعبودیة وامره لهم بعبادة عز و جل قال الله هذا یوم الخ قال ابوالسعود کلام مستأنف ختم به حکایة ما حکی مما یقع یوم یجمع الله الرسل علیهم الصلوة والسلام واشیرالی نتیجته وما له لله ملک السمٰوات الخ ان السورة اشتملت علی انواع کثیرة من العلوم فمنها بیان الشرائع والاحکام والتکالیف و منها المناظرة مع الیهود فی انکارهم شریعة محمد علیه الصلوة والسلام و منها المناصرة مع النصاری فی قولهم بالتثلیث فختم السورة بهذه النکتة الوافیة باثبات کل هذه المطالب

سورة الانعام

الحمد لله الخ قال المسكين اخذامن ابى السعود بيان لموجبات توحيده وبطلان اشراكهم به مع معاينتم لها هوالذى خلقكم من طين الخ قال ابوالسعود استيناف مسوق لبيان بطلان كفرهم بالبعث مع مشاهدتهم لما يوجب الايمان به اثر بطلان اشراكهم به تعالى مع معاينتهم لموجبات توحيده وهوالله الخ قال ابوالسعود جملة مسوقة لبيان شمول احكام الٰهية تعالى لجميع المخلوقات واحاطة علمه بتفاصيل احوال العباد واعمالهم المؤدية الى الجزاء اثر الاشارة الى تحقق المعاد وماتاتيهم من اٰية الخ قال ابوالسعود كلام مستانف وارد لبيان كفرهم باٰيات الله و اعراضهم عنها بالكلية بعد ما بين فى الاٰية الاولى اشراكهم بالله سبحانه واعراضهم عن بعض اٰيات التوحيد و فى الاٰية الثانية امتراء هم فى البعث واعراضهم عن بعض اٰياية فقد كذبوابالحق الخ قال ابوالسعود فان الحق عبارة عن القراٰن الذى اعرضواعنه حين اعرضواعن كل اٰية اٰية منه عبر عنه بذلك ابانة لكمال قبح فافعلوا به فان تكذيب الحق ممالايتصود صدوره عن احدالم يرواكم اهلكنا الخ اعلم ان الله تعالى لما منعهم عن ذلك الاعراض و التكذيب والاستهزاء بالتهديد والوعيد اتبعه بما يجرى مجرى الموعظة والنصيحة فى هذا الباب فوعظهم بسائرالقرون الماضية كقوم نوح و عاد و ثمود و غيرهم ولونزلنا عليك الخ قال ابوالسعود جملة مستانفة سيقت بطريق تلوين الخطاب لبيان شدة سكيمتهم فى المكابرة وما يتفرع عليها من الاقاديل الباطلة اثربيان اعراضهم عن اٰيات الله و تكذيبهم بالحق واستحقاقهم بذلك لنزول العذاب ولبة التنزيل ههنا اليه عليه السلام مع نسبة اتيان الاٰيات و مجئ الحق فيما سبق اليهم للاشعار بقدحهم فى نبوة عليه السلام فى ضمن قدحهم فيما نزل عليه صريحا و قالوالولانزل الخ قال ابوالسعود شروع فى قدحهم فى نبوة عليه السلام صريحا بعد ما اشيرالى قدحهم فيها ضمنا ولقد استهزئ برسل الخ قال ابوالسعود تسلية لرسول الله صلى الله عليه وسلم عمايلقاه من قومه قل سيروا الخ قال ابوالسعود بعد بيان ما فعلت الامم الخالية و ما فعل بهم خوطب رسول الله صلى الله عليه وسلم بانذارقومه و تذكيرهم باحوالهم الفطيعة تحذير الهم عما هم عليه و تكملة لستلية بما فى ضمنه من العدة اللطيفة بانه سيحيق بهم مثل ما حاق باضرابهم الاولين قل لمن ما فى السمٰوٰت الخ قال المسكين عود الى تقرير التوحيد وابطال الشرك قل اى شيء اكبر شهادة الخ قال

لـ وجه المناسبة بين اولها واخرسا بقها ان كليها مشترك فى اثبات التوحيد ۱۲ منه عفى عنه

ابو السعود روی ان قریشا قالو الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا محمد لقد سألنا عنک الیھود و النصاری فزعموا ان لیس عندھم ذکرو لا صفة فارنامن یشھد لک انک رسول اللہ فنزلت قال المسکین فھو عود الی الجواب عن قدحھم فی النبوة الذین اٰتینا ھم الخ قال ابو السعود جواب عما سبق من قولھم لقد سألنا عنک والخ و من اظلم الخ لماحکم علی اولٰئک بالخسران بین سبب الخسران و یوم نحشرھم الخ قال المسکین بیان حال اھل الشرک یوم الجزاء و منھم من یستمع الیک الخ قال ابو السعود کلام مبتدأ مسوق لحکایة ما صدر فی الدنیا عن بعض المشرکین من احکام الکفرثم بیان ما سیصدرعنھم یوم الحشر تقریر الماقبلہ و تحقیقا لمضمونہ و ھم ینھون عنہ الخ قال المسکین بیان لسعیھم فی کفر غیرھم مع کفر انفسھم ولوتری اذوقفوا علی النار الخ قال ابو السعود شروع فی حکایة ما سیصدرعنھم یوم القیامة من القول المناقض لما صدرعنھم فی الدنیا من القبائح المحکیة مع کونہ کذبا فی نفسہ و قالوا ان ھی الخ قال المسکین ھذا توطئة لما سیاتی من قولہ تعالی و لو تری اذوقفوا علی ربھم الح بین فی ھذہ الأیة کیفیة حالھم فی القیامة قد خسرالذین کذبوا الخ اعلم ان المقصود من ھذہ الأیة شرح حالة اخری من احوال منکری البعث والقیامة و ھی امران احدھما حصول الخسران والثانی حمل الاوزارالعظیمة وما الحیاة الدنیا الخ قال ابو السعود لما حقق فیما سبق ان وراء الحیاة الدنیا حیوة اخری یلقون فیھا من الخطوب مایلقون بین بعدہ حال تینک الحیاتین فی انفسھما قد نعلم انہ لیحزنک الخ قال ابو السعود استیناف مسوق لتسلیة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الحزن الذی یعتریہ مما حکی عن الکفرة من الاصرار علی التکذیب المبالغة فیہ ببیان انہ علیہ السلام بمکانة من اللہ عزوجل و ان ما یفعلون فی حقہ فھوراجع الیہ تعالی فی الحقیقة وانہ ینتقم منھم لا محالة اشد انتقام ولقد کذبت رسل الخ قال ابو السعود افتنان فی تسلیمہ علیہ الصلوة والسلام فان عموم البلیة ربما یھون امرھا بعض تھوین و ارشاد لہ علیہ الصلوة والسلام الی لاقتداء بمن قبلہ من الرسل الکرام علیھم الصلوة والسلام فی الصبر علی ما اصابھم من امھم من فنونہ الاذیة وعدة ضمنیة لہ علیہ الصلوة والسلام بمثل مامنحوہ من النصروان کان کبر علیک الخ قال ابو السعود کلام مستانف مسوق لتاکید ایجاب الصبر المستفاد من التسلیة ببیان انہ امر لامحید عنہ اصلا انما یستجیب الذین الخ اعلم انہ تعالی بین السبب فی کونھم بحیث لایقبلون الایمان ولا یترکون الکفر وقالوا لو لانزل الخ قال ابو السعود حکایة لبعض اٰخر من اباطیلھم بعد حکایة ما قالوافی حق القراٰن الکریم و بیان ما یتعلق بہ وما من دابة فی الارض الخ لما قدم ذکر الکفارو بین انھم یرجعون الی اللہ و یحشرون بین ایضا بعدہ بقولہ و ما من دابة الخ انھم یحشرون والمقصود بیان ان الحشروا

لبعث کما هو حاصل فی حق الناس فهو ایضاً حاصل فی حق الهائم قال المسکین فالمراد تفظیع شان الحشر والذین کذبوا الخ قال المسکین بیان لجهلهم و عنادهم مع اقامة البراهین لملجئة من یشأ الله یضلله الخ قال ابو السعود تحقیق للحق و تقریر لما سبق من حالهم ببیان انهم من اهل الطبع لایتاتی منهم الایمان اصلا قل ارأیتکم ان اتکم الخ قال ابو السعود امر لرسول الله صلی الله علیه وسلم بان یبکتهم ویلقهم الحجر بما لاسبیل لهم الی النکیر ولقد ارسلنا الی امم الخ اعلم انه تعالی بین فی الأیة الاولی ان الکفار عند نزول الشدائد یرجعون الی الله تعالیٰ ثم بین فی هذه الأیة انهم لایرجعون الی الله عند کل ما کان من جنس الشدائد بل قدیبقون مصرین علی الکفر منجمدین علیه غیر راجعین الی الله تعالی فلما نسوا ما ذکروا به الخ اعلم ان هذا الکلام من تمام القصة الاولی قل ارایتم ان اخذالله الخ قال ابو السعود امر رسول الله صلی الله علیه وسلم تکریر التبکیت علیهم و نثنیة الالزام الاول قل ارأیتکم ان اتاکم عذاب الله بغتة الخ قال السعود بتبکیت اٰخرلهم بالجائهم الی الاعتراف باختصاص العذاب بهم و ما نرسل المرسلین الخ قال ابو السعود کلام مستانف مسوق لبیان وظائف الرسالة علی الاطلاق و تحقیق ما فی عهدة الرسل علیهم السلام و اظهار ان مایتقرحه الکفرة علیه علیه السلام لیس مما یتعلق بالرسالة اصلا قل لا اقول لکم الخ قال ابو السعود استیناف مبنی علی ما اسس من الستة الالٰهیة فی شان ارسال الرسل و انزل الکتب مسوق لا ظهار تبریة علیه السلام عما یدورعلیه مقترحاتهم و انذربه الذین یخافون الخ قال ابو السعود بعد ما حکی لرسول الله صلی الله علیه وسلم ان من الکفرة قوما لایتعظون ولا یتأثرون امر علیه الصلوة والسلام بتوجیه الانذارالی من یتوقع منهم التأثر فی الجملة ولاتطرد الذین الخ قال ابو السعود لما امر صلی الله علیه وسلم بانذارالمذکورین لینتظموافی سلک المتقین نهی صلی الله علیه وسلم عن کون ذلک بحیث یؤدی الی طردهم و کذلک فتنا الخ قال ابو السعود استیناف مبین لمانشأ عنه ماسبق من النهی هوقدیمه تعالی لفقراء المومنین فی امرالدین بتوفیقهم للایمان مع ما هم علیه فی امرالدنیا من کمال سوء الحال و اذا جاءک الخ قال المسکین امر بتقریهم اثر النهی عن تبعیدهم و کذلک نفصل الخ قال المسکین بیان لعادته تعالی المستمرة فی تفصیل المهمات اثر التفصیل المذکور قل انی نهیت الخ قال ابو السعود امر علیه الصلوة والسلام بالرجوع الی مخاطبة المصرین علی الشرک اثرما امر بمعاملة من عداهم من اهل الانذ ارو التبشیر بما یلیق بحالهم قل انی علی بینة الخ قال ابو السعود تحقیق للحق الذی علیه رسول الله صلی الله علیه وسلم و بیان لاتباعه اياه اثر ابطال الباطل الذی علیه الکفرة و بیان عدم اتباعه له ما عندی ما تستعجلون الخ قال ابو السعود استیناف مبین لخطأ هم فی شان ماجعلوه منشأ لتکذیبهم بهاو هو عدم مجیٔ ما

وعد فيها من العذاب الذى كانوا يستعجلونه و عنده مفاتح الغيب الخ قال ابو السعود بيان لاختصاص المقدورات به تعالى من حيث العلم اثر بيان اختصاص كلها به تعالى من حيث القدرة و هو الذى يتوفاكم الخ اعلم انه تعالى لما بين كمال علمه بالأية الاولى بين كمال قدرة بهذه الأية و هو القاهر فوق عباده الخ اعلم ان هذا نوع اٰخرمن الدلائل الدالة على كمال قدرة الله تعالى و كمال حكمة قل من ينجيكم الخ قال ابو السعود اى قل لهم تقريرالهم بانحطاط شركائهم عن رتبة الالٰهية قل هو القادر الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان انه تعالىٰ هو القادر على القائم فى المهالك اثر بيان انه هو المنجى لهم منها و فيه وعيد ضمنى بالعذاب لاشراكهم وكذب به الخ قال ابو السعود ايذان لعتوهم و مكابرتهم واذا رأيت الذين يخوضون الخ اعلم انه تعالى فى الأية الاولى بين ان الذين يكذبون بهذا الذين فانه لا يجب على الرسول ان يلازمهم و ان يكون حفيظا عليهم ثم بين فى هذه الأية ان اولٰئک المكذبين ان ضموا الى كفرهم و تكذيبهم الاستهزاء بالدين والطعن فى الرسول فانه ينجب الاحتراز عن مقارتهم و ترک مجالستهم و ما على الذين يتقون الخ قال ابن عباسؓ قال المسلمون لئن كنا كلما استهزأ المشركون بالقراٰن و خلصوا فيه قناعنهم لما قدرنا على ان نجلس فى المسجد الحرام و ان نطوف بالبيت فنزلت هذه الأية و خصت الرخصة فيها للمؤمنين بان يقعدوامعهم و يذكرونهم ويفهمونهم وذر الذين اتخذو الخ قال المسكين بيان لسوء حالهم فى ضمن الامر بالاعراض عنهم و تذكير لهم بالقراٰن قل اندعوا من دون الله الخ اعلم ان المقصود من هذه الأية الرد على عبدة الاصنام و هى مؤكدة لقوله قل انى نهيت و هو الذى خلق السموٰت الخ اعلم انه تعالى لما بين فى الأيات المتقدمة فساد طريق عبدة الاصنام ذكر ههنا ما يدل على انه لامعبود الا الله وحده و اذ قال ابراهيم لابيه الخ اعلم انه سبحانه و تعالى كثيرا يحتج على مشركى العرب باحوال ابراهيم عليه السلام قال ابو السعود الذى يدعون انهم على ملة و تلک حجتنا اتينا ها الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن ابراهيم عليه السلام انه اظهر حجة الله تعالى فى التوحيد و نصرها وذب عنها عدد وجوه نعمه واحسانه عليه فاولها قوله و تلک حجتنا و ثانيها انه تعالى خصه بالرفعة و ثالثها انه جعله عزيزا فى الدنيا و ذلک لانه تعالى جعل اشرف الناس و هم الانبياء والرسل من نسله و ذريته و ما قدروا الله حق قدره الخ اعلم انا ذكرنا ان مدار امر القراٰن على اثبات التوحيد و النبوة والمعاد و انه تعالى لما حكى عن ابراهيم عليه السلام انه ذكر دليل التوحيد و ابطال الشرک وقرر تعالى ذلک الدليل بالوجوه الواضحة شرع بعده فى تقرير امر النبوة و هذا كتاب انزلناه الخ اعلم انه تعالى لما ابطل بالدليل قول من قال ما انزل الله على بشر من شئ ذكر بعده ان القراٰن كتاب الله انزل الله تعالى على محمد عليه الصلوة والسلام و من اظلم ممن افترى الخ

اعلم انه تعالی لما شرح کون القرآن کتاباً نازلا من عندالله ذکر عقبیه ما یدل علی و عید من ادعی النبوة والرسالة علی سبیل الکذب والافتراء ولقد جئتمونا فرادی الخ قال المسکین توبیخ لهم من الله تعالی بعد التوبیخ من الملٰئکة ان الله فالق الحب الخ اعلم انه تعالی لما تکلم فی التوحید ثم ارد فه بتقریر امر النبوة ثم تکلم فی بعض بتقاریع هذا الاصل عادههنا الی ذکر الدلائل الدالة علی وجود الصانع و کمال علمه و حکمته تنبیها علی ان المقصود الاصلی من جمیع المباحث العقلیة والتقلیة و کل المطالب الحکمیة انما هو معرفة الله تعالی بذاته و صفاته و افعاله فالق الاصباح الخ هذا نوع آخرمن الدلائل و هوالذی جعل لکم الخ هذا هوالنوع الثالث من الدلائل و هوالذی انشاکم الخ هذا نوع رابع و هوالذی انزل الخ هذا النوع الخامس و جعلوا لله شرکاء الخ اعلم انه سبحانه و تعالی لما ذکر هذه البراهین الخمسة من دلائل العالم الاسفل والعالم الاعلی علی ثبوت الالٰهیة و کمال القدرة والرحمة ذکر بعد ذلک ان من الناس من اثبت الله شرکاء بدیع السمٰوٰت والارض الخ اعلم انه تعالی لما بین فساد قول المشرکین شرع فی اقامة الدلائل علی فساد قول من یثبت له الولد ذلکم الله ربکم الخ قال المسکین کانه فذلکة لجمیع ماسبق مبینة لتوحده و عظمته قدجاء کم بصائر الخ قال المسکین بیان لفخامة الآیات المذکورة الدالة علی تحقیق الحق و ابطال الباطل و کذلک نصرف الخ قال المسکین بیان لحسن تصریف الآیات وضلال بعض و هدایة بعض اتبع ما اوحی الیک الخ قال المسکین امرله علیه السلام بالثبات علی تلک الآیات اثر بیان فحامتها و حسن تصریقها و قدح المشرکین فیها و بعدم الاعتداد بهم و باباطیلهم و لو شاء الله الخ قال المسکین کانه تسلیة له علیه السلام فی اشراکهم معرضین عن الآیات ولاتسبوا الذین یدعون الخ قال المسکین لما ذکر فی الآیات السابقة جهلهم و عنادهم فلا یبعدان یغضب بعض المسلمین و یشتموهم وآلهتهم فنهی الله تعالی عنه واقسموا بالله الخ لما ذکر فیما قبل ان الآیاتَ المنزلة لم تنفع المشرکین ذکر ههنا انهم طلبوا الآیات المفترحة تعصباً و عناداً و ذکر جوابه و نقلب الخ قال المسکین مقرر لمضمون الجواب المذکور ولو اننا نزلنا الیهم الخ اعلم انه تعالی بین فی هذه الآیة تفصیل ما ذکره علی سبیل الاجمال بقوله ما یشعرکم و کذلک جعلنا الخ قال ابوالسعود کلام مبتدأ مسوق لتسلیة رسول الله صلی الله علیه وسلم عما کان یشاهده قال المسکین من اعراضهم عن الآیات الالٰهیة واصغائهم الی زخرف القول ولتصغی الیه الخ قال المسکین هو متمم للآبة الاولی افغیرالله ابتغی الخ اعلم انه تعالی کما حکی عن الکفار انهم اقسموا الخ واجاب عنه بانه لافائدة فی اظهار تلک الآیات لانه تعالیٰ لواظهرها لبقوا مصرین علی کفرهم ثم انه تعالی بین فی هذه الآیة ان الدلیل الدال علی نبوة قد حصل و کمل فکان ما یطلبونه طلبا للزیادة وذلک مما

لایجب الالتفات الیه و انما قلنا ان الدلیل الدال علی نبوة قد حصل بوجهین الاول قوله و هو الذی انزل الیکم الکتاب والثانی قوله والذین اٰتیناهم الکتاب و قال ابوانسعود قوله تعالی و الذین اٰتیناهم الکتاب کلام مستانف غیر داخل تحت القول المقدر مسوق من جهة تعالی لتحقیق حقیة الکتاب الذی نیط به امر الحکمة قال المسکین و لعل هذا هو الاقرب لان الکلام فی تحقیق کون الأیات حقة صادقة لا فی امر النبوة و تمت کلمة ربک الخ قال ابوالسعود شروع فی بیان کمال الکتاب المذکور من حیث ذاته اثر بیان کماله من حیث اضافة الیه تعالی بکونه منزلا منه بالحق و تحقیق ذلک بعلم اهل الکتاب به و ان تطع اکثر من فی الارض الخ قال المسکین تحذیر عن اتباع من اعرض عن الأیات التامة الصادقة العادلة ان ربک هواعلم الخ قال المسکین تقریر لما قبله ای لما کان الله تعالیٰ عالما بالواقع فمن حکم علیه بالضلال فهو ضال لاشک فکلوا مما ذکراسم الله علیه الخ قال ابوالسعود امر مرتب علی النهی عن اتباع المضلین الذین من جملة اضلالهم تحلیل الحرام و تحریم الحلال قال المسکین ای خلاف الأیات و خذوا الخ اعلم انه تعالی لما بین انه فصل المحرمات اتبعه بما یوجب ترکها بالکلیة او من کان میتا الخ اعلم انه تعالی لما ذکر فی الأیة الاولی ان المشرکین یجادلون المؤمنین فی دین الله ذکر مثلا یدل علی حال المؤمن المهتدی و علی حال الکافر الضال و کذلک جعلنا الخ قال المسکین تتمة لحال المضلین المجادلین و فی ضمنه تسلیة لرسول الله صلی الله علیه وسلم واذا جاء تهم اٰیة قالو الن نؤمن الخ قال المسکین رجوع الی بیان حال المعرضین عن الأیات المصرین علی الجهالات فمن یردالله ان یهدیه الخ قال المسکین بیان ان الانتفاع بالأیات بمحض فضل الله تعالی فلا فائدة فی اظهار مقترحاتهم و هذا صراط ربک الخ قال المسکین بیان لکون مدلول الأیات حقانا فعاللمتذکرین المستحقین لدارالسلام وولایة الله تعالی و یوم نحشرهم جمیعا الخ اعلم انه تعالی لمابین حال من یتمسک بالصراطا المستقیم بین بعده حال من یکون بالضد من ذلک لتکون قصة اهل الجنة مردفة بقصة اهل النار یمعشر الجن والانس الخ قال ابوالسعود شروع فی حکایة ما سیکون من توبیخ المعشرین و تقریعهم بتفریطهم فیما یتعلق بخاصة انفسهم اثر حکایة توبیخ معشر الجن باغواء الانس واضلالهم و بیان مال امرهم ذلک ان لم یکن الخ اعلم انه تعالی لما بین انه ما عذاب الکفار الابعدان بعث الیهم الانبیاء والرسل بین بهذه الأیة ان هذا هوالعدل والحق ولکل درجات الخ اعلم انه تعالیٰ لما شرح احوال اهل الثواب والدرجات و احوال اهل العقاب والدرکات ذکر کلاما کلیا و ربک الغنی الخ بین ان تخصیص المطیعین بالثواب والمذنبین بالعذاب لیس لاجل انه محتاج الی طاعة المطیعین او ینتقص بمعصیة المذنبین قل یقوم اعملوا الخ اعلم انه لما

بين بقوله انما توعدون امر رسوله من بعده ان يهدد من ينكر البعث من الكفار و جعلوا الله الخ اعلم انه تعالى لما بين قبح طريقتهم فى انكارهم البعث والقيامة ذكر عقيبه انواعا من جهالاتهم وركاكات اقوالهم وكذلك زين الخ اعلم ان هذا هو النوع الثانى من احكامهم الفاسدة و مذاهبهم الباطلة قالوا هذه انعام الخ اعلم ان هذا نوع ثالث من احكامهم الفاسدة وقالو اما فى الخ هذا نوع رابع من انواع قضايا هم الفاسدة وهو الذى انشاجنات الخ قال ابوالسعود تمهيد لما سيأتى من تفصيل احوال الانعام اى هو الذى انشأ من غير شركة لاحد فى ذلك بوجه من الوجوه و من الانعام حمده قال ابوالسعود شروع فى تفصيل حال الانعام و ابطال ما تقولوا على الله تعالى فى شانها بالتحريم والتحليل قل لااجد فيما اوحى الخ اعلم انه تعالى لما بين فساد طريقة اهل الجاهلية فيما يحل ميحرم من المطعومات اتبعه بالبيان الصحيح فى هذا الباب سيقول الذين اشركو الخ قال ابوالسعود حكاية لفن اخرمن كفرهم قل هلم شهداء كم الخ اعلم انه تعالى لما ابطل على الكفار جميع انواع حججهم بين انه ليس لهم على قولهم شهود البتة قل تعالوا الخ اعلم انه تعالى لما بين فساد مايقوله الكفار ان الله حرم علينا كذاوكذا اردفه ببيان الاشياء التى حرمها عليهم و ان هذا صراطى الخ انه تعالىٰ لما بين فى الايتين المتقدمتين ما وحى به اجمل فى اٰخره اجمالاً يقتضى دخول ما تقدم فيه و دخول سائر الشريعة فيه ثم اٰتينا موسى الخ قال ابوالسعود كلام مسوق من جهة تعالى تقرير اللوصية و تحقيقا لها وتمهيد الما يعقبه من ذكر انزال القراٰن المجيد كما بينئى عنه تغيير الاسلوب بالالتفات الى التكلم هل ينظرون الخ اعلم انه تعالىٰ لما بين انه انما انزل الكتاب ازالة للعذر وازاحة للعلة بين انهم لايؤمنون البتة و شرح احوالاً توجب الباس عن دخولهم فى الايمان ان الذين فرقوا الخ قال ابو السعود استيناف لبيان احوال اهل الكتابين اثر بيان احوال لمشركين من جاء بالحسنة الخ قال ابوالسعود استيناف مبين لمقا ديرا جزٓية[1] العاملين قل اننى هدانى الخ قال ابوالسعود امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بان يبين لهم ماهو عليه من الدين الحق الذى يدعون انهم عليه وقد فارقوه بالكلية قل ان صلاتى الخ قال ابوالسعود عيدالامر لما ان الما موربه معلق بفروع الشرائع و ما سبق باصولها قل اغيرالله ابغى الخ اعلم انه تعالى لما امر محمدا صلى الله عليه وسلم بالتوحيد المحض امره بان يذكرما يجرى مجرى الدليل على صحة هذا التوحيد ثم بين انه لا يرجع اليه من كفرهم و شركهم ذم ولا عقاب ثم بين تعالىٰ ان رجوع هؤلاء الشركين الى موضع لاحاكم فيه ولا امرالا الله تعالى وهوالذى جعلكم الخ قال المسكين بين فى هذه الأية الامور الحاملة على امتثال جميع الاوامر من النعم والاجتناب عن جميع النواهى من النقم فكانها تاكيد و تقرير لجميع ما فى السودة مع غيرها والله اعلم

[1] المدلولة عليها بقوله فيما قبل ينبئهم بما كانو يفعلون ۱۲ منه

سورۃ الاعراف

اتبعوا ما انزل الخ اعلم ان امرالرسالة انما یتم بالمرسل و هوالله سبحانه و تعالی والمرسل و هو الرسول والمرسل الیه و هوالامة فلما امر فی الأیة الا ولی الرسول بالتبلیغ و لانذارمع قلب قوی و عزم صحیح امرالمرسل الیه و هوالامة فلما امر فی الأیة الاولی الرسول بالتبلیغ و الانذار مع قلب قوی و عزم صحیح امرالمرسل الیه و هم الامة بمتابعة الرسول و کم من قریة اهلکناها الخ اعلم انه تعالی لما امرالرسول علیه الصلوة والسلام بالانذارو التبلیغ و امرالقوم بالقبور والمتابعة ذکر فی هذه الأیة ما فی ترک المتابعة والاعراض عنها من الوعید فلنسئلن الذین الخ قال ابوالسعود بیان لعذابهم الاخروی اثر بیان عذابهم الدنیوی خلاانه قد تعرض لبیان مبادی احوال المکلفین جمیعاً لکونه ادخل فی التهویل والوزن یومئذ الخ اعلم انه تعالیٰ لما بین فی الأیة الاولیٰ السؤال والحساب بین فی هذه الأیة وزن الاعمال ولقد مکنا کم فی الارض الخ اعلم انه تعالی لما امرالخلق بمتابعة الانبیاء علیهم السلام ثم خوفهم بعذاب الدنیا ثم خوفهم بعذاب الأخرة رغبهم فی هذه الأیة بطریق اٰخروهو انه کثرت نعم الله علیهم و کثرة النعم توجب الطاعة ولقد خلقناکم الخ قال ابوالسعود تذکیر لنعمة عظیمة فائضة علی اٰدم علیه السلام ساریة الی ذریة موجبة لشکرهم کاف یا بنی اٰدم قد انزلنا الخ فی نظم الأیة وجهان الاول انه تعالی لما بین انه امراٰدم و حواء بالهبوط الی الارض و جعل الارض مستقرابین بعده انه تعالی انزل کل مایحتاجون الیه فی الدین والدنیا من جملتها اللباس الوجه الثانی انه تعالی لما ذکر واقعة اٰدم فی انکشاف العورة و انه کان یخصف الورق علیها اتبعه بان بین انه للخلق اللباس للخق لیستروابها عورتهم و نبیه علی المنته العظیمة علی الخلق بسبب انه اقدرهم علی التستر یا بنی اٰدم لایفتننکم الخ اعلم ان المقصود من ذکر قصص الانبیاء علیهم السلام حصول العبرة لمن یسمعها فکانه تعالی لما ذکر قصة اٰدم و بین فیها شدة عداوة الشیطان لأدم و اولاده اتبعها بان حذراولاد اٰدم من قبول وسوسة الشیطان واذافعلوا فاحشة الخ قال المسکین بیان لولایة الشیطان للکافرین فی فعلهم الفاحشة و تقلیدهم الباطل وافتراء هم علی الله تعالی قل امر ربی بالقسط الخ اعلم انه تعالی لما بین

لے لما بین فی اخرالسورة المتقدمة مسلک النبی صلی الله علیه وسلم و ما هو علیه من الدین الحق بقوله قل البنی هدانی' الخ امرفی اول هذه السورة بتبلیغ دینه ذلک الی الناس و ایضا کان المذکور فی خاتمة السورة الاول کونه تعالی سریع الحساب و ذکر فی اول هذه السورة سوال الامم والانبیاء و الوزن فحصلت الماسبة بهذین الوجهین ۱۲ منه عفی عنه

امر الامر بالفحشاء بین تعالی ان یأمر بالقسط والعدل و اقیموا و جوهکم الخ قال المسکین هذا من جملة القسط و کذاقوله وادعوہ ثم اشاربقوله کما برأکم الی وقوع الجزاء ثم بین حال القائمین بالقسط والناکبین عنه بقوله فریقاً هدی ثم عال ضلالتهم بقوله انهم اتخذوا الخ یا بنی اٰدم خذوا الخ اعلم ان الله تعالی لما امربالقسط فی الأیة الاولی و کان من جملة القسط امر اللباس وامرالماکول والمشروب لاحرم اتبعه بذکرهما قل انماحرم ربی الفواحش الخ اعلم انه تعالی لما بین فی الأیة الاولی ان الذی حرّموہ[1] لیس بحرام بین فی هذه الأیة انواع المحرمات ولکل امة اجل الخ انه تعالیٰ لمابین الحلال والحرام و احوال التکلیف بین ان لکل احداجلا معینا لایتقدم ولایتأ خرواذاجاء ذلک الاجل مات لامحالة والغرض منه التخویف لیتشدد المرء فی القیام بالتکالیف کما ینبغی یا نبی اٰدم اما یاتینکم الخ اعلم انه تعالی لما بین احوال التکلیف و بین ان لکل احد اجلامعینا لایتقدم ولا یتاخربین انهم بعد الموت انه کانوا مطیعین فلاخوف علیهم ولاحزن وان کانوا متمردین واقعوا فی اشدالعذاب فمن اظلم من افتری الخ اعلم ان قوله تعالی فمن اظلم یرجع الی قوله والذین کذبوا قال ادخلوا فی امم الخ اعلم ان هذه الأیة من بقیة شرح احوال الکفار و هوانه تعالی یدخلهم النار ان الذین کذبوا الخ اعلم ان المقصود منه اتمام الکلام فی وعید الکفار والذین اٰمنوا و عملوا الخ اعلم انه تعالی لما استوفی الکلام فی الوعید اتبعه بالوعد فی هذه الأیة و نادی اصحاب الجنة الخ اعلم انه تعالی لما شرح وعید الکفار وثواب اهل الایمان والطاعات اتبعه بذکر المناظرات التی تدوربین الفریقین ولقد جئنا هم بکتاب الخ اعلم انه تعالی لما شرح احوال اهل الجنة و اهل النار واهل الاعراف ثم شرح الکلمات الذائرة بین هؤلاء الفرق الثلاث علی وجه یصیر سماع تلک المناظرات حاملا للمکلف علی الحذروالاحتراز وداعیاله الی النظر والاستدلال بین شرف هذا الکتاب الکریم و نهایة منفعة هل ینظرون الخ اعلم انه تعالی لما بین ازاحة العلة لست انزال هذا الکتاب المفصل الموجب للهدایة والرحمة بین بعده حال من کذب ان ربکم الله الخ اعلم انا بینا ان مدارالقراٰن علی تقریر هذه المسائل الاربع و هی التوحید والنبوة والمعاد و القضاء والقدر ولاشک ان مداراثبات المعاد علی اثبات التوحید والقدرة والعلم فلما بالغ الله تعالی فی تقریر المعاد عاد الی ذکر الدلائل الدالة علی التوحید و کمال القدرة والعلم لتصری تلک الدلائل مقررة لاصول التوحید و مقررة ایضالا ثبات المعاد وادعواربکم الخ اعلم انه تعالی لما ذکرالدلائل الدالة علی کمال القدرة والحکمة والرحمة ابتعه بذکر الاعمال اللائقة بتلک و هوالذی یرسل الریاح الخ لما ذکردلائل الالٰهیة و کمال العلم والقدرة من العالم العلوی اتبعه بذکر الدلائل من بعض احوال العالم السفلے قال

[1] من ملبوسات فی الطواف و ما کولات من البحائر والسوائب و غیرهما ۱۲ منه

المسکین واستدل فی ضمنه علی صحة البعث بقوله کن لک نخرج الموتیٰ والبلدة لطیب الخ قال ابو السعود و هذا کما تری[1] مثل لارسال الرسل علیهم السلام بالشرائع التی هی ماء حیاة القلوب الی المکلفین المنقسمین الی المقتبسین من انوارها والمحرومین من مغانم اثارها و قد عقب ذلک بما یحققه و یقرره من قصص الامم الخالیة بطریق الاستیناف فقیل ولقدارسلنا نوحا الخ فی الکبیر[2] اعلم انه تعالی لما ذکر فی تقدیر المبدأ والمعاد دلائل ظاهرة و بینات قاهرة و براهین باهرة اتبعهابذکر قصص الانبیاء علیهم السلام و فیه فوائد احدها التنبیه علی ان اعراض الناس عن قبول هذه الدلائل من خواص قوم محمد علیه الصلوة والسلام بل هذه العادة المذمومة کانت حاصلة فی جمیع الامم والسالفة والمصیبة اذا عمت خفت فیفید تسلیة الرسول علیه السلام و ثانیها انه تعالی یحکی فی هذه القصص ان عاقبة المنکرین کان الی الکفر واللعن والخسارة و عاقبة امر المحقین الی الدولة والسعادة و ذلک یقوی قلوب المحقین و یکسرقلوب المبطلین و ثالثها التنبیه علی انه تعالی و ان کان یمهل هؤلاء المبطلین ولکنه لایهملهم بل ینتقم منهم علی اکمل الوجوه و رابعها بیان ان هذه القصص دالته علی نبوة محمد علیه الصلوة والسلام لانه علیه السلام کان امیا و ما طالع کتابا ولا تلمذ استاذ افاذا ذکرهذه القصص علی الوجه من غیر تحریف ولاخطأدل ذلک علی انه انما عرفها بالوحی من الله و ذلک یدل علی صحة نبوته و ما ارسلنا فی قریة الخ قال ابو السعود اشارة اجمالیة الی بیان احوال سائرالامم اثر بیان احوال الامم المذکورة تفصیلا ولو ان اهل القری الخ اعلم انه تعالی لما بین فی الأیة الاولی ان الذین عصواو تمردوااخذهم الله بغتة بین فی هذه الأیة انهم لواطاعوالفتح الله علیهم ابواب الخیرات او لم یهدللذین یرثون الخ اعلم انه تعالی لما بین فیما تقدم من الأیات حال الکفار الذین اهلکهم الله تعالی بالاستیصال مجملا و مفصلا اتبعه ببیان الغرض من ذکرهذه القصص حصول العبرة لجمیع المکلفین فی مصالح ادیانهم و طاعتهم ثم بعثنامن بعدهم موسیٰ[3] الخ اعلم ان هذا هوالقصة السادسة من القصص التی ذکرها الله تعالی فی هذه السورة و ذکر فی هذه القصة من الشرح والتفصیل مالم یذکر فی سائر القصص لاجل ان معجزات موسی کانت اقوی وجهل قومه کان اعظم وافحش الذین یتبعون الرسول النبی الامی الخ اعلم انه تعالی لما بین ان من صفة من یکتب له الرحمة التقوی وایتاء الذکوة والایمان بالأیات ضم الی ذلک ان یکون من صفة اتباع النبی الامی فکانه تعالی بین بهذه الأیة ان هذه الرحمة لایفوزبها من بنی اسرائیل الامن

---

[1] فهوبصورته مناسب لقوله فانزلنا به الماء فاخرجنابه من کل الثمرات بمعناه مناسب لقوله ولقد جئناهم بکتاب فصلناه بحیث افادوجه التقیید بقوله لقوم یؤمنون ۱۲ منه [2] صرح به لئلایشتبه علی الناظر بانه من تفسیر الی السعود ا [3] الی اٰخر القصة ۱۲ منه

اتقی واٰتی الزکوٰۃ واٰمن بالدلائل فی زمن موسی و من ھذہ صفت فی ایام الرسول اذا کان مع ذلک متبعا للنبی الامی فی شرائعه قل یایھاالناس الخ قال ابوالسعود لما حکی ما فی الکتابین من نعوت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم و شرف من یتبعه من اھلھما و نیلھم السعادۃ الدارین امرعلیه الصلوۃ والسلام ببیان ان تلک السعادۃ غیر مختصة بھم بل شاملة لکل من ینبعه کائنا من کان ببیان عموم رسالة للثقلین مع اختصاص رسالة سائر الرسل علیھم السلام باقوامھم و من قوم موسی امة الخ قال ابوالسعود کلام مبتدأ مسوق لدفع ما عسی یوھمه تخصیص کتب الرحمة والتقوی والایمان بالاٰیات بمتبعی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من حرمان اسلاف قوم موسی من کل خیر و بیان ان کلھم لیسوا کما حکیت احوالھم بل منھم امة الخ و قطعناھم اثنتی عشرۃ الخ قال المسکین ھذا بقیة من حکایة قصة بنی اسرائیل واسألھم عن القریة التی الخ قال المسکین ھذا ایضاً بعض قبائح الیھود و اذتاذن ربک الخ قال المسکین ھذا بیان الجزائھم من الذل والصغار اثر بیان قبائھم و قطعنا ھم فی الارض الخ ھذا ایضامن بقایا احوالھم الی قوله تعالی واذنتقنا الجبل الخ واذا حذربک الخ لما شرح قصة موسی علیه السلام مع توابعھا علی اقص الوجوہ ذکر فی ھذہ الاٰیة ما یجری مجری تقریر الحجة علی جمیع المکلفین واتل علیھم نباالذی الخ قال المسکین ھذا تقبیح لمن ضل بعد العلم والھدی کبعض علماء بنی اسرائیل الذین ذکرت اخبارھم فیما قبل او کل من ذکرہ اللہ تعالی بایاته و مواثیقه التی اخذھا فی عالم الذر کمایدل علیه قوله تعالی ذلک مثل الذین کذبو الخ ساء مثلا القوم الذین الخ اعلم انه تعالی لما قال بعد تمثیلھم بالکلب ذلک مثل القوم الذین کذبوا باٰیٰتنا وزجر بذلک عن الکفروالتکذیب الکرہ فی باب الزجر بقوله ساء مثلامن یھدیٖ اللہ الخ اعلم انه تعالیٰ لما وصف الضالین بالوصف المذکور و عرف حالھم بالمثل المذکور بین فی ھذہ الاٰیة ان الھدایت والضلالة من اللہ تعالیٰ ولقد ذرأنا لجھنم الخ قال ابوالسعود کلام مستأنف مقرر لمضمون ما قبله بطریق التذئیل و للہ الاسماء والحسنی الخ قال ابوالسعود تنبیه للمومنین علی کیفیة ذکرہ تعالی و کیفیة المعاملة مع المخلین بذلک الغافلین عنه سبحانه و عما یلیق به اثر بیان غفلتھم التامة وضلالتھم الطامة و ممن خلقنا امة یھدون الخ اعلم انه تعالی لما قال ولقد ذرأنا فاخبران کثیرا منھم مخلوقون للناراتبعه بقوله و ممن خلقنا امة لیبین ایضا ان کثیرا منھم مخلوقون للجنة والذین کذبوا بایاتنا الخ اعلم انه تعالی لما ذکر حالی الامة الھادیة العادلة اعاد ذکر المکذبین باٰیات اللہ تعالی و ما علیھم من الوعید اولم یتفکروا الخ قال ابوالسعود کلام مبتدأ مسوق لانکار عدم تفکرھم فی شانه علیه الصلوۃ والسلام وجھکھم بحقیقة حال الموجبة للایمان به وبما انزل علیه من الاٰیات التی کذبوابھا اولم ینظروا فی ملکوت الخ قال ابوالسعود استیناف

اٰخر مسوق للانکار والتوابیخ باخلالهم بالتامل فی الاٰیات التکوینیة المنصوبة فی الاٰفاق والانفس الشاهدة لحصة مضمون الاٰیات المنزلة اثر ما فعی علیهم باخلالهم بالتفکر فی شانه علیه الصلوة والسلام من یضلل الله الخ قال ابو السعود استیناف مقرر لما قبله منبئ عن الطبع علی قلوبهم یسئلونک عن الساعة الخ قال ابو السعود استیناف مسوق لبیان بعض احکام ضلالهم و طغیانهم قل لا املک الخ قال ابو السعود شروع فی الجواب عن السؤال ببیان عجزه عن علمها اثر بیان عجز الکل عنه وابطال زعمهم الذی بنو اعلیه سؤالهم من کونه علیه الصلوة والسلام ممن[1] یعلمها هو الذی خلقکم من نفس واحدة الخ اعلم انه تعالی رجع فی هذه الاٰیة الی تقریر امر التوحید وابطال الشرک خذالعفو الخ قال ابو السعود بعد ما عدمن اباطیل المشرکین و قبائحهم مالا یطاق تحمله امر علیه السلام بجامع مکارم الاخلاق التی من جملتها الاغضاء عنهم و امابنزغنک الخ قال ابوزید لما نزل قوله و اعرض عن الجاهلین قال النبی صلی الله علیه وسلم کیف یارب والغضب فنزل قوله و اما ینزغنک ان الذین اتقوا الخ قال ابو السعودا استیناف مقرهما قبله ببیان ان ما امربه علیه السلام من الاستعاذة بالله تعالی سنة مسلوکت للمتقین والاخلال بهادیدن الغاوین واذا لم تأتهم باٰیة الخ قال المسکین عود الی اثبات حقیقة الاٰیات المنزلة علیه السلام و کفایتها فی امر الایمان و اغنائها عن الاٰیات المقترحة واذا قرئ الخ قال ابو السعود ارشاد الی طریق الفوز بما اشیر الیه من المنافع الجلیلة التی ینطوی علیها القراٰن واذکر ربک الخ قال المسکین لما کانت التلاوة المذکورة منه علیه السلام بالجهر لیتمکن السامع من استماعه امر فی هٰذه الاٰیة بالذکر الخفی لیفی حق الجلوة والخلوة ان الذین عندربک الخ لما رغب الله رسوله فی الذکر و فی المواظبة علیه ذکر عقیبه ما یقوی دواعیه فی ذلک

[1] الاولی ان یقال ممن یدعی علمها ۱۲ منه

سورۃ الانفال[1]

انما المؤمنون الذین الخ اعلم انه تعالی لما قال واطیعوا الله و رسوله ان کنتم مؤمنین و اقتضیٰ ذلک کون الایمان مستلزما للطاعة شرح ذلک فی هذه الأیة مزید شرح و تفصیل و بین ان الایمان لایحصل الاعند حصول هذه الطاعات کما اخرجک ربک الخ قال المسکین عود الی حکم الانفال والتشبیة فی الکراهة حالا والموافقة للحکمة مالا واذیعدکم الله الخ قال المسکین تفصیل لقصة بدر یایها الذین اٰمنوا اذا القیتم الخ قال ابو السعود خطاب للمؤمنین بحکم کلی جارفیما سیقع من الوقایع و الحروب جئ به فی تضاعیف القصة اظهار اللاعتناء بشانه و مبالغة فی حضهم علی المحافظة علیه فلم تقتلوهم الخ قال ابو السعود رجوع الی بیان بقیة احکام الواقعة واحوالها و تقریر ما سبق منها ان تستفتحوا فقد الخ قال ابو السعود خطاب لاهل مکة علی سبیل التهکم بهم و ذلک انهم حین ارادوا الخروج تعلقوا باستار الکعبة وقالوا اللهم انصر علی الجندین و اهدی الفئتین واکرم الحزبین یایها الذین اٰمنوا اطیعوا الخ قال المسکین لما خاطب اهل مکة بالتهکم امر المؤمنین بان لایکونو امثلهم بل یطیعوا الله و رسوله واتقوا فتنة الخ قال المسکین لما امر فی الأیة الاولی بالاطاعة والاستجابة امر فی هذه الأیة بحمل غیرهم علیها بالامر بالمعروف والنهی عن المنکر واذکروا اذا انتم الخ قال المسکین بیان لموجبات الاطاعة من النعم الجلیلة یایهاالذین اٰمنوالا تخونوا الله الخ قال المسکین لما امر فیما قبل الاطاعة نهےٰ ههنا عن المعصیة والخیانة و لما کان الحامل علیها فی الاغلب حب المال والولد شرح کونهما فتنة یایها الذین اٰمنوا ان تتقوا الله الخ قال المسکین فیه الحض علی التقوی و بیان کونه مدارالسعادة الدنیا و الاخرة اثرالا مربه فیما قبل واذیمکربک الخ اعلم انه تعالی لماذکرالمؤمنین نعمه علیهم بقوله واذکروا اذانتم قلیل فکذلک ذکر رسوله نعمه علیه واذا تتلےٰ علیهم اٰیٰتنا الخ اعلم انه تعالی لما حکی مکرهم فی ذات محمد حکی مکرهم فی دین محمد صلی الله علیه وسلم و ما کان الله لیعذبهم الخ

---

[1] لما ابطل طریقة المشرکین فی خاتمة السورة السابقة و هوالجهاد باللسان بین فی هذه السورة احکام الجهاد بالسان ۱۲ منه

قال ابو السعود جواب لکلمتهم الشفاء و بیان للموجب لامهالهم والتوقف فی اجابة دعائهم و مالهم ان لا یعذبهم الخ قال ابو السعود بیان لاستحقاقهم العذاب بعد بیان ان المانع لیس من قبلهم و ما کان صلاتهم الخ قال ابو السعود مساق الکلام لتقریر استحقاقهم العذاب او عدم ولایتهم للمسجد فانها لاتلیق بمن هذه صلاته ان الذین کفروا ینفقون الخ اعلم انه تعالی لما شرح احوال هؤلاء الکفار فی الطاعات البدنیة اتبعا بشرح احوالهم فی الطاعات المالیة قال المسکین و حسن موقعها ههنا نزولها فی المطعمین یوم بدر قل للذین کفروا الخ اعلم انه تعالی لما بین صلاتهم فی عباداتهم البدنیة و عباداتهم المالیة ارشدهم الی طریق الصواب و قاتلوهم حتی الخ اعلم انه تعالی لما بین ان هؤلاء الکفار ان انتهوا عن کفرهم حصل لهم الغفران و ان عادوا فهم متوعدون بسنة الاولین اتبعه بان امر بقتالهم اذا اصروا واعلموا ان ما غنمتم الخ اعلم انه تعالی لما امر بالمقاتلة فی قوله و قاتلوهم و کان من المعلوم ان عند المقاتلة قد تحصل الغنیمة لاجرم ذکر الله تعالی حکم الغنیمة اذانتم بالعدوة الدنیا الخ قال المسکین متعلق ببدر یایها الذین امنوا اذالقیتم الخ اعلم انه تعالی لما ذکر انواع نعمه علی الرسول و علی المؤمنین یوم بدر علمهم اذا لقوا الثبات و ان یذکروا الله کثیراً واذزین لهم الشیطان الخ قال المسکین هذا ایضا متعلق ببدر ولوتری اذ یتوفی الخ اعلم انه تعالی لما شرح احوال هؤلاء الکفار شرح احوال موتهم والعذاب الذی یصل الیهم کداب ال فرعون الخ لما بین ما انزله باهل بدر من الکفار عاجلا و اجلا اتبعه بان بین ان هذه طریقة و سنته فی الکل فقال کدأب الخ ثم ذکر مایجری مجری العلة فی العقاب الذی انزله بهم فقال ذلک بان الله الخ ان شر الدواب الخ قال ابو السعود بعدما شرح احوال المهلکین من شرار الکفرة شرع فی بیان احوال الباقین منهم و تفصیل احکامهم فاما تثقفنهم الخ قال ابو السعود شروع فی بیان احکامهم بعد تفصیل احوالهم و لا یحسبن الذین کفروا سبقوا الخ اعلم انه تعالی لما بین مایفعل الرسول فی حق من یجده فی الحرب و یتمکن منه و ذکر ایضاً ما یجب ان یفعله فیمن ظهر منه نقض العهد بین ایضا حال من فاته فی یوم بدر وغیره واعدوا لهم الخ اعلم انه تعالی لما اوجب علی رسوله ان یشرد من صدر عنه نقض العهد وان ینبذ العهد الی من خاف منه النقض امره فی هذه الأیة بالاعداد لهؤلاء الکفار قال ابو السعود اولقتال الکفار علی الاطلاق و هو الانسب لسیاق النظم الکریم و ان جنحوا الخ اعلم انه لما بین ما یرهب

بـه الـعـدومـن الـقوة والاستظهار بین بعده انهم عندالارهاب اذا جنحوا ای مالوا الی الصلح فالحکم قبول الصلح قال المسکین ثم لما کان فی الصلح احتمال الخداع و عدنبیه بحسبانه تعالی ایاه و علله بنصره وبالمؤمنین فی قوله و ان یریدوا الخ یا ایهاالنبی حسبک الله و من اتبعک الخ قال ابوالسعود شروع فی بیان کفایة تعالی ایاه علیه الصلوة والسلام فی جمیع امـوره وامور المؤمنین او فی الامور الواقعة بینهم و بین الکفرة کافة اثر بیان کفایته تعالی ایاه عـلیه الصلوة والسلام فی مادة حاصته یایها النبی حرض الخ بعد ما بین کفایته ایاهم بالنصروا لامـداد امـر عـلیه الصلوة والسلام بترتیب مبادی نصره و امداده ماکان لنبی ان یکون الخ واعلم ان المقصود من هذه الأیة تعلیم حکم اٰخرمن احکام الغزو والجهاد فی حق النبی صلی الله علیه وسلم یایها النبی قل لمن فی ایدیکم الخ اعلم ان الرسول لما اخذا لفداء من الاساریٰ و شـق عـلیهم اخذاموالهم منهم ذکرالله تعالی هذه الأیة استماله لهم ان الذین اٰمنوا وهاجروا الیٰ اٰخرالسورة اعلم انه تعالی قسم المؤمنین فی زمان الرسول صلی الله علیه وسلم الی اربعة اقسـام و ذکر حکم کل واحد منهم و تقریر هذه القسمة انه علیه السلام ظهرت نبوة بمکة ودعـا الـنـاس هناک الی الذین ثم انتقل من مکة الی المدینة فحین هاجرمن مکة الی المدینة صـارالـمؤمنون علی قسمین منهم من واقعته فی تلک الهجرة و منهم من لم یوافقه فیها بل بـقی هناک اماالقسم الاول فهم المهاجرون الاولون و قدوصفهم بقوله ان الذین اٰمنوا الخ و انما قلنا ان المراد منهم المهاجرون الاولون لانه تعالی قال فی اٰخر الأیة والذین اٰمنوا من بـعدوها جروله و اما القسم الثانی من المؤمنین الموجودین فی زمان محمد صلی الله علیه وسـلم فهم الانصار اوواونصروا القسم الثالث من اقسام مومنی زمان الرسوله علیه السلام و هم المؤمنون الذین ماوافقواالرسول فی الهجرة و بقوافی مکته و هم المعنیون بقوله والذین اٰمـنـوا ولم بهاجروا القسم الرابع من مؤمنی زمان محمد صلی الله علیه وسلم هم الذین لم یوافواالرسول فی الهجرة الا انهم بعد ذلک هاجروا الیه وهوالمراد من قوله تعالی والذین اٰمـنـوامن بعد قال المسکین لما کانت الوظیفة هوالجهاد وقت القدرة والهجرة عندالعجز ذکر الهجرة و بعض احکامها بعد ذکرالجهاد

سورۃ التوبہ[1]

ماكان للمشركين ان يعمروا مساجد الله الخ اعلم انه تعالى بدء السورة بذكر البراءة عن الكفار و بالغ فی ایجاب ذلک و ذكر من انواع فضائحهم و قبائحهم مايوجب تلك البراءة قال المسكين واشعر ذلک باهانتهم اجاب[2] عما افتخروابها يايها الذين امنوا لا تتخذوا اٰباء كم الخ قال المسكين اخذامن الكبير لما بالغ فی البراءة عن الكفار كان مظنة ان يقال ان البراءة عن الاقارب صعب جدافذكرها فی هذه الاٰية لقد نصركم الله فی مواطن الخ قال المسكين لما امرالله تعالى فيما قبل بترجيح موالاة الله تعالى على موالاة غيره والقطع عما سواه الكده بتذكير واقعة حنين واضرابها بان كثرة جماعتكم لم تغن شيئا وانما نفعكم نصرالله تعالى فحق عليكم التوكل عليه لا على غيره يايها الذين اٰمنوا انما المشركون الخ لما امر صلى الله عليه وسلم عليا ان يقرأ على مشركی مكة اول سورة براءة وينبذاليهم عهدهم قالاناس ستعلمون ماتلقونه من الشدة لانقطاع السبل وفقد الحمولات فنزلت هذه الاٰية واجاب الله تعالى بقوله و ان خفتم علية قاتلواالذين قال ابوالسعودامر هم بقتال اهل الكتابين اثرامرهم بقتال المشركين و قالت اليهود الخ قال ابو السعود جملة مبتدأة سيقت لتقرير ما مرمن عدم ايمان اهل الكتابين بالله سبحانه و انتظامهم بذلک فی سلک المشركين اتخذوا احبارهم الخ قال ابوالسعود زيادة تقرير لما سلف من كفرهم بالله تعالىٰ يريدون ان يطفوا الخ اعلم ان المقصود منه بيان نوع من الافعال القبيحة الصادرة عن رؤساء اليهود والنصارى وهو سعيهم فی ابطال امر محمد صلى الله عليه وسلم هوالذی ارسل رسوله الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن الاعداء هم يحاولون ابطال امر محمد صلى الله عليه وسلم و بين تعالى انه يابى ذلک الابطال و انه يتم امره بين كيفية ذلک الاتمام يايهاالذين اٰمنوا ان كثيرا الخ قال ابوالسعودشروع فی بيان حال الاحبارو الرهبان فی اغوائهم لارذالهم اثر بيان سوء حال الاتباع فی اتخاذهم لهم اربابا ان عدة الشهور الخ قال المسكين رجوع الى بيان بعض

---

[1] اعلم ان كلتاالسورتين مشتملة على بيان احكام الجهاد و ها المناسبة ظاهرة ۱۲ منه عفى عنه

[2] سقطت ههنا كلمة ۱۲ مصحح

قبائح المشرکین و ضلالاتهم وجها لا تهم من تغییر احکام الله تعالی الموجبة لقتالهم یایها الـذین امنوا مالکم الخ اعلم انه تعالی لما شرح مصائب هؤلاء الکفار و فضائحهم عاد الی الترغیب فی مقاتلتهم انفروا اخفافا و ثقالا الخ قال ابو السعود تجرید للامر بالنفور بعد التوبیخ علی ترکه والانکار علی المساهلة فیه لو کان عرضا الخ قال ابو السعود صرف للخطاب عنهم و توجیه له الی رسول الله صلی الله علیه وسلم تعدید الماصدرعنهم من الهنات قولا و فعلا علی طریق المبائة و بیان لدناء ة هممهم وسائر رذائلهم قال المسکین شرع الله تعالی من ههنا قبائح المنافقین و فضائحهم فی غزوة تبوک و امتد هذاالبیان الی اخرالسورة الاما وقع من بعض احوال المنافقین فی التضاعیف استطراداوالا قوله وما کان الله لیضل فکانه تسلیة للذین استغفروا للمشرکین قبل ذلک قوله تعالی لقد جاء کم رسول من انفسکم الخ اعلم انه تعالی لما امررسوله علیه السلام ان یبلغ فی هذه السورة الی الخلق تکالیف شاقة شدیدة صعبة یعسرتحملها الامن خصه الله تعالی بوجوه التوفیق و الکرامة ختم السورة بما یوجب سهولة تحمل تلک التکالیف فان تولو الخ قال ابو السعود نتوین للخطاب و توجیه له الی النبی صلی الله علیه وسلم تسلیة له

سورۃ یونس[1]

ان ربکم الله الذی الخ اعلم انه تعالی لما حکی عن الکفار انهم تعجبوا من الوحی و البعثة والرسالة ثم انه تعالی ازال ذلک التعجب بانه لایبعد البتته فی ان یبعث خالق الخلق الیهم رسولا یبشرهم علی الاعمال الصالحة بالثواب و علی الاعمال الباطلة الفاسدة بالعقاب کان هذا الجواب انما یتم ویکمل باثبات امرین احمدهما اثبات ان لهذا العالم الٰها قاهر اقادرانا فذالحکم بالامر والنهی والتکیف والثانی اثبات الحشر والنشروالبعث والقیامة حتی یحصل الثواب والعقاب اللذان اخبرالانبیاء عن حصولهما فلاجرم انه سبحانه ذکر فی هذا الموضع مایدل علی تحقیق هذالمطلوبین هو الذی جعل الشمس ضیاء الخ قال ابو السعود تنبیه علی الاستدلال علی وجوده تعالیٰ ووحدته و علمه و قدرته و حکمته باثار صنعه فی النیرین بعد التنبیه علی الاستدلال بمامرمن ابداع السمٰوٰت والارض والاستواء علی العرش و غیر ذلک و بیان لبعض افراد التدبیر الذی اشیرالیه اشارة اجمالیة و ارشادالی انه حیث دبرت امورهم المتعلقة بمعاشهم هذا التدبیر البدیع فلان یدبر مصالحهم المتعلقة بالمعاد بارسال الرسل و انزال الکتاب و تبیین طرأیق الهدی و تعیین مهاوی والردیٰ اولی واخری ان الذین لایرجون لقاء ناالخ اعلم انه تعالی لما اقام الدلائل القاهرة علی صحة القول باثبات الأله الرحیم الحکیم و علی صحة القول بامعاد والحشروا انه شرع بعده فی شرح احوال من یکفربها و فی شرح احوال من یؤمن بهاولو یعجل الله للناس الشر الخ ان الذی یغلب علی ظنی ان ابتداء هذه السورة فی ذکر شبهات المنکرین للنبوة مع الجواب عنها فالشبهة الاولی ان القوم تعجبوا من تخصیص الله تعالیٰ محمداً علیه السلام بالنبوة فازال الله تعالی ذلک التعجب بقوله اکان للناس عجبا ثم ذکر دلائل التوحید و دلائل صحة المعاد و حاصل الجواب انه یقول انی ماجئتکم الا بالتوحید والاقرار بالمعاد و قددللت علی صحتها فلم یبق للتعجب من نبوتی معنی والشبهة الثانیة للقوم انهم کانوا ابدایقولون اللهم ان کان مایقول محمد حقا فی ادعاء الرسالة فامطر علینا حجارة من السماء او ائتنا بعذاب الیم فاجاب الله تعالی عن هذه الشبهة

---

[1] خاتمته ما قبلها و فاتحتها تشترکان فی اثبات الرسالة ۱۲ منه عفی عنه

بما ذکره فی هذه الأیة و اذامس الانسان الضر الخ انه تعالی حکی عنهم انهم یستعجلون فی نزول العذاب ثم بین فی هذه الأیة انهم کاذبون فی ذلک الطلب والاستعجال لانه لونزل بالانسان ادنی شیء یکرهه و یؤذیه فانه یتضرع الی الله تعالی فی ازالة عنه و فی دفعه عنه و ذلک یدل علی انه لیس صادقا فی هذا الطلب و لقد اهلکنا القرون الخ بین فی هذه الأیة ما یجری مجری التهدید وهوانه تعالی قد ینزل عذاب الاستیصال ولا یزیله و اذا تتلی علیهم أیاتنا بینات الخ اعلم انه هذا الکلام هوالنوع الثالث من شبهاتهم و کلماتهم التی ذکروها فی الطعن فی نبوة النبی صلی الله علیه وسلم حکاها الله تعالی فی کتابه و اجاب عنها فمن اظلم ممن افتری الخ اعلم ان تعلق هذه الأیة بما قبلها ظاهر و یعبدون من دون الله الخ قال ابوالسعود حکایة لجنایة اخری لهم نشأت عنها جنایتهم الاولی قال المسکین ای قولهم ائت بقرأن غیر هذا اوبدله لان فی القرأن ابطال الوهیة اصنامهم و ما کان الناس الاامة الخ اعلم انه تعالی لما اقام الدلائل القاهرة علی فساد القول بعبادة الاصنام بین السبب فی کیفیة حدوث هذا المذهب الفاسدوالمقالة الباطلة و یقولون لولا الخ اعلم ان هذا الکلام هوالنوع الرابع من شبهات القوم فی انکارهم نبوة واذا اذقناالناس رحمة الخ اعلم ان القوم لما طلبوا من رسول الله صلی الله علیه وسلم أیة اخری و اجاب الجواب و هو قوله انما الغیب لله ذکر جوابا أخرو تقریره ان عادة هؤلاء الاقوام المکرواللجاج والعناد و عدم الانصاف و اذا کانوا کذلک فبتقریران اعطواما سألوه من انزال معجزات اخری فانهم لایؤمنون بل یبقون علی کفرهم هوالذی یسرکم فی البحر الخ قال المسکین هذا متهم لما قررقبله انما مثل الحیوة الدنیا الخ اعلم انه تعالی لما قال یایها الناس انما بغیکم الخ اتبعه هذا المثل العجیب الذی ضربه لمن یبغی فی الارض و یغتربالدنیا و یشتدتمسکه بهاوالله یدعوا الی الخ اعلم انه تعالی لما نفرالغافلین عن المیل الیٰ الدنیا بالمثل السابق رغبهم فی الاخرة هذه الأیة للذین احسنوا الخ اعلم انه تعالی لما دعا عباده الی دارالسلام ذکر السعادات التی تحصل لهم فیها والذین کسبوا السیآت الخ اعلم انه کما شرح حال المسلمین فی الأیة المتقدمة شرح حال من اقدم علی السیئات فی هذه الاربعة و یوم نحشرهم جمیعا الخ اعلم ان هذا نوع أخر من شرح فصائح اولٰئک الکفارالذین کسبواالسیئات هنالک نبلوا الخ هذه الأیة کالتتمة لما قبلها قل من یرزقکم من السماء الخ اعلم انه تعالی لما بین فضائح عبدة الاوثان

اتبعها بذكر الدلائل الدالة على فساد هذا المذهب و ما كان هذا القرآن الخ قال ابو السعود شروح فی بيان ردهم للقرآن الكريم اثر بيان ردهم للادلة العقلية المندرجة فی تضاعيفه قال المسكين كانه عود الى تقرير مضمون قوله تعالى فی اول السورة و اذا تتلیٰ عليهم اٰيتنا بينات قال الذين لايرجون لقاء نائت بقرآن غيرهذا الآية و منهم من يؤمن به الخ قال المسكين ببيان لمعاملة الكفار مع القرآن و صاحب القرآن على انحاء شتى و يوم نحشرهم كان لم يلبثوا الخ اعلم انه تعالى لما وصف هولاء الكفار بقلة الاصغاء و ترک التدبر اتبعه بالوعيد ولكل امة رسول الخ اعلم انه تعالى لما بين حال محمد صلى الله عليه وسلم مع قومه بين ان حال كل الانبياء مع اقوامهم كذلک و يقولون متى هذا الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الخامسة من شبهات منكرى النبوة فانه عليه السلام كلما هددهم بنزول العذاب و مرزمان ولم يظهرذلک العذاب قالوامتى هذا الوعد الخ قل ارايتم ان اتاكم الخ اعلم ان هذا هوالجواب الثانی عن قولهم متى هذا الوعد ويستنبؤنک احق هو الخ قال المسكين هی تتمة لا قبلها و كذاقوله تعالیٰ الاان لله ما فی السمٰوٰت والارض الخ تتمة للجواب المذكور ببيان ان الله تعالى مالک العلويات والسفليات ووعده حق والاحياء والاماتته بيده فهوقادر على نزول العذاب متى شاء و انه ينزل لامحالة يايها الناس قدجاء كم الخ اعلم ان الطريق الى اثبات نبوة الانبياء عليهم السلام امر ان الاول ان يقول ان هذا الشخص قداعى النبوة و ظهرت المعجزة على يده و كل من كان كذلک فهو رسول من عند الله حقا و صدقا و هذا الطريق مما قد ذكره الله تعالى فی قوله و ما كان هذا القرآن ان يفترى الخ فنقوله انه تعالى لما بين صحة نبوة محمد صلى الله عليه وسلم بطريق المعجزة ففی هذه الآية بين صحة نبوة بالطريق الثانی وهذا الطريقُ طريق كاشف عن حقيقة النبوة معرف لماهيتها فاستدلال بالمجزة هوالذی يسميه المنطقيون برهان الان و هذا الطريق هوالطريق الذی يسمونه برهان اللم وهو اشرف و اعلى و اكمل و افضل قل ارايتم ما انزل الله الخ لما ذكرالدلائل الكثيرة على صحته النبوة و بين فساد سؤالاتهم و شبهاتهم فی انكارها اتبع ذلک ببيان فساد طريقتهم فی شرائعهم احكامهم و ماتكون فی شأن الخ اعلم انه لما اطال الكلام فی امرالرسول بايرادالدلائل على فساد مذاهب الكفار و فی امره بايرادالجواب عن شبهاتهم و فی امره بتحمل اذا هم بالرفق معهم ذكر هذا الكلام ليحصل به تمام السلوة

والسرور للمطیعین و تمام الخوف و الفزع للمذنبین و هو کونه سبحانه و تعالی عالما بعمل کل واحد و بما فی قبله من الدواعی والصوارف الاان اولیاء الله الخ اعلم انا ببیان قوله تعالی و ما تکون فی شان و ما تتلوامنه من قران مما یقوی قلوب المطیعین و مما یکسر قلوب الفاسقین فاتبعه الله تعالی بشرح احوال المخلصین الصادقین الصدیقین فی هذه الآیة و یحزنک قولهم الخ قال ابوالسعود تسلیة للرسول علیه الصلوة والسلام عما کان یلقاه من جهتهم من الاذیة الناشئة عن مقالاتهم الموحشة و تبشیرله علیه الصلوة والسلام بانه عزوجل ینصره و یعزه علیهم اثر بیان ان له ولاتباعه امنا من کل محذور و فوزابکل مطلوب الاان الله الخ قال ابوالسعود و هو مع مافیه من التاکید لما سبق من اختصاص العزة لله تعالی الموجب لسلوته علیه السلام و عدم مبالاته بالمشرکین و بمقالاتهم تمهید لما لحق من قوله تعالی و ما یتبع الذین الخ و برهان علی بطلان ظنونهم و اعمالهم المبنیة علیها هوالذی جعل لکم الخ قال ابوالسعود تنبیه علی تفرده تعالی بالقدرة الکاملة وانعمة الشاملة لیدهم علی توحیده سبحانه باستحقاق العبادة و تقریر لما سلف من اختصاص العزة به سبحان و قالوا اتخذالله الخ اعلم ان هذا نوع اٰخرمن الاباطیل التی حکاها الله تعالی عن الکفار قل اٖن الذین یفترون الخ اعلم انه تعالی لما بین بالدلیل القاهران اثبات الولدلله تعالی قول باطل ثم بین انه لیس لهذا القائل دلیل علی صحة قوله فقد ظهر ان ذلک المذهب افتراء علی الله و نسبة لما لا یلیق به الیه فبین ان من هذا حاله فانه لایفلح البتة واتل علیهم نبأنوح الخ قال ابوالسعود لیتدبرو اما فیه من زوال ما تمتعوابه من النعیم و حلول عذاب الغرق الموصول بالعذاب المقیم فینزجروابذلک عماهم علیه من الکفراوتنکسر شدة شکیمتهم او یعترف بعضهم بصحة نبوتک بان عرفوا ان مانتلوه موافق لما ثبت عندهم من غیر مخالفة بینهما اصلامع علمهم بانک لم تسمع ذلک من احدلیس الابطریق الوحی و فیه من تقریر ما سبق من کون الکل لله سبحانه و اختصاص العزة به تعالی و انتفاء الخوف والحزن عن اولیاء ہ عز و علاقاطبة و تشجیع النبی صلی الله علیه وسلم و حمله علی عدم المبالاة بهم و باقوالهم و افعالهم ما لا یخفی ولقد بوأنا بنی اسرائیل الخ قال ابوالسعود کلام مستانف سیق لبیان النعم الفائضة علیهم اثر نعمته الانجاء علی وجه الاجمال واخلالهم بشکرها و اداء حقوقها فان کنت فی شک الخ اعلم انه تعالی لما ذکر من قبل اختلافهم عندما جاء هم اوردعلی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذہ الایۃ ما یقوی فی صحۃ القرآن والنبوۃ ان الذین حقت علیھم الخ قال ابو السعود شروع فی بیان سراصرار الکفرۃ علی ما ھم علیہ من الکفر والضلال کلام مستأنف لتقریر ما سبق من استحالۃ ایمان من حقت علیھم کلمۃ تعالی لسوء اختیارھم مع تمکنھم من التدارک فیکون الاستثناء الآتی بیانالکون قوم یونس علیہ السلام ممن لم یحق علیہ الکلمۃ لاھتدائھم الی التدارک فی وقتہ و لو شاء ربک لآمن الخ قال ابو السعود عقبق لدوران ایمان کافۃ المکلفین وجود اوعدما علی قطب مشیئۃ تعالی مطلقا اثر بیان تبعیۃ کفر الکفرۃ لکلمۃ قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت الخ اعلم انہ تعالی لما بین فی الآیات السالفۃ ان الایمان لایحصل الابتخلیق اللہ تعالی و مشیئۃ امر بالنظر والاستدلال فی الدلائل حتی لایتوھم ان الحق ھو الجبر المحض فھل ینتظرون الخ قال المسکین تقریر لما سبق من عدم اغناء الآیات والنذر عنھم ببیان انھم لایؤمنون حتی یقع علیھم العذاب فیؤمنون حیث لاینفعھم الایمان قل یایھا الناس ان کنتم فی شک الخ اعلم انہ تعالیٰ لما ذکر الدلائل علی اقصی الغایات وابلغ النھایات امر رسولہ باظھار دینہ وباظھار المباینۃ عن المشرکین لکے تزول الشکوک والشبھات فی امرہ و تخرج عبادۃ اللہ تعالی من طریقۃ السرالی الاظھاروان یمسسک اللہ بضر الخ قال ابو السعود تقریر لما اوردفی حیز الصلۃ من سلب النفع من الاصنام و تصویر لاختصاصہ بہ سبحانہ قل یایھاالناس قد جاء کم الحق الخ قال المسکین اتمام للحجۃ بعد تبلیغ الدین واتبع الخ قال المسکین امرلہ علیہ الصلوۃ والسلام بالاتباع والصبر علی التبلیغ اثر الامر باالتبلیغ

سورۃ ھود علیہ السلام

ان لاتعبدوا الخ ابوالسعود کانه قیل کتاب احکمت اٰیاته ثم فصلت لئلاتعبدوا الا الله ای لتترکوا عبادة غیرالله عز و جل ولمحضو فی عبادته فان الاحکام والتفصیل علی مافصل من المعانی مما یدعوهم الیٰ الایمان والتوحید و ما یتفرع علیه من الطاعات قاطبة الاانهم یثنون صدورهم الخ قال المسکین بیان للتولی واشارة الی جزاء ه و ما من دابة فی الارض الخ اعلم انه تعالی لما ذکر فی الأیة الاولی انه یعلم ما یسرون و ما یعلنون اردفه بمایدل علی کونه تعالی عالما بجمیع المعلومات فذکر ان رزق کل حیوان انما یصل الیه من الله تعالیٰ فلولم یکن عالما بجمیع المعلومات لما حصلت هذه المهمات و هوالذی خلق السمٰوٰت الخ اعلم انه تعالیٰ لما اثبت بالدلیل المتقدم کونه عالما مالمعلومات اثبت بهذاالدلیل کونه تعالی قادرا[۲] علی کل المقدورات ولئن قلت انکم الخ اعلم انه تعالی لما بین انه خلق هذا العالم لاجل ابتلاء المکلفین و امتحانهم فهذا یوجب القطع بحصول الحشروالنشر فعندهذا خاطب محمدا علیه الصلوٰة والسلام و قال ولئن قلت الخ ولئن اخرنا عنهم العذاب الخ قال المسکین اخذامن ابی السعود لما اوعدهم الله تعالی بالعذاب فی قوله و ان تولوافانی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر تعجبوا من تاخیره فاجاب الله تعالی فی هذه الأیة ولئن اذقنا الانسان منارحمة الخ قال ابوالسعود ووجه تعلق الأیات الثلث بما قبلهن من حیث ان اذا قته النعماء و مساس الضراء فصل من باب الابتلاء واقع موقع التفصیل من الاجمال الواقع فی قوله لیبلوکم ایکم احسن عملا والمعنی ان کلامن اذاقة النعماء و نزعها فی کونه ابتلاء للانسان ایشکرام یکفر لایهتدی فیه الی سنن الصواب بل یحید فی کلتا الحالتین عنه الی مهاوی الضلال فلایظهر منه باحسن عمل الامن الصابرین الصالحین او من حیث ان انکارهم بالبعث واستهزاء هم العذاب بسبب بطرهم و فخرهم کانه قیل انما فعلوا ما فعلوا الان طبیعة الانسان مجبولة علی ذلک فلعک تارک الخ اعلم انه هذا نوع اٰخرمن کلمات الکفار والله تعالی بین ان قلب الرسول ضاق بسببه ثم انه تعالی قواه وایده بالاکرام والتائید ام یقولون افتراه الخ اعلم ان القوم لما طلبوامنه المعجز قال معجزی[۳] هذا القراٰن و لما حصل المعجزالواحد کان طلب الزیادة بغیا و جهلا ثم قدر کونه معجزا بان

---

[۱] فاتحة هذه و خاتمة ما قبلها تشتملان علی بیان الرسالة ۱۲ منه

[۲] فهو تقریر بقوله تعالی فیما قبل و هو علی کل شیء قدیر ۱۲ منه

[۳] لقولهم لولاانزل علیه کنزاوجاء معه ملک ۱۲ منه عفی عنه

تحداهم بالمعارضة من كان يريدالحيوة الدنيا الخ قال ابو السعود لما امرنبيه عليه الصلوة والسلام والمؤمنين بان يزدادوا علما و يقينا بان القراٰن منزل بعلم الله و بان لاقدرة لغيره علی شئ اصلا و هيجهم علی الثبات علی الاسلام والرسوخ فيه عند ظهورعجز الكفرة و ما يدعون من دون الله عن المعارضة و تبين انهم ليسوا علی شئ اصلااقتضی الحال ان يتعرض لبعض شئونهم الموهمة لكونهم علی شئ فی الجملة من نيلهم الحظوظ العاجته واستيلائهم علی المطالب الدنيوية و بيان ان ذلک بمعزل عن الدلالة عليه ولقد بين ذلک ای بيان ثم اعيدالترغيب فيما ذكر من الايمان بالقراٰن والتوحيد والاسلام فقيلا فمن كانه علی بينة من ربه الخ و تقديره افمن كان علی بينة من ربه كاولئک الذين ذكرت اعمالهم و بين مصيرهم و مالهم يعنی ان بينهما تفاوتا عظيما و من اظلم ممن افتری الی قوله هم الا خسرون قال ابو السعود و هذه الاٰيات كماتری مقررة لما سبق من انكار المماثلة بين من كان علی بينة من ربه و بين من كان يريدالحيوة الدنيا ابلغ تقرير فانهم حيث كانوأ اظلم من كل ظالم واخسرمن كل خاسر لم يتصور مماثلة بينهم و بين احدمن الظلمة الاخسرين فماظنک بالمماثلة بينهم و بين من هو فی اعلی مدارج الكمال و لما ذكر فريق الكفار و اعمالهم شرح فی بيان حال اضدادهم اعنی فريق المؤمنين وما يول اليه امرهم من العواقب الحميدة تكملة لما سلف من محاسنهم المذكورة فی قوله تعالی افمن كان علی بينة من ربه الاٰية يتبين مابينهما من التباين البين حالا و مالأفقيل ان الذين اٰمنوا الخ و بعد بيان حاليهما عقلا اريد بيان تباينهما حسا فقيل مثل الفريقين كالا عمے الخ ولقد ارسلنا نوحا الی قوله الی اٰخرالقصص المذكورة فی السورة قال ابو السعود ولما بين من فاتحة السورة الكريمة الی هذا المقام انها كتاب محكم الاٰيات مفصلها نازل فی شان التوحيد و ترک عبادة غيرالله سبحانه و ان الذی انزل عليه نذير و بشير من جهة تعالی و قرر فی تضاعيف ذلک ماله مدخل فی تحقيق هذاالمرام من الترغيب والترهيب والزام المعاندين بما يقارنه من الشواهد الحقة الدالة علی كونه من عندالله تعالی و تسلية الرسول صلی الله عليه وسلم مما عراه من ضيق الصدرالعارض له من افتراحاتهم الشنيعة و تكذيبهم له و تسميتهم للقراٰن تارة سحرا و اخری مفتری و تثبية عليه الصلوة والسلام والمؤمنين علی التمسک به والعمل بموجبه علی ابلغ وجه ابداع اسلوب شرع فی تحقيق ماذكرو تقرير بذكر قصص الانبياء صلوٰة الله عليهم اجمعين المشتملة علی ما اشتمل عليه فاتحة السورة الكريمة ليتاكد ذلک بطرق احدها ان ما اضربه من التوحيد و فروعه مما اطبق عليه الانبياء قاطبة والثانی ان ذلک انما علمه رسول الله صلی الله عليه وسلم بطريق الوحی فلا يبقی فی حقيقة كلام اصلا و ليتسلی بما

بشاهده من معاناة الرسل قبله من اممهم و مقاساتهم الشداء من جهتهم ان فی ذلک لأیة لمن الخ قال المسکین ذکر اعظم منافع بیان القصص ثم اتبعه بذکر یوم الأخرة واحواله و ما یلقی الناس فیه من سعداء واشقیاء فلاتک فی مریة الخ قال ابو السعود و لما کان مساق النظم الکریم قبیل الشروع فی القصص لبیان غایة سوء حال الکفرة و کمال حسن حال المؤمنین و قد ضرب لهم مثلا فقیل مثل الفریقین الخ و قد قص عقیب ذلک من انباء الامم السالفة مع رسلهم المبعوثة الیهم ما یتذکربه المتذکر نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن کونه فی شک من مصیرامر هولاء المشرکین فی العاجل والأجل ثم علل ذلک فقیل ما یعبدون الخ ای هم و أباء هم سواء فی الشرک وقد بلغک ما لحق بابائهم فیسلحقهم مثل ذلک فان ثماثل الاسباب یقتضی تماثل المسببات ولقد اٰتینا موسی الخ اعلم انه تعالی لما بین فی الأیة الاولی اصرار کفار مکة و بین تعالی ان هؤلاء الکفار کانوا علی هذه السیرة الفاسدة مع کل الانبیاء علیهم السلام ضرب لذک مثلا و هوانه لما انزل التورٰیة اختلفوا فیه و ذلک یدل علی ان عادة الخلق هکذا فاستقم الخ قال ابو السعود لما بین فی تضاعیف القصص سوء عاقبة الکفرو عصیان الرسل و ان کل واحد من المؤمنین والکافرین یو فی جزاء عمله امر رسوله الله صلی الله علیه وسلم بالاستیقامة کما امربه و اقم الصلوة الخ اعلم انه تعالی لما امره بالاستقامة اردفه بالامر بالصلوة و ذلک یدل علی ان اعظم العبادات بعد الایمان بالله هو الصلوة فلولا کان من القرون الخ اعلم انه تعالی لما بین ان الامم المتقدمین حل بهم عذاب الاستیصال بین السبب فیه و لوشاء ربک الخ قال المسکین کان المذکور فی الأیة الاولی السبب الظاهری و فی هذه الأیة السبب الحقیقی و کلا نقص علیک الخ انه تعالی لما ذکر القصص الکثیرة فی هذه السورة ذکر فی هذه الأیة نوعین من الفائدة و قل للذین لایؤمنون الخ اعلم انه تعالی لما بلغ الغایة فی الاعذاروالانذاروالترغیب والترهیب اتبع ذلک بان قال للرسول و قل الخ

سورۃ یوسف علیہ السلام

ذلک من انباء الغیب الخ اعلم ان المقصد من هذا اخبارعن الغیب فیکون معجزا و ما اکثر الناس ولوحرصت الخ اعلم ان وجه اتصال هذه الأیة بما قبلها ان کفار قریش و جماعة من الیهود الطلبوا هذه القصة من رسول الله صلی الله علیه وسلم علی سبیل التعنت واعتقد رسول الله صلی الله علیه وسلم انه اذا ذکرها فربها اٰمنوا فلما ذکرها اصرواعلی کفرهم فنزلت هذه الأیة قال المسکین ثم ذکر غفلتهم عن الأیات الکونیة کغفلتهم عن الأیات المنزلة وذکر الوعید بالعذاب علی الغفلة ثم امر علیه السلام باظهار حقیقة سبیل الحق الذی بعث به والدعوة الیه ثم دفع الاستبعاد فی کونه علیه الصلوة والسلام رسولا لکونه بشراوذکر عاقبة المکذبین للرسول من حلول العذاب بهم و لوبعد حین ثم نبه علی فائدة ذکر القصص فی القراٰن و قررکون القراٰن المشتمل علی هذه القصص حقا و صدقا

لے احدهما للرسول و ثانیهما للمؤمنین ۱۲ منه ۲ے لما قال فی اخر السورة التی تقدمت و کلانقص من انباء الرسل الخ بین فی هذه السورة القصة التی هی احسن القصص ۱۲ منه عفی عنه

سورۃ الرعد[1]

اللہ الذی رفع السموٰت الخ اعلم انہ تعالی لما ذکر ان اکثر الناس لایؤمنون ذکر عقیبہ ما یدل علی صحۃ التوحید والمعاد و ھوالذی مدالارض الخ اعلم انہ تعالی لما قرر الدلائل السماویۃ اردفھا بتقریر الدلائل الارضیۃ و فی الارض قطع الخ قال ابوالسعود جملۃ مستانفۃ مشتملۃ علی طائفۃ اخری من الأیات و ان تعجب الخ اعلم انہ تعالی لما ذکر الدلائل القاھرۃ علی ما یحتاج الیہ فی معرفۃ المبدء ذکرہ بعدہ مسئلۃ المعاد و یستعجلونک بالسیئۃ الخ اعلم انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یھدھم تارۃ بعذاب القیامۃ و تارۃ بعذاب الدنیا والقوم کلما ھدھم بعذاب القیامۃ انکروا القیامۃ والبعث والحشر والنشرو ھوالذی تقدم ذکرہ فی الأیۃ الاولی و کلما ھدھم بعذاب الدنیا قالو الہ فجئنا بھذا العذاب فلھذا البسبب حکی اللہ عنھم انھم یستعجلون و یقول الذین کفروا الخ اعلم انہ تعالی حکی عن الکفار انھم طعنوا فی نبوۃ بسبب طعنھم فی الحشرو النشراولاً ثم طعنوا فی نبوتہ بسبب طعنھم فی صحتہ ما ینذرھم بہ من نزول عذاب الاستیصال ثانیا ثم طعنوا فی نبوتہ بان طلبوا منہ المعجزۃ[2] والبینۃ ثالثا و ھوالمذکور فی ھذہ الأیۃ اللہ یعلم ما تحمل الخ قال المسکین ھذاالرکوع بکمالہ تقریر للتوحید وابطال للشرک مرتبط بقولہ اللہ الذی رفع السموات الخ و فی تضاعیفہ جعل قول ان اللہ لا یغیرما بقوم الخ غایۃ للحفظ المذکور فی قولہ یحفظونہ من امراللہ و ضرب امثالا للحق والباطل و بین جزاء الحق والمبطل ثم ذکر اوصاف المحقین والمبطلین بقولہ افمن یعلم انما انزل الیک الی قولہ اولئک لھم اللعنۃ ولھم سوء الدار . قولہ تعالی اللہ یبسط الخ اعلم انہ تعالیٰ لما حکم علی نقض عھد اللہ فی قبول التوحید والنبوۃ بانھم ملعونون فی الدنیا و معذبون فی الأخرۃ فکانہ قیل لوکانوا اعداء اللہ لما فتح اللہ علیھم ابواب النعم واللذات فی الدنیا فاجاب اللہ عنہ بھذہ الأیۃ و یقول الذین کفروا الخ قال المسکین کان المذکورالی ھھنا امرالتوحید و ما یتعلق بہ والأن شرع فی اثبات الرسالۃ والجواب عن شبھاتھم فیھا و تقریعھم علی انکارھا ففی ھذہ الأیۃ اجاب عن شبھتھم المشورۃ لولاانزل علیہ أیۃ من ربہ حاصل الجواب انا اعطیناک أیۃ عظیمۃ ھی الذکر ای القرأن الذی تطمئن بہ قلوب المؤمنین و یضل بہ المردۃ من الطاغین کذلک ارسلناک فی امۃ الخ

---

[1] والمناسبۃ بین اول ھذہ السورۃ واٰخرۃ المتقدمۃ ان کلیھما یشترک فی اثبات حقیۃ القراٰن ۱۲ منہ عفی عنہ

[2] ای من مقترحاتھم الواھیۃ ۱۲ منہ

قال المسكين فيه تصريح بالمقصود واما قوله وهم يكفرون بالرحمٰن فلعل المراد به تسلية النبی صلی الله عليه وسلم ای لاتحزن لو كفروابک فانهم يكفرون بالرحمٰن فتوكل عليه ولاتهتم بهم ولو ان قرانا سيرت به الجبال الخ قال المسكين فيه اثبات لامر القران الدال علی النبوة و اقناط من ايمانهم و بيان الجزاء هم علی الكفرو لقد استهزیٔ برسل الخ قال المسكين فيه تسلية للنبی صلی الله عليه وسلم عما لقی من المشركين من التكذيب والاقتراح علی طريقة الاستهزاء به ووعيد لهم ثم اشارالی استحقاقهم العذاب فی قوله افمن هو قائم علی كل نفس الخ ببيان ان امرالتوحيد عقلی بديهی لا عذر لاحد فی الاعراض عنه و اهمال امره مثل الجنة التی وعد الخ اعلم انه تعالیٰ لما ذكر عذاب الكفار فی الدنيا والأخرة اتبعه بذكر ثواب المتقين والذين اٰتيناهم الكتاب الخ قال المسكين هذا دليل اٰخر علی حقيقة القراٰن الذی جاء به الرسول بان اهل الكتاب يصدقونه ثم اشارالی ركاكة رای المنكرين بقوله قل انما امرت الخ ای ليس فيما انزل الی الامرالتوحيد و هذا مما لاينكرو كذلک انزلناه الخ قال المسكين فيه تصريح ايضابالمقصود من انزال القراٰن علی الرسول ولقد ارسلنا رسلا من قبلک الخ اعلم ان القوم كانوايذكرون انواعاً من الشبهات فی ابطال نبوة فالشبهة الاولی قولهم ما لهذ الرسول يأكل الطعام و يمشی فی الاسواق و هذه الشبهة انما ذكرها الله تعالی فی سورة اخری والشبهة الثانية قولهم الرسول لابدوان يكون من جنس الملٰئكة فاجاب الله تعالی عنه ههنا بقوله ولقدارسلنا لا الشبهة الثالثة عابوارسول الله صلی الله عليه وسلم بكثرة الزوجات فاجاب الله تعالیٰ عنه بقوله ولقد ارسلنا الخ والشبهة الرابعة قالوالوكان رسولا من عندالله لكان ای شیء طلبنا منه من المعجزات اتی به ولم يتوقف فاجاب الله تعالی عنه بقوله و ما كان لرسول الخ الشبهة الخامسة انه عليه السلام كان يخوفهم بنزول العذاب ثم ان ذلک الموعود كان يتاخرفاجاب الله عنه بقوله ولكل اجل كتاب الشبهة السادسة قالوا لوكان فی دعوی الرسالة محقا لما نسخ الاحكام التی نص الله تعالی علی ثبوتها فی الشرائع المتقدمة فاجاب الله سبحانه عنه بقول يمحوا الله مايشاء و اما نرينک بعض الذی نعدهم الخ قال المسكين كانه تفصيل و توضيح لقوله و ما كان لرسول ان ياتی باٰية الا باذن الله لكل اجل كتاب اولم يروا انا نأتی الخ اعلم انه تعالی لما وعد رسوله بان يره بعض ما وعدوه او يتوفاه قبل ذلک بين فی هذه الأية ان اٰثار حصول تلک المواعيد و علاماتها قدظهرت و يقول الذين كفروا الخ اعلم انه تعالی حكی عن القوم انهم انكروا كونه رسولا من عندالله ثم انه تعالی احتج عليهم بامرين الاول شهادة الله والمراد انه تعالی اظهر المعجزات والثانی قوله و من عنده علم الكتاب

سورة ابراهیم علیہ السلام

وما ارسلنا من رسول الخ قال المسكين كانه قسيم لقوله لتخرج الناس من الظلمات اى كافتهم فكان الحاصل انا بعثنا جميع الرسل الى اقوامهم خاصة وارسلناك الى الناس عامة ولقد ارسلنا موسى الخ قال ابوالسعود شروع فى تفصيل[2] ما اجمل فى قوله عز و جل ولقد ارسلنا و اذتاذن الخ قال ابوالسعود من جملة مقال موسى عليه الصلوة والسلام لقومه الم يأتكم نبأ الذين الخ قال المسكين هذا ترهيبه من عليه السلام غب ترغيب و يحتمل ان يكون ابتداء مخاطبة من الله تعالى لقوم الرسول صلى الله عليه وسلم ثم ذكر تعالى المناظرة التى وقعت بين الانبياء عليهم السلام و اقوامهم الى خاتمة الركوع ثم ذكر تعالى جزاء المكذبين فى قوله تعالىٰ فاوحى اليهم ربهم الى اٰخر الركوع و اشار فى تضاعيف بقوله تعالى الم تران الله خلق السموات والارض الخ الى ان من هذاشانه حقيق بان يؤمن به و يرجى ثوابه ويخشى عقابه و قال الشيطان لما قضى الامر الخ اعلم انه تعالى لما ذكر المناظرة التى وقعت بين الرؤساء والاتباع من كفرة الانس اردفها بالمناظرة التى وقعت بين الشيطان و بين اتباعه من الانس و ادخل الذين اٰمنوا الخ اعلم انه تعالى لما بالغ فى شرح احوال الاشقياء من الوجوه الكثيرة شرح احوال السعداء الم تر كيف ضرب الله الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال الاشقياء واحوال السعداء ذكر مثالا يبين الحال فى حكم لهذين القسمين يثبت الله الخ قال المسكين بيان كيفية المشية واٰثاره الم ترالى الذين بدلوا الخ اعلم انه تعالى عادالى وصف احوال الكفار فى هذه الاٰية قل لعبادى الذين اٰمنوا الخ اعلم انه تعالى لما امرالكافرين على سبيل التهديد والوعيد بالتمتع بنعيم الدنيا امرالمؤمنين فى هذه الاٰية بترك التمتع بالدنيا والمبالغة فى المجاهدة بالنفس والمال الله الذى خلق السموات الخ اعلم انه تعالى لما اطال الكلام فى وصف احوال السعداء و احوال الاشقياء و كانت العمدة فى حصول السعادات معرفة الله تعالىٰ بذاته و بصفاته و فى حصول الشقاوة فقدان هذه المعرفة لاجرم ختم الله تعالى وصف احوال السعداء والاشقياء بالدلائل الدالة على وجودالصانع و كمال علمه و قدرته واذ قال ابراهيم الخ اعلم انه تعالى لما بين بالدلائل المتقدمة انه لامعبودالاالله شبحانه و تعالى وانه لايجوز عبادة غيره تعالى البتة حكى عن ابراهيم عليه السلام مبالغة فى انكار عبادة الاوثان ولا تحسبن الله غافلا الخ قال المسكين هذا عود الى ذكر جزاء المكذبين بالتوحيد والنبوة ويمتد الى خاتمة السورة فخلاصة السورة كلها تقرير امر النبوة ووعيد المنكرين لها والله اعلم ثم فختم شان الكتاب الكافى لما ذكر بقوله هذا بلغ للناس و بين فوائد العلمية والعملية

[1] بين امر الرسالة فى اخر المتقدمة واول هذه فهذا هو وجه الربط بينهما ۱۲ منه

[2] وقد مرمراراً ما فى ذكر القصص من الحكم ۱۲

سورۃ الحجر[2]

ربما یود الذین الخ قال ابو السعود لما بین کون السورة الکریمة بعضامن الکتاب و القراٰن لتوجیه المخاطبین الی حسن تلقی ما فیها من الاحکام و القصص و المواعظ شرع فی بیان ماتتضمنه فقیل ربما و قال هذا بیان حقارة شان الکفار و عدم الاعتداد بما هم فیه من الکفروا التکذیب کما ینطق به قوله تعالی ذرهم یاکلوا و ما اهلکنا من قریة الخ قال ابو السعود شروع فی بیان سر تاخیر عذابهم و قالوا یایها الذی نزل الخ قال ابو السعود شروع فی بیان کفرهم بمن انزل علیه الکتاب بعد بیان کفرهم بالکتاب ومایول الیه حالهم انا نحن نزلنا الذکر الخ قال ابو السعود ردلا نکارهم التنزیل واستهزاء هم برسول الله صلی الله علیه وسلم و تسلیة له ولقد ارسلنا من قبلک الخ اعلم ان القوم لما اساؤا فی الادب و خاطبوه بالساهة وقالوا انک لمجنون فاالله تعالی ذکر ان عادة هؤلاء الجهال مع جمیع الانبیاء هکذا کانت ولک اسوة فی الصبر ولو فتحنا علیهم بابا الخ ان القوملما طلبوانزول ملائکة بین الله تعالی فی هذه الأیة ان بتقدیر ان یحصل هذا المعنی لقال الذین کفرواهذامن باب السحر ولقد جعلنا فی السماء بروجا الخ اعلم انه تعالی لما اجاب عن شبهة منکری النبوة و کان قدثبت ان القول بالنبوة متفرع علی القول بالتوحید اتبعه بدلائل التوحید فقال ولقد جعلنا فی السماء الخ والارض مددنا ها الخ وجعلنا لکم فیها معایش الخ وان من شیء الاعندنا الخ وارسلنا الریاح لواقح الخ و انا لنحن نحیی الخ ولقد علمنا المستقدمین الخ و ان ربک هو یحشر الخ ولقد خلقنا الانسان الخ واذ قال ربک للملٰئکة الخ اعلم انه تعالی لما ذکر حدوث الانسان الاول واستدلال بذکره علی وجود الالٰه القادر المختار ذکر بعده واقعته ان المتقین فی جنات الخ اعلم انه تعالی لما شرح احوال اهل العقاب اتبعه بصفة اهل الثواب و نبئهم عن ضیف ابراهیم الخ قال ابو السعود المقصود اعتبارهم بما جری علی ابراهیم علیه الصلوة والسلام مع اهله من البشری فی تضاعیف الخوف و بما حل بقوم لوط من العذاب و نجاته علیه الصلوة والسلام مع اهله التابعین له فی ضمن الخوف

---

[1] اقول کان فیما قبل بیان الکفار السابقین و ههنا ذکر حال الموجودین منهم ۱۲ منه [2] ختم السورة التی مرت ببیان جزاء المکذبین بین فی الول هذه السورة تمنیهم الاسلام اذارأوا الجزاء ۱۲ منه عفی عنه

و تنبیههم بحلول انتقامه تعالی من المجرمین و علمهم بان عذاب الله هو العذاب الالیم و فی الکبیر اعلم انه تعالی لما بالغ فی تقریر النبوة ثم اردفه بذکر دلائل التوحید ثم ذکر عقیبه احوال القیامة و صفة الاشقیاء والسعداء اتبعه بذکر قصص الانبیاء علیهم السلام لیکون سماعها مرغبا فی الطاعة الموجبة للفوز بدرجات الانبیاء و محذرا عن المعصیة لاستحقاق درکات الاشقیاء فبدأ اولا بقصة ابراهیم علیه السلام و ما خلقنا السموات والارض الخ اعلم انه تعالی لما ذکر انه اهلک الکفار فکانه قیل الاهلاک والتعذیب کیف یلیق بالرحیم الکریم فاجاب عنه بانی انما خلقت الخلق لیکونوا مشتغلین بالعبادة والطاعة فاذا ترکوها و اعرضوا عنها وجب[1] فی الحکمة اهلاکهم و تطهیر وجه الارض منهم ولقد اٰتیناک سبعاً الخ اعلم انه تعالی لما صبره علی اذی قومه وامره بان یصفح الصفح الجمیل اتبع ذلک بذکر النعم العظیمة التی خص الله تعالیٰ محمدا صلی الله علیه وسلم بها لان الانسان اذاتذکر کثرة نعم اللّٰه علیه سهل علیه الصفح والتجاوز لاتمدن عینیک الخ لما عرف رسوله عظم نعمه علیه فیما یتعلق بالدین نهاه عن الرغبة فی الدنیا و قل انی انا الخ اعلم انه تعالی لما امررسوله بالزهد فی الدنی او خفض الجناح للمومنین امره بان یقول للقوم انی انا النذیر المبین فیدخل تحت کونه نذیرا کونه مبلغا لجمیع التکالیف ولقد نعلم انک یضیق الخ اعلم انهٗ تعالی لما ذکران قومه یسفهون علیه قال له ولقد نعلم لان الجبلة البشریة و المزاج الانسانی یقتضی ذلک فعندهذا قال له فسبح الخ

[1] لیس المراد بالوجوب الوجوب العقلی کما عندالمعتزلة بل بمحض ارادته و مشیة کما عند اهل الحق ۱۲ منه

سورۃ النحل

اتی امر الله فلا تستعجلوه الخ قال المسکین لعل المقصود الاصلی منه اثبات التوحید و افتتحه بالوعید علی الاعراض عنه واتبعه ببیان انه دین اجمع علیه جمهور الانبیاء علیهم الصلوة والسلام و امروا بدعوة الناس الیه خلق السمٰوٰت الخ اعلم انه تعالی لما بین فیما سبق ان معرفته الحق مطلع السعادات اتبعه بذکر الدلائل علی وجود الصانع الالٰه تعالی و کمال قدرته و حکمته افمن یخلق کمن لا یخلق الخ قال المسکین هو کا لنتیجة لما سبق من الدلائل التی هی نعم ایضا و اذا قیل لهم ماذا انزل الخ اعلم انه تعالی لما بالغ فی تقریر دلائل التوحید واورد الدلائل القاهرة فی ابطال مذاهب عبدة الاصنام ذکر بعد ذلک شبهات منکری النبوة مع الجواب عنها فالشبة الاولی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم لما احتج علی صحة نبوة نفسه بکون القراٰن معجزة طعنوا فی القراٰن و قالوا انه اساطیر الاولین و لیس هو من جنس المعجزات و لما ثبت کون القراٰن معجزامرا راکثیرة لاجرم اقتصر فی هذه الأیة علی مجرد الوعید قدمکر الذین من قبلهم الخ اعلم ان المقصود من هذه الأیة المبالغة فی وصف وعید اولئک الکفار و قیل للذین اتقواالخ اعلم انه تعالی لما بین احوال الاقوام الذین اذا قیل لهم ماذا انزل ربکم قالوا اساطیر الاولین اتبعه بذکروصف المؤمنین هل ینظرون الا ان الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الثانیة لمنکری النبوة فانهم طلبوا ان ینزل الله تعالی ملکامن السماء یشهد علی صدقه فی ادعاء النبوة و قال الذین اشرکو الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الثالثة لمنکری النبوة و تقریرها انهم تمسکوا بصحة القول بالجبر علی الطعن فی النبوة فالکل من الله و لا فائدة فی مجیئک وارسالک فکان القول بالنبوة باطلا واقسموا بالله جهد ایمانهم الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الرابعة لمنکری النبوة فقالوا القول لبعث والحشر والنشر باطل فکان القول بالنبوة باطلاوالذین هاجروا الخ اعلم انه تعالی لما حکی عن الکفار انهم تمادوا فی العی والجهن والضلال و فی مثل هذه الحالة لایبعد اقدامهم علی ایذاء المسلمین وحینئذیلزم علی المؤمنین ان یهاجروا فذکر تعالیٰ حکم تلک الهجرة و ما ارسلنا من قبلک الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الخامسة لمنکری النبوة کانوا یقولون الله اعلی واجل من ان یکون رسوله و احدامن البشرا فامن الذین مکروا الخ قال المسکین اخذامن الکبیر لعله راجع الی بیان حال الذین اضطر المسلمون الی الهجرة من ایذائهم فهدهم الله تعالی اولم یروا الی ما خلق الله الخ قال المسکین رجوع الی اثبات التوحید و اقامة الدلائل و ابطال اقوال

لے ختم السورة السابقة باثبات الرسالة وافتتح هذه ببیان التوحید و ایضا لما قال فی تلک ولقد نعلم انک یضیق صدرک اخبر فی هذه بانه اتی امر الله الخ لئلایصق صدره ۱۲ منه عفی عنه

المشركين من اتخاذالولدله تعالى و نحوه و تهديد هم بقوله ولويؤاخذالله الناس و فساد مذهب عبدة الاصنام بالامثال من قوله ضرب الله مثلا عبدا الخ و ضرب الله مثلاً رجلين الخ واختصاص علم الغيب به تعالى فى قوله ولله غيب السموت والارض و كمال قدرته على كل شيء من الامور التى يؤيد مطلب التوحيد وامتدت هذه الدلائل الى قوله تعالى و الله جعل لكم مما خلق ظللاوجعل لكم من الجبال اكنانا الى اخرالأية ثم نبه على كون تلك الامور نعما تاما بقوله كذلك يتم نعمة عليكم لعلكم تسلمون ثم سلى رسوله الله صلى الله عليه وسلم ان تولوا وانكروا بعدالمعرفة بقوله فان تولواوقوله يعرفون نعمة الله الخ و يوم نبعث من كل امة شهيد الخ اعلم انه تعالى لما بين من حال القوم انهم عرفوا نعمت الله ثم انكروها اتبعه بالوعيد فذكر حال يوم القيامة قال المسكين وامتد ذلك الى قوله و يوم نبعث المكررولما كان المبين لهذه المهمات هو القرأن ختمه بالثناء على القرأن بقوله و نزلنا عليك الخ ان الله يامر بالعدل الخ قال المسكين اخذامن ابى السعود كانه دليل لكون القرأن تبيانا لكل شيء يعنى امرالله تعالى فى هذا القرأن بكل محمود و نهى فيه عن كل مذموم فصدق كونه تبيانا و هدى الخ و يحتمل ان يكون اجمالا لما سبق من تفصيل الاحكام واوفوا بعهد الله الخ اعلم انه تعالى لما جمع كل المامورات والمنهيات فى الأية الاولى على سبيل الاجمال ذكر فى هذه الأية بعض تلك الاقسام ولوشاء الله الخ قال المسكين هذا بيان حكمة تخصيص النبيين بيوم القيامة ما عندكم ينفد الخ قال ابوالسعود تعليل للخيرية بطريق الاستيناف من عمل صالحاً من ذكر الخ قال ابوالسعود شروع فى تحريض كافة المومنين على كل عمل صالح غب ترغيب طائفة منهم فى الثبات على ماهم عليه من عمل صالح مخصوص دفعالتوهم اختصاص الاجرالموفوربهم و بعملهم للذكور فاذاقرأت القرأن الخ اعلم انه تعالى لما قال قبل هذه الأية ولتجزينهم اجرهم باحسن ماكانوايعملون ارشد الى العمل الذى به تخلص اعماله عن الوساوس فقال فاذا قرأت القرأن قال ابوالسعود و تخصيص قراءة القرأن من بين الاعمال الصالحة بالاستعاذة عندارادتها للتنبيه على انها لغيره عليه السلام و فى سائر الاعمال اهم فانه عليه السلام حيث امربها عند قراءة القرأن الذين لاياتيه الباطل من بين يديه ولامن خلفه فماظنكم بمن عداه عليه السلام فيما عداالقراءة من الاعمال واذا بدلنا أية الخ اعلم انه تعالى شرع من هذاالموضع فى حكايةٍ[1] شبهات منكرى نبوة محمد صلى الله عليه وسلم من كفر بالله من بعدايمانه الخ قال ابوالسعود هوابتداء كلام لبيان حال من كفربايات الله بعدما أمن بها بعد بيان حال من لم يومن بهارأساً ثم ان ربك للذين هاجروا الخ لماذكر فى الأية المتقدمة حال من كفربالله وحال من اكراه على الكفر ذكر بعده حال من هاجرمن بعدما فتن قال المسكين ثم ذكراليوم الذى يجازى فيه الكافروالمؤمن فقال يوم تاتى كل نفس الخ و ضرب الله مثلا قرية الخ اعلم انه تعالى لماهددالكفار بالوعيد الشديد

[1] اى بعد اثبات التوحيد من فاتحة السورة ۱۲ منه

فی الأخرۃ ھددھم ایضا بأفات الدنیا و ھو الوقوع فی الجوع والخوف ولقد جاء ھم رسول منھم الخ قال ابو السعود من تتمۃ المثل جیٔ بھما لبیان ان مافعلوہ من کفران النعم لم یکن مزاحمۃ منھم لقضیۃ العقل فقط بل کان ذلک معارضۃ لحجۃ اللہ علی الخلق ایضافکلوا ممارزقکم اللہ الخ یعنی ان ذلک الجوع انما کان بسبب کفرکم فاترکوا الکفر حتی تاکلوا انما حرم علیکم المیتۃ الخ یعنی انکم لما امنتم و ترکتم الکفر فکلوا الحلال الطیب واترکوا الخبائث ولاتقولوا لماتصف الخ اعلم انہ تعالی لما حصر المحرمات بالغ فی تاکید ذلک الحصر و علی الذین ھادوا الخ قال ابو السعود ھو تحقیق لما سلف من حصر المحرمات فیما فصل بابطال ما یخالفہ من قریۃ الیھود و تکذیبھم فی ذلک فانھم کانوا یقولون لسنااول من حرمت علیہ وانما کانت محرمۃ علی نوح و ابراھیم و من بعدھما حتی انتھی الامر الینا قال المسکین یمکن ان یکون ھذاتائیداً لما سلف من وقوع الجوع والخوف علی القریۃ بسبب کفرھم و حینئذمحط الفائدۃ قولہ تعالی و ما ظلمنا ھم الخ ثم ان ربک للذین عملوا الخ اعلم ان المقصود بیان ان الافتراء علی اللہ و مخالفۃ امراللہ یامنعھم من التوبۃ و حصول المغفرۃ والرحمۃ ان ابراھیم کان امۃ الخ اعلم انہ تعالی لما زیف فی ھذہ السورۃ مذاھب المشرکین فی قولھم باثبات الشرکاء و طعنھم فی نبوۃ الانبیاء و قولھم تحلیل اشیاء و تحریم اشیاء و کان ابراھیم علیہ السلام رئیس الموحدین و قدوۃ الاصولیین والمشرکون کانوا مفتخرین بہ لاجرم ذکرہ اللہ تعالی فی أخرھذہ السورۃ لیصیر ذلک حاملا علی الاقرار بالتوحید والرجوع عن الشرک انما جعل السبت الخ قال ابو السعود تحقیق لذلک النفی الکلی و توضیح لہ بابطال ما عسی یتوھم کونہ قادحاً فی کلیۃ فان الیھود کانوایدعون ان السبت من شعائر الاسلام وان ابراھیم علیہ السلام کان محافظا علیہ ای لیس السبت من شرائع ابراھیم و شعائر ملۃ التی امرت باتباعھا حتی یکون بینہ علیہ الصلوۃ والسلام و بین بعض المشرکین علاقۃ فی الجملۃ وانما شرع ذلک لنبی اسرائیل بعد مدۃ طویلۃ ادع الی سبیل ربک الخ اعلم انہ تعالی لما امر محمد اصلی اللہ علیہ وسلم باتباع ابراھیم علیہ السلام بین الشیٔ الذی امرہ بمتابعتہ فیہ فقال ادع الخ و ان عاقبتم فعاقبوا الخ قال ابو السعود بعدما امرہ علیہ الصلوۃ والسلام فیما یختص بہ من شان الدعوۃ بما امرہ بہ من الوجہ اللائق عقبہ بخطاب شامل لہ و لمن شایعہ فیما یعم الکل فان الدعوۃ الماموربھا لاتکاد تنفک عن ذلک کیف لاوھی موجبۃ لصرف الوجوہ عن القبل المعبودۃ وادخال الاعناق فی قلادۃ غیرمعھودۃ قاضیۃ علیھم بفساد مایاتون و مایذرون و بطلان دین استمرت علیھم أباؤھم و قد ضاقت علیھم الحیل و عییت لھم العلل و سدت علیھم طرق المحاجۃ و المناظرۃ وارتجت دونھم ابواب المباحثۃ والمحاورۃ

سورۃ بنی اسرائیل

واتینا موسی الکتاب الخ ذکرالله تعالی فی الأیة الاولی اکرامه محمد اصلی الله علیه وسلم بان اسری به وذکر فی هذه الأیة انه اکرم موسی علیه الصلوة والسلام قبله بالکتاب الذی أتاه ذریة من حملنا الخ قال ابوالسعود والمراد تاکید الحمل علی التوحید بتذکیر انعامه تعالی علیهم فی ضمن انجاء أباء هم من الغرق فی سفینة نوح علیه السلام انه کان عبداشکورا الخ قال ابوالسعود فیه ایذان بان انجاء من معه کان ببرکة شکره علیه الصلوة والسلام و حث للذریة علی الاقتداء به وزجرلهم عن الشرک الذی هو اعظم مراتب الکفران و قضینا الی بنی اسرائیل الخ اعلم انه تعالی لما ذکر انعامه علی بنی اسرائیل بانزال التورٰته علیهم و بانه جعل التوراة هدی لهم بین انهم ما اهتدوابهداه بل وقعوا فی الفساد ان احسنتم احسنتم الخ اعلم انه تعالی حکی عنهم انهم لما عصوا سلط علیهم اقواما و لما تابواازال عنهم تلک المحنة فعند ذلک ظهرانهم ان اطاعوافقد احسنوا الی انفسهم و ان اصرواعلی المصیة فقد اساؤالی انفسهم ان هذا القرأن یهدی الخ انه تعالی لما شرح ما فعله فی حق عباده المخلصین و هوالاسراء برسول الله صلی الله علیه وسلم وایتاع الکتاب لموسی علیه السلام و ما فعله فی حق العصاة والمتمردین و هو تسلیط انواع البلاء علیهم کان ذلک تنبیها علی انه طاعة الله توجب کل خیر و کرامة و معصیة توجب کل بلیة و غرامة لاجرم اثنی علی القرأن و یدع الانسان بالشر الخ قال ابوالسعود بیان لحال المهدی اثر بیان الهادی و اظهار لما بینهما من التباین والمراد بالانسان الجنس اسندالیه حال بعض افراده او حکی عنه حاله فی بعض احیانه فالمعنی علی الاول ان القرأن یدعوالانسان الی الخیر الذی لاخیر فوقه من الاجرالکبیر و یحذره من الشروراء ه من العذاب الالیم و هوای بعض منه و هو الکافر یدعولنفسه بما هو الشرمن العذاب المذکور اما بلسانه حقیقة کدأب من قال منهم الٰهم ان کان هذا هوالحق من عندک فامطر علینا حجارة من السماء او ائتنا بعذب الیم و اما باعمالهم السیئة المضبنه الیه الموجبة له مجازا کما هو یدن کلهم و علی الثانی ان القرأن یدعوا الانسان الی ماهو خیروهو فی بعض احیانه کما عندالغضب یدعه و یدعو الله تعالی لنفسه

لے لما سلی الله تعالی رسوله صلی الله علیه وسلم فی اخرالسورة المتصدمة اراده تسلیة فی هذه ببیان اکرامه بالاسراء کیلا یلتفت الی اعداء ه ۱۲ منه عفی عنه

و اھلہ و مالہ بما ھو شرو جعلنا اللیل والنھار الخ لما بین فی الاٰیة المتقدمة ان ھذا القراٰن یھدی للتی ھی اقوم و ذلک الاقوم لیس الاذکرالدلائل الدالة علی التوحید والنبوة لاجرم اردفہ بذکر دلائل التوحید و ھو عائب العالم العلوی والسفلی و کل انسان اٰلزمناہ الخ قال المسکین لما بین تعالی ان القراٰن یھدی للتی ھی اقوم و بین حال المکلفین نبہ فی ھذہ الاٰیة ان امرالاعمال لیس مھملابل یسئلون عنہ یوم القیامة من اھتدی فانما الخ قال ابوالسعود فذلکة لما تقدم من بیان کون القراٰن ھادیالا قوم الطرائق ولزوم الاعمال لاصحابھا و لا تزروا زرة الخ قال ابوالسعود تاکید للجملة الثانیة و ما کنا معذبین الخ قال ابوالسعود بیان للعنایة الربانیة اثر بیان اختصاص اٰثارالھدایة والضلال باصحابھا و عدم حرمان المھتدی من ثمرات ھدایة و عدم مؤاخذة النفس بجنایة غیرھا واذا اردنا الخ قال ابوالسعود بیان لکیفیة وقوع التعذیب بعدالبعثة التی جعلت غایة لعد صحتہ من کان یریدالعاجلة الخ قال المسکین لما ذکر فیما سبق جزاء الاعمال ذکر فی ھذہ الاٰیة شرط قبولھا و ھوارادة الاٰخرة بالعمل و بین عدم الاغترار بالدنیا و زخارفھا بانھا من العطاء العالم الذی لایدل علی القبول لاتجعل مع اللہ الٰھا اٰخر الخ لما بین ان الناس فریقان منھم من یرید بعملہ الدنیا فقط و ھو اھل العقاب والعذاب و منھم من یرید بہ طاعة اللہ و ھم اھل الثواب ثم شرط ذلک بشرائط ثلثة اولھا ارادة الاٰخرة و ثانیھا ان یعمل عملا و یسعی سعیا موافقا لطلب الاخرة و ثالثھا ان یکون مؤمنا لاجرم فصل فی ھذہ الاٰیة تلک المجملات فبدأ اولا بشرح الایمان و اشرف اجزاء الایمان ھوالتوحید و نفی الشرکاء والاضداد فقال لاتجعل مع اللہ الٰھا اٰخر ثم ذکر عقیبہ سائرالاعمال التی یکون المقدم علیھا والمشتغل بھا ساعیا سعیاً یلیق بطلب الاٰخرة و صارمن الذین سعدطائرھم و حسن بختھم و کملت احوالھم ذلک مما اوحیٰ الیک ربک الخ اعلم انہ تعالی جمع فی ھذہ الاٰیة خمسة و عشرین نوعاً من التکالیف بعضھا اوامروبعضھا نواہ جمعھا اللہ تعالی فی ھذہ الاٰیات و جعل فاتحتھا قولہ ولا تجعل مع اللہ الٰھا اٰخر فتقعدمذموما مخذولاً و خاتمتھا قولہ ولاتجعل مع اللہ الٰھا اٰخر فتلقیٰ فی جھنم ملوماً مدحورا ولقد صرفنا الخ قال المسکین اخذامن ابی السعود ھذاتاکید لاثبات الاوھیا ای کررنا ھذا المعنی فی ھذا القراٰن بحیث لایبقی التباس فیہ قل لوکان الخ قال المسکین عود الی ابطال الشرک واذا قرأت القراٰن الخ اعلم انہ تعالی لما تکلم فی الاٰیة المتقدمة فی المسائل الالٰھیة تکلم فی ھذہ الاٰیة فیما یتعلق بتقریر النبوة قالواء اذاکنا الخ اعلم انہ تعالی لما تکلم اولاً فی الالٰھیات ثم اتبعہ بذکر شبھاتھم فی النبوات ذکر فی ھذہ الاٰیة شبھات القوم فی انکار المعاد والبعث و قد ذکرنا کثیرا ان

مدار القراٰن على المسائل الاربعة و هى الالٰهيات والنبوات والمعاد والقضاء والقدر و قل لعبادى الخ لما ذكر الحجة اليقينية فى ابطال الشرك وفى صحة المعاد قال فى هذه اذاردتم ايرادالحجة على المخالفين فاذكروا تلك الدلائل بالطريق الاحسن و هوان لايكون ذكر الحجة مخلوطاً بالشتم والسب ربكم اعلم بكم الخ قال المسكين كانه تعليل للقول الاحسن وعدم الخشونة بانه لافائدة فيها لان الهداية والضلال متعلقان بالمشيئة الازلية و ربك اعلم بمن الخ بمعنى انه غير مقصور عليكم ولاعلى احوالكم بل علمه بجميع الموجودات والمعدومات فيعلم حال كل واحد و يعلم ما يليق به من المصالح والمفاسد فلهذا السبب فضل بعض النبيين على بعض واٰتى موسى التورٰة وداؤد الزبور و عيسى الانجيل فلم يبعد ايضا ان يوتى محمد القراٰن و ان يفضله على جميع الخلق قل ادعوا الذين زعمتم الخ قال المسكين رجوع الى ابطال الشرك ببيان ان الذين تعبدونهم محتاجون الى الالٰه الحق فكيف تتخذونهم اٰلهة و ان من قرية الانحن الخ قال ابوالسعود بيان لتحتم حلول عذابه تعالى بمن لايحذره اثر بيان انه حقيق بالحذروان اساطين الخلق من الملٰئكة والنبيين عليهم الصلٰوة والسلام على خذرمن ذلك و مامنعنا الخ قال المسكين عود الى مسئلة النبوة بالجواب عن اقتراحهم بالاٰيات الدالة علىٰ النبوة على زعمهم و اذ قلنالك ان ربك الخ قال المسكين اخذامن ابى السعود هذا متمم للجواب المذكور فى الاٰية الاولى و حاصله ان الله محيط بجميع الاشياء و قدعلم ان هؤلاء يكذبون ولو ظهرت لهم مقترحاتهم كما كذبوا بالرويا التى اريناك و كما كذبوا بالشجرة التى جعلت فى القراٰن للملعونين تنبت فى اصل الجحيم فلوانا ارسلنا بما اقترحوه من الاٰيات لفعلولها مافعلوا بنظائرها و فعل بهم ما فعل باشياعهم و قد قضينا بتاخير العقوبة العامة لهذه الامة الى الطامة الكبرى و هو معنى قوله و نخوفهم فمايزيدهم الاطغيانا كبيرا و اذ قلنا للملٰئكة اسجدوا الخ قال المسكين لما قررالله تعالى امرالتوحيد والنبوة و كيفية الاعمال شرع الاٰن فى تعدبدالنعم الباعثة على الايمان والرادعة عنالكفر فذكر اولاً قصة اكرام بنى اٰدم بذكر اكرام ابيهم اٰدم عليه السلام و تضمنت هذه الحكاية تحقيق مضمون قوله تعالى اولئك الذين يدعون ببيان ان للملٰئكة امتثلوا واطاعوامن غير تردد و تلعثم و تحقيق مضمون قوله تعالى فما يزيد هم الاطغيانا كبيرا ببيان عناد ابليس و عتوه عن امرالله تعالى ربكم الذى يزجى لكم الخ قال ابوالسعود و هذاتذكير لبعض النعم التى هى دلائل التوحيد و تمهيد لذكر توحيد هم عند مساس الضر تكملة لما مر من قوله تعالى فلايملكون الخ ولقد كرمنا بنى اٰدم الخ اعلم ان المقصود من هذه الاٰية

ذکر نعمته اخری جلیلة رفعیة من نعم الله تعالی علی الانسان یوم ندعوا کل اناس الخ اعلم انہ تعالی لما ذکر انواع کرامات الانسان فی الدنیا ذکراحول درجاته فی الأخرة قال المسکین و ایضاھو تقریر لما مرمن اثبات البعث والحساب و ان کادوالیفتنونک الخ قال المسکین ھذا بیان لعداوة الکفار مع النبی صلی الله علیه وسلم فی امرالدین و ھوالمذکور فی ھذه الأیة و فی الامر الدنیا و ھو فیما بعد فی قوله تعالی و ان کادوالیستفزونک الخ و ھو راجع الی بحث النبوة فکان المذکور فیما سبق ھوالتکذیب و ھھنا العداوة اقم الصلوة لدلوک الشمس الخ لما قال وان کادوا لیستفزونک امره تعالی بالاقبال علی عبادته تعالی لکی ینصره علیهم فکانه قیل لاقبال لسعیهم فی اخراجک من بلدتک ولا تلتفت الیهم واشتغل بعبادة الله تعالی و دوام علی اداء الصلوات و نظیره قوله تعالی فاصبر علی مایقولون واسبح بحمد ربک قال المسکین ثم ذکر ثمرة اقباله علیه السلام علی عبادة تعالی تطییبا لقلبه و شغلاله عن عداوتهم والاھتمام بهم فقال عسی ان یبعثک ربک مقاما محمود اثم امره علیه الصلوة والسلام بان یفوض امرد خوله و خروجه الیه تعالی فی کل حال و یطلب منه العزو النصرو لایبالی بکیدھم ولا یدبرلنفسه فقال و قل رب ادخلنی مدخل صدق الخ ثم بشره الله تعالی باجابة دعائه بالنصر فقال و قل جاء الحق و زھق الباطل و ننزل من القران ما ھو شفاء الخ قال المسکین ھذا دلیل لنبوته علیه السلام ببیان معجزته التی فاقت کل معجزة فهوایضا عائد الی تقریر النبوة التی ذکرت فی الأیات السالفة ثم انه تعالی ذکر السبب الاصلی فی وقوع ھؤلاء الجاھلین الضالین فی اودیة الضلال و مقامات الخزی والنکال و ھوالاستکبار والبطرو الیاس والقنوط ویجمعها الغفلة والقسوة فقال واذا انعمنا علی الانسان الخ ثم بین فی قوله قل کل یعمل الخ ان اعمال المومنین من قبول الهدیٰ والرحمة و اعمال الکفرین من الغفلة والقسوة علی طریقتهم التی تشاکل حالهم و یسئلونک عن الروح الخ قال المسکین ھذا ایضا متعلق بمسئلة النبوة وجواب عما ارادالیهود بالسؤال عنه ابطال امر نبوة علیه السلام و الزام الحجة علیه ولئن شئنا لنذھبن الخ قال المسکین ھذا ایضا تقریر لنبوته علیه السلام بکونه علیه السلام مؤیدابالوحی و ثباته من الله تعالی قل لئن اجتمعت الانس الخ قال المسکین ھذا ایضاتقریر لنبوته علیه السلام ببیان کون وحیه معجزاولقدصرفنا الخ قال المسکین بیان لجلالة القرأن العظیم بانه کاف شاف واف للمقصود و ذکر لشدة عاد الکفار المنکرین و قالوالن نؤمن الخ قال المسکین ھذا جواب عن قدحهم فی نبوة علیه السلام باقتراح الأیات عناد او حاصل الجواب انی بشرلا اقدر بنفسی علی الایتان بالأیات لکنی رسول یکفی

للدلالة علی رسالتی دلیل مالان الدلیل الواحد السالم عن القادح یکفی فی اثبات المطلوب ولایلزم اجتماع الدلائل الکثیرة والالم یثبت شیء من المطالب لان المخاصم لا ینتهی الی حدبل لایزال یطالب مدة عمره بالدلائل الغیر المتناهیة و هذه سفسطة بینة و ما منع الناس ان یومنوا الخ اعلم انه تعالیٰ لما حکی شبهة القوم فی اقتراح المعجزات الزائدة واجاب عنها حکی عنهم شبهة اخری و هی ان الله تعالی لوارسل رسولا الی الخلق لوجب ان یکون من الملٰئکة فاجاب الله تعالیٰ عن هذه قل کفی بالله الخ تقریره ان الله تعالی لما اظهر المعجزة علی و فق دعوای کان ذلک شهادة من الله تعالی علی کونی صادقا فبعد ذلک قول القائل بان الرسول یجبان یکون ملکالا انساناتحکم فاسدو من یهدی الله فهو المهتد الخ اعلم انه تعالی لما اجاب عن شبهات القوم فی انکار النبوة و اردفها بالوعید الاجمالی و هو قوله انه کان بعباده الخ ذکر بعده الوعیدالشدید علی سبیل التفصیل قال المسکین و علل الوعید بشیئین الکفربالأیات الدالة علی التوحید والنبوة و انکار البعث ثم اجاب عن استبعادهم للبعث بقوله او ثم یروان الله الخ فمدارالکلام ههنا علی امرالنبوة والمعاد قل لوانتم تملکون الخ ان الکفارلما قالو الن نؤمن لک الخ طلبوا اجراء الانهار والعیون فی بلدتهم لتکثراموالهم و تتسع علیهم معیشتهم فبین الله تعالیٰ لهم انهم لوملکواخزائن رحمة الله لبقوعلیٰ بخلهم و شحهم ولما اقدموا علیٰ ایصال النفع الی احدوعلی هذالتقدیر فلا فائدة فی اسعافهم بهذا المطلوب الذی التمسوه قال المسکین خلاصة المرام ان اظهار المقترحات اما للدلالة علی النبوة فجوابه مامر فی قوله هل کنت الابشرا رسولا و اما لاتساع الارزاق فجوابه علی ماذکر ههنا ان الاتساء لایکون حسب قانون التمدن الابان یعاون بعضهم بعضا و هؤلاء بنخلهم ماکانوا لعیان فانتفت هذه الفائدة ایضا فکان اظهار المقترحات عبثا محضاً فافهم والاحسن والاقرب ان یفسروالرحمة بالنبوة و یقال انه تعالی لما بین فیما قبل انکارهم للنبوة الدال علی المکراهة فرع علی هذه الکراهة انکم لو تملکون فرضا امرالنبوة لما اعطیتموها احدا و لقد اٰتینا موسی الخ قال المسکین تنظیر لاتیان الرسول بالأیات العظام وعناد الکفرة الجهلة اللئکم بالحق انزلناه الخ عادالی تعظیم حال القراٰن و جلالة درجة قل ادعوالله الخ قال المسکین تقریر للتوحید والعبادة فی الخاتمة کما کان فی الفاتحة فتناسب الاول والاخر

فہرست مضامین

ہماری دیگر مطبوعات

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان (061-4540513-4519240)